وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر:۲۲)

تفسیرِ کبیر

مُصَنِّفَہٗ

حضرت مِرزا بشیر الدّین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثّانی المصلح الموعود

رضی اللہ عنہ

جلد دہم

سُورتہائے الفیل، قریش، الماعُون، الکوثر، الکافِرون

النّصر، اللّھب، الاخلاص، الفلق، النّاس

نظارت نشرو اشاعت قادیان

الفہرست

سُوْرَةُ الْفِیْلِ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ الفیل۔ یہ سورۃ مکی ہے [له]

وَھِیَ خَمْسُ اٰیَاتٍ دُوْنَ الْبَسْمَلَۃِ وَفِیْھَا رُکُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے سوا پانچ آیتیں ہیں اور ایک رکوع ہے۔

سورۃ الفیل مکی سورۃ ہے

[له] سورۃ الفیل مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ یہ سورۃ مکی ہے اور مفسرین لکھتے ہیں کہ اس سورۃ کے مکی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ مغربی مستشرقین کے نزدیک بھی یہ سورۃ مکی ہے۔ جرمنی کا مشہور مستشرق نولڈکے اسے نہایت ابتدائی سورتوں میں سے قرار دیتا ہے اور سورۃ تکاثر کے زمانہ کی بتاتا ہے۔

اس سورۃ کا تعلق پہلی سورۃ سے ایک تو اُس لمبے تعلق کو مدنظر رکھتے ہوئے ہے جس کا ذکر میں اس سے پہلے کی شائع شدہ تفسیر میں کر چکا ہوں۔ یعنی قرآن کریم کی یہ آخری سورتیں سوائے چند آخری سورتوں کے باری باری اسلام کے ابتدائی زمانہ کے متعلق اور اسلام کے آخری زمانہ کے متعلق آتی ہیں۔ ایک سورۃ میں اسلام کے ابتدائی زمانہ کا خصوصیت سے ذکر ہوتا ہے اور دوسری سورۃ میں اسلام کے آخری زمانہ کا خصوصیت سے ذکر ہوتا ہے۔ میری یہ مراد نہیں کہ جس سورۃ میں اسلام کے ابتدائی زمانہ کا ذکر آتا ہے۔ اُس میں آخری زمانہ کا ذکر نہیں ہوتا۔ اور نہ یہ کہ جس سورۃ میں اسلام کے آخری زمانہ کا ذکر آتا ہے اُس میں ابتدائی زمانہ کا ذکر نہیں ہوتا۔ بالعموم دونوں ہی ذکر ہوتے ہیں۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ ایک سورۃ میں مدنظر اسلام کا ابتدائی زمانہ ہوتا ہے اور دوسری سورۃ میں خصوصیت کے ساتھ مدنظر اسلام کا آخری زمانہ ہوتا ہے۔ پس یہ سورتیں خصوصیت کے لحاظ سے ابتدائی یا آخری زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ نہیں کہ پہلے اور دوسرے زمانہ کا اکٹھا ذکر نہیں ہوتا۔ بسا اوقات بڑے زور سے ہوتا ہے۔ مگر وہ مقصود اول نہیں ہوتا۔ مقصود اول صرف ایک ذکر ہوتا ہے اور یہ دور باری باری چلتا ہے۔ اس لحاظ سے سورۃ الفیل آخری زمانہ کے متعلق معلوم ہوتی ہے یعنی اس میں خصوصیت کے ساتھ آخری زمانہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ گو ذکر اس میں پہلے زمانہ کا ہے مگر مقصود آخری زمانہ کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

سورۃ الفیل کا تعلق سورۃ الھمزۃ سے

قریبی ترتیب کے لحاظ سے اس سورۃ کا تعلق پہلی سورۃ سے یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں یہ بتایا گیا تھا کہ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ۔ عیب چینیاں کرنے والے، دوسروں کو نقصان پہنچانے والے اور تکلیفیں دینے والے لوگ جو اپنے مال اور دولت پر گھمنڈ کرتے ہیں وہ تباہ اور برباد کئے جائیں گے۔ یہ حکم تو عام تھا۔ کیونکہ فرماتا ہے وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ۔ ہر ایسے شخص پر عذاب آئیگا جو هُمَزَة اور لُمَزَة ہوگا لیکن مقصود اول اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف تھے۔
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپ کے دشمن مالدار تھے۔ دولتمند تھے۔ ان کی بڑی بڑی تجارتیں تھیں بڑی بڑی جائیدادیں تھیں۔ تمام ملکی اقتدار ان کے قبضہ میں تھا اور وہ اپنے مال و دولت اور رتبہ کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ ان طاقتوں اور قوتوں کی وجہ سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور انکے

ساتھی کسی صورت میں بھی اُن پر غالب نہیں آسکتے۔
اللہ تعالیٰ نے اُن کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے
تمہارا یہ خیال کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تم پر غالب
نہیں آسکتے قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد ہے محمد رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم ضرور غالب آئینگے اور تم لوگ جو
بڑے کہلاتے ہو اور مال و دولت کے غلط استعمال
کی وجہ سے غریبوں کو ستاتے اور دکھ دیتے ہو۔ ناکام و
نامراد رہو گے۔ غرض اس سورۃ میں یہ خبر دی گئی تھی کہ
یہ لوگ بڑے دُکھ میں مبتلا ہونگے۔ ان کی تباہی کامل ہوگی
اور ان کا انجام نہایت دردناک ہوگا۔ یہاں قدرتی طور پر
سوال پیدا ہوتا تھا کہ ایسا کس طرح ہوگا عقل میں تو یہ نہیں آسکتا
کہ بڑے بڑے مالدار، بڑے بڑے عقلمند، بڑے بڑے
مدبّر اور بڑی بڑی طاقتوں والے ہار جائیں اور کمزور
جیت جائیں جن کے پاس حکومت ہو وہ تو شکست
کھا جائیں اور جو ہمسائیوں کے مظالم کا شکار ہو رہا ہو
وہ فتح حاصل کرلے۔ پس چونکہ یہ اعتراض پیدا ہوتا تھا کہ
عقل اس بات کو نہیں مان سکتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ
نے اس سورۃ میں ایک ایسا واقعہ پیش کیا ہے جسے
کوئی عقل نہیں مان سکتی تھی۔ اس میں جو کچھ ہوا الٰہی
تقدیر کے ماتحت ہوا اور عقل کے بالکل خلاف نتیجہ
پیدا ہوا اور دنیا کو تسلیم کرنا پڑا کہ اس دنیا میں صرف
وہی کچھ نہیں ہوتا جو عقل کے مطابق ہو بلکہ ایسے واقعات
بھی رُونما ہوجایا کرتے ہیں جو عقل کے خلاف ہوتے ہیں
جیسا کہ اصحاب الفیل کا واقعہ ہے۔ ایک بادشاہ نے
جس کی بہت بڑی اور منظم حکومت تھی مکہ پر حملہ کیا۔ مگر
جیسا کہ آگے تفصیل آئیگی باوجود ساری طاقتوں اور قوتوں کے
وہ ہار گیا اور مکہ کے لوگ جو بے سروسامان تھے جیت گئے۔

سورۃ الفیل کا سورۃ ھمزہ سے دوسرا تعلق

یوں تو ھمزۃ اور لمزۃ ہر جگہ ہوتے ہیں مگر اس جگہ
پہلے مخاطب مکہ کے ھمزہ اور لمزہ ہی تھے اور انہی
کے متعلق یہ کہا گیا تھا کہ اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ
یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗۤ اَخْلَدَہٗ۔ وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ
ہم مال و دولت کے زور سے غالب آجائیں گے اور
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے مقابلہ میں ہار
جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان مکہ والوں کو فرماتا ہے کہ تمہارے
مکہ میں ایک مثال موجود ہے۔ تم جو محمد رسول اللہ صلے اللہ
علیہ وسلم کے مقابلہ میں اپنے آپکو بڑا کہہ رہے ہو تمہیں
یاد رکھنا چاہیئے کہ تم سے بھی بڑے بڑے لوگ دنیا میں
موجود تھے۔ تم سے بھی بڑی بڑی حکومتیں دنیا میں موجود
تھیں۔ تم سے بھی بڑی بڑی طاقتیں دنیا میں موجود تھیں
چنانچہ انہی حکومتوں اور طاقتوں میں سے ایک نے مکہ پر
حملہ کیا اور تم لوگوں نے بغیر مقابلہ کئے اس کے سامنے
ہتھیار ڈال دئے۔ لیکن مکہ چونکہ خدا کے ایک پیارے
کا صدر مقام بننے والا تھا اور چونکہ وہ خدا تعالیٰ کی ایک
پیاری جگہ اور اس کا مقدس مقام تھا۔ اللہ تعالےٰ نے
دشمن کے ارادوں کو باطل کردیا اور اس کی تدبیروں کو
توڑ کر رکھ دیا۔ چنانچہ آخر مکہ ہی غالب رہا اور وہ بڑا
طاقتور دشمن ناکام و نامراد رہا۔ یہ مثال تمہارے سامنے
موجود ہے عقل میں یہ بات بھی نہیں آتی تھی مگر آخر ہوا
وہی جو اللہ تعالیٰ کا منشاء تھا۔ کیا اس مثال کو دیکھتے ہوئے
اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم جن کے پاس کوئی مال نہیں۔ کوئی دولت نہیں۔
کوئی جتھہ نہیں۔ کوئی طاقت نہیں وہ کس طرح جیت
جائینگے اور مکہ والے جو طاقتور اور جتھہ والے ہیں۔
اُن کے مقابلہ میں کس طرح ہار جائینگے۔ تم اصحاب الفیل
کے واقعہ کو مدِّنظر رکھو اور یہ سمجھ لو کہ جس طرح وہاں ہوا
اسی طرح اللہ تعالیٰ اس موقعہ پر بھی اپنی قدرت کا
زبردست نشان دکھائیگا۔ اور تمہیں محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں مغلوب کردیگا۔

دوسرا تعلق اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے یہ ہے کہ
اس میں دلیل بالاولیٰ کے طور پر اس امر کی طرف اشارہ

ہے کہ خانۂ کعبہ مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ خانۂ کعبہ ایک علامت تھی آنے والے کی۔ ایک عظیم الشان انسان نے دعائے ابراہیمی کے ماتحت دنیا کی ہدایت کیلئے آنا تھا اور اس کے لئے ایک مرکز کی ضرورت تھی۔ اسی کیلئے اللہ تعالیٰ نے اس مقام کو مقدس قرار دیا اور اسے لوگوں کا مرجع بنا دیا مگر بہرحال یہ مقصود نہیں تھا۔ مقصود وہی تھا جس نے دعائے ابراہیمی کے ماتحت ظاہر ہونا تھا اور جس کا کام یہ بتایا گیا تھا کہ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ وہ خدا کی آیتیں انہیں پڑھ پڑھ کر سنائیگا۔ اُن کے دلوں کو پاک کریگا۔ انہیں احکام الٰہیہ کی حکمتیں سکھائیگا۔ انہیں خدا تعالیٰ کی شریعت کے اسرار سمجھائیگا اور اُن میں پاکیزگی اور طہارت پیدا کریگا یہ انسان اصل مقصود تھا مکان اصل مقصود نہیں تھا۔ مکان تو صرف ایک علامت تھی اصل اہمیت رکھنے والی وہ چیز تھی جو اس کے پیچھے تھی اور درحقیقت اگر ہم غور سے کام لیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ظاہری چیزیں اہمیت نہیں رکھتیں بلکہ اصل اہمیت اُسی چیز کی ہوتی ہے جو اُن چیزوں کے پیچھے ہوتی ہے اور ان کا محرک ہوتی ہے۔

لطیفہ مشہور ہے کہ شیخ سعدی ایک دفعہ سفر کرتے ہوئے کسی سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ ایک دن شہر کے رئیس نے دعوت کی اور اُس نے اعلان کرا دیا کہ وہ مسافر جو سراؤں میں ٹھہرے ہوئے ہیں وہ بھی میرے ہاں مدعو ہیں۔ سرائے والے نے شیخ سعدی کو بتا دیا کہ آج آپ کو یہاں سے کھانا نہیں ملیگا کیونکہ فلاں رئیس نے دعوت کی ہے اور آپ کو بھی اُس نے بلایا ہے۔ شیخ سعدی گو آدمی بہت بڑے تھے مگر لباس نہایت سادہ رکھتے تھے لیکن اسکے باوجود انکو بادشاہوں کے دربار میں جانے کی عادت تھی اور چونکہ وہ بہت مشہور تھے جس جگہ بھی جاتے لوگ ان کی قدر کرتے اور انہیں عزت کے مقام پر بٹھاتے۔ اسی عادت کے مطابق وہ اس رئیس کے ہاں گئے اور سیدھے صدر کی جگہ کے قریب بیٹھ گئے انہیں یہ خیال ہی نہ رہا کہ یہ نئی جگہ ہے اور یہاں لوگ مجھے نہیں جانتے۔ اتنے میں کوئی بہت بڑا رئیس آگیا۔ صاحب خانہ کے ملازم شیخ سعدی کے پاس آئے اور انہیں کہا کہ حضور جگہ چھوڑیئے فلاں صاحب تشریف لائے ہیں۔ شیخ سعدی وہاں سے اُٹھے اور دوسری جگہ بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ ایک اور رئیس آگئے۔ پھر ملازموں نے شیخ سعدی کو وہاں سے اٹھایا اور وہ ہٹ کر پرے بیٹھ گئے۔ وہاں بیٹھے تھے کہ ایک اور رئیس آگیا اور انہیں وہاں سے بھی اٹھنا پڑا۔ اسی طرح ہوتے ہوتے وہ جوتیوں کی جگہ پہ پہنچ گئے۔ خیر انہوں نے کھانا کھا لیا اور چلے گئے۔ چونکہ اس رئیس کی طرف سے تین دن کی دعوت کا اعلان تھا۔ شیخ سعدی چونکہ بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار میں جاتے اور ان کی مجالس میں بیٹھا کرتے تھے اسلئے مختلف بادشاہوں کی طرف سے انہیں بڑے بڑے قیمتی خلعت ملے ہوئے تھے۔ دوسرے دن دعوت پر جاتے ہوئے انہوں نے کسی بڑے بادشاہ کا دیا ہوا ایک نہایت قیمتی خلعت نکالا اور پہن لیا۔ اُس میں موتی اور جواہرات ٹنکے ہوئے تھے اور سونے کے کام سے بھرا ہوا تھا جب دعوت کی جگہ پہ پہنچے تو بجائے مسند پر بیٹھنے کے جاتے ہی دروازے کے پاس جاکر بیٹھ گئے۔ اتنے میں اسی رئیس کا ایک نوکر آیا اور اُس نے کہا حضور آپ یہاں کیوں تشریف رکھتے ہیں اُٹھیئے اور اُوپر چلیئے۔ وہ اُٹھ کر اس سے اوپر کی جگہ بیٹھے۔ ایک اور ملازم آگیا اور اس نے کہا۔ حضور یہاں کہاں بیٹھے ہیں اوپر ہو کر بیٹھئے۔ یہ کچھ اوپر ہو کر بیٹھ گئے۔ وہاں بیٹھے تھے کہ ایک اور نوکر نے دیکھ کر کہا حضور یہ جگہ آپ کے لئے مناسب نہیں آپ مسند کے قریب

تشریف لائیے۔ آخر صاحب خانہ تشریف لائے اور انہوں نے شیخ سعدی کا جو لباس دیکھا تو سمجھا کہ کوئی وزیر یا بڑا امیر کسی مملکت کا آیا ہے۔ اور ان سے آکر کہا کہ آپ مجھے کانٹوں میں کیوں گھسیٹتے ہیں آئیے اور مسند پر بیٹھیے چنانچہ اس نے شیخ سعدی کا اس قدر احترام کیا کہ خود بھی مسند پر نہ بیٹھا اور انہیں جگہ دے دی جب کھانا سامنے آیا تو شیخ سعدی نے خلعت لپیٹ کر شوربے میں ڈبو دیا۔ لوگوں نے سمجھا کہ یہ کوئی پاگل ہے جو ایسی حرکت کر رہا ہے صاحب خانہ نے بھی کہا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا جناب یہ میری دعوت نہیں اسی خلعت کی دعوت ہے اس لئے میں اسے کھلا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا ہم تو سمجھے نہیں آپکا مطلب کیا ہے وہ کہنے لگے میں ہی کل اس دعوت میں آیا تھا مگر مجھے دھکے دیتے دیتے جوتیوں تک پہنچا دیا گیا۔ مگر آج میں جوتیوں میں بیٹھا تو مجھے آگے لاتے لاتے مسند تک پہنچا دیا گیا۔ آخر میں تو وہی ہوں جو کل بھی اس مجلس میں آیا تھا۔ پھر مجھ سے جو سلوک میں فرق کیا گیا ہے وہ کیوں ہے۔ اسی لئے کہ آج میں نے خلعت پہنا ہوا ہے۔ مگر کل میں نے خلعت نہیں پہنا تھا۔ پس درحقیقت یہ اسی لباس کی دعوت ہے میری دعوت نہیں۔ شیخ سعدی مستغنی آدمی تھے انہیں خلعت کے خراب ہونے یا رہنے کی پرواہی کیا تھی۔ جب صاحب خانہ نے یہ بات سنی تو اس نے معذرت کی اور کہا کہ ہم سے غلطی ہوگئی تھی ہمیں معاف کیا جائے۔ یہ بظاہر ایک لطیفہ ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ سعدی کے مقابلہ میں خلعت کی کیا حقیقت تھی۔ نادان سمجھتے ہونگے کہ شاید خلعت کی وجہ سے سعدی کی عزت تھی مگر جو عقلمند تھے وہ جانتے تھے کہ اس خلعت کی عظمت اس میں ہے کہ سعدی نے اس کو پہنا ہے نہ یہ کہ سعدی کو اس خلعت کی وجہ سے عزت حاصل ہے۔ اسی طرح خانۂ کعبہ کی اپنی ذات میں کوئی عزت نہیں تھی خانۂ کعبہ کو اگر عزت حاصل تھی تو اس لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی بنیادیں اٹھائیں تا موعود کل ادیان ظاہر ہو کر اس سے تعلق پیدا کرے اور اللہ تعالیٰ نے اُسے لوگوں کے لئے ایک مقامِ اتحاد اور اقوامِ عالم کے لئے مرجع بنا دیا۔ اسی نقطۂ نگاہ کے ماتحت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم یہ تو دیکھو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ کیا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ یہ ہے کہ میں وہ شخص ہوں جس کے ظہور کیلئے خانۂ کعبہ کی بنیاد رکھتے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعائیں کی تھیں۔ تم کہتے ہو کہ یہ غریب ہے کمزور ہے۔ ناطاقت ہے اور ہم بڑے دولتمند ہیں یہ ہمارے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتا۔ تمہیں سمجھنا چاہیئے کہ خانۂ کعبہ کی قیمت زیادہ ہے یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیمت زیادہ ہے۔ خانۂ کعبہ کی تو بنیاد ہی اسی لئے رکھی گئی تھی کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسوقت جو دعا کی، اس میں کھلے طور پر یہ الفاظ آتے ہیں کہ وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ۔ پس خانۂ کعبہ قائم ہی اسی لئے کیا گیا تھا کہ تمام بنی نوع انسان کو مخاطب کرنے والا نبی اس جگہ پیدا ہو۔ اگر علامت کے لئے خدا نے یہ نشان دکھایا تھا کہ اس نے ابرہہ اور اسکے لشکر کو تباہ و برباد کر دیا تو تم سمجھ لو کہ اس مقصود کے لئے وہ کتنا بڑا نشان ظاہر کریگا۔ جب ایک علامت کیلئے اُس نے اصحاب الفیل کو تباہ کر دیا تو وہ چیز جو مقصود بالذات ہے اس کے لئے تو وہ جتنی بھی غیرت دکھائے کم ہے۔ حالانکہ اصحاب الفیل کو جو طاقت حاصل تھی وہ مکہ والوں کو نہیں تھی۔ گویا مکہ والوں کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہاری تو کوئی حیثیت ہی نہیں تم تو اصحاب الفیل کے مقابلہ میں بھی ذلیل تھے۔ جب تمہارے جیسے ذلیل

انسانوں کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اصحاب الفیل کے حملہ سے مکہ کو بچایا تو کیا تم یہ خیال کرسکتے ہو کہ تمہارے حملہ سے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بچائیگا۔

تیسرا قریبی تعلق پہلی سورۃ سے یہ ہے کہ اس میں بتایا گیا ہے کہ مکہ کا بچانا بھی گو اصحاب الفیل کی تباہی کی ایک وجہ تھی۔ مگر اصل وجہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت تھی اور یہ مقصد اور تمام مقاصد سے زیادہ مقدم اور اہم تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خانۂ کعبہ کو بچانا خود بھی ایک مقصود تھا مگر بعض دفعہ ایک سے زیادہ بھی مقصود ہوجاتے ہیں۔ مثلاً بعض دفعہ حکومت باہر سے آنے والے وزراء کی دعوت کرتی ہے تو وہ وزیر اعظم کی بھی دعوت کرتی ہے۔ وزیر خارجہ کی بھی دعوت کرتی ہے۔ وزیر تعلیم کی بھی دعوت کرتی ہے۔ وزیر مال کی بھی دعوت کرتی ہے۔ اسی طرح دوسرے وزراء کی بھی دعوت کرتی ہے۔ مگر مقدم وزیر اعظم کی دعوت ہوتی ہے۔ وزیر خارجہ یا وزیر مال یا وزیر تعلیم کی دعوت مقدم نہیں ہوتی۔ اسی طرح مکہ کے بچانے میں جہاں تک خانۂ کعبہ کی حفاظت مدنظر تھی وہاں اس سے بڑھ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام مدنظر تھا جو تھوڑے ہی دنوں تک پیدا ہونے والے تھے اور جس کی تفصیل آگے آئیگی۔ اللہ تعالیٰ اس جگہ فرماتا ہے کہ تم کہتے ہو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح جیت جائینگے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان ہی کی خاطر اصحاب الفیل کو تباہ کردیا۔ اب کیا تم سمجھتے ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے پہلے تو اس نے آپ کے لئے ایسا عظیم الشان نشان دکھا دیا تھا۔ مگر پیدا ہونے کے بعد وہ آپکو چھوڑ دیگا۔ جس انسان کی حیثیت اتنی عظیم الشان تھی کہ اُسکے پیدا ہونے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے اُس کے لئے اپنے نشانات کو ظاہر کرنا شروع کردیا تھا تم سمجھ سکتے ہو کہ اس کے پیدا ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کو اُس کا کتنا بڑا احترام ملحوظ ہوگا اور اس کی عظمت کے اظہار کے لئے وہ کیا کچھ نہ کریگا۔ پس تمہیں اپنا فکر کرلینا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ تم اس کی مخالفت میں اپنی عاقبت تباہ کرلو۔

سورۃ الفیل کا سورۃ ہمزہ سے تیسرا تعلق

سورۃ الفیل کا سورۃ ہمزہ کو چوتھا تعلق

چوتھا قریبی تعلق اس سورۃ اور پہلی سورۃ کا یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں دشمن کے مال و دولت کے مالک ہونے کا دعویٰ بیان کیا گیا تھا۔ دشمن کا دعویٰ تھا کہ مَیں بڑا مالدار ہوں اور اس کی وجہ سے میں ہمیشہ ہمیش قائم رہونگا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب الفیل کے واقعہ کو پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ اصحاب الفیل بھی بڑے دولتمند تھے اور ان کی دولت سے تمہاری دولت زیادہ نہیں مگر باوجود اس کے کہ وہ بڑے دولتمند تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو تباہ کردیا۔ پس تمہارا یہ خیال کرلینا کہ چونکہ ہمارے پاس بڑی دولت اور مال ہے اس لئے ہم تباہ نہیں ہوسکتے غلط ہے۔ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں اگر تم کھڑے ہوگے تو ضرور کاٹے جاؤ گے۔ اس کی تلوار کے سامنے بڑا اور چھوٹا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ سب کے سب تباہ ہوجاتے ہیں۔ وہ دشمن ایک ایسے گرجا کو بچانے کے لئے مکہ پر حملہ آور ہوا تھا جس میں جابجا قیمتی پتھر لگے ہوئے تھے۔ سنگِ مرمر کا اس میں کام کیا گیا تھا۔ دُور دُور سے انجینئر اس کی تعمیر کیلئے منگوائے گئے تھے سونے کا پانی اس پر پھروایا گیا تھا اور نہایت قیمتی پتھر اُس میں جڑوائے گئے تھے۔ اس کے مقابلہ میں ظاہری قیمت کے لحاظ سے خانۂ کعبہ کی کیا حیثیت ہے۔ اگر ظاہری قیمت کو دیکھا جائے تو اس کے مقابلہ میں اس کی کچھ بھی حیثیت نہیں۔ پس تم اگر دولت کا گھمنڈ کرتے ہو تو اس گرجا کے بنانے والوں کے پاس زیادہ دولت تھی مگر جب وہ بھی خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں آئے تو تباہ ہوگئے۔

سورۃ الفیل کا سورۃ ہمزہ سے پانچواں تعلق

پانچواں قریبی تعلق اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے یہ ہے کہ بعض لوگ یہ اعتراض کردیا کرتے ہیں کہ اگلے جہان کے

عذاب سے لوگوں کو ڈرانے کا فائدہ کیا ہے؟ پہلی سورۃ میں فرمایا گیا تھا کہ کَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ نَارُ اللّٰهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ۔ میں بتا چکا ہوں کہ اِن آیات میں خصوصیت سے اس دنیا کے عذاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر اس کے ظاہری معنے چونکہ یہی نظر آتے ہیں کہ اگلے جہان میں کفار پر اس رنگ میں عذاب نازل ہوگا۔ اِس قسم کی آیات پر کفار شور مچا دیا کرتے ہیں کہ اگلا جہان تو کسی نے دیکھا نہیں۔ پس تم اگلے جہان کے عذابوں کا ذکر کرکے درحقیقت لوگوں کو دھوکا دیتے ہو۔ اور ایک ایسی بات پیش کرتے ہو جس کی تصدیق اس دُنیا میں نہیں ہوسکتی۔ جیسے اب تک بھی یورو پین مصنف یہی اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے اگلے جہان کے عذابوں سے ڈرا ڈرا کر لوگوں کو مسلمان کر لیا۔ یہی عرب لوگ کہتے تھے کہ قرآن کریم ایسے عذابوں کی خبر دیتا ہے جو اس جہان سے تعلق نہیں رکھتے وہ صرف ایسے عذابوں کا ذکر کرتا ہے جو اگلے جہان سے تعلق رکھتے ہیں اور اگلا جہان ہم نہیں مانتے پھر ہم ان باتوں کو کس طرح درست تسلیم کر لیں۔ اس کے جواب کیلئے قرآن کریم کا یہ طریق ہے کہ جہاں وہ کسی اخروی عذاب یا انعام کا ذکر کرتا ہے وہاں کسی نہ کسی دنیوی عذاب یا انعام کا ضرور ذکر کرتا ہے یہ بتانے کیلئے کہ تم اخروی عذاب یا انعام یا نتیجہ کے متعلق تو کہہ سکتے ہو۔ کہ ہم ان باتوں کو کس طرح مان لیں یہ تو اگلے جہان سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر تم دنیوی امور کے متعلق یہ بات نہیں کہہ سکتے اس لئے ہم اخروی عذابوں یا انعاموں کے ذکر کے ساتھ ہی بعض دنیوی امور سے تعلق رکھنے والی پیشگوئیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جو موجودہ حالات میں بالکل ناممکن نظر آتی ہیں۔ اگر یہ ناممکن نظر آنے والی باتیں ممکن ہو جائیں۔ اور تمہاری آنکھوں کے سامنے یہ باتیں پوری ہو جائیں تو تمہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ جس خدا نے ان غیر ممکنات کو ممکنات کی صورت دے دی ہے وہ اخروی عذابوں کو بھی اسی رنگ میں پورا کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم کا یہ ایک عام قانون ہے کہ وہ اخروی اور دنیوی عذابوں اور انعاموں کو آپس میں ملا کر بیان کرتا ہے تاکہ دنیوی عذاب اور انعام اخروی عذابوں اور انعاموں کی صداقت پر گواہ ہوں اور کفار ان کے انکار کی جرأت نہ کر سکیں۔

غرض اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفیل کو کفار کے اس اعتراض کے جواب میں بیان کیا ہے کہ اگلے جہان کے عذابوں کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تمہیں یہ بات عقل کے خلاف اور ناممکن نظر آتی ہے مگر ایسی ہی ناممکن بات اصحاب الفیل کی بربادی کی بھی تھی۔ اُن کا حملہ ایسے رنگ میں ہُوا اور ایسے حالات میں ہُوا اور عربوں کا دفاع اتنا کمزور پڑ گیا اور انہوں نے اپنے آپکو ابرہہ اور اس کے لشکر کے مقابلہ میں اتنا بیکس اور بے بس پایا کہ ہتھیار ڈال دئے اور سمجھ لیا کہ ہم انکا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مگر باوجود اس کے اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایسے سامانوں اور ذرائع سے دشمن کو تباہ کیا گیا کہ جس کی مثال دنیا میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی۔ فرماتا ہے تم غور کرو اور سوچو کہ وہاں کیا بات تھی اور کس طرح اللہ تعالیٰ نے اُس کے لشکر کو تباہ کیا۔ اُس کا لشکر اسلئے تباہ ہُوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ایک دُعا کی تھی جس کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ نے اُن سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اس شہر کو امن والا بنائیگا۔ اور اسے دشمنوں کے حملہ سے محفوظ رکھیگا۔ ابراہیمؑ کے وقت لوگ کہتے ہونگے کہ جناب آپ نے یہ دعویٰ تو کر دیا ہے مگر اس کا ثبوت کیا ہے۔ یہ تو آئندہ زمانہ کے متعلق آپ ایک بات کہہ رہے ہیں۔ اور اُس زمانہ میں نہ ہم زندہ ہونگے نہ آپنے زندہ رہنا ہے۔ پھر ایسی بات کا فائدہ کیا ہے۔ مگر جب وہ وقت آیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ ابراہیمؑ کی پیشگوئی

پُوری ہوئی اور ایک زبردست دشمن جو لشکر جرار کیساتھ خانہ کعبہ پر حملہ آور ہوا تھا اُس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کو بچا لیا اور اس طرح ایک ناممکن بات ممکن ہوگئی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ پیشگوئی کی تھی۔ اُسوقت مکہ دنیا میں کوئی شہر نہیں تھا محض اللہ تعالیٰ کی محبّت اور اُس کی رضا کیلئے انہوں نے اپنی بیوی اور ایک چھوٹے بچے کو جو ابھی بالغ بھی نہیں ہُوا تھا۔ اُس مقام پر آکر چھوڑ دیا۔ اُس وقت تک ابھی زمزم کا چشمہ بھی نہیں پھوٹا تھا۔ بالکل وادیٔ غیر ذی زرع کی سی حالت تھی نہ اُس میں پانی کا کوئی سامان تھا نہ کھانے کا کوئی سامان تھا صرف ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلی خشک کھجوروں کی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے پاس رکھدی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت وہ اپنی بیوی اور بچے کو وہاں چھوڑ کر واپس چل پڑے۔ انہوں نے اپنی بیوی کو بتایا نہیں کہ میں تمہیں یہاں اکیلے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ کیونکہ انہیں خیال گذرا کہ ماں کی مامتا اپنے بچہ کی تکلیف کی وجہ سے شاید اس کی برداشت نہ کر سکے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام چلے تو آپ نے اس محبت کی وجہ سے جو طبعاً انسان کو اپنی بیوی اور بچے سے ہوتی ہے تھوڑی دیر کے بعد انہیں مڑ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ پہلے تو وہ اس رنگ میں باتیں کرتے رہے کہ بیوی کو یہ شبہ پیدا نہ ہُو اکہ میں انہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں اور جب وہاں سے واپس چلے تو واپس لوٹتے وقت بھی اس انداز میں واپس گئے جیسے کوئی ایندھن اکٹھا کرنے جاتا ہے یا پانی کا انتظام کرنے کیلئے جاتا ہے مگر جب چل پڑے تو اُن سے برداشت نہ ہو سکا اور تھوڑے فاصلہ پر جاکر انہوں نے اپنی بیوی اور بچے کی طرف دیکھا اور پھر چلے اور چند قدم اٹھائے تو محبت نے غلبہ پایا اور انہوں نے دوبارہ اپنی بیوی اور بچے کی طرف دیکھا پھر چلے تو تھوڑی دیر کے بعد محبت نے پھر جوش مارا اور پھر انہوں نے اپنی بیوی اور بچے پر نظر ڈالی حضرت ہاجرہؓ اپنے خاوند کی ان حرکات سے سمجھ گئیں۔ یہ جُدائی عارضی نہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے یہ مستقل طور پر جا رہے ہیں۔ کیونکہ اُن کے چہرے پر رقّت کے آثار تھے اور ان کی آنکھوں میں آنسو آئے ہوئے تھے۔ حضرت ہاجرہؓ نے سمجھ لیا کہ بات کچھ اور ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھیں اور حضرت ابراہیمؑ کے پاس گئیں اور کہا کہ کیا آپ ہم کو چھوڑے چلے جا رہے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ رقّت کی وجہ سے کوئی جواب نہ دے سکے۔ اُن کا گلا پکڑا گیا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور انہوں نے اپنا منہ پھیر لیا۔ حضرت ہاجرہؓ کو یقین آگیا کہ اب یہ ہم کو مستقل طور پر چھوڑے چلے جا رہے ہیں۔ چونکہ حضرت ہاجرہؓ کا پہلے بھی اپنی سَوت کے ساتھ جھگڑا ہو چکا تھا اسلئے انہیں خیال آیا کہ شاید یہ اس کی وجہ سے نہ ہو۔ پھر خیال آیا کہ چونکہ حضرت ابراہیم اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں اسلئے شاید اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو اس بات کا حکم نہ دیا ہو چنانچہ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ ءَ اَللّٰہُ اَمَرَكَ۔ کیا خدا نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ایسا کرو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مگر غم کی وجہ سے ان سے بات نہیں کی گئی حضرت ہاجرہؓ نے یہ سنکر کہا اگر خدا نے آپ کو یہ حکم دیا ہے تو خدا ہم کو چھوڑیگا نہیں۔ آپ بیشک چلے جائیں۔ جسوقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی اور بیٹے کو وہاں چھوڑا ہے۔ اس وقت مکہ کوئی شہر نہیں تھا۔ وہاں کھانے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہاں پینے کی کوئی چیز نہیں تھی صرف ایک مشکیزہ پانی کا اور ایک تھیلی کھجوروں کی وہ انہیں دے کر واپس چلے گئے اور اس لئے گئے کہ خدا نے ان سے کہا تھا کہ تو اپنے بیٹے کو ہماری راہ میں ذبح کر۔ میرا کامل یقین ہے اور میں نے متواتر یہ بات بیان کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میں اسے قرآن کریم سے ثابت کر سکتا ہوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رویاء میں جو یہ دیکھا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں اس سے مراد ظاہری ذبح

(۲۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حضرت اسمٰعیلؑ کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑنے کا واقعہ

کرنا نہیں تھا بلکہ اس سے مراد یہ تھی کہ ایک وقت آپکو حکم دیا جائیگا کہ آپ اپنے بیٹے اسماعیل کو ایک ایسی وادیٔ غیر ذی زرع میں جاکر چھوڑ آئیں جہاں نہ پینے کے لئے پانی ہو اور نہ کھانے کے لئے غلّہ۔ ایک جنگل اور وحشتناک بیابان میں جہاں ہر وقت اس بات کا امکان تھا کہ بھیڑیا آئے اور انہیں کھا جائے۔ جہاں کھانے اور پینے کی کوئی چیز نہ تھی۔ جہاں رہائش کے لئے کوئی مکان نہیں تھا۔ جہاں سینکڑوں میل تک آبادی کا کوئی نشان تک نہ تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بیٹے اسماعیل کو چھوڑنا قتل سے کسی طرح کم نہیں تھا بلکہ زیادہ ہی تھا۔ قتل کرتے وقت تو مقتول کی ایک منٹ میں جان نکل جاتی ہے مگر یہاں اس بات کا امکان تھا کہ وہ بھوکے اور پیاسے کئی کئی دن تک تڑپ تڑپ اور سسک سسک کر جان دیں۔

پس میرے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو خواب دیکھی تھی اُس میں اسی طرف اشارہ تھا کہ ایک دن تمہیں حکم دیا جائے گا کہ جاؤ اور اسماعیلؑ کو جنگل میں چھوڑ آؤ۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ ایک ایسی جگہ پر جس میں کشش کے کوئی سامان نہیں۔ جس میں کھانے پینے کے کوئی سامان نہیں جس میں رہائش کا کوئی سامان نہیں اپنا گھر بنائے۔ اور پھر اُس گھر کو ترقی دے کر ایک بستی کی شکل دے اور اُس بستی میں ایک ایسی قوم پلتی چلی جائے جس میں اُس کا آخری نبی دنیا کی ہدایت کے لئے مبعوث ہو۔ اس غرض کیلئے خدا تعالیٰ نے ایک جنگل کو چُنا اور اس لئے چُنا تا وہ خطّہ بیرونی دُنیا کے تعیش سے محفوظ رہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عرب میں بُت پرستی بھی تھی۔ بے دینی بھی تھی۔ بے حیائی بھی تھی اور وہ قوم شرک کے انتہا کو پہنچ چکی تھی مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ انسانیت کا جوہر جیسے عرب میں قائم تھا ویسا دنیا میں اور کہیں قائم نہیں تھا اور اس کی وجہ یہی ہے کہ مکّہ کے لوگ ایک جنگل میں پڑے ہوئے تھے اور دنیوی تعیش کے سامانوں سے بہت دُور تھے۔

بیشک اُن میں بعض دولتمند بھی تھے مگر دنیا کی دولت کے مقابلہ میں اُن کی دولت ایسی ہی تھی جیسے کسی چوہڑے کے پاس اگر لاکھ دو لاکھ روپے ہوں تو وہ اپنے آپ کو بہت بڑا امیر سمجھ لیتا ہے حالانکہ یورپ کے کئی کارخانہ دار ایسے ہیں جن کے ملازموں کے ملازموں کے پاس اس سے زیادہ دولت ہوتی ہے۔ مکّہ کی دولت بھی اس وقت کی معلومہ دنیا کی دولت کے مقابلہ میں بالکل حقیر تھی اور یہ جو کچھ ہُوا اللہ تعالیٰ کی حکمت کے ماتحت ہُوا۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ مکّہ میں ایک ایسی قوم بسائے جو دولتمند دُنیا اور عیش والی دنیا سے الگ رہتے ہوئے اِنسانی جوہروں کو قائم رکھ سکے۔ چنانچہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا ایک بڑا ذریعہ یہی تھا کہ آپؐ کو عرب قوم مل گئی جس نے قربانی اور ایثار کا وہ نمونہ دکھایا جس کی مثال دنیا کے پردہ پر نہیں مل سکتی۔ انہوں نے جس رنگ میں اپنی جانوں کی قربانی پیش کی ہے اسکی مثال دنیا میں اور کہیں نہیں ملتی۔ اس طرح وہ قوم اسلام کے پھیلنے اور اس کی اشاعت کا ایک ذریعہ بن گئی۔ مگر اسکی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ بہر حال خانۂ کعبہ کی بنیاد رکھتے وقت اور اپنی اولاد کو وہاں بسانے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کوئی طاقت اور قوت حاصل نہیں تھی اُس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ خبر دی کہ خدا ایک نبی کو میری اولاد میں مبعوث کرے گا جو دنیا کیلئے مرجع ہو جائیگا اور جب انہوں نے دعا کی کہ الٰہی دنیا کے چاروں طرف سے لوگ یہاں آئیں اور حج کریں اور عبادت اور ذکر الٰہی میں اپنا وقت گذاریں اور تیرا نام بلند کریں اور تسبیح و تحمید کریں تو کیا انہیں طاقت حاصل تھی کہ وہ لوگوں کو کھینچ لاتے۔ وہ تو خود اپنی بیوی اور بچے کو وہاں مرنے کے لئے چھوڑ گئے تھے انہوں نے کسی اور کو کیا لانا تھا مگر پھر خدا نے مکّہ کی آبادی کے کیسے سامان کئے اور ان کی دعا کو کس حیرت انگیز رنگ میں پورا

فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب واپس چلے گئے تو چند دنوں کے بعد پانی ختم ہوگیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام پیاس کی شدت سے تڑپنے لگے ماں سے اپنے بچے کی حالت دیکھی نہ گئی تو انہوں نے صفا و مروہ پر چڑھ کر دیکھنا چاہا کہ شاید ادھر ادھر کوئی آدمی نظر پڑ جائے اور وہ اُن کے لئے پانی کا انتظام کر دے یا پانی کا کچھ پتہ دے مگر وہاں آدمی کہاں؟ آخر جب بہت بیتاب ہوگئیں تو انہیں کسی کی آواز سنائی دی۔ اس پر انہوں نے بلند آواز سے کہا اے خدا کے بندے تُو جو کوئی بھی ہے میں تجھے قسم دیتی ہوں کہ اگر تجھے پانی کا پتہ ہے تو مجھے بتا کیونکہ میرا بچہ پیاسا مر رہا ہے اس کے جواب میں اس آواز دینے والے نے کہا۔ ہاجرہ میں خدا کا فرشتہ ہوں جا اور دیکھ کہ خدا نے اسماعیلؑ کے قدموں کے نیچے پانی کا ایک چشمہ پھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ وہ آئیں اور انہوں نے دیکھا کہ واقعہ میں زمین میں سے ایک چشمہ پھوٹ رہا ہے۔ یہی چشمہ زمزم کہلاتا ہے اور اسی تبرک کی وجہ سے لوگ اُس کا پانی دُور دُور لے جاتے ہیں بلکہ بعض لوگ وہاں اپنا کفن لے جاتے اور زمزم کے پانی سے گیلا کر کے لے آتے ہیں۔ پھر جُرہم قبیلہ وہاں سے گذرا اس قبیلہ کے آدمی چونکہ اسی راستہ سے یمن میں تجارت کے لئے جاتے تھے اور پانی نہ ملنے کی وجہ سے ان میں سے بعض مر جاتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یہاں پانی موجود ہے۔ تو انہوں نے خواہش کی کہ یہاں ایک درمیانی پڑاؤ بنا لیا جائے چنانچہ جُرہم قبیلہ کا رئیس حضرت ہاجرہؑ کے پاس آیا اور اُس نے درخواست کی کہ ہمیں یہاں بسنے کی اجازت دیجئے ہم آپ کی رعایا بن کر رہیں گے۔ حضرت ہاجرہؑ نے اُس کی اس درخواست کو منظور فرما لیا اور اس طرح وہ ایک درمیانی پڑاؤ بن گیا جہاں جُرہم قبیلہ کے اور بھی کئی لوگ رہنے لگ گئے رفتہ رفتہ اس پڑاؤ نے ایک گاؤں کی شکل اختیار کر لی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اسی قبیلہ کی ایک لڑکی سے شادی کر لی۔ بھلا حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس جنگل میں جہاں سینکڑوں میل تک آبادی نہ تھی کہاں سے بیوی لانی تھی۔ خدا نے ہی یہ سامان کیا کہ وہاں جُرہم قبیلہ کا ایک گاؤں بسا دیا۔ اس طرح ان کو بیوی بھی مل گئی اور ان کی اولاد کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ مگر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ آباد کیا تھا اُس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ یہ مکہ کسی دن شہر بن جائیگا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ لوگ یہاں آئینگے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اپنا وقت گذاریں گے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ شہر ہمیشہ محفوظ رہیگا اور اللہ اسے امن والا بنائیگا۔ اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے یہ تمام باتیں ناممکن تھیں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مکہ شہر بنے گا۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مکہ محفوظ رہیگا۔ مگر اصحاب الفیل کے حملہ کے وقت وہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا کہ مکہ ایک شہر بنے گا اور شہر بھی ایسا جو دشمن کے حملہ سے محفوظ رہیگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو پورا کر کے دکھا دیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اصحاب الفیل کو اُس وقت تک کس نے حملہ کرنے سے روکے رکھا تھا آخر کونسی طاقت تھی جو اس عرصۂ دراز میں مکہ کی محافظ رہی حضرت ابراہیمؑ اور اصحاب الفیل کے واقعہ کے درمیان کوئی ۲۸ سو سال کا فرق تھا۔ یا بعض روایتوں کے لحاظ سے ۲۲ سو سال کا فرق تھا۔ دو ہزار دو سو یا دو ہزار آٹھ سو سال تک مکہ پر کوئی حملہ نہیں کرتا۔ دو ہزار دو سو سال تک مکہ کے گرانے کی خواہش کسی کے دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ دو ہزار دو سو سال تک خانۂ کعبہ کو منہدم کرنے کا جوش کسی کے دل میں پیدا نہیں ہوتا نہ کسی یہودی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے نہ کسی عیسائی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے نہ کسی اور حکومت کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ اس عرصہ میں ثمود کی حکومت آئی، عاد کی حکومت آئی۔ یہ بڑی بڑی حکومتیں تھیں اور ان کی طاقت بہت زیادہ تھی مگر کسی کو یہ خیال پیدا نہ ہوا کہ وہ خانۂ کعبہ پر حملہ کرے لیکن ادھر ربیع الاول میں محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوتے ہیں اور اُدھر دو ماہ پہلے محرم میں ابرہہ حملہ کر دیتا ہے اور اُس وقت خدا یہ نشان ظاہر کرتا ہے کہ وہ ابرہہ اور اُس کے لشکر کو تباہ کر دیتا ہے۔ اتنی مدت تک کسی کو خانہ کعبہ پر حملہ کرنیکا خیال نہ آنا اور اُسوقت آنا جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہونے والے تھے بتاتا ہے کہ یہ شیطان کی طرف سے اُس وقت آخری حملہ تھا۔ تاکہ پیشتر اس کے کہ اُس انسان کا ظہور ہو جو دعائے ابراہیمی کے ماتحت پیدا ہونے والا تھا یہ جگہ ہی مٹا دی جائے۔ اور ابراہیمی پیشگوئی کا دنیا میں ظہور نہ ہو۔ بہرحال اس پیشگوئی کا پورا ہونا اور ایسے حالات میں پورا ہونا جو بالکل مخالف تھے اور ایسے وقت میں پورا ہونا جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پیدا ہونیوالے تھے بتاتا ہے کہ اس پیشگوئی کی ایک کڑی اللہ تعالےٰ کے تصرف میں تھی اور اسی نے مخالف حالات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس عظیم الشان پیشگوئی کو پورا کیا۔ دعائے ابراہیمی میں صاف طور پر یہ الفاظ آتے ہیں کہ الٰہی تُو میری اولاد میں سے ایک ایسا انسان مبعوث کر جو دنیا کو ہدایت دینے والا ہو اور ساتھ ہی یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خانہ کعبہ کو محفوظ رکھے۔ یہ دونوں دعائیں اللہ تعالےٰ کی کمال حکمت کے ماتحت ایک ہی وقت میں پوری ہوتی ہیں۔ محرّم میں خانہ کعبہ کو برباد کرنے والا دشمن اُٹھتا ہے۔ اور ربیع الاول میں وہ شخص پیدا ہو جاتا ہے جو کہتا ہے کہ میں دعائے ابراہیمی کا مصداق ہوں مگر ۲۲ سو سال تک نہ کسی نے خانہ کعبہ پر حملہ کیا اور نہ کسی نے یہ کہا کہ میں دُعائے ابراہیمی کا مصداق ہوں۔ کیا یہ سب کچھ اتفاق ہے؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کو تم اتفاق کہہ لو مگر کیا ابرہہ کے حملہ کو بھی کوئی اتفاق کہہ سکتا ہے۔ یقیناً اگر تعصب سے کام نہ لیا جائے تو نہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کو اتفاق کہا جا سکتا ہے اور نہ ابرہہ کے حملہ کو اتفاق کہا جا سکتا ہے بلکہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ جو کچھ ہوا اللہ تعالیٰ کے منشاء اور اس کے ازلی فیصلہ کے مطابق ہوا۔ پیشگوئی کا پورا ہونا ناممکن نظر آتا تھا۔ حالات قطعی طور پر مخالف تھے اور کوئی انسان محض اپنی عقل سے قیاس کر کے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ پیشگوئی پوری ہو جائے گی۔ مگر ناممکن حالات کو ممکن بناتے ہوئے اللہ تعالےٰ نے اس پیشگوئی کو پورا کر دیا۔ اگر اس دنیا میں ایسے نظارے نظر آ سکتے ہیں تو کیا اس خدا کی بتائی ہوئی وہ پیشگوئیاں پوری نہیں ہو سکتیں جو اگلے جہان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر ان پیشگوئیوں کا پورا ہونا ممکن ہے تو اگلے جہان سے تعلق رکھنے والی پیشگوئیوں کا پورا ہونا کیوں ممکن نہیں۔

غرض اللہ تعالیٰ نے هُمَزَةٍ اور لُمَزَةٍ کے ساتھ اس سورۃ کو جوڑ کر اُس اعتراض کو رد کیا ہے جو کفار کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے کہ اگلے جہان کے متعلق جو خبریں دی گئی ہیں وہ ہم کس طرح مان لیں۔ اللہ تعالےٰ جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ دعائے ابراہیمی کونسی ممکن تھی۔ اسماعیل کا موت سے بچ جانا کونسا ممکن تھا۔ خانہ کعبہ کا بن جانا اور سارے عرب کی توجہ کا اُس کیطرف پھر جانا کونسا ممکن تھا ۲۸ سو سال کے بعد ایک جرار لشکر کے دل میں خانہ کعبہ پر حملہ کرنے اور اُسے گرا دینے کا احساس پیدا ہونا کونسا ممکن تھا۔ اُس دشمن کا تباہ ہونا کونسا ممکن تھا اور پھر اس دشمن کی تباہی کے عین دو ماہ بعد اُس شخص کا پیدا ہو جانا جس کی خاطر خانہ کعبہ کو بسایا گیا تھا کونسا ممکن تھا۔ اگر یہ ساری ناممکن باتیں ممکن ہو گئی ہیں تو اگلے جہان کی باتوں پر تم کیا اعتراض کرتے ہو۔ جس خدا نے یہ باتیں پوری کی ہیں وہی اگلے جہان کی باتوں کو بھی پورا کر دے گا۔

غرض قرآن کریم کا یہ طریق ہے کہ وہ اس دنیا کی خبروں اور اگلے جہان کی خبروں کو ملا کر بیان کرتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(مَیں) اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں) ؀

اسی طرح جزا و سزا اور تبشیر و انذار کی خبروں کو بھی ملاکر بیان کرتا ہے تاکہ وہ قریب الفہم ہو جائیں مثلاً اگلے جہان کی دوزخ اور اگلے جہان کی جنت کی حقیقت انسانی سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک وہ اس جہان سے تعلق رکھنے والی انذاری خبروں اور بشارتوں کو پورا ہوتے نہ دیکھ لے۔ جب وہ اِس جہان سے تعلق رکھنے والی خبروں کو پورا ہوتے دیکھ لیتا ہے تو اُس کے دِل میں خود بخود یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ جب یہ ناممکن باتیں ممکن ہوگئی ہیں تو اگلے جہان سے تعلق رکھنے والی خبریں بھی ضرور پوری ہوکر رہیں گی۔

؀ تفسیر۔ بسم اللہ کی آیت تمام سورتوں میں مشترک ہے جو ہر سورۃ سے پہلے آتی ہے۔ میری تحقیق کے مطابق بسم اللہ مضامین سورۃ کھولنے کی کنجی ہے اور اس میں ایسے گُر بتائے گئے ہیں جن سے اگلی سورۃ کے مضامین خود بخود کُھل جاتے ہیں۔ بڑی چیز جو بسم اللہ کے ذریعہ ظاہر کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی ہر سورۃ میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہوتی ہے جو غیر معمولی ہوتی ہے یا وہ غیر معمولی ہوتی ہے عقیدہ کے لحاظ سے یعنی دنیا کے عقاید کچھ اور ہوتے ہیں اور قرآن کریم کوئی اور عقیدہ پیش کرتا ہے جس کی وجہ سے دنیا کہہ دیتی ہے کہ یہ غلط ہے یا وہ غیر معمولی ہوتی ہے آیندہ واقعات کے لحاظ سے یعنی اُس میں ایسی پیشگوئی ہوتی ہے جو حیرت انگیز ہوتی ہے یا وہ غیر معمولی ہوتی ہے پُرانے اخبار کے لحاظ سے یعنی تاریخ کچھ اور کہتی ہے مگر قرآن کہتا ہے کہ یہ صحیح نہیں اصل واقعہ یوں ہے یا غیر معمولی ہوتی ہے اس لحاظ سے کہ دنیوی قانونِ قدرت جو لوگوں نے سمجھ رکھا ہوتا ہے اُس کے خلاف ہوتی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے یہ بات سائنس کے خلاف کہہ دی ہے۔ بہرحال کوئی نہ کوئی غیر معمولی بات اُس میں آجاتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہر سورۃ سے پہلے بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کو رکھا ہے یعنی میں اللہ کا نام لیکر شروع کرتا ہوں جو بغیر کسی محنت اور کوشش کے اور بغیر کسی استحقاق کے سامان مہیا کرتا ہے۔ پھر وہ ایسا خدا ہے کہ جب کوئی شخص اس کے پیدا کردہ سامانوں سے کام لیتا ہے تو وہ اس کی کوشش کا بہتر سے بہتر بدلہ دیتا ہے۔ جیسے دنیا میں بعض دفعہ بڑے آدمی کو گواہی کے طور پر پیش کر دیا جاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر سورۃ سے پہلے اپنے آپکو بطور گواہ پیش کیا ہے۔ یہی دیکھ لو۔ پرسوں یہاں چاند نہیں دیکھا گیا۔ اگر کوئی احمدی دوسرے احمدی سے کہہ دیتا کہ کل روزہ ہوگا تو دوسرا فوراً کہتا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ سارے شہر نے تو چاند نہیں دیکھا پھر روزہ کس طرح ہوگیا۔ اسپر اگر وہ یہ جواب دیتا ہے کہ میں خلیفۃ المسیحؑ سے سنکر آیا ہوں تو دوسرا ضرور خاموش ہو جائیگا۔ کیونکہ وہ سمجھے گا کہ جس انسان کا میرے سامنے نام لیا گیا ہے وہ اتنی بڑی پوزیشن کا ہے کہ وہ غلط بات نہیں کہہ سکتا۔ اسے ضرور کہیں نہ کہیں سے اطلاع آئی ہوگی۔ اسی طرح قرآن کریم میں چونکہ غیر معمولی مطالب آتے ہیں اس لئے ہر سورۃ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بِسۡمِ اللّٰہِ رکھدی ہے یہ بتانے کیلئے کہ تم کہو گے کہ یہ تو غیر معمولی باتیں ہیں ہم کیسے مان لیں کہ اس طرح ہوکر رہیگا۔ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ ان خبروں کا بتانے والا کوئی انسان نہیں بلکہ ہم جو زمین و آسمان کے مالک ہیں یہ خبر دے رہے ہیں اسلئے ان خبروں کی سچائی پر تمہیں بہرحال ایمان رکھنا چاہیئے۔ یہی حکمت ہے جس کی بناء پر ہر سورۃ سے پہلے بِسۡمِ اللّٰہِ رکھدی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ تم کو اگر اس میں کوئی غیر معمولی یا ناممکن

بسم اللہ مضامین سورۃ کیلئے بطور کنجی کے

بات نظر آئے یا آئندہ کے متعلق کوئی پیشگوئی ہو جس کا پُورا ہونا بظاہر مشکل نظر آتا ہو تو تم اس کو غلط مت سمجھو اسلئے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔ یہ کتنا بڑا دعویٰ ہے جو قرآن کریم نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ دنیا کی اور الہامی کتب میں سے ہر کتاب الٰہی ہونے کا تو دعویٰ کرتی ہے مگر وہ کتاب کے ہر ٹکڑے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرار نہیں دیتی۔ عیسائی خود اپنے ہاتھ سے لکھتا ہے کہ انجیل میں فلاں فلاں بات غلط ہے۔ اور پھر کہتا ہے کہ انجیل خدا کی کتاب ہے۔ اور جب اس سے پوچھا جائے کہ یہ کیا۔ ایک طرف تو تم انجیل کی بعض باتوں کو غلط قرار دیتے ہو اور دوسری طرف اسے الٰہی کتاب کہتے ہو تو وہ جواب دیتا ہے کہ انجیل صرف اپنی مجموعی حیثیت میں خدا کی کتاب ہے۔ یہ نہیں کہ اس کا ہر ٹکڑہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اسی طرح یہودی اپنے ہاتھ سے لکھتا ہے کہ بائبل کی فلاں فلاں بات غلط ہے اور پھر ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ بائبل خدا کی کتاب ہے۔ اور جب اُس سے پُوچھا جائے کہ وہ کیوں ایسا متضاد دعویٰ کرتا ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ بائبل بحیثیت مجموعی خدا کی طرف سے ہے یہ نہیں کہ اس کا ہر ٹکڑہ اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں قرآن کریم کی یہ کتنی بڑی فضیلت ہے کہ اس نے ہر ٹکڑہ سے پہلے بِسْمِ اللّٰہ نازل کر کے یہ دعویٰ پیش کیا ہے کہ اس کا ہر ٹکڑہ میری طرف سے ہے یہ بھی میری طرف سے ہے اور وہ بھی میری طرف سے ہے تا کوئی شخص بائبل یا انجیل کی طرح یہ نہ کہہ سکے کہ فلاں ٹکڑہ خدا کی طرف سے نہیں بلکہ نعوذ باللہ انسانوں نے اس میں ملا دیا ہے گویا بِسْمِ اللّٰہ نے قرآن کریم کے ہر ٹکڑے پر مہر لگا دی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور یہ کہ اگر کوئی ایک ٹکڑہ بھی غلط نکلے تو یہ کتاب خدا کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔ بائبل پر ایمان رکھنے والا کہہ دیتا ہے کہ بائبل کا جو حصہ پورا ہو رہا ہے یہ خدا کی طرف سے ہے اور جو حصہ پورا نہیں

۲۱۱
ہر سورۃ کے پہلے بسم اللہ رکھنے کی وجہ

ہو رہا۔ یہ انسانوں کی طرف سے ہے۔ مگر قرآن کہتا ہے کہ اگر اس کتاب کا کوئی ایک ٹکڑہ بھی پُورا نہیں ہوتا تو تم سمجھ لو کہ ساری کی ساری کتاب خدا کی طرف سے نہیں۔ غرض بِسْمِ اللّٰہِ نے قرآن کریم کے ہر ٹکڑے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ڈال دی ہے اور بار بار وہ اس ذمہ داری کا اظہار کرتا ہے۔ بیشک بائبل بھی خدا تعالیٰ کی کتاب ہے مگر اس کے باوجود بائبل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسمیں ایسے حصے ہیں جو انسانوں نے اپنے ہاتھ سے اسمیں ملائے ہیں۔ اسی طرح انجیل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے مگر اس کے باوجود اُس میں ایسے ٹکڑے بھی ہیں جن کے متعلق عیسائی کہتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں۔ یہی مشکل قرآن کریم کے متعلق بھی پیش آسکتی تھی اگر ایک دفعہ ہی قرآن کریم میں بِسْمِ اللّٰہِ آتی تو ہو سکتا تھا کہ بعض مسلمان اپنی بے ایمانی میں یہ کہہ دیتے کہ فلاں ٹکڑہ خدا کی طرف سے نہیں۔ بعض انسانوں نے اس میں ملا دیا ہے۔ اس نقص کے ازالہ کیلئے اللہ تعالیٰ نے ہر ٹکڑہ سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ نازل کر دی ہے اور اس طرح بتایا ہے کہ قرآن کریم سارے کا سارا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ بائبل کی اگر ایک آیت غلط ثابت ہو جائے تو یہودی یہ نہیں مانیگا کہ ساری بائبل غلط ہے انجیل کی اگر ایک آیت غلط ثابت ہو جائے تو عیسائی یہ نہیں مانے گا کہ ساری انجیل غلط ہے۔ لیکن قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ ہم دنیا کے سامنے یہ دعویٰ پیش کرتے ہیں کہ اس کا ایک ایک ٹکڑہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی سورۃ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور اس کی بڑی سے بڑی سورۃ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اگر کوئی ایک ٹکڑہ بھی غلط ثابت ہو جائے تو سمجھ لو کہ سارا قرآن غلط ہے خدا نے اسے نازل نہیں کیا۔ یہ کتنا عظیم الشان دعویٰ ہے جو قرآن کریم نے پیش کیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی الہامی کتاب نہیں ٹھہر سکتی۔ دنیا میں لوگ اپنی

ذمہ واریاں کم کیا کرتے ہیں مگر قرآن کریم نے بار بار بِسْمِ اللّٰہِ نازل کر کے اپنی ذمہ واریوں کو بہت بڑھا لیا ہے اگر ایک دفعہ بِسْمِ اللّٰہِ آتی تو خیال کیا جا سکتا تھا کہ کچھ ٹکڑے ایسے بھی ہوں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوں مگر ہر سورۃ سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ کوئی ٹکڑہ بھی ایسا نہیں جس کی صداقت کی ذمہ داری ہم نہ لیتے ہوں۔ اس لئے کسی ایک ٹکڑے کا غلط ہونا درحقیقت سارے قرآن کا غلط ہونا ہے۔ مگر کوئی ایک ٹکڑہ بھی ایسا ثابت نہیں کیا جا سکتا جو غلط ہو۔ اور جس کی صداقت دنیا پر واضح نہ کی جا سکتی ہو۔ غرض یہ آیت قرآن کریم کے مشترک مضامین کی کنجی اور اس کے ہر ٹکڑہ کے خدا کی طرف سے نازل ہونے کی ایک بیّن دلیل ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں اسلامی عقیدہ کا خوب بیان کیا گیا ہے۔ اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ بھی اس دُنیا میں ہے وہ خدا کا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے خدا کرتا ہے۔ کوئی چیز خدا تعالیٰ کے اختیار سے باہر نہیں اور کسی بات میں خدا تعالیٰ کسی دوسرے کی امداد کا محتاج نہیں۔ ہر چیز جو ماسوی اللہ ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کی محتاج ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اسی کو عربی زبان میں توکل کہتے ہیں۔ یعنی اس عقیدہ کے مطابق انسانی عمل کا نام اسلامی اصطلاح میں توکل ہے پس بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں توکّل علی اللہ کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم خدا سے مدد مانگتے ہوئے۔ ایسے خدا سے مدد مانگتے ہوئے جس نے سب کے سب سامان بغیر کسی محنت اور کوشش اور تدبیر کے مہیا کر کے دئے ہیں اور جو ان سامانوں سے کام لینے پر پھر اچھے سے اچھا اور ہمیشہ اور بار بار نتیجہ خیز بدلہ دیتا ہے اس کام کو شروع کرتے ہیں یہ مختصراً ترجمہ ہے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کا اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کی تفسیر کی جائے تو اسی پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں گویا اس چھوٹی سی آیت میں یہ پیش کیا گیا ہے کہ حال خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے کیونکہ جب انسان کہتا ہے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ مَیں خدا سے مدد مانگتا ہوں۔ تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ یہ زمانہ جس میں مَیں ہوں اور کام کرنا چاہتا ہوں خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے اگر حال خدا تعالیٰ کے اختیار میں نہیں تو وہ مدد کس سے مانگتا ہے۔ مدد اسی سے مانگی جاتی ہے جس کے قبضہ و تصرف میں حال کا زمانہ ہو پس اگر مَیں کام کرتے ہوئے خدا تعالیٰ سے مدد مانگتا ہوں تو درحقیقت میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں خدا تعالیٰ کو طاقت حاصل ہے پھر الرَّحْمٰن کا لفظ آتا ہے یعنی مَیں اس سے مدد مانگتا ہوں جو رحمٰن ہے۔ رحمٰن کے معنے ہیں بغیر کوشش محنت اور خدمت کے ہر قسم کی ضرورتوں کو پورا کرنے والا۔ گویا رحمانیت کے ماتحت وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو بغیر کسی محنت اور کوشش کے انسانوں کو ملتی ہیں۔ رحمانیت میں آسمان کی پیدائش بھی شامل ہے رحمانیت میں زمین کی پیدائش بھی شامل ہے۔ رحمانیت میں پانی بھی شامل ہے رحمانیت میں ہوا بھی شامل ہے۔ رحمانیت میں انسان کا اپنا جسم بھی شامل ہے۔ رحمانیت میں اُسکے تمام قویٰ مثلاً ناک، کان اور آنکھیں وغیرہ بھی شامل ہیں۔ رحمانیت میں حیوانات بھی شامل ہیں۔ رحمانیت میں جمادات بھی شامل ہیں۔ رحمانیت میں چاند اور ستارے وغیرہ بھی شامل ہیں۔ غرض جو کچھ بھی اس دنیا میں پایا جاتا ہے جسکے بنانے میں ہم نے محنت نہیں کی وہ رحمانیت کا نتیجہ ہے اور ہر چیز جسکے بنانے میں ہم نے ہاتھ ہلایا ہے وہ رحیمیت ہے۔ دنیا میں دو ہی چیزیں ہیں یا تو ایسی چیزیں ہیں جنکے بنانے میں انسان نے حصہ نہیں لیا۔ یا ایسی چیزیں ہیں جن کے بنانے میں انسان نے حصہ لیا ہے۔ وہ چیزیں جن کے بنانے میں انسان نے حصہ نہیں لیا وہ رحمانیت کی صفت کے ماتحت آتی ہیں۔ اُن کیلئے کیوں رحمانیت کا لفظ بولا گیا ہے؟ کیوں نہیں کہا گیا کہ کچھ چیزیں خدا نے بنائی ہیں اور کچھ ایسی ہیں جن میں بندوں کی محنت اور انکی کوشش کا

بِسْمِ اللّٰہ میں توکل کا سبق

دخل ہے۔ کیوں خدا نے یہ نہیں کہا اور لفظ رحمٰن سے
اس مفہوم کو ادا کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ لفظ
بولے جاتے کہ کچھ چیزیں ایسی ہیں جو خدا نے پیدا کی ہیں
اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جو بندوں نے بنائی ہیں۔ تو ان
الفاظ سے یہ نتیجہ تو نکلتا کہ ان پیدا کی ہوئی اشیاء میں سے
کچھ چیزیں خدا کی بھی ہیں مگر یہ نتیجہ نہ نکلتا کہ جو چیزیں
خدا نے پیدا کی ہیں وہ سب کی سب انسان کے فائدہ
کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ یہ سوال بہرحال باقی رہ جاتا کہ وہ
چیزیں جو خدا نے بنائی ہیں وہ کسی فائدہ کے لئے ہیں یا
اُن میں سے کچھ بے فائدہ بھی ہیں۔ مگر رحمانیت کے لفظ
نے بتا دیا کہ وہ سب کی سب ہمارے فائدہ کیلئے ہیں۔
رحم کا لفظ کسی کو فائدہ پہنچانے کے لئے بولا جاتا ہے۔
یونہی نہیں بولا جاتا۔ مثلاً اگر سُورج چمک رہا ہو تو ہم یہ
نہیں کہہ سکتے کہ وہ بڑا رحم کر رہا ہے کیونکہ رحم میں دو
باتوں کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔ اوّل دوسرے کے
فائدہ کا کام کرنا۔ دوّم اس نیت سے کرنا کہ دوسرے
کو فائدہ پہنچے۔ فرض کرو کوئی شخص جا رہا ہے اور اُس کی
جیب سے اتفاقاً ایک پیسہ گر گیا ہے۔ کسی اور نے
اٹھا لیا ہے۔ اب اُسے فائدہ تو پہنچ گیا مگر کیا کوئی شخص
اس وجہ سے کہ اُس کے پیسہ سے دوسرے نے فائدہ
اٹھا لیا ہے یہ کہیگا کہ وہ بڑے رحم کرنے والے انسان
ہیں۔ پس رحم کے معنوں میں صرف یہی بات شامل نہیں
ہوتی کہ دوسرے کو فائدہ پہنچے بلکہ اُس میں یہ بھی ضروری
ہوتا ہے کہ دوسرے کو فائدہ پہنچانے کی نیت بھی ہو۔
پس رحمٰن کا لفظ بول کر بعض زائد امور بیان کئے گئے
ہیں جو اس لفظ کے بغیر ادا نہیں ہو سکتے تھے یعنی یہی
نہیں کہا گیا کہ خدا نے ایسی چیزیں پیدا کی ہیں جن کے
پیدا کرنے میں انسان کا دخل نہیں بلکہ خدا نے ان چیزوں
کو پیدا ہی انسان کے فائدہ کے لئے کیا ہے اور اس
نیت سے پیدا کیا ہے کہ انسان اُن سے فائدہ اُٹھائے

رحیم فَعِیل کے وزن پر ہے اور یہ وزن تواتر اور لمبے زمانہ کی
طرف اشارہ کرتا ہے اور رحمٰن فَعْلَان کے وزن پر ہے اور
وسعت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ رحیم کے معنے ہیں وہ جو
بار بار نتائج پیدا کرتا ہے۔ جب رحمانیت کے سامانوں سے
انسان فائدہ اُٹھا لیتا ہے تو رحیم خدا اس کے بار بار نتائج
پیدا کرتا ہے مثلاً انسان روٹی کھاتا ہے روٹی کھانے کا
یہی نتیجہ نہیں ہوتا کہ پیٹ بھر جاتا ہے بلکہ اس کے نتیجہ
میں خون پیدا ہوتا ہے جو مہینوں اور سالوں انسانی جسم
میں کام کرتا ہے۔ اسی خون سے اُس کے دماغ کو طاقت
ملتی ہے اس کی نظر کو طاقت ملتی ہے اُس کے ذہن کو طاقت
ملتی ہے اُس کے کانوں کو طاقت ملتی ہے جو مہینوں اور
سالوں اُس کے کام آتی ہے۔ پھر اسی میں سے نطفہ پیدا
ہوتا ہے جس سے اس کی نسل پیدا ہوتی ہے۔ پھر اُس نسل
سے اگلی نسل اور اگلی نسل سے اور اگلی نسل پیدا ہوتی
ہے۔ گویا ایک ایک فعل تواتر سے نتائج پیدا کرتا ہے یہ
رحیمیت ہے۔ اگر دنیا میں صرف یہی سلسلہ ہوتا کہ جب
کوئی شخص کام کرتا تو اسی وقت اس کا ایک نتیجہ پیدا
ہو جاتا تو ہم اس کو بدلہ تو کہہ سکتے تھے جیسے مزدور مزدوری
کرتا ہے تو اپنی اجرت لے لیتا ہے مگر ہم اسے رحیمیت
نہیں کہہ سکتے تھے رحیمیت کی مثال ایسی ہی ہے جیسے پنشن
ہوتی ہے۔ لوگ ملازمت کرتے ہیں تو انہیں اس کا بھی ایک
بدلہ مل رہا ہوتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اُنکے کھاتے میں
یہ بھی لکھا جاتا ہے کہ آئندہ اس کام کا متواتر نتیجہ پیدا ہوگا
چنانچہ اگر کوئی دس یا پندرہ سال ملازمت کرتا ہے تو وہ
تنخواہ کے $\frac{1}{4}$ حصہ کی پنشن کا حقدار ہو جاتا ہے۔ بیس
سال گذر جائیں تو $\frac{1}{3}$ پنشن کا حقدار ہو جاتا ہے۔ پچیس
سال گذر جائیں اور وہ ڈاکٹری سارٹیفکیٹ بھی پیش کر دے
تو اُسے نصف پنشن مل جاتی ہے۔ اور اگر تیس سال گذر جائیں
تو بغیر ڈاکٹری سارٹیفکیٹ کے ہی وہ پوری پنشن کا حقدار
بن جاتا ہے۔ یہ چیز ہے جو رحیمیت کے مشابہ ہے یعنی

کام کا بدلہ نقد ہی نہیں ملا بلکہ آئندہ کے لئے اور نیک نتائج کی بنیاد بھی ساتھ ہی رکھدی گئی۔ پھر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی رحیمیت اور خدا تعالیٰ کی رحیمیت میں فرق کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب انسان بدلہ دیتا ہے تو یہ سمجھ کر دیتا ہے کہ اس شخص نے کچھ سالوں کے بعد مر جانا ہے اگر اُسے پتہ لگ جائے کہ اس شخص نے کبھی نہیں مرنا تو وہ کبھی اُسے پنشن نہ دے۔ مگر چونکہ اُسے یقین ہوتا ہے کہ اس نے ضرور چند سالوں کے اندر اندر مر جانا ہے اس لئے وہ پنشن دے دیتا ہے لیکن خدا کو نہ صرف یہ پتہ ہے کہ انسان نہیں مریگا بلکہ وہ خود کہتا ہے کہ میں انسان کو مارونگا نہیں بلکہ اُسے ابدی زندگی دونگا۔ گویا یہی نہیں کہ وہ اتفاقی طور پر اس حادثہ کو برداشت کر لیتا ہے بلکہ وہ انسان کے زندہ رہنے اور اس کی دائمی حیات کے خود سامان مہیا کرتا ہے اسلئے خدا کی رحیمیت کی شان اور ہے اور انسان کی رحیمیت کی شان اور ہے۔ بہر حال بِسْمِ اللّٰہ حال پر۔ رحمٰن ماضی پر۔ اور رحیم کا لفظ مستقبل پر دلالت کرتا ہے اور یہ تینوں الفاظ بتاتے ہیں کہ تمام کے تمام کاموں میں تقدیر الٰہی انسان کے ساتھ وابستہ ہے۔ بِسْمِ اللّٰہ میں چھوٹی سی تدبیر شامل ہے یعنی انسان کہتا ہے میں خدائی مدد سے یہ کام شروع کرتا ہوں۔ گویا ارادہ انسان کا اپنا ہوتا ہے۔ اگر میرا ارادہ کسی کام کے متعلق نہ ہو تو میں یہ کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ میں خدا کی مدد سے فلاں کام شروع کرتا ہوں۔ بہر حال اس میں کچھ بندے کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد رحمانیت کا دَور ہے جو خالص خدا سے تعلق رکھتا ہے۔ اور رحیمیت میں تھوڑا سا کام بندہ کرتا ہے اور غیر منتہی نتیجہ خدا پیدا کرتا ہے گویا تدبیر اور تقدیر دونوں سے مل کر یہ دنیا چلتی ہے اور بسم اللہ ہم کو بتاتی ہے کہ تقدیر اور تدبیر آپس میں اس طرح الجھی ہوئی ہیں کہ ان کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ آگے انسان

کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے اُس کے کام بڑے اور چھوٹے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایمان کامل میں تقدیر کا پہلو غالب ہوتا ہے اور تدبیر کا پہلو کمزور رہوتا ہے جیسے رحمانیت خالص خدا کی تھی اسی طرح جو انسان خدا تعالیٰ کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے اُس کی زندگی کے کاموں میں بھی تقدیر زیادہ اور تدبیر کم نظر آتی ہے۔ وہ بیشک تدبیر بھی کرتا ہے مگر اُس کے نتائج اس کی تدبیر سے بہت زیادہ پیدا ہوتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرماتا ہے۔ مَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (انفال ع۲) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکر اُٹھاتے اور مٹھی بھر کر اُنہیں دشمن کی طرف پھینکا مگر اس کا جو نتیجہ نکلا وہ مٹھی بھر کنکروں سے کہاں نکل سکتا تھا۔ دس ہزار آدمی بھی اگر ایک ایک مٹھی کنکروں کی پھینکیں تو اُن کا وہ نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھینکے ہوئے مٹھی بھر کنکروں نے پیدا کر دیا آپ نے اِدھر مٹھی بھر کر کنکر پھینکے اُدھر ایک ہزار تجربہ کار لشکر جو سامنے کھڑا تھا بیکار ہو گیا۔ کنکر بیشک آپ نے ہی پھینکے مگر جب آپ نے کنکر پھینکے تو خدا تعالیٰ نے کہا۔ اب آگے بندے کا کام نہیں بلکہ میرا کام ہے۔ چنانچہ کنکروں کو دشمن تک پہنچانے کیلئے ہَوا کی ضرورت تھی۔ خدا نے ہَوا سے کہا کہ چلو اور کنکروں کو دشمن کی آنکھوں میں ڈالو۔ یہ مٹھی بھر کنکر صرف دو چار کی آنکھوں میں پڑ سکتے تھے مگر خدا نے زور کی ہَوا چلا کر میدان کی ریت اور کنکر اٹھا اٹھا کر دشمن کی آنکھوں میں ڈالنے شروع کر دئے۔ گویا مٹھی بھر کنکر تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھینکے اور کروڑوں کروڑ کنکر خدا نے پھینکے۔ جب انسان کوئی چیز پھینکنے کیلئے اپنے ہاتھ ہلاتا ہے تو اس سے کسی قدر ہَوا میں ضرور حرکت پیدا ہوتی ہے آپ کے کنکر پھینکنے سے بھی ضرور ہَوا میں حرکت پیدا

ہوئی ہوگی مگر اس حرکت سے جو ہوا پیدا ہوگی وہ اتنی
بھی تو نہیں ہوگی جتنی ایک پھونک مارنے سے پیدا
ہوتی ہے۔ لیکن اِدھر آپؐ نے اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور
اُدھر خدا نے ہَوا سے کہا کہ تم زور سے چلو اور دشمن کو
اندھا کر دو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے دشمن کو اُس کے
عزائم میں کلی طور پر ناکام کر دیا۔ بہرحال اس سے ظاہر
ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ
نے جو یہ نشان ظاہر فرمایا اس میں تدبیر کا حصہ بہت کم
تھا اور تقدیر کا حصہ بہت زیادہ تھا۔ یہی حال رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کاموں کا تھا۔ یہی حال باقی
انبیاءؑ کے کاموں کا تھا۔ اُن کے کاموں میں بھی تدبیر کم
اور تقدیر زیادہ تھی۔ پھر انبیاء سے نیچے اُتر کر جو لوگ
اللہ تعالیٰ کے محبوب ہوتے ہیں اُن کے کاموں کو ہم
دیکھتے ہیں تو ان میں بھی تدبیر کم ہوتی ہے اور تقدیر
زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن جو کمزور ایمان والا ہوتا ہے
اُس میں تدبیر کا پہلو غالب ہوتا ہے جیسے مادی لوگ
ہیں یا دہریہ وغیرہ ہیں۔ مَیں نے کمزور ایمان والا اُن کو
اِس لئے کہا ہے کہ دہریہ میں بھی کچھ نہ کچھ ایمان ضرور
ہوتا ہے کم از کم وہ خدا تعالیٰ کے قانونِ قدرت پر
ضرور ایمان رکھتا ہے اِس لحاظ سے ہم پورے طور پر
کسی کو بے ایمان نہیں کہہ سکتے۔ کسی کو خدا کے کلام
پر ایمان ہوتا ہے اور کسی کو خدا تعالیٰ کے قانونِ قدرت
پر ایمان ہوتا ہے۔ پاگل بیشک مستثنیٰ ہوتا ہے، وہ
قانونِ قدرت کا بھی لحاظ نہیں کرتا اور خدا تعالیٰ کے کلام
کا بھی پاس نہیں کرتا۔ مگر اس کو مستثنیٰ کرتے ہوئے باقی
تمام مادی آدمی آدھی بات پر ضرور ایمان رکھتے ہیں یعنی
گو اُنہیں خدا تعالیٰ کے کلام پر ایمان نہیں ہوتا مگر وہ
اُس کے فعل پر ضرور ایمان رکھتے ہیں بلکہ بعض دفعہ
مومنوں سے بھی زیادہ وہ خدا تعالیٰ کے فعل پر ایمان کا
اظہار کرتے ہیں۔ بہرحال کمزور ایمان والے اور مادی اور
دہریہ انسانوں کے کاموں پر تدبیر غالب ہوتی ہے،
اور تقدیر کا حصہ کم ہوتا ہے گو ہوتا ضرور ہے مثلاً جب
وہ کھانا کھاتا ہے تو اُن کا معدہ کھانے کو ہضم کرتا ہے
اور یہ تقدیر ہی کا فعل ہے اُس نے تو اتنا ہی کیا تھا کہ
ارادہ کیا اور منہ میں لقمہ ڈال لیا۔ باقی جو کچھ کام کیا وہ
خدا تعالیٰ کی تقدیر ہی نے کیا۔

حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ ہمیشہ فرمایا کرتے
تھے کہ دہریہ سے دہریہ بھی خدا تعالیٰ کی تقدیر سے باہر
نہیں ہوتا۔ ایک دہریہ کی زبان پر بھی میٹھا رکھ دو تو
باوجود اس کے کہ وہ خدا کو گالیاں دیتا ہوگا مگر خدا کو
گالیاں دینے والی زبان بھی اس میٹھے کو میٹھا ہی چکھے گی
غرض تقدیر ہر ایک شخص کے کام کے ساتھ کام کر رہی
ہوتی ہے مگر تدبیر کا پہلو غالب ہوتا ہے اور تقدیر کا
پہلو کمزور ہوتا ہے سوائے اہل اللہ کے کہ ان کا حساب
اس کے اُلٹ ہوتا ہے۔ ان دو کے علاوہ جو درمیانی
درجہ کا مومن ہوتا ہے خواہ وہ کلام الٰہی کو ماننے والا ہو
یا نہ ماننے والا ہو جیسے عیسائی کہ وہ بھی اپنے آپ کو
مومن کہتے ہیں کیونکہ وہ عیسائی مذہب کو تسلیم کرتے ہیں
حالانکہ وہ اسلام پر ایمان نہیں لائے۔ اسی طرح یہودی
بھی اپنے آپکو مومن کہتے ہیں کیونکہ وہ یہودی مذہب
کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہندو بھی اپنے آپ کو مومن کہتے
ہیں کیونکہ وہ ہندو مذہب کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان لوگوں
کے لئے خواہ وہ کلام الٰہی کو ماننے والے ہوں یا نہ ہوں
دونوں چیزوں کا امتزاج ہوتا ہے اور تقدیر اور تدبیر
ان کے لئے ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ دعائیں بھی
کرتے ہیں خواہ وہ سچے مذہب پر نہ ہوں جیسے عیسائی
اور یہودی اور ہندو سب دُعاؤں سے کام لیتے ہیں
اور تدبیر سے بھی کام لیتے ہیں گویا تقدیر اور تدبیر کا
ایک لطیف امتزاج ان دونوں کے لئے ہوتا ہے۔
غرض مومنِ کامل جو خدا تعالیٰ کے رنگ میں رنگین ہو جاتا

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝

(اے محمد (صلعم)) کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے رب نے ہاتھی (استعمال کرنے) والوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا ۳؎

ہے اُس کے کاموں میں تقدیر کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ اور جو شخص خدا تعالےٰ سے دُور چلا جاتا ہے اُس کے کاموں میں تدبیر کا پہلو غالب ہوتا ہے اور جو درمیانی درجہ کا آدمی ہوتا ہے اس کے کاموں میں تقدیر اور تدبیر دونوں ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ مضمون ہے جس کو بِسْمِ اللّٰهِ ظاہر کرتی ہے اور چونکہ ہر سورۃ سے پہلے بِسْمِ اللّٰهِ آتی ہے۔ اس لئے جب انسان بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھتا ہے تو وہ اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ جو کچھ آگے مضمون بیان ہو رہا ہے اُس سے مَیں اپنے ایمان اور عرفان کے لحاظ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرونگا۔ اگر وہ اعلیٰ درجے کا ایمان رکھنے والا ہے تو وہ اس سے ایسا فائدہ اٹھاتا ہے کہ وہ سورۃ اُس کے لئے ویسی ہی بن جاتی ہے جیسے محمد رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نازل ہوئی تھی۔ اور اگر وہ دشمنی کرتا ہے تو کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ساری کی ساری سورۃ بیکار اور رائگاں چلی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر اس کے حق میں ضائع ہو جاتی ہے۔ اور اگر وہ درمیانی درجہ کا مومن ہو تو سورۃ کا مضمون صرف ایک حد تک اُسے فائدہ بخشتا ہے پُورا فائدہ نہیں دیتا۔

۳؎ تفسیر۔ اَلَمْ تَرَ اصل میں اَلَمْ تَرَیٰ ہے لَمْ جب فعل مضارع پر آتا ہے تو اگر اس کے آخر میں یا ہو۔ تو وہ گر جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اَلَمْ تَرَیٰ کی بجائے صرف اَلَمْ تَرَ رہ گیا۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ کیا تُو نے دیکھا نہیں۔

یہاں دیکھنے سے دل کی آنکھوں سے دیکھنا اور بصیرت کی راہ سے دیکھنا مراد ہے۔ آنکھوں سے دیکھنا مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ جس واقعہ کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے پہلے کا ہے۔ کتنا پہلے کا ہے؟ اس بارہ میں اختلاف ہے بعض مؤرخ کہتے ہیں یہ ستّر سال پہلے کا ہے۔ بعض مؤرخ کہتے ہیں یہ پچاس سال پہلے کا ہے۔ بعض مؤرخ کہتے ہیں یہ چالیس سال پہلے کا ہے۔ بعض مؤرخ کہتے ہیں یہ تیس سال پہلے کا ہے۔ بعض مؤرخ کہتے ہیں یہ تیئیس سال پہلے کا ہے۔ بعض مؤرخین اِسے پندرہ سال پہلے کا قرار دیتے ہیں۔ اور بعض مؤرخین اِسے دس سال پہلے کا قرار دیتے ہیں۔ لیکن صحیح روایت جس کے قرائن بعض دُوسری تاریخوں سے بھی ملتے ہیں یہ ہے کہ درحقیقت یہ اسی سال کا واقعہ ہے جس سال میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تھے جو تاریخی شہادتیں کثرت سے مل جاتی ہیں اور جن کے قرائن دُوسری تاریخوں یا دُوسرے ملکوں کی تاریخوں سے بھی ملتے ہیں وہ اسی کی تائید کرتی ہیں۔ یہ واقعہ محرم میں ہُوا تھا جو اسلامی سال کا پہلا مہینہ ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش اسی سال ربیع الاول میں ہوئی ہے آگے کچھ پیدائش کی تاریخوں کے متعلق اختلاف ہے اور کچھ محرم کی تاریخوں کے متعلق اختلاف ہے۔ کسی نے محرم کی پہلی تاریخیں قرار دی ہیں اور کسی نے محرم کی آخری تاریخیں قرار دی ہیں۔ اسی طرح کسی نے ربیع الاول کی پہلی تاریخ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش بتائی ہے اور کسی نے کوئی اور تاریخ بتائی ہے۔ اس اختلاف کی وجہ سے اس امر میں بھی اختلاف ہو گیا ہے کہ یہ واقعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے کتنے دن پہلے ہُوا۔ بعض کہتے ہیں اس حملہ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیدائش میں پچپن دن کا فاصلہ تھا۔ حافظ دمیاطی کا بھی قول ہے۔ لیکن سہیلی جو ایک بہت بڑے مؤرخ گذرے ہیں اُن کا یہ خیال ہے کہ یہ واقعہ رسول کریم

۲ اصحاب الفیل کے ہلاک ہونے کے وقت کا تاریخ سے تعیّن

صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے پچاس دن پہلے ہوا ہے
اور بالعموم اسلامی مؤرخ اور محدث پچاس دن والی روایت
کو ترجیح دیتے ہیں۔ پھر اس سے اُتر کر بعض نے چالیس دن
اور بعض نے تیس دن بھی فاصلہ قرار دیا ہے مگر کثرت سے
مؤرخین سہیلی کی اس روایت کو کہ دونوں واقعات میں
پچاس دن کا فاصلہ تھا ترجیح دیتے ہیں۔ پس جبکہ رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے یہ واقعہ پہلے ہوا ہے
خواہ تیس دن پہلے ہوا ہو خواہ تیس سال بہرحال رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نفسہٖ ولفمہٖ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا اس لئے
تَرَ سے رؤیتِ قلبی ہی مراد لی جائے گی رؤیتِ عینی نہیں
پس اَلَمْ تَرَ کے لفظی معنے یہ ہوئے کہ کیا تجھے معلوم نہیں
اس فقرہ کے عام طور پر دو معنے ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ ہم
دوسرے شخص سے پوچھتے ہیں کہ آیا فلاں بات اُسے
معلوم ہے یا نہیں۔ دُوسرے معنے اِس قسم کے فقرہ کے
یہ ہوتے ہیں کہ تمہیں یہ بات خوب معلوم ہے۔ گو یا
بظاہر نفی کے الفاظ ہوتے ہیں مگر معنے مثبت ہی کے
ہیں بلکہ مثبت پر زور دینے کے ہوتے ہیں۔ اُردو میں بھی
کہتے ہیں تمہیں معلوم نہیں مَیں ایسا کر سکتا ہوں۔ اور
اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مَیں
ایسا کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ گویا اس قسم کا فقرہ بجائے
اس کے کہ شک کا اظہار کرے یقین اور وثوق پر دلالت کرتا
ہے۔ اگر ایسا فقرہ کہنے والا کوئی انسان ہو تو کسی کو شبہ بھی
ہو سکتا ہے کہ آیا اس نے شک کے معنوں میں استعمال
کیا ہے یا وثوق کے معنوں میں۔ لیکن خدا تعالیٰ کے متعلق
ہم یہ نہیں خیال کر سکتے کہ نعوذ باللہ اس کے قول کا یہ
مطلب ہے کہ مجھے تو معلوم نہیں کہ تم کو فلاں واقعہ کا
علم ہے یا نہیں تم ہی بتاؤ کہ تمہیں اس کا علم ہے یا نہیں۔
پس یہ فقرہ شک کے معنوں میں خدا تعالیٰ کے متعلق استعمال
ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قرآن کریم کہتا ہے کہ اُس سے کوئی
چیز مخفی نہیں۔ اور جب وہ کہتا ہے کہ خدا تعالےٰ سے
کوئی چیز مخفی نہیں تو اُس کی طرف وہ معنے کبھی منسوب
نہیں ہو سکتے جن میں شک و شبہ پایا جاتا ہو۔ پس
اس آیت کے وہی معنے مراد لینے ہوں گے جو یقین اور
قطعیت پر دلالت کرتے ہیں۔ پس اَلَمْ تَرَ کے لفظی
معنے گو یہی ہیں کہ کیا تمہیں معلوم نہیں۔ مگر درحقیقت
اِس کا مفہوم اس جگہ یہ ہے کہ تم خوب اچھی طرح سے
جانتے بوجھتے اور سمجھتے ہو۔ اور تم سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے۔

اَلَمْ تَرَ کے متعلق ایک اور سوال یہ
پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی مخاطب تو ساری دنیا
ہے۔ آیا اَلَمْ تَرَ میں بھی ساری دنیا مخاطب ہے یا
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہیں یا دشمنانِ
اسلام مخاطب ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یوں تو قرآنِ کریم
ساری دنیا کے لئے ہے خواہ بعض آیات میں براہ راست
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کیوں نہ مخاطب ہوں
مگر اس سورۃ کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں خطاب
براہ راست محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات
سے ہے اور پھر آپؐ کے توسط سے باقی دنیا مخاطب ہے
چنانچہ آگے ہی فرماتا ہے۔ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ تیرے
رب نے کس طرح کیا۔ یوں تو خدا تعالیٰ سب کا رب ہے
مگر جب ایک ایسے واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے جو عرب اور
خصوصاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے تعلق
رکھتا ہے تو رَبُّكَ کے الفاظ سے یہی سمجھا جائے گا کہ
اس میں خطاب خصوصیت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کی ذات اقدس سے ہی کیا گیا ہے۔ غرض اس آیت میں ت
اور ك یہ دو ضمائر خطاب کی ہیں۔ پس تَرَ اور رَبُّكَ یہ
دو الفاظ جو اس جگہ آئے ہیں بتاتے ہیں کہ اس واقعہ کا
تعلق خصوصیت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے
ساتھ ہے اور اس سورۃ میں جو مضمون بیان ہوا ہے اس کا
اصل اور اہم تعلق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی
ہے۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اس کا

خاص تعلق نہ ہوتا تو رَبُّكَ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ مثلاً ہم یہ کبھی نہیں کہینگے کہ تمہیں پتہ ہے "تمہارے خدا" نے نادر شاہ سے کیا کیا۔ ہم یہ تو کہینگے کہ تمہیں پتہ ہے خدا نے نادر شاہ سے کیا کیا مگر یہ نہیں کہینگے کہ "تمہارے خدا" نے اس سے کیا سلوک کیا۔ کیونکہ تمہارے کا لفظ خاص تعلق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی طرح جب خدا نے کہا کہ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ تیرے خدا نے اس سے کس طرح کا سلوک کیا تو اس کے معنے درحقیقت یہی ہیں کہ ہمنے اُس وقت جو کچھ کیا تھا محض تیرے لئے کیا تھا۔ ورنہ اگر یہ مفہوم نہ لیا جائے تو اصحاب الفیل کے واقعہ کا علم رکھنے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا خصوصیت ہے عرب کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ ایسا واقعہ ہوا ہے بلکہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تک ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے اصحاب الفیل کا واقعہ دیکھا تھا ایسی صورت میں اَلَمْ تَرَ کہنے کے کوئی معنے ہی نہیں بنتے۔ وہ واقعہ جو ان ہزاروں لوگوں کو معلوم تھا اور جس کو دیکھنے والے بھی کئی زندہ موجود تھے۔ اسی واقعہ کا اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی علم ہو گیا تو اس میں آپؐ کی خصوصیت کیا ہے۔ آپؐ کی خصوصیت اسی صورت میں ظاہر ہوتی ہے کہ اس واقعہ کا آپؐ سے کوئی خاص تعلق ہو۔

۲۱۱ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ میں کَیْفَ استعمال کرنے میں حکمت

پھر اس آیت میں اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ کے الفاظ ہیں یعنی تیرے رب نے کس طرح کیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ اَلَمْ تَرَ مَا فَعَلَ رَبُّكَ تجھے معلوم نہیں کہ تیرے ربّ نے کیا کیا۔ کس طرح کیا اور کیا کیا میں بہت بڑا فرق ہے۔ اگر صرف یہ بیان کرنا مقصود ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب الفیل سے کیا کیا تو کَیْفَ کا لفظ اللہ تعالیٰ اس جگہ استعمال نہ کرتا مگر اُس نے کَیْفَ کا لفظ استعمال کیا ہے جو بتاتا ہے کہ یہاں یہ بیان کرنا مقصود نہیں کہ اصحاب الفیل سے کیا ہوا۔ بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اصحاب الفیل سے جو کچھ ہوا کس طرح ہوا۔ عربی زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ کلام کے مفہوم میں بہت بڑی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ فارابی ایک مشہور مسلمان فلسفی گذرے ہیں۔ جس طرح یورپ میں ہیگل وغیرہ مشہور ہیں اسی طرح مسلمانوں میں فارابی اسی پایہ کے فلسفی تھے۔ سارا دن فلسفہ اور ادب کی باتوں میں ہی مشغول رہتے تھے۔ زبان کے لحاظ سے بھی بہت بڑے ادیب تھے اور چوٹی کے نحو دان سمجھے جاتے تھے۔ ایک دفعہ وہ بازار میں سے گذر رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ ایک آٹھ نو سال کا لڑکا حلوا بیچ رہا ہے انہوں نے اس لڑکے سے پوچھا کَیْفَ تَبِیْعُ الْحَلْوٰی تم حلوا کس طرح بیچتے ہو۔ اُس نے کہا رَطْلًا بِدِرْهَمٍ ایک درہم کے بدلہ میں مَیں ایک پونڈ دیتا ہوں۔ فارابی نے یہ جواب سنا تو انہوں نے اُس کے گلے میں پٹکا ڈال لیا اور شور مچا دیا کہ کتنا بڑا اندھیر ہے عربی زبان کا خون ہو رہا ہے اور کوئی شخص توجہ نہیں کرتا۔ اُدھر لڑکے نے چیخیں مارنا شروع کر دیا۔ شور سن کر بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ چونکہ وہ آدمی بڑے پایہ کے تھے اس لئے کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ لڑکے کو اُن کے ہاتھ سے چھڑائے۔ یُوں سمجھ لو جیسے علامہ اقبال یا غالب اپنے زمانہ میں کسی کو پکڑ کر شور مچا دیتے کہ اُردو زبان کا قتل ہو گیا۔ اُن کے سامنے کون راہ گیر بولنے کی جرأت کر سکتا تھا۔ اسی طرح یہ واقعہ ہوا لوگ حیران تھے۔ لیکن بات میں دخل نہ دے سکتے تھے۔ آخر بلدہ کا کمشنر پولیس آیا۔ پہلے تو وہ اس نظارہ کو دیکھ کر گھبرایا۔ مگر آدمی ہوشیار تھا کہنے لگا حضور اس مجرم کو چھوڑ دیجئے اور ہمارے حوالہ کیجئے ہم اس کو سزا دینگے پھر اُس نے پوچھا کہ حضور اس نے قصور کیا کیا ہے۔ انہوں نے کہا قصور کا پوچھتے ہو۔ اس سے بڑھ کر قصور کیا ہو گا کہ میں کَیْفَ سے سوال کرتا ہوں اور یہ کَمْ کا جواب دیتا ہے۔ ہماری زبان برباد کر دی گئی اور ہم پر ظلم کیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ فارابی تو ایک نکتے سے بھی یہ

اُمید رکھتے تھے کہ وہ صحیح عربی بولے مگر مسلمان خدا تعالیٰ
سے بھی یہ اُمید نہیں رکھتے کہ وہ اپنے کلام میں صحیح عربی
الفاظ استعمال کرے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے تو
کَیْفَ کا لفظ استعمال کیا ہے مگر اس کی مراد کَمْ سے
ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کَیْفَ کے لفظ نے مضمون
کو ایسی خوبی بخشدی ہے جو اسکی شان کو بہت بڑھا دیتی
ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ
تمہیں معلوم ہے کہ اُن سے کس طرح کیا۔ یہاں کمیّت پر
زور دینا مقصود نہیں۔ یہ مراد نہیں کہ دس مرے تھے یا سَو۔
ہاتھی مرے تھے یا گھوڑے۔ افسر مرے تھے یا ماتحت۔ بلکہ
اُن غیر معمولی حالات کی طرف اشارہ مقصود ہے جن میں انکی
ہلاکت واقعہ ہوئی۔ خواہ ایک ہی شخص مرا ہو مگر وہ مرا
اس طرح کہ دُنیا کہتی تھی کہ وہ نہیں مریگا مگر پھر بھی وہ مرگیا۔
پس یہاں کمیت کا بتانا مقصود نہیں بلکہ کیفیّت کا بتانا
مقصود ہے۔ یعنی غیر معمولی حالات اللہ تعالیٰ کی طرف سے
پیدا کر دیئے گئے۔ جن حالات کو انسانی عقل سمجھ ہی نہیں
سکتی تھی۔ مگر مفسرین کا بڑا زور اس امر پر ہوتا ہے کہ اُن
کے سر پر پتھر پڑے اور پاخانہ کی جگہ سے نکل گئے۔ یا یہ کہ
اُن میں سے کوئی ایک بھی بچ کر واپس نہ جا سکا۔ حالانکہ
قرآن اس پر زور ہی نہیں دے رہا۔ قرآن تو کہتا ہے کہ
اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ کیا تم نے دیکھا اور غور کیا کہ
تمہارے رب نے کیسے غیر معمولی حالات میں اصحاب الفیل
کو تباہ کیا۔ خدا تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ اُن میں بڑی موت
واقعہ ہوئی۔ بڑی موت تو بعض دفعہ جہاز کے ڈوبنے
سے بھی ہو جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ جس امر پر زور دینا
چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ تم میرا ہاتھ دیکھو اور اس امر پر
غور کرو کہ جو کچھ کیا تھا میں نے کیا تھا کسی انسانی ہاتھ کا
اُس میں دخل نہیں تھا پس حقیقت اور واقعات پر زور
دینا اس جگہ مطلوب نہیں بلکہ اس کے نادر اور مخفی الاسباب
ہونے پر زور دینا مقصود ہے۔ یہ سوال نہیں کہ ابرہہ اور
اس کا لشکر سب کا سب مر گئے یا کچھ بچ بھی گئے۔ بلکہ
سوال یہ ہے کہ وہ کس طرح مرے۔ جو بھی مرے اُنکے
مرنے میں کسی انسانی تدبیر کا دخل نہیں تھا بلکہ محض ہمارے
پیدا کردہ حالات کے نتیجہ میں وہ ہلاک ہوا۔ پس یہاں
خدا اپنے فعل کو پیش کر رہا ہے۔ وہ یہ نہیں بتاتا کہ ابرہہ
پر کیسی تباہی آئی۔ بلکہ یہ بتاتا ہے کہ اُس پر کیسے تباہی
آئی۔ وہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے ابرہہ کو اُن حالات میں مارا جبکہ
دُنیا اُس کے مارے جانے کا خیال بھی نہ کر سکتی تھی۔ پس
خدا تعالیٰ اس جگہ اپنے فعل پر زور دے رہا ہے اور اس پر
زور دے رہا ہے کہ اُس نے یہ فعل محض محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی
خاطر کیا۔ پس اس صورت میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے احترام کا
اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خاطر اپنی قدرت دکھانے کا اور
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات کو دشمن کے حملے سے بچانے کا
خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے خانہ کعبہ کی حفاظت یا اس کا بچانا ایک ضمنی چیز
ہے اور ایسی ہی ہے جیسے کسی بڑے آدمی کی دعوت کے ساتھ اُس کے نوکر کی
بھی دعوت ہو جاتی ہے یا کسی بڑے آدمی کی دعوت ہو تو
اُس کے پرائیویٹ سکرٹری کو بھی بلا لیا جاتا ہے۔ پرائیویٹ
سکرٹری اپنی ذات میں مقصود نہیں ہوتا بلکہ مقصود وہی
بڑا آدمی ہوتا ہے جس کے اعزاز میں دعوت دی جا رہی
ہوتی ہے۔ اسی طرح خانہ کعبہ کی حفاظت اصل مقصود نہیں
تھی بلکہ اصل مقصود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
حفاظت تھی۔ چنانچہ فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ
تونے دیکھا تیرے رب نے کس طرح معاملہ کیا۔ اس میں
رَبُّکَ کا لفظ صاف طور پر بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا منشاء
یہ ہے کہ اس واقعہ سے خانہ کعبہ کو بچانا اتنا مطلوب نہ تھا جتنا
تیری ذات کو بچانا مقصود تھا۔ اگر خانہ کعبہ کو بچانا اس
واقعہ کا اصل مقصود ہوتا تو یوں فرماتا۔ اَلَمْ تَرَ کَیْفَ
فَعَلَ رَبُّ الْکَعْبَۃِ۔ تونے دیکھا کہ کعبہ کے رب نے
کس کس طرح کا معاملہ کیا۔ ظاہر ہے کہ جب اس نشان
میں خدا تعالیٰ کا ہاتھ تھا تو خدا تعالیٰ کا ہی یہ حق ہے کہ وہ

بتائے کہ اُس نے یہ نشان کس کے لئے دکھایا تھا۔ اگر تو اس نشان میں انسانی ہاتھ ہوتا تو بیشک انسان کہہ سکتے تھے کہ یہ نشان فلاں کے لئے ظاہر ہوُا ہے۔ مگر جبکہ اس میں کسی انسان کا ہاتھ نہیں بلکہ محض خدا کا ہاتھ ہے۔ تو اسی کا حق ہے کہ وہ یہ بتائے کہ اُس نے یہ نشان کس کے لئے ظاہر کیا تھا۔ فرض کرو ایک دعوت کرنے والا الف کے اعزاز میں دعوت کرتا ہے تو ب اور ج کا کیا حق ہے کہ وہ یہ کہیں کہ یہ دعوت دال کے اعزاز میں دی گئی ہے۔ اگر ب اور ج کوئی ایسی بات کہیں گے تو ہم دعوت کرنے والے سے پوچھیں گے کہ بتاؤ تم نے کس کے اعزاز میں دعوت دی تھی پھر جو کچھ وہ کہیگا وہی فیصلہ کن بات ہوگی۔ اسی طرح اس آیت میں ایک طرف کَیۡفَ فَعَلَ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اس میں کسی بندے کا ہاتھ نہیں تھا۔ پھر رَبُّکَ کہہ کر یہ بتایا ہے کہ ہم نے یہ نشان کس کے لئے ظاہر کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیشک مکّہ والوں کی بھی خاطر ہوگئی۔ بیشک خانۂ کعبہ کا بھی اعزاز ہوگیا۔ مگر یہ ایک ضمنی بات تھی۔ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے تو یہ نشان محض تیرے لئے دکھایا تھا اور تُو ہی ہمارا اصل مقصود تھا۔ پس درحقیقت یہ نشان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کیلئے تھا اور کسی کیلئے نہیں تھا۔

مکّہ کے لوگ بھی اس معجزہ کے تو قائل تھے مگر وہ اس امر کے قائل نہ تھے کہ یہ معجزہ کسی اور کے لئے ظاہر ہوُا ہے وہ اتنا تو سمجھتے تھے کہ دُعائے ابراہیمی کے پُورا ہونے کا یہ ایک ثبوت ہے مگر یہ کہ احترامِ محمدی میں ایسا ہوُا ہے اس کو وہ نہیں مانتے تھے۔ اگر مانتے تو مسلمان کیوں نہ ہوجاتے۔ اللہ تعالیٰ اسی امر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے اے احمقو تم اسے اب بھی نہیں مانتے۔ حالانکہ ہم نے اِس کی پیدائش سے بھی پہلے اِس کے لئے یہ معجزہ دکھادیا تھا اور جب ہم نے اِس کی پیدائش سے بھی پہلے اس کے لئے اپنے معجزات ظاہر کرنے شروع کر دئے تھے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم اَب بھی اس کی زندگی کے آخری ایام تک اس کے لئے اپنے نشانات دکھاتے چلے جائیں گے۔ رَبُّکَ میں رَبّ کے لفظ سے اِس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت اور آپ کے کام سے اس نشان کا تعلق تھا اگر یہ معجزہ نہ دکھایا جاتا۔ تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت صحیح طور پر نہ ہوسکتی اور نہ صحیح طور پر آپ کا کام چل سکتا۔ پس رَبّ کے لفظ نے یہ بھی بتادیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح تربیت اور آپ کے کام کے صحیح طور پر چلنے کے لئے اصحاب الفیل پر تباہی آئی تھی تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اِس واقعہ کا کیا تعلق ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئی کو پورا کرنے والے تھے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دُعا مانگی وہ یہ تھی کہ رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِیۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَةَ وَیُزَکِّیۡهِمۡ (البقرۃ ع ۱۵) اے ہمارے رب تُو اِس نسل میں جسے مَیں مکّہ میں چھوڑ کر جارہا ہوں ایک نبی بھیجیو۔ وَابۡعَثۡ فِیۡهِمۡ کے معنے ہیں وَابۡعَثۡ فِیۡ اَهۡلِ مَکَّةَ یعنی اے میرے رب تو ایک زمانہ میں مکّہ کے رہنے والوں میں ایک رسول بھیجیو جو مِنۡهُمۡ کا مصداق ہو یعنی وُہ انہی میں سے ہو۔ یہیں کا باشندہ ہو اور انہی لوگوں کے ساتھ اُس کے تعلقات ہوں۔ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِکَ وہ ان اہلِ مکّہ کو تیری آیات پڑھ پڑھ کر سنائے۔ وَیُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَةَ اور ان کو تیری کتاب اور حکمت سکھائے۔ وَیُزَکِّیۡهِمۡ اور ان کو پاک کرے۔ اس دُعا سے ظاہر ہے کہ یہ رسول مکّہ میں آنا تھا۔ مکّہ کے لوگوں کی اُس نے اصلاح کرنی تھی اور مکّہ کے لوگوں کو اُس نے ایک بڑی قوم بنانا تھا۔ بیشک آپ نے باقی دنیا کی بھی اصلاح کرنی تھی مگر بہرحال اُن کا مقام مکّہ کے بعد تھا۔ تزکیہ کے

ایک معنے بڑا بنانے اور ترقی دینے کے بھی ہیں۔ اس لحاظ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ کے لوگوں کو ایک بڑی قوم بنانا تھا۔ اگر خانۂ کعبہ تباہ ہو جاتا تو لازماً مکّہ کے لوگ متفرق ہو جاتے اور وہ تلاشِ معاش کے لئے اِدھر اُدھر پھیل جاتے۔ مکّہ کے لوگ خانۂ کعبہ کی وجہ سے ہی وہاں بیٹھے ہوئے تھے جس طرح مجاور قبروں پر بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں اگر کوئی قبر کسی بادشاہ کے حکم سے مٹا دی جائے تو یہ لازمی بات ہے کہ وہ مجاور جو اُس پر بیٹھے ہوئے ہونگے اور جنکی آمد قبر کے چڑھاوے پر منحصر ہُوا کرتی ہے وہ بھی اِدھر اُدھر چلے جائیں گے۔ اور اپنی معاش کے لئے کوئی اور ذریعہ تلاش کرینگے۔ اگر خانۂ کعبہ بھی تباہ ہو جاتا تو مکّہ کے لوگوں کیلئے گذارہ کی کوئی صورت نہ رہتی اور نہ مکہ والوں کا کوئی ادب اور احترام اُن کے دلوں میں باقی رہتا۔ گویا خانۂ کعبہ کی تباہی کے ساتھ اوّل تو مکّہ والوں کا احترام جاتا رہتا۔ لوگ کہتے کہ مکّہ والے یونہی دعویٰ کرتے رہتے تھے کہ یہ بڑا مقدس مقام ہے۔ اگر مقدس مقام ہوتا تو تباہ کیوں ہوتا۔ پھر لازمی طور پر وہ متفرق ہوکر اِدھر اُدھر چلے جاتے اور اس طرح آنے والے موعود کیلئے جو جگہ مقرر تھی وہ بھی جاتی رہتی۔ آخر اگر مکّہ اُجڑ جاتا تو آنیوالا موعود کہاں آتا اور وہ آکر کیا کرتا۔ اس کے متعلق تو یہ خبر دی گئی تھی کہ وہ مکّہ میں آئیگا اور مکّہ کے لوگوں میں رہیگا۔ یہ خبر اُس وقت تک پُوری نہیں ہو سکتی تھی جب تک مکّہ کو آباد نہ رکھا جاتا۔ پس آنے والے موعود کے ظہور اور اس کے کام کی تکمیل کے لئے ضروری تھا کہ خانۂ کعبہ کو قائم رکھا جاتا اور اسی کی طرف رَبُّكَ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ پس رَبُّكَ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ خانۂ کعبہ سے بھی زیادہ اصحاب الفیل کی تباہی کا موجب درحقیقت تیرا احترام تھا۔ ایک اور بات جو یاد رکھنے والی ہے وہ یہ ہے کہ ابرہہ نے بیشک خانۂ کعبہ کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر اُس کے لشکر نے یہ ارادہ نہیں کیا تھا۔ اُس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ چلو اور وہ چل پڑے۔ مگر اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ

۲۱۱
اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ میں اصحاب الفیل کے لفظ کے استعمال کرنے میں حکمت

فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحَابِ الْفِيْلِ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم نے اصحاب الفیل کے ساتھ کس طرح کا سلوک کیا۔ آخر یہ زیادتی بلاوجہ تو نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لئے کیا یہ مشکل تھی اگر وہ یہ کہہ دیتا کہ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَبْرَهَة۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالےٰ نے ابرہہ کے ساتھ کیا کیا۔ یا کہہ دیتا کہ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِمَلِكِ الْيَمَنِ۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ خدا تعالیٰ نے یمن کے بادشاہ کے ساتھ کیا کیا۔ وہ ایسا کہہ سکتا تھا مگر خدا نے وہ نہیں کہا جو سیدھی بات تھی بلکہ چکّر دے کر یہ کہا ہے کہ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحَابِ الْفِيْلِ اسکے صاف معنے یہ ہیں کہ یہاں کوئی نیا نکتہ بیان کیا گیا ہے اور وہ اسی امر کا اظہار ہے کہ ہم نے صرف ابرہہ کو ہی تباہ نہیں کیا بلکہ ابرہہ کی قوم کو بھی تباہ کر دیا۔ اصحاب الفیل صرف وہ نہیں تھے جو ابرہہ کے ساتھ تھے بلکہ فیل والی قوم یمن کی حاکم قوم تھی جس کی تباہی کا اس آیت میں ذکر آتا ہے۔

اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے اگر کسی لشکر کی توپیں توڑ دیجائیں یا کسی بٹالین کو تباہ کر دیا جائے تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے توپوں والوں کو تباہ کر دیا۔ کیونکہ توپوں والی حکومت یا تو انگریزوں کی ہے یا فرانسیسیوں کی ہے یا امریکنوں کی ہے۔ ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے فلاں بٹالین کو تباہ کر دیا مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے توپوں والوں کو تباہ کر دیا جب ہم یہ کہیں گے کہ ہم نے توپوں والوں کو تباہ کر دیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ایسی ضرب لگائی کہ صرف وہی لشکر تباہ نہیں ہُوا جو لڑنے آیا تھا بلکہ ایسی ضرب لگائی کہ انکے پیچھے جو ملکی قوت تھی اُسے بھی توڑ دیا۔ اس مثال کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہاں خالی ابرہہ اور اُس کے لشکر کی تباہی کا ذکر نہیں کیونکہ اصحاب الفیل صرف ابرہہ اور اس کا لشکر نہیں تھا بلکہ اصحاب الفیل وہ قوم تھی جو یمن پر حکومت کر رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ اس ساری قوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ ہم نے ابرہہ کو ہی نہیں مارا بلکہ اُسے اور

اس کے ساتھیوں کو ایسی زک پہنچائی کہ جس کے ساتھ یمن میں نجاشی کی حکومت بھی بالکل فنا ہوگئی۔ یہ میں آگے چلکر بتاؤنگا کہ اس میں کیا حکمت ہے۔ بہرحال اصحاب الفیل کہکر اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ صرف ابرہہ اور اُس کا لشکر تباہ نہیں ہوا بلکہ اُن کی وہ پچھلی طاقت جو یمن میں تھی وہ بھی تباہ ہوگئی اور اس تباہی کا اتنا اثر پڑا کہ عیسائیوں کے قویٰ بالکل ڈھیلے ہوگئے۔ اِس تباہی میں اللہ تعالیٰ کی جو بہت بڑی حکمت کام کر رہی تھی وہ یہ ہے کہ ایک بھاری حکومت کے کسی لشکر کا تباہ ہوجانا خطرہ کو کم نہیں کرتا بلکہ اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ اگر کسی چور کو پکڑتے ہوئے کوئی کانسٹیبل مارا جائے تو چوروں کے لئے خطرہ کم نہیں ہوجاتا بلکہ بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر بعض لوگ بغاوت کر رہے ہوں اور فوج کا کوئی دستہ اُن کا مقابلہ کرتا ہو اور مارا جائے تو اُس دستے کا مارا جانا خطرہ کم نہیں کرتا بلکہ اور بھی بڑھا دیتا ہے کیونکہ اس کے بعد حکومت اپنی ساری طاقت اس فتنہ کو مٹانے کیلئے صرف کر دیا کرتی ہے سو اگر صرف ابرہہ مارا جاتا۔ اگر صرف اتنا اثر ہوتا کہ اسکے لشکر کو نقصان پہنچ جاتا اور وہ شکست کھا کر بھاگ جاتا تو پیچھے یمن کی حکومت موجود تھی، حبشہ کی حکومت موجود تھی، جس کا وہ گورنر تھا اور یہ حکومتیں اپنی ساری طاقتیں عرب کی تباہی میں لگا سکتی تھیں۔ اور اگر ایسا ہوتا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سخت خطرہ میں پڑ جاتی۔ کیونکہ اگلے سال پھر عیسائی حکومت کا کوئی لشکر مکہ پر حملہ آور ہوجاتا۔ اس سے اگلے سال پھر کوئی حملہ کر دیتا۔ یمن میں انکا اڈہ تو قائم ہی تھا وہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بڑی آسانی کے ساتھ اپنے لشکر بھیجکر عربوں کو تباہ کر سکتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں پلنا۔ مکہ والوں میں چلنا پھرنا۔ مکہ والوں میں جوان ہونا اور پھر مکہ والوں کا آپؐ کے بلند کیریکٹر کو دیکھنا اور دُعائے ابراہیمی کو اس رنگ میں پورا ہوتے دیکھنا کہ مکہ والوں میں سے ہی ایک شخص نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے قطعی طور پر ناممکن ہوجاتا۔ وہ قوم جسے ایک حکومت کے بھاری لشکروں کا متواتر سامنا کرنا پڑتا اوّل تو وہ پراگندہ ہوجاتی اور پھر اگر پراگندہ نہ بھی ہوتی تب بھی اُسے یہ فرصت کہاں مل سکتی تھی کہ وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کیریکٹر کو دیکھے اور آپؐ کی زندگی کی ایک ایک حرکت میں آپؐ کی صداقت کے آثار مشاہدہ کرے اِس طرح اسلام کی تمام بنیاد خطرہ میں پڑ جاتی۔ پس اللہ تعالےٰ فرماتا ہے ہم نے ابرہہ اور اُس کے لشکر کو ہی نہیں بلکہ اُس قوت کو ہی کچل دیا جو اُس کے پیچھے کام کر رہی تھی۔ اور اُن کو ایسی مار پڑی اور عربوں میں اتنی دلیری پیدا ہوگئی کہ انہوں نے بغاوتیں شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایران نے اُس جگہ پر آکر قبضہ کر لیا۔ اور نجاشی کی حکومت جاتی رہی۔ چونکہ مکہ والوں سے ایرانی حکومت کا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ اِس لئے وہ چُپ کر کے بیٹھ گئی اور جن کو مکہ والوں پر غصہ آسکتا تھا اللہ تعالیٰ نے اُن کی جڑیں تک اُکھاڑ کر پھینکدیں۔ اِس کے بعد حبشہ میں بیشک نجاشی کی حکومت قائم رہی مگر یمن میں اُس کا جو اڈہ قائم تھا وہ نہ رہا اور چونکہ وہ یمن سے ہی حملہ کر سکتا تھا اور اب یمن پر ایران قابض ہوچکا تھا۔ اِس لئے عرب کو اُس کی طرف سے حملہ کا کوئی خطرہ نہ رہا۔ پس اصحاب الفیل سے نجاشی کی حکومت مراد ہے۔ ہاتھی عرب میں نہیں ہوتا تھا بلکہ حبشہ سے آتا تھا پس اصحاب الفیل سے مراد بھی حبشہ کی حکومت ہی ہے۔ اللہ تعالےٰ اس حکومت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم نے اصحاب الفیل سے کیا کیا اور کس طرح ہم نے حبشہ کی حکومت کو ہی عرب سے مٹا دیا۔ گویا ہم نے صرف ابرہہ اور اُس کے لشکر کو ہی شکست نہیں دی بلکہ عرب سے حبشہ کی حکومت ہی مٹا دی تاکہ اُس کی طرف سے بار بار حملہ کا خطرہ نہ رہے۔

اب میں اصحاب الفیل کا واقعہ تاریخوں سے اس نقطۂ نگاہ کو مدنظر رکھتے ہوئے بیان کرتا ہوں جو اس کے متعلق میرا ہے۔

واقعہ اصحاب الفیل رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی

اصحاب الفیل کے واقعہ کی تفصیل تاریخی لحاظ سے

پیدائش کے سال میں اکثر اور معتبر روایات کے مطابق اور پیدائش سے دس، پندرہ، تیئیس، تیس، چالیس، پچاس اور ستر سال پہلے مختلف کمزور روایتوں کے مطابق ہوا۔ سہیلی کے نزدیک پچاس دن قبل از ولادت اور دمیاطی کے نزدیک پچپن دن قبل از ولادت یہ واقعہ ہوا۔ بعض کے نزدیک چالیس دن پہلے اور بعض کے نزدیک ایک ماہ پہلے ہوا۔

تفصیل اس واقعہ کی یوں ہے کہ اس واقعہ سے چند سال پہلے یمن پر حمیر کی حکومت تھی (حمیر عرب کی ایک قوم ہے) اور ذونواس حمیری بادشاہ اس علاقہ پر حکومت کر رہا تھا۔ ذونواس حمیری بادشاہ کے متعلق بعض مورخین یہ کہتے ہیں کہ وہ مذہباً یہودی ہوگیا تھا۔ اور بعض کے نزدیک وہ یہودی نہیں ہوا تھا بلکہ مشرک تھا لیکن یہودیوں کیطرف مائل تھا۔ غالباً اُس کے یہودی ہونے کا خیال اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ وہ عیسائیوں کا دشمن تھا مگر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ یہودی ہوگیا ہو۔ بہرحال اُسکے دل میں عیسائیوں کی سخت دشمنی تھی۔ میرا خیال ہے کہ شاید یہ دشمنی اسلئے ہو کہ یمن حبشہ کے ساحل کے مقابل میں ہے ممکن ہے قریب ہونے کی وجہ سے اُس کا حبشہ سے بگاڑ ہو جایا کرتا ہو۔ ایک دفعہ اُس نے غصہ میں آکر اپنے ملک کے بیس ہزار عیسائی گرفتار کئے اور خندقیں کھود کر اُن کو زندہ جلا دیا۔ مفسرین کا خیال ہے کہ سورۃ البروج کی آیات قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۙ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۙ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۙ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۗ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اُس نے خندقیں کھود کر آگ جلائی اور بیس ہزار عیسائیوں کو اُس آگ میں زندہ جلا دیا۔ صرف ایک شخص جس کا نام دوس ثعلبان تھا وہ بچ کر بھاگ نکلا۔ اُسوقت عیسائیوں کا تمام دارومدار رُومی حکومت پر تھا۔ رُومی حکومت کے تمام باشندے عیسائی تھے اور پھر یہ حکومت اتنی زبردست اور وسیع تھی کہ اُس وقت نصف دُنیا پر حکومت کر رہی تھی شام اور فلسطین اور اناطولیہ سب اُسکے تابع تھے۔ اِسی طرح مصر اور لیبیا اور حبشہ تک کے بادشاہ اس کے ماتحت تھے عیسائی لوگ اُس وقت بھاگ کر وہیں پناہ لیا کرتے تھے۔ جیسے پچھلے زمانہ میں ہندوستان کے مسلمان ٹرکی، اور بعد میں افغانستان کے بادشاہ کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے مصائب میں اگر کوئی کام آسکتا ہے تو یہی ہیں۔ عیسائی بھی اُس وقت اپنا ملجأ و ماویٰ صرف قیصر روم کو سمجھتے تھے۔ دوس ذوثعلبان اُس وقت بھاگ کر قیصر کے پاس پہنچا۔ اُس زمانہ میں ایران اور روم کی آپس میں بڑی کثرت سے لڑائیاں ہوتی تھیں جس کی وجہ سے کئی قیصر سال کا اکثر حصہ شام میں ہی گزارتے تھے۔ اُس وقت بھی قیصر وہیں تھا۔ اُس نے قیصر کے پاس پہنچ کر فریاد کی کہ اِس قتلِ عام کا بدلہ لیا جائے۔ قیصرِ روما کی سرحد یمن کے ساتھ نہیں ملتی تھی درمیان میں پانچ چھ سَو میل کا ایک آزاد علاقہ تھا اسلئے قیصرِ روما خود تو کچھ نہیں کر سکتا تھا مگر وہ اتنے عظیم الشان قتلِ عام کو نظر انداز بھی نہیں کرنا چاہتا تھا چنانچہ اُس نے دوس ذوثعلبان کو حبشہ کے بادشاہ کے نام جو اُس کے ماتحت تھا ایک چٹھی لکھ کر دی۔ حبشہ اور یمن کے درمیان بحیرۂ احمر ہے اور اُس زمانہ میں دو تین دن میں کشتیاں اِدھر سے اُدھر چلی جاتی تھیں۔ آجکل کے جہازوں کے لحاظ سے تو یہ سفر چند گھنٹوں کا ہے۔ بہرحال اُس نے حبشہ کے بادشاہ کے نام چٹھی لکھی کہ اس واقعہ کی طرف توجہ کرو اور جو عیسائی مارے گئے ہیں اُن کا بدلہ لو۔ اُس وقت حبشہ کے بادشاہ نجاشی کہلاتے تھے۔ انگریزی میں اُن کو نیگس NEGUS کہتے ہیں۔ اُسوقت جو نجاشی حکومت کر رہا تھا اُس کا نام اَصْحمہ بن بحر تھا۔ یہ اُسی بادشاہ کا نام ہے جس کے زمانہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی اور جس کے متعلق تاریخ اور احادیث سے ثابت ہے کہ وہ آخری زمانہ میں مسلمان ہوگیا تھا۔ اُسی کی زندگی کا یہ واقعہ

ہے اور اُسی کے نام بادشاہ نے چٹھی لکھی کہ دوس ذو ثعلبان کی مدد کرو۔ چنانچہ اُس نے اپنے دو جرنیل ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ یمن بھجوائے۔ ان میں سے ایک کا نام ارباط تھا اور دُوسرے کا نام ابرہہ بن الصباح اور اُسکی کنیت ابو یکسوم تھی، یہ سفید رنگ کا تھا۔ رومی حکومت اور اُس کے ماتحت جو حکومتیں تھیں اُن سب میں یہ دستور تھا کہ وہ عام طور پر دو دو جرنیل بھیجا کرتے تھے یہانتک کہ رومی حکومت میں بعض دفعہ دو ڈکٹیٹر مقرر کئے جاتے تھے۔ کلیو پڑا کا باپ جب مرا ہے تو اُس نے اپنے بعد اپنے بیٹے اور بیٹی دونوں کو بادشاہت دے دی تھی۔ یہی کلیو پڑا ہے جس سے روم کے ایک ڈکٹیٹر نے شادی کی اور وہ اسی قضیہ میں مارا گیا۔ دراصل وہ دو دو ڈکٹیٹر یا دو جرنیل اس لئے مقرر کرتے تھے کہ انہیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ اگر صرف ایک شخص مقرر کیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ بغاوت کرے لیکن اگر دو ہوئے تو ان میں سے ایک دوسرے کا محافظ ہو جائیگا اور اس طرح خرابی پیدا نہیں ہوگی۔ گو کسی قوم کے دو بادشاہ ہونا ایک بالکل غیر طبعی چیز ہے۔ مگر ان لوگوں میں عرصۂ دراز تک یہ بات قائم رہی۔ اسی طرح جب وہ کسی جگہ جرنیل بھیجتے تو جرنیل بھی دو دو اکٹھے بھیجا کرتے تھے تاکہ وہ ایک دوسرے کے نگران رہیں اور کوئی شرارت نہ کر سکیں۔ مَیں بتا چکا ہوں کہ جو دو جرنیل یمن بھیجے گئے اُن میں سے ایک کا نام ارباط تھا اور دوسرے کا نام ابرہہ بن الصباح۔ ابرہہ کی کنیت ابو یکسوم تھی۔ اور وہ سفید رنگ کا تھا۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ حبشہ میں دو قسم کی قومیں بستی ہیں۔ ایک کالے رنگ کی اور ایک سفید رنگ کی۔ شاہی خاندان سفید رنگ کی نسل میں سے ہے۔ اصل میں یہ نوبی قوم کے افراد تھے جن کی پُرانے زمانہ میں اتنی زبردست حکومت تھی کہ وہ یورپ اور ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ جنوبی مصر اور سوڈان یہ نوبیا کا علاقہ ہے۔ نوبیا کی حکومت اصل میں عرب تھی اور یہ عرب کے باشندے ہی تھے جنہوں نے پھیلتے پھیلتے حبشہ میں حکومت قائم کر لی۔ اسی وجہ سے حبشہ کی زبان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب زمانہ تک عربی ہی کی ڈائے لکٹ DIALECT تھی۔ چنانچہ قرآن کریم میں بیسیوں الفاظ ایسے ہیں جو حبشی زبان کے ہیں۔ عرب میں بولی جانے والی عربی کے الفاظ نہیں مگر حبشہ کے ساتھ میل جول اور تعلق رکھنے کی وجہ سے عربوں نے اُن الفاظ کو اپنی زبان میں داخل کر لیا۔

نوبی قوم کے افراد عرب ہونے کی وجہ سے نسبتاً سفید رنگ کے تھے اور ابرہہ کا رنگ بھی سفید تھا معلوم ہوتا ہے وہ بھی شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہوگا۔ یہ دونوں جرنیل ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ یمن پر حملہ آور ہوئے انہوں نے حمیری حکومت سے جنگ کی اور اُسے شکست دے کر یمن میں مسیحی حبشی حکومت قائم کر دی۔ کچھ عرصہ کے بعد دونوں جرنیلوں میں اختلاف پیدا ہو گیا جیسا کہ طبعی طور پر اُن دو افراد میں ہُوا کرتا ہے جو ایک جیسی طاقت رکھتے ہوں۔ ارباط اور ابرہہ میں جب اتفاق نہ ہو سکا تو وہ جنگ پر آمادہ ہو گئے اور اپنے اپنے ڈویژن لے کر ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آراء ہو گئے۔ یہ ایک اُصول ہے کہ جب قوم میں بیداری اور زندگی ہوتی ہے تو اُس کے افراد قومی مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں اور جب قوم میں تنزل آجاتا ہے تو اُس کے افراد ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دے دیتے ہیں۔ ابھی تک حبشیوں میں قومی بیداری موجود تھی چنانچہ جب لشکر ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آراء ہوئے تو دونوں جرنیلوں کو یہ خیال پیدا ہُوا کہ لڑائی تو ہماری آپس میں ہے ہم قوم کو کیوں مروائیں اگر ہم نے اسی طرح لڑائی کی تو یمن میں سے نجاشی کی حکومت بالکل جاتی رہیگی۔ چنانچہ لڑائی کو ملتوی کر کے اُن دونوں نے آپس میں ملاقات کی اور ان خیالات کا اظہار کیا کہ اسکے نتیجہ میں ہماری قوم کو نقصان پہنچے گا۔ ہمیں کوئی ایسا طریق اختیار

کرنا چاہیئے جس سے قوم کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور ہمارے جھگڑے کا بھی فیصلہ ہو جائے چنانچہ اُن دونوں نے آپس میں یہ فیصلہ کیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے لڑیں جو جیت جائے اور دوسرے کو قتل کر دے وہ حکومت کرے۔ چنانچہ اِس فیصلہ کے مطابق وہ دونوں آپس میں لڑنے کے لئے نکلے۔ فیصلہ یہ تھا کہ فوج کو ہٹا دیا جائیگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا فوج ہٹا دی گئی اور دونوں ایک دُوسرے کے سامنے آگئے ارباط نے چابک دستی سے آگے بڑھکر ابرہہ پر ایسا کاری وار کیا کہ اُس کا ناک، کان اور کلا کٹ گیا لیکن اُس وقت اُس کا ایک غلام جو اُس سے عشق رکھتا تھا بغیر کسی کو بتلائے ایک پتھر کے پیچھے چُھپ کر یہ تمام نظارہ دیکھ رہا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ اُس کا آقا گر گیا ہے تو اُسکی محبت نے جوش مارا اور وہ اپنے آقا کی مدد کے لئے آگے بڑھا۔ اِدھر ارباط ابرہہ کی طرف بڑھا کہ اُسے تلوار سے مار ڈالے اور اُدھر اچانک پیچھے سے ابرہہ کے غلام نے ارباط پر حملہ کر دیا اور خنجر سے اُسے مار ڈالا۔ اِس طرح جو فاتح تھا وہ مر گیا اور مفتوح زندہ رہا۔ چند دنوں کے بعد ابرہہ کے زخم اچھے ہو گئے اور ساری حکومت اُسکے قبضہ میں آگئی اور اس طرح ابرہہ یمن کا واحد بادشاہ بن گیا۔

جب نجاشی کو یہ خبر پہنچی تو اُس پر یہ بات بہت گراں گذری کہ تفرقہ پیدا ہوا اور ایک جرنیل نے دُوسرے جرنیل کے خلاف حملہ کیا اور اُسے مار دیا۔ نجاشی فطرتاً بہت شریف آدمی تھا۔ بلکہ خود ابرہہ کے متعلق تاریخی شہادتوں سے یہ امر ثابت ہے کہ وہ بھی بہت حلیم الطبع تھا اور اُس نے مکّہ کے خلاف جو کارروائیاں کیں۔ وہ جیسا کہ مَیں آگے چل کر بتاؤنگا محض پولٹیکل وجوہات کی بناء پر تھیں۔ بہرحال نجاشی چونکہ شریف بادشاہ تھا۔ اُسے یہ خبر ملنے پر بہت رنج ہوا کہ میرے جرنیل آپس میں لڑے اور اُن میں سے ایک نے دُوسرے کو مار دیا۔ چنانچہ اُس نے ناراض ہو کر قسم کھائی کہ مَیں مقتول کا انتقام لینے کیلئے ابرہہ کی پیشانی کے بال کھینچونگا اور اسکے ملک کو اپنے پاؤں تلے رَوندونگا۔ پُرانے زمانہ میں یہ طریق رائج تھا کہ جب کسی شخص کو ذلیل کرنا مدنظر ہوتا تھا تو اُسکے ماتھے کے بال پکڑ کر کھینچا جاتا۔ نجاشی نے بھی قسم کھائی کہ مَیں ابرہہ کو ذلیل کرنے کے لئے اُس کی پیشانی کے بال مونڈ دُونگا۔ اور اُس کے ملک کو اپنے پاؤں تلے رَوندونگا۔ یہ بھی ایک محاورہ ہے جسکے معنے یہ ہوتے ہیں کہ مَیں اُسے شکست دُونگا۔ اور اسے دُنیا کی نگاہ میں ذلیل اور رُسوا کردونگا۔ نجاشی نے اپنے دربار میں یہ بات کہی تو ابرہہ کے کسی دوست نے فوراً یہ بات ابرہہ تک پہنچا دی کہ اس طرح بادشاہ نے قسم کھائی ہے کہ مَیں ابرہہ کی پیشانی کے بال کھینچونگا اور یمن کا ملک اپنے پاؤں تلے رَوندونگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نجاشی اس واقعہ کی وجہ سے یمن پر حملہ کریگا اور آپکو گورنری سے برطرف کردیگا ابرہہ بہت ہوشیار آدمی تھا جب اُسے یہ خبر پہنچی تو اُس نے ایک نائی بلوایا اور اپنی پیشانی کے بال منڈوا دئے اِسی طرح ایک بوری لی اور اُسے یمن کی مٹی سے بھر دیا۔ اسکے بعد اُسنے یہ دونوں چیزیں ایک آدمی کے ہاتھ نجاشی کے پاس بھجوا دیں اور ساتھ ہی معافی کا ایک خط لکھا اور معذرت کی کہ اِن اِن حالات میں یہ واقعہ ہوا ہے۔ اگر قصور ہے تو ہم دونوں کا مشترکہ ہے لیکن بہرحال جو کچھ ہوا ہے کسی دھوکے کے ماتحت نہیں ہوا۔ ہمارا فیصلہ یہی تھا کہ ہم میں سے جو شخص دُوسرے کو مار لیگا وہ یمن کا حاکم بن جائیگا۔ اگر مَیں مارا جاتا تو وہ بادشاہ بن جاتا۔ مگر چونکہ لڑائی میں وہ مارا گیا اس لئے اس فیصلہ کے مطابق میں ہی یمن کا حاکم بنا۔ اس میں کسی فریب یا دھوکے بازی کا دخل نہیں اور نہ اچانک کسی پر حملہ ہوا ہے بلکہ سوچی سمجھی ہوئی تدبیر اور باہمی فیصلہ کے مطابق ہم نے آپس میں یہ لڑائی کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے لکھا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ بادشاہ سلامت نے قسم کھائی ہے کہ وہ میری پیشانی کے بال کھینچوائینگے۔ مَیں اس قسم کو پُورا کرنے کیلئے اپنی پیشانی کے بال مونڈ کر حضور کی خدمت میں بھجوا رہا ہوں

اسی طرح مجھے یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ حضور نے قسم کھائی ہوئی کہ میں یمن کے ملک کو اپنے پاؤں تلے روندونگا۔ اس قسم کو پورا کرنے کے لئے میں یمن کی مٹی ایک بوری میں بھر کر بھجوا رہا ہوں۔ آپ اس کو پاؤں تلے روندیں تو آپ کی قسم پوری ہو جائیگی۔ باقی جہانتک میری ذات کا تعلق ہے میں آپ کا مطیع اور فرمانبردار ہوں اور مجھے آپ کی غلامی پر فخر ہے۔ اُس کا یہ طریق کہ اُس نے اپنی پیشانی کے بال مونڈ کر بھیجدئے اور یمن کی مٹی ایک بوری میں بھر کر اسلئے بھیج دی کہ بادشاہ اس کو اپنے پاؤں تلے روندے اور اپنی قسم پوری کرلے۔ نجاشی کو بہت پسند آیا اور اُس نے لکھا کہ ہم تمہیں معاف کرتے ہیں اور تمہیں اپنی طرف سے یمن کا گورنر مقرر کرتے ہیں۔ جب ابرہہ کو یہ خبر پہنچی تو اُس نے اس خوشی میں کہ بادشاہ نے مجھے معاف کر دیا ہے اور میری جان بخشی کی ہے فیصلہ کیا کہ میں یمن میں ایک بڑا بھاری گرجا بنواؤنگا۔ اتنا بڑا کہ جس کی مثال ان علاقوں میں نہ پائی جائے چنانچہ جب بادشاہ کی طرف سے اسے گورنری پر فائز ہونے کے آرڈر ملے اور ساتھ ہی یہ بھی اطلاع آگئی کہ ہم تمہیں معاف کرتے ہیں تو ابرہہ نے بادشاہ کو شکریہ کی ایک چٹھی لکھی جس میں یہ بھی تحریر کیا کہ آپ نے مجھ پر جو یہ مہربانی کی ہے کہ مجھے یمن کا گورنر مقرر کر دیا ہے اور میرے قصور سے درگذر فرمایا ہے میں نے اس خوشی میں آپ کے اس احسان کا شکریہ ادا کرنے کیلئے یہ منّت مانی ہے کہ میں یمن میں ایک بہت بڑا گرجا بنواؤنگا جس کی مثال اور ممالک میں نہ پائی جائے۔ چنانچہ اس منّت کو پورا کرنے کیلئے اُس نے دُور دُور سے انجینئر بلوائے۔ اچھی لکڑی، اچھا میٹیریل اور اچھے نقشہ ساز مہیا کئے اور ایک بہت بڑا گرجا بنوایا۔ یہ گرجا اتنا بلند تھا کہ اس کو دیکھتے وقت انسان کی ٹوپی گر جاتی تھی۔ عربی میں کلاہ کو قلنسوہ کہتے ہیں۔ چونکہ یہ گرجا ایسا تھا جس کو دیکھتے ہوئے سر پر سے ٹوپی گر جاتی تھی اس لئے عربوں نے اس کا نام قلیس رکھدیا یعنی وہ گرجا جس کے دیکھنے سے ٹوپی گر جاتی ہے۔ جب گرجا بن گیا تو اس کے بعد اُس نے صرف اس گرجا کی تعمیر پر ہی کفایت نہیں کی بلکہ یہ بھی کوشش شروع کر دی کہ عرب خانہ کعبہ کو چھوڑ کر قلیس کا حج کریں اور اسی کو اپنا مرکز اور مرجع قرار دے دیں۔

اصحاب الفیل کے واقعہ کے متعلق ایک خاص مضمون کا انکشاف

یہاں وہ مضمون آتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ میں صرف مجھ پر کھولا ہے اور جس کی طرف تیرہ سو سال تک مسلمانوں کی توجہ نہیں گئی۔ وہ مضمون یہ ہے کہ یہ دو سورتیں یعنی سورۃ الفیل اور سورۂ ایلاف اس حقیقت کا اظہار کرتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بلکہ آپ کی پیدائش سے بھی پہلے آپ کے دشمنوں اور دوستوں کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں یعنی آپ کی آمد کی انتظار میں اگر ایک طرف آپ کے دشمنوں نے تیاری شروع کر دی تھی تو دوسری طرف آپ کے دوستوں نے بھی تیاری شروع کر دی تھی کہتے ہیں "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" یعنی ترقی کرنے والے وجود کی طرف شروع میں ہی نظریں اُٹھنی شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ تو ایک دنیوی ضرب المثل ہے اللہ تعالیٰ کی بھی ہمیشہ سے یہ سنت چلی آئی ہے کہ جب بھی کوئی مامور آنے والا ہوتا ہے اُس کی بعثت سے پہلے اُس کے متعلق پیشگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں جو ثبوت ہوتا ہے اس بات کا کہ اب وہ زمانہ بالکل قریب آگیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی موعود نے مبعوث ہونا ہے۔ اگر پرانی باتیں کسی کی سمجھ میں نہ آسکیں تو اس زمانہ کو ہی دیکھ لو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پچھلے سو سال میں عام طور پر مسیح موعود اور مہدی معہود کے ظہور کے متعلق لوگوں میں احساس پیدا ہو چکا تھا اور ان میں اس کے متعلق حرکت اور بیداری پائی جاتی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے بھی پہلے یہ حرکت پیدا ہوئی اور یہ حرکت کسی ایک قوم میں پیدا نہیں ہوئی بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں اور عربوں سب میں یہ احساس تھا کہ کوئی عظیم الشان ظہور ہونے والا ہے۔ عرب لوگ قیاس کرتے تھے کہ دعوۃ ابراہیمی والا موعود آنے والا ہے۔ عیسائی سمجھتے تھے کہ فارقلیط آنے والا ہے یا "وہ نبی" جس کی خبر

دی گئی تھی دُنیا میں ظاہر ہونے والا ہے اور یہودی سمجھتے تھے کہ وہ نبی جس نے اُنہیں غلامی سے آزادی دلائی ہے اور جس نے موسیٰؑ کا مثیل ہونا ہے وہ دنیا میں مبعوث ہونے والا ہے۔ یہودی صرف موسیٰؑ نبی کے مثیل کی آمد کے قائل تھے اور وہ اس اُمید میں لگے ہوئے تھے کہ عنقریب وہ موعود انسان جس کی نوشتوں میں خبر دی گئی تھی مبعوث ہونیوالا ہے مگر یہ پیشگوئیاں تو موسیٰؑ کے زمانہ سے تھیں۔ موسیٰؑ نے خبر دی تھی کہ ایک زمانہ میں میرا مثیل دنیا میں آئیگا اور وہ آتشی شریعت اپنے ہمراہ لائیگا۔ پس یہ اُمید کوئی نئی اُمید نہیں تھی بلکہ موسیٰؑ کے زمانہ سے ہی اُنہیں یہ خبر مل چکی تھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس آنے والے موعود کے متعلق اُن کے دلوں میں خلش اور تڑپ کیوں نہ داؤدؑ کے وقت میں پیدا ہوئی۔ کیوں نہ سلیمانؑ کے وقت میں پیدا ہوئی۔ کیوں نہ زکریاؑ کے وقت میں پیدا ہوئی۔ کیوں نہ حزقیل کے وقت میں پیدا ہوئی۔ اس اُمید کی کسی قدر ابتداء مسیح کے وقت میں ہوئی ہے چنانچہ حضرت مسیحؑ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ ہم آپ کو کیا سمجھیں کیا آپ مسیح ہیں یا ایلیاہ ہیں۔ یا "وہ نبی" گویا "وہ نبی" کی آمد کا احساس کسی قدر حضرت مسیحؑ کے زمانہ میں پیدا ہو چکا تھا مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ احساس بہت ہی تیز ہو گیا تھا اور یہ الٰہی سنت اور دستور ہے کہ جب کسی موعود نے آنا ہو تو اُس کی آمد سے پہلے ہی طبائع میں ایک عام احساس اُس کے متعلق پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور لوگوں کی اُنگلیاں اُس کی طرف اُٹھنے لگتی ہیں۔ پس مَیں نے اِس سورۃ پر جو کچھ غور کیا ہے اُس کے لحاظ سے میری تحقیقات یہی ہے کہ اُس زمانہ میں لوگوں کے دِلوں میں آنے والے موعود کے متعلق ایک جستجو شروع تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ کوئی ظہور ہونیوالا ہے۔ یہ جستجو عربوں کے دلوں میں بھی تھی کیونکہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ پیشگوئی کی تھی کہ مکہ میں ایک نبی مبعوث ہوگا یہ جستجو یہودیوں کے دِلوں میں بھی تھی کیونکہ موسیٰؑ نے یہ کہا تھا کہ میری مانند ایک نبی کھڑا کیا جائیگا۔ یہ جستجو عیسائیوں کے دلوں میں بھی تھی کیونکہ مسیحؑ نے یہ کہا تھا کہ میرے دوبارہ آنے سے پہلے ایک رُوحِ کامل آئیگی جو تمام سچائیوں کو ظاہر کریگی۔ پس عیسائیوں کو اللہ تعالیٰ کی ایک رُوحِ کامل کے ظہور کی اُمید تھی۔ عربوں کو یہ اُمید تھی کہ عرب کا پیغمبر آئیگا اور یہودیوں کو یہ اُمید تھی کہ موسیٰؑ کا مثیل آنے والا ہے۔ اور یہ رَو اس قدر چلی کہ ہر قوم بڑے جوش سے اس اُمید کا اظہار کرتی بلکہ فخر کرتی کہ ہمارا نبی آئیگا۔ تو وہ ہمارے دشمنوں سے بدلہ لیگا۔ جیسے اس زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ اور انگلستان میں بہت سے ایسے لوگ گذرے ہیں جنہوں نے مسیحیت کا دعویٰ کیا یا اعلان کیا کہ ہم مسیحیت کو غلبہ دینے کیلئے آئے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں میں کئی لوگ ایسے پیدا ہو گئے جو مہدویت کے مدعی تھے کیونکہ مسیح اور مہدی کے ظہور کا زمانہ آگیا تھا اور دُنیا میں اس کے متعلق ایک عام رَو چل رہی تھی جس طرح بارش سے پہلے ہوائیں چلتی ہیں اور وہ اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اب بادل آنیوالا اور آسمان سے پانی برسنے والا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ماموروں کے آنے سے پہلے زمین میں ایک عام حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور کئی لوگ ماموریت کے مدعی بنجاتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عیسائیوں اور یہودیوں اور عربوں سب میں یہی رَو جاری تھی عرب اپنی مجالس میں بیٹھتے تو یہی ذکر کرتے کہ اب ابراہیمی وجود ظاہر ہونے والا ہے۔ یہودی اپنی مجالس میں بیٹھتے تو یہی ذکر کرتے کہ ایسے آثار ظاہر ہو رہے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ موسیٰؑ کا مثیل آنے والا ہے۔ اِسی طرح عیسائی اپنی جگہ باتیں کرتے کہ مسیحؑ کی پیشگوئیاں پوری ہونیوالی ہیں۔ اصل میں تو یہ ایک ہی وجود تھا جس کی آمد کی مختلف قومیں منتظر تھیں مگر وہ سمجھتے یہی تھے کہ ہمارا موعود دُوسری اقوام سے بالکل الگ ہوگا۔ حالانکہ جس کی پیشگوئی ابراہیمؑ نے کی تھی اُسی کی پیشگوئی موسیٰؑ نے کی تھی اور جس کی پیشگوئی

موسیٰؑ نے کی تھی اُسی کی پیشگوئی ابراہیمؑ اور عیسیٰؑ نے کی تھی اور جس کی پیشگوئی عیسیٰؑ نے کی تھی اُسی کی پیشگوئی ابراہیمؑ اور موسیٰؑ نے کی تھی۔ وجود ایک ہی تھا مگر اپنی اپنی پیشگوئیوں کی وجہ سے ہر قوم کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہمارا نبی آئیگا تو وہ دوسری اقوام کو مارنے کیلئے آئیگا۔ جب عیسائی سُنتے کہ یہودیوں کے دلوں میں بھی امیدیں پیدا ہو رہی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ کوئی موعود آنیوالا ہے جو انکی قوم کو ترقی دیگا تو وہ اس امید کو تو درست سمجھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ کوئی موعود ضرور آنے والا ہے مگر وہ یہودیوں کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ یہ لوگ جھوٹے طور پر ان اُمیدوں کے سہارے کھڑے ہو رہے ہیں ورنہ وہ موعود جو آنیوالا ہے ہمارا ہے۔ اسی طرح مکہ والوں میں جب سے یہ احساس پیدا ہوا کہ دُعائے ابراہیمیؑ کے نتیجہ میں عرب میں کوئی پیغمبر مبعوث ہونیوالا ہے۔ تو گو عیسائی یہ تو سمجھتے تھے کہ آنے والا ضرور آئیگا مگر وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ عرب قوم جو اس موعود کا انتظار کر رہی ہے یہ کوئی پولٹیکل چال ہے۔ اور وہ ڈرتے تھے کہ اِس پولٹیکل چال کے نتیجہ میں کوئی ایسا آدمی عرب میں نہ کھڑا ہو جائے جس کے پیچھے سارا عرب لگ جائے اور اس طرح حکومت کی باگ ڈور اِس قوم کے ہاتھ میں آجائے جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے کچھ عرصہ پہلے اور خود آپؑ کے زمانہ میں بھی انگریز اور دوسرے یورو پین جہاں کسی شخص کے متعلق سنتے کہ اُس نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو فوراً اُس کے پیچھے دوڑ پڑتے حالانکہ انگلستان میں مثال موجود ہے۔ امریکہ میں مثال موجود ہے کہ وہاں عیسائیوں میں سے بعض لوگوں نے مسیح ہونے یا مسیح کا پیشرو نبی ہونے کا دعویٰ کیا مگر وہ اس پر بُرا نہیں مناتے تھے بلکہ خوش ہوتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر تو یہ جھوٹا ہے تو ہمیں اسکی طرف توجہ کرنے کی کیا ضرورت ہے خود بخود تباہ ہو جائیگا اور اگر سچا ہے تو بہرحال اس سے عیسائی دنیا کو نفع ہوگی اور یہ ہمارے فائدہ کی بات ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہوتا کہ آنے والا موعود ہم میں آنے والا ہے تو وہ سمجھتے کہ یہ کوئی پولٹیکل چال ہے جو عیسائیت کو کمزور کرنے کیلئے اختیار کی جا رہی ہے۔ یہی احساس اُس زمانہ کی عیسائیت میں تھا۔ یہودیوں کے پاس چونکہ حکومت نہیں تھی اسلئے جب وہ سنتے کہ عرب بھی ایک موعود کا انتظار کر رہے ہیں جس کے متعلق وہ سمجھتے ہیں کہ وہ عربوں میں سے ہوگا۔ یا عیسائی بھی ایک موعود کا انتظار کر رہے ہیں۔ جس کے متعلق وہ سمجھتے ہیں کہ وہ عیسائیوں میں سے ہوگا۔ تو وہ اپنے دلوں پر پتھر رکھ کر بیٹھ جاتے اور اندر ہی اندر پیچ و تاب کھانے لگتے۔ وہ سمجھتے کہ ہمارے پاس حکومت نہیں ورنہ ہم اِن لوگوں کو بتا دیں کہ ہم اُنکے اِن خیالات کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی طرح عرب بھی جب سنتے کہ یہودی اور عیسائی دونوں اُس موعود کا اپنی اپنی اقوام میں انتظار کر رہے ہیں۔ تو وہ بھی اپنے دلوں پر پتھر رکھ کر بیٹھ جاتے۔ مگر عیسائیوں میں طاقت تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ ہم اپنے زور سے اس بات کو مٹا سکتے ہیں۔ جیسے اِس زمانہ میں یوروپین اقوام کی حالت تھی کہ جب کوئی مسیحیت کا مدعی کھڑا ہوتا تو مسلمان تو اُسے مار نہیں سکتے تھے حالانکہ مسلمان بھی اُس کو اپنا رقیب سمجھتے تھے۔ مگر جب عیسائی مسلمانوں میں سے کسی کو مہدویت کا مدعی پاتے تو فوراً اسکو مارنے کیلئے کھڑے ہو جاتے۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب عیسائی دیکھتے کہ عربوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ آنے والا موعود عرب ہوگا اور یہودیوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ آنے والا موعود یہود میں سے ہوگا تو وہ رقابت کے احساس کے ماتحت مقابلہ کیلئے کھڑے ہو جاتے اور سمجھتے کہ یہ عیسائیت کو کمزور کرنے کی مخفی تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں انہی حالات کو دیکھکر ابرہہ کو محسوس ہوا کہ عرب میں خانۂ کعبہ ایک ایسا مقام ہے جس کی وجہ سے سارا عرب اکٹھا ہو سکتا ہے۔ اِدھر وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ عربوں میں یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ اُن کے بلند ہونے اور دُنیا میں ترقی

کرنے کا وقت آگیا ہے اور ابراہیمؑ کا موعود اب بہت جلد آنے والا ہے اور گو عیسائی ایسے مدعی کو جھوٹا ہی سمجھتے مگر بہرحال اُن کے دل میں یہ ڈر پیدا ہو گیا کہ اگر جھوٹے طور پر بھی اُن میں کوئی مدعی کھڑا ہو گیا تو بات خطرناک ہو جائیگی۔ پہلے ہی ایک جتھہ بنانے کا ذریعہ اِن لوگوں کے پاس موجود ہے یعنی سارے عرب خانۂ کعبہ کو مانتے ہیں اور اسکی عزّت تکریم کرتے اور اُسے مقدس مقام تسلیم کرتے ہیں۔ اگر وہ موعود بھی آگیا تو خانۂ کعبہ تو پہلے ہی اُن کے اتحاد کا ذریعہ ہے اُس موعود کے ذریعہ یہ اور بھی متحد ہو جائیں گے اور عرب میں سے عیسائی حکومت تباہ ہو جائیگی۔ عرب میں عیسائیت کی حکومت ایک تو یمن میں تھی اور ایک مدینہ سے اُوپر تھی یعنی شمالی عرب کا بہت سا حصہ روم کے بادشاہ نے فتح کیا ہوا تھا اور وہاں اس کی حکومت قائم تھی۔ گویا فلسطین سے لیکر مدینہ سے ڈیڑھ دو سو میل اُوپر تک تمام علاقہ عیسائی حکومتوں کے پاس تھا اور یہی عرب کے متمدن علاقے تھے یا یمن متمدن علاقہ تھا جس میں غلہ بھی پایا جاتا تھا۔ معادن بھی پائے جاتے تھے اُسکی تجارت بھی بڑی بھاری تھی اور یا شمالی علاقے متمدن تھے۔ اُن کی ایران کے ساتھ بھی تجارتیں تھیں اور روم کے ساتھ بھی تجارتی تعلقات تھے۔ اِن تمام متمدن علاقوں پر عیسائیوں نے قبضہ کر رکھا تھا اور درمیان کے علاقہ کو انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔ جب عربوں میں ایک آنے والے موعود کے متعلق احساسات پیدا ہوئے اور اُن میں بیداری کے آثار نظر آنے لگے تو عیسائیوں نے سمجھا کہ اگر عرب منظم ہو گئے تو وہ ہمیں یمن سے بھی نکال دینگے اور شمالی علاقوں سے بھی نکال دینگے معلوم ہوتا ہے جب ابرہہ نے یمن میں گرجا بنایا تو اس کے ساتھ ہی اسکے دل میں یہ احساس بھی پیدا ہو گیا کہ میں اِس گرجا سے یہ بھی کام لوں کہ عرب کے خانۂ کعبہ کی عزّت کو گرا دوں اور اہلِ عرب کی توجہ اپنے گرجا کی طرف پھرا دوں۔ اِس کے دو فائدے ہونگے، ایک تو یہ کہ عیسائیت پھیلے گی۔ دُوسرے عربوں کا اتحاد ٹوٹ جائیگا۔ کوئی ایک گھر نہیں رہیگا۔ جس میں وہ جمع ہو سکیں۔ اسلئے آئندہ اگر عرب میں کوئی مدعی کھڑا بھی ہُوا تو اُس کیلئے اپنی حکومت بنانے میں آسانی نہیں ہوگی۔ اِس خیال کی وجہ سے ابرہہ نے یہ تدبیر کی ورنہ گرجے دنیا میں بنا ہی کرتے ہیں مگر کبھی کسی گرجا سے اس رنگ میں کام نہیں لیا گیا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ ابرہہ نے اس امر کا اعلان تمام مملکت میں کروا دیا کہ عرب آئندہ قلیس کی زیارت کے لئے آیا کریں اور پھر اپنی اس سکیم کو پُورا کرنے کے لئے ابرہہ نے عرب کے بڑے بڑے رؤسا کو بُلا کر انہیں رشوتیں دیں۔ انعام و اکرام کے وعدے کئے اور اُن سے کہا کہ تم سارے عرب میں یہ اعلان کر دو کہ آئندہ خانۂ کعبہ کی بجائے اہلِ عرب اُس گرجا میں اکٹھے ہُوا کریں جو صنعاء میں بنایا گیا ہے اور بیت اللہ کی بجائے اُس کی زیارت کیلئے آیا کریں۔ ابرہہ کی یہ تحریک صاف بتاتی ہے کہ یہ جو کچھ کیا گیا محض ایک پولیٹیکل چال کے طور پر کیا گیا۔ ورنہ دنیا میں اور ہزاروں گرجے تھے کسی اور گرجے کے متعلق ایسی تحریک کیوں نہیں کی گئی۔ پھر جو یمن میں گرجا بنایا گیا تھا اُس کی یمن کے لحاظ سے بیشک بڑی حیثیت تھی مگر ایبے سینیا کے گرجوں کے مقابلہ میں اُس کی کیا حیثیت ہو سکتی تھی جسکی طرف سے وہ خود ایک گورنر اور ماتحت حاکم تھا۔ یقیناً ایبے سینیا میں اس سے بھی بڑے بڑے گرجے ہوں گے۔ مگر کبھی ایبے سینیا کی حکومت نے یہ کوشش نہیں کی کہ عرب اُن کے گرجوں کی طرف رجوع کریں اور خانۂ کعبہ کو چھوڑ دیں اِسی طرح رومن حکومت میں ہزاروں گرجے تھے اور رومن حکومت اُس زمانہ میں ایسی زبردست تھی کہ حبشہ کی بھی وہی حاکم تھی۔ یمن کی بھی وہی حاکم تھی۔ پھر شام فلسطین۔ انطاکیہ اور یونان وغیرہ سب اُس کے قبضہ میں تھے۔ اتنی بڑی حکومت میں جسقدر گرجے ہو سکتے ہیں اور جتنے شاندار ہو سکتے ہیں وہ ایک ظاہر امر ہے۔ مگر رومن حکومت نے بھی کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ غیر قومیں اُن کے کسی معبد کو مقدس قرار دیں اور اُسکی

زیارت کے لئے آیا کریں۔ پھر یمن میں ابرہہ نے ایسا کیوں کیا صرف اس لئے کہ وہ خانۂ کعبہ کی حرمت کو گرا دے۔ اور خانۂ کعبہ کی حرمت کو گرانے کا خیال اُسے اس لئے آیا کہ اُس نے دیکھا کہ اہلِ عرب میں یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ ہم میں ایک نبی آنے والا ہے۔ اُس نے سمجھا کہ اگر یہ دو چیزیں مل گئیں تو لازماً عرب حکومت قائم ہو جائے گی اور ہمارا رہنا مشکل ہو جائیگا چنانچہ اسی احساس کے ماتحت اُس نے یہ اعلان کر دیا۔

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابرہہ نے علاوہ اپنی مملکت میں اِس قسم کا اعلان کرنے کے خود نجاشی کو بھی اطلاع دے دی کہ مَیں چاہتا ہوں کہ عربوں کی توجہ خانۂ کعبہ سے ہٹا کر صنعاء کے گرجا کی طرف پھرا دوں اور عربوں کو بھی معلوم ہو گیا کہ ابرہہ نے نجاشی کو ایسا خط لکھا ہے، جہاں تک میرا احساس ہے مَیں سمجھتا ہوں کہ نجاشی کو ابرہہ کی اِس سکیم سے کوئی ہمدردی نہیں تھی اور غالباً ابرہہ نے اُسے اپنی ساری سکیم بتائی بھی نہیں صرف مجملاً اُس نے نجاشی کو اطلاع دے دی۔ جس سے غرض یہ تھی کہ اگر اس سے بعد میں کوئی فتنہ اُٹھے تو بادشاہ ناراض نہ ہو کہ مجھے اِس سکیم سے کیوں ناواقف رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اُس نے اتنی خبر تو دے دی کہ عیسائیت کو یہاں کے لوگوں میں رُوشناس کرنے کے لئے مَیں عربوں میں یہ تحریک کرنا چاہتا ہوں کہ وہ صنعاء کے گرجا کی طرف توجہ کریں اور بیت اللہ کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا لیں مگر اُس نے تفصیلاً اپنی سکیم نجاشی کے سامنے نہیں رکھی۔ جب عربوں کو معلوم ہُوا کہ ابرہہ نے نجاشی کو ایسا خط لکھا ہے اور اُس نے اپنی مملکت میں اعلان کرایا کہ آئندہ لوگ خانۂ کعبہ کی بجائے قلیس کی زیارت کے لئے آیا کریں تو اُن میں سخت جوش پیدا ہو گیا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ بات معمولی نہیں۔ یُوں گرجے دنیا میں بنا ہی کرتے ہیں۔ بیشک اُس کے پاس روپیہ زیادہ تھا اِس لئے اُس نے زیادہ بلند عمارت بنالی یا زیادہ اچھی لکڑی اُس نے لگالی یا زیادہ ماہر انجینئر اُس نے گرجا کی تعمیر کے لئے منگوا لئے یا زیادہ پائیدار روغن اُسنے کروا دیا مگر یہ کیا مطلب ہے کہ اس کے بعد بادشاہ کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ یہ گرجا سارے عرب کا نقطۂ مرکزی بن جائے۔ اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ یہ ایک پولٹیکل چال چلی جارہی ہے۔ چنانچہ اسکے نتیجہ میں اہلِ عرب میں جو سیاسی دماغ کے مالک تھے اُن میں بھی قدرتاً جوش پیدا ہُوا اور جو مذہبی لوگ تھے اُن میں بھی جوش پیدا ہُوا اور سب میں یہ احساس پیدا ہُوا کہ خانۂ کعبہ کی ہتک کی جارہی ہے خصوصاً قریش میں یہ جوش بہت زیادہ پھیل گیا جس وقت یہ خبر لوگوں میں عام طور پر پھیل گئی۔ تو ایک دن کوئی عرب جو کوئی مشہور آدمی نہیں تھا بلکہ ایک معمولی آدمی تھا۔ یا زیادہ سے زیادہ کسی قبیلہ کا رئیس ہوگا صنعاء میں آیا (عرب لوگ وہاں آتے رہتے تھے کیونکہ یمن کی بادشاہت منظم تھی اور اُنہیں اپنی حاجات لیکر وہاں آنا پڑتا تھا) اور کسی بہلانے سے اُس نے گرجا میں سونے کی اجازت حاصل کرلی۔ یوروپین گرجوں کے ساتھ تو رہائشی کمرے نہیں ہوتے۔ مگر ایشیائی گرجوں کے ساتھ رہائشی کمرے بھی ہوتے ہیں اور اسی قسم کے کمرے قلیس کے ساتھ بھی تھے۔ رات کو وہ وہاں سویا تو جیسے اوباش لوگوں کا طریق ہوتا ہے اُسے ایک حرکت سُوجھی جو اچھی نہ تھی مگر بہرحال جو کچھ ہُوا خدا تعالیٰ کی حکمت کے ماتحت ہُوا۔ اُس نے گرجا میں عین عبادت گاہ کے اندر جاکر پاخانہ کر دیا اور پھر کہیں اِدھر اُدھر بھاگ گیا۔ اِس بارہ میں ابن جریر کی روایت ابن اسحاق سے یہ ہے کہ جب ابرہہ نے نجاشی کو اپنے اس ارادہ سے اطلاع دی کہ وہ نئے گرجا کو سارے عرب کا مرجع بنانا چاہتا ہے اور اس وقت تک دم نہ لیگا جب تک ایسا نہ کرلے اور اس کا چرچا عربوں میں ہُوا تو بنو مالک کی شاخ بنو فقیم کے ایک قبیلہ نساء کے ایک شخص کو غصّہ آیا اور وہ صنعاء گیا اور اُس نے قلیس گرجا میں پاخانہ کر دیا۔ صبح جب نوکر صفائی کرنے کے لئے اندر گیا

تو اُس نے دیکھا کہ عبادت گاہ میں پاخانہ پھرا ہُوا ہے۔ اُس نے افسروں کو اطلاع دی اور افسروں نے گورنر کو لکھا کہ اِس اِس طرح ہمارے مقدس مقام میں کوئی شخص پاخانہ پھر گیا ہے اور غالباً پاخانہ پھرنے والا عرب تھا کیونکہ اُسی نے رات کو یہاں سونے کی ہم سے اجازت طلب کی تھی اور اب صبح سے وہ غائب ہے۔ اُسے یہ بھی بتایا گیا کہ یہ قریش کا کام ہے جن کو اس بات پر غصہ ہے کہ اُنکی عبادتگاہ کے مقابل پر آپ نے یہ عبادتگاہ بنائی گئی ہے۔ ابرہہ کو جب اِس واقعہ کا علم ہُوا تو اُسے سخت طیش آیا اور اُس کے دل میں مکہ کے خلاف غصہ پیدا ہُوا بعض کہتے ہیں کہ اُس نے اسی وقت قسم کھائی کہ وہ مکہ پر چڑھائی کریگا اور خانۂ کعبہ کی اینٹ سے اینٹ الگ کر دیگا۔ اس کے بعد بعض اور واقعات بھی ہوئے جو ابرہہ کے دل میں متواتر یہ احساس پیدا کرتے چلے گئے کہ خانۂ کعبہ کی موجودگی میں صنعاء کا گرجا کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ اس بارہ میں دُوسری روایت مقاتل بن سلیمان کی ہے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ قریش کے کچھ نوجوان صنعاء گئے جہاں یہ گرجا تھا اور وہاں کسی کام کے لئے آگ جلائی۔ اتفاقاً اس دن ہَوا تیز چل رہی تھی آگ کی کچھ چنگاریاں اصل عمارت کی طرف اُڑ کر پہنچ گئیں اور اُس میں آناً فاناً آگ لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس گرجا میں لکڑی کا کام زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ تاریخ سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ اُس گرجا پر روغن کا بہت زیادہ کام کیا گیا تھا چونکہ روغن کو آگ بہت جلدی لگ جاتی ہے اِس لئے ممکن ہے اس آگ میں زیادہ تر اُس روغن کا بھی دخل ہو جو اُس پر کیا گیا تھا بہرحال یہ بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک بلت پیدا ہوئی اور اس گرجے کا ایک حصہ جل گیا بعض روایات میں تو یہ آتا ہے کہ سارا جل گیا مگر بعض دوسری روایات میں ذکر آتا ہے کہ سارا گرجا نہیں جلا بلکہ اس کا صرف ایک حصہ جلا۔ اِس پر ابرہہ کے دل میں اَور بھی احساس پیدا ہُوا کہ جب تک خانۂ کعبہ موجود ہے۔ اِس گرجا کی عظمت اہلِ عرب کے دِلوں میں قائم نہیں ہو سکتی۔ اتفاق ایسا ہُوا کہ یہ لوگ جن کی وجہ سے گرجا میں آگ لگی، یہ بھی عرب تھے اور گرجا میں پاخانہ پھرنے والا بھی عرب ہی تھا۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اُنہوں نے عمداً یا ارادتاً گرجا کو نقصان پہنچانے کے لئے آگ جلائی تھی۔ تاریخ سے صاف ثابت ہے کہ انہوں نے اپنی کسی غرض کے لئے آگ جلائی تھی۔ مگر اتفاقاً اس روز ہوا تیز چل رہی تھی آگ کی چنگاریاں اُڑ کر اصل عمارت تک بھی جا پہنچیں اور اُنہوں نے گرجا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بہرحال یہ ایک اتفاق تھا اور ایسے اتفاقات دُنیا میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یہ تو نہیں ہوتا کہ ہَوا سے پہلے کوئی عہد لے لیتا ہے کہ جب میں آگ جلاؤں تو تُو بھی چل پڑیو۔ مگر چونکہ پہلے بھی ایک واقعہ ہو چکا تھا بادشاہ کے دِل میں احساس پیدا ہُوا کہ یہ جو کچھ ہُوا ہے شرارتاً ہُوا ہے اور اُس کے دِل میں مکہ کا بغض اور بھی ترقی کر گیا۔ اُس وقت ابرہہ نے اپنے آدمی بھیج کر عرب کے بعض اچھے اچھے رؤسا کو جمع کرنا شروع کیا تاکہ بغیر چڑھائی کرنے کے عربوں کو خانۂ کعبہ کی طرف سے ہٹا کر قلیس کی طرف مائل کیا جا سکے۔ چنانچہ محمدؐ بن خزاعی اور قیس بن خزاعی جو قبیلۂ خزاعہ کے بڑے سردار تھے ابرہہ کے پاس آئے ابرہہ نے اُن سے انعام و اکرام کے وعدے کئے اور اُن سے کہا کہ تم عرب میں پھرو اور لوگوں کو توجہ دلاؤ کہ وُہ اپنا مرکزی نقطہ صنعاء کے گرجا کو بنالیں اور خانۂ کعبہ کی طرف سے اپنی توجہ ہٹالیں۔ حج کے لئے بھی آیندہ قلیس ہی آیا کریں یہ لوگ عیسائی نہیں تھے مگر جیسے انگریزوں کے زمانۂ اقتدار میں کئی مسلمان انکی خوشامدیں کرتے پھرتے تھے۔ یا جہاں بھی کوئی حاکم ہو۔ وہاں بعض لوگ اس قسم کے بھی ہوتے ہیں جو لالچ میں آجاتے ہیں اور حکام کی خوشامدیں کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ان کو بھی جب انعام و اکرام کے وعدے دیے گئے تو یہ اس دَورہ کے لئے تیار ہو گئے چنانچہ بادشاہ سے ہدایتیں لے کر اُنہوں نے سیدھا رُخ مکہ کی طرف کیا۔ یہ شمال کی طرف نکل گئے۔ ان کا طریق یہ تھا کہ تمام لوگوں کو جمع کرتے اور پھر اُنہیں نصیحت کرتے کہ

خانۂ کعبہ کو چھوڑو اور صنعاء کے گرجا کی طرف جایا کرو۔ اگر ایسا کروگے تو حاکم قوم سے تمہارے تعلقات ہو جائینگے اور تم بہت جلد ترقی کر جاؤ گے۔ جس وقت یہ دورہ کرتے ہوئے بنو کنانہ کے علاقہ میں پہنچے اور اہلِ تہامہ یعنی مکّہ اور اُس کے نواحی میں رہنے والوں کو اطلاع ہوئی۔ کہ دو عرب سردار ابرہہ نے اِس پراپیگنڈہ کے لئے بھجوائے ہیں۔ کہ اہلِ عرب خانۂ کعبہ کو چھوڑ دیں اور صنعاء کے گرجا کو اپنا مرکز بنائیں۔ تو انہوں نے ہذیل قبیلہ کے سردار عُروہ بن حیاص کو بُلوایا اور اُسے کہا کہ تم جاؤ اور صحیح صحیح حالات معلوم کر کے آؤ۔ آیا واقعہ میں خزاعہ قبیلہ کے سردار محمد بن خزاعی اور قیس بن خزاعی بادشاہ کے کہنے پر اس قسم کا پراپیگنڈہ کرتے پھرتے ہیں کہ خانۂ کعبہ کو چھوڑو اور صنعاء کو اپنا مرکز بناؤ۔ وہ لوگ بیشک مشرک تھے اور بتوں کی پرستش کرتے تھے مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اُنہیں خانۂ کعبہ سے عقیدت تھی۔ پھر عقیدت کے علاوہ مکّہ کی ساری آمدن ہی خانۂ کعبہ پر تھی اگر خانۂ کعبہ کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹ جاتی تو صرف اُن کے مذہبی احساسات کو ہی صدمہ نہ پہنچتا بلکہ اُن کی سیاسی برتری کو بھی سخت صدمہ پہنچتا۔ پس انہوں نے چاہا کہ ہم پہلے جلدی سے اس کا پتہ لے لیں تاکہ اگر واقعہ میں محمد بن خزاعی ایسا کر رہا ہو تو ہم عرب سردار مل کر اُسے اس کام سے روکیں۔ چنانچہ ہذیل کا سردار عُروہ بن حیاص سفر کرتے کرتے وہاں پہنچا اور اُس نے دیکھا کہ واقعہ میں محمد بن خزاعی خانۂ کعبہ کے خلاف پراپیگنڈہ کر رہا ہے۔ اُس نے سمجھا کہ مَیں نے اَب قوم سے کیا مشورہ کرنا ہے جھٹ کمان سنبھالی تیر رکھا اور ایسا نشانہ لگایا کہ محمد بن خزاعی کے سینہ میں وہ تیر لگا اور وہ اسی وقت مر گیا۔ یہ دیکھ کر اس کا بھائی قیس بن خزاعی وہاں سے بھاگا اور اُس نے ابرہہ کو خبر دی کہ آپ کا ایلچی محمد بن خزاعی جو تمام علاقہ کا دورہ کرتا پھرتا تھا اُس کو مکّہ والوں نے مار ڈالا ہے (یہ سوچنے والی بات ہے کہ عربوں میں عام خیال تھا کہ محمد نامی شخص سے اُن کی اُمیدیں وابستہ ہیں کیا ابرہہ نے محمد بن خزاعی کو اسی نام کی روایت کی وجہ سے ہی تو نہ چُنا تھا کہ لوگ اس کے منہ سے یہ تحریک سنکر اس مشہور روایت کی بناء پر سمجھینگے کہ شاید یہی وہ شخص ہے اور یہی وہ تحریک ہے جس سے عرب کی اُمیدیں وابستہ تھیں) اب یہ ایک اور واقعہ پیش آگیا جس پر ابرہہ کو غصہ آیا اور اُس نے سمجھا کہ جب تک خانۂ کعبہ موجود ہے میرا گرجا لوگوں میں کبھی مقبول نہیں ہو سکتا۔ ابن حاتم اور حلیۂ ابو نعیم میں ایک اور روایت بھی بیان کی گئی ہے مگر میرے نزدیک وہ ایسی قابلِ اعتبار نہیں۔ اس میں لکھا ہے۔ کہ کلسوم ابن الصباح حمیری جو ابرہہ کی بیٹی کا بیٹا تھا حج کے لئے گیا۔ اس جگہ مَیں ضمنی طور پر یہ بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں کہ اس روایت سے یہ پتہ لگتا ہے کہ ابرہہ نے اپنی بیٹی یمن کے پُرانے شاہی خاندان میں سے ایک شخص کے ساتھ بیاہ دی تھی۔ یہ وہی خاندان ہے جسکو شکست دے کر ابرہہ اور اریاط نے یمن میں عیسائی حکومت قائم کی۔ بہرحال کلسوم ابن الصباح حمیری جو ابرہہ کی بیٹی کا بیٹا تھا حج کے لئے گیا۔ راستہ میں اُسے عربوں نے لُوٹ لیا۔ اس روایت پر مجھے پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ عیسائی اپنی بیٹیاں غیر عیسائیوں کو نہیں دیتے تھے۔ اگر کہا جائے کہ وہ مسلمان نہیں بلکہ عیسائی ہی تھا تو اس کا حج کے لئے جانا بے معنی ہو جاتا ہے اور اگر وہ عیسائی نہیں ہُوا تھا تو کوئی عیسائی اپنی بیٹی کسی غیر عیسائی کو نہیں دیتا تھا خصوصاً جو بڑے خاندان تھے وہ اس بارہ میں بہت احتیاط سے کام لیا کرتے تھے۔ پس یہ روائت اپنی اندرونی شہادت کے لحاظ سے ہی اِس قابل نہیں کہ اسے قبول کیا جائے۔ بہرحال روائت بتاتی ہے کہ راستہ میں عربوں نے اُسے لُوٹ لیا۔ اور جس گرجا میں وہ ٹھہرا ہوا تھا اُسے بھی لُوٹ لیا۔ اِس پر ابرہہ نے مکّہ پر حملہ کیا۔ یہ روائت میرے خیال میں عیسائی اثر کے ماتحت خود بنالی

گئی ہے کیونکہ پیچھے جس قدر روائتیں گذر چکی ہیں اُنمیں
سے کوئی ایک روایت بھی ایسی نہیں جو ابرہہ کو مکہ پر حملہ
کرنے کا پولٹیکل حق دیتی ہو۔ لیکن یہ روایت ایسی ہے جو
اُس کو حملہ کا پولٹیکل حق دے دیتی ہے۔ اگر اس کا نواسہ مارا
گیا تھا تو یقیناً اسے پولٹیکل حق پہنچ جاتا تھا کہ وہ اُس
ملک پر حملہ کردے جس کی طرف سے ایسا فعل ہوا ہے۔
پس میرے نزدیک عیسائی اثر کے ماتحت ابرہہ کے حملہ
کو حق بجانب ثابت کرنے کیلئے یہ روایت وضع کی گئی ہو۔
چونکہ مکہ پر ابرہہ کے حملہ کی کوئی جائز اور معقول وجہ
نہیں تھی اور عیسائیوں پر اس سے بہت بڑا الزام آتا
تھا۔ اِس لئے ابرہہ کو اس اعتراض کی زد سے بچانے
کے لئے یہ روایت گھڑی گئی ہے تاکہ لوگوں پر یہ اثر ڈالا
جاسکے کہ یہ حملہ بلا وجہ نہیں تھا بلکہ اُسے ایک سیاسی
اشتعال دلایا گیا تھا جس کی وجہ سے اُس نے عرب پر حملہ
کیا۔ اور اس حملہ کا پولٹیکل نقطۂ نگاہ سے وہ پُوری طرح
حقدار تھا۔

دُوسرے اس روایت کی بناوٹ بتا رہی ہے کہ
یہ عقل کے خلاف ہے اس لئے کہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ
ابرہہ کی بیٹی کا بیٹا حمیری تھا۔ تاریخوں سے ثابت ہے کہ
ابرہہ کا یمن سے کوئی ذاتی تعلق نہیں تھا۔ نجاشی کی طرف
سے وہ اس علاقہ کو فتح کرنے کے لئے جرنیل مقرر ہوا تھا۔
اس لئے بہرحال یمن میں وہ ایک نووارد کی حیثیت رکھتا
تھا۔ پس اگر اُس نے اپنی لڑکی یمن میں بیاہی تھی تو یمن میں
آنے کے بعد بیاہی تھی۔ پھر اُس بیٹی کے ہاں ایک
بیٹا پیدا ہوا جو بڑی عمر کا ہو کر حج کے لئے گیا اور یہ واقعہ
پیش آیا۔ ہم اندازاً یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جب وہ لڑکا حج کیلئے
گیا ہوگا تو وہ بیس بائیس سال کا ضرور ہوگا۔ پھر یہ تو
نہیں کہ یمن میں آتے ہی اُس نے سارے ملک پر قبضہ
کرلیا تھا۔ لازماً اُسے حمیر کو شکست دینے اور یمن پر قبضہ
پانے میں کچھ سال لگے ہونگے۔ پھر اس کے بعد یہ بھی ثابت
ہے کہ ارباط اور ابرہہ دونوں میں اختلاف پیدا ہوا اور
یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے ایک لڑائی کی شکل اختیار کر گیا۔
جس میں ارباط مارا گیا اور ابرہہ یمن کا اکیلا بادشاہ بن گیا۔
اِن تمام جھگڑوں میں اندازاً دو تین سال ضرور صرف
ہوگئے ہونگے۔ اِس کے بعد ایک دو سال اُسے اپنی
لڑکی کے لئے داماد تلاش کرنے میں صرف ہوگئے ہونگے۔
آخر غیر ملکی شخص کو یُونہی آسانی سے تو داماد نہیں بنالیا جاتا
اس شادی کے بعد اُس کی بیٹی کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جو بائیس
سال کی عمر میں حج کے لئے گیا۔ اگر حمیر کو شکست دینے اور
ملکی حالات کو سازگار بنانے میں کم از کم تین سال بھی صرف
ہوئے ہوں اور صرف ایک سال غیر ملکی داماد تلاش کرنے میں
لگا ہو اور یہ سمجھا جائے کہ اُس کی بیٹی کا بیٹا ۲۲ سال کی عمر
میں حج کے لئے گیا تھا تو یہ ۲۶ سال بن جاتے ہیں گویا یمن
میں آنے کے ۲۶ سال بعد ابرہہ نے خانۂ کعبہ پر حملہ کرنے
کی سکیم بنائی۔ اِدھر تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نجاشی
کے وقت کا یہ واقعہ ہے وہ وہی تھا جو رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کے زمانہ میں اسلام لایا اور اسلام پر ہی اُس نے
وفات پائی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے
چالیس سال بعد دعویٰ نبوت فرمایا تھا اور دعویٰ نبوت
کے پانچ سال بعد ہجرت حبشہ ہوئی۔ گویا رسول کریم صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم جب ۴۵ سال کے تھے تب مسلمان حبشہ پہنچے
اِس کے بعد مزید آٹھ سال تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
مکہ میں رہے مگر نجاشی ایمان نہیں لایا۔ ۴۵ میں آٹھ جمع
کئے جائیں تو ترپن ۵۳ سال بن جاتے ہیں۔ اِسکے بعد رسول کریم
صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لے گئے اور آٹھویں
سال آپ نے مختلف بادشاہوں کو تبلیغی خطوط لکھے جن
میں سے ایک خط نجاشی کے نام تھا۔ ترپن ۵۳ میں یہ آٹھ سال
جمع کئے جائیں تو اکسٹھ ۶۱ ہوگئے۔ گویا اکسٹھ سال کی عمر میں
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کو خط لکھا اور وہ
مسلمان ہوگیا۔ اسلام لانے کے چھ ماہ بعد نجاشی کا انتقال

ہوگیا۔ اس اکسٹھ[۶۱] سال میں دہ چھبیس سال جمع کرو جو ابرہہ کے یمن میں گذرے تو ۸۷ سال بن جاتے ہیں۔ پھر اس میں نجاشی کی حکومت کا وہ زمانہ شامل کرو جو اس سے پہلے گذر چکا تھا۔ اور پھر نجاشی کی بادشاہت سے پہلی عمر کا اندازہ لگاؤ تو اندازاً پچیس[۲۵] تیس[۳۰] سال شمار کرنے پڑینگے۔ ۸۷ میں ۲۵ جمع کئے جائیں تو ۱۱۲ سال بن جاتے ہیں اور اگر تیس سال جمع کئے جائیں تو ۱۱۷ سال نجاشی کی عمر بن جاتی ہے۔ اور یہ عمر بالکل غیر طبعی ہے۔ جب تک تاریخوں سے قطعی طور پر یہ عمر ثابت نہ ہو۔ اس وقت تک عقل اس امر کو مان نہیں سکتی۔ پس یہ روایت درائت اور عقل کے اعتبار سے بالکل غلط ثابت ہوتی ہے۔ اسلئے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ عیسائیوں کی طرف سے یہ روایت بعد میں بنائی گئی ہے جسے مسلمان مفسرین نے سادگی سے اپنی تفسیروں میں درج کرلیا۔ جیسا کہ اُن کا عام طریق تھا کہ جو بھی روایت انہیں اپنے کسی راوی کی طرف سے ملتی اُسے بغیر تحقیق کئے تفسیر میں درج کرلیتے۔ اس روایت کی بھی انہوں نے تحقیق نہیں کی۔ جب بعض عیسائیوں نے یہ روایت بناکر کسی معتبر نظر آنے والے انسان کے ذریعہ مسلمانوں تک پہنچائی تو مفسرین نے اپنی کتابوں میں درج کرلی۔ انہوں نے یہ نہیں سمجھا کہ درحقیقت اس روایت کے ذریعہ ابرہہ کے لئے بہانہ تلاش کیا گیا ہے اور یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اُس کا خانہ کعبہ پر حملہ ناجائز نہیں تھا بلکہ پولٹیکل وجوہ رکھتا تھا۔

اِن روایات میں سے تلیس میں پاخانہ کرنے کی روایت زیادہ معتبر کتب کی ہے اور کثرت سے ملتی ہے گرجا کے جل جانے کی روایت اس سے کم معروف ہے اور کلسوم بن صباح کے حج کی روایت اور بھی کم ہے۔ اور عقل کے بھی خلاف ہے۔ پس یہ روایت جو میرے نزدیک خود عیسائیوں نے وضع کی ہے بظاہر واقعات کے خلاف ہے۔ اور پہلی دو[۲] روایتوں میں سے ایک یا دونوں صحیح ہیں۔ بہرحال ان دونوں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ کام ایک فرد کا تھا۔ یا پھر اتفاقی طور پر گرجا کی ہتک ہوئی۔ دُوسرے ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابرہہ نے اپنا یہ مشن بنا لیا تھا کہ خانۂ کعبہ کو کمزور کردے۔ اور عرب کو کسی نہ کسی طرح اس کی طرف رجوع کرنے سے روک دے۔ پس سوال گرجا بنانے کا نہ تھا بلکہ ایک ایسا گرجا بنانے کا تھا جو خانۂ کعبہ کو دُنیا کی نظروں سے گرادے اور یہ ایک سوچی سمجھی ہوئی تدبیر مقامِ ابراہیمؑ کو مٹانے کی تھی یا دُوسرے لفظوں میں موعودِ کعبہ کی بعثت کو مشکوک و مشتبہ کرنے کی تدبیر تھی۔ اور گو یہ مضمون ابرہہ کے ذہن میں نہیں ہو سکتا تھا مگر نتیجہ یہی نکلتا تھا۔ پس اس واقعہ کو ترکی اور ترکی کہہ کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو توجہ دلانا کہ یہ واقعہ تیرے احترام اور اعزاز میں ظاہر کیا گیا ہے بالکل درست اور صحیح ہے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ درحقیقت اس واقعہ کے بیان سے خانۂ کعبہ کے اعزاز سے زیادہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعزاز کا بیان کرنا مقصود ہے۔ بہرحال ابرہہ کو غصہ آیا اور اُس نے ایک بڑا لشکر جمع کیا اور اپنے ساتھ کچھ ہاتھی بھی لے لئے، ایک ہاتھی کا نام محمود تھا بعض روایات میں ہے کہ اس کے ساتھ آٹھ ہاتھی تھے بعض میں ہے کہ بارہ تھے۔ بعض میں ہے کہ نجاشی نے محمود نامی ہاتھی اس غرض سے بھجوایا تھا مگر یہ درست نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ نجاشی کا طریق اس کے خلاف ہے، دُوسرے کہیں تاریخ میں ذکر نہیں کہ نجاشی کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تھی۔ بہرحال یہ ہاتھی ابرہہ نے مکہ والوں پر رعب ڈالنے کیلئے اپنے ساتھ لے لئے اور غرض یہ تھی کہ بجائے اس کے کہ خانۂ کعبہ کی دیواروں کو آدمی گرائیں زنجیریں باندھ کر خانۂ کعبہ کی چاروں دیواروں کو دو[۲] دو[۲]۔ تین تین ہاتھیوں سے باندھ دیا جائیگا اور ایک ہی جھٹکے میں اُسکی چاروں دیواروں کو منہدم کردیا جائیگا۔ اِس طرح عربوں پر

بہت زیادہ رعب پڑیگا اور خانۂ کعبہ کا بھی نعوذ باللہ
چند منٹ میں صفایا ہو جائے گا۔

یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنے والی ہے جو میری
اس پہلی دلیل کا مزید ثبوت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم کی بعثت سے کچھ عرصہ پہلے تمام مذاہب میں
موعود ادیان کی آمد کا بڑی شدت کے ساتھ انتظار کیا
جا رہا تھا اور عیسائیوں کو یہ خوف پیدا ہو گیا تھا کہ اگر یہ
رَو جاری رہی اور عرب میں کوئی مدعی نبوت پیدا ہو گیا تو
خانۂ کعبہ کے ذریعہ ان کو جو اتحاد حاصل ہے وہ اور بھی پختہ
ہو جائیگا اور اہل عرب میں ایسی بیداری پیدا ہو جائیگی کہ
ہو سکتا ہے عیسائی حکومت کا عرب سے خاتمہ ہو جائے اور
خود اہل عرب کی حکومت قائم ہو جائے۔ میری اس دلیل کا
ایک مزید ثبوت وہ روایت ہے جو جامع البیان میں علامہ
طبری نے لکھی ہے اور جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ
ابرہہ نے محمد بن خزاعی اور اس کے بھائی قیس بن خزاعی کو
مقرر کیا کہ وہ سارے عرب میں اعلان کریں کہ لوگ قلیس کے
حج کیلئے آیا کریں۔ اس روایت سے ظاہر ہے کہ رسول کریم
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے لوگوں نے محمد
نام رکھنا شروع کر دیا تھا اور یہ ایک ایسی بات ہے جسے
مسلمان بھی مانتے ہیں اور عیسائی بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے
چھوٹے درجہ کے جو عالم ہیں وہ تو سمجھتے ہیں کہ رسول کریم
صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے محمد نام عرب میں تھا ہی
نہیں۔ مگر جو اعلیٰ پایہ کے عالم ہیں وہ اس کے خلاف ہیں کیونکہ
تاریخوں سے ثابت ہے کہ بعض لوگوں نے اپنے بچوں کا نام
محمد رکھا ہوا تھا جیسے اسی روایت میں محمد بن خزاعی کا
ذکر آتا ہے اور یہ اکیلا نام نہیں بلکہ تاریخوں سے ایسے
پانچ نام ثابت ہیں۔ اس کی وجہ درحقیقت وہی ہے جو میں
پہلے بیان کر چکا ہوں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی
بعثت سے پہلے اہل عرب میں بھی اور یہودیوں اور عیسائیوں
میں بھی یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ عنقریب کوئی ظہور ہونیوالا
ہے۔ خود عیسائی مؤرخین نے لکھا ہے کہ اُن میں یہ روایت
تھی کہ آنے والے نبی کا نام محمدؐ ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے یہودیوں
اور عیسائیوں سے اس قسم کی پیشگوئیوں کو سن کر اُن کا
ذہن اس طرف مائل ہوا کہ جب آنے والے موعود کا نام
محمدؐ بتایا جاتا ہے تو ہم اپنے بچوں کا نام محمد کیوں نہ رکھ
دیں۔ شاید ہمارا بچہ ہی وہ موعود بن جائے جس کی آمد کا انتظار
کیا جا رہا ہے۔ عیسائی کتب سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اُنہیں
یہ ذکر تھا کہ آنیوالے موعود کا نام محمدؐ ہو گا۔ چنانچہ برنباس
کی انجیل جس کو عیسائی ہمیشہ دباتے رہے ہیں۔ اُس میں
صاف طور پر لکھا تھا کہ محمدؐ نامی ایک شخص ظاہر ہونے والا
ہے۔ پس یہ محمد نام بھی بتاتا ہے کہ اُس وقت لوگوں میں یہ
احساس پیدا ہو چکا تھا کہ آنے والا آرہا ہے اور اس کا نام
محمدؐ ہو گا۔ چنانچہ لوگ تفاؤل کے طور پر اپنے بچوں کا نام
محمد رکھنے لگ گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید ہمارا بچہ ہی وہ
خوش قسمت بچہ بن جائے جس کے متعلق تمام مذاہب میں
پیشگوئیاں پائی جاتی ہیں اور جس کی آمد کا شدت سے انتظار
کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ تاریخ سے پانچ آدمی ایسے ثابت
ہیں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے قریب زمانہ میں ہوئے
اور جن کا نام محمد تھا۔ وہ لوگ جن کا نام تو محمد تھا مگر تاریخوں
میں اُن کا ذکر نہیں اُن کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے قریب زمانہ کو
نظر انداز کرتے ہوئے ہمیں ایسی کوئی مثال نظر نہیں آتی
کہ عربوں نے اپنے بچوں کا نام محمدؐ رکھا ہو۔ اُن کا پہلے
اپنے بچوں کا نام محمد نہ رکھنا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ
وآلہ وسلم کی بعثت کے قریب زمانہ میں اُن کا نام محمد رکھنا
بتاتا ہے کہ اُس وقت اُن کے دلوں میں یہ احساس پیدا
ہو چکا تھا کہ اب وہ موعود عنقریب ظاہر ہونے والا ہے
اور لوگوں نے تفاؤل کے طور پر اپنے بیٹوں کا نام محمد رکھنا
شروع کر دیا تھا۔ بہرحال ابرہہ کو جب محمد بن خزاعی کے
مارے جانے کی خبر ملی تو اُس کا غصہ اور بھی بھڑک اُٹھا۔

اور خانۂ کعبہ کے گرانے کا اور بھی زیادہ خیال اُسے پیدا ہُوا۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ محمد بن خزاعی کا مارا جانا اُسے مکہ پر حملہ کرنے کا کوئی سیاسی حق نہیں دیتا تھا۔ کیونکہ خزاعہ قبیلہ یمن کے ماتحت نہیں تھا۔ عربوں کا اپنے کسی آدمی کو اُس کی غداری کی وجہ سے مار دینا ابرہہ کیلئے حملہ کی کوئی سیاسی وجہ پیدا نہیں کرتا۔ اپنے آدمی کو ہر قوم مار سکتی ہے گو اسکا یہ فعل ظالمانہ ہو۔ یہ ذکر میں نے اِسلئے کیا ہے کہ ممکن ہو کوئی کہدے کہ چونکہ محمد بن خزاعی کو مارا گیا تھا اس لئے ابرہہ نے اگر حملہ کیا تو سیاسی لحاظ سے یہ حملہ جائز تھا۔ میں نے بتایا ہے کہ اس کا مارا جانا بالکل اور چیز ہے یہ عرب کا باشندہ تھا اور ایک عرب نے ہی اس کو مارا تھا اور قومی طور پر نہیں ذاتی طور پر مارا تھا۔ خزاعہ قبیلہ یمن کے ماتحت نہیں تھا کہ اُسے حملہ کی کوئی سیاسی وجہ بنایا جا سکتا۔

جب ابرہہ نے لشکر جمع کرنا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس معجزے کو خاص اہمیت دینے کیلئے لوگوں کی توجہ اسکی طرف پھرا دی۔ اور عربوں میں مقابلہ کا ایک عام جوش پیدا ہو گیا۔ پہلے یمن کے لوگوں میں جوش پیدا ہُوا اور پھر انہیں دیکھ کر باقی عرب میں جوش پیدا ہو گیا۔ حمیری خاندان کے جو جرنیل زندہ تھے انہوں نے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی سیادت قائم کرنے اور دوبارہ بادشاہت حاصل کرنے کے لئے سارے عرب میں جوش پھیلانا شروع کر دیا اور اُن سے کہا کہ تم نے ہمارا ساتھ نہیں دیا تھا اب تم نے دیکھا کہ ابرہہ تمہاری قوم کو برباد کرنے اور خانۂ کعبہ کو گرانے کیلئے عرب پر حملہ کر رہا ہے اب بھی موقعہ ہے اگر تم اپنی عزت کو برقرار رکھنا چاہتے ہو تو آؤ ہم سب مل کر ابرہہ کا مقابلہ کریں۔ چنانچہ ذونفر حمیری اس تحریک کا لیڈر بنا۔ یہ یمن کا باشندہ اور رئیس اور سابق شاہی خاندان میں سے تھا اس نے خانۂ کعبہ کی حفاظت کے نام سے یمن میں ایک عام جوش پیدا کر دیا۔ اور یمن کے تمام عرب قبائل اُس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ جونہی ابرہہ صنعاء سے نکلا یہ لشکر اُس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اور دونوں لشکروں کی آپس میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان لوگوں میں بیشک مذہبی جوش تھا، قومی حمیت تھی مگر یمن کی حکومت رومی حکومت کا ایک حصہ تھی اور اسکی فوج باقاعدہ تربیت یافتہ تھی۔ بیشک ان میں بھی نظام تھا مگر ان کا نظام اور ابرہہ کی باقاعدہ فوج کا نظام ایسا ہی تھا جیسے انگریزی حکومت کے مقابلہ میں قبائلیوں کو پیش کیا جائے۔ اُن کے پاس سامان زیادہ تھا پھر وہ چھاؤنیوں میں ورزشیں کرتے رہتے تھے اور وہ ساری کی ساری فوج تنخواہ دار تھی اُن کا مقابلہ کس طرح ہو سکتا تھا چنانچہ باوجود اِس کے کہ یہ لوگ بڑی بے جگری سے لڑے اور انہوں نے اپنے مذہب کو بچانے کی کوشش کی مگر آخر شکست کھائی اور ابرہہ نے ذونفر کو قید کر لیا۔ ابرہہ ذونفر کو قتل کرنے لگا تو اُس نے کہا "میرے قتل میں تو اتنا فائدہ نہ ہو گا، اگر مجھے قید کر کے ساتھ رکھا جائے تو زیادہ فائدہ ہو گا" (ابن جریر) یہ فقرہ بظاہر معمولی نظر آتا ہے مگر اس میں ایک بہت بڑی بات پوشیدہ ہے اور وہ بات یہ ہے کہ ذونفر کو یقین تھا کہ ابھی عرب کے اور کئی قبائل ابرہہ سے لڑنے کے لئے آئیں گے۔ اور ابرہہ کے لئے مشکلات پیدا ہونگی۔ اگر میں اس کے ساتھ رہا تو اس بارہ میں کچھ کام کر سکونگا اور بعد میں اس سے نفع اٹھاؤنگا مگر زندہ رہنے سے اُسے اور کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ اُس کا یہ کہنا کہ میرے قتل میں فائدہ نہیں بلکہ قید کر کے ساتھ رکھنے میں فائدہ ہے۔ بتاتا ہے کہ ذونفر سمجھتا تھا کہ ابھی آئندہ اور کئی قبائل ابرہہ سے لڑنے کیلئے آئینگے۔ اگر مجھے زندہ رکھو گے تو درمیانی صلح کرانے والے کے طور پر مجھ سے کام لے سکتے ہو۔ اِس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ابرہہ کے اِس ارادہ سے سارے عرب میں ایک آگ لگ چکی تھی اور تمام عرب سمجھتے تھے کہ اُس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔

اِس کے بعد ابرہہ کا لشکر شمال کی طرف اور بڑھا اور بڑھتے بڑھتے خثعم قبیلہ کی زمین پر پہنچا۔ طائف اور یمن کے درمیان

اِس قبیلہ کا علاقہ ہے۔ وہاں ایک دُوسرا عرب لشکر اُس کے
مقابلہ کے لئے تیار تھا جو نفیل بن حبیب الخثعمی کی زیرِ قیادت
تھا۔ اِس لشکر میں قبیلہ خثعم کے بھی آدمی تھے اور شہران
اور ناھس کے بھی لوگ تھے۔ شہران اور ناھس بعض لوگوں
کے نزدیک خثعم کا ہی حصّہ ہیں اور بعض کے نزدیک یہ علیحدہ
قبائل تھے۔ انہوں نے بھی مل کر خانہ کعبہ کی حفاظت کے لئے
ابرہہ کا مقابلہ کیا۔ مگر پھر وہی بات ہوئی۔ یہ لوگ قبائلی
تھے جو چھٹے مہینے یا سال میں ایک دفعہ لڑنے کیلئے چلے
جاتے تھے اور وہ باقاعدہ منظم فوج تھی جو چھاؤنیوں میں
تربیت حاصل کرتی تھی اور روزانہ فوجی مشقیں اور ورزشیں
کرتی تھی۔ اُس کا اور ان کا مقابلہ ہی کیا ہو سکتا تھا۔ نہ فنونِ
جنگ کا علم رکھنے کے لحاظ سے دونوں کی کوئی نسبت تھی
اور نہ سامان کے لحاظ سے کوئی نسبت تھی۔ یہ لوگ بڑی
بے جگری سے لڑے اور ان میں سے بہت سے مارے گئے۔
اور بہت سے زخمی ہوئے مگر آخر انہوں نے بھی شکست
کھائی اور نفیل بن حبیب الخثعمی قید کر لیا گیا۔ اُسے بھی ابرہہ نے
قتل کرنا چاہا مگر جب نفیل نے کہا کہ مجھے زندہ رکھنے سے
شہران اور ناھس کے قبیلوں پر اس کا اثر بڑھ جائیگا۔ تو
اُس نے اُسے زندہ رکھا۔ اور راستہ دکھانے کے لئے
اپنے ساتھ لے لیا۔ اِس سے پتہ لگتا ہے کہ عربوں میں اُس وقت
ایمان بہت کمزور ہو چکا تھا۔ یُوں وہ بڑی دلیری سے لڑتے
تھے مگر جب اپنی جان کا سوال آ جاتا تو لالچ میں آ جاتے۔ یہی
نفیل نے کیا۔ جب اُسے قتل کیا جانے لگا تو اُس نے ابرہہ
کو اپنی خدمات پیش کر دیں اور کہا کہ آگے جنگل ہے۔ آپ کو
راستہ ملنا مشکل ہوگا۔ اگر مجھے زندہ رکھا جائے تو میں لشکر کو
خانہ کعبہ تک پہنچا دُونگا چنانچہ بادشاہ نے اُس کی اس
پیشکش کو قبول کر لیا۔ اور اُسے قید کر کے اپنے ساتھ لے
لیا۔ یہ لشکر پھر آگے بڑھا۔ جب طائف کے قریب پہنچا
تو طائف کا سردار مسعود بن مُعتّب جو ثقیف قوم میں سے
تھا (یہی قوم ہے جس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے
اپنا زمانۂ بچپن گذارا ہے۔ اور یہی قوم ہے جس سے آپ کی
وہ آخری جنگ ہوئی جسے غزوۂ حنین کہتے ہیں) ثقیف قوم
کے بڑے بڑے لوگوں کو لے کر بادشاہ کے استقبال کو نکلا
یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ لات بُت جس کا قرآن کریم میں بھی ذکر
آتا ہے اور جس کا ذکر بعض دفعہ اُردو شعراء بھی اپنے کلام میں
کر لیتے ہیں۔ اُس کا بُت خانہ اسی طائف میں تھا۔ اُس نے
آگے آکر بادشاہ سے کہا کہ اے بادشاہ ہم کو آپ سے کوئی
اختلاف نہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ طائف والے بھی
خانہ کعبہ کو مانتے تھے بلکہ حج بھی کرتے تھے مگر پھر بھی لات
کی وجہ سے انہیں خانہ کعبہ سے رقابت تھی اور وہ محسوس
کرتے تھے کہ خانہ کعبہ کی موجودگی میں ہمارا بُت خانہ لوگوں کا
مرجع نہیں بن سکتا۔ اِس کی کچھ یہ بھی وجہ تھی کہ طائف کے لوگ
بڑے مالدار تھے اور اُن کی زمین بڑی اعلیٰ درجہ کی تھی وہاں کا
انگور اور انار اتنا میٹھا اور لذیذ ہوتا ہے کہ دنیا میں اور کہیں
اُس قسم کا انگور اور انار نہیں ملتا۔ یورپ کے لوگ اٹلی کے انگور
کو سب سے بہتر سمجھتے ہیں مگر میں نے سفر یورپ میں اٹلی کا
انگور بھی کھایا ہے اور طائف کا انگور بھی میں کھا چکا ہوں
میں سمجھتا ہوں اگر طائف کے انگور کو میں سو نمبر دوں تو اٹلی
کے انگور کو میں صرف دس نمبر دے سکتا ہوں۔ طائف
کے مقابلہ میں اٹلی کے انگور کی کوئی نسبت ہی نہیں۔ انار
بھی میں نے کسی جگہ کا اتنا میٹھا نہیں دیکھا جس کو کھا کے
مُنہ میٹھے سے بھر جائے لیکن طائف کا انار ایسا ہے کہ
اُس کے کھانے سے مُنہ میٹھے سے بھر جاتا ہے۔ بہت ہی
تیز مٹھاس اُس میں ہوتی ہے پس چونکہ وہ مالدار تھے اور
پھر لات کا بُت خانہ بھی طائف میں تھا۔ اس لئے وہ مکّہ
والوں سے رقابت رکھتے تھے اور ان کو یہ خیال رہتا تھا کہ
ہمارا مندر کیوں اتنا بڑا نہیں سمجھا جاتا جتنا خانہ کعبہ سمجھا
جاتا ہے۔ چنانچہ باوجود اسکے کہ وہ حج کرنے کے لئے بھی
جاتے تھے اُن کی کوشش رہتی تھی کہ لات کے مندر کا رتبہ
کسی طرح خانہ کعبہ سے زیادہ ہو جائے یا کم از کم خانہ کعبہ

کے برابر ہوجائے۔ اب جو انہوں نے ابرہہ کو آتے دیکھا۔ تو اُن کی رقابت جوش میں آگئی اور انہوں نے سمجھا کہ ابرہہ خانۂ کعبہ کو گرا دیگا تو لات کے مندر کی طرف لوگوں کی توجہ بڑھ جائیگی۔ چنانچہ جب ابرہہ آیا تو مسعود بن معتب اس کے اِستقبال کو نکلا اور اُس نے ابرہہ سے کہا کہ ہم کو آپ سے کوئی اختلاف نہیں اور نہ ہمیں خانۂ کعبہ سے کوئی ہمدردی ہے اور ہم تو آپ کے مطیع اور فرمانبردار ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ایک آدمی کر دیتے ہیں جو آپ کو سیدھا مکہ تک لے جائے۔ کیونکہ آگے وادیاں زیادہ خطرناک ہیں ممکن ہے لشکر بھٹک جائے اور وہ مکہ تک نہ پہنچ سکے۔ اِس کے ساتھ ہی اُس نے اپنے جذباتِ عقیدت کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے گرجا کو کچھ نہ کہیئے۔ وہ تو کسی اور گرجا کو گرانے کیلئے نکلا ہی نہیں تھا وہ تو صرف خانۂ کعبہ کو گرانے کے لئے نکلا تھا۔ کیونکہ اُس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو چکا تھا کہ خانۂ کعبہ عرب کو عیسائیت کی طرف لانے میں مخل ہے۔ جب اُس نے اپنے گرجے کا ذکر کیا کہ اُسے کچھ نہ کہا جائے تو ابرہہ نے اسکی بات فوراً مان لی بلکہ اُسے کچھ انعام بھی دیا۔ اُس نے ابورغال نامی ایک شخص کو راستہ دکھلانے کے لئے ابرہہ کے ساتھ روانہ کیا۔ جب لشکر مغمس نامی مقام پر پہنچا جو مکہ کے بالکل قریب ہے تو وہاں ابورغال مرگیا اور اُسکی قبر وہاں بنائی گئی۔ عرب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک بلکہ بعد میں بھی (میں کہہ نہیں سکتا کہ اب وہ قبر ہے یا نہیں مجھے ذاتی طور پر اس کا کوئی علم نہیں) جب بھی اس قبر کے پاس سے گذرتے تو اُسے پتھر مارتے یہ ظاہر کرنے کیلئے کہ یہ لعنتی آدمی ہے۔ جس نے اپنے مذہب اور قوم سے غداری کرکے ابرہہ اور اُس کے لشکر کو راستہ دکھایا۔

ابرہہ کا لشکر کہاں تک پہنچا۔ اور آیا وہ مغمس مقام سے بھی آگے بڑھا ہے یا نہیں، اس کے متعلق تاریخوں میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک وہ حدودِ حرم سے باہر ہی رہا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ عرفات تک پہنچا۔ اِس طرح مکہ سے وہ گیارہ بارہ میل تک پہنچ گیا تھا۔ بعض اسے اور بھی قریب بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابرہہ اور اس کا لشکر مزدلفہ کے قریب تک پہنچ گیا تھا۔ اس لحاظ سے مکہ سے وہ صرف سات آٹھ میل دُور رہا۔ بہرحال مغمس تک تو ساری تاریخیں متفق ہیں اور بتاتی ہیں کہ وہاں تک ضرور پہنچا۔ اور مغمس کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ پندرہ سولہ میل کا ہوگا۔

سنن ابی داؤد کی روایت ہے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جب طائف کی طرف گئے (غزوۂ حنین کے موقعہ پر) تو ہم ایک قبر کے پاس سے گذرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قبر کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ ابورغال کی قبر ہے جو ثقیف بھی کہلاتا تھا اور ثمود قوم میں سے تھا۔ یہ مکہ کی حفاظت کیلئے آیا تھا۔ جب واپس اپنے شہر کی طرف گیا۔ تو وہی عذاب جو اس کی قوم کو پہنچا تھا اُسے بھی پہنچا اور وہ مرگیا اور اِس جگہ دفن ہوُا۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابورغال ابرہہ کا راہنما نہ تھا بلکہ مکہ کے محافظین میں سے تھا۔ کیونکہ آپؐ فرماتے ہیں یہ مکہ کی حفاظت کے لئے آیا تھا۔ لیکن دُوسری روایت بتاتی ہے کہ وہ ابرہہ کو راستہ دکھانے آیا تھا۔ یہ دونوں روایتیں بظاہر بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں کیونکہ ایک روایت تو اُسے خانۂ کعبہ کا دشمن بتاتی ہے اور تاریخ سے بھی ثابت ہے کہ عرب اُسکی قبر کو پتھر مارا کرتے تھے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں کہ ابورغال مکہ کی حفاظت کیلئے آیا تھا۔ اِسپر بعض نے تو کہا ہے کہ ان میں سے صرف ایک روایت صحیح ہے۔ چنانچہ وہ سنن ابی داؤد میں بیان شدہ روایت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں اور دُوسری روایت کو غلط بتلاتے ہیں۔ لیکن بعض کہتے ہیں کہ دُوسری روایت بھی تاریخی لحاظ سے اس قدر یقینی ہے کہ ہم اسے غلط نہیں کہہ سکتے۔ اس مشکل کا حل مفسرین نے اِس طرح کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں۔

یہ دو الگ الگ شخص تھے مگر دونوں کا نام ایک تھا۔ ایک ابورغال وہ تھا جو مکّہ کی حفاظت کے لئے آیا تھا اور ایک ابورغال وہ تھا جو ابرہہ کا راہنما بن کر آیا تھا۔ پس قبریں بھی دو الگ الگ تھیں۔ اگر الگ الگ نہ ہوتیں تو قبر دکھاتے وقت جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ یہ مکّہ کا محافظ تھا تو اہلِ عرب آپ سے یہ نہ پوچھتے کہ یا رسول اللہ اس کو تو ہم پتھر مارا کرتے ہیں اور اسے باغی اور غدّار سمجھتے ہیں اور آپ اِسے محافظِ کعبہ قرار دے رہے ہیں؟ پس معلوم ہوا کہ یہ قبر کسی دوسرے ابورغال کی تھی اسی لئے آپ سے کسی نے یہ سوال نہیں کیا کہ یا رسول اللہ آپ یہ کیا فرما رہے ہیں؟ ایک ابورغال ابرہہ کے ساتھ آیا اور مر گیا اور ایک ابورغال وہ تھا جس نے حفاظتِ کعبہ میں حصّہ لیا اور بعد میں مرا۔ یہ بھی ثبوت ہے اِس بات کا کہ یہ اَور ابورغال تھا۔ وہ ابورغال تو ابھی عذاب آیا ہی نہیں تھا کہ مر گیا تھا اور یہ ابورغال عذاب آنے کے بعد مرا میں سمجھتا ہوں مغمّس میں پہنچتے ہی ابورغال کی جو موت واقعہ ہو گئی اِس کی وجہ یہ تھی کہ آخر اُن کے دلوں میں کچھ نہ کچھ تو ایمان تھا اور وہ خانۂ کعبہ کو مقدّس تسلیم کرتے تھے جب وہ راہنما بن کر نکلا تو اُس کے دل پر قدرتی طور پر اس کا بوجھ پڑا کہ میں کیسی غدّاری کر رہا ہوں اور اُس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ پس ابورغال دو تھے ایک ابورغال حفاظتِ کعبہ کیلئے مکّہ میں رہا اور جب واپس اپنی قوم کی خبر لینے کے لئے گیا تو اُسی بیماری کا شکار ہو گیا جو اصحاب فیل اور اُس کی قوم میں پھوٹ پڑی تھی اور دوسرا ابورغال وہ تھا جو ابرہہ کے لشکر کے ساتھ اُس کا راہنما بن کر آیا اور کسی وجہ سے رستہ میں ہی مر گیا۔ میرے خیال میں اُس کا ہارٹ فیل ہو گیا کیونکہ اُس کے دل پر اپنی غدّاری کا ایسا بوجھ پڑا کہ وہ اُس کی برداشت نہ کر سکا اور موت کا شکار ہو گیا۔

جب مغمّس مقام پر ابرہہ کا لشکر پہنچا تو اُس نے اسود بن مقصود حبشی کو روانہ کیا کہ وہ کچھ فوج اپنے ساتھ لے جائے اور مکّہ کا حال معلوم کر کے آئے۔ اِس نام سے بھی پتہ لگتا ہے کہ حبشہ کی زبان اُس وقت بہت کچھ عربی زبان سے ملتی جلتی تھی۔ مَیں نے بتایا تھا کہ حبشی زبان ایک طرح عربی کی ایک شاخ تھی جس طرح کہ عبرانی زبان عربی کی شاخ ہے۔ عربی اور حبشی زبان کے بہت سے الفاظ آپس میں ملتے ہیں اور کثرت کے ساتھ ان میں سے ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ نام بھی بہت کچھ ملتے جلتے ہیں چنانچہ اِسی اسود بن مقصود نام کو دیکھ لو مقصود عربی نام ہے۔ اِسی طرح ابرہہ اور یکسوم کا وزن عربی اوزان میں سے ہے اب بھی اِن دونوں زبانوں میں بہت کچھ مشارکت پائی جاتی ہے لیکن اُس زمانہ میں تو یہ مشارکت بہت بڑھی ہوئی تھی اصل میں حبش کے حاکم لوگ عربی بالنسل تھے اور موجودہ شاہی خاندان بھی اسی عربی نسل میں سے ہے اِسی وجہ سے یہ دونوں زبانیں آپس میں ملتی جلتی ہیں۔

بہرحال اُس نے اسود بن مقصود حبشی کو کچھ فوج دیکر روانہ کیا تاکہ وہ مکّہ کا حال معلوم کر کے واپس آئے۔ وہ فوج کا ایک دستہ لے کر مکّہ کے قریب پہنچا۔ مکّہ کے اِردگرد بہت سی وادیاں ہیں جن میں جانور چرتے رہتے ہیں۔ اُس نے مکّہ والوں کے جانور اِن وادیوں میں چرتے دیکھے جب وہ ضروری معلومات حاصل کر چکا تو آتی دفعہ وہاں جانوروں کو بھی ہانک کر اپنے ساتھ لے آیا۔ مکّہ والوں کی بڑی جائیداد اُونٹ تھی۔ گھوڑا عرب میں بہت کم ہوتا ہے ۱۹۱۲ء میں جب مَیں حج کے لئے گیا تو سارے مکّہ میں صرف تین چار گھوڑے تھے اب مَیں نہیں کہہ سکتا کہ وہاں کیا حالت ہے۔ عرب کا گھوڑا جو دنیا میں مشہور ہے وہ مشرق کے علاقہ میں ہوتا ہے یعنی نجد اور اُس کے اطراف میں۔ شام وغیرہ میں بھی لوگ گھوڑے رکھتے ہیں لیکن حجاز میں گھوڑے کا بہت کم رواج ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں چارہ نہیں ہوتا۔ اُونٹ تو درختوں کے پتے اور کانٹے وغیرہ کھا لیتا ہے مگر گھوڑا یہ چیزیں نہیں کھا سکتا اِس لئے عرب کی بڑی جائیداد اونٹ ہی ہوتی ہے

اور پُرانے زمانہ میں بھی یہی اُن کی جائیداد تھی۔ جس طرح ہمارے ملک میں رواج ہے کہ وہ ایک آدمی کو اس غرض کے لئے مقرر کر دیتے ہیں کہ وہ جانوروں کو باقاعدہ باہر لے جائے اور پھر گھروں میں شام کو واپس لے آئے اور ماہوار اُسے کچھ رقم دے دیتے ہیں یہی دستور مکہ میں بھی تھا۔ لیکن اُونٹوں کے متعلق یہ دستور ہے کہ اُنہیں روزانہ شام کو واپس نہیں لاتے بلکہ چھ چھ سات سات دن یا اس سے بھی زیادہ باہر رکھتے ہیں البتہ کبھی کبھی وہ مالک کو دکھلانے کے لئے لے بھی آتے ہیں۔ مکہ سے دو دو تین تین منزل پر جہاں کچھ درخت اور کانٹے وغیرہ ہیں وہ اپنے جانور بھیج دیتے تھے۔ اسی دستور کے مطابق اُس روز بھی مکہ والوں کے جانور باہر گئے ہوئے تھے جب اسود حالات معلوم کر کے واپس آنے لگا تو وہ اُن اُونٹوں کو بھی ہانک لایا۔ اِن میں حضرت عبدالمطلب کے بھی دو سو اُونٹ تھے۔ جب یہ لوگ خبر رسانی کے لئے مکہ کے قریب آئے اور اُنہوں نے حالات معلوم کئے تو مکہ والوں نے سمجھ لیا کہ اب حملہ سر پر پہنچ گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک اجتماع کیا جس میں کنانہ ھذیل اور قریش کے بڑے بڑے سردار جمع ہوئے اور انہوں نے غور کرنا شروع کیا کہ ہمیں ابرہہ کا مقابلہ کرنا چاہیئے یا نہیں۔ کنانہ وہ قوم ہے جس میں سے قریش نکلے ہیں۔ صرف قریش ہی بنو اسمٰعیل نہیں بنو اسمٰعیل تمام عرب میں پھیلے ہوئے تھے۔ قریش صرف کنانہ کے ایک بیٹے کی نسل کا نام ہے۔ بہرحال قریش نے اور ھذیل اور کنانہ کے سرداروں نے مل کر مشورہ کیا اور غور کیا کہ کس طرح مقابلہ کیا جائے۔ مشورہ میں ہر ایک کی رائے یہی تھی کہ ہم میں لڑنے کی طاقت ہی نہیں اس لئے مقابلہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔ میں بتا چکا ہوں کہ ابرہہ اس لئے نہیں آیا تھا کہ وہ عربوں کو کوئی تکلیف پہنچائے یا مکہ والوں کو کوئی سزا دے اُس کی غرض صرف یہی تھی کہ خانہ کعبہ کو گرا دے اور عربوں کی توجہ اس مرکز کی طرف نہ رہے اِس کے بعد یا تو اُن کی توجہ صنعاء کی طرف پھر جائے یا وہ پراگندہ ہو جائیں۔ اُن کے اکٹھے ہونے کی کوئی صورت نہ رہے اُس نے اِسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک خاص آدمی مکہ والوں کی طرف بھجوایا جو حمیری قبیلہ کا تھا اور جس کا نام حناطہ تھا اور اُس کے ذریعہ یہ پیغام بھجوایا کہ میں صرف خانہ کعبہ کو گرانے کے لئے آیا ہوں تم لوگوں کو کسی قسم کی گزند پہنچانا میرا ارادہ نہیں اور چونکہ مکہ والوں سے میری کوئی دشمنی نہیں اِس لئے میں نہیں چاہتا کہ تم خواہ مخواہ اپنی جانیں ضائع کرو۔ تم اگر ایک طرف ہو جاؤ اور مجھے خانہ کعبہ کو گرا لینے دو تو تم میرے بھائی ہو مجھے تم سے کسی قسم کا جھگڑا مطلوب نہیں۔ یہ سردار جب مکہ پہنچا تو اُس نے دریافت کیا کہ مکہ کا سردار آج کل کون ہے۔ لوگوں نے حضرت عبدالمطلب کا نام لیا کہ وہ سردار ہیں وہ حضرت عبدالمطلب کے پاس گیا اور اُن کو ابرہہ کا پیغام دیا انہوں نے جواب میں کہا کہ اگر اُس کی ہم سے لڑنے کی نیت نہیں تو ہماری بھی اُس سے لڑنے کی نیت نہیں۔ پھر انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ اللہ تعالےٰ کی قسم ہم ہرگز ابرہہ سے لڑائی کرنا نہیں چاہتے۔ اور سچائی سے کام لیتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ ہم نے غور کر کے فیصلہ کر دیا ہے کہ ہم میں لڑائی کی طاقت نہیں اِس لئے مقابلہ نہ کیا جائے۔ ابرہہ جو فوج اپنے ساتھ لایا تھا اُس کے متعلق بعض کہتے ہیں کہ اُس کی ۶۰ ہزار کی تعداد تھی اور بعض بیس ہزار بتاتے ہیں گویا ایک پورا ڈویژن وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور اتنی بڑی فوج سے تو بعض دفعہ ایک ملک کا ملک فتح کر لیا جاتا ہے۔ جب محمد بن قاسم ہندوستان میں آئے تو اُن کے ساتھ صرف تین ہزار آدمی تھے۔ پس چونکہ ابرہہ ایک بھاری فوج لے کر آیا تھا انہوں نے کہا کہ ہم کسی احسان کے اظہار کے لئے نہیں بلکہ امر واقعہ کے طور پر کہتے ہیں کہ ہم میں اُس سے لڑنے کی طاقت نہیں باقی یہ گھر جسے ہم مانتے ہیں اِس کے متعلق ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ خدا کا گھر ہے اور اللہ تعالےٰ نے اِس کی حفاظت کا وعدہ کیا ہوا ہے اور ہم یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ جو اللہ تعالےٰ کے دوست اور اُس کے نبی اور اُس کے

پیارے تھے انہوں نے اس گھر کو بنایا تھا پس ہم اپنے متعلق تو اقرار کرتے ہیں کہ ہم لڑنا نہیں چاہتے لیکن ہم یہ بھی کہدینا چاہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ اس گھر کو بچانا چاہے تو یہ گھر اُس کا ہے اور اس کا ادب اور احترام اُس کے ذمہ ہے۔ پس اگر اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت نہ ہو کہ وہ اِس گھر کی حفاظت کرے بلکہ وہ چاہتا ہو کہ اس گھر کو چھوڑ دے اور ابرہہ کے لشکر کو اجازت دیدے کہ وہ اِس گھر کو توڑ دے تو اِس گھر کو بچانے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ اِس پر حیاطہ نے کہا کہ اگر آپ لوگ لڑنا نہیں چاہتے تو بہتر ہے کہ آپ میرے ساتھ چلیں، ابرہہ نے بھی خواہش کی تھی کہ میں مکہ کے کسی رئیس کو اپنے ساتھ لاؤں آپ میرے ساتھ چل کر ابرہہ پر یہ روشن کر دیں کہ آپ کا ارادہ کسی قسم کی لڑائی کا نہیں اس سے ابرہہ کا دل ٹھنڈا ہو جائے گا اور ممکن ہے وہ خانہ کعبہ کو گرانے کا ارادہ ترک کر دے۔ اِس پر حضرت عبد المطلب نے اپنے لڑکوں اور بعض رؤوسا کو ساتھ لیا اور ابرہہ سے ملنے کیلئے مغمس مقام پر پہنچے۔ چونکہ عرب کے لوگ جیسا کہ اگلی سورۃ میں ذکر آئے گا اکثر سفر کرتے رہتے تھے۔ بعض یمن کیطرف جاتے تھے، بعض شام کیطرف جاتے تھے، بعض حبشہ کیطرف جاتے تھے، بعض عراق کیطرف جاتے تھے۔ اِس لئے اِن علاقوں کے رہنے والے لوگوں کے ساتھ اُن کی دوستیاں اور تعلقات تھے انہی سفروں کی وجہ سے حضرت عبد المطلب کے بھی ذونفر حمیری کے ساتھ تعلقات تھے جو دوستانہ حد تک پہنچے ہوئے تھے۔ جب باتوں باتوں میں انہیں حیاطہ سے معلوم ہوا کہ ذونفر نے بھی مکہ کے بچانے کے لئے ایک لشکر جمع کیا تھا اور ابرہہ کے ساتھ لڑائی بھی کی تھی جس میں اُسے شکست ہوئی اور وہ قید کر لیا گیا اور اب بھی وہ ابرہہ کے ساتھ ہی ہے تو حضرت عبد المطلب کو خیال آیا کہ میں پہلے ذونفر سے ملونگا وہ یمن کا رہنے والا ہے اور بادشاہ کی عادات اور حبشہ قوم کے خصائل سے اچھی طرح واقف ہے ممکن ہے وہ اِس بارہ میں مجھے کوئی مفید مشورہ دے سکے۔ چنانچہ جب کیمپ میں پہنچے تو انہوں نے پتہ لیا کہ ذونفر کہاں ہے۔ وہ بے شک قید تھا مگر اُس زمانہ کی قید اس طرح نہیں ہوتی تھی کہ مجرموں کو کوٹھڑیوں میں بند رکھا جاتا بلکہ صرف اُن کی نگرانی ہوتی تھی جیسے آج کل نظر بندوں کی نگرانی کی جاتی ہے۔ حضرت عبد المطلب لوگوں سے پتہ دریافت کرتے ہوئے ذونفر کے پاس پہنچے اور اُس سے کہا کہ ذونفر تم کو کعبہ اور کعبہ والوں کی کوئی پروا نہیں یعنی اگر تمہارے دل میں کعبہ کی محبت ہوتی یا ہماری دوستی کا تمہیں کچھ پاس ہوتا تو تم کوشش کرتے کہ یہ حملہ ٹل جائے ذونفر نے جواب میں کہا کہ ایک قیدی جسے یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ شام تک زندہ رہے گا یا نہیں اور جسے شام کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ صبح تک زندہ رہے گا یا نہیں، اُس کی پروا یا عدم پروا کا سوال ہی کیا ہو سکتا ہے؟ میں تو اِس وقت کلی طور پر بادشاہ کے رحم پر ہوں۔ وہ چاہے تو شام کو قتل کروا دے اور چاہے تو صبح کو قتل کروا دے۔ باقی جو کچھ میں کر سکتا تھا وہ میں نے کیا۔ ابرہہ سے میں نے لڑائی بھی کی مگر مجھے شکست ہوئی اور میں قید ہو گیا۔ اب میری رائے کا کیا سوال ہے۔ اور میں اِس بارہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ میرے دل کی تو یہی خواہش ہے کہ تم لوگ بچو مگر یہ میرے بس کی بات نہیں ہاں میں نے قید کے زمانہ میں شاہی ہاتھی کے مہاوت انیس نامی سے دوستی پیدا کر لی ہے وہ میرا ادب اور احترام بھی کرتا ہے اگر آپ چاہیں تو میں اُس مہاوت سے آپ کو ملوا دیتا ہوں اور اُس سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ موقع ملنے پر وہ آپ لوگوں کے متعلق کوئی نیک بات بادشاہ کے کان میں ڈال دے۔ پُرانے زمانہ میں یہ ایک عام دستور تھا اور ہندوستان میں بھی یہ دستور ایک لمبے عرصہ تک رہا ہے کہ بادشاہ اپنے نوکروں کی بات بہت کچھ مانتے تھے اور اُن کی بات کو رد کرنا شان کبریائی کے خلاف سمجھتے تھے معلوم ہوتا ہے اُن میں بھی یہی رواج تھا۔ انیس چونکہ بادشاہ کا مُنہ چڑھا نوکر تھا اور گو مہاوت کا عہدہ بھی بڑا بھاری عہدہ ہوتا ہے کیونکہ مہاوت پر بہت بڑی ذمہ واری ہوتی ہے اور

بادشاہ کی جان کی حفاظت اُس کے ذمہ ہوتی ہے مگر بہرحال یہ عہدہ ویسا تو نہیں جیسے کرنیل یا جرنیل کا عہدہ ہوتا ہے اُس کی حیثیت ایک بڑے شافر جیسی سمجھنی چاہیئے مگر چونکہ اُس کی بات سُنی جاتی تھی اس لئے ذونفر نے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو مَیں انیس سے آپ کی ملاقات کرا دوں۔ حضرت عبدالمطلب کو اُس وقت کوئی راہ نظر نہ آتی تھی آپ نے اُس کی بات کو بھی خوشی سے قبول کیا۔ اِس پر ذونفر نے انیس کو بلوا بھیجا اور اُس سے کہا کہ عبدالمطلب قریش کے سردار ہیں اور غریبوں کا خاص خیال رکھنے والے ہیں۔ انسان چھوڑ جانوروں تک کو کھانا کھلاتے ہیں اِن کے دوسو اونٹ شاہی سوار پکڑ کر لے آئے ہیں۔ اِن کو بادشاہ سے ملوا سکو اور کوئی نیک سفارش اِن کے متعلق کر سکو تو کوشش کرو۔ اس نے کہا بہتر ہے اور وہ حضرت عبدالمطلب کو اپنے ساتھ لے گیا۔ پُرانے زمانہ میں یہ طریق تھا کہ جب جانور وغیرہ ذبح کئے جاتے تو لوگ اُن کا کچھ حصہ چیلوں اور کتّوں کے لئے بھی رکھ لیتے تھے۔ اب بھی بعض لوگ ایسا کرتے ہیں۔ اُن کے اِسی وصف کی طرف اُس وقت ذونفر نے اشارہ کیا اور کہا کہ یہ انسانوں کا بھی خیال رکھتے ہیں اور دوسرے جانوروں کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ وہ اُنہیں اپنے ساتھ لے گیا اور شاہی خیمہ کے دروازہ کے پاس جا کر اُس نے کہا حضور اجازت دیں عبدالمطلب، جو مکّہ کے رئیس ہیں وہ آپ سے ملنے کیلئے آئے ہیں۔ پھر اُس نے وہی بات دُہرائی جو ذونفر نے کہی تھی کہ یہ بڑے محسن ہیں تمام انسانوں اور غریبوں کی خوراک کا خیال رکھتے ہیں بلکہ وحشی جانوروں تک کی غذا کا اہتمام کرتے ہیں اور پھر یہ فقرہ بھی بڑھا دیا کہ حضور انکی طرف نظرِ التفات رکھیں بادشاہ نے انہیں اندر آنے کی اجازت دے دی۔ حضرت عبدالمطلب بڑے مضبوط، قوی الجثہ، لمبے قد والے اونچے چکلے جسم والے اور سفید رنگ کے انسان تھے جب آپ خیمۂ دربار میں داخل ہوئے اور ابرہہ نے اپنے سامنے ایک نہایت وجیہہ خوبصورت، چوڑے چکلے جسم والا قد آور اور مضبوط انسان پایا تو وہ آپ کی شکل اور قدو قامت کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ (حبشہ کے لوگوں کا قد چھوٹا ہوتا ہے) چنانچہ آپکے داخل ہوتے ہی وہ کھڑا ہوگیا۔ اِس کے بعد اُس نے پہلے تو یہ چاہا کہ آپ کو اپنے ساتھ ہی تخت پر بٹھالے مگر پھر خیال آیا کہ اگر میں نے انہیں اپنے ساتھ تخت پر بٹھالیا تو حبشی قوم ناراض ہو جائے گی کہ شاہی مقام کی بے حرمتی کی گئی ہے مگر وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ آپ کو نیچے بٹھائے اور خود اونچا بیٹھا رہے۔ آخر خیمہ میں جو قالین بچھا ہُوا تھا اُس پر وہ خود بھی بیٹھ گیا اور حضرت عبدالمطلب کو بھی اُس نے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور ترجمان کو بُلا کر کہا کہ اِن سے کہو کہ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کے آنے کی کیا غرض ہے اور آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ ترجمان نے اُن سے کہا کہ بادشاہ سلامت کہتے ہیں مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے اور وہ دریافت کرتے ہیں کہ آپ کس غرض کیلئے آئے ہیں؟ حضرت عبدالمطلب نے ترجمان سے کہا کہ بادشاہ سے کہو آپ کے آدمی میرے دوسو اونٹ پکڑ کر لے آئے ہیں وہ مجھے واپس کر دیئے جائیں جب اس جواب کا ترجمہ کر کے ابرہہ کو سنایا گیا تو اُس نے ترجمان سے کہا کہ ان سے کہو جب مَیں نے آپ کی شکل دیکھی تھی تو مَیں بہت ہی متاثر ہوا تھا اور مَیں سمجھتا تھا کہ آپ بڑے عقلمند، لائق اور تجربہ کار انسان ہیں۔ اسی لئے میں آپ سے ملنے کے لئے تخت سے نیچے اُتر آیا۔ مگر اب جو میں نے آپکی بات سُنی ہے تو میرے دل سے وہ سب اثر جاتا رہا ہے۔ آپ نے سُنا ہوگا کہ میں ایک بڑی فوج لے کر اس لئے آیا ہوں کہ اُس مقام کو جو آپ کے اور آپ کے باپ دادوں کا عبادتگاہ ہے گرادوں۔ مَیں مانتا یا نہ مانتا لیکن اُس حسن ظنی کی وجہ سے جو مجھے آپ پر تھی میں یقین رکھتا تھا کہ آپ میرے سامنے یہی بات پیش کریں گے کہ ہمارے مقدس مذہبی مقام کو چھوڑ دو اور چلے جاؤ۔ مگر آپ نے اُس کا ذکر تک نہیں کیا حالانکہ وہ آپ کی عبادت گاہ ہے اور نہ صرف آپکی عبادت گاہ ہے بلکہ

آپ کے باپ دادا کی بھی یہی عبادت گاہ رہی ہے۔ آپ نے میرے پوچھنے پر اگر ذکر کیا تو یہ کہ میرے دوسو اونٹ واپس کر دئے جائیں بھلا یہ بھی کوئی اونٹوں کے ذکر کرنے کا موقع تھا۔ پس مجھے تعجب ہے کہ آپ نے اُن دوسو اونٹوں کا تو ذکر کیا جو آپ کی ملکیت تھے اور جن کو میرے آدمی لے آئے تھے مگر اُس گھر کو بھول گئے جس سے آپ کا اور آپ کے باپ دادوں کا دین وابستہ ہے۔ حضرت عبدالمطلب نے جب یہ بات سُنی تو ترجمان سے کہا کہ اپنے بادشاہ سے کہہ دو۔ اُونٹوں کا مالک مَیں ہوں اور میں نے آپ سے جو اُونٹ مانگے ہیں یہی بتانے کے لئے مانگے ہیں کہ وہ اُونٹ میرے ہیں اور میرے دل میں اُن کا درد ہے۔ اگر خانہ کعبہ بھی کسی کا گھر ہے تو اُس کے دل میں بھی اُس کا درد ہوگا۔ پس میرا مطالبہ غلط نہیں بلکہ مَیں نے اپنے اونٹوں کا مطالبہ کرکے آپ کو یہ بتایا ہے کہ اگر ہمارا عقیدہ اس گھر کے متعلق صحیح ہے تو پھر آپ اس گھر پر حملہ کرکے نہیں بچیںگے۔ کیونکہ اگر مجھے اونٹوں کی فکر ہے تو کیا کعبہ جس کا گھر ہے اُسے یہ فکر نہیں ہوگی کہ وہ اِسے آپ کے حملہ سے بچائے؟ باقی ہر انسان اپنی طاقت کے مطابق کام کرتا ہے۔ اگر ہم لڑکر مارے جائیں اور آپ پھر بھی اس گھر کو گرا دیں تو ہمارے لڑنے کا فائدہ کیا ہے اور اگر خدا نے اِس گھر کو بچانا ہے تو ہمیں لڑائی کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ جس کا یہ گھر ہے وہ خود اِس کی حفاظت کریگا۔ ابرہہ یہ جواب سُنکر مبہوت سا ہوگیا۔ مگر اُس نے کہا مجھے اِس کام سے اب کوئی روک نہیں سکتا۔ حضرت عبدالمطلب نے کہا تو پھر آپ اور اِس گھر والا آپس میں سمجھ لیں مجھے میرے اُونٹ واپس دے دئے جائیں۔ اِس پر ابرہہ نے اونٹوں کی واپسی کا حکم دے دیا اور حضرت عبدالمطلب کے اونٹ اُنہیں واپس دے دئے گئے۔

مَیں بتا چکا ہوں کہ اُس وقت حضرت عبدالمطلب کے ساتھ آپ کے بیٹوں کے علاوہ جو پہرہ دار کے طور پر گئے تھے بعض اور رؤوسا بھی تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ یعمر بن نفاثہ بنو کنانہ کے سردار اور خویلد بن واثلہ ہذیل کے سردار آپ کے ساتھ تھے۔ حضرت عبدالمطلب پر تصوّف کا رنگ غالب تھا اور اِس رنگ میں انہوں نے ابرہہ سے بات کی۔ مگر دوسرے سیاسی ٹائپ کے آدمی تھے اور چاہتے تھے کہ اُنہیں بھی ابرہہ سے بات کرنے کا موقع ملے۔ جب حضرت عبدالمطلب بات کر چکے تو یعمر بن نفاثہ اور خویلد بن واثلہ نے کہا کہ ہم بھی کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا تو انہوں نے کہا تہامہ وادی یعنی مکّہ اور اُس کے ارد گرد جس قدر علاقہ ہے اُس تمام علاقہ کی طرف سے ہم یہ پیشکش لے کر آئے ہیں کہ آپ اس تمام علاقہ کے مال و دولت۔ مکانات۔ اونٹوں۔ بکریوں۔ گھر کے اثاثہ اور دوسری تمام چیزوں کی قیمت لگوا لیں اور اس تمام قیمت کا ۱/۳ آپ لے لیں اور ۲/۳ ہمارے پاس رہنے دیں ہماری درخواست صرف اس قدر ہے کہ آپ خانہ کعبہ کو کچھ نہ کہیں اور اُس کے گرانے کا ارادہ ترک کر دیں۔ بادشاہ نے کہا نہیں میں تو خانہ کعبہ کو ہی گرانے کے لئے آیا ہوں مجھے تمہارے مال کی ضرورت نہیں۔ اِس پر یہ لوگ وہاں سے کہ لوٹ آئے۔ مکّہ واپس آنے پر حضرت عبدالمطلب نے تمام لوگوں کو جمع کیا اور ابرہہ سے اُن کی جو ملاقات ہوئی تھی اُس کے حالات سُنائے اور یہ بھی بتایا کہ ہم لوگوں نے اُس کے سامنے یہ تجویز بھی رکھی تھی کہ وہ تہامہ کے تمام اموال کا تیسرا حصہ لے اور خانہ کعبہ کو چھوڑ دے۔ مگر اُس نے اِس تجویز کو ماننے سے بھی انکار کر دیا ہے یہ حالات بتا کر اُنہوں نے کہا اب ابرہہ کا خانہ کعبہ پر حملہ کرنا یقینی ہے مگر ظاہر ہے کہ ہمارے پاس نہ لشکر ہے اور نہ اُس کے مقابلہ کا کوئی سامان ہے۔ اِس لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ تم سب لوگ اس شہر کو چھوڑ دو اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر ڈیرے لگا لو تاکہ جو کچھ ابرہہ نے کرنا ہے وہ کرلے یا جو کچھ خدا نے کرنا ہے وہ ظاہر ہو جائے اس کے بعد ہم مکّہ میں

واپس آجائیں گے۔ یہ کہہ کر حضرت عبدالمطلب کچھ قریش دوستوں کے ساتھ خانہ کعبہ کے پاس آئے۔ دل میں رقت تھی، سوز تھا، درد تھا۔ خانہ کعبہ کے دروازہ کا حلقہ جس کو پکڑ کر دروازہ کھولتے ہیں اُسے انہوں نے اپنے ہاتھ میں لیا اور اللہ تعالیٰ سے نہایت سوز کے ساتھ دعا کرتے ہوئے یہ شعر کہے ؎

لَاهُمَّ إِنَّ الْعَبْدَ يَمْنَعُ ۔ رَحْلَهُ فَامْنَعْ حَلَالَكَ
لَا يَغْلِبَنَّ صَلِيبُهُمْ ۔ وَمِحَالُهُمْ غَدْوًا مِحَالَكَ

لَاهُمَّ یہ دراصل اَللّٰهُمَّ ہے۔ عربی میں دستور ہے کہ بعض دفعہ شعری ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اَللّٰهُمَّ کا اَلْ گرا دیتے ہیں اور اللہ کی جگہ صرف لا کہہ دیتے ہیں۔

لَاهُمَّ إِنَّ الْعَبْدَ يَمْنَعُ ۔ رَحْلَهُ فَامْنَعْ حَلَالَكَ

اے اللہ جب بندے کے گھر کو کوئی لوٹنے کے لئے آتا ہے تو وہ اُس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور وہ کسی کو اپنا گھر لوٹنے نہیں دیتا فَامْنَعْ حَلَالَكَ اے رب وہ اُس کا گھر ہوتا ہے جس میں وہ آپ رہتا ہے یا اُس کے بیوی بچے رہتے ہیں۔ مگر یہ گھر ایسا ہے جس کے متعلق تُو نے دنیا کے لوگوں کو کہا ہے کہ آؤ اور یہاں عبادت کرو بس میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ تُو بھی اپنے اس گھر کی حفاظت فرما جس میں لوگ عبادت کے لئے جمع ہوتے ہیں اور اُسے دشمن کے حملہ سے بچا۔

لَا يَغْلِبَنَّ صَلِيبُهُمْ ۔ وَمِحَالُهُمْ غَدْوًا مِحَالَكَ

اے میرے رب کل ابرہہ اپنی صلیبیں اور لشکر لے کر اور اپنی تمام تدبیروں اور قوت اور جلال کے ساتھ خانہ کعبہ کو گرانے کے لئے آئے گا۔ اے خدا اُن کی صلیبیں اور فوجیں اور تمہیں تیری قدرتوں اور تدبیروں اور طاقتوں پر کل غالب نہ آئیں۔ پھر وہ اور قریش کو لے کر پہاڑوں کی طرف چلے گئے اور ابرہہ کے حملہ کا انتظار کرنے لگے۔

دوسرے دن صبح کے وقت ابرہہ نے اپنے لشکر کو تیار ہونے کا حکم دے دیا۔ اُس نے اعلان کیا کہ پہلے ہاتھی نکالے جائیں اور اُن کے پیچھے پیچھے لشکر روانہ ہو۔ جب صبح کے وقت ہاتھی نکالے گئے تو اُن کا سب سے بڑا ہاتھی جس کے متعلق میں نے بتایا ہے کہ اُس کا نام محمود تھا الٰہی تصرف کے ماتحت بیٹھ گیا اور اُس نے چلنے سے انکار کر دیا۔ تمام تاریخیں اِس بات پر متفق ہیں کہ جس وقت مکّہ کی طرف اُسکو ہانکا گیا تو وہ بیٹھ گیا۔ جس طرح فوج میں سردار اور لفٹیننٹ اور کیپٹن ہوتے ہیں اور اُن کے حکم پر سپاہی حرکت کرتے ہیں اِسی طرح ہاتھیوں کا بھی ایک لیڈر ہوتا ہے اور وہ اُس سوار ہاتھی کے بغیر مقابلہ کے لئے نہیں نکلتے۔ اگر اُن کا سردار ہاتھی کھڑا ہو جائے تو وہ بھی کھڑے ہو جاتے ہیں اور اگر وہ حملہ کرے تو وہ بھی حملہ کرتے ہیں۔ بہرحال وہ اُس کے تابع ہوتے ہیں اور اپنے لیڈر کے بغیر باہر نہیں نکلتے اگر نکلیں گے بھی تو بے ترتیبی کے ساتھ۔ بعض دفعہ وہ اِس خیال سے چل پڑتے ہیں کہ شاید ہمارا سردار پیچھے آ رہا ہو۔ مگر وہ اُس کے بغیر لڑتے کبھی نہیں۔ جب محمود نامی ہاتھی جو تمام ہاتھیوں کا سردار تھا اچانک بیٹھ گیا تو انہیں سخت فکر ہوا۔ کہ اگر یہ نہ اُٹھا تو باقی ہاتھی بھی نہیں اُٹھیں گے اور ہمارا سارا پروگرام خراب ہو جائے گا۔ چنانچہ اُسے اُٹھانے کے لئے نیزے مارے گئے۔ کھرپیاں اُس کے بدن میں گھسیڑی گئیں۔ اِسی طرح دوسرے تمام آلات اور کانٹے وغیرہ اُس کے پیٹ اور مُنہ پر مارے گئے مگر اُس نے چلنے سے انکار کر دیا جب بہت مارتے تو وہ گھبرا کر کھڑا ہو جاتا مگر حملہ کے لئے مکہ کی طرف نہ چلتا۔ آخر انہوں نے اُس کا مُنہ دوسری طرف کیا تو وہ اُٹھ بیٹھا اور چل پڑا۔ اسی طرح وہ اُس کا مُنہ جنوب کی طرف کرتے تو وہ چل پڑتا، شمال کی طرف کرتے تو وہ چل پڑتا مشرق کی طرف کرتے تو وہ چل پڑتا مگر مکّہ کی طرف مُنہ کرتے تو بیٹھ جاتا۔ یہ دیکھ کر اُن پر سخت گھبراہٹ طاری ہوئی وہ مارتے رہے اور اُسے اُٹھانے کی کوشش کرتے رہے مگر وہ نہ اُٹھا۔ اِس وجہ سے لشکر کے چلنے میں بہت دیر ہو گئی۔ اِتنے میں بادشاہ کو خبر پہنچی کہ لشکر میں بعض سپاہیوں کے جسم پر

چیچک نمودار ہو گئی ہے۔ چیچک کی مرض حبشیوں کی مخصوص مرض ہے بعض امراض بعض ملکوں سے مخصوص ہوتی ہیں۔ چیچک اصل میں حبشہ سے آئی ہے اور اسی ملک کی مخصوص بیماری ہے جس طرح آتشک اصل میں یورپ سے آئی ہے اسی لئے عربی کتب میں آتشک کو داء الافرنج کہتے ہیں یعنی یوروپین لوگوں کی بیماری۔ چونکہ مکہ والے خدا کے گھر کو چھوڑ کر چلے گئے تھے اور اب خدا کے گھر اور اس لشکر کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں تھی صرف خدا ہی تھا جو اس گھر کی حفاظت کر سکتا تھا اس لئے خدا اس کام کو کرنے کے لئے آگیا۔ مگر چیچک کی صورت میں جو حبشیوں کے لئے سب سے زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ بادشاہ کے پاس رپورٹ کی گئی کہ لشکر میں وبا پھیل گئی ہے۔ ہاتھی پہلے ہی اُٹھ نہیں رہا تھا اس سے دلوں میں اور بھی گھبراہٹ پیدا ہوئی اور اُس دن لشکر کی روانگی کو ملتوی کرنا پڑا۔ تاریخوں میں اس کے متعلق تفصیل تو نہیں آئی مگر اتنا ضرور ثابت ہے کہ اُس دن لشکر ٹھہر گیا۔ غالباً اس لئے کہ ہاتھی نہیں چلتے تھے لیکن شام تک اور پھر دوسرے دن تک تو ہزاروں ہزار آدمی چیچک میں مبتلا ہو کر تڑپنے لگا اور دوسرے تیسرے دن اُن میں موتیں بھی شروع ہو گئیں۔ عربوں میں اس سے پہلے چیچک کا کوئی کیس نہیں ہوا تھا اور وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ یہ مرض کیا ہے۔ طائف کے جو لوگ ابرہہ کے لشکر کے ساتھ اس لئے شامل ہو گئے تھے کہ اس طرح اُن کے مندر کی عظمت بڑھ جائے گی اُن میں بھی چیچک پھوٹ پڑی اور انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ اُس غداری کی سزا ہے جو انہوں نے خانہ کعبہ کے ساتھ کی۔ جیسا کہ سب لوگ جانتے ہیں یہ مرض سخت متعدی ہے اور ایک سے دوسرے کو لگ جاتی ہے۔ جو لوگ ابھی تک تندرست تھے انہیں بھی دوسرے بیماروں سے یہ مرض لگ گئی اور تمام لشکر میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عرب جو ابرہہ کے لشکر کے ساتھ اس لئے آئے تھے کہ اُسے رستہ دکھائیں وہ بھاگ نکلے میں بتا چکا ہوں کہ عرب اس مرض سے ناواقف تھے اور وہ جانتے بھی نہیں تھے کہ چیچک کیا بلا ہے اگر وہ اس مرض سے واقف ہوتے تو سمجھتے کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ ہے مگر چونکہ وہ اس مرض کو جانتے نہیں تھے اس لئے انہوں نے سمجھا کہ یہ خدا کا عذاب ہے اور واقعہ میں وہ عذاب ہی تھا مگر اس عذاب کی طرف مرض سے ناواقفیت کی وجہ سے اُن کی توجہ بہت جلد پھر گئی اور وہ ڈر کر بھاگ گئے۔

جن قوموں میں چیچک یا ایسی ہی وبائی امراض ہُوا کرتی ہیں وہ اُن کے علاج بھی جانتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں جب حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو شام کی طرف کمانڈر انچیف بنا کر بھجوایا تو وہاں طاعون پھیل گئی انہوں نے وہاں کے لوگوں سے پوچھا کہ جب طاعون ہو تو تم کیا کیا کرتے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ ہم پہاڑوں پر ادھر اُدھر پھیل جاتے ہیں۔ یہ سُنکر بعض صحابہؓ نے کہا کہ ہمیں بھی پہاڑوں پر چلے جانا چاہیئے اور اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہیئے ٹھنڈک میں یُوں بھی طاعون کا اثر کم ہو جاتا ہے جب صحابہؓ اِس خیال کی طرف مائل ہوتے تو حضرت ابوعبیدہ نے اُن کو کہا کہ کیا تم خدا کی تقدیر سے بھاگتے ہو؟ اس پر ایک صحابی نے جواب دیا کہ ہم خدا کی تقدیر سے خدا کی تقدیر کی طرف بھاگتے ہیں یعنی ہم جہاں جاتے ہیں وہاں بھی تقدیر الٰہی ہی ہوگی۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم تقدیر سے بھاگ رہے ہیں۔ چیچک کا بھی یہی علاج سمجھا جاتا ہے کہ جہاں یہ مرض ہو اُس مقام کو چھوڑ دیا جائے اور ادھر اُدھر کھُلی جگہوں میں لوگ پھیل جائیں۔ جس وقت لشکر میں چیچک پیدا ہوئی تو لشکر والوں نے فیصلہ کیا کہ اب ہمیں اِدھر اُدھر منتشر ہو جانا چاہیئے۔ مگر اس میں مشکل یہ پیش آگئی کہ مکہ کے اردگرد کی تمام وادیاں غیر آباد ہیں اور وہ اتنی پیچیدہ ہیں کہ میلوں میل تک جنگل پھیلتے چلے جاتے ہیں اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ راستہ کدھر جاتا ہے۔ جب لشکر بھاگ کر ادھر اُدھر کی وادیوں میں پھیلا تو نتیجہ یہ ہُوا کہ بوجہ غیر آباد اور سخت پیچیدہ اور جنگل ہونے کے وہ راستہ بھول گئے اور

چونکہ طائف کے راہنما خود بھاگ گئے تھے انہیں کوئی راستہ دکھلانے والا نہ رہا اور بجائے یمن کی طرف جانے کے کوئی مدینہ کی طرف نکل گیا، کوئی نجد کی طرف چلا گیا، کوئی کسی اور علاقہ کی طرف چل پڑا۔ اُن کو پتہ ہی نہیں لگتا تھا کہ ہمارا ملک کس طرف ہے۔ اور بہت سے لوگ تو انہی وادیوں میں بھٹک بھٹک کر بھوکے اور پیاسے مر گئے۔ اسی افراتفری اور گھبراہٹ میں وہ سامان بھی جو اُن کے ساتھ تھا انہوں نے وہیں پھینک دیا اور خود بے سروسامانی کی حالت میں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگے۔ اس سے زیادہ مشکل اُن کو بیماروں کے متعلق پیش آئی۔ انہوں نے سمجھا کہ اگر ہم بیماروں کو یہیں پھینک کر چلے جاتے ہیں تو وہ کھائیں گے کہاں سے اور اُن کی تیمارداری کون کرے گا اور اگر ساتھ لے جاتے ہیں تو کس طرح ساتھ لے جائیں اور کہاں لے جائیں۔ چنانچہ کئی لوگوں نے تو اپنے بیماروں کو وہیں پھینکا اور خود اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ اس طرح وہ بیمار بھوکے پیاسے تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ اور جن لوگوں نے بیماروں کو اپنے ساتھ لیا تھا اوّل تو اُن کے لئے سفر کرنا مشکل ہو گیا۔ پھر چونکہ یہ متعدی مرض تھا وہ خود بھی چیچک میں مبتلا ہو گئے۔ اور اس طرح اُن کا اکثر حصہ اس مرض کا شکار ہو گیا۔ ابرہہ بھی اس تباہی کو دیکھ کر بھاگا۔ وہ چونکہ بادشاہ تھا اس لئے معلوم ہوتا ہے اُس نے بعض راہنما اپنے رعب کے ماتحت رکھے ہوئے تھے وہ سیدھا یمن کی طرف آیا مگر اُس کو بھی چیچک ہو گئی اور اتنی شدید ہوئی کہ اس کے سارے بدن میں پیپ پڑ گئی اور راستہ میں اُس کا گوشت جھڑتا چلا گیا۔ روایات میں کچھ مبالغہ بھی ہو جاتا ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُسے چیچک ہوئی اور شدید قسم کی ہوئی۔ جب وہ صنعاء پہنچا تو روایات کے مطابق اُس کی صرف ہڈیاں اور سر باقی رہ گیا تھا چنانچہ وہاں پہنچکر وہ مر گیا۔

یہ تباہی اس قسم کی تھی اور ایسا غیر معمولی رنگ اپنے اندر رکھتی تھی کہ اس سے ایک تہلکہ مچ گیا اور تمام لوگ انتہائی طور پر مرعوب ہو گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ عذاب ہی اور خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ اس بارہ میں مفسرین نے کیا کیا روایات بیان کی ہیں۔ یہاں صرف اس قدر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ عام روایت جو مشہور ہے اُس میں یہ ذکر آتا ہے کہ ابرہہ اور اُس کے لشکر پر اُوپر سے پرندے پتھر مارتے تھے وہ پتھر ہر شخص کے سر پر پڑتے اور اُس کے پاخانہ کی جگہ سے نکل جاتے۔ مگر انہی روایات میں عکرمہ کی بھی ایک روایت آتی ہے جو روح المعانی میں درج ہے اور اُس میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ مَنْ اَصَابَهُ الْحَجَرُ جَدَرَتْهُ جس شخص پر پتھر گرتا تھا اُسے چیچک نکل آتی تھی پھر وہ کہتے ہیں وَهُوَ اَوَّلُ جُدَرِيٍّ ظَهَرَ بِاَرْضِ الْعَرَبِ۔ یہ پہلا چیچک کا حملہ ہے جو عرب میں ظاہر ہوا اس سے پہلے عرب لوگ جانتے ہی نہیں تھے کہ چیچک کیا ہوتی ہے۔ اسی طرح طبری میں یعقوب بن عتبہ کے متعلق لکھا ہے کہ اِنَّهُ حَدَّثَ اَنَّ اَوَّلَ مَارُئِيَتِ الْحَصْبَةُ وَالْجُدَرِيُّ بِاَرْضِ الْعَرَبِ ذَالِكَ الْعَامَ (جامع البیان) یعنی یعقوب بن عتبہ یہ روایت کرتے ہیں کہ سب سے پہلا چیچک کا حملہ جو ملک عرب میں ہوا وہ اسی سال ہوا جس سال ابرہہ آیا تھا اس سے پہلے عرب میں کبھی چیچک نہیں ہوئی تھی۔

اب میں وہ مختلف روایات بیان کرتا ہوں جو اس بارہ میں مفسرین نے بیان کی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو روایات میں نے پہلے بیان کی ہیں وہ بھی مفسرین اور مؤرخین کی ہی بیان کردہ ہیں لیکن میں نے پہلے وہ روایات لکھی ہیں جو میرے نزدیک زیادہ درست ہیں۔ اب میں وہ روایات بیان کروں گا جن پر مفسرین نے اپنی تفسیر کی بنیاد رکھی ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ جب ابرہہ نے خانہ کعبہ پر مغمس میں حملہ کا ارادہ کیا اور اپنے ہاتھیوں کو لشکر کے آگے رکھنے کا حکم دیا تو بڑا ہاتھی جو اور تمام ہاتھیوں کا لیڈر اور سردار تھا بیٹھ گیا اور اُس نے چلنے سے انکار کر دیا۔ اتنے میں انہوں نے دیکھا کہ سمندر کی طرف سے کچھ پرندے

اُڑتے ہوئے آرہے ہیں۔ وہ پرندے چھوٹے چھوٹے تھے لیکن اُن کے مُنہ آدمیوں کی طرح تھے۔ انکی چونچیں اونٹوں کی طرح تھیں اور اُن کے پنجے شیروں کی طرح تھے۔ ہر پرندہ کے پاس تین پتھر تھے۔ ایک پتھر اُس نے چونچ میں پکڑا ہُوا تھا اور ایک ایک پتھر اُس نے ایک ایک پنجہ میں پکڑا ہُوا تھا۔ پتھروں کے متعلق یہ روایت ہے کہ وہ چنے کے دانے سے چھوٹے اور مسور کے دانہ سے بڑے تھے گویا چنے اور مسور کے دانہ کے درمیان اُن کا حجم تھا۔ اُن پتھروں پر ابرہہ کے لشکر کے ایک ایک سپاہی کا نام لکھا ہُوا تھا۔ کسی پر ابرہہ کا، کسی پر کسی اَور کا، کسی پر کسی اور کا۔ جس پتھر پر کسی کا نام لکھا ہُوا ہوتا تھا اُسی کی طرف وہ پرندے جاتے اور اُس کے سر پر وہ پتھر مارتے، پتھر اُس کے سر پر لگتا اور اُس کے پاخانہ کے مقام سے نکل جاتا اور وہ اُسی وقت مٹی کا ڈھیر بن کر رہ جاتا۔ اِسی طرح لکھا ہے کہ اُن پتھروں سے سب کے سب آدمی مارے گئے یعنی ابرہہ کے لشکر میں جس قدر آدمی تھے اُن میں سے کوئی بھی نہیں بچا سوائے ابرہہ کے۔ ابرہہ وہاں سے بھاگا۔ اُس کے نام کا پتھر جس پرندہ کی چونچ میں تھا وہ بھی ساتھ ساتھ اُڑتا گیا لیکن وہ پتھر اُس نے پھینکا نہیں یہاں تک کہ ابرہہ یمن جا پہنچا وہاں سے اُس نے جہاز لیا اور اس میں سوار ہوکر حبشہ کے ساحل پر پہنچا۔ پھر حبشہ کے ساحل پر پہنچکر اُس زمانہ کے لحاظ سے پندرہ بیس دن کا سفر طے کرتے ہوئے وہ نجاشی کے پاس پہنچا اور اُسے بتایا کہ میں نے اِس اِس طرح خانۂ کعبہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ اچانک پرندے آئے اور انہوں نے آسمان پر سے پتھر پھینکے جن سے وہ سارے کے سارے آدمی مرگئے جو میرے ساتھ گئے تھے۔ نجاشی نے کہا یہ کس طرح ہوسکتا ہے میری عقل میں تو نہیں آسکتا کہ چھوٹے چھوٹے پرندے آئیں لوگوں کو پتھر ماریں اور وہ مرجائیں۔ اتنے میں کچھ کھٹکا ہُوا اور ابرہہ نے آسمان پر ایک اُسی قسم کا پرندہ دیکھکر کہا۔ بادشاہ سلامت! اسی قسم کے پرندے آئے تھے جن کی چونچ اور پنجوں میں پتھر تھے اور وہ ایک ایک آدمی کو مارتے تھے۔ ابھی اُس نے اتنا ہی کہا تھا کہ پرندے نے ایک پتھر ابرہہ کے سر پر پھینکا پتھر پڑنے کی دیر تھی کہ وہ مرکر زمین پر جا پڑا۔

یہ وہ روایت ہے جو اپنی مکمل صورت میں راویوں نے بیان کی ہے۔ اِس روایت میں پتھروں کا ذکر آتا ہے اور اس لحاظ سے یہ میری پہلی بیان کردہ روایت کے خلاف بلکہ عقل کے بھی خلاف ہے اور کوئی عقلمند اس قسم کی باتوں کو صحیح تسلیم نہیں کرسکتا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اکثر روایتیں یہی بتاتی ہیں کہ ابرہہ وہاں سے بھاگا مگر اُسے راستہ میں ہی چیچک ہوگئی اسی حالت میں وہ یمن پہنچا اور صنعاء کے قریب آکر مرگیا۔ اور جیسا کہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں اُن روایات میں یہ بھی ذکر آتا ہے کہ جس شخص کو پتھر لگتا تھا اُس کو چیچک نکل آتی تھی۔ دراصل یہ بہت مبالغہ آمیز روایتیں ہیں کہ پتھر اُن کے سر پر پڑتے اور اُنکے پاخانہ کے سوراخ سے باہر نکل جاتے۔ مگر اسی قسم کی روایتوں میں سے بعض میں یہ بھی آتا ہے کہ جس کو پتھر لگتا اُس کو چیچک نکل آتی تھی۔ روایت کے یہ الفاظ دوسری تمام روایتوں کا بھانڈا پھوڑ دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اُنہیں صرف چیچک ہوئی تھی۔ مگر کہانی بنانے والوں نے اُسے کچھ کی کچھ شکل دے دی یہ بات صحابہ کی متواتر روایت اور بعض دوسری روایتوں سے بھی ثابت ہے کہ اُنہیں چیچک ہوگئی تھی اور یہ بھی ثابت ہے کہ چیچک عرب میں پہلی دفعہ ابرہہ کے لشکر میں ہی نمودار ہوئی تھی۔ اس کے بعد ایک مسلمان کو یہ یقین کرانے کی کوشش کرنا کہ خدا تعالیٰ نے اُن کے لئے سمندر کی طرف سے خاص طور پر بعض ایسے جانور بھجوا دیے تھے جن کا دنیا میں کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا اور پھر یہ کہنا کہ وہ تھے تو چڑیا کے برابر مگر اُن کے مُنہ آدمیوں کی طرح تھے چونچ اونٹ کی طرح تھی اور پنجے شیر کی طرح تھے بتاتا ہے کہ یہ کہانی بنانے والے نے الف لیلہ کے قصوں کو بھی مات کر دیا ہے اگر تو وہ یہ کہتے کہ وہ پرندے بڑے بڑے معلوم ہوتے تھے جیسے خیالی اور تصویری عقاب کا نقشہ کھینچا جاتا ہے۔ اور بتاتے ہیں کہ اُن کے منہ بڑے خونخوار دیوؤں کی طرح

تھے اور انہی کی طرح اُن کی گردنیں اُٹھی ہوئی تھیں۔ شیروں کی طرح بڑے بڑے پنجے تھے اور ہر ایک پنجے اور منہ میں پچاس پچاس سیر وزنی پتھر تھے جنہیں وہ آسمان پر سے ابرہہ کے لشکر پر گراتے اور وہ اُسی وقت مر جاتے۔ تب تو کوئی بات بھی ہوتی۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ وہ تھا تو چڑیا کا پنجہ لیکن نظر شیر کا پنجہ آتا تھا۔ بھلا چڑیا کے پنجہ سے شیر کی کیا ہیبت نظر آئے گی۔ پھر چڑیا کی اتنی باریک سی چونچ سے جو تراشی ہوئی پنسل کی مانند ہو وحشی اونٹ کا اثر کس طرح پڑ سکتا ہے۔ پس یہ روایت اپنی ذات میں تمسخر سے کم نہیں اور بڑا تمسخر جو اس روایت میں کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جب وہ پرندے پتھر پھینکتے تھے تو جسے وہ پتھر لگتا اُسے چیچک نکل آتی گویا نعوذ باللہ خدا کو یہ نسخہ آج کل سوجھا ہے کہ وہ انسانی جسم کے اندر سے ہی چیچک کی بیماری پیدا کر دیتا ہے اُس زمانہ میں خدا تعالیٰ کو یہ نسخہ معلوم نہیں تھا۔ اسی لئے وہ پرندے اُسے پیدا کرنے پڑے جو آدمیوں کے منہ والے اور اونٹ کی گردن والے اور شیر کے پنجوں والے تھے اور وہ بعض عجیب قسم کے پتھر جو اب دُنیا میں نہیں ملتے پھینکتے تھے۔ یہ پتھر جس آدمی کے سر پر لگتے اُس کے پاخانہ کے سوراخ سے نکل جاتے۔ مگر اس سب جدوجہد اور کوشش کا نتیجہ صرف یہ ہوتا کہ پتھر جس کو لگتا اُس کو چیچک نکل آتی تھی۔

یہ بات اپنی ذات میں ہی بتاتی ہے کہ یہ اَن پڑھ عربوں کی قوتِ متخیلہ تھی جس نے یہ قصہ بنایا۔ چونکہ وہ جانتے نہیں تھے کہ چیچک کیا ہوتی ہے اس لئے جب چیچک ہوئی تو لوگوں نے عجیب عجیب قصے بیان کرنے شروع کر دیئے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی نے یہ بیان کیا ہو کہ پتھروں پر اُن کی لاشیں ملیں۔ پھر کسی اور نے یہ ذکر کیا ہو کہ پرندوں نے اُن کا گوشت ٹکڑے ٹکڑے کیا ہوا تھا تو دوسرے نے یہ سمجھ لیا ہو کہ انہیں پرندوں نے ہی پتھر مار مار کر مار ڈالا تھا۔ پھر جب انہوں نے کسی سے سُنا کہ دراصل اُن کو چیچک نکل آئی تھی تو پہلی من گھڑت روایت کے ساتھ انہوں نے اِس کو بھی ملا دیا اور روایت کو اس طرح شکل دے دی کہ وہ پرندے جس کو بھی پتھر مارتے تھے اس کو چیچک نکل آتی تھی۔ یہ بالکل ویسی ہی بات ہے جیسے مثل مشہور ہے کہ ایک دفعہ کسی شخص نے پوچھا کہ بگلا پکڑنے کی کیا ترکیب ہے؟ دوسرے نے جواب دیا کہ بگلا پکڑنے کی ایک بڑی عمدہ ترکیب ہے۔ سردی کے موسم میں بگلا سُکڑا ہوا تالاب کے کنارے بیٹھا ہوا ہوتا ہے تم موم لو اور آہستہ آہستہ لیٹتے لیٹتے جھاڑیوں اور پتھروں کے پیچھے چھپتے بگلے کے قریب جاؤ اور اُس کے سر پر موم رکھ دو۔ اس کے بعد چُپ کر کے کسی پتھر کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ جب سورج نکلیگا اور گرمی پیدا ہوگی تو وہ موم آہستہ آہستہ پگھل کر بگلے کی آنکھوں میں جا پڑے گی اور وہ اندھا ہو جائے گا۔ اُس وقت آگے بڑھکر بگلے کو پکڑ لینا۔ اُس نے کہا اتنی کوشش کرنے کی بجائے کیوں نہ میں اُسی وقت بگلے کو پکڑ لوں جب میں اُس کے سر پر پہنچ جاؤں موم رکھنے اور اُس کے پگھلنے کا انتظار کرنے اور پھر بگلے کے اندھے ہونے تک وہیں پتھروں کے پیچھے چھپ کر بیٹھے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ اگر اس طرح پکڑ لوگے تو اس میں اُستادی کونسی ہوگی۔ بعینہٖ یہی مثال اس روایت کو بیان کرنے والوں کی ہے۔ وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے پرندے بھجوائے ہر پرندے کی چونچ اور پنجوں میں پتھر تھے۔ وہ پتھر ہر ایک کے سر پر گراتے اور پھر جس کو بھی پتھر لگتا اسکو چیچک نکل آتی۔ سیدھی طرح کیوں نہ کہہ دیا کہ اُن کو چیچک نکل آئی تھی۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کے لئے اتنی بڑی کہانی کی ضرورت ہوتی۔ ہمارے سامنے خدا تعالیٰ روزانہ چیچک پیدا کرتا ہے مگر کبھی کوئی پرندے نہیں بھجواتا۔ فرق صرف یہی ہے کہ عرب میں چونکہ اس سے پہلے کبھی چیچک نہیں ہوئی تھی اس لئے وہ سمجھ نہ سکے کہ یہ کیا چیز ہے۔ جیسے آتشک پہلے یورپ میں ہوئی پھر اس کے بعد وہ دوسرے ممالک میں آئی۔ اسی طرح ہیضہ انیسویں صدی سے پہلے یورپ میں نہیں تھا ایشیا کو چک اور چین میں ہوتا تھا پھر یہاں سے یک رَو چلی اور یورپ میں بھی ہیضہ کے واقعات ہونے لگے۔ اب بجائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ فلاں کو ہیضہ ہوگیا اگر ہم کہیں کہ خدا نے بڑے بڑے جن اور دیو بھیجے وہ ناک میں پھونک مارتے تھے جس کی انتڑیاں

پھول جاتیں اور اس کے بعد دست لگ جاتے تھے اور آدمی
مرجاتا تھا تو کیا کوئی عقلمند اس کو ماننے کے لئے تیار ہوگا؟
اسی طرح چیچک اُن کو ویسے ہی نکلی جیسے آج کل لوگوں کو نکلتی
ہے مگر چونکہ عربوں کو اس مرض کا علم نہیں تھا اسلئے مختلف
باتوں کو سُن سُن کر انہوں نے ایک عجیب قصہ بنالیا۔ کسی سے
سُنا کہ وہ پتھروں پر مرے پڑے تھے۔ کسی سے سُنا کہ
پرندے اُن کا گوشت نوچتے تھے، کسی سے سُنا کہ انہیں
ایسے دانے نکل آتے تھے جو چنے سے چھوٹے اور مسور سے
ذرا بڑے تھے۔ تو اِن سب باتوں کو ملا کر انہوں نے "کہیں کی
اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا" کی طرح ایک
افسانہ بنالیا۔ حالانکہ واقعہ صرف اتنا تھا کہ اُن کو چیچک
نکل آئی تھی۔ باقی یہ کہ پتھروں کا کیا واقعہ ہے اس کا ذکر اگلی
آیت میں آجائے گا۔ بہرحال وہ بات جو میں نے بیان کی ہے
اُس کی تصدیق میں بعض اور روایات بھی ہیں جن سے پتہ لگتا
ہے کہ چیچک والی بات ہی صحیح ہے۔

دُرِّ منثور میں ابن اسحاق جو ایک بہت بڑے مؤرخ
گذرے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے
ہیں (یہ روایت بعض اور کتابوں میں بھی پائی جاتی ہے) کہ آپ
نے فرمایا میں نے خود مکہ میں اپنی آنکھوں سے دو آدمیوں کو دیکھا
جو بھیک مانگ رہے تھے اور آنکھوں سے اندھے تھے۔ میں
نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں تو اُس نے بتایا کہ یہ ابرہہ
کے ہاتھیوں کے مہاوت ہیں۔ دیکھو اس روایت سے بات
بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ چیچک ہی ایک ایسا مرض ہے
جس سے اکثر لوگ اندھے ہو جاتے ہیں۔ پُرانے زمانہ میں تو اس
قسم کے اندھوں کی بڑی کثرت تھی۔ اگر اندھوں سے اُن کے
اندھا ہونے کی وجہ معلوم کی جاتی تھی تو سَو میں سے اسّی کا
جواب یہ ہوتا تھا کہ چیچک نکلنے کی وجہ سے وہ اندھے ہوگئے
دراصل چیچک جب شدت سے نکلے تو آنکھ میں اس کے دانے
نکل آتے ہیں اور اس کی وجہ سے کئی لوگوں کی آنکھیں ضائع
ہو جاتی ہیں۔ اب دیکھو کہ پہلی روایت میں تو یہ ذکر تھا کہ پرندے
پتھر مارتے ہر پتھر آدمی کے سر پر لگتا اور اُس کے پاخانہ کے
سوراخ سے نکل جاتا اور پھر اُس کو چیچک ہو جاتی مگر حضرت
عائشہ رضی اللہ عنہا ان میں سے کسی بات کا ذکر نہیں فرماتیں۔
وہ یہ نہیں کہتیں کہ میں نے اُن کے سر دیکھے تو اُن میں سوراخ
تھے بلکہ وہ سیدھی طرح ایک بات بیان کر دیتی ہیں کہ میں نے
بعض اندھوں کو مکہ کی گلیوں میں بھیک مانگتے دیکھا تو میرے
دریافت کرنے پر لوگوں نے بتایا کہ یہ ابرہہ کے ہاتھیوں کے
فیلبان تھے۔ پھر روایت میں تو یہ ذکر آتا ہے کہ جس کو بھی پتھر
لگتا وہ مرجاتا مگر حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں میں نے اُن میں سے
بعض لوگوں کو زندہ بھیک مانگتے دیکھا صرف اتنی بات تھی کہ
اندھے ہو چکے تھے اور یہ صریح طور پر چیچک نکلنے کی علامت ہے
اب بھی باوجود اسکے کہ چیچک کے ٹیکے نکل آئے ہیں اگر اندھوں
سے پوچھو تو بہت سے ایسے اندھے نکل آئیں گے جن کی بینائی
چیچک کے نتیجہ میں ضائع ہوئی ہوگی۔

اسی طرح حلیۂ ابونعیم میں آتا ہے کہ لَیْسَ کُلُّھُمْ
اَصَابَهُ الْعَذَابُ یعنی ہر ایک کو یہ عذاب نہیں پہنچا تھا۔
اگر خدا نے پتھروں پر ہر ایک کا نام لکھ لکھ کر بھیجا تھا تو یہ کس
طرح ہو سکتا تھا کہ خدا تو پتھروں پر اُن کا نام لکھے مگر وہ نہ
مریں۔ اس سے بھی پتہ لگتا ہے کہ یہ بیماری تھی جس سے کچھ
مر گئے اور کچھ بچ گئے۔

پھر یہ بھی تاریخوں سے پتہ لگتا ہے کہ جس کو وہ پتھر
لگتا تھا اُس کا گوشت جھڑنے لگ جاتا تھا۔ یہ بھی چیچک کی
ایک علامت ہے۔ جب چیچک بڑی کثرت اور شدت کے ساتھ
نکلتی ہے تو جسم کا گوشت گل سڑ کر جھڑنے لگتا ہے اور چمڑا
بالکل گل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پتھروں کی جو شکل بتائی گئی
ہے وہ بھی چیچک کے دانوں سے ملتی ہے کہا جاتا ہے کہ وہ
پتھر چنے سے چھوٹا اور مسور سے بڑا ہوتا تھا اور یہی چیچک کے
دانوں کی کیفیت ہوتی ہے۔ چیچک کا دانہ چنے سے چھوٹا اور
مسور سے کچھ بڑا ہوتا ہے۔ دراصل جہاں تک میں سمجھتا ہوں
اس قسم کی کہانیاں بات کو پورے طور پر نہ سمجھنے کے نتیجہ میں

پیدا ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نے ابرہہ کے لشکر پر اس آسمانی عذاب کے نازل ہونے کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کی ہو کہ خدا نے اُن پر پتھراؤ کر دیا اور سننے والے نے یہ سمجھا ہو کہ واقعہ میں اُن پر پتھر گرے تھے۔ ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں "تجھ پر پتھر پڑیں" مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ واقعہ میں تیرے سر پر پتھر آ آ کر گریں۔ میں سمجھتا ہوں ایسی ہی کوئی بات اُس وقت کسی نے کہی ہوگی کہ آسمان سے اُن پر پتھر پڑے۔ اُس کا تو یہ مطلب تھا کہ آسمان سے عذاب نازل ہوا مگر سننے والے نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ واقعہ میں اُن پر پتھر پڑے تھے۔ پھر جب انہوں نے کسی ایسے شخص کو دیکھا جو اس مرض کے حملہ سے بچ گیا تھا اور اُس کے تمام جسم پر انہوں نے داغ دیکھے جو چنے سے کچھ چھوٹے اور مسور سے ذرا بڑے تھے تو سمجھا کہ یہی اُن پتھروں کے نشان ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پتھر چنے سے چھوٹے اور مسور سے بڑے تھے۔

مجھے خود گیارہ بارہ سال کی عمر میں چیچک نکلی تھی جس کے میری کلائی پر اب تک دو نشان ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ اُن میں سے ایک نشان مسور سے ذرا بڑا ہے اور دوسرا چنے سے ذرا چھوٹا۔ مگر چونکہ عرب اس مرض کو جانتے نہیں تھے اس لئے جب انہوں نے اِس کے متعلق باتیں سُنیں تو قسم قسم کے قصے مشہور کرنے شروع کر دئے اور ہمارے مفسرین نے وہی قصے اپنی تفسیروں میں درج کر لئے۔ حالانکہ اصل حقیقت صرف اتنی ہے کہ اصحاب فیل میں چیچک کی بیماری پھیل گئی اور وہ تتر بتر ہو گئے۔ بہت سے مر گئے، بہت سے اندھے ہو گئے اور کچھ بچ بھی گئے

مَیں نے جیسا کہ بتایا تھا یہ سارا واقعہ ایک طرف کَیْفَ کی اور دوسری طرف تَرَىٰ اور رَبُّكَ کی تشریح ہے قرآن کریم نے کَیْفَ کا مختصر لفظ استعمال کر کے سارے مضمون کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ یعنی دیکھنا یہ نہیں کہ کیا ہُوا دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح ہُوا۔ یمن سے ابرہہ چلتا ہے ایک بہت بڑا لشکر ساتھ لیتا ہے۔ راستہ میں عرب اس کا مقابلہ کرتے ہیں مگر وہ ناکامی کا مُنہ دیکھتے ہیں۔ تمام رستہ میں صرف تین جگہیں ایسی تھیں جہاں عربوں کے مقابلہ کا امکان تھا۔ اِن میں سے دو جگہ لڑائی ہوئی اور عربوں کو شکست ہو گئی اور تیسری جگہ یعنی مکّہ پر خود اہلِ مکّہ نے فیصلہ کر دیا کہ ہم میں مقابلہ کی کوئی طاقت نہیں۔ غرض کوئی صورت مقابلہ کی باقی نہ رہی لیکن ابرہہ پھر بھی ناکام ہو گیا۔ پس یہاں یہ سوال نہیں کہ ابرہہ کے آدمی مر گئے خدا تعالےٰ جس بات کو پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بغیر ظاہری سامانوں کے مر گئے۔ جتنی ظاہری طاقتیں اُس کے سامنے آئیں انہوں نے شکست کھائی۔ یمن کے لوگوں میں بغاوت ہوئی اور وہ ابرہہ کی فوجوں سے لڑے مگر انہوں نے شکست کھائی اور اُن کا سردار اور لیڈر بھی قید ہو گیا۔ پھر خثعم میں پہنچے تو وہاں بھی عرب قبائل نے اکٹھے ہو کر بادشاہ کا مقابلہ کیا لیکن وہاں بھی عرب مارے گئے اور ابرہہ کے مقابلہ میں زیر ہوئے۔ اِس کے بعد جب ابرہہ مکّہ کے قریب پہنچا تو کنانہ اور ہذیل اور قریش نے مل کر مشورہ کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہمارے اندر اُس کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔ گویا جتنی انسانی تدبیریں تھیں اُن کو یا تو ہیچ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا یا استعمال کرنے پر ناکامی و نامرادی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ جب کوئی صورت نہ رہی تو حضرت عبد المطلب اپنے ساتھیوں سمیت مکّہ چھوڑ کر پہاڑوں پر چلے گئے اور ابرہہ کے لشکر کا انتظار کرتے رہے مگر لشکر مکّہ میں داخل نہیں ہُوا۔ جب انہوں نے آدمی بھجوا کر معلوم کیا کہ کیا بات ہے تو انہیں پتہ لگا کہ انسانی تدبیر سے نہیں بلکہ محض خدائی ہاتھ سے اُن میں چیچک پھیل گئی ہے اور وہ پراگندہ ہو کر بجائے مکّہ پر حملہ کرنے کے اِدھر اُدھر پھیل گئے ہیں اور اپنی جانیں بچانے کی فکر کر رہے ہیں۔ یہ سارا معاملہ کَیْفَ کی تفسیر تھا کَمْ کی تفسیر نہ تھا۔ ورنہ بارہ[12] ہزار کے ایک لشکر کا مارا جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ ابھی چین کی ایک لڑائی کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی جس میں بتایا گیا ہے کہ

وہاں اسّی ہزار آدمی مارا گیا اور دس لاکھ زخمی ہوا یا پکڑا گیا اتنی بڑی تعداد کے مقابلہ میں دس بارہ ہزار کے لشکر کی تباہی کی حقیقت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ پھر فرق کیا ہے۔ تم خود ان دونوں واقعات کو دنیا کے سامنے پیش کرکے دیکھ لو کہ ان میں سے کس کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ آیا چین کی لڑائی کا جس میں اسّی ہزار آدمی مارا گیا ہے یا اس کا جس میں صرف بارہ ہزار آدمی شامل ہوا تھا مگر جب حملے کا وقت آیا تو اس میں ایک ایسی بیماری پھوٹ پڑی جس سے وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ یقیناً ہر شخص اس سے متاثر ہوگا۔ اس لئے نہیں کہ دس یا بارہ ہزار آدمی مرے بلکہ اگر صرف بارہ آدمی مکہ پر حملہ کرتے اور فرض کرو کہ مکہ میں صرف حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہوتے اور یہ واقعہ پیش آجاتا تو جو اثر اس واقعہ کا طبیعت پر پڑتا اور جس طرح اس سے خدا تعالےٰ کی خدائی کا انکشاف ہوتا وہ بارہؔ لاکھ کے مرنے سے بھی نہ ہوتا۔ اگر بارہؔ لاکھ انسان انسانی تدبیر سے مر جائے۔ تو بہرحال یہی کہا جائے گا کہ وہ انسانی تدبیر سے مرا۔ اور انسانی تدبیروں کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ ایک غالب آتا ہے اور دوسرا مغلوب ہو جاتا ہے لیکن اگر بارہؔ آدمی بھی خدائی ہاتھ سے مریں تو اس سے ایک ہیبت پیدا ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کے جلال اور اُس کی قوت کا ایک بہت بڑا مظاہرہ ہوتا ہے جو طبائع پر اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ اِسی لئے خدا تعالےٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اَلَمْ تَرَ مَا فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ یا کَمْ عَذَّبَ کا لفظ اُس نے استعمال نہیں بلکہ اس نے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ کے الفاظ استعمال کئے ہیں یعنی ہم نے کس طرح ایک ایسی تدبیر اُن کو ہلاک کرنے کے لئے کی جس میں انسانی ہاتھ کا کوئی دخل نہیں تھا۔ چیچک ایسی ہی مرض ہے جو کسی انسان کے قبضہ میں نہیں۔ بعض مرضیں بیشک ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو پھیلایا جا سکتا ہے جیسے ہیضہ ہے یا ٹائیفائڈ ہے یا طاعون ہے۔ گو ان کے پھیلانے میں بھی بڑی مشکلات ہوتی ہیں لیکن چیچک کے متعلق اب تک کوئی ایسا طریق معلوم نہیں ہو سکا جس سے اُسے لوگوں میں پھیلایا جا سکے اور ہیضہ اور ٹائیفائڈ اور طاعون کے متعلق بھی موجودہ زمانہ میں معلوم ہوا ہے کہ یہ امراض پھیلائی جا سکتی ہیں۔ اس سے پہلے اِن امراض کے متعلق لوگوں کو کچھ علم نہیں تھا کہ یہ پھیلائی جا سکتی ہیں۔ پس آج سے چودہ سو سال پہلے ابرہہ کے لشکر میں ایک ایسی بیماری کا پھیل جانا جو کبھی عرب میں نہ ہوئی تھی اور جس کا عربوں کو پتہ تک نہیں تھا۔ اُس کا علاج جاننا تو الگ رہا یقینی طور پر بتاتا ہے کہ یہ بیماری خدا نے پیدا کی تھی اِسی لئے كَيْفَ کا لفظ استعمال کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ۔ اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم! تُو نے دیکھا کہ تیرے ربّ نے کس طرح کیا۔ "تیرے ربّ" کے الفاظ صاف طور پر بتاتے ہیں کہ ان الفاظ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ فعل محض تیری خاطر کیا گیا تھا۔ جب ماں اپنے بچہ سے کہتی ہے کہ "تیری ماں نے کیا کیا" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے تیری خاطر کیا کیا۔ اِسی طرح اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تُو یہ دیکھ کہ ہم نے تیری خاطر کس طرح اپنی قدرت کا نشان دکھایا۔ تو بارہ ہزار کی موت نہ دیکھ بلکہ یہ دیکھ کہ کیا کوئی انسان تھا جس نے اُن کو مارا۔ کیا کوئی انسانی تدبیر تھی جس نے اُن کا خاتمہ کیا۔ جب تمام حیلے بیکار ہو گئے، جب تمام کوششیں جاتی رہیں تو وہ خدا جو تجھ کو مکہ میں پیدا کرنا چاہتا تھا، وہ خدا جو تجھ کو دنیا کا سردار بنانا چاہتا تھا، وہ خدا جو تجھ کو مکہ میں بہت بڑی عظمت دینا چاہتا تھا اُس نے اپنی قدرت کا زبردست ہاتھ دکھایا۔ پس اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم! تُو دیکھ کہ کس طرح ہم نے اُن میں بیماری پیدا کرکے تمام لشکر کو تباہ کر دیا۔ اور جب انسان ناکام و نامراد ہو کر بھاگ گیا تو اُس لشکر کے رستہ میں ہم خود کھڑے ہو گئے۔ غرض كَيْفَ اور تَرَ اور رَبُّكَ کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ اس واقعہ کے اندر

ایسے امور پائے جاتے ہیں کہ دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے کہ یہ سب واقعہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خاطر ہُوا۔

اوّل دو ہزار سال سے اُوپر گذر گئے مگر مکہ پر کوئی حملہ نہ ہُوا لیکن اُس سال جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پیدا ہونے والے تھے دشمن کے دل میں یہ خیال پیدا ہُوا کہ وہ مکہ پر حملہ کرے اور خانہ کعبہ کو گرا دے۔ اِس کا موجب جاہے یہ سمجھ لو کہ یہودیوں اور عیسائیوں اور عربوں میں یہ تحریک شروع ہو گئی تھی کہ وہ موعود جس کی انبیاء کے نوشتوں میں ایک لمبے عرصہ سے خبر چلی آ رہی ہے عنقریب ظاہر ہونے والا ہے اور عیسائی ڈرتے تھے کہ اگر وہ موعود عرب میں ظاہر ہو گیا جیسا کہ بعض پیشگوئیوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ عرب میں ظاہر ہوگا تو اُن کے لئے سخت مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اس لئے انہوں نے چاہا کہ عرب جس نقطہ مرکزی پر متحد ہیں اُسے گرا دیا جائے اور اس طرح اُن کی طاقت کو توڑ دیا جائے۔ اور چاہے یہ سمجھ لو کہ شیطان نے جب دیکھا کہ اُس کا سر کچلنے والا ایک زبردست انسان دنیا میں کھڑا ہونے والا ہے تو اُس نے کوشش کی کہ وہ حربہ جو اُس کے خلاف استعمال کیا جانے والا ہے بیکار ہو جائے ان دونوں میں سے کوئی وجہ سمجھ لو بہرحال یہ حملہ اتفاق نہیں تھا آخر یہ سوچنے والی بات ہے کہ اگر خانہ کعبہ پر کسی کی طرف سے حملہ ہونا تھا تو بناءِ کعبہ کے بعد پہلے سال کیوں نہ ہُوا، دوسرے سال کیوں نہ ہُوا، تیسرے سال کیوں نہ ہُوا، چوتھے سال کیوں نہ ہُوا، پانچویں سال کیوں نہ ہُوا، چھٹے سال کیوں نہ ہُوا؟ یا اگر کسی نے حملہ کرنا ہی تھا تو پہلی صدی میں کیوں نہ کیا، دوسری صدی میں کیوں نہ کیا، تیسری صدی میں کیوں نہ کیا؟ بائیس سو سال تک برابر خاموشی چلی گئی لیکن اِدھر وہ شخص پیدا ہوتا ہے جس کے پیدا ہونے کی خبر خانہ کعبہ کی بنیاد رکھتے وقت دی گئی تھی، جس نے ساری دنیا کو اپنے مذہب سے روشناس کرنا تھا اور جس نے تمام قوموں کا مرجع بننا تھا۔ اور اُدھر خانہ کعبہ کو تباہ کرنے کے لئے ایک لشکر آ جاتا ہے۔ صاف پتہ لگتا ہے کہ خواہ یہ تدبیر انسانی دماغ سے پیدا کی گئی ہو خواہ شیطانی دماغ نے اس کو پیدا کیا ہو بہرحال یہ تھی اُسی موعود کی طاقت توڑنے کے لئے۔

دوم اللہ تعالےٰ نے صرف حملہ آور دشمن کو نہیں مارا بلکہ اُس کی حکومت کو ہی مٹا دیا۔ اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَبْرَهَةَ بلکہ فرمایا ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ یعنی وہ قوم جو فیل والی تھی اللہ تعالےٰ نے اُس کو مٹا دیا۔ کیونکہ اس حکومت سے یہ خطرہ ہو سکتا تھا کہ وہ آئندہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے راستہ میں روک نہ بنے۔ یمن اور مکہ کا آپس میں گہرا تعلق تھا اگر یمن میں مسیحی حکومت رہتی اور صرف ابرہہ کا لشکر تباہ ہو جاتا تو ممکن تھا کہ اس کے بعد اور لشکر آتے اور مکہ پر حملہ کرتے اور اس طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کام میں روک پیدا ہوتی۔ پس خدا تعالےٰ نے اس فتنہ کا استیصال کرنے کے لئے اُس حکومت کو ہی مٹا دیا جس سے یہ خطرہ ہو سکتا تھا۔ غرض یہ تباہی خدا تعالےٰ کی طرف سے ایک سوچی سمجھی ہوئی تدبیر تھی آنیوالے موعود کا راستہ صاف کرنے کے لئے۔ اگر مکہ کے لوگ اُس وقت لڑتے تو خدا تعالےٰ میں یہ بھی طاقت تھی کہ وہ مکہ والوں کو ابرہہ اور اُس کے لشکر پر غالب کر دیتا۔ قرآن کریم میں صاف طور پر آتا ہے کہ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ (سورۃ بقرہ ع ۳۳) بہت سی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی طاقتوں پر غالب آ جاتی ہیں۔ بدر میں ایسا ہی ہُوا، غزوہ خندق میں ایسا ہی ہُوا۔ مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت تھی جو اپنے سے کئی گنا بڑی جماعت پر غالب آگئی۔ لیکن بدر نے مکہ والوں کو ایسا ڈرایا نہیں کہ وہ مسلمانوں پر دوسرا حملہ نہ کریں۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی جماعت ہم پر غالب تو آئی ہے مگر اس میں کوئی عجیب بات نہیں کبھی ایک آدمی تین پر بھی غالب آ جاتا ہے بلکہ دنیا میں اس قسم کی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ ایک دس پر غالب آ گیا یا ایک بیس پر غالب آ گیا۔ پس بدر میں مسلمانوں کے غلبہ کے باوجود کفار ڈرے نہیں۔ لیکن کعبہ پر حملہ آور ہونے والوں کی تباہی کا واقعہ خدا نے بغیر کسی انسانی ہاتھ اور تدبیر کے اس لئے ظاہر کیا تا کہ لوگ ڈر جائیں اور وہ یقین

کرلیں کہ اس واقعہ میں خدا تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔ پس اس موقعہ پر خدا تعالیٰ نے بھی ایک سوچی ہوئی تدبیر اختیار کی جیسے انسان نے بھی ایک سوچی ہوئی تدبیر اختیار کی تھی۔ ایک انسان نے ایک گرجا بنایا مگر اس لئے نہیں کہ اُس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے بلکہ اس لئے کہ عربوں کی توجہ خانہ کعبہ کی طرف سے ہٹا کر اس کی طرف منتقل کرا دے۔ پھر عربوں میں منادی کی گئی اور خاص طور پر وہ عرب رؤوسا چنے گئے جن کا پبلک پر اثر تھا اور اُن کو انعام واکرام کے وعدے دے کر اس غرض کے لئے مقرر کیا گیا کہ وہ لوگوں میں یہ پراپیگنڈہ کریں کہ آئندہ خانہ کعبہ کی بجائے اس گرجے کا حج کیا جائے حالانکہ حج گرجوں کا نہیں ہُوا کرتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہاں اصل مقصد گرجے کا قیام نہ تھا بلکہ خانہ کعبہ کے مقام کو گرانا مقصود تھا۔ اسی طرح یہاں اللہ تعالیٰ کی اصل غرض ابرہہ کو مارنے کی نہیں تھی بلکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے راستہ سے ہر قسم کی روکوں کو دُور کرنا تھی۔ پھر جس طرح گرجہ کا حملہ اتفاقی نہیں ہُوا اسی طرح ابرہہ کی تباہی بھی اتفاقی نہیں ہوئی۔ اُس کی غرض بھی یہی تھی کہ عرب کے نبی کے لئے ترقی کے امکانات بالکل مٹا دئے جائیں اور خدا تعالیٰ کی غرض بھی یہی تھی کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ترقی کے لئے یمن کی حکومت بالکل مٹا دی جائے تاکہ آپ ہر قسم کے خطرہ میں آئے بغیر ترقی کر سکیں۔

اصل بات یہ ہے کہ زمانہ محمدی کے متعلق جو پیشگوئیاں سابق کتب میں پائی جاتی تھیں اُن کے آثار ظاہر ہونے لگ گئے تھے۔ مسیحیوں نے ان پیشگوئیوں کو یا تو بائبل سے اخذ کیا تھا یا اُن کے اولیاء نے جو پیشگوئیاں کی تھیں اُن سے انہوں نے یہ نتائج اخذ کئے تھے۔ بائبل کی پیشگوئیاں تو بالکل واضح ہیں جیسے استثناء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ "میں اُن کیلئے اُنکے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا" (باب ۱۸ آیت ۱۸) دوسری جگہ اس قسم کے الفاظ آتے ہیں کہ خدا تعالیٰ تیرے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ صاف بات ہے کہ جب بنو اسحاق کو یہ کہا گیا کہ تمہارے بھائیوں میں سے موسیٰ کی مانند ایک نبی آئے گا تو اس سے مراد بنو اسمٰعیل کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ جیسے اگر سیدوں کو یہ کہا جائے کہ "تمہاری بھائی قوم میں سے" تو اس سے سیّد مراد نہیں ہو سکتے یا پٹھانوں کو یہ کہا جائے کہ "تمہاری بھائی قوم میں سے" تو اس سے پٹھان مراد نہیں ہو سکتے یا مغلوں کو یہ کہا جائے کہ "تمہاری بھائی قوم میں سے" تو اس سے مغل مراد نہیں ہو سکتے۔ بہرحال کوئی دوسری قوم مراد ہوگی۔ اسی طرح ہر شخص جانتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے معروف قبائل یا بنو اسحاق تھے یا بنو اسماعیل جب بنو اسحاق کو یہ کہا گیا کہ تمہارے بھائیوں میں سے ایک نبی کھڑا کیا جائیگا جو موسیٰ کی مانند ہوگا جیسا کہ استثناء میں یہ پیشگوئی موجود ہے تو اس کے صاف معنے یہ تھے کہ اللہ تعالیٰ کسی زمانہ میں بنو اسمٰعیل میں نبی کھڑا کرے گا۔ اور تورات سے پتہ چلتا ہے کہ بنو اسمٰعیل عرب میں جا کر بسے ہیں۔ اس کے متعلق بائبل کے بہت سے حوالے ہیں۔ یسعیاہ نبی کی کتاب میں بھی جہاں وہ عرب کے متعلق پیشگوئی کرتے ہیں بنو اسمٰعیل کا خاص طور پر نام آتا ہے گویا یسعیاہ نبی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ بنو اسمٰعیل عرب میں بسے ہوئے تھے۔ غرض ایک طرف بائبل یہ بتاتی ہے کہ بنو اسمٰعیل عرب میں تھے اور دوسری طرف بائبل یہ پیشگوئی کرتی ہے کہ بنو اسحاق کے بھائیوں یعنی بنو اسمٰعیل میں کو ایک نبی آئے گا۔ ان دونوں پیشگوئیوں کو ملا کر یا پیشگوئی کے دونوں گروہوں کو ملا کر صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک نبی بنو اسمٰعیل میں آنے والا تھا۔ پس جب اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا وقت قریب آگیا تو لوگوں میں اس آنے والے موعود کے متعلق ایک عام چرچا شروع ہو گیا۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی آمد کے متعلق گذشتہ اولیاء نے بھی بہت سی پیشگوئیاں کی ہوئی تھیں اور لوگ اُن کا علم رکھتے تھے۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی یہ سُنت ہے کہ وہ عظیم الشان پیشگوئیاں جہاں انبیاء سے کراتا ہے وہاں انبیاء کے بعد آنیوالے اولیاء سے بھی اُن کے متعلق کئی قسم کی

پیشگوئیاں کرا دیتا ہے اسی وجہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
کے متعلق بہت سی پیشگوئیاں یہودی کتب میں ایسی پائی جاتی ہیں جو
بائبل میں نہیں اور جو درحقیقت یہود کے اولیاء کی تھیں۔
حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق بھی بیسیوں
پیشگوئیاں ایسی ہیں جو اُمتِ محمدیہ کے اولیاء نے کی ہیں۔
اہم اور بنیادی پیشگوئیاں تو انبیاء کے ذریعہ ہی ہوتی ہیں لیکن
بعض چھوٹی چھوٹی کیفیتیں اللہ تعالیٰ اولیاء کے ذریعہ بھی
بیان کر دیتا ہے اور اس طرح تمام دنیا مختلف پیشگوئیوں کو
مدنظر رکھتے ہوئے موعود کا انتظار کرنے لگتی ہے۔ جب
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا زمانہ قریب آگیا تو
الٰہی سُنت کے مطابق عام طبائع میں یہ احساس پیدا ہونا
شروع ہو گیا کہ اب کوئی ظہور ہونے والا ہے جس طرح
حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قریب زمانہ میں
لوگوں میں ایک عام حرکت پیدا ہو گئی تھی اور عیسائی مسیح کا
اور مسلمان مہدی کا اور دوسری قومیں اپنے اپنے موعود کا
انتظار کرنے لگ گئی تھیں۔ چونکہ عیسائیوں کو بائبل اور اولیاء
کی پیشگوئیوں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ نبی عرب میں پیدا
ہوگا اس لئے اُن میں گھبراہٹ تھی کہ اب ایک شدید حملہ
مسیحیت پر ہونے والا ہے۔ چنانچہ بخاری اور دوسری
کتبِ احادیث میں صاف لکھا ہے کہ قیصرِ روما اُس وقت
ستاروں کو دیکھا کرتا تھا تا اُسے معلوم ہو کہ مختون نبی (یعنی
عرب) کب پیدا ہوگا۔ اس بارہ میں جو حدیث آتی ہے اُس
میں لکھا ہے کہ قیصرِ روما شام میں تھا کہ اُس نے ایک دن
ستاروں کو دیکھا اور کہا ان ستاروں سے معلوم ہوتا ہے
کہ وہ نبی جس کی خبر کتابوں میں دی گئی ہے وہ عنقریب ظاہر
ہونے والا ہے۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا تبلیغی خط اُسے
پہنچا تو ابوسفیان اُن دنوں وہیں تھا وہ خود کہتا ہے کہ قیصرِ روما
نے مجھے بلایا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام حالات مجھ
سے پوچھے اور پھر اُس نے اپنی قوم سے کہا مجھے تو یہ وہی نبی
معلوم ہوتا ہے جس کی خبر ہماری پیشگوئیوں میں پائی جاتی ہے

اسی طرح حدیثوں میں آتا ہے کہ اُس نے ایک دن ستاروں
میں دیکھا اور کہا کہ نبی مختون عنقریب ظاہر ہونے والا ہے۔
میں سمجھتا ہوں جب قیصرِ روما نے ستاروں کو دیکھ کر یہ بات
کہی تو ابوسفیان نے اپنے زمانہ کے خیالات کے مطابق یہ سمجھ
لیا کہ جیسے نجومی پیشگوئی کرتے ہیں اسی طرح قیصرِ روما نے
ستاروں کو دیکھ کر یہ بات کہی ہے۔ حالانکہ نہ اُس قسم کے
نجومی دنیا میں ہوتے ہیں اور نہ وہ پیشگوئیاں کرتے ہیں۔ یہ
ساری بات ہی غلط ہے اصل بات جو میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے
کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ عظیم الشان خبریں جو نبیوں کے
متعلق ہوتی ہیں اُن میں آنے والے نبی کی علامت کے طور پر
بعض ایسی خبریں بھی ہوتی ہیں جو ستاروں اور سیاروں سے
تعلق رکھتی ہیں۔ جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
ہمارے مہدی کی دو علامتیں ایسی ہیں کہ جب سے زمین و آسمان
پیدا ہوئے ہیں یہ دو علامتیں کسی مدعی کی تصدیق کیلئے ظاہر
نہیں ہوئیں۔ اور وہ یہ کہ رمضان کے مہینہ میں چاند کو اُسکے
گرہن کی تاریخوں میں سے پہلی رات اور سورج کو اُس کے گرہن
کی تاریخوں میں سے دوسری تاریخ گرہن لگے گا (دارقطنی)
اب اگر کوئی شخص سورج اور چاند کو گرہن لگتے دیکھ کر یہ کہے کہ
میں نے سورج اور چاند کو دیکھ کر یہ سمجھا ہے کہ مہدویت کا مدعی
ظاہر ہو گیا ہے یا عنقریب ظاہر ہونے والا ہے تو کیا کوئی
شخص اس کا یہ مطلب لے گا کہ اُس نے سورج اور چاند کی شکل
دیکھ کر یہ اندازہ لگایا ہے یا سورج اور چاند کی حرکتوں سے اُس
نے یہ پیشگوئی معلوم کی ہے۔ وہ کہیگا یہی کہ میں نے سورج اور
چاند کو دیکھ کر یہ سمجھا ہے۔ مگر اُس کی مراد یہ ہوگی کہ سورج اور
چاند کے متعلق جو پیشگوئی تھی اُس کو پورا ہوتے دیکھ کر میں نے
یہ سمجھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی موعود آنے والا ہے
اسی طرح قیصرِ روما کے قول کا یہ مطلب نہیں کہ نجومی کی طرح اُس
نے ستاروں کو دیکھا اور سمجھ لیا کہ عرب کا نبی ظاہر ہونیوالا
ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں ستاروں کے متعلق پہلی کتب میں کوئی
خاص پیشگوئی ہوگی جو اُن کے اولیاء نے کی ہوگی اور

جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ثبوت ہوگی۔ جب قیصر روما نے اُس علامت کو ستاروں میں پورا ہوتے دیکھا تو اُس نے سمجھ لیا کہ نبی مختون کے ظہور کا وقت اب قریب آگیا ہے۔

ہماری جماعت کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مخالف مولوی جو غالباً گجرات کا رہنے والا تھا ہمیشہ لوگوں سے کہتا رہتا تھا کہ مرزا صاحب کے دعویٰ ہی بالکل دھوکا نہ کھانا حدیثوں میں صاف لکھا ہے کہ مہدی کی علامت یہ ہے کہ اُس کے زمانہ میں سورج اور چاند کو رمضان کے مہینہ میں گرہن لگے گا۔ جب تک یہ پیشگوئی پوری نہ ہو اور سورج اور چاند کو رمضان کے مہینہ میں گرہن نہ لگے اُن کے دعویٰ کو ہرگز سچا نہیں سمجھا جا سکتا۔ اتفاق کی بات ہے وہ ابھی زندہ ہی تھا کہ سورج اور چاند کے گرہن کی پیشگوئی پوری ہوگئی۔ اُس کے ہمسائے میں ایک احمدی رہتا تھا اُس نے سُنایا کہ جب سورج کو گرہن لگا تو اُس نے گھبراہٹ میں اپنے مکان کی چھت پر چڑھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ ٹہلتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا "ہُن لوگ گمراہ ہون گے"۔ "ہُن لوگ گمراہ ہون گے"۔ یعنی اب لوگ گمراہ ہو جائیں گے۔ اُس نے یہ نہ سمجھا کہ جب پیشگوئی پوری ہوگئی ہے تو لوگ حضرت مرزا صاحب کو مان کر ہدایت پائیں گے گمراہ نہیں ہوں گے۔ عیسائی بھی ایک طرف تو یہ مانتے تھے کہ وہ تمام علامتیں پوری ہوگئی ہیں جو پہلی کتب میں پائی جاتی ہیں مگر دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ سُنکر وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اس وقت اتفاقی طور پر ایک جھوٹے نے دعویٰ کر دیا ہے جیسے مسلمان کہتے ہیں علامتیں تو پوری ہوگئی ہیں مگر اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس وقت ایک جھوٹے نے دعویٰ کر دیا ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ ایسا اتفاق ایک جھوٹے کو ہی نصیب ہوتا ہے سچے کو نصیب نہیں ہوتا۔

غرض میرے نزدیک پہلی کتابوں میں اس قسم کی پیشگوئی پائی جاتی تھی کہ فلاں ستارہ جب فلاں جگہ پر ہوگا یا فلاں علامت تمہیں ستاروں میں دکھائی دے گی تو یہ اس بات کا نشان ہوگا کہ وہ نبی جس کی خبر دی جا رہی ہے عنقریب ظاہر ہونیوالا ہے۔

قیصر نے ایسی ہی کوئی علامت دیکھ کر یہ بات کہی لیکن سننے والے چونکہ اصل حقیقت سے آگاہ نہیں تھے اس لئے جب اُس نے یہ کہا کہ میں نے ستاروں میں نبی مختون کی علامت دیکھ لی ہے تو انہوں نے یہ سمجھا کہ جس طرح نجومی ستاروں کو دیکھا کرتے ہیں اسی طرح اُس نے ستاروں کو دیکھ کر کوئی بات معلوم کی ہے۔

اسی طرح میں پہلے بتا چکا ہوں کہ عرب لوگ محمد نام نہیں رکھتے تھے مگر جب آنے والے موعود کے متعلق عام چرچا شروع ہُوا تو انہوں نے اپنے بچوں کا نام محمد رکھنا شروع کر دیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بائبل کی پیشگوئیوں سے یہ سمجھا گیا تھا کہ نبی عرب محمد نامی ہوگا۔ پس قرب زمانہ نبوی میں جب عربوں میں یہ احساس پیدا ہُوا کہ آنے والا آرہا ہے تو انہوں نے تفاؤل کے طور پر اپنے بچوں کے نام محمد رکھنے شروع کر دئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس وقت یہ عام احساس پیدا ہو رہا تھا کہ نبی عربی کا زمانہ قریب آگیا ہے۔

پھر لوگوں کے اس عام احساس کا اس امر سے بھی پتہ لگتا ہے کہ یہودی لوگ شام کو چھوڑ کر مدینہ اور خیبر میں آبسے تھے کیونکہ اُن کے اولیاء نے انہیں یہ خبریں دے رکھی تھیں کہ اب وہ "نبی" ظاہر ہونے والا ہے لیکن ظاہر جنوبی علاقہ میں ہوگا گویا وہ اُس کا علاقہ مدینہ اور اُس کا ماحول بتاتے تھے اور اپنی قوم کو نصیحت کرتے تھے کہ تم اس طرف کو چلے جاؤ تاکہ جب وہ نبی مبعوث ہو تو اُسکی برکت سے تم عیسائیوں کے ظلموں سے بچ جاؤ۔ اُن میں یہ خبر تھی کہ اگر وہ اُس موعود کو مان لینگے تو اللہ تعالیٰ اُنکی مشکلات کو دُور کر دیگا بعض یہودیوں کی نسبت تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ مدینہ اور اُسکے نواح میں اس لئے آکر بسے تھے کہ وہ نبی اس علاقہ میں ظاہر ہونیوالا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ عرب کی طرف ہجرت کی رو اور مدینہ کے قریب یہود کا بستیاں بنانا انہی پیشگوئیوں کی وجہ سے تھا۔

یہ ساری باتیں جن کا اُوپر ذکر کیا جا چکا ہے بتاتی ہیں۔ عیسائیوں اور یہود دونوں میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا بڑی شدت کے ساتھ انتظار کیا جا رہا تھا۔ قیصر روما

نے آسمان پر ایسی علامتیں دیکھیں جن کو دیکھ کر اُسے کہنا پڑا کہ نبیٔ مختون کے ظہور کا وقت آگیا ہے۔ یہودی اس لئے مدینہ میں ہجرت کر کے آئے کہ اُن کے اولیاء نے یہ بتایا تھا کہ وہ نبی اِس علاقہ میں ظاہر ہونے والا ہے اور عربوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے پہلے اس لئے اپنے بچوں کا نام محمد رکھنا شروع کر دیا جو پہلے نہیں ہوتا تھا کہ شاید انہی کا بچہ وہ خوش قسمت بچہ ہو جس نے دنیا کا نجات دہندہ بننا ہے۔ یہ تینوں باتیں بتاتی ہیں کہ عربوں میں بھی احساس تھا کہ اُس نبی کے پیدا ہونے کا وقت آگیا ہے۔ یہود میں بھی یہ احساس تھا کہ اُس نبی کے پیدا ہونے کا وقت آگیا ہے اور عیسائیوں میں بھی یہ احساس تھا کہ اُس نبی کے پیدا ہونے کا وقت آگیا ہے۔ لیکن یہودیوں اور مسیحیوں یا یُوں کہو کہ اُن میں سے اکثر کا یہ خیال تھا کہ وہ ہوگا اُن کی قوم میں سے۔ گو ظاہر ہوگا عرب سے۔ وہ یہ تو سمجھتے تھے کہ علامتیں بالکل ظاہر ہیں مگر وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ یہ نبی ہم میں سے ظاہر ہوگا کسی اَور قوم میں سے نہیں ہوگا۔ عرب سمجھتے تھے کہ ہم میں سے ہوگا، عیسائی سمجھتے تھے کہ ہم میں سے ہوگا، یہودی سمجھتے تھے کہ ہم میں سے ہوگا۔

غرض اُن میں یہ تو چرچا تھا کہ وہ موعود جس کی خبر دی گئی تھی آنے والا ہے مگر وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہم میں سے آئے گا کسی اَور قوم میں سے نہیں آئے گا۔ یہودی سمجھتے تھے کہ ہم میں سے آئے گا اور عیسائی سمجھتے تھے کہ ہم میں سے آئے گا اور چونکہ آنے والے کی خبریں ہر قوم میں پائی جاتی تھیں اس لئے اُن کے دلوں میں یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں ان پیشگوئیوں سے کوئی اور قوم "ناجائز فائدہ" نہ اُٹھالے۔ اور چونکہ مسیحی دنیا کے بادشاہ تھے وہ سیاسی طور پر اس خیال کے تقویت پانے کو اپنے خلاف سمجھتے تھے۔ اِس لئے اُن میں سے بعض صاحبِ اقتدار لوگوں نے یہ خیال کیا کہ بہتر ہو کہ عربوں کے شیرازہ کو بکھیر دیا جائے تاکہ نبیٔ عربی کے خیال کے ماتحت یہ ایک مرکز پر جمع نہ ہو جائیں اور مسیحیت کے لئے مشکلات پیش نہ آئیں۔ چنانچہ انہی باتوں کے نتیجہ میں ابرہہ نے پہلے گرجا بنایا پھر اُسے رشوتوں سے عربوں میں مقبول کرنا چاہا اور جب اِس میں اُسے کامیابی نہ ہوئی تو خانۂ کعبہ کو گرانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے جو نشان دکھایا اُس نے بجائے آپؐ کا رستہ روکنے کے اُس کو اَور بھی کھلا کر دیا اور دنیا پر واضح کر دیا کہ اللہ تعالےٰ اُسی کے ساتھ ہے جس کے لئے اِس خانۂ کعبہ کی بنیاد رکھی گئی تھی اور اُس کا مخالف ہے جو اِس گھر کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ اِس گھر کو نہیں مٹاتا بلکہ اُس مقصود پر حملہ کرتا ہے جس کے لئے اِس گھر کو بنایا گیا تھا لطیفہ یہ ہے کہ وہی قوم جس نے اِس نبی کو گرانے کی کوشش کی تھی اُسی قوم کے پروں کے نیچے نبی عربی کی جماعت نے پناہ حاصل کی۔ یمن حبشہ کا صوبہ تھا اور یمن کا گورنر نجاشی کے ماتحت تھا یہ نجاشی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک زندہ رہا۔ اِس نجاشی کی فوج کسی زمانہ میں مکہ پر حملہ آور ہوئی کہ وہ خانۂ کعبہ کو گرائے۔ اِس لئے آئی کہ یہ نقطۂ مرکزی نہ رہے تاکہ اگر عرب میں کوئی مدعیٔ نبوت کھڑا بھی ہو تو اُسے خانۂ کعبہ سے طاقت حاصل نہ ہو۔ مگر اللہ تعالےٰ کی شان اور اُس کی قدرت دیکھو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیدا ہوئے، مکہ میں جوان ہوئے اور مکہ میں ہی ادھیڑ عمر کو پہنچے مگر جب چالیس سال کے بعد آپؐ نے نبوت کا دعویٰ فرمایا تو مکہ کے لوگوں نے آپ کی مخالفت کی اور رفتہ رفتہ یہ مخالفت اتنی ترقی کر گئی کہ دعویٔ نبوت کے پانچویں سال مکہ والوں کے مظالم سے تنگ آکر آپ کی قوم پناہ لینے کے لئے ایک غیر ملک کی طرف ہجرت کر گئی اور وہ ملک اسی نجاشی کا ملک تھا جس کے لشکر نے نبی عربی کی طاقت توڑنے کے لئے مکہ پر حملہ کیا تھا۔ مکہ کے لوگوں کو جب اِس بات کا علم ہوا تو وہ بھی اُن کے پیچھے پیچھے حبشہ پہنچے تاکہ نجاشی کو کہہ کر وہ اِن لوگوں کو مکہ میں واپس لائیں اور اُن پر اپنے مظالم کا سلسلہ جاری رکھیں۔ خدا کی قدرت ہے وہ مکہ والے جو ابرہہ کا خانۂ کعبہ پر حملہ برداشت نہ کر سکتے تھے اور جو ابرہہ سے لڑنے کی طاقت اپنے اندر نہ پاکر پہاڑوں پر چلے گئے تھے

وہ ابرہہ کے بادشاہ نجاشی کے پاس اس لئے جاتے ہیں کہ اُس
شخص کی جماعت کو مارا جائے جس کیلئے خانۂ کعبہ کی بنیاد
رکھی گئی تھی۔ مگر وہ نجاشی جس کا لشکر اس لئے آیا تھا کہ
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عرب میں پیدا نہ ہوں وُہ
آپ کی مدد کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے گویا مارنیوالا بچانے والا
بن جاتا ہے اور بچانے والا مارنے والا بن جاتا ہے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ جب مکہ سے ہجرت
کرکے حبشہ پہنچے اور قریش کو اس کا علم ہُوا تو انہوں نے
اپنے دو سرداروں کو جن میں سے ایک حضرت عمرو بن العاص بھی
تھے جو بعد میں اسلام لے آئے اور دوسرے عبد اللہ
بن ربیعہ تھے حبشہ بھجوایا۔ تاکہ نجاشی سے مل کر ان لوگوں کو
مکہ میں واپس لایا جائے۔ وہ اپنے ساتھ بہت کچھ تحائف لیکر
حبشہ پہنچے اور انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ ہمارے کچھ غلام
مکہ سے بھاگ کر آپ کے ملک میں آگئے ہیں آپ انکو ہمارے
ساتھ واپس بھجوا دیں۔ نجاشی نے مسلمانوں کو بلایا اور اُن سے
پوچھا کہ کیا بات ہے۔ انہوں نے کہا۔ اے بادشاہ! ہم ہر قسم
کے فسق و فجور میں مبتلا تھے۔ دن رات شراب پیتے اور ہر قسم
کے گھناؤنے اور ناجائز کاموں میں مبتلا رہتے تھے کہ اللہ تعالےٰ
نے اپنا ایک رسول ہم میں مبعوث فرمایا اور ہم اُس پر ایمان
لے آئے۔ اُس پر ایمان لانے کی برکت سے اب ہم ایک خدا
کو مانتے ہیں، جھوٹ سے پرہیز کرتے ہیں، فسق و فجور سے
بچتے ہیں، ظلم کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے ہیں، نیک کاموں
میں حصہ لیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اپنی زندگی مفید
کاموں میں صرف کریں۔ مگر ہماری قوم کے افراد کو ہم سے
اختلاف ہے اور وہ اس کی وجہ سے ہم پر ہر قسم کے مظالم کرتی
ہے۔ ہم نے جب اس کے مظالم کو بڑھتے ہوئے دیکھا تو ہم
تیرے ملک میں پناہ لینے کے لئے آگئے۔ اے بادشاہ!
ہم نے سنا ہے کہ تُو بڑا منصف ہے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے
متعلق انصاف سے کام لیا جائے اور ہمیں ہماری قوم کے
حوالے نہ کیا جائے۔ بادشاہ نے کہا ٹھیک ہے آپ لوگ
میرے ملک میں بڑی خوشی سے رہ سکتے ہیں اور اُس نے
قریش کو جواب دے دیا کہ میں مسلمانوں کو تمہارے ساتھ
روانہ نہیں کرسکتا۔ دوسرے دن انہوں نے پادریوں کو
اُکسایا اور کہا کہ یہ مسلمان تمہارے مسیح کو گالیاں دیتے ہیں
انہوں نے دربار میں شور مچا دیا کہ آپ نے ان لوگوں کو
چھوڑ کیسے دیا یہ تو ہمارے دین کے سخت مخالف ہیں انکو
اپنے ملک میں ہرگز پناہ نہیں دینی چاہیئے۔ بادشاہ نے
مسلمانوں کو پھر بلایا اور اُن سے پوچھا کہ بتاؤ مسیح اور انکی
والدہ حضرت مریم صدیقہ کے متعلق تمہارا کیا عقیدہ ہے؟
انہوں نے کہا مسیح کو ہم نبی سمجھتے ہیں اور حضرت مریم کو
صدیقہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے سورۂ مریم کی کچھ
آیتیں بھی پڑھ کر سنائیں جن میں ان عقائد کا ذکر آتا ہے۔
بادشاہ نے کہا یہ باتیں تو ٹھیک ہیں۔ نجاشی دراصل موحد
تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے ایک نشان اپنے زمانۂ
بچپن میں دیکھا تھا جس کی وجہ سے وہ موحد ہو گیا تھا۔ آجتک
بھی عیسائیوں میں ایک موحد فرقہ پایا جاتا ہے۔ وہ یہ تو سمجھتے
ہیں کہ حضرت مسیح سب سے بڑے نبی ہیں مگر بہرحال وہ آپکو نبی ہی
سمجھتے ہیں خدا نہیں سمجھتے جب نجاشی نے کہا کہ مسلمان ٹھیک
کہتے ہیں تو اُس کی قوم نے شور مچا دیا کہ ٹھیک کس طرح ہے
مسیح اور اُس کی والدہ حضرت مریم کو تو خدائی طاقتیں حاصل
تھیں۔ اُس وقت اُس نے اپنے سامنے پڑا ہُوا ایک تنکا اٹھایا
اور اُسے اُٹھا کر کہا خدا کی قسم مسیح کا جو درجہ ان مسلمانوں نے
بیان کیا ہے مَیں ایک تنکے کے برابر بھی مسیح کو اس سے زیادہ
نہیں سمجھتا۔ اگر تم لوگ خفا ہوتے ہو تو بے شک ہو جاؤ مجھے
تمہاری پروا نہیں۔ میں ابھی بچہ تھا کہ تم نے مجھ سے غداری
کی مگر میرے خدا نے اُس وقت مجھے تخت دیا اور تمہیں میرے
مقابلہ میں ناکام و نامراد رکھا جس خدا نے مجھے اُس وقت
تخت دیا تھا جب میں بچہ تھا اُس خدا سے میں اب بڑھاپے
میں غداری نہیں کرسکتا اور مسیح کو کوئی ایسا درجہ نہیں
دے سکتا جو حقیقت کے خلاف ہو۔

جس واقعہ کی طرف نجاشی نے اشارہ کیا وہ یہ تھا کہ ابھی یہ چھ سات سال کی عمر کا ہی تھا کہ اس کا باپ مرگیا اور اس کا چچا سلطنت کا سربراہ ہو کر کام کرنے لگا کچھ عرصہ کے بعد اُس نے یہ دیکھ کر کہ میرا بھتیجا ابھی بہت چھوٹا ہے اور اس کے جوان ہونے میں دیر لگے گی پادریوں اور امراء کو بلا کر کہا کہ اس بچہ کے جوان ہونے تک تو ملک کی حالت بہت کمزور ہو جائے گی اگر تم لوگ مناسب سمجھو تو میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دوں۔ چونکہ اُس وقت وہی برسرِ اقتدار تھا اور نجاشی بہت چھوٹا تھا انہوں نے اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ایک دن درباریوں میں سے کسی نے اپنے گھر میں یہ بات کی جو اُس کے لڑکے نے بھی سُن لی اور چونکہ لڑکے لڑکوں کے دوست ہوتے ہیں اُس نے یہ بات نجاشی کو آکر سُنادی کہ تمہارا چچا اپنی بادشاہت کا اعلان کرنے والا ہے۔ لڑکا بڑا دلیر تھا اُس کا چچا کسی مہم کے لئے باہر گیا ہوا تھا جب وہ واپس آیا تو اُس کے دروازہ میں داخل ہوتے ہی لڑکا تیر کمان لے کر اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور عین اُس کے دل کی طرف تیر کھینچ کر کہنے لگا۔ گھوڑے پر سے اُتر آؤ اور بادشاہت میرے حوالے کر دو ورنہ میں ابھی تمہیں مار ڈالوں گا۔ فوجی افسروں میں بھی یہ بات پھیل چکی تھی انہوں نے جب ایک چھوٹے بچے کو اس دلیری کے ساتھ کھڑا ہوتے دیکھا تو اس کا اُن پر اتنا اثر ہوا کہ تمام نوجوان طبقہ اُسی وقت باغی ہو گیا اور نجاشی کے ساتھ مل گیا۔ اُس کے چچا نے جب یہ نظارہ دیکھا تو سمجھا کہ مقابلہ فضول ہے اور بادشاہت اُس کے حوالے کر دی۔ یہی واقعہ نجاشی نے اپنے درباریوں کو یاد دلایا اور کہا تم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہو کہ ہم یہ تخت تم سے چھین لیں گے مگر جس خدا نے میری اُس وقت مدد کی تھی جب میں چھوٹا بچہ تھا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اب اتنی لمبی عمر اُس کے فضل اور احسان کے ماتحت گذارنے کے بعد میں اُس سے غدّاری کروں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ خدا کی تعلیم یہی ہے کہ مسیحؑ نبی تھا اِس سے بلند کوئی اور مقام میں مسیحؑ کو ہرگز نہیں دے سکتا۔

جب اُس نے یہ بات کہی تو درباری ڈر کر خاموش ہو گئے اور بادشاہ نے مسلمانوں کو اجازت دے دی کہ وہ آزادی کے ساتھ اُس کے ملک میں رہیں۔ دیکھو یہ کتنی عجیب بات ہے ابرہہ کا لشکر خانہ کعبہ کو گرانے جاتا ہے بلکہ خانہ کعبہ کو نہیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو گرانے جاتا ہے۔ کیونکہ اُس کا عقیدہ یہی تھا کہ جو موعود آئے گا عیسائیوں میں سے آئے گا کسی اور قوم میں سے نہیں۔ اُس نے چاہا کہ عرب جو ایک نبی کا انتظار کر رہے ہیں اور جن کے اتحاد کا نقطہ مرکزی خانہ کعبہ ہے اُن کو عیسائیت کے مقابلہ میں مغلوب رکھنے کے لئے خانہ کعبہ کو گرا دے اور اُن کے شیرازہ کو بکھیر دے تاکہ نبیٔ عربی کے خیال کے ماتحت وہ ایک مرکز پر جمع نہ ہو سکیں مگر وہی جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو گرانے کے لئے کھڑا ہوا تھا اُسی کے ہاں مسلمانوں نے پناہ لی۔

یہ مت خیال کرو کہ مسلمانوں کی اصل جگہ تو مکہ تھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اُن کے خاص صحابہ تو مکہ ہی میں رہے تھے پھر نجاشی نے اُنہیں کس طرح پناہ دی اور کس طرح اُس قوم کے پروں کے نیچے انہوں نے ترقی کی حقیقت یہ ہے کہ اِس ہجرت کی وجہ سے مکہ کے مسلمان بھی کفار کے ظلم و ستم سے بچ گئے تھے۔ چنانچہ جتنا قتل و غارت اور خون خرابہ ہجرت حبشہ سے پہلے ثابت ہے اُتنا خون خرابہ ہجرت حبشہ کے بعد ثابت نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ اگر مسلمانوں کو مارنا چاہتے تھے تو اس لئے تو نہیں کہ زید یا بکر سے انہیں کوئی دشمنی تھی وہ اس لئے مارنا چاہتے تھے کہ اسلام کا وجود ہی مٹ جائے۔ مگر اب مسلمانوں کا اسّی فی صدی حصہ حبشہ میں جا چکا تھا اور صرف بیس فی صدی حصہ مکہ میں رہ گیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ہم نے بیس فی صدی مسلمانوں کو مار بھی دیا تو کچھ نہیں بنے گا کیونکہ حبشہ میں اسلام کا درخت اپنی جڑیں پکڑ چکا ہے۔ پس مسلمانوں کے حبشہ جانے کی وجہ سے اُس مارپیٹ کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا جو مکہ میں جاری تھی۔ بعد میں بے شک انہوں نے

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک وادی میں قید بھی رکھا اور انہوں نے آپ کو بھوکا اور پیاسا بھی رکھا۔ اسی طرح مسلمانوں کو اُنہوں نے اَور کئی رنگوں میں دُکھ دئے مگر بہرحال اُن کا یہ رنگ بدل گیا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اب انکو مارنے پیٹنے کا اتنا فائدہ نہیں۔ پس ہجرت کی وجہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کو ترقی مل گئی اور ملی بھی اُسی قوم کے زیرِ سایہ جس نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تباہ کرنے کی کوشش کی تھی اِسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے گھر میں پالا گویا وہی جو آپ کی تباہی کی کوشش کر رہا تھا اُسی کے گھر میں آپ پل رہے تھے۔ اِسی قسم کے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بعض اور بھی واقعات ہیں مثلاً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بچپن میں ثقیف قوم میں پرورش پائی حالانکہ یہ ثقیف قوم وہی تھی جس نے ابرہہ کو راہنما دئے تھے تاکہ وہ جاتے اور خانۂ کعبہ کو گرائے۔ گویا وہی قوم جو خانۂ کعبہ کو گرانے کے لئے اپنی خدمات پیش کرتی ہے اُسی کے گھر میں خانۂ کعبہ کا مقصود پرورش پاتا اور اپنی زندگی کے کئی سال بسر کرتا ہے اِس زمانہ میں بھی دیکھ لو مہدویت کے مدعیوں سے جہاں بھی مقابلہ کیا ہے انگریزوں نے کیا ہے مگر پھر انگریزوں کے سایہ تلے ہی مسیح موعودؑ نے ترقی کی ہے۔ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت مرزا صاحب نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ مَیں انگریزوں کے سایہ تلے پلا ہوں۔ اُن نادانوں سے کوئی پوچھے کیا خدا نے یہ نہیں کیا کہ موسیٰؑ فرعون کے سایہ تلے پلے؟ کیا خدا نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جماعت کو نجاشی کے سایہ تلے نہیں پالا؟ یہ تو اللہ تعالےٰ کی سُنت ہے کہ وہ اپنے انبیاء کو دشمنوں کے سایہ تلے ترقی دیتا ہے جو اُن کی صداقت کا ایک ثبوت اور اُن کی جماعتوں کے لئے ایک قابلِ فخر بات ہوتی ہے۔ جب مرزا صاحب نے یہ لکھا کہ مَیں انگریزوں کے سایہ تلے پلا ہوں تو درحقیقت اِن الفاظ کے ذریعہ آپ نے اپنے دشمن کو بتایا کہ اللہ تعالےٰ کا یہ عجیب نشان دیکھ کر جو مہدی کا سب سے بڑا دشمن تھا اُسی کے سایہ کے نیچے خدا نے مجھے ترقی دی۔ غرض اللہ تعالیٰ کی یہ ایک عظیم الشان سُنت چلی آتی ہے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ظاہر ہوئی اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں بھی ظاہر ہوئی کہ وہ اپنی جماعتوں کو اپنے دشمنوں کے سایہ تلے ترقی دیتا ہے۔ حضرت مسیحؑ ناصری کے زمانہ میں بھی یہی بات ہوئی۔ یہودی آپ کے متعلق بار بار کہتے تھے کہ یہ بادشاہ ہونیکا مدعی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ روما کی حکومت کو تباہ کر دے مگر اُسی روما کی حکومت کے سایہ تلے آپ نے پرورش پائی اور پھر ایک دن وہ آپ کی غلامی میں بھی داخل ہو گئی گویا آپ نے اُس حکومت کو تو تباہ کیا مگر اس طرح کہ اُس کا مذہب بدل دیا اور اُسے عیسائی بنا لیا۔

خانہ کعبہ پر حملہ کرنیوالوں کی تباہی کے متعلق وہیری کے بعض اعتراضات

وہیری اِس جگہ لکھتا ہے کہ اس واقعہ کا مضمون کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں۔ اُس کا مطلب یہ ہے کہ جو حملہ آور تھے وہ مسیحی تھے جن کو قرآن کریم اہل کتاب کہتا ہے اور جو مکہ میں رہنے والے تھے وہ کافر تھے۔ پس وہ کہتا ہے یہ عجیب بات ہے کہ مسلمان اِسے خدا کا کلام تو کہتے ہیں مگر اُن میں اتنی عقل نہیں کہ یہ بے جوڑ بات اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ اہلِ کتاب کو مشرکوں کے مقابلہ میں سزا دی گئی۔ وہ کہتا ہے مسلمان اِس کو نشان قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ نشان نہیں بلکہ اِس میں اللہ تعالےٰ کی ہتک ہے کیونکہ سزا مشرکوں کو ملنی چاہیئے تھی نہ کہ اہلِ کتاب کو۔

دوسری بے جوڑ بات یہ ہے کہ خود تاریخ مانتی ہے کہ صنعاء کے گرجا کی ہتک کی گئی اور اُس میں کسی عرب نے پاخانہ کر دیا۔ اسی طرح تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ اُس گرجا کو آگ لگائی گئی اور یہ آگ لگانے والے بھی عرب تھے پس قصور سراسر عربوں کا تھا۔ عربوں نے ایک معبد کی ہتک کی اور پھر خدا کی عبادت گاہ کو آگ لگانے کی کوشش کی۔ مگر قرآن کریم کا خدا نعوذ باللہ ایسا بے سمجھ ہے کہ جو گرجا کی ہتک کا بدلہ لینے کے لئے گیا تھا اُس پر تو عذاب نازل کر دیا اور

جنھوں نے ایک معبد کی ہتک کی تھی اور بلا وجہ قوم کو مشتعل دلایا تھا اُن کی تائید کر دی۔ یہ عجیب خدا ہے کہ جو مظلوم تھا اُس پر اُس نے عذاب نازل کر دیا اور جو ظالم تھا اسکی تائید کر دی۔ جو خدا کو ماننے والے تھے اُن کو تو مار دیا اور جو مشرک اور بُت پرست تھے اُن کو بچا لیا۔

پادری وہیری WHERRY جس کے اعتراضات کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے ایک امریکن پادری تھا جس کی بڑی عمر لدھیانہ میں گذری۔ اُس نے قرآن کریم کی ایک تفسیر بھی لکھی ہے اور گو اُس کا نام تفسیر ہے مگر حقیقتاً وہ تمام عیسائی معترض جنھوں نے کبھی اور کسی زمانہ اور کسی ملک اور کسی زبان میں اسلام پر اعتراض کئے تھے وہ تمام اعتراضات اُس نے اِس کتاب میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک ایسا انسان جس کو قرآنی علوم کی واقفیت ہو اور جو اُس کے وسیع مطالب کا صحیح رنگ میں علم رکھتا ہو اُس کے لئے یہ ایک دلچسپ تفسیر ہے۔ کیونکہ یہ اتنی بے جوڑ ... اتنی لغو، اتنی دُور از کار اور اتنی پیش پا افتادہ باتوں ... میں ہے کہ اُنھیں پڑھ کر حیرت آتی ہے۔ اور تعجب آتا ہے کہ وہ انسان جس نے یہ تعلیم دی تھی کہ اگر کوئی تیرے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تُو اپنا دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے اُس کے پیروؤں کا آج اگر عمل ہے تو اس بات پر کہ جس نے تیری سات پشت کو بھی تھپڑ نہیں مارا تو اُس کو بھی اور اُس کی سات پشت کو بھی تھپڑ مار۔ اِس سُورۃ کے نیچے اُسے اعتراض کرنے کے لئے اَور تو کچھ نہیں ملا کیونکہ اُس کے نزدیک یہ صرف ایک قصہ ہے گو ہمارے نزدیک صرف قصہ نہیں کیونکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم میں کوئی بات بطور قصہ بیان نہیں اگر وہ کسی گذشتہ قصہ کو بیان بھی کرتا ہے تو درحقیقت اُس میں آئندہ کے متعلق پیشگوئی ہوتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ گو یہ واقعہ پیچھے ہو چکا ہے مگر آئندہ زمانہ میں بھی ایک اِسی قسم کا واقعہ ہونے والا ہے۔ بہرحال اِس کو صرف ایک گذشتہ قصہ تسلیم کرنے کیوجہ سے اُسے اَور تو کوئی اعتراض نہیں سوجھا صرف یہ اعتراض سوجھا ہے کہ یہ عجیب بات ہے کہ قرآن اِس کو نشان قرار دیتا ہے حالانکہ یہ کیسا نشان ہُوا کہ جن کو سزا ملی وہ اہل کتاب میں سے تھے جو قرآن کریم کے نزدیک بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی ایک سچی کتاب پر ایمان رکھنے والے تھے اور جن کے مقابلہ میں یہ معجزہ دکھایا گیا وہ مکہ کے بُت پرست اور مشرک تھے کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایک طرف تو قرآن اپنے آپ کو خدائی کتاب کہتا ہے اور دوسری طرف وہ یہ بتاتا ہے کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ میں کچھ بھی غیرت نہیں تھی اُس نے مسیح ناصری پر ایمان لانے والوں اور اپنی ایک کتاب کو الہامی تسلیم کرنے والوں کو تو ذلیل کیا اور مارا اور جو بُت پرست تھے جن کو تمام قرآن میں بُرا بھلا کہا گیا ہے اور جو یقیناً اہلِ کتاب کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے اُن کو بچایا اور اُن کی تائید میں اپنے فرشتے نازل کئے۔ وہ کہتا ہے یہ ایک نہایت ہی لغو اور عقل کے خلاف بات ہے اور اس سے خدا تعالیٰ پر بہت بڑا الزام عائد ہوتا ہے۔ دوسری بات وہ یہ کہتا ہے کہ خود تاریخ سے ثابت ہے کہ ایک عرب گیا اور اُس نے صنعاء کے گرجا میں پاخانہ کر دیا اور اس طرح مسیحی قوم کے ایک مقدس معبد میں پاخانہ کرکے اُس نے تمام قوم کو مشتعل کیا۔ جب اُس کی خطا ثابت ہے اور ابرہہ اسی ہتک کا بدلہ لینے کے لئے گیا تھا تو چاہیئے تھا کہ ابرہہ کی تائید کی جاتی مگر قرآن یہ بتاتا ہے کہ جو شخص محض اپنے معبد کی ہتک کا بدلہ لینے کے لئے گیا تھا اُسے تو شدید سزا ملی اور جس قوم کا ایک فرد گرجا میں پاخانہ کرکے آ گیا تھا اُس قوم کی تائید کی گئی حالانکہ سزا ظالم کو ملنی چاہیئے تھی نہ کہ مظلوم کو۔

جہاں تک اُس کی عبارت اور اعتراض سے پتہ چلتا ہے پادری وہیری کو نفس واقعہ پر کوئی اعتراض نہیں وہ یہ نہیں کہتا کہ ابرہہ نے حملہ نہیں کیا تھا یا حملہ کرنے تو گیا تھا مگر مارا نہیں گیا تھا۔ وہ اس تمام واقعہ کو تسلیم کرتا ہے مگر اس میں سے جو درسِ عبرت نکالا گیا ہے پادری وہیری کو اُس پر اعتراض ہے ... درست تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن اگر

واقعہ درست ہے تو دہریں عبرت پر اُسی صورت میں اعتراض ہوسکتا ہے جب یہ کہا جائے کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا جو پیش آگیا اِسے نشان یا معجزہ قرار دینا درست نہیں۔ پس پادری وہیری اگر کہہ سکتا تھا تو یہ کہ تم جو کہتے ہو کہ خدا نے ابرہہ کو ہلاک کیا اور اُس پر عذاب نازل کیا یہ درست نہیں واقعہ ٹھیک ہے اُس کی ہلاکت میں کوئی شبہ نہیں۔ ابرہہ واقعہ میں حملہ کے لئے گیا اور ایک بہت بڑا لشکر اپنے ساتھ لے گیا مگر جو تباہی اُس پر واقعہ ہوئی یا وہ تباہی جس کا سامنا اُس کے لشکر کو کرنا پڑا وہ کوئی خدائی فعل نہیں تھا بلکہ ایک اتفاقی حادثہ تھا جو پیش آگیا اور اس کی وجہ سے مکہ کی عظمت اور اُس کی بڑائی کو پیش کرنا اور ابرہہ کی تذلیل کرنا درست نہیں۔ اور واقعہ میں اگر یہ اتفاقی حادثہ ثابت ہو تو ہمیں تسلیم کرنا پڑیگا کہ نہ اس سے خانۂ کعبہ کی کوئی عظمت ظاہر ہوتی ہے اور نہ ابرہہ کی تذلیل ہوتی ہے۔ جیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص حج کے لئے جائے مگر بمبئی میں پہنچتے ہی اُسے ہیضہ ہو جائے اور وہ مر جائے۔ اب کوئی شخص یہ نہیں کہیگا کہ دیکھو اُس پر اِس لئے عذاب نازل ہوا ہے کہ وہ حج کے لئے جا رہا تھا۔ ہر شخص اُسے اتفاقی حادثہ قرار دے گا یا ہوسکتا ہے کہ حاجیوں کا کوئی جہاز جا رہا ہو اور سمندر میں طوفان آجائے اور وہ جہاز غرق ہو جائے مگر کوئی شخص اُسے عذاب قرار نہیں دے گا۔ اگر کوئی شخص ہم پر اعتراض کرے کہ وجہ کیا ہے کہ دو چار سو حاجی سمندر میں ڈوب جاتے ہیں اور تم اُسے عذاب قرار نہیں دیتے؟ تو ہم کہیں گے صرف یہی ایک جہاز تو نہیں تھا جو آج حاجیوں کو لے کر گیا ہر سال کئی کئی جہاز حاجیوں کو لے کر جاتے ہیں اور اُن میں سے اکثر سلامتی کے ساتھ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے ہیں یہ ثبوت ہے اِس بات کا کہ اگر آج کوئی جہاز غرق ہوا ہے تو یہ ایک اتفاقی حادثہ ہے جو اُسے پیش آگیا عذاب نہیں۔ اگر عذاب ہوتا تو اکثروں پر نازل ہوتا۔ اِسی طرح اگر حج کے لئے جاتے ہوئے کسی کو ہیضہ ہو جاتا ہے تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ اُس پر عذاب نازل ہوا اور جب ہم سے کوئی پوچھے کہ تم اِسے عذاب کیوں نہیں قرار دیتے؟ تو ہمارا جواب یہی ہوگا کہ ہر سال دو چار لاکھ حاجی حج کے لئے جاتا ہے اور قریباً سارے کا سارا سلامتی کے ساتھ مکہ پہنچ جاتا ہے اگر اُن میں سے ایک دو کو ہیضہ ہو گیا ہے تو یہ بہرحال ایک اتفاقی حادثہ ہے اگر اکثر مر جاتے تو بے شک شبہ ہوسکتا تھا کہ کہیں یہ خدائی عذاب نہ ہو مگر اکثروں کا بچ جانا اور صرف ایک دو کا مرنا ثبوت ہے اِس بات کا کہ جو کچھ پیش آیا وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا اِس سے بڑھ کر اُس کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ اِسی طرح وہیری اِس واقعہ کے متعلق بھی کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا اور چونکہ اتفاقی طور پر یہ مصیبت آگئی تھی اِس لئے اِسے عذاب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اور چونکہ اُسے عذاب قرار نہیں دیا جاسکتا اِس لئے اِس واقعہ سے خانۂ کعبہ کی عظمت اور اُس کی بڑائی کا استدلال کرنا بھی درست نہیں اور یقیناً اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر یہ اتفاقی حادثہ ثابت ہو جائے تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ابرہہ پر عذاب آیا اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے خانۂ کعبہ کی عظمت کا ثبوت ملتا ہے ہمارے یہ دونوں دعوے غلط ثابت ہو جائیں گے۔ غرض پادری وہیری کا اعتراض اسی صورت میں درست ہوسکتا ہے اگر ابرہہ کی تباہی کو اتفاقی حادثہ قرار دیا جاسکے۔ اِس لئے سب سے پہلے ہم یہی دیکھتے ہیں کہ آیا یہ کوئی اتفاقی حادثہ تھا؟ جو باتیں اِس سورۃ کی تفسیر میں میں پہلے کہہ چکا ہوں وہ کافی سے بھی زیادہ اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ ہم اسے ہرگز اتفاقی حادثہ نہیں کہہ سکتے اِس لئے کہ خانۂ کعبہ کی حفاظت اور اُس کے محفوظ رہنے کا وعدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے چلا آتا ہے اور عرب لوگ اِس بات کے مدعی تھے کہ خانۂ کعبہ پر کوئی شخص حملہ نہیں کرسکتا اگر کرے گا تو خدا خود اِس گھر کو اس کے حملہ سے بچائے گا۔ چنانچہ ابرہہ کا واقعہ اِس کا ثبوت ہے۔ اور حضرت عبدالمطلب نے اُسے اِسی امر کی طرف توجہ دلائی تھی جب ابرہہ نے اُنہیں کہا کہ تمہارے دو سو اُونٹ جو میری فوج پکڑ کر لے آئی ہے تم اُن دو سو اونٹوں کو تو

مانگتے ہو اور خانۂ کعبہ جو تمہارا اور تمہارے باپ دادا کا معبد ہے اُس کے متعلق کچھ نہیں کہتے تم کیسے جاہل اور عقل سے کورے انسان ہو۔ تو حضرت عبدالمطلب نے اُسے یہی جواب دیا کہ میرا سوال ہی آپ کے اس اعتراض کو رد کر دیتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ میرے دو سو اونٹ مجھے واپس دے دیئے جائیں یہ مطالبہ میں نے کیوں کیا اس لئے کہ میں دو سو اونٹ کا مالک ہوں۔ پس میں نے اِس سوال سے ہی تم کو یہ بتایا ہے کہ مالک کو اپنی چیز کی پروا ہوتی ہے اور وہ اُس کا ضائع ہونا برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ خانۂ کعبہ خدا کا گھر ہے اور وہی اِس کا مالک ہے اگر اپنے اونٹوں کیلئے میں تمہارے در پر سوالی بن کر آگیا ہوں تو کیا تم سمجھتے ہو کہ خدا کو اپنے اِس گھر کی پروا نہیں ہوگی۔ اگر وہ اِس گھر کا مالک ہے تو جس طرح مجھے اپنے اونٹوں کی فکر ہے اُسی طرح اُسے بھی اِس گھر کی فکر ہوگی اور وہ اِسے تمہارے حملہ سے ضرور بچائے گا۔ اِس جگہ حضرت عبدالمطلب نے اپنی بات کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے یہی دلیل دی ہے کہ ہمارا عقیدہ خانۂ کعبہ کے متعلق یہ ہے کہ یہ خدا کا گھر ہے اور اُس نے آپ اِس گھر کو بچانے کا وعدہ کیا ہُوا ہے۔ اگر ہمارا یہ عقیدہ درست ہے تو پھر اگر تم نے خانۂ کعبہ پر حملہ کیا تو وہ تمہیں ضرور تباہ کر دے گا۔ یہ واقعہ اپنی ذات میں اس بات کا ثبوت ہے کہ خانۂ کعبہ کی حفاظت کا وعدہ دو ہزار سال سے چلا آرہا تھا اور عرب لوگ اِس بات کے مدعی تھے کہ جو شخص اِس گھر پر حملہ کرے گا وہ تباہ ہو جائے گا۔ اِس دعویٰ کے بائیس سو سال بعد ایک شخص اُٹھتا اور بیت اللہ پر حملہ کرتا ہے' ایک بہت بڑا لشکر اُس کے ساتھ ہے تمام قسم کے ساز و سامان سے وہ مسلح ہے' اُسے اپنی طاقت پر بہت بڑا ناز ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ خانۂ کعبہ کو گرانا کوئی مشکل کام نہیں مگر باوجود اِن تمام باتوں کے وہ اور اُس کا لشکر ایسی بُری طرح تباہ ہوتے ہیں کہ دنیا اُن کو دیکھ کر عبرت حاصل کرتی ہے کون شخص ہے جو اِس واقعہ کو اتفاقی قرار دے سکے کیا دو ہزار سال سے عربوں کا یہ دعویٰ کرنا کہ خانۂ کعبہ پر کوئی شخص حملہ نہیں کر سکتا اگر کرے گا تو مارا جائے گا۔ اور دو ہزار سال میں صرف ایک شخص کا حملہ کرنا اور تباہ ہو جانا یہ اتفاق کہلا سکتا ہے بے شک اگر عربوں کا خانۂ کعبہ کے متعلق کوئی دعویٰ نہ ہوتا اور ابرہہ اور اُس کا لشکر تباہ ہو جاتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ یہ ایک اتفاقی امر ہے۔ وہ حملہ کے لئے آئے تھے مگر اُن میں ایک بیماری پھوٹ پڑی اور وہ مر گئے۔ لیکن دو ہزار سال سے مکہ والوں کا ایک دعویٰ کرنا اور نسلاً بعد نسلٍ اِس عقیدہ پر قائم رہنا اور پھر جب ابرہہ اپنا لشکر لیکر آیا تو اُن کا ابرہہ کے سامنے بھی اِس پیشگوئی کا اعلان کر دینا اور پھر اِس پیشگوئی کے عین مطابق اُس کا مارا جانا یہ سب کچھ اتفاق کس طرح ہو گیا؟ دنیا میں قاعدہ ہے کہ جب کبھی کوئی کیس سامنے آئے اُسکے متعلق سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ بادی النظر میں سچا ہے یا جھوٹا۔ یا پہلا اثر انسانی طبیعت پر کیا پڑتا ہے اور اُس کے متعلق کون سے نتائج ہم فوری طور پر حاصل کر سکتے ہیں۔ اِس نقطۂ نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو مکہ والوں کی طرف سے دو ہزار سال سے یہ کہا جا رہا تھا کہ اگر خانۂ کعبہ پر کوئی شخص حملہ کرے گا تو وہ تباہ ہو جائے گا۔ اور جب دو ہزار سال کے بعد ایک دشمن اُٹھا اور اپنا لشکر لے کر خانۂ کعبہ کو گرانے کے لئے بڑھا تو مکہ کے سردار نے اُسے کہہ دیا کہ ہمارے ہاں یہ روایت چلی آتی ہے کہ اگر کسی نے اِس گھر پر حملہ کیا تو وہ تباہ ہو جائے گا اس لئے تم اِس ارادہ کو ترک کر دو مگر وہ پھر بھی باز نہ آیا اور آخر وہی کچھ ہُوا جو مکہ کے سردار نے اُسے کہا تھا اور جس کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے پیشگوئی چلی آتی تھی یعنی وہ مارا گیا اور اُس کا لشکر تباہ ہو گیا۔ اِس تمام واقعہ کو دیکھتے ہوئے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ بادی النظر میں یہ کیس مکہ والوں کے حق میں جاتا ہے۔ پس اب ہمارا فرض نہیں کہ ہم یہ ثابت کریں کہ یہ اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ عیسائیوں کا فرض ہے کہ اگر وہ اسے اتفاقی حادثہ قرار دیتے ہیں تو ثابت کریں کہ یہ کس طرح اتفاقی حادثہ ہے دو ہزار سال سے خانۂ کعبہ کی حفاظت کے متعلق ایک پیشگوئی تھی وہ پیشگوئی ابرہہ کو یاد کرا دی گئی مگر اُس نے اپنے ارادہ کو

ترک کرنے سے انکار کیا اور فیصلہ کیا کہ میں ضرور اس گھر کو
گراؤں گا۔ جب اُس نے یہ فیصلہ کر لیا تو ابھی اُس نے خانہ کعبہ
کو گرانے کے لئے ایک قدم بھی نہیں اُٹھایا تھا کہ خدا کا عذاب
اُس پر نازل ہو گیا اور وہ نہایت ذلیل اور مقہور ہو کر مرا۔ اِس
دو ہزار سالہ پیشگوئی کو سُننے اور پھر اِس پیشگوئی کو سب کے
سامنے پورا ہوتے دیکھنے کے بعد ہم پر یہ کس طرح فرض
ہو گیا کہ ہم یہ ثابت کریں کہ یہ اتفاقی حادثہ نہیں تھا۔ بلکہ عیسائیوں
کا فرض ہے کہ وہ اِسے اتفاقی حادثہ ثابت کریں اور اپنی دلیل
ہمارے سامنے پیش کریں۔ اگر اُن کی دلیل ہمارے سامنے
آئے گی تب ہمارا فرض ہوگا کہ ہم اُس کو توڑیں لیکن جب تک
اُن کی دلیل ہمارے سامنے نہیں آتی بارِ ثبوت بہرحال
عیسائیوں کے ذمہ ہے۔

دُوسرا جواب یہ ہے کہ جو چیز ایک تسلسل میں واقعہ
ہو وہ چیز خود اپنی ذات میں اپنی صداقت کا ثبوت ہوتی ہے
اگر ایک زنجیر ہو تو یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ زنجیر کا حق
مقدّم ہوتا ہے کڑی کا حق مقدّم نہیں ہوتا کیونکہ کڑی بہرحال
زنجیر کے تابع ہوتی ہے۔ ایک شخص کے متعلق اگر ہمارے پاس
یہ ثبوت موجود ہو کہ وہ دس سال سے برابر سچ بولتا چلا آرہا ہے
کوئی شخص کہتا ہے کہ اسے نو سال سے برابر سچ بولتے دیکھ رہا
ہوں، کوئی شخص کہتا ہے کہ میں اسے آٹھ سال سے برابر سچ
بولتے دیکھ رہا ہوں کوئی شخص کہتا ہے کہ میں اسے سات سال
سے برابر سچ بولتے دیکھ رہا ہوں تو یہ تسلسل خود اپنی ذات میں
اُس کے راستباز ہونے کا ثبوت ہوگا۔ اگر کوئی شخص ہمارے
پاس آئے اور اُس کے متعلق کہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے تو
بادی النظر میں وہ بات سچی سمجھی جائیگی جو دس سال سے ثابت
ہے۔ وہ بات سچی نہیں سمجھی جائے گی جو نئی پیش کی جارہی ہے
اور دس سال کے تجربہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم دوسرے شخص
کو اس الزام سے بری قرار دیں گے ہاں الزام لگانے والے
سے ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اگر تمہیں اپنے الزام پر اصرار ہے تو
تم اِس کا ثبوت لاؤ۔ وہ اگر کہے کہ ثبوت اسے پیش کرنا چاہیئے کہ
اِس نے جھوٹ نہیں بولا تو ہر شخص الزام لگانے والے کو احمق
قرار دے گا۔ ہم کہیں گے ثبوت تیرے پاس ہونا چاہیئے
اُس کے سچا ہونے کی تو یہی سب سے بڑی دلیل ہے کہ زندگی
کا ایک لمبا تسلسل بتا رہا ہے کہ یہ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ یہی
وہ دلیل ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے دعویٰ نبوت
کے وقت قوم کے سامنے پیش کی۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت دعویٰ نبوت فرمایا تو کسی نے کہا
پاگل ہو گیا ہے، کسی نے کہا جھوٹ بولتا ہے، کسی نے کہا
اِس پر جادو کیا گیا ہے، کسی نے کہا بُتوں کی ناراضگی کی اِسے
سزا ملی ہے، غرض عجیب عجیب قسم کی باتیں آپ کے متعلق مشہور
ہونے لگیں۔ جب ان باتوں کا چرچا ہُوا تو ایک دن آپ نے
تمام مکّہ والوں کو جمع کیا اور اُن کے سامنے کھڑے ہو کر ایک
تقریر کی جس میں فرمایا کہ تم میرے رشتہ دار ہو، مجھے دیر سے
جانتے ہو، میری عادات سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہو تم
بتاؤ کہ کیا میں نے کبھی جھوٹ بولا ہے؟ اُن سب نے متفقہ طور
پر کہا کہ ہرگز نہیں آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں اور ہم سب اِس بات
کے گواہ ہیں کہ آپ کی راستبازی مسلّم ہے اِس پر رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی صداقت شعاری کا اقرار اُن سے منوانے
کے لئے ایک اَور بات کہی۔ بعض جگہیں ایسی ہوتی ہیں جہاں
جنگل ہوتا ہے اور اُن میں اگر کوئی لشکر چھپنا چاہے تو بڑی
آسانی سے چھپ سکتا ہے۔ لیکن بعض ایسے چٹیل میدان ہوتے
ہیں کہ اُن میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ دُور دُور تک آدمی
دکھائی دیتا ہے۔ مکّہ کے ارد گرد بھی ایسی جگہ ہے۔
اُس میں کوئی بڑا لشکر چھپ نہیں سکتا۔ جب مکّہ والوں نے
کہا کہ ہم نے ہمیشہ آپکو راستباز پایا ہے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں یہ کہوں کہ اِس پہاڑی کے
پیچھے ایک بہت بڑا جرّار لشکر تم پر حملہ کرنے کیلئے چھپا بیٹھا
ہے تو کیا تم میری اِس بات کو تسلیم کر لوگے؟ یہ ایک ایسی
بات تھی جو قطعی طور پر ناممکن تھی اگر کوئی لشکر مکّہ پر حملہ کرنے
کے لئے آئے تو وہ اُس پہاڑی کے پیچھے چھپ ہی نہیں سکتا

مگر باوجود اس کے کہ یہ بات بالبداہت ناممکن تھی انہوں نے کہا ہاں اگر آپ یہ کہیں گے کہ اس پہاڑی کے پیچھے ایک لشکر چھپا بیٹھا ہے تو باوجود اس کے کہ ہماری آنکھیں اُس کو نہیں دیکھتی ہوں گی ہم آپ کی بات کو درست تسلیم کر لیں گے۔ یہ آپ کی صداقت کی کتنی زبردست دلیل ہے جس کا مکّہ والوں نے اپنی زبان سے اقرار کیا کہ اگر ایک ناممکن اور نظر نہ آنیوالی بات بھی آپ بیان کریں گے تو ہم اُسے ضرور مان لیں گے۔ ہم اپنی آنکھوں کو جھوٹا قرار دیں گے مگر آپ کی بات کو تسلیم کر لیں گے جب انہوں نے اس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صداقت اور آپ کی راستبازی کا علی الاعلان اقرار کیا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میری صداقت پر تمہیں ایسا ہی یقین ہے تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ خدا نے مجھے یہ کہا ہے کہ میں اُس کا رسول ہوں اور اُس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں ڈراؤں اور تمہیں بتوں کی پرستش سے روکوں اگر تم میری بات نہیں مانو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ اس پر وہی لوگ جو ابھی چند منٹ پہلے آپ کو راستباز کہہ رہے تھے ہنسی اور مذاق کرتے ہوئے منتشر ہو گئے۔ اور کسی نے کہا جھوٹ بولتا ہے، کسی نے کہہ دیا پاگل ہو گیا ہے، کسی نے کہہ دیا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ لیکن یہی واقعہ تم کسی معقول انسان کے سامنے رکھو تو وہ کیا کہیگا؟ وہ اُنہی لوگوں کو پاگل قرار دے گا جو ابھی آپ کو راستباز قرار دے رہے تھے اور ابھی آپ کو جھوٹا قرار دینے لگے۔ غرض واقعات نے تسلسل کی زنجیر بالبداہت تسلیم شدہ ہوتی ہے اور اگر کوئی اُس کے خلاف بات کہتا ہے تو اُس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ دلیل لائے دوسرے کا فرض نہیں ہوتا کہ اُس کی بات کو توڑے۔ دو ہزار سال سے عربوں کا یہ دعویٰ تھا کہ خانہ کعبہ خدا کا گھر ہے اور وہ اس کی آپ حفاظت کرے گا۔ عربوں کے اس دعوے کے متعلق تم کہو کہ یہ ابہام تھا، شک تھا، وہم تھا، بے دینی تھی، کفر تھا لیکن بہرحال جو کچھ بھی تھا عرب کہتے تھے کہ خانہ کعبہ محفوظ رہے گا اور دو ہزار سال سے زنجیر کی یہ کڑی مسلسل چلی آئی تھی اور لوگ اسی ڈر کے مارے خانہ کعبہ پر حملہ نہیں کرتے تھے۔ جب دو ہزار سال گزر جاتے ہیں تو ایک شخص اُٹھتا اور خانہ کعبہ پر حملہ کرتا ہے اور وہ حملہ کرنے والا زندہ نہیں رہتا بلکہ بُری طرح تباہ ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ اس واقعہ کا تسلسل دو ہزار سال سے ثابت ہے یقیناً ہر شخص عربوں کے دعویٰ کی ہی تصدیق کرے گا۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ یہ واقعہ جو ایک لمبی زنجیر کی ایک کڑی نظر آ رہا ہے اصل میں اس زنجیر کی کڑی نہیں کسی اور زنجیر کی کڑی ہے یا ایک بے تعلق کڑی ہے۔ تو بارِ ثبوت اُس کے ذمہ ہے لیکن جہاں تک اس زنجیر کے تسلسل کا سوال ہے اُس کے لحاظ سے ماننا پڑتا ہے کہ مکّہ والوں نے اِس بارہ میں جو دعویٰ کیا تھا وہ بالکل صحیح اور درست تھا اور واقعات نے بھی اُن کے دعویٰ کی تصدیق کر دی۔ اب اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا تو اُس کا فرض ہے کہ وہ دلیل لائے مسلمان کا فرض نہیں کہ وہ اس کے اتفاقی حادثہ نہ ہونے کے دلائل دے۔ بہرحال پیشگوئی کے لحاظ سے بھی اور واقعاتی زنجیر کے لحاظ سے بھی مکّہ والوں کا دعویٰ درست ثابت ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف کہتا ہے تو اُس کا فرض ہے کہ وہ دلیل لائے مگر وہ دلیل نہ وہیری نے پیش کی ہے اور نہ کسی اور عیسائی پادری نے پیش کی ہے۔

دوسری بات اِس بارہ میں یہ کہی جا سکتی ہے کہ یہ اتفاقی واقعہ تو نہیں تھا۔ تھا تو یہ ایک نشان ہی مگر خدا کو یہ نشان مسیحیوں کے خلاف نہیں دکھانا چاہیئے تھا بلکہ مسیحیوں کی تائید میں دکھانا چاہیئے تھا۔ چونکہ یہ نشان مسیحیوں کے خلاف دکھایا گیا ہے اِس لئے ہم اسے تسلیم نہیں کر سکتے۔ یہ بھی بالکل پاگل پن کی بات ہوگی اگر خدا نے یہ نشان دکھایا ہے تو یقیناً ہمیں یہ بھی ماننا پڑیگا کہ وہیری کی عقل سے بہرحال خدا تعالےٰ کی عقل مقدم ہے اگر وہ اسے خدا تعالےٰ کا نشان سمجھنے کے باوجود یہ کہتا ہے کہ خدا نے مسیحیوں کے خلاف یہ نشان کیوں دکھایا اُسے تو مسیحیوں کی تائید میں نشان دکھانا چاہیئے تھا تو یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کہتے ہیں کہ کوئی پٹھان حدیث پڑھ رہا تھا تو اُس میں یہ ذکر آ گیا کہ

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ نماز پڑھتے ہوئے اپنے نواسہ حضرت امام حسن کو گود میں اُٹھا لیا جب آپ رکوع کے لئے گئے تو آپ نے بچے کو اُتار کر ایک طرف بٹھا دیا دوسری طرف اُس نے فقہ میں یہ مسئلہ پڑھا ہوا تھا کہ حرکت سے نماز ٹوٹ جاتی ہے جب اُس نے حدیث میں یہ واقعہ پڑھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے امام حسن کو نماز پڑھتے اپنی گود میں اُٹھا لیا اور رکوع کے وقت اُسے اُتار دیا تو کہنے لگا "خو محمد صاحب کا نماز ٹوٹ گیا"۔ کسی سُننے والے نے اُسے جواب دیا کہ بیوقوف نماز تو سکھائی ہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہے آپ پر کس طرح اعتراض ہو سکتا ہے۔ اِسی طرح یہ فیصلہ کرنا کہ نشان مسیحیوں کی تائید میں دکھایا جاتے یا مسیحیوں کے خلاف دکھایا جائے خدا تعالےٰ کا کام ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ نشان خدا تعالےٰ نے دکھایا ہے تو اِس کے بعد یہ کہنا کہ خدا تعالیٰ نے نعوذ باللہ بڑی بے وقوفی کی کہ مسیحیوں کی تائید میں اُس نے نشان نہ دکھایا ویسی ہی بات ہے جیسے پٹھان نے کہہ دیا تھا کہ "خو محمد صاحب کا نماز ٹوٹ گیا"۔ اگر تمہاری عقل میں ایک بات نہیں آتی تب بھی جبکہ ثابت ہو کہ یہ واقعہ اتفاقی نہ تھا تمہیں ماننا پڑے گا کہ تم جو کچھ سمجھتے ہو یہ تمہاری عقل کی غلطی ہے خدا تعالےٰ کی عقل بہر حال تمہاری عقل پر مقدم ہے۔ گو دنیا میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی عقل کو خدا کی عقل سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے ایک گریجوایٹ جو وکیل بھی تھا مجھ سے ملنے کے لئے آیا اور اُس نے مجھ سے بعض سوالات کئے۔ جب میں نے اُس کے تمام سوالات کا جواب دے کر بتایا کہ اصل سوال یہ ہے کہ کیا خدا تعالےٰ ہے یا نہیں اگر خدا تعالیٰ ہے تو پھر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پھر سوال یہ ہوگا کہ آپ کی عقل مقدم ہے یا خدا تعالےٰ کی تو اس پر وہ صاحب بے اختیار ہو کر بولے کہ میری عقل مقدم ہے۔ یہ بات سُنکر اُن کے ساتھی بھی ہنس پڑے کہ یہ کیسی خلاف عقل بات ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ تمام اعتراضات کے دُور ہو جانے کے بعد بھی اگر وہ اپنی بات کو سچا ثابت کر سکتے تھے تو اِسی طرح کہ یہ کہتے کہ خدا تعالےٰ سے میں زیادہ عقلمند ہوں۔ اگر اُس نے ایک بات کی ہے اور میری عقل اُسے نہیں مانتی تو میں اُسے کیوں قبول کروں۔ یہی پادری وہیری کی حالت ہے کہ وہ اِسے اتفاقی حادثہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ وہ اِس واقعہ سے انکار بھی نہیں کر سکتے لیکن اعتراض یہ کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے مسیحیوں کو کیوں مارا اور اُن کے مقابل پر مشرکین مکہ کو کیوں نہ مارا لیکن بہرحال ایسے شخص کو بھی جواب دینا پڑتا ہے اِس لئے میں اُس کے اعتراضات کا جواب دیتا ہوں۔

پہلا جواب یہ ہے کہ اُس کا یہ کہنا کہ مسیحی تو اہل کتاب تھے اور مکہ کے لوگ بُت پرست۔ پھر مسیحیوں پر کیوں عذاب آیا اور بُت پرستوں کو اللہ تعالےٰ نے کیوں بچا لیا خود بڑی بے دینی اور جہالت کی بات ہے۔ بھلا خدا کو مسیحی یا غیر مسیحی سے کیا تعلق ہے، خدا تو عدل و انصاف اور راستی اور صداقت کو دیکھتا ہے اگر تو وہ یہ کہتا کہ ابرہہ حق پر تھا اور مکہ والے ناحق پر۔ اِسلئے عذاب مکہ والوں پر آنا چاہیئے تھا نہ کہ ابرہہ پر۔ تب بھی کوئی بات تھی (اُس نے آگے چل کر یہ دلیل بھی دی ہے مگر اِس کا جواب میں الگ دوں گا) لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ مسیحیوں کو کافروں کے مقابلہ میں کیوں سزا دی گئی۔ یہ تو ویسی ہی ظالمانہ بات ہے جیسے بعض لوگ اپنے آدمی کی رعایت کر دیتے ہیں حالانکہ وہ ظالم ہوتا ہے اور دوسرے آدمی کو بُرا بھلا کہتے ہیں حالانکہ وہ مظلوم ہوتا ہے۔ کیا ہمارا خدا بھی نعوذ باللہ ایسا ہے کہ وہ عدل و انصاف کو تو مدنظر نہ رکھے اور محض مسیحی ہونے کی وجہ سے لوگوں کی تائید کرتا پھرے۔ اگر پادری وہیری اپنے خدا کو ایسا سمجھتے ہیں تو الگ بات ہے اسلام جس خدا کو پیش کرتا ہے وہ اِس قسم کا ظالمانہ سلوک نہیں کرتا بلکہ اسلام تو بنی نوع انسان کو بھی یہی تعلیم دیتا ہے کہ تم مظلوم کا ساتھ دو اور ظالم کو اُس کے ظلم سے روکو خواہ وہ تمہارا باپ ہو یا بھائی۔ دوست ہو یا کوئی اور عزیز رشتہ دار۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دفعہ صحابہؓ بیٹھے تھے کہ آپ نے فرمایا اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا۔ اے میرے پیرو! میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں

کہ تم اپنے بھائیوں کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہوں یا مظلوم صحابہؓ کو یہ بات رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پہلی تعلیم کے خلاف نظر آئی اور وہ حیران ہوئے کہ یہ اُلٹی بات کیا کہی جا رہی ہے کہ مظلوم کے علاوہ ظالم کی بھی مدد کرو۔ چنانچہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ مظلوم کی مدد کرنے والی بات تو ہماری سمجھ میں آتی ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ہم ظالم کی کس طرح مدد کریں؟ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ظالم کی مدد کرنے کا یہ مطلب ہے کہ تم اُسے ظلم سے روکو کیونکہ اگر وہ ظلم کرے گا تو تباہ ہو جائے گا۔ اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم سے بھی روک دیا۔ مگر ایسی طرز پر کہ بات اُن کے دلوں میں گھر کر گئی۔ اگر آپ یہ فرماتے کہ ظالم کی مدد نہ کرو تو کئی لوگ یہ کہنے لگ جاتے کہ اپنے بھائی بندوں کی تو بعض دفعہ مدد کرنی ہی پڑتی ہے مگر جب آپ نے اسی بات کو اس رنگ میں بیان فرمایا کہ اگر تم ظالم کی مدد کروگے تو تم خود اُسے تباہ کر دوگے تو مقصد بھی پورا ہو گیا اور بات بھی سننے والوں کے دل کی گہرائیوں میں اُتر گئی۔ پس اسلام کی یہی تعلیم ہے کہ حق و انصاف کی مدد کی جائے لیکن یہ پادری صاحب خدا تعالےٰ کو نعوذ باللہ انسان سے بھی زیادہ بد اخلاق سمجھتے ہیں کہ اُس سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ کسی خاص مذہب یا خاص فرقہ کی تائید کیا کرے، عدل اور انصاف کو ملحوظ نہ رکھا کرے۔ ہم تو نہیں سمجھتے کہ عیسائی مذہب سچا ہے۔ لیکن فرض کرو کہ وہ سچا ہے تو کیا پادری وہیری یہ سمجھتا ہے کہ اگر سچے مذہب کا پیرو ظلم بھی کرے تب بھی اُس کی تائید کی جائے اور مظلوم کو اُس کا حق نہ دیا جائے۔ بے شک مغربی قوموں کا آج کل یہی طریق عمل ہے مگر کوئی شریف اور انصاف پسند آدمی اس طریق کو درست ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ ابرہہ اہل مکہ کا معبد گرانے کیلئے نکلا تھا اور یہ ایک نہایت ہی ظالمانہ فعل تھا بے شک وہ مسیحی تھا لیکن وہ ظالم مسیحی تھا اور ظالم کی مدد کرنا تو کسی شریف انسان کا کام بھی نہیں ہو سکتا کجا یہ کہ خدا تعالیٰ سے یہ امید رکھی جائے کہ وہ ظالم کی مدد کرے اور مظلوم کو کچل دے محض اس لئے کہ ظالم مسیحی ہے اور مظلوم بُت پرست۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ حملہ کفار پر نہیں تھا کفار کو تو اُس نے امان دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ حملہ سراسر خانہ کعبہ پر تھا چنانچہ دیکھ لو قلیس میں پاخانہ کس نے پھرا تھا ایک عرب نے پھرا تھا مگر وہ حملہ کے لئے خانہ کعبہ کی طرف آ دوڑا۔ کیا خانہ کعبہ نے پاخانہ پھرا تھا یا خانہ کعبہ پاخانہ پھرا کرتا ہے؟ پاخانہ پھرنے والا ایک عرب تھا مگر وہ حملہ خانہ کعبہ پر کرتا ہے بیشک عیسائی تعلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات بھی سچ جاتی ہے کیونکہ عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قصور لوگوں نے کیا اور صلیب پر اللہ تعالےٰ نے مسیحؑ کو چڑھا دیا۔ لیکن کوئی عقلمند اور شریف انسان اس قسم کی بات کو جائز قرار نہیں دے سکتا کہ قصور کوئی کرے اور سزا کسی کو دی جائے۔ بائبل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسرے کو سزا دینی جائز نہیں چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جب بن یامین کو اپنے ساتھ لے کر مصر گئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے چاہا کہ کسی طرح وہ بن یامین کو اپنے پاس رکھ لیں۔ مگر انہوں نے اپنے اس ارادہ کا کسی پر اظہار نہ کیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان پیدا کر دئے کہ جن کے ماتحت وہ قانوناً اپنے بھائی کو پکڑ سکتے تھے۔ سرکاری پیالہ کہیں گم ہو گیا اور اِدھر اُدھر تلاش شروع ہو گئی۔ ابھی اُس پیالہ کی تلاش ہی ہو رہی تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے شک کی بناء پر اپنے بھائیوں سے پوچھا کہ اگر چوری کی کوئی چیز کسی کے پاس سے نکل آئے تو اُس کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیئے؟ انہوں نے کہا چور کی یہی سزا ہے کہ اُسے گرفتار کر لیا جائے۔ تھوڑی دیر گذری تو بن یامین کے سامان میں سے سرکاری پیالہ نکل آیا۔ اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ اب بن یامین کو واپس جانے نہیں دیا جائے گا۔ یہ سُنکر اُن کا ایک بھائی آگے بڑھا اور اُس نے کہا اس لڑکے کا باپ بہت بُڈھا ہے اور اُس کا پہلے ہی ایک بیٹا گم ہو چکا ہے جس کی وجہ سے اُسے بڑی تکلیف ہے

اگر یہ بھی اب واپس گھر نہ پہنچا تو اُس کی تکلیف اور بھی بڑھ جائے گی۔ اس لئے اے بادشاہ میں اپنے آپ کو اُس کی جگہ پیش کرتا ہوں مجھے قید کر لیا جائے اور اس کو رہا کر دیا جائے۔ اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ میں ظالم نہیں کہ بے قصور کو پکڑ لوں اور جس کا قصور ہو اُسے جانے دوں گویا بائبل بھی یہ تسلیم کرتی ہے کہ ظلم کوئی کرے اور پکڑا کوئی جائے یہ نہایت ظالمانہ فعل ہے مگر عیسائی ہمیں یہی سناتے ہیں کہ گناہ لوگوں نے کیا اور صلیب خدا نے حضرت مسیح کو دے دی سو دوسرے مذاہب بے شک اس عقیدہ کو نہیں مانتے مگر اس میں کسی مذہب کا سوال نہیں عقل اور شرافت بھی نہیں مانتی کہ مجرم کوئی ہو اور سزا کسی کو دی جائے۔ اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے غور کرو کہ صنعاء کے گرجا میں کوئی جاہل اور بدتہذیب عرب پاخانہ کر دیتا ہے۔ اس پر بادشاہ کو غصہ آتا ہے مگر اس غصہ میں وہ اُس عرب کو نہیں مارتا جس نے پاخانہ کیا تھا، وہ اُس عرب کے رشتہ داروں کو بھی نہیں مارتا، وہ اُس عرب کی قوم کو بھی نہیں مارتا، وہ اپنے لشکر کے ساتھ کئی سو میل کا سفر طے کرتے ہوئے اس لئے جاتا ہے کہ خانۂ کعبہ کو جو تمام عرب کا مقدس مقام تھا گرا دے۔ کون عقلمند کہہ سکتا ہے کہ یہ انصاف تھا۔ کون عقلمند کہہ سکتا ہے کہ یہ اقدام ہتک کا بدلہ لینے کے لئے کیا گیا تھا۔ میں تاریخی روایات سے ثابت کر چکا ہوں کہ مکہ کے لوگوں کو ابرہہ نے یہ پیغام بھیجا کہ میں تم کو مارنے کے لئے نہیں آیا میں صرف خانہ کعبہ کو گرانے کے لئے آیا ہوں۔ اگر تم لوگ میرے رستہ میں روک نہ بنے تو میں خانۂ کعبہ کو گرا کر واپس چلا جاؤں گا۔ اگر انسان نے قصور کیا تھا تو انسان ہی اُس قصور کا ذمہ وار تھا اور اگر سزا دی جا سکتی تھی تو اُسی عرب کو جس نے گرجا میں پاخانہ کیا۔ اگر زیادہ طیش آیا تھا تو اُس کے بھائی بندوں کو بھی گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ اگر اس سے بھی بڑھ کر غصہ آتا تو اُس کی قوم پر بھی حملہ کیا جا سکتا تھا۔ مگر یہ کیا کہ قصور تو ایک جاہل عرب کرتا ہے اور حملہ خانۂ کعبہ پر کیا جاتا ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی عیسائی ایک ہندو سے لڑے تو غصہ میں حکومت ہندوؤں کا کوئی مندر گرا دے یا کوئی ہندو کسی عیسائی سے لڑے تو غصہ میں ہندو حکومت مسیحیوں کا کوئی گرجا گرا دے۔ آخر دونوں باتوں میں کوئی جوڑ تو ہونا چاہیئے۔ یہ جوڑ تو نظر آ سکتا ہے کہ زید نے قصور کیا تو زید کے بھائی بندوں کو بھی پکڑ لیا گیا مگر یہ کہ زید قصور کرے اور ایک قومی معبد کو گرانے کے لئے حملہ شروع کر دیا جائے اِن دونوں کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں۔ پس ابرہہ کا فعل بتاتا ہے کہ وہ اُن کفار سے لڑنے کے لئے نہیں گیا تھا جن کے ایک فرد نے اُس کے گرجا کی ہتک کی تھی بلکہ وہ اس لئے گیا تھا کہ خانۂ کعبہ کو گرا دے۔ پس وہ خدا کے حضور ایک خطرناک مجرم تھا اور اُس کے فعل کے جواز میں یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنے گرجا کی ہتک کا بدلہ لینے گیا تھا۔

تیسرے جیسا کہ میں ثابت کر چکا ہوں ابرہہ کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ عربوں کے اتحاد کو توڑ دے کوئی مذہبی غرض اس حملہ کے پیچھے نہیں تھی ورنہ دنیا میں اور ہزاروں گرجے موجود تھے کبھی کسی گرجا کے بننے کے بعد عیسائیوں کی طرف سے یہ کوشش ہوئی کہ غیر اقوام کے افراد بھی اُس کو اپنا مقدس مقام قرار دے لیں؟ لیکن ابرہہ نے اِدھر گرجا بنایا اُدھر اُس نے یہ کوشش شروع کر دی کہ خانۂ کعبہ کی بجائے لوگ اس کی زیارت کے لئے آیا کریں اور اُس نے بعض عرب رؤساء کو رشوتیں دے دے کر اس پراپیگنڈہ کے لئے مقرر کیا۔ آخر اس کا مذہب سے کیا تعلق تھا۔ ہر شخص کے دل میں اپنے مذہب کا احترام ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اپنے مذہب کے خلاف دوسرے سے کوئی بات سُنے اور عرب بھی اس عقیدت کے جذبات سے خالی نہیں تھے ابرہہ اس حقیقت کو بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ عربوں کو خانہ کعبہ سے گہری عقیدت ہے اور وہ اس کو چھوڑنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہو سکتے مگر اس کے باوجود اُس کا بعض عرب رؤساء کو

خانہ کعبہ کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے کے لئے مقرر کرنا اور پھر خانہ کعبہ کو گرانے کی کوشش کرنا بتاتا ہے کہ یہ ایک سیاسی چال تھی جو غلبۂ عیسائیت کے لئے اختیار کی گئی تھی اور جس کے پیچھے اُس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ عربوں میں ایک نبی کی آمد کے متعلق جو احساس پیدا ہو رہا ہے اُس کے خلاف اُن کی توجہ کو پھیر دے اور عربوں کا شیرازہ بالکل بکھیر دے ۔ یہ ایک نہایت ہی گندی سیاسی غرض تھی جس کے لئے اُس نے حملہ کیا پس ایسا شخص ضرور سزا کا مستحق تھا اور خدا تعالیٰ نے اُسے سزا دی۔

دوسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ وہ ہتک کا بدلہ لینے گیا تھا اُس کو سزا کیوں ملی۔ اِس کا ایک جواب تو آچکا ہے کہ ہتک تو ایک عرب نے کی تھی مگر وہ خود عرب والوں سے امان کا وعدہ کرتا ہے۔ چنانچہ جہاں بھی عربوں نے اُس سے یہ کہا ہے کہ خانہ کعبہ کو بے شک گرا لو ہم تمہارے ارادہ میں مزاحم نہیں ہوتے وہاں اُس نے اُن سے صلح کر لی ہے اگر وہ ہتک کا بدلہ لینے گیا تھا تو اُسے اُس عرب پر غصہ آنا چاہیئے تھا جس نے گرجا میں پاخانہ کیا۔ اُس کے قبیلہ پر غصہ آنا چاہیئے تھا۔ اُس کی قوم پر غصہ آنا چاہیئے تھا مگر یہ کیا کہ وہ سیدھا خانہ کعبہ کا رُخ کرتا ہے اور عربوں سے بار بار کہتا ہے کہ مجھے تم سے کوئی عداوت نہیں اگر تم میرے رستہ میں روک نہ بنو تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ پس یہ کہنا کہ وہ ہتک کا بدلہ لینے کے لئے گیا تھا واقعات کے بالکل خلاف ہے ۔

دوسرے انسان کی ہتک کا کسی معبد سے بدلہ لینا عقل کے بالکل خلاف ہے اور پھر مرکزی معبد کو گرانے کی کوشش کرنا تو اور بھی قابلِ نفرین فعل ہے۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ صنعاء کا گرجا عیسائی قوم کا کوئی مرکزی معبد نہیں تھا لیکن خانہ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ایک مرکزی معبد چلا آتا تھا۔ اگر ایک عام معبد کی ہتک کا بدلہ لینے کے لئے کسی مرکزی معبد کو گرانے کی کوشش کرنا عیسائیوں کے نزدیک جائز ہے تو کیا وہ پسند کریں گے کہ مسلمان اپنی بعض مساجد کی ہتک کا بدلہ لینے کے لئے یروشلم کا گرجا گرا دیں؟ لاہور میں ریلوے سٹیشن کے قریب ایک پُرانی مسجد تھی جس میں ریلوے کا ٹوٹا پھوٹا سامان رکھا جاتا تھا انگریزوں نے اپنے زمانہ میں اُس میں بعض دفعہ کتے بھی باندھے ہیں۔ مسلمانوں نے اِس مسجد کو آزاد کرانے کے لئے ایک لمبی جدوجہد کی جس پر ریلوے کا کباڑ خانہ اس میں سے اُٹھا لیا گیا اور مسجد بحال کر دی گئی مگر اس کے بعد بھی یہ مسجد ویران پڑی رہی اب شاید پاکستان بن جانے کی وجہ سے اس مسجد کی آبادی کا بھی کوئی سامان ہو گیا ہو ورنہ اس سے پہلے تو یہ ہمیشہ ویران پڑی رہتی تھی۔ اب کیا مسلمانوں کا حق ہے کہ اس بناء پر کہ عیسائیوں نے اُن کی ایک مسجد کی ہتک کی تھی یروشلم کا گرجا جا کر گرا دیں۔ اگر وہ اس بات کو ماننے کے لئے تیار ہوں تو ہم اُن کے جواب کی معقولیت کو تسلیم کر لیں گے لیکن اگر یروشلم کا گرجا گرانا تو الگ رہا اُس کے گرانے کا ذکر سُن کر بھی اُن کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے تو یہ کونسا انصاف ہے کہ ہمیں یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ صنعاء کے گرجا میں ایک پاگل عرب نے پاخانہ کر دیا تھا اس لئے ابرہہ کیلئے یہ جائز ہو گیا تھا کہ وہ عربوں کے مقدس ترین مقام خانہ کعبہ پر جا کر حملہ کر دے۔ یقیناً اُس نے جو کچھ کیا وہ ایک ظالمانہ فعل تھا اور ظالم کو ضرور سزا ملنی چاہیئے تھی چنانچہ خدا تعالیٰ نے اُسے سزا دی۔

۲ سورۃ الفیل میں آخری زمانہ کے متعلق پیشگوئی

میں جیسا کہ اُوپر بتا چکا ہوں اس سورۃ میں درحقیقت آخری زمانہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور مسلمانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے بھی پہلے عیسائی دنیا نے آپ کے دین کو روکنے اور اُس کی ترقی کے امکانات کو مسدود کرنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ جب وہ علامات اُنہیں نظر آئیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ نبی عربی دُنیا میں پیدا ہونے والا ہے تو انہوں نے خانہ کعبہ کا رُخ کیا تاکہ عرب جس نقطۂ مرکزی پر جمع ہو سکتے ہوں اُسے توڑ دیا جائے اور وہ موعود جس کا عرب میں شدت کے ساتھ انتظار کیا جا رہا تھا اُس کے راستہ میں روکیں پیدا ہو جائیں لیکن اللہ تعالیٰ نے

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی آمد کے احترام اور آپ کے اعزاز میں خانہ کعبہ کو گرنے نہیں دیا۔ اللہ تعالےٰ اِس نشان کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ پھر ایک زمانہ میں عیسائی دنیا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طاقت اور آپ کی قوت کو مٹانے کی کوشش کرے گی اور تسلی دیتا ہے کہ تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ جس خدا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا ہونے سے بھی پہلے آپ کا ادب اور احترام کیا تھا اُس خدا کے متعلق کون یہ خیال بھی کر سکتا ہے کہ وہ آپؐ کی پیدائش کے بعد، آپؐ کے دعوئ نبوت کے بعد، آپکی بےمثال اور حیرت انگیز قربانیوں کے بعد، آپؐ کی خدا تعالےٰ سے بے انتہا محبت کے اظہار کے بعد، آپ کی اعلیٰ درجے کی نیک اور پاک جماعت دنیا میں قائم ہو جانے کے بعد، آپکی کامل اور ہر قسم کے نقائص سے منزہ شریعت لوگوں کے سامنے پیش ہو جانے کے بعد، آپؐ کے دین اور مذہب کے تمام دنیا میں پھیل جانے کے بعد، اب اِس جنگ کو برداشت کرلیگا کہ اُسے تباہ ہونے دے اور دشمن کو اُس کے بداراد وں میں کامیاب کر دے۔ کوئی عقلمند جو ذرا بھی اِن واقعات پر نگاہ رکھنے والا ہو وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان رکھتے ہوئے ایک لحظہ کے لئے بھی یہ بات نہیں مان سکتا کہ اس مقابلہ میں عیسائیت کو کامیابی حاصل ہوسکتی ہے۔ یقیناً ایک مسلمان کے لئے اِس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ ٹکر جو اسلام اور عیسائیت میں ہونے والی ہے اُس کا وہی کچھ نتیجہ نکلیگا جو ابرہہ کے وقت میں نکلا جبکہ وہ خانہ کعبہ سے ٹکر لینے کے لئے آیا۔ لیکن افسوس کہ باوجود اِس کے کہ مسلمانوں کے پاس قرآن کریم موجود ہے۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ والی سورۃ موجود ہے اور وہ اُسے ہر روز دیکھتے اور پڑھتے ہیں اُنہیں اِس بات پر یقین نہیں کہ اس لڑائی میں آخر اسلام فتحیاب ہوگا اور عیسائیت ہاریگی۔ یقین سے میری مراد صرف مُنہ کی لاف و گزاف نہیں بلکہ وہ معقول یقین مراد ہے جس کے ساتھ انسان کا عمل شامل ہوتا ہے۔ بے شک جہاں تک زبان کے دعووں کا سوال ہے ہر مسلمان کہتا ہے کہ اسلام جیتے گا لیکن جہاں تک اسلام کی فتح اور کامیابی پر یقین کا سوال ہے ننانوے فیصدی مسلمان یہ یقین نہیں رکھتے کہ اس لڑائی میں اسلام جیتے گا۔ شاید آپ لوگ یہ خیال کرتے ہوں کہ میں نے ایک ایسی بات کہدی ہے جو واقعات کے خلاف ہے فلسطین میں مسلمان لڑ رہے ہیں ہندوستان میں بہت کچھ کوشش اور جدوجہد کر رہے ہیں پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان ننانوے فیصدی اسلام کی فتح پر یقین نہیں رکھتے۔ میرا جواب یہ ہے کہ یقین کے ساتھ ہمیشہ عمل شامل ہوتا ہے وہ ایمان، ہرگز ایمان نہیں کہلا سکتا جس کے ساتھ عمل کی قوت نہ ہو۔ وہ ایک وسوسہ تو کہلا سکتا ہے۔ اُسے کمزوری اخلاق تو کہا جا سکتا ہے۔ مگر وہ سچا ایمان ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اگر سچا ایمان ہو تو یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان عمل نہ کرے۔ اگر کسی کو پتہ ہو کہ میرا بچہ علاج سے بچ جائے گا تو کیا دنیا میں کوئی بھی شخص ایسا ہوسکتا ہے جو اپنے بچہ کے علاج میں کوتاہی کرے؟ اگر وہ اُس کے علاج میں کوتاہی کرتا ہے تو دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہے۔ یا تو وہ اللہ تعالےٰ کے قانون سے بالکل جاہل ہے اور جاہل میں ہرگز ایمان نہیں ہوتا۔ اللہ تعالےٰ قرآن مجید میں بار بار فرماتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے عارف اور عالم بندے ہی اُس پر ایمان لایا کرتے ہیں۔ اگر ایک شخص کے بچے کو نمونیا ہو جاتا ہے اور وہ اُس کا علاج تو نہیں کرتا مگر یہ کہتا چلا جاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ فضل کرے گا تو کون کہہ سکتا ہے کہ وہ خدا تعالےٰ پر سچا ایمان رکھتا ہے۔ یقیناً وہ ایک جاہل آدمی ہے جو ایک ڈھکوسلا خدا تعالےٰ کی طرف منسوب کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ اُس کے ایمان کا ثبوت ہے۔ اور یا پھر وہ اپنے بچہ کے علاج کی طرف اگر توجہ نہیں کرتا تو اِس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اُس نے تو مر ہی جانا ہے ڈاکٹر کی فیسوں پر مجھے روپیہ ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن جس شخص کو یقین ہو کہ میرا بچہ علاج سے ضرور اچھا ہوسکتا ہے اور جو خدا تعالےٰ کے قانون سے بھی جاہل نہ ہو۔

وہ کبھی اپنے بچہ کے علاج میں غفلت سے کام نہیں لے سکتا۔ اگر مسلمانوں کو بھی یقین ہوتا کہ عیسائیت یا اسلام نے غالب آنا ہے تو یہ کوشش اور وہ قربانی کیوں نہ کرتے جو اس کیلئے ضروری تھی۔ انہیں یہ تو نظر ہی آتا ہے کہ بہ نسبت مسلمانوں کے عیسائی، روئے زمین کے بہت زیادہ حصہ پر حاکم ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے ایک ایک روپیہ کے بدلہ میں اُن کے پاس ایک ایک لاکھ روپیہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی ایک ایک تلوار کے مقابلہ میں اُن کے پاس ایک ایک توپ ہے بلکہ ایک ایک توپ کا بھی سوال نہیں سو سو دس دس اور بیس بیس توپیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے لنگڑے ٹٹوؤں کے مقابلہ میں اُن کے پاس ہوائی جہاز موجود ہیں۔ اُن کو معلوم ہے کہ جتنے غلیلے اُن کے گھروں میں ہیں اُن سے زیادہ مسیحیوں کے پاس توپ کے گولے ہیں اور یہ کوئی مبالغہ نہیں بلکہ اس پر قسم اُٹھائی جا سکتی ہے۔ مگر اتنی بڑی مصیبت کے مقابلہ میں انہوں نے کیا تیاری کی ہے اور کونسی قربانیاں ہیں جو اُن کی طرف سے پیش کی جا رہی ہیں؟ میں نے ابھی چند دن ہوئے عراق کا ایک اخبار دیکھا جس میں فلسطین کا ذکر کرتے ہوئے اُس نے بڑے زور کے ساتھ لکھا تھا کہ تم کہتے ہو ہمارے دلوں میں فلسطین کی بڑی محبت ہے تمہاری محبت کی علامت تو یہی ہے کہ ستر ستر پونڈ پر تمہاری رائفلیں تمہارا دشمن لے گیا اور تم نے کچھ بھی خیال نہ کیا کہ ہم یہ کیا کر رہے ہیں۔ گویا دس دس پونڈ کے بدلہ میں جب تمہیں ستر پونڈ مل گئے تو تم اپنے ملک سے غدّاری کرنے کے لئے تیار ہو گئے جب تمہاری اپنے ملک سے محبت کی یہ حالت ہے تو تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ فلسطین میں تمہیں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے یہی نمونہ مسلمانوں نے اِس جگہ دکھایا۔ جن دنوں مسلمانوں کی بہو بیٹیاں سکھ اٹھا اٹھا کر لے جا رہے تھے اُن دنوں بعض غدّار مسلمان مسلم لیگ سے رائفلیں خرید کر سکھوں کے آگے بیچ دیا کرتے تھے۔ یہ مسلمانوں کی عملی حالت ہے۔ اور پھر وہ اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ محض نعروں سے وہ جیت جائیں گے۔ اُن کے اللہ اکبر کے نعرے بھی جھوٹے ہیں، اُن کے دعوے بھی جھوٹے ہیں اور اُن کا یہ خیال کہ ہمیں اسلام پر یقین ہے یہ بھی محض دھوکا اور فریب ہے۔ نہ انہیں خدا سے محبت ہے نہ رسول سے محبت ہے نہ قرآن سے محبت ہے نہ اسلام سے محبت ہے۔ جب تک وہ اپنی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کریں گے اُن کی ترقی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوگی۔ اب بھی فلسطین میں شور پڑا ہوا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہاں مسلمانوں کو بڑی بھاری طاقت حاصل ہے۔ حالانکہ ہمارے آدمی وہاں موجود ہیں اور اُن کی چٹھیاں ہمارے پاس آتی رہتی ہیں جو اتنی بھیانک اور خوفناک ہوتی ہیں کہ انہیں پڑھ کر دل لرز جاتا ہے۔ ہمارے ایک مبلغ نے لکھا ہے کہ اس جگہ کا وزیر جنگ اُس سے ملا اور اُس نے کہا کہ ہمارے پاس کوئی طاقت نہیں پاکستان کو لکھو کہ وہ کسی طرح ہماری مدد کرے ہمارے دعوے ایک دھوکے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ اِس وقت حالت یہ ہے کہ مصر، شام، عراق، لبنان اور شرق اردن وغیرہ سب نے مل کر حملہ کیا ہوا ہے مگر یہود برابر جیت رہے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے یہ تو اعلانوں پر اعلان ہو رہے ہیں کہ ہم یہود کو مار ڈالیں گے مگر تیاری کچھ نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب لڑائی کا وقت آیا تو دشمن نے جیتنا شروع کر دیا۔ اب کہا جاتا ہے کہ مسلمان کیا کریں۔ برطانیہ اور امریکہ نے تو سامان بھیجنا بند کر دیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آج سے سال بھر پہلے تو انہوں نے سامان بھیجنا بند نہیں کیا ہوا تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انہوں نے آج سے سال بھر پہلے تیاری نہ کی؟ اور آج یہ شکوہ کر رہے ہیں کہ امریکہ اور برطانیہ نے ہمیں سامان بھجوانا بند کر دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کو یہ یقین ہوتا کہ خدا اُن کی اسی رنگ میں مدد کرے گا جس طرح اُس نے ابرہہ کے مقابلہ میں خانہ کعبہ کی کی۔ تو یقیناً وہ عمل بھی کرتے۔ وہ قربانی اور ایثار سے بھی کام لیتے اور اسلام کی ترقی کے لئے اپنی ہر چیز قربان کر دیتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو خدا تعالیٰ کی نصرت اُن

کی طرف دوڑتی ہوئی آجاتی۔ مگر قربانی کا مادہ یونہی تو پیدا نہیں ہو جاتا۔ قربانی ہمیشہ یقین کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ جس شخص کو یقین ہو کہ دشمن اُسے شکست نہیں دے سکتا وہ قربانی کرنے پر دلیر ہوتا ہے اور جس شخص کو یقین ہو کہ اگر وہ مر بھی گیا تو وہ جنت میں جائے گا وہ بھی اپنی کسی چیز کو قربان کرنے میں دریغ نہیں کرتا۔ بہرحال یقین ہی ایک ایسی چیز ہے جو جرأت پیدا کرتی ہے۔ یقین ہی ایک ایسی چیز ہے جو قربانی اور ایثار کا مادہ پیدا کرتی ہے اور یقین ہی ایسی چیز ہے جو بڑی بڑی مشکلات میں انسان کے قدم کو متزلزل ہونے سے بچاتی ہے۔ اور ایک مسلمان کے یقین کو اِس سے زیادہ مضبوط کرنے والی اَور کیا شے ہو سکتی ہے کہ خدا تعالیٰ خود فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ۔ اے مسلمان! تجھے پتہ ہے یا نہیں کہ اصحاب فیل کے ساتھ ہم نے کیا کیا۔ اگر تجھے اس واقعہ کا علم ہے تو تُو عیسائیت کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر کیوں مایوس ہوتا جا رہا ہے تیرا خدا آج بھی وہی خدا ہے جو اصحاب فیل کے وقت تھا۔ وہ خدا مفلوج نہیں ہو گیا، وہ خدا مسلول نہیں ہو گیا، وہ خدا بڈھا نہیں ہو گیا، وہ خدا ناکارہ نہیں ہو گیا۔ اُس خدا کی طاقتیں ماری نہیں گئیں، وہ خدا اب بھی ویسا ہی زندہ ہے جیسے پہلے زندہ تھا اور اب بھی ویسی ہی طاقتیں رکھتا ہے جیسی پہلے طاقتیں رکھتا تھا۔ جب تمہارا زندہ اور طاقتور خدا موجود ہے تو تم یہ خیال بھی کس طرح کر سکتے ہو کہ وہ اس مصیبت میں تمہاری مدد نہیں کرے گا اور اسلام کی کشتی کو منجدھار میں چھوڑ دے گا۔ اگر یہ یقین اور ایمان کسی کے دل میں پیدا ہو جائے تو مال اور جان کی قربانی اُس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ وہ اپنی جان کی قربانی بھی بے حقیقت سمجھتا ہے۔ اپنے بیوی بچوں کی جان کی قربانی بھی بے حقیقت سمجھتا ہے اور اپنی جائیداد کی قربانی بھی بے حقیقت سمجھتا ہے۔ آج مسلمان اگر پھر اپنے اندر ایسا یقین پیدا کر لیں تو آج بھی وہ دنیا کی ایک بڑی طاقت بن سکتے ہیں اور بڑی بات تو یہ ہے کہ اگر وہ قربانی اور ایثار کا یہ نظارہ دکھائیں تو اُن کے ایمان کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ بھی آسمان سے اُن کی مدد کے لئے اُتر آئے اور کہے کہ میرے بندوں نے قربانی پیش کر دی ہے اب اگر میں اُن کی مدد کے لئے نہ گیا تو مجھ پر بیوفائی کا الزام عائد ہو گا۔ مگر افسوس اس طرف کوئی توجہ نہیں چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف توجہ ہے۔ کہیں منسٹریوں کے جھگڑے کی طرف توجہ ہے کہیں کسی اَور بات کی طرف توجہ ہے لیکن اگر توجہ نہیں تو اُسی مقصود کی طرف جس سے اُن کی زندگی اور ایمان وابستہ ہے دنیا میں ایک آگ لگی ہوئی ہے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مزار اس وقت خطرہ میں ہے۔ یہود اُس کے دروازہ پر طاقت پکڑتے جا رہے ہیں اور یہود کے ارادے یہ ہیں کہ وہ سارے عرب کے علاقہ پر قبضہ کر لیں۔ کہا جاتا ہے کہ آج سے کئی سو سال پہلے جبکہ یہود کو کوئی طاقت حاصل نہیں تھی وہ مدینہ میں مسلمان بن کر گئے اور انہوں نے سرنگ لگا کر یہ کوشش کی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعش مبارک کو نکال لیں اور اُس کی بے حرمتی کریں۔ اچانک اُس وقت کے مسلمان بادشاہ کو خواب آگئی اور اللہ تعالیٰ نے رؤیا میں اُسے وہ یہود دکھا دئے جو یہ شرارت کر رہے تھے اور وہ گرفتار کر لئے گئے۔ اگر وہی قوم جس نے اپنی ذلّت اور بے کسی کے زمانہ میں بھی ہمارے آقا کی ہتک کرنے میں کوتاہی نہیں کی اُسے عرب اور شام کی حکومت مل گئی تو وہ کیا کچھ نہیں کرے گی۔ پس کتنا بڑا خطرہ ہے جو اِس وقت اسلام کو درپیش ہے۔ مگر افسوس کہ مسلمان چھوٹی چھوٹی باتوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور جو اصل مقصود ہے وہ اُن کی نظروں سے اوجھل ہے حالانکہ اس وقت قربانی اور صرف قربانی ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے اسلام دنیا میں پھر زندہ ہو سکتا ہے۔ اگر ہم اس لڑائی میں مارے بھی جاتے ہیں تو کیا ہوا عزت کی ایک گھنٹہ کی زندگی ہزار سالہ بے عزتی کی زندگی سے بہتر ہوتی ہے۔ یقیناً کوئی باغیرت مومن یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ وہ بے عزتی کی زندگی بسر کرے وہ عزت کی موت کو بے عزتی کی

زندگی سے ہزار درجہ بہتر سمجھیگا۔

غرض اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ کے ذریعہ آئندہ زمانہ کے متعلق ایک بہت بڑی پیشگوئی فرمائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آخری زمانہ میں پھر مسیحیت اپنے زور میں آکر اسلام کو توڑنے کی کوشش کرے گی مگر جس طرح سابق میں ہُوا اللہ تعالےٰ آئندہ زمانہ میں بھی اسلام کو دشمن کے حملہ سے بچائے گا۔ اور اُس کا وہی انجام کرے گا جو اصحاب الفیل کا ہُوا۔

جیسا کہ میں اُوپر اشارہ کر چکا ہوں زمانۂ بعثتِ اُولیٰ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عربوں نے اپنے بچوں کے نام محمد رکھنے شروع کر دئے تھے کہتے ہیں "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"۔ جب انہوں نے سُنا کہ آنے والے نبی کا نام محمدؐ ہو گا تو انہوں نے کہا چلو ہم بھی اپنے بچوں کا نام محمدؐ رکھ دیں شاید یہی اصل محمدؐ ہو جائے۔ اس بڑھتی ہوئی رَو کو دیکھکر عیسائیت کو سخت فکر پیدا ہُوا اور اُس نے چاہا کہ خانۂ کعبہ کو تباہ کر دے تاکہ عرب کی ترقی کے امکانات بالکل مٹ جائیں۔ اِس زمانہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں کا عام رجحان مسیحیت موعودہ اور مہدویت کی طرف تھا کیونکہ زمانۂ مسیحیت بالکل قریب آچکا تھا۔ پہلی بارہ صدیوں کو دیکھو اور پھر پچھلی ایک صدی کو دیکھو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ گذشتہ بارہ صدیوں میں جتنے مہدویت کے مدعی گذرے ہیں اُس سے دس گنا زیادہ مدعی صرف پچھلی ایک صدی میں ہوئے ہیں۔ یہ دس گنا فرق ثبوت ہے اس بات کا کہ مسیحیت اور مہدویت کے زمانہ کے قرب کی وجہ سے لوگوں میں ایک رَو پیدا ہونی شروع ہو گئی تھی چنانچہ جس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عیسائیت کو اپنے متعلق فکر پیدا ہو گئی تھی اِسی طرح اِس زمانہ میں بھی اس رَو کو دیکھکر عیسائیت کو فکر پڑ گئی اور اُس نے سمجھا کہ اس طرح عیسائیت اسلام کے مقابلہ میں کمزور ہو جائے گی۔ لیکن جس طرح اُس زمانہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی جماعت نے حبشہ کی عیسائی حکومت میں پناہ لی جس کا ایک گورنر خانۂ کعبہ کو گرانے کے لئے آیا تھا۔ اِسی طرح اِس دوسرے زمانہ میں بھی مہدئ موعودؑ نے اُنہی کے سایہ تلے پناہ پائی جن کو مہدویت کے کچلنے کی فکر تھی۔

قادیان کے متعلق ایک اعتراض اور اس کا جواب

اِس جگہ جماعت احمدیہ سے تعلق رکھنے والی یہ بات ہے کہ بعض مخالفین یہ اعتراض کر دیا کرتے ہیں کہ قادیان کو جماعت احمدیہ اپنا مقدس مقام قرار دیا کرتی تھی مگر وہ اِس وقت ہندوؤں اور سکھوں کے قبضہ میں ہے۔ ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اِس وقت قادیان سے احمدیوں کا نکلا جانا بھی درحقیقت اِسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اور گو بظاہر یہ فعل ہندوستانیوں کا نظر آتا ہے لیکن اصل میں یہ ساری کارروائی لارڈ مونٹ بیٹن مسیحی کی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے اِس کے متعلق میں نے مضامین لکھے تھے کہ گورداسپور کا علاقہ انڈین یونین میں صرف کشمیر کی خاطر شامل کیا گیا ہے اور لارڈ مونٹ بیٹن کا اِس میں یقینی ہاتھ ہے۔ لیکن اب گورنمنٹ پاکستان کے بعض افسروں اور ہندوستان سے باہر رہنے والوں نے بھی کئی مضامین میں یہ لکھا ہے کہ گورداسپور کا علاقہ جو ہندوستان کو دیا گیا وہ درحقیقت اِسی لئے دیا گیا تھا تاکہ کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ ملایا جا سکے۔ لیکن اِس سُورۃ سے ہمارے دلوں کی ڈھارس بندھتی ہے اور یقین ہوتا ہے کہ جس طرح اصحابِ فیل پہلی دفعہ تباہ ہوئے اب بھی تباہ ہوں گے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا الہام ہے کہ

شخصے پائے من بوسید و من گفتم کہ سنگِ اسود منم (تذکرہ صفحہ ۲۵)

ایک شخص نے میرے پاؤں کو چوما اور میں نے کہا ہاں سنگِ اسود مَیں ہی ہوں۔ درحقیقت ہر زمانہ کا مامور اُس کی جماعت کیلئے سنگِ اسود کا رنگ رکھتا ہے کیونکہ لوگ اُسے چومتے اور اُس کے اِرد گرد اکٹھے رہتے ہیں اور اس طرح دین کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ پس اِس زمانہ میں دین کی تقویت صرف حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے وابستہ ہے اور اس زمانہ میں روحانی سنگِ اسود آپ ہی ہیں گو جسمانی سنگِ اسود وہی ہے جو خانۂ کعبہ میں

موجود ہے اسی طرح یہ سورۃ الفیل بھی آپ پر الہاماً نازل ہوئی ہے پھر جس طرح اصحاب الفیل کے پہلے حملہ میں اصل مقصد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو تباہ کرنا تھا اسی طرح اب جو احمدیت پر حملہ ہوا ہے سو وہ اسی لئے ہوا ہے کہ ہندو بھی جانتا ہے اور سکھ بھی جانتا ہے اور مسیحی بھی جانتا ہے کہ اگر اسلام نے غلبہ پایا تو احمدیت کے ذریعہ ہی غلبہ پائے گا۔ پس اب بھی اس کا اصل مقصد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو تباہ کرنا ہے کیونکہ مسیح موعود کا کام اپنا وجود منوانا نہیں بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا وجود منوانا ہے۔ آپ خود فرماتے ہیں ؎

وہ ہے میں چیز کیا ہوں بس فیصلہ یہی ہے

قادیان کے متعلق ایک عیسائی پادری کی رائے

لیکن جس طرح گذشتہ زمانہ میں خانہ کعبہ کو گرانے میں ابرہہ اور اُس کا لشکر ناکام رہا تھا اسی طرح ہم جانتے ہیں اور اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ دنیا کی ساری طاقتیں اور قومیں مل کر بھی اگر اس سلسلہ کو جسے خدا نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دین قائم کرنے کے لئے کھڑا کیا ہے مٹانا چاہیں تو وہ ساری طاقتیں مل کر بھی اس سلسلہ کو مٹا نہیں سکتیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم کمزور ہیں، ہم جانتے ہیں کہ ہمارے اندر کوئی طاقت نہیں۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آسمان کی فوجیں ہماری تائید میں اُتریں گی اور اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ کا نظارہ دنیا متواتر دیکھتی چلی جائے گی۔ یہاں تک کہ وہی شخص جس کو مسلمانوں نے اپنی نادانی سے ٹھکرا دیا ہے اُسی کے ہاتھوں سے اسلام دنیا میں دوبارہ قائم ہوگا اور معترضین ہمارے سامنے نہایت شرمندگی کے ساتھ وہی کچھ کہتے آئیں گے جو یوسفؑ کے بھائیوں نے اُس سے کہا اور ہماری طرف سے بھی انہیں یہی کہا جائے گا کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ غیر دنیا، کافر دنیا، بے دین دنیا جس کا مقابلہ ہماری جماعت کر رہی ہے وہ تو جانتی ہے کہ احمدیت کی اشاعت میں ہی عیسائیت کی موت ہے لیکن مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ احمدیت کی اشاعت میں نعوذ باللہ اسلام کی تباہی ہے۔

مجھے یاد ہے میری خلافت کے ابتدائی زمانہ میں پادری والٹر WALTER سکرٹری لٹریچر آل انڈیا وائی ایم سی اے پادری ہیوم HUME اور فورمن کرسچن کالج لاہور کے پرنسپل مسٹر لیوکس LUCAS مجھ سے ملنے کیلئے قادیان آئے اور مختلف امور پر گفتگو کرتے رہے۔ واپس جاکر مسٹر لیوکس نے کولمبو میں عیسائیوں کے سامنے ایک لیکچر دیا جس میں کہا کہ آپ لوگ شاید یہ سمجھتے ہوں گے کہ عیسائیت کی جنگ بڑے بڑے شہروں یا بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں لڑی جائے گی۔ لیکن میں آپ لوگوں کو بتاتا ہوں کہ میں اس وقت ایک ایسے گاؤں میں سے ہو کر آیا ہوں جس میں ریل بھی نہیں جاتی (اُس وقت تک قادیان میں ریل نہیں آئی تھی) جس میں تار بھی نہیں (اُس وقت تک قادیان میں تار بھی نہیں تھی) اور جو نہایت ہی ادنیٰ حیثیت میں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اُسے ایک معمولی قصبہ کہا جا سکتا ہے۔ مگر میں وہاں عیسائیت کے مقابلہ کی ایسی تیاری دیکھ کر آیا ہوں کہ میں سمجھتا ہوں اسلام اور عیسائیت کی آئندہ جنگ جس میں یہ فیصلہ ہوگا کہ اب اسلام زندہ رہے یا عیسائیت۔ وہ کہیں اور نہیں لڑی جائے گی بلکہ قادیان کے قصبہ میں لڑی جائے گی۔ یہ فورمن کرسچن کالج کے پرنسپل کی رائے ایک سیلون کے اخبار میں چھپی تھی۔ مگر بدقسمتی سے وہی مسلمان جن کو ذلّت کے مقام سے نکالنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس آسمانی سلسلہ کو قائم کیا تھا وہی اس عظیم الشان تحریک سے فائدہ اٹھانے کی بجائے اس کے راستہ میں قسم قسم کی روکیں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہی ہے جو اُن کی آنکھیں کھولے اور انہیں سچا ایمان اور تقویٰ نصیب کرے۔

أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ۝ وَّأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ

کیا (اُن کو حملہ سے قبل ہلاک کر کے) اُن کے منصوبہ کو باطل نہیں کر دیا ۵۴ اور (پھر) اُن (کی لاشوں) پر

طَيْرًا أَبَابِيلَ ۝ تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ۝

جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے (جو) اُن (کے گوشت) کو سخت قسم کے پتھروں پر مارتے (اور نوچتے) تھے

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۝

اِس طرح اُس نے انہیں غلہ کے بیرونی چھلکے کی طرح کر دیا جس کے اندر کا دانہ کھا لیا گیا ہو۔ ۵۵

ع ۱ / ۳۰

ضَلَّلَ

۵۴ حل لغات - ضَلَّلَ کے معنے ہوتے ہیں سَيَّرَهُ إِلَى الضَّلَالِ (اقرب) اُس کو ضلال کی طرف لے گیا یعنی دین یا حق یا رستہ سے اُس کو دُور کر دیا۔ یہاں مراد یہ ہے کہ کامیابی کے مقررہ رستہ سے اللہ تعالیٰ نے اُسے دُور کر دیا۔ کیونکہ کَيْد کے مقابلہ میں یہی معنے اس جگہ چسپاں ہوتے ہیں پس أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ کے یہ معنے ہوں گے کہ کیا اُس کی تدبیر کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے راستہ سے دور نہیں کر دیا۔

تفسیر - حل لغات میں جو معانی بتلائے گئے ہیں اُن سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جو تفسیر میں اُوپر کر چکا ہوں وہی درست اور صحیح ہے۔ میں نے بتایا تھا کہ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مستقل طور پر عیسائیوں کے منصوبوں کو ایک لمبے عرصہ تک باطل کر دیا۔ اِسی لئے خدا تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ أَلَمْ يُضِلَّ كَيْدَهُمْ کیا خدا نے اُن کی کید کو ہٹا نہیں دیا۔ بلکہ یہ فرمایا ہے کہ أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ۔ تضلیل مصدر ہے اور مصدر عربی زبان میں ہمیشہ مستقل اور لمبے زمانہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں قَامَ زَيْدٌ تو اس کے معنے ہوں گے زید کھڑا ہوا لیکن اگر ہم کہیں گے زَيْدٌ قَائِمٌ تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ زید دیر سے کھڑا ہے اور آئندہ بھی اُس کے کھڑا رہنے کی امید ہے۔ اِسی طرح أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اُس نے عیسائیوں کا منصوبہ صرف اُس وقت باطل نہیں کیا جب وہ خانہ کعبہ پر حملہ کرنے کے لئے آئے تھے۔ بلکہ اُس نے بعد میں بھی ایک لمبے عرصہ تک اُن کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا اور اُن کی قوت کو کچل دیا تا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بڑھنے اور پنپنے کا موقع ملے اور آپؐ کی ترقی کے راستہ میں کوئی روک واقع نہ ہو۔ چنانچہ اسلام کے مقابلہ میں عیسائی ایک لمبے عرصہ تک مغلوب رہے۔ مگر پھر قرآن کریم کی ہی پیشگوئیوں کے مطابق دوبارہ عیسائیوں کو غلبہ حاصل ہوا۔ اور اب الٰہی فیصلہ یہ ہے کہ وہ مسیحیت کو دوسری شکست انشاء اللہ ہمارے ہاتھ سے دے گا۔

۵۵ حل لغات - أَبَابِيل جمع ہے جس کا مفرد کوئی نہیں لیکن بعض کے نزدیک اس کا مفرد إِبَّوْل ہے۔ ابابیل کے متعلق عوام الناس یہ سمجھتے ہیں کہ اس جگہ ابابیل وہی پرندہ مراد ہے جسے اردو زبان میں بھی ابابیل کہتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔ جس پرندے کو ہم ابابیل کہتے ہیں عربی زبان میں اُسے ابابیل نہیں بلکہ خفّاش کہتے ہیں۔ پس اس جگہ ابابیل سے کوئی خاص پرندہ مراد نہیں بلکہ اس کے معنے فِرَق یعنی جماعتوں کے ہیں اور طَيْرًا أَبَابِيلَ سے مراد یہ ہے کہ

"جماعت در جماعت" اور "گروہ در گروہ" پرندے آئے۔ یہ لفظ انسانوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور حیوانوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور پرندوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اگر گروہ در گروہ گھوڑے کسی جگہ کھڑے ہوں تو اُن کے متعلق بھی ابابیل کا لفظ استعمال کر لیا جائے گا چنانچہ عربی زبان کا یہ محاورہ ہے کہ جَاءَتِ الْخَيْلُ اَبَابِيْلَ جس کے معنے جَمَاعَاتٌ مِنْ هٰهُنَا وَهٰهُنَا کے ہیں یعنی جماعت در جماعت اور گروہ در گروہ گھوڑے آئے کچھ یہاں سے اور کچھ وہاں سے۔ اسی طرح اگر انسانوں کا کوئی بہت بڑا لشکر جمع ہو تو اُسے بھی ابابیل کہہ دیں گے اور مراد یہ ہوگی کہ بٹالین کے بعد بٹالین اور فوج کے بعد فوج آتی چلی گئی۔ پھر اس کے ایک معنے "جماعاتِ عظام" کے بھی ہوتے ہیں یعنی بڑی بڑی جماعتیں۔ اور ابابیل کے معنے اَقَاطِيْعُ تَتْبَعُ بَعْضُهَا بَعْضًا کے بھی ہوتے ہیں یعنی بڑے بڑے ٹکڑے جو ایک دوسرے کے بعد متواتر آتے چلے جائیں۔ پس اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ کے یہ معنے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف پرندے بھیجے جماعت در جماعت۔ کچھ یہاں کے کچھ وہاں سے۔ وہ بڑے بڑے ٹکڑوں میں باری باری آتے تھے اور گروہ در گروہ تھے۔ اس میں اسی طرف اشارہ ہے کہ چیچک سے اُس لشکر میں سخت موت پڑی اور لاشیں میدان میں چھوڑ کر باقی لوگ بھاگ گئے اور چاروں طرف سے گدھ اور چیلیں آ کر وہاں جمع ہو گئے تا اُن کی لاشوں سے نوچ نوچ کر گوشت کھائیں۔

سِجِّیل

سِجِّيْل چکنی مٹی کے ڈلے کی طرح کے پتھر کو کہتے ہیں لیکن لُغت کے بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ کلمہ معرب ہے اور سنگ گِل سے بنا ہے جو فارسی زبان کا لفظ ہے یعنی پتھر اور مٹی۔ عرب چونکہ گ نہیں بول سکتے اس لئے جب فارسی سے عربی زبان میں یہ لفظ گیا تو سنگ کی بجائے سج اور گِل کی بجائے جل بن گیا۔ پس سجّیل کے معنے ہیں ایسا پتھر جو کئی پتھر کے ٹکڑوں اور مٹی کی تہوں سے بنا ہوا ہو یا پکی ہوئی مٹی کا پتھر جسے پنجابی زبان میں کھنگر کہتے ہیں۔

تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ کے معنے عام محاورہ کے مطابق تو یہ ہیں کہ اُن پر سجّیل مارتے تھے لیکن اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ اُن کو سجّیل پر مارتے تھے۔ اور چونکہ مردار خور پرندوں کا یہ عام قاعدہ ہے کہ وہ مُردہ کا گوشت لے کر پتھر پر بیٹھ جاتے ہیں اور گوشت کو بار بار پتھر پر مارتے جاتے اور کھاتے جاتے ہیں نہ معلوم اُسے نرم کرتے ہیں یا اُس کی صفائی کرتے ہیں۔ بہرحال چیلوں اور گدھوں کا یہ عام قاعدہ ہے کہ وہ گوشت کو کھاتے ہوئے پتھر پر مارتے جاتے ہیں۔ اس لئے یہ بھی درست ہے کہ بِا کے معنے اس جگہ 'پر' کے لئے جائیں خصوصاً جبکہ یہ ثابت ہے کہ یہ لوگ چیچک سے مرے تھے اور اُن کی لاشیں تمام میدان میں پھیل گئی تھیں۔ پس آیت کا یہ مطلب ہے کہ مردار خور پرندے وہاں جمع ہو گئے اور انہوں نے اُن کی بوٹیاں نوچ نوچ کر اور پتھروں پر مار مار کر کھانی شروع کر دیں۔

بِا کے معنے جو اس جگہ عَلٰی کے کئے گئے ہیں یہ لُغت سے بھی ثابت ہیں اور استعمالِ قرآن سے بھی ثابت ہیں۔ ایک عرب شاعر کہتا ہے

اَرَبٌّ يَبُوْلُ الثُّعْلُبَانُ بِرَأْسِهٖ
لَقَدْ هَانَ مَنْ بَالَتْ عَلَيْهِ الثَّعَالِبُ

یعنی کیا وہ رب ہو سکتا ہے جس کے سر پر گیدڑ پیشاب کر جائیں۔ وہ چیز تو بہت ہی ذلیل ہے جس کے سر پر گیدڑ پیشاب کر جائے اور وہ اپنے آپ کو اس سے بچا بھی نہ سکے۔ یہ در اصل ایک صحابی کا شعر ہے جو انہوں نے اپنے زمانۂ بُت پرستی میں کہا تھا۔ وہ ایک دفعہ بُت کو اپنے ساتھ لے کر کسی سفر پر جا رہے تھے کہ راستہ میں انہیں پانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پانی کچھ فاصلہ سے مل سکتا تھا۔ انہوں نے اسباب کو ایک جگہ رکھا اور چاہا کہ وہ جا کر پانی لے آئیں مگر پھر خیال آیا کہ میرے اسباب کی

کون حفاظت کرے گا اگر پیچھے سے کوئی شخص آیا اور اسباب اُٹھا کر لے گیا تو میں کیا کروں گا۔ اس پر انہوں نے بُت کو نکال کر اسباب کے پاس رکھ دیا اور اُس سے کہا حضور میں تو پانی پینے چلا ہوں میرے آنے تک اسباب کی حفاظت فرمائیں۔ انہوں نے سمجھا کہ بُت سے زیادہ اچھا محافظ اور کون ہو سکتا ہے۔ مگر جب واپس آئے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک گیدڑ ٹانگ اُٹھا کر اُس بُت کے سر پر پیشاب کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اُن کے دل میں ایسی سخت نفرت پیدا ہوئی کہ انہوں نے بُت کو وہیں پھینکا اور یہ شعر کہا کہ

أَرَبٌّ يَبُوْلُ الثُّعْلُبَانُ بِرَأْسِهٖ
لَقَدْ هَانَ مَنْ بَالَتْ عَلَيْهِ الثَّعَالِبُ

کیا وہ بُت بھی رب ہو سکتا ہے جو اپنے سر کو پیشاب سے نہیں بچا سکتا۔ گیدڑ آتا ہے اور ٹانگ اُٹھا کر اس پر پیشاب کر دیتا ہے مگر اُس میں اتنی ہمت بھی نہیں کہ اپنے سر کو ہی پیشاب سے بچا سکے۔

اس شعر میں بِرَأْسِهٖ کے الفاظ ہیں مگر مراد یہ ہے کہ سر پر۔ اسی طرح قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ (آل عمران ع ۸) اگر تو اُسے ایک ڈھیر پر امین بنائے۔ اس جگہ بھی باء کے معنے ساتھ کے نہیں بلکہ پر کے ہیں۔ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَإِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ (التطفیف ع ۱) اس کے بھی لفظی معنے تو یہ ہیں کہ جب وہ اُن کے ساتھ گذرتے ہیں۔ مگر مراد یہ ہے کہ جب وہ اُن پر سے گزرتے ہیں تو آنکھیں مارتے ہیں۔ پس تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ اُن کو ایسے پتھروں پر مارتے تھے جو جلے ہوئے تھے۔

تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اُس تباہی کا نقشہ کھینچا ہے جو اصحاب الفیل پر آئی۔ آپ لوگوں نے دیکھا ہو گا کہ چیلیں اور گدھ اور کوّے اور دوسرے مردار خور جانور جب کوئی بوٹی کھاتے ہیں تو کس طرح کھاتے ہیں۔ وہ مردار کی بوٹی توڑ کر ایک طرف جا بیٹھتے ہیں اور پتھر پہ بیٹھ کر کبھی اُسے ایک طرف سے مارتے ہیں کبھی دوسری طرف سے۔ اور اس طرح بار بار اُس کو پتھر پر مارنے کے بعد کھاتے ہیں۔ یہی کیفیت اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں ظاہر کی ہے اور بتایا ہے کہ جب ہم نے چیچک سے اُن کو مار دیا تو چونکہ وہ ہزاروں ہزار تھے اِس لئے مُردوں کے ڈھیروں پر گروہ در گروہ اور جماعت در جماعت چیلیں اور گدھ اور کوّے اور دوسرے مُردار خور جانور اکٹھے ہو گئے۔ اور وہ بڑے بڑے جرنیل اور کرنیل جن کے ارد گرد ہر وقت پہرے رہتے تھے اور جو بڑی بڑی اعلیٰ وردیاں پہن کر اکڑ اکڑ کر چلتے تھے اُن کی بوٹیاں نوچ نوچ کر اور پتھروں پر مار مار کر کھانے لگے۔

۲۱۱
اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ ... اَبَابِيْل کو مراد ... لشکر پر اُن کے مُردوں ... گدھوں وغیرہ کا

غالباً کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہو گا جس نے اپنی زندگی میں یہ نظارہ نہ دیکھا ہو کہ چیلیں اور گدھ کس طرح بوٹی کھاتے ہیں۔ ہم نے تو ہزار ہا دفعہ دیکھا ہے اُن کا یہی طریق ہوتا ہے کہ وہ بوٹی کو توڑ کر اینٹ یا پتھر پر جا بیٹھتے ہیں اور پھر اُس بوٹی کو چونچ میں مضبوطی سے پکڑ کر پتھر پر مارتے ہیں کبھی اس طرف سے اور کبھی اُس طرف سے۔ شاید اس لئے کہ وہ مار مار کر اُسے نرم کرنا چاہتے ہیں یا اُن کی کوئی اور وجہ ہے بہرحال وہ کرتے اسی طرح ہیں۔ ابرہہ کا لشکر بھی جب چیچک سے مر گیا تو مردار خور جانور اکٹھے ہو گئے اور اُنہوں نے اُن کی بوٹیاں توڑ توڑ کر اور پتھروں پر مار مار کر کھانی شروع کر دیں۔ اس کے بعد کیا ہوا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُوْلٍ۔ اُس نے ... دانہ کھائے ہوئے بھُسے کی طرح کر دیا جس طرح اندر سے گندم کو کیڑا کھا جاتا ہے اور اُوپر کا صرف چھلکا باقی رہ جاتا ہے یہی طرح اُن کی کیفیت ہو گئی۔ اُن کا گوشت سب گدھیں اور چیلیں اور کوّے کھا گئے اور باقی صرف ہڈیاں رہ گئیں یا چمڑا اور سر کے بال رہ گئے۔

یہ وہ واقعہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں بیان فرمایا اور جو تمام آیات کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ افسوس ہے کہ مفسرین نے بجائے اس کے کہ حقیقت پر غور کرتے ایسے ایسے لاطائل اور بے بنیاد اور لغو قصے اس کے متعلق اپنی تفسیروں میں بھر دیے ہیں کہ جن کو پڑھ کر انسان کی اپنی عقل بھی حیران ہوتی ہے اور دشمن کو بھی اسلام پر ہنسی اُڑانے کا موقع ملتا ہے۔

سُوْرَةُ قُرَيْشٍ مَكِّيَّةٌ

سورۃ قریش ۔ یہ سورۃ مکی ہے [1]

وَهِيَ أَرْبَعُ آيَاتٍ دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے سوا چار آیتیں ہیں اور ایک رکوع ہے

سورۃ قریش کے دو نام

[1] اس سورۃ کے دو نام ہیں اسے قریش بھی کہتے ہیں اور اس کا ایک نام حدیثوں میں لِاِیْلٰفِ بھی آتا ہے لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ درحقیقت تین لفظ ہیں لیکن بعض لوگ جن کو پورے معنے نہیں آتے وہ غلطی سے لِاِیْلٰفِ کو ایک اور قُرَیْشٍ کو دوسرا لفظ سمجھ لیتے ہیں۔ یہ تو خیر جہلاء کی بات ہے معنوں کے لحاظ سے علماء بھی اس آیت کے معنوں میں مشکلات محسوس کرتے چلے آتے ہیں۔

سورۃ قریش مکی سورۃ ہے۔

مستشرقین اس سورۃ کو مکی قرار دیتے ہیں لیکن ضحاک اور کلبی دونوں نے اسے مدنی قرار دیا ہے ابن عباسؓ کی روایت یہ ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ چونکہ ضحاک اور کلبی دونوں صحابی نہیں بلکہ تابعی ہیں اس لئے میرے نزدیک بھی اس کا مکی ہونا ثابت ہے کیونکہ ایک صحابی کی روایت بہرحال زیادہ صحیح مانی جائے گی۔ وہ شخص جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا ہو لازماً وہ تاریخ زیادہ صحیح طور پر بتا سکتا ہے اور بعد میں آنے والوں کی روایت اُس کے مقابلہ میں بغیر دلیل کے کوئی وقعت نہیں رکھ سکتی حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے باقی مفسرین نے بھی اتفاق کیا ہے اور مستشرقین یورپ بھی عام طور پر اسے مکی قرار دیتے ہیں بلکہ بعض اسے نہایت ابتدائی سورتوں میں سے سمجھتے ہیں۔ چنانچہ نولڈکے جرمن مستشرق اسے مکی قرار دیتا ہے اور ساتھ ہی کہتا ہے کہ یہ نہایت ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ نولڈکے کا خیال ہے کہ یہ سورۃ الفیل کے زمانہ کی ہے (تفسیر ویری) ویری نے بھی اپنی تفسیر میں اسے مکی قرار دیا ہے۔

ہمارے مفسرین اور مستشرقین میں یہ فرق ہے کہ مفسرین اپنے دعویٰ کی بنیاد تاریخ پر رکھتے ہیں لیکن مستشرقین بجائے تاریخ پر بنیاد رکھنے کے مضمون اور عبارت سے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نہ تو قرآن کریم کا مضمون صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں اور نہ اتنی عربی جانتے ہیں کہ اسکی عبارت سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں مشہور مستشرق مارگولیتھ تھے یہ چوٹی کے مستشرقین میں سے سمجھے جاتے تھے۔ عربی کے بھی یہ پروفیسر تھے اور تاریخ کے بھی پروفیسر تھے خصوصاً اسلامی تاریخ کے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی انہوں نے لائف بھی لکھی ہے۔ انہوں نے ایک دفعہ عربی بولنے کی مہارت کا دعویٰ کیا تھا میں جب لندن گیا تو لڑکوں نے شرارت سے اُن کو مجبور کیا کہ وہ ہم سے عربی میں بات کریں۔ باوجود ہمارے عرب ممالک میں نہ رہنے اور عربی بولنے کی مہارت نہ ہونے کے (پروفیسر مارگولیتھ کئی سال مصر میں رہ چکے تھے) دو چار فقروں کے بعد مارگولیتھ صاحب کہنے لگے میں عربی میں بات نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مستشرقین عربی بہت کم جانتے ہیں۔ صرف بعض بعض مضامین کے بارہ میں انہوں نے تحقیق کی ہوتی ہے اور اُن میں سے بعض مضامین میں وہ واقعہ میں بعض کام کی باتیں نکالنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اگر عربی کتب میں سے ہم وہی باتیں خود نکالنا چاہیں تو نکال تو سکتے ہیں لیکن ہمیں بہت سی کتابیں دیکھنی پڑیں گی اور بہت زیادہ وقت صرف کرنا پڑیگا۔ مگر بہرحال زبان عربی سے اُن کی واقفیت اتنی کم ہے کہ اُن کا آیات قرآنیہ کو دیکھ کر یہ کہنا کہ اس کی مکہ والی زبان ہے اور اس کی مدینہ والی محض ایک ڈھکوسلہ ہوتا ہے۔ باقی رہا اُن کا زمانہ کی تاریخ سے

لحاظ سے سورتوں اور آیات کی ترتیب قائم کرنا دراصل یہ انکی ہمارے مذہب پر ایک زد ہوتی ہے اور اُن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم زمانہ کے لحاظ سے نازل ہوا ہے یعنی جس رنگ میں زمانہ بدلتا گیا اُسی رنگ میں قرآن کریم کے احکام بھی بدلتے چلے گئے۔ یُوں تو ہم بھی کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے حالات کو مدنظر رکھا ہے مگر ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہ حالات نہ ہوتے تب بھی خدا تعالیٰ یہ احکام ضرور نازل کرتا کیونکہ یہ احکام صرف مکہ اور مدینہ کے لئے نہیں تھے بلکہ تمام دنیا کے لئے تھے۔ مگر اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ حالات مکہ کے زمانہ کے مطابق ہیں اور وہ حالات مدینہ کے زمانہ کے مطابق ہیں۔ اس لئے فلاں فلاں سورتیں مکی ہیں اور فلاں فلاں مدنی۔ لیکن بہرحال چونکہ اُن کا رعب دنیا پر قائم ہے اس لئے اُن کا نام کہیں لانا پڑتا ہے اور چونکہ اس زمانہ میں لوگ اُن کی بات کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں اس لئے ہم بھی جہاں کہیں اپنے مفید مطلب کوئی بات نظر آتی ہے اُن سے فائدہ اُٹھا لیتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض جگہ مضمون بھی کسی سورۃ کے مکی یا مدنی ہونے پر دلالت کرتا ہے مگر یہ کوئی مستقل دلیل نہیں ہاں بعض جگہ ایسا ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ میرے نزدیک اس سورۃ کا مضمون بھی ایسا ہے جو اس کے مکی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں تھے مکہ کی حفاظت کا وعدہ تھا ورنہ مدینہ میں جانے کے بعد تو یہ پیشگوئیاں شروع ہو گئی تھیں کہ ہم خود مکہ فتح کرینگے۔ اس لئے مکہ کے حالات بہرحال ہجرت سے پہلے زمانہ سے ہی مطابقت رکھتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے آخری پارہ کی سورتیں یکے بعد دیگرے اسلام کے ابتدائی اور آخری زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں یعنی ایک سورۃ اگر ابتدائے زمانۂ اسلام کے متعلق ہوتی ہے تو دوسری سورۃ آخری زمانۂ اسلام کے متعلق ہوتی ہے۔ یہ سورۃ اسلام کے ابتدائی زمانہ کے متعلق ہے جیسا کہ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ والی سورۃ آخری زمانہ کے متعلق تھی۔

سورۃ قریش کا سورۃ الفیل سے تعلق

اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے یہ تعلق ہے کہ پہلی سورۃ میں یہ بتایا گیا تھا کہ کس طرح خدا تعالیٰ نے کعبہ کی حفاظت کی اور یہ کہ آئندہ زمانہ میں بھی وہ کعبہ کی اسی طرح حفاظت فرمائے گا۔ آئندہ زمانہ کی بات تو ابھی دنیا نے دیکھی نہیں جب وقت آئے گا دنیا اس نظارہ کو بھی دیکھ لے گی لیکن پہلا نشان مکہ والے دیکھ چکے ہیں۔ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ اسی نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اس عظیم الشان نشان کو دیکھتے ہوئے پھر بھی مکہ کے لوگ دنیا کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی طرف کم توجہ کرتے ہیں حالانکہ اتنا بڑا نشان دیکھنے کے بعد انہیں یہ یقین ہو جانا چاہیئے تھا کہ خانہ کعبہ سے تعلق رکھنے والوں اور اُس کی سچی خدمت کرنے والوں کا اللہ تعالیٰ خود حافظ و ناصر ہوتا ہے اور اس وجہ سے انہیں دنیا کی طرف کم توجہ کرنی چاہیئے تھی مگر افسوس ہے کہ اُن کی حالت اس کے برعکس ہے۔

دوسرا تعلق اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں کعبہ کے دشمنوں کا انجام بتایا گیا تھا۔ اب اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ خانہ کعبہ سے محبت رکھنے والوں کے انجام کا ذکر کرتا ہے۔ گویا ایک میں دشمنوں کا انجام بتایا اور دوسری میں دوستوں سے خواہ وہ کتنے گنہگار ہی تھے اپنے تعلق کا اظہار کیا اور اُن پر اپنے احسان کا ذکر کیا۔

میں اُوپر بتا چکا ہوں کہ ابرہہ اور اُس کے لشکر کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ کوئی اتفاقی امر نہیں تھا اس امر کا مزید ثبوت ان دونوں سورتوں کا یکے بعد دیگرے آنا ہے۔ دنیا میں یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ جب کسی چیز کے دونوں پہلو بیان کر دیئے جائیں اور وہ دونوں پہلوؤں سے کامل نظر آتی ہو تو اُس پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ وہ اتفاقی ہے۔ چونکہ اصحاب الفیل کے واقعہ پر یہ اعتراض ہو سکتا تھا کہ کیوں نہ اسے اتفاقی حادثہ قرار دے دیا جائے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

(میں) اللہ (تعالےٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ○ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ○

(اور اغراض کے علاوہ) قریش کے دلوں کو مانوس کرنے کیلئے یعنی اُن کے دلوں کو گرمائی و سرمائی سفروں سے مانوس کرنے کیلئے (ہم نے ابرہہ کو تباہ کیا) ۲ے

سورۂ ایلف کے ذریعہ اس اعتراض کو دُور کر دیا۔ پہلی سورۃ میں یہ بتایا گیا تھا کہ جس نے خانۂ کعبہ سے دشمنی کی اُس سے ایسا ایسا سلوک ہُوا۔ اب سورۂ ایلف میں یہ بتاتا ہے کہ جس نے خانۂ کعبہ سے دوستی کی اُس سے اس اس طرح سلوک ہُوا۔ اگر خانۂ کعبہ سے دشمنی رکھنے والوں کی سخت ذلت اور رسوائی ہوئی اور دوسری طرف خانۂ کعبہ سے دوستی رکھنے والوں کو اللہ تعالےٰ نے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے تو ہر شخص اِن دونوں متقابل باتوں کو دیکھ کر سمجھ سکتا ہے کہ یہ جو کچھ ہُوا بالارادہ ہُوا اتفاقی امر نہیں تھا۔ مثلاً ہمارے ہاں پٹواری زمین کی پیمائش کرتے ہیں تو اُن کا طریق یہ ہوتا ہے کہ پہلے وہ ایک پختہ نشان سے زمین کی پیمائش شروع کرتے ہیں اور مقصود زمین کے نشانات لگا لیتے ہیں اس کے بعد ایک اَور پختہ نشان سے پیمائش شروع کرتے ہیں اور پھر اس کے مطابق اس زمین کا حدود اربعہ نکال لیتے ہیں۔ اگر دونوں طرف کی پیمائش آپس میں مطابق ہو جائے تو اُس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں رہتا اور تسلی ہو جاتی ہے کہ جو حد قائم کی گئی ہے وہ بالکل درست ہے اِسی طرح خدا تعالےٰ نے ایک سورۃ میں یہ بیان کیا کہ دشمن سے کیا معاملہ ہُوا اور دوسری سورۃ میں یہ بیان کیا کہ دوست سے کیا معاملہ ہُوا۔ جب ایک طرف اس سلوک کا ذکر کیا گیا ہے جو خانۂ کعبہ کے دشمنوں سے ہُوا اور دوسری طرف اُس سلوک کا ذکر کیا گیا ہے جو خانۂ کعبہ کے دوستوں سے ہُوا تو جس طرح پٹواری جب دونوں طرف سے پیمائش کر لیتا ہے تو اُس کی قائم کردہ حدود قطعی طور پر درست ہوتی ہیں اسی طرح دوست اور دشمن سے متقابل کا یہ سلوک بتاتا ہے کہ دشمن سے جو سلوک ہُوا وہ بھی بالارادہ تھا اور دوست سے جو سلوک ہُوا وہ بھی بالارادہ تھا اور چونکہ دونوں زاویوں سے پیمائش ایک ہی نکلی ہے اِس لئے دشمن کی تباہی اتفاقی امر نہیں کہلا سکتا۔

لِاِيْلٰفِ ۲ے

۲ے حل لغات۔ لِاِيْلٰفِ میں جو لام آتا ہے یہ بتاتا ہے کہ اس کا کوئی متعلق محذوف ہے۔ عربی زبان میں حروف کے ساتھ کلمے شروع نہیں ہُوا کرتے بلکہ یا تو فعل سے کلمہ شروع ہوتا ہے یا اسم سے شروع ہوتا ہے مثلاً کہیں گے ذَهَبَ زَيْدٌ زید گیا یا کہیں گے زَيْدٌ ذَاهِبٌ زید جانے والا ہے۔ پس عربی میں یا تو فعل کے ساتھ جملہ شروع ہوتا ہے یا اسم کے ساتھ ... ساتھ اگر جملہ شروع ہو گا تو وہ مبتدا اور خبر سے مرکب ہو گا اور اگر فعل کے ساتھ جملہ شروع ہو گا تو وہ فعل اور فاعل سے مرکب ہو گا حرف کے ساتھ کوئی جملہ شروع نہیں ہوتا۔ مثلاً یہاں لام حرف ہے اور اِيْلٰفٌ مصدر ہے اسکو دیکھکر ہر شخص جو معمولی عربی بھی جاننے والا ہو فوراً سمجھ جائے گا کہ اس فقرہ سے پہلے ضرور کچھ نہ کچھ محذوف ہے کیونکہ نہ تو یہ جملہ فعل کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور نہ اسم کے ساتھ نہ یہ مبتدا اور خبر ہے نہ فعل اور فاعل ہے۔ اس لئے لام کا متعلق بہرحال یہاں محذوف ہے۔

حروف کے متعلق عربی زبان میں یہ طریق رائج ہے کہ اگر کسی فقرہ کے شروع میں وہ آجائیں تو اُن کا متعلق محذوف ہوتا ہے مثلاً بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کو ہی لے لو۔ یہ باء سے شروع ہوتی ہے جو ایک حرف ہے اِس لئے اِس سے پہلے ضرور کچھ نہ کچھ محذوف ہے جو

بار کا متعلق کہلاتا ہے اور وہ محذوف یہ ہے کہ اَقْرَأُ یا اَشْرَعُ یعنی میں اللہ کا نام لے کر پڑھتا ہوں یا اللہ کا نام لے کر شروع کرتا ہوں یا اِقْرَأْ یا اِشْرَعْ۔ اسی طرح لِاِیْلٰفِ میں بھی لام کا متعلق محذوف ہے۔ اگر کوئی کہے کہ آپ کو کس طرح پتہ لگ گیا کہ اس سے پہلے ضرور کچھ محذوف ہے کیوں نہ سمجھا جائے کہ یہ محض ایک ڈھکوسلہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اِس میں ڈھکوسلے کا کوئی سوال نہیں عربی لغت نے ایک قاعدہ بنایا ہوا ہے اُس کے ماتحت ہم خود بخود سمجھ جاتے ہیں کہ فلاں کا متعلق محذوف ہے یا نہیں۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی ڈاک خانہ میں تار دینے جائے اور ٹِک ٹِک کی آواز سُنے تو پوچھے کہ آپ لوگوں کو کس طرح پتہ لگ جاتا ہے کہ اِس ٹِک ٹِک سے مراد کیا ہے تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ گورنمنٹ نے پہلے سے ایک کوڈ بنایا ہوا ہے اُس کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ٹِک کی آواز آتی ہے تو ہم فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ اس سے A مراد ہے یا B مراد ہے یا C مراد ہے۔ اِسی طرح عربی زبان میں تمام قواعد مدوّن ہیں اُن کے مطابق جب کسی فقرہ سے پہلے حرف آئیگا مثلاً بار آئیگی یا لام آئے گا تو ہم اُن قواعد کو مدنظر رکھتے ہوئے فوراً سمجھ جائیں گے کہ اِن کا متعلق محذوف ہے۔ بیشک بعض دفعہ دو دو چار چار متعلق بھی نکل آئینگے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی حرف تو شروع میں آئے مگر اُس کا متعلق محذوف نہ ہو۔ یہاں بھی لِاِیْلٰفِ کے لام نے بتا دیا ہے کہ اس کا متعلق محذوف ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا محذوف ہے؟ اِس بارہ میں بہت کچھ اختلاف ہے مگر اِس اختلاف کے معنے صرف اتنے ہیں کہ کسی کا رُحجان کسی معنے کی طرف چلا گیا ہے اور کسی کا رحجان کسی طرف۔ اور چونکہ وہ معنے سب کے سب اس مقام پر چسپاں ہو جاتے ہیں اس لئے ہمارے نزدیک جھگڑے یا اختلاف کا کوئی سوال ہی نہیں ہم سمجھتے ہیں کہ وہ سارے کے سارے درست ہیں کئی متعلق ہونے کے یہ معنے نہیں کہ ہم اُن میں سے کسی ایک کو ہی درست قرار دیں اور باقی متعلقات کو رَد کر دیں۔ بلکہ اگر سارے کے سارے متعلق معنوں کے لحاظ سے چسپاں ہو جاتے ہیں تو ہم اُن سب کو تسلیم کرلیں گے صرف یہ کہیں گے کہ کسی نحوی عالم کا ذہن ایک طرف چلا گیا ہے اور کسی نحوی عالم کا ذہن دوسری طرف چلا گیا ہے۔ اِس لحاظ سے خواہ دو متعلق ہوں یا تین ہوں یا چار ہوں اگر وہ سب کے سب اپنے معانی کے لحاظ سے آیت پر چسپاں ہو جاتے ہوں تو وہ سب کے سب درست ہوں گے۔

اِس آیت کے محذوف کے متعلق ایک قول بصری نحویوں کا ہے اور ایک کوفی نحویوں کا۔ گذشتہ زمانہ میں عرب میں دو بڑے مشہور نحوی سکول تھے ایک بصری اور دوسرا کوفی۔ یعنی اِن دونوں شہروں کے نحوی بعض الگ الگ اصول کے معتقد تھے (اسے بھی انگریزی زبان میں سکول کہتے ہیں اس سے مدرسہ مراد نہیں) اور ان اصولی مسائل کی وجہ سے اُن کے مسائل کے استخراج میں فرق ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے بعض بعض مسائل نحویہ میں وہ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے تھے۔ ہندوستان میں باوجود اس کے کہ مذہباً اس کے افراد زیادہ تر کوفی ہیں یعنی امام ابوحنیفہ صاحبؒ کوفی کے متبع۔ نحو میں زیادہ تر بصری علماء کی طرف رجوع کیا جاتا ہے لیکن مصر اور شام کے لوگ کوفی نحویوں کے قول کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں حالانکہ وہ مذہباً شافعی ہیں۔ یوں اختلاف تو ہر جگہ ہے ہندوستان میں بھی اور باہر بھی۔ کوئی کسی نحوی کے قول کو ترجیح دیتا ہے اور کوئی کسی کے قول کو۔

اس تمہید کے بعد میں بتانا چاہتا ہوں کہ بصری نحویوں کا قول اِس بارہ میں یہ ہے کہ یہاں لام کا متعلق پہلی سورۃ کی آخری آیت ہے یعنی فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ۔ ہم نے اُن کو دانہ کھائے ہوئے بھُسے کی طرح کر دیا قریش کے اِیلاف کے لئے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ہی لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ کا متعلق ہے تو خانہ کعبہ کی حفاظت خانہ کعبہ کی وجہ سے تھی یا اِیلاف قریش کی وجہ سے؟ اگر قریش کا اِیلاف مدنظر نہ ہوتا تو کیا اصحابِ فیل کو تباہ نہ کیا جاتا

اگر کیا جاتا تو یہ مزید احسان قریش پر کیسا؟ گویا یہ متعلق تسلیم کرنے کی وجہ سے یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ پہلی سورۃ میں بتایا گیا تھا کہ خانہ کعبہ کے احترام کے نتیجہ میں ہم نے ایسا کیا مگر یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ قریش کے اندر مودّت اور اُنس پیدا کرنے کے لئے ہم نے ایسا کیا۔ بظاہر یہ اختلاف معلوم ہوتا ہے بلکہ جو معنے میں نے بیان کئے تھے اُن کے لحاظ سے تو یہ اعتراض اور بھی پختہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ میں نے صرف یہی نہیں بیان کیا تھا کہ خانہ کعبہ کے احترام کی وجہ سے اصحابِ فیل کو تباہ کیا گیا بلکہ میں نے یہ بیان کیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے احترام کی وجہ سے بھی اصحابِ فیل کو تباہ کیا گیا۔ گویا پہلے تو اصحابِ فیل کی تباہی کی صرف دو اغراض بتائی گئی تھیں (۱) خانہ کعبہ کا احترام اور (۲) قریش کا اِیلاف۔ مگر میں نے ایک تیسری وجہ بھی بتا دی جو میرے نزدیک ان دونوں وجوہ سے مقدم اور زیادہ اہم تھی۔ پس یہ اعتراض اور بھی بڑھ گیا کہ پہلے دو وجوہ بتائی گئی تھیں مگر اب اسی کام کی ایک تیسری وجہ بھی بتائی جا رہی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میرے معنوں کی وجہ سے یہ اعتراض زیادہ پختہ نہیں ہو گیا بلکہ بالکل مٹ گیا ہے۔ وجہ یہ کہ میں نے اصحابِ فیل کی تباہی کی دو وجوہ بتائی تھیں میں نے کہا تھا کہ پہلی سورۃ میں ایک تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے احترام کا ذکر ہے اور ایک خانہ کعبہ کے احترام کا ذکر ہے۔ پس جب تعدد جائز ہو گیا تو جہاں ایک کام کی دو غرضیں ہو سکتی ہیں وہاں تیسری غرض بھی ہو سکتی ہے۔ میرے معنوں سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ ایک کام دو اغراض کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ جب ایک کام دو اغراض کے لئے ہو سکتا ہے تو ایک کام تین اغراض کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ فرض کرو ایک شخص لائل پور سے چلا ہے اور اُس کا ارادہ یہ ہے کہ راولپنڈی سے سودا خریدے مگر پھر اُسے خیال آتا ہے کہ چلو پشاور چلوں وہاں میرے بعض رشتہ دار رہتے ہیں اس طرح دونوں کام ہو جائیں گے۔ پشاور سے میں سودا بھی خرید لوں گا اور اپنے رشتہ داروں سے بھی مل لوں گا۔ تو یہ تعدّدِ اغراض بالکل درست ہو گا اسی طرح اللہ تعالےٰ نے خانہ کعبہ کا احترام بھی ظاہر کرنا چاہا ہے، محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا احترام بھی ظاہر کرنا چاہتا ہے بلکہ میرے نزدیک مقدم غرض دعوئ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا احترام ظاہر کرنا تھی۔ اب اُس نے ایک تیسری غرض بھی بیان کر دی کہ ہمنے یہ نشان اِیلٰفِ قُرَیْش کے لئے بھی ظاہر کیا تھا اس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں۔

جس طرح ایک ہی سفر کی تین غرضیں بھی ہو سکتی ہیں سودا بھی خرید لیا جائے، رشتہ داروں سے بھی مل لیا جائے اور کسی دوست سے بھی ملاقات کر لی جائے اسی طرح اصحابِ فیل کی تباہی بھی تین اغراض کے لئے ہو سکتی ہے۔ جب دنیوی کاموں میں تعددِ اغراض کو جائز سمجھا جاتا ہے جائز ہی نہیں بلکہ بعض دفعہ مستحسن خیال کیا جاتا ہے تو اللہ تعالےٰ نے بھی اگر ایک کام کی تین اغراض بتا دیں تو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ پس لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ کے جو معنے بصری نحویوں نے کئے ہیں اُن پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اصحابِ فیل کی تباہی سورۂ فیل کی بتائی ہوئی اغراض کے علاوہ قریش کی دلجمعی اور تسلی کے لئے بھی ہو سکتی تھی اور یہ سورۃ بتاتی ہے کہ اس تباہی میں یہ غرض بھی مخفی تھی۔

بعض لوگ تعددِ اغراض کے خلاف فلسفیانہ رنگ میں اعتراض کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک کام کی اگر کئی اغراض ہوں تو اُن میں سے کوئی مقدم اور اہم ہو گی اور جب کوئی غرض اہم اور مقدم ہو گی تو باقی سب ضمنی رہ جائیں گی مقصود ان میں سے کوئی بھی نہ ہو گی۔ اس کے جواب میں یاد رکھنا چاہیئے کہ خالص فلسفہ ایک لغو اور بیہودہ شئے ہے جو محض کتابوں تک محدود ہوتا ہے ورنہ دنیا میں تمام باتیں ہوتی ہیں۔ دیکھنا یہ نہیں کہ فلسفی کیا کہتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ دنیا کیا کرتی ہے۔ اگر یہی فلسفہ کسی کے سامنے بیان کرو اور کہو کہ تُو نے کہا تھا میں شادی اس لئے کر رہا ہوں کہ گھر بس جائے گا اولاد ہو گی اور اب تُو کہتا ہے کہ روٹی کا بھی آرام ہو جائے گا

اِن دونوں میں سے تمہاری کوئی ایک ہی غرض ہو سکتی ہے دونوں نہیں تو وہ کیا کہیگا۔ وہ ایسا اعتراض کرنے والے کو پاگل سمجھے گا بلکہ شادی کی ایک تیسری غرض بھی ہوتی ہے کہ تقویٰ حاصل ہو کیونکہ شہوانی قوٰی بھی اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں پیدا کئے ہوئے ہیں۔ پھر بعض لوگ جن کی طبیعت میں کچھ نقص ہوتا ہے وہ تو یہ بھی کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہمارے گھر میں کوئی پڑھا ہوا نہیں لڑکی پڑھی ہوئی ہے اگر وہ آئی تو ہمارے گھر میں بھی علم کا چرچا ہو جائے گا۔ اِس طرح شادی کی ایک اَور غرض بھی بیان کر دی جاتی ہے اور کوئی شخص نہیں کہتا کہ تم ایک ہی کام کی تین تین چار چار اغراض بیان کر رہے ہو یہ تو درست نہیں صرف ایک غرض ہونی چاہیئے۔ پس فلسفی کا یہ کہنا کہ ایک غرض اصلی ہوگی اور باقی سب ضمنی ہونگی بالکل غلط ہے۔ حقائق کا علم علم النفس اور فلسفہ کے امتزاج سے ہوتا ہے محض فلسفہ سے نہیں۔ اگر ہم سب امور کا تجزیہ فلسفہ سے کریں تو دنیا کی کوئی حقیقت حقیقت نہیں رہتی۔ دنیا کے بہت سے کام کئی کئی اغراض کے لئے ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف ایک غرض کے لئے وہ کام نہ کیا جاتا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر صرف ایک غرض ہوتی تب بھی وہ کر لیا جاتا۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سب اغراض ایک اہمیت کی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کم و بیش اہمیت کی ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کم اہمیت والی اغراض خالی ہوتیں تو اُن کے لئے کام نہ کیا جاتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگر وہی ہوتیں زیادہ اہمیت والی نہ ہوتی تو بھی کام کیا جاتا۔ بہرحال ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ کوئی وجہ مقدم ہے اور کوئی مؤخر۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ تعددِ اغراض ناجائز ہے۔ ایسا کہنا فطرتِ انسانی کے بھی خلاف ہے اور واقعات کے بھی خلاف ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی صفات کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ فطرتِ انسانی اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کے مطابق پیدا کی ہے۔ ہم اپنی فطرت پر قیاس کر کے سمجھ سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی صفات بھی اِسی رنگ میں جاری ہوتی ہیں۔ اور صرف صفاتِ الٰہی پر غور کر کے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ بعض لوگوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر فرض کرو ایک ہی غرض ہوتی تو کیا وہ شخص کام کرتا یا نہ کرتا؟ ہم کہتے ہیں ضرور کرتا۔ اِس پر وہ کہتے ہیں تو پھر تم اَور اغراض اُس کے ساتھ کیوں شامل کرتے ہو۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ اِس امر کا فیصلہ کہ وہ کام کس غرض سے تھا کام کرنے والے کے بیان پر منحصر ہے۔ اگر اُس نے ایک کام دو اغراض سے کیا ہے اور وہ دو اغراض منطقی طور پر اُس کام کی غرض بن سکتی ہیں تو بہرحال ہمیں اُس کی بات کو تسلیم کرنا ہوگا اور اُس پر اعتراض کرنے والا بے وقوف ہوگا۔ ہمارا کوئی حق نہیں ہوگا کہ ہم کہیں کہ صرف فلاں غرض اِس کام کی تھی باقی سب غرضیں باطل ہیں۔

اِس تمہید کے سمجھ لینے کے بعد یہ امر سمجھ لینا آسان ہے کہ اصحابِ فیل کی تباہی تینوں اغراض کے لئے تھی اور یہ کہنا کہ اگر یہ تباہی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے احترام یا خانہ کعبہ کے بچانے کے لئے تھی تو قریش پر احسان کیوں جتایا گیا ہے باطل اور واقعات کے خلاف ہے۔ جب اِس تباہی کی تینوں اغراض تھیں تو وہ اِن تینوں کا ذکر کرے گا۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے احترام کا بھی ذکر کرے گا، خانہ کعبہ کی عزت کا بھی ذکر کرے گا اور قریش پر احسان بھی جتائیگا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہر کام کئی طرح پورا کیا جا سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایک طرح پورا کرنے میں ایک غرض پوری ہو اور دوسری طرح پورا کرنے میں دو غرضیں پوری ہوں۔ پس اگر اُس کام کو دوسری طرح پورا کیا گیا ہے تو اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ دونوں اغراض مدنظر تھیں اور اگر تیسری طرح پورا کیا گیا ہے جس کے ساتھ تین اغراض وابستہ تھیں تو ہمیں ماننا پڑیگا کہ تینوں اغراض اُسکے مدنظر تھیں۔

میں اُوپر تفصیلاً بتا چکا ہوں کہ ابرہہ اور اُس کے لشکر اور اُس کی حکومت کی تباہی صرف خانہ کعبہ کے احترام اور اُسکی عزت کی حفاظت کے لئے نہیں تھی کیونکہ جتنی تباہی سے خانہ کعبہ بچ سکتا تھا اُس سے بہت زیادہ تباہی ہوئی تھی جو بتاتی ہے کہ اُس کی تباہی میں کچھ اَور اغراض بھی تھیں۔ مثلاً خانہ کعبہ کی حفاظت اِس طرح بھی ہو سکتی تھی کہ ابرہہ کے لشکر میں چند موت کے حادثا

ہو جاتے اور وہ ڈر کر بھاگ جاتے۔ اس طرح بھی خانہ کعبہ اُس کے حملہ سے بچ سکتا تھا لیکن اگر مسیحی حکومت یمن سے بالکل برباد نہ ہو جاتی تو اُس کی طرف سے مکہ پر بار بار حملے ہوتے رہتے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ترقی نہ کر سکتے۔ اِدھر یہ جو ذکر ہے کہ قریش یمن کا سفر کیا کرتے تھے وہ بھی نہ کر سکتے۔ آخر جس ملک سے لڑائی ہو اس کی طرف وہ آزادانہ رنگ میں کس طرح سفر کر سکتے تھے۔ پس اللہ تعالےٰ نے صرف ابرہہ اور اُس کے لشکر کو نہیں بھگایا بلکہ یمن سے اس کی حکومت ہی مٹا دی اِسی تباہی کی طرف اللہ تعالےٰ نے پچھلی سورۃ میں اشارہ کیا تھا اور کہا تھا کہ غور کرو اور سوچو کہ ہم نے اصحابِ فیل کو کس رنگ میں تباہ کیا اور دیکھو کہ اس سے نہ صرف مکہ بچ گیا بلکہ یمن سے عیسائی حکومت بھی اُٹھ گئی اور یمن کی عیسائی حکومت کے تباہ ہونے کی وجہ سے ہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن نے مکہ میں ترقی کی اور اس تباہی کی وجہ سے ہی قریش کو یمن میں سردی کا سفر نصیب ہوا۔ اگر یہ تباہی نہ ہوتی تو وہ رِحۡلَۃَ الشِّتَآءِ کس طرح کر سکتے وہاں تو اُن کا دشمن بیٹھا ہوا تھا۔ یہ تمام امور بتاتے ہیں کہ خالی ابرہہ اور اُس کے لشکر کی تباہی اللہ تعالےٰ کے مدِ نظر نہیں تھی بلکہ یہ ایک ایسی صورت پیدا کی جا رہی تھی جس کے نتیجہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت بھی ہو جاتی، خانہ کعبہ کی بھی حفاظت ہو جاتی اور مکہ والوں کے سفروں میں بھی روک پیدا نہ ہوتی پس تباہی کی کیفیت اس نوع کی تھی کہ وہ کیفیت صاف طور پر ایلافِ قریش کی غرض کو بھی ثابت کرتی ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ نبی عربی کی بننے والی اُمت کی حفاظت بھی اللہ تعالےٰ کے مدِ نظر تھی کیونکہ اُس کی حفاظت میں نبی اُمّی کی بعثت کی کامیابی مضمر تھی۔ پس مکہ والوں کی حفاظت بحیثیت مکہ والوں کے نہیں کی گئی یا قریش کی حفاظت بحیثیت قریش کے نہیں کی گئی بلکہ قریش کی اگر حفاظت کی گئی تو اس لئے کہ قریش آئندہ آنیوالے نبی اُمّی کی اُمت بننے والے تھے۔ اگر وہ پراگندہ ہو جاتے تو وہ اُس کی اُمت نہ بن سکتے۔ پس مکہ والوں کی حفاظت بھی مکہ والوں کی خاطر نہیں تھی بلکہ وہ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر تھی گویا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کی خاطر اس قوم کو بھی بچایا گیا۔ خلاصہ یہ کہ اصحابِ فیل کو مندرجہ ذیل تین اغراض کے پورا کرنے کیلئے تباہ کیا گیا۔

اصحابِ فیل کو تباہ کئے جانے کی تین اغراض

اوّل۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے احترام کیلئے۔

دوم۔ خانہ کعبہ کے اعزاز کے لئے

سوم۔ قریش کو بچانے کے لئے جو حاملِ دینِ مصطفوی ہونے والے تھے نہ کہ اُن کی کسی ذاتی خوبی کی وجہ سے۔

کیا سورۃ قریش سورۃ فیل کا حصہ ہے؟

اِس جگہ ایک اَور سوال کا حل کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ میں لام کا جو تعلق پہلی سورۃ سے ظاہر کیا گیا ہے اس سے یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ یہ سورۃ سورۃ الفیل کا ایک حصہ ہی ہے علیحدہ سورۃ نہیں۔ اِس کے متعلق بعض علماء نے یہ مزید دلیل دی ہے کہ اُبی ابن کعب کے نسخۂ قرآن میں اس سورۃ اور اصحاب الفیل کی سورۃ کو اکٹھا لکھا ہوا ہے اور دوسری تائیدی دلیل یہ پیش کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ آپ نے ایک دفعہ پہلی رکعت میں سورۃ تین پڑھی اور دوسری رکعت میں سورۂ فیل اور سورۂ قریش دونوں پڑھیں اور بیچ میں بسم اللہ نہیں پڑھی۔ اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک بھی یہ دونوں سورتیں ایک ہی تھیں لیکن یہ دلائل کوئی قوت نہیں رکھتے۔ اُبی ابن کعب اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُن چار آدمیوں میں سے تھے جن کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یہ قرّاء اُمت ہیں اگر کسی شخص نے قرآن سیکھنا ہو تو ان سے سیکھے لیکن جہاں یہ درست ہے وہاں اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُبی ابن کعب ویسے ہی غلطی کر سکتے ہیں جیسے کوئی اور شخص غلطی کر سکتا ہے۔ ہم اپنے پاس سے ایک مضمون بنا کر لکھتے ہیں لیکن اُس میں بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں کہیں "ہے" رہ جاتا ہے، کہیں "کا" کی جگہ "کی" لکھا ہوا ہوتا ہے، کہیں کوئی اور غلطی ہو جاتی ہے۔ کاتب قرآن کریم لکھتے ہیں تو باوجود

اِس کے کہ بعض دفعہ بڑے بڑے مشّاق کاتب ہوتے ہیں پھر بھی اُن سے کئی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ممکن ہے کسی جگہ پر غلطی سے ابی ابن کعب کو خیال نہ رہا ہو اور وہ اِن دونوں سورتوں کے درمیان بسم اللہ لکھنا بھول گئے ہوں۔ جبکہ قرآن کریم کا جو نسخہ ہمارے پاس ہے اُس میں اِن دونوں سورتوں کو الگ الگ لکھا ہُوا ہے اور اُن کے درمیان بسم اللہ بھی لکھا ہُوا ہے اور قرآن کریم کا یہ نسخہ ایسا ہے جس کی ترتیب میں صرف ابی ابن کعب نے ہی کام نہیں کیا بلکہ بہت سے اور صحابہ نے بھی جن کا رتبہ قرأت میں حضرت ابی ابن کعب سے کم نہ تھا کام کیا تھا۔ چاروں قراء نے مل کر اس میں حصہ لیا ہے اور باقی سارے صحابہؓ نے بھی ملکر حصہ لیا ہے۔ جو نسخہ ان ساروں نے مل کر لکھا ہے یہ صاف بات ہے کہ وہ زیادہ احتیاط سے لکھا ہُوا ہو گا۔ پھر ابی ابن کعب کے نسخہ میں تو غلطی کا امکان ہے کیونکہ کسی نے اُس پر بحث نہیں کی لیکن اِس پر بحثیں کی گئی ہیں۔ اور صحابہؓ نے اس کے متعلق اپنی شہادتیں اور گواہیاں دی ہیں کہ کوئی سورۃ نہیں لکھی گئی، کوئی آیت نہیں لکھی گئی، کوئی زیر اور زبر نہیں لکھی گئی جس کے متعلق دو قسم کی شہادتیں نہیں لی گئیں۔ ایک یہ کہ تحریر موجود ہو۔ دوسرے یہ کہ زبانی گواہ موجود ہوں جو یہ کہتے ہوں کہ ہم نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ایسا سُنا ہے۔ یہ کتنی بڑی محنت ہے اور کتنی بڑی احتیاط کا ثبوت ہے۔ زبانی گواہی کو نہیں مانا گیا جب تک اُس کے ساتھ تحریری شہادت نہ ہو اور تحریری شہادت کو نہیں مانا گیا جب تک اُس کے ساتھ زبانی گواہ نہ ہوں۔ گویا تحریر بھی موجود ہو اور زبانی گواہ بھی موجود ہوں تب کسی سورۃ یا آیت کو قرآن کریم میں شامل کیا جاتا اور یہ زبانی گواہ بھی بعض دفعہ سینکڑوں تک ہُوا کرتے تھے صرف ایک دو آیتیں ایسی ہیں جن کے متعلق صرف دو دو گواہ ایسے ملے ہیں جنہوں نے یہ کہا ہے کہ ہم نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ایسا سُنا ہے لیکن باقی ساری آیتیں اور سورتیں ایسی ہیں جن میں کسی کے بیس، کسی کے پچاس اور کسی کے سو گواہ تھے اور بہت سے حصوں کے ہزاروں گواہ موجود تھے۔ بہرحال وہ شہادت جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تحریر سے ثابت ہوتی تھی خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے املاء اور لکھوانے سے ثابت ہوتی تھی۔ پھر زبانی گواہ آتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم نے رسول کریم صلے علیہ وسلم سے ایسا سُنا یا ہم نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ایسا پڑھا ہے وہی قطعی اور یقینی سمجھی جاتی تھی اور اِسی قسم کی شہادتوں کے بعد ہی قرآن کریم میں کوئی آیت شامل کی جاتی تھی پس وہ نسخۂ قرآن جو ہمارے پاس ہے اور جس میں سورۃ الفیل اور سورۃ القریش کو الگ الگ لکھا ہُوا ہے۔ یہ خود اپنی ذات میں اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ یہ دونوں سورتیں الگ الگ ہیں۔ اگر ایک شخص اپنے طور پر قرآن کریم لکھتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ دو سورتوں کے درمیان بسم اللہ اُس سے غلطی سے رہ جائے۔ پس یہ کوئی دلیل نہیں جو پیش کی گئی ہے۔

دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ اس منفی دلیل کے علاوہ ایسی مثبت دلیل بھی موجود ہے کہ سورۃ قریش سے پہلے بسم اللہ لکھی ہوئی تھی اور اِس وجہ سے اِس کے الگ سورۃ ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور وہ یہ ہے کہ تمام مؤرخین اور تمام قراء اور تمام ماہرین فن صحابہؓ سے متفقہ طور پر یہ بات ثابت ہے کہ صرف ایک سورۃ البراءۃ ایسی ہے جس سے پہلے بسم اللہ نہیں لکھی گئی اور اِس شہادت کے دینے والوں میں خود ابی ابن کعب بھی شامل ہیں۔ یہ سب گواہ اتفاق کرتے ہیں کہ سوائے سورۃ البراءۃ کے اور کوئی سورۃ نہیں جس سے پہلے بسم اللہ لکھی ہوئی نہ ہو۔ اور جب سوائے سورۃ البراءۃ کے سارے قرآن کریم میں اور کوئی سورۃ نہیں جس سے پہلے بسم اللہ نہ ہو تو اگر ابی ابن کعب نے اپنے نسخۂ قرآن میں سورۃ قریش سے پہلے بسم اللہ نہیں لکھی تو یہ بات خود تواتر کے خلاف ہے اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اُن سے غلطی ہوئی۔ احادیث صحیحہ سے صاف ثابت ہے کہ جس سورۃ سے پہلے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بسم اللہ لکھواتے تھے وہ اُس کے ایک الگ سورۃ ہونے کی ایک قطعی شہادت ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ البرٰۃ کے متعلق یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ وہ کوئی الگ سورۃ

ہے یا نہیں۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کا یہی خیال تھا کہ یہ سورۃ الگ نہیں بلکہ یہ ایک فصل ہے سورۃ انفال کے مضمون کی اور میرے نزدیک یہی درست ہے میں غور سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سورۃ انفال میں ایک دعویٰ کیا گیا ہے جس کا تفصیلی ثبوت سورۃ البرأۃ میں پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ مضمون مستقل اور اہم تھا اس لئے اُس کو بطور فصل قرار دے دیا گیا۔ پس وہ کوئی الگ سورۃ نہیں بلکہ سورۃ انفال کی ہی ایک فصل ہے اور اس کا ثبوت یہی ہے کہ صریح طور پر حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب بھی کوئی نئی سورۃ لکھواتے اُس سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ضرور لکھواتے تھے۔ سورۃ البرأۃ سے پہلے چونکہ بسم اللہ نہیں اس لئے یہ سورۃ الانفال سے کوئی الگ سورۃ نہیں مگر چونکہ یہ الگ فصل تھی مسلمانوں نے اس کا نام سورۃ البرأۃ رکھ لیا۔

مفسرین نے اس جگہ پر یہ بھی جواب دیا ہے کہ مضمون کا اتحاد ایک سورۃ ہونے پر دلالت نہیں کرتا اور یہ بالکل درست ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم تو سارے کا سارا منظم، سارے کا سارا مرتب اور سارے کا سارا باترتیب ہے۔ اُس کے مضامین ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پروئے ہوئے ہیں جس طرح ہار میں موتی پروئے ہوئے ہوتے ہیں اور جب سارا قرآن ہی منظم ہے تو یہ کہہ دینا کہ چونکہ اس سورۃ کا مضمون لام کے ذریعہ سے پہلی سورۃ کے ساتھ جوڑا گیا ہے اس لئے یہ الگ سورۃ نہیں کوئی صحیح دلیل نہیں بنتی۔ اگر اس دلیل کو تسلیم کیا جائے تو سارے قرآن کریم ہی کو ایک دلیل سمجھا جائیگا کیونکہ سارے قرآن میں ہی مضامین کا ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ ہے۔ اس کی موٹی مثال قرآن کریم کے شروع میں ہی موجود ہے۔ سورۃ فاتحہ میں آتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ اور سورۃ بقرۃ کے شروع میں آتا ہے الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ قرآن ہی وہ کامل کتاب ہے جس کے لئے تم نے دعا کی ہے اور اس میں متقیوں کے لئے ہدایت ہے۔ گویا سوال سورۃ فاتحہ میں ہے اور جواب سورۃ بقرۃ میں۔ اب کیا اس جوڑ کی وجہ سے سورۃ بقرۃ کے الگ سورۃ ہونے کا انکار کیا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں اور نہ کسی نے اس جوڑ کی وجہ سے سورۃ بقرۃ کے مستقل سورۃ ہونے کا انکار کیا ہے۔

(۲) لام کا وہ متعلق جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اُس کے علاوہ ایک دوسرا محذوف متعلق بھی لام کا تجویز کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں اس سے پہلے اِعْجَبْ يَا مُحَمَّدُ محذوف ہے یعنی اے ہمارے نبی تعجب کر قریش کے سردی گرمی کے سفروں سے محبت کرنے پر۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی زبان میں ایک لام تعجب کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ جب کسی فقرہ میں لام تعجب استعمال کیا جائے تو لازماً اس سے پہلے یا تو تعجب کا لفظ موجود ہوگا اور یا پھر محذوف ہوگا۔ اس جگہ چونکہ تعجب کا لفظ موجود نہیں اس لئے وہ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے اِعْجَبْ محذوف ہے اور اصل عبارت یوں ہے کہ اِعْجَبْ يَا مُحَمَّدُ لِنِعَمِ اللّٰهِ عَلٰى قُرَيْشٍ فِيْ اِيْلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ یعنی اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو تعجب کر اللہ تعالیٰ کے قریش پر یہ احسان کرنے پر کہ اُن کے دل میں گرمی سردی کے سفروں کی محبت پیدا ہوگئی۔ اس طرح اُن کا گذارہ بھی چلتا ہے اور اُن کا رُعب بھی بڑھتا ہے۔ مکّہ کے لوگوں کو اپنے شہر سے اتنی محبت تھی کہ وہ اُسے عارضی طور پر چھوڑنا بھی پسند نہیں کرتے تھے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ مکّہ کے لوگ جن کے دلوں میں مکہ کی اتنی شدید محبت تھی تعجب ہے کہ وہ کس باقاعدگی کے ساتھ گرمیوں میں شام کا اور سردیوں میں یمن کا سفر کرتے ہیں (یہ مضمون آگے آئے گا کہ اس میں کیا حکمت تھی) اس سے اُن کا گذارہ بھی چلتا ہے اور اُن کا اردگرد کی قوموں پر رُعب بھی پڑتا ہے۔ یہ اتفاقی بات نہیں بلکہ ہم نے اپنی تقدیر خاص سے اُن کے دلوں میں یہ محبت پیدا کی ہے پس انہیں چاہیئے کہ جس گھر کی وجہ سے اُن کو یہ عزت ملی ہے اُس گھر کے مالک کی بھی عبادت کریں۔

(۳) تیسرے معنے بعض کے نزدیک یہ ہیں کہ یہ لام متعلق ہے فَلْيَعْبُدُوْا کا جو بعد کی آیت میں مذکور ہوا ہے یہ زمخشری اور بعض پُرانے نحویوں کا قول ہے۔ دراصل یہ زجاج کا قول ہے جسے زمخشری نے قبول کر کے اپنی تفسیر میں درج کیا ہے۔

اِن معنوں پر بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ فَلْيَعْبُدُوْا سے پہلے فاء پڑی ہوئی ہے اور فاء ہمیشہ جملہ کے آخری حصہ کے لئے آتی ہے حالانکہ لام کا متعلق پہلے آنا چاہیئے تھا۔ وہ کہتے ہیں ہم یہ مانتے ہیں کہ بعض دفعہ ایک چیز مقام کے لحاظ سے پہلے ہوتی ہے لیکن ذکر کے لحاظ سے پیچھے آتی ہے مگر فاء بتا رہی ہے کہ فَلْيَعْبُدُوْا کا مقام بعد کا ہے اِس لئے اِسے لام کا متعلق کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے جس کا مقدم ہونا ذکراً نہ ہو تو مقاماً اور معناً ضروری ہے اِس کا جواب زجاج اور زمخشری نے یہ دیا ہے کہ فاء شرط کے جواب کے لئے آتی ہے اور اس جگہ فاء سے پہلے ایک اور جملہ محذوف ہے اور یہ فاء اُسی محذوف جملہ پر دلالت کرتی ہے نہ کہ اِيْلٰفِهِمْ پر۔ چنانچہ وہ یہ فقرہ اِس جگہ محذوف بتاتے ہیں فَاِنْ لَّمْ يَعْبُدُوْا بِنِعْمَةٍ اُخْرٰى فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ یعنے اگر خدا تعالےٰ کی اَور نعمتوں کی قریش کو قدر نہیں تو کم سے کم قریش کے دلوں میں جو اُس نے سردی گرمی کے سفروں کی محبت پیدا کی ہے اس کی قدر کرتے ہوئے تو اللہ تعالےٰ کی عبادت کریں۔ گویا اصل عبارت یُوں ہے کہ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ اگر وہ کسی اَور نعمت کی قدر نہیں کرتے تو ایلافِ قریش کی نعمت کی وجہ سے ہی خدا تعالےٰ کی عبادت کریں۔

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ۔ اِيْلٰف۔ اٰلَفَ کا مصدر ہے اور اس کے معنے کسی چیز کی محبت دل میں ڈالنے کے ہوتے ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ عربی زبان میں اٰلَفَ کے دو مصدر آتے ہیں اِلَافٌ بھی اور اِيْلٰفٌ بھی۔ وہ اٰلَفَ جس کا مصدر اِلَافٌ ہوتا ہے اُس کے اور معنے ہوتے ہیں اور وہ اٰلَفَ جس کا مصدر اِيْلٰف ہوتا ہے اُس کے اور معنے ہوتے ہیں جب صرف اٰلَفَ کا فعل آئے تو ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ اس کے کیا معنے ہیں۔ آیا اِيْلٰفٌ والے معنے ہیں یا اِلَافٌ والے معنے ہیں۔ ہم عبارت کو دیکھ کر اس بارہ میں کوئی رائے قائم کریں گے اور یہ فیصلہ کریں گے کہ وہ اٰلَفَ اِيْلٰفٌ والا ہے یا اٰلَفَ اِلَافٌ والا ہے۔ لیکن اگر مصدر ساتھ آ جائے تو ہمیں اس کے معنوں کی تعیین میں کوئی دقت پیش نہیں آئیگی ہم فوراً سمجھ سکیں گے کہ اِس کے کیا معنے ہیں۔ چونکہ اس آیت میں مصدر اِلَافٌ نہیں بلکہ اِيْلٰفٌ استعمال کیا گیا ہے اور اِيْلٰفٌ کے معنے کسی چیز کی محبت پیدا کرنے اور ڈالنے کے ہوتے ہیں خصوصاً مکان یا مقام کی محبت پیدا کرنے کے لئے یہ لفظ زیادہ استعمال ہوتا ہے اِس لئے اِس جگہ محبت پیدا کرنے کے معنے ہی مراد لئے جائیں گے۔

لفظ ایلٰف کے متعلق پہلے مفسرین کی ٹھوکر

عجیب بات یہ ہے کہ بعض دفعہ بڑے بڑے عالم بھی ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ یہاں صریح طور پر اِيْلٰفٌ کا لفظ استعمال ہُوا ہے بعض مفسّر اس کے معنے اِلَافٌ کے کر جاتے ہیں یعنی بجائے محبت پیدا کرنے کے وہ صرف محبت کرنے کے معنے لیتے ہیں۔ حالانکہ محبت کرنے کے تو یہ معنے ہوتے ہیں کہ مَیں محبت کرتا ہوں یا میرے دل میں محبت ہے لیکن محبت پیدا کرنے کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ مَیں دوسرے کے دل میں محبت پیدا کرتا ہوں۔ دراصل اس لفظ کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ اس سے دھوکا لگ جاتا ہے۔ آلَفَ میں دو ہمزے آتے ہیں یعنی اصل لفظ اگر لکھا جائے تو اُس کی شکل یُوں ہوگی أَأْلَفَ۔ لیکن عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب دو ہمزے اکٹھے ہو جائیں تو دونوں ہمزوں کو ملا کر مد بنا دیتے ہیں یعنی بجائے أَأْ کہنے کے ہم آ کہہ دیں گے مثلاً أَأْمَنَ کو ہم أَأْمَنَ نہیں کہیں گے بلکہ ہمزوں کی جگہ مد استعمال کر کے آمَنَ کہہ دیں گے۔ اِسی طرح أَأْلَفَ کو آلَفَ کہہ دیں گے۔ مگر عربی زبان میں آلَفَ کے دو وزن ہیں اور

۲۰۱ اِيْلٰف

اسی وجہ سے اِس کے دو الگ الگ مصدر آتے ہیں۔ وہ دو وزن فَاعَلَ اور اَفْعَلَ ہیں۔ کبھی یہ لفظ فَاعَلَ کے وزن پر ہوگا اور کبھی اَفْعَلَ کے وزن پر۔ جب فَاعَلَ کے وزن پر ہو تو اِس کا مصدر فِعَالٌ کے وزن پر آئیگا اور جب فعل اَفْعَلَ کے وزن پر ہوگا تو مصدر اِفْعَالٌ کے وزن پر ہوگا بات یہ ہے کہ عربی زبان میں تمام افعال کا وزن بیان کرنے کیلئے ف - ع - ل کے حروف کو استعمال کیا جاتا ہے اور ہر لفظ کا وزن انہی تین حرفوں کے ہیر پھیر سے نکالا جاتا ہے۔ اگر فَاعَلَ کے وزن پر کوئی لفظ بنانا ہوگا تو چونکہ فَاعَلَ میں ف کے بعد ایک الف زائد ہے اِس لئے اُس میں بھی ہم پہلے حرف کے بعد ایک الف زائد کر دیں گے۔ اور اگر اَفْعَلَ کے وزن پر کوئی لفظ بنانا ہوگا تو چونکہ اَفْعَلَ الف پہلے حرف یعنی ف سے پہلے ہے ہم اس لفظ کے پہلے حرف کے پہلے ایک الف بڑھا دیں گے۔ اس قاعدہ سے ظاہر ہے کہ اَلِفَ کے لفظ سے اگر ہم فَاعَلَ کے وزن پر لفظ بنانا چاہیں گے تو اُسے آلَفَ لکھیں گے اور اگر اَفْعَلَ کے وزن پر لفظ بنانا چاہیں تو بھی اُسے آلَفَ لکھیں گے لیکن فرق یہ ہوگا کہ جب فَاعَلَ کے وزن پر ہم آلَفَ کا لفظ بنائیں گے تو ہم یہ سمجھیں گے کہ آ کے دو ہمزوں میں سے پہلا ہمزہ اَلِفَ کا ہے اور دوسرا ہمزہ فَاعَلَ کے وزن کا ہے۔ اور جب اَفْعَلَ کے وزن پر یہ لفظ بنائیں گے تو ہم سمجھیں گے کہ پہلا ہمزہ تو اَفْعَلَ کے وزن کا ہے اور دوسرا ہمزہ اصل لفظ کا ہے۔ ورنہ ظاہری شکل ایک ہوگی۔ لیکن جب ان لفظوں سے مصدر بنائیں گے تو وہ مصدر مختلف شکلوں کے ہونگے آلَفَ بوزن فَاعَلَ سے بنا ہوا مصدر اِلَافٌ ہوگا اور آلَفَ بوزن اَفْعَلَ سے بنا ہوا مصدر اِیْلَافٌ ہوگا کیونکہ فَاعَلَ کا مصدر فِعَالٌ کے وزن پر آتا ہے اور اَفْعَلَ کا مصدر اِفْعَالٌ کے وزن پر آتا ہے۔ پس جبکہ اَلِفَ سے بنے ہوئے دونوں لفظ جو فَاعَلَ اور اَفْعَلَ کے وزن پر ہوں شکل میں ایک ہوں گے اور اُن کے معنوں کا فرق صرف سیاق و سباق سے معلوم ہوگا مصدر کی صورت میں معنوں کا فوراً پتہ لگ جائے گا کیونکہ دونوں کے مصدر الگ الگ شکل کے ہیں۔ اسی لئے یہاں مصدر استعمال کیا گیا ہے تاکہ معنے واضح ہو جائیں لیکن تعجب ہے کہ بعض بڑے علماء نے باوجود اِیْلَاف کا مصدر استعمال ہونے کے اس جگہ آلَفَ کے معنے کئے ہیں جس کا مصدر اِلَافٌ ہے اور بعض نے تو قرأۃ دو میں سے ایک جگہ اِلَافٌ کا لفظ پڑھنا جائز سمجھا ہے۔

جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں وہ آلَفَ جس کا مصدر اِیْلَافٌ ہو اُس کے معنے کسی دوسرے کے دل میں محبت پیدا کر دینے کے ہوتے ہیں خصوصاً مکان یا مقام کی محبت۔ چنانچہ کہتے ہیں آلَفْتُهٗ مَكَانًا كَذَا جَعَلْتُهٗ يَأْلَفُهٗ (اقرب) میں نے فلاں مکان کے متعلق اُس سے اِیْلَاف کیا یعنی اُس کے دل میں اُس مکان کی محبت پیدا کر دی۔ اِسی طرح آلَفَهٗ اِیْلَافًا کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ هَيَّاَهٗ وَ جَهَّزَهٗ۔ اُس کو سامان دیا اور اُسے تیار کر دیا۔ پھر ایک محاورہ آلَفَهٗ اِیَّاهُ بھی عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے جس کے معنے ہوتے ہیں اَلْزَمَهٗ اِیَّاهُ اُس کے ساتھ اُسے لازم کر دیا یا اُس کے ساتھ اُس کے تعلق کو مضبوط کر دیا۔

پہلے معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ کے یہ معنے ہوں گے کہ قریش کے دل میں محبت پیدا کرنے کے لئے یا اُنس پیدا کرنے کے لئے ہم نے اصحابِ فیل کو تباہ کیا۔ گویا یہاں اضافت مفعولی ہے۔ آگے رہا یہ سوال کہ اس کا دوسرا مفعول کیا ہے۔ تو اس کے متعلق میں بتا چکا ہوں کہ مفسرین نے دوسرا مفعول رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ کا جملہ قرار دیا ہے یعنی سردی گرمی کے سفروں کی محبت پیدا کرنے کے لئے یا سردی گرمی کے سفروں کو محبوب بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اصحابِ فیل کو تباہ کیا۔

دوسرے معنے آلَفَ اِیْلَافًا کے تیار کرنے اور سامان مہیا کرنے کے ہوتے ہیں۔ سامان مہیا کرنے کے معنوں کے رُو سے اس آیت کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ قریش کو

گرمی سردی کے سفر پر تیار کرنیکے فعل الٰہی پر تعجب کرو یعنی اِس قوم کا سفروں پر آمادہ ہو جانا یا اِن سفروں کے لئے ہر قسم کے سامانوں کا اُس کے لئے مہیا ہو جانا ایک ایسی چیز ہے جو قابلِ تعجب ہے۔ درحقیقت تیار کرنے کے معنے سامان مہیا کرنے کے بھی ہوتے ہیں پس اس میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اُن کے لئے امن قائم کر دیا۔ رستے کھول دئے۔ لوگوں کے دلوں میں اُن کی محبت پیدا کر دی۔ اُن کا احترام پیدا کر دیا اور پھر خود اُن کے دلوں میں اس خواہش کا پیدا ہو جانا بھی ایک تعجب کی بات ہے کیونکہ وہ مکّہ کے عاشق تھے اور سفر پر جانا پسند نہیں کرتے تھے۔

تیسرے معنے اِیْلَاف کے کسی چیز کو لازم کر دینے کے ہیں۔ ان معنوں کے رُو سے اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ ہم نے اصحابِ فیل کو تباہ کیا تاکہ ہم قریش کو شتاء و صیف کے سفروں سے وابستہ کر دیں وہ ان کو چھوڑیں نہیں۔ اگر ہم اصحاب فیل کو تباہ نہ کرتے تو یہ اس امر پر مجبور ہو جاتے کہ سفروں کو چھوڑ دیں لیکن ہمارا منشاء یہ تھا کہ سفروں پر قائم رہیں اور چونکہ ہمارا منشاء یہ تھا کہ یہ سفروں پر قائم رہیں اس لئے ہم نے اصحابِ فیل کو تباہ کر کے ایسے سامان کر دئے کہ انہیں سفر چھوڑنے کے لئے کوئی مجبوری پیش نہ آئی۔

چوتھے معنے یہ ہیں کہ قریش کو سردی گرمی کا سفر کرنیکی محبت پیدا کرنے پر اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے یعنی فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ کا صلہ بنا کر۔ اس کے یہ معنے ہوں گے کہ خدا تعالےٰ نے اُن پر ایک بہت بڑا انعام کیا ہے اور وہ یہ کہ اُن کے دلوں میں اُس نے سردی گرمی اور شتاء و صیف کے سفر کی محبت پیدا کر دی ہے پس یہ جو اللہ تعالےٰ نے اُن پر فضل کیا ہے کہ اُس نے شتاء و صیف کے سفر کی محبت اُن کے دلوں میں پیدا کر دی ہے اور پھر اس کے لئے اُس نے سامان بھی مہیا کر دئے ہیں یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ چاہیئے کہ وہ اس کی وجہ سے اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کریں اور اُسکی عبادت کریں۔

پانچویں معنے یہ ہیں کہ قریش کے اپنے نفسوں پر سردی گرمی کا سفر واجب کر دینے پر تعجب کرو یعنی یہ کیوں گھروں میں بیٹھ کر عبادت نہیں کرتے اور سفر کرتے ہیں۔ اس کے متعلق بھی آگے جہاں مضمون کی تفصیل آئے گی میں روشنی ڈالوں گا اِس جگہ مَیں صرف یہ کہدینا چاہتا ہوں کہ مجھے اِن معنوں پر اُسکی موجودہ شکل میں اعتراض ہے۔

اس جگہ پر بعض مفسرین نے ایک نکتہ بیان کیا ہے اور وہ نکتہ اِیْلَاف کے متعلق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ اٖلٰفِهِمْ میں دو اِیْلَاف آتے ہیں۔ ایک اِیْلَاف لفظ قریش سے پہلے آتا ہے اور ایک اِیْلَاف لفظ قریش کے بعد آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں پہلے اِیْلَاف کے بارہ میں قراء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کہ اسے اِلَاف پڑھنا چاہیئے یا اِیْلَاف۔ بعض کہتے ہیں کہ لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ اٖلٰفِهِمْ نہیں بلکہ لِاِلَافِ قُرَيْشٍ اٖلٰفِهِمْ پڑھنا چاہیئے اور بعض اِلَافِ قُرَيْشٍ نہیں بلکہ لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ پڑھتے ہیں لیکن قرآن مجید کی تحریر میں سب متفق ہیں کہ اسکو اِیْلٰف ہی لکھنا چاہیئے اِلَاف نہیں لکھنا چاہیئے۔ گویا پڑھتے تو بعض اس کو اِلَاف ہیں لیکن لکھتے وقت وہ اسے اِلَاف نہیں بلکہ اِیْلَاف لکھتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اِلَافِهِمْ کے متعلق لکھنے میں تو سب اس بات پر متفق ہیں کہ اسے اِیْلٰف لکھا جائے گا لیکن پڑھنے میں سب اُسے اِلَافِهِمْ پڑھیں گے۔ انہوں نے اِس سے ایک استدلال کیا ہے جو نہایت ہی لطیف استدلال ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم کی حفاظت کا یہ ایک زبردست ثبوت ہے کہ قرآن کریم کی تحریر بھی اور روایت بھی ایسی پختگی کے ساتھ قائم ہیں کہ اُن کے بارہ میں کسی کو شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ اگر یہ تحریر کسی شبہ کا موجب ہو سکتی تھی اور اگر کوئی شخص بھی خیال کرتا کہ اس تحریر میں غلطی رہ گئی ہے تو جو لوگ اس عقیدہ کے قائل تھے کہ پہلا اِیْلٰف درحقیقت اِلَاف ہے وہ جس طرح اُس کو اِلَاف پڑھتے ہیں اِسی طرح تحریر میں بھی اُسکو

اِلَاف کردیتے مگر وہ پڑھتے تو اِلَاف ہیں لیکن لکھتے اِیْلٰف ہیں۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ بھی اِس امر سے انکار نہیں کرسکتے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے جو نسخہ پہنچا ہے اُس میں اِیْلٰف ہی لکھا ہوا ہے ورنہ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اُن کا خیال تو یہ ہے کہ یہ لفظ اِیْلٰف نہیں بلکہ اِلَاف ہے لیکن لکھتے اِیْلٰف ہیں اور پڑھتے اِلَاف ہیں۔ اُنکا اِلَاف پڑھنا اور اِیْلٰف لکھنا ثبوت ہے اس بات کا کہ باوجود اس کے کہ اُن کے اپنے دل میں یہ یقین تھا کہ یہاں قرأت اِلَاف ہے چونکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جو نسخہ قرآن پہنچا اس میں اِیْلَاف ہی لکھا ہوا تھا اِس لئے اُن میں یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اسے بدل سکیں۔ اس سے بڑا ثبوت قرآن کریم کی حفاظت کا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کا اپنا خیال یہ ہے کہ اِلاف ہے اِیْلَاف نہیں وہ بھی پڑھتے تو الاف ہیں لیکن لکھتے اِیْلَاف ہیں اور وہ یہ جرأت نہیں کرسکتے کہ اس کو بدل دیں۔ دوسرا اِیْلٰف جو ہے یہ قرآن کریم کے اُن نسخوں میں جو ہمارے ملک میں چھپتے ہیں یاء کی بجائے کھڑی زیر کے ساتھ لکھا ہوا ہوتا ہے مگر اس سے یہ لفظ اِلَاف نہیں بن جاتا بلکہ اِیْلٰف ہی رہتا ہے۔ دراصل لکھنے کے دونوں طریق مروج ہیں یاء کے ساتھ بھی اس لفظ کو لکھ لیتے ہیں اور کھڑی زیر کے ساتھ بھی لکھ لیتے ہیں۔ مگر مفسرین کے نزدیک قرّاء اسے پڑھتے تو اِیْلٰف ہیں مگر لکھتے اِلَاف ہیں۔ انہیں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ تحریر میں تبدیلی کرکے اِسے یاء کے ساتھ لکھنا شروع کردیں۔ ورنہ جب اُن کا خیال یہ تھا کہ یہاں یاء ہے تو وہ تحریر میں بھی اس کو یاء کے ساتھ بدل سکتے تھے لیکن قرأت کے اختلاف کے باوجود وہ لکھتے تو اِلاف ہیں مگر پڑھتے اِیْلٰف ہیں۔ یہ ثبوت ہے اِس بات کا کہ ہر شخص خواہ وہ موافق تھا یا مخالف یہ یقین رکھتا تھا کہ اُسے قرآن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اِسی طرح پہنچا ہے اِس میں تبدیلی کرنے کی اُسے جرأت نہیں ہوتی تھی۔ یہ قرآن کریم کے محفوظ اور غیر محرف ہونے کی ایک نہایت ہی عمدہ اور لطیف دلیل ہے۔

اِیْلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ۔ اِیْلٰفِهِمْ کو دوبارہ زور دینے کے لئے دُہرایا گیا ہے اور یہ پہلے اِیْلٰف کا بدل ہے۔ بدل سے مراد یہ ہے کہ وہی لفظ اپنی اصلی شکل میں یا اپنے کسی ہم معنی لفظ کی شکل میں کلام پر زور دینے کے لئے دوبارہ لایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں اُردو میں بھی اِس قسم کے فقرات استعمال ہوتے ہیں۔ مَیں نہیں جانتا کہ اُردو میں اسے بدل کہتے ہیں یا کچھ اَور۔ بہرحال جب کلام پر زور دینا مطلوب ہو تو اُردو میں بھی بات کو دُہرایا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے۔ دیکھو میاں مَیں تمہیں کہتا ہوں۔ دیکھو میاں میں تمہیں کہتا ہوں۔ گو یا لفظاً یا معناً بعض دفعہ ایک بات کو زور دینے کے لئے دُہرایا جاتا ہے۔ پس اِیْلٰفِهِمْ پہلے اِیْلَاف کا بدل ہے اور معنے یہ ہیں کہ ہم نے قریش کے اِیْلَاف کے لئے ایسا کیا ہاں ہاں ہم نے قریش کے اِیْلَاف کے لئے ایسا کیا۔ اُردو میں ایسے موقعہ پر بعض دفعہ ہاں ہاں کا لفظ بڑھا دیا جاتا ہے یعنی اِس میں کوئی شبہ نہیں یقینی اور قطعی بات ہے۔

یہ زور جو یہاں کلام پر دیا گیا ہے اِس کے متعلق یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ زور رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ پر ہو یعنی ہم نے قریش کے دل میں اِیْلَاف پیدا کیا پھر ہم کہتے ہیں کہ ہم نے اِیْلَاف پیدا کیا۔ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ کے متعلق۔ گویا یہ زور رِحْلَةَ الشِّتَآءِ والصَّيْفِ پر ہو لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اِیْلَاف پر زور دیا گیا ہو اور خود اسی مضمون کے لئے یہ لفظ دوبارہ لایا گیا ہو یعنی ہم نے اِیْلَاف کے لئے رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ کا انتظام کیا۔

اس جگہ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اِس قسم کا معنوں کا اختلاف مضمون کو مبہم نہیں کر دیتا۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی کہے کہ اس آیت کے تو پانچ چھ معنے ہوگئے ہیں اور مضمون مبہم ہوگیا ہے۔ مگر یہ غلط ہے اِس قسم کا اختلاف مضمون کو مبہم نہیں کرتا بلکہ کلام الٰہی میں ایسا اختلاف مضامین کو وسیع

کر دیتا ہے اور وہ سب معنے ہی ایک وقت میں مدنظر ہوتے ہیں کیونکہ ہم قرآن کریم کی نسبت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ خدائے علیم و خبیر کا کلام ہے۔ اگر ایک لفظ کے استعمال سے تین یا چار معنے نکل سکتے تھے اور اُن میں سے دو یا تین معنے الٰہی منشاء میں نہیں تھے اور اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ معنے لئے جائیں تو اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی وضاحت میں کونسی مشکل تھی وہ باقی معنوں کی نفی کر دیتا اور بتا دیتا کہ یہاں صرف فلاں معنے مراد ہیں۔ آخر جب خدا نے ایک ایسا جملہ یا لفظ استعمال کیا تھا جس کے کئی معنے ہو سکتے تھے اور خدا تعالیٰ کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ علیم و خبیر ہے وہ جانتا تھا کہ اُس کے ایک ایک لفظ سے کیا کیا معنے نکلیں گے تو وہ اُن معنوں کی تردید کر دیتا اور کہتا کہ میرا مطلب صرف فلاں معنے سے ہے باقی معنے یہاں مراد نہ لئے جائیں۔ اگر انسان کا کلام ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ انسان غلطی کر سکتا ہے وہ ایک لفظ استعمال کرتا ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ اُس کے معنے کیا ہیں یا بعض دفعہ معنے تو جانتا ہے مگر اُس لفظ کے استعمال کرتے وقت وہ معنے اُس کے ذہن میں نہیں ہوتے اور اِس طرح غلطی کر جاتا ہے ہمارے ملک کا مشہور لطیفہ ہے کہ نواب سعادت علی خاں کی مجلس میں ایک دفعہ سید انشاء اللہ خاں بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب سعادت علی خاں لونڈی زادہ تھے اور اکثر لوگ اِس کا علم رکھتے تھے۔ ایک دن وہ دربار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ لوگوں نے اُن کی تعریفیں شروع کر دیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ بادشاہ پر جس قسم کا اعتراض ہو سکتا ہو عموماً لوگ اُس کے خلاف باتیں کرتے ہیں تاکہ اُس کا دل خوش ہو اور وہ سمجھے کہ یہ لوگ میرے وفادار ہیں۔ جب بادشاہ کی تعریفیں شروع ہوئیں تو بعضوں نے کہا کہ حضور کا کیا ہے حضور تو نجیب الطرفین ہیں ہم تو حضور کے مقابلہ میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے۔ اِس طرح وہ تعریفیں کر کے لونڈی زادہ ہونے کا الزام دُور کر رہے تھے کہ انشاء اللہ خاں بھی بول اُٹھے اُن کی عادت تھی کہ جو بھی کوئی بات کر رہا ہوتا اُس سے بڑھ کر بات کرتے۔ چونکہ بادشاہ کے بہت مُنہ چڑھے ہوئے تھے اِس لئے وہ ہمیشہ دربار میں دوسروں سے بڑھ کر بات کرنے کے عادی تھے تاکہ بادشاہ یہ سمجھے کہ یہی میرے سب سے بڑے خیر خواہ ہیں۔ جب لوگوں نے تعریف کی اور کہا کہ حضور تو نجیب الطرفین ہیں تو انشاء اللہ خاں کو بھی جوش آیا اور انہوں نے کہا نجیب الطرفین کیا حضور تو انجب ہیں۔ عربی زبان میں جب اَفْعَل کے وزن پر لفظ استعمال ہوتا ہے تو اُس کے معنے ہوتے ہیں دوسروں سے زیادہ اس میں یہ خوبی ہو مثلاً جب اَمْجَد کہا جائے تو اس کے معنے ہوں گے زیادہ مجد والا۔ جب اَکْرَم کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس کے معنے ہوں گے زیادہ کرم والا۔ چونکہ درباری بادشاہ کو نجیب الطرفین قرار دے رہے تھے انہوں نے کہا نجیب الطرفین کیا حضور تو اَنْجَب ہیں یعنی سب سے زیادہ شریف ہیں۔ مگر بدقسمتی سے عربی زبان میں انجب کے معنے لونڈی زادہ کے بھی ہیں سو وہ کہہ تو بیٹھے مگر اُس وقت اُن کے ذہن میں یہ نہیں آیا کہ اس لفظ کے اور معنے بھی پائے جاتے ہیں اور وہ معنے ایسے ہیں جن سے بادشاہ پر زد پڑتی ہے۔ پھر بعض دفعہ ایک بات تو مُنہ سے نکلتی ہے مگر اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا مگر خدا کی قدرت ہے اُس وقت کئی علماء بادشاہ کے دربار میں بیٹھے ہوئے تھے اور خود بادشاہ بھی عربی جانتا تھا۔ انہوں نے اَنْجَب کہا تو یکدم تمام درباریوں اور بادشاہ کا ذہن اَنْجَب کے اِنہی معنوں کی طرف چلا گیا اور تمام دربار پر سناٹا چھا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے اور کئی قسم کی باتیں کر کے اِس اثر کو زائل کرنا چاہا مگر وہ اِس میں کامیاب نہ ہوئے نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کو اُن سے اِتنی عداوت ہو گئی کہ اُس نے اُنہیں ذلیل کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ یا تو وہ بادشاہ کے اِتنے مُنہ چڑھے تھے کہ ہر وقت دربار میں رہتے اور یا گرتے گرتے بہت ہی ادنیٰ حالت کو پہنچ گئے۔ تو انسان غلطی کر سکتا ہے اور ہو سکتا ہے

کہ وہ ایک ایسا لفظ استعمال کرے جس کے معنے وہ نہ جانتا ہو۔ مگر کیا خدا تعالےٰ بھی ایسا کر سکتا ہے۔ کیا خدا تعالیٰ کو یہ معلوم نہیں کہ میں جو الفاظ استعمال کر رہا ہوں اُن سے کیا کیا معنے نکل سکتے ہیں۔ جب خدا علیم وخبیر ہے اور وہ جانتا ہے کہ ایک لفظ کے دو معنے بھی ہو سکتے ہیں، تین معنے بھی ہو سکتے ہیں، چار معنے بھی ہو سکتے ہیں۔ تو اگر خدا تعالےٰ اِن سب میں سے کوئی ایک معنے لینا چاہتا تھا تو خدا تعالےٰ کی شان اور اُس کی عظمت کے شایاں یہ امر تھا کہ وہ کوئی ایسا اشارہ کر دیتا جس سے پتہ لگ جاتا کہ یہاں صرف دوسرے معنے مراد ہیں۔ تیسرے معنے مراد نہیں یا چوتھے اور پانچویں معنے مراد نہیں۔ لیکن اگر کلام ایسا ہو کہ اُس کے زیادہ معنے ہو سکتے ہوں اور خدا تعالیٰ نے اُن معنوں کو رد نہ کیا ہو تو تفسیر کا یہ اصول ہے کہ پھر وہ سارے معنے مراد لئے جائیں گے۔ اِس لئے کہ اُس کلام کا کہنے والا عالم الغیب خدا ہے۔ اگر وہ معنے اُس کے مدنظر نہ ہوتے تو وہ اُن کی تردید کیوں نہ کرتا۔ چنانچہ قرآن کریم میں جب بھی ایک ایسا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس سے کوئی شبہ پیدا ہوتا ہے وہیں اِس شبہ کا ازالہ بھی کر دیتا ہے اور بتا دیتا ہے کہ میری مراد اِن معنوں سے یہ نہیں بلکہ یہاں اِس کے اَور معنے ہیں۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَـٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ (یوسف ع ۱۲) یعنی یہ قرآن کریم جو ہم نے نازل کیا ہے اِس میں کوئی جھوٹی باتیں نہیں بلکہ یہ کلام پہلی تمام پیشگوئیوں کو پورا کرنے والا ہے اور ہر قسم کے مضامین اِس میں تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں لیکن قرآن کریم ہے کتنی کتاب؟ انجیل سے بھی چھوٹی ہے پس جب خدا تعالےٰ کی طرف سے یہ دعویٰ پیش کیا گیا ہے کہ اِس کتاب میں وہ ہر قسم کے مضامین بیان کر دئے گئے ہیں جو دینیات سے تعلق رکھتے ہیں

تو یہ لازمی بات ہے کہ اِتنی چھوٹی سی کتاب میں وہ تمام مضامین تفصیل کے ساتھ نہیں آ سکتے تھے۔ پھر تو قرآن کریم کی ہزاروں ہزار جلدیں چاہیئے تھیں۔ اور اگر ہزاروں ہزار جلدیں ہوتیں تو لوگ اِس کو حفظ نہ کر سکتے اور اِس طرح قرآن کریم کی حفاظت مشتبہ ہو جاتی۔ اب اگر لوگ قرآن کریم کو آسانی سے حفظ کر لیتے ہیں تو اِس لئے کہ قرآن کریم حجم کے لحاظ سے ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔ اگر اغانی کی طرح بیسؔ جلدوں میں قرآن کریم ہوتا یا لسان العرب کی طرح اس کی بیسؔ جلدیں ہوتیں تو کتنے لوگ اس کو حفظ کرنے والے ہوتے؟ یہ لازمی بات تھی کہ بہت تھوڑی تعداد میں ایسے لوگ نکلتے جو اتنی بڑی کتاب کو حفظ کرنے کی کوشش کرتے۔ پھر اس کی لمبائی خود اس کتاب کو مشتبہ کر دیتی اور لوگ کہتے کہ چونکہ اتنی بڑی کتاب حافظ حفظ نہیں کر سکتے اِس لئے ضرور اس میں کچھ نہ کچھ غلطیاں ہو گئی ہوں گی۔ مگر اب ہزاروں ہزار نہیں لاکھوں حافظ دنیا میں موجود ہیں اور بڑے بڑے شدید دشمن یہاں تک کہ میورؔ، نولڈکےؔ اور سپرنگرؔ جیسے شخص بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہم قرآن کریم کے متعلق خواہ کچھ بھی کہیں اِس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جس صورت میں یہ کتاب اپنے صحابہؓ کو دی تھی اُسی صورت میں وہ آج بھی محفوظ ہے۔ وہ اس امر کے تو قائل نہیں کہ خدا تعالےٰ نے یہ کتاب نازل کی ہے مگر وہ یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہتے کہ جس صورت میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ کتاب اپنے متبعین کو دی تھی اُسی صورت میں یہ کتاب آج بھی موجود ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ چنانچہ بعض نے کھلے طور پر کہا ہے کہ ہم انجیل یا بائیبل کی طرح اس پر اعتراض نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اُن کتابوں کو کوئی حفظ نہیں کرتا مگر قرآن کریم کو حفظ کرنے والے لاکھوں لوگ موجود ہیں مگر یہ بھی لازمی بات ہے کہ یہ کتاب اِسی صورت میں حفظ ہو سکتی تھی جب مختصر الفاظ میں ہوتی۔ غرض ایک طرف اس کو یاد کرنے کی اہمیت مجبور کرتی تھی کہ یہ کتاب مختصر ہو مگر دوسری طرف

قرآن کریم کا یہ دعویٰ کہ وہ تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ ہے تقاضا کرتا تھا کہ سارے مضامین اس میں آجائیں اب یہ دونوں باتیں کس طرح اکٹھی ہوسکتی تھیں؟ یہ اسی طرح اکٹھی ہوسکتی تھیں کہ ایک ایک جملہ میں کئی کئی مضامین ہوں۔ اگر ہم اس حکمت کا انکار کردیں تو قرآن کریم میں تمام مضامین کس طرح آسکتے ہیں۔ پس قرآن کریم کے یہ دو دعوے یعنی ایک یہ کہ اس کی حفاظت کی جائے گی زبانی بھی اور تحریری بھی۔ اور دوسرا یہ کہ تمام مضامین اس میں آگئے ہیں لازماً اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ قرآن کریم کی ایک ایک آیت کے کئی کئی معانی ہیں۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک ایک آیت کے سات بطن ہیں۔ اگر ایک ایک بطن کے سات معنے بھی ہوں تو ایک ایک آیت کے ۴۹ معنے تو یہی ہوگئے۔ پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ تشریح کرکے بتا دیا ہے کہ قرآن کریم کی ایک ایک آیت بڑے وسیع مطالب پر حاوی ہے۔ بہرحال جب قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا کہ اس میں تمام مضامین ہیں اور جب قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کو حفظ کیا جائے گا اور اس طرح اس کی ظاہری حفاظت کی جائے گی تو اِن دونوں باتوں کو ملا کر خود بخود یہ نتیجہ نکل آیا کہ قرآن کریم ایسی عبارت میں نازل کیا جائے گا جو مختصر بھی ہو اور وسیع مطالب پر بھی مشتمل ہو۔ اور جیسا کہ میں بتا چکا ہوں ضروری تھا کہ اللہ تعالےٰ اس قسم کے طریقِ کلام کو اختیار کرتا۔ ورنہ اس کتاب کی وسعت ہزار ہا جلدوں میں بھی نہ آسکتی۔ پس قرآن کریم ایسی عبارت میں نازل کیا گیا ہے کہ ایک ایک جملہ اور فقرہ کے کئی کئی معنے نکلتے ہیں اور اگر کوئی معنے مراد نہیں ہوتے تو اُسی جگہ یا دوسری جگہ اُن معنوں کی تردید کردی جاتی ہے۔ اس طرح مختصر لفظوں میں بے انتہاء مطالب آگئے ہیں۔ اور آیات زیرِ تفسیر میں بھی اسی کمال کا ایک نقشہ کھینچا گیا ہے کہ مختلف مضامین ایک خاص اسلوبِ بیان سے پیدا کئے گئے ہیں اور سب ہی درست ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر فائدہ دیتے ہیں اور تبلیغ حق میں مفید ہیں۔ پس کئی معنوں سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ابہام ہوگیا بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ کمال ہوگیا۔ فقرہ چھوٹا سا ہے اور اس کے معنے بہت وسیع ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں ایک چھوٹی سی آیت آتی ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا (الدھر ع۱) اس آیت میں صرف ایک ضمیر کے ذریعہ سے مضمون کو اتنا وسیع کردیا گیا ہے کہ اس پر کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ یہ ایک فلسفیانہ مضمون ہے جو اِن آیات میں بیان ہُوا ہے۔ اور اگر اُس فلسفہ پر بحث کی جائے تو یقیناً اِس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ہی ہم ایک کتاب لکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ اِس آیت میں جو فلسفہ بیان ہُوا ہے اُس کے ایک ایک حصہ پر یورپ کے بعض فلاسفروں نے مستقل طور پر بعض کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ مثلاً اس آیت سے پہلے خدا تعالےٰ کا ذکر آتا ہے اِس لئے اِس آیت کے یہ معنے بنیں گے کہ "وہ کھانا کھلاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے"۔ پھر قریب ہی طعام کا لفظ ہے اِس لئے ضمیر اُس کی طرف بھی جاسکتی ہے۔ اس لحاظ سے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ "وہ کھانا کھلاتے ہیں باوجود کھانے کی محبت کے" یعنی خود بھوکے ہوتے ہیں اُنہیں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے مگر بھوکے رہ کر اور تکلیف اُٹھا کر بھی دوسروں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

قرآن کریم کی ایک آیت کے متعدد معانی ہونے کی دلیل

تیسرے معنے اِس کے یہ بنتے ہیں کہ "وہ کھانا کھلاتے ہیں کھانا کھلانے کی محبت کی وجہ سے"۔ اور وہ اس کام کو خود اس کام کے شوق کی وجہ سے کرتے ہیں۔ یہ تین اعلیٰ درجہ کے اخلاقی مدارج ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں بیان فرماتے ہیں اور جس پر موجودہ زمانہ میں یوروپین فلاسفروں نے بڑی لمبی بحثیں کی ہیں۔ انہوں نے سوال اُٹھایا ہے کہ نیکی کیا ہے اور ہمیں کیوں کرنی چاہیئے اِس کا جواب بعض فلسفیوں نے یہ دیا ہے کہ نیکی وہ ہے جو محض نیکی کے لئے کی جائے۔ اُس کے کرتے وقت کوئی

خاص غرض مدنظر نہ ہو۔ بعض اور فلسفیوں نے کہا ہے کہ نیکی
وہ ہے جو کسی GREAT IDEAL یعنی
اعلیٰ درجہ کے مقصد کو مدنظر رکھ کر کی جائے اور بعضوں نے
کہا ہے کہ نیکی یہ ہے کہ خود تکلیف اُٹھا کر دوسروں کی خاطر
کام کیا جائے۔ یہ تینوں فلسفیانہ نکتے يُطْعِمُونَ الطَّعَامَ
عَلٰی حُبِّہٖ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اِس معیار کو بھی تسلیم
کیا گیا ہے کہ نیکی ایسے وقت میں کرنی چاہیئے کہ خود تکلیف میں
ہو لیکن دوسروں کے لئے ایثار کرے۔ اسی طرح اس معیار کو
بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ نیکی محض نیکی کی خاطر کی جائے۔ چنانچہ
فرماتا ہے کہ ہمارے مومن بندے محض ایک نیک کام کو اُس
کی ذاتی محبت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ اور پھر اس معیار کو بھی
تسلیم کیا گیا ہے کہ نیک کام وہ ہے جو ایک ہائر آئیڈیل
کے لئے کیا جائے۔ چنانچہ فرماتا ہے يُطْعِمُونَ الطَّعَامَ
عَلٰی حُبِّہٖ وہ دوسروں کو محض خدا کی رضا اور اُس کی خوشنودی
کے لئے کھانا کھلاتے ہیں۔ اُن کے مدنظر کوئی دنیوی غرض
نہیں ہوتی بلکہ ایک بلند و بالا مقصد اُن کے سامنے ہوتا ہے
جو یہ ہے کہ انہیں خدا تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جائے۔ ان
تین اخلاقی نکتوں پر موجودہ زمانہ کے فلسفیوں نے بڑی بڑی
بحثیں کی ہیں اور کسی نے کسی کو اعلیٰ قرار دیا ہے اور کسی نے
کسی کو۔ مگر قرآن کریم نے صرف ایک مختصر سی ضمیر رکھ کر
ایسی تعلیم پیش کر دی ہے جو ان تمام فلسفوں پر حاوی ہے۔
اگر کوئی فلاسفر ہمارے پاس آئے اور کہے کہ میں اِس بات کو
اچھا سمجھتا ہوں کہ نیکی محض نیکی کی خاطر کی جائے تو ہم کہیں گے
ٹھیک ہے قرآن کریم میں یہ تعلیم موجود ہے چنانچہ ہم یہ آیت
نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیں گے۔ اگر دوسرا فلاسفر یہ کہے
کہ میں تو اِس بات کو نیکی سمجھتا ہوں کہ دوسروں کی خاطر تکلیف
اُٹھا کر کام کیا جائے۔ تو ہم کہیں گے ٹھیک ہے قرآن کریم
میں یہ تعلیم موجود ہے چنانچہ ہم یہی آیت نکال کر اُس کے سامنے
رکھ دیں گے۔ پھر کوئی تیسرا فلسفی ہمارے پاس آجائے اور کہے
کہ نیکی وہ ہے جو کسی ہائر آئیڈیل کے لئے کی جائے تو ہم
کہیں گے ٹھیک ہے قرآن کریم کی یہی تعلیم ہے چنانچہ ہم یہی آیت
نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیں گے۔ اگر ہٖ کی جگہ طعام کا لفظ
ہوتا یا اللہ کا لفظ ہوتا یا اِطعام کا لفظ ہوتا تو گو ایک معنے
تو آجاتے مگر باقی دو معنے باطل ہو جاتے۔ یہی حکمت ہے جس
کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہاں ضمیر استعمال کی ہے کوئی
اسم استعمال نہیں کیا۔ ورنہ وہ يُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰی
حُبِّ اللّٰہِ بھی کہہ سکتا تھا وہ يُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰی
حُبِّ الطَّعَامِ بھی کہہ سکتا تھا۔ وہ يُطْعِمُونَ الطَّعَامَ
عَلٰی حُبِّ الْاِطْعَامِ بھی کہہ سکتا تھا مگر اُس نے یہ نہیں کہا
بلکہ يُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ کہا تا کہ ہٖ کی ضمیر
اللہ تعالیٰ کی طرف بھی چلی جائے، طعام کی طرف بھی چلی جائے
اور اطعام کی طرف بھی چلی جائے۔ پس قرآن کریم کا یہ ایک
بہت بڑا کمال ہے کہ وہ مختصر الفاظ میں اتنا مضمون بھر دیتا
ہے کہ اور لوگ بڑی بڑی کتابوں میں بھی اُس کو بیان نہیں
کر سکتے۔ پس مختصر ہونا از معانی کلام پر کوئی اعتراض نہیں کیا
جا سکتا۔ ہاں جہاں بعض معنے اللہ تعالیٰ کے منشاء کے
خلاف ہوتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کا مقصد کسی خاص معنوں کی
طرف انسانی ذہن کو لے جانا ہوتا ہے تو وہاں فوراً اشارہ
ہو جاتا ہے کہ صرف فلاں معنے لئے جائیں اور معنے نہ لئے جائیں
بلکہ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ قرآن کریم میں بعض جگہ ایک ایسا
لفظ استعمال ہوا ہے جس کے دو معنے ہو سکتے ہیں تو ساتھ ہی
قرآن کریم کی طرف سے اُس کے معنے بھی دئے ہوتے ہوتے
ہیں یہ بتانے کے لئے کہ یہاں یہ لفظ صرف اِن معنوں میں
استعمال ہوا ہے دوسرے معنے مراد نہیں لئے گئے۔

اب بیشتر اس کے کہ میں اِن آیات کی تفسیر کروں میں
لفظ قریش کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

قُرَیْشٍ قُرَیْش کا لفظ قَرَش سے نکلا ہے جس کا مضارع
دونوں طرح آتا ہے قَرَشَ يَقْرُشُ اور قَرَشَ يَقْرِشُ۔
قَرْشًا اِن کا مصدر ہے۔ اور قَرَشَ کے معنے ہوتے ہیں
قَطَعَہٗ اُس کو کاٹ دیا۔ اور قَرَشَ الشَّیْءَ کے معنے

ہوتے ہیں جَمَعَہٗ مِنْ ھُنَا وَمِنْ ھُنَا وَضَمَّ بَعْضَہٗ اِلٰی بَعْضٍ۔ چیز کو کچھ یہاں سے اور کچھ وہاں سے لیا اور اکٹھا کرکے رکھ دیا اور قَرَشَ مِنَ الطَّعَامِ کے معنے ہوتے ہیں اَصَابَ مِنْہُ قَلِیْلًا تھوڑا سا کھانا کھالیا۔ اور قَرَشَ الْجَیْشُ بِالرِّمَاحِ کے معنے ہوتے ہیں طَعَنُوْا بِھَا۔ لشکر نے نیزوں کے ساتھ اپنے دشمن کو مارا اور قَرَشَ فُلَانٌ لِعَیَالِہٖ کے معنے ہوتے ہیں کَسَبَ۔ اُس نے اپنے لئے یا اپنے خاندان کے لئے کمائی کی۔ اِسی سے ایک اور لفظ قِرْش نکلا ہے جس کے متعلق لکھا ہے دَآبَّۃٌ تَکُوْنُ فِی الْبَحْرِ۔ قرش سمندر میں رہنے والا ایک جانور ہے لَا تَدَعُ دَآبَّۃً اِلَّا اَکَلَتْھَا وہ سب جانوروں کو کھا جاتا ہے فَجَمِیْعُ الدَّوَآبِّ تَخَافُھَا۔ اِس وجہ سے سارے سمندری جانور اُس سے ڈرتے ہیں وقَبِیْلَۃٌ مِّنَ الْعَرَبِ اور اس کے معنے عرب کے ایک قبیلہ کے بھی ہیں۔ وَاِنْ اَرَدْتَ بِقُرَیْشٍ الْحَیَّ صَرَفْتَہٗ اور اگر قریش کے معنے تم حی کے لو (حی کے معنے بھی قبیلہ کے ہوتے ہیں) تو پھر یہ لفظ منصرف ہوگا جیسے اِسی سورۃ میں آتا ہے لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ اِس میں ش کے نیچے تنوین آئی ہے یعنی اس جگہ یہ لفظ منصرف استعمال ہوا ہے وَاِنْ اَرَدْتَ الْقَبِیْلَۃَ لَمْ تَصْرِفْہُ لیکن اگر قبیلہ کا لفظ مراد لو تو پھر یہ غیر منصرف ہوگا۔ یعنی قُرَیْش کے آخر میں تنوین نہ آسکے گی اور نہ اِس کے نیچے زیر آ سکے گی۔

اِس قبیلہ کے آدمیوں کو قُرَشِیٌّ بھی کہتے ہیں اور قریشیؔ بھی کہتے ہیں۔ سیبویہ جو نحو کے بہت بڑے ماہر اور امام سمجھے جاتے ہیں اُن کا یہ خیال ہے کہ حی سمجھ کر منصرف بنانا اصل قاعدہ ہے۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ اسے قبیلہ قرار دیکر غیر منصرف بنانا بھی جائز ہے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا گویا چاہیں تو قُرَیْشَ پڑھ لیں اور اسے منصرف نہ بنائیں اِس صورت میں علم اور تانیث دو وجہیں پیدا ہوجائیں گی جن کی وجہ سے یہ غیر منصرف ہو جائے گا۔

قِرش کے متعلق مفسرین اپنے زمانہ کے ملاحوں کی روایتوں کی بناء پر لکھتے ہیں کہ یہ ایک بہت بڑا سمندری جانور ہے جو کشتیوں پر حملہ کرتا اور انہیں مار کر اُلٹا دیتا ہے اور سوائے آگ اور روشنی کے اور کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔ جب یہ جانور حملہ کرے تو لوگ آگ جلا کر اُس کے مُنہ کے آگے رکھ دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اِس بیان سے جو لُغت میں آیا ہے وھیل مچھلی مراد ہے۔ وھیل مچھلی ہی ایک ایسی چیز ہے جو زور سے اپنی دُم مار کر جہازوں کو توڑ دیتی ہے۔ یہ مچھلی افریقہ کے ساحل پر بہت ہوتی ہے اور کراچی کے قریب بھی کبھی کبھی آجاتی ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ یہ بحیرۂ احمر کے آگے سے گذرتی ہے اور عرب کا علاقہ بحیرۂ احمر کا ہی ہے۔ یہ روایت اِس بات کا ثبوت ہے کہ وھیل مچھلی عرب کے سمندر کے کناروں پہ بھی کبھی کبھی دیکھی جاتی ہے۔ چونکہ کراچی کے پاس بعض دفعہ وھیل مچھلی دیکھی گئی ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ بحیرۂ احمر کے پاس سے گذر کر افریقہ کے ساحلوں سے یہ مچھلی گذرتی ہے یا پھر ہم قِرش سے مراد شارک مچھلی بھی لے سکتے ہیں۔ شارک بھی چھوٹی کشتیوں پر حملہ کرکے اُن کو اُلٹا دیتی ہے یہ تو ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ باقی سارے جانوروں کو کھا جاتی ہے یا نہیں مگر عرب لوگ ممکن ہے کہ جن مچھلیوں سے آشنا تھے اُنہیں شارک کھا جاتی ہو۔

قریش کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اُنہیں اس مچھلی کی وجہ سے ہی قریش کہتے ہیں۔ چنانچہ مفسرین نے اِس بارہ میں حضرت ابن عباس کی ایک روایت درج کی ہے۔ اِسی طرح بعض اور بڑے بڑے عربوں کے اقوال بھی درج کئے ہیں چنانچہ روایات میں ہے کہ حضرت معاویہ نے ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پوچھا کہ کیا تم بتا سکتے ہو کہ قریش کو قریش کیوں کہتے ہیں انہوں نے جواب دیا کہ قریش مچھلی کی وجہ سے جو سارے سمندری جانوروں سے بڑی ہوتی ہے اور اُن کو کھا جاتی ہے مگر اُسے کوئی نہیں کھا سکتا چونکہ قریش قبیلہ بھی عرب میں سب سے بڑا ہے اور سارے عرب قبائل اس سے

ڈرتے ہیں اِس لئے اسے بھی قریش کہنے لگ گئے ہیں۔ اُنہوں نے یہ سوال کیا کہ کیا تم اِس کا ثبوت عرب شاعروں کے کلام سے دے سکتے ہو۔ یعنی یہ کیوں نہ سمجھ لیا جائے کہ تم نے یہ بات اپنے پاس سے بنائی ہے کہ اُن کا قریش نام اس وجہ سے تھا۔ اگر یہ بات تم نے اپنے پاس سے نہیں بنائی تو عرب شعراء کا کوئی کلام اپنی تائید میں پیش کرو۔ اس پر حضرت ابن عباسؓ نے کچھ شعر پڑھے جن میں یہ ذکر آتا تھا کہ قریش کو اس لئے قریش کہتے ہیں کہ جس طرح قرش مچھلی باقی تمام سمندری جانوروں پر غالب آجاتی ہے اِسی طرح قریش بھی تمام قبائل عرب پر غالب ہیں۔ مگر میرے اپنے خیال میں یہ روایت صحیح نہیں۔ اِس لئے کہ جو نظم بتائی جاتی ہے اُس کے دیکھنے سے صاف پتہ لگتا ہے کہ وہ بناوٹی ہے۔ کیونکہ اُس میں یہ بھی ذکر آتا ہے کہ عنقریب ایک نبی ظاہر ہوگا جو تمام عرب کا مرجع اور ملجاء و ماوٰی ہوگا۔ اگر وہ اِس قسم کے اشعار کہا کہتے تھے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا انکار ہی کس طرح کر سکتے تھے۔ اُنہوں نے تو بڑی بڑی مخالفتیں کیں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا سخت مقابلہ کیا پس میں سمجھتا ہوں کہ یہ روایت بناوٹی ہے۔ لیکن اِس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عربوں میں یہ خیال تھا اور اس کا تاریخوں سے بھی ثبوت ملتا ہے کہ قریش کا قریش نام اس جانور کی وجہ سے پڑا مگر یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُنہیں قریش کیوں کہا گیا۔ اُس جانور کا نام تو قِرش ہے؟ اِس کے دو جواب دئے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب اتنے بڑے جانور کا نام قِرش ہے جس سے تمام سمندری جانور ڈرتے ہیں اور جو اُن سب کو کھا جاتا ہے تو اِس چھوٹے سے قبیلہ کا نام تو قریش یعنی چھوٹا قِرش ہی موزوں تھا۔ گویا اُن کے نزدیک قریش کو قریش اِس لئے کہتے ہیں کہ یہ چھوٹا سا قبیلہ تھا۔ اِس لئے لوگوں نے قِرش کہنے کی بجائے اُسے قریش کہنا شروع کر دیا جس سے مراد یہ ہے کہ یہ بھی ایک چھوٹی سی وہیل مچھلی ہے۔ مگر بعضوں نے کہا ہے کہ یہ بات نہیں بلکہ تصغیر کا صیغہ بعض دفعہ اظہار عظمت کے لئے بھی آتا ہے۔ اِس لئے قریش کے معنے بڑی قرش یعنی بڑی وھیل مچھلی کے ہیں اور مراد یہ ہے کہ یہ بڑی قوم ہے۔ مگر یہ سارے معنے ایسے ہیں جن میں ایک حد تک تکلّف پایا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ گو یہ بات صحابہؓ سے بھی ثابت ہے اور عربوں سے بھی کہ قریش کو قریش اِس جانور کی وجہ سے کہتے ہیں مگر صحابہؓ کے زمانہ میں یہ نام نہیں رکھا گیا بلکہ اُن کے باپ دادا کے زمانہ سے یہ نام چلا آتا ہے۔ پھر نہ قرآن کریم نے یہ معنے بتلائے ہیں اور نہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بتائے ہیں۔ اگر تو وہ بتا دیتے کہ قریش کو قرش مچھلی کی وجہ سے قریش کہا جاتا ہے تو ہم کہدیتے کہ آمنّا وصدّقنا۔ اور ہم سمجھ لیتے کہ چونکہ خدا تعالےٰ کو غیب کا علم حاصل ہے اور اُس کے توسط سے خدا تعالےٰ کے رسول کو بھی بعض امور میں غیب کا علم حاصل ہو جاتا ہے اِس لئے انہوں نے جو معنے بتائے ہیں وہی صحیح ہیں مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی روایت مصدّقہ تو الگ رہی ضعیف بھی مَیں نے نہیں دیکھی جس میں قریش کی وجہ تسمیہ یہ بتائی گئی ہو۔ باقی رہے صحابہؓ سو جو بات انہوں نے قوم سے سُنی وہ انہوں نے آگے بیان کر دی۔ پھر ضروری نہیں کہ یہ روایت صحیح ہو ایسی روایتیں صحیح بھی ہوتی ہیں اور غلط بھی ہوتی ہیں ہم پابند نہیں کہ محض اِس وجہ سے کہ اُن کی طرف یہ روایت منسوب ہوتی ہے اسے درست تسلیم کرلیں اور قریش کی وجہ تسمیہ اِسی قِرش کو قرار دیں۔

میرا اپنا خیال ہے کہ قریش کا لفظ قَرَشَ سے نکلا ہے جس کے معنے ہیں اِدھر اُدھر سے جمع کیا۔ علّامہ قرطبی جو سپین کے ایک بہت بڑے عالم گذرے ہیں انہوں نے بھی اپنی تفسیر میں یہی معنے لکھے ہیں۔ میں تو پہلے بھی یہی بیان کرتا تھا مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ علّامہ قرطبی بھی اِس کے یہی معنے کرتے ہیں۔ اب مجھے اُن کا حوالہ مل گیا ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ اِن معنوں کا میں موجد نہیں بلکہ

اس بارہ میں میرا علامہ قرطبی سے توارد ہو گیا ہے۔ علامہ قرطبی سپینش مفسّر تھے۔ اور یہ ایک عجیب بات ہے جو خدا تعالیٰ کی کسی حکمت پر دلالت کرتی ہے (شاید اس میں یہ بتایا گیا ہو کہ آئندہ زمانہ میں یورپ پھر اسی رنگ میں ترقی کرنے والا ہے) کہ سپین کے مسلمان مفسّر بغداد کے مصنّفوں کی نسبت بہت زیادہ معقول لکھنے والے ہیں۔ چوٹی کی کتابیں جو مختلف علوم و فنون سے تعلق رکھتی ہیں وہ سب کی سب سپین میں لکھی گئی ہیں سوائے حدیث کے کہ حدیث وہاں نہیں گئی۔ اس لئے کہ حدیث کا علم انہی لوگوں سے نکلنا تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس رہنے والے تھے اور وہ وہی تھے جو بغداد کے رہنے والے تھے یا دمشق کے رہنے والے تھے یہی وجہ ہے کہ سپین میں حدیث کی کوئی کتاب اُس پایہ کی نہیں لکھی گئی جس پایہ کی کتابیں عرب کے یا اُس کے پاس کے علاقوں میں لکھی گئی ہیں مگر باقی جتنے علوم ہیں اُن پر سپین کے لوگوں کی طرف سے بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً فلسفہ میں ابنِ رُشد جو چوٹی کا فلسفی سمجھا جاتا ہے سپین کا رہنے والا تھا۔ تصوّف میں جس شخص کو تمام دنیا چوٹی کے مقام پر سمجھتی ہے یعنی حضرت محی الدین صاحب ابن عربی وہ ہسپانیہ کے رہنے والے تھے۔ نقہ کے متعلق جو آخری کلام سمجھا جاتا ہے وہ علامہ ابن حجر کا ہے اور علامہ ابن حجر بھی سپینش تھے۔ مفسّرین میں قرطبی جو نہایت اعلیٰ درجہ کا مفسّر ہے وہ بھی اندلسی ہے۔ اور علامہ ابو حیان جو بحر محیط کے مصنف ہیں وہ بھی اندلسی ہیں میرے نزدیک پُرانی تفسیروں میں سے بحر محیط کے پایہ کی کوئی اور تفسیر نہیں۔ علامہ ابو حیان احمدیت سے پہلے ایک ہی شخص ہوئے ہیں جنہوں نے قرآن کریم میں ترتیب کا دعویٰ کیا ہے اور انہوں نے کوشش کی ہے کہ اپنے اس دعویٰ کو ثابت کریں اور گو وہ ہمارے مقام تک نہ پہنچے ہوں مگر بہرحال وہ ایک ہی مفسّر ہیں جنہوں نے کہا ہے کہ قرآن کریم بے جوڑ کتاب نہیں بلکہ سارے قرآن میں ایک ترتیب پائی جاتی ہے۔ اسی طرح نحو اور ادب میں بھی وہ امام کہلاتے ہیں۔ بہرحال اندلسی مفسّر قرطبی نے بھی یہی معنے کئے ہیں۔ افسوس ہے کہ اُن کی ساری تفسیر چھپی نہیں۔ مصر میں اُن کی تفسیر کی ابھی صرف دو تین جلدیں چھپی ہیں جو میرے پاس موجود ہیں باقی تفسیر ابھی تک نہیں چھپی۔ مگر جو چھپا ہے وہ اتنی خطرناک طور پر غلط ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ کوئی حدیث ایسی نہیں جو صحیح لکھی ہوئی ہو ساری کی ساری غلط ہیں۔ پہلے انسان اعتبار کر کے حدیث نقل کر لیتا ہے مگر بعد میں وہ غلط نکل آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اُس تفسیر کو چھاپتے وقت احتیاط سے کام نہیں لیا گیا بہرحال قرطبی نے بھی یہی کہا ہے کہ قریش قَرَش سے نکلا ہے جس کے معنے ہیں اِدھر اُدھر سے جمع کیا۔ ذبیانی نے بھی یہ معنے کئے ہیں مگر ساتھ ہی دوسرے معنے بھی لکھ دئے ہیں۔

قریش دراصل نام ہے نضر بن کنانہ کا۔ جیسے خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ مروی ہے۔ چنانچہ آپ سے جب سوال کیا گیا کہ قریش کن کو کہتے ہیں تو آپ نے فرمایا اَلْقُرَیْشُ مِنْ وُّلْدِ النَّضْرِ نضر کی جو اولاد ہے وہ قریش کہلاتی ہے۔ اِسی طرح احادیث میں آتا ہے قَالَ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی کِنَانَۃَ مِنْ بَنِیْ اِسْمٰعِیْلَ وَاصْطَفٰی مِنْ کِنَانَۃَ قُرَیْشًا وَاصْطَفٰی مِنْ قُرَیْشٍ بَنِیْ ھَاشِمَ وَاصْطَفَانِیْ مِنْ بَنِیْ ھَاشِمَ (سراج منیر) یعنی اللہ تعالےٰ نے کنانہ کو بنی اسمٰعیل میں سے فضیلت دی۔ کنانہ میں سے قریش قبیلہ کو فضیلت دی۔ قریش قبیلہ میں سے اللہ تعالیٰ نے بنو ہاشم کو فضیلت دی اور بنو ہاشم میں سے اللہ تعالیٰ نے مجھے فضیلت دی۔ اِس حدیث میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے قریش کو بنو کنانہ قرار دیا ہے اور دوسری حدیث میں آتا ہے کہ مِنْ وُّلْدِ النَّضْرِ۔ دراصل کنانہ کے کئی بیٹے تھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ تشریح فرما دی کہ اُن میں سے صرف نضر کی اولاد قریش کہلاتی ہے ساری اولاد نہیں۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ قریش صرف مالک بن نضر کی

اولاد کا نام ہے۔ بلکہ بعض نے یُوں بھی کہا ہے کہ نضر کی اولاد میں سے صرف مالک کی ہی اولاد چلی ہے باقی کی نہیں۔ مگر یہ ساری بھی شعبدہ بازی ہے جو مذہبی جھگڑوں سے تعلق رکھتی ہے چنانچہ جب ہم روایتوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیعوں کی روایت ہے۔ چونکہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ مالک بن نضر کی اولاد نہیں بلکہ ایک دوسرے بیٹے کی اولاد ہیں۔ اس لئے اُن کو قریش میں سے نکالنے کیلئے اُن کے دشمنوں نے یہ روایت گھڑی ہے وہ اِس روایت کو پیش کرکے کہتے ہیں کہ دیکھو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ مگر ابو بکرؓ اور عمرؓ دونوں قریش میں سے نہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے اِس قسم کی روایتیں گھڑ کر شامل کردیں کہ نضر کی اولاد میں سے صرف مالک کی اولاد چلی ہے اِس لئے یہ قریشی ہی نہیں ہیں۔ پس یہ حدیث شیعہ سُنّی جھگڑے کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ قصی بن حکیم بن نضر کی اولاد تھے۔ پس اُن کو قریشیوں میں سے نکالنے کے لئے یہ روایت وضع کی گئی ہے کہ قریش صرف مالک بن نضر کی اولاد کا نام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تو حضرت اسمٰعیلؑ کو خانہ کعبہ میں اِس لئے بٹھایا تھا کہ وہ خانہ کعبہ کی حفاظت کریں لیکن حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں آگے یہ جوش دیر تک قائم نہ رہا جیسے آج بعض سید چور بھی ملتے ہیں اور ڈاکو بھی ملتے ہیں۔ کچھ نسل تک تو انہوں نے اِس وعدہ کو یاد رکھا لیکن اِس کے بعد وہ اس وعدے کو بھول گئے اور حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد سارے عرب میں پھیل گئی۔ بلکہ عرب کے علاوہ شام تک بھی چلی گئی۔ آخر قربِ زمانۂ نبوی میں قصی بن حکیم بن نضر کے دل میں خیال آیا کہ ابراہیمی وعدہ کو تو ہم پورا نہیں کررہے ہمارے دادا نے تو یہ کہا تھا کہ تم یہاں رہو۔ اِس گھر کی صفائی رکھو۔ خانہ کعبہ کے حج اور طواف کے لئے جو لوگ آئیں اُنکی خدمت کرو اور اللہ تعالےٰ کی عبادت میں اپنا وقت گذارو مگر ہم اِدھر اُدھر بکھر گئے اور اس خدمت کو جو ہمارے دادا نے ہمارے سپرد کی تھی بھول گئے۔ یہ خیال اُن کے دل میں اتنے زور سے پیدا ہوا کہ انہوں نے بنو نضر کے اندر یہ تحریک شروع کی کہ آؤ ہم لوگ اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر مکہ میں جا بسیں اور خانہ کعبہ کی خدمت کریں۔ یہ مناسب نہیں کہ ہم دنیوی اغراض کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وعدہ کو بھول جائیں اور جو نصیحت انہوں نے اپنی اولاد کو کی تھی اُس کی پروا نہ کریں۔ انہوں نے جب ہمارے سپرد یہ کام کیا تھا کہ ہم خانہ کعبہ کی خدمت کریں تو ہمارا فرض یہی ہے کہ ہم مکہ میں چلے جائیں اور خانہ کعبہ کی خدمت کریں۔ چنانچہ اُن کی قوم نے اُن کی بات مان لی اور وہ سب مکہ میں اکٹھے ہوگئے۔ یہ ایک بہت بڑی قربانی تھی جو انہوں نے کی۔ وہ باہر بڑی بڑی اچھی چراگاہوں میں رہتے تھے، وہ تجارتیں بھی کرتے تھے، وہ زمینداریاں بھی کرتے تھے، وہ اَور کئی قسم کے کاروبار میں بھی حصہ لیتے تھے مگر یکدم ساری قوم نے اپنی زمینیں چھوڑیں، گلہ بانی چھوڑی، زمینداری چھوڑی، تجارت چھوڑی اور ایک وادی غیر ذی زرع میں جہاں آمدن کی کوئی صورت نہیں تھی آبیٹھے۔ میں سمجھتا ہوں اِس قربانی کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی کہ ایک قوم کی قوم اپنے پیشے چھوڑ کر محض اِس لئے ایک وادی غیر ذی زرع میں آبیٹھی کہ اُن کے دادا ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو یہ نصیحت کی تھی کہ تم مکہ میں رہو اور جو لوگ یہاں حج اور طواف اور اللہ تعالےٰ کی عبادت کے لئے آئیں اُن کی خدمت کرو۔ یہ ایک بہت بڑی قربانی تھی جو انہوں نے کی۔ پس چونکہ یہ لوگ متفرق ہونے کے بعد پھر اپنے گھر بار چھوڑ کر مکہ میں جمع ہوگئے تھے تاکہ ابراہیمی وعدہ کو پورا کریں اِس لئے اُن کا نام قریش رکھا گیا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں قَرَش کے معنے جمع کرنے کے ہیں پس قریش وہ قبیلہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئی کو پورا کرنے کے لئے مکہ میں جمع کیا گیا اور اِسی لئے اُن کا نام قریش ہوا۔ انہیں اس لئے قریش نہیں کہتے تھے کہ وہ باقی تمام قبائل عرب پر غالب تھے اور قرش کی طرح اُن کو کھا جاتے تھے۔ قریش کو عربوں میں

یہ شہرت اور عزت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے قرب زمانہ میں حاصل ہوئی ہے ورنہ اس سے پہلے تو یہ لوگ مجاوروں کی طرح وہاں بیٹھے ہوتے تھے اور قبائل عرب پر ان کو کوئی غلبہ حاصل نہیں تھا۔ پس قریش کے معنے ہیں وہ قبیلہ جو اردگرد سے اکٹھا کرکے قصیّ بن کلاب بن نضر نے مکّہ میں آ بٹھایا تھا یا یوں کہو کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی کچھ اولاد قریش کہلائی کیونکہ وہ اردگرد سے لاکر مکّہ میں بیت اللہ کی خدمت کے لئے لا بٹھائی گئی تھی۔

میں اُوپر بتا چکا ہوں کہ قریش کا نام قریش کیوں پڑا۔ میں نے بتایا ہے کہ اس بارہ میں میری تحقیق یہ ہے کہ اُن کا یہ نام کسی سمندری جانور کی وجہ سے نہیں رکھا گیا بلکہ اصل بات یہ ہے کہ قصیّ بن کلاب کے وعظ کرنے پر اور یہ توجہ دلانے پر کہ چونکہ ہمارے دادا ابراہیمؑ نے ہمیں مکّہ میں رہنے کا ارشاد فرمایا تھا اور ہمارے سپرد خانہ کعبہ کی خدمت کی تھی ہمیں چاہیئے کہ ہم اردگرد کے علاقوں کو چھوڑ کر مکّہ میں جا بسیں اور وہیں اپنی زندگی بسر کریں۔ وہ مکّہ میں آکر رہنے لگ گئے تھے۔ پس چونکہ وہ قصیّ بن کلاب بن نضر کے توجہ دلانے پر مختلف مقامات سے اُٹھ کر مکّہ میں جا کر بس گئے اس لئے وہ قریش کہلائے یعنی جمع شدہ لوگ۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ قریش تو تصغیر کا صیغہ ہے اور معنے یہ ہیں کہ مکّہ میں جمع ہو جانے والا ایک چھوٹا سا ٹکڑہ یا ایک چھوٹا سا گروہ پھر کیا وجہ ہے کہ آل اسمٰعیل کو ایک چھوٹا سا گروہ یا چھوٹا سا ٹکڑہ کہا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حکم تو سارے بنو اسمٰعیل کو تھا کہ وہ مکّہ میں رہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور پرستش کریں اور جو لوگ حج اور طواف کے لئے آئیں انکی خدمت کریں۔ مگر چونکہ بنو کنانہ میں سے صرف نضر بن کنانہ کی اولاد مکّہ میں آکر بسی اور چونکہ وہ سارے بنو اسمٰعیل میں سے ایک چھوٹا سا گروہ تھا اس لئے وہ قریش کہلائے یہ بتانے کے لئے کہ ہم تھوڑے سے آدمی ہیں جو اپنے دادا ابراہیم کی بات مان کر یہاں جمع ہو گئے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور جو لوگ خانہ کعبہ کے حج کے لئے آئیں اُن کی خدمت کریں۔ اور شاید اس نام میں اس طرف بھی اشارہ ہو کہ دوسرے قبائل کو بھی مکّہ میں جمع ہونے کی تحریک ہوتی رہے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی باقی اولاد کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوتا رہے کہ جب ہم سے تھوڑے سے لوگ وہاں بس گئے ہیں اور اُنہوں نے ہر قسم کی تکلیف کو برداشت کر لیا ہے تو ہم بھی تو اولادِ ابراہیمؑ میں سے ہیں اگر ہم بھی وہاں جا بسیں اور اپنے دادا کے حکم کو مان لیں تو اس میں حرج کیا ہے۔ پس شاید اس تصغیر میں ایک یہ بھی حکمت ہو کہ اس نام سے باقی بنو اسمٰعیل کے دل میں تحریک ہوتی رہے اور وہ بھی اپنے دادا ابراہیمؑ کی بات کو مانتے ہوئے خدا تعالیٰ کے گھر کی خدمت کے لئے مکّہ میں آ بسیں۔ پس ممکن ہے کہ اس نام سے اُنہوں نے دوسرے قبائل کے اندر تحریک کرنے کی ایک صورت پیدا کی ہو اور مکّہ میں اُن کے جمع ہونے کے لئے ایک تحریک جاری کی ہو۔

غرض قصیّ بن کلاب کی تحریک پر یہ لوگ آئے اور مکّہ میں بس گئے مگر ابتدا میں عرب کی توجہ حج کی طرف اتنی نہیں تھی کہ وہ مکّہ میں کثرت سے آتے جاتے اور خانہ کعبہ کی برکات سے مستفیض ہوتے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ قوم جو اپنے دادا کی ہدایت اور خدا تعالیٰ کی طرف سے بڑی بڑی پیشگوئیوں کے باوجود خانہ کعبہ کو چھوڑ کر چلی گئی۔ اگر حاجی کثرت سے مکّہ میں آتے ہوتے تو ان لوگوں کے رزق کے سامان پیدا ہوتے رہتے اور اُن کو مکّہ چھوڑنے کی مجبوری پیش نہ آتی۔ پس آل اسمٰعیل کا مکّہ کو چھوڑ کر دوسرے عرب علاقوں میں پھیل جانا اس امر کا ثبوت ہے کہ اس وقت تک خانہ کعبہ کے حج کا رواج عرب میں کم تھا اور بہت تھوڑے لوگ حج کے لئے آتے تھے۔ مجاوروں کو ہی دیکھ لو اُن کا کام کتنا ذلیل ہے اُسے دیکھ کر شرم آنے لگتی ہے۔ مگر گیوہ اس ذلیل کام کو بھی آسانی سے چھوڑنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ وہ ایک قابلِ نفرت کام میں اپنی زندگی کے دن

بسر کر رہے ہوتے ہیں پھر بھی اس کام سے اُن کا جتنا رزق وابستہ ہوتا ہے چاہے وہ رزق ذلت سے ہی آئے اُسے وہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ پس اگر بنو اسمٰعیل نے مکہ چھوڑا تو یقیناً اس کے معنے یہ تھے کہ اُس زمانہ میں بہت ہی کم لوگ حج کیا کرتے تھے اور اُن کے گذارہ کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اِس لئے یہ لوگ مکہ سے نکلے اور تمام عرب میں پھیل گئے۔ جب قصیّ بن کلاب کی تحریک پر یہ لوگ مکہ میں جا بسے تو یہی وقت اُن کو پھر پیش آئی۔ وہ بس تو گئے مگر چونکہ حاجی بہت کم آتے تھے اور یہ لوگ وہیں مکہ میں رہتے تھے باہر کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سخت تنگی اور عُسر کی حالت میں مبتلا ہو گئے اور اُن کے گذارہ کی کوئی صورت نہ رہی بلکہ بعض لوگوں کی تو فاقہ تک نوبت پہنچ گئی اور اُن کے لئے اپنی عزت اور زندگی کا قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ مگر پھر بھی قریش کو داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے ان تمام صعوبتوں کو بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا اور اپنی زبان پر وہ ایک لمحہ کے لئے بھی حرفِ شکایت نہ لائے اوّل تو اُن کی یہی بہت بڑی قربانی تھی کہ انہوں نے اپنے کام کاج چھوڑے، پیشوں کو ترک کیا، تجارتوں کو نظر انداز کیا، زمینداریوں سے مُنہ موڑا اور ایک وادیٔ غیر ذی زرع میں جہاں روزی کا کوئی سامان نہ تھا، اہل و عیال کو لے کر رہنا شروع کر دیا۔ مگر پھر بھی کوئی کہہ سکتا تھا کہ قریش کا مکہ میں بسنا کوئی ایسی قربانی نہیں جس کی تعریف کی جا سکے کیونکہ مکہ کی عزت لوگوں میں بہت پھیلی ہوئی تھی اور لوگ وہاں حج کے لئے آتے جاتے تھے اِس لئے ممکن ہے وہ دولت یا عزت کی خواہش کی وجہ سے مکہ میں جا کر بس گئے ہوں۔ سو چونکہ یہ اعتراض پیدا ہو سکتا تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے اُن کی عزت ظاہر کرنے کے لئے پھر دوسری دفعہ اُنکو قربانی کا موقع دیا۔ مکہ میں بسنے کی وجہ سے اُن کے گذارہ کی کوئی صورت نہ رہی۔ حج کی طرف عربوں کو بہت کم توجہ تھی نتیجہ یہ ہوا کہ فاقوں کی وجہ سے جانوں کے اتلاف تک نوبت پہنچ گئی۔ یہ لوگ کافر بھی تھے، مشرک بھی تھے، بے دین بھی تھے اور اُن میں سینکڑوں قسم کی خرابیاں پائی جاتی تھیں لیکن اِس قوم میں بعض غیر معمولی خوبیاں بھی تھیں۔ مکہ کے لوگوں میں سے جب کسی خاندان کے پاس کھانے پینے کا سامان بالکل ختم ہو جاتا اور اُس کی حالت غیر ہو جاتی۔ وہ دوست بھی جو اُنکی حالت سے آگاہ ہوتے مدد سے لاچار ہوتے کیونکہ وہ خود بھی غریب ہی ہوتے تھے تو وہ فاقہ کش لوگ قصیّ پر اعتراض نہیں شروع کر دیتے تھے کہ اُس نے ہمیں غلط تعلیم دی تھی ہم مکہ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ ہم نے بیوقوفی کی کہ ایسی جگہ آ بسے جہاں روٹی کا کوئی سامان نہیں تھا بلکہ وہ خاندان اُسی وقت اپنا خیمہ اٹھا کر مکہ سے ذرا باہر چلا جاتا (مکانوں کا رواج عرب میں بہت کم تھا بلکہ اب تک بھی بادیہ کے لوگ خیموں میں رہتے ہیں) اور مکہ سے دو تین میل پرے اپنا خیمہ لگا لیتا اور اپنے بیوی بچوں کو بھی وہیں لے جاتا تاکہ اُس کے رشتہ داروں، دوستوں اور محلہ والوں کو اُس کی اِس بُری اور خراب حالت کا پتہ نہ لگے۔ اور وہیں وہ سب کے سب بھوکے مر جاتے۔ میں سمجھتا ہوں یہ اس قسم کی قربانی ہے کہ اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ لوگ بھوکے ہوتے ہیں تو وہ فوراً کسی دوسری جگہ جا کر اپنی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ دوسروں سے سوال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے اور صبر اور برداشت کی قوت کو بالکل کھو بیٹھتے ہیں۔ ہمارے صوفیاء نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ کوئی بزرگ تھے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں شہر چھوڑ کر باہر جنگل میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کروں گا وہ کھانا بھیج دے گا تو کھا لوں گا اور اگر نہ بھیجے گا تو فاقہ کروں گا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ انہوں نے شہر سے باہر ڈیرے لگا لئے ہیں تو اُن کی بزرگی اور تعلقات کی وجہ سے دوستوں نے اُن کو باقاعدہ صبح و شام کھانا پہنچانا شروع کر دیا مگر ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ انہیں کھانا نہ پہنچا۔ شاید اُن سے زیادہ تعلق رکھنے والے لوگ کہیں باہر چلے گئے تھے یا شاید

قریش کی مکہ میں آباد ہونے کے لئے انتہائی قربانی [۲۰۱]

اُن میں سے ہر ایک نے یہ سمجھا کہ دوسرے نے کھانا بھیج دیا ہوگا۔ اور اس طرح کوئی شخص بھی کھانا نہ لایا۔ ایک وقت گذرا اور اُنہیں کھانا نہ ملا۔ دوسرا وقت آیا تب بھی کھانا نہ آیا۔ اِس کے بعد تیسرا وقت آگیا مگر اُنہیں پھر بھی کھانا نہ پہنچا۔ تیسرے کے بعد چوتھا اور چوتھے کے بعد پانچواں اور پانچویں کے بعد چھٹا فاقہ اُن پر آگیا۔ جب چھ فاقے ہوگئے تو اب اُن کے لئے برداشت کرنا مشکل ہوگیا وہ کسی طرح گرتے پڑتے شہر میں آئے اور اپنے کسی دوست کے ہاں جا کر اُس سے خواہش کی کہ وہ اُنہیں کچھ کھانے کو دے۔ اُس نے تین روٹیاں اور اُن پر کچھ سالن رکھکر پیش کیا۔ انہوں نے روٹیاں اٹھائیں سالن لیا اور باہر جنگل کو چل پڑے۔ کچھ دُور جا کر انہوں نے دیکھا کہ گھر کے مالک کا کتا بھی اُن کے پیچھے چلا آرہا ہے۔ اُنہیں خیال آیا کہ اس کتے کا بھی ان روٹیوں پر حق ہے۔ اس پر انہوں نے ایک روٹی لی اُس پر سالن کا تیسرا حصہ رکھا اور کتے کے آگے ڈال دیا۔ اُس نے جلدی جلدی روٹی کھائی اور پھر اُن کے پیچھے چل پڑا۔ وہ تھوڑی دُور گئے ہونگے کہ پھر اُن کو خیال آیا کہ کُتا تو ابھی پیچھے چلا آرہا ہے معلوم ہوتا ہے ابھی اسے سیری نہیں ہوئی۔ مَیں سمجھتا ہوں کتا شاید اس لئے اُن کے پیچھے گیا ہوگا کہ وہ اُس کے مالک کے دوست تھے اور کتا اُن کو اکثر آتے جاتے دیکھتا ہوگا۔ کتا جہاں اپنے آقا کے ساتھ محبت رکھتا ہے وہاں وہ اپنے آقا کے ساتھ ملنے والوں کو بھی خوب پہچانتا ہے بہت ہی ذہین جانور ہے۔ مگر انہوں نے تصوّف کے اثر کے نیچے یہ سمجھا کہ شاید یہ اپنا حق مانگتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کتے کو دیکھ کر کہا بے شک تیرا حق مجھ سے زیادہ ہے تُو تو ہر وقت وہاں بیٹھا رہتا ہے مگر میں تو کبھی کبھار جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر انہوں نے دوسری روٹی لی اُس پر بقیہ سالن کا نصف حصہ رکھا اور اُسے کتے کے آگے ڈال دیا۔ کتے نے وہ روٹی بھی کھالی گر پھر بھاگ کر اُن کے پیچھے چل پڑا۔ اب جو کتا اُن کے پیچھے چلا تو اُنہیں بہت غصہ آیا اور جب انسان کو غصہ آتا ہے تو وہ جانوروں سے بھی باتیں کرنے لگتا ہے ہمارے ملک میں بیل چلانے والے بیل سے باتیں کرتے ہیں۔ گدھے چلانے والے گدھوں سے باتیں کرتے ہیں۔ تانگے والے آدھی باتیں سواری سے کرتے ہیں اور آدھی باتیں گھوڑے سے کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں شاباش قدم اٹھائے چلا جائیں تجھے خوب گھاس کھلاؤں گا۔ کبھی نہیں چلتا تو غصہ میں اُسے گالیاں دینی شروع کر دیتے ہیں۔ اِسی طرح جب انہوں نے بھی دیکھا کہ کتا ابھی تک پیچھے چلا آرہا ہے تو انہوں نے غصے سے اُس کی طرف دیکھا اور کہا بے حیا دو روٹیاں تو میں ڈال چکا ہوں مگر پھر بھی تُو میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ انہوں نے یہ بات کہی ہی تھی کہ اُن پر کشفی حالت طاری ہوئی اور انہوں نے دیکھا کہ وہی کتا اُن کے سامنے کھڑا ہے۔ کشف میں جانور بھی باتیں کر لیتے ہیں۔ زمین بھی بات کر لیتی ہے لکڑی بھی بات کر لیتی ہے اِس لئے کتے کی بات پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے انہوں نے دیکھا کہ کتا اُن کے سامنے کھڑا ہے اور وہ اُن سے کہہ رہا ہے کہ بے حیا میں ہوں یا تم۔ میں جس انسان کے دروازہ پر بیٹھا ہوں اُسے مَیں نے کبھی نہیں چھوڑا خواہ فاقوں پر فاقے کیوں نہ آئیں۔ مگر تم محض خدا کے لئے جنگل میں جا بیٹھے تھے لیکن چند فاقے ہی آئے تھے کہ شہر کی طرف اُٹھ بھاگے۔ اُس نے اتنا کہا اور کشفی حالت جاتی رہی۔ انہوں نے تیسری روٹی اور باقی سالن بھی کتے کے آگے ڈال دیا اور خود خالی ہاتھ جنگل کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچے ہی تھے کہ تھوڑی دیر میں اُن کے دوست اور کئی دوسرے لوگ کھانا لئے ہوئے پہنچے اور اُن سے معذرت کرنے لگے کہ پچھلے چند دنوں وہ اس خدمت سے محروم رہے۔ اُن بزرگ نے کہا اِس میں تمہارا کوئی قصور نہیں یہ خدا تعالےٰ کی طرف سے میرا امتحان لیا گیا تھا۔ اب اِس قصہ کو مکہ کے لوگوں کے حالات سے مقابلہ کر کے دیکھو وہ لوگ مشرک تھے لیکن اُن میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمت بننے کی قابلیت خدا تعالےٰ پیدا کر رہا تھا۔ یہ کتنی

بڑی قربانی ہے کہ وہ مکہ سے کچھ فاصلہ پر خیمے لگا لیتے اور اپنے بیوی بچوں سمیت وہیں بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرجاتے مگر مکہ کو نہ چھوڑتے تھے اور نہ دوسرے لوگوں سے سوال کرتے۔ اِس سے ایک طرف تو اُن کے اُس جوش کا پتہ لگتا ہے جو اُن کے دلوں میں خانہ کعبہ کی خدمت کے متعلق تھا اور دوسری طرف اُن کی قناعت کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ وہ لوگوں پر بار نہیں بنتے تھے کسی سے کچھ مانگتے نہیں تھے۔ الگ تھلگ ایک خیمہ میں پڑے رہتے اور وہیں سب کے سب مرجاتے۔ میں سمجھتا ہوں ہماری جماعت جو اس امر کی مدعی ہے کہ وہ خدا تعالےٰ کی نازل کی ہوئی تعلیم پر ایمان رکھتی اور اُس کے نور کی حامل ہے اُس کے افراد کو بھی اِس سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

قریش کی قربانی میں ہماری جماعت کے لئے نمونہ

خصوصاً حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد اور آپ کے خاص اتباع کی اولاد کو میں اُن کے اِس فرض کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ دین کے لئے قربانی اور ایثار کا وہ مادہ ابھی تک اُن میں پیدا نہیں ہوا جو احمدیت میں داخل ہونے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانے کے بعد اُن میں پایا جانا چاہیئے تھا۔ اُن کا قدم نہایت سست ہے اور اُن کے اندر قربانی اور ایثار کا مادہ ابھی بہت کم ہے یقیناً اِس معیار کے ساتھ ہم کبھی بھی دنیا پر غالب نہیں آسکتے جب تک ہم میں سے ہر شخص یہ نہیں سمجھ لیتا کہ وہ غرض جس کے لئے وہ اِس سلسلہ میں شامل ہوا ہے اور وہ مقصد جس کیلئے اُس نے بیعت کی ہے وہ دوسری تمام اغراض اور دوسرے تمام مقاصد پر مقدم ہے اُس وقت تک یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُس نے اپنے ایمان کا کوئی اچھا نمونہ دکھایا ہے۔ بلکہ میرے نزدیک حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد کے لئے تو ایسے کام کرنا جن سے دین کی خدمت میں روک پیدا ہو قطعی طور پر ناجائز ہے اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ ویسا ہی دنیادار شخص ہے جیسے کوئی اَور لیکن دوسروں کو بھی یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اُن کے اندر یہ مادہ ہونا چاہیئے کہ جب دین کی طرف سے اُنہیں آواز آئے وہ اپنے تمام کام کاج چھوڑ کر فوراً چلے آئیں اور اپنے آپ کو دینی خدمات میں مشغول کردیں۔ اب اگر وہ دنیا کا کام کرتے ہیں تو اِس لئے کہ ابھی دین کو اُن کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ لیکن اگر ضرورت پیش آجائے تو پھر اُن کو یاد رکھنا چاہیئے کہ بیعت کے وقت انہوں نے یہ عہد کیا تھا کہ ہم دین کو دنیا پر مقدم رکھیں گے۔ اِس دین کو دنیا پر مقدم رکھنے کے عہد کے آخر کوئی معنے تو ہونے چاہئیں۔ اِس کے تم کوئی ادنےٰ سے ادنےٰ معنے کرلو آخر کسی نہ کسی چیز کو تمہیں بہرحال اپنے کاموں پر مقدم رکھنا پڑے گا۔ اگر اس عہد میں تم مال شامل کرو تو تمہیں مال پر دین کو مقدم رکھنا پڑے گا۔ اگر جان شامل کرو تو تمہیں جان پر دین کو مقدم رکھنا پڑے گا۔ اگر خدمت شامل کرو تو تمہیں ہر قسم کی خدمت پر دین کو مقدم رکھنا پڑے گا۔ بہرحال کوئی نہ کوئی مفہوم تمہیں اِس اقرار کا تسلیم کرنا پڑے گا اور جب یہ اقرار ہر احمدی نے کیا ہے تو ہماری جماعت کے افراد کو سوچنا چاہیئے کہ اس اقرار کے بعد وہ کیا کررہے ہیں اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ دین کو دنیا پر مقدم رکھتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا ایسے احمدی موجود ہیں جو سَو میں سے ۵۱ روپیہ دین کے لئے خرچ کرتے ہوں۔ مقدم کے معنے تو یہ ہوتے ہیں کہ میں اور کاموں پر اس کام کو ترجیح دیتا ہوں۔ اگر انہیں سَو روپیہ اپنے اخراجات کے لئے ملتا ہے اور وہ دیانتداری کے ساتھ اپنے تمام کاموں پر دین کو مقدم سمجھتے ہیں تو اُس کا ثبوت اِسی طرح مل سکتا ہے کہ وہ سَو میں سے ۵۱ روپے دین کے لئے خرچ کرتے ہوں۔ مگر کیا وہ ایسا کرتے ہیں؟ کیا وہ دن رات کے ۲۴ گھنٹوں میں سے تیرہ گھنٹے دین کے کاموں پر صرف کرتے ہیں؟ یا قربانی اور ایثار کے لحاظ سے وہ اپنے بیوی بچوں اور دوسری چیزوں پر دین کو مقدم کرتے ہیں؟ یا وطن کے لحاظ سے وہ دین کو دنیا پر مقدم سمجھتے ہیں؟ یا جان کے لحاظ سے وہ دین کو دنیا پر مقدم سمجھتے ہیں؟ آخر کوئی ایک چیز تو ہونی چاہیئے جس کے لحاظ سے وہ کہہ سکتے ہوں کہ ہم دین کو دنیا پر مقدم کررہے ہیں۔ اگر ہر احمدی اِس

نقطۂ نگاہ سے غور کرے اور اُسے اپنے اندر ایک بات بھی ایسی نظر نہ آئے جس میں وہ دین کو دنیا پر مقدم کر رہا ہو تو اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ محض منافقت کی بات ہے کہ وہ دعوےٰ تو یہ کرتا ہے کہ مَیں دین کو دنیا پر مقدم کرتا ہوں مگر عمل یہ ہے کہ وہ کسی ایک چیز کے لحاظ سے بھی دین کو دنیا پر مقدم نہیں کرتا۔ آخر کوئی ایک چیز تو ہونی چاہیئے جس کے متعلق وہ کہہ سکے کہ مَیں فلاں چیز کے لحاظ سے دین کو دنیا پر مقدم کر رہا ہوں۔ اور اس عہد کا کوئی نہ کوئی مفہوم تو ہونا چاہیئے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ عہد ہم سے صرف اتنا تقاضا نہیں کرتا کہ ہم کسی ایک پہلو میں دین کو دنیا پر مقدم کریں بلکہ ہر بات میں اور اپنے ہر کام میں ہمارا فرض ہے کہ ہم دین کو دنیا پر مقدم کریں۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ جو شخص اپنے ہر کام میں دین کو دنیا پر مقدم نہیں کر سکتا اُسے کم از کم یہ تو کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ کسی ایک کام میں ہی دین کو دنیا پر مقدم رکھے تاکہ وہ کہہ سکے کہ میں اس عہد کو پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ کوشش خواہ وہ مال کے لحاظ سے کرے، خواہ تجارت کے لحاظ سے کرے، خواہ پیشہ کے لحاظ سے کرے، خواہ وطن کی محبت کے لحاظ سے کرے، خواہ ملازمت کے لحاظ سے کرے، خواہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے تعلقات کے لحاظ سے کرے، خواہ عبادت کے لحاظ سے کرے، خواہ قربانی اور ایثار کے لحاظ سے کرے، بہرحال کوئی ایک چیز تو ایسی ہونی چاہیئے جسے وہ دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہو اور کہہ سکتا ہو کہ جن کاموں کا مجھے موقع ملا ہے اُن میں مَیں نے دین کو دنیا پر مقدم کر لیا ہے اور جو باقی کام ہیں اُن میں بھی مَیں پوری طرح تیار ہوں کہ اس عہد کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کروں۔ لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اُس کا دعوائے ایمان محض ایک منافقانہ فعل ہے جو اُس کے کسی کام نہیں آسکتا۔ تم قریش کے اس واقعہ پر غور کرو اور دیکھو کہ باوجود اس کے کہ یہ لوگ سچے دین کے حامل نہیں تھے، باوجود اِس کے کہ یہ لوگ بُت پرست تھے، باوجود اس کے کہ یہ لوگ بے دین تھے انہوں نے کتنی عظیم الشان قربانی کی۔ یہ لوگ اپنی قوم پر بوجھ نہیں بنے انہوں نے کہا ہم خدا کے لئے آئے تھے ہماری قوم کا کیا حق ہے کہ وہ ہماری خدمت کرے۔ وہ خیمہ اُٹھا کر مکہ سے باہر چلے جاتے۔ باپ کے سامنے اُس کا بیٹا مرتا، ماں کے سامنے اُس کی بیٹی مرتی، بیوی کے سامنے اُس کا خاوند مرتا، بچوں کے سامنے اُن کا باپ مرتا، دوست کے سامنے دوست اور رشتہ دار کے سامنے رشتہ دار مرتا مگر کیا مجال کہ اُن کی زبان پر کوئی شکایت آتی۔ کیا مجال کہ وہ اس جگہ کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتے۔ اتنی بڑی مصیبت دیکھنے کے بعد بھی انہوں نے اس جگہ کو نہیں چھوڑا۔ وہ کسی معجزہ کو دیکھ کر وہاں نہیں آئے تھے، وہ کسی نشان کو دیکھ کر وہاں نہیں آئے تھے، وہ کسی تازہ تعلیم پر ایمان لا کر وہاں نہیں آئے تھے، دو ہزار سال پہلے اُن کے دادا ابراہیمؑ نے ایک بات کہی تھی اور وہ اپنے دادا کے وعدہ کے مطابق اس سرزمین میں آبسے۔ اُن پر فاقے آئے مگر انہوں نے اس جگہ کو نہ چھوڑا اُن میں فاقہ سے موتیں ہوئیں مگر انہوں نے اس جگہ کو نہ چھوڑا۔ انہوں نے سالہا سال غربت اور تنگی اور افلاس میں اپنی زندگی کے دن بسر کئے۔ اُن کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہیں تھا اُن کے پاس گذارہ کا کوئی سامان نہیں تھا مگر انھوں نے کہا ہم اس مقام کو اب نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم مٹ جائیں گے ہم ایک ایک کر کے فنا ہو جائیں گے مگر ہم مکہ کو چھوڑ کر کہیں باہر نہیں جائیں گے۔ یہ اتنی عظیم الشان قربانی ہے کہ یقیناً اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔

بہرحال اسی طرح مکہ میں ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ ہاشم بن عبدمناف جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پڑدادا تھے اُن کا وقت آگیا۔ جب انہوں نے یہ حال دیکھا تو سمجھا کہ اس طرح تو قوم فنا ہو جائے گی۔ انہوں نے لوگوں کو جمع کیا اور

اُن میں تقریر کی کہ جو طریق تم نے ایجاد کیا ہے یہ اپنی ذات میں تہوّر کے لحاظ سے تو بڑا اچھا ہے مگر اس طرح وہ کام پیدا نہیں ہوگا جس کیلئے تم لوگ مکہ میں آئے ہو۔ اگر یہی طریق جاری رہا اور تم میں سے اکثر مر گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مکہ خالی ہو جائے گا بے شک جوش و خروش اور عزم کی پختگی کے لحاظ سے یہ کام ایسا شاندار ہے کہ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے مگر عقل کے لحاظ سے یہ اچھا نہیں کوئی ایسی تدبیر ہونی چاہیئے کہ ہم سب لوگ مکہ میں بھی رہیں اور اس قسم کی موت بھی ہم میں واقعہ نہ ہو۔ غالباً اُن کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا ہوگا کہ اگر اس طریق کو جاری رہنے دیا گیا تو دوسری قوموں پر اس کا بُرا اثر پڑے گا اور وہ کہیں گی یہ لوگ خدا کیلئے مکہ میں بیٹھے ہوئے تھے مگر بھوکے مر گئے۔ پس اس طرح خدا کا احترام کم ہو جائے گا اور لوگ یہ سمجھیں گے کہ خدا تعالیٰ کی خاطر قربانی کرنے کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔ ہمیں اپنے آپ کو اس طرح رکھنا چاہیئے کہ ہمارا اعزاز دنیا میں قائم ہو اور دوسرے عرب قبائل سے ہماری حالت اچھی ہو۔ مکہ والوں نے ہاشم کی بات سُن کر کہا آپ جو تدبیر بتائیں ہم اُسے ماننے کے لئے تیار ہیں۔ آپ نے فرمایا میری تجویز تو یہ ہے کہ ہم لوگ رہیں تو مکہ میں ہی مگر اپنی حالت کو بہتر بنانے کیلئے تجارت شروع کر دیں۔ یوں بھی اپنی ذاتی اغراض کے لئے ہم بعض دفعہ سفر کر لیتے ہیں اگر آئندہ ہم بعض سفر محض تجارت کی خاطر کریں تو اس سے ہماری گری ہوئی حالت بہت کچھ سُدھر جائیگی اور ہماری پریشانی دور ہو جائے گی۔ زراعت کی تجویز آپ نے اس لئے نہ کی کہ مکہ میں زراعت کی کوئی صورت نہیں تھی دوکانداری کی تجویز آپ نے اس لئے نہ کی کہ دوکاندار کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ رات دن دوکان پر بیٹھا رہے۔ آپ نے سمجھا کہ اگر لوگوں نے دوکانداری شروع کر دی تو خدمتِ کعبہ کا وہ موقع جو اب انہیں مل رہا ہے اس سے وہ محروم ہو جائیں گے چنانچہ آپ نے یہ تجویز کی کہ قوم کا روپیہ لے کر ہر سال دو سفر کئے جائیں۔ ایک سفر سردی کے موسم میں کیا جائے جو یمن کی

بنی ہاشم میں تجارت کے تمغے بھجوانے کی ابتداء

طرف ہو اور ایک سفر گرمی کے موسم میں کیا جائے جو شام کی طرف ہو۔ شام بوجہ سرد مقام ہونے کے گرمی کے سفر کے لئے موزوں تھا اور یمن بوجہ گرم مقام ہونے کے سردی کے سفر کے لئے موزوں تھا۔ آپ نے تجویز کیا کہ ہر سال اہل مکہ کے نمائندہ قافلے یہ دو سفر محض تجارت کی غرض سے کیا کریں اور تجارت بھی قوم کے لئے کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاشم بن عبد مناف نے دنیا میں یا کم سے کم عرب میں سب سے پہلے کمپنی سسٹم جاری کیا ہے۔ یوں تو تاجر دنیا میں ہمیشہ تجارت کیا ہی کرتے ہیں۔ زید تجارت کی غرض سے باہر جاتا اور سودا لے کر آ جاتا ہے تو پھر اُسے زیادہ مہنگے داموں پر وہ فروخت کر دیتا ہے۔ مگر یہ کہ سفر کسی فرد کا نہ ہو بلکہ قومی طور پر تمام قبیلہ کا مشترکہ سرمایہ لے کر سفر کیا جائے اس کی ابتداء کم سے کم عرب میں ہاشم بن عبد مناف سے ہی ہوئی ہے۔ لوگوں نے کہا بہت اچھا ہمیں منظور ہے چنانچہ قافلے جانے لگے۔ جب بھی کوئی قافلہ جاتا تو ہر شخص دس بیس پچاس یا سو روپیہ جتنا دینا چاہتا قافلہ والوں کے سپرد کر دیتا۔ پھر اُن میں سے ایک کو رئیس بنا دیا جاتا۔ اور باقی لوگ اہل مکہ کی طرف سے نمائندہ بن کر اس سفر پر روانہ ہو جاتے۔ امراء جن کی حالت کچھ اچھی تھی وہ بعض دفعہ تجارت کی غرض سے اپنے غلام بھی اِن سفروں میں بھیج دیا کرتے تھے۔ اُن کا طریقِ تجارت یہ تھا کہ وہ مکہ سے روانہ ہوتے وقت ایسی چیزیں اپنے ساتھ لے لیتے تھے جو اُنکی نظروں میں متبرک ہوتی تھیں اور جہاں جہاں عرب قبائل سے گذرتے وہاں مکہ کے تبرکات اُنہیں دیتے جاتے۔ مثلاً آب زمزم کے کچھ مشکیزے بھر کر اپنے ساتھ رکھ لیتے چونکہ عرب قبائل کو خانہ کعبہ سے بہت عقیدت تھی اس لئے جب اُنہیں گھر بیٹھے آب زمزم میسر آ جاتا یا اسی طرح کی بعض اور چیزیں مل جاتیں تو وہ بہت خوش ہوتے اور قریش کو نہایت ادب اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے۔ اسی طرح اور بھی کئی چیزیں وہ اپنے ساتھ رکھ لیتے تھے مثلاً مکہ میں

لوہارے کا کام اچھا ہوتا ہے وہ لوہے کی تیار شدہ چیزیں لے لیتے۔ اسی طرح کھجوریں اپنے ساتھ رکھ لیتے اور یہ سب چیزیں رستہ میں فروخت کرتے جاتے۔ پھر جہاں عرب قبائل میں ٹھہرتے اور دیکھتے کہ وہاں کوئی چیز ایسی ہے جو شام میں اچھے داموں پر فروخت کی جا سکتی ہے تو وہ اُن قبائل سے ایسی چیزیں خود خرید لیتے اور شام میں جا کر فروخت کر دیتے پھر جب شام سے آتے تو وہاں سے دو قسم کا مال خرید لیتے کچھ تو مکہ والوں کے لئے اور کچھ راستہ میں آنے والے عرب قبائل میں فروخت کرنے کے لئے۔ اس طرح اُن کو نفع بھی حاصل ہوتا اور شام اور دوسرے عرب علاقوں کا مال بھی مکہ میں آ جاتا۔ اسی طرح سردیوں میں وہ یمن کا سفر کیا کرتے تھے۔ مکہ اور یمن کے درمیان بھی بڑا لمبا فاصلہ تھا اور اس راستہ پر بھی مختلف عرب قبائل آباد تھے اس سفر میں بھی وہ تمام لوگوں کو مکہ کے تحائف دیتے اور اُن سے عمدہ عمدہ چیزیں خریدتے ہوئے یمن پہنچ جاتے اور یمن میں تمام مال فروخت کر کے وہاں کی مصنوعات اور غلہ وغیرہ کچھ مکہ والوں کے لئے اور کچھ رستہ کے عرب قبائل میں فروخت کرنے کے لئے لے آتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال میں ہی مکہ کی دولت سارے عرب سے زیادہ ہو گئی۔ اُن کا یہ بھی طریق تھا کہ جب قافلہ واپس آتا تو ہر آدمی جس کا اس تجارت میں حصہ ہوتا تھا وہ اپنا آدھا حصہ غربا کے لئے نکال دیتا تھا۔ مثلاً ایک شخص کو دو سو روپیہ نفع حاصل ہوا تو سو روپیہ وہ خود رکھ لیتا تھا اور سو روپیہ قومی فنڈ میں دے دیتا تھا۔ اس طرح غربا کے گذارہ کے لئے ایک کافی رقم نکل آتی تھی۔ فرض کرو ایک دفعہ قافلہ گیا اور اُسے ایک لاکھ روپیہ نفع حاصل ہوا تو پچاس ہزار روپیہ اُسی وقت غربا میں تقسیم کرنے کے لئے علیحدہ کر لیا جاتا تھا۔ اس طرح ایک قلیل مدت میں غربا کی حالت بھی بہت بہتر ہو گئی۔ چنانچہ ایک عرب شاعر مکہ والوں کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مکہ کے لوگ ایسے اعلیٰ درجہ کے اخلاق کے مالک ہیں کہ وہ اپنا آدھا مال غربا میں بانٹ دیتے ہیں اور اس طرح اُن کے غریب بھی امیر کے برابر ہو جاتے ہیں۔ یہ تو ایک مبالغہ ہے کیونکہ سارے مکہ میں زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس مالدار ہوں گے اور سارے شہر کی آبادی پندرہ بیس ہزار ہو گی وہ اپنا نصف نصف مال تقسیم بھی کریں تو بہت تھوڑا روپیہ لوگوں کو مل سکتا تھا۔ لیکن بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان سفروں کے نتیجہ میں اُن کی حالت اچھی ہو گئی اور وہ موت جو محض فاقوں کی وجہ سے اُن پر آ رہی تھی اُس سے انہوں نے نجات حاصل کر لی اس کے بعد قریش اس طریق پر برابر عمل کرتے رہے یہاں تک کہ اسلام آ گیا اور مکہ والے باقی سارے عرب سے زیادہ امیر ہو گئے اور دوسروں سے زیادہ معزز بھی ہو گئے۔

ان مذکورہ بالا واقعات سے دو باتیں نکلتی ہیں ایک تو یہ کہ بنو اسمٰعیل وعدۂ ابراہیمی کی پابندی کرتے ہوئے مکہ میں بیٹھے نہیں رہے بلکہ شروع میں ہی وہ مکہ چھوڑ کر اِدھر اُدھر پھیل گئے تھے۔ قصی بن کلاب نے تحریک کر کے دوبارہ انہیں مکہ میں بسایا۔ پس جو لوگ اُن کے کہنے پر مکہ میں آ بسے اُن کو قریش کہا جانے لگا یعنی وہ لوگ جو پہلے بکھرے ہوئے تھے مگر پھر قصی کی تحریک پر دوبارہ مکہ میں جمع ہوئے۔

دوسری بات ان واقعات سے یہ نکلتی ہے کہ مکہ میں بسنے کی وجہ سے یہ لوگ غریب ہو گئے تھے۔ ہاشم جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پڑدادا تھے انہوں نے تحریک کی کہ یہ لوگ شام اور یمن کا سفر کیا کریں تاکہ ان کی حالت اچھی ہو۔

اگر تیس سال ایک نسل کا فرق سمجھا جائے تو یہ تحریک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے کوئی سوا دو سو سال پہلے ہوئی ہے۔ یوں تو انسانوں کی عمر نہ ستر سال بلکہ اسی سال بھی ہوتی ہے مگر قومی عمریں ہمیشہ تھوڑی ہوتی ہیں۔ ہندوستان کی عمر پہلے ۲۲ سال تھی اب

کہتے ہیں کہ ۲۸ سال کے قریب ہے۔ یورپ کے لوگ جن کا آدمی بعض دفعہ ۸۵ سال کی عمر میں بھی فوت ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ابھی تو وہ جوان تھا اور اُس کے کام کرنیکا وقت تھا اُن میں بھی بڑی سے بڑی عمر ۶۵ سال سمجھی جاتی ہے۔ عام طور پر چالیس سال عمر اوسط سمجھی جاتی ہے ہندوستان میں چونکہ غربت زیادہ ہے اِس لئے یہاں کی عمر پہلے ۲۲ سال تھی اب ۲۸ سال کے قریب قریب سمجھی جاتی ہے۔ اگر ہم عربوں کی ایک نسل کی عمر ۳۰ سال فرض کرلیں تو یہ تحریک رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے کوئی سوا دو سَو سال پہلے شروع ہوئی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے درمیان کوئی ۲۲-۲۳ سو سال کا فرق تھا۔ میں نے بتایا تھا کہ یہ اندازہ ۲۲ سَو سے ۲۸ سو سال تک سمجھا جاتا ہے اگر ہم چھوٹے سے چھوٹا اندازہ رکھ لیں جو ۲۲ سو سال کا ہے اور اُس میں سے یہ سوا دو سو سال نکال دیں تو باقی دو ہزار سال رہ گئے۔ یہ دو ہزار سال کا زمانہ ایسا تھا جس میں قوم اپنا فرض بھولی رہی دنیا میں یہ قاعدہ ہے کہ جوں جوں اوپر کی نسل کی طرف جائیں ماں باپ کی یاد اولاد کے دلوں میں زیادہ قائم ہوتی ہے اور جوں جوں نیچے کی طرف آئیں یہ یاد کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اِس قاعدہ کے مطابق حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے زمانہ کا قرب جس نسل کو حاصل تھا اُسے قدرتاً وہ وعدے زیادہ یاد ہونے چاہیئے تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئے کیونکہ دنیا میں طریق یہی ہے کہ باپ کو بیٹا زیادہ یاد رکھتا ہے پوتا اُس کی یاد کو کم کر دیتا ہے اور پڑپوتا اُس کی یاد کو اَور بھی کم کر دیتا ہے یہاں تک کہ چار پانچ پشت میں تو اولاد اپنے دادا پڑدادا کو بالکل ہی بھول جاتی ہے۔ اور اگر اس سے بھی زیادہ عرصہ گذر جائے تو اُنہیں کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ چنانچہ تمام بڑی بڑی قوموں کو دیکھ لو سب میں یہی کیفیت نظر آئیگی مثلاً رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیٹی حضرت فاطمہ رضؓ کی اولاد نے جو ابتداء میں قربانیاں کیں وہ کتنی حیرت انگیز ہیں مگر اب سادات کو دیکھ لو اُن کی کیا حالت ہے۔ اُن میں سے اکثر ایسے ملیں گے جو اسلام سے کوسوں دُور ہیں حالانکہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کی اولاد ہیں۔ پھر تاتاری اپنی قوم کو دیکھ لو چینی ترکستان سے یا تو خان جو مغلوں کا ایک پڑدادا تھا اُٹھا اور طوفان کی طرح تمام یورپ پر پھیلتا چلا گیا۔ دوسری طرف جتلائی خان مشرق میں چینی سمندر کے کناروں تک پر قابض ہو گیا۔ گویا ایک طرف جاپان کے کناروں تک ہماری قوم پہنچی تو دوسری طرف یورپ کو بھی اُس نے روند ڈالا۔ مگر اب کئی مغل ایسے نظر آئیں گے جو دشمن کا مقابلہ تو الگ رہا خطرہ سامنے دیکھکر چیخ مار کر بھاگ جائیں گے اور اپنے باپ دادوں کے کارنامے انہوں نے یکسر بھلا دئے ہیں۔ اِسی طرح پٹھان آئے تو وہ کس طرح سارے ہندوستان میں پھیل گئے مگر اب سمٹ سمٹا کر وہ پٹھان ایک چھوٹے سے علاقہ میں رہ گئے ہیں۔ اگر قربانی اور ایثار کا اِن میں وہی مادہ رہتا جو اِن کے باپ دادا میں تھا تو یہ انقلاب کیوں پیدا ہوتا اور کیوں وہ حاکم بننے کے بعد محکوموں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے۔ غرض طبعی طریق کو اگر مدنظر رکھا جائے تو شروع زمانہ میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کا اثر اُنکی قوم پر زیادہ ہونا چاہیئے تھا اور دو ہزار سال کے بعد تو ایسی جاہل اور اَن پڑھ قوم میں سے اُن کا ذکر بالکل مٹ جانا چاہیئے تھا مگر ہوا یہ کہ عین دو ہزار سال کے بعد پھر اُن میں ایک تحریک پیدا ہوئی اور وہ اپنے دادا کے حُکم کی تعمیل کرتے ہوئے مکہ میں آبسے۔ وہ بُھوکے بھی رہے، وہ ننگے بھی رہے، وہ تکلیفیں بھی برداشت کرتے رہے مگر انہوں نے مکہ کو نہ چھوڑا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا اتفاق تھا جس نے دو ہزار سال کے بعد قوم میں خانہ کعبہ کے گرد بسنے کا پھر احساس پیدا کر دیا۔ علم النفس کے ماتحت اگر ہم غور کریں تو دو ہزار سال کے بعد یہ ذکر قوم میں سے بالکل مٹ جانا چاہیئے تھا مگر ہوا یہ کہ دو ہزار سال کے بعد

یکدم اُن میں ایک شخص پیدا ہؤا اور اُس نے کہا کہ ہم کو پھر مکہ میں جمع ہو جانا چاہیئے اور اولادِ اسمٰعیل میں سے ایک قبیلہ باوجود ہر قسم کے مخالفانہ حالات کے مکہ میں بیٹھ جاتا ہے اور خانہ کعبہ کی خدمت اور مکہ کی حفاظت کا کام اپنے ذمہ لے لیتا ہے اور پھر یہ لوگ اِس کام کو اتنی محبت اور اتنے پیار سے سرانجام دیتے ہیں کہ وہ بھوکے مرتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے اُن کے بچے تڑپ تڑپ کر جان دیتے ہیں۔ اُن کی بیویاں اور اُن کی بیٹیاں مرتی ہیں مگر وہ مکہ کو چھوڑنے کا نام نہیں لیتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ احساس دو ہزار سال گذرنے کے بعد اِن لوگوں میں کیوں پیدا ہؤا اور پھر اِسی قبیلہ کے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہؤا جس میں سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پیدا ہونا تھا ایک معمولی غور سے بھی یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ یہ قدرت کی ایک انگلی تھی جس نے قوم کو اشارہ کیا کہ جس بات کے لئے تمہارے باپ دادا نے اِس مکہ کو آباد کیا تھا اُس کا وقت اب بالکل قریب آرہا ہے جاؤ اور مکہ میں رہو۔ ورنہ یہ اتفاق کس طرح ہو سکتا ہے کہ دو ہزار سال اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد ایک بڑی قوم کا صرف وہی ٹکڑہ مکہ میں جمع ہوتا جس میں سے آنے والے موعود نے پیدا ہونا تھا۔ دشمن کہہ سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ جھوٹا دعویٰ کر دیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ آخر یہ کیا بات ہے کہ اِس جھوٹے کی آمد سے پہلے تمام قوم چاروں طرف سے اکٹھی ہو کر مکہ میں آجاتی ہے اور اِس لئے آتی ہے کہ ہمارے دادا ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ تم اِس مقام پر رہو اور اِسے آباد رکھو کہ یہ عالمگیر مذہب کا مرکز بننے والا ہے۔ یہ عظیم الشان تغیر جو یکدم بنو اسمٰعیل میں پیدا ہؤا اور جس نے اُن میں تہلکہ ڈال دیا بتاتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس وعدہ کے مطابق ہؤا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا گیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ اے میرے رب تُو مکہ والوں میں ایک رسول مبعوث فرما جو انہی میں سے ہو وہ اُنہیں تیری آیات پڑھ پڑھ کر سنائے، تیری کتاب کا علم اُن کو دے حکمت کی باتیں اُن کو سکھائے اور اُن کے نفوس کا تزکیہ کرے اِس دعائے ابراہیمی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ رسول مکہ میں آئیگا اور مکہ کے رہنے والوں سے سب سے پہلے کلام کرے گا اگر مکہ آباد نہ ہوتا تو وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُوْلًا کی دعا کس طرح پوری ہوتی اور وہ کون سے لوگ تھے جن میں یہ رسول مبعوث ہوتا۔ اِسی طرح ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ وہ انہیں کتاب اور حکمت سکھائے۔ اگر مکہ آباد نہ ہوتا تو وہ کون لوگ تھے جنکو کتاب اور حکمت سکھائی جاتی۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا کہ وہ رسول اُن کو پاک کرے گا مگر وہاں کوئی آدمی ہی نہ ہوتا تو اُس رسول نے پاک کن کو کرنا تھا وہ تو خس کم جہاں پاک کا پہلے ہی مصداق بن چکے تھے۔ اگر مکہ آباد نہ ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو یہ چار دعائیں کی تھیں اِن میں سے ایک بھی پوری نہ ہو سکتی۔ پس یہ اتفاق نہیں تھا بلکہ جو کچھ ہؤا الٰہی سکیم اور اُس کے منشاء کے مطابق ہؤا۔ دشمن کہہ سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ جھوٹا دعویٰ کر دیا مگر اِس امر کو کون اتفاق کہہ سکتا ہے کہ دو ہزار سال تک ایک قوم اِدھر اُدھر بھٹکتی پھرتی ہے۔ وہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کی تمام پیشگوئیوں کو فراموش کر دیتی ہے مگر جب زمانہ محمدی قریب آتا ہے تو یکدم اُس قوم میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے۔ وہ کہتی ہے ہم سے یہ کیا بے وقوفی ہوئی کہ ہم اِدھر اُدھر پھرتے رہے ہمارے دادا نے تو ہم سے کہا تھا کہ مکہ میں رہو اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ ہمارے دادا نے تو کہا تھا کہ تمہاری تمام ترقی مکہ میں رہنے سے وابستہ ہے مگر ہم کہیں کے کہیں پھرتے رہے۔ اور وہ پھر مکہ میں آکر بس جاتی ہے۔ اِس لئے نہیں

کہ مکہ میں کوئی کارخانہ کھل گیا تھا، اس لئے نہیں کہ وہاں تجارتیں اچھی ہوتی تھیں، اس لئے نہیں کہ وہاں زراعت اچھی تھی بلکہ صرف اس لئے کہ ابراہیمؑ نے اُنہیں ایک بات کہی تھی اور وہ اُس پر عمل کرنے کے لئے وہاں اکٹھے ہو گئے۔ پس یہ اتفاق نہیں بلکہ جو کچھ ہوا اللہ تعالیٰ کے منشا اور اُس کے ازلی فیصلہ کے مطابق ہوا۔

پھر میرے نزدیک بالکل ممکن ہے کہ اس اجتماع میں یہودی اور نصرانی روایات کا بھی دخل ہو کیونکہ قوم کو دوبارہ بسانے والے قصیؔ تھے جن کے تعلقات نصاریٰ اور یہود سے تھے۔ تعجب نہیں کہ جب یہودیوں اور عیسائیوں میں یہ چرچے شروع ہوئے ہوں کہ نبی موعود کی آمد کا وقت قریب ہے اور یہود و نصاریٰ کے علماء سے اُنہوں نے یہ سُنا ہو کہ موعود نبی عرب میں ظاہر ہونے والا ہے تو اپنی قومی روایات کو ملا کر انہوں نے یہ نتیجہ نکالا ہو کہ اگر یہ موعود نبی عرب میں آیا تو پھر مکہ میں ہی آئے گا اور اس طرح اُن کے دل میں یہ احساس پیدا ہُوا ہو کہ جب ہمارے لئے خدا تعالیٰ یہ نعمت ظاہر کرنے والا ہے تو کیوں نہ ہم اُس سے فائدہ اُٹھائیں اور اپنی قوم کو وہاں لے جا کر بٹھا دیں۔ تاکہ جب نبی عرب کے ظہور کا وقت آئے تو ہماری قوم اُس پر ایمان لا کر اللہ تعالیٰ کی برکات حاصل کرے جیسا کہ مدینہ والوں نے کیا کہ انہوں نے یہودیوں سے آنے والے نبی کے متعلق باتیں سُنیں اور انہی باتوں کے نتیجہ میں وہ رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے۔ چنانچہ تاریخ میں مذکور ہے کہ جب رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ کیا اور آپ کی قوم نے آپ کی مخالفت شروع کی تو ایک دفعہ مدینہ سے چند افراد حج کے لئے مکہ میں آئے۔ رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم حج کے دنوں میں ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور کہتے کہ میں تمہیں خدا کا یہ پیغام پہنچاتا ہوں کہ تم شرک کو چھوڑ دو خدائے واحد کی پرستش کرو اور اخلاقِ فاضلہ اپنے اندر پیدا کرو۔ جب آپ یہ باتیں کہتے تو باہر سے آئے ہوئے لوگ قہقہہ مار کر اور ایک دوسرے کی طرف آنکھیں مٹکا مٹکا کر دیکھتے اور یہ کہتے ہوئے کہ معلوم ہوتا ہے یہ وہی مکّہ کا پاگل ہے" مُنہ پھیر کر چلے جاتے۔ روحانی نقطۂ نگاہ کو مدنظر رکھا جائے تو اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا کی نجات کے لئے آپ پاگل ہو رہے تھے۔ آپ کے دل میں درد تھا کہ کسی طرح یہ دنیا ہلاکت اور تباہی کے راستوں سے بچ جائے۔ اِن معنوں کے لحاظ سے اگر کوئی شخص آپ کو پاگل کہتا ہے تو ہم اُسے کہیں گے خدا کرے ایسے پاگل دنیا میں اور بھی پیدا ہوں کیونکہ اِن معنوں کا پاگل بڑی قیمتی چیز ہے۔ لیکن وہ لوگ جو کچھ کہتے مخالفت اور عناد کے نتیجہ میں کہتے اور وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں سننے سے انکار کر دیتے لیکن باوجود اِس کے آپ مایوس نہ ہوتے اور حج کے دنوں میں آپ ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے۔ ایک سال مدینہ کے کچھ لوگ جو حج کے لئے آئے ہوئے تھے آپ نے اُن کو تبلیغ شروع کی۔ اُن کے دلوں میں کچھ شرافت تھی۔ کچھ یہودیوں سے بھی انہوں نے باتیں سُنی ہوئی تھیں جب ایک جگہ کھڑے ہو کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُنہیں تبلیغ کی تو اُنہوں نے آپ سے کہا آئیے ہم ایک طرف کنارے پر بیٹھ کر آپ کی باتیں سُنیں۔ چنانچہ سب ایک طرف بیٹھ گئے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُنہیں اپنا پیغام پہنچانا شروع کیا۔ کچھ دیر سُننے کے بعد انہوں نے کہا ہمارے شہر میں کچھ یہودی بستے ہیں اور چونکہ ہم زیادہ ہیں اور وہ تھوڑے ہیں اور معاملات میں ہمارا پہلو غالب رہتا ہے وہ ہمیشہ ہم سے کہا کرتے ہیں کہ آج کل اِس ملک میں ایک بہت بڑا نبی ظاہر ہونے والا ہے اُس کے ذریعہ ہم لوگ تم پر غالب آ جائیں گے لیکن اُس نے ہم میں سے آنا ہے اور مدینہ میں آنا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم مدینہ میں آبسے ہیں۔ جب وہ وقت آئے گا ہم اُس کے ذریعہ سے پھر ترقی کریں گے۔ مگر ہمیں تو آپ کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی جس کے متعلق یہودی یہ

سمجھتے تھے کہ اُن میں سے آنے والا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم میں سے آنا تھا۔ ہمیں آپ کی باتیں سچی نظر آتی ہیں اور جو علامتیں یہودیوں نے ہمیں بتائی تھیں وہ آپ میں پوری ہوتی نظر آتی ہیں مگر یہ بھی ڈر ہے کہ اگر ہم نے اس بارہ میں کوئی فیصلہ کیا تو قوم میں جوش پیدا نہ ہو جائے۔ اور وہ یہ نہ سمجھے کہ آپ تو غلطی سے مان آئے ہیں اب ہمیں بھی غلطی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم اپنی قوم کے سامنے یہ باتیں رکھیں اور پھر اگر خدا انہیں اور ہمیں توفیق دے تو آپ پر ایمان لے آئیں۔ رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھی بات ہے چنانچہ وہ لوگ گئے اور انہوں نے اپنی قوم کو یہ تمام باتیں بتائیں چونکہ وہ لوگ آنے والے نبی کے متعلق یہودیوں سے مختلف باتیں سنتے رہتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے سال مدینہ کے ۱۲ آدمی رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہ آپ پر ایمان لے آئے۔ اس طرح اسلام مکہ سے مدینہ جا پہنچا۔ میں سمجھتا ہوں اسی طرح بالکل ممکن ہے قصی بن حکیم نے بھی یہودی علماء اور نصاریٰ سے اس قسم کی باتیں سُنی ہوئی ہوں اور اُن کے دل میں یہ خیال آیا ہو کہ خدا تو ہمارے گھر میں نبوت کا چشمہ پھوڑنے والا ہے اور ہم اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں اور اسی بنا پر انہوں نے اپنی قوم کو یہ نصیحت کی ہو کہ آؤ اور مکہ میں اکٹھے ہو جاؤ تا کہ آنے والے ظہور سے فائدہ اُٹھا سکو۔

میں نے اُوپر کہا تھا کہ خدا کی انگلی نے اُنہیں اشارہ کیا اور وہ مکہ میں جمع ہو گئے۔ لیکن اب میں کہہ رہا ہوں کہ انہوں نے یہود اور نصاریٰ سے آنے والے نبی کی باتیں سُنیں اور جب اُنہیں معلوم ہوا کہ عرب میں ایک نبی آنے والا ہے تو اپنی قومی روایات اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وعدے ملا کر انہوں نے یہ نتیجہ نکال لیا ہو کہ وہ نبی مکہ میں پیدا ہونے والا ہے۔ بظاہر ان دونوں میں اختلاف نظر آتا ہے لیکن درحقیقت کوئی اختلاف نہیں۔ اِس لئے کہ اگر انہوں نے یہود اور نصاریٰ سے سُن کر ایسا کیا تب بھی یہود اور نصاریٰ نے جو کچھ بتایا وہ خدائی پیشگوئیاں تھیں اور خدائی پیشگوئیاں بھی قدرت کی انگلی ہوتی ہیں جو بنی نوع انسان کی راہنمائی کرتی ہیں۔ اور اگر انہوں نے اِن پیشگوئیوں کو نہیں سُنا تب بھی یہ خدائی انگلی اور اُس کی قدرت کا ایک زبردست ہاتھ تھا کہ جس بات کا اُنہیں دو ہزار سال تک خیال نہ آیا وہ نبیٔ عرب کے ظہور سے سوا دو سو سال پہلے اُنہیں یاد آگئی اور ایسی یاد آئی کہ ہزاروں تکالیف کے باوجود وہ مکہ میں آکر بس گئے۔ پس اگر وہ یہود و نصاریٰ کی باتیں سُنکر آتے تب بھی اور اگر وہ خود بخود آتے تب بھی، جو کچھ ہوا قدرت کے اشارہ کے ماتحت ہوا اور اس طرح اپنی قوم کو وہاں جمع کر کے وہ خدائی تدبیر کا آلۂ کار بن گئے۔

پھر ہاشم کے زمانہ میں شام اور یمن کی طرف تجارتی قافلے جاری کرنے کی سکیم بھی اسی الٰہی تدبیر کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے۔ یمن میں اُس وقت مسیحیت پھیلنی شروع ہو گئی تھی اور شام میں تو مسیحیت غالب آ چکی تھی۔ شام سے بھاگ کر یہودی شمالی عرب میں آ گئے تھے۔ اسی طرح وہ یمن میں بھی چلے گئے تھے۔ چنانچہ میں اوپر بتا چکا ہوں کہ یمن کا ایک حمیری بادشاہ جس نے بیس ہزار عیسائیوں کو زندہ جلا دیا تھا اُس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ یہودی ہو گیا تھا یا یہودیوں کی طرف مائل تھا۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ یہودی شام سے بھاگ کر یمن میں چلے گئے تھے اور یہی قومیں تھیں جنہوں نے آئندہ زمانہ میں اسلام سے ٹکر لینی تھی۔ چنانچہ پہلے یمن کا واقعہ ہوا یعنی ابرہہ وہاں سے آیا اور اُس نے خانہ کعبہ پر حملہ کیا۔ اِس کے بعد جب اسلام پھیلا تو شام کے عیسائیوں نے اسلام سے مقابلہ شروع کر دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال حکمت کے ماتحت یہود اور نصاریٰ کے حالات سے مکہ والوں کو باخبر رکھنے کے لئے یہ شتاء و صیف کے سفر تجویز کرا دئے۔ روزی کمانا اور چیز ہے مگر اس غرض کیلئے وہ خاص ملکوں کو

چُن لینا اَور چیز ہے۔ ورنہ ہاشم بن عبد مناف اُن کو یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ تجارتیں کیا کرو۔ مگر اُن کا ایسی سکیم بنانا جس سے مکّہ والوں کا یمن اور شام سے تعلق پیدا ہو جائے اور پھر اللہ تعالیٰ کا اس سورۃ کو اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ کے بعد رکھنا صاف بتاتا ہے کہ یہ جو کچھ ہوا الٰہی سکیم کے ماتحت ہوا۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ اُنہیں اِس طریق پر کام کرنے کے نتیجہ میں روزی بھی مل جائے اور اُنہیں شام اور یمن کے حالات بھی معلوم ہوتے رہیں جن سے کسی زمانہ میں اُن کی ٹکر ہونی تھی چنانچہ جیساکہ میں بتا چکا ہوں اِن میں سے ایک کی ٹکر اسلام کی بعثت سے پہلے ہوئی اور ایک کی ٹکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ہوئی۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یمن اور شام میں عیسائی رہتے تھے اور عیسائیوں سے بڑی کثرت کے ساتھ اُنہیں ایسی خبریں مل سکتی تھیں جن میں آنے والے موعود کی خبر دی گئی تھی یا اسی طرح یہود بھی اِن مقامات پر رہتے تھے اور اُن سے بھی آنے والے ظہور کے متعلق بہت سی خبریں معلوم ہو سکتی تھیں۔ پس اِن دونوں سفروں سے مکہ والوں کو یہودیوں اور مسیحیوں سے میل ملاپ کا موقعہ ملتا تھا اور پُرانے وعدے اِس اَن پڑھ قوم کے دلوں میں تازہ ہوتے رہتے تھے اور اس طرح اُن کی توجہ زیادہ سے زیادہ خانہ کعبہ سے تعلق رکھنے والے مامور کی طرف پھرتی تھی۔

یہ لازمی بات ہے کہ جن لوگوں کے کانوں میں متواتر اِس قسم کی باتیں پڑتی رہیں اُن پر ایک قسم کا رُعب پڑ جاتا ہے اور وہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ کوئی بات ضرور ہے۔ چنانچہ جب وہ یہود اور نصاریٰ سے متواتر اس قسم کی باتیں سُنتے تو وہ بھی یہ سمجھنے لگ جاتے کہ اب ضرور کسی نے آنا ہے اور اس طرح اُن کی باتوں سے اُن کے دلوں پر ایک چوٹ لگتی۔ اُن کے کفر پر ایک کاری ضرب لگتی اور اُنکی بے دینی کی دیوار میں شگاف پڑ جاتا۔ وہ جوں جوں سفر کرتے آنیوالے ظہور کے متعلق متواتر یہود اور نصاریٰ سے پیشگوئیاں سُنتے اور پھر وہ اِن پیشگوئیوں کو مکّہ میں آکر بیان کرتے اِس طرح ساری قوم میں ایک حرکت سی پیدا ہو گئی اور اُن میں بھی ایک نبی کی آمد کا احساس شروع ہو گیا۔ دوسری طرف اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب شام اور یمن میں مکّہ والے جاتے تو یہودی اور عیسائی بھی سمجھتے کہ ہمیں مکّہ والوں کی طرف سے خطرہ ہے اِن کے مقابلہ کے لئے ہمیں ہوشیار ہو جانا چاہیئے کیونکہ پیشگوئیاں سب عرب کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

غرض سفر شتاء و صیف کے اِن سفروں میں ایک بہت بڑی غرض اللہ تعالیٰ نے یہ مخفی رکھی ہوئی تھی کہ مکّہ کے لوگ یہود و نصاریٰ سے بار بار ملیں اور آنے والے نبی کے متعلق اُن سے پیشگوئیاں سنتے رہیں تاکہ جب اُس نبی کا ظہور ہو اُس پر ایمان لانا اُن کے لئے آسان ہو۔ چنانچہ میں بتا چکا ہوں کہ مدینہ کے لوگوں کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی توفیق محض یہود سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ہی ملی۔ اللہ تعالیٰ بھی قرآن کریم میں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے وَ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ یَسۡتَفۡتِحُوۡنَ عَلَی الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا (بقرہ ع۱۱) یعنی آج یہودی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا انکار کر رہے ہیں مگر پہلے یہی یہود عربوں کو بتایا کرتے تھے کہ عنقریب ایک نبی آنے والا ہے جس کے ذریعہ ہمیں اپنے دشمنوں پر فتح حاصل ہو گی۔ پس اِس شمال و جنوب کے سفر کی وجہ سے مکّہ کے اَن پڑھ لوگ یہود و نصاریٰ کے علماء سے ملتے اور اُن کی آراء سے جو وہ آخری نبی کے بارہ میں رکھتے تھے واقف رہتے چنانچہ اس کا ثبوت اِس امر سے بھی ملتا ہے کہ احادیث میں آتا ہے حضرت ابو طالب جب اپنے ساتھ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو شام کے سفر پر لے گئے تو وہاں ایک پادری نے آپکو دیکھ کر کہا کہ اِس بچے کی خاص نگرانی کرنا اِس میں ایسی علامات پائی جاتی ہیں شاید یہ بہت بڑا انسان ثابت ہو اور شاید عرب کے بارہ میں جو الہامی کلام ہے وہ اِسی کے ذریعہ سے پورا ہو۔

اِسی قسم کی باتیں کہ وہ اِن سفروں میں متواتر سُنتے رہتے تھے اور اِنہی باتوں کو اللہ تعالےٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں ابتدائی دَور چلانے کا ایک ذریعہ بنانا چاہتا تھا۔ پس یہ دونوں سفر درحقیقت اللہ تعالےٰ کی ایک حکمت کے ماتحت تھے۔ ورنہ وہ قوم جس میں الہام نہیں پایا جاتا تھا، جس کے پاس کوئی شریعت نہیں تھی، جو متمدن علاقوں سے بہت دُور رہنے والی تھی اُس کے لئے یہ کتنی مشکل بات تھی کہ وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کو سُنکر آپ پر ایمان لے آتی۔ مگر اِن سفروں کے نتیجہ میں جب وہ لوگ متواتر یہودیوں اور عیسائیوں سے اِس قسم کی باتیں سُنتے تو اُن کا اپنا عقیدہ کمزور ہو جاتا اور وہ سمجھتے کہ شاید کچھ بات ہو اور شاید کوئی آنے والا ہم میں آ ہی جائے پس یہ دونوں سفر اللہ تعالےٰ کی ایک بہت بڑی حکمت کے ماتحت تھے۔ یہی وجہ ہے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ اِن کی حالت پر تعجب کرو کہ کس طرح یہ قوم جو مکہ میں آلسی تھی جو بھوکی مر جاتی تھی مگر مکہ سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتی تھی اب باقاعدہ جس طرح نماز فرض ہوتی ہے، سردی آتی ہے تو یمن کی طرف چل پڑتے ہیں گرمی آتی ہے تو شام کی طرف چل پڑتے ہیں۔ یہ سفروں کی محبت اُن کے دلوں میں آخر کس نے پیدا کی ہے صرف ہم نے پیدا کی ہے مگر یہ مکہ میں بیٹھے رہتے تو اِن کو کچھ بھی پتہ نہ چلتا کہ ہمنے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیا کیا پیشگوئیاں کی ہوئی ہیں مگر اب اُن کے دلوں میں اِن سفروں کی ایسی محبت پیدا کر دیگئی ہے کہ یہ نہایت باقاعدگی کے ساتھ گرمیوں میں شام کا اور سردیوں میں یمن کا سفر کرتے ہیں یمن میں جاتے ہیں تو وہاں کے لوگوں سے اِس قسم کی باتیں سنتے ہیں کہ ایک نبی آنیوالا ہے اور شاید وہ عرب سے ہی پیدا ہو۔ شام میں جاتے ہیں تو وہاں کے لوگوں سے سنتے ہیں کہ ایک نبی آنے والا ہے اور شاید وہ عرب سے ہی پیدا ہو۔ اِس طرح اُن کے کانوں کو ہم نے اُن پیشگوئیوں کا آشنا رکھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے متعلق تھیں تاکہ آپ کے دعویٰ کو سُنتے ہی وہ یکدم انکار نہ کر دیں اور واقعہ میں مکہ والوں کو کلامِ الٰہی سے جتنا

بُعد تھا اُس کو دیکھتے ہوئے یہ کتنا مشکل تھا کہ وہ رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی آواز سُنکر آپ پر ایمان لاسکتے۔ یہ اُنہی پیشگوئیوں کے سُننے کا نتیجہ تھا کہ جب رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ فرمایا تو مکہ میں سے ہی کچھ لوگ ایسے کھڑے ہو گئے جو فوراً آپ پر ایمان لے آئے چنانچہ جس دن رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ فرمایا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مکہ میں نہیں تھے بلکہ مکہ سے کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو چونکہ سخت گرمی کا موسم تھا ایک دوست کے ہاں دوپہر کے وقت کچھ سستانے کیلئے ٹھہرے وہ ابھی لیٹے نہیں تھے کہ اُن کے دوست کی لونڈی سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ کہنے لگی۔ ہائے ہائے بیچارہ اس کا دوست تو پاگل ہو گیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اِدھر اُدھر دیکھا اور سمجھا کہ یہ الفاظ شاید میرے متعلق ہی کہے گئے ہیں چنانچہ اُنہوں نے اُس سے پوچھا کہ کون دوست؟ اُس نے کہا تمہارا دوست محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کیا ہُوا؟ وہ لونڈی کہنے لگی وہ کہتا ہے میرے ساتھ فرشتے باتیں کرتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ اُس وقت لیٹنے ہی لگے تھے کہ یہ بات سُن کر آپ نے چادر سنبھالی اور دوست سے کہا میں اب جاتا ہوں۔ اُس نے کہا ذرا ٹھہریں سخت گرمی کا وقت ہے آپ کو اس وقت جانے سے تکلیف ہوگی۔ انہوں نے کہا نہیں اب میں ٹھہر نہیں سکتا۔ چنانچہ وہ سیدھے رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم آپ کی آواز سُن کر تشریف لائے اور دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی حضرت ابوبکرؓ نے کہا میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں آپ بتائیں کہ کیا آپ یہ کہتے ہیں کہ خدا کے فرشتے آپ پر نازل ہوتے ہیں اور وہ آپ سے باتیں کرتے ہیں؟ رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ خیال فرماتے ہوئے کہ یہ میرے دوست ہیں اور ان سے میرے پُرانے تعلقات چلے آرہے ہیں ایسا نہ ہو کہ ٹھوکر کھا جائیں مناسب سمجھا کہ پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کچھ

سمجھالیں چنانچہ آپ نے فرمایا ابوبکر پہلے میری بات سُن لو بات یہ ہے کہ ـــ حضرت ابوبکرؓ نے اُسی وقت آپ کے سلسلۂ کلام کو منقطع کرتے ہوئے کہا۔ میں آپ سے کوئی بات نہیں پوچھتا آپ صرف یہ بتائیں کہ کیا آپ نے کہا ہے کہ خدا کے فرشتے مجھ پر نازل ہوتے ہیں اور وہ مجھ سے باتیں کرتے ہیں؟ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جواب دینے سے قبل پھر فرمایا۔ ابوبکر بات تو سُن لو۔ آپ نے خیال فرمایا کہ اگر یکدم میں نے کچھ جواب دیا تو ممکن ہے یہ ٹھوکر کھا جائیں اس لئے تمہیداً میں اِن سے چند باتیں کہہ لُوں۔ مگر ابوبکرؓ نے کہا نہیں میں آپ کو خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ آپ مجھے کوئی اَور بات نہ بتائیں مجھے صرف یہ بتائیں کہ کیا آپ نے یہ کہا ہے کہ خدا کے فرشتے مجھ پر نازل ہوتے ہیں؟ جب انہوں نے آپ کو اللہ تعالےٰ کی قسم دی اور اصرار کیا کہ مجھے کوئی اور بات نہ بتائی جائے صرف میری بات کا جواب دیا جائے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے اَور کوئی چارۂ کار نہ رہا اور آپ نے فرمایا ابوبکر ٹھیک ہے میں نے کہا ہے کہ خدا کے فرشتے مجھ پر نازل ہوتے اور مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ اِس بات کو سنتے ہی حضرت ابوبکرؓ نے کہا پھر آپ گواہ رہیں کہ میں آپ پر ایمان لاتا ہوں اور فرمایا یا رسول اللہ! آپ دلیلیں دے کر میرا ایمان خراب کرنا چاہتے تھے۔ میں نے آپ کے چال چلن اور طور طریق کو مدتوں سے دیکھا ہوا ہے اِس کے بعد آپکی صداقت کے متعلق میرے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ پس میں کسی دلیل کی وجہ سے نہیں بلکہ خود آپ کی وجہ سے آپ پر ایمان لاتا ہوں۔ یہ کیا چیز تھی جس نے ابوبکرؓ کو یکدم ایمان لانے پر آمادہ کر دیا۔ یہ اُنہی باتوں کا نتیجہ تھا جو مکہ والوں نے یہودیوں اور عیسائیوں سے متواتر سُنی ہوئی تھیں ورنہ مکہ والے اِن پیشگوئیوں کو کیا جانتے تھے اگر وہ شام اور یمن کے سفروں پر نہ جاتے، اگر وہ آنے والے نبی کے متعلق اُن سے بار بار پیشگوئیاں نہ سُنتے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا دعوئ نبوت مکہ والوں کے لئے ایک ایسی غیر معمولی چیز تھی کہ شاید ابوبکرؓ جیسا انسان بھی آپ کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوتا مگر چونکہ متواتر اُن کے کانوں میں یہ آوازیں پڑی ہوئی تھیں کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا تعالےٰ سے ہمکلامی کا دعویٰ کرتے ہیں، دُنیا میں ایسے مذاہب بھی ہیں جو خدا تعالےٰ کی طرف سے پیشگوئیاں کرتے ہیں۔ پھر اُنہوں نے مخصوص طور پر عرب کے متعلق یہود اور نصاریٰ سے یہ خبریں سُنی ہوئی تھیں کہ عرب میں ایک نبی آنے والا ہے اَور اِن باتوں سے اُن کے کان پوری طرح آشنا تھے اِس لئے اِن باتوں نے اُن کیلئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا راستہ کھول دیا۔ پس مکہ والوں کے یمن اور شام کے سفر درحقیقت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کیلئے بطور ارہاص تھے اور اس ذریعہ سے وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے لئے تیار کئے جا رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ کے معاً بعد خدا تعالےٰ نے سورۂ ایلاف کو رکھا ہے ؛

تفسیر ۔ چونکہ بسم اللہ کے بعد کی دونوں آیتیں درحقیقت ایک مضمون پر مشتمل ہیں اِس لئے اِن دونوں کی تفسیر اکٹھی ہی کی جانی مناسب ہے ۔ چنانچہ میں اِن دونوں آیات کی تفسیر یکجائی طور پر بیان کرتا ہوں :-

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۔ جو معانی میں اُوپر بیان کر چکا ہوں ۔ اُن کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ مختلف محذوفات کی وجہ سے جو لام سے پہلے نکالے گئے ہیں اور ایلاف کے مختلف معنوں کی وجہ سے اِس آیت کے کئی معنے ہوں گے ۔ جو قریباً ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والے ہوں گے ۔ پہلا مطلب اِس کا یہ ہوا کہ ہم نے قریش کے دل میں سردی گرمی کے دونوں سفروں کی محبت پیدا کرنے کے لئے ابرہہ کے لشکر کو تباہ کر دیا اور اُنہیں بھوسے کی طرح

مٹا دیا۔ اِس میں جیسا کہ مَیں بتا چکا ہوں اِس طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالےٰ اِن دونوں سفروں کو قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اِن معنوں کے رُو سے خدا تعالےٰ کا زور دونوں سفروں کے قیام پر ہے یعنی دونوں سفروں کا قیام الٰہی سکیموں کا ایک حصہ تھا۔ اور چونکہ الٰہی حکمت چاہتی تھی کہ یہ دونوں سفر قائم رہیں اِس لئے اُس نے ابرہہ کے لشکر کو تباہ کر دیا مگر میں بتا چکا ہوں کہ اِس کے یہ معنے نہیں کہ "اِسی لئے" تباہ کیا بلکہ 'اس لئے' کے معنے ہیں۔ اور 'اِس لئے' اور 'اِسی لئے' میں فرق ہوتا ہے۔ 'اِسی لئے' کے معنے ہوتے ہیں کہ یہی اصل مقصد تھا۔ مگر 'اِس لئے' کے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مختلف وجوہ میں سے یہ بھی ایک وجہ تھی جیسا کہ مَیں پہلے بیان کر چکا ہوں اِس تباہی کے کئی اسباب تھے۔ جن میں سے ایک یہ بھی تھا۔ پس یہاں ہم "اِس لئے" کہیں گے نہ کہ "اِسی لئے"۔

مَیں نے بتایا ہے کہ اُن کے سردی گرمی کے سفروں کے قیام کی بڑی وجہ یہ تھی کہ رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے آنے کی پیشگوئیاں یہودیوں اور عیسائیوں میں تو محفوظ تھیں لیکن حضرت ابراہیمؑ کی پیشگوئیاں مکّہ میں محفوظ نہیں تھیں۔ مکّہ والے اِمتدادِ زمانہ کی وجہ سے اُن پیشگوئیوں کا اکثر حصہ بھول چکے تھے۔ اِس لئے ضروری تھا کہ انکو وہ پیشگوئیاں دوسری قوموں کے ذریعہ سے یاد کروائی جائیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام شرعی نبی نہیں تھے بلکہ وہ ایک دوسرے نبی کے تابع تھے شریعت لانے والے نبی حضرت نوح علیہ السلام تھے۔ دوسرے ملکوں میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے جو شریعتیں آئیں وہ الگ ہیں اُن کا یہاں ذکر نہیں۔ لیکن بنی اسرائیل کی نسل جن قوموں سے براہِ راست چلتی تھی اُن میں حضرت نوح علیہ السلام شریعت لانیوالے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اُن کی شریعت کے تابع تھے جس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شریعت لانے والے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُن کی شریعت کے تابع تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنے سلسلہ کے پہلے نبی تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اُنکے سلسلہ کے آخری نبی تھے۔ جس طرح کہ بنی اسرائیل کے سلسلہ کے حضرت موسیٰ علیہ السلام پہلے نبی تھے اور حضرت عیسےٰ علیہ السلام آخری نبی تھے۔ اِسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآنِ کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ (صافات عٓ) نوحؑ کی جماعت میں سے ابراہیمؑ تھے یعنی وہ علیحدہ نبی نہیں تھے بلکہ وہ اِسی سلسلہ کی ایک کڑی تھے۔ گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نوحی سلسلہ کے ایک نبی تھے اور چونکہ وہ نوحی سلسلہ کے ایک نبی تھے اِس لئے کوئی علیحدہ شریعت نہیں لائے۔ چنانچہ بائیبل پڑھ کر دیکھ لو صاف پتہ لگتا ہے کہ اُن کی کوئی شریعت نہیں تھی۔ لیکن جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر آتا ہے وہاں شریعت کا بھی ذکر آجاتا ہے۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ شرعی نبی نہیں تھے اُن کے زمانہ میں نوحؑ کی شریعت پر ہی عمل ہوتا تھا۔ اِس کے بعد بنو اسمٰعیل اور بنو اسحاق میں سے پہلے بنو اسحاقؑ میں نبوت آئی۔ باوجود اس کے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چھوٹے بیٹے تھے اور بنو اسمٰعیل میں بعد میں آئی۔ اِس لئے کہ آخری نبی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہونا تھا اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ مقدر تھا کہ وہ بنو اسمٰعیل میں سے آئیں گے۔ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اُن کے دونوں بیٹوں کی نسلوں کے متعلق یہ وعدے تھے کہ اُن میں نبی بھی آئیں گے اور بادشاہ بھی ہونگے اب اگر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے سلسلہ میں نبوت پہلے آجاتی تو بنو اسحاق کے متعلق جو الٰہی وعدے تھے وہ پورے نہ ہو سکتے کیونکہ خاتم النبیین کے بعد تو کوئی نیا سلسلہ شروع نہیں ہو سکتا تھا اِس لئے پہلے اسحاق کا سلسلہ جاری کیا گیا تاکہ جب یہ ختم ہو جائے تو پھر اسمٰعیل کا سلسلہ شروع ہو کیونکہ اسمٰعیلی نبی نے خاتم النبیین کی صورت میں ظاہر ہونا تھا۔ بنو اسحاق کے سلسلہ میں مختلف تاریخوں کے

لحاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آٹھ سو سال بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام آتے ہیں یا بعض لوگ چھ سو سال کا اندازہ بتلاتے ہیں۔ یہ متفرق اندازے ہیں جن کو مدِنظر رکھتے ہوئے چار سو سال سے آٹھ سو سال گذرنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے۔ اب اگر ہم اس امر کو مدِنظر رکھیں کہ حضرت عیسیٰؑ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے درمیان چھ سو سال کا عرصہ گذرا ہے تو اسی پر قیاس کر کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان بھی چھ سو سال کا فاصلہ ہوگا اور اسی پر قیاس کر کے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام میں بھی چودہ سو سال کا فاصلہ ہوگا جس طرح حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں چودہ سو سال کا فاصلہ ہے۔ بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چھ سو سال بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے۔ اِس عرصہ میں نوحؑ کی شریعت تو جاری رہی مگر جب مٹتے مٹتے بالکل مٹ گئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ ایک نئی شریعت بنی اسرائیل کے لئے آگئی۔ مگر اُن کا موعود چونکہ خاتم النبیین تھا جس نے موسوی سلسلہ کے ختم ہونے پر آنا تھا نتیجہ یہ ہُوا کہ بنو اسحاق میں تو شریعت کا دوبارہ اجراء ہوگیا اور وہ قوم اُس سے غافل نہ ہوئی مگر بنو اسمٰعیل میں چونکہ شریعت نہ آئی اِس لئے وہ کمزور ہوتے ہوتے ایسی حالت تک پہنچ گئے کہ اُن میں سے شریعت بالکل مٹ گئی۔ وہ جنگلوں میں رہتے تھے۔ غیر ملکوں سے اُن کے کوئی تعلقات نہ تھے۔ وہ پڑھے لکھے بھی نہیں تھے اور کتابت کا فن بھی اُن میں بالکل مفقود تھا اور اس بارہ میں اتنی کمزوری تھی کہ پڑھنے لکھنے والے عرب میں کوئی قابلِ قدر وجود نہیں سمجھے جاتے تھے۔ سارے مکہ میں صرف سات آدمی تھے جو پڑھے لکھے تھے۔ گو اِس بارہ میں روایتوں میں اختلاف ہے بعض پانچ کہتے ہیں، بعض سات کہتے ہیں، بعض گیارہ کہتے ہیں۔ مگر مکہ پندرہ بیس ہزار کا شہر تھا اس میں پانچ سات یا گیارہ کیا حیثیت رکھتے تھے۔ پھر جن کو پڑھنا آتا تھا اُن کو بھی اُن کی قوم نے پڑھنے کی اِس لئے اجازت دی تھی تاکہ مختلف حکومتوں اور ریاستوں سے خط و کتابت کرنی پڑے تو اُن سے کام لیا جا سکے یا معاہدات لکھنے ہوں تو وہ لکھ سکیں گویا قومی ضرورت کے ماتحت اُنکو اجازت دی جاتی تھی کہ وہ پڑھ لیں۔ ورنہ یُوں وہ یہی سمجھتے تھے کہ پڑھنا لکھنا کوئی اچھا کام نہیں اور اس کی وجہ اُن کا یہ خیال تھا کہ پڑھنے سے حافظہ کمزور ہو جاتا ہے اور یہ بات ایک حد تک ٹھیک بھی ہے۔ پڑھنے کی وجہ سے حفظ کرنے کا شوق کم ہو جاتا ہے۔ دراصل عربوں میں علمِ ادب کا بڑا شوق تھا۔ اور گو وہ پڑھتے نہیں تھے مگر ہزاروں ہزار شعر حفظ کر لیا کرتے تھے۔ پس یہ تو ضرور فائدہ تھا مگر کم سے کم جو ضروری ریکارڈ محفوظ کرنا ہوتا تھا اُسے بھی وہ تعلیم کے فقدان کی وجہ سے محفوظ نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ نوحؑ کی تعلیم اُن میں بالکل مفقود ہوگئی اور اُن کی حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ انہیں آئندہ نبی کی بعثت کے متعلق ابراہیمی پیشگوئیوں اور اُس کی تفصیلات کا علم نہ رہا۔ اُن میں پیشگوئیاں تو تھیں مگر امتدادِ زمانہ اور پھر جہالت کی وجہ سے رفتہ رفتہ پیشگوئیوں کی تفصیل غائب ہوگئی۔ وہ صرف اِتنا جانتے تھے کہ ہمارے باپ ابراہیمؑ نے ہمیں یہاں بٹھایا ہے اور اِس لئے بٹھایا ہے کہ یہاں بیٹھنے سے ہماری ترقی وابستہ ہے جیسے ہمارے ملک میں سادھو یہ کہا کرتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا نے یہ پیشگوئی کی ہوئی ہے کہ کسی زمانہ میں سارے ہندوستان میں تمہاری حکومت ہو جائے گی۔ مگر اس کے ساتھ کوئی علامتیں نہیں، کوئی آثار نہیں، کوئی تفاصیل نہیں جن سے یہ پتہ لگ سکے کہ یہ پیشگوئی کب پوری ہوگی اور اس کے پورا ہونے کی کیا کیا علامات ہوں گی۔ اسی طرح وہ اتنا تو جانتے تھے کہ ہمیں ہمارے باپ ابراہیم نے یہاں ہماری ترقی کے لئے بٹھایا ہوا ہے مگر نوحؑ اور ابراہیمؑ کی پیشگوئیاں وہ بالکل نہیں جانتے تھے۔ یہ تفصیلات یہود اور عیسائیوں میں موجود تھیں۔

اس لئے اللہ تعالےٰ نے یہ دیکھ کر کہ یہ جاہل بھی ہیں اور اِن میں نوحؑ اور ابراہیمؑ کی تعلیم کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا یہود اور نصاریٰ سے اُن کا تعلق قائم کرنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ ہاشم بن عبد مناف کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ وہ ہر سال مکّہ والوں کے قافلے یمن اور شام میں روانہ کیا کریں تاکہ تجارتی اموال کے ذریعہ اُن کی حالت بھی درست ہو جائے اور یہود و نصاریٰ سے تعلقات پیدا ہو جانے کی وجہ سے محمدی پیشگوئیاں بھی اُن کے سامنے بار بار آتی رہیں۔

دوسرے معنے اس کے یہ بنیں گے کہ اِس امر پہ تعجب کرو کہ کس طرح اللہ تعالےٰ نے قریش کو سردی گرمی کے سفر پر تیار کر دیا یعنی اِن لوگوں کے دلوں میں سفر کی محبت پیدا کر دی۔ اِن معنوں کے رُو سے ایک دوسرے معنوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بے شک اِن معنوں کی اِس طرف بھی اشارہ ہے کہ اِن کو سردی گرمی کے سفر پر تیار کر دیا اور اِس طرح یہ محمدی دین کی طرف مائل ہو گئے۔ مگر ایک اَور حکمت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور وہ یہ کہ ہاشم نے کہا تھا کہ اگر تم سفروں کے لئے نہ نکلے تو تم بھوکے مرو گے اور دوسری قوموں میں ذلیل ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالےٰ اِسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوتے فرماتا ہے کہ اِس سردی گرمی کے سفر کی دراصل ہم نے تدبیر کی تھی اگر یہ سفر نہ ہوتا تو اُن میں ایمان تو تھا ہی نہیں صرف قومی رسم و رواج کی وجہ سے وہ وہاں ٹھہرے ہوتے تھے ممکن تھا کہ اگر وہ اِسی طرح ایک لمبے عرصہ تک بھوکے مرتے چلے جاتے تو تنگ آ کر وہ مکّہ چھوڑ دیتے۔ پس اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ ہم نے انہیں مکّہ میں رکھنے کیلئے یہ تدبیر سکھا دی ورنہ دنیا کی تاریخ پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں قومیں دنیا میں ایسی گذری ہیں جنہوں نے اپنی معاشی ضرورتوں کیلئے جگہیں بدلی ہیں۔ یہی ایریئنز جو آج ہندوستان کے ملک میں پھرتے ہیں تبت وغیرہ علاقوں اور چین کی طرف سے آتے تھے اور پھر یہاں آ کر بس گئے انکا کچھ حصہ اپنے مرکز سے نکلا تو یورپ میں جا کر بس گیا۔ پھر مغلیہ قوموں کو ہی دیکھ لو انہی میں سے کچھ ترکیہ میں جا بسے کچھ فن لینڈ میں جا بسے۔ اِسی طرح ہنگری بھی مغلوں اور ترکوں سے بسا ہوا ہے۔ چین کے اوپر کے علاقوں اور منگولیا وغیرہ میں بھی مغل پائے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض کے نزدیک تو مغلوں کی ابتداء ہی منگولیا سے ہوئی ہے۔ پھر کچھ ہندوستان میں بھی آ گئے۔ یہی حال پٹھانوں کا ہے ہندوستان میں جن کو خان صاحب، خان صاحب کہہ کر پکارا جاتا ہے یہ دراصل روٹی کی تنگی کی وجہ سے ہی افغانستان سے آئے تھے۔ کچھ معاشی حالت درست کرنے کے لئے اور کچھ معاشی مصیبتوں سے بچنے کے لئے۔ اِسی طرح اور ہزاروں قومیں ہیں جو اپنے ملکوں سے نکلیں اور معاشی ضروریات کے لئے دوسرے ملکوں میں جا بسیں۔ عرب لوگ بھی اگر یہ سفر نہ کرتے تو بالکل ممکن تھا کہ معاشی ضروریات اُنہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیتیں کہ وہ مکّہ چھوڑ دیتے۔ بے شک ایک دفعہ قصّی بن کلاب نے اُنہیں وہاں لا کر بسا دیا تھا مگر جن مشکلات کی وجہ سے انہوں نے پہلے مکّہ چھوڑا تھا اُنہی مشکلات کی وجہ سے وہ دوبارہ بھی چھوڑ سکتے تھے۔ جب خدا پر اُنہیں یقین نہ تھا، جب اُس کے نشانات اُن کے سامنے نہ تھے، جب خدا کو وہ جانتے ہی نہیں تھے بلکہ دن رات بُتوں کی پوجا کرتے رہتے تھے تو آخر یہ الٰہی تصرّف نہیں تھا تو اَور کیا تھا کہ باوجود مخالف حالات کے اللہ تعالےٰ نے اُنہیں مکّہ میں سے نکلنے نہیں دیا اور آخر اُن کے گذارہ کے لئے یہ صورت پیدا کر دی کہ اُن کے دل میں تجارتی سفروں کی تحریک پیدا کر دی گئی۔ چنانچہ اُن میں سے کچھ لوگ باہر کمانے کے لئے چلے جاتے اور باقی سب مکّہ میں ہی بیٹھے رہتے، وہ کما کر لاتے اور دوسرے لوگ کھاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے عرصہ میں ہی اُن کی حالت دوسروں سے اچھی ہو گئی۔ یہ سفر بھی کوئی زیادہ لمبا نہیں ہوتا تھا۔ دو تین مہینہ کا سفر ہوتا تھا۔ اِس کے بعد پھر مکّہ میں آ کر رہنا شروع کر دیتے تھے۔ پھر یہ بھی نہیں تھا کہ سارا مکّہ سفر پر چلا جاتا۔ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ قافلہ میں صرف دو تین سو آدمی شامل

ہوا کرتے تھے حالانکہ مکہ کی آبادی پندرہ بیس ہزار تھی۔ اگر جوان مردوں کا اندازہ لگایا جائے تو پندرہ بیس ہزار کی آبادی میں تین چار ہزار جوان ضرور ہوگا اور اگر بوڑھے اور کھولت کے زمانہ والے بھی ملا لئے جائیں تو پانچ چھ ہزار آدمی بنجاتا ہے۔ ان میں سے صرف دو تین سو شام چلا جاتا دو تین سو آدمی یمن چلا جاتا اور باقی سب وہیں رہتے۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ سارے کا سارا مکہ خالی ہو جاتا اور سب یمن یا شام کی طرف چل پڑتے۔ صرف دو تین سو آدمی قافلہ میں جایا کرتے تھے اور جو باقی رہتے وہ اُن لوگوں کی جو عمرہ وغیرہ کے لئے آیا کرتے تھے خدمت کرتے اور اُن کی ضرورتوں کے پورا کرنے کا خیال رکھتے اور اس کا خود حدیثوں سے بھی ثبوت ملتا ہے۔ حدیثوں میں صاف ذکر آتا ہے کہ وہ سارے کے سارے سفر نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ مکہ کے اُمرا کی نسبت احادیث میں آتا ہے اِنَّهُمْ كَانُوا يَشْتُوْنَ بِمَكَّةَ وَيَصِيْفُوْنَ بِالطَّائِفِ (سراج منیر) یہ ابن عباسؓ سے روایت ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ اُمراءِ مکہ سردی کے موسم میں مکہ میں رہتے تھے اور گرمیاں طائف میں گذارتے تھے کیونکہ طائف پہاڑی علاقہ ہے اور اُس میں سردی ہوتی ہے پس یہ سفر صرف چند آدمی کرتے تھے سارے کے سارے اس سفر پر نہیں نکلتے تھے مگر اس قافلہ کی وجہ سے گذارہ سب کو مل جاتا اور وہ خانہ کعبہ کی خدمت میں مشغول رہتے۔

مجھے یاد ہے حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے وقت میں جب میر محمد اسحاق صاحب کی تعلیم کا زمانہ آیا۔ (میر صاحب مجھ سے پونے دو سال چھوٹے تھے) تو ہمارے نانا جان مرحوم نے حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا کہ اسے کیا پڑھایا جائے۔ آپ نے فرمایا اس کو دینی تعلیم دلوائیے۔ ایک بیٹے کو تو آپ نے دنیا پڑھائی ہے اِس کو دینی تعلیم دلوا دیں۔ اس پر نانا جان مرحوم نے اپنی طرف سے یا نانی اماں کی طرف سے کہا کہ پھر تو یہ اپنے بھائی کے ٹکڑوں پر پلیگا۔ جب انہوں نے یہ بات کہی تو حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ نے فرمایا خدا بعض دفعہ ایک شخص کو دوسرے کی خاطر روٹی دیتا ہے آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ اگر یہ دینی خدمت میں مشغول رہا تو اپنے بھائی کے ٹکڑوں پر پلیگا۔ آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ دین کی خدمت کرے گا تو اس کے طفیل اللہ تعالےٰ اس کے بھائی کی روزی میں بھی برکت پیدا کر دے گا۔ پھر آپ نے حضرت ابو ہریرہؓ کا واقعہ سنایا۔ جب وہ اسلام لائے تو اُن کے دل میں شوق پیدا ہوا کہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھوں اور آپکی باتیں سنوں۔ چنانچہ وہ رات دن مسجد میں بیٹھے رہتے تھے تاکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب بھی باہر تشریف لائیں اور کوئی بات کریں تو اُس کے سننے سے محروم نہ رہیں۔ اُنکی روایات کی کثرت کو دیکھ کر بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ بڑے پرانے صحابی تھے حالانکہ وہ پرانے صحابی نہیں بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف تین سال پہلے ایمان لائے تھے مگر روایتیں سب سے زیادہ انہی کی ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ لوگ پرانے پرانے صحابیوں کو نہیں جانتے مگر ابو ہریرہؓ کو جانتے ہیں۔ کیونکہ حدیثوں میں بار بار آتا ہے کہ ابو ہریرہؓ نے یہ کہا ابو ہریرہؓ نے وہ کہا۔ غرض وہ بہت بعد میں اسلام لائے ہیں لیکن اُن کے دل میں دین سیکھنے کا جوش تھا جب وہ ایمان لائے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے متعلق انہوں نے یہ عہد کر لیا کہ چونکہ اور لوگوں نے آپکی بہت سی باتیں سُن لی ہیں اور مجھے آخر میں ایمان لانیکی توفیق ملی ہے اس لئے میں اب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ چنانچہ جس طرح قریش مکہ میں آکر بیٹھ گئے تھے وہ بھی مسجد میں آکر بیٹھ گئے اور انہوں نے عہد کیا کہ جس طرح بھی ہو سکا میں دین کی خدمت کروں گا دنیا کا کوئی کام نہیں کروں گا۔ اِن کا ایک بھائی بھی مسلمان ہو چکا تھا۔ چونکہ یہ سب کاروبار چھوڑ کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آ بیٹھے تھے اس لئے

کچھ مدت تک تو وہ اپنے ایمان کے جوش میں اپنے بھائی کو کھانا پہنچاتا رہا۔ عربوں کی زندگی بہت ہی سادہ ہوا کرتی تھی وہ کھجوریں کھا کر پانی پی لیتے اور اس کو غذا کے لئے کافی سمجھتے یا کبھی سوکھا گوشت مل جاتا تو وہی کھا کر پانی پی لیتے۔ غرض بہت ہی سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور اُنکو کھانا پہنچانا کوئی مشکل امر نہ تھا مگر کچھ مدت تک ایمان کے جوش میں اُنہیں کھانا پہنچانے کے بعد حضرت ابوہریرہؓ کا بھائی تنگ آگیا (حضرت ابوہریرہؓ ایک عیسائی خاندان میں سے تھے اور اُن کی والدہ بھی عیسائی تھیں) جب اُس نے تنگی محسوس کی تو ایک دن وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ ابوہریرہؓ سے کہئے کہ وہ کچھ کمایا بھی کرے۔ یہ کیا کہ سارا دن مسجد میں ہی بیٹھا رہتا ہے کوئی کام نہیں کرتا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہیں کیا معلوم کہ خدا اس کے طفیل تمہیں بھی رزق دیتا ہو۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ نے یہی واقعہ ہمارے نانا جان مرحوم کو سنایا چنانچہ اس کے بعد نانا جان مرحوم نے دنیوی تعلیم کا ارادہ چھوڑ کر انہیں اسی کام پر لگا دیا۔

غرض کچھ لوگ مکہ والوں میں سے سفروں پر جاتے تھے اور کمائی کر کے لاتے تھے اور باقی لوگ مکہ میں ہی رہتے۔ مکہ میں رہنے والوں کی وجہ سے اللہ تعالےٰ قافلہ والوں کے کام میں بھی برکت پیدا کر دیتا اور اس طرح اُن کا بھی گذارہ ہو جاتا اور مکہ والے بھی پلتے رہتے۔ بہر حال مکہ والوں کا اکثر حصہ وہیں مکہ میں رہتا تھا صرف ایک حصہ تجارت کرتا اور وہ جو کچھ کما کر لاتا وہ مکہ والوں میں بانٹ دیتا۔ یہ چیز کوئی معمولی چیز نہیں دنیا میں اسکی کتنی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اگر یہ محض ایک انسانی تدبیر تھی تو دیکھنا یہ چاہیئے کہ دنیا میں اور کہاں کہاں اس طریق پر عمل ہوتا ہے یقیناً دنیا کی اور کسی قوم نے وہ مثال قائم نہیں کی جو مکہ کے لوگ قائم کر چکے ہیں ہماری جماعت کو ہی دیکھ لو جب وقف کی تحریک کی جاتی ہے تو اُن میں سے کتنے نکلتے ہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ وَ اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ والی جماعت ہم ہی ہیں دعویٰ یہ ہے کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ثانیہ کی جماعت ہیں مگر اُن میں سے کتنے دین کے لئے اپنی زندگی وقف کرتے ہیں۔ دوسروں کے کام کو دیکھ کر یہ کہنا کہ یہ معمولی بات ہے اور چیز ہے اور حقیقت کو مدنظر رکھنا اور بات ہے۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ مکہ والوں نے جو کچھ کیا وہ ایک معمولی بات ہے مگر سوال یہ ہے کہ آج بھی اس مثال پر کتنے لوگ عمل کر سکتے ہیں یا کتنے لوگ عمل کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ کولمبس نے جب امریکہ دریافت کیا تو لوگوں نے حسد کی وجہ سے اُس کے اس فعل کی تحقیر شروع کر دی۔ چنانچہ وہ جہاں بھی بیٹھتا لوگ اُس پر طنز کرتے کہ کولمبس نے بڑی دریافت کی ہے وہ جہاز میں بیٹھا اور سامنے ایک ملک آگیا۔ بھلا اس دریافت میں اُس نے کیا کیا ہے۔ ایک دفعہ کسی دعوت میں بہت سے لوگ شامل تھے اور مذاقیہ رنگ میں آپس میں گفتگو ہو رہی تھی کہ کولمبس نے اپنی جیب میں سے ایک انڈا نکالا اور کہا اِسے میز پر کھڑا کر دیں۔ جن لوگوں نے یہ کوشش کی وہ ناکام رہے۔ جب وہ سارا زور لگا چکے اور انڈا کھڑا نہ ہوا تو کولمبس نے جیب میں سے ایک بڑا سا سُوا نکالا اور انڈے میں سوراخ کر دیا سوراخ کی وجہ سے اُس میں سے لعاب نکل آیا۔ کولمبس نے اس لعاب کے ذریعہ سے انڈے کو میز پر کھڑا کر دیا اِس پر کولمبس نے کہا دیکھا انڈا کھڑا ہو گیا یا نہیں۔ تم کہتے تھے کہ امریکہ کا سفر کولمبس نے کیا اور امریکہ دریافت ہو گیا ہمیں یہ موقعہ نہ ملا اِس لئے ہم رہ گئے۔ مگر اس انڈے کو کھڑا کرنے کا تو تم کو موقعہ مل گیا تھا تم اِسے کھڑا نہ کر سکے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ کام کرنا اور چیز ہے اور یہ کہہ دینا کہ ایسا کام تو ہر شخص کر سکتا ہے اور بات ہے۔ اگر یہ ایسی ہی آسان بات ہے تو دنیا میں اور کسی نے وہ کیوں نہ کر لیا جو مکہ والوں نے کیا تھا۔ کیا دنیا کے پردہ پر

آج کوئی شہر، کوئی قصبہ اور کوئی بستی ایسی ہے جس میں یہ طریق رائج ہو کہ چند لوگ روزی کما کر لاتے ہوں اور پھر شہر والوں کو کھلا دیتے ہوں اور اُن سے کہتے ہوں کہ تم اطمینان سے یہاں بیٹھے رہو ہم کمائیں گے اور تمہیں کھلائیں گے۔ ہم نے تو دیکھا ہے احمدیوں میں سے بھی بعض ایسے بے حیا اور بے شرم ہوتے ہیں کہ وہ بڑی ڈھٹائی سے کہدیتے ہیں کہ مبلغوں کا کیا ہے وہ تو پیسے لے کر کام کرتے ہیں۔ اُن بے حیاؤں سے کوئی پوچھے کہ تم بغیر پیسے کے کام نہ کرو وہ پیسے لے کر کام نہ کریں تو دین کا کام کون کرے پھر تو دین کا خانہ ہی خالی ہو جاتے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح تم کما سکتے تھے اسی طرح وہ بھی کما سکتے تھے یہ کہنا کہ غربت کی وجہ سے وہ پڑھ نہیں سکتے تھے یا دنیا میں ترقی نہیں کر سکتے تھے بالکل جاہلانہ بات ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے باپ بہت ہی معمولی آدمی تھے۔ ٹوپیاں بنایا کرتے تھے مگر اُن کا ایک بیٹا انجنیئر ہو گیا اور دوسرا علامہ کہلانے لگا۔ یہی حضرت سید احمد صاحب کیا تھے؟ ایک بہت ہی غریب آدمی کے لڑکے تھے مگر ترقی کر کے کہیں کے کہیں جا پہنچے۔ پس یہ کہنا کہ وہ دنیا میں ترقی نہیں کر سکتے تھے اس لئے دین کی طرف چلے گئے بالکل غلط ہے۔ دنیا میں مثالیں موجود ہیں کہ بڑے بڑے غریب لوگوں کی اولادیں بڑے بڑے اعلیٰ مقام تک جا پہنچیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے دین میں اپنی قابلیت ثابت کر دی ہے تو اسی طرح وہ دنیوی کاموں میں بھی اپنی قابلیت ظاہر کر سکتا تھا مگر اُس نے یہی چاہا کہ وہ خدا کا کام کرے اور دنیا کے کام کو نظر انداز کر دے۔ اصل بات یہ ہے کہ محض اس حسد اور غصہ کی وجہ سے کہ لوگ ہمیں یہ کیوں طعن کرتے ہیں کہ ہم دین کی خدمت نہیں کرتے بعض لوگ اس قسم کے اعتراضات شروع کر دیتے ہیں کہ مبلغوں کا کیا ہے وہ بھی تو نوکری کرتے ہیں حالانکہ یہ انتہا درجہ کی بے شرمی کی بات ہے۔ پس یہ کہنا کہ مکہ والوں نے اگر ایسا کیا تو اپنی حالت کو درست کرنے کے لئے کیا

اس میں قربانی کی کونسی بات ہے محض واقعات پر غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ اگر ایسا ہر شخص کر سکتا ہے تو سوال یہ ہے کہ باقی قومیں ایسا کیوں نہیں کر لیتیں اور وہ کیوں خاموش ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم اس خوبی کو مکہ والوں کی طرف منسوب کریں تو اس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ وہ سب سے زیادہ نیک جماعت تھی کیونکہ باوجود اس کے کہ وہ کافر تھے، باوجود اس کے کہ وہ بے دین تھے انہوں نے وہ کچھ کیا جو کبھی مسلمانوں نے نہیں کیا۔ انہوں نے وہ کچھ کیا جو کبھی احمدیوں نے بھی نہیں کیا۔ اس رنگ کی قربانی میں احمدی یقیناً مکہ والوں کے برابر نہیں ہیں۔ بلکہ اس قربانی میں صحابہؓ بھی مکہ والوں کے برابر نہیں۔ اور اگر اس قربانی میں وہ صحابہ سے بھی بڑھے ہوئے تھے، وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانیوالوں سے بھی بڑھے ہوئے تھے تو ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۙ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ایک نشان تھا جو خدا نے دکھایا۔ ایک آسمانی تدبیر تھی جس کو خدا تعالےٰ نے ظاہر کیا۔ مکہ والوں کی یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ ایسا کر سکتے۔ یہ خدا کا نشان تھا اور اُسی خدا کی قدرت کا یہ کرشمہ تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں مبعوث کرنا چاہتا تھا اور یہی بات خدا تعالےٰ اس جگہ کہہ رہا ہے کہ مکہ والوں نے باوجود اس کے کہ وہ بے دین تھے، باوجود اس کے کہ وہ مشرک تھے، باوجود اس کے کہ وہ روحانیت سے عاری تھے، وہ فعل کیا جو آج تک دنیا کی کوئی قوم نہیں کر سکی۔ پس وہ فعل مکہ والوں نے نہیں کیا وہ فعل ہم نے اُن سے کروایا۔ وہ صرف ہمارے تصرف اور اثر کا نتیجہ تھا انہوں نے جو کچھ کیا ہم اُس کی وجہ قومی کیریکٹر قرار نہیں دے سکتے کیونکہ قومی کیریکٹر کے ہوتے ہوئے بھی بھوک پیاس کی تکلیف پر لوگ اِدھر اُدھر بھاگ جایا کرتے ہیں۔ اسے ہم صرف خدا تعالےٰ کا تصرف اور خدا تعالےٰ کی تدبیر ہی کہہ سکتے ہیں۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ چونکہ مکہ والوں کا کام اُن کا اپنا کام نہ تھا خدا تعالےٰ کا کام تھا اس لئے

ہم اُس کی نقل اتارنے کی کوشش نہ کریں جس حد تک اِس قربانی کی مثال ہم پیش کر سکیں ہمیں پیش کرنی چاہیئے جب تک ہم ایسا نہ کریں ہم دنیا میں کوئی بڑا انقلاب پیدا نہیں کر سکیں گے۔ صحابہؓ نے بے شک دنیا میں انقلاب پیدا کیا لیکن وہ انقلاب ایسی ہی قربانی کی مثال قائم کرنیکی کوشش سے پیدا کیا۔ اگر وہ بالکل اس معیار پر پورے اُترتے تو جو مکّہ والوں میں معجزہ کے طور پر اور ظہور محمّدی کے پیش خیمہ کے طور پر اللہ تعالےٰ نے دکھایا تھا۔ تو یقیناً صحابہؓ اپنی ترقی کے معیار کو اَور بھی اُونچا لے جاتے۔ وہ اسلام کی بنیادوں کو اَور بھی مضبوط کر دیتے۔ وہ کفر کی تباہی کو اَور بھی مکمل کر دیتے ہماری جماعت کے افراد کو بھی غور کرنا چاہیئے کہ وہ اِسوقت کیا نمونہ پیش کر رہے ہیں۔ جب وہ غیروں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں دیکھو ہماری جماعت کتنی قربانی کر رہی ہے کس طرح نوجوان اپنی زندگیاں وقف کر رہے ہیں کیونکہ وہاں غیر کی طرف سے اُنہیں عزت مل رہی ہوتی ہے۔ مگر جب اندر بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں اِن مولویوں کا کیا ہے یہ تو پیسے لے کر کام کرتے ہیں۔ حالانکہ جو کچھ مکّہ والوں نے کیا اگر ساری جماعت قربانی کے اُس نقطہ تک پہنچ جائے تو دنیا میں حیرت انگیز طور پر ہماری تبلیغ کا سلسلہ وسیع ہو جائے۔ میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ ہماری جماعت کی ماہوار آمد پچیس تیس لاکھ سے کم نہیں۔ اگر دین کو دنیا پر مقدّم کیا جائے جس کے معنے کم از کم ۱۵ فی صدی کے ہیں تو تیرہ لاکھ ماہوار آمد بن جاتی ہے۔ میں نے جماعت کی آمد کا جو یہ اندازہ لگایا ہے یہ غلط نہیں حفاظتِ قادیان کے لئے جو تحریک کی گئی تھی اُس میں ماہوار آمدن کے ساڑھے تیرہ لاکھ کے وعدے تھے اور ابھی جماعت کا بہت سا حصہ باقی تھا جس نے اس تحریک میں حصہ نہیں لیا تھا۔ پھر جماعت کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو اپنی آمدن صحیح نہیں بتاتا۔ مجھے معلوم ہے ایک شخص کی جائداد مجھ سے زیادہ تھی مگر میرے چندہ سے اُس کا چندہ بہت کم تھا۔ شاید اس میں اندازہ کی غلطی تھی یا اُس کی وجہ کمزوریٔ ایمان تھی۔ بہرحال اسکو دیکھتے ہوئے میرا اندازہ یہی تھا کہ ہماری جماعت کی ماہوار آمدن ۲۵-۳۰ لاکھ سے کم نہیں۔ اگر ۱۵ فی صدی چندہ دیا جائے اور ۲۵ لاکھ ماہوار آمد اوسطاً سمجھ لی جائے تو ½ ۱۲ لاکھ ماہوار آمد ۵۰ فی صدی کے حساب سے اور تیرہ لاکھ ۱۵ فی صدی کے حساب سے بن جاتی ہے۔ مکّہ والے بھی آخر اپنی آمد کا نصف قومی کاموں کے لئے دے دیا کرتے تھے۔ وہ کافر تھے، وہ بے ایمان تھے، وہ مشرک تھے۔ مگر وہ سب کے سب اپنی آمد کا نصف اس لئے نکال دیا کرتے تھے تاکہ وہ غربا میں تقسیم کیا جائے اور مکّہ آباد رہے۔ اُن کے دلوں میں ایمان نہیں تھا؛ اُن کے پاس قرآن نہیں تھا، اُن کے سامنے قومی ترقی کا کوئی مقصود نہیں تھا، اُن کے سامنے کوئی اعلیٰ درجے کا آئیڈیل نہیں تھا۔ محض اتنی بات تھی کہ قصیؔ نے ہم کو کہا ہے کہ ہمارے دادا ابراہیمؑ نے یہ کہا ہے کہ مکّہ میں رہو۔ اِس لئے ہم یہاں رہنے کے لئے آگئے ہیں۔ یہ کتنا چھوٹا سا آئیڈیل ہے۔ اِس کے مقابلہ میں تمہارا آئیڈیل کیا ہے۔ تمہارا آئیڈیل یہ ہے کہ تم نے دنیا فتح کرنی ہے تم نے دنیا میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بادشاہت قائم کرنی ہے تم نے دنیا میں خدا کی بادشاہت قائم کرنی ہے۔ وہ اپنے چھوٹے مقصد کو پورا کرنے کے لئے اپنا نصف مال لاکر دے دیتے تھے۔ اُن میں سے ہر شخص اپنی آمد کا آدھا حصہ نکال کر کہتا کہ یہ آدھا حصہ غریبوں کے لئے ہے تاکہ مکّہ آباد رہے اور وہ اِسے چھوڑ کر اِدھر اُدھر نہ جائیں۔ مگر تم بڑے مقصد کے لئے وہ قربانی نہیں پیش کر سکتے اگر تم ایسا کرو تو سلسلہ کی سالانہ آمد سوا کروڑ یا ڈیڑھ کروڑ ہونی چاہیئے۔ اگر جماعت مکّہ والوں کی قربانی کے برابر قربانی کرنے لگ جائے، اُس سے نصف بھی کرنے لگ جائے، اُس سے چوتھا حصہ بھی کرنے لگ جائے تو کتنا عظیم الشان کام ہو سکتا ہے۔ کتنی تبلیغ وسیع ہو سکتی ہے۔

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب آپ مدینہ میں آ گئے صحابہؓ نے بڑی بڑی قربانیاں کیں مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان بحیثیت قوم قربانی کے اس معیار کو زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکے۔ حضرتِ عثمانؓ کے زمانہ میں فتنہ پیدا ہوا۔ مان لو کہ یہ کسی غلطی کی وجہ سے پیدا ہوا مگر اتنا تو ہے کہ اُس وقت لوگوں کی طبائع میں جو غش پیدا ہو گیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ قومی تباہی ہمارے سامنے کھڑی ہے انہوں نے اگر دیکھا تو اس بات کو کہ ہم حق پر ہیں۔ اُس وقت بعض صحابی بھی آپ کے مقابلہ میں تھے۔ چاہے وہ کتنے ہی چھوٹے ہوں مگر بہرحال وہ کہلاتے تو صحابہ ہی تھے۔ پھر حضرتِ علیؓ کا زمانہ آیا اُس زمانہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ چاہے وہ کتنے ہی چھوٹے تھے بہرحال علیؓ کے مقابلہ میں صحابہ کہلانے والے موجود تھے۔ ہم مان لیتے ہیں کہ علیؓ بالکل غلطی پر تھے، ہم مان لیتے ہیں کہ علیؓ ہرگز خلافت کے مستحق نہیں تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ علیؓ کے پاس خلافت آنے سے اسلام کو نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا مگر علیؓ کو ضعف پہنچ جانے سے اسلام کو ضعف پہنچ سکتا تھا۔ لیکن وہ اتنی موٹی بات کو بھی نہ سمجھ سکے اور انہوں نے لڑائیاں شروع کر دیں۔ دو خلافتوں میں آدھی دنیا فتح ہو چکی تھی اگر باقی دو خلافتیں اُسی اطمینان کے ساتھ چلنے دیتے تو باقی ساری دنیا پر بھی اسلام پھیل جاتا اور پھر نہ تباہیاں ہوتیں نہ بربادیاں ہوتیں نہ خرابیاں پیدا ہوتیں۔ مگر وہ اپنے نفس کو قابو میں نہ رکھ سکے اور اُنکے دلوں میں یہی بات رہی کہ ہم حق پر ہیں ہم اپنا حق چھوڑ نہیں سکتے۔ حالانکہ اِنہی لوگوں میں وہ صحابی بھی تھے جنہوں نے فتنہ کے خیال سے کبھی اپنے حق کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں میں اپنی کمر کو پٹکا باندھے مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ معاویہ آئے اور انہوں نے مسجد میں کھڑے ہو کر ایک تقریر کی جس میں کہا میں نے سوچا ہے میرے بعد حکومت کے لئے میرا لڑکا یزید سب سے زیادہ موزون ہے اس میں وہ تمام قابلیتیں موجود ہیں جو حکمران میں ہونی چاہئیں۔ اِس لئے میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ میرے بعد یزید خلیفہ ہو گا۔ کوئی ہے جو یہ سمجھتا ہو کہ وہ اِس منصب کا یزید سے زیادہ حقدار ہے۔ حضرتِ عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں میں نے پٹکا کھولا اور میں نے کھڑے ہو کر یہ کہنا چاہا کہ سب سے زیادہ اس منصب کا وہ حقدار ہے جس کا باپ اُس وقت اسلام کے لئے لڑ رہا تھا جب تیرا باپ کافر تھا اور جو اُس وقت اسلام کے لئے خود لڑ رہا تھا جب تو کافر تھا مگر پھر خیال آیا کہ اگر میں نے یہ کہہ بھی دیا تو اس کا فائدہ کیا ہو گا اسلام میں پہلے ہی تفرقہ کم نہیں اِس سے اَور بھی بڑھ جائے گا اور یہ جائز نہیں کہ میں ایک دنیوی بات کی خاطر اسلام کی ترقی اور اُس کے مفاد کو نقصان پہنچاؤں۔ یہ حقیقی قربانی تھی۔ اگر مسلمان سارے کے سارے چھوٹے اور بڑے اِس نقطۂ نگاہ کو سمجھ لیتے تو یقیناً اسلام میں وہ تفرقہ پیدا نہ ہوتا جس نے اُس کی بنیادیں ہلا دیں اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ بہت سی باتوں میں حق پر تھے مگر سوال یہ ہے کہ بہت سی جگہوں پر انسان کو اپنا حق بھی قربان کرنا پڑتا ہے۔ جب زیادہ بڑا مقصد سامنے آ جائے تو اُس وقت قربانی اور صرف قربانی ہی ایک ایسی چیز ہوتی ہے جو انسان کے کام آتی ہے۔ اگر اُس وقت کے مسلمان بھی ایسا کرتے اور وہ اپنے ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح نہ دیتے تو یقیناً اسلام کی ترقی کہیں سے کہیں نکل جاتی۔ مگر افسوس کہ آخری دو خلفاء کے وقت میں بعض مسلمانوں سے وہ قربانی پیش نہ کی جا سکی جو مکہ والوں نے پیش کی تھی اور جس کا نتیجہ ظہورِ محمدی تھا۔

خلاصہ کلام یہ کہ دنیا کی تاریخوں میں اسکی کوئی مثال نہیں ملتی کہ صدیوں تک ایک قوم کے افراد اپنے لئے تمام ترقی کے راستوں کو روک کر اُس گھر کو آباد رکھنے

کے لئے جسے وہ خدا کا گھر سمجھتے ہیں کمائیں آپ اور کھلائیں دوسروں کو۔ انفرادی مثالیں تو مل جاتی ہیں مگر قومی طور پر اور متواتر ایک لمبے عرصہ تک اِس قسم کی حیرت انگیز قربانی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اور جب تک اِس قسم کی مثال پیش نہیں کی جائے گی اُس وقت تک دنیا کی اُلجھنوں کا حل بھی پیدا نہیں ہوگا۔

یہاں یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ اللہ تعالےٰ نے سورۂ ایلاف کیوں اُتاری۔ قریش نے تو جو کچھ کرنا تھا کر لیا اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانہ آگیا۔ اِس زمانہ میں قریش کی تعریف کرنے کے تو یہ معنے تھے کہ اُن کو اَور بھی مغرور کر دیا جائے۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ دیکھا ہمیں کافر کافر کہتے تھے مگر ہم نے کتنی قربانی کی پھر اللہ تعالیٰ نے ایسا کیوں کیا۔ اِسی لئے کہ اللہ تعالےٰ مسلمانوں کو توجہ دلاتا ہے کہ تم بھی قربانی کا یہ نمونہ پیش کرو۔ پنجابی کی ایک مثال ہے۔ "دِھیئے نی مَیں تینوں کہواں۔ نُنویں نی توں کَن رکھ۔" یعنی ساس نے جب کوئی بات بہو سے کہنی ہو تو وہ بیٹی کو ڈانٹتی ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ بہو اُس بات کو سُن لے اور ہوشیار ہو جائے۔ اِسی طرح قریش کا ذکر اللہ تعالےٰ نے اِس لئے کیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو توجہ دلائے کہ کسی زمانہ میں ایک کافر اور مشرک قوم مکہ میں آکر بسی اور اُس نے مکہ کو بسانے کے لئے ایسی حیرت انگیز قربانی کی جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ بے شک اُن میں یہ خوبی خدا تعالےٰ کے تصرف سے پیدا ہوئی مگر تمہارے ساتھ بھی تو اُس کا فضل ہے تمہیں بھی اِس قربانی کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے اسلام کے لئے ایسی ہی قربانی پیش کرنی چاہیئے اور ایسا ہی نمونہ دکھانا چاہیئے جیسے اِن لوگوں نے دکھایا۔

قادیان کو ہی لے لو۔ وہاں رہنے والے رہتے ہیں اور ہماری جماعت کے لوگ دوسروں کے سامنے تعریفیں بھی کرتے ہیں اور اُن سے کہتے ہیں دیکھا ہم لوگوں نے کیا کیا۔ ہم سب لوگ مشرقی پنجاب کو چھوڑ کر آگئے مگر ہم اب تک وہاں بیٹھے ہیں لیکن کہنے والے کو یہ خیال نہیں آتا کہ آیا یہ صرف دوسرے کا فرض ہے تیرا فرض نہیں۔ وہ دوسروں کے سامنے اس فعل کی تعریف کرتا ہے مگر جب اپنی باری آتی ہے تو کھسکنے لگتا ہے۔ صاف پتہ لگتا ہے کہ وہ محض فخر لینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے ورنہ کام کرنے کے لئے وہ تیار نہیں۔ وہ غیر از جماعت افراد میں بیٹھتا ہے تو کہتا ہے تم نے کبھی غور کیا کہ ہماری جماعت نے قادیان میں کیسا شاندار نمونہ دکھایا ہے۔ ہماری جماعت کتنی بڑی قربانی کر رہی ہے۔ وہ سُنتا ہے اور تعریف کرتا ہے اُس بیچارے کو کیا پتہ کہ اِن لوگوں کی تنظیم کیسی ہے۔ اگر اُسے پتہ ہوتا تو وہ آگے سے جواب دیتا کہ وہ تو قربانی کر رہے ہیں تم یہ بتاؤ کہ تم کیا کر رہے ہو؟ مگر اُسے چونکہ علم نہیں ہوتا وہ محض ذکر سُنکر متاثر ہو جاتا ہے۔ حالانکہ سوال یہ ہے کہ تم نے اُس قربانی میں کیا حصہ لیا۔ اگر تم نے اُس قربانی میں کوئی حصہ نہیں لیا تو وہ قربانی تمہارے لئے ملامت کا موجب تو ہو سکتی ہے فخر کا موجب نہیں بن سکتی۔ اگر وہ علی الاعلان کہہ دیتے کہ ہم قادیان نہیں جا سکتے ہم نے اینٹوں کو کیا کرنا ہے تو خواہ یہ جواب کتنا ہی غلط ہوتا وہ خدا تعالےٰ کے سامنے جا کر کہہ سکتے تھے کہ ہم نے جو کچھ کیا دیانتداری سے کیا۔ ہم یہی سمجھتے تھے کہ مومن کی جان زیادہ قیمتی ہوتی ہے اُسے اینٹوں کی خاطر قربان نہیں کیا جا سکتا مگر جب وہ دوسروں کی قربانی کا ذکر سُنکر سبحان اللہ سبحان اللہ کہنے لگ جاتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ بھی مانتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے کیا اچھا کیا۔ لیکن اِس کے بعد جب اپنا سوال آتا ہے تو پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جب دوسرے لوگ یہ قربانی کر رہے ہیں تو ہم کیوں کریں۔

پس لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ والی آیات یہی سبق دینے کے لئے نازل ہوئی ہیں کہ خدا اب بھی اصحاب الفیل کا واقعہ دکھانے کے لئے تیار ہے مگر تم بھی تو قریش والا نمونہ دکھاؤ۔ میرے پاس

کئی لوگ آتے ہیں اور وہ کہتے ہیں خدا ہمیں کب قادیان
واپس دے گا اور کب اصحاب الفیل والا نشان ہمارے
لئے ظاہر کرے گا۔ میں ایسے لوگوں سے پوچھتا ہوں۔
اصحاب الفیل والا نشان کن لوگوں کے لئے ظاہر کیا گیا تھا
اُن لوگوں کے لئے جنہوں نے سوا دو سو سال تک وہ قربانی
کی جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ انہوں نے
اپنی جانیں دے دیں مگر مکہ نہ چھوڑا۔ وہ بھوک سے نڈھال
ہو کر جب موت کے قریب پہنچ جاتے تو اپنا خیمہ اُٹھاتے
اور مکہ سے باہر چلے جاتے۔ اُن کے سامنے اُن کے بیوی
بچے مرجاتے، اُن کے سامنے اُن کے بھائی مرجاتے، اُن
کے سامنے اُن کی بہنیں مرجاتیں، اُن کے سامنے اُن کے
دوست اور رشتہ دار مرجاتے مگر وہ کسی سے کچھ مانگتے
نہیں تھے۔ وہ اس تکلیف کی وجہ سے مکہ کو چھوڑتے بھی نہیں
تھے۔ وہ ایک ایک کر کے مرگئے، مٹ گئے اور فنا ہوگئے
مگر انہوں نے مکہ کو نہ چھوڑا۔ تم بھی یہ قربانی کرو تو خدا
تمہارے لئے بھی اصحاب الفیل والا نشان دکھادے گا
بلکہ وہ تو غیر مومن تھے اُن کے لئے دیر کے بعد نشان ظاہر
ہوا تم مومن ہو تمہارے لئے یہ نشان جلد ظاہر ہو جائے گا۔
مگر پہلے قربانی کی مثال تو ہونی چاہیئے پھر تمہارا بھی حق
ہو گا کہ تم خدا سے کہو کہ ہم نے اپنی قربانی تو پیش کر دی
ہے اب تُو بھی ہماری تائید میں اپنا نشان دکھا۔ لیکن
اپنا فرض ادا نہ کرنا اور خدا تعالیٰ سے کہنا کہ وہ وعدہ پورا
کرے یہ کوئی دیانتداری نہیں۔ خدا تعالیٰ اپنے وعدوں
کو پورا کرنے والا ہے اور یقیناً وہ سب سے زیادہ سچا ہے
مگر وہ بھی نشان دکھاتا ہے جب اُس کے مقابلہ میں بندہ
بھی قربانی پیش کرتا ہے مگر یہ رُوح ابھی جماعت میں
کہاں ہے؟ جب تک یہ احساس قائم نہ ہو جائے اور
پھر اس احساس کو دوسروں کے اندر قائم نہ کیا جائے اُس
وقت تک کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ خلیفہ آخر کیا
کر سکتا ہے۔ دو یا چار یا پانچ لاکھ یا دس لاکھ آدمیوں کو
سمجھانے کے لئے ایک ایک کے گھر پر تو نہیں جا سکتا۔ اِس کا
طریق تو یہی ہے کہ لوگ سنیں اور آگے پہنچائیں، وہ سنیں اور
آگے پہنچائیں۔ جب تک وہی آگ اُن کے دلوں میں بھی
نہ لگ جائے، وہی تڑپ اُن کے دلوں میں بھی پیدا نہ ہو جائے
جو خلیفۂ وقت کے دل میں لگی ہوئی ہو اور جب تک ایک ایک
احمدی دوسرے کو پکڑ کر یہ نہ کہے کہ تم میں فلاں غلطی ہے
اس کی اصلاح کرو اُس وقت تک یہ کام ہو کس طرح
سکتا ہے۔ دیکھو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی
وفات کے قریب جب حجۃ الوداع میں لوگوں کو جمع کر کے
ایک تقریر کی تو اس آخری وصیت میں آپ نے یہی کہا کہ
فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ۔ میں نے بات کہہ دی ہے
مگر میری بات سب لوگوں کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی۔
میری بات اسی طرح دوسرے لوگوں تک پہنچ سکتی ہے کہ جو
شخص مجھ سے کوئی بات سُنے وہ آگے پہنچائے وہ اگلا شخص
پھر آگے پہنچائے اور اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہے۔ یہی
قومی ترقی کا گُر ہے۔ اسی سے قومیں زندہ ہوتی ہیں اسی سے
وہ دنیا میں فتحیاب ہوتی ہیں۔ ورنہ خلیفہ خلیفہ ہی ہے
خدا نہیں۔ اب اس وقت میں جو کچھ کہہ رہا ہوں کراچی والے
اُسے نہیں سُن رہے۔ سندھ میں ہماری درجنوں جماعتیں
ہیں وہ میری ان باتوں کو نہیں سُن رہیں۔ پنجاب میں سینکڑوں
جگہ پر جماعتیں ہیں وہ ان باتوں کو نہیں سُن رہیں۔ صوبہ سرحد
میں درجنوں مقامات پر احمدیہ جماعتیں ہیں وہ میری ان
باتوں کو نہیں سُن رہیں۔ ہندوستان اور مشرقی پاکستان
میں سینکڑوں جگہ جماعتیں ہیں مگر اُن میں سے کوئی بھی
میری یہ باتیں نہیں سُن رہی۔ اس کے علاوہ ہندوستان
سے باہر سینکڑوں جگہ جماعتیں ہیں مگر اُن سب تک میری
یہ آواز نہیں پہنچ رہی۔ بے شک تقریریں چھپ بھی جاتی ہیں
مگر زبانی بات کا جو اثر ہو سکتا ہے وہ پڑھنے سے کہاں
ہو سکتا ہے۔ پس جب ایک شخص سب دنیا تک اپنی آواز
نہیں پہنچا سکتا تو پھر کونسا طریق ہے جس سے لوگوں کی اصلاح ہو۔

وہ طریق یہی ہے کہ ہر احمدی اپنے آپ کو دوسروں کی اصلاح کا ذمہ دار سمجھے۔ وہ رات اور دن اس کام میں لگا رہے اور اس غرض کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لئے تیار رہے۔ جب تم ایسا کرو گے تو آسمان سے خدا تعالیٰ کا فضل نازل ہونا شروع ہو جائے گا اور تمہاری کامیابی تمہارے سامنے آجائے گی۔ اس وقت بھی ہم خدا تعالیٰ کے فضل سے اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ ہم ساری دنیا میں تبلیغ کر سکتے ہیں۔ بلکہ اگر ہم اپنے اندر جانی قربانی کا صحیح جذبہ پیدا کر لیں، مالی قربانی کا صحیح جذبہ پیدا کر لیں تو ساری دنیا میں اسلام کا جھنڈا گاڑ سکتے ہیں۔

تیسرے معنے اس آیت کے یہ ہوں گے کہ قریش کے دل میں جو سردی گرمی کے سفروں کی محبت اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے جس کی وجہ سے اُن کو با فراغت رزق ملتا ہے اور متمدن اقوام سے ان کو تعلق پیدا کرنے کا موقع ملتا ہے اس نعمت کو ملحوظ رکھ کر انہیں خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اور خانہ کعبہ کے رب کی عبادت کرنی چاہیئے۔

ان معنوں کے رُو سے اس مضمون کی طرف اشارہ سمجھا جائے گا کہ تمہارے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے یہ تمہاری وجہ سے نہیں ہو رہا بلکہ خانہ کعبہ کی خدمت کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ کیونکہ جب کسی کام کا ایک نتیجہ بیان کر دیا جائے تو درحقیقت وہی نتیجہ اُس کام کا اصل باعث ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آقا اپنے نوکر کو تنخواہ دیتا ہے اگر کسی وقت وہ نوکر اُس کی نافرمانی کرتا ہے تو آقا اُس سے کہتا ہے ہم تمہیں تنخواہ دیتے ہیں تم کو چاہیئے کہ تم ہماری فرمانبرداری کرو۔ اس کے دوسرے لفظوں میں یہ معنے ہوتے ہیں کہ ہم تمہیں اس لئے تنخواہ دیتے ہیں کہ تم ہماری فرمانبرداری کرو۔ اسی طرح لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ کا نتیجہ یہاں فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ کا لایا گیا ہے یعنی ہم نے ایلاف کیا اور اس کے اچھے اچھے نتائج پیدا کئے پس چاہیئے کہ وہ رب البیت کی عبادت کریں۔ یہاں "پس" کا لفظ بتاتا ہے کہ پہلا انعام، پہلا اکرام اور پہلا احترام اسی غرض سے تھا کہ وہ رب البیت کے ساتھ تعلق رکھیں۔ پس اگر فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ کو لِاِیْلٰفِ کے ساتھ لگایا جائے جیسا کہ بہت سے نحوی یہی سمجھتے ہیں۔ تو اس صورت میں اس کے معنے یہ ہوں گے کہ تمہارے ساتھ یہ سلوک اس لئے کیا جاتا ہے کہ تم خدا کے گھر کو آباد رکھو اور اُس کا ذکر کیا کرو۔ اس طرح اُن پر واضح کیا گیا ہے کہ تم اپنے متعلق یہ خیال نہ کر لینا کہ سلوک تمہاری کسی نیکی یا تمہاری کسی خوبی کی وجہ سے ہے۔ جیسے یہود میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ وہ خدا کے محبوب اور پیارے ہیں اس لئے اُن سے نیک سلوک کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی اس کا ذکر آتا ہے کہ یہودیوں کا یہ خیال تھا کہ انہیں صرف چند دن سزا ملے گی۔ بعض کا یہ خیال تھا کہ ابراہیمی نسل میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں جائیگا۔ بعض کا یہ خیال تھا کہ انہیں صرف گیارہ مہینے سزا ملیگی بارھویں مہینے ہر ایک کو آزاد کر دیا جائیگا۔ بعض کا یہ خیال تھا کہ انکو صرف چالیس دن تک سزا ملیگی اور بعض کا یہ خیال تھا کہ انہیں بارہ دن سزا ملیگی۔ پھر بعض لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ انہیں صرف سات دن سزا ملیگی اور بعض خیال کرتے تھے کہ یہودی جب دوزخ کے پاس لے جائے جائینگے تو وہ خدا سے کہینگے کہ اُس تعلق کو یاد کر جو تجھے ہمارے باپ ابراہیمؑ سے تھا۔ اس پر خدا انہیں فوراً واپس لوٹا دے گا اور انہیں جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ اسی قسم کا خیال عربوں میں بھی پیدا ہو سکتا تھا کہ چونکہ ہم ابراہیمؑ کی نسل میں سے ہیں اس لئے ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ امتیازی سلوک کیا جا رہا ہے۔ پس اس آیت میں اس کا ازالہ کیا گیا ہے۔

درحقیقت ہر قوم جب بداعمالی کی طرف راغب ہوتی ہے اور اپنی ذمہ داریوں کو بھول جاتی ہے تو وہ چاہتی ہے کہ کسی ٹوٹکے کے ذریعہ سے ہی نجات حاصل کر لے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ۔ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ۔ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ۔ انکو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم نے ان پر جو احسان کیا ہے یہ خانہ کعبہ

کی وجہ سے کیا ہے اُن کی ذات کی وجہ سے نہیں کیا۔ ابراہیمؑ کی نسل ہونے کی وجہ سے ہم اُن پر یہ فضل نہیں کر رہے تھے بلکہ اِس لئے کر رہے تھے کہ اگر اُنہیں کھانے پینے کو بافراغت مل جائے گا تو وہ خدا کا ذکر کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اپنے اوقات بسر کریں گے تاکہ آنے والے موعود پر ایمان لانے کے لئے تیار ہوتے رہیں۔ پس لِاِیْلٰفِ کا تعلق اگر فَلْیَعْبُدُوْا سے سمجھا جائے تو اس امر پر سند ثابت ہوگا کہ قومی برتری کوئی چیز نہیں۔ اُن کا یہ خیال کہ یہ سب کچھ ہماری خاطر ہو رہا ہے بالکل غلط ہے۔ یہ خانہ کعبہ کی خاطر، خانہ کعبہ کے نبی کی خاطر اور ذکرِ الٰہی کو قائم رکھنے کی خاطر ہو رہا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اَور قومیں تو الگ رہیں آج مسلمان بھی اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بڑے آدمی پر اپنا فضل نازل کرتا ہے تو اُس کی سُنّت ہے کہ وہ اس فضل کا سلسلہ اُس کی اولاد کے لئے بھی جاری کرتا ہے مگر آہستہ آہستہ وہ یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ ہم خدا کے خاص محبوب ہیں اور خدا کے محبوب کے وہ یہ معنے لیتے ہیں کہ جیسے عاشق کہتے ہیں ہمیں مار لو، پیٹ لو، دکھ دے لو ہم تمہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ اِسی طرح وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خواہ ہم خدا کو گالیاں دے لیں، خواہ ہم بے دینی کریں۔ خواہ ہم اُس پر سَو سَو اعتراض کریں، خواہ ہم اُس کو بُرا بھلا کہیں، خواہ ہم اس کے کسی حکم کو نہ مانیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا عاشق ہے وہ ہمیں چھوڑ نہیں سکتا۔ چنانچہ مختلف شکلوں اور صورتوں میں لوگوں نے یہ عقیدہ قائم کیا ہُوا ہے۔ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کی ایک بہن تھیں جو کسی پیر کی مُرید تھیں۔ وہ ایک دفعہ آپ سے ملنے کے لئے آئی تو آپ نے اُس سے کہا بہن تمہیں نماز کی طرف توجہ نہیں تم آخر خدا کو کیا جواب دو گی۔ اُس نے کہا میں نے جس پیر کی بیعت کی ہوئی ہے اُس نے مجھے کہہ دیا ہے کہ چونکہ تم نے میری بیعت کرلی ہے اس لئے اب تمہیں سب کچھ معاف ہے۔ آپ نے اپنی بہن سے کہا۔ بہن اپنے پیر صاحب سے پوچھنا کہ خدا کا حکم کس طرح معاف ہو گیا۔ نماز کا حکم تو خدا نے دیا ہے اور وہ قیامت کے دن اس کا حساب لے گا۔ آپ کی بیعت کرنے سے یہ حکم کس طرح معاف ہو گیا؟ اُس نے کہا بہت اچھا جب میں جاؤں گی تو یہ بات اُن سے ضرور دریافت کروں گی۔ کچھ مدت کے بعد وہ پھر آپ سے ملنے کے لئے آئی تو آپ نے اُس سے پوچھا کہ بتاؤ کہ تم نے اپنے پیر صاحب سے وہ بات دریافت کی تھی؟ اُس نے کہا ہاں میں اپنے پیر صاحب کے پاس گئی تھی اور اُن سے میں نے یہ بات دریافت کی تو وہ کہنے لگے تو نُور دین سے ملنے گئی تھی معلوم ہوتا ہے یہ شرارت تجھے نُور دین نے ہی سکھائی ہے۔ میں نے کہا کسی نے سکھائی ہو آپ یہ بتائیں کہ اس کا جواب کیا ہے؟ انہوں نے کہا قیامت کے دن جس وقت خدا تم سے پوچھیگا کہ تم نمازیں کیوں نہیں پڑھا کرتی تھیں تو تم کہہ دینا کہ میرا جواب پیر صاحب سے لیجئے اُنہوں نے کہا تھا کہ میری بیعت کر لینے سے اب تمام ذمہ واری مجھ پر آپڑی ہے تمہیں نمازیں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اس پر خدا کے فرشتے تم کو چھوڑ دینگے اور وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ میں نے کہا پیر صاحب پھر آپ کا کیا بنے گا اتنے لوگوں کے گناہ آپ کے ذمہ لگ جائیں گے؟ اس پر وہ کہنے لگے جس وقت خدا ہم سے حساب لینا چاہیگا تو ہم لال لال آنکھیں نکال کر اُس سے کہیں گے کہ کربلا میں ہمارے دادا امام حسینؓ کی شہادت کچھ کم تھی کہ اب ہم کو بھی دق کیا جاتا ہے۔ اس پر خدا اپنی آنکھیں نیچی کر لیگا اور ہم بھی فوراً جنت میں چلے جائینگے۔

دیکھو مسلمانوں کی حالت گرتے گرتے کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ حالانکہ اَور لوگ تو الگ رہے خدا کے نبی اور رسول بھی جن سے تعلق رکھنے کی بنا پر ہم اپنے آپ کو افضل سمجھتے ہیں دن اور رات کام کیا کرتے تھے بلکہ نبیوں اور رسُولوں کو رہنے دو ہمارا خدا بھی ہر وقت کام کرتا ہے آخر خدا کو ہم رب العالمین کہتے ہیں یا نہیں اور رب العالمین کے کیا معنے ہوتے ہیں

یہی کہ وہ ہمیں روٹیاں کھلاتا ہے، ہمارے جانور پالتا ہے، ہمارے بچے پالتا ہے، سمندر کے نیچے رہنے والی مچھلیوں کو پالتا ہے، پرندے پالتا ہے۔ اسی طرح اَور تمام جانداروں کو پالتا ہے۔ پھر جب ہم کہتے ہیں خدا نے زمین و آسمان بنایا تو اس کے کیا معنے ہوتے ہیں۔ یہی معنے ہوتے ہیں کہ ہمارا خدا انجنیئرنگ کا کام بھی کرتا ہے، ہسبنڈری کا کام بھی کرتا ہے، زراعت کا کام بھی کرتا ہے۔ پھر جب ہم کہتے ہیں اُس نے کیمیاوی ترکیبوں سے اس اس طرح چیزیں بنائیں تو تو اس کے کیا معنے ہوتے ہیں یہی معنے ہوتے ہیں کہ ہمارا خدا صنّاع بھی ہے اور ہمارا خدا سائنسدان بھی ہے۔ غرض جو کام پیشے جو ہم اختیار کرتے ہیں سارے کے سارے خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ خدا بھی بیٹھ جائے اور وہ کچھ نہ کرے حالانکہ اگر نکمّا پن ہی اصل چیز ہے تو سب سے زیادہ نکمّا رہنے کا حق خدا تعالےٰ کو ہونا چاہیئے۔ آخر جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے کیا اُس کا یہ حق نہیں کہ وہ اِتنا بڑا کام کرنے کے بعد کچھ آرام بھی کرے۔ پس اگر آرام کرنا ہی بڑا کام ہے تو سب سے زیادہ نکمّا نعوذ باللہ خدا تعالےٰ کو ہونا چاہیئے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں اللہ تعالیٰ بھی کام کرتا ہے اُس کے رسول بھی کام کرتے ہیں، اُس کے خلیفے بھی کام کرتے ہیں اور اُس کے مومن بندے بھی کام کرتے ہیں۔ پھر یہ کیا کہ ایک زمانہ میں انبیاء کی جماعتیں یہ کہنے لگ جاتی ہیں کہ ہمیں اب کام کرنے کی ضرورت نہیں ہماری ذمہ واریاں کسی اَور نے اُٹھالی ہیں۔ دراصل یہ قومی تنزّل کی علامتیں ہیں اور اس وقت بھی مسلمانوں میں عمل کا ترک اُن کے اسی قومی تنزّل کا ثبوت ہے وہ یہی چاہتے ہیں کہ اُن کا بوجھ کوئی اَور اُٹھائے مسیح آجائے اور اُن کے گھر مال و دولت سے بھر دے۔ خود اُنہیں کوئی کام نہ کرنا پڑے۔ گویا خدا اور اُس کے رسول کا بس یہی کام ہے کہ وہ ڈاکوؤں کی طرح دوسروں کا مال لوٹ کر مسلمانوں کے حوالے کردیں اور اُن کی بہو بیٹیاں اغوا کر کے مسلمان نوجوانوں کو دیتے چلے جائیں تاکہ وہ عیاشیاں کریں۔ یہ کتنی بڑی بدعملی ہے جو غلط اعتقادات کی وجہ سے بعض مسلمانوں میں پائی جاتی ہے اور کیا ایسی قوم دنیا میں کوئی بھی ترقی کرسکتی ہے۔ حالانکہ جہاں حقیقی محبت ہو وہاں کام زیادہ کیا جاتا ہے اور عام حالات سے زیادہ قربانی پیش کی جاتی ہے۔ مشرک لوگ اپنے جھوٹے معبودوں کے لئے کتنے پاپڑ بیلتے ہیں اور طرح طرح کی تکالیف اُٹھا کر اُنہیں خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تو جہاں حقیقی محبت ہوتی ہے وہاں انسان کام زیادہ کرتا ہے کام کو چھوڑ نہیں دیا کرتا۔ یہی بات اللہ تعالےٰ لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ کی آیات میں بیان فرماتا ہے یعنی مکّہ کے قریش اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اُن پر مہربانی کی، اُن کے لئے امن قائم کیا، اُن کی بھوک کو دُور کیا اور اُن کے لئے ہر قسم کے خطرات کو دنیا سے ہٹا دیا تو اُن کو چاہیئے تھا کہ وہ رب البیت کی عبادت بھی کرتے۔ مگر ایک طرف تو یہ مانتے ہیں کہ خدا نے اُن کے خوف کو دُور کیا، خدا نے اُن کی بھوک کو دور کرنے کے سامان مہیا کئے مگر دوسری طرف یہ اتنے نکمّے ہوگئے ہیں کہ ہماری عبادت تک نہیں کرتے۔ ہم نے ان کے دلوں میں جو ایلاف کیا اور اُس کے نتیجہ میں رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ کو قائم کیا ان کے سفر نفع مند ہوگئے اور ان کی بھوکیں دور ہوگئیں انہیں سوچنا چاہیئے کہ یہ سب کچھ کیوں کیا گیا۔ آخر ہماری کوئی غرض تھی، کوئی مقصد تھا، کوئی وجہ تھی جس کی بناء پر ان سے یہ سلوک کیا گیا تھا۔ اور وہ وجہ یہی تھی کہ وہ اس گھر کو آباد رکھیں۔ پس چاہیئے کہ جبکہ ہم نے اپنا حق ادا کر دیا ہے تو یہ بھی اپنا حق ادا کریں اور عبادتِ الٰہی میں اپنا وقت گذاریں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سفر بھی لوگوں کے دلوں میں حج کا شوق پیدا کرنے اور اُنہیں خانہ کعبہ کی طرف متوجہ کرنے کا ایک ذریعہ تھے جیسا کہ میں اُوپر بتا چکا ہوں اہلِ عرب کو شروع میں حج کی طرف

کوئی زیادہ توجہ نہیں تھی پس اللہ تعالیٰ نے اِن سفروں کو انہیں حج کی طرف متوجہ کرنے کا ایک ذریعہ بنا دیا۔ جب یہ لوگ اُن کے گھروں میں جاتے اور ذکر کرتے کہ ہم مکہ سے آئے ہیں جہاں خانۂ کعبہ ہے اور جس کا اِس اِس طرح حج کیا جاتا ہے اور جس سے بڑی بڑی برکتیں حاصل ہوتی ہیں تو تمام عرب میں پراپیگنڈہ ہو جاتا اور وہ لوگ جو حج سے غافل تھے اُن کے دلوں میں بھی حج کرنے کی تحریک پیدا ہو جاتی۔ اِس طرح اُن کو روزی بھی مل جاتی اور حج بھی لوگوں میں زیادہ سے زیادہ مقبول ہوتا چلا جاتا۔

چوتھے معنے اس کے یہ ہیں کہ تعجب ہے مکہ والوں نے اپنے نفسوں پر سردی اور گرمی کے سفر واجب کر چھوڑے ہیں اور بیٹھ کر خدا تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے۔ یہ معنے بھی بعض مفسرین نے کئے ہیں یعنی تعجب ہے کہ یہ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ تو کرتے ہیں مگر عبادت نہیں کرتے انہیں چاہیئے کہ یہ ان سفروں کو چھوڑ دیں اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اپنا وقت گذاریں۔ مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ معنے درست معلوم نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ ساری تاریخ اور خود عبارت کی بناوٹ بتا رہی ہے کہ یہاں اُن کے اس فعل کو بُرا نہیں کہا گیا بلکہ اُسے اچھا قرار دیا گیا ہے اور جب اُن کے اِس فعل کو اچھا قرار دیا گیا ہے تو اس آیت کے یہ معنے نہیں ہو سکتے کہ وہ سفر کیوں کرتے ہیں انہیں چاہیئے کہ وہ سفر چھوڑ دیں اور بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں پس یہ معنے لغتاً اور نحواً تو درست ہیں مگر یہاں چسپاں نہیں ہوتے۔ دوسرے وہ یہ سفر اس لئے کیا کرتے تھے کہ روٹی کما کر لائیں اور پھر مکہ والوں میں بانٹیں تا کہ وہ مکہ میں ہی رہیں، تلاشِ معاش میں مکہ چھوڑ کر اِدھر اُدھر نہ چلے جائیں۔ اب اِن معنوں کو درست تسلیم کرنے کا تو یہ مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اُن سے فرماتا ہے کہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے کہ تم باہر جاؤ اور مکہ والوں کو کھلاؤ۔ مگر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ معنے عقل کے خلاف ہیں۔ اِس لئے اِس آیت کا ہرگز یہ مفہوم نہیں۔

اِن سفروں کی ضرورت تو اُنہیں موت اور ہلاکت کی وجہ سے پیش آئی تھی۔ اگر بلاضرورت مکہ والے سفر کرتے تو اعتراض کی بات تھی مگر جبکہ ایک اعلیٰ مقصد کے لئے انہوں نے یہ سفر اختیار کئے تھے تو اس آیت کے یہ معنے کرنا کہ وہ سفر کیوں کر رہے ہیں اِن سفروں کو چھوڑیں اور بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں کسی طرح بھی درست معلوم نہیں ہوتا۔ ہاں یوں یہ معنے درست ہو سکتے ہیں کہ اِن معنوں کو زمانۂ نبوی سے مخصوص قرار دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ پہلے تو یہ سفر جائز تھے مگر اب تو مکہ والوں کو یہ سب کام چھوڑ کر صداقتِ محمدیت پر غور کرنا چاہیئے اور زیادہ سے زیادہ دین کی خدمت میں لگ جانا چاہیئے۔ اگر یہ معنے کئے جائیں تو یقیناً درست ہیں چنانچہ دیکھ لو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد یہ سفر خود بخود بند ہو گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حج کو اتنا مقبول کر دیا کہ مکہ والوں کو باہر جانے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ وہیں بیٹھے بٹھائے اللہ تعالیٰ اُن کو رزق دے دیتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے چونکہ تجلی کامل نہیں ہوئی تھی اس لئے مکہ والوں کو ان سفروں کی ضرورت پیش آتی رہتی تھی مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد تجلی الٰہی کامل طور پر ظاہر ہو گئی اس لئے اب یہ ضرورت نہیں تھی کہ مکہ والے سفر کریں۔ اگر ہم اس آیت کے یہ محدود معنے کر لیں تو پھر کوئی اعتراض نہیں پڑتا۔ ہم کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اِن سفروں کو کلیۃً بُرا نہیں کہا بلکہ مکہ والوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بعد اب اِن سفروں کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں چاہیئے کہ اِن سفروں کو چھوڑ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے فائدہ اٹھاؤ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اپنا وقت گذارو۔ ان معنوں کے رُو سے یہ کفار پر ایک ضربِ کاری اور مسلمانوں کی عظیم الشان تعریف ہے۔ آخر مومن بھی تو مکہ کے ہی رہنے والے تھے اور اُن کی ضروریات بھی ویسی ہی تھیں لیکن وہ تو ایمان لاتے ہی سب کچھ چھوڑ کر تبلیغِ حق اور خدمتِ دین

میں لگ گئے اور جب وہ ایسا کر سکتے تھے تو مکہ کے اور لوگ ایسا کیوں نہیں کر سکتے تھے۔

ان معنوں سے پھر احمدیوں کے لئے ایک سبق نکلتا ہے۔ انہیں سوچنا چاہیئے کہ کیا مکہ والوں پر خدا تعالیٰ کا کوئی زیادہ احسان تھا جس طرح اُن کو خدا تعالیٰ نے ناک کان اور مُنہ دئے تھے اسی طرح ہم کو اُس نے ناک کان اور مُنہ بخشے ہیں۔ جس طرح اُن کو قویٰ عطا کئے گئے تھے اُسی طرح ہم کو قویٰ دئے گئے ہیں۔ جو علوم اُن کو دئے گئے تھے وہی علوم ہم کو دیئے گئے ہیں۔ جو قرآن اُن کو دیا گیا تھا وہی قرآن ہم کو دیا گیا ہے۔ اُس میں سے کوئی حصہ کم تو نہیں کر دیا گیا۔ اگر مکہ والوں کو اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ تم اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف توجہ کرو اور اپنے تمام اوقات خدمتِ دین میں صرف کرو تو یہ حکم مکہ والوں کے ساتھ کوئی مخصوص تو نہیں تھا۔ جو حالت اُن کی تھی وہی حالت ہماری ہے اور جو صداقت اُن کے پاس تھی وہی صداقت ہمارے پاس ہے۔ جب ہماری جماعت دعویٰ کرتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی تمام صداقتوں کا احیاء حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ فرمایا ہے تو سورۂ ایلاف میں جس صداقت کو پیش کیا گیا ہے لازماً ہمیں اُس صداقت کا بھی از سرِ نو احیاء کرنا پڑے گا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس سورۃ میں تو قریش مخاطب کئے گئے ہیں ہم ایسا کیوں کریں۔ اِس لئے کہ ہماری جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوبارہ ظلّی رنگ میں مبعوث فرمایا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت درحقیقت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہی بعثت ثانیہ ہے جب ہماری جماعت یہ تسلیم کرتی ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظلِّ کامل ہیں تو ہماری جماعت کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ بیت اللہ کا ظل وہ مقام ہے جہاں خدا تعالیٰ کا نام روشن ہوتا ہے اور صحابہ کا ظل وہ جماعت ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر ایمان لا چکی ہے۔ اِس صورت میں جو فرائض اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیت اللہ میں رہنے والوں پر عائد ہو چکے ہیں یقیناً وہی فرائض ہماری جماعت پر بھی عائد ہوتے ہیں۔ دنیا میں بھی ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ جب باپ مر جاتا ہے تو تمام بھائیوں میں سے بڑا بھائی اُس کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ اُس وقت کوئی نہیں پوچھتا کہ ہمارا یہ بڑا بھائی باپ کا قائم مقام کس طرح بن گیا۔ کیونکہ عقل کہتی ہے کہ جب اصل سامنے نہ ہو تو بہرحال اُس کا کوئی ظل ہونا چاہیئے اور پھر عقل یہ بھی کہتی ہے کہ جو ذمہ داریاں اصل پر عائد ہوتی ہیں وہی ذمہ داریاں ظل پر بھی عائد ہوں گی۔ پس ہماری جماعت جب ظلّی رنگ میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہی جماعت ہے اور ظلِّ محمدؐ پر ایمان لا کر ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جماعت میں شامل ہو چکے ہیں تو ہمیں بھی ان آیات کا اپنے آپ کو ویسا ہی مخاطب سمجھنا پڑے گا جیسے صحابہؓ مخاطب تھے۔ اور ہمیں بھی وہی کچھ کرنا پڑے گا جو صحابہؓ نے کیا۔ اللہ تعالیٰ اِن آیات میں زمانۂ محمدی کے لوگوں سے کہتا ہے فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۔ تم کو چاہیئے کہ تم عبادتوں میں اپنا وقت لگاؤ اور ذکرِ الٰہی کی عادت ڈالو۔ یہی کام احمدیوں کا ہے مگر افسوس ہے کہ احمدیوں نے اب تک اس مقام کو نہیں پایا۔ کتنے احمدی ہیں جو اس معیار پر پُورے اُترتے ہیں بے شک دوسروں سے زیادہ چندہ دینے والے احمدی موجود ہیں مگر چندہ سے تو دین نہیں پھیلتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ دین کی ترقی تو نفس کی صفائی اور عبادت کی کثرت سے ہوتی ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ ذکرِ الٰہی اور عبادت کی طرف بہت ہی کم توجہ ہے۔ فرض نمازیں بیشک وہ دوسروں سے زیادہ ادا کرتے ہیں مگر ذکرِ الٰہی کرنا۔ مساجد میں بیٹھنا۔ راتوں کو اُٹھ کر تہجد ادا کرنا۔ اعتکاف کرنا۔ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جن کا قرآن کریم میں

ذکر آتا ہے اور جو نفس کی اصلاح کے ساتھ نہایت گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ مگر ہماری جماعت کی توجہ ان کی طرف بہت کم ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعائیں کیں اُن میں بھی آتا ہے کہ الٰہی تیرے لئے اعتکاف کرنے والے لوگ اور تیری عبادت میں اپنا وقت گذارنے والے لوگ میری اولاد میں ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ احمدیوں کو اس طرف بہت کم توجہ ہے حالانکہ جب تک اِن باتوں کی طرف توجہ نہ ہو انسان کا نفس کبھی جِلا نہیں پاتا۔ جلاءِ نفس ہمیشہ ذکر الٰہی سے ہوتا ہے۔ نمازوں کے متعلق بھی میں دیکھتا ہوں کہ اس امر کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی کہ نمازیں آہستگی کے ساتھ پڑھیں۔ لوگ سُنتیں جلدی جلدی ختم کرکے مسجد سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لاہور میں جن دنوں اُمّ طاہر بیمار تھیں میں متواتر جماعت کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا رہا اور میں نے دیکھا کہ آخر پندرہ بیس دن کے بعد جماعت کو یہ عادت ہوئی کہ وہ آہستہ آہستہ نماز پڑھے امام کے ساتھ تو آہستہ نماز پڑھنے پر لوگ مجبور ہوتے ہیں ورنہ اگر اُن کا بس چلے تو امام رکوع میں ہی ہو اور وہ سلام پھیر کر چلے جائیں۔ لیکن جب فرض نماز ختم ہوتی ہے اور سُنتیں پڑھنے کا وقت آتا ہے تو جھٹا پٹ ایک دوڑ شروع ہو جاتی ہے جو نہایت نامناسب اور اسلامی تعلیم کے خلاف حرکت ہے۔ ہماری جماعت کے دوستوں کا فرض ہے کہ وہ ٹھہر ٹھہر کر نمازیں پڑھا کریں اور اپنے اوقات کا ایک بڑا حصہ ذکر الٰہی اور دُعاؤں میں صرف کیا کریں اور دوسرے مسلمانوں سے بھی انہیں یہی کہنا چاہیئے کہ وہ عبادت اور ذکر الٰہی پر زور دیں۔ کیونکہ اسلام کی اصل ترقی ذکر الٰہی اور عبادت پر زور دینے سے ہی ہوگی۔

تاریخوں سے ثابت ہے کہ جب رومی سفیر مسلمانوں کی حالت دیکھ کر واپس گیا تو اُس نے بادشاہ سے کہا کہ آپ مسلمانوں کے مقابلہ میں جیت نہیں سکتے۔ اُس نے پوچھا کیوں؟ رومی سفیر نے جواب دیا کہ وہ تو سارا دن لڑتے اور ساری رات اللہ تعالیٰ کی عبادتیں کرتے ہیں۔ وہ آدمی نہیں بلکہ جنّ معلوم ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت پر زور دینا ایسا نُور پیدا کر دیتا ہے جس سے پہلے انسان کو اپنے نفس پر قابو حاصل ہوتا ہے اور پھر وُہ دُنیا کی اور طاقتوں کو مغلوب کر لیتا ہے۔

آج کل کے لوگ مغربی تہذیب کے ماتحت یہ سمجھتے ہیں کہ ذکر الٰہی وغیرہ کرنا اور مصلّے پر بیٹھے رہنا وقت کو ضائع کرنا ہے۔ حالانکہ یہ مصلّے پر بیٹھ کر ذکر الٰہی کرنیوالے ہی تھے جنھوں نے بارہ سال کے اندر اندر آدھی دُنیا تہ و بالا کر دی۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ مصلّے پر بیٹھنے سے وقت ضائع نہیں ہوتا بلکہ انسان کو ایسی برکت ملتی ہے کہ وہ بڑے بڑے کام تھوڑے سے وقت میں کر لیتا ہے۔ پس مصلّے پر بیٹھنے کے معنے نکماپن کے نہیں بلکہ درحقیقت اس سے ایسی مہارت پیدا ہو جاتی ہے اور دل میں اس قسم کا نور پیدا ہو جاتا ہے کہ تھوڑے سے وقت میں انسان بڑے بڑے کام کر لیتا ہے۔ اگر تین گھنٹے وہ ذکر الٰہی میں مصروف رہتا ہے تو بیشک بظاہر اُس کے تین گھنٹے وقت میں سے کم ہو جائیں گے مگر انہی تین گھنٹوں کی بدولت وہ آٹھ گھنٹوں میں وہ کچھ کام کر لیگا جو باقی ۲۴ گھنٹوں میں بھی نہیں کر سکیں گے۔ پس عبادت کی کثرت تہجد اور ذکر الٰہی کی طرف توجہ کرو اور اپنی زندگیاں دین کی خدمت کے لئے وقف کرو۔ میں بتا چکا ہوں کہ ابھی ہماری جماعت میں بہت تھوڑے لوگ ہیں جنھوں نے خدمتِ دین کے لئے اپنی زندگیاں وقف کی ہوں اور پھر جو اپنی زندگیاں وقف کر چکے ہیں اُن میں سے بھی ایک حصہ ایسا ہے جو اپنے فرائض کو نہیں سمجھتا مثلاً کوئٹہ کی جماعت کو ہی لے لو۔ یہ جماعت بہت سی جماعتوں سے اچھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے بعض کاموں میں

اِس نے نہایت شاندار نمونہ دکھایا ہے مگر جہاں تک زندگی
وقف کرنے کا سوال ہے ابھی وہ بھی اِس میں بہت پیچھے ہے۔
اس معاملہ میں سب سے بڑی ذمہ واری حضرت
مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاندان پر ہے۔ مَیں
صرف دوسروں پر اعتراض نہیں کرتا۔ میں حضرت مسیح موعود
علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاندان کے افراد کو بھی اِس میں
شامل کرتا ہوں۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ اُن میں سے بھی ایک حصہ
اس فرض کو بھول کر دنیوی کاموں اور تجارتوں میں مشغول
ہو گیا ہے اور یہ ایک بہت بڑی کوتاہی ہے جس کا وہ
ارتکاب کر رہے ہیں۔ لیکن میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اُن کو
بگاڑنے والی زیادہ تر جماعت ہے جو اُن کو صاحبزادے
صاحبزادے کہہ کر خراب کر دیتی ہے۔ حالانکہ جو صاحب
کو بھول گیا وہ زادہ کہاں سے آ گیا۔ وہ دکانیں کر رہے
ہیں، وہ تجارتیں کر رہے ہیں۔ روپیہ کمانے کی کوششیں
کر رہے ہیں اور جب اُنہیں کہا جائے کہ تم دین کے لئے
اپنی زندگی کیوں وقف نہیں کرتے تو اُن کا جواب یہ ہوتا
ہے کہ اگر ہم زندگیاں وقف کریں تو گذارہ کس طرح کریں
گویا دوسرا شخص اگر تیس روپیہ لے کر گذارہ کر سکتا ہے
تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اِتنے تھوڑے روپوں میں گذارہ
نہیں کر سکتے۔ حالانکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام
کا نام خدا تعالیٰ نے ابراہیم بھی رکھا ہے جس سے خدا تعالیٰ
کا یہی منشاء ہے کہ آپ کی اولاد اسماعیلی نمونہ کو اختیار
کرے اور دین کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے۔ اس
کے بعد خدا اُنہیں زیادہ دے تو وہ زیادہ قبول کریں اور
اگر کم دے تو کم پر راضی رہیں یہ خدا تعالیٰ کی مرضی پر
منحصر ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت میں سے
بعض فاقہ زدہ نبی بھی ہوتے ہیں اور حضرت سلیمانؑ جیسے
بادشاہ بھی گذرے ہیں جن کے لشکروں اور نوکروں کی
تعداد ہی ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ میں یہ بھی دیکھتا ہوں
کہ جماعت کے سفلی طبع لوگ یا منافق طبقہ اُنکو ادنیٰ نگاہ
سے دیکھتا ہے جو دین کی خدمت کرتے ہیں اور اُن کی
تعریف کرتا ہے جو دنیا کمانے میں لگے ہوئے ہیں۔
مَیں خوب سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کا ایک حصہ جاہل ہے
اور دوسرا منافق۔ جو اس طرح جماعت کو تباہ کرنا چاہتا
ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کا فعل ایک دن
ایسے سب لوگوں کو خس کم جہاں پاک کر دے گا۔ کیونکہ
مومنوں کا دَور ابھی آنا ہے۔ بہرحال میں جماعت کو یہ
انتباہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس بارہ میں ہماری جماعت
خطرناک کوتاہی کا ارتکاب کر رہی ہے۔ دین کی خدمت
کے لئے جتنے لوگوں کو اپنی زندگی وقف کرنی چاہیئے
اُتنے لوگ اپنی زندگی وقف نہیں کر رہے اور پھر جو زندگی
وقف کرتے ہیں وہ بھی اپنے فرائض کو پورے طور پر ادا
نہیں کر رہے۔ حالانکہ جب تک اس امر کی طرف توجہ نہیں
ہوگی ہمارا کبھی بھی وہ پیمان پُورا نہیں ہوگا جو ہم خدا کے
ساتھ بیعت کے وقت کرتے ہیں۔ اور جب تک ہم اپنے
پیمان کو پُورا نہیں کرتے اُس وقت تک خدا تعالیٰ کا
ہمارے متعلق جو عہد ہے اُس کے بھی ہم کبھی حقدار نہیں
ہو سکتے۔

اب میں پھر اِس مضمون کی طرف آتا ہوں اور بتاتا
ہوں کہ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ نتیجہ
ہے لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ
وَالصَّيْفِ کا۔ یعنی خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے
اہلِ مکہ سے احسان اور سلوک اِسی لئے کیا تھا کہ وہ ہماری
عبادت کرتے۔ آخر کیا حق تھا اُن کا ہم پر کہ ہم دوسروں
کے مقابلہ میں اُن سے نمایاں سلوک کرتے۔ کیا یورپ
والے ہمارے دشمن تھے۔ کیا ہندوستان والے ہمارے
دشمن تھے۔ کیا حبشی ہماری مخلوق نہیں تھے؟ پھر کیوں ہم
نے اُن کی ترقی کا خاص سامان کیا؟ اِسی لئے کہ وہ ہمارے
گھر کے پاس رہتے ہیں۔ تا ایسا نہ ہو کہ اُنہیں روٹی کی
تکلیف ہو اور وہ اس مقام کو چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ مگر

دیکھو ہم تو انہیں روٹی دیتے رہے مگر انہوں نے ہمارا خیال نہ رکھا حالانکہ انہیں چاہیئے تھا کہ اس احسان کے بدلے میں وہ رب البیت کی عبادت کرتے اور ہمارے احسانات کی قدر کرتے۔

یہاں رب البیت کیوں کہا ہے؟ صرف بیت کیوں نہیں کہا۔ اِس لئے کہ قرآن کریم اس بات کا قائل نہیں کہ کوئی بے جان چیز اپنے اندر طاقتیں رکھتی ہے۔ وہ طاقتوں کا مالک صرف خدا تعالیٰ کو سمجھتا ہے۔ پس توحیدِ کامل کا سبق دینے کے لئے یہاں رب البیت کے الفاظ رکھے گئے ہیں۔ یعنی مکہ والے یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس بیت کی وجہ سے انہیں یہ اعزاز حاصل ہوا ہے حالانکہ یہ اعزاز انہیں بیت کی وجہ سے نہیں بلکہ رب البیت کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ گویا نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ تم یہ مت سمجھو کہ خانۂ کعبہ نے کچھ کیا ہے خانۂ کعبہ کچھ نہیں کر سکتا وہ مٹی کا ایک مکان ہے اور اُس میں یہ طاقت ہرگز نہیں کہ وہ کسی کو کوئی فائدہ پہنچا سکے۔ اِس گھر کا رب ہے جو سب طاقتوں کا مالک ہے۔ احادیث میں آتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ طواف کر رہے تھے کہ آپ حجرِ اسود کے پاس سے گذرے اور آپ نے اُسے اپنی سوٹی ٹھکرا کر کہا مَیں جانتا ہوں کہ تُو ایک پتھر ہے اور تجھ میں کچھ بھی طاقت نہیں مگر میں خدا کے حکم کے ماتحت تجھے چُومتا ہوں۔ یہی جذبۂ توحید تھا جس نے اُن کو دنیا میں سربلند کیا۔ وہ خدائے واحد کی توحید کے کامل عاشق تھے۔ وہ یہ برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ اُس کی طاقتوں میں کسی اَور کو شریک کیا جائے بے شک وہ حجرِ اسود کا ادب بھی کرتے تھے مگر اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے کہا ہے اس کا ادب کرو۔ نہ اِس لئے کہ حجرِ اسود کے اندر کوئی خاص بات ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر خدا تعالیٰ ہمیں کسی حقیر سے حقیر چیز کو چُومنے کا حکم دیدے تو ہم اُس کو چومنے کے لئے بھی تیار ہیں کیونکہ ہم خدا تعالیٰ کے بندے ہیں کسی پتھر یا مکان کے بندے نہیں۔ پس وہ ادب بھی کرتے تھے اور توحید کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتے تھے اور یہی ایک سچے مومن کا مقام ہے۔ ایک سچا مومن بیت اللہ کو ویسے ہی پتھروں کا ایک مکان سمجھتا ہے جیسے دنیا میں اور ہزاروں مکان پتھروں کے بنے ہوئے ہیں۔ ایک سچا مومن حجرِ اسود کو ویسا ہی پتھر سمجھتا ہے جیسے دنیا میں اَور کروڑوں پتھر موجود ہیں مگر وہ بیت اللہ کا ادب بھی کرتا ہے، وہ حجرِ اسود کو چُومتا بھی ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میرے رب نے اِن چیزوں کے ادب کرنے کا مجھے حکم دیا ہے مگر باوجود اس کے کہ وہ اس مکان کا ادب کرتا ہے باوجود اس کے کہ وہ حجرِ اسود کو چُومتا ہے پھر بھی وہ اس یقین پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم ہوتا ہے کہ مَیں خدائے واحد کا بندہ ہوں کسی پتھر کا بندہ نہیں۔ یہی حقیقت تھی جس کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اظہار فرمایا۔ آپ نے حجرِ اسود کو سوٹی ماری اور کہا میں تیری کوئی حیثیت نہیں سمجھتا۔ تُو ویسا ہی پتھر ہے جیسے اور کروڑوں پتھر دُنیا میں نظر آتے ہیں۔ مگر میرے رب نے کہا ہے کہ تیرا ادب کیا جائے اس لئے میں ادب کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے اور اُس پتھر کو بوسہ دیا اِس کا مطلب یہی تھا کہ خدا نے تیرا ادب سکھایا ہے اس لئے مَیں ادب کرتا ہوں ورنہ تیرے اندر ذاتی طور پر کوئی ایسی طاقت نہیں جس کی بناء پر تجھے چُوما جا سکے۔ جب اس احساس کے ساتھ ہم حجرِ اسود کو چومتے ہیں کہ ہمارے خدا نے اِس کو چومنے کا حکم دیا ہے ورنہ وہ ایک معمولی پتھر ہے تو ہم توحید پر قائم ہوتے ہیں۔ اور جب ہم اِس کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اُس پتھر کو کسی خاص خوبی کا مالک سمجھ لیتے ہیں تو ہمارا یہی فعل مشرکانہ فعل بن جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے حجرِ اسود کو چُوما مگر وہ مشرک نہیں تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ حجرِ اسود اپنی ذات میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میرے رب کا حکم مجھے لایا اور میں نے اُسے چُوما۔ لیکن اگر کوئی دوسرا شخص حجرِ اسود کو

چومتا ہے اور دل میں سمجھتا ہے کہ حجرِ اسود میں کوئی خاص بات ہے جس کی وجہ سے اُسے چوما جاتا ہے تو وہی شخص مشرک بن جائے گا۔ اگر ایک شخص خانہ کعبہ کا اس لئے طواف کرتا ہے کہ میرے خدا نے اس کے طواف کرنے کا حکم دیا ہے تو وہ بڑا موحد ہے اور اگر کوئی شخص خانہ کعبہ کا اِس لئے طواف کرتا ہے کہ اِس گھر میں کوئی خاص طاقت ہے تو وہ مشرک ہے یہی مضمون اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ تم سمجھتے ہو اِس بیت کی وجہ سے تمہیں یہ اعزاز حاصل ہوا ہے احمقو! یہ سب کچھ اِس بیت نے نہیں کیا بلکہ رب البیت نے کیا ہے۔ اس گھر کو تو خدا نے محض ایک علامت کے طور پر مقرر کیا ہے۔ جیسے پُرانے زمانہ میں دستور تھا کہ بادشاہ کسی بکرے یا اُونٹ وغیرہ پر اپنا نشان لگا کر اُسے آزاد چھوڑ دیتے تھے اور کسی کی طاقت نہیں تھی کہ اُس کو نقصان پہنچا سکے اور اگر کوئی اسکو نقصان پہنچاتا تو اُس کے معنے یہ ہوتے تھے کہ بادشاہ کی ہتک کی گئی ہے۔ چنانچہ جب کوئی مخالف بادشاہ اُس بکرے یا اُونٹ کو مار ڈالتا تو اُس سے لڑائی شروع ہو جاتی تھی۔ اِس لئے نہیں کہ اُس نے اُونٹ کو مارا ہے اِس لئے نہیں کہ اُس نے گھوڑے کو مارا ہے۔ اِس لئے نہیں کہ اُس نے بکرے کو مارا ہے۔ اس لئے نہیں کہ اُس نے دُنبہ کو مارا ہے بلکہ اِس لئے کہ بادشاہ یہ سمجھتا تھا کہ اُس نے میری ہتک کی ہے۔ اسی طرح بیت اللہ کو خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے لئے ایک مرکز اور اولادِ ابراہیم کو جمع رکھنے کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ پس وہ خدا کی ایک علامت ہے جو دنیا میں پائی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ اس گھر میں کوئی خاص بڑائی پائی جاتی ہے تو وہ مشرک ہے اور اگر کوئی شخص اس کی یہ سمجھ کر ہتک کرتا ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کی مقرر کردہ نشانی نہیں تو وہ

خدا کا بھی دشمن ہے۔ ایک سے وہ معاملہ کیا جائیگا جو مشرکوں سے کیا گیا اور دوسرے سے وہ معاملہ کیا جائیگا جو اصحاب الفیل سے کیا گیا۔ صرف اُسی شخص کا نقطۂ نگاہ صحیح سمجھا جائے گا جو یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ کیا رب البیت نے کیا ہے بیت نے نہیں کیا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ۔ جو کچھ مکّہ والوں سے سلوک ہو رہا ہے اس کی وجہ رب البیت کے سوا کوئی نہیں۔ اگر اس گھر کا کوئی رب نہ تھا تو اصحاب الفیل کو کس نے تباہ کیا۔ اگر رب البیت نہ تھا تو مکہ کی حفاظت اِس طرح صدیوں تک کس نے کی۔ اگر رب البیت نہ تھا تو مکّہ والوں کو رزق کس نے مہیا کیا۔ اگر رب البیت نہ تھا تو اُن کے اِن سفروں میں یہ برکات کس طرح رکھی گئیں۔ اگر رب البیت نہ تھا تو آنے والے موعود کی یاد دلانے کے لئے جس کی خاطر یہ گھر بنایا گیا تھا مکّہ والوں کو اِن ملکوں سے کس نے روشناس کروایا۔ پس جب تمہارے ساتھ جو کچھ سلوک کر رہا ہے خدا تعالیٰ کر رہا ہے تو یہ کیسی قابلِ شرم حرکت ہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر لات اور منات اور عُزّیٰ کی پرستش کر رہے ہو اور سمجھتے ہو کہ خانہ کعبہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ہم جو جی چاہے کر لیں ہمارے لئے جائز ہے تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اس خانہ کعبہ کی عزت بھی رب البیت کی وجہ سے ہے اور جب اس کی عزت بھی رب البیت سے وابستہ ہے اور اُسی نے تم کو ترقیات بخشی ہیں تو کیا تمہارا فرض نہیں کہ تم شرک چھوڑ دو اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ گویا عبادت اور توحید دونوں پر اس آیت میں زور دیا گیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ جھوٹے معبودوں اور مندروں اور پجاریوں کی بھی تو دنیا میں عزت کی جاتی ہے۔ پھر کیا وہ عزت بھی اس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ بُتوں نے اُن کو عزت دی ہے یعنی تم یہ کہتے ہو کہ

خانہ کعبہ کی عزت رب البیت کی وجہ سے ہے حالانکہ دنیا میں ایسے مندر بھی موجود ہیں جن کی بڑی عزت کی جاتی ہے پھر کیا اُن کی عزت بھی اُن کے بتوں کی طرف منسوب ہو سکتی ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان بتوں نے اُن کو عزت دی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جھوٹی اور سچی چیزیں ایک ہی وقت میں دنیا میں موجود رہتی ہیں۔ سونا بھی موجود ہوتا ہے اور ملمع بھی موجود ہوتا ہے مگر کیا ملمع کی وجہ سے لوگ سونے کو چھوڑ دیا کرتے ہیں؟ اسی طرح دنیا میں سیپ کے بنے ہوئے موتی بھی موجود ہیں اور اصلی موتی بھی موجود ہیں نقلی ہیرا بھی موجود ہے اور اصلی ہیرا بھی موجود ہے۔ ایسی صورت میں ہم کیا کرتے ہیں کیا ہم اصلی چیزوں کو چھوڑ دیا کرتے ہیں یا ہم یہ کیا کرتے ہیں کہ ہمارے پاس ایسی امتیازی علامات ہیں جن پر پرکھ کر ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ جھوٹا کونسا ہے اور سچا کونسا۔ ہم جھوٹے موتیوں کی وجہ سے اصلی موتیوں کو چھوڑا نہیں کرتے۔ ہم جھوٹے ہیروں کی وجہ سے اصلی ہیروں کو چھوڑا نہیں کرتے۔ ہم جھوٹے سونے کی وجہ سے اصلی سونے کو چھوڑا نہیں کرتے۔ بلکہ ہم یہ کہا کرتے ہیں کہ ہمارے پاس ایسے امتیازی نشانات ہیں جن پر پرکھ کر ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ نقلی چیز کونسی ہے اور اصلی چیز کونسی۔ اسی طرح اس معاملہ میں بھی ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ یہ عزت جو خانہ کعبہ کو حاصل ہوئی خدا تعالیٰ کی طرف سے تھی یا نہیں اور اگر خدا تعالےٰ کی طرف سے تھی تو اس کا امتیازی نشان کیا تھا جو اسے دوسرے معبدوں اور مندروں سے ممتاز کر دے۔

اسی کو ایک اور مثال سے یوں سمجھ لو کہ ماں باپ بچے کو پالتے ہیں اور ماں باپ کی خدمت بچہ کی طبعی محبت کا ثبوت ہوتی ہے لیکن بعض دفعہ ٹھگ بچہ چرا کر لے جاتے ہیں اور بچہ کو آئندہ کی شرارت کی غرض سے پالتے ہیں۔ وہ اُس کو بد اخلاق، چور اور ڈاکو بنانے کی کوشش کرتے ہیں مگر بہرحال وہ پالتے محبت سے ہیں۔ اگر ماں باپ کی طرح محبت سے نہ پالیں تو وہ فوراً بھاگ جائے گویا وہ محبت تو کرتے ہیں مگر اُن کی محبت جھوٹی ہوتی ہے۔ اب کیا اُن کا پالنا اس امر کی دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ ماں باپ کو بھی بچہ سے محبت نہیں ہوتی۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اصلی اور نقلی چیزوں میں بڑا بھاری فرق پایا جاتا ہے اسی طرح جھوٹے معبودوں اور مندروں اور پجاریوں کی عزت اور اُس عزت میں بڑا بھاری فرق ہے جو خانہ کعبہ کو حاصل ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ خانہ کعبہ اتفاقی طور پر معزز نہیں ہوا بلکہ خانہ کعبہ کی بنیاد اللہ تعالےٰ کے الہام سے رکھی گئی چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ یہ سب سے پہلا گھر تھا جو سب دنیا کے فائدہ کے لئے بنایا گیا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ پُرانے زمانے کے قومی مذہب ایسا گھر نہیں بنا سکتے جو سب دنیا کے لئے ہو۔ ایسا گھر خدا تعالےٰ ہی کی طرف سے اور اُسی کے الہام سے مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد زمانہ ابراہیمی میں پھر خدا تعالےٰ کے الہام کے مطابق اس کی عمارت کی تجدید ہوئی چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میں خدا کے لئے اس گھر کو بناتا ہوں اور اس لئے بناتا ہوں کہ یہاں لوگ آئیں، اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، اُس کے گھر کا طواف کریں، عبادت اور ذکر الٰہی میں اپنا وقت بسر کریں اور آنے والوں کی خدمت کریں۔ پھر اُنہوں نے دعا کی کہ خدایا تو بھی اس گھر کو امن دیجیو اور اس کے رہنے والوں کو اپنے پاس سے رزق دیجیو اور پھر اُن میں سے ایک نبی پیدا کیجیو جو انہیں تیری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنائے اُنہیں کتاب اور حکمت سکھائے اور اُنکے نفوس کا تزکیہ کرے یہ دعا تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے

خانہ کعبہ کی بنیاد رکھتے وقت کی۔ اُس وقت کی جب خانہ کعبہ کی ترقی کے کوئی آثار نہ تھے۔ اُس وقت کی جب اُس کی آبادی کے کوئی آثار نہ تھے۔ اُس وقت کی جب وہ محض ایک وادیٔ غیر ذی زرع تھی۔ اُس وقت کی جب اُس میں پانی کا ایک گھونٹ اور گندم کا ایک دانہ بھی موجود نہیں تھا۔ پس اس کے بعد خانہ کعبہ کی جو کچھ ترقی ہوئی اُسے یقیناً ہم اس دعا اور پیشگوئی کی طرف منسوب کریں گے اور کہیں گے کہ یہ سلوک محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا۔ اس کے مقابلہ میں دنیا میں بیشک لاکھوں مندر موجود ہیں مگر کیا اُن میں سے کوئی ایک مندر بھی ایسا ہے جس کی ترقی کسی پیشگوئی کے ماتحت ہوئی ہو۔ یا کیا ان مندروں میں سے کوئی ایک مندر بھی ایسا ہے جس کو ماننے والے آج ہی اس قسم کی پیشگوئی دنیا میں شائع کر سکیں۔ اگر اُن میں ہمت اور طاقت ہے تو وُہ ایسی پیشگوئی کریں اور پھر دیکھیں کہ اس کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ یُوں کسی مندر کی عزت ہونا اَور بات ہے اور پیشگوئی کے ماتحت عزت ہونا اور بات ہے۔ اگر ایک شخص کسی مجلس میں بیٹھے ہوئے قبل از وقت کہہ دیتا ہے کہ ابھی زید آئے گا اور پھر واقعہ میں زید آجاتا ہے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ دیکھو میری بات پوری ہو گئی۔ لیکن ایک اَور شخص جو چُپ کر کے بیٹھا رہتا ہے اگر وہ کہے کہ دیکھو میری بات پوری ہو گئی زید آگیا ہے تو ہر شخص اس پر ہنسے گا کہ تم نے یہ بات ہی کب کی تھی کہ زید کے آنے پر تم کہہ رہے ہو کہ میری بات پوری ہو گئی ہے۔ اسی طرح خانہ کعبہ کی بنیاد رکھتے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک پیشگوئی کی۔ اُس میں یہ بھی ذکر تھا کہ خانہ کعبہ ترقی کرے گا۔ یہ بھی ذکر تھا کہ لوگ یہاں حج اور طواف کیلئے آئیں گے۔ یہ بھی ذکر تھا کہ لوگ یہاں بسیں گے۔ یہ بھی ذکر تھا کہ اس گھر کو محفوظ رکھا جائے گا اور کوئی دشمن اسے تباہ نہیں کر سکے گا۔ یہ بھی ذکر تھا کہ اس مقام پر رہنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق دیا جائیگا جب ایک ایک کر کے تمام پیشگوئیاں پوری ہو گئیں اور پھر مخالف حالات میں پوری ہوئیں تو یقیناً ان پیشگوئیوں کا پورا ہونا اپنی ذات میں اس بات کا ثبوت ہے کہ خانہ کعبہ سے جو کچھ سلوک ہوا وہ اتفاقی نہیں تھا بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا۔ لیکن دوسرے مندروں میں سے اگر کسی کو کوئی عزت حاصل ہوتی ہے تو چونکہ اُس کے ساتھ کوئی پیشگوئی نہیں تھی اس لئے اُسے محض اتفاق پر محمول کیا جائے گا۔ پھر خانہ کعبہ کا محلِّ وقوع دیکھو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک ایسی جگہ یہ گھر بنایا جہاں کوئی آبادی نہیں تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک ایسی جگہ یہ گھر بنایا جس کے ارد گرد بھی میلوں میل تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک ایسی جگہ یہ گھر بنایا جہاں پانی موجود نہیں تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک ایسی جگہ یہ گھر بنایا جہاں کھیتی موجود نہیں تھی۔ گویا خدائی ہاتھ کا ثبوت دینے کے لئے جو جگہ ہر قسم کی ترقی کے سامانوں سے محروم تھی وہی جگہ اس گھر کے لئے تجویز کی گئی۔ پانی آبادی کے لئے ضروری ہوتا ہے مگر وہاں پانی نہیں تھا۔ کھیتی آبادی کیلئے ضروری ہوتی ہے مگر وہاں کھیتی نہیں تھی۔ شہر اور ارد گرد کی آبادی۔ آبادی کے لئے ضروری ہوتی ہے مگر وہاں نہ کوئی شہر تھا اور نہ اس کے ارد گرد کوئی آبادی تھی۔ ان حالات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے خبر پا کر دنیا میں یہ اعلان کرنا کہ یہاں لوگ آئیں گے اور حج بیت اللہ کریں گے اور پھر لوگوں کا وہاں آنا اور حج بیت اللہ کرنا اور ایک غیر آباد مقام کا آباد ہو کر ایک بہت بڑا شہر بن جانا بتاتا ہے کہ جو کچھ ہوا ربّ البیت کی طرف سے ہوا۔ اس کے مقابلہ میں اتفاقی طور پر اگر کسی مندر کو شہرت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ ہرگز اُس مندر کے کسی بُت کی طرف منسوب نہیں

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِيْٓ

پس اُنہیں لازم ہے کہ وہ (یعنی قریش) اس گھر (یعنی کعبہ) کے مالک کی عبادت کریں۔ جس نے اُنہیں

أَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝

ع ۲۱

(ہر قسم کی) بھوک (کی حالت) میں کھانا کھلایا اور (ہر قسم کے) خوف کی حالت میں امن بخشا ۔ ۵۳

ہو سکتی۔ کیونکہ کب اُس مندر کی عظمت کے متعلق پیشگوئی کی گئی تھی۔ کب یہ کہا گیا تھا کہ اس کی لوگوں میں شہرت ہو جائے گی اور کب کسی قوم اور مذہب نے اس دعویٰ کی سچائی پر اپنی عزت اور اپنی سچائی کی بازی لگائی تھی۔ پس اُسے اگر شہرت حاصل ہوئی ہے تو محض اتفاقی طور پر۔ جیسے لنڈن ایک بہت بڑا شہر بن گیا۔ مگر اس کے لئے کوئی پیشگوئی نہیں تھی۔ نیو یارک ایک بہت بڑا شہر بن گیا مگر اُس کے لئے کوئی پیشگوئی نہیں تھی بے شک وہ بہت بڑے شہر ہیں مگر انکی ترقی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہو سکتی لیکن اگر لنڈن سے پچاسویں حصہ کے برابر بھی کوئی شہر اللہ تعالیٰ کی پیشگوئی کے مطابق آباد ہوتا ہے تو ہم اُسے اللہ تعالیٰ کا نشان قرار دیں گے۔ پس کسی مندر کی مقبولیت اور خانہ کعبہ کی مقبولیت میں بڑا بھاری فرق ہے۔ خانہ کعبہ کی مقبولیت خدائی پیشگوئیوں کے مطابق ہوئی ہے لیکن مندروں کی مقبولیت محض ایک اتفاقی امر ہے جس طرح سونے کے مقابلہ میں ملمع ہوتا ہے اسی طرح خانہ کعبہ کی عظمت کے مقابلہ میں کسی مندر کی عظمت یا اُس کی ترقی بھی ایک ملمع سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

۵۳ تفسیر۔ اس آیت نے اُس مضمون کو بالکل واضح کر دیا ہے جس پر میں شروع سے زور دیتا چلا آرہا ہوں۔ میں نے بتایا تھا کہ یہاں اصل ذکر خدا کی خدائی اور اس کی طاقت و قوت اور اس کے فضل اور احسان کا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ خدا ہی ہے جس نے رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ کی محبت پیدا کی اور وہ خدا ہی ہے جس نے انہیں سفر کی سہولتیں مہیا کر کے عزت اور شہرت دی۔ اب اس آیت میں اُوپر کے اسی مضمون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب قریش پر ہم نے اس قدر احسانات کئے ہیں تو کیا اُن کا فرض نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ اُس خدا کی عبادت اَلَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ۔ جس خدا نے اُنہیں بھوک پر کھانا کھلایا اور اُن کے خوف کو امن سے بدل دیا۔

عربی زبان میں یہ قاعدہ ہے کہ کبھی اشارۂ قریب کا ذکر پہلے آجاتا ہے اور اشارۂ بعید کا ذکر بعد میں آتا ہے اور کبھی ترتیب کلام کو مدنظر رکھا جاتا اور اسی کے مطابق اشارہ لایا جاتا ہے۔ یہ دونوں طریق عربی زبان میں مروّج ہیں اور دونوں طرح ضمائر کا استعمال ہوتا ہے۔ اس جگہ اشارۂ قریب کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور اشارۂ بعید کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔ اشارۂ قریب لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ تھا اور اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ قریش بھوکے مرتے تھے ہم نے اُنہیں روٹی کھلائی۔ پس چونکہ روٹی کا قریب میں ذکر آتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے روٹی کا ہی ذکر کیا اور فرمایا اَلَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ۔ اس کے بعد دوسرا اشارہ جو اشارۂ بعید ہے۔ سورۃ الفیل کی آخری آیت فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ

کی طرف تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ابرہہ اور اُس کے لشکر کو بھوسہ کی طرح اڑا دیا۔ اگر ابرہہ کے لشکر کا کلّی استیصال نہ کیا جاتا تو یمن کو مکّہ کو مستقل خطرہ رہتا اور یمن کا سفر مکّہ والوں کے لئے بالکل ناممکن ہو جاتا۔ اسی طرح یمن سے لڑائی کی وجہ سے شام کا سفر بھی ناممکن ہو جاتا کیونکہ یمن بھی روم کا صوبہ تھا پس چونکہ اس صورت میں مکّہ والوں کے لئے یہ دونوں سفر ناممکن ہو جاتے۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا پُرہیبت نشان دکھایا کہ یمن کی مسیحی حکومت بالکل تباہ ہو گئی اور شام پر بھی رُعب طاری ہو گیا اور مکّہ والوں کے دونوں سفر قائم رہے پس چونکہ یہاں اشارہ بعید فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ کی طرف تھا اور اللہ تعالیٰ اپنے اُس احسان کا ذکر کرنا چاہتا تھا جو اُس نے اصحاب الفیل کو تباہ کر کے مکّہ والوں پر کیا اس لئے اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ کا ذکر اُس نے اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ کے بعد کیا۔

اس آیت نے سورۃ الفیل کی آخری آیت کی طرف اشارہ کر کے ہمیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ کے جو مختلف معانی کئے گئے ہیں وہ سب کے سب درست ہیں یعنی اس سورۃ میں ایک مستقل مضمون بھی بیان کیا گیا ہے اور اس میں پہلی سورۃ کے مضمون کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اَلَّذِیْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ نے سورۃ ایلاف کے مستقل مضمون کی طرف اشارہ کر دیا اور اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ نے سورۃ الفیل کی طرف اشارہ کر دیا۔ گویا یہ بھی درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب الفیل کو ایلافِ قریش کی غرض سے تباہ کیا اور یہ بھی درست ہے کہ اُن کے دلوں میں رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ کے متعلق رغبت پیدا کی تاکہ اُن کو روٹی مل جائے اور مکّہ میں اطمینان کے ساتھ بیٹھے رہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ اپنے اِن دونوں انعامات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ تم اُس خدا کی عبادت کرو جس نے تمہیں بھوک کی حالت میں کھانا کھلایا۔ جو تمہارے قافلوں کو شام اور یمن کی طرف لے گیا اور اس طرح اُس نے تمہارے لئے روٹی کا سامان کیا۔ اسی طرح تم اُس خدا کی عبادت کرو جس نے تمہارے خوف کو امن سے بدل دیا یعنی اصحاب الفیل جب حملہ کر کے آئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں تباہ کیا اور تمہارے لئے اُس نے امن کی صورت پیدا کی۔

مِنْ جُوْعٍ میں مِنْ کا لفظ کیوں رکھا گیا ہے اور جُوْعٍ پر تنوین کیوں آئی ہے؟ اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں اور دونوں ہی اس جگہ چسپاں ہوتی ہیں پہلی یہ کہ تنوین تعظیم کے لئے آتی ہے۔ اگر اس امر کو مدنظر رکھا جائے تو اَلَّذِیْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ کے یہ معنی ہوں گے کہ اے اہل مکہ ہم نے تم کو ایک ایسی خطرناک بھوک سے بچایا ہے جس سے تمہارے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ لوگ ایک وادی غیر ذی زرع میں پڑے ہوئے تھے۔ ایسے غیر آباد خطہ میں رہتے ہوئے وہ بھوک کی موت سے کہاں بچ سکتے تھے۔ طائف میں بے شک باغات وغیرہ تھے اور وہاں کسی قدر زراعت بھی ہوتی تھی مگر یہ زراعت بہت ناکافی تھی۔ مکہ کے صرف چند امراء خاندان ہی ایسے تھے جن کو طائف سے غلّہ آتا تھا۔ باقی لوگوں کے لئے یا تو یمن سے غلّہ آتا تھا یا مدینہ اور اُس کے نواحی سے آتا تھا بلکہ بعض دفعہ شام سے بھی لانا پڑتا تھا۔ زیادہ تر یمن سے ہی مکہ میں غلّہ آتا تھا اسی طرح کبھی کبھار حبشہ سے بھی آجاتا تھا پس اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ میں اللہ تعالیٰ اس امر کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ تمہارا جائے وقوع ایسا تھا کہ تمہیں معمولی روٹی بھی کھانے کے لئے میسر نہیں آسکتی تھی مگر ہم نے محض اپنے فضل سے ایسے حالات

پیدا کردئے کہ تمہیں بافراغت کھانا میسر آگیا اور تم بھوک کی تکلیف سے بچ گئے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں مِنَ الجُوْعِ نہیں فرمایا اگر مِنَ الجُوْعِ ہوتا تو اس کے معنے محض بھوک کے ہوتے مگر مِنْ جُوْعٍ کے یہ معنے ہیں کہ ایسی شدید بھوک جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اٰمَنَهُمْ مِّنَ الْخَوْفِ نہیں فرمایا بلکہ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ فرمایا ہے۔ اس میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے صرف خوف دُور نہیں کیا بلکہ ایسا شدید خوف دُور کیا جس نے تمہاری بنیادوں کو ہلا دیا تھا۔ غرض تنوین چونکہ تعظیم کے لئے آتی ہے اس لئے مِنْ جُوْعٍ کے یہ معنے ہوں گے کہ ایسی بھوک جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی اور مِنْ خَوْفٍ کے یہ معنے ہونگے کہ ایسا خطرناک خوف جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ چنانچہ اصحاب الفیل کے واقعہ میں مَیں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں کہ حضرت عبدالمطلب نے ابرہہ سے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ ہم میں تم سے لڑنے کی کوئی طاقت نہیں اگر یہ خدا کا گھر ہے تو وہ آپ اس کو بچا لے گا۔ پھر ھذیل اور بنو کنانہ نے بھی متفقہ طور پر غور کرنے کے بعد اہل مکہ کو یہی مشورہ دیا تھا کہ ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے تم ابرہہ اور اُس کے لشکر کے سامنے ہتھیار ڈال دو تاکہ وہ جو چاہے کرے۔ یہ کتنا بڑا خوف ہے کہ ایک قوم کی قوم ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار ہو گئی یہی حکمت ہے جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے یہاں مِنَ الْخَوْفِ نہیں بلکہ مِنْ خَوْفٍ فرمایا ہے یعنی مَیں نے ایک عظیم الشان خوف سے تم کو بچایا۔ لیکن جہاں تنوین تعظیم کے لئے آتی ہے وہاں عربی زبان میں تنوین تحقیر کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے۔ اگر اس استعمال کو مدِّ نظر رکھا جائے تو پھر مِنْ جُوْعٍ کے یہ معنے ہونگے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ بھوک۔ اور مِنْ خَوْفٍ کے یہ معنے ہونگے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ خوف۔ یعنی ہم نے اتنی فراوانی اور کثرت کے ساتھ رزق دیا کہ مکہ والے چھوٹی سے چھوٹی بھوک سے بھی نجات پا گئے۔ یہ خدا تعالیٰ کا کتنا بڑا فضل اور کتنا بڑا احسان ہے کہ اُس نے مکہ والوں کو ایک ایسی خطرناک جگہ رکھ کر جہاں روٹی کا کوئی سامان نہ تھا ہر فرد کے لئے روٹی مہیا کر دی۔ حقیقتاً اگر غور کیا جائے تو یہ بڑے بھاری انعام اور فضل کا ثبوت ہے کہ ایسے خطرناک مقام پر رکھ کر اُس نے ہر ایک کو روٹی مہیا کی ہر ایک کو بافراغت رزق دیا یہاں تک کہ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ بھوک کی تکلیف سے بھی محفوظ ہو گئے۔ اسی طرح اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ کے یہ معنے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ والوں کو ادنیٰ سے ادنیٰ خوف سے بھی نجات دی۔ یعنی ابرہہ اور اُس کے لشکر کو اُس نے حرم کی حدود میں داخل ہی نہیں ہونے دیا باہر ہی اُس کا خاتمہ کر دیا۔ اگر وہ مکہ میں داخل ہو جاتا اور منجنیقوں سے پتھر برسانے لگتا تو کچھ نہ کچھ خوف اہلِ مکہ کو ضرور ہوتا۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب حجاج بن یوسف نے مکہ پر حملہ کیا تو روایات میں آتا ہے کہ ایک منجنیق کا پتھر خانہ کعبہ کو بھی آلگا اور اُس کا کچھ حصہ جل بھی گیا۔ بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے اگر وہ اسی طرح ہوا تھا تو حجاج نے جب حملہ کیا اس وقت خانہ کعبہ کا کچھ حصہ کیوں جل گیا تھا اور کیوں اُس پر پتھر بھی آلگا اس کا جواب بعض لوگوں نے یہ دیا ہے کہ اُس کی نیت خانہ کعبہ کو پتھر مارنے کی نہیں تھی اتفاقی طور پر وہ اُسے آلگا تھا۔ دوسرے آگ فوراً بجھا دی گئی تھی اُس سے کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ بہرحال جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اصحاب الفیل کی تباہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بطور ارہاص تھی اور خانہ کعبہ کی حفاظت اپنی ذات میں اتنی مقصود نہیں تھی جتنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی

حفاظت مقصود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جس شان سے اُس وقت نشان ظاہر ہُوا اُس شان کا نشان بعد میں ظاہر نہیں ہُوا۔ بہر حال اللہ تعالےٰ نے اُس وقت اہل مکہ کو ادنیٰ سے ادنیٰ خوف سے بھی بچایا اور ابرہہ کو وہیں مار دیا۔

حضرت علیؓ کے متعلق ایک روایت آتی ہے کہ انہوں نے کہا وَ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ کے یہ معنے ہیں کہ خلافت ہمیشہ قریش میں رہے گی مگر یہ ایسی بچپن کی سی بات ہے کہ میں مان ہی نہیں سکتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا کہا ہو۔ بعض اور مفسرین نے بھی لکھا ہے کہ یہ روایت حضرت علیؓ کی طرف یونہی منسوب کردی گئی ہے کہ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ کے یہ معنے ہیں کہ کہیں خلافت قریش میں سے نہ چلی جائے۔ اس پر ایک مؤرخ نے لطیفہ لکھا ہے کہ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ میں تو یہ بتایا گیا تھا کہ خلافت قریش میں سے نہیں جائے گی مگر آخر وہ چلی ہی گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ بعض لوگ اپنے پاس سے باتیں بنا کر دوسروں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں یہی بات اس روایت کے متعلق معلوم ہوتی ہے۔

بعضوں نے کہا ہے کہ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ میں اُس قحط کی طرف اشارہ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پڑا۔ احادیث میں آتا ہے کہ جب قریش مکہ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بہت تنگ کیا اور سخت تکالیف پہنچائیں تو آپؐ نے دعا فرمائی کہ اَللّٰهُمَّ خُذْهُمْ بِسِنِيْنَ كَسِنِيْ يُوْسُفَ یعنی اے اللہ تو اِن لوگوں کو ویسے ہی پکڑ جیسے یوسف کے زمانہ میں تُو نے لوگوں کو قحط سے پکڑا تھا۔ اِس پر مکہ میں ایک شدید قحط پڑا۔ آخر وہی لوگ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید مخالف تھے انہوں نے آپ سے دعا کی درخواست کی۔ چنانچہ آپ نے دُعا کی جس پر کچھ ارد گرد کے علاقے میں بارشیں ہوگئیں۔ کچھ حبشہ کی حکومت نے وہاں غلہ بھجوا دیا اور اس طرح قحط دُور ہُوا۔ پس بعض لوگ کہتے ہیں کہ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ میں اِسی قحط کی طرف اشارہ ہے۔ مگر یہ درست نہیں ہے اس لئے کہ واقعات سے یہ ثابت ہے کہ یہ سورۃ نہایت ابتدائی سورتوں میں سے ہے اور وہ قحط جو مکہ میں پڑا وہ شعب ابی طالب میں محصور ہونے کے وقت پڑا۔ پس یہ آیت جب پہلے نازل ہو چکی تھی تو قحط کا اس کے ساتھ تعلق کیا ہُوا۔ یہاں تو اللہ تعالیٰ اُن پر حجت کرتا ہے کہ اُس نے اُن کے خوف کو امن سے بدل دیا۔ جو چیز ابھی ظاہر ہی نہیں ہوئی تھی وہ اُن کے لئے حجت کس طرح ہو سکتی تھی۔

بہر حال اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے خالی سفروں کی طرف اشارہ نہیں۔ چنانچہ جب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب خانہ کعبہ کی بنیاد رکھی تھی تو اُس وقت آپ نے ایک دعا فرمائی تھی جس کا اللہ تعالےٰ اِن الفاظ میں ذکر فرماتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ۔ اسی طرح آپ نے یہ دُعا کی تھی کہ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ۔ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (ابراہیم ع ۶) حضرت ابراہیم علیہ السلام دُعا کرتے ہیں کہ اے خدا تو اس گھر کو امن والا بنائیو اور مجھے اور میری اولاد کو شرک سے بچائیو۔ پھر کہتے ہیں۔ اے خدا میں نے اپنی اولاد کو تیرے مکرم و محترم گھر کے پاس ایک ایسی جگہ لا کر بسا دیا ہے جہاں کوئی کھیتی باڑی نہیں ہوتی محض اس لئے کہ وہ نمازوں کو

قائم کریں اور تیرے ذکر میں مشغول رہیں فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ پس اے خدا تو خود لوگوں کے دلوں میں تحریک کر کہ وہ ان کی طرف جھکیں وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ اور انہیں کھانے کے لئے ہر قسم کے پھل عنایت فرما تاکہ یہ تیرا شکر ادا کرتے رہیں۔

اِس دُعا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالےٰ سے اپنی اولاد کے لئے دو باتیں مانگی ہیں۔ امن اور رزق اور پھر ذریعہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ امن اور رزق اُنہیں کس طرح ملے؟ آپ فرماتے ہیں یہ دونوں چیزیں اُنہیں حکومت اور تلوار کے زور سے نہ ملیں۔ بیشک دُنیا میں حکومت کے زور سے امن بھی قائم ہو جاتا ہے اور حکومت لوگوں کا روپیہ بھی کھینچ کھینچ کر لے آتی ہے مگر آپ فرماتے ہیں مَیں یہ پسند نہیں کرتا کہ اُنہیں اِس رنگ میں یہ چیزیں ملیں۔ میری دُعا اور التجا یہ ہے کہ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ لوگوں کے دلوں میں اُن کی محبت پیدا ہو اور وہ عقیدت کے ساتھ اُن کی طرف جھکیں۔ گویا جو کچھ ملے زور اور طاقت سے نہ ملے بلکہ عقیدت اور محبت کی وجہ سے ملے۔ یہ کتنی کڑی شرطیں ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دُعا میں لگا دی ہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص جنگل میں جا کر یہ دُعا کرے کہ خدایا مجھ پر بارش برسا وہ میرے اردگرد نہ برسے۔ وہ صرف آدھ گھنٹہ برسے اور جب برس چکے تو فوراً اِسی جگہ سے ایک درخت نکل آئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اپنی اولاد کو ایک ایک جنگل میں لا کر بٹھا دیتے ہیں اور پھر دُعا یہ کرتے ہیں کہ اُنہیں امن حاصل ہو۔ بھلا جنگل میں امن کہاں! جنگل میں تو یہی ہو سکتا ہے کہ کوئی بھیڑیا آئے اور چیر پھاڑ جائے یا کوئی ڈاکو آئے اور وہ لُوٹ لے پھر وادیٔ غیر ذی زرع کہاں اور رزق کہاں! مگر وہ ایک جنگل میں اپنی اولاد کو بٹھا کر یہ دُعا کرتے ہیں کہ خدایا اُنہیں رزق عطا فرما گویا اللہ تعالےٰ سے وہ اپنی اولاد کے لئے دو چیزیں مانگتے ہیں۔ رزق بھی مانگتے ہیں اور امن بھی مانگتے ہیں اور مانگتے بھی وادیٔ غیر ذی زرع میں ہیں۔ مگر پھر یہیں پر بس نہیں کرتے بلکہ ایک اور شرط یہ عائد کرتے ہیں کہ اُنہیں رزق اور امن تو ملے مگر تلوار سے نہیں۔ حکومت اور طاقت کے زور سے نہیں بلکہ اس طرح کہ ان کی محبت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو اور وہ خود بخود عقیدتمندانہ جذبات کے ساتھ ان کی طرف جھکتے چلے جائیں۔ یہ کتنی سخت اور کڑی شرائط ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دُعا کے ساتھ لگائی ہیں۔ اس کے مقابل میں وہ دو باتیں اپنی اولاد کی طرف سے بھی کہتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مکہ میں رہیں گے اور دوسری یہ کہ خدا تعالےٰ کی عبادت میں لگے رہیں گے اور وہ عبادت توحید والی ہو گی۔ اللہ تعالےٰ اِسی دعائے ابراہیمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے اَلَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ۔ اے مکہ والو! ہم نے وہ وعدہ پُورا کر دیا جو ہم نے ابراہیم کے ساتھ کیا تھا۔ اب کیا تمہارا فرض نہیں کہ تم بھی اُس عہد کو پورا کرو جو تمہاری طرف سے تمہارے دادا ابراہیمؑ نے کیا تھا۔ یہ دو باتیں کہ وہ مکہ میں رہیں گے اور عبادتِ خدا میں لگے رہیں گے اور عبادت بھی توحید والی کریں گے ہم نے نہیں کہی تھیں۔ ہم نے ابراہیمؑ سے یہ نہیں کہا تھا کہ اے ابراہیم چونکہ تُو ہم سے دو چیزیں مانگ رہا ہے ہم بھی تجھ سے دو چیزیں مانگتے ہیں۔ ہم نے ابراہیم سے کوئی سودا نہیں کیا۔ بلکہ ابراہیم نے خود کہا کہ اے میرے رب مَیں تجھ سے یہ سودا کرتا ہوں اور یہ سودا پیش کرنیوالا تمہارا اپنا دادا تھا۔ اُسکی بات کی پچ تو تمہیں زیادہ ہونی چاہیئے۔ ہم پر ابراہیم نے جو ذمہ واری رکھی تھی وہ ہم نے پوری کر دی۔

اَلَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ۔ اُس نے جیل کہا تھا ہم نے رزق پہنچایا اُس نے کہا تھا کہ میری اولاد کو وادیٔ غیر ذی زرع میں رزق دیا جائے۔ سو ہم نے وادیٔ غیر ذی زرع میں ہی تمہیں رزق دے دیا۔ اُس نے کہا تھا کہ انہیں اِس خطرناک مقام پر امن دیا جائے۔ سو ہم نے اِس خطرناک مقام پر تمہیں امن دے دیا۔ اُس نے کہا تھا کہ یہ رزق اور امن انہیں تلوار کے زور سے نہ ملے بلکہ لوگوں کی محبت اور پیار کے نتیجہ میں ملے سو ہم نے لوگوں کے دلوں میں تمہاری محبت قائم کر دی اور اب اُسی محبت کے نتیجہ میں تمہیں رزق اور امن حاصل ہو رہا ہے۔ اب کیا تمہارا فرض نہیں کہ تمہارے دادا نے تمہاری طرف سے جو وعدہ کیا تھا کہ یہ اس گھر میں ہمیشہ کے لئے بس جائیں گے اور اس میں خالص توحیدی عبادت کو قائم کریں گے، تم اسے پورا کرو۔ ہم نے کتنے عرصہ تک اپنے وعدہ کو پورا کیا۔ اس کے مقابلہ میں تمہاری طرف سے بھی یہ وعدہ تھا کہ ہم گھر میں رہیں گے اور خدائے واحد کی پرستش بجا لائیں گے تم ہزاروں سال سے شرک کرتے چلے آرہے ہو مگر ہم نے تمہیں کچھ نہیں کہا۔ کیونکہ تم کہہ سکتے تھے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی تعلیم نہیں پہنچی۔ لیکن اب تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تمہاری طرف بھیج دئے گئے ہیں اور وہ تمہیں خدائے واحد کی طرف بُلا رہے ہیں۔ مگر اے ظالمو! تم اب بھی خدائے واحد کی طرف نہیں آرہے ؎

سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ الماعون - یہ سورۃ مکی ہے [1]

وَهِيَ سَبْعُ اٰيَاتٍ دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے سوا سات آیتیں ہیں اور ایک رکوع ہے

سورۃ ماعون مکی سورۃ ہے

[1] یہ سورۃ سورۂ ماعون کہلاتی ہے اکثر علماء کے نزدیک یہ سورۃ مکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہ کے نزدیک مدنی ہے۔ ہبتہ اللہ جو قرآن کریم کے ایک بڑے مفسر گذرے ہیں اُن کے نزدیک اس کا نصف مکی ہے اور نصف مدنی ہے۔ نصف مکی اُن کے نزدیک عاص بن وائل کی نسبت اُترا ہے اور نصف مدنی اُن کے نزدیک عبداللہ بن ابی ابن سلول کی نسبت اُترا ہے۔ مستشرقین میں سے نولڈکے اسے ابتدائی سالوں کی سورۃ قرار دیتا ہے اور میور پانچویں سال کی قرار دیتا ہے اور وہیری جسے شوق ہے کہ وہ کوئی بڑا محقق سمجھا جائے اور کوئی نئی بات پیش کرے یا نئی بات کی تائید کرے اُس نے کہا ہے کہ میری رائے بھی ہبتہ اللہ کے مطابق ہے کہ یہ سورۃ آدھی مکی ہے اور آدھی مدنی ہے۔ چونکہ اکثر مفسرین

سورۃ ماعون کا شانِ نزول

اور راوی اسے مکی قرار دیتے ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کی نسبت کوئی اور تحقیقات پیش کریں۔ بے شک حضرت ابن عباسؓ جو صحابی ہیں اُن کی روایت یہ ہے کہ یہ سورۃ مدنی ہے۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت کوئی تیرہ سال کے تھے اس لئے وہ جو کچھ بیان فرماتے ہیں اُس میں سے ننانوے فی صدی دوسروں سے سُنا ہوتا ہے جس میں غلطی کا امکان بھی ہوسکتا ہے۔ یوں بوجہ بہت زیرک ہونے کے اکثر اوقات اُن کی رائے درست اور صحیح ہوتی ہے۔ زمانۂ نزول کے متعلق بعض دفعہ صحابہ اور تابعین نے اِس امر سے بھی دھوکا کھایا ہے کہ اگر کسی آیت کے بارہ میں خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یا کسی صحابی نے یہ کہہ دیا کہ یہ فلاں شخص کے بارہ میں نازل ہوئی تھی اگر وہ شخص مکی تھا تو انہوں نے قیاس کرلیا کہ وہ آیت یا سورۃ مکہ میں نازل ہوئی تھی اور اگر کسی مدینہ کے شخص کے بارہ میں روایت میں ایسے الفاظ آئے تو اُنہوں نے سمجھ لیا کہ وہ آیت یا سورۃ مدنی ہے۔ پس اس سورۃ کے مضمون کو دیکھتے ہوئے میرے نزدیک قرین قیاس یہی ہے کہ آئمۂ جمہور نے جو سمجھا وہی درست تھا۔ گو جمہور نے اپنی تائید میں کوئی ایسی روایت جو کسی صحابی سے مروی ہو نہیں لکھی۔ لیکن اکثر تابعین کا اس پر اتفاق بتاتا ہے کہ روایات تو ضرور تھیں مگر بوجہ شہرت عامہ کے انہوں نے اُن کے بیان کرنیکی ضرورت نہیں سمجھی۔

شانِ نزول بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ سورۃ ابوجہل کے متعلق اُتری ہے۔ دوسرے لکھتے ہیں کہ ولید بن مغیرہ کے متعلق اُتری ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ عاص بن وائل کے متعلق اُتری ہے۔ یا عمر بن عائذ کے متعلق اُتری ہے یا مدینہ کے دو منافقوں کے متعلق اُتری ہے یا ابوسفیان بن حرب کے متعلق اُتری ہے۔ اس قسم کی روایات کو بیان کرنے کی میرے لئے کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے انہیں صرف اس لئے بیان کیا ہے کہ یہ ایک واضح مثال اس بات کی ہے کہ بعض دفعہ مختلف آراء کے ملنے سے کس طرح ایک مضحکہ خیز بات بن جاتی ہے۔ بھلا جس چیز کے متعلق کوئی

یقینی پتہ ہی نہیں اُس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت کیا تھی یہ بات کہ کوئی آیت یا سورۃ کس شخص کے بارہ میں ہے سوائے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کون بتا سکتا تھا اور اگر آپ بتلاتے کہ یہ آیت کس شخص کے بارہ میں اُتری ہے تو آپ ایک شخص کا نام لیتے یا ایک جماعت کے ایک فعل کا ذکر کرتے۔ یہ تو نہیں کہ آپ فرماتے مجھے اللہ تعالےٰ نے بتایا ہے کہ یہ آیت یا سورۃ فلاں شخص کے بارہ میں ہے یا فلاں کے یا فلاں کے۔ اِس قسم کے شبہ والی بات یا غیر یقینی رائے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک آیت قرآنی کی نسبت جس کا علم آپ کو خدا تعالےٰ کی طرف سے ملتا تھا کس طرح کہہ سکتے تھے۔ پس یہ روایات رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نہیں بلکہ لوگوں کے خیالات ہیں اور لوگوں کے خیالات سے شانِ نزول کا پتہ نہیں لگ سکتا۔ مَیں نے اس آیت کے شانِ نزول کی نسبت مختلف روایات کے مطابق صرف سات آدمیوں کا نام لیا ہے ورنہ روایات میں بارہ کے قریب لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ اِن میں سے کوئی مراد ہے لیکن ان روایات کی طرف تفسیر میں اشارہ کرنا اس آیت کی تفسیر کو مدنظر رکھتے ہوئے بالکل غیر ضروری تھا مگر اس آیت کے بارہ میں جو یہ روایات آتی ہیں ان کی ایک قیمت ضرور ہے اور وہ یہ کہ ان سے خوب اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ شانِ نزول کے معنے یہ نہیں ہوتے کہ واقعہ میں اُس شخص یا واقعہ کے بارہ میں وہ آیت نازل ہوئی ہے۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اس آیت کا مضمون فلاں شخص یا واقعہ پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ اگر یہ مطلب ان روایات کا نہیں ہوتا تو پھر یہ روایات جو اس آیت کو بارہ متفرق اشخاص کے بارہ میں بتاتی ہیں ایک دوسرے کے نقیض ہونے کے سبب سے جھوٹی کہلائیں گی اور ان کے راوی خواہ صحابی ہوں خواہ تابعی نعوذ باللہ من ذالک مفتری قرار پائیں گے۔ مگر چونکہ ان لوگوں کی دیانت اور راستبازی کو دیکھتے ہوئے اُن کو جھوٹا نہیں کہا جا سکتا اس لئے سوائے اِس توجیہہ کے اور کوئی توجیہہ ان روایات کی ہو ہی نہیں سکتی کہ ان لوگوں کا یہ منشا نہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا تعالےٰ نے مجھے فرمایا ہے کہ یہ آیت فلاں شخص کی نسبت ہے بلکہ یہ مراد ہے کہ ہمارے علم میں فلاں شخص کے حالات پر یہ آیت خوب چسپاں ہوتی ہے۔ پس شانِ نزول کی کسی روایت سے کسی آیت کے معنوں کو ایک خاص واقعہ سے محدود کرنا نہایت غلط طریق ہے اور قرآن کریم کے وسیع سمندر کو ایک کوزے میں بند کرنے کی ناکام کوشش کے مترادف ہے۔

اس زمانہ کے مسلمان علماء میں یہ عام مرض ہے کہ جب ان کے سامنے قرآن کریم کی کوئی آیت پڑھی جائے اور انہیں کہا جائے کہ اس سے یہ مضمون نکلتا ہے تو وہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ واہ ہمارے ساتھ اس کا کیا تعلق؟ اِس کا تو شانِ نزول یہ ہے اور یہ آیت فلاں شخص سے تعلق رکھتی ہے۔ گویا جس طرح کشتی کو کسی کیلے یا درخت کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے وہ اس آیت یا سورۃ کو کسی منافق یا مومن یا مہاجر یا انصاری یا عیسائی یا یہودی کے ساتھ باندھ دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم کسی خاص شخص کے لئے نہیں آیا بلکہ ساری دنیا کے لئے آیا ہے اس کے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی مخاطب ہیں تمام مسلمان اور عیسائی اور یہودی اور مجوسی وغیرہ بھی مخاطب ہیں۔ پھر قیامت تک آنے والے تمام لوگ بھی اس کے مخاطب ہیں۔ زید یا بکر کے ساتھ اس کی کسی آیت یا سورۃ کو مخصوص قرار دینا قطعی طور پر غلط بات ہے۔ بلکہ مَیں تو اس بات کو بھی جائز نہیں سمجھتا کہ قرآن کریم کو صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے مخصوص قرار دیا جائے۔ اگر قرآن صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کوئی بات کہتا تو وہ وہیں ختم ہو جاتی اور

باقی دنیا اُس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکتی۔ حالانکہ قرآن کریم قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کے لئے ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرماتا ہے اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ۔ اب کیا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو اصحاب الفیل کے واقعہ پر غور نہیں کرنا چاہیئے؟ پس میں تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی کسی سورۃ یا آیت کے شانِ نزول کو مخصوص قرار دینا جائز نہیں سمجھتا کجا یہ کہ یہ قرار دیا جائے کہ کوئی سورۃ یا آیت کسی منافق یا کسی مومن یا کسی کافر کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم میں بار بار اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرماتا ہے کہ ہم نے تم پر قرآن نازل کیا ہے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ قرآن ہمارے لئے نازل نہیں ہوا۔ جیسے آپؐ پر نازل ہوا ہے ویسے ہی ہمارے لئے نازل ہوا ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اگر ہم پر فضیلت حاصل ہے تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی نیکی اور آپ کے تقویٰ اور آپ کے عرفان اور آپ کی روحانیت کے اعلیٰ مقام کو دیکھتے ہوئے آپ کو اس غرض کے لئے چُن لیا کہ آپ پر اپنا کلام نازل کرے اور آپ کو اس کا پہلا مخاطب قرار دے۔ پس آپ کی جو روحانی اور اخلاقی اور دماغی فضیلت تھی اس کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے اپنا کلام آپ پر پہلی دفعہ نازل کیا لیکن جب وہ نازل ہوگیا تو اس کے بعد میرے لئے، اس تفسیر کے پڑھنے والوں کے لئے اور باقی سب دنیا کے لئے وہ ویسا ہی ہوگیا جیسے وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے تھا۔

اِس شان نزول کے مخمصہ سے تنگ آکر رازی اور بعض دوسرے علماء نے کہا ہے کہ یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ شانِ نزول کیا ہے بلکہ دیکھا یہ جائے گا کہ آیت کا مطلب کیا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ جیسا کہ اُوپر ثابت کیا جا چکا ہے خود شانِ نزول کے معنے سمجھنے میں لوگوں نے غلطی کھائی ہے ورنہ ان الفاظ کے اَور معنے ہیں اور اُن کے رُو سے آیت کا مفہوم محدود ہوتا ہی نہیں۔

اب مَیں اِن روایات کے مضمون کو لیتا ہوں۔ بعض راوی کہتے ہیں ابوجہل نے اور بعض کہتے ہیں عاص بن وائل نے ایک اُونٹ ذبح کیا تو ایک یتیم کچھ گوشت مانگنے کے لئے آگیا۔ اس پر اُس نے یتیم کو سونٹا مارا۔ آخر اونٹ اُس نے خود تو نہیں کھانا تھا بہرحال اُس کا گوشت اُس نے تقسیم ہی کرنا تھا مگر اُس نے تقسیم اُن لوگوں میں کرنا تھا جن میں تقسیم کرنے میں اُس کی شہرت اور عزت میں زیادتی ہو۔ پس جب وہ یتیم گوشت مانگنے کیلئے آیا تو وہ اُسے خفا ہوا اور غصہ سے اُس کو سونٹا مارا۔ دوسری روایات میں جہاں اشخاص کے نام بدلے ہیں اعمال میں بھی اختلاف ہے جو اُن سے ظاہر ہوئے مگر مفہوم اِن سب روایات کا یہی ہے کہ ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح یتیم کے ساتھ بُرا سلوک کیا تھا۔ پس سب روایات کا خلاصہ یہی ہے کہ اس آیت کا مضمون ابوجہل پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ ولید بن مغیرہ پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ عاص بن وائل پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ عمرو بن عائذ پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ مدینہ کے دو منافقوں پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ ابوسفیان بن حرب پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ سب لوگ بوجہ دینِ محمدی کی رُوح سے دور ہونے کے بخیل اور ظالم تھے اور اگر اُوپر کی تشریح کے مطابق ان روایات کا مطلب سمجھا جائے تو یہ روایات بالکل درست ہیں۔ بلکہ دس یا بارہ کی بھی شرط نہیں یہ مضمون تو لاکھوں پر چسپاں ہوسکتا ہے۔ اس زمانہ کو ہی دیکھ لو دنیا کی ڈیڑھ ارب آبادی میں سے اگر وہ لوگ تلاش کئے جائیں جو تکذیبِ دین کرنے والے ہیں تو ایک ارب سے زیادہ ایسے لوگ نکل آئیں گے جو علی الاعلان دین کا انکار کرتے ہیں۔ پھر

ساٹھ ستر کروڑ ایسے لوگ نکل آئیں گے جو مُنہ سے تو دین کا انکار نہیں کرتے مگر شامل وہ پہلے گروہ میں ہی ہیں۔ باقی تیس کروڑ میں سے اُنتیس[۲۹] کروڑ سے بھی اُوپر وہ لوگ نکلیں گے جو یُوں تو انکار نہیں کرتے مگر عملاً وہ بھی دین کا انکار کرتے ہیں۔ صحیح معنوں میں دین کو ماننے والا اور سچے دل سے اُس پر ایمان رکھنے والا بہت تھوڑا حصہ نکلیگا جو ہزاروں یا زیادہ سے زیادہ لاکھوں کی تعداد میں ہوگا۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان ساروں کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے اگر اُن کے لئے نازل نہیں ہوئی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُن کو مجرم کس طرح قرار دے گا پھر تو وہ بڑی آسانی سے کہہ دیں گے کہ یہ آیت ہمارے متعلق نہیں بلکہ فلاں شخص کے متعلق تھی۔ یہ لوگ موردِ الزام اُسی صورت میں سمجھے جا سکتے ہیں جب یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ آیت کسی خاص شخص سے مخصوص نہیں بلکہ ہر شخص جو تکذیبِ دین کرتا ہے وہ اس کا مخاطب ہے۔

جن مفسرین نے اس آیت کو ابو جہل پر چسپاں کیا ہے انہوں نے لکھا ہے کہ ایک یتیم کا مال ابو جہل کے سپُرد تھا ایک دن وہ ننگا دھڑنگا اُس کے پاس آیا۔ کپڑے اُس کے پاس نہیں تھے اور اُس نے آکر تقاضا کیا کہ میری امانت میں سے کچھ روپیہ مجھے دے دیا جائے مگر ابو جہل نے اُسے دھتکارا اور وہ مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔ قریش کے رؤوساء نے اُسے شرارتاً مشورہ دیا کہ تم محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر اُن سے سفارش کراؤ وہ غریبوں کی خدمت کا بڑا دعویٰ کیا کرتے ہیں اُن کی غرض یہ تھی کہ آپ سفارش کریں گے تو ابو جہل آپ کو ڈانٹے گا اور آپ ذلیل ہوں گے اور سارے شہر میں آپ پر ہنسی اُڑے گی۔ اور اگر سفارش نہیں کریںگے تب بھی آپ کی سُبکی ہوگی ہم ہر جگہ لوگوں کو بتائیں گے کہ دیکھو غریبوں کی مدد کرنے کے بڑے بڑے دعوے کئے جاتے ہیں مگر حالت یہ ہے کہ ایک یتیم سفارش کے لئے آیا اور اُن سے اتنا نہ ہو سکا کہ اُس کی سفارش ہی کر دیں بہرحال قریش کے مشورہ پر وہ آپ کے پاس گیا۔ جب وہ یتیم آپ کے پاس پہنچا تو چونکہ آپ نے حلف الفضول میں عہد کیا ہُوا تھا کہ آپ غرباء کی مدد کیا کریں گے اِس لئے آپ فوراً اس کے ساتھ چلنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ کس دشمن کے پاس جا رہے ہیں اُسے ساتھ لیا ابو جہل کے دروازہ پر پہنچے اور دستک دی ابو جہل باہر آیا تو آپ نے فرمایا یہ یتیم آیا ہے اِس کی کچھ امانت آپ کے پاس ہے چونکہ اِسے روپیہ کی ضرورت ہے اِس لئے آپ وہ روپیہ اِسے دے دیں۔ ابو جہل چُپ کر کے اندر گیا اور اُس نے روپیہ لا کر اُس یتیم کو دے دیا جب قریش کو اس بات کا علم ہُوا تو انہوں نے ابو جہل کو طعنے دئے اور کہا کہ تُو تو صابی ہو گیا ہے قریشِ مکہ مسلمانوں کو صبانی یا صابی کہا کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ صابی ایک فرقہ تھا جو عراق میں رہتا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب ہوتا تھا۔ یہ لوگ چونکہ حضرت ابراہیمؑ کا بہت ذکر کیا کرتے تھے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی اپنے دین کو دینِ حنیفی کہتے تھے۔ مکہ کے لوگوں نے اس مشابہت کی وجہ سے آپ پر ایمان لانے والوں کو بھی صابی یا صبائی کہنا شروع کر دیا۔ غرض جب ابو جہل نے اُس یتیم کو مال واپس کیا تو قریش نے اُسے طعنے دئے اور کہا کہ تُو تو صبائی ہو گیا ہے۔ اُس نے کہا خدا کی قسم مَیں صبائی نہیں ہُوا لیکن جب میرے سامنے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آئے تو میں نے دیکھا کہ آپ کے دائیں اور بائیں وحشی اُونٹ کھڑے ہیں اور مَیں ڈرا کہ اگر مَیں نے آپ کی بات نہ مانی تو یہ اُونٹ مجھ پر حملہ کر دیں گے۔
یہ روایت ایک اور طرح بھی آتی ہے اور میرے نزدیک وہی زیادہ صحیح ہے کہتے ہیں کہ مکہ میں جب حلف الفضول کا معاہدہ ہُوا یعنی تین فضل نامی شخصوں نے ایک انجمن بنائی

کہ اس کے سب ممبر قسم کھائیں کہ مظلوم کی مدد کریں گے (مَیں نے بھی اس کی نقل میں ایک تحریک جاری کی تھی مگر افسوس کہ وہ اب تک کامیاب نہیں ہو سکی جب خدا تعالیٰ چاہیگا کامیاب ہو جائے گی یہ تحریک ایک رؤیا کی بنا پر تھی۔ میں نے دیکھا کہ گویا خدا تعالیٰ کا ارشاد ہوا ہے کہ تم اپنے خاندان کے لوگوں سے کہہ دو کہ اگر حلف الفضول پر اُن کا عمل رہے تو وہ تباہی سے بچے رہیں گے) اس معاہدہ کے بعد وہ نوجوان محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی پہنچے۔ یہ دعویٰ سے پہلے کی بات ہے۔ آپ نے بھی غربا کی مدد کرنے کی قسم کھائی اور اس معاہدہ میں شامل ہو گئے مگر کچھ عرصہ کے بعد وہ نوجوان اس معاہدہ کو بھول گئے لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تو سچے آدمی تھے آپ کو یہ معاہدہ یاد رہا۔ جب آپ نے دعویٰ کیا تو ایک دن بعض مخالفوں نے شرارتاً یہ چاہا کہ آپکا امتحان لیا جائے۔ انہوں نے سوچا کہ آپ نے بھی غریبوں کی حمایت کے لئے قسم کھائی تھی اب ہم دیکھتے ہیں کہ آپ غریبوں کی حمایت کرتے ہیں یا نہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک بدوی تھا جس سے ابوجہل نے کچھ سامان لیا تھا مگر اُس کی رقم اُسے نہ دی تھی۔ وہ بدوی مکہ میں آتا اور شور مچاتا کہ ہم باہر سے آتے ہیں اپنا سودا یہاں فروخت کرتے ہیں مگر مکہ کے یہ لوگ جو بیت اللہ کے محافظ اور مذہبی آدمی سمجھے جاتے ہیں ہم پر اس اس رنگ میں ظلم کرتے ہیں اور جب لوگ اُس سے دریافت کرتے کہ کیا ہوا تو وہ کہتا کہ ابوجہل نے میری اتنی رقم دینی ہے مگر وہ نہیں دیتا۔ وہ کچھ فاتر العقل سا تھا اور یُوں اُس کا نقصان بھی کافی ہوا تھا۔ جب وہ اس طرح بار بار شور مچاتا تو ایک دن لوگوں نے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ اسے محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بھیج دو اور اُسے کہا کہ وہ آپ کو ساتھ لے جائے۔ اُن کی نیت نیک نہیں تھی اُن کا منشاء صرف یہ تھا کہ اگر محمد صلے اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ نہ گئے تو ہم کہیں گے کہ دیکھو آپ نے غریبوں کی مدد کے لئے قسم کھائی ہوئی تھی مگر اُس کو پورا نہ کیا اور اگر گئے تو چونکہ ابوجہل آپ کی بات نہیں مانیگا آپ ذلیل ہوں گے۔ بہرحال انہوں نے اُس بدوی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھجوا دیا۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُس کے حالات سنے تو آپ نے اُسی وقت اپنی چادر سنبھالی اور اُس بدوی کے ساتھ چل پڑے۔ ابوجہل کے دروازہ پر پہنچ کر آپ نے دستک دی جب وہ باہر آیا تو آپ نے فرمایا اس بدوی کی کچھ رقم آپ نے دینی ہے اسے روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔ مَیں آپ کے پاس اسلئے آیا ہوں کہ آپ اس کی رقم اسے دے دیں۔ اُس نے کہا اچھا مَیں ابھی لاتا ہوں۔ چنانچہ وہ اندر گیا اور روپیہ لاکر اُس نے بدوی کو دے دیا۔ جب اُس کے دوستوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے اُسے طعنہ دیا کہ تم تو ہمیں کہتے تھے کہ اُن کا مال کھانا جائز ہے (جیسے آجکل بعض مولوی کہتے ہیں کہ احمدیوں کا مال لُوٹ لینا اور اُسے کھاجانا جائز ہے) مگر تمہاری اپنی یہ حالت ہے کہ روپیہ فوراً لاکر دے دیا۔ تم نے یہ کیا کیا ہم نے تو اُس کو ذلیل کرنے کے لئے یہ منصوبہ کیا تھا مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُلٹا ہم ذلیل ہو گئے۔ جب دوستوں نے اُسے یہ طعنہ دیا تو روایتوں میں آتا ہے ابوجہل نے اُنہیں یہ جواب دیا کہ خدا کی قسم جب محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) میرے پاس آئے تو میں نے دیکھا کہ آپ کے دائیں اور بائیں دو مست اونٹ کھڑے ہیں اور مجھے یُوں معلوم ہوا کہ اگر مَیں نے انکار کیا تو یہ دونوں اُونٹ مجھ پر حملہ کر دیں گے۔ اِس لئے مَیں ڈرا اور مَیں نے روپیہ لاکر دے دیا۔ بہرحال یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ اب خواہ یہ سمجھ لو کہ ایک یتیم آپ کے پاس سفارش کے لئے آیا اور آپ اُس کے ساتھ چل پڑے اور خواہ اس واقعہ کو درست تسلیم کر لو کہ ایک بدوی آپ کے پاس آیا اور آپ اُس کی رقم دلوانے کیلئے ابوجہل کے

پاس گئے یا ان دونوں میں سے کوئی بات سمجھ لو تاریخ اس بات پر متفق ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ابوجہل کے پاس گئے اور آپ نے ایک غریب کا کھایا ہوا مال اُس سے اُگلوا دیا۔ مذکورہ بالا معاہدہ کے بارہ میں احادیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ کیا جاہلیت کی کوئی بات ایسی ہے جسے آپ پسند فرماتے ہوں؟ آپ نے فرمایا ہاں حلف الفضول ایک ایسی چیز تھی کہ آج میں اُسے اسلام میں بھی پسند کرتا ہوں۔ پھر آپ نے فرمایا لَوْ دُعِيْتُ اِلَيْهِ لَاَجَبْتُ۔ اگر اب بھی میں اُس کی طرف بلایا جاؤں تو میں اُس میں ضرور حصہ لوں۔ مظلوم کی مدد کرنا ایک بہت بڑی قیمتی چیز ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں میں سے اب یہ بالکل مٹ گئی ہے۔ وہ یوں تو بڑے جوش و خروش کا اظہار کرتے ہیں مگر غریبوں کی مدد کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ لوگ ایک دوسرے کے مُنہ کی طرف دیکھتے ہیں اور جس کا لحاظ ہوتا ہے اُس کی طرفداری کرتے ہیں حالانکہ اصل تقویٰ یہ ہے کہ جس کا حق مارا جا رہا ہو اُس کی تائید کے لئے انسان کھڑا ہو جائے اور اُس کا حق دلوانے کے لئے دوسرے کے دروازہ پر دھرنا مار کر بیٹھ جائے اور کہے کہ میں تب تک نہیں ہٹوں گا جب تک اس کا حق اسے نہ دلوا لوں۔

ترتیبِ سُورۃ یہ سورۃ دراصل پہلی سورۃ کے مضمون کا تتمہ ہے۔ پہلی سورۃ میں یہ مضمون بیان کیا گیا تھا کہ ہم نے تمہارے لئے رزق مہیا کر دیا ہے تاکہ تم خدا تعالےٰ کے گھر میں بیٹھ کر اُس کی عبادت کرو مگر تم اس طرف سے غافل ہو۔ اب یہ بتاتا ہے کہ جن قوموں میں غفلت پیدا ہو جاتی ہے بڑھتے بڑھتے اُنکی یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ دنیا کی محبت موت کو بھلا دیتی ہے اور اُخروی زندگی پر سے اُن کا ایمان بالکل اُٹھ جاتا ہے۔ یہی مکہ کے لوگوں کا حال ہو گیا ہے ورنہ ابراہیمؑ کی اولاد اور قیامت کی منکر! یہ تعجب کی بات نہیں تو اور کیا ہے۔ خدا کا ایک اولوالعزم نبی جو ایک لمبی بنیاد دین کی قائم کرنا چاہتا ہے جس کی تعلیم اور جس کے نصائح کی بنیاد ہی اللہ تعالےٰ کی رضامندی اور اُس کے قرب پر ہے اُسی کی اولاد اگر اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ یہ جہان میٹھا ہے اگلے جہان کو کس نے دیکھا ہے۔ تو یہ کتنے غضب کی بات ہے۔ اتنا عظیم الشان تغیر یقیناً اس وقت تک نفس میں پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کوئی بڑی بھاری خرابی پیدا نہ ہو جائے۔ اور پھر مکہ کے لئے جو بات نہایت تعجب انگیز ہے وہ یہ ہے کہ آلِ ابراہیم کے دونوں حصے اُس وقت بعث بعد الموت کے منکر ہو گئے تھے۔ آلِ ابراہیم بنو اسحاق اور بنو اسمٰعیل پر مشتمل ہے جن میں سے بنو اسمٰعیل جو مکہ والے تھے وہ تو موت کے بعد کسی زندگی کے قائل ہی نہیں تھے۔ رہ گئے بنو اسحاق، ان کے متعلق شاید یہ بات ہر ایک کو معلوم نہ ہو بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ بہت کم لوگ یہ جانتے ہوں گے کہ بنو اسحاق کی کتابوں میں بھی کلی طور پر بعث بعد الموت کا ذکر اُڑا دیا گیا تھا۔ عام طور پر مسلمان غلط یہ سمجھتے ہیں کہ یہودیوں کے نزدیک بھی قیامت کا دن آنیوالا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہودی کتابوں میں قیامت کا کوئی ذکر نہیں۔ اگر تم میں سے کسی نے بائیبل پڑھی ہو تو وہ میری اس بات کی صداقت کی گواہی دے سکتا ہے اور اگر کسی نے پہلے نہ پڑھی ہو تو وہ اب پڑھ کر دیکھ لے بلکہ پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں یونہی دس پندرہ صفحے کسی جگہ سے بائیبل کے اُلٹ لو پھر دس پندرہ صفحے کسی جگہ سے قرآن کریم کے نکال لو اور پھر یہ دیکھو کہ قرآن کریم میں کتنی دفعہ حیات بعد الموت کا ذکر آتا ہے اور بائیبل میں کتنی دفعہ حیات بعد الموت کا ذکر آتا ہے۔ تمہیں صاف دکھائی دے گا کہ قرآن کریم میں تو دس پندرہ صفحات میں ہی کئی جگہ مرنے کے بعد کی زندگی کا ذکر آ جائے گا۔ مگر بائیبل میں اس سے دُگنے صفحات میں بھی اس زندگی کی

طرف اشارہ تک نہ ہوگا حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے بعد الموت زندگی کا ذکر یہودیوں میں سے بالکل مٹ گیا تھا اب یہ تو ہم نہیں مان سکتے کہ ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام نے انہیں حیات بعد الموت کی کوئی خبر نہیں دی تھی یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جو پے در پے انبیاء اُن میں آئے۔ جیسے داؤدؑ۔ سلیمانؑ۔ الیاسؑ۔ زکریاؑ۔ یحییٰ علیہم السلام اِن میں سے کسی نے بھی اُن سے حیات بعد الموت کا ذکر نہیں کیا۔ پس بائبل میں اِس کا کوئی ذکر نہ ہونا بتاتا ہے کہ یہود نے ایسی باتوں کو بائبل سے نکال دیا تھا ساری بائبل میں اس اہم مسئلہ کی طرف اشارہ تک نہ ہونا جبکہ قرآن کریم بعث بعد الموت کے ذکر سے بھرا پڑا ہے کوئی معمولی بات نہیں میری رائے یہ ہے کہ بائبل میں یہ تغیر اس لئے پیدا ہوا کہ یہود نے بائبل کی اُن آیات کو جو اُخروی زندگی کے متعلق تھیں غلطی سے اس جہان پر چسپاں کر لیا اور جب بعض حصے بائبل کے اس خیال کے خلاف روشنی ڈالتے نظر آئے تو انہوں نے ایسے حصوں کو بائبل سے نکال دیا جیسے قرآن کریم میں یہ بتایا گیا تھا کہ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (الرحمٰن ع۳) جو شخص خدا سے ڈریگا اُسے دو جنت ملیں گے اِس جہان میں بھی اور اگلے جہان میں بھی۔ تو مسلمانوں نے چونکہ سارا زور اُخروی جنت پر دے دیا تھا انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ دونوں جنتیں اگلے جہان میں ملیں گی۔ اسی طرح جب یہودیوں نے اپنی کتاب میں دیکھا کہ اللہ تعالےٰ نے اُن کے ساتھ مختلف انعامات کا وعدہ کیا ہوا ہے تو چونکہ توجہ تمام تر دنیوی انعامات کی طرف تھی انہوں نے غلو کر کے یہ ساری باتیں دُنیا کے متعلق سمجھ لیں اور جن حصوں کو اس خیال کے مطابق کرنے میں دِقّت محسوس ہوئی اِن حصوں کو بائبل سے بالکل نکال دیا۔ قرآن کریم میں بھی بہت سی آیتیں ایسی ہیں جو اس جہان کے متعلق ہیں لیکن مسلمانوں نے اُن کو اگلے جہان پر چسپاں کر دیا ہے۔ آخری پارہ میں بہت سی پیشگوئیاں ایسی ہیں جو اس زمانہ میں لفظاً لفظاً چسپاں ہوتی ہیں۔ جب انسان ایک طرف قرآن کریم میں اِن پیشگوئیوں کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف اُن واقعات کو دیکھتا ہے جو دنیا میں رُونما ہوئے تو اُس کا دل عش عش کر اُٹھتا ہے وہ بے اختیار سبحان اللہ کہنے لگ جاتا ہے اور اللہ تعالےٰ کے وعدوں پر اس کا یقین بہت بڑھ جاتا ہے مگر ہمارے مفسرین شروع سے لے کر آخر تک اُس کو قیامت پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ اور یہ قدرتی بات ہے کہ جب کسی کو معلوم ہو کہ یہ سورۃ قیامت کے متعلق ہے تو وہ کہتا ہے چلو چھٹی ہوئی مجھے اس پر غور کرنیکی ضرورت ہی کیا ہے۔ مگر یہودی اس کے برخلاف بائبل کی سب باتیں جو اُخروی زندگی کے متعلق تھیں اُن کو اس جہان پر چسپاں کر دیتے تھے۔ اگلے جہان کا ذکر ہمیشہ الہامی کتب میں استعارہ کی زبان میں کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں دُودھ کی نہریں ہوں گی، وہاں شراب کی نہریں ہوں گی اور دُودھ سے مراد علم اور شراب سے مراد شراب محبت ہوتی ہے مگر وہ کہتے تھے کہ یہ سب کچھ اس دنیا میں ملے گا اس لئے اُخروی زندگی کے متعلق جس قدر اشارے اُن کی کتب میں پائے جاتے تھے وہ سب کے سب یا تو انہوں نے اِس دنیا کے متعلق قرار دے دیئے تھے یا انکو ناقابلِ تاویل دیکھکر سرے سے اُڑا ہی دیا تھا۔ اِن اشارات کے مٹ دینے کی وجہ سے اب بائبل میں حیات بعد الموت کا کہیں ذکر ہی نظر نہیں آتا۔

غرض یہ ایک عجیب بات ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دونوں نسلوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے اُخروی زندگی کے ذکر کو اپنی کتب میں سے بالکل مٹا دیا تھا۔ عیسائیوں میں اُخروی زندگی کا کچھ خیال تو ضرور پایا جاتا ہے مگر عیسائیوں میں بھی اُخروی زندگی کا کوئی معیّن نشان نہیں۔

ہم سے کوئی پوچھے تو ہم جنت اور دوزخ کا حال اِس طرح بیان کرتے ہیں جس طرح اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوا کوئی شہر ہوتا ہے کیونکہ اسلام میں بڑی کثرت کے ساتھ اِن باتوں کا ذکر آتا ہے۔ مگر عیسائیوں سے پوچھو تو اُن کے ہاں اس کے متعلق عجیب قسم کا دوغلا سا خیال پایا جاتا ہے۔ مثلاً قیامت کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تَقُوْمُ السَّاعَۃُ عَلٰی اَشْرَارِ النَّاسِ۔ یعنی دنیا میں جب صرف اشرار الناس رہ جائیں گے اور اخیار بالکل مٹ جائیں گے تو قیامت آجائے گی۔ اِس کے یہ معنے نہیں کہ خدا تعالےٰ کی پیدائش بالکل فنا ہو جائیگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا مٹ جائے گی اور اس کی جگہ کوئی اور دنیا قائم کر دی جائے گی۔ لیکن عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ نیکوں پر قیامت آئے گی۔ چنانچہ اُن میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ آخری زمانہ میں جب مسیح آئے گا تو شریر سب مار دئے جائیں گے اور نیک ہمیشہ زندہ رہیں گے اور یہی دنیا جنت بن جائے گی۔ گویا یہود نے بھی اِس مادی دنیا کو اپنے لئے پسند کیا تھا اور عیسائیوں نے بھی اِسی مادی دنیا کو جنت بنا لیا۔ جب وہ اس دنیا میں رہیں گے اور یہی دنیا جنت بن جائے گی تو اس کے معنے یہ ہیں کہ یہی بکرے کاٹ کاٹ کر کھائیں گے یہی بھینسوں کا دودھ پئیں گے اور یہی پھل اپنے استعمال میں لائینگے قرآن کریم نے تو اس حقیقت کو پیش کیا تھا کہ جنت میں جو میوہ ملے گا اُس کے کھانے سے خدا تعالیٰ کی محبت بڑھے گی۔ اور جو دودھ کا پیالہ ملے گا اُس کے پینے سے خدا تعالےٰ کا عرفان ترقی کرے گا۔ اور اُس نے بتایا تھا کہ اس دنیا کی چیزیں جنت کی نعمتوں کے مقابلہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتیں۔ یہ چیزیں اور ہیں اور وہ چیزیں اور۔ مگر عیسائیوں کے نزدیک جب روحانی لوگ اِس دنیا میں ہمیشہ زندہ رہیں گے تو یہی دنیا جنت بنجائیگی درحقیقت اس کے معنے یہ ہیں کہ اگر دنیا میں لوگ بھلے مانس بن جائیں، شرافت کے ساتھ اپنی زندگی کے دن بسر کرنے لگیں، شرارتوں اور بداعمالیوں سے بچیں تو عیسائیوں کے نزدیک کسی اور جنت کی ضرورت ہی نہیں۔ اِسی دنیا کو ہم جنت کہہ دیں گے۔ گویا وہ جنت جس میں ہمارے نزدیک انسان روحانی بنتے بنتے آخر خدا کو دیکھنے لگ جائے گا یہ تصور مسیحیوں کے نزدیک بالکل غلط ہے۔ اُنکے نزدیک اِس دنیا میں سے جب اشرار الناس کا خاتمہ ہو جائیگا تو یہی دنیا جنت کہلانے لگ جائے گی اور اسی دنیا کی نعمتیں اُن کے لئے جنت کی نعمتیں بن جائیں گی۔ لیکن حال یہ ہے کہ مسیحی رُہبان موجودہ زمانہ کو پچھلے زمانوں سے بُرا اور خراب سمجھتے ہیں مسلمانوں کی بھی آج کل یہی حالت ہے۔

وہ بھی جنت کو اُنہی مادی چیزوں کا مجموعہ سمجھتے ہیں جو دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ مجھے یاد ہے ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ میں ندوہ کا جلسہ ہوا مولوی شبلی صاحب مرحوم نے اِس جلسہ کی صدارت کے لئے مصر سے علامہ رشید رضا بلوائے علامہ رشید رضا مفتی عبدہٗ کے شاگرد تھے اور مفتی عبدہٗ جمال الدین صاحب افغانی کے شاگرد تھے۔ جمال الدین صاحب افغانی کا طرزِ تفسیر ایک حد تک (گو اس درجہ کو نہیں پہنچ سکے) ہمارے ساتھ ملتا جلتا تھا۔ مفتی عبدہٗ اُن کے شاگرد تھے اور مفتی عبدہٗ کے شاگرد علامہ رشید رضا تھے چونکہ مفتی عبدہٗ ایسی باتوں سے بچتے تھے جو خلافِ عقل اور نقل ہوں اور دشمن کو اسلام پر ہنسی کا موقع دیتی ہوں اس لئے اُن کی تفسیر مصر میں بہت مقبول تھی۔ رشید رضا صاحب چونکہ اُن کے شاگرد اور اُن کے قدم پر چلنے والے تھے مصر میں اُن کو بھی بہت رسوخ حاصل تھا گو مفتی عبدہٗ جیسا مقام اُن کو حاصل نہیں تھا۔ بہرحال مولنا شبلی نے اُن کو صدارت کے لئے بلوایا۔ یہ حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ کے زمانہ کی بات ہے۔ میں اُن دنوں مدرسہ احمدیہ کا انچارج تھا میں نے ارادہ کیا کہ بعض علماء کو اپنے ساتھ لیکر ہندوستان کے مشہور عربی مدارس کا دورہ کروں اور یہ دیکھوں کہ وہ

مدارس کس رنگ میں جاری ہیں اور کس طرح اُن میں لڑکوں کو تعلیم دی جاتی ہے تاکہ اس تجربہ سے فائدہ اُٹھا کر ہم اپنے مدرسہ کی تعلیم کو بھی ترقی دے سکیں چنانچہ ہم اس دَورہ کے سلسلہ میں دیوبند۔ فرنگی محل۔ رامپور اور بنارس وغیرہ گئے۔ دِلّی کے مدارس بھی دیکھے۔ کان پور کے مدرسہ الٰہیات کا بھی معائنہ کیا۔ مولنا شبلی کو ہمارے اِس دَورہ کا پتہ لگا۔ تو چونکہ وہ مرنجانِ مرنج اور غیر متعصب آدمی تھے آج کل کے مُلّانوں کی طرح نہیں تھے انہوں نے اصرار کیا کہ آپ ہمارے جلسہ پر ضرور تشریف لائیں اور ہمارے ہاں ہی قیام کریں۔ ہم اُن کی دعوت پر چلے تو گئے مگر مصلحتاً ہم اُن کے ہاں نہ ٹھہرے کیونکہ ہم نے سمجھا کہ غیر احمدیوں کو پتہ لگا تو وہ چڑیں گے اور ممکن ہے اِس طرح کوئی بدمزگی پیدا ہو مگر جب مولنا شبلی کو پتہ لگا کہ ہم کہیں اَور ٹھہرے ہوئے ہیں تو وہ اصرار کر کے ہمیں اپنے ہاں لے گئے اور ایک دو دن جب تک جلسہ ہوتا رہا ہم اُنہی کے ہاں ٹھہرے ہمارے جانے سے کچھ بدمزگی بھی ہوئی اور غیر احمدیوں نے گالیاں بھی دیں مگر وہ ہمت والے آدمی تھے انہوں نے کوئی پروا نہ کی۔ اِسی جلسہ میں ایک دن رات کے وقت ندوہ کے ایک پروفیسر عبدالکریم صاحب کی نماز کے موضوع پر تقریر رکھی گئی۔ اِس جلسہ میں شہر کے بڑے بڑے رؤوساء علماء اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ خاص طور پر مدعو تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ شبلی صاحب تھے یا نہیں بہرحال ہم سب لوگ موجود تھے کہ عبدالکریم صاحب ندوی نے نماز پر تقریر شروع کی۔ مولنا شبلی نے اس خیال سے کہ لوگوں کو نماز پڑھنے کا شوق پیدا ہو نوجوان طبقہ کو خصوصیت سے مدعو کیا ہوا تھا اور بیرسٹر اور وکیل وغیرہ بڑی کثرت سے آئے ہوئے تھے بدقسمتی سے مولنا شبلی صاحب کو خود معلوم نہیں تھا کہ یہ پروفیسر صاحب کس لیاقت کے ہیں شاید وہ عربی اچھی پڑھاتے ہوں گے اِس لئے شبلی صاحب کو اُن پر حسن ظنی تھی

سلمانوں کے نزدیک جنت کا عجیب و غریب نقشہ

بہرحال وہ تقریر کے لئے کھڑے ہوئے اور اُنہوں نے ایک دو فقرے اِس امر کے متعلق کہے کہ لوگوں کو نماز پڑھنی چاہیئے کیونکہ نماز کا خدا تعالےٰ نے حکم دیا ہے اور نماز پڑھنے سے جنّت ملتی ہے۔ اِس کے بعد وہ نماز تو بھول گئے اور انہوں نے یہ بیان کرنا شروع کر دیا کہ جنّت جو نماز کے بدلہ میں ملتی ہے کیا چیز ہے اور جنّت کا جو نقشہ انہوں نے کھینچا وہ ایسا خطرناک تھا کہ میں سمجھتا ہوں چکلے میں بیٹھنے اور اُس جنّت میں بیٹھنے میں کوئی امتیاز نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہاں عورتوں کی اِس اِس طرح تصویریں لگی ہوئی ہوں گی اور جس تصویر کو انسان پسند کرے گا وہ اُسی وقت عورت بن جائے گی اور وہ اُس سے خلوت شروع کر دے گا۔ پھر وہ یُوں کرے گا۔ اُس میں اِتنی طاقتیں ہوں گی۔ وہ فلاں فعل چوبیس چوبیس گھنٹہ تک کرتا چلا جائے گا۔ مجھے یاد ہے میرے ساتھ کچھ بیرسٹر بیٹھے ہوئے تھے وہ یہ تقریر سُن کر کہنے لگے خدا کا بڑا فضل ہے کہ یہ لیکچر رات کو ہوا اگر دن کو ہوتا اور غیر مسلم بھی اس میں آئے ہوئے ہوتے تو ہم شرمندگی سے اُن کو مُنہ دکھلانے کے قابل نہ رہتے۔

غرض مسلمانوں نے بھی جنت کو جو روحانیت کا مقام تھا جو دیدارِ الٰہی کا مقام تھا ایک نہایت ہی شرمناک چیز بنا لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی دین کا انکار ہی ہے بھلا یہ بھی کوئی اقرار ہے کہ اس دنیا میں تو جہاں خدا تعالیٰ سے غافل کرنے کے ہزاروں سامان موجود ہیں یہیں کہا جاتا ہے کہ

جو دم غافل سو دم کافر

اور وہ جہاں جہاں خدا نظر آ جائیگا اُس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہاں عورتوں کی بغلوں میں ہم سارا دن گھسے رہیں گے نہ نماز ہوگی نہ عبادت ہوگی نہ عشقِ الٰہی کے جذبات ہوں گے نہ روحانیت کی ترقی کے کوئی سامان ہوں گے گویا اِس دنیا میں ہمیں یوں کافر بنایا گیا اور جنت میں ہمیں اِس طرح کافر بنایا جاتا ہے ؛

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝

(مَیں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

اَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ يُكَذِّبُ بِالدِّيۡنِ ؕ‏ ۝

(اے مخاطب) کیا تو نے اُس شخص کو پہچانا؟ جو دین کو جھٹلاتا ہے ۲۵

۲۵ حل لغات - اَرَءَیۡتَ کے لفظی معنے تو یہ ہیں کہ کیا تُو نے دیکھا مگر عربی زبان میں رَاَیۡتَ کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے ایک رویتِ بصری کے معنوں میں دوم رویتِ قلبی کے معنوں میں یعنی اس کے معنوں میں آنکھ سے دیکھنا بھی شامل ہے اور دل سے دیکھنا بھی شامل ہے۔ مثلاً اِس وقت میرے سامنے گھڑی پڑی ہوئی ہے اگر میں کسی سے کہنا چاہوں کہ میں نے اس گھڑی کو دیکھا تو مَیں کہونگا رَأَیۡتُ هٰذِهِ السَّاعَةَ۔ لیکن کبھی یہ لفظ رویتِ قلبی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اُس وقت اِس کے معنے دیکھا کی بجائے "پایا" کے ہوتے ہیں۔ اُردو میں بھی کہتے ہیں "مَیں نے اُس کو ایسا پایا" چنانچہ عربی زبان میں کہتے ہیں رَاَیۡتُ زَیۡدًا اَسَدًا مَیں نے زید کو شیر دیکھا اب اس کے یہ معنے نہیں ہوں گے کہ مَیں نے زید کو دیکھا تو شیر کی طرح اُس کے پنجے تھے بلکہ معنے یہ ہوں گے کہ مَیں نے زید کا تجربہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ بڑا بہادر انسان ہے۔ یہ رویتِ قلبی کہلاتی ہے کیونکہ تجربہ دل سے ہوتا ہے ظاہری آنکھ سے نہیں ہوتا پس رَاَیۡتُ زَیۡدًا اَسَدًا کے یہ معنے نہیں کہ مَیں نے ظاہری آنکھوں سے زید کو دیکھا تو وہ شیر نظر آیا بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ مَیں نے سرد اور گرم اور اچھی اور بُری حالتوں میں اس کا تجربہ کیا اور میرے دل نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ ایسا ہے۔

رویتِ قلبی کے معنوں میں جب یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے دو مفعول آتے ہیں اور رویتِ بصری کی صورت میں صرف ایک مفعول آتا ہے۔ مگر جب اس سے پہلے ہمزہ آجائے تو اُس وقت اِس کے ایک اور معنے بھی ہو جاتے ہیں جو اس کی عام بناوٹ کے بالکل خلاف ہیں یعنی اس لفظ کے معنے پانے کے نہیں رہتے بلکہ یہ معنے ہو جاتے ہیں کہ اَخۡبِرۡنِیۡ مجھے بتاؤ۔ حالانکہ مفرد لفظ کے یہ معنے نہیں ہوتے ماضی کے صیغہ پر ہمزہ زائد کر دینے سے یہ معنے پیدا ہوتے ہیں۔ پس اَرَءَیۡتَ کے لفظی معنے گو یہ ہیں کہ کیا تُو نے دیکھا۔ مگر عرب کے محاورہ کے مطابق اسکے معنے اَخۡبِرۡنِیۡ یعنی مجھے بتلاؤ کے ہو جاتے ہیں۔

اَلدِّیۡنُ - دین کے عربی زبان میں تیرہ[13] معنے ہیں (۱) اَلۡجَزَاءُ وَالۡمُکَافَاۃُ - بدلہ اور مطابق عمل نتیجہ (۲) اَلطَّاعَةُ - فرمانبرداری (۳) اَلۡحِسَابُ - حساب لینا (۴) اَلۡقَهۡرُ وَالۡغَلَبَةُ وَالۡاِسۡتِعۡلَاءُ - کسی پر غلبہ پانا اور اُس پر فائق ہو جانا (۵) اَلسُّلۡطَانُ - بادشاہت اور حکومت (۶) اَلتَّدۡبِیۡرُ - تدبیر (۷) مَا یُتَعَبَّدُ بِهِ اللّٰهُ - وہ حرکات و سکنات یا الفاظ جن کے ذریعہ سے خدا تعالےٰ کی عبادت کی جاتی ہے جس کو ہم نماز پڑھنا کہتے ہیں (۸) اَلۡمِلَّةُ - دین یا نظامِ جماعت (۹) اَلۡوَرَعُ - بدیوں سے رُکنے کی خواہش (۱۰) اَلۡحَالُ حالت یا کیفیت (۱۱) اَلۡقَضَاءُ - قضاء و قدر جسے تقدیر کہتے ہیں (۱۲) اَلۡعَادَةُ - عادت کا ہو جانا (۱۳) اَلشَّاْنُ ایک خاص حالت۔ شان کے معنے حالت کے ہوتے ہیں لیکن اَلشَّاْنُ کا لفظ عام حالت کی کسی قدر بلند معنوں کیطرف اشارہ کرتا ہے جسے ہمارے ملک میں بڑی شان کہہ دیتے ہیں یا اس کے معنے حالتِ مخصوصہ کے سمجھ لیں۔

نوٹ:- اَرَءَیۡتَ کے محاورہ کے مطابق معنے اَخۡبِرۡنِیۡ کے ہیں لیکن ہم نے ترجمہ کی سہولت کی غرض سے آیت کا لفظی ترجمہ کیا ہے کیونکہ بامحاورہ ترجمہ کریں تو بعض الفاظ خطوط وحدانی میں لانے پڑتے ہیں اور خطوط کے باہر کا ترجمہ بے معنیٰ ہو جاتا ہے۔

اَرَءَيْتَ کے معنے اس جگہ تمام مفسرون اور نحویوں نے اَخْبِرْنِیْ کے کئے ہیں یعنی مجھے بتا۔ میں نے بتایا ہے کہ جب یہ لفظ رویتِ قلبی کے معنوں میں استعمال ہو تو اس کے دو مفعول آیا کرتے ہیں۔ ایک مفعول تو ظاہر ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ مجھے وہ شخص بتا جو تکذیبِ دین کرتا ہے۔ پس ایک مفعول تو آگیا سوال یہ ہے کہ دوسرا مفعول کہاں ہے؟ سو ظاہر ہے کہ وہ مفعول یہاں محذوف ہے۔ حُوفی نے جو ایک بڑے نحوی گذرے ہیں یہاں دوسرا مفعول اَلَيْسَ مُسْتَحِقًا عَذَابَ اللّٰهِ کے جملہ کو قرار دیا ہے یعنی مجھے بتا تو سہی کہ جو شخص دین کی تکذیب کرتا ہے کیا وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق نہیں یعنی وہ عذاب کا مستحق ضرور ہے اور زمخشری نے وہ الفاظ مَنْ هُوَ کے بتائے ہیں۔ زمخشری معتزلی ہیں اور معتزلیوں کے خیالات آج کل کے نیچریوں سے ملتے جلتے تھے لیکن ادب اور نحو میں وہ بڑے پایہ کے انسان ہیں ایک عربی لغت کی کتاب بھی انہوں نے لکھی ہے اور کم سے کم انہوں نے قرآن کریم کی یہ خدمت ضرور کی ہے کہ وہ قرآن کریم کے الفاظ کی تائید میں عربی کے محاورات، نحو کے قواعد اور شعر بڑی کثرت سے لے آتے ہیں جس سے معنے بالکل واضح ہو جاتے ہیں اور میرے نزدیک اُن کی ایک یہ بھی بڑی خدمت ہے کہ اُنہوں نے بہت سی رطب و یابس باتوں سے اپنی تفسیر کو بالکل پاک کر دیا ہے گو اس کے ساتھ وہ ایک حد تک معجزات کا بھی انکار کر دیتے ہیں مگر جو لغو باتیں قرآن کریم کی طرف منسوب ہوتی تھیں اُن سے بھی انہوں نے ایک حد تک تفسیر کو پاک کر دیا ہے۔ نیچری کی تلوار دو طرفہ چلتی ہے وہ لغویات بھی اُڑا دیتا ہے اور ساتھ ہی کچھ سچے معجزے بھی اُڑا دیتا ہے

علامہ زمخشری کے تجویز کردہ محذوف کو مدنظر رکھتے ہوئے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ مَنْ هُوَ۔ یعنی اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا اے مخاطبِ قرآن مجھے بتا تو سہی کہ وہ شخص جو دین کا انکار کرتا ہے وہ کون ہے۔ اس امر کی دلیل کہ اَرَءَيْتَ میں رویتِ بصری نہیں بلکہ قلبی ہے زمخشری نے یہ دی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں اس آیت کی ایک قرأت اَرَءَيْتَكَ ہے اور یہ مسلمہ بات ہے کہ کافِ خطاب رویتِ بصری میں نہیں لگ سکتا۔ وہ اس قرأت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ یہاں رویتِ بصری مراد نہیں ہو سکتی مگر میرے نزدیک اس کیلئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں تھی یہاں رویتِ قلبی ہی مراد ہو سکتی ہے بصری ہو ہی نہیں ہو سکتی۔

حُوفی کہتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں رویتِ بصری ہی مراد ہو اور حذف کوئی نہ ہو اور معنے یہ ہوں کہ کیا تُو نے اُس شخص کو جو دین کا انکار کرتا ہے دیکھا ہے اور مطلب یہ ہو کہ اس قسم کا انکار کرنے والے کو یقیناً تُو نے دیکھا ہے اور ہمزہ انکار کے لئے نہ ہو بلکہ اقرار کیلئے ہو جیسے اَلَمْ تَرَ میں نفی نہیں بلکہ اقرار ہے۔ مگر درحقیقت یہاں رویتِ بصری نہیں بلکہ رویتِ قلبی ہی ہے کیونکہ مختلف اشخاص کو جب دیکھنے کا ذکر ہو تو اُس وقت رویتِ بصری مراد نہیں ہو سکتی۔ آخر يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ سے کوئی ایک شخص تو مراد نہیں بلکہ سارا مکہ دین کی تکذیب کر رہا تھا۔ بلکہ سب دنیا ہی ایسا کر رہی تھی۔ اور جب ایک قوم کا ذکر ہو تو اُس وقت رویتِ بصری نہیں بلکہ قلبی ہی مراد ہو سکتی ہے اور ایک وجود کے ذکر سے محض تشخص ذہنی مراد ہوتا ہے ہم قوم کے فعل یا عمل یا طریقہ کا ایک وجود تسلیم کر کے کہتے ہیں کہ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے آگیا ہے۔ پس حُوفی کے ان معنوں کو مدنظر رکھا جائے تب بھی درحقیقت رویتِ بصری نہیں بلکہ رویتِ قلبی ہی کا ذکر اس آیت میں پایا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان معنوں کے رُو سے مفعول ایک ہی سمجھا جائے گا لیکن مراد رویتِ قلبی ہی لی جائے گی۔ بہرحال یہ حُوفی کا خیال ہے ان کے سوا سب علماء اس بات پر متفق ہیں کہ اس آیت میں رویتِ قلبی ہی مراد لی جا سکتی ہے۔

مَیں پہلے کئی دفعہ بیان کرچکا ہوں کہ قرآن کریم جو الفاظ استعمال کرتاہے یا محاورے استعمال کرتا ہے اُن کے جس قدر معنے ہوں وہ سب کے سب اگر سیاق و سباق کے لحاظ سے چسپاں ہوسکتے ہوں تو آیت کے صحیح معنے سمجھے جائیں گے پس اَلدِّین کے جو معنے مَیں نے اُوپر بیان کئے ہیں اُن میں سے جو معنے بھی اِس سُورت کے مضمون کے مطابق ہوں اُن کی طرف آیت کا اشارہ سمجھا جائے گا اور کسی کو اختیار نہیں کہ اُن میں سے کسی معنے کو ردّ کرے۔ پس مَیں اِن مختلف معانی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس آیت کی تفسیر کرتا ہوں۔

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ (۱) مجھے بتا تو سہی کہ وہ جو جزا و سزا کا انکار کرتا ہے وہ کون ہے؟ (۲) یا مجھے بتا تو سہی کہ وہ جو اطاعت کا منکر ہے یعنی نظام یا اطاعت کا منکر ہے وہ کون ہے؟ (۳) یا مجھے بتا تو سہی کہ وہ جو حق و انصاف کے غلبہ کا منکر ہے وہ کون ہے؟ (۴) یا مجھے بتا تو سہی کہ حکومتِ الٰہیہ کا منکر کون ہے۔ (۵) یا مجھے بتا تو سہی کہ مذہب کا منکر کون ہے (۶) یا مجھے بتا تو سہی کہ عبادتِ الٰہیہ کا منکر کون ہے (۷) یا مجھے بتا تو سہی کہ قومی شیرازہ بندی یا دوسرے لفظوں میں مذہبی شیرازہ بندی کا منکر کون ہے (۸) یا مجھے بتا تو سہی کہ شبہات سے محفوظ رہنے اور اُن سے بچنے کی خواہش کا منکر کون ہے (۹) یا مجھے بتا تو سہی کہ عادت کی طاقت اور اُس کے اثرات کا منکر کون ہے (۱۰) یا مجھے بتا تو سہی کہ تدبیرِ صحیحہ کا منکر کون ہے (۱۱) یا مجھے بتا تو سہی کہ قضاءِ الٰہی کا منکر کون ہے (۱۲) یا مجھے بتا تو سہی کہ اللہ تعالیٰ کی جلوہ آرائیوں اور اُس کی جلوہ نمائیوں کا منکر کون ہے۔

یہ بارہ[۱۲] معنے سارے کے سارے اس جگہ پر چسپاں ہوتے ہیں لغت کے بیان کردہ تیرہ معنوں میں سے بعض کو مَیں نے چھوڑ دیا ہے۔ مثلاً حال کے معنے میں نے چھوڑ دئے ہیں کہ یہ لفظ شان کے لفظ سے بہت قریب معنے رکھتا ہے اور شان کے معنے میں نے لے لئے ہیں۔ مِلّت کے معنوں کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے کیونکہ اس کے دو معنے ہیں اور دونوں اس جگہ چسپاں ہوتے ہیں۔ حساب کے معنوں کو بھی میں نے چھوڑ دیا ہے اس لئے کہ حساب کے معنی جزا و مکافاۃ سے ملتے ہیں اور یہ معنے مَیں نے لے لئے ہیں پس ایک بڑھ گیا اور دو چھوڑ دیے گئے۔ اور اس طرح تیرہ معنوں میں سے بارہ معنے رہ گئے۔ اب مَیں اِن معنوں کے مطابق اس آیت کی تفسیر الگ الگ بیان کرتا ہوں

تفسیر۔ دِین کے پہلے معنوں کے لحاظ سے آیت کے یہ معنے تھے کہ مجھے بتا تو سہی کہ جزا و سزا کا منکر کون ہے یعنی اُس کے فعل کی شناعت اور بُرائی بڑی وسیع ہے جیسے ہم کہتے ہیں۔ بتاؤ تو سہی یہ بات کون کہتا ہے۔ اِس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ زید کہتا ہے یا بکر۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو بھی کہتا ہے بڑی بُری بات کہتا ہے۔ اسی مفہوم کے مطابق اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھے بتا تو سہی کہ جزا و مکافاۃ کا منکر کون ہے یعنی وہ بہت بُرا آدمی ہے (آگے جا کر بتائے گا کہ جزا و مکافاۃ کے انکار کا نتیجہ کیا نکلے گا) یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ بارہ باتیں جو شمار کی گئی ہیں در حقیقت یہ اصولی بدیاں ہیں اور اُنکے نتیجہ میں انسان ہزاروں ہزار جزئی بدیوں میں مبتلا ہو جاتاہے۔ گویا ان میں سے ایک ایک بدی ایسی ہے کہ جس کے اندر وہ قائم ہو جائے گی اُس کے اندر اور ہزاروں بدیاں پیدا ہو جائیں گی مثلاً پہلی چیز جزا و سزا کا انکار ہے۔ جب بھی جزا و سزا کا منکر کوئی انسان ہو جائے گا اُسے ہر قسم کی بدیوں پر دلیری پیدا ہو جائے گی۔ ہزاروں ہزار نیکیاں انسان ڈر کے مارے کرتا ہے اور ہزاروں ہزار نیکیاں انسان امید کے ساتھ کرتا ہے۔ جزا و سزا سے مراد اخروی جزا و سزا ہی نہیں بلکہ جزا و سزا کا سلسلہ اس دنیا میں بھی چلتا ہے اور قرآن کریم میں متواتر بیسیوں جگہ پہ یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اگلے جہان سے ہی جزا و سزا شروع نہیں ہوتی

دِین کے تیرہ معنے[۱]

بلکہ اِسی جگہ سے شروع ہو جاتی ہے۔ انبیاء کے منکروں پر جو عذاب آتا ہے یا قانونِ قدرت کو توڑنے والوں کو جو سزائیں ملتی ہیں وہ اگلے جہان سے شروع نہیں ہوتیں بلکہ اِسی جہان سے شروع ہو جاتی ہیں۔ پس اس جگہ یہ مراد نہیں کہ جو جنت و دوزخ کا قائل نہیں۔ بلکہ مراد اعمال کا بدلہ ہے خواہ اِس دنیا میں ملے خواہ اگلے جہان میں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جو جنت و دوزخ کے قائل نہیں لیکن جزا و سزا کے قائل ہیں وہ بھی ہزاروں بدیوں سے بچے رہتے ہیں مثلاً بعض لوگ ایسے ہیں جو قومی خرابیوں کے نتائج کے قائل ہیں وہ یہ مانتے ہیں کہ بعض قسم کے کیرکٹر پیدا ہو جائیں تو قوم تباہ ہو جاتی ہے اور بعض قسم کے کیرکٹر پیدا ہو جائیں تو قوم تباہی سے بچ جاتی ہے۔ مثلاً تعلیم اگر کسی قوم میں آجائے، سچ کی عادت اگر کسی قوم میں راسخ ہو جائے، محنت کی عادت اگر کسی قوم میں پیدا ہو جائے، قربانی اور ایثار کا مادہ اگر کسی قوم میں پیدا ہو جائے تو وہ قوم ترقی کر جاتی ہے۔ یہ بھی جزا و سزا ہی ہے۔ چنانچہ جن قوموں میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ ان باتوں کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور پیدا ہوتا ہے وہ اپنی اصلاح کر لیتی اور ترقی کر جاتی ہیں۔ یورپ کی قومیں چونکہ عیسائیت کی قائل ہیں اس لئے وہ جزا و سزا کی مُنہ سے قائل ہیں مگر عملاً دہریہ ہیں آئندہ زندگی کی امید اُن میں سوائے جہال کے یا سوائے پادریوں کے ایک خاص طبقہ کے اور کسی میں نہیں پائی جاتی۔ لیکن انہوں نے تاریخ کے گہرے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ ضرور نکال لیا ہے کہ عام طور پر لوگوں میں جو یہ خیال پایا جاتا ہے کہ بعض کام بے نتیجہ رہ جاتے ہیں یہ بالکل غلط ہے کوئی کام بے نتیجہ نہیں رہتا انفرادی کام بھی اور قومی کام بھی۔ ہر کام کے نتائج آخر ضرور نکلتے ہیں۔ اچھے کام کے اچھے نتائج نکلتے ہیں اور بُرے کام کے بُرے نتائج پیدا ہوتے ہیں پس خدا تعالیٰ کی رضامندی یا نارضامندی کی خاطر نہیں بلکہ جو قانونِ قدرت اُنہیں دنیا میں رائج نظر آتا ہے اُسے دیکھتے ہوئے وہ اِس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ ایسا کوئی فعل نہیں جو بے جزا یا بے سزا کے رہے۔ اِس وجہ سے وہ قومی اخلاق پر پوری طرح عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ سچ اس لئے نہیں بولتے کہ خدا تعالیٰ خوش ہوگا۔ وہ سچ اس لئے نہیں بولتے کہ سچ بولنے سے جنّت ملتی ہے بلکہ وہ سچ اس لئے بولتے ہیں کہ سچ کے بغیر اعتبار پیدا نہیں ہوتا اور اعتبار کے بغیر تعاون پیدا نہیں ہوتا۔ یا اگر ہم سچ نہیں بولیں گے تو غیر قوموں میں ہمارا اعتبار نہیں رہے گا اور ہماری تجارت ترقی نہیں کریگی ہندوستان کی غیر ملکوں سے کروڑوں روپیہ کی تجارت تھی جو جھوٹ بولنے کی وجہ سے سب کی سب تباہ ہو گئی۔ اِس کے مقابلہ میں یورپ کا آدمی بھی انفرادی طور پر جھوٹ سے پرہیز نہیں کرتا ہے مگر وہ ایسا جھوٹ نہیں بولتا جو قومی نقصان کا موجب ہو۔ یہاں کسی دوکاندار سے جاکر کہہ دو کہ ہمارے گھر فلاں چیز بھجوا دینا تو وہ کبھی ویسی نہیں ہوگی جیسی دوکان پر جاکر دیکھی گئی تھی۔ لیکن یورپ اور امریکہ میں آرڈر بھجواؤ تو چھ مہینہ یا سال کے بعد عین آرڈر کے مطابق چیز آجائیگی۔ تم کبھی غیر ملکوں میں اس قسم کا تمسخر نہیں دیکھو گے جیسے ہمارے ملک میں ہوتا ہے کہ اخبارات میں اشتہار شائع کئے جاتے ہیں کہ اگر فلاں چیز کا ایک آرڈر دیا جائے تو ہم ایک گھڑی مفت دینگے حالانکہ وہ چھ آنے کی گھڑی ہوتی ہے مگر نام انعام رکھا جاتا ہے جو صریح دھوکا بازی ہوتی ہے۔ یا قلم وہی ہوگی جو اڑھائی آنے کی جرمنی سے آتی ہے اور اشتہار یہ دیا جاتا ہے کہ ایک فونٹن پن مفت دیا جائے گا۔ یہ دھوکا اور فریب یورپ میں نہیں۔ اِس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ قومی کیرکٹر اچھا نہ ہو تو تجارتیں نہیں چل سکتیں۔ انہوں نے چونکہ غیر ملکوں میں اپنا مال بیچنا ہوتا ہے اِس لئے وہ ایسی طرز پر کام کرتے ہیں کہ اُن کے وقار کا سکّہ بیٹھا رہتا ہے خصوصاً انگلستان اور امریکہ میں

یہ بات نہایت نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ جرمنی میں ایک حصہ ایسا تھا جو فریب کاری کرتا تھا مگر عام طور پر جرمنوں میں بھی یہ بات نہیں تھی پھر انگلستان اور امریکہ کے بعد سوئٹزرلینڈ نے بھی تجارت میں خاص طور پر ترقی کرلی ہے کوئی مال منگواؤ بالکل ویسا ہی آئے گا جیسا آرڈر دیا گیا تھا۔ فرانس سے منگواؤ تو وہ نوّے فیصدی ٹھیک ہوگا لیکن ہندوستان کے کسی دوکاندار کو آرڈر دو وہ نوّے فیصدی خراب مال بھجوائیگا پس جزاؤ مکافاۃ کے یہ معنے نہیں کہ خدا کی طرف سے جو جزاء و مکافاۃ ملتی ہے بلکہ جو شخص بھی جزاء و مکافاۃ پر یقین نہیں رکھیگا خواہ قومی اخلاق کے نتائج پر اُس کا یقین نہ ہوگا اور خواہ خدا تعالےٰ پر اُس کا یقین نہیں ہوگا اُس کا کیریکٹر ضرور خراب ہو جائے گا۔

بعض احمق فلاسفر کہہ دیا کرتے ہیں کہ کسی انعام کی خاطر کام کرنا یا کسی سزا کے خوف سے کام کرنا اچھے اخلاق میں شمار نہیں ہو سکتا۔ اصل میں یہ فلاسفروں کا نہیں بلکہ پادریوں کا ایک احمقانہ نظریہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتداء میں جس قدر فلسفہ یورپ میں پڑھایا جاتا تھا وہ پادریوں کے سکولوں میں ہی پڑھایا جاتا تھا پادری ہی پروفیسر ہوتے تھے اور تمام کالج انہی پادریوں کے ماتحت ہوتے تھے اِس لئے یوروپین فلسفہ میں کئی ایسی چیزیں داخل ہو گئی ہیں جو مذہب سے رنگین ہیں جیسے ہمارے ابتدائی زمانہ کے علوم بھی بہت حد تک مذہب سے متاثر نظر آتے ہیں۔ لغت کو لے لو، شعر کو لے لو، تفسیر کو لے لو سب میں مخصوص مذہبی عقائد کی جھلک پائی جائیگی۔ اس لئے ہمارے علوم میں بھی کئی غلطیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے مذہب نے فلسفہ میں دخل نہیں دیا لیکن یورپ کے مذہب نے فلسفہ میں بھی دخل دیا ہے۔ ہمارے مذہب نے طب میں دخل نہیں دیا لیکن یورپ کے مذہب نے طب میں بھی دخل دیا ہے۔ ہاں ہمارے مذہب نے لغت میں دخل دیا ہے اور اس کا اثر لغت میں صاف طور پر نظر آتا ہے بعض دفعہ کسی مقام پر قرآن کریم کی لُغت حل کرنے میں مشکل پیش آتی ہے اور ہم لغت دیکھتے ہیں تو وہ ان معنوں کی تائید میں جن کی ہم تحقیق کر رہے ہوتے ہیں زیر بحث آیت کو ہی مثال میں پیش کر دیں گے اور اس سے تحقیق تشنہ رہجائیگی یہ ایک کمزوری ہے جو عربی لُغت میں پائی جاتی ہے اگر خدا تعالےٰ نے کسی کو توفیق دے تو وہ لغت سے اس قسم کی باتوں کو ضرور نکال دے جو مذہبی عقیدہ کی وجہ سے اس میں داخل کر دی گئی ہیں ان باتوں کی موجودگی قرآن کریم کی خدمت نہیں بلکہ اُس پر ظلم ہے اِس لئے کہ جب کوئی شخص جھوٹا راستہ اپنے لئے نکالتا ہے تو وہ علم کے دروازہ کو بند کر دیتا ہے۔ قرآن کریم تو خدا کی کتاب ہے انہیں سمجھنا چاہیئے تھا کہ جو کچھ خدا نے کہا ہے وہ صحیح ہے اور سیں غور کرنا چاہیئے تھا کہ اگر اُنکے علم کے مطابق لغت میں اِس کے کسی لفظ کے معنے نہیں ملتے تو وہ اور کوشش کریں خدا تعالیٰ اُن پر ضرور کوئی راستہ تحقیق کا کھولدیگا یہ کیا کہ قرآن کریم کے کسی لفظ کے معنوں کی تلاش میں خود اُسی آیت کو پیش کر دیا جس میں وہ لفظ استعمال ہوا ہے اور اسکے معنے لغت کے مطابق نہیں بلکہ تفسیر کے مطابق کر دئے حالانکہ لغت نے تو ہمیں یہ نتیجہ نکالنے میں مدد دینی تھی کہ جو معنے ہم نے سمجھے ہیں وہ درست ہیں یا نہیں۔ اگر یہ لوگ جلدبازی کی بجائے غور کرتے تو لغت میں بھی زیادتی ہوتی اور قرآن کریم کے معارف میں بھی زیادتی ہوتی۔ مگر چونکہ انہیں نے جھوٹا راستہ اختیار کیا اس لئے جو کسی سابق مفسّر نے اس آیت کی تفسیر میں کسی خاص لفظ کے معنے کئے تھے وہی انھوں نے اس لفظ کے لغت میں معنے لکھدئے اور لغت کو قرآن کریم کی خدمت سے محروم کر دیا اور یہ غلطی ایک دو مقام پر نہیں کی گئی بلکہ ایسے بہت سے الفاظ ہیں جن کے بارہ میں یہ غلطی کی گئی ہے سب سے بڑی لغت کی کتاب لسان العرب ہے

اس کو ہی دیکھا جائے تو اِس میں بھی بعض مقامات پر نقص نظر آئے گا۔ ایک لفظ جس کے معنے وہ لکھ رہے ہیں اگر قرآن کریم میں اس کا استعمال لغت کے معروف معنوں کے خلاف نظر آیا ہے تو انہوں نے تفسیری معنے اس لفظ کے لکھ کر اُسکی سند میں قرآن کریم کی زیر بحث آیت لکھ دی۔ حالانکہ چاہئے تھا کہ تفسیری معنوں کو یا تو رد کرتے کہ یہ لغت کے خلاف ہیں یا پھر عربوں کے محاورہ سے مثالیں دے کر ثابت کرتے کہ یہ تفسیری معنے درست ہیں اور عرب ان معنوں میں اس لفظ یا جملہ کو بولتے ہیں۔ آیت کو ہی دلیل کے طور پر پیش کر دینے سے اعتراض دُور نہیں ہوتا بلکہ اور مضبوط ہوتا ہے۔ اگر وہ زیادہ تحقیق کرتے تو یقیناً اس کے کئی حل نکل آتے مگر انہوں نے جلد بازی سے کام لیا اور اس طرح یہ نقص رہ گیا۔

چونکہ پادریوں کا بھی یورپ میں فلسفہ کی تعلیم میں دخل تھا اس لئے انہوں نے اسلام پر اعتراض کرنے کے لئے فلسفہ میں ایسی کئی باتیں داخل کر دیں جو درحقیقت کسی فلسفہ کا نتیجہ نہیں بلکہ قرآن پر اعتراض کرنے کے لئے انہوں نے اُن مسائل کو فلسفہ میں شامل کر دیا۔ چونکہ قرآن کریم بار بار اس مسئلہ کو پیش کرتا ہے کہ مرنے کے بعد جنت اور دوزخ ہوگی اس لئے انہوں نے فلسفہ کے نام پر یہ بحث اُٹھا دی کہ جو کام انسان عذاب کے ڈر کے مارے کرتا ہے یا انعام کی خواہش سے کرتا ہے وہ کوئی نیکی نہیں بلکہ نہایت ادنیٰ درجہ کا خلق ہے۔ مگر یہ بالکل جھوٹ ہے اگر یہ ادنیٰ اخلاق ہیں تو دنیا میں اخلاق ہیں ہی نہیں۔ کونسا کام ہے جو انسان ڈر کے مارے نہیں کرتا یا کونسا کام ہے جو انسان کسی فائدہ کی امید میں نہیں کرتا۔ یہی پادری جو اعتراض کرنے والا ہے اگر اُس کے سامنے پاؤ بھر مرچیں رکھ دی جائیں اور اُسے کہا جائے کہ یہ مرچیں کھاؤ تو کیا وہ کھالیگا وہ کہے گا میں مرچیں نہیں کھا سکتا کیونکہ مجھے پیچش ہو جائیگی اب کیا ڈر کے مارے اُس نے مرچوں کو چھوڑا یا نہیں۔ مگر کیا یہ بدی ہو جائے گی؟ اگر ڈر کے مارے کسی کام کو چھوڑنا بُرا ہے تو یہ قانون اور تعزیرات وغیرہ کیوں ہیں اور کیوں یہ کہا جاتا ہے کہ اگر چور چوری کرے گا تو اُسے اِتنی سزا دی جائے گی۔ اگر مسیحی فلسفہ کا یہ نکتہ درست ہے تو یہ ساری گورنمنٹیں قانونِ اخلاق کو بگاڑنے والی ہیں قانونِ اخلاق اِسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ وہ یہ اعلان کر دیں کہ ہم کسی کو چوری کی سزا نہیں دیں گے اگر کسی نے چوری چھوڑنی ہے تو خود بخود چھوڑ دے یا ہم کسی کو قتل کی سزا نہیں دیں گے اگر کسی نے قتل چھوڑنا ہے تو اپنی مرضی سے چھوڑ دے۔ مگر کیا دنیا کی کوئی گورنمنٹ ایسی بات مان سکتی ہے؟ محض قرآن اور اسلام پر اعتراض کرنے کے لئے پادریوں نے اپنا مُنہ کالا کیا ہے اور ایک ایسا فلسفہ بنا کر پیش کر دیا ہے جو نہ یورپ میں رائج ہے نہ امریکہ میں رائج ہے نہ فرانس میں اور نہ جرمنی میں رائج ہے اور نہ عملاً دنیا میں ایسا ممکن ہے۔ وہی پروفیسر جو کالج میں یہ پڑھاتا ہے کہ سزا کے خوف سے کام کرنا سخت بُرا ہوتا ہے یا جزاء کی اُمید سے کام کرنا بداخلاقی ہے وہ خود اس قانون پر عمل نہیں کر رہا ہوتا کیونکہ وہ تنخواہ لیکر پڑھا رہا ہوتا ہے۔ اور اگر اُس کا نوکر غلطی کرتا ہے تو وہ اسے آٹھ آنے جرمانہ کر دیتا ہے۔ اب کیا آٹھ آنے جرمانہ وہ اپنے نوکر کے اخلاق کو بگاڑنے اور اُس کے معیارِ اخلاق کو گرانے کے لئے کرتا ہے۔ اگر سزا کا خوف دلانا انسان کے اخلاق کو بگاڑتا ہے تو وہ اپنے نوکر کو سزا کا خوف کیوں دلاتا ہے وہ اُسے جُرمانہ کیوں کرتا ہے؟ محض اس لئے کہ وہ خود اِس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے کہ دنیا میں انسان مختلف معیارِ اخلاق کے ہیں۔ کسی پر سزا زیادہ اثر کرتی ہے کسی پر انعام زیادہ اثر کرتا ہے اور کوئی ایسا ہوتا ہے جو عشق کے مقام پر ہوتا ہے وہ سزا اور انعام سب کچھ بھول جاتا ہے۔ بہرحال ابتدائی درجہ خوف کا ہے دوسرا درجہ انعام کی امید کا ہے اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ انسان کو نیکی کی عادت

ہو جاتی ہے اور وہ نیکی کے فلسفہ پر غور کر کے اُس کے ذاتی جوہر سے واقف ہو جاتا ہے اور پھر وہ نیکی کو محض اس کی محبت اور رغبت کی وجہ سے کرتا ہے کسی انعام کی خواہش یا کسی سزا کے ڈر سے نہیں کرتا۔ اور سب سے مقدم درجہ یہ ہے کہ کسی اعلیٰ مثال کی نقل میں تکمیلِ نفس کی خاطر نیکی کی جائے۔ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی ترک کر دو تو بنی نوع انسان کا بیشتر حصہ گناہوں اور بدیوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ پس یہ فلسفہ محض اسلام کی دشمنی کے نتیجہ میں پادریوں نے پیش کر کے اپنا ناک کٹایا ہے مسلمان جب تک اُن کے فریبوں سے واقف نہیں تھا وہ اِن باتوں سے متاثر ہو جاتا تھا مگر جب یہ اعتراض اُن لوگوں تک پہنچے جو قرآن کریم کو سمجھتے تھے تو اُن کا سارا فریب کھل گیا۔

غرض جزا و سزا سے مراد یہاں اُخروی جزا و سزا نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہاں اخروی جزا و سزا لازمی نہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ اُس جزا و سزا کا ردّ ہے۔ بہرحال جزا و سزا کا احساس یعنی اس بات کا کہ اچھے اخلاق سے قوم ترقی کرتی ہے اور بُرے اخلاق سے قوم بگڑ جاتی ہے یا اچھے اطوار سے قوم ترقی کرتی ہے اور بُرے اطوار سے قوم بگڑ جاتی ہے۔ یا جو قومیں بُرے کام کرتی ہیں آخر کسی نہ کسی وقت اُس کی سزا کو بھگتتی ہیں۔ یا خدا تعالیٰ کو ماننے والے کا یہ یقین کہ خدا تعالیٰ میرے بُرے اعمال کی ضرور سزا دے گا خواہ دنیا میں دے یا اگلے جہان میں۔ یا اچھے اعمال کا مجھے ضرور انعام دے گا خواہ دنیا میں دے یا اگلے جہان میں۔ یہ خیال کسی فرد یا قوم میں پیدا ہو جانا اُسے بُری باتوں سے ضرور روکتا ہے یہ اتنی ثابت شدہ اور صاف بات ہے کہ اس کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ کوئی جان بوجھ کر اندھا ہو جائے۔ پس اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ میں جب دِین کے معنے جزاء و مکافاۃ کے لئے جائیں تو اِس آیت کے یُوں معنے ہوں گے کہ مجھے بتا تو سہی وہ کون ہے جو کہتا ہے کہ دنیا میں جزا و سزا نہیں۔ وہ بیشک بیشک انکار کر دے، وہ بے شک خدا کو نہ مانے مگر یہ لازماً ہر انسان کو ماننا پڑے گا کہ کچھ اعمال قوموں یا انسانوں کو تنزّل کی طرف لے جاتے ہیں اور کچھ اعمال قوموں یا انسانوں کو ترقی کی طرف لے جاتے ہیں یہ ایسا ثابت شدہ امر ہے کہ جو شخص اِس کا انکار کرے گا وہ ضرور تنزّل کی طرف جائیگا اور ضرور بُرائیوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ (۲) دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ تُو مجھے بتا تو سہی وہ کون ہے جو اطاعت کا منکر ہے۔ اطاعت سے مراد نظام اور ضبط کے ہیں غلامی نہیں۔ غلامی کا قرآن اور اسلام دشمن ہے بلکہ سب سے پہلا مذہب جس نے دنیا سے غلامی کو اُڑایا وہ اسلام ہے مگر یہ ایک الگ مضمون ہے۔ لوگ غلطی سے کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں غلامی جائز ہے میں سارا قرآن سامنے رکھ دیتا ہوں کوئی شخص مجھے ایک ہی ایسی آیت نکال دے جس میں غلامی کو جائز قرار دیا گیا ہو۔ مجھے تو اب تک کوئی ایسی آیت نہیں ملی حالانکہ معترض سے سینکڑوں گنے زیادہ میں نے قرآن پڑھا ہو گا پس جس چیز کو غلامی کہتے ہیں وہ قرآن میں نہیں نہ کسی حدیث میں ہے۔ میں مانتا ہوں کہ مسلمانوں میں غلطی سے غلامی کا رواج رہا ہے مگر مسلمانوں کی غلطی سے قرآن اور اسلام پر اعتراض عائد نہیں ہو سکتا جب ہندو یہاں تھے اُس وقت بھی مسلمان سینما دیکھا کرتے تھے اور اب ہندو چلے گئے ہیں تب بھی مسلمان سینما دیکھتے ہیں۔ ناچ گانا پہلے بھی ہوا کرتا تھا اور ناچ گانا اب بھی ہوتا ہے۔ ریڈیو پر خبریں سننے لگو تو بدبختی آجاتی ہے۔ اُسے ذرا کھولیں تو فوراً ہا ہا کی آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں اسی طرح مسلمانوں میں بے پردگی ہے۔ مسلمان شرابیں پیتے ہیں اور اتنی کثرت سے پیتے ہیں کہ ابھی سندھ گورنمنٹ نے اعلان کیا ہے کہ اگر رمضان میں ہم شراب روکیں گے تو گورنمنٹ کو دس لاکھ روپیہ کا نقصان ہو گا۔ ملوں تو میری سمجھ میں ہی

یہ بات نہیں آئی کہ اگر دس لاکھ کا گورنمنٹ کو نقصان ہو گیا تو کیا ہوا۔ مگر اس سے بھی زیادہ جس چیز نے مجھے پریشان کر دیا وہ یہ ہے کہ دس لاکھ ماہوار نقصان کے معنے یہ ہیں کہ سندھ میں ماہوار پچاس لاکھ روپیہ کی شراب پی جاتی ہے۔ سارے پاکستان کی آبادی سندھ سے بارہ گنے زیادہ ہے اگر صرف سندھ میں پچاس لاکھ روپیہ ماہوار شراب پر صرف کیا جاتا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ چھ کروڑ روپیہ سالانہ کی شراب سندھ میں پی جاتی ہے اور اگر اسی پر باقی پاکستان کا بھی قیاس کیا جائے تو چونکہ پاکستان کی آبادی سندھ سے بارہ گنے زیادہ ہے اس لئے معلوم ہوا کہ بہتر کروڑ روپیہ کی شراب صرف پاکستان کے مسلمان پیتے ہیں میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی۔ لیکن اگر ایسا ہی ہے تو کیا اس کا ذمہ وار اسلام ہے؟ اسلام تو کہتا ہے کہ شراب نہ پیو۔ پس یہاں [illegible] عت مراد نہیں جسے غلامی کہتے ہیں۔ قرآن جس کو [illegible] کہتا ہے وہ نظام اور ضبطِ نفس کا نام ہے یعنی کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ انفرادی آزادی کو قومی مفاد کے مقابلہ میں پیش کر سکے۔ یہ ہے ضبطِ نفس اور یہ ہے نظام۔ تمام قانون جو دنیا میں بنتے ہیں تمام گورنمنٹیں جو نقل و حرکت۔ ریلوے۔ پاسپورٹ اور تجارتوں کے متعلق قانون بناتی ہیں تمام ملک کی آبادی اس کے ماتحت ہوتی ہے حکومتیں کہتی ہیں کہ فرد بیشک آزاد ہے مگر اُسے ایسی آزادی حاصل نہیں کہ وہ قوم کو نقصان پہنچائے ہم فرد کو زیادہ سے زیادہ آزادی دینگے مگر جہاں اُس کا فائدہ قوم کے فائدہ سے ٹکرا جائیگا ہم اُسے آزادی نہیں دینگے۔ یہ قانون ہے جو ایک لمبے تجربہ اور کشمکش اور جھگڑوں اور لڑائیوں کے بعد نکھر نکھرا کر اس صورت میں نکل آیا ہے اور تمام متمدن دنیا کم سے کم اس وقت اس کو صحیح تسلیم کرتی ہے۔ اِسی کی طرف قرآن کریم نے [illegible] پہلے اشارہ فرمایا اور کہا اَرَءَيْتَ الَّذِیْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ۔ مجھے اُس شخص کی خبر دے جو نظام و ضبطِ نفس کا قائل نہیں یعنی پھر میں تجھے بتاؤنگا کہ وہ اپنے اور اپنی قوم کے لئے ہرگز کسی عزت کا موجب نہیں بن رہا۔ لازماً اُس سے بدافعالیاں اور بداعمالیاں ظاہر ہوں گی۔ مذکورہ بالا قانون کو توڑنے کے بعد کوئی شخص نیکی پر قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ یہ کیا لطیف مضمون ہے جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔ یورپ کا کوئی ایک فلسفی بھی ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جس کی دس جلدیں کی کتاب میں بھی قومی کیریکٹر کے متعلق وہ مضمون بیان ہوا ہو جو اس چھوٹے سے فقرہ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ اَرَءَيْتَ الَّذِیْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ۔ یہ ایک چھوٹا سا جملہ ہے لیکن اس میں اتنا مضمون ہے کہ اس پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ فرماتا ہے ضبطِ نفس یا نظام کا انکار کرکے اگر کوئی کہے کہ میں نیک رہ سکتا ہوں تو یہ بالکل غلط بات ہے وہ ضرور خرابی اور فساد کا موجب ہوگا۔ مثلاً گورنمنٹیں قانون بناتی ہیں کہ بائیں طرف چلو یا یہ کہ دائیں طرف چلو۔ اب اگر کوئی کہے کہ میں کیوں اس پر عمل کروں۔ جب سڑک پر چلنے کی عام اجازت ہے تو میں تو سڑک کے جس طرف چاہونگا چلونگا دائیں یا بائیں نہیں چلونگا اس شخص کا انجام ظاہر ہے کہ یہ کسی گاڑی سے ٹکرا کر زخمی ہوگا یا سامنے سے آنیوالوں سے قدم قدم پر ٹکرائے گا اور سب مسافروں کیلئے تکلیف کا موجب ثابت ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام کی پابندی کے بغیر دنیا میں امن قائم ہی نہیں رہ سکتا پس کسی کا یہ کہنا کہ میں فلاں قانون کیوں مانوں ایک فساد کا راستہ ہے مگر نظام کی پابندی کے یہ معنے بھی نہیں کہ چند افراد اپنے ہاتھ میں حکومت کے اختیارات لے لیں اور جس طرح چاہیں لوگوں پر دباؤ ڈالیں۔ ابھی سول میں میں نے پڑھا ہے کہ راولپنڈی یا لائل پور میں ایک شخص نے روزہ نہیں رکھا تھا لوگوں نے اُس کا منہ کالا کرکے تمام بازار میں پھرایا۔ اب اگر وہ شخص احتجاج کرے کہ پبلک کو اس بات کا کیا حق ہے کہ وہ نظام کو اپنے ہاتھ میں لے تو یہ بالکل ٹھیک ہوگا پبلک کو ہرگز

اس قسم کا کوئی حق نہیں۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
کے زمانہ کا واقعہ ہے ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا،
اور اُس نے کہا یا رسول اللہ اگر میں اپنی بیوی کو کسی
غیر محرم کے پاس ایسی حالت میں بیٹھا دیکھوں جس کے معنے یہ
ہوں کہ وہ شخص زنا کر رہا ہے تو یا رسول اللہ کیا میں
اُسے مار ڈالوں؟ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
ہرگز نہیں۔ اُس نے کہا یا رسول اللہ اسلام تو اُس کیلئے
قتل ہی کی سزا تجویز کرتا ہے (اُس وقت تک ابھی رجم پر ہی
عمل ہوتا تھا) آپ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ اُس صحابی نے
کہا جب اسلام بھی اُس کے لئے یہی سزا تجویز کرتا ہے
تو اگر میں خود ہی اُسے مار ڈالوں تو اس میں کیا حرج ہے؟
آپ نے فرمایا اگر تم اُسے مارو گے تو تم قاتل سمجھے جاؤ گے
تم اُسے قاضی کے پاس لے جاؤ اور اُس کے سامنے مقدمہ
پیش کرو۔ اپنے ہاتھ میں قانون لینے کا تمہیں اختیار
نہیں۔ غرض جو قانون گورنمنٹ نے بنایا ہے اُس میں گورنمنٹ
کے قاضی کا فیصلہ لینا ضروری ہوگا۔ ورنہ اس سے امن
نہیں بلکہ فساد اور بدامنی پیدا ہوگی یا جو قانون سوسائٹی
نے بنایا ہے اُس میں سوسائٹی کا قاضی فیصلہ کرے گا یا
پنچ وغیرہ کریں گے ہر ایک کو حق نہیں کہ وہ قانون کو اپنے
ہاتھ میں لے اور مجرم کو سزا دینی شروع کر دے۔
ہزاروں ہزار دفعہ انسان یہ سمجھتا ہے کہ دوسرے پر
الزام ثابت ہے مگر قاضی کہتا ہے کہ الزام ثابت نہیں
اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قانون یہ کہتا ہے کہ اگر اس اس
طرح جرم ثابت ہو تب دوسرا شخص مجرم ثابت ہوگا اور
اگر اُس طرح جرم ثابت نہیں ہوگا تو اُسے بَری قرار
دیا جائے گا کیونکہ قانون نے غیر مجرموں کو بچانے کے
لئے ثبوت کے معیار زیادہ سخت تجویز کئے ہوتے ہیں
اگر نرم ہوتے تو کئی غیر مجرموں کو بھی لوگ پھنسا دیتے۔
پس قانون نے ناکردہ گناہ لوگوں کو سزا سے محفوظ رکھنے
کے لئے ثبوت کے معیار پبلک کے نقطۂ نگاہ کے مقابلہ میں
زیادہ سخت رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر پبلک کو یہ اختیار
ہوتا کہ وہ جس کو چاہے سزا دیدے تو وہ اپنی ناتجربہ کاری
کے ماتحت کئی غیر مجرموں کو بھی سزا دے دیتی۔ بہرحال
قانون کا منشاء صرف مجرم کو سزا دینا نہیں ہوتا بلکہ اُس کا
یہ بھی منشاء ہوتا ہے کہ کوئی غیر مجرم اس سزا کا مستحق نہ
بن جائے۔ پبلک تو سمجھتی ہے کہ ہمیں جس کے متعلق کوئی
شبہ ہو گیا ہے اُسے ہم سزا دے دیں لیکن قانون کا
دماغ منصفانہ ہوتا ہے۔ وہ سزا تو دیتا ہے مگر ایسے طور
پر جرم ثابت کرتا ہے کہ غیر مجرم مجرم ثابت نہ ہو اور سزا
صرف اُسی کو ملے جس نے جرم کیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا
ہے ضبطِ نفس اور نظام کا جو شخص منکر ہوگا وہ گناہ میں
ضرور مبتلا ہوگا۔

ہم سے کئی لوگ پوچھتے ہیں کہ فلاں سے یہ غلطی
ہو گئی ہے کیا ہم اُس کے پیچھے نماز پڑھنا چھوڑ دیں؟
میں ہمیشہ اُنہیں کہا کرتا ہوں کہ تم محکمہ کو لکھو اور پھر جو
کچھ وہ فیصلہ کرے اُس کے مطابق عمل کرو تمہارا حق نہیں
کہ تم خود بخود اس بارہ میں کوئی فیصلہ کر لو کیونکہ ممکن ہے
تمہاری اُس سے دشمنی ہو اور تمہاری رائے آزادانہ نہ ہو
پس قانون شکنی اَور چیز ہے اور قانون شکنی کا ثبوت اَور
چیز ہے۔ اور وہ بھی نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر
کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جو شخص نظام کی پابندی
کرے گا وہ تبھی ایسا کرے گا۔ جب اُسے یقین ہوگا کہ
قومی ترقی فردی ترقی کی ضامن ہوا کرتی ہے۔ اس وقت دنیا
میں دو نظریے پائے جاتے ہیں ایک یہ کہ چونکہ قوم فرد
سے بنی ہے اس لئے فردی ترقی ہی اصل مقصود ہے
اس عقیدہ کے قائل لوگ سمجھتے ہیں کہ [illegible] زیادہ ضروری
نہیں اگر افراد کی ترقی میں نظام قومی روک بن جائے تو اُن
کا حق ہے کہ وہ اس نظام کو توڑ دیں۔ لیکن بعض اور لوگوں کا
نظریہ یہ ہے کہ قومی ترقی فردی ترقی کی ضامن ہوتی ہے۔ اُن کا

نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ فردی آزادی کو قائم رکھنا بیشک قوم کے ذمہ ہے لیکن فرد کو اپنے طور پر یہ اختیار نہیں کہ وہ قومی قانون کو اپنے مفاد کے خلاف دیکھ کر توڑ دے اگر وہ سمجھتا ہے کہ قومی قانون فرد کی ترقی میں روک بن گیا ہے تو وہ مقررہ ذرائع سے اُس قانون کو بدلوا سکتا ہے مگر اُس کا یہ اختیار نہیں کہ وہ آپ ہی آپ اُس کو توڑنا شروع کر دے۔ اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ کا یہی مفہوم ہے کہ جو بھی قومی ترقی کے اُوپر فردی ضرورت کو غالب کرے گا وہ ضرور خود غرضی کے گناہوں میں مبتلا ہو جائے گا اور ذاتی جلبِ منفعت کے لئے مختلف قسم کے ایسے کام شروع کر دے گا جن سے قوم میں غلطیاں پیدا ہو جائیں گی اور کئی قسم کے گناہوں کا دروازہ کھل جائیگا

(۳) اِس آیت کے تیسرے معنے غلبہ کے منکر کے ہیں۔ غلبہ کے منکر سے بھی یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ محض غلبہ کا منکر۔ کیونکہ محض غلبہ تو دنیا میں کسی نہ کسی صورت میں ہوتا ہی ہے۔ ملک میں انتظام نہیں ہوتا تو چور اور ڈاکو غالب ہوتے ہیں۔ انتظام ہوتا ہے تو حکومت غالب ہوتی ہے۔ یہ تو دنیا میں کبھی ہوتا ہی نہیں کہ کوئی غالب اور کوئی مغلوب نہ ہو۔ پس اس سے مراد محض غلبہ نہیں ہوتا بلکہ حق و انصاف کا غلبہ مراد ہے۔ پس اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ کے ایک معنے یہ ہوئے کہ مجھے بتا تو سہی کہ وہ کون لوگ ہیں جو یہ یقین نہیں رکھتے کہ آخر نیک اعمال ہی کی فتح ہوتی ہے۔ جو شخص بھی یہ خیال رکھیگا کہ نیک اعمال کی فتح ضروری نہیں وہ بدی میں ضرور مبتلا ہوگا جیسے ہماری پنجابی زبان میں کہتے ہیں۔

ایہہ جگ مِٹھا تے اگلا کِن ڈِٹھا

جس شخص کا یہ عقیدہ ہوگا کہ نیکی آخر کار غالب نہیں آتی۔ وہ لازماً بدی میں مبتلا ہو جائے گا کیونکہ اُس کو روکنے والی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ کوئی بدی کے مقام سے کھینچنے والا جذبہ اُس کے اندر کام نہیں کر رہا ہوگا۔

وہ سمجھیگا کہ بہرحال میں نے اپنا یا اپنی قوم کا کام کرنا ہے اگر اُس کے لئے مجھے بُرا ذریعہ اختیار کرنا پڑے گا تو میں بُرا ذریعہ اختیار کر لوں گا اور اگر اچھا ذریعہ اختیار کرنا پڑا تو اچھا ذریعہ اختیار کر لوں گا۔ نیک ذریعہ اختیار کرنے میں چونکہ قربانی کرنی پڑتی ہے اس لئے یہ لازمی بات ہے کہ ایسا شخص گناہ اور بدی کے راستوں کو زیادہ اختیار کرے گا۔ لیکن جو شخص یہ سمجھے گا کہ آخر نیکی ہی کی فتح ہوتی ہے یہ لازمی بات ہے کہ وہ اپنے نفس کو روکتا رہے گا اور سمجھیگا کہ اگر مجھے عارضی نقصان پہنچتا ہے تو کیا حرج ہے میں عارضی فائدہ کیلئے اپنا دائمی نقصان کیوں کروں۔

اس جگہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ خیال کہ آخر میں نیکی کی فتح ہوتی ہے کبھی بھی قیامت پر یقین کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ جو شخص قیامت پر یقین نہیں رکھتا وہ نیکی کے آخری غلبہ پر بھی کبھی یقین نہیں رکھ سکتا۔ مثلاً یورپ کے فلاسفر سب اس بات پر متفق ہیں اور زور دیتے ہیں کہ نیکی کو نیکی کی خاطر کرنا چاہیئے یا دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنے بنتے ہیں کہ خالص نیکی ہی آخر غالب آیا کرتی ہے۔ مگر کوئی ایک یوروپین ملک بھی تو ایسا نہیں جس کی سیاست اس پر مبنی ہو۔ انکی تمام سیاست اس بات پر چکر کھاتی ہے کہ ہماری قوم کو غلبہ ملنا چاہیئے۔ اس کے لئے وہ ناجائز ذرائع بھی اختیار کریں گے اور دھوکا بازیاں اور فریب بھی کرتے رہینگے انگریزی کی ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ

END JUSTIFIES THE MEANS

یعنی اگر ہمارا مقصد نیک ہو تو اس کے حصول کیلئے جو ذرائع بھی اختیار کئے جائیں خواہ کتنے بُرے ہوں وہ جائز اور درست ہی سمجھے جائیں گے۔ یہ نظریہ اُن میں کیوں پیدا ہوا ہے اِسی لئے کہ اُن کو اُخروی زندگی پر ایمان نہیں وہ کہتے تو یہ ہیں کہ اصل چیز نیکی ہے اور نیکی کو نیکی کی خاطر

کرنا چاہیئے مگر جب وہ دنیا کا مطالعہ کرتے ہیں تو
دیکھتے ہیں کہ نیکی کرنے والا بعض دفعہ نقصان بھی اُٹھاتا
ہے اس لئے وہ یہ مسئلہ ایجاد کرنے پر مجبور ہوتے ہیں
کہ نیکی کو سنبھالنے کے لئے اگر کچھ ستون بدی کے بھی
کھڑے کرنے پڑیں تو حرج نہیں کیونکہ اصل مقصد تو
نیکی کو قائم کرنا ہے۔ لیکن جو شخص اُخروی زندگی پر ایمان
لاتا ہے وہ اعمال کا انجام کلی طور پر اسی دنیا میں دیکھنے کا
منتظر نہیں ہوتا وہ سمجھتا ہے کہ اگر نیکی پر کاربند رہتے
ہوئے مجھے یا میری قوم کو نقصان پہنچتا ہی تو پہنچے
دوسرے اس دنیا کے نقصان کو اگلے جہان میں پورا کر دیا
جائے گا۔ ایسا شخص نیکی کے قیام کے لئے بُرے ذرائع
کو استعمال کرنے کی نہ جرأت کرتا ہے اور نہ اس کی
ضرورت سمجھتا ہے کیونکہ وہ اس دنیا کو اگلی دنیا کی ایک
کڑی سمجھتا ہے اور اس امر پر یقین رکھتا ہے کہ نیکی
بہرحال غالب آئے گی خواہ اگلے جہان میں ہی کیوں نہ
غالب آئے۔ یہی وجہ ہے کہ نیکی کے اعلیٰ معیار پر کبھی
خدا پرست کے سوا اور کوئی شخص قائم نہیں ہوا۔ یُوں
اخلاقِ فاضلہ پر یورپ کے فلاسفر بڑا زور دیں گے اور
بیسیوں باتیں اپنی کتابوں میں لکھ دیں گے۔ چنانچہ ہکسلے
سپنسر، ہیگل اور کینٹ کی کتابیں پڑھ کر دیکھو تو اُن
کے دیکھنے سے یُوں معلوم ہوگا کہ شاید اُن میں مذہبی لوگوں
سے بھی زیادہ نیکیاں پائی جاتی ہیں۔ مگر جب اُن کے ذاتی
کیریکٹر کو دیکھا جائے تو وہ نبیوں کے غلاموں کے غلاموں
کے برابر بھی نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ صرف
باتیں بگھارتے ہیں ورنہ اُن کے دل میں صرف اتنی بات
ہوتی ہے کہ ہمیں اپنا فائدہ چاہیئے خواہ کسی طرح حاصل
ہو۔ چنانچہ جب اُنہیں نیکی کے معیار غلط نظر آتے ہیں اور
کسی کام میں اُنہیں اپنا نقصان دکھائی دیتا ہے تو وہ
سب کچھ بھول جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب ہمیں اپنے
فائدہ کی کوئی صورت پیدا کرنی چاہیئے۔ اِدھر ہم انبیاء کو
دیکھتے ہیں کہ کتنے ہی خطرہ کی صورت ہو یا کیسی ہی مشکلات
ہوں اُن کے عمل میں کوئی فرق نہیں آتا۔

گلیلیو نے جب یہ تحقیق کی کہ سورج زمین کے گرد
چکر نہیں کھاتا بلکہ زمین سورج کے گرد چکر کھاتی ہے تو
پادریوں نے اُس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا اور کہا کہ بائبل میں
تو یہ لکھا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی شکل پر بنایا ہے اور
جب انسان خدا کی شکل پر ہے اور انسان اس زمین پر
رہتا ہے تو لازماً یہ زمین اعلیٰ ہوئی مگر یہ اتنا بڑا کفر بکتا ہے
کہ کہتا ہے وہ زمین جس پر خدا نے انسان کو بنایا وہ سورج
کے گرد چکر لگاتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے گلیلیو کو مختلف قسم
کی اذیتیں پہنچانی شروع کر دیں۔ کچھ مدت تک تو وہ
مقابلہ کرتا رہا مگر آخر اُس نے اعلان کیا کہ میں اب سمجھ گیا
ہوں۔ دراصل شیطان نے مجھے کافر و بے دین بنانے
کے لئے ورغلا دیا تھا اور مجھے یہ نظر آنے لگا کہ زمین سورج
کے گرد چکر کاٹتی ہے لیکن یہ غلط تھا زمین سورج کے گرد
چکر نہیں کاٹتی بلکہ سورج زمین کے گرد چکر کاٹتا ہے۔
کیونکہ دین میں ایسا ہی لکھا ہے۔ اس لئے میں
اپنے پہلے عقیدہ سے توبہ کرتا ہوں۔ یہ کتنی چھوٹی سی بات
تھی مگر کہاں گئی اُس کی صداقت اور کہاں گیا اُس کا دعویٰ۔
یہی یورپ کے آج کل کے فلسفیوں کا حال ہے۔ کتابوں
میں کچھ لکھتے ہیں مگر جب ذاتی اغراض کا سوال آجائے یا
قومی مفاد اور لڑائیوں کا سوال آجائے تو اتنا جھوٹ بولتے
ہیں کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں۔ اُس وقت سارا فلسفہ
اُنہیں بھول جاتا ہے۔ اِدھر وادیٔ غیر ذی زرع کا بسنے والا
ایک شخص جو پڑھا لکھا نہیں تھا۔ جو دستخط کرنا بھی نہیں جانتا
تھا۔ جس کا صرف اتنا دعویٰ نہیں تھا کہ زمین سورج کے
گرد گھومتی ہے یا سورج زمین کے گرد گھومتا ہے بلکہ وہ
اپنی قوم اور ملک کے رسم و رواج اور اس کے عقیدوں
کے خلاف ساری دنیا میں اعلان کرتا تھا کہ اس دنیا کا
ایک خدا ہے۔ جب اُس کی قوم نے اُس کی مخالفت کی تو

وہ نڈر ہو کر اُن کے مقابلہ پر کھڑا ہو گیا یہاں تک کہ ایک لمبے مقابلہ کے بعد اس کی قوم نے یہ تدبیر کی کہ اُس کے چچا کا اُس پر بڑا اثر ہے اگر اُس کے ذریعہ اُسے سمجھایا جائے اور وہ بھی یہ دباؤ ڈالے کہ اگر تم نے اس طریق کو جاری رکھا تو میں بھی تمہیں چھوڑ دوں گا تو ممکن ہے یہ شخص سیدھا ہو جائے۔ اور یہ سوچ کر قوم کے بڑے بڑے لوگ اُس کے چچا کے پاس گئے اور اُس سے کہا کہ تمہارے بھتیجے نے ہم سے لڑائی کر رکھی ہے اور وہ بہت لمبی ہو گئی ہے۔ اب ہم تمہارے سامنے یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ آخر اس لڑائی کی وجہ کیا ہے؟ کیا اُس کا دماغ خراب ہو گیا ہے اگر دماغ خراب ہو گیا ہے تو اُس کے علاج پر جو بھی خرچ آسکتا ہو وہ ہم خرچ کرنے کے لئے تیار ہیں یا کیا اسکو دولت کی خواہش ہے اگر یہ ہے تو ہم اپنی تمام دولت جمع کر کے اُس کا تیسرا حصہ اُسے دے دیتے ہیں۔ ہم میں سے ہر بڑے سے بڑا مالدار اور ہر غریب سے غریب انسان بھی اپنی دولت کا تیسرا حصہ اس کے حوالے کرنے کے لئے تیار ہے۔ یا پھر کیا اِس کی یہ خواہش ہے کہ کسی اچھے خاندان میں اس کی شادی ہو جائے اگر اِس کی یہ خواہش ہے تو ہم سارے رؤساء کی لڑکیاں اِس کے سامنے پیش کرنے کے لئے تیار ہیں وہ جس سے چاہے شادی کرلے۔ یا پھر کیا اُسے حکومت کی خواہش ہے؟ اگر یہ بات ہے تو ہم حکومت اُس کے حوالے کرنے کے لئے تیار ہیں۔ بتاؤ دنیاداری کے لحاظ سے اِس سے زیادہ وسعت حوصلہ والی تجویز اَور کیا ہو سکتی تھی اور کیا اِس کے بعد ممکن تھا کہ چچا اپنے بھتیجے کی حمایت کر سکتا؟ پھر قوم نے اتنی بڑی پیشکش کرنے کے بعد جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ ہم اس کے بدلہ میں یہ نہیں کہتے کہ تمہارا بھتیجا اپنا دعویٰ چھوڑ دے ہم صرف [illegible] کہ وہ ہمارے بُتوں کی تردید نہ کرے اَور باقوں [illegible] متعلق وہ بے شک وعظ وغیرہ کرتا رہے۔ پھر انہوں نے کہا اے ہمارے رئیس! ہم تیرا بھی ادب کرتے ہیں اور دراصل تیری خاطر ہی ہم نے تیرے بھتیجے کو اب تک چھوڑا ہوا ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ ہماری یہ باتیں معقول ہیں تو تم اپنے بھتیجے کے سامنے اِن باتوں کو پیش کرو اور اُسے منوانے کی کوشش کرو اور اگر تم اُسے نہ منوا سکو اور خود بھی اُسے چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہو تو اِس کے معنے یہ ہوں گے کہ تم اپنی قوم کو ہر طرح ذلیل کرنا چاہتے ہو۔ ہم نے زیادہ سے زیادہ قربانی جو کی جاسکتی تھی کر دی ہے اب تمہارا فرض ہے کہ اپنے بھتیجے کو منواؤ اور وہ نہ مانے تو تم اُس کا ساتھ چھوڑ دو ورنہ اپنے بھتیجے کا ساتھ دینے کی وجہ سے تمہاری قوم مجبور ہو جائیگی کہ وہ تم سے بھی اپنے تعلقات منقطع کرلے۔ بتاؤ دنیوی نقطۂ نگاہ سے اِس سے زیادہ منصفانہ تجویز اَور کیا ہو سکتی ہے؟ میں سمجھتا ہوں اِس سے زیادہ ظاہری شکل میں منصفانہ اور عادلانہ اَور کوئی تجویز نہیں ہو سکتی تھی یا کم سے کم میں نے دنیا کے پردہ پر اِس قسم کی اَور کوئی مثال نہیں دیکھی۔ چچا نے اُن کی باتیں سُنیں اور سمجھا کہ قوم نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک کہا ہے اِس سے زیادہ وہ کیا قربانی کر سکتی ہے۔ چنانچہ جب قوم کا نمائندہ وفد یہ پیشکش کرنے کے بعد واپس چلا گیا تو اُس نے اُس اُمّی، وادیٔ غیرِ ذی زرع میں رہنے والے اور ایک غیر متمدّن ملک میں پرورش پانے والے بھتیجے کو بلایا اور اُس سے کہا اے میرے بھتیجے! تجھے معلوم ہے کہ میری قوم میرا کتنا لحاظ کرتی ہے آج وہ میرے پاس آئی تھی اور اُس نے مجھے کہا تھا کہ ہم نے تیری خاطر اب تک تیرے بھتیجے کو چھوڑ رکھا ہے اُسے کوئی سزا نہیں دی (دراصل اُن کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے اتنی سزا نہیں دی جس سے وہ ختم ہو جائے ورنہ سزا تو وہ دیتے رہتے تھے) مگر اب معاملہ حد سے

بڑھ گیا ہے ہم چاہتے ہیں کہ یہ لڑائی کسی طرح ختم ہو جائے چنانچہ اے میرے بھتیجے آج انہوں نے یہ یہ تجویزیں میرے سامنے رکھی تھیں جن کا میں کوئی جواب نہیں دے سکا میری قوم مجھے کہہ گئی ہے کہ تیرا بھتیجا ان میں سے جس تجویز کو چاہے مان لے ہم اُس پر راضی ہیں اور اگر وہ کسی تجویز کو نہ مانے تو پھر تُو اس کا ساتھ چھوڑ دے کیونکہ وہ غیر معقولیت پر قائم ہے اور بلا وجہ ضد کرتا ہے اور اگر تُو اِس کے بعد بھی اپنے بھتیجے کو نہ چھوڑے تو ہم مجبور ہو جائیں گے کہ تیری سیادت سے انکار کر دیں اور تجھے اپنی لیڈری سے الگ کر دیں چچا یعنی ابوطالب نے جب یہ کہا تو اس خیال سے کہ میں نے ساری عمر جس قوم کی خدمت کی ہے وہ بھی آج مجھے چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئی ہے اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تب اُن کے بھتیجے یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا کی یہ حالت دیکھی تو پُرانی محبت اور تعلقات کی وجہ سے آپ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور آپ نے فرمایا اے میرے چچا میں آپ سے یہ قربانی نہیں چاہتا کہ آپ اپنی قوم کو چھوڑ دیں۔ اے چچا آپ اپنی قوم کے ساتھ مل جائیں اور اُسے خوش رکھیں۔ باقی رہا اُن کی تجاویز سو میں نے جو کچھ اپنی قوم کے سامنے پیش کیا ہے سچ سمجھ کر کیا ہے کسی دنیوی لالچ یا حرص کی وجہ سے نہیں کیا۔ اور یہ تجویزیں تو کچھ چیز ہی نہیں اے میرے چچا اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لا کر کھڑا کر دیں تب بھی میں اُس سچائی کو نہیں چھوڑ سکتا جو خدا نے مجھے عطا فرمائی ہے اور جس کے پیش کرنے کا اُس نے مجھے حکم دیا ہے۔ باقی میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری خاطر کوئی قربانی کریں آپ اپنی قوم کے ساتھ جا ملیں اور مجھے میرے خدا پر چھوڑ دیں۔ ابوطالب اپنی قوم میں بہت بڑی وجاہت رکھتے تھے۔ ابوطالب اپنی قوم کے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ ابوطالب اپنی قوم کی لیڈری چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے مگر جب انہوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سُنی تو اُن کے دل پر اس کا ایسا غیر معمولی اثر ہوا کہ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ جو چیز اِس انسان کی طرف سے پیش کی جا رہی ہے کسی بناوٹ سے تعلق نہیں رکھتی۔ یہ فکر و تدبیر سے تعلق رکھنے والی بات نہیں بلکہ یہ کچھ اور بات ہے جس نے ایک ایسا گہرا نقش اِس کے دل پر پیدا کر لیا ہے کہ اب دنیا کی کوئی طاقت اور قوت اسے اپنے مقام سے ہلا نہیں سکتی اور سچ کی خاطر یہ ہر موت قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ تب جس طرح آگ کے پاس بیٹھنے والا گرم ہو جاتا ہے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نورِ ایمان کی چنگاری سے ابوطالب کا دل بھی گرم ہو گیا اور اُس نے کہا اے میرے بھتیجے جا اور اپنے کام میں مشغول رہ۔ میری قوم اگر مجھے چھوڑتی ہے تو بیشک چھوڑ دے میں تجھے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ کیا دنیا کے فلسفیوں میں اس قسم کی کوئی مثال مل سکتی ہے جس میں یہ سارے کونے موجود ہوں۔ یوں نہیں کہ فلاں فلسفی جلا دیا گیا بلکہ ایسی مثال جس میں اِس واقعہ کی طرح ہر قسم کی پیشکش کی گئی ہو اور وہ پھر بھی اپنے دعوے پر قائم رہا ہو۔ یقیناً یورپ کے کسی فلسفی میں تم ایسی مثال تلاش نہیں کر سکتے۔ لیکن اسلام میں تمہیں ایسی ہزاروں مثالیں دکھائی دیں گی۔ صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں ہی نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے طفیل اُن کے غلاموں اور اُن کے چاکروں میں بھی حضرت عمرؓ یا حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ایک بدوی سے قتل ہو گیا اور اس کا مقدمہ قاضی کے سامنے پیش ہوا قتل ثابت تھا اِس لئے فیصلہ ہوا کہ اسے قتل کی سزا دی جائے۔ اُس نے قاضی کو کہا کہ میرے پاس کچھ یتیموں کا مال پڑا ہوا ہے میں تو بیشک قتل کا سزاوار ہوں

مگر میرے مرنے سے وہ یتیم بھی مرجائیں گے میں نے
اُن کا مال زمین میں ایک مقام پر دفن کیا ہوا ہے اور
میرے سوا اُس کا کسی کو علم نہیں۔ مجھے تین دن کی اجازت
دیجئے تاکہ میں جاکر وہ مال اُن یتیموں کے حوالے
کرآؤں۔ قاضی نے کہا میں اجازت تو دے دوں
مگر تمہارا ضامن کون ہے ہمیں کیا پتہ ہے کہ تم واپس
بھی آؤ گے یا نہیں؟ جنگلوں میں جو قومیں بستی ہیں
اُن کا پتہ لگانا بڑا مشکل ہوتا ہے اس لئے قاضی نے
ضامن کا مطالبہ کیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور
حضرت ابوذر غفاریؓ پر نظر ڈال کر کہا یہ میرے
ضامن ہیں قاضی نے اُن سے پوچھا کہ کیا آپ اِس کی
ضمانت دینے کے لئے تیار ہیں؟ انہوں نے کہا ہاں۔
چنانچہ اُسے چھوڑ دیا گیا اور وہ چلا گیا۔ جب تیسرا دن آیا
تو عصر کے وقت اُس کا انتظار کیا جانے لگا۔ سورج
غروب ہونے میں دو گھنٹے رہتے تھے۔ پون گھنٹہ گذرا
مگر وہ نہ آیا۔ جب وقت گذرنے لگا اور اُس بدوی
کا کچھ پتہ نہ لگا تو حضرت ابوذر غفاریؓ جو ایک مخلص
صحابی تھے اُن کی جان خطرہ میں دیکھ کر مسلمانوں میں
گھبراہٹ پیدا ہوئی اور انہوں نے حضرت ابوذر غفاریؓ
سے پوچھا کہ حضرت وہ کون شخص تھا جس کی آپ نے
ضمانت دی تھی وقت ختم ہونے کو آیا ہے اور اُس کا
کچھ پتہ ہی نہیں لگتا۔ اُنہوں نے جواب میں کہا مجھے تو
معلوم نہیں کہ وہ کون تھا۔ لوگوں نے اُن سے کہا
تو پھر آپ نے ایک نامعلوم شخص کی اتنی بڑی ضمانت
کیوں دی؟ حضرت ابوذر غفاریؓ نے فرمایا اُس نے
جب سب لوگوں پر نظر ڈال کر میرے متعلق کہا کہ یہ
میرے ضامن ہیں تو میری غیرت نے برداشت
نہ کیا کہ ایک مسلمان نے جب بغیر جاننے کے مجھ پر
اعتبار کیا ہے تو میں اُس پر اعتبار نہ کروں سو وہ بھی
مجھے نہیں جانتا تھا مگر جب اُس نے مجھ پر یہ
حُسن ظنی کی کہ میں اُس کی ضمانت دے دوں گا تو میں
اُس پر حُسن ظنی کیوں نہ کرتا اور اُس کی ضمانت کیوں
نہ دے دیتا۔ بہرحال وقت گذرتا جارہا تھا اور لوگوں
میں بے چینی اور اضطراب بڑھتا جارہا تھا کہ یکدم
اُنہوں نے دُور سے گرد اُٹھتی دیکھی اور اُنہیں محسوس
ہوا کہ ایک شخص بے تحاشا اپنے گھوڑے کو دوڑاتا
چلا آرہا ہے وہ گھوڑا اتنی تیزی سے دوڑا رہا تھا
کہ جب وہ مجلس میں پہنچا تو اس کا گھوڑا گرا اور مرگیا
لوگوں نے دیکھا تو وہ وہی بدوی تھا جس کا انتظار کیا
جارہا تھا۔ اُس نے کہا میں یتیموں کا مال دے آیا ہوں
اور اب میں حاضر ہوں مجھے بے شک قتل کردیا جائے
اُس کی اِس وفاداری اور ایمانداری کا اتنا اثر ہوا کہ
مقتول کے وارثوں نے کہا کہ ہم اپنا خون اسکو معاف
کرتے ہیں (اسلام میں مقتول کے وارث اگر چاہیں
تو قاتل کو معاف کرسکتے ہیں)

یہ ایک مثال نہیں۔ درجنوں اور سینکڑوں اور
ہزاروں ایسی مثالیں تاریخ اسلام میں سے پیش
کی جاسکتی ہیں۔ پالیٹکس کی نہیں۔ ڈپلومیسی کی نہیں
جو یوروپین قومیں پیش کرتی ہیں۔ بلکہ اس قسم کی سیدھی
صاف اور سادہ مثالیں جن سے پتہ لگتا ہے کہ سچ
اور انصاف اور قربانی اور استقامت کیا چیزیں
ہیں اور کس طرح مسلمانوں نے نڈر ہوکر اِن نیکیوں پر
عمل کیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ انہوں نے کیوں عمل
کیا؟ اسی لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم مارے بھی
گئے تو کیا ہوا اگلے جہان میں ہمیں بدلہ مل جائے گا۔
پس اگلے جہان پر اگر یقین نہ ہو تو کامل نیکی کبھی
پیدا نہیں ہوسکتی۔ اگلے جہان پر ایمان ہی ہے جو
اس صداقت کو ظاہر کرتا ہے کہ آخر نیک اعمال ہی کی
فتح ہوتی ہے۔

(۴) دین کے ایک معنے اَلسُّلْطَانُ وَالْمُلْکُ وَالْحُکْمُ

کے ہیں یعنی حکومت اور بادشاہت۔ مگر حکومت اور بادشاہت سے آج کل کی حکومت اور بادشاہت مراد نہیں جسے آئینی بادشاہت کہتے ہیں اور جو پارلیمنٹ کے ذریعہ سے چلتی ہے بلکہ اس سے وہ حکومت اور ملوکیت مراد ہے جو اقتدار رکھتی ہے۔

اَلسُّلْطَانُ وَالْمُلْکُ وَالْحُکْمُ کے یہ بھی معنے نہیں کہ وہ حکومت جو ڈنڈے کے زور کے چلتی ہو اور جس میں جبر اور تشدد سے احکام منوائے جاتے ہیں پس جس طرح اِن معنوں میں سے وہ حکومت نکل جاتی ہے جو پارلیمنٹری ہوتی ہے اور لوگوں کے مشورہ سے چلتی ہے اِسی طرح اَلسُّلْطَانُ وَالْمُلْکُ وَالْحُکْمُ میں سے وہ حکومت بھی نکل جاتی ہے جو ڈنڈے کے زور سے چلتی ہے اور زبردستی اپنے احکام لوگوں سے منواتی ہے۔ سُلْطَان کا لفظ اُن حکومتوں کو بھی نکال دیتا ہے جس کے حکمران صرف رسمی بادشاہ ہوتے ہیں اور جن کا کام صرف کاغذات پر دستخط کرنا ہوتا ہے اور حُکْم کا لفظ اُن حکومتوں کو نکال دیتا ہے جو ڈنڈے کے زور سے کام کرتی ہیں۔

عربی زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے تمام الفاظ اپنے اندر گہری حکمت رکھتے ہیں۔ مثلاً مُلْک کا لفظ ہی لے لو۔ ہماری زبان میں لوگ مُلک کا لفظ عام طور پر استعمال کرتے ہیں مگر جب اُن سے پوچھا جائے کہ ملک کسے کہتے ہیں تو وہ کہتے ہیں اُسی علاقہ کو جس میں ہم بستے ہیں لیکن اہل عرب اور وہ لوگ جو عربی زبان کو سمجھتے ہیں وہ اس کے یہ معنے نہیں لیں گے بلکہ وہ م۔ ل اور ک کے مجموعہ سے اس کے معنے اخذ کریں گے۔ دراصل عربی زبان کو جو خصوصیتیں حاصل ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ حرفوں سے بنی ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ باقی زبانیں حرفوں سے نہیں بنیں۔ بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ باقی زبانوں کے حروف اتفاقی حادثہ ہیں مگر عربی زبان کے حروف اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ تمام حروف اپنے اندر مستقل معنے رکھتے ہیں اور اُن کے مجموعہ کے معنے اُن حروف سے پیدا ہوتے ہیں۔ گویا اپنی ذات میں کوئی مِلا جُلا لفظ معنے نہیں دیتا بلکہ تمام حروف مل کر معنے پیدا کرتے ہیں دوسرے الفاظ میں یُوں سمجھ لو کہ عربی زبان کی نسبت باقی زبانوں کا وہی ہے جو دنیا کی دوسری زبانوں کو چینی زبان سے ہے

عربی زبان کی ایک خصوصیت

چینی زبان میں ہر جملہ ایک حرف سمجھا جاتا ہے اور ہر مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بنے بنائے جملے استعمال ہوتے ہیں مثلاً اُردو زبان میں جب ہم کہتے ہیں "گھوڑا لاؤ" تو یہ ایک مستقل جملہ ہوتا ہے اور جب ہمیں ضرورت محسوس ہوتی ہے ہم اسی میں تھوڑی بہت تبدیلی کر دیتے ہیں مثلاً ہم کہہ دیتے ہیں۔ گھوڑا لائے۔ کبھی کہہ دیتے ہیں گھوڑا لایا۔ کبھی کہہ دیتے ہیں گھوڑا لائیں۔ گویا تبدیلی صرف فعل میں واقعہ ہوتی ہے۔ مگر چینی زبان میں گھوڑا لاؤ ایک مستقل حرف ہوتا ہے۔ گویا چینی زبان میں جملہ اپنی ذات میں لفظ کا قائم مقام ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں تو صرف چھتیس[۲۶] حروف تہجی ہوتے ہیں مگر اُن کے ہاں کئی ہزار حروفِ تہجی ہیں کیونکہ جب ایک مستقل جملہ کو حرف بنایا جائیگا تو سیدھی بات ہے کہ اس طرح حروف ہزاروں ہزار بنتے چلے جائیں گے۔ پس عربی اور چینی میں یہ فرق ہے کہ چینی زبان میں جملہ حرف بن جاتا ہے اور عربی زبان میں حرف لفظ کا کام دیتا ہے معنے صرف لفظ سے شروع نہیں ہوتے بلکہ حرف سے شروع ہوتے ہیں۔

چنانچہ مُلْک کے لفظ میں م ل ک کے ملنے کے بعد معنے پیدا نہیں ہوتے بلکہ م کے بھی معنے ہیں ل کے بھی معنے ہیں اور ک کے بھی معنے ہیں اور جب یہ حروف کہیں جمع ہو جاتے ہیں تو ان کے اندر ایک خاص معنے پیدا ہو جاتے ہیں اور اس وجہ سے ان حروف کو خواہ آگے کر دو خواہ پیچھے ایک خاص مفہوم ان تمام الفاظ میں

۲۶۱

مشترک پایا جائے گا۔ چنانچہ عربی زبان کے وہ تمام الفاظ جو ق ل اور ک سے مرکب ہیں اُن کو اگر غور کر دیکھا جائے تو اُن میں طاقت اور قوت کے معنے پائے جائیں گے مثلاً مُلْكٌ حکومت بادشاہت اور طاقت کو کہتے ہیں۔ مَلِكٌ بادشاہ کو کہتے ہیں مَلَكٌ فرشتے کو کہتے ہیں۔ اِس کو اُلٹا دو تو كَلْمٌ بن جائیگا جس کے معنے زخم کرنے کے ہیں اس میں بھی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لَكْمٌ تھپڑ مارنے کو کہتے ہیں اِس میں بھی طاقت کے معنے پائے جاتے ہیں غرض م ل ک سے جو الفاظ بھی مرکب ہوں گے اُنمیں طاقت اور قوت کے معنے پائے جائیں گے۔ یہ ایک ایسا عجیب مضمون ہے کہ اس سے سینکڑوں معانی قرآن کریم کے اور سینکڑوں معانی احادیث کے میں نے نئے نکالے ہیں افسوس ہے کہ آخری زمانہ میں عربوں میں سے بھی یہ مضمون مٹ گیا تھا۔ اِس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عربی زبان کو اُمّ الالسنہ ثابت کرتے ہوئے پھر اِس مضمون پر روشنی ڈالی اور اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ ہمارے لئے گویا چودہ طبق روشن ہو گئے ہیں۔ ہزاروں ہزار مضامین اس ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کھولے ہیں اور وہ مضامین ایسے ہیں کہ بعض دفعہ عرب بھی انکو سُنکر حیران رہ جاتے ہیں اور وہ پوچھتے ہیں کہ آپ نے یہ باتیں کہاں سے نکالی ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اس علم کی بنیاد حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے رکھی ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اِس کی بنیاد نہیں رکھی بلکہ اس مضمون کی تکمیل فرمائی ہے۔ اس کی بنیاد ابتدائے اسلام میں رکھی گئی تھی۔ چنانچہ علامہ سکاکی نے بھی اپنی کتاب مفتاح العلوم میں اِس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح ابن فارس نے بھی مختصص میں اس پر بحث کی ہے۔ ابن جنی اور ثعلبی وغیرہ نے بھی اِس طرف اشارات کئے ہیں مگر ان لوگوں نے اس مضمون کو مکمل نہیں کیا صرف حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی ایک ایسے وجود ہیں جنہوں نے موجودہ زمانہ میں اِس مضمون کو وسیع کیا اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے

حُكْمٌ کا لفظ جو ح ک م سے مرکب ہے یہ بھی خالی زور پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ اس زور کے پیچھے کوئی معقول وجہ کام کر رہی ہو یاسی سے حکمت کا لفظ نکلا ہے جس کے معنے فلاسفی کے ہیں گویا کوئی مقصد تھا۔ کوئی غرض تھی کوئی فائدہ اور نفع مد نظر تھا جس کی وجہ سے ایک ہدایت دی گئی۔ یُونہی حُكْمٌ کا لفظ نہیں بولیں گے اور اگر بولیں گے تو غلط ہو گا۔ جیسے روٹی کو کوئی سوٹی کہہ دے تو وہ غلط ہو گا۔ بہر حال ح ک م اپنے اندر حکمت کے معنے رکھتے ہیں یعنی کام کے پیچھے کوئی غرض ہونی چاہیئے کوئی نفع بخش باعث ہونا چاہئے یونہی زور اور جبر اور تشدّد کے ساتھ کام نہیں لینا چاہیئے۔ غرض اَلسُّلْطَانُ وَالْمُلْكُ وَالْحُكْمُ میں سے وہ آئینی بادشاہت بھی نکل گئی جس میں بادشاہ محض دکھاوے کی چیز ہوتا ہے کوئی طاقت اُس میں نہیں ہوتی۔ دستخط کے لئے کاغذات اُس کے پاس بھیجدتے جاتے ہیں اور وہ اُن پر دستخط کر کے واپس کر دیتا ہے اور جب وزراء سے پوچھا جائے کہ ایسے بادشاہ کا فائدہ کیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ عوام الناس اُتو ہوتے ہیں اُن کے لئے کوئی نہ کوئی بادشاہ بھی چاہیئے جس کے ساتھ وہ چمٹے چلے جائیں ورنہ ہزاروں ہزار ایسے لوگ نکل آئیں گے جو کہیں گے کہ ہم پارلیمنٹ کی نہیں سنتے ہم بادشاہ کی بات مانیں گے۔ ایسے بے وقوفوں سے چھٹکارا پانے کے لئے بادشاہت کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے ورنہ حقیقتاً اس بادشاہ میں کوئی طاقت نہیں ہوتی وہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسے کسی گڑیا کو بادشاہ سمجھ لیا جائے۔ اس کے مقابلہ میں ایسے بادشاہ بھی ہوتے ہیں

جو حکم دے دیتے ہیں کہ فلاں کو مار دو۔ فلاں کو جلا دو۔ فلاں کو پھانسی دے دو اور جب اُن سے پوچھا جائے کہ اس کی وجہ کیا ہے تو وہ کہتے ہیں ہماری مرضی۔

حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان کو جب ہم الہامی مانتے ہیں تو ہمیں ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس زبان کے پیچھے جو محرکات کام کر رہے ہیں وہ بھی مذہبی اور الہامی ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت کا وہ مفہوم جو اسلام کے نزدیک ہے وہ ان تینوں الفاظ کو ملانے سے پیدا ہوتا ہے۔ لُغت والوں کا قاعدہ ہے کہ جب وہ کسی لفظ کے معنے بیان کرتے وقت درمیان میں واو کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر معنے اپنی ذات میں نامکمل ہیں ہاں اگر سب معنوں کو ملا لیا جائے تب اس کے صحیح معنے پیدا ہوں گے۔ اگر لُغت والوں نے یہ کہنا ہوتا کہ دین کے معنے یا سلطان کے ہیں یا مُلک کے ہیں یا حُکم کے ہیں تو وہ کہتے اَلسُّلْطَانُ اَوِ الْمُلْكُ اَوِ الْحُكْمُ مگر انہوں نے کہا ہے اَلسُّلْطَانُ وَ الْمُلْكُ وَالْحُكْمُ۔ پس لغت کے قاعدہ کے مطابق یہ تینوں مل کر دین کے معنے دیتے ہیں۔

سُلْطَان نے تو اس بات کی وضاحت کر دی کہ ہم اُس حکومت کی طرف اشارہ نہیں کر رہے جو رسمی ہوتی ہے اور جو محض دکھلاوے کے طور پر کام کر رہی ہوتی ہے اور حُکم نے اس بات کو واضح کر دیا کہ اُس کے احکام بلاوجہ نہیں ہوتے بلکہ اُس کے ہر حکم کے پیچھے کوئی معقول وجہ ہوتی ہے کوئی اعلیٰ درجہ کی حکمت کام کر رہی ہوتی ہے اور کوئی ضروری محرک اُس کے پیچھے پوشیدہ ہوتا ہے اور مُلْك نے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ اس کا غلبہ وسیع ہے۔ گویا سُلطان نے اس کی گہرائی کی طرف اشارہ کیا ہے اور مُلک نے اس کی وسعت کی طرف اشارہ کیا ہے اور حُکم نے اس کی معقولیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ گویا حکومت ہو اور بڑی گہری حکومت ہو۔ حکومت ہو اور بڑی وسیع حکومت ہو۔ حکومت ہو اور بڑی معقول حکومت ہو۔ جس کا کوئی حکم بلاوجہ نہ ہو۔ جس کا کوئی حکم بلاغرض نہ ہو۔ جس کا کوئی حکم جبری نہ ہو اور اُس میں اُن لوگوں کا فائدہ مدنظر ہو جن کو وہ حکم دیا گیا ہو۔ دیکھو یہ حکومت کی کتنی زبردست تعریف ہے اور کیسی اعلیٰ درجہ کی حکومت کا اس میں نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی کہے کہ ایسی حکومت دنیا میں کہیں نظر نہیں آتی۔ لیکن فرض کرو ایسی حکومت قائم ہو جائے تو تم بتاؤ کہ کیا اس سے بہتر حکومت دنیا میں کوئی اور ہو سکتی ہے؟ حکومت بڑی گہری ہو۔ حکومت بڑی وسیع ہو۔ اُس کے احکام میں وسعت بھی ہو اور گہرائی بھی ہو۔ ہر ضروری حکم نافذ کر رہی ہو اور ساتھ ہی کوئی حکم بلاوجہ نہ ہو۔ غیر معقول نہ ہو۔ جبری نہ ہو۔ ہر حکم میں لوگوں کا فائدہ اور نفع مدنظر ہو یہ حکومت اگر پیش کی جائے تو دنیا میں سوائے پاگل اور ضدی کے اور کون اس کا انکار کر سکتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ مجھے بتاؤ تو سہی کیا دنیا میں کوئی شخص ایسا بھی ہے جو ایسی حکومت کا منکر ہو۔ حکومت کا اگر منکر ہو جائے تو بے شک ہو جائے۔ غلبہ کا اگر منکر ہو جائے تو بے شک ہو جائے مگر جس حکومت میں یہ تین باتیں پائی جائیں اُس کا کوئی منکر نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی ہو تو فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وہ شخص بڑا ہی بے دین ہوگا اور اُس کے اخلاق سخت خراب ہوں گے۔ اس کے مقابلہ میں جو شخص اس حکومت کو ماننے والا ہوگا اُس کے اخلاق مضبوط ہوں گے اور اُسے اپنے اعمال پر تصرف حاصل ہوگا۔ یہی وہ چیز ہے جسے اسلامی اصطلاح میں حکومتِ الٰہیہ

کہتے ہیں مگر یاد رکھنا چاہیئے اس سے وہ حکومت الٰہیہ مراد نہیں جس کا آج کل شور مچایا جا رہا ہے۔ چھوٹے لڑکے جب آپس میں کھیلتے ہیں تو بعض دفعہ ایک لڑکا جھک جاتا ہے اور دوسرا لڑکا اُس کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا ہے مگر سیدھا نہیں بلکہ اُلٹا جس طرح سکاٹس ایملشن پر مچھلی کی تصویر ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ لڑکا جو نیچے ہوتا ہے کہتا ہے "میرے کوٹھے کون چڑھیا" دوسرا کہتا ہے "کا نوٹو" اس پر وہ کہتا ہے "اُتر کا نوٹو میں چڑھاں" چنانچہ وہ اُتر کر نیچے آ جاتا ہے اور وہ لڑکا جو نیچے ہوتا ہے اُوپر سوار ہو جاتا ہے۔ یہی حال ان حکومتِ الٰہیہ کا مطالبہ کرنے والوں کا ہے نہ حکومت الٰہیہ ہے نہ کچھ اور محض لوگوں میں شہرت حاصل کرنے اور وزارتوں پر قبضہ کرنے کے لئے اس کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ حکومتِ الٰہیہ تو محض خدا تعالیٰ کی قائم کردہ ہوتی ہے بندے کی قائم کردہ نہیں ہوتی۔ آخر کونسا انسان ہے جو اس قسم کی حکومت کو نافذ کر سکتا ہے سوائے اس کے جو یہ کہے کہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوں اور اس لئے آیا ہوں کہ دنیا میں حکومت الٰہیہ کو قائم کروں۔ پھر حکومتِ الٰہیہ کسی ایک ملک پر نہیں ہو سکتی۔ حکومتِ الٰہیہ جب بھی آئے گی ملکی حدبندی سے آزاد ہو کر آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس بات کو بار بار پیش کیا ہے کہ پاکستان میں اس وقت آئینِ اسلام جاری نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں نے جب بھی کسی لیکچر میں یہ بات بیان کی ہے فوراً اخبارات میں شور مچ جاتا ہے کہ ایک مذہبی آدمی ہو کر شریعت کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ حالانکہ میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ شریعتِ اسلام پاکستان میں جاری نہیں ہو سکتی میں جو کچھ کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس وقت آئینِ اسلام جاری نہیں کیا جا سکتا اور شریعتِ اسلام اور آئینِ اسلام میں فرق ہے۔ آئینِ اسلام خلافت سے تعلق رکھتا ہے اور خلافت کے معنے یہ ہیں کہ سارے مسلمان اُس کے تابع ہو جائیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا عرب پاکستان کے تابع ہو جائے گا؟ کیا فلسطین پاکستان کے تابع ہو جائے گا؟ کیا انڈونیشیا پاکستان کے تابع ہو جائیگا؟ کیا اور اسلامی ممالک پاکستان کے تابع ہو جائیں گے؟ وہ ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ اس وقت مسلمانوں میں کوئی خلافت نہیں اور چونکہ وہ پاکستان کے تابع نہیں ہو سکتے اس لئے پاکستان میں آئینِ اسلام بھی جاری نہیں ہو سکتا ہاں شریعتِ اسلام ہر وقت جاری ہو سکتی ہے۔ حکومتِ الٰہیہ در اصل عرش پر ہے دنیا میں صرف اُس کا ظل قائم ہوتا ہے اور قرآن کریم میں یہ وعدہ ہے کہ ہر حملہ جو اس حکومت پر ہوگا ہم پر ہوگا اور ہر دشمن جو اُس پر چڑھائی کرے گا وہ ہمارا دشمن ہوگا اور ہم خود اُس کا مقابلہ کریں گے۔ ایسی حکومت کوئی انسان بنا ہی کس طرح سکتا ہے۔ جس چیز کا میں مخالف ہوں وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ ہم آئینِ اسلام جاری کریں گے کیونکہ آئینِ اسلام خلافت کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتا۔ آئینِ اسلام چند اصول کا نام ہے جو خلافت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں لیکن مسلمان اِس وقت خلافت کے قائل نہیں یہ خلافت جب بھی قائم ہوگی رُوحانی ہوگی جیسے میں اپنے آپ کو خلیفہ کہتا ہوں یہ ظاہر ہے کہ میری خلافت سے دنیوی خلافت مراد نہیں۔ پھر میں یہ نہیں کہتا کہ میں آپ ہی خلیفہ بن گیا ہوں بلکہ میں ساتھ ہی یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ خدا نے مجھے خلیفہ بنایا ہے۔ اب یہ واضح بات ہے کہ اگر میں اپنے اِس دعویٰ میں جھوٹا ہوں تو خدا خود مجھے سزا دے گا اور اگر سچا ہوں تو لوگوں کی مخالفت میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ بہرحال نظامِ خلافت کے بغیر حکومتِ الٰہیہ دنیا میں ہرگز قائم نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر یہ حکومت قائم ہو جائے تو پھر اِس سے بہتر حکومت دنیا میں اَور کوئی نہیں ہو سکتی۔

اللہ تعالیٰ اسی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ کیا حکومتِ الٰہیہ کے منکر کو تم نے دیکھا ہے۔ ایسا انسان کبھی بھی اعلیٰ درجہ کی اخلاقی زندگی بسر نہیں کرسکتا وہ رذائل میں گرفتار رہتا ہے اور نفسی نفسی کے جذبات سے متاثر ہوتا ہے۔ غرض خدا تعالیٰ کی حکومت کا اس دنیا میں موجود ہونا اور اس کے متعلق کامل یقین رکھنا ایک بہت بڑا اور اہم عقیدہ ہے یہ عقیدہ نہ لفظوں سے پیدا ہوتا ہے نہ تقریروں سے بلکہ یہ انسان کے اندر سے پیدا ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی حکومت کے آخر کیا معنے ہیں۔ کیا عیسائی خدا کو نہیں مانتے؟ کیا یہودی خدا کو نہیں مانتے؟ پھر خدا تعالیٰ کی حکومت کے قیام کا کیا مطلب ہے؟ دراصل خدا تعالیٰ کی حکومت کے معنے خدا تعالیٰ کے اس دنیا میں کامل تصرّف کے ہیں یعنی انسان خدا تعالیٰ کو ایک عامل اور فعّال وجود تسلیم کرے صرف منہ سے نہ کہے کہ خدا ہے بلکہ تسلیم کرے کہ خدا اس دنیا کے ذرہ ذرہ میں دخل دے رہا ہے۔ مگر اس کے بھی وہ معنے نہیں جو نادان مسلمانوں نے تقدیر کے سمجھ لئے ہیں کہ اگر چوری بھی کرواتا ہے تو نعوذ باللہ خدا کرواتا ہے، بدکاری بھی کرواتا ہے تو خدا کرواتا ہے، قتل بھی کرواتا ہے تو خدا کرواتا ہے۔ یہ بدترین تمسخر اور استہزاء ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ دنیا میں ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق کاموں میں دخل دیتا ہے۔ ایک حکومت چل رہی ہوتی ہے اور کوئی مقتدر بادشاہ برسرِ حکومت ہوتا ہے تو کہنے والے اُس کے متعلق کہتے ہیں کہ سارے کام یہی کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ملک کے استحکام اور فوجوں کی ضروریات سے تعلق رکھنے والے تمام امور ان کے ہاتھ میں ہیں۔ اب اگر کوئی شخص یہ فقرہ کہے اور دوسرا سُن کر کہہ دے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے پاخانہ تو چوڑھا صاف کرتا ہے تو سب لوگ ہنس پڑیں گے اور کہنے والے کو پاگل قرار دیں گے اسی طرح ہم جب زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے خدا کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سب کام وہ کرتا ہے تو اس میں چوری اور بدکاری کا کیا ذکر ہے کہ یہ کہا جائے کہ خدا ہم سے چوری کرواتا ہے، خدا ہم سے بدکاری کرواتا ہے، خدا ہم سے ظلم کرواتا ہے، خدا ہم سے بددیانتی کرواتا ہے۔ اس سے زیادہ بے شرمی اور بے حیائی اور کیا ہوگی۔ اور پھر نام اس کا تقدیر رکھا جاتا ہے حالانکہ یہ اوّل درجہ کی بے دینی اور کفر ہے۔ وہ احمق اور نادان لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اگر خدا کچھ کریگا تو کفر چھڑوائے گا یا کفر کروائے گا۔ بے دینی چھڑوائیگا یا بے دینی کروائے گا۔ چوری کروائیگا یا چوری چھڑوائیگا؟ ایک شریف آدمی اگر کسی کام میں دخل دیا کرتا ہے تو کیا کرتا ہے۔ کیا وہ چوری کرواتا ہے یا چوری کرنے سے روکتا ہے، قتل کرواتا ہے یا قتل کرنے سے روکتا ہے؟ اگر اُن کے متعلق یہ بات کہی جائے کہ انہوں نے فلاں جگہ چوری کروائی ہے تو وہ لال لال آنکھیں نکال کر آجائیں گے کہ تم نے ہماری ہتک کی ہے مگر خالقِ کون و مکان اور تمام نیکیوں کے سرچشمہ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہم کو ڈاکہ ڈلواتا ہے، وہ ہم سے فریب کرواتا ہے اور پھر اس قسم کا عقیدہ رکھنے والے اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور ساتھ ہی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے بھی یہی تعلیم پیش کی ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ اس قسم کی پاک اور بے عیب کتاب کی طرف اتنا گندہ اور ناپاک عقیدہ منسوب کرنا اور پھر اپنے آپ کو مسلمان کہنا بتاتا ہے کہ مسلمان کس حد تک گر چکے ہیں اور وہ کیسے بیدین ہوگئے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ صاف فرماتا ہے کہ اگر ہم نے جبراً لوگوں کو کسی بات پر قائم کرنا ہوتا تو ہم اُن کو توحید پر قائم کرتے۔ پھر حدیثیں سناتے ہیں کہ جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ خدا نے پہلے سے لکھ رکھا ہے اور اس کے قلم کی سیاہی خشک ہوچکی ہے وہ اتنا غور

نہیں کرتے کہ جس چیز سے خدا کی خدائی پر حرف آتا ہو اُسے
ہم قرآن اور حدیث کی طرف منسوب ہی کس طرح
کر سکتے ہیں. خصوصاً ایسا عقیدہ جو اسلام کی اہم
تعلیموں کے خلاف ہے، جو قرآن کے خلاف ہے اُس
کو تقدیر کے نام سے پیش کرنا اتنا گھناؤنا اور
گندہ فعل ہے کہ کوئی عقلمند اور باغیرت مومن اُسے
ایک لحظہ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتا. اس قسم
کی تقدیر کوئی تقدیر نہیں. یہ ایک ڈاکو کی تقدیر تو
ہو سکتی ہے مگر ہمارے پاک خدا کی تقدیر نہیں ہو سکتی.
ہمارے پاک خدا کی تقدیر دنیا کو پاک کرنے کیلئے جاری
ہے نہ کہ اُس کو ناپاک اور گندہ کرنے کے لئے ہم جب
کہتے ہیں کہ تقدیر میں ایسا ہی لکھا تھا تو اس کا وہ مفہوم
نہیں ہوتا جو مسلمان سمجھتے ہیں بلکہ اس کے معنے مٰلِكِ
يَوْمِ الدِّيْنِ کے ہوتے ہیں یعنی تمام نتائج خدا ہی
پیدا کرتا ہے. حقیقت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ بیکار نہیں
بیٹھا ہوا. یہ نہیں کہ تم چوری کرو اور وہ عرش پر خاموش
بیٹھا رہے. بلکہ کوئی جرم اور کوئی فعل ایسا نہیں جس کا
کوئی نہ کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو، خواہ وہ جلد نکلے یا دیر سے.
کہتے ہیں خدا کی لاٹھی نظر نہیں آتی مگر جب پڑتی ہے تو اُسکی
چوٹ بڑی سخت ہوتی ہے. پس تقدیر کا صرف اتنا
مفہوم ہے کہ ہمارا خدا چپ کر کے بیٹھا ہوا نہیں بلکہ
وہ تمام افعال کے نتائج پیدا کرتا رہتا ہے. جو لوگ
بھی خدا تعالیٰ کے متعلق یہ سمجھتے ہیں کہ وہ چُپ
کر کے بیٹھا ہوا ہے دنیا کے کاموں میں کوئی دخل نہیں
دے رہا اُن کے عمل اور خیالات پر مذہب کا کوئی اثر
نہیں ہوتا. وہ سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے نعوذ باللہ
من ذالک یونہی ایک بڑ ماردی ہے کہ یوں کرو تو
اس کے یہ نتائج پیدا ہوں گے. ورنہ وہ دنیا کے
کاموں میں کوئی دخل نہیں دے رہا، جو کچھ کرتے
ہیں ہم کرتے ہیں اللہ میاں صرف عرش پر بیٹھا ہنس رہا

ہوتا ہے کہ خوب تماشا ہو رہا ہے. لیکن ہم اس قسم کے
خدا کے قائل نہیں. ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا
کے کاموں میں دلچسپی لے رہا ہے اور ہر کام کے نیک
یا بد نتائج پیدا کر رہا ہے. اسی کی طرف سورۂ فاتحہ
کے ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. مٰلِكِ
يَوْمِ الدِّيْنِ. جب خدا جزا و سزا کا مالک ہے
تو دنیا میں ہر فعل کا نتیجہ جلد یا بدیر ضرور نکلتا ہے اور اگر
بعض دفعہ وہ نتائج اس جہان میں مخفی ہوتے ہیں
تو اگلے جہان میں نکل آتے ہیں. دنیا نے قرآن کریم
کی اس پیش کردہ صداقت کا ایک لمبے عرصہ تک
انکار کیا مگر اب چند سال ہوئے سائنسدانوں نے
ثابت کیا ہے کہ ہر نطفہ جو انسان کے جسم میں سے
نکلتا ہے اُس پر کچھ نشانات ہوتے ہیں جو مختلف
اخلاق کے قائم مقام ہوتے ہیں. کوئی نشان غصہ کا
ہوتا ہے کوئی دیانت کا ہوتا ہے، کوئی جھوٹ کا
ہوتا ہے کوئی سچائی کا ہوتا ہے. فرض کرو کسی کے
پڑدادے یا لکڑ دادے نے جھوٹ کو اپنی عادت بنالیا
تھا تو اُس کے نطفہ پر جھوٹ کا ایک نشان پڑ جائے گا
جو نسلاً بعد نسل چلتا چلا جائے گا. اسی طرح اگر باپ
دادا میں بعض نمایاں خوبیاں تھیں تو وہ خوبیاں ایک
نشان کی صورت میں نطفہ میں آجاتی ہیں. اسی طرح
چلتے چلتے ہو سکتا ہے کہ چھٹی یا ساتویں پشت میں اُن
میں سے کوئی ایک نشان ٹوٹ جائے اور وہ کیرکٹر جس
کا وہ قائم مقام تھا پیدا ہونے والے بچے میں آجائے
فرض کرو کہ وہ کیرکٹر چوری کا تھا تو بچہ بڑا ہو کر چور
بن جاتا ہے اور سارا خاندان حیران رہ جاتا ہے کہ
اس کا نہ باپ چور تھا نہ دادا چور تھا پھر اس میں چوری
کی عادت کہاں سے آگئی. حالانکہ وہ اثر باپ دادا
سے نہیں بلکہ اس سے بھی پہلے کے آباؤ اجداد سے

نطفہ کے ذریعہ چلتا چلا آرہا تھا جواب آکر ظاہر ہوا۔ لکڑدادے میں چوری کی عادت تھی جو چھٹی یا ساتویں پشت میں آکر ظاہر ہوگئی۔ اسی طرح جھوٹ دغابازی اور ظلم سب افعال ایسے ہیں جو انسانی نطفہ پر اثر کرتے ہیں اور اُس پر اِن اخلاق کے نشانات قائم ہو جاتے ہیں جو آئندہ نسلوں میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ انسان سمجھتا ہے کہ میرا عمل پوشیدہ ہوگیا حالانکہ پوشیدہ نہیں ہوا بلکہ برابر قائم رہا ہے اور آئندہ نسل میں کسی وقت آکر ظاہر ہو جائے گا بعض قیاس آرائیاں ہوتی ہیں لیکن یہ قیاس آرائی نہیں ایک ثابت شدہ حقیقت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا خدا اِس دنیا میں ہر فعل کا نتیجہ پیدا کر رہا ہے اور یہی ایک ایسا عقیدہ ہے جس کے ذریعہ دنیا میں اعلیٰ درجہ کی نیکی پیدا ہوتی ہے۔ جو شخص اس کا انکار کرتا ہے وہ اخلاقی اور قومی ذمہ داریوں سے غافل ہو جاتا ہے اور قومی اصلاح کا خیال اُس کے دل سے نکل جاتا ہے اور نفسی نفسی کے جذبات سے متاثر ہو جاتا ہے حضرت مسیح ناصری علیہ السلام نے اسی نقطۂ نگاہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے متبعین کو یہ دعا سکھلائی ہے کہ

اے خدا تیری بادشاہت جس طرح آسمان پر ہے اسی طرح زمین پر بھی آئے۔

مسیحی اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ زمین پر بھی تیرے احکام کا غلبہ ہو حالانکہ وہ تو پہلے سے ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ جس طرح آسمانی لوگ تیری حکومت کی نسبت تسلیم کرتے ہیں کہ وہ جاری ہے زمینی لوگ بھی اسی طرح ماننے لگیں۔ درحقیقت اگر دنیا کے لوگ خدا تعالیٰ کی بادشاہت کی نسبت یقین رکھیں کہ وہ اِس دنیا میں بھی موجود ہے تو دنیا کی خرابی بالکل مٹ جائے۔ قادر علیٰ کل شئے خدا پر یقین ہی انسان کو حقیقی قربانی پر آمادہ کرتا ہے۔ دیکھو صحابہؓ نے کیا کچھ قربانی کی۔ اُن کے بیوی بچے بھی تھے مگر وہ جانتے تھے کہ ہمارا خدا زندہ ہے ہم مر جائیں گے تو وہ انکی خبرگیری کرے گا۔ اگر وہ بھی مر جائیں گے تو اگلے جہان میں ہمیں بدلہ مل جائے گا۔ جو شخص خدا تعالیٰ کو ذرہ ذرہ کا دیکھنے والا مانتا ہے وہ غریبوں پر ظلم نہیں کرسکتا وہ قوم کی غفلت پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا تعالیٰ سزا دے گا اور اس کا اثر اُس پر بھی پڑے گا۔ وہ اپنی روحانی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہو سکتا۔ وہ دکھاوا نہیں کرسکتا کیونکہ ایسا شخص اپنا بدلہ خدا سے چاہتا ہے اور خدا تعالیٰ تو خود دیکھ رہا ہے دکھاوے کی کیا ضرورت ہے اور جب وہ خود نیکی کرتا ہے تو لوگوں کو نیکی سے کب روک سکتا ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کا قانون گو اس دنیا میں ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ مگر جب خدا تعالیٰ کے مامور دنیا میں آتے ہیں تو یہ قانون نہایت نمایاں رنگ اختیار کرلیتا ہے۔ خدا تعالیٰ ہمیشہ ہی ظالم کو سزا دیتا ہے، خدا تعالیٰ ہمیشہ ہی نیک لوگوں کو ترقی دیتا ہے۔ مگر جب نیک اور متقی لوگوں کی جماعت کسی مامور کے ذریعہ قائم کی جارہی ہو تو اُس وقت خدا تعالیٰ کا یہ قانون بڑے نمایاں طور پر ظاہر ہونے لگتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کرنے کے بعد جب غار ثور میں جا چھپے اور حضرت ابوبکرؓ آپ کے ساتھ تھے تو مکہ کے کفار کا قافلہ آپ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور اس نے ایک کھوجی بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ پاؤں کے نشانات کو دیکھتے دیکھتے آخر تمام کفار غار ثور کے منہ پر جا پہنچے۔ یہ غار دو تین گز لمبی چوڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ غار ثور میں داخل ہو گئے تو مکڑی نے اُس کے

مُنہ سے نکلے ہوئے ایک درخت کی شاخوں پر جالا تن دیا جن لوگوں نے مکڑی کو جالا تنتے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ مکڑی منٹوں میں جالا تن دیتی ہے۔ یہ ایک خدائی فعل تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے ظاہر ہُوا۔ کھوجی ساتھ تھا اُس نے مکّہ والوں سے کہا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہیں اِس غار میں ہیں اَور کہیں نہیں گئے۔ وہ چاہتے تو اُس وقت بڑی آسانی سے جھانک کر آپ کو دیکھ سکتے تھے مگر سوال یہ ہے کہ وہ کس طرح جھانک سکتے جبکہ ایک فعّال خدا موجود تھا۔ خدا تعالےٰ نے اُس وقت اُن کی گردنیں پکڑی ہوئی تھیں اور وہ غار کی طرف دیکھ ہی نہیں سکتے تھے چنانچہ باوجود اس کے کہ وہ مکّہ سے سات میل تک اپنے کھوجی کے ساتھ آئے عین غار ثور کے مُنہ پر پہنچ کر وہ اسکی بات نہیں مانتے اور ہنستے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارا کھوجی آج پاگل ہوگیا ہے بھلا اِس غار میں بھی کوئی جا سکتا ہے مکڑی نے جالا تنا ہُوا ہے اگر کوئی اندر داخل ہوتا تو یہ جالا ٹوٹ نہ جاتا؟ اب دیکھو جہاں تک انسانی تدبیر کا سوال ہے یہ امر ناممکن تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُن کو نظر نہ آتے اِسی لئے حضرت ابو بکرؓ اس وقت گھبرائے اور اُنہوں نے کہا یا رسول اللہ اب تو کفار اتنے قریب آچکے ہیں کہ اگر وہ ذرا بھی جھک کو ہمیں جھانکیں تو دیکھ سکتے ہیں۔ اِس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ ابو بکر غم مت کرو خدا ہمارے ساتھ ہے حالانکہ وہ ابو بکرؓ کو پکڑنے نہیں آئے تھے اگر وہ اُن کو پکڑ بھی لیتے تو مار پیٹ کر چھوڑ دیتے وہ صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پکڑنا چاہتے تھے۔ مگر جس شخص کو پکڑنے کے لئے وہ نہیں آتے وہ تو گھبراتا ہے اور جس کو پکڑنے کے لئے آتے ہیں وہ بڑے اطمینان سے کہتا ہے کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا اِن کفار میں یہ طاقت ہی کہاں ہے کہ وہ ہمیں جھانک کر دیکھ سکیں۔ خدا ہمارے ساتھ ہے وہ عرش پر بیٹھا ہُوا نہیں بلکہ دنیا کے ذرہ ذرہ پر کامل تصرف رکھتا ہے اِس پر حضرت ابو بکرؓ نے کہا یا رسول اللہ میں اپنے لئے تو نہیں گھبرایا مجھے پکڑ کر اگر اُنہوں نے مار بھی ڈالا تو کیا ہُوا میری گھبراہٹ تو صرف آپ کے لئے تھی کہ کہیں آپ کو کوئی ضرر نہ پہنچے کیونکہ اگر آپ کو کوئی ضرر پہنچا تو دین تباہ ہو جائے گا۔ دیکھو کتنا عظیم الشان یقین تھا جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالےٰ کی بادشاہت پر حاصل تھا آپ جانتے تھے کہ خدا تعالیٰ کے منشاء کے سوا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ پھر حنین کے موقع پر جب صحابہؓ کا لشکر کفار کے تیروں کی بوچھاڑ سے پیچھے ہٹ گیا اور اُس کے قدم اُکھڑ گئے تو ایک وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایسا آیا جب صرف ایک آدمی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہ گیا اُس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے آگے بڑھنا چاہا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ کی سواری کی باگ پکڑ لی اور انہوں نے کہا یا رسول اللہ اب آگے بڑھنے کا وقت نہیں۔ لشکر جب تک دوبارہ جمع نہ ہولے مناسب یہی ہے کہ آپ آگے نہ بڑھیں مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بڑے جوش سے فرمایا ابو بکرؓ میرے گھوڑے کی باگ چھوڑ دو۔ اور پھر آپ اُسے ایڑ لگا کر یہ کہتے ہوئے دشمن کی طرف بڑھے کہ اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ۔ مَیں خدا کا نبی ہوں جھوٹا نہیں۔ مَیں عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔ یعنی جب مَیں خدا کا نبی ہوں اور میرے متعلق اللہ تعالےٰ کا یہ وعدہ ہے کہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ تو وہ خود مجھے بچائے گا۔ دیکھو یہ خدا تعالیٰ کے فعّال ہونے پر ایمان کا کتنا زبردست مظاہرہ ہے۔ آپ جانتے تھے کہ خدا تعالےٰ صرف عرش پر بیٹھا ہُوا نہیں بلکہ اس دنیا میں بھی حکومتِ الٰہیہ جاری ہے اور تیر بھی اگر

چلتاہے تو اُسی کے حکم سے چلتا ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ چار ہزار تیر اندازوں کے تیروں میں کوئی ایک تیر بھی مجھے خدا تعالیٰ کے اِذن کے بغیر آلگے۔ تیر خدا کا غلام ہے ممکن نہیں کہ وہ اُس کے حکم کے خلاف کسی کے سینہ میں آلگے۔ دیکھو چار ہزار تیر انداز سامنے ہیں راستہ تنگ ہے مگر آپ برابر آگے بڑھتے چلے جارہے ہیں اور فرماتے ہیں
اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ + اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ
مَیں خدا کا سچا نبی ہوں جب مجھے خدا نے کہا ہے کہ یہ لوگ تجھے مار نہیں سکتے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اُن کے تیر مجھے ہلاک کر دیں۔ پھر یمن کا گورنر ایران کے بادشاہ کے حکم کے ماتحت آپ کو گرفتار کرنے کے لئے اپنے آدمی بھجواتا ہے۔ یہودیوں نے اُس کے پاس شکایت کی تھی کہ عرب میں یہ ایک نئی حکومت بن رہی ہے جو آپ کے لئے پریشانی کا موجب ہوگی۔ بادشاہ بیوقوف تھا اُس نے یمن کے گورنر کو پیغام بھجوایا کہ مَیں نے سُنا ہے عرب میں ایک مدعیٔ نبوت کھڑا ہوا ہے اُسے فوراً گرفتار کر کے میرے پاس بھجوا دیا جائے۔ گورنر یمن نے اپنے آدمی مدینہ بھجوائے۔ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے کہا کہ اِس اِس طرح ہمارے بادشاہ نے گورنر یمن کے نام حکم بھیجا تھا جس پر گورنر نے ہمیں آپ کی طرف بھجوایا ہے آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ معلوم ہوتا ہے بادشاہ کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے چنانچہ گورنر نے ہمیں کہا ہے کہ ہم آپ کو یہ بھی کہہ دیں کہ مَیں آپ کے متعلق بادشاہ کی خدمت میں سفارش کروں گا اور اُسے لکھوں گا کہ آپ کے پاس غلط رپورٹ پہنچی ہے اِس شخص سے ملک کے امن کو کوئی خطرہ نہیں۔ آپ نے فرمایا ٹھہرو میں اللہ تعالےٰ سے دُعا کرلوں۔ دوسرے دن وہ پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا ابھی کچھ اَور ٹھہرو مَیں دُعا کر رہا ہوں تیسرے دن وہ پھر آئے تو آپ نے فرمایا ابھی کچھ اور ٹھہرو مَیں دُعا کر رہا ہوں۔ چوتھے دن وہ پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ آپ اپنا فیصلہ سُنا دیجئے۔ آپ نے فرمایا تم جاؤ اور گورنر سے کہہ دو کہ میرے خدا نے تمہارے خدا کو آج رات مار ڈالا ہے۔ انہوں نے کہا جناب ایک بار پھر سوچ لیجئے اِس کا نتیجہ ملک عرب کے لئے اچھا نہیں ہوگا یہاں سخت تباہی واقعہ ہوگی اور عرب کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں گورنر نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آپ کی سفارش کردے گا اور آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ آپ نے فرمایا جاؤ مَیں نے جو کچھ کہا ہے اپنے گورنر سے کہہ دو کہ میرے خدا نے آج رات تمہارے خدا کو مار دیا ہے۔ اِس پر وہ واپس چلے گئے اور انہوں نے گورنر کو یہ جواب سُنا دیا۔ اُس نے جواب سُن کر کہا کہ یہ شخص یا تو پاگل ہے یا پھر واقعہ میں اللہ تعالےٰ کا نبی ہے کسی دوسرے کے مُنہ سے ایسی بات نہیں نکل سکتی۔ چودہ پندرہ دن گذرے تو ایک شاہی جہاز کے آنے کی اطلاع ملی گورنر نے اپنے سکرٹری استقبال کے لئے بھیجے جب سفیر گورنر یمن کے پاس پہنچا اور اُسے خط پیش کیا تو جیسے ایرانی دستور تھا اُس نے ادب کے ساتھ اُس خط کو چُوما۔ مگر جب اُس کی مہر دیکھی تو چونکہ وہ دوسرے بادشاہ کی مُہر تھی اُس نے اپنے درباریوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا وہ بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے جو عرب کے نبی نے کہی تھی۔ پھر اُس نے خط کھولا تو اُس کے اندر یہ الفاظ تھے جو شاہِ ایران کے بیٹے کی طرف سے تھے کہ ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ حکومت کے تمام آفیسرز سے ہماری اطاعت کا عہد لو اور ہم تم کو اطلاع دیتے ہیں کہ ہم نے فلاں تاریخ کو اُن ظلموں کی وجہ سے جو بادشاہ کررہا تھا اُسے مار ڈالا ہے اور اب ہم خود بادشاہ ہیں

اور ضروری ہے کہ ہماری اطاعت کا عہد لیا جائے۔
اس کے بعد اُس نے لکھا کہ ہمارے باپ نے جو ظالمانہ
احکام دئے تھے اُن میں سے ایک حکم عرب کے ایک
مدعی نبوت کے متعلق بھی تھا کہ اُسے گرفتار کرکے ہمارے
پاس بھجوایا جائے ہم اس حکم کو بھی منسوخ کرتے ہیں اب
اس کی تعمیل کی ضرورت نہیں۔ جب اُس نے تاریخ دیکھی
تو وہ وہی تاریخ تھی جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
نے یہ فرمایا تھا کہ ہمارے خدا نے تمہارے خدا کو آج
رات مار ڈالا ہے۔ اب دیکھو یہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ
خدا کا کتنا بڑا نشان ہے کہ اُس نے بیٹے کے ہاتھ
سے باپ کو مروا ڈالا اور کس طرح اِس سے ظاہر ہوتا ہے
کہ دنیا کے ذرہ ذرہ پر خدا تعالےٰ کی حکومت جاری
ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جس سے دنیا میں حقیقی عدل
اور انصاف قائم ہوتا ہے یہ نہ ہو تو انصاف قائم
نہیں ہو سکتا۔ پس اللہ تعالےٰ فرماتا ہے مجھے بتاؤ
تو اُس شخص کا حال جو اس دنیا میں حکومت الٰہیہ کا انکار
کرتا ہے اگر کوئی انکار کرے تو تم دیکھو گے کہ اُسے
کبھی سچا تقویٰ نصیب نہیں ہوگا۔ دنیا کے پردہ پر
سچا تقویٰ سوائے خدا تعالےٰ کی بادشاہت ماننے
کے اور کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتا۔ جس کو پتہ ہوگا
کہ خدا دنیا کے تمام معاملات میں دخل دے رہا ہے
اور ہر کام کا وہ نتیجہ پیدا کرتا ہے وہ بدی کرے گا
کیوں۔ جتنا جتنا یہ یقین بڑھتا چلا جائیگا اُتنا ہی
انسان کے اندر تقویٰ بھی بڑھتا چلا جائے گا اور وہ
بدیوں سے بچتا چلا جائے گا۔

دین کے پانچویں معنے مذہب کے

(۵) دین کے ایک معنے مذہب کے ہیں۔
مذہب بھی انسان کو اخلاق فاضلہ کی تعلیم دیتا ہے
خواہ کوئی مذہب ہو۔ مذہب اپنی ذات میں بہت سی
بدیوں کو روکنے والی چیز ہے اس میں سچے مذہب
کی بھی کوئی شرط نہیں ہر مذہب انسان کو بدیوں سے
روکتا ہے۔ بیشک لوگ کہتے ہیں کہ آپس کی لڑائیوں اور
فسادات کی بڑی وجہ مذہب ہی ہے لیکن اگر غور سے کام
لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ لڑائیاں اور فسادات مذہب
کی وجہ سے نہیں بلکہ مذہب پر عدم عمل کی وجہ سے ہیں۔
مثلاً سکھ مذہب کو ہی لے لو سکھ مذہب کی بنیاد حضرت
باوا نانک رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم پر ہے اور انہوں نے
جو تعلیم دی اُس میں یہی لکھا ہے کہ امن سے رہو بنی نوع انسان
پر رحم کرو اور فتنہ و فساد میں حصہ نہ لو۔ یہی حال
ہندو مذہب کا ہے۔ جب انسان کسی مذہب کا پیرو
ہوتا ہے تو گو وہ اُس کی تعلیم کی خلاف ورزی کرتے
ہوئے فتنہ و فساد میں حصہ لینے لگ جائے مگر
کبھی نہ کبھی اُسے خیال آجاتا ہے کہ مَیں غلطی کر رہا
ہوں مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ عیسائی دنیا میں
کتنا ظلم کر رہے ہیں پانچ سو سال تک انہوں نے
دنیا کو اس طرح غلامی کے پنجہ میں دبائے رکھا ہے کہ
جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی مگر انجیل میں
تو یہی لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص تیرے ایک گال پر
تھپڑ مارے تو تُو اپنا دوسرا گال بھی اُس کی طرف
پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھے ایک میل بیگار لے جانا
چاہے تو تُو اُس کے ساتھ دو میل چلا جا۔ عیسائی خواہ
کتنا ظلم کریں جب کبھی کوئی عیسائی انجیل کو غور سے
پڑھے گا اُس کے دل میں ضرور رحم پیدا ہوگا اور
اُسے یہ احساس ہوگا کہ مجھے لوگوں پر ظلم نہیں کرنا
چاہیئے۔ ہندو مذہب کو لے لو اُس میں نہایت اعلیٰ درجہ
کی اخلاقی تعلیم موجود ہے۔ مَیں نے خود وید پڑھے
ہیں مَیں تو جب بھی انہیں پڑھتا ہوں مجھے یقین ہوتا
ہے کہ وہ خدا تعالےٰ کی طرف سے ہیں۔ اِس میں
کوئی شبہ نہیں کہ ویدوں میں اس قسم کی لغویات
بھی ہیں کہ فلاں رشی نے دھوتی اتار کر رکھی تو بچہ پیدا
ہو گیا اور اُس نے کہا کہ میں اِس طرح بس لئے

پیدا ہوتا ہوں کہ میں گندے رستے سے پیدا نہیں ہونا چاہتا تھا مگر اس کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ کی صفات کا ذکر ایسے شاندار طریق پر اُس میں پایا جاتا ہے کہ اُسے پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا دل زمین سے اُونچا ہو رہا ہے۔ بے شک اُس میں اور چیزیں بھی مل گئیں مگر اُس کا ابتدائی منبع ضرور خدا تعالیٰ کی طرف سے تھا اور جو شخص بھی تعصب کو دُور کر کے ویدوں کا مطالعہ کرے گا اس کا دل روحانیت کے جذبات سے لبریز ہو جائے گا۔ یہی حال انجیل تورات اور ژند واوستا کا ہے۔ پھر قطع نظر اس سے کہ کوئی مذہب خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے یا نہیں بغیر نیک تعلیم کے کوئی مذہب پھیل ہی نہیں سکتا۔ کیا کوئی بھی مذہب دنیا میں ایسا ہے جس کی یہ تعلیم ہو کہ فریب کرو، بدکاری کرو؟ ہندوؤں میں وام مارگی ایک ایسا فرقہ ہے جس میں بدکاری کو جائز سمجھا جاتا ہے مگر وہ مذہب نہیں بلکہ ایک فلسفہ ہے۔ وہ اپنے آپ کو کسی الٰہی کتاب کی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ الٰہی کتاب کا جھوٹا ترجمہ کرتے ہیں مثلاً وید میں لکھا ہے نیکی کر تو وہ اس کا ترجمہ یہ کریں گے کہ بدکاری کر۔ مگر بہرحال یہ ایک فلسفہ ہے مذہب نہیں۔ مذہب کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ کوئی شخص دعویٰ کرے کہ خدا نے مجھے یوں کہا ہے اور ایسی کوئی الہامی کتاب نہیں جس میں یہ تعلیم ہو کہ بدی کر۔ کوئی مذہب ایسی تعلیم دے ہی نہیں سکتا اس لئے کہ اگر وہ ایسی تعلیم دیگا تو دنیا میں مقبول نہیں ہو سکے گا۔ مذہب ہمیشہ زمانہ کی رَو کا مقابلہ کر کے آگے بڑھتا ہے اور جب مذہب کا کام ہی یہ ہے کہ وہ عام رَو کے خلاف تعلیم دے تو وہ خلاف فطرت تعلیم دے کر پھیل ہی کس طرح سکتا ہے۔ رسم و رواج تو اس کے پہلے سے ہی مخالف ہوتے ہیں اگر فطرت بھی اس کے خلاف ہو تو وہ چلے گا کس طرح سچے مذہب کی مخالفت رسم و رواج و عادات بے شک کرتے ہیں اور سخت کرتے ہیں مگر چونکہ وہ فطرت اور عقل کے عین مطابق ہوتا ہے باوجود دنیا کی مخالفت کے وہ آخر جیت ہی جاتا ہے کیونکہ فطرت و عقل اُس کی تائید میں ہر انسان کے دل میں بغاوت کرنے لگ جاتے ہیں۔

مجھے ایک دفعہ برما سے ایک شخص نے بہائیت کے متعلق ایک کتاب بھیجی اور لکھا کہ آپ دیکھیں بہائیت کی تعلیم کیسی اعلیٰ ہے کہ سچ بولو۔ عورتوں کو تعلیم دو ظلم نہ کرو۔ بدی سے بچو۔ کیا ایسی تعلیم بھی جھوٹی ہو سکتی ہے؟ میں نے اُسے جواب میں لکھا کہ یہ بڑی اچھی باتیں ہیں مگر اس سے جو نتیجہ آپ نے نکالا ہے میں اُس سے متفق نہیں۔ اس لئے کہ آپ کہتے ہیں یہ کیسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہے بہائیت کہتی ہے جھوٹ نہ بولو۔ بہائیت کہتی ہے عورتوں کے حقوق ادا کرو۔ بہائیت کہتی ہے فریب نہ کرو۔ بہائیت کہتی ہے امانت اور دیانت سے کام لو۔ میں نے لکھا کہ دنیا میں بڑے بڑے مذاہب یہودیت، اسلام، ہندو مذہب اور زرتشتی ازم ہیں اِن تمام مذاہب کی کتب میں سے آپ وہ حوالجات نکال کر مجھے بھجوا دیں جن میں یہ لکھا ہو کہ جھوٹ بولو۔ سچ نہ بولو۔ دیانت داری کو ترک کر دو۔ انصاف نہ کیا کرو۔ عورتوں کے حقوق نہ ادا کیا کرو۔ اگر کسی مذہب کی کتاب میں یہ بات لکھی ہوئی ہو تو میں مان لوں گا کہ بہائیت نے نہایت اعلیٰ تعلیم پیش کی ہے اور اگر سب مذاہب میں یہی تعلیم ہے تو اِس میں بہائیت کو امتیاز کونسا حاصل ہوا۔ یہ تو ایک طبعی تعلیم ہے جو ہر مذہب کو پیش کرنی پڑتی ہے ورنہ فطرت کے خلاف کھلی تعلیم دیکر وہ کہاں کامیاب ہو سکتا ہے۔ غرض کسی مذہب کو لے لو وہ سچا ہو یا جھوٹا ضرور اخلاق کی پابندی کراتا ہے یہی وجہ ہے قرآن کریم نے اہلِ کتاب کی لڑکیاں لے لینا تو جائز

قرار دیا ہے لیکن غیر اہلِ کتاب کی لڑکیوں سے شادی جائز قرار نہیں دی۔ اسی طرح اہلِ کتاب کے ذبیحہ کو تو جائز قرار دیا ہے لیکن غیر اہلِ کتاب کے ذبیحہ کو جائز قرار نہیں دیا۔ اس میں حکمت یہی ہے کہ اگر ایک عیسائی عورت آئے تو خواہ وہ اپنے مذہب پر کس قدر ہی ناقص ایمان رکھتی ہو بہرحال انجیل کی تعلیم اُس پر ضرور کچھ نہ کچھ ضبط رکھے گی۔ ایک یہودی عورت کو یہودی مذہب کی تعلیم بعض حدود کے اندر مقید رکھے گی۔ ایک ہندو عورت کو ہندو مذہب کی تعلیم اباحت اور بے دینی کی طرف جانے سے روکے گی۔ لیکن جو عورت لامذہب ہے جو مانتی ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی کوئی کتاب دنیا کی ہدایت کے لئے نازل کی ہے وہ یقیناً ایسے کام کر سکتی ہے جو ہمارے علم سے باہر ہوں۔ ایک عیسائی عورت کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ وہ کیا کر سکتی ہے کیونکہ اُس کی تعلیم موجود ہے۔ ایک یہودی عورت کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ وہ کیا کر سکتی ہے کیونکہ اُس کی تعلیم موجود ہے۔ لیکن ایک لامذہب عورت کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا کرے گی کیونکہ اُس کی کوئی ایسی تعلیم نہیں جس کی بناء پر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ وہ کیا کچھ کرے گی۔ اسی طرح اہلِ کتاب کا ذبیحہ جائز ہے خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی عورت کی دعوت قبول کی اور کھانا کھایا۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس نے کھانے میں زہر ملا دیا۔ یہ انفرادی فعل تھا کیونکہ یہودی تعلیم یہ نہیں کہتی کہ دوسرے کے کھانے میں زہر ملا دیا کرو۔ غرض ہمارے پاس کوئی نہ کوئی بنیاد ایسی ہونی چاہیئے جس پر چلنے سے ہم محفوظ ہو جائیں اور وہ بنیاد مذہب کے سوا اور کوئی نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ۔ تمہیں دنیا کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ مذہب بھی بہت سی بدیوں کو روک رہا ہے چاہے وہ جھوٹا ہو یا سچا۔ اگر سچا ہوگا تو نورٌ علیٰ نور، وہ تو ہر قسم کی خرابیوں اور گندوں سے بچائے گا لیکن جو جھوٹا مذہب ہو وہ بھی بہت سی بدیوں سے لوگوں کو بچا لیتا ہے کیونکہ اُس کے اندر اخلاقی تعلیم ضرور پائی جاتی ہے۔ پس فرماتا ہے جو شخص مذہب کو تسلیم نہیں کرتا تم دیکھو گے کہ وہ قسم قسم کی خرابیوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ مذہب کو تسلیم کرنے والا اگر گناہ بھی کرے گا تو ساتھ ہی ساتھ اُس کے دل میں یہ بھی احساس پیدا ہوگا کہ میں مذہب کے خلاف چل رہا ہوں اور میرا فعل میری غلطی کا نتیجہ ہے لیکن جو شخص کسی مذہب کو ماننے والا نہیں وہ غلطی بھی کرے گا تو کہے گا کہ میں ٹھیک کر رہا ہوں اور یہ مقام کہ بدی کو جائز سمجھا جائے بڑا خطرناک ہوتا ہے۔

دین کے چھٹے معنے عبادتِ الٰہیہ کے

(۶) دین کے چھٹے معنے عبادتِ الٰہیہ کے ہیں اِس لحاظ سے اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ کے یہ معنے ہوں گے کہ مجھے بتا تو سہی اُس شخص کا حال جو دین یعنی عبادتِ الٰہیہ کا انکار کرتا ہے۔

عبادتِ الٰہیہ بھی انسان کو بڑی بڑی نیکیوں کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ عبادت بھی خواہ سچی ہو یا جھوٹی دونوں صورتوں میں بدیوں سے روکنے والی ہوتی ہے یہ ضروری نہیں کہ سچے مذہب کی بتائی ہوئی عبادتِ الٰہیہ ہی بدیوں سے روکنے والی ہو بلکہ درحقیقت ہر عبادتِ الٰہیہ بدی سے روکتی ہے۔ چاہے ہندوؤں کی ہو، عیسائی کی ہو، یہودی کی ہو، زرتشتی کی ہو۔ مثلاً عیسائی اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہے تو کیا کہتا ہے یہی کہتا ہے کہ اے خدا میری آج کی روٹی مجھے دے اے خدا تیری بادشاہت جیسی آسمان پر ہے ویسی ہی زمین پر بھی آئے۔ یہ چیز انسان کے دل میں آخر خشیت تو پیدا کر دیتی ہے۔ ایک جابر بادشاہ جو ظالمانہ حکومت کر رہا ہوتا ہے اگر کھڑے ہو کر

دل میں ایک دفعہ بھی اللہ تعالیٰ کے حضور یہ دعا کرتا ہے
کہ اے خدا میری آج کی روٹی مجھے دے تو اُس کے دل
میں بھی کچھ نہ کچھ انکسار پیدا ہو جاتا ہے اور وہ سمجھتا
ہے کہ مَیں بھی کسی کا محتاج ہوں۔ اِس کے بعد یہی خیال
اُسے نیکیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ غرض عبادت الٰہیہ
اپنی ذات میں بڑے بڑے گناہوں کو دور کرنے والی ہوتی
ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ
اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ
نماز انسان کو فحشاء اور منکر سے بچاتی ہے۔ اِسی مضمون
کی طرف اِن الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ اَرَءَیْتَ
الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ۔ مجھے بتا تو سہی کہ
وہ کون ہے جو عبادتِ الٰہیہ کا منکر ہے۔ اگر ہے تو تُو
دیکھے گا کہ اُس میں یہ یہ عیوب ہوں گے کہ وہ یتیموں
پر ظلم کرے گا، مسکینوں کے حقوق ادا نہیں کرے گا
اور مداہنت اور منافقت کا مادہ اُس میں پایا جائے گا۔
وہاں فرمایا تھا نماز بدیوں اور بے حیائیوں سے روکتی
ہے اور یہاں فرماتا ہے کہ جو نماز کا منکر ہے وہ بدی
کا مرتکب ہوگا گویا وہی مفہوم یہاں دوسرے الفاظ
میں ادا کر دیا گیا ہے۔

عبادتِ الٰہیہ کیا چیز ہے اور نیکی کی صحیح تعریف
کیا ہے۔ اِس بارہ میں یورپ میں بڑی بڑی بحثیں
ہوئی ہیں۔ یورپ کے فلاسفروں نے اس موضوع پر
دو دو، تین تین، چار چار جلدوں میں کتابیں لکھی ہیں
اور بڑی بڑی لمبی بحثیں کرنے کے بعد انہوں نے یہ
نتیجہ نکالا ہے کہ نیکی وہ ہے جس سے زیادہ سے زیادہ
لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ مگر ہر تعریف جو انہوں نے کی ہے
اُس پر کوئی نہ کوئی اعتراض پڑتا ہے مثلاً یہی تعریف
لے لو کہ نیکی وہ کام ہے جس سے زیادہ سے زیادہ لوگوں
کو فائدہ پہنچے۔ اگر اس کو درست سمجھ لیا جائے تو کیا
اگر اکثر لوگ یہ فیصلہ کر لیں کہ ہم قلیل التعداد لوگوں کو
لُوٹ لیں گے تو اُن کا یہ فیصلہ جائز ہوگا۔ اِس تعریف کے
رُو سے یقیناً اکثریت کی لوٹ مار جائز ہوگی مگر درحقیقت
جائز نہیں۔ اِسی طرح اَور جس قدر تعریفیں کی جاتی ہیں
سب کی سب غلط ہیں۔ صرف ایک تعریف ہے جس کے
متعلق میں سمجھتا ہوں کہ وہ نیکی کی صحیح تعریف ہے اور
وہی اکیلی تعریف ہے جس کے بغیر کوئی تعریف نہیں
اور وہ تعریف جس کا قرآن کریم سے بھی پتہ چلتا ہے
یہ ہے کہ نیکی کہتے ہیں خدا تعالیٰ کی تصویر کا انعکاس
اپنے اندر لے لینے کو۔ تعبّد کے معنے ہوتے ہیں
نشان لے لینا۔ پس عبادتِ الٰہیہ کے معنے ہوتے
خدا تعالیٰ کے عکس اور اُس کی تصویر کو اپنے اندر
پیدا کر لینا۔ یہی ایک صحیح ترین تعریف ہے اور
اِس کے سوا اور کوئی تعریف نہیں۔ جو شخص خدا تعالیٰ
کو نہیں مانتا اُسے ہم پہلے خدا تعالیٰ کے وجود کا قائل
کریں گے۔ لیکن جب وہ قائل ہو جائے گا تو اُسے
ماننا پڑے گا کہ اگر کامل اور بے عیب وجود خدا تعالیٰ
کا ہے تو نیکی سوائے اِس کے اَور کچھ نہیں کہ ہم اُس
بے عیب اور کامل ذات کا عکس اپنے اندر پیدا کر لیں
اور اُس کی تصویر بن جائیں۔ جب کوئی شخص خدا تعالیٰ
کی صفات کا عکس اپنے اندر لے لیگا تو وہ تمام دنیا
سے حُسنِ سلوک کرنے لگ جائے گا اور اُس کا رحم
دوست اور دشمن سب پر وسیع ہوگا کیونکہ خدا تعالیٰ
کے نزدیک سب اُس کے بندے ہیں۔ ابوجہل بھی اُس
کا بندہ ہے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی
اُس کے بندے ہیں۔ یونس نبی کے واقعہ کو ہی دیکھ لو
اللہ تعالیٰ نے حضرت یونسؑ کو الہاماً بتایا کہ نینوہ
کی بستی چالیس دنوں کے اندر اندر تباہ کر دی جائیگی
وہ اُس بستی کو چھوڑ کر جنگل میں جا بیٹھے اور عذاب کا
انتظار کرنے لگے۔ چالیس دن کے بعد کوئی نینوہ سے
آنیوالا ملا تو اُس سے اُنہوں نے پوچھا کہ نینوہ کا

۷۵۱
نیکی کی صحیح تعریف

کیا حال ہے اُس نے بتایا کہ سب لوگ خوش وخرّم ہیں اور بالکل خیریت کے ساتھ ہیں۔ اِس پر حضرت یونسؑ کو خیال گذرا کہ اگر میں نینوہ میں واپس گیا تو لوگوں کے سامنے مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ چنانچہ وہ جہاز میں بیٹھ کر کسی غیر ملک کی طرف چل پڑے۔ راستہ میں طوفان آیا اس پر انہوں نے جہاز والوں سے اصرار سے کہا کہ یہ عذاب میری وجہ سے آرہا ہے جو اپنے آقا (خدا) کا بھاگا ہوا غلام ہوں اِس لئے مجھے سمندر میں پھینک دو۔ چنانچہ بہت سے انکار کے بعد انہوں نے انکو سمندر میں پھینک دیا۔ اور سمندر کی ایک بڑی مچھلی اُن کو نگل گئی اور آخر اُس نے قے کرکے اُنہیں کنارہ پر پھینک دیا۔ وہ ابھی زندہ تھے مگر مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے سخت کمزور ہو چکے تھے وہاں ایک کدو کی بیل اُگی ہوئی تھی اُنہوں نے اُس کے سایہ میں سر چھپایا اور آرام کیا۔ رات کو خدا تعالیٰ نے ایک کیڑے کے دل میں القاء کیا اور اُس نے راتوں رات وہ بیل کاٹ کر رکھ دی۔ صبح جب انہوں نے بیل کو کٹا دیکھا تو جیسے انسان کی عادت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ ناراضگی کے وقت بے جان چیزوں اور جانوروں کو بھی بُرا بھلا کہہ دیتا ہے اُنہوں نے بھی غصہ میں کہا کہ خدا اس کیڑے پر لعنت کرے جس نے ایسی آرام دہ بیل کو کاٹ دیا ہے۔ اِس پر حضرت یونسؑ کو الہام ہوا کہ اے یونس: کیا یہ بیل تیری اُگائی ہوئی تھی؟ انہوں نے عرض کیا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ بیل تیری اُگائی ہوئی نہیں تھی صرف تجھے اِس سے فائدہ پہنچ رہا تھا مگر جب یہ بیل کٹ گئی تو تجھے کتنا غصہ آیا کہ تُو نے کیڑے پر بھی لعنت کرنی شروع کر دی۔ اے یونس اگر تجھے اِس بیل کا اتنا غم ہے تو کیا نینوہ کے بسنے والے ہمارے بندے نہیں تھے وہ خواہ کتنے ہی گندے ہوں بہرحال ہمارے بندے تھے جب انہوں نے توبہ کرلی تو تو کس طرح یہ امید کرتا تھا کہ ہم اُنکو ہلاک کر دینگے۔ یہ ہے ہمارا خدا جو نہ طرفداری کرتا ہے نہ جتھوں کا ساتھ دیتا ہے نہ طاقتور کی تائید کرتا ہے۔ وہ رحم اور صرف رحم چاہتا ہے۔ چنانچہ جب بھی کوئی شخص اُس سے رحم کی استدعا کرتا ہے وہ اُسے معاف کر دیتا ہے اور کہتا ہے جاؤ ہم نے تمہیں معاف کیا مگر توبہ بہرحال سچی ہونی چاہیئے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ۔ ہماری بادشاہت تو یہ ہے کہ ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی رزق دیتے ہیں اور ابوجہل کو بھی رزق دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا سورج چڑھتا ہے تو جیسے ایک مومن اُس سے فائدہ اُٹھاتا ہے ویسے ہی ایک کافر بھی اُس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ وہ ہستی ہے جس کی نقل کرنے کے بعد ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم غلطی کر رہے ہیں پس عبادت الٰہیہ کے معنے صرف سجدہ اور رکوع کرنے کے نہیں بلکہ اپنے سامنے ایک اعلیٰ درجہ کا نمونہ رکھ کر عبادت کرنے کے ہیں۔ جو اس نمونہ کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتا ہے وہ نہایت اعلیٰ درجہ کی زندگی بسر کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کی ذات کو اپنے لئے نمونہ بنائیگا اُس کا عمل اور نمونہ دوسرے سب لوگوں سے اچھا ہوگا۔

دِین کے ساتویں معنے مِلّۃ کے

(۷) دِین کے ایک معنے جیسا کہ مَیں نے بتایا تھا مِلّۃ کے ہوتے ہیں۔ مِلّۃ کے دو معنے ہیں جس کی وجہ سے مَیں نے اِس کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک شریعت اور مذہب کے معنے۔ دوسرے قومیت کے۔

دِین اور مِلّۃ میں فرق

دِین اور مِلّۃ میں یہ فرق ہوتا ہے کہ دِینُ اللہ تو ہم کہہ سکتے ہیں لیکن مِلّۃُ اللہ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ شریعت تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے مگر خدا کسی قومیت میں شامل نہیں وہ قوموں سے بالا ہے

اِس لئے مِلّۃ کے لفظ کو اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب نہیں کرتے - مِلّۃ کا لفظ دِین کی نسبت ان معنوں میں وسیع ہے کہ ہر دین شریعت کے لحاظ سے مِلّۃ میں شامل ہے لیکن ہر مِلّۃ کے مفہوم میں دِین شامل نہیں - لیکن دِین میں ایک اور معنے بھی پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ مِلّۃ کے اس حصہ کے مشابہ ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ دِین کے معنے خدمت کے بھی ہیں چنانچہ کہتے ہیں دَانَ الْقَوْمَ : خَدَمَھُمْ یعنی دَانَ الْقَوْمَ کے ایک معنے یہ ہوتے ہیں کہ اُس نے قوم کی خدمت کی - پس چونکہ اس آیت سے اگلی آیت فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ہے اِس لئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس جگہ دِین کے معنوں میں قومی خدمت بھی شامل ہے - یتیم اُس شخص کا تعلقدار نہیں ہوتا اور نہ مسکین اُسکا تعلقدار ہوتا ہے نہ قوم میں حسنِ سلوک کا مادہ پیدا کرنا جس کا وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ میں ذکر آتا ہے انسان کا شخصی معاملہ ہے - بلکہ یہ سارے امُور قوم سے تعلق رکھتے ہیں - یتامیٰ و مساکین سے حسنِ سلوک بھی قوم سے تعلق رکھتا ہے اور قوم سے حسنِ سلوک بھی قوم کی خدمت ہے - پس اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ کے ایک معنے یہ ہوں گے کہ کیا تو بتا سکتا ہے یا مجھے بتا تو سہی اُس شخص کا حال جو قومی خدمت کا منکر ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ اس کے اندر قومی جذبہ نہیں پایا جاتا یا قومی خدمت کا احساس اُس کے دل میں نہیں پایا جاتا -

۲۱۱ اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ کا مطلب

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ کفر ایک مِلّت ہے - یہاں مِلّۃ کے معنے شریعت کے نہیں ہو سکتے کیونکہ جتنی قومیں کفر سے تعلق رکھنے والی ہیں اُن کی کوئی ایک شریعت نہیں - یہودی کتنے خرابی میں مبتلا ہیں کسقدر گمراہی اُن میں پائی جاتی ہے مگر وہ ایک خدا کے قائل ہیں اِس کے مقابلہ میں عیسائی بھی کافر ہیں مگر وہ توحید کے مسئلہ کے متعلق جو تمام مسائل میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اُن سے اختلاف رکھتے ہیں اور حضرت مسیحؑ کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ خدا کا بیٹا تھا اور خدا نے حضرت مریمؑ کو اپنے بیٹے کی پیدائش کے لئے بطور آلہ کے استعمال کیا - پھر عیسائیوں کے بعض فرقے ایسے ہیں جو حضرت مریم کو ایک رنگ میں خدا تعالےٰ کی بیوی تسلیم کرتے اور اُن کی پرستش کرتے ہیں - چنانچہ کئی آرتھوڈکس فرقے حضرت مریم کو اسی حیثیت سے دیکھتے ہیں - اب دیکھو کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں ہی جو ایک کڑی کے دو سلسلے ہیں کس قدر اختلاف پایا جاتا ہے - پھر زرتشتی ہیں اُن کی شریعت بالکل الگ ہے - یہود کے نزدیک خدا تعالےٰ کی خوشنودی کی علامت اِس دنیا کے انعامات ہیں لیکن زرتشتی اصل انعام کا وقت مرنے کے بعد کے زمانہ کو سمجھتے ہیں - چنانچہ بائیبل اور انجیل کو غور سے پڑھ کر دیکھو تو اُن میں جزاء و سزا کو دنیا سے مخصوص قرار دیا گیا ہے یا کم سے کم دنیوی جزاء و سزا پر بہت زور دیا گیا ہے - مگر زرتشتی تعلیم کو دیکھو تو وہ اگلے جہان سے تمام انعامات کو وابستہ قرار دیتی ہے - ژند اور اوستا میں سارا زور مرنے کے بعد کی زندگی پر ہے اور بار بار بتایا گیا ہے کہ وہاں گنہگاروں کے لئے دوزخ اور نیک لوگوں کے لئے جنت ہوگی - گویا زرتشتی تعلیم کو پڑھو تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم اور ژند و اوستا کی تعلیم اس بارہ میں ایک ہی ہے جہاں تفصیلاتِ شریعت میں قرآن کریم کے ساتھ یہودی تعلیمیں ملتی ہیں وہاں بعث بعد الموت کے معاملہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ اُس کا کوئی جوڑ ہی نظر نہیں آتا - بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور ژند و اوستا دونوں ایک منبع سے نکلی ہیں - پھر ہندو تعلیم

لے لو تو اُس کا کوئی جوڑ یہودی تعلیم یا زرتشتی تعلیم کے ساتھ نہیں۔ اُن کی ساری بنیاد اِس بات پر ہے کہ نسلی طور پر بعض قوموں کو بعض قوموں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے اور خدا اپنا سارا انعام اُن کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہودی قوم میں بھی نسلی تفوّق کا اظہار کیا گیا ہے مگر دوسری قوموں کے خلاف اُس میں وہ رنگ نہیں جو ہندو تعلیم میں پایا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ اُن کو غلام بنا کر رکھیں اور اُن سے اچھوتوں کا سا سلوک کریں۔ مگر ہندو قوم میں ساری بنیاد نسلی تفوق پر ہے۔ پھر تناسخ کو لے لو تو یہودیوں میں تناسخ کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ عیسائیوں میں بھی تناسخ کا کوئی ذکر نہیں۔ ژند اور اوستا میں بھی تناسخ کا کوئی ذکر نہیں۔ پس جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ کہ کفر ایک مِلّۃ ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اُن کی عبادت ایک ہے یا اُن کے عقیدے ایک ہیں یا اُن کی کتاب ایک ہے۔ کیونکہ ہمیں صریح طور پر نظر آتا ہے کہ اُن کی عبادتیں الگ الگ ہیں اُنکے عقیدے الگ الگ ہیں اُن کی کتابیں الگ الگ ہیں پس مِلّۃ کے معنے اس حدیث میں شریعت کے ہو ہی نہیں سکتے بلکہ اس حدیث میں مِلّۃ کے معنے جتھے اور جماعت کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اسلام کے سوا جس قدر مذاہب دنیا میں پائے جاتے ہیں وہ سارے کے سارے اسلام کے مقابلہ میں جتھہ بن جاتے ہیں اسلئے ہمیشہ اُن سے ہوشیار رہنا اور یہ نہ سمجھنا کہ فلاں ہندو ہے اور فلاں عیسائی، فلاں یہودی ہے اور فلاں پارسی۔ جب اسلام کا مقابلہ ہوگا یہ سارے کے سارے متحد ہو جائیں گے۔ چنانچہ گذشتہ تیرہ سو سال کی تاریخ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی صداقت کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ مسلمان حکمرانوں نے اپنے عہدِ حکومت میں یہودیوں سے اِس قدر حسنِ سلوک کیا کہ اسکی مثال ملنی مشکل ہے۔ بڑے بڑے عہدوں پر اُن کو فائز کیا مگر اُنہوں نے آخر مسلمانوں کے خلاف ہی تلوار چلائی ہندوؤں کے ساتھ مغل بادشاہوں نے کیا کیا حسنِ سلوک کیا مگر ہندو آخر مسلمانوں کے ہی دشمن ہوئے۔ سکھوں کو دیکھ لو اُن کی موجودہ ریاستوں میں سے اکثر مسلمانوں کی ہی دی ہوئی ہیں۔ سکھوں کی حکومت احمد شاہ ابدالی نے بنائی۔ اُن کے گوردواروں کی جائدادیں اکثر مسلمانوں کی دی ہوئی ہیں۔ لیکن وہ ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ یہی حال پارسیوں کا ہے پس اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ کا یہ مفہوم نہیں کہ اُن کی شریعت ایک ہے بلکہ اس میں انکی قومی شیرازہ بندی اور جتھہ بندی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا کہ وہ اسلام کے خلاف ہمیشہ متحد ہوتے رہیں گے۔

غرض مِلّۃ میں دین کے علاوہ قومی شیرازہ بندی بھی شامل ہے اور مَیں نے بتایا ہے کہ خدمت اور احساسِ قومی اس کا ایک حصہ ہے۔ پس جب ہم مِلّۃ کے معنے کریں تو اس میں شریعت کی طرف اشارہ نہیں ہوگا بلکہ قومی جتھہ بندی کی طرف اشارہ ہوگا اور اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ کے ساتویں معنے یہ ہوں گے کہ قومی تعصب اور قومی جتھہ بندی کا کون منکر ہے جو شخص اس کا منکر ہوگا وہ ہمیشہ خرابی کی طرف جائے گا۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ بعض دفعہ بہتر سے بہتر لفظ بھی غلط معنوں میں استعمال ہونے لگتا ہے مجھے یاد ہے حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے کہ لوگ کہتے ہیں تعصب بُری چیز ہے، تعصب تو بڑی اچھی چیز ہے۔ اُس وقت میری تعلیم چونکہ ابھی ابتدائی حالت میں تھی۔

اِس لئے جب بھی آپ یہ فقرہ استعمال فرماتے مجھے یُوں محسوس ہوتا کہ میرا جسم کانپ اُٹھا ہے اور مَیں اپنے دل میں کہتا تھا کہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ تعصب جیسی بُری چیز کو آپ اچھا قرار دے رہے ہیں مگر پھر آہستہ آہستہ یہ مضمون مجھ پر واضح ہونا شروع ہُوا اور میں نے سمجھ لیا کہ یہ لفظ عربی ہے اور عربی میں اِس کا اور مفہوم ہے اور اُردو میں اَور۔ عربی میں جہاں اس کے معنے بُرے ہیں وہاں اِس کے معنے اچھے بھی ہیں۔ لفظ کی بناوٹ کے لحاظ سے اِس کے معنے یہ ہیں کہ اپنے دین اور طریقے کے لئے غیرت کا ظاہر کرنا اور اُس پر اگر حملہ ہو تو اُسے دُور کرنا۔ ظاہر ہے کہ یہ معنے اچھے ہیں۔ جس چیز کو انسان اچھا سمجھتا ہے اس کے لئے اظہارِ غیرت اور اُسکی حفاظت کے لئے قربانی ایک بہترین فعل ہے۔

درحقیقت یہ لفظ اُردو میں غلط استعمال ہونے لگ گیا ہے۔ اور صرف بُرے معنوں میں محصور ہو کر رہ گیا ہے اور اسی وجہ سے ابتداءً مجھے حضرت خلیفۂ اوّل کے مذکورہ بالا فقرہ پر تعجب ہوا کرتا تھا مگر آہستہ آہستہ جب میں نے زیادہ علم پڑھا تو پھر میری سمجھ میں یہ بات آنے لگ گئی کہ آپ کی بات ٹھیک ہے۔ ہم تعصب کے معنے اُردو میں صرف یہ لیتے ہیں کہ ناجائز طور پر قوم کی طرفداری کرنا۔ لیکن عربی میں اس کے دو مفہوم ہیں جن میں سے ایک کو اُردو میں بالکل نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔

مَیں نے بتایا تھا کہ اس آیت میں نیکی کی جڑوں کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ کون کون سی نیکیاں ہیں جن کے چھوڑنے سے بدیوں کا دروازہ کھل جاتا ہے اور کون کون سی نیکیاں ہیں جن کو اختیار کرنے سے مزید نیکیوں پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ پس مِلّۃ کے اقرار سے اِس آیت میں (مَیں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس آیت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ دین کا انکار فطرت کے خلاف ہے۔ ایسا شخص وہی ہو سکتا ہے جو فطرت کو بھول جائے پس اِس آیت میں دین کی ضرورت پر زور ہے) اِس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان کی فطرتِ صحیحہ اُسے قومی خدمت کی طرف راغب کرتی ہے اور جو شخص قومی خدمت کی ضرورت کو محسوس کرے گا وہ لازماً انفرادی ضرورتوں کو مقدّم کرنے والے شخص سے بہت زیادہ نیک کام کرے گا۔ بے شک انفرادی حقوق بھی ہوتے ہیں لیکن ایک وقت ایسا بھی آ جاتا ہے جب اُن پر زور دینا گناہ کا موجب ہوتا ہے۔ مثلاً بدلہ لینا ہے۔ عیسائیت کہتی ہے بدلہ نہ لے۔ مگر مسیحی جب یہ تعلیم پیش کرتے ہیں تو وہ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ کیونکہ مسیحیوں سے زیادہ بدلہ آج تک دنیا میں کسی قوم نے نہیں لیا۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ موقع ہو تو بدلہ لے نہ ہو تو نہ لے۔ اگر تمہیں اِس بات میں دنیا یا ظالم کا فائدہ نظر آتا ہے کہ بدلہ لو تو بدلہ لو ورنہ بدلہ نہ لو۔ اصل مقصد تو نیکی کا پھیلانا ہے اگر بدلہ لینے سے نیکی پھیلتی ہو تو بدلہ لو۔ اگر بدلہ نہ لینے سے نیکی پھیلتی ہو تو بدلہ نہ لو۔ یہ ہے اسلام کی تعلیم۔ عربوں میں تعصب بہت تھا یعنی قومی خدمت اور قوم کے لئے قربانی کا احساس اُن میں بہت زیادہ تھا۔ لیکن بعض دفعہ غلط طریق پر چل کر وہ اِسے انتہا تک لے جاتے تھے اور یہ فعل نیکی نہیں بلکہ بدی بن جاتا تھا۔ چنانچہ بعض دفعہ غریب یا مسکین کی حمایت کے نام سے اُنہوں نے جنگیں کی ہیں جو سَو سَو سال تک بھی چلی گئی ہیں۔ مثلاً ایک عرب کے کھیت میں ایک کُتیا نے بچے دیدئے کسی عرب کا اُونٹ کھل کر اُس کھیت میں چلا گیا اور اُسکے پاؤں تلے ایک بچہ کُتیا کا مر گیا کھیت والے نے سمجھا کہ کتیا نے میرے کھیت میں پناہ لی تھی اُس کا بچہ مارا گیا ہے اِس لئے مجھے بدلہ لینا چاہیئے اس نے اُس اونٹ کو مار دیا۔ جس کا اُونٹ تھا وہ ایک اَور عرب کا مہمان تھا اُس عرب نے کہا کہ چونکہ میرے مہمان کا اونٹ مارا گیا ہے اِس لئے اُس کا بدلہ لینا میرا فرض ہے اس لئے اس اُونٹ

مارنے والے عرب کو مار دیا۔ اس مقتول کی قوم نے اپنے بھائی کا بدلہ لینے کے لئے اجتماع کیا جس پر قاتل کی قوم نے اپنے بھائی کی مدد کا فیصلہ کیا اور باہم جنگ شروع ہو گئی جس میں آہستہ آہستہ دوسری اقوام بھی شامل ہوتی گئیں اور سارے عرب میں سو سال تک جنگ ہوتی رہی جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے عرب پر حکومت عطا فرمائی تو اُس وقت تک ہزاروں انسانوں کا خون اسی قسم کے لغو بدلوں میں لیا جا چکا تھا اور سینکڑوں انسان ایسے تھے جن کے خون کا بدلہ ابھی لیا جانے والا تھا۔ اس لئے اس فتنہ کو ختم کرنے کے لئے آپ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر ایک وعظ فرمایا جس میں اَور باتوں کے علاوہ آپ نے ایک یہ بات بھی بیان فرمائی کہ دیکھو عرب میں بعض قبائل کے بعض قبائل پر خون کے حق قائم ہیں کیونکہ انہوں نے اُن کے آدمی مار ڈالے تھے۔ مگر کبھی نہ کبھی یہ چیز ختم ہونی چاہئے ورنہ عرب کی طاقت بالکل ٹوٹ جائے گی۔ اس لئے میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ آئندہ ہر خون کا بدلہ لینے کی حکومت ذمہ دار ہوگی افراد کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ خود بخود کسی قتل کا بدلہ لیں۔ باقی رہے پچھلے خون سو آج میں اُن سارے خونوں کو معاف کرتا ہوں اب کسی کا کوئی حق نہیں کہ وہ اُن میں سے کسی خون کا بدلہ لے۔ اس پر سب لوگ تسلی پا گئے اور امن قائم ہو گیا۔ ورنہ اگر وہ خون باقی رہتے تو اسلامی زمانہ میں بھی خونریزی کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قومی خدمت کے غلط جذبہ کو ایک نیک رَو سے بدل دیا اور بتایا کہ یہ قومی خدمت نہیں قوم کی تباہی کی صورت ہے اور اس طرح قومی خدمت کا صحیح جذبہ پیدا کر کے عرب کو ایک بلاءِ عظیم سے نجات دلوا دی۔

میں نے اس سے پہلے دین کے معنوں میں ضبط کا ذکر کیا تھا۔ ضبط اور چیز ہے اور خدمتِ ملی کا احساس اور چیز ہے۔ ضبط و نظام ظاہر پر دلالت کرتا ہے تم بائیں طرف چلتے ہو تو اس سے نہیں کہ تمہارا دل بائیں طرف چلنے کو چاہتا ہے بالکل ممکن ہے تمہارا دل دائیں طرف چلنے کو چاہے مگر تم کہتے ہو میں قوم کا حکم مانتے ہوئے بائیں طرف چلوں گا۔ لیکن قومی خدمت کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ اگر فرد یہ دیکھے کہ قوم اُس کی ہلاکت اور بربادی سے بچ سکتی ہے تو وہ بلا دریغ اپنے آپ کو قربان کر دے۔ ضبط و نظم میں حکم کی اطاعت کا سوال ہوتا ہے لیکن ملکی یا قومی جذبہ میں حکم کوئی نہیں ہوتا تم خود قوم کا فکر رکھتے ہو، تم خود ملک کی ترقی کا احساس رکھتے ہو اور جب تمہیں قومی یا ملکی برتری کا احساس مجبور کرتا ہے تم اپنے آپ کو ملک اور قوم کے لئے قربان کر دیتے ہو۔ گذشتہ جنگِ عظیم میں جاپانی فوج کے راستہ میں ایک جگہ بجلی کی تاروں کی باڑ لگا دی گئی تھی جس کی وجہ سے اُن کی فوج آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ انہوں نے بڑا زور لگایا کہ کسی طرح اُس کو دور کریں مگر ناکام رہے۔ آخر جاپان کے کچھ نوجوان اپنے آپ کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے وہ اپنے پیٹوں سے بم باندھ کر اُس تار پر گر گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تو تباہ ہو گئے مگر بجلی کی تار بھی ٹکڑے ہو گئی اور فوج کے لئے راستہ بن گیا۔ اُنہیں حکم نہیں تھا کہ تم ایسا کرو مگر چونکہ وہ دیکھتے تھے کہ اگر حالت اسی طرح رہی تو ہماری فوج وقت پر آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ اس لئے وہ اُن کو بچانے کے لئے اپنے آپ کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ میں اس جگہ اس سوال پر بحث نہیں کر رہا کہ یہ طریق قربانی کا اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔ میں یہ بتا رہا ہوں کہ قومی خدمت کے لئے قربانی اور ضبط و نظم کے لئے قربانی الگ الگ اقسام کی ہیں۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد جب عیسائیوں نے لڑائی شروع ہوئی تو شام میں ایک موقع پر دشمن کا

ایک بڑا بھاری لشکر جمع ہو گیا۔ مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ عیسائیوں نے پہلے مخفی طور پر یہ پتہ کرایا کہ مسلمانوں میں صحابی کون کون سے ہیں اور پھر انہوں نے اپنے کچھ تیرانداز ایک ٹیلے پر بٹھا دیئے اور انہیں ہدایت کر دی کہ وہ اپنے تیروں کا خصوصیت سے صحابہؓ کو نشانہ بنائیں۔ وہ جانتے تھے کہ جب بڑے بڑے لوگ مارے گئے تو باقی فوج کے دل خود بخود ٹوٹ جائیں گے اور وہ میدان سے بھاگ جائے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی صحابہؓ مارے گئے اور کئی کی آنکھیں ضائع ہو گئیں۔ اس پر مسلمانوں کو سخت فکر پیدا ہوا اور انہوں نے سمجھا کہ اگر اب ہم آگے بڑھے تو تمام کے تمام صحابہؓ ختم ہو جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ اس پر بعض نوجوانوں نے اپنی خدمات پیش کیں اور کہا کہ ہم اپنے آپ کو قربان کرنے کے لئے تیار ہیں اور ان خدمات کے پیش کرنے میں سب سے مقدم وہ نوجوان تھا جس کے خاندان نے اسلام کی دشمنی کا بیج مکہ میں بویا تھا یعنی ابوجہل کا بیٹا عکرمہ۔ ان نوجوانوں نے کہا کہ صحابہؓ بہت بڑی خدمات کر چکے ہیں اب ہم جو بعد میں آئے ہیں ہمیں ثواب حاصل کرنے کا موقع دیا جائے۔ ہم مل کر قلب لشکر پر حملہ کریں گے اور عیسائی جرنیلوں کو مار ڈالیں گے۔ حضرت ابوعبیدہ جو لشکر کے کمانڈر تھے انہوں نے کہا یہ تو بڑے خطرے کی بات ہے اس طرح تو جس قدر نوجوان جائیں گے سب کے سب موت کے گھاٹ اتر جائیں گے۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے مگر اس کے سوا اب چارہ بھی کوئی نہیں۔ کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ ہم نوجوان تو بچ رہیں اور صحابہؓ مارے جائیں؟ اس پر انہوں نے حضرت خالدؓ سے مشورہ لیا انہوں نے بھی کہا کہ عکرمہ کی رائے ٹھیک ہے دشمن نے ہماری کمزوری کو معلوم کر لیا ہے اور اب وہ صحابہ کو ختم کرنا چاہتا ہے ہمیں اجازت دی جائے کہ ہم ساٹھ نوجوان اپنے ساتھ لیں اور قلب لشکر پر حملہ کر دیں۔ آخر حضرت ابوعبیدہ نے اُن کے اصرار پر اجازت دے دی اور ساٹھ نوجوانوں نے قلب لشکر پر حملہ کر کے اُسے شکست دے دی لیکن اس لڑائی میں ان میں سے اکثر نوجوان مارے گئے۔ ایک صحابی ذکر کرتے ہیں کہ جب عیسائی لشکر کو شکست ہو گئی اور وہ سب بھاگ گئے تو میں زخمیوں کی دیکھ بھال کیلئے میدانِ جنگ میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ عکرمہؓ بن ابی جہل ایک جگہ زخمی تڑپ رہے تھے میں نے دیکھا اور سمجھا کہ انہیں سخت پیاس لگی ہوئی ہے۔ پانی کی چھاگل میرے پاس تھی میں آگے بڑھا تاکہ چھاگل اُن کے مُنہ سے لگاؤں مگر ابھی میں نے یہ ارادہ ہی کیا تھا کہ عکرمہ نے فضل بن عباسؓ کی طرف اشارہ کیا جو اُن کے پہلو میں پڑے زخموں سے تڑپ رہے تھے اور کہا کہ انہیں مجھ سے زیادہ پیاس معلوم ہوتی ہے تم جاؤ اور پہلے فضل کو پانی پلاؤ وہ مجھ سے زیادہ حقدار ہیں۔ وہ کہتے ہیں میں پانی پلانے کے لئے فضل کی طرف گیا تو انہوں نے ایک اور شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو اُن کے قریب ہی زخموں سے تڑپ رہا تھا کہا کہ پہلے اسے پانی پلاؤ اُسے مجھ سے بھی زیادہ پیاس معلوم ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں اُس وقت دس زخمی مسلمان قریب قریب پڑے ہوتے تھے میں ایک سے دوسرے کے پاس اور دوسرے سے تیسرے کے پاس اور تیسرے سے چوتھے کے پاس گیا مگر ہر شخص نے مجھے یہی کہا کہ دوسرے کو پانی پلاؤ وہ مجھ سے زیادہ حقدار ہے۔ جب میں آخری کے پاس پہنچا تو وہ مرچکا تھا۔ پھر واپس لوٹا تو نواں شخص بھی مرچکا تھا۔ پھر آٹھویں کی طرف بڑھا تو وہ بھی مرچکا تھا۔ اس طرح ایک ایک کر کے سب کو میں نے دیکھا کہ وہ فوت ہو چکے ہیں۔ پانی کی چھاگل میرے ہاتھ میں تھی،

مرنے والے مرچکے تھے مگر مرتے وقت اُن میں سے کسی
ایک نے بھی پانی کا ایک گھونٹ نہ پیا محض اس لئے
کہ میرا ساتھی مجھ سے زیادہ پیاسا معلوم ہوتا ہے یہ کر
قومی روح یعنی اپنے نفس کو مقدم کرنے کی بجائے قومی
ضرورتوں کو انسان مقدم رکھے اور اپنے آپ کو قومی
مفاد اور برتری کے لئے قربان کر دے مگر قومی ایثار
کا صحیح جذبہ جب بھی پیدا ہوگا قومی خدمت سے
پیدا ہوگا۔ جب قومی خدمت کا صحیح جذبہ کسی انسان
کے دل میں پیدا ہو جائے تو وہ بے انتہاء قربانیاں
کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ جس شخص کے اندر
قومی جذبہ پیدا ہوگا اس کا مطمح نظر وسیع ہو جائیگا۔
ایک کمزور سے کمزور اور جاہل سے جاہل انسان کو بھی
جاکر دیکھو اُس کی قوتِ فکر اتنی مری ہوئی نہیں ہوتی
جتنی لوگ سمجھتے ہیں۔ جاہل سے جاہل ماں بھی بچے کا
کتنا فکر کرتی ہے اُس کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورتوں کا
وہ خیال رکھتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ اُسے کوئی
تکلیف نہ ہو۔ گاؤں میں غریب سے غریب گھر والوں میں
چلے جاؤ جب شادی بیاہ کا موقعہ آئیگا عورت اپنے
پٹارے میں سے کوئی کپڑا نکالے گی اور لڑکی کے جہیز
میں رکھ دیگی اور جب اُس سے پوچھو کہ یہ کپڑا تم
نے کب خریدا تھا تو وہ کہے گی دس سال ہوئے میں
نے یہ کپڑا خریدا تھا پھر اس لئے رکھ دیا کہ بچی کی
شادی کے وقت کام آئے گا۔ اگر اس میں عقل نہیں
تھی تو اُس نے اتنی لمبی باتیں کس طرح سوچ لیں۔
پھر بیسیوں دفعہ خاوند کے پاس معاملہ ادا کرنے
کے لئے روپیہ نہیں ہوتا تو عورت اپنی پوٹلی میں سے
روپیہ نکال کر اُسے دے دیتی ہے اور جب اُس سے
پوچھا جائے کہ یہ روپیہ تم نے کہاں سے لیا تو وہ بتاتی ہے
کہ پیسہ پیسہ کر کے میں جمع کرتی چلی گئی تھی تاکہ
ضرورت کے وقت کام آئے۔ وہ ایسا کیوں کرتی ہے
اسی لئے کہ اُس کے اندر عائلی جذبہ ہوتا ہے جو اُسے
سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے اور جب وہ سوچتی ہے تو
اُسے مشکلات نظر آتی ہیں پھر وہ اُن مشکلات کے علاج
پر غور کرتی ہے اور آخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی
ہے۔ اسی طرح ہر شخص اپنے بچے کے متعلق ضرور کچھ نہ
کچھ سوچ رہا ہوتا ہے میں اُسے کس طرح تعلیم دلاؤنگا
کس طرح اُس کے کپڑوں اور کھانے کا انتظام کرونگا
اس بارہ میں کیا کیا مشکلات پیش آئیں گی اور اُن کو
کس طرح دُور کیا جاسکے گا۔ اگر اسی قوتِ فکر کو قومی
بنا دو تو ہر انسان قومی ضروریات کے متعلق سوچ
رہا ہوگا اور وہی جاہل انسان جس کے متعلق تم سمجھتے ہو
کہ وہ کسی کام کا نہیں جب اُسے ان باتوں کے سوچنے
پر لگا دوگے تو اُس کی نظر وسیع ہو جائے گی۔
درحقیقت ہم جس شخص کو جاہل کہتے ہیں قومی نقطۂ نگاہ
سے اُس کے صرف اتنے معنے ہوتے ہیں کہ اُس کے
دماغ کو سوچنے کی طرف توجہ نہیں۔ یہ معنے نہیں ہوتے
کہ وہ سوچ نہیں سکتا۔ میں نے احمدیہ جماعت کی مجلس
شوریٰ میں دیکھا ہے اور میرا بیس پچیس سال کی مجلس
شوریٰ کا یہ تجربہ ہے کہ بسا اوقات کسی فیصلہ کی
پوری زنجیر اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک
ایک عام آدمی کی رائے بھی اُس کے ساتھ نہ ملالی جائے
سو میں سے صرف ایک دفعہ مجھے اپنے طور پر فیصلہ
کرنا پڑتا ہے ورنہ ننانوے دفعہ میں فیصلہ اسی طرح
کرتا ہوں کہ کچھ اِس کی رائے میں سے لیا اور کچھ
اُس کی رائے میں سے، اور ایک نتیجہ پیدا کر لیا۔
اگر ہم عوام کو مجلس مشاورت میں شامل نہ کرتے
تو وہ بھی صرف اپنے گھر کی ضروریات کے متعلق ہی
اپنے دماغوں سے کام لینے کے عادی ہوتے۔ لیکن
جب ہم نے اُن کو اپنی مشاورت میں شامل کر لیا
تو اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اُن کے دماغ ترقی کر گئے

چنانچہ اُن کی آراء کے ٹکڑے ٹکڑے مل کر ایک مکمل سکیم بن جاتی ہے جو جماعت کیلئے نہایت مفید اور بابرکت ثابت ہوتی ہے۔ غرض جس طرح فرد اپنی ضرورتوں کے متعلق سوچکر سکیم بنالیتا ہے اسی طرح اگر اُس کا دماغ قومی ضرورتوں کی طرف منتقل کر دیا جائے تو ہر فرد قومی ضرورتوں کے متعلق سوچنے لگ جائے اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے ہر شخص اس کی قابلیت رکھتا ہے جنگل میں رہنے والا ہو یا پہاڑ پر رہنے والا، گاؤں میں رہنے والا ہو یا شہر میں رہنے والا، ہر شخص پاکستان کے مستقبل کے متعلق بھی سوچ سکتا ہے فلسطین کے مستقبل کے متعلق بھی سوچ سکتا ہے۔ اسی طرح دنیا کے ہر سیاسی مسئلہ کے متعلق سوچ سکتا ہے نقص یہ ہے کہ اُسے یہ احساس نہیں کرایا گیا کہ تم پر قوم کے متعلق ذمہ واری ہے اس لئے وہ یہ تو کرتا ہے کہ کبھی اپنی بیوی کے متعلق سوچتا ہے کبھی اپنی لڑکی کے متعلق سوچتا ہے کبھی اپنے لڑکوں کے متعلق سوچتا ہے کبھی اپنے رشتہ داروں کے متعلق سوچتا ہے مگر وہ اپنے ملک اور اپنی قوم اور اپنے مذہب کے متعلق کبھی نہیں سوچتا۔ اس لئے نہیں کہ وہ سوچ نہیں سکتا بلکہ اس لئے کہ وہ اس کا عادی نہیں اگر قومی جذبہ پیدا ہو جائے تو ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی کچھ نہ کچھ سکیمیں سوچنے لگ جائے گا اور اگر قومی جذبہ پیدا نہیں ہوگا تو عام لوگ تو الگ رہے پڑھے لکھے بھی اپنی قوم سے غافل رہیں گے۔ نہ انہیں اپنی قوم کے نقائص کا پتہ ہوگا نہ اُس کے علاج کا فکر ہوگا اور سارا نظام ڈھیلا ہو جائے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس نکتہ کو سمجھا نہیں گیا کہ جس طرح فرد کا دماغ ہے اسی طرح قوم کا بھی دماغ ہے۔ قوم کا دماغ ایک غیر مادی اور روحانی چیز ہے مگر اس سے زیادہ یقینی اور پختہ چیز اور کوئی نہیں جب کسی قوم کے افراد میں جذبۂ ملت پیدا ہو جاتا ہے تو تمام افراد قومی ضرورتوں کے متعلق سوچنے لگ جاتے ہیں اور قومی ضرورتوں کے متعلق سوچنے اور غور و فکر کرنے کے نتیجہ میں قومی رُوح پیدا ہو جاتی ہے اور قومی روح سے قومی دماغ پیدا ہوتا ہے جو نظر تو نہیں آتا مگر وہ ایک ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

جس قوم میں قومی دماغ پیدا ہو جاتا ہے وہ باوجود افراد کے علم کی کمی کے جیت جاتی ہے اور جس قوم میں قومی دماغ پیدا نہیں ہوتا وہ باوجود افراد کی علمیت کے ہار جاتی ہے۔ جس طرح فرد حکومت کا قائم مقام نہیں ہو سکتا اسی طرح فردی دماغ قومی دماغ کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔

گذشتہ دنوں میں ملک میں جو فساد ہوا اُس میں انفرادی طور پر کچھ مسلمانوں نے بھی اپنے بچاؤ کی تدبیریں کی تھیں مگر قومی طور پر انہوں نے کوئی تدبیر نہیں کی تھی بعض شہروں نے بے شک بعض تدابیر اختیار کی تھیں جیسے امرتسر ہے مگر شہر بھی ایک ملک کے مقابلہ میں فرد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ایسی بُری طرح پٹے کہ جس کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ سکھ مشرقی پنجاب میں بائیس ۲۲ فیصدی تھے اور مسلمان چالیس ۴۰ فیصدی۔ مگر بائیس ۲۲ فیصدی نے چالیس فیصدی کو مارا اور ایسی بُری طرح مارا کہ انہیں ایک قدم بھی نکلنے نہیں دیا۔ اسی وجہ سے کہ سکھوں میں قومی دماغ تھا مگر مسلمانوں میں صرف انفرادی دماغ تھا قومی دماغ نہیں تھا۔ جب تک قومی دماغ نہ ہو اُس وقت تک بڑے بڑے مصائب کا مقابلہ کبھی نہیں کیا جا سکتا اور نہ کوئی بڑی ترقی کی جا سکتی ہے۔ جس طرح انسانی جسم میں ہزاروں ہزار پیچیدہ کام کرنے والے اعضاء پائے جاتے ہیں۔ دانت چباتے ہیں۔ گلے کی نالیوں کے ذریعہ غذا معدہ میں پہنچتی ہے معدہ اُس کو ہضم کرتا ہے اور پھر اعلیٰ درجے کا خون دل اور دماغ اور دوسرے اعضاء میں جاتا اور انسانی زندگی کو برقرار رکھتا ہے اسی طرح ان سے بھی زیادہ ایک اور اہم چیز جسم انسانی میں پائی جاتی ہے اور وہ روح ہے جس پر تمام حیات کا

دار و مدار ہے اور جس کے متعلق سائنسدان بھی ابھی تک یہ معلوم نہیں کر سکے کہ وہ کیا چیز ہے۔ بہرحال وہ ایک خلاصہ ہے ہزار وں ہزار پیچیدہ تغیرات کا بے شک وہ ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتی، بے شک دُنیا یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ جسم انسانی کے کون سے عضو میں پوشیدہ ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی چیز ایسی ضرور ہے جس کی عدم موجودگی انسانی جسم کو بالکل بیکار بنا دیتی ہے۔ جب انسان مر جاتا ہے تو اُس کے جسم کی سب چیزیں موجود ہوتی ہیں کہیں غائب نہیں ہو جاتیں۔ دل بھی ہوتا ہے، دماغ بھی ہوتا ہے، معدہ اور جگر اور انتڑیاں بھی ہوتی ہیں، ہاتھ اور پاؤں بھی ہوتے ہیں مگر دل اور اعصاب کا تمام نظام یکدم بے کار ہو جاتا ہے۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ کوئی اور چیز انسانی جسم میں ضرور ہے۔ وہ انگلی میں ہے یا بازو میں، دل میں ہے یا دماغ میں، ہمیں اس کا علم نہیں مگر اُس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح انسانی جسم میں رُوح موجود ہوتی ہے اور اُسی پر تمام حیات کا دار و مدار ہوتا ہے اِسی طرح ایک قومی روح بھی ہوتی ہے اور ایک قومی دماغ بھی ہوتا ہے جب تک کسی قوم میں قومی دماغ قائم رہتا ہے وہ تمام اقوام پر غالب رہتی ہے اور کوئی قوم اُس کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتی۔ انگریزوں کو لے لو اُن میں قومی دماغ ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ دوسری اقوام پر غالب رہتے ہیں۔ جرمن طنزاً کہا کرتے ہیں کہ انگریز بڑا جاہل ہے وہ اچھے عالم پیدا نہیں کر سکتا۔ فرانسیسی طنزاً کہا کرتا ہے کہ انگریز صرف نقّال ہے وہ مُوجد پیدا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جہاں تک انفرادی ایجادات کا تعلق ہے انگریز جرمنوں کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتے فلسفہ کا سوال آتے تو یقیناً انگریز جرمن کا خوشہ چین ہے۔ ادب اور اخلاق کا سوال آئے تو یقیناً انگریز فرانس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آرٹ میں بھی فرانس اور اٹلی کا مقابلہ انگریزوں کے بس کی بات نہیں۔ مگر باوجود اس کے کہ جرمن اور اٹلی اور فرانس والوں کا انفرادی دماغ بہت اعلیٰ ہے پھر بھی قومی لحاظ سے انگریز ہمیشہ غالب رہتے ہیں۔ اس لئے کہ گو انگریزوں کا انفرادی دماغ اتنا اعلیٰ نہیں مگر قومی دماغ اُن میں پایا جاتا ہے اور اس وجہ سے وہ ہمیشہ غالب رہتے ہیں۔ ابتدائے زمانہ اسلام میں مسلمانوں کو جو غلبہ حاصل ہؤا اُس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اُن میں قومی دماغ پایا جاتا تھا۔ ورنہ مسلمانوں کی تعلیم رومیوں سے زیادہ نہیں تھی۔ رومی سالوں تک مسلمانوں کو پڑھا سکتے تھے۔ اسی طرح جہاں تک تجارت یا تمدّن کا تعلق ہے مسلمان ایرانیوں سے بہت پیچھے تھے یہی حال دوسرے امور کا ہے۔ مذہب کو چھوڑ کر کوئی ایک فردی خوبی بھی ایسی نہیں تھی جس میں مسلمان رومیوں اور ایرانیوں کا مقابلہ کر سکیں مگر پھر بھی یہ حالت تھی کہ مسلمان جہاں جاتا رومی بھی بھاگ جاتا اور ایرانی بھی بھاگ جاتا۔ آخر وہ کیا چیز تھی جو مسلمانوں کو حاصل تھی۔ وہ چیز یہی تھی کہ اسلام کے ذریعہ سے مسلمانوں میں قومی دماغ پیدا ہو چکا تھا اور قومی دماغ کا فردی دماغ مقابلہ نہیں کر سکتا۔ قومی دماغ کا یہ مفہوم ہوتا ہے کہ قوم کے ہر فرد میں یہ احساس ہوتا ہے کہ مَیں کچھ چیز نہیں اصل چیز قوم ہے۔ چنانچہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے صحابہؓ نے جو کچھ قربانیاں کیں وہ اِس بات کا ایک بیّن ثبوت ہیں کہ کس طرح وہ ہر چیز میں قوم کے مفاد کو مدِّ نظر رکھتے تھے۔ دراصل محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات فرد نہیں تھی بلکہ وہ ایک نشان تھی قومی عظمت کا۔ اِس لئے آپ کے لئے جو قربانیاں کی گئیں وہ فرد کے لئے نہیں تھیں بلکہ قوم کے لئے ہی تھیں۔ اُن کی قربانیوں کا اندازہ اِسی واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک جنگ میں دشمن کی طرف سے تیروں کی بوچھاڑ

ہو رہی تھی کہ حضرت طلحہؓ نے اپنا ہاتھ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کے سامنے کر دیا تاکہ کوئی تیر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نہ آلگے اور انہوں نے اپنا ہاتھ برابر اسی طرح رکھا یہاں تک کہ اُن کا ہاتھ شل ہو گیا اور ساری عمر کے لئے بیکار ہو گیا۔ کیا جذبۂ ایمان تھا کہ انہوں نے اُف تک نہ کی اور اپنے ہاتھ کو برابر تیروں کی بوچھاڑ میں کھڑے رکھا۔ ایک دفعہ حضرت طلحہؓ سے کسی نے پوچھا کہ طلحہ جب تمہارے ہاتھ پر تیر لگتے تھے تو کیا تمہارے مُنہ سے اُف بھی نہیں نکلتی تھی؟ انہوں نے جواب دیا کہ اُف تو نکلنا چاہتی تھی مگر میں نکلنے نہیں دیتا تھا کیونکہ میں ڈرتا تھا کہ کہیں میرا ہاتھ ہل نہ جائے اور کوئی تیر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نہ آلگے۔ یہ واقعہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم میں کوئی فرد باقی نہیں رہا ہمارا صرف یہی کام ہے کہ ہم قوم کے لئے یا قوم کے نشان محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے رات اور دن قربانیاں کریں اور اپنے آپ کو اسی راہ میں قربان کر دیں۔

اُحد کی جنگ جب ختم ہوئی تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو زخمیوں کی دیکھ بھال کے لئے روانہ کیا انہوں نے ایک انصاری صحابی کو دیکھا کہ وہ سخت نازک حالت میں ہیں۔ وہ اُس کے قریب گئے اور اُس سے کہا کہ بھائی کوئی تمہارا پیغام ہو تو مجھے بتا دو میں تمہارے عزیزوں اور رشتہ داروں تک پہنچا دوں گا۔ اُس نے کہا میں اسی تلاش میں تھا کہ مجھے کوئی دینے والا ملے اور میں اُس کے ذریعہ اپنے رشتہ داروں کو ایک پیغام بھجواؤں۔ اچھا ہُوا کہ تم مجھے مل گئے لاؤ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو اور وعدہ کرو کہ میرا پیغام میرے خاندان تک پہنچا دو گے۔ انہوں نے ہاتھ میں ہاتھ رکھ کر اقرار کیا کہ میں تمہارا پیغام ضرور پہنچا دوں گا۔ اس پر اُن زخمی صحابی نے کہا میرے عزیزوں اور رشتہ داروں اور بھائی بندوں کو جا کر کہہ دینا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری قوم کا بہترین خزانہ ہیں اور یہ ایک قیمتی امانت ہیں جو ہمارے پاس ہے مجھے یقین ہے کہ تمہارے دل میں بھی اس قیمتی متاع کی صحیح قدر و قیمت کا احساس ہو گا تاہم میں بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ یہ پیغام تمہیں پہنچا دوں کہ جب تک ہم زندہ رہے ہم نے اس امانت میں خیانت نہیں ہونے دی اور اس کی حفاظت میں اپنا پورا زور صرف کر دیا۔ اب ہم مرنے لگے ہیں اور اپنے پیچھے اس امانت کو چھوڑے جا رہے ہیں میں اپنے تمام بیٹوں، بھائیوں اور اُن کی اولاد سے یہ امید کرتا ہوں کہ وہ اپنی جان سے بھی زیادہ اس مقدس امانت کی حفاظت کریں گے۔ اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی واقع نہیں ہونے دیں گے۔

مرنے والا مرتا ہے تو کس طرح کبھی اُسے اپنی بیوی کا خیال آتا ہے کبھی اپنے بچوں کا خیال آتا ہے۔ وہ اگر کچھ بتاتا بھی ہے تو یہ کہ فلاں سے میں نے اتنا روپیہ لینا ہے۔ فلاں کو اتنا قرض دینا ہے۔ بچوں کی اس طرح تربیت کی جائے۔ بیوی کے گذارے کا یہ انتظام کیا جائے۔ مگر وہ صحابی مرتے وقت بھی اگر خیال کرتا ہے تو اپنی قوم کا بلکہ نوع انسانی کا۔ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں اپنی قوم ہی کی نہیں بلکہ نوع بشر کی روح کو سمٹا ہُوا پاتا ہے اور اُس کی قومی روح انفرادی حقوق کو بھول جاتی ہے، وہ صرف قوم اور اس کے مظہر کو دیکھتا ہے اور مرتے ہوئے اپنے باقیماندہ خاندان کو زندہ رہنے کی نہیں بلکہ مرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اپنا حصہ لینے کی نہیں بلکہ اپنا حصہ قربان کرنے کی وصیت کرتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ فرد اور خاندان کی عزت اور بچاؤ قوم کی عزت اور بچاؤ کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ رُوح اگر اب بھی مسلمانوں میں پیدا ہو جائے تو اُن کا مقابلہ نہ سکھ کر سکتے ہیں اور نہ ہندو کر سکتے ہیں۔

مسلمان یُوں تو سکھوں پر ہمیشہ پھبتی اُڑاتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سکھ بڑی بیوقوف قوم ہے لیکن سکھ میں قومی دماغ ہے جس سے مسلمان ابھی تک محروم ہے اور یہی وجہ ہے کہ قلیل التعداد ہونے کے باوجود مشرقی پنجاب میں سکھ جیت گیا اور مسلمان ہار گیا۔ غرض قومی دماغ بڑی قیمتی چیز ہوتی ہے اور جب کسی قوم میں یہ دماغ پیدا ہو جائے تو اُس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ ہر فرد قومی بہتری کے متعلق سوچتا اور غور و فکر کرتا ہے۔ جہاں بھی دو چار افراد مجلس میں بیٹھتے ہیں وہ یہی باتیں کرتے ہیں کہ ہماری قوم میں فلاں کمزوری ہے اور اُس کا یہ علاج ہے فلاں نقص ہے اور اُس کا یہ علاج ہے۔ پھر ایک محلہ کے لوگ دوسرے محلہ والوں سے ملتے ہیں تو وہاں بھی یہی ذکر کرتے ہیں۔ تیسرے محلہ والوں سے ملتے ہیں تو اُن سے بھی یہی ذکر کرتے ہیں۔ پھر ایک شہر کے لوگ جب دوسرے شہر والوں سے ملتے ہیں تو وہ بھی یہی قومی تذکرہ کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دماغوں میں ایک اشتراک پیدا ہو جاتا ہے اور قوم کے اندر ایک ایسی روح پیدا ہو جاتی ہے کہ سب کی نظر صرف ایک ہی جہت کی طرف اُٹھتی ہے۔ ہندوؤں میں یہی سپرٹ تھی جس نے انہیں کامیاب کیا۔ ادنیٰ سے ادنیٰ ہندو بھی اگر کوئی شکایت کرتا تو بڑے سے بڑا افسر بھی جب درخواست کے پیچھے مثلاً دیوی چند کا نام لکھا ہوا دیکھتا تو وہ کہتا کہ جو کچھ دیوی چند کہہ رہا ہے ٹھیک ہے۔ اِس کے مقابلہ میں اگر ایک مسلمان افسر بھی کوئی شکایت کرتا تو وہ سمجھتے کہ یہ غلط ہے مسلمان جھوٹ بول رہا ہے اور ہندو سچ بول رہا ہے۔ دوسری طرف مسلمان افسروں کی یہ حالت تھی کہ اگر ہندو اور مسلمان کا جھگڑا اُن کے پاس پہنچتا تو وہ بھی ہندو کی تائید کرتے تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ یہ مسلمان بڑا انصاف پسند ہے حالانکہ وہ جو کچھ کرتا انصاف اور اسلام کے بالکل خلاف ہوتا تھا۔ محض اِس لئے کہ ہندو اُس کی تعریف کریں وہ مسلمان کے خلاف چلتا اور پھر اِس کا نام انصاف رکھتا۔ یہ نتیجہ تھا اِس بات کا کہ مسلمانوں کے اندر قومی روح نہیں تھی۔ چنانچہ جب گذشتہ مصیبت آئی وہ بُری طرح شکست کھا کر بھاگے کیونکہ قومی مصیبت کے وقت فردی دماغ کام نہیں دیتا بلکہ قومی دماغ کام دیتا ہے اور قومی دماغ اُسی وقت پیدا ہوتا ہے جب سب افراد کے دماغ ایک ہی جہت پر کام کر رہے ہوں۔

اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اِس آیت میں فرماتا ہے اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ مجھے بتاؤ تو سہی کہ وہ کون ہے جو قومی خدمت کے جذبہ سے منکر ہے؟ اگر کوئی ایسا ہے تو وہ ضرور تباہ ہوگا۔ اِس سے اِس طرف اشارہ کیا ہے کہ مکہ والوں میں اور دوسرے غیر عربوں میں صحیح قومی خدمت کا جذبہ نہیں اِس لئے اُن کا اتحاد عارضی ثابت ہوگا۔ خود انکی قوم سے غدار پیدا ہوتے رہیں گے لیکن مسلمانوں میں قومی خدمت کا جذبہ ہے اِس لئے اُن میں قومی دماغ پیدا ہے اور بوجہ قومی دماغ کے انکا غریب اور امیر ایک سلک میں پرویا ہوا ہے۔ وہ سب کے سب ایک مقصد سامنے رکھتے ہیں جس کو ذاتی مقاصد پر قربان کرنے کے لئے وہ کسی قیمت پر بھی تیار نہیں اِس لئے لازماً مسلمان جیتیں گے اور اُن کے دشمن ہاریں گے

دِین کے آٹھویں معنے وَرَع کے

(۸) آٹھویں معنے دِین کے وَرَع کے ہیں۔ وَرَع کے معنے شبہات سے محفوظ رہنے کی کوشش کے ہیں یعنی وہ چیزیں جو ناپسندیدہ اور بُری ہیں اُن سے احتراز کرے اور اُن سے محفوظ رہنے کی خواہش رکھے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسانی نفس کی تین حالتیں ہوتی ہیں۔ ایک حالت نفسِ امّارہ کی کی ہوتی ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ کہہ کر اشارہ فرمایا ہے یعنی نفس

کی وہ حالت جس میں وہ بدیوں کا حکم دیتا ہے اور انسان بدیوں کا ایسا عادی ہو جاتا ہے کہ وہ گناہ اور عیب کو پسند کرنے لگ جاتا ہے۔ اور ایک حالت نفس کی نفس مطمئنۃ ہوتی ہے یعنی وہ نفس اپنی حالت پر خوش ہو جاتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ میرا وجود خدا تعالیٰ کے خاص منشاء کے ماتحت بعض مخصوص اغراض اور مقاصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور جو سامان خدا تعالیٰ نے میرے لئے پیدا کئے ہیں وہ بہرحال میرے لئے مناسب حال ہیں گویا وہ اپنی حالت پر مطمئن ہو جاتا ہے۔ مجنون کی طرح یہ نہیں کرتا کہ کبھی خدا کی طرف چلا جائے اور کبھی شیطان کی طرف۔ کبھی دین کی طرف چلا جاتے اور کبھی دنیا کی طرف۔ بلکہ نفس مطمئنہ وہ ہے جو خدا کے پاس گیا اور اُس کے پاس ٹِک گیا پھر وہاں سے ہلا نہیں۔ تیسرا نفس، نفس لوّامہ ہوتا ہے جو بدیوں کو دیکھتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ یہ بدیاں ہیں اور نفس کو ملامت کرتا ہے کہ تمہیں ان بدیوں سے بچنا چاہیئے۔ کسی سے بدی سرزد ہو جائے تو وہ افسوس کرتا ہے اور استغفار میں لگ جاتا ہے اور اپنے نفس کو سخت ملامت کرتا ہے جس پر لفظ لوّامہ دلالت کرتا ہے۔ یہ حالت ورع کی ادنیٰ حالت ہے ورنہ اصل ورع یہ ہے کہ نفس کو یہ روکتا ہے اور وہ اس کے روکنے سے گناہ سے باز آ جاتا ہے۔ اسی نفس لوّامہ کو انگریزی دان لوگ کانشنس کہہ دیتے ہیں یا پُرانے طریق کے لوگ ضمیر کی آواز کہہ دیتے ہیں۔ عربی زبان میں ضمیر کے معنے انسان کے اندرونے کے ہیں۔ ضمیر کی آواز کے معنے ہوتے ہیں انسان کی اندرونی طاقتوں کا مطالبہ۔ اب یورپ نے اِس کونشنس کا بھی انکار کر دیا ہے۔ پہلے وہ لوگ بڑی کثرت سے کانشنس کانشنس کہا کرتے تھے مگر اب بعض ایسے فلاسفر پیدا ہو گئے ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ بالکل لغو بات ہے نفس لوّامہ یا کانشنس یا ضمیر کوئی چیز نہیں درحقیقت رسم و رواج اور انسانی عادات کا ایک ردِّ عمل ہوتا ہے اسے لوگ ضمیر کی آواز کہہ دیتے ہیں جس ماحول میں انسان رہتا ہے اور جس قسم کی رسوم و عادات کا وہ شکار ہوتا ہے اُس کے خلاف جب کوئی بات اُس کے کان میں پڑتی ہے یا اُس کا ذکر کرتا ہے تو اُس کے دل میں نفرت پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً گائے ہے ہندو گائے نہیں کھاتا لیکن مسلمان کھاتا ہے اور اُسے ذرا بھی بُرا محسوس نہیں ہوتا۔ انگریز گائے کھاتا ہے اور اُسے کچھ بھی بُرا محسوس نہیں ہوتا۔ اگر ہندو کے سامنے گائے کے گوشت کا نام لے دو تو اُسے فوراً قے آ جائے گی۔ لیکن مسلمان اور انگریز کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ کہتے ہیں اگر یہ ضمیر کی آواز ہوتی تو ایک انگریز یا مسلمان کو قے کیوں نہ آتی۔ یا مثلاً سؤر انگریز کھاتا ہے یہودی اور مسلمان نہیں کھاتا اگر اُس کے سامنے سؤر کا ذکر آ جائے تو وہ تھو تھو کرنے لگتا ہے لیکن انگریز اور سکھ تھو تھو نہیں کرتا بلکہ اُسی وقت اُس کے دل میں خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ مَیں اِس چیز کو استعمال کروں۔ اگر یہ طبعی چیز ہوتی تو ایک انگریز کے دل میں بھی پیدا ہو جاتی۔ ایک یہودی کے دل میں بھی پیدا ہو جاتی۔ ایک مسلمان کے دل میں بھی پیدا ہو جاتی۔ ایک ہندو کے دل میں بھی پیدا ہو جاتی۔ مگر نہیں پیدا ہوتی۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ طبیعت میں کوئی خاص مادہ نہیں بلکہ جو کچھ ہے عادت اور رسم و رواج کی وجہ سے ہے۔ چونکہ ایک کو عادت ہوتی ہے سؤر نہ کھانے کی اِس لئے سؤر کے ذکر پر اُس کے دل میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ دوسرے کو عادت ہوتی ہے سؤر کے استعمال کی اِس لئے اُس کے دل میں کوئی نفرت پیدا نہیں ہوتی۔ اگر اِس کے اُلٹ ہوتا تو نتیجہ بھی اِس کے خلاف رُونما ہوتا۔ مثلاً اگر ہندوؤں میں گائے کھانے کا رواج ہوتا اور انگریز گائے سے پرہیز کرتے تو یہی بات آج اُلٹ ہو جاتی۔

ہندو گائے کے گوشت سے کبھی بُرا نہ مناتے اور انگریز گائے کے گوشت کا ذکر سُن کر ہی تھُو تھُو کرنے لگ جائے اِسی طرح وہ کہتے ہیں اگر مسلمانوں میں سؤر کا رواج ہوتا تو اُن کو بھی یہ بات بُری نہ لگتی۔ پس یہ طبیعت کی بات نہیں عادت کی بات ہے جس بات کے کرنے کی انسان کو عادت ہوتی ہے اُس پر وہ بُرا نہیں مناتا اور جس بات کی انسان کو عادت نہیں ہوتی اُس پر وُہ بُرا مناتا ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں۔ اوّل تو اِس قسم کی مثالیں حقیقت کو ثابت نہیں کرتیں۔ سوال گائے کے گوشت اور سؤر کے گوشت کا نہیں۔ اِس کو کوئی بھی طبعی نہیں کہتا۔ یہ مذہبی احکام ہیں اور مذہبی احکام اور طبعی احکام میں فرق ہوتا ہے۔ یہاں سوال نفس لوّامہ کا ہے شریعت کا نہیں سؤر اور گائے کا تعلق شریعت سے ہے نفس لوّامہ سے نہیں۔ ہم تو خود مانتے ہیں کہ چونکہ گائے کا گوشت مسلمانوں میں جائز ہے اِس لئے اُس کا استعمال مسلمانوں کو بُرا نہیں لگتا اور چونکہ گائے کا گوشت ہندوؤں میں ناجائز ہے اِس لئے اُنہیں اِس کا ذکر بُرا لگتا ہے یا سؤر کا گوشت چونکہ مسلمانوں میں جائز نہیں اِس لئے مسلمانوں کو اِس کا ذکر بُرا لگتا ہے اور چونکہ سؤر کا گوشت عیسائیوں میں جائز ہے اِس لئے اُنہیں اِس کا ذکر بُرا نہیں لگتا۔ یہ درست ہے بلکہ ہم خود اِس بات کے قائل ہیں کہ شرعی احکام کو بُرا یا بھلا ماننا فطرت پر دلالت نہیں کرتا یہ شریعت کی تفصیلات ہیں جن کو انسان اچھا یا بُرا سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جس چیز کو ہم نفس لوّامہ کہتے ہیں وہ اخلاقی پابندیاں ہیں اُن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر قوم میں اُن کا وجود پایا جاتا ہے۔ مثلاً گائے یا سؤر کے متعلق ہم مان لیتے ہیں کہ اِن کا خاص قوموں کے ساتھ تعلق ہے لیکن جھوٹ بولنا۔ فریب کرنا۔ ریاکاری کرنا۔ احسان فراموشی کرنا۔ قومی غداری کرنا یہ کسی قوم سے مخصوص نہیں۔ جہاں تک شریعت کے احکام کا تعلق ہے مسلمان اگر نماز نہیں پڑھتا تو اُسے گھبراہٹ ہوتی ہے اگر روزہ نہیں رکھتا تو اُسے گھبراہٹ ہوتی ہے بلکہ اگر وہ بیمار بھی ہوتا ہے تو بعض دفعہ اللہ تعالیٰ کی رُخصتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے غلطی سے روزہ رکھ لیتا ہے۔ اِسی طرح ہندوؤں میں شرادھ وغیرہ کی قسم کے شرعی احکام پائے جاتے ہیں یا بعض قسم کے روزے اُن میں پائے جاتے ہیں یا مُردے کا جلانا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ طبعی احکام ہیں۔ مُردے کا جلانا طبعی نہیں بلکہ شرعی امر ہے اگر مسلمانوں میں جلانے کا اور ہندوؤں میں دفنانے کا رواج ہوتا تو یہ اِس پر خوش ہوتا اور وہ اُس پر خوش ہوتا۔ ہم جب اِس نفس لوّامہ کا ذکر کرتے ہیں جو شریعت کے بغیر بھی انسان کو نیکی کی طرف مائل کرتا ہے تو ہم نیکی سے مراد اُس وقت شرعی احکام نہیں لیتے بلکہ اخلاق مراد لیتے ہیں۔ پس یہ نفس لوّامہ شریعت کے احکام سے تعلق نہیں رکھتا۔ ضمیر شریعت کے احکام سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ اُن طبعی نیکیوں سے تعلق رکھتی ہے جو تمام مذاہب میں تسلیم شدہ ہیں۔ یہ فرق تو ضرور ہے کہ مسلمان کہیگا اِس طرح نماز پڑھو اور ہندو کہیگا اِس طرح پڑھو مگر کیا کوئی مذہب ایسا بھی نظر آسکتا ہے جو یہ کہے کہ سچ نہ بولو۔ ایسے مذہب تو ضرور ہیں جو ایسی باتیں کہلواتے ہیں جو جھوٹی ہوتی ہیں مگر مُنہ سے وہ یہ نہیں کہتے کہ جھوٹ بولو۔ یہ ضرور ہے کہ بعض مذاہب کی طرف ظالمانہ تعلیمیں منسوب کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کتنا بھیانک عقیدہ ہے جو مسلمانوں میں پایا جاتا ہے کہ اگر کوئی کافر ہو تو اُسے مار ڈالو۔ یہ اسلام کی تعلیم نہیں۔ مسلمانوں نے اسلام کی طرف منسوب کر دی ہے لیکن کسی مسلمان مولوی سے پوچھ دیکھو کہ کیا قرآن کریم میں یہ آتا ہے کہ ظلم کرو یا یہ آتا ہے کہ ظلم نہ کرو؟ تو وہ یہی جواب دیگا کہ قرآن کریم کی تعلیم یہی ہے کہ ظلم نہ کرو مگر وہ بعض ظالمانہ کام غلطی سے اسلام کی طرف منسوب کر دے گا۔

اسی طرح ہندو مذہب بیسیوں باتیں ایسی بتائے گا جو ظالمانہ ہوں گی لیکن جب پوچھو تو سارے پنڈت یہی کہیں گے کہ ہمارے مذہب کا حکم یہی ہے کہ ظلم نہ کرو۔ غرض شریعت کے احکام میں تو اختلاف ہو جاتا ہے لیکن طبعی اصول میں اختلاف نہیں ہوتا۔ کوئی زرتشتی، ہندو، عیسائی یا کسی اَور مذہب کا پیرو یہ نہیں کہیگا کہ ہمارے مذہب میں یہ تعلیم پائی جاتی ہے کہ امن سے نہ رہو۔ خیانت کرو۔ جھوٹ بولو۔ ظلم کرو۔ یہ اصولی نیکیاں ہیں اور انہی سے نفسِ لوّامہ کا تعلق ہے۔ ان امور کے بارہ میں خود بخود انسان کی حالت اُسے مجبور کر دیتی ہے اور کسی نہ کسی وقت وہ اپنے افعال پر شرمندہ ہو جاتا ہے۔

حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک دفعہ ایک چور علاج کے لئے آیا۔ آپ بڑے پایہ کے طبیب تھے اور ہر قسم کے لوگ آپ کے پاس آتے رہتے تھے۔ آپ نے اُسے فرمایا کہ تم نے یہ کیا گناہ کا طریق اختیار کیا ہوا ہے کہ لوگوں کا مال لُوٹتے اور اپنے گھر میں حرام مال ڈال لیتے ہو۔ اُس نے کہا واہ مولوی صاحب ہم حرام کماتے ہیں۔ ہمارے مال سے زیادہ حلال روزی اَور کس کی ہو سکتی ہے ہم رات کو جاگتے ہیں اپنی جان کو خطرہ میں ڈالتے ہیں۔ جب لوگ سو رہے ہوتے ہیں ہم محنت و مشقت کرتے ہیں آخر محنت سے ہی رزق حلال ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا اُس کے جواب سے مَیں نے سمجھ لیا کہ اُس کی فطرتِ صحیحہ دب گئی ہے۔ چنانچہ مَیں نے اُس سے اَور باتیں شروع کر دیں۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد جب پہلی بات سے اُس کا ذہن ہٹ گیا مَیں نے اُس سے پوچھا اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم چوری کس طرح کرتے ہو؟ اُس نے کہا اصلی چوری کے لئے ایک آدمی سے زیادہ درکار ہوتے ہیں اگر اکیلا آدمی کوئی چیز چُرا لے تو دراصل وہ اُچکا ہوتا ہے ماہرِ فن چور نہیں ہوتا۔ چوری کے لئے کئی آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک آدمی اُس گھر کا واقف ہوتا ہے جس میں چوری کا ارادہ ہو جو مال و اسباب کی جگہ بتاتا ہے۔ پھر سیندھ لگانے کا ماہر ہوتا ہے جو اِس عمدگی سے سیندھ لگاتا ہے کہ گھر والوں کو آواز تک نہیں آتی۔ پھر تیسرے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے جو دبے پاؤں چلنے کا اور تالے وغیرہ توڑنے کا ماہر ہوتا ہے یہ شخص سیندھ کے سوراخ سے اندر جا کر مال نکالتا ہے اور چوتھے آدمی کو جو سیندھ کے مُنہ پر کھڑا ہوتا ہے مال دے دیتا ہے۔ یہ تمام لوگ چونکہ صرف لنگوٹے کسے ہوئے ہوتے ہیں ایک پانچواں آدمی شریفانہ لباس میں گلی کی نکڑ پر کھڑا رکھا جاتا ہے جو پہرہ داروں کی خبر بھی رکھتا ہے اور مال اندر سے نکال کر بھی اُسی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ بوجہ شریفانہ لباس میں ہونے کے شور بھی پڑے تو اُس پر شبہ نہیں کیا جاتا۔ وہ چھٹے آدمی کو جو سُنار ہوتا ہے مال لے جا کر دے دیتا ہے جو سونے موتی جڑاؤ کو الگ الگ کر کے بازار میں فروخت کر دیتا ہے اور پھر فیصلہ شدہ اصول کے مطابق سب میں حصہ تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ مَیں نے یہ سُنکر اس کو کہا کہ اگر سُنار مال کھا جائے تو پھر کیا کرو؟ اس پر اُس کا رنگ سُرخ ہو گیا اور وہ بڑے غصہ سے کہنے لگا کہ اُس کی طاقت ہے کہ بے ایمانی کر کے دوسرے کا مال کھا جائے۔ اس پر مَیں نے کہا اچھا دوسرے کا مال کھانے والا حرام خور ہوتا ہے! میرے اِس فقرہ پر اُسے ہوش آگیا اور وہ شرمندہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ اسی طرح آپ کے پاس ایک دفعہ ایک کنجر علاج کیلئے آیا۔ آپ نے اُسے نصیحت کی اور فرمایا تم ایسا گندہ پیشہ کیوں کرتے ہو؟ اُس نے کہا مولوی صاحب ہمارا پیشہ گندہ کس طرح ہو گیا؟ آپ نے فرمایا گندہ نہیں تو اَور کیا ہے کہ جن لڑکیوں کو تم بیاہ کرلاتے ہو اُنہی سے

پیشہ کروا کے پیسے کماتے ہو۔ اُس نے کہا مولوی صاحب کون ایسا بے حیا ہے جو دوسرے کی لڑکیوں سے بدکاری کروا کر روٹی کھائے۔ ہم تو اپنی بیٹیوں سے بدکاری کرواتے ہیں دوسرے گھر سے آئی ہوئی لڑکیوں سے کبھی یہ کام نہیں کرواتے۔ گویا کثرتِ بدکاری کے باوجود بھی اُس میں بدکاری کا احساس باقی تھا۔ تو نفسِ لوّامہ کا تعلق عادتی امور سے نہیں بلکہ اُن احساسات سے ہی جو فطرت کا حصہ ہیں اور اُن احساسات کے لحاظ سے دنیا کے تمام ممالک میں ایک ہی آواز پائی جاتی ہے۔ یورپ کا فلاسفر کہتا ہے کہ یہ بھی تمہاری غلطی ہے۔ امانت اور جھوٹ اور سچ اور ظلم اور احسان یہ باتیں بھی رسماً اور عادتاً ہوتی ہیں اگر جھوٹ بلوایا جائے تو انسان جھوٹ بولنے لگ جائے اور سچ سے نفرت کرنے لگے اور اگر بد دیانتی کروائی جائے تو انسان بد دیانتی کرنے لگے اور دیانت سے نفرت کرنے لگے مگر چونکہ ایسا نہیں کیا جاتا اس لئے جھوٹ اور بد دیانتی سے نفرت کو طبعی سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ یہ بھی فطرت کا حصہ نہیں بلکہ عادت سے تعلق رکھنے والے امور ہیں۔ ہم کہتے ہیں یہ بات بھی درست نہیں۔ یہ تو ہم بھی مانتے ہیں کہ نفسِ لوّامہ مرجاتا ہے۔ نفسِ امّارہ آخر اسی وقت پیدا ہوگا جب نفسِ لوّامہ مرجائے گا۔ اگر بار بار خیانت کروائی جائے گی تو یقیناً خیانت کا احساس دل میں سے مٹ جائے گا اور اگر بار بار جھوٹ بلوایا جائے گا تو جھوٹ کا احساس دل میں سے مٹ جائے گا۔ مگر سوال یہ نہیں کہ کسی کو عادت ڈال ڈال کر کوئی فعل کروایا گیا ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ جو باتیں مختلف مذاہب اور مختلف ممالک اور مختلف حالات میں تمام بنی نوع انسان میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں وہ عادت یا رسم و رواج کے ساتھ تعلق رکھنے والی کس طرح قرار دی جاسکتی ہیں۔

دنیا میں جو بڑے بڑے براعظم ہیں اُن میں ایشیا ہے ۔ ۔ ۔ ہے۔ امریکہ ہے۔ افریقہ ہے۔ جنوب مشرقی جز ۔ ۔ ۔ ہیں۔ ان کی زبانوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ ہندوستان میں ہی بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جو چیلوں کو پوچھ لو تو اُن کی ہی کئی زبانیں نکل آئیں گی۔ پٹھانوں کی زبان سے لو تو وہ ہماری زبان سے الگ ہے۔ بنگالی زبان دیکھو تو وہ اَور قسم کی ہے۔ پھر جب ہندوستان سے باہر چلے جاؤ تو زبانوں کا اتنا بڑا اختلاف نظر آئیگا کہ حیرت آجائیگی چینی اَور زبان استعمال کرتے ہیں۔ روسی اَور زبان استعمال کرتے ہیں۔ افریقہ کے حبشی بالکل اَور زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ ذرا بھی تو اُن کی ہماری زبان کے ساتھ کوئی مشابہت نظر نہیں آتی۔ پھر امریکہ کے ریڈ انڈینز کو دیکھو اُن کی زبان اَور ہے۔ کتنا اختلاف زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد مذہبوں کو دیکھو تو اُن میں عظیم الشان اختلاف نظر آئے گا۔ افریقہ میں چلے جاؤ تو تمہیں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مذہبوں کا فرق دکھائی دے گا۔ جزائر میں چلے جاؤ تو وہاں مذاہب کا اختلاف نظر آئے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ طبعی نیکیوں سے لگاؤ اگر صرف مذہب کا نتیجہ ہے تو وہ چیز تو بدل گئی۔ تم کہتے ہو کہ چونکہ مذہب نے جھوٹ کے خلاف تعلیم دی تھی اِس لئے لوگ جھوٹ سے نفرت کرنے لگے یا چونکہ مذہب نے امانت کے متعلق تعلیم دی تھی اس لئے اُنہیں امانت کی عادت پڑ گئی۔ ہم کہتے ہیں کہ اُسی مذہب نے خدا کے متعلق بھی سمجھایا تھا۔ رسول کے متعلق بھی سمجھایا تھا۔ کتاب کے متعلق بھی سمجھایا تھا۔ مگر چین والا کچھ کہتا ہے۔ منگولیا والا کچھ کہتا ہے۔ آسٹریلیا والا کچھ کہتا ہے۔ ریڈ انڈینز کچھ کہتے ہیں۔ یہودی اور عیسائی کچھ کہتے ہیں۔ جب اَور سب چیزیں بدل گئیں تو کیا وجہ ہے کہ یہ چیزیں نہ بدلیں۔ صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ مذہب کا حصہ نہیں بلکہ فطرت کا حصہ ہیں مذہب کا حصہ بدل گیا اور فطرت قائم رہی۔ غرض مختلف مذاہب۔ مختلف زبانوں مختلف رسم و رواج اور مختلف عادات کا پیدا ہو جانا اور پھر طبعی نیکیوں میں اُن کا آپس میں اشتراک رہنا بتاتا ہے

کہ فطرت سے تعلق رکھنے والے اُمور اور ہیں اور شریعت سے تعلق رکھنے والے اُمور اور ہیں۔ ساری دنیا میں زبانیں بدلیں۔ رسم ورواج بدلے۔ حالات اور واقعات بدلے مگر سچ اور جھوٹ کو اچھا یا بُرا سمجھنے کا احساس ایک ہی رہا۔ امانت اور دیانت کو بُرا یا اچھا سمجھنے کا احساس وہی رہا۔ فجی میں بعض ایسے لوگ اب تک پائے جاتے ہیں جو ماں باپ کو مار کر کھا جاتے ہیں۔ یہ کتنا بڑا فرق ہے جو اُن میں اور دوسرے لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ اِسی طرح معیارِ زندگی کو لے لو تو اُس میں اختلاف ہوگا۔ شادی بیاہ کے معاملہ کو لے لو تو اُس میں اختلاف ہوگا۔ موت کے معاملات کو لے لو تو اُس میں اختلاف ہوگا کوئی مردہ کو دفن کرتا ہے کوئی جلاتا ہے اور کچھ ایسے لوگ اِس دنیا میں پائے جاتے ہیں جو ماں باپ سے پیار کی یہ علامت سمجھتے ہیں کہ بیمار ہونے پر اُنہیں ذبح کر کے کھا لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ماں باپ پر ہمارا حق ہے کہ ہم اُنہیں کھائیں اُن کے گوشت کو ضائع کیوں ہونے دیں۔ مگر سچ اور جھوٹ کے متعلق ایک افریقہ کے حبشی سے پوچھو جاپانی سے پوچھو چینی سے پوچھو۔ امریکہ کے ریڈ انڈینز سے پوچھو فن لینڈ کے رہنے والوں سے پوچھو۔ سوئٹزرلینڈ کے رہنے والوں سے پوچھو۔ ناروے کے رہنے والوں سے پوچھو۔ افریقن قبائل سے پوچھو تو یہ سارے کے سارے زبانوں اور رسم و رواج اور طرزِ رہائش کے اختلاف کے باوجود اِس بات میں کلّی طور پر متفق ہوں گے کہ سچ اچھی چیز ہے اور جھوٹ بُری چیز ہے۔ امانت سے کام لینا چاہیئے۔ خیانت اور بددیانتی سے بچنا چاہیئے۔ یہ ثبوت ہے اِس بات کا کہ یہ آواز فطرتِ انسانی کی آواز ہے کیونکہ مذاہب بدل گئے لیکن یہ چیز نہیں بدلی۔ رسم ورواج کے ساتھ تعلق رکھنے والے اُمور بدل گئے۔ زبانوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے اُمور بدل گئے مگر یہ امور نہ بدلے۔ پس زمانوں ملکوں اور مذہبوں کے بدل جانے کے باوجود اِن باتوں کے نہ بدلنے کے یہ معنے کیوں نہ لئے جائیں کہ یہ جذبات عادات کا نتیجہ نہیں بلکہ عاداتِ قومی ان جذبات کا نتیجہ ہیں۔ یورپ کا فلاسفر کہتا ہے کہ عادات کے نتیجہ میں یہ جذبات پیدا ہوئے ہیں۔ ہم کہتے ہیں اگر اس کے نتیجہ میں یہ جذبات پیدا ہوتے تو ضروری تھا کہ عادات کے مختلف ہونے سے اِن میں بھی اختلاف پیدا ہو جاتا مگر چونکہ ان میں کوئی اختلاف نہیں اِس لئے ہم بجائے یہ تسلیم کرنے کے کہ عادات کے نتیجہ میں یہ جذبات پیدا ہوئے ہیں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عاداتِ قومی اِن جذبات کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں۔

غرض ہر ملک اور ہر قوم میں یہاں تک کہ جاہل سے جاہل اقوام میں بھی سچائی اور دیانت اور امانت اور عدل اور انصاف اور رحم اور ایسی ہی دوسری خوبیوں کی برتری کا احساس پایا جاتا ہے۔ میں نے مختلف مذاہب اور قوموں کے اخلاق کا مطالعہ کیا ہے اور اس بارہ میں بعض بڑی بڑی کتب پڑھی ہیں۔ پُرانی سے پُرانی قوموں کے اخلاق کا بھی میں نے مطالعہ کیا ہے اور اُن قبائل کے عادات کا بھی مطالعہ کیا ہے جو اب بھی جنگلوں میں ننگے رہتے ہیں اور انسانوں کے قریب نہیں پھٹکتے۔ اگر کوئی آدمی اُنہیں نظر آئے تو بسا اوقات وہ اُسے تیر مار کر ہلاک کر دیتے ہیں۔ میں نے اِن سب اقوام اور لوگوں کے حالات کا مطالعہ کر کے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ کچھ اخلاق کے اصول ایسے ہیں کہ ہزاروں لاکھوں اختلافات کے باوجود یہ لوگ اِن اصول میں متحد ہیں اور دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اِن میں اختلاف نہیں پایا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مختلف اقوام میں گناہوں سے بچنے کا احساس درحقیقت نتیجہ ہے نفسِ لوامہ۔ کانشنس یا ضمیر کا۔ یہ قومی رسم و رواج کا نتیجہ نہیں۔ پس جو شخص بھی نفسِ لوامہ کی طاقت کا قائل ہوگا لازمی بات ہے کہ وہ اُس کی

آواز کو سنے گا اور گناہ سے بچ جائے گا۔ میں نے بتایا
ہے کہ یورپ کے لوگ کہتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے۔ جو
باتیں انسان نے اپنے باپ دادا سے سُنی ہوئی ہوتی ہیں
اُن کو کرنے لگ جاتا ہے اور جن باتوں سے اُسے منع
کیا جاتا ہے اُن کی نفرت اُس کے دل میں بیٹھ جاتی ہے
ضمیر یا فطرت کی کوئی آواز نہیں ہوتی جو اُسے بُرائیوں پر
ملامت کرے۔ اللہ تعالےٰ نے اِسی بات کا اِس آیت میں
ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جو بھی دِیْن یا وَرَع یعنی
بدیوں سے بچنے کے احساس کا منکر ہوگا وہ بدیوں میں
مبتلا ہو جائے گا اور بہت سی نیکیوں سے محروم ہو جائیگا
فرماتا ہے اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ
مجھے بتاؤ تو اُس شخص کا حال جو وَرَع کا منکر ہے اور کہتا
ہے کہ بدیوں سے احتراز کرنے کی خواہش طبعی تقاضا نہیں
بلکہ ایک غیر فطرتی امر ہے۔ جو شخص بھی یہ کہے گا اُس کا
کیریکٹر کمزور ہوگا اور اُس کے اخلاق خراب ہو جائینگے
اِس کے مقابلہ میں جو شخص بھی وَرَع کا قائل ہوگا وہ
نیکیوں میں ترقی کرتا چلا جائے گا۔ قرآن کریم میں
اللہ تعالےٰ نے نفسِ لوّامہ کو اپنی ہستی کے ثبوت میں
پیش کیا ہے اور اِس میں کیا شبہ ہے کہ نفسِ لوّامہ
کی پیدائش ایک خدائی تدبیر ہے۔ چونکہ انسان مختلف
قسم کے ابتلاؤں میں پڑنے والا تھا اِس لئے اللہ تعالیٰ
نے نہ چاہا کہ وہ بغیر حفاظت کے رہے چنانچہ خدا تعالےٰ
نے اُس کی فطرت میں ہی ایک آواز رکھ دی۔ یہ فطرت
کی آواز اُسے ہمیشہ نیکی کی طرف کھینچتی رہتی ہے بسا اوقات
وہ بدیوں کے میدان میں بہت دُور نکل جاتا ہے مگر پھر
کسی وقت فطرت کی آواز اُسے یکدم کھینچکر نیکی کی طرف
اِس طرح لے آتی ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے وہ کبھی
بدیوں میں مبتلا ہی نہیں ہوا تھا اور کبھی گناہوں
کی شامت اُسے نیکیوں سے بالکل محروم کر دیتی ہے۔
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کبھی
انسان نیکیوں میں اِتنی ترقی کر جاتا ہے کہ یُوں معلوم ہوتا
ہے اب وہ کبھی بدی کے قریب بھی نہیں جائے گا مگر
یکدم اُسے جھٹکا لگتا ہے اور وہ دوزخ میں جا پڑتا
ہے اور کبھی وہ بدیاں کرتا چلا جاتا ہے اور اُن بدیوں میں
اتنی ترقی کر جاتا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے وہ نیکی کے
کبھی قریب نہیں آئے گا مگر یکدم اُسے جھٹکا لگتا ہے اور
وہ جنّت میں چلا جاتا ہے۔ آپؐ کے اِس قول کے مطابق
ہمیں دنیا میں ہزاروں مثالیں ملتی ہیں اور یہ فوری تغیر
بھی کسی غیر طبعی بات کا نتیجہ نہیں ہو سکتا یقیناً اِس کے پیچھے ایک
طبعی مظاہرہ ہوتا ہے اور یہ اُسی طاقت کا نتیجہ ہوتا ہے جو خدا تعالےٰ نے
ہر انسان میں پیدا کی ہے اور جو اُسے کھینچکر کہیں سے کہیں لیجاتی ہے۔
ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ایک شہر میں ایک بہت بڑا
رئیس تھا جو ہر وقت ناچ گانے اور شراب میں مشغول
رہتا تھا اور اُس کا دعویٰ تھا کہ چونکہ میرے بادشاہ اور
حکام سے تعلقات ہیں اِس لئے کوئی شخص مجھے روکنے
کی طاقت نہیں رکھتا۔ ہم نے اُسے بہت سمجھایا مگر وہ
ہمیشہ کہتا کہ تم میرا کیا بگاڑ سکتے ہو مجھے روکنے کی تم میں
ہمّت نہیں کیونکہ بالا حکام اور سرکاری افسران سے میرے
خاص تعلقات ہیں۔ چونکہ رات اور دن ناچ گانے کا شغل
برابر جاری رہتا تھا اور عبادت میں خرابی واقعہ ہوتی تھی
اِس لئے تنگ آکر میں نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا۔ ایک دفعہ
میں حج کے لئے گیا تو مَیں نے کیا دیکھا کہ وہی رئیس
حج بیت اللہ کے لئے آیا ہُوا ہے۔ اُسے دیکھکر میرے
ہوش اُڑ گئے کہ ایسا بدمعاش اور بے ایمان بھی حج
کے لئے آنکلا ہے۔ مَیں نے آگے بڑھ کر اُس سے مصافحہ
کیا اور کہا یہ کیا بات ہے کہ آج تم حج کے لئے آئے ہوئے
ہو۔ تمہاری خاطر تو ہم نے شہر ہی چھوڑ دیا تھا تمہاری
وجہ سے ہماری نمازیں خراب ہوئیں۔ تہجد پڑھنے میں
مزہ نہ آیا۔ دُعاؤں کی طرف توجہ نہ ہو سکی کیونکہ ہر وقت
گانے بجانے کا شور رہتا تھا آخر میں نے تنگ آکر

وہ شہر ہی چھوڑ دیا مگر جس شخص کو چھوڑ کر میں باہر نکلا تھا آج پھر وہ یہاں موجود ہے۔ میں نے ہر ممکن نصیحت جو میرے امکان میں تھی تمہیں کی۔ تمہیں قرآن سنایا تم پر اثر نہ ہوا۔ حدیثیں سنائیں تم پر اثر نہ ہوا مگر آج یہ کیا معاملہ ہے کہ تم حج کے لئے یہاں موجود ہو؟ اُس نے کہا تم جو کچھ کہتے ہو درست ہے مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کا ایک وقت مقدر ہوتا ہے ایک دن عصر کے بعد شراب کا دَور چل رہا تھا۔ صراحیوں پر صراحیاں لنڈھائی جا رہی تھیں۔ دوست اور ندیم بیٹھے تھے۔ گانا بجانا ہو رہا تھا اور میں چھت پر منڈیر کے قریب بیٹھا تھا کہ گلی میں سے کوئی آدمی گذرا جو یہ آیت پڑھتا جا رہا تھا کہ اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ کیا مومنوں کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ خدا کے خوف سے وہ گناہ کو چھوڑ دیں اور ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو جائیں یہ آواز میرے کان میں پڑی تو یکدم میرے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔ میں نے صراحیاں توڑ دیں اور اپنے دوستوں کو کہا کہ تم اِسی وقت میرے پاس سے چلے جاؤ۔ اُس وقت میرے دل پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ مجھے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کوئی مسافر یہ آیت پڑھ رہا ہے بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے جھانک کر کہہ رہا ہے کہ کیا تم نے گناہوں سے باز نہیں آنا۔ اور میں نے سچی توبہ کی اور اُس کے نتیجہ میں تم مجھے آج یہاں دیکھ رہے ہو غرض ضمیر مردہ نہیں ہوتی وہ مسخ ہو سکتی ہے، وہ گناہوں سے دب سکتی ہے مگر مر نہیں سکتی۔ بہرحال ضمیر انسان کو ہلاتی رہتی اور اُسے بیدار کرتی رہتی ہے جو شخص اس ضمیر کی آواز کو سُن لیتا ہے وہ نیکی کی طرف قدم اُٹھانے لگ جاتا ہے اور جو اُسے مُردہ نہیں کرتا نیکیوں کا راستہ اُس کے لئے کُھلا رہتا ہے لیکن جو شخص ضمیر کو کچل دیتا یا مار ڈالتا ہے وہ بدیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پس فرماتا ہے اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ۔ مجھے خبر تو دو اُس شخص کے متعلق جو ضمیر کی آواز کا منکر ہے اور کہتا ہے کہ یہ محض ڈھکوسلہ ہے تم دیکھو گے کہ ایسا انسان قسم قسم کی خرابیوں میں مبتلا ہو جائے گا اور نیکیوں سے محروم ہو جائیگا کیونکہ وہ ذریعہ جو نیکیوں کی طرف لے جانے والا تھا اس کا اُس نے استیصال کر دیا۔

اَلدِّیْن کے نویں معنے عادت کے

(۹) اَلدِّیْن کے ایک معنے عادت کے ہیں۔ عادت بھی انسان کو بدیوں سے بچانے میں بڑی ممد ہوتی ہے سیاق و سباق کو مدنظر رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عادت سے مراد نیکی کی عادت ہے عام عادت اس سے مراد نہیں ہو سکتی یعنی یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ جسے گوشت کھانے کی عادت ہوگی وہ یتیموں پر ظلم نہیں کرے گا یا جسے انگریزی لباس پہننے کی عادت ہوگی وہ بدیوں سے محفوظ رہے گا۔ یہ بالکل بے معنی بات بن جاتی ہے۔ سیاق و سباق خود بتا رہا ہے کہ اس جگہ عادت سے مراد نیکی کی عادت ہے اور اللہ تعالیٰ اِس مضمون کو بیان کر رہا ہے کہ جو شخص اِس اصل کو تسلیم کرتا ہے کہ عادت کا بھی انسانی ترقی میں بہت بڑا دخل ہے اور عادت بھی نیکیوں میں ترقی کرنے اور بدیوں کے دبانے میں بہت بڑا حصہ رکھتی ہے وہ ترقی کر جاتا ہے اور جو شخص عادت کی قوت کو نہیں مانتا وہ بدیوں میں مبتلا ہو جاتا اور نیکیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ دنیا میں قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے جس نے اِس فلسفہ کو پیش کیا ہے کہ انسان کی فطرت کے اندر جس قدر باتیں پائی جاتی ہیں وہ ساری کی ساری انسان کے فائدہ اور نفع اور ترقی کیلئے رکھی گئی ہیں۔ یہ نکتہ دنیا میں صرف قرآن کریم نے ہی پیش کیا ہے۔ وہ کسی انسانی جذبہ کے متعلق یہ نہیں مانتا کہ وہ بے کار اور لغو ہے بلکہ وہ اصرار کرتا ہے کہ ہر جذبہ جو انسانی فطرت میں پایا جاتا ہے وہ اپنے اندر حکمت رکھتا ہے اور انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کیا گیا ہے

سارا قرآن اِس مضمون سے بھرا پڑا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز لغو پیدا نہیں کی بلکہ جو کچھ پیدا کیا ہے تمہارے فائدہ کے لئے پیدا کیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ بعض دفعہ مثالوں سے بتاتا ہے کہ موت جس سے تم ڈرتے ہو وہ بھی تمہارے فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ ابتلاء جس سے تم خوف کھاتے ہو وہ بھی تمہارے فائدہ کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ غرض اصرار اور تکرار سے وہ اس بات کو پیش کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو چیز بھی پیدا کی ہے انسانی فائدہ کے لئے پیدا کی ہے مضرت اور نقصان کے لئے پیدا نہیں کی۔ مضرت اور نقصان اُس کے غلط استعمال سے پیدا ہوتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دفعہ ایک ریشمی جُبہ آیا۔ آپ نے حضرت عمرؓ کو بُلوا کر وہ جُبہ اُنہیں تحفۃً دے دیا۔ نماز کا وقت آیا تو حضرت عمرؓ وہی ریشمی جُبہ پہنے آ گئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنہیں دیکھا تو آپ کے چہرہ پر خفگی کے آثار ظاہر ہوئے اور آپ نے فرمایا۔ عمر تم نے یہ کیا کافروں والا لباس پہن رکھا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ آپ نے ہی تو یہ جُبہ مجھے دیا تھا اور اب آپ ہی میرے پہننے پر اظہار ناراضگی فرما رہے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تمہارے استعمال کے لئے تو نہیں تھا تمہاری بیوی بچے بھی تھے تم اپنی بیوی یا اپنی بیٹی کو دے سکتے تھے تمہیں یہ کس نے کہا تھا کہ تم خود اسے پہن لو۔ اب دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ریشمی جُبّہ دیا آپ اُس کے دینے سے انکار نہیں کرتے مگر فرماتے ہیں یہ اَور کام کے لئے تھا تم اپنی بیوی کو پاجامہ یا کُرتا بنوا دیتے یا بیٹی کے لئے کوئی کپڑا سلوا لیتے، خود کیوں پہنا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں کوئی چیز بھی ایسی پیدا نہیں کی جو انسانی فائدہ کے لئے نہ ہو۔ ہاں ہر چیز کے الگ الگ کام ہیں مثلاً سونا خدا تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے مگر دوسری طرف یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جو لوگ دنیا میں سونا جمع کریں گے اُنہیں قیامت کے دن وہی سونا گلا گلا کر جسم پر داغ دئے جائیں گے۔ اب بظاہر یہ بات عجیب معلوم دیتی ہے کہ خود ہی سونا پیدا کیا ہے اور خود ہی اُس کے استعمال پر سزائیں تجویز کر دی ہیں۔ اِس کا جواب یہی ہے کہ سونا خدا تعالےٰ نے جمع کرنے کے لئے پیدا نہیں کیا بلکہ اُسے تجارت اور اقتصادی امور میں لینے دینے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اِسی طرح اپریشن میں ہڈیوں کے جوڑنے اور دانتوں کے جوڑنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے کیونکہ سونا ایسی دھات ہے جسے سب سے کم زنگ لگتا ہے۔ اس لئے پیدا نہیں کیا گیا کہ اِس سے زیور بنوا بنوا کر رکھ لئے جائیں۔ سوائے اِس کے کہ تھوڑے سے زیور عورت زینت کے طور پر استعمال کرے۔ غرض ہر چیز کسی فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اِنہی میں سے عادت بھی ایک ایسی چیز ہے جس کا انسانی ترقی کے ساتھ نہایت گہرا تعلق ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ عادت بُری چیز ہے۔ اچھی عادت بھی بُری ہے اور بُری عادت بھی بُری ہے۔ وہ کہتے ہیں جب کسی نیک کام کی بھی عادت ہو جائے تو انسان کو کیا ثواب مل سکتا ہے۔ مگر یہ درست نہیں۔ دنیا میں عادت اللہ تعالےٰ کی عظیم الشان نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ عادتوں کے ذریعہ نیکی کا سفر بہت آسان ہو جاتا ہے اگر عادت نہ ہوتی تو یہ سفر اِتنا آسان نہ ہوتا۔ عادت ہی ایک ایسی چیز ہے جو ہر اگلے عمل کو انسان کے لئے آسان کر دیتی ہے۔ عربی میں مثل ہے کہ اَلْعَوْدُ اَحْمَدُ یعنی جب تم کوئی کام کرو تو پھر اُسے دُہراؤ اور یاد رکھو کہ جتنی دفعہ تم کوئی کام دُہراؤ گے اتنا ہی وہ اچھا ہو جائیگا۔ ہم سوئی تاگا لے کر بیٹھ جائیں اور کپڑا سینے لگیں تو شاید ایک معمولی کپڑا سینے میں ہی ہمیں پانچ دن لگ جائیں اور پھر اُس کی سلائی یُوں معلوم ہوگی جیسے کوئی چیونٹا چل رہا ہے لیکن درزی اُسی کپڑے کو شام تک سی دیگا۔ اب

ایک درزی کو ہم پر کیا فوقیت ہے یہی فوقیت کہ اُس
نے کپڑے سینے کی عادت ڈالی ہوئی ہے۔ یہی حال
اور کاموں کا ہے۔ مثلاً سائیکل کی سواری ہے لوگ
تو کہتے ہیں کہ سائیکل چلانا نہیں بھولتا مگر میں تو بھول
گیا۔ کئی سالوں کے بعد میں ایک دن گھر میں سائیکل چلانے
لگا تو گر پڑا ہاں تیرنا نہیں بھولا۔ ۲۵ سال کے بعد بھی
میں تیرا تو تین میل تک مسلسل تیرتا چلا گیا۔ بہرحال
سائیکل کی سواری لے لو یا تیرنا لے لو اس میں بھی مشاق
نکل جاتے اور دوسرے لوگ رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ
اُنہیں تیرنے یا سائیکل چلانے کی عادت ہوتی ہے۔ دنیا
میں لوگ سفر کرتے وقت پوچھا کرتے ہیں کہ کوئی اچھا
موٹر چلانے والا ہے۔ کبھی پوچھتے ہیں یہاں کوئی اچھا
طبیب ہے؟ اچھا موٹر چلانے والا کون ہوتا ہے وہی
جسے موٹر چلانے کی عادت ہوتی ہے۔ اچھا طبیب کون ہوتا
ہے وہی جسے علاج کرنے کی دیرینہ عادت ہوتی ہے۔
اچھا سرجن کون ہوتا ہے وہی جسے اپریشن کرنے کی دیرینہ
عادت ہوتی ہے۔ اچھے اُستاد کے کیا معنے ہوتے ہیں
یہی کہ جس نے سالہا سال تک پڑھایا ہو۔ اچھے باورچی کے
کیا معنے ہوتے ہیں یہی کہ جس نے سالہا سال کھانا
پکایا ہو۔ بے شک ان کاموں میں عقل بھی دخل رکھتی ہے
مگر عادت کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ غرض جو کام بھی
دنیا میں نظر آتے ہیں۔ جس قدر پیشے اور فنون نظر آتے
ہیں اُن میں مہارت محض عادت سے پیدا ہوتی ہے
عادت کو نکال دو تو کوئی مہارت پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ کہنا
کہ عادت بُری چیز ہے حماقت ہے۔ عادت اللہ تعالیٰ
کی عظیم الشان نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ کہتے ہیں۔

ط کسب کمال کُن کہ عزیز جہاں شوی

اِس کے معنے بھی یہی ہیں کہ عادت پیدا کرو۔ غرض دنیا
کے ہر فن کی ترقی عادت کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہر عمل
جو تم کرتے ہو وہ ویسا ہی دوسرا عمل تمہارے لئے آسان
کر دیتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ
جب کوئی انسان نیک عمل کرتا ہے تو فرشتے ایک سفید
نقطہ اُس کے دل پر لگا دیتے ہیں اور جب کوئی بُرا کام
کرتا ہے تو فرشتے اُس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگا دیتے
ہیں۔ اِسی طرح سیاہ اور سفید نقطے لگتے چلے جاتے ہیں
یہاں تک کہ ایک دن سفید نقطے سیاہ نقطوں پر غالب
آجاتے ہیں اور وہ بدیوں سے محفوظ ہو جاتا ہے
یا سیاہ نقطے سفید نقطوں پر غالب آجاتے ہیں اور
وہ نیکیوں سے محروم ہو جاتا ہے اور اُس کے دل پر مُہر
لگ جاتی ہے۔ اِس کا بھی یہی مطلب ہے کہ نیکی کی عادت
آہستہ آہستہ اُسے ایسے مقام پر پہنچا دیتی ہے کہ بدی
اُسے ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے سمندر کی مچھلی جنگل میں
پھینک دی جائے یا بدی کرتے کرتے وہ ایسا عادی
ہو جاتا ہے کہ نیکی کرنا اُسے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے
جیسے سمندر کی مچھلی کو خشکی میں پھینک دیا جائے۔ نیکی کے
میدان میں اگر اُسے لایا جائے تو اُس کے ہوش اُڑ جاتے ہیں
اور وہ ایک قدم بھی چلنے کی اپنے اندر طاقت نہیں پاتا۔
یہ عادتوں ہی کا اثر ہوتا ہے ورنہ اور کوئی بات نہیں ہوتی
سپاہی ہمارے ملک کا ایک اہم ترین حصہ ہے لیکن
سپاہی کیوں بہادر سمجھا جاتا ہے۔ اِسی لئے کہ اُسے ہتھیار
چلانے کی عادت ہوتی ہے۔ واٹرلو میں جب نپولین کی
انگریزوں سے جنگ ہوئی تو ایک بہت ہی چھوٹی سی غلطی
کی وجہ سے نپولین کی فوجوں کو شکست ہو گئی۔ نپولین
کا ایک جرنیل تھا جو تھا تو بڑا بہادر مگر اُس سے ایک
غلطی ہو گئی۔ اُسے آگے بڑھ کر واٹرلو کی پہاڑی پر قبضہ کرنے
کا حکم تھا وہ منزل مارتا ہوا وہاں پہنچا تو سپاہیوں پر
ترس کھا کر اُس نے اُنہیں پہاڑی کے نیچے آرام کرنے
کا حکم دے دیا اور سمجھا کہ صبح پہاڑی پر قبضہ کر لیں گے
مگر نپولین کو کہلا بھیجا کہ پہاڑی پر قبضہ ہو گیا ہے
رات کو برطانوی فوجوں نے واٹرلو کی پہاڑی پر قبضہ کر لیا

صبح جرنیل نے یہ حال دیکھا تو اپنی بات سچی کرنے کے لئے متواتر انگریزی فوج پر حملے کئے مگر کامیاب نہ ہوا بلکہ اپنی فوج تباہ کرلی۔ صبح نپولین پہنچا تو مجبوراً اُسے لڑنا پڑا مگر پہاڑی کی وجہ سے اُس کی فوج غالب نہ آسکی جس فوج کو پہاڑی پر قبضہ کرنے کے لئے بھجوایا گیا تھا نپولین کی خاص پسندیدہ فوج تھی جب بار بار حملوں سے اس فوج کا گولہ بارود ختم ہوگیا خود بڑے لشکر کو بھی شکست ہوگئی تو ایک افسر اس فوج کے پاس سے گذرا اور اُن سے کہا کہ فوج کو شکست ہوگئی ہے تم کیوں نہیں بھاگتے تو انہوں نے کہا کہ نپولین نے ہمیں بھاگنا سکھایا ہی نہیں۔ مطلب یہ تھا کہ نپولین نے ہمیں لڑنے کی عادت ہی ڈالی ہے بھاگنے کی نہیں۔ غرض عادت دنیا کی اہم ترین طاقتوں میں سے ایک طاقت ہے۔ وہ چیز جسے ماحول کے مطابق ہو جانا کہتے ہیں درحقیقت عادت کا ہی دوسرا نام ہے۔ جب پودوں کو ایک خاص زمین میں کچھ مدت رہنے کی عادت ڈال دی جاتی ہے تو وہ پودے اُس زمین کے ساتھ ایک خاص مناسبت پیدا کرلیتے ہیں اور زیادہ بہتر فصل پیدا ہونے لگتی ہے اور وہ پودے اس ملک کے لحاظ سے کچھ نئی خصوصیات بھی پیدا کرلیتے ہیں یہی حال جانوروں کا ہے۔ اسی طرح جب انسانوں کو نئی قسم کی عادتیں ڈال دی جائیں تو نئی قسم کے انسان پیدا ہونے لگ جاتے ہیں۔ اگر عادت کے قانون پر لوگ غور کریں اور اعلیٰ درجہ کی عادات اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں تو یقیناً آئندہ نسلیں نہایت اعلیٰ درجہ کی پیدا کی جاسکتی ہیں۔ یقیناً انسان برتر (جسے امریکن SUPERMAN کہتے ہیں) پیدا کئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ لوگ عادت کے فلسفے پر غور کریں اور اس کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ مگر افسوس ہے کہ لوگ اپنی نسلوں کو خود رَو پودوں کی طرح بغیر کسی حفاظت اور نگرانی کے چھوڑ دیتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باپ اچھا ہوتا ہے تو بیٹا خراب ہو جاتا ہے۔ پھر عادتیں پیدا ہوتی ہیں سوسائٹی سے اچھے سے اچھا آدمی بھی اپنی اولاد کی تربیت میں قطعی طور پر ناکام رہے گا اگر اُس کا ماحول اچھا نہیں اور اگر اُس کے اردگرد رہنے والے اعلیٰ درجہ کے اخلاق اور اعلیٰ درجہ کی عادات اپنے اندر رکھنے والے نہیں۔ اگر ساری قوم مل کر اپنی عادتوں کی اصلاح کرے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آئندہ نسل ایسی اعلیٰ درجہ کی پیدا ہوگی جس کا چلن نہایت مضبوط ہوگا جس کے اخلاق نہایت بلند ہوں گے اور جس کا جذبۂ ملت اتنا اعلیٰ درجے کا ہوگا کہ دنیا کی کوئی قوم اُس کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکیگی۔

یورو پین قوموں کے سکولوں میں اس امر کو خصوصیت سے مدنظر رکھا جاتا ہے اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے قومی چلن کو ترقی دیں۔ یورپ کے لوگ جب بھی انصاف کا ذکر کریں گے ہمیشہ کہیں گے یہ کرسچن سویلیزیشن ہے یا کرسچن سویلیزیشن کا تقاضا یوں ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آج کل یورپ جس اعلیٰ مقامِ اخلاق پر پہنچا ہوا ہے اُس کے رُو سے ایسا ہونا ضروری ہے حالانکہ وہ اعلیٰ مقامِ اخلاق تو کجا ابھی اُس مقام کے ادنیٰ ترین معیار تک بھی نہیں پہنچا جو اسلام نے مقرر کیا ہے مگر بار بار کرسچن سویلیزیشن کی اصطلاح استعمال کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض مسلمان بھی دورانِ جنگ میں تقریریں کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ جرمن کرسچن سویلیزیشن کے خلاف چل رہا ہے حالانکہ ان بے چاروں نے انجیل کبھی کھول کر بھی نہیں دیکھی تھی مگر کرسچن سویلیزیشن کا شور مچاتے چلے جاتے تھے۔

غرض یورو پین قومیں اپنی قومیت کی برتری ثابت کرنے کے لئے نوجوانوں میں احساسِ برتری پیدا کرتی رہتی ہیں اور اسی احساس کی بیداری کیلئے انہوں نے یہ اصطلاح قائم کی ہے مگر بعض احمق مسلمان بھی انکی نقل کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے

اخلاق بُرے ہیں اور اُن کے اخلاق اچھے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عادت ایک بڑی طاقت ہے۔ جو قومیں اس نکتہ کو سمجھتی ہیں وہ بہت بڑا فائدہ اٹھالیتی ہیں اور جو اس کو نہیں سمجھتیں وہ نوجوانوں کو بغیر نگرانی کے چھوڑ دیتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آوارہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جو فرد اس نکتہ کو سمجھے گا کہ نیکی کی عادت ایک عظیم الشان نعمت ہے وہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرے گا اور جو اس نکتہ کو کوئی وزن نہیں دے گا وہ نیکیوں سے محروم ہو جائیگا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کو خدا تعالےٰ نے اس دنیا میں پیدا کیا تو اُس نے ہزاروں ہزار نیکیاں پیدا کردیں اور اُن نیکیوں کا غلط استعمال بدیاں بن گیا جب ہم افراد کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا بھی بعض نیکیوں پر قبضہ ہوتا ہے اور بعض پر نہیں چنانچہ اپنے لوگوں میں ہی غور کر کے دیکھ لو۔ ایک شخص جھوٹ فوراً بول دے گا لیکن خیانت نہیں کرے گا۔ ایک اور شخص مال اڑانے سے دریغ نہیں کرے گا مگر سچ بولیگا۔ کوئی شخص گالی نہیں دے گا مگر تھپڑ رسید کر دیگا۔ دوسرا مارے گا نہیں مگر اُٹھتے بیٹھتے گالیاں دیتا چلا جائیگا۔ ایک اور آدمی اُن عیوب میں مبتلا ہوتا ہے جو نرمی سے پیدا ہوتے ہیں کوئی اُن عیوب میں مبتلا ہوتا ہے جو سختی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اب دیکھو یہ دونوں فطرتیں ہیں اور دونوں مختلف مواقع پر مختلف کام کرتی ہیں۔ طاقت والا آدمی طاقت کے کام پر تو لگ جائیگا مگر جہاں دبنے کا معاملہ آئے وہاں وہ دب نہیں سکیگا اور نرم طبیعت آدمی نرمی کے کام تو کرے گا مگر مقابلہ اور طاقت والا کام نہیں کر سکے گا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ان اُمور کو خوب سمجھتے تھے اور آپ ہر شخص کی فطرت کے مطابق کام لیا کرتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر عرب کا ایک سردار جس پر قربانیوں کا بہت اثر ہوتا تھا آپ کو اُس کی آمد کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا ساری قربانیاں اُس کے راستہ میں کھڑی کر دو۔ جب تمام قربانیاں اُس کے سامنے کھڑی کی گئیں تو اُس نے حیران ہو کر پوچھا کہ یہ جانور کیسے ہیں؟ صحابہؓ نے جواب دیا کہ یہ قربانیاں ہیں۔ اس بات کا اُس سردار پر اتنا اثر ہوا کہ اُس نے واپس جا کر اپنی قوم سے کہا کہ انہیں مکہ میں آنے کی اجازت دینی چاہیئے ایسا نہ ہو کہ اُن کی قربانیاں ضائع چلی جائیں۔ یوں وہ لڑاکا تھا مگر قربانیوں کو دیکھ کر اُس کا دل برداشت نہ کر سکا کہ خدا کے نام کی قربانی رائیگاں چلی جائے۔ اِس بارہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص تجھے یہ کہے کہ اُحد پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو تُو اُس کی بات مان لے لیکن اگر کوئی شخص تجھے یہ کہے کہ کسی کی فطرت بدل گئی ہے تو تُو اُس کی بات نہ ماننا۔ اور یہ بات صحیح ہے بعض چیزیں آسان ہو جاتی ہیں جو فطرت کے مطابق ہوتی ہیں اور بعض چیزیں مشکل ہو جاتی ہیں جو فطرت کے خلاف ہوتی ہیں۔ اپنے ارد گرد رہنے والوں کو ہی دیکھ لو بعض لوگ چندے خوب دیں گے لیکن جب نماز کا وقت آئے گا تو کھسک جائیں گے۔ بعض اور لوگ تمہیں اس قسم کے نظر آئیں گے جو نمازیں بروقت ادا کرلیں گے لیکن جیب سے پیسہ نکالنے کا وقت آنے تو رونے لگ جائیں گے۔ پھر ایک اور آدمی اِس قسم کا ہوتا ہے کہ اگر اُس سے چندہ مانگو تو وہ اپنا گھر بار لٹانے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ وطن سے بے وطن ہونے پر آمادہ ہو جاتے گا لیکن اگر اُسے لڑائی میں جان دینے کے لئے کہو تو گھبرائے گا۔ حسان بن ثابتؓ اور ابوہریرہؓ دونوں ایسے تھے جو کسی لڑائی میں شامل نہیں ہوئے۔ غزوۂ احزاب کے موقعہ پر ایک یہودی جاسوس عورتوں کی طرف آگیا حسان بن ثابتؓ اس وقت پہرہ پر مقرر تھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن حضرت صفیہؓ نے کہا حسان اسے مار ڈالو یہ جاسوس

معلوم ہوتا ہے۔ حسانؓ کہنے لگے تم مارنا چاہو تو مار دو مجھ سے تو مارا نہیں جا سکتا۔ حضرت صفیہؓ نے ڈنڈا اٹھایا اور اُس کے سر پہ مارا، ڈنڈا لگتے ہی وہ زمین پر گر گیا اور بیہوش ہو گیا مگر گرتے وقت کپڑا اِدھر اُدھر ہو جانے کی وجہ سے وہ ننگا ہو گیا۔ انہوں نے شرم کے مارے اپنا منہ ایک طرف کر لیا اور حسان سے کہا کہ اب تو یہ بیہوش پڑا ہے اگر پہلے نہیں مارا تو اب ہی مار دو۔ حسانؓ کہنے لگے نہ بی بی ابھی اس کے اندر جان معلوم ہوتی ہو ایسا نہ ہو کہ مجھ پر حملہ کر دے تم خود ہی مارو۔ چنانچہ حضرت صفیہؓ نے منہ پر کپڑا ڈال لیا اور لٹھ مار کر اُسے مار دیا۔ اب یہ تو نہیں کہ حضرت حسانؓ نعوذ باللہ بے ایمان تھے، وہ بڑے مخلص صحابی تھے مگر لڑائی اُن کی طبیعت کے خلاف تھی۔ تو جو چیزیں طبیعت کے مطابق ہوتی ہیں اُن کا کرنا بڑا آسان ہوتا ہے اور جو چیزیں طبیعت یا مزاج کے خلاف ہوتی ہیں اُن کا کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ایسی کمزوریوں کا علاج بھی صرف اور صرف عادت ہے مثلاً اگر سَو نیکیاں ہیں جن کا بجالانا ضروری ہے اور سَو بدیاں ہیں جن سے بچنا ضروری ہے اور ان میں سے پچاس نیکیاں اور پچاس بدیاں کسی کی طبیعت کے مطابق ہیں تو پچاس نیکیاں اور پچاس بدیاں ایسی ہوں گی جو طبیعت کے مطابق نہ ہونے کے سبب سے بہت زیادہ جدّ و جہد کی محتاج ہوں گی۔ اور یہ ظاہر بات ہو کہ جبتک طبیعت جیسی کوئی طاقتور چیز مدد نہ کرے تب تک انسان بدیوں سے رُک نہیں سکتا۔ بہرحال کوئی حربہ ایسا چاہئے تھا جو طبیعت کے برابر وزن رکھتا جس سے اِس موقع پر مدد لی جاتی اور وہ حربہ عادت کا ہے جب انسان اِس حربہ کو اختیار کر لیتا ہے تو اُن نیکیوں کا حصول اور بدیوں سے اجتناب بھی اُس کے لئے آسان ہو جاتا ہے جو اُس کی طبیعت کے مطابق نہیں ہوتیں۔

لوگوں میں یہ بحث چلی آتی ہے کہ طبیعت کا اثر قوی ہوتا ہے یا عادت کا اور اِس بارہ میں بعض عجیب عجیب قصے مشہور ہیں۔ کہتے ہیں مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اُس کی بیوی میں ایک دفعہ اس پر جھگڑا شروع ہو گیا کہ تخم تاثیر یا صحبت کا اثر ان دونوں میں سے زیادہ طاقت کس میں ہے۔ تخم تاثیر سے مراد طبیعت ہے اور صحبت کے اثر سے مراد عادت ہے۔ بیوی کہتی کہ طبیعت کا اثر زیادہ ہوتا ہے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کہتے کہ صحبت اور عادت کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ آخر اس کے فیصلہ کے لئے انہوں نے ایک لڑکا پالا وہ میراثیوں کا لڑکا تھا۔ سات آٹھ سال تک اُسے سکول میں تعلیم دلائی گئی اور اُس کے ماحول کو بالکل بدل دیا گیا۔ ایک دن اُنہوں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ طبعی میلان قوی ہے یا عادت۔ چنانچہ انہوں نے اُس دن برتن میں روٹی رکھنے کی بجائے ایک ٹوٹی پھوٹی جُوتی لپیٹ کر رکھ دی۔ لڑکا سکول سے واپس آیا اور روٹی کھانے کے لئے اُس نے برتن پر سے کپڑا اٹھایا تو بجائے روٹی کے اُس میں سے جُوتی نکل آئی یہ دیکھکر وہ بے تحاشا رونے لگ گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بیوی سے کہا کہ دیکھا میں نہیں کہتا تھا کہ صحبت کا اثر زیادہ ہوتا ہے چونکہ یہ شریفوں میں پلا ہے اِس لئے اسے دُکھ ہُوا ہے کہ میرے ساتھ ایسا گندہ مذاق کیوں کیا گیا ہے۔ بیوی نے کہا اِس سے بھی تو پوچھ دیکھو کہ یہ کیوں رو رہا ہے اُنہوں نے لڑکے سے پوچھا کہ تُو کیوں روتا ہے تو اُس نے جواب میں کہا کہ آپ تو دو دو کھائی ہیں اور میرے لئے ایک ہی رکھی ہے۔ بیوی کہنے لگی دیکھا تخم تاثیر کتنی طاقت رکھتا ہے کہ اتنے لمبے عرصہ کے بعد بھی اِس میراثی کی طبیعت نہیں بدلی۔ حقیقت یہ ہے کہ طبعی اُمور اپنے اندر بڑی طاقت رکھتے ہیں لیکن طبیعت کو کسی بات سے ہٹانے کا اگر کوئی ذریعہ ہے تو وہ علوت ہے اگر علوت کا حربہ نہ ہوتا تو انسان کہتا میری طبیعت میں نرمی ہے اِس لئے میں سختی والے کام نہیں کر سکتا یا میری

طبیعت میں سختی پائی جاتی ہے اس لئے میں نرمی سے کام
نہیں لے سکتا۔

حضرت عمرؓ وہ شخص تھے جو بات بات پر تلوار نکال
لیا کرتے تھے بعض دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو
بھی کہہ دیتے کہ یا رسول اللہ آپ فلاں شخص کے متعلق اگر
ذرا بھی اشارہ کر دیتے تو میں اُسے قتل کر دیتا مگر پھر
یہی عمرؓ تھے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سُنتے
سُنتے اتنے نرم دل ہو گئے کہ صحابہؓ کہتے ہیں اپنی خلافت
کے زمانہ میں ہم نے عمرؓ سے زیادہ بات بات پر رونے والا
اور کوئی شخص نہیں دیکھا۔ طبیعت وہی تھی لیکن عادت
کے ساتھ حضرت عمرؓ نے اُس کو دبا لیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا
ہے ہم مانتے ہیں کہ ماں باپ کے اثر، گندے ماحول
اور خراب تعلیم سے کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں
لیکن اس کے مقابلہ میں ہم نے عادت کی خوبی بھی رکھی
ہے جس چیز کی تم عادت ڈال لو وہی چیز تمہارے لئے
آسان ہو جائے گی۔ فطرتِ انسانی کڑواہٹ کو ناپسند
کرتی ہے، شراب کڑوی ہوتی ہے لیکن پندرہ بیس
دن شراب پینے کے بعد ایسی عادت ہو جاتی ہے کہ
اُس کی کڑواہٹ ذرا بھی بُری محسوس نہیں ہوتی اور
لوگ اُس کے پینے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ غرض
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ بدیاں
مٹانے کے لئے ہم نے عادت کا حربہ پیدا کیا ہوا ہے
جو چیزیں تمہاری فطرت کے مطابق ہیں وہ تو ہیں ہی، جو
خلاف ہیں اُن کی عادت ڈال لو۔ ایک ایک بدی لیکر
اُس سے بچنے کی عادت اپنے اندر پیدا کرو نتیجہ یہ ہوگا
کہ عادت غالب آجائے گی۔ پھر دوسری بدی کو پکڑ لو
وہ دُور ہو جائے تو تیسری بدی کو پکڑ لو۔ اسی طرح
رفتہ رفتہ تمام بدیاں دُور ہو جائیں گی اسی وجہ سے
حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ
ہر رمضان میں کسی ایک بدی کو دُور کرنے کا تم عہد کر لو
اور جہاں تم خدا کے لئے کھانا پینا چھوڑتے ہو وہاں
ایک بدی بھی چھوڑ دو۔ دوسرا رمضان آئے تو دوسری بدی
چھوڑنے کا عہد کر لو۔ اِس طرح چند رمضان کے مہینوں
میں کئی بدیاں چُھٹ جائیں گی۔ یہ بھی دراصل عادت ڈالنے
والی ہی بات ہے۔ جب انسان عہد کرے گا کہ اس مہینہ
میں میں نے فلاں کام نہیں کرنا تو اُس کے نہ کرنے کی
عادت ہو جائے گی اور رفتہ رفتہ وہ بدی بالکل چُھٹ
جائے گی۔

بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ عادت کی نیکی کوئی نیکی
نہیں۔ وہ بھی کوئی نیکی ہے جس کی عادت پڑ جائے۔ لیکن
یہ غلط بات ہے۔ عادت کی نیکی بعض دفعہ تو بیشک نیکی
نہیں ہوتی لیکن بعض دفعہ ہوتی ہے۔ دراصل یہ دو الگ
الگ مواقع ہیں جن کی وجہ سے عادت کی نیکی بعض دفعہ
نیکی بن جاتی ہے اور بعض دفعہ نیکی نہیں رہتی۔ جب انسان
کو اپنی سمجھ بوجھ کے زمانہ سے پہلے کسی چیز کی عادت
پڑے اور پھر اُسے اُس عادت پر غور کرنے اور اُس کی
حقیقت کو سمجھنے کا کبھی موقع نہ ملا ہو تو وہ نیکی نیکی نہیں
کہلاتی مثلاً اگر کسی شخص کو بچپن سے سچ بولنے کی عادت
ہے یا نماز پڑھنے کی عادت ہے اور بعد میں اُسے سچائی
اور نماز پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اور وہ ان نیکیوں کو
علیٰ وجہ البصیرت نہیں بلکہ محض عادت کی وجہ سے بجا لاتا
ہے تو اُس کی یہ نیکیاں محض عادتی نیکیاں قرار پائیں گی۔
لیکن جو شخص کسی بات کو سمجھتے ہوئے اُس کی عادت ڈالتا
ہے اور کوشش کرتا ہے کہ میں اپنے اندر نیکی کو قائم کر لوں
اور بدی سے بچوں تو وہ اُس کی محنت کا ثمرہ اور پھل ہے
اور اچھا کام کرنے پر انعام تو ملا ہی کرتا ہے مثلاً جو
انسان ابتداء سے جھوٹ بولنے کا عادی ہے اور جس کی
گھٹی میں جھوٹ بولنا داخل ہے وہ جب کوشش کریگا
کہ میں آئندہ سچ بولوں تو یہ لازمی بات ہے کہ اُسے تکلیف
ہوگی لیکن جب پندرہ بیس دفعہ اپنے آپ کو خطرے میں

ڈال کر وہ سچ بولے گا تو اُس کے بعد سچ بولنے کی عادت اُس میں پیدا ہو جائے گی اور وہ نتیجہ ہوگا اس کی محنت کا۔ اور جو پھل کسی کی محنت اور کوشش کا ہو اُس سے وہ محروم نہیں کیا جا سکتا۔ پس جس بدی کا ترک انسان نے محنت سے کیا ہو اور جس نیکی کے بار بار اور بالارادہ کرنے کی وجہ سے انسان کو اُس کی عادت ہو گئی ہو وہ نیکی ایک قابل قدر نیکی ہے۔ پس یہ غلط بات ہے کہ عادت کی نیکی نیکی نہیں ہوتی۔ جب یہ عادت زور سے پیدا کی جائے گی اور اس کے لئے محنت اور کوشش کی جائے گی تو اس کا جو نتیجہ پیدا ہوگا اُس سے وہ محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص دُعا کرتے اور اللہ تعالےٰ کا ذکر کرتے ہوئے سو جاتا ہے اُس کی ساری رات ہی عبادت اور دُعا میں بسر ہوتی ہے۔ دراصل ہر انسان کے اندر ایک نفسِ مکتوم یعنی SUBJECTIVE MIND ہوتا ہے جو دماغ کے خزانہ کے طور پر کام کرتا ہے جب انسان دُعا کرتے ہوئے سوتا ہے تو گو بظاہر وہ سویا ہوا ہوتا ہے مگر اُس کا نفسِ مکتوم کام کر رہا ہوتا ہے یہ دُعا اُس کے ارادہ کے ماتحت نہیں ہوتی اور بظاہر اس کا ثواب اُسے نہیں ملنا چاہیئے لیکن چونکہ یہ اُس کی جاگنے والی دُعا کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے اس لئے اس کا ثواب اُسے ضرور ملے گا اور ملتا ہے۔

دین کے دسویں معنے قضاء کے

دِین کے دسویں معنے قضاء کے ہیں۔ اس لحاظ سے اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ کے یہ معنے ہوں گے مجھے بتا تو سہی اُس شخص کا حال جو قضاء کا انکار کرتا ہے۔ (یہی جو انکار کرتا ہے) تو اُسے دیکھیگا کہ وہ یتیم کو دھتکارتا ہے (يَدُعُّ الْيَتِيْمَ) سیاق و سباق سورۃ کے لحاظ سے قضاء کے معنے اِس جگہ قضائے الٰہی کے ہیں یعنی کون ہے وہ شخص جو قضائے الٰہی کا انکار کرتا ہے۔ مگر قضائے الٰہی سے مراد وہ قضائے الٰہی نہیں جس کا آجکل مسلمانوں میں خیال پایا جاتا ہے یا جس کا دوسرے مذاہب میں عقیدہ پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مجبور پیدا کیا ہے۔ اُسے مومن یا کافر عالم یا جاہل۔ اندھا یا آنکھوں والا۔ کمزور یا طاقتور خود بنا دیا ہے اور وہ اپنی حالت کو بدل نہیں سکتا۔ اگر یہاں وہی قضاء مراد لی جائے جس کا آج کل مسلمانوں میں عقیدہ پایا جاتا ہے یا جو دوسرے مذاہب میں اس سے مراد لی جاتی ہے تو اس آیت کے کوئی معنے نہیں رہتے۔ جب انسان پیدا ہی مجبور کیا گیا ہے اور وہ خدا تعالےٰ کے مقرر کردہ قانون پر چل رہا ہے اور اُسے تو ڑ نہیں سکتا تو اس آیت کے معنے ہی کیا ہوئے کہ مجھے بتا تو سہی وہ شخص جو خدا تعالےٰ کے قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے کیسا مجرم ہے یہ معنے بالکل بے جوڑ ہو جاتے ہیں درحقیقت یہاں قضاء الٰہی سے مراد وہ قضاء الٰہی ہے جو قرآن کریم پیش کرتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات ع ۳) کہ میں نے جن و انس کو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کے بندے بن جائیں۔ اب يَعْبُدُوْنِ سے ظاہری عبادتیں تو مراد نہیں بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ ایسے بن جائیں کہ حقیقی طور پر خدا تعالےٰ اُن کے دل میں آجائے۔ اگر لِيَعْبُدُوْنِ سے ظاہری عبادتیں مراد ہیں تو پھر اللہ تعالےٰ نے یہ کیوں فرمایا ہے فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ کہ لعنت ہے اُن نماز پڑھنے والوں پر جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نمازیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو پڑھنے والے کے لئے لعنت کا موجب ہوتی ہیں اور بعض نمازیں ایسی ہوتی ہیں جو اُس کے لئے رحمت کا موجب ہوتی ہیں۔ پس آیت مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ میں

لِیَعْبُدُوْنِ سے مراد ظاہری عبادات نہیں بلکہ اس سے
مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات انسان کے اندر
جاگزیں ہو جائیں اور وہ خدا تعالیٰ کا صحیح مظہر اور نمونہ
بن جائے یہی مقصد تھا جس کے لئے خدا تعالیٰ نے
جن و انس کو پیدا کیا اور یہی ایک تقدیر الٰہی ہے اور اسی
کی طرف مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ
کی آیت میں اشارہ ہے یعنی ہر انسان جو دنیا میں پیدا
ہوا ہے وہ محض اسی لئے پیدا ہوا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ
کا عبد بن جائے، اللہ تعالیٰ کا بندہ بن جائے اور
یہ قانون حصر کے طور پر بیان ہوا ہے۔ کیونکہ عربی زبان
کا یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی جملے میں مَا اور اِلَّا آجائیں
تو وہ حصر کے معنے دیتا ہے۔ پس مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ
الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ کے معنے عربی زبان کے
قواعد کے لحاظ سے یہی بنتے ہیں کہ یہی وہ مقصد ہے جس
کے لئے جن و انس کو پیدا کیا گیا ہے اس کے سوا اُن کی
پیدائش کا اور کوئی مقصد نہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ
اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ سے مراد یہ نہیں ہو سکتا کہ میں نے جن و
انس کو اس لئے پیدا کیا ہے تا وہ میری مخلوق بن جائیں
کیونکہ جب خدا تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا تو وہ اسی وقت
مخلوق ہو گئے دوبارہ مخلوق بننے کا سوال ہی نہیں رہتا۔
پس اس آیت کے یہی معنے ہیں کہ انسان کو اس لئے پیدا
کیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا صحیح عبد بن جائے یا
دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات
کو جذب کرے اور اُس کا سچا، مخلص اور مومن بندہ بنے
یہی قضائے الٰہی ہے۔ اور اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ
بِالدِّیْنِ میں اسی طرف اشارہ ہے کہ جو مذکورہ بالا
قضائے الٰہی کا انکار کرے وہ کبھی نیک نہیں ہو سکتا
اور اُس کے افعال ضرور گندے ہوں گے پس جو شخص
قضائے الٰہی کو سمجھ لیتا ہے اور جان لیتا ہے کہ وہ صرف
اس لئے پیدا کیا گیا ہے تا خدا تعالیٰ کا مخلص اور مومن
بندہ بن جائے اور اُسے اس بات پر یقین ہو تو وہ خود
اپنی اصلاح کرے گا۔ کیونکہ وہ سمجھے گا کہ میں یقیناً بدیوں پہ
غالب آ سکتا ہوں کیونکہ میری پیدائش کی غرض ہی نیک
ہونا ہے۔ گناہ درحقیقت بڑھتا ہی مایوسی سے ہے جو لوگ
مایوس ہو جاتے ہیں اُن میں مقابلہ کی طاقت کمزور ہو جاتی
ہے اور وہ شیطان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں
دنیا میں ہزاروں ہزار لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جو
کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے کوئی رستہ تجویز
نہیں کیا اور اس لئے وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ
کہہ دیتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ نے ہماری نجات کا کوئی
رستہ تجویز ہی نہیں کیا تو پھر بدی کا مقابلہ کرنے سے
کیا فائدہ۔ ایسے لوگ اپنی بدیوں کی وجہ سے یہ سمجھ لیتے
ہیں کہ اب اُن کے لئے کوئی راہِ نجات نہیں۔ اس لئے اُن
کے اندر نیکی کے لئے خاص جدوجہد پیدا نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں دوسری جگہ فرماتا ہے
وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا کُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ
حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ
وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (سجدة ع) یعنی اگر ہم اپنی مرضی کر
کام لیں تو ہر شخص کو ہدایت دے دیں یعنی جب بھی اللہ تعالیٰ
اپنی مشیت کو استعمال کرے گا اُس کی مشیت یہی ہو گی کہ
سب جن و انس اُس کے مخلص اور مومن بندے بن جائیں
اور وہ ہدایت پا جائیں۔ اُس کی مشیت یہ نہیں ہو گی کہ وہ
گمراہ ہو جائیں اور ہدایت سے ہٹ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے
انسان کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ چور اور ڈاکو
بن جائے بلکہ اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اُس کا عبد بن جائے
اُس کا بندہ بن جائے۔ لیکن خدا تعالیٰ ساتھ ہی یہ بھی
فرماتا ہے کہ میں نے ایک اور قانون بھی مقرر کر دیا ہے
اور وہ بھی نظر انداز نہیں ہو سکتا اور وہ قانون یہ ہے کہ
لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔

مَیں تمام جنوں اور انسانوں کو جہنم میں داخل کردونگا۔ اِس آیت سے لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ شاید اللہ تعالےٰ نے یہ قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ تمام جن و انس جہنم میں جائیں گے۔ حالانکہ دوسری آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کا یہ خیال غلط ہے۔ اللہ تعالےٰ سورۂ رحمٰن میں فرماتا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ۔ جو شخص اپنے اندر خوف پیدا کر لیتا ہے اُسے دو جنتیں ملیں گی۔ اِس جہان میں بھی اُسے جنت ملے گی اور اگلے جہان میں بھی اُسے جنت ملیگی۔ اب جس شخص کے لئے اللہ تعالےٰ یہ فرماتا ہے کہ اُس کے لئے اِس جہان میں بھی جنت ہے اور اگلے جہان میں بھی جنت ہے اُسے دوزخ کہاں ملے گی۔ دو ہی زمانے ہیں۔ یہ جہان ہے یا اگلا جہان ہے۔ اُسے یہاں بھی جنت مل گئی اور اگلے جہان میں بھی جنت مل گئی تو دوزخ کہاں ملی۔ پس معلوم ہوا کہ یہ گروہ جس کا قرآن کریم میں ذکر آتا ہے دوزخ میں نہیں جائے گا اور اگر یہ گروہ دوزخ میں نہیں جائے گا تو لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ کے جو یہ معنے کئے جاتے ہیں کہ مَیں جن و انس میں سے ہر ایک کو جہنم میں ڈالونگا کیسے صحیح ہو سکتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ معنے ٹھیک نہیں۔

اِسی طرح اللہ تعالےٰ دوسری جگہ فرماتا ہے يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر) کہ اے نفسِ مطمئنہ تُو اپنے رب کی طرف لَوٹ اِس حال میں کہ تُو اُس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ اِس آیت میں لفظ اِرْجِعِيْ یا تو اِس جہان کے متعلق ہے یا موت سے بعد کی زندگی کے متعلق ہے۔ اِن دونوں کے علاوہ اس کے کوئی اَور معنے نہیں لئے جا سکتے۔ جب خدا تعالےٰ کسی شخص سے راضی ہو گیا ہو اور وہ خدا تعالےٰ سے راضی ہو گیا ہو تو پھر وہ دوزخ میں کیسے جا سکتا ہے۔ اور اگر اِس سے مراد موت کے بعد کی زندگی ہے تب بھی یہ آیت بتاتی ہے کہ مرنے کے بعد فوراً اُسے کہا جائے گا فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ۔ جاؤ میرے بندوں میں داخل ہو جاؤ اور میری جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو پھر دوزخ میں جانے کا کونسا وقت آئیگا معلوم ہوا کہ یہ بات غلط ہے کہ ہر ایک رُوح جہنم میں جائے گی۔

اِس بات کی تردید کہ ہر ایک رُوح جہنم میں جائے گی۔

ایک اَور جگہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْا خَيْرًا لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (النحل ع) یعنی متقیوں سے کہا جائے گا کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے یعنی وہ کیا پُر حکمت کلام ہے۔ اِس پر وہ کہیں گے کہ جو کچھ اُس نے نازل کیا ہے ٹھیک ہے۔ یعنی اُس نے کوئی بھی ایسا حکم نازل نہیں کیا جو ہمارے لئے مضرت رساں ہو۔ ہر حکم جو اُس کی طرف سے نازل ہوا ہے وہ ہمارے لئے مفید اور بابرکت ہے اور ہماری ترقیات کے لئے ہے۔ پس جب خدا تعالےٰ کا کلام خیر ہی خیر ہے۔ جب خدا تعالےٰ کا کلام خوبی ہی خوبی ہے جب خدا تعالےٰ کا کلام نیکی ہی نیکی ہے تو لازمی بات ہے کہ جو لوگ اِس پر عمل کریں گے اُن کے لئے ورلی دنیا میں بھی بھلائی ہوگی اور اگلے جہان میں بھی بھلائی ہوگی اور اُن کو ہمیشہ رہنے والے باغات ملیں گے جن میں ہر خواہش پوری ہوگی۔ اللہ تعالےٰ متقیوں کو اسی طرح بدلہ دیتا ہے۔ ملائکہ اُن کی رُوح اس حالت میں نکالینگے

کہ وہ مومن بالکل پاک صاف ہوں گے تب ملائکہ اُن سے کہیں گے کہ تم پر ایک عظیم الشان سلامتی کا نزول ہونیوالا ہے جاؤ اور جاکر جنت الٰہی میں داخل ہوجاؤ یعنی جنت میں داخلہ کے بعد اللہ تعالےٰ کا وصال جو سب سلامتیوں کا سردار ہے تم کو حاصل ہوگا۔ پس جس مومن کیلئے اِس جہان میں بھی جنت ہے اور اگلے جہان میں بھی اُسے جنت ملے گی اُس کے دوزخ میں جانے کا امکان ہی نہیں۔

مذکورہ بالا آیت میں جو اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ فرمایا ہے اِس سے ظاہر ہے کہ یہاں متقیوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو نیکی کی صورت میں مریں۔ متقی سے یہ مراد نہیں کہ وہ بچپن سے آخر عمر تک نیکی ہی نیکی کرے۔ بلکہ موت سے پہلے جس کی حالت کامل اور نیک ہو جائے گی وہ متقی ہے۔ اگر اس سے پہلے کوئی گناہ اُس نے کیا ہے تو وہ معاف کر دیا جائے گا

حدیث شفاعت بھی اِس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ کامل مومن کے لئے دوزخ نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میری اُمت میں سے اسّی ہزار آدمی بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے یعنی سوال و جواب سے جو کوفت ہوتی ہے وہ بھی اُنہیں نہیں ہوگی وہ بغیر سوال و جواب کے سیدھے جنت میں چلے جائیں گے ظاہر ہے کہ اُن سے بھی زیادہ وہ لوگ ہوں گے جو سوال و جواب کے بعد جنت میں جائیں گے۔ پس لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ کے یہ معنے کرنا کہ ہر جن و انس دوزخ میں سے ہو کر جائے گا بالکل لغو ہیں۔ مفسرین نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے کہ دوزخ مومن کے لئے جنت بن جائے گی۔ وہاں باغات ہونگے پھول ہوں گے لیکن اول تو یہ ایک تمسخر بن جاتا ہے کہ انبیاء صلحاء کو دوزخ میں ڈالا جائے لیکن بنا دیا جائے اُسے جنت دوسرے اس طرح مومنوں کو یہ کوفت تو ہوگی کہ خدا تعالیٰ اُن سے ناراض ہے اس لئے وہ اُنہیں دوزخ میں بھیج رہا ہے

بعد میں بے شک اُنہیں پتہ لگ جائے کہ یہ دوزخ نہیں ہے جنت ہے۔ یہاں تو باغات ہیں، پھول کھلے ہیں۔ آخر یہ عذاب اُنہیں کس قصور کی بناء پر دیا جائے گا؟ اور پھر یہ خیال کر لینا کہ نعوذ باللہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام بھی ایک وقت دوزخ میں جائینگے کس طرح درست ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اِن آیات نے صاف طور پر ثابت کر دیا ہے کہ بہت سے مومن ایسے ہوں گے (اللہ تعالےٰ جانتا ہے اُن کی تعداد کیا ہوگی کروڑوں ہوگی یا اربوں ہوگی) جو سیدھے جنت میں جائیں گے اور دوزخ اُن کے پاس بھی نہیں پھٹکے گی۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ کے کیا معنے ہوں گے؟ سو اِس کے ایک معنے تو یہ ہو سکتے ہیں کہ اَلْجِنَّةِ وَالنَّاسِ دونوں میں الف لام عہد کا ہے۔ الف لام کے کئی معنے ہوتے ہیں۔ الف لام جنس کیلئے بھی آتا ہے یعنی کسی جنس کے جتنے افراد ہوتے ہیں وہ سب اُس میں شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح معہود ذہنی یا ذکری کیلئے بھی آتا ہے یعنی جس جماعت کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہو اُسکی طرف اِس میں اشارہ ہوتا ہے مثلاً ہم کہتے ہیں جَآءَ الرِّجَالُ۔ لوگ آگئے۔ یہاں الف لام جنس کے لئے نہیں۔ اِس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ دنیا کے سب لوگ آگئے۔ بلکہ اِس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے آنے کی ہم امید کرتے ہیں یا جن کا پہلے ذکر کیا گیا ہے پس اَلْجِنَّةِ وَالنَّاسِ سے مراد یہاں یہ ہوں گے کہ وہ جن و انس جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے سب دوزخ میں جائیں گے اور پہلے ذکر کفار کا ہے مومنوں کا نہیں۔ پس مطلب یہ ہوا کہ کفار میں سے بڑے لوگ اور عوام الناس سب جہنم میں جائینگے کیونکہ خدا تعالےٰ کے نزدیک سب برابر ہیں۔ خواہ کوئی بادشاہ ہو یا فقیر کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی جائے گی۔

دوسرے معنے اِس آیت کے یہ ہو سکتے ہیں کہ جنت کے لئے بھی دوزخ میں سے ہو کر رستہ ملتا ہے۔ اِس دوزخ

سے مراد خدا تعالے کی ناراضگی کی دوزخ نہیں بلکہ محض تکالیف مراد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دوزخ دو قسم کی ہوتی ہے ایک خدا تعالے کی ناراضگی کی دوزخ۔ دوم وہ دوزخ جو انسان خود اپنے نفس کو کچلنے کے لئے دنیا میں تیار کرتا ہے۔ یعنی ایک دوزخ انسان خود بناتا ہے اور ایک دوزخ خدا تعالے بناتا ہے۔ جو دوزخ خدا تعالے بناتا ہے وہ اُس کی ناراضگی پر دلالت کرتی ہے اور جو دوزخ انسان خود اپنے نفس کو کچلنے کے لئے تیار کرتا ہے (اگرچہ وہ ظاہر میں دوزخ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اصل میں وہ جنت ہوتی ہے) وہ خدا تعالے کی ناراضگی پر دلالت نہیں کرتی بلکہ انسان خدا تعالے کو راضی کرنے کیلئے خود اپنے اُوپر اُسے وارد کر لیتا ہے۔ مثلاً ایک انسان رات کو اُٹھتا ہے، اپنے آرام کو خراب کرتا ہے۔ دوسرے لوگ سو رہے ہوتے ہیں، نیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں۔ بستروں میں آرام کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اُٹھتا ہے اپنے آرام کی پرواہ نہیں کرتا، نیند کو خراب کرتا ہے تکلیف اُٹھاتا ہے اور خدا تعالے کی عبادت کرتا ہے۔ یا لوگ روپیہ جمع کرتے ہیں مگر یہ اپنے مال کو خدا تعالے کی راہ میں لٹاتا ہے اُس کی رضاء حاصل کرنے کے لئے اُس کی راہ میں اُسے خرچ کرتا ہے اور اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالتا ہے۔ یا یہ روزے رکھتا ہے، دوسرے لوگ عیش کی زندگی گذارتے ہیں، مچھلی کے کباب اُڑاتے ہیں مُرغے اُڑاتے ہیں، برف والا پانی پیتے ہیں۔ لیکن یہ اپنے اُوپر پانی بھی حرام کر لیتا ہے اور سارا دن کچھ نہیں کھاتا۔ یہ دوزخ ہے یا نہیں۔ خدا تعالے فرماتا ہے لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ کہ ہر ایک جن وانس کو جہنم میں سے ہو کر جانا پڑے گا۔ ایک طرف واضح طور پر یہ کہہ دیا گیا ہے کہ مومن کامل سیدھا جنت میں میں جائے گا۔ اور دوسری طرف یہ فرمایا گیا ہے کہ جنت بغیر کانٹوں میں سے گذرے نہیں ملے گی پس ثابت ہوا کہ ہر انسان کو دوزخ میں سے ہو کر گذرنا پڑے گا خواہ وہ دوزخ انسان اصلاحِ نفس کے لئے خود تیار کرے یعنی اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالے، قربانیاں کرے، اپنی زبان کو روکے اور اپنے نفس کو شہوات سے روکے اور خواہ اس دوزخ میں سے گذرنے کے لئے تیار ہو جائے جو خدا تعالے کی ناراضگی کی دوزخ ہے۔ اوّل الذکر دوزخ میں سے سب سے زیادہ خدا تعالے کے انبیاء گذرے ہیں خدا تعالے کے انبیاء سے زیادہ دنیا میں خدا تعالے کی خاطر کون تکلیف اُٹھاتا ہے۔ اپنے لئے سب سے بڑا دوزخ انبیاء ہی تیار کرتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جتنا زیادہ کسی کو خدا تعالے سے پیار ہو گا اُتنی ہی زیادہ وہ دنیا میں تکلیفیں اُٹھائیگا پس لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ میں یا تو اِس آیت کے سباق کی طرف اشارہ ہے جس میں کفار کا ذکر ہے اور یا دوزخ سے مراد یہاں صرف خدا تعالیٰ کی ناراضگی والی دوزخ نہیں بلکہ وہ تکلیف و دُکھ کی دوزخ بھی مراد ہے جس میں سے مومن خدا تعالے کی رضا کے حصول کے لئے اپنی مرضی سے گذرتا ہے۔

دوسری بعض آیات جو اس مضمون کو واضح کرتی ہیں کہ ہر جن وانس دوزخ میں سے ہو کر نہیں جائے گا یہ ہیں۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۗ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ

وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ ۙ۝ الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ۘ وَ بَیْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَ عَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ یَّعْرِفُوْنَ كُلًّۢا بِسِیْمٰىهُمْ ۚ وَ نَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ ۫ لَمْ یَدْخُلُوْهَا وَ هُمْ یَطْمَعُوْنَ ۝ وَ اِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا یَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِیْمٰىهُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمْ وَ لَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (الاعراف ع ۵-۶) ۔

اِن آیات میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور پھر اُنہوں نے مناسب حال اعمال کئے اُن پر ہم وہ بوجھ نہیں ڈالیں گے جن کے اٹھانے کی اُن میں طاقت نہ ہو۔ وہ لوگ جنّت والے ہیں اور جنّت میں ہمیشہ رہیں گے۔ دیکھو یہ کیسا لطیف مضمون ہے اِس خوف سے کہ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ جنّت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پیدائش کے وقت سے لے کر آخر وقت تک یعنی موت تک اُس نے کوئی ٹھوکر نہ کھائی ہو اور اُس نے کوئی غلطی نہ کی ہو۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے جو شخص بھی زور لگا کر اپنی اصلاح کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے خواہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے سے پہلے ہی فوت ہو جائے۔ ہم اُس کے گناہ معاف کر دیں گے اور وہ سیدھا جنّت میں جائے گا۔ پھر فرمایا وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَ نُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ کہ ہم ہر قسم کا کینہ اُن کے دلوں سے نکال دیں گے۔ اُن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ اللہ تعالےٰ کی تعریف کریں گے جس نے اُنہیں جنّت کا رستہ دکھایا اگر اللہ تعالےٰ اُنہیں جنّت کا رستہ نہ دکھاتا تو وہ ہدایت نہیں پا سکتے تھے اور یہ قضاء الٰہی تھی جو اس طرح ظاہر ہوئی کہ اُن کے پاس اللہ تعالےٰ کے رسول آئے۔ اگر وہ رسول اُن کے پاس نہ آتے تو وہ اِس ہدایت کو نہیں پا سکتے تھے۔ اور اُنہیں پکار پکار کر کہہ دیا جائے گا کہ چونکہ تم نے دنیا میں نیک اعمال کئے ہیں اِس لئے تم جنّت کے وارث قرار دئے گئے ہو۔ پھر فرمایا وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ ۝ جنّت والے دوزخ والوں سے کہیں گے کہ جو وعدہ اللہ تعالےٰ نے ہم سے کیا تھا وہ تو پُورا ہو گیا۔ کیا تم سے جو اُس نے وعدہ کیا تھا وہ پورا ہو گیا ہے؟ وہ کہیں گے ہاں وہ وعدہ بھی پُورا ہو گیا ہے۔ اور پکارنے والا پکاریگا کہ ظالموں پر اللہ تعالےٰ کی لعنت ہے۔ اب دیکھو اگر یہ لوگ دوزخ میں سے ہو کر جنّت میں جاتے تو انہیں آواز دیکر پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب وہ اکٹھے دوزخ میں آئے تو یہ پوچھنے کے کیا معنے ہو سکتے ہیں کہ تم سے جو وعدہ خدا تعالےٰ نے کیا تھا آیا وہ پورا ہو گیا ہے یا نہیں۔ وہ تو اُنہیں دوزخ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے تھے۔ جنّت والوں کا آواز دینا صاف بتاتا ہے کہ وہ دوزخ میں نہیں گئے۔ کیا اُن کی آنکھیں اندھی ہونگی یا آنکھوں پر پٹی باندھ کر اُنہیں دوزخ میں سے گذارا جائے گا کہ اُنہیں ایک دوسرے کو آواز دیکر پوچھنے کی

ضرورت ہوگی۔ پھر فرمایا وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ کہ مومنوں اور کافروں کے درمیان پردہ ڈال دیا جائیگا تا دوزخیوں کو دیکھ کر مومنوں کے دل گھبرا نہ جائیں خدا تعالےٰ تو مومن کے دل کا اتنا لحاظ کرتا ہو کہ فرماتا ہے مومنوں کو دوزخ کا عذاب دُور سے دیکھنے کی تکلیف سے بھی بچایا جائے گا مگر آج کل کا مسلمان کہتا ہے کہ ہر انسان دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

پھر فرمایا وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ یعنی اعراف والے لوگ سب کو اُن کی شکلوں سے پہچان لیں گے اور جنت والوں کو پکار کر کہیں گے کہ تم پر اللہ کی سلامتی ہو، وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے بلکہ جنّت میں داخل ہونے کی امید کر رہے ہوں گے۔ اِن آیات سے ظاہر ہے کہ یہ گروہ بھی دوزخ سے باہر ہوگا اور اعراف والے اُن سے یہ کہیں گے کہ تم پر اللہ کی سلامتی ہو۔ سابق مفسّرین نے اِس آیت کے معنے کرنے میں غلطی کھائی ہے اور کہا ہے کہ اعراف والے لوگ وہ ہیں جن کی جنت کا فیصلہ نہیں ہوا ہوگا۔ حالانکہ اعراف والے لوگوں کی نسبت تو یہ بتایا گیا ہے کہ وہ جنت و دوزخ کے لوگوں سے مخاطب ہو کر سوال و جواب کریں گے اور یہ مقام اعلیٰ لوگوں کا ہوتا ہے پس اعراف والے ادنیٰ درجہ کے مومن نہیں بلکہ انبیاء و صلحاءِ کامل کا گروہ ہے یہ گروہ مومنوں کو مخاطب کرکے کہیگا کہ گھبراؤ نہیں تم پر اللہ کی سلامتی ہے۔ اِس لئے کہ یہ عام مومن ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے بلکہ جنت میں داخل ہونے کی اُمید کر رہے ہوں گے اور خوف سے گھبرائے ہوئے ہوں گے، اعراف والے اُن کو تسلی دیں گے کہ تم پر سلامتی ہی سلامتی ہے گھبراؤ نہیں۔

پھر اِسی اعلیٰ گروہ کی توجہ اہلِ دوزخ کی طرف پھیری جائے گی تو وہ کہیں گے۔ اے ہمارے رب تو ہمیں ظالموں کے ساتھ مت کیجیو۔ یہاں پر ایک عجیب لطیفہ ہے۔ مفسّرین کہتے ہیں کہ اصحاب الاعراف سے مراد یہاں ادنیٰ درجہ کے لوگ ہیں۔ اگر یہ معنے بھی مان لئے جائیں تو خدا تعالےٰ کہتا ہے کہ وہ ادنیٰ درجہ کے لوگ بھی جنت میں جائیں گے چنانچہ وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب تُو ہمیں ظالموں کے ساتھ مت کیجیو۔ یہ عجیب بات ہے کہ مفسّرین کے نزدیک تو معمولی درجہ کے مومن جنت میں نہیں جائیں گے لیکن خدا تعالےٰ کہتا ہے کہ ادنیٰ درجہ کے مومن بھی جنت میں جائیں گے اور دوزخ کی آگ سے بچائے جائیں گے۔

پھر فرمایا۔ اصحابِ اعراف کفار سے کہیں گے کہ تم کو تمہارے جتھوں نے فائدہ نہیں پہنچایا۔ تم مومنوں کے بدخواہ تھے لیکن دیکھو آج وہ جنت میں جا رہے ہیں اور پھر مومنوں سے کہیں گے کہ جاؤ اب جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اِن آیات سے دو باتیں ظاہر ہیں۔ اوّل مومن دوزخ میں نہیں جائے گا کیونکہ یہاں کہا گیا ہو کہ مومن دوزخ سے دُور کھڑے ہوں گے کہ اُنہیں اصحابِ اعراف جنت میں جانے کا حکم دیں گے۔ دوسرے یہ کہ اصحاب اعراف کمزور مومنوں کا نام نہیں کیونکہ فرمایا گیا ہے کہ اعراف والے دوسرے مومنوں کو اجازت دیں گے کہ جاؤ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ کوئی عقلمند نہیں کہہ سکتا کہ ادنیٰ درجہ کے لوگ اعلیٰ درجہ والوں کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت دیں گے۔

اُوپر کی آیات سے بھی صاف ثابت ہوتا ہے کہ تقدیرِ الٰہی یہی ہے کہ ہر ایک انسان کو جنت میں داخل کیا جائے۔ لیکن اگر کوئی دوزخی ہے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی راستہ سے بھولا بھٹکا مسافر لیکن کسی نہ کسی دن وہ بھی ضرور جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اگر اِن دوزخیوں کو قضائے الٰہی پر یقین ہوتا اور وہ سمجھتے

کہ اللہ تعالےٰ نے ہمیں اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہم اُس کے مخلص اور مومن بندے بن جائیں تو وہ ضرور نیکی کے لئے جد وجہد کرتے اور اپنے نفسوں کی اصلاح کرتے پس جب انسان قضائے الٰہی پر یقین نہیں رکھتا تو وہ ٹھوکر کھا جاتا ہے اور مختلف قسم کی بدیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مثلاً عیسائیوں کا قضاء الٰہی پر ایمان ایسا ہی ہے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ انسان گنہگار پیدا ہوتا ہے اور جب تک وہ کفارہ پر ایمان نہ لائے وہ پاک نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ہندو ہیں اُن کا بھی قضاء الٰہی پر یقین نہیں ہندو تناسخ کے قائل ہیں۔ اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان دوزخ کے لئے پیدا ہوا ہے جنت کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ اللہ تعالےٰ نیکی کا انعام دیتا ہے مگر کوئی نہ کوئی گناہ ایسا رکھ لیتا ہے جس کی وجہ سے خدا تعالےٰ اُسے پھر دنیا میں بھیج دیتا ہے کوئی قسمت والا ہی نیکیاں کرکے جنت میں جاتا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ اُسے اُس کے کسی قصور کے بدلہ میں جو چھپا کر رکھ لیا جاتا ہے پھر دنیا میں بھیج دیتا ہے اِس طرح ایک چکر سا بندھ جاتا ہے۔ انسان نیک اعمال کرتا ہے اور جنت میں جاتا ہے خدا تعالےٰ اُس کا کوئی نہ کوئی قصور باقی رکھ لیتا ہے اور آخر اُس قصور کے بدلہ میں وہ پھر اُسے دنیا میں بھیج دیتا ہے۔ یہ بالکل وہی بات ہے جو ہندو مسلمانوں سے کرتے ہیں جب تھوڑا سا قرضہ باقی رہ جاتا ہے تو کہہ دیتے ہیں چودھری جی آپ کا قرضہ صاف ہو گیا ہے اِس سے وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ تھوڑا سا قرضہ جو باقی رہ گیا تھا بڑھتا چلا جاتا ہے مثلاً دس روپے اگر قرضہ تھا تو اُس پر ڈیوڑھا سُود لگ کر سال میں قرضہ پندرہ روپے ہو جائے گا پھر پندرہ سے بائیس ہو جائے گا اِسی طرح وہ بڑھتا جائیگا اور کچھ عرصہ کے بعد جب وہ چودھری اُن سے ملیگا یا وہ خود ہی اُس کے گھر جائیں گے تو اُس سے کہیں گے چودھری جی آپ کا کچھ قرضہ باقی ہے ہم نے اُسوقت غلطی سے کہہ دیا تھا کہ قرضہ صاف ہو گیا ہے دراصل غلطی لگ گئی تھی تھوڑا سا قرضہ باقی رہ گیا تھا جو اب سُود پڑتے پڑتے اِتنا ہو گیا ہے اور اس طرح پھر ایک چکر شروع ہو جاتا ہے۔ اُن کے نزدیک اللہ تعالےٰ بھی انسان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا ہے جیسا وُہ مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ بھی اُن کے نزدیک سلیٹ صاف نہیں کرتا کوئی نہ کوئی گناہ رکھ لیتا ہے جو بڑھتے بڑھتے اِس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ اُنہیں واپس دنیا میں بھیج دیتا ہے۔ لیکن یہ سب ڈھکوسلے اور غلط خیالات ہیں درحقیقت خدا تعالیٰ نے ہمیں جنت کے لئے پیدا کیا ہے اور وہ جنت میں پہنچانے کے لئے ہماری مدد بھی کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس حقیقت کو سمجھ لے تو ظاہر ہے کہ اُس کے دل میں جنت کے لئے بے حد شوق پیدا ہو جائے گا اور وہ اس کے لئے بے انتہاء کوشش اور جد وجہد کرے گا۔ وہ اپنے نفس کی اصلاح کرکے اُسے اِس قابل بنائے گا کہ جنت کا اہل بن جائے۔ اگر وہ اپنی زندگی میں گناہ بھی کرتا رہا ہے تب بھی وہ مایوس نہیں ہو گا اُسے یہ اُمید ہو گی کہ وہ اب بھی نیک عمل کرے تو جنت کو حاصل کر سکتا ہے۔ پس قضائے الٰہی پر ایمان اور یقین ہونے سے انسان کا حوصلہ پست نہیں ہوتا بلکہ اُس کا حوصلہ بلند ہوتا ہے۔ اگر انسان کو قرآن کریم کی بتائی ہوئی قضائے الٰہی پر یقین ہو گا تو وہ جنت کو حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کریگا اور جسے اس پر ایمان نہ ہوگا وہ مایوس ہو کر گناہ کے سمندر میں کود پڑے گا اور کہیگا کہ انجام تو خراب ہے ہی کیوں نہ اِس دنیا کی لذّتوں سے فائدہ اُٹھاؤں۔

دِین کے گیارھویں معنے تدبیر کے

(۱۱) گیارھویں معنے دِین کے تدبیر کے ہیں۔ تدبیر کا منکر بھی مختلف گناہوں کا مرتکب ہو جاتا ہے اور نیکیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص تدبیر کا

منکر ہے۔ کوشش اور اصلاح کا منکر ہے وہ سمجھتا ہے کہ اگر وہ ایک دفعہ گر گیا تو گر گیا۔ ایسے شخص کا بچنا بھی مشکل ہے۔ اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے یہ خیال مت کرو کہ ہم نے تمہیں تدبیر کرنے اور بدی کا مقابلہ کرنے کی قوتیں اور طاقتیں عطا نہیں کیں۔ ہم نے تمہیں سب طاقتیں دی ہیں۔ اگر تمہاری نیت نیک ہو اور ان طاقتوں کو جو ہم نے تمہیں عطا کی ہیں استعمال کرو تو تم بدیوں سے بچ سکتے ہو۔ لیکن جو شخص تدبیر کا منکر ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر اُس نے ایک گناہ بھی کر لیا تو پھر اُس کا بچنا مشکل ہے ایسا انسان مختلف بدیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جب وہ تدبیر کا ہی قائل نہیں تو وہ بدیوں سے بچنے کی کوشش ہی کیا کریگا۔

مجھے یاد ہے بچپن میں میرا ایک دوست تھا مجھے اُس کی بعض بدیوں کا پتہ لگا۔ مَیں نے اُس سے پوچھا کیا یہ ٹھیک ہے کہ تم میں فلاں فلاں بدیاں پائی جاتی ہیں؟ اُس نے کہا ٹھیک ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ مَیں نے اتنے گناہ کئے ہیں کہ اب سزا سے بچ نہیں سکتا اور مجھے دوزخ میں جانا ہی ہے اس لئے اب مَیں گناہ خوب زور سے کرتا ہوں کہ اِس زندگی کے تو لطف اُٹھا لوں۔ مَیں نے اُسے سمجھایا کہ خدا تعالےٰ نے انسان کے اندر ایسی طاقتیں پیدا کر دی ہیں جن کے ذریعہ اگر وہ چاہے تو بدیوں پر غالب آ سکتا ہے وہ سمجھ گیا اور اِس کے بعد اُس نے اصلاح کی کوشش کی جس سے اُس کی اصلاح ہو گئی اور وہ بدیوں پر غالب آ گیا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ۔ ہم ہر ایک کی مدد کرتے ہیں، ہم مومن کی بھی مدد کرتے ہیں اور کافر کی بھی مدد کرتے ہیں۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تعالےٰ مومن کو بھی روزی دیتا ہے اور کافر کو بھی روزی دیتا ہے۔ مومن کی کوشش کو بھی کامیاب کرتا ہے اور کافر کی کوشش کو بھی کامیاب کرتا ہے۔ خدا تعالےٰ فرماتا ہے کہ جب ہم کافر کو بھی دنیوی فوائد کے حصول میں جن کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مدد دیتے ہیں۔ تو جو ہم سے ملنے کی کوشش کرے اُسے ہم کیوں مدد نہیں دیں گے۔ جب خدا تعالےٰ اپنے دشمن کی بھی مدد کرتا ہے تو وہ اپنے دوست کی مدد کیوں نہیں کرے گا۔ حقیقت یہی ہے کہ تدبیر کا رستہ کھلا ہے۔

پھر دوسری جگہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (اعلیٰ)، تو نصیحت کرتا جا۔ کیونکہ نصیحت ہمیشہ ہی فائدہ دیتی ہے۔ یہ تدبیر کبھی رائگاں نہیں گئی۔ جب کسی قوم کے افراد نے اصلاح کر لی وہ ہمیشہ ہی کامیاب ہوئے۔ ‘اِنْ’ کہکر اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یہ قطعی اور لازمی بات ہے کہ نصیحت ہمیشہ کامیاب رہتی ہے۔ اسی طرح ایک اَور جگہ خدا تعالےٰ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (آل عمران ع ۱۴) وہ لوگ جن سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے، کوئی بدی ہو جاتی ہے تو وہ اللہ تعالےٰ کو یاد کرتے ہیں اور اپنی اصلاح کر لیتے ہیں، خدا تعالےٰ سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ اللہ تعالےٰ کے سوا کون ہے جو گناہوں سے بچا سکے یہ جملہ معترضہ ہے۔ آگے فرماتا ہے وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔ وہ استغفار کرتے ہیں اور اپنے اُس گناہ پر اصرار نہیں کرتے اور جانتے ہیں کہ ہم نے اُن کے لئے ایک راستہ نجات کا بنا چھوڑا ہے اگر وہ گناہ چھوڑنا چاہیں تو چھوڑ سکتے ہیں۔ اُن

لوگوں کی جو اِس نکتہ کو سمجھتے ہیں یہ جزاء ہوگی کہ وہ اپنی کوشش اور جدوجہد سے خدا تعالیٰ کو پالیں گے اور اُن کو مغفرت ملے گی اور باغات ملیں گے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی اور یہ انعام عارضی نہیں ہوگا بلکہ وہ اِن باغات میں ہمیشہ رہیں گے اور محنت کرنے والوں کا بدلہ اچھا ہی ہوتا ہے یعنی جو کوئی بھی کوشش کرے گا اپنی کوشش میں ناکام نہیں ہوگا۔ دیکھو کتنا صاف رستہ کھولا گیا ہے جو کوئی بھی کوشش کرتا ہے وہ بدیوں اور گناہوں پر غالب آجاتا ہے مَیں کہتا ہوں اگر وہ غالب نہیں بھی آتا بلکہ شیطان سے لڑائی کرتا ہوا مر جاتا ہے تب بھی اُسے یہی بدلہ ملے گا کیا کوئی سمجھدار انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ سپاہی جو لڑتے لڑتے فتح سے پہلے مر جاتا ہے اُس پر ملک والے ناراض ہوتے ہیں؟ کیا ملک والے اُس پر اس لئے ناخوش ہوتے ہیں کہ وہ فتح سے پہلے کیوں مر گیا؟ بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ جو سپاہی جنگ میں لڑتے لڑتے مرجاتے ہیں اُن کو بعد میں بڑے بڑے انعام ملتے ہیں۔ برطانوی فوج میں بعض کو وکٹوریہ کراس مل جاتے ہیں اور جرمنی میں آئرن کراس۔ پس حقیقت یہی ہے کہ جو شخص سچی کوشش کرتے کرتے مر جائے گو وہ اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب نہ ہو وُہ دوزخ میں نہیں جائیگا۔ وُہ تو خدا تعالیٰ کا سپاہی تھا جو لڑتے لڑتے مر گیا۔ وُہ اپنی مرضی سے تو نہیں مرا۔ اُس نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ مجھے موت آجائے۔ وہ الٰہی قانون کے مطابق لڑتا ہُوا مرا ہے۔ وہ ایسا ہی سمجھا جائے گا جیسے وہ مومن ہونے کی صورت میں مرا۔ سپاہی جو لڑتے ہوئے مارا جائے وہ قابلِ تعریف ہوتا ہے یا قابلِ سزا؟ جب وہ قابلِ تعریف ہوتا ہے قابلِ سزا نہیں ہوتا تو پھر جو شخص خدا تعالیٰ سے ملنے کی کوشش کرتا ہُوا مر جاتا ہے اُسے خدا تعالیٰ دوزخ میں کیوں ڈالے گا۔

احادیث میں آتا ہے کوئی شخص تھا جس نے ننانوے قتل کئے تھے وہ توبہ کے لئے کسی عالم کے پاس گیا اور اُس سے جاکر کہا کیا میری توبہ قبول ہوسکتی ہے اُس نے کہا تیری توبہ قبول نہیں ہوسکتی۔ اُس شخص نے کہا اگر میری توبہ قبول نہیں ہوسکتی تو میں تجھے بھی مار دوں گا۔ ایک گناہ اور زیادہ ہوگیا تو کیا ہُوا۔ یہ کہہ کر اُس نے اُس عالم کو قتل کر دیا۔ اِسی طرح اُس نے ایک ایک کرکے بہت سے علماء کو مار دیا۔ ایک دفعہ کوئی شخص اُسے ملا جس نے اُسے بتایا کہ فلاں جگہ پر فلاں عالم ہے وہ کہتا ہے کہ ہر ایک کی توبہ قبول ہوتی ہے تم اُس کے پاس جاؤ۔ وہ شخص اُس کے پاس جا رہا تھا کہ رستہ میں ہی مر گیا۔ اُس کی موت پر فرشتوں کا آپس میں جھگڑا ہوگیا۔ (یہ سب تمثیلی زبان کی بات ہے) بہرحال احادیث میں آتا ہے کہ فرشتوں کا آپس میں جھگڑا ہوگیا۔ دوزخ والے فرشتے کہتے تھے کہ یہ شخص دوزخی ہے اسے توبہ ابھی نصیب نہیں ہوئی۔ اور جنّت والے فرشتے کہتے تھے کہ یہ شخص جنتی ہے کیونکہ یہ توبہ کرنے کے لئے جا رہا ہے کہ رستہ میں مر گیا۔ آخر دوزخ اور جنّت دونوں کے فرشتے خدا تعالیٰ کے پاس فیصلہ کرانے کے لئے پہنچے۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا زمین ناپو جس طرف سے یہ شخص توبہ کرنے کے لئے چلا تھا اگر وہ جگہ قریب ہے تو یہ دوزخی ہے اور اگر وہ جگہ جہاں یہ توبہ کرنے کے لئے جا رہا تھا قریب ہے تو یہ جنتی ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی طنابیں کھینچ دیں اور اُس جگہ کو جہاں وہ توبہ کرنے کے لئے جا رہا تھا زیادہ قریب کر دیا۔ فرشتوں نے دونوں طرف کی زمین کو ناپا اور خدا تعالیٰ سے آکر کہا کہ جس طرف یہ شخص توبہ کرنے کے لئے جا رہا تھا وہ زمین چھوٹی ہے خدا تعالیٰ نے حکم دیا پھر اُسے جنت میں لے جاؤ۔ اس تمثیل میں اِس امر کو ظاہر کیا گیا ہے کہ جو نجات کی کوشش کرتے ہوئے

مرجاتاہے اگر وہ گناہوں پر غالب آنے میں کامیاب
نہ ہوا ہو تب بھی وہ جنتی ہی ہے بشرطیکہ جذبہ صادق اور
جدوجہد صحیح اور معیاری ہو۔ لیکن جو شخص تدبیر اور
کوشش کا ہی منکر ہو تو اُس کے بارہ میں آیت زیر
تفسیر میں فرماتا ہے کہ تُو اُسے دیکھے گا کہ وہ بدیوں
میں مبتلا ہو جائے گا۔ وہ سمجھ لے گا کہ میرے لئے اب
بدیوں کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے۔ لیکن اُس کی یہ رائے غلط
ہے۔ مومن جانتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے تدبیر کا راستہ
کھلا رکھا ہے۔ تدبیر سے انسان بدیوں پر غالب آسکتا
ہے۔ اگر تدبیر کا راستہ کھلا نہ ہوتا تو پھر اللہ تعالیٰ
ہمیں لاحول، استغفار اور تعوّذ کیوں سکھاتا۔ یہ
چیزیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اِسی لئے سکھائی ہیں کہ
تدبیر کا راستہ ہر وقت کھلا ہے۔ جو کوئی بھی تدبیر
کرے گا اور اپنے نفس کی اصلاح کرے گا۔ وہ ضرور
بدی پر غالب آجائے گا۔

دِین کے بارھویں معنے شأن کے

(۱۲) بارھویں معنے دِین کے شأن کے ہیں۔
شأن کے معنے ہوتے ہیں بڑا کام۔ اَلْخَطْبُ الْعَظِیْمُ
بہت بڑی مہم (اقرب الموارد) اَلْحَالُ وَالْاَمْرُ الَّذِیْ
یَتَّفِقُ وَ یَصْلُحُ وَلَا یُقَالُ اِلَّا فِیْمَا یَعْظُمُ
مِنَ الْاَحْوَالِ وَالْاُمُوْرِ (مفردات) جس
کام میں ناکامی ہو اُسے شأن نہیں کہیں گے۔ بلکہ ہر وہ
کام جس میں کامیابی کے لئے مواد بہم پہنچ جاتا ہے اور
وہ ہو جایا کرتا ہے شأن کہلاتا ہے۔ شأن کا لفظ کبھی
چھوٹے کام پر نہیں بولا جاتا ہمیشہ بڑے کام کے لئے
بولا جاتا ہے۔ پس شأن کے معنے ہوتے بڑی حالت یا
وہ بڑا کام جو ضرور پورا ہو کر رہنے والا ہو۔ قرآن کریم
میں انہی معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ (الرحمٰن) ہر زمانہ
میں خدا تعالیٰ ایک خاص ارادہ کرتا ہے اور وہ جو
ارادہ کرتا ہے اُس کے لئے سامان بھی ضرور پیدا کرتا
ہے اور اُس میں اُسے ہمیشہ کامیابی ہوتی ہے۔ کُلَّ
یَوْمٍ سے مراد انبیاء کا زمانہ ہے۔ یہ آیت سورۂ رحمٰن
میں ہے۔ اِس سے پہلے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
کی بعثت کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے زمانے اور پہلے انبیاء کے زمانوں کا مقابلہ
کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اُس نے دنیا کو انبیاء کے
زمانوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر نبی کے زمانہ کے
متعلق وہ ایک تقدیر جاری کرتا ہے جو اُسی طرح
پوری ہو کر رہتی ہے اور اِس سکیم کے منکر یا اُس سے
مُنہ پھیر لینے والے (ابتدائی زمانہ میں منکر اس کے
مخاطب ہوتے ہیں درمیانی اور آخری زمانہ میں اس
سکیم پر بظاہر ایمان لانے والے لیکن عملاً رُوگردانی
کرنے والے) خدا تعالیٰ کی گرفت میں آتے ہیں۔
پس اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ
فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ کے یہ معنے
ہوں گے مجھے بتا تو سہی اُس شخص کا حال جو اِس بات
سے انکار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر زمانہ میں ایک نئی
سکیم جاری کرتا ہے اور اِس زمانہ میں جو سکیم جاری
کی گئی ہے وہ محمدی سکیم ہے۔ اگر کوئی شخص اِس زمانہ
کی سکیم یعنی محمدی سکیم کا منکر ہے تو تُو دیکھیگا کہ اُس میں
ہر طرح کی بدی پائی جائے گی اور ایسا شخص مختلف قسم
کے گناہوں میں مبتلا ہو گا۔

وَیسے تو خدا تعالیٰ ہر زمانہ میں ہی اپنی قدرت
کا اظہار کرتا رہتا ہے لیکن انبیاء کے زمانہ میں وہ خاص
طور پر اپنی قدرت کا اظہار کرتا ہے اور اُن کے ذریعہ
ایک خاص سکیم کو جاری کرتا ہے خواہ دشمن کتنے ہی
روڑے کیوں نہ اٹکائیں خدا تعالیٰ کی سکیم پُوری
اور کامیاب ہو کر رہتی ہے۔ ایک سکیم حضرت موسیٰ
علیہ السلام کے زمانہ میں جاری کی گئی تھی حضرت موسیٰ
علیہ السلام کے دشمن کتنے طاقتور تھے فرعون جیسا طاقتور بادشاہ

آپ کے مقابلہ میں تھا لیکن خدا تعالیٰ کی سکیم کے مقابلہ میں نہ تو فرعون کامیاب ہو سکا اور نہ اُسے چھوڑ کر آپ کی اُمت ہی جیت سکی۔ جب آپ کی قوم نے کہہ دیا اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ اے موسیٰ جا تُو اور تیرا خدا دونوں لڑو ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے۔ ہم تمہاری بات کو نہیں مانتے اپنی کامیابی اور بہتری کا سامان ہم خود پیدا کر لیں گے۔ تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے متعلق فیصلہ کیا کہ وہ جنگلوں میں چالیس سال تک بھٹکتی رہے کہاں اُس کی وہ حالت تھی کہ مصر سے نکلنے کے بعد وہ کامیابی پر کامیابی حاصل کرتی رہی۔ لیکن جب اُس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کی خلاف ورزی کی تو اُسے جنگلوں میں بھٹکنا پڑا اور کوئی صورت بھی اُسکی کامیابی کی نہ رہی یہاں تک کہ اُس نے حضرت یوشع علیہ السلام کے ہاتھ پر توبہ کی۔ یہی حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تھا آپ کے زمانہ میں بھی ایک سکیم جاری ہوئی۔ مخالفوں نے اپنا زور لگایا مگر وہ کامیاب نہ ہوئے خدا تعالیٰ کی ہی سکیم کامیاب ہوئی۔ اور یہودیوں کی بادشاہت اُس وقت تک نہ آئی جب تک کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بتائے ہوئے راستہ پر چل نہ پڑے۔ (سوائے موجودہ زمانہ کی عارضی کامیابی کے جس کا ذکر خود قرآن کریم میں موجود ہے دیکھو تفسیر سورۃ بنی اسرائیل)

جتنی بھی تکلیف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم نے اُٹھائی ہے اُس کا تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ تین سو سال تک اُس نے ذلت کی زندگی گذاری۔ بعض دفعہ سات سات سال تک وہ سطح زمین سے اسّی فٹ نیچے گیلی زمین میں غاروں میں چھپی رہی۔ میں نے اُن جگھوں کو اٹلی میں خود دیکھا ہے (اُن کو کیٹا کومبز کہتے ہیں) ایسی خطرناک جگہیں ہیں کہ وہ تمہارے واہمہ میں بھی نہیں آ سکتیں۔ اگر وہ تکالیف ہماری جماعت کو اُٹھانی پڑیں تو مجھے خوف ہے کہ بہت سے احمدی احمدیت چھوڑ دیں۔ لیکن عیسائیوں میں سے ایک مخلص طبقہ (ان میں کمزور ڈر سے مسیحیت چھوڑ دیتے تھے) وہاں سات سات سال تک متواتر رہا ہے تا اِن گڑھوں اور غاروں میں چُھپ کر کسی طرح اُن کا ایمان بچ جائے۔ غاروں کے اندر ہی اُن کے گرجے تھے۔ چوری چوری وہ باہر نکلتے تھے اور اپنے ہمدردوں کے ذریعہ شہر سے غلّہ منگواتے تھے۔ غاروں میں بالکل اندھیرا تھا وہ شمعیں جلا جلا کر گزارہ کرتے اور دن رات وہیں گذار دیتے تھے۔

اُس جگہ کے دیکھنے کے بعد کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ عیسائیوں کو اُس نے ایک لمبے عرصہ تک بادشاہت اور حکومت کیوں دی۔ یہ تو اُن کے باپ دادوں کی اُن قربانیوں کا نتیجہ ہے جن کو خدا تعالیٰ نے بھلایا نہیں۔ میں جب اُس جگہ کو دیکھنے کیلئے گیا تو ابھی دو درجے ہی نیچے گیا تھا کہ مجھ میں آگے جانے کی طاقت نہ رہی پھر بھی میری آگے جانے کی نیت تھی مگر میرے بعض ساتھیوں نے زور سے کہا کہ اگر آپ اور آگے گئے تو ہم بیمار ہو جائیں گے اِس لئے ہم واپس آ گئے۔ دو درجے ہی جانے میں ہمارے دل بیٹھ گئے اور ہمارے جسموں میں کوئی طاقت نہ رہی ستر میل لمبے غار تھے اور عیسائی وہیں رات دن رہتے تھے وہیں بچے پیدا ہو رہے تھے، وہیں اُن کے گرجے تھے جگہ بہ جگہ یہ کتبے لگے ہوئے ہیں کہ میرے بیوی بچے بہن بھائی یہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ روما کی پولیس کسی مخبر سے خبر معلوم کر کے یہاں آئی اور اُس نے اُن سب کو مار دیا۔ میں کسی طرح بچ گیا اب میں یہاں کتبہ لگاتا ہوں تا دیکھنے والے اُن کے لئے دُعا کریں۔ کسی کتبہ پر یُوں لکھا ہے، یہاں ہمارے پادری صاحب وعظ کر رہے تھے کہ اُنہیں روما کی پولیس نے شہید کر دیا اُن کی یادگار کے طور پر میں یہ کتبہ لگاتا ہوں۔ کیا ہی عجیب قسم کا

استقلال ہے ، کیا ہی عجیب قسم کی قربانی ہے ۔ اس کے
بدلہ میں اگر اُس قوم کو ایک لمبا عرصہ حکومت مل گئی
تو اس کا خدا تعالیٰ پر کوئی الزام نہیں آسکتا ۔ پس
ہر زمانہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک سکیم جاری کی
جاتی رہی ہے اور جو بھی اس کے مقابلہ میں اُٹھتا رہا
ہے ناکام ہوتا رہا ہے ۔ حضرت کرشن علیہ السلام
حضرت رام چندر علیہ السلام کے زمانہ میں بھی ایک سکیم
جاری ہوئی ۔ حضرت زردشت علیہ السلام کے زمانہ میں
بھی ایک سکیم جاری ہوئی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
کے زمانہ میں بھی ایک سکیم جاری ہوئی ۔ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ
فِیْ شَاْنٍ ۔ اللہ تعالیٰ ہر زمانہ میں ایک نئی سکیم جاری
کرتا ہے اور جو اُس پر نہیں چلتا وہ گناہ میں ترقی
کرے گا نیکی میں ترقی نہیں کرے گا ۔

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سب سے
پہلے مخالف عرب تھے ۔ اُن میں سے جنھوں نے آپ کو
مان لیا وہ کامیاب ہوگئے اور ترقی کرگئے ۔ حضرت ابوبکرؓ اور
ابوجہل میں آخر کیا فرق تھا بلکہ ابوجہل اپنی قوم میں حضرت
ابوبکرؓ سے زیادہ عقلمند سمجھا جاتا تھا لیکن حضرت ابوبکرؓ
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر کہاں سے
کہاں پہنچ گئے اور ابوجہل آپ کا انکار کرکے کہاں
سے کہاں جا گرا ۔

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں قوم ایسا کرتی
ہے وہ کیوں بچ گئی ۔ فلاں قوم بدکاریاں بھی کرتی ہے
اور دوسرے کام بھی کرتی ہے اگر وہ کامیاب ہوگئی ہے
تو ہم اسلام کے احکام یعنی نمازوں ، روزوں اور پردہ
وغیرہ کے احکام پر عمل کرنے کے بغیر کیوں کامیاب نہیں
ہوسکتے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے لوگوں کے مطابق
اس سکیم کا پہلا حصہ تھا بعد کے زمانہ میں یعنی جب ایک
دفعہ نبی کی قوم غالب آگئی تو اب سکیم کا دوسرا حصہ چلتا
ہے جو نبی کے ماننے والوں کے متعلق ہے اور وہ یہ کہ اگر
وہ عملاً دین کو چھوڑ دیتے ہیں تو خدا تعالیٰ انکو زیادہ
سزا دیتا اور اُن کے دشمن کا خیال چھوڑ دیتا ہے اور
ظاہری ماننے والوں سے فرماتا ہے کہ وہ قومیں اس زمانہ
کی سکیم کے مطابق چلنے کی دعویدار نہیں ۔ اس سکیم
کے مطابق چلنے کے دعویدار تم ہو ۔ تم اس سکیم کے پُرزے
ہو ، وہ تو اس کے پُرزے نہیں ۔ یہ قانون تمہارے
لئے ہے اُن کے لئے نہیں ۔ جو قومیں اس سکیم کی مخاطب ہی
نہیں یا جو ابھی تک مخاطب نہیں ہوئیں وہ اگر اس کے
خلاف چلتی ہیں تو انہیں کوئی سزا نہیں ۔ تو چونکہ اُنکی
سزا کی سکیم زمانہ نبوی میں پوری ہو چکی اب اُن کو اُنکی
بدعملیوں کی وجہ سے سزا دینے کی اتنی ضرورت نہیں
جتنی کہ تم کو تمہاری بدعملیوں کی سزا دینے کی ضرورت ہے ۔

اِس زمانہ میں مسلمان اگر ترقی کرسکتے ہیں تو اسلام
کے احکام پر عمل کرکے ہی کرسکتے ہیں ۔ مسلمان اپنے مذہب
کو چھوڑ کر ترقی نہیں کرسکتے ۔ مسلمان تو اس زمانہ میں
خدا تعالیٰ کی طرف سے جاری شدہ سکیم کے پُرزے ہیں
اگر وہی اس سکیم کو چھوڑ دیں تو یہ نظام کیسے چل سکتا
ہے ۔ اگر مسلمان مذہب پر چلے بغیر ترقی پاسکتا ہے تو
خدا تعالیٰ کو اس سکیم کے جاری کرنے کی ضرورت ہی کیا
تھی ؟ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان اسلام کے
بغیر ترقی نہیں کرسکتے ۔ لیکن جب احمدیت پورے طور پر
قائم ہو جائے گی اُس وقت دوسرے مسلمان اس سکیم
کے پُرزے نہیں رہیں گے اور وہ اس کے بغیر بھی ترقی
کرسکیں گے ۔ مگر جب تک احمدیت دنیا میں قائم نہیں
ہو جاتی اُس وقت تک دوسرے مسلمان بھی اس سکیم
کے ایسے ہی پُرزے ہیں جس طرح احمدی اس سکیم کے
پُرزے ہیں اور وہ اس کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتے ۔

دوسری قومیں اسلام کے بغیر ترقی کرسکتی ہیں
کیونکہ وہ اس سکیم کے پُرزے نہیں وہ تو پہلے سے
خدا تعالیٰ کو چھوڑ چکی ہیں اُن کے مزید بگڑ جانے سے

فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝

وہی شخص تو یتیم کو دھتکارا کرتا ہے ۳ے

موجودہ زمانہ کے مذہب یعنی اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ لیکن اگر مسلمانوں کو بھی اسلام چھوڑنے پر دنیا کی ترقی اور غلبہ مل جائے تو وہ بھی اسلام کو چھوڑ دیں گے اِس صورت میں خدا تعالےٰ کی ہدایت کا کوئی حامل نہ رہیگا اور محمدی سکیم ناکام ہو جائے گی۔ پس اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اسلام کے بغیر ترقی نہ دے گا تا اُن کو مجبوراً اسلام کیطرف لوٹنا پڑے اور دنیا کے دکھ آخر اُنہیں خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ کریں اور اسلام کے ذریعے جو خدا کی سکیم جاری ہوئی ہے وہ دنیا میں زندہ اور قائم رہے مگر عیسائی اپنے مذہب پر عمل نہیں کرتا تو وہ باوجود بگڑنے کے بے شک ترقی کرتا چلا جائے گا۔ اگر ہندو اپنے مذہب پر عمل نہیں کرتا تو وہ باوجود بگڑنے کے بیشک ترقی کرتا چلا جائے گا کیونکہ وہ مذاہب تو اپنی ذات میں بھی بگڑ چکے ہیں۔ اُن کے بگڑنے سے خدا تعالےٰ کی سکیم کی موٹر خراب نہیں ہوتی لیکن اگر مسلمانوں کو خدا تعالےٰ باوجود بگڑنے کے ترقی کرنے دے تو پھر اُس کی موٹر رُک جائے گی کیونکہ مسلمان اُس کی موٹر کے پُرزے ہیں اگر اِن کو غافل ہونے دیا جائے تو موٹر بھی خراب ہو جائے گی۔ پس اللہ تعالےٰ فرماتا ہے مجھے بتا تو سہی اُس شخص کا حال جو شانِ الٰہی کا انکار کرتا ہے، اُس سلسلہ کا انکار کرتا ہے جس کو خدا تعالےٰ نے اِس زمانہ میں جاری کیا (یہاں سلسلہ سے مراد سلسلہ محمدی ہے کیونکہ جو سلسلہ خدا تعالےٰ نے اِس زمانہ میں جاری کیا ہے وہ سلسلہ محمدی ہی ہے) اگر کوئی شخص ایسا ہی جو سلسلہ محمدیہ کا انکار کرتا ہے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اِس زمانہ میں اگر ترقی اور کامیابی حاصل ہوگی تو سلسلہ محمدیہ پر چل کر ہی ہوگی اور اِس سلسلہ کا پُرزہ بننے کی صورت میں ہی ملے گی (جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اِس سے مراد اسلام کے غلبہ سے پہلے کا زمانہ ہے اِس کے بعد سکیم کا دوسرا حصہ چلتا ہے)

۳ے حل لغات۔ يَدُعُّ دَعَّ سے مضارع کا صیغہ ہے اور دَعَّهُ دَعًّا کے معنے ہیں دَفَعَهُ دَفْعًا عَنِيْفًا۔ اس کو سختی سے ہٹایا۔ وَفِی الْاَسَاسِ "دَعَّ الْيَتِيْمَ"۔ دَفَعَهُ بِجَفْوَةٍ۔ "اساس" لغت کی کتاب میں دَعَّ الْيَتِيْمَ کے معنے یہ لکھے ہیں کہ یتیم کو دھتکارا اور اُس سے بُرا سلوک کیا (اقرب الموارد)

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جو دین کی تکذیب کرتا ہے وہی یتیم کو دھتکارنے والا ہے۔ فاء جو ذٰلِكَ سے پہلے آئی ہے بتاتی ہے کہ اِس سے پہلے کوئی جملہ محذوف ہے کیونکہ ظاہر جملہ یعنی اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ 'فاء' کی وجہ نہیں بن سکتا۔ یہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ مفسرین کے نزدیک اِس جملہ کی مختلف تشریحات ہیں۔ صاحب کشاف یعنی علامہ زمخشری جو تفسیر کے لحاظ سے تو اعلیٰ پایہ کے نہیں سمجھے جاتے مگر نحو اور لغت کے امام مانے جاتے ہیں اُن کے نزدیک یہاں فاء سے پہلے اِنْ لَمْ تَعْلَمْهُ کا جملہ محذوف ہے یعنی اے مخاطب اگر تو نہیں جانتا کہ وہ کون شخص ہے جو دین کی تکذیب کرتا ہے تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اُس میں یہ یہ علامات پائی جاتی ہیں۔

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ کے متعلق مفسرین کا ایک اعتراض اور اس کا جواب

بعض مفسرین نے اِس آیت پر ایک اعتراض وارد کیا ہے اور وہ یہ کہ اِنْ لَمْ تَعْلَمْ کا جملہ شک پر دلالت کرتا ہے لیکن خدا تعالےٰ جو علیم و خبیر ہے اُسے شک نہیں ہو سکتا کہ مخاطب اِس امر کو جانتا ہے یا نہیں۔ اِس اعتراض کے مختلف لوگوں نے مختلف

جواب دیئے ہیں مگر میرے نزدیک اِس جگہ اِس جملہ کے استعمال کی وجہ یہ ہے کہ اس جگہ مخاطب ایک مخصوص شخص نہیں بلکہ فرداً فرداً تمام بنی نوع انسان یا قرآن کریم کے پڑھنے والوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب مخاطب متعدد ہوں تو بعض کو اِس مضمون کا جس کا ذکر اس آیت میں ہے علم ہوگا اور بعض کو علم نہیں ہوگا۔ پس جب متعدد مخاطبین کا علم اس مضمون کے بارہ میں مختلف ہونا ممکن ہے تو یہ آیت متکلم یعنی اللہ تعالیٰ کے شک پر دلالت نہیں کرتی بلکہ مخاطبین کی مختلف حالتوں پر دلالت کرتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب اگر تو اس سوال کا جواب نہیں جانتا تو اس کا جواب یہ ہے۔

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ جیسے کہ بتایا جا چکا ہے اَرَءَیْتَ میں ہمزہ استفہام کا نہیں بلکہ تاکید کا ہے اور محاورہ میں اِس کے معنے ہیں مجھے بتا تو سہی۔ پس جب اس جگہ سوال کیا ہی نہیں گیا تو اللہ تعالیٰ کے متعلق شک کا الزام پیدا ہی نہیں ہوتا۔

اِس جگہ یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گو اَرَءَیْتَ میں حرف تا استعمال کیا گیا ہے جو ضمیر مخاطب واحد ہے مگر اس سے مراد بہت سے افراد ہیں۔ جیسا کہ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (بنی اسرائیل ع ۳) یعنی اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اگر تیرے ماں باپ بوڑھے ہو جائیں تو تو اُنہیں اُف تک مت کہیو اور اُنہیں مت جھڑکیو۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظی معنے بالکل غلط ہیں کیونکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یتیم تھے بلکہ اُن کی والدہ بھی اُن کے بچپن میں فوت ہو گئی تھیں اور قرآن کریم میں سورۃ والضحیٰ میں آپ کے یتیم ہونے کا ذکر آتا ہے۔ پس آیت فَلَا تَقُلْ میں خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں اور جب آپ سے خطاب نہیں

اَرَءَیْتَ میں مخاطب صرف آنحضرتؐ نہیں

تو لازماً سب مسلمانوں سے خطاب ہے۔ اور ضمیر واحد لانے کی وجہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کو فرداً فرداً مخاطب کیا گیا ہے تاکہ مضمون پر خاص زور پڑے اور مطلب یہ ہے کہ اے زید تو بھی اور اے بکر تو بھی اس حکم کو غور سے سُن لے کہ اگر تیرا باپ اور تیری ماں بوڑھے ہو جائیں اور بڑھاپے سے اُن کا مزاج چڑچڑا ہو جائے تو تو اُن کے غصہ کو برداشت کر لیا کر۔ اور اُن کی باتوں کو سُنکر اتنا بھی نہ کہا کر کہ ’بس جانے دیجئے‘۔ غرض کبھی کبھی مفرد کا لفظ جمع کیلئے بھی بولا جاتا ہے اور اُس وقت تمام افراد انسانی یا افراد قوم فرداً فرداً مخاطب ہوتے ہیں۔ اسی قاعدہ کے مطابق اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ میں بھی فرداً فرداً تمام مسلمان یا تمام انسان مراد ہیں اور کہا گیا ہے کہ جو جانتا ہے وہ بھی یاد رکھے اور جو نہیں جانتا وہ بھی جان لے کہ تکذیبِ دین کرنے والا مختلف گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کوفی جو نحو کے علماء میں سے ہیں کہتے ہیں کہ اِس جگہ ہمزہ انکار کا نہیں بلکہ تاکید کا ہے (میں اس کے بارہ میں پہلے لکھ چکا ہوں) اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ کیا تُو نے وہ شخص دیکھا ہے جو تکذیبِ دین کرتا ہے یعنی تجھے یقیناً معلوم ہے کہ تکذیبِ دین کرنیوالا کون ہے۔ ہم اُس کے انجام کی تجھ کو خبر دیتے ہیں کہ وہ قسم قسم کے گناہوں میں مبتلا ہو جائیگا۔ اِن معنوں کے رُو سے یہ آیت ایک پیشگوئی پر مشتمل سمجھی جائے گی اور اس طرف اشارہ سمجھا جائیگا کہ اسلام کی مخالفت کرنے والے قسم قسم کے گناہوں میں مبتلا ہو جائینگے اور ایسا ہی ہُوا۔

یتیم کو دھتکارنا اور اُس سے بدسلوکی کرنا قرآن کریم کے نزدیک بدترین اعمال میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ بار بار قرآن کریم میں اِس کا ذکر فرماتا ہے۔ مثلاً اَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْھَرْ۔ قرآن کریم میں یتیم کے متعلق جتنے بھی لفظ آتے ہیں وہ دھتکارنے، رد کرنے

اور دبا دینے کے آتے ہیں۔ اس پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تعلیم کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یتیم ہونے کا ردِ عمل تو نہیں؟ اور یہ سوال اُن لوگوں نے اُٹھایا ہے جن کے نزدیک قرآن کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت کی آواز ہے، خدا تعالےٰ کی آواز نہیں۔ اور ایسے لوگ دو قسم کے ہیں۔ بعض لوگ مسلمان ہیں اور بعض غیر مسلمان۔ جو مسلمان ہیں وہ کہتے ہیں کہ چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت پاک اور منزّہ تھی اِس لئے جب آپ نے دنیا کی خرابیوں کو دیکھا تو اُن کے خلاف آپ کے دل میں جوش پیدا ہو گیا۔ آپ نے احتجاج کیا اور اُن کے خلاف آواز اُٹھائی اور یہی آواز جو آپ کی نیک اور پاک فطرت کی طرف سے اُٹھائی گئی تھی، اللہ تعالیٰ کی آواز تھی۔ دوسری قسم کے لوگ جو غیر مسلم ہیں وہ کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک ذہین اور ہوشیار آدمی تھے۔ جب آپ نے دنیا میں مظالم دیکھے، خرابیاں اور برائیاں دیکھیں تو آپ کے اندر اُن کا ردِ عمل پیدا ہو گیا اور اُن سے متاثر ہو کر جو باتیں آپ نے کہیں وہ قرآن کریم ہے لیکن آپ اپنے خیال میں نعوذ باللہ من ذالک بوجہ کمی علم کے اُسے خدا تعالےٰ کی آواز سمجھ کر کہتے تھے کہ مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ ورنہ الہام وغیرہ کوئی نہیں ہوتا تھا۔ آپ ذکی الحس تھے، حاد الطبیعت تھے اور آپ کی فطرت صاف تھی۔ پس آپ کی صاف فطرت نے اچھی باتیں پیدا کریں اور آپ نے خیال کر لیا کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔ پس یہاں یہ اعتراض ہوتا ہے کہ آپ جو بار بار کہتے ہیں کہ یتیم کی خبر گیری کرو، یتیم کی خبر گیری کرو۔ تو کیا آپ کے یتیم ہونے کا یہ ردِ عمل تو نہیں۔ ہر ایک چیز کا ایک ردِ عمل ہوتا ہے اِسی ردِ عمل کے نتیجہ میں بعض دفعہ انسان اُس کے اُلٹ کام کرتا ہے اور بعض دفعہ اُس کے مطابق کام کرتا ہے۔ بعض لوگ دیکھتے ہیں کہ دنیا کے بہت سے لوگ ظلم کرتے جا رہے ہیں وہ بھی اس ماحول سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اُن کی طبائع میں اُس کا ردِ عمل اِس طرح پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھی ظلم کرنے لگ جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ہم سب ظالموں سے بدلے لے رہے ہیں۔ اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ مظالم کو دیکھتے ہیں تو انصاف کی رُوح اُن کے اندر پیدا ہو جاتی ہے، ظلم کے خلاف اُن کے اندر جوش پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اُس کے خلاف ہر ممکن قربانی کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ غرض علم النفس کے ماتحت انسان کے اندر جو ردِ عمل ہوتا ہے وہ کبھی تو اصل فعل کے مطابق ہوتا ہے اور کبھی اُس کے مخالف ہوتا ہے۔ پس اِس موقعہ پر بعض منکرین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جو فرماتے ہیں کہ یتیم کی خبر گیری کرو، یتیم کی خبر گیری کرو۔ کیوں نہ یہ سمجھا جائے کہ یہ تعلیم آپ کے یتیم ہونے کا ردِ عمل ہو یعنی یہ خدا تعالےٰ کا کلام نہیں آپ کی فطرت کی آواز ہے کیونکہ آپ یتیم تھے۔ آپ پر جو ظلم کئے گئے آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ میرے یتیم ہونیکے سبب سے ہے۔ آپ کا دل نہایت حساس تھا اُس نے دنیا سے اُن مظالم کا بدلہ لینا چاہا، آپ کے اندر ایک جوش اُٹھا آپ نے دیکھا کہ آپ جیسے اور بھی یتیم ہیں جو لوگوں کے ظلموں کا شکار ہو رہے ہیں۔ اُن پر سختیاں کی جاتی ہیں، تکالیف دی جاتی ہیں اور مختلف قسم کے اور مظالم توڑے جاتے ہیں۔ آپ نے کہا بہت اچھا اب میں اِن ظلموں کا بدلہ لوں گا۔ میں اُنہیں مٹنے دوں گا، اُن پر الزام لگاؤں گا، اُن کی بُرائیاں بیان کروں گا اور یتیموں کی مدد کروں گا۔ آپکے اندر جوش پیدا ہو گیا۔ آپ کی طبیعت صاف تھی اُس کے اندر سے ایک آواز اُٹھی یہ طبعی آواز تھی جو قدرتی طور پر آپ کے اندر سے اُٹھی۔ مگر آپ نے ناواقفیت کی وجہ سے (نعوذ باللہ من ذالک) اُسے الہام سمجھ لیا۔

ہم کہتے ہیں یہ درست نہیں کہ قرآن کریم آپ کی فطرت کی آواز ہے اور اس کی تعلیم اس ردِّ عمل پر مشتمل ہے جو اس زمانہ کے حالات کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں پیدا ہوا۔ گو ہم عقیدۃً بھی مانتے ہیں کہ قرآن کریم خدا تعالےٰ کا کلام ہے مگر علم ظاہر کے لحاظ سے بھی ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ قرآن کریم نفسیاتی ردِّ عمل کا نتیجہ نہیں ہے پس مسلمان متشکک کے لئے تو ہمارا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں خُدا تعالیٰ کا کلام ہے اس لئے اُس کے 'ردِّ عمل' ہونے کا خیال بالبداہت باطل ہے۔ کیا خدا تعالےٰ یتیم یا مسکین ہے کہ یتامیٰ اور مساکین پر جو ظلم ہوتے تھے اُن کے جواب میں اُس کے دل میں بھی ایک ردِّ عمل ہوا اور اُس نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اس ردِّ عمل کا اظہار فرمایا۔ لیکن اسلام کے منکر کے اعتراض کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ قرآن کریم کے دعویٰ کو نظر انداز کر کے عقلاً بھی یہ اعتراض درست نہیں ہے کیونکہ واقعات سے ثابت ہے کہ یتامیٰ وغیرہ کے خلاف قرآن کریم کی تعلیم انتقامی نہیں، اصلاحی ہے۔ ہم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے یُتم کے زمانہ کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا یُتم ایسا نہیں تھا کہ اُس کے خلاف آپ کے اندر کوئی ردِّ عمل پیدا ہوتا۔ اگر آپ کے اَور رشتہ دار نہ ہوتے یا ایسے رشتہ دار ہوتے جو آپ پر ظلم کرتے، آپ پر سختی کرتے اور تکالیف دیتے۔ تب تو یہ اصلاحی آواز نہیں انتقامی آواز ہوتی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آپ پر ایسا دن آیا ہی نہیں کہ جب آپ نے یُتم کو محسوس کیا ہو۔ بے شک آپ یتیم تھے لیکن ساتھ ہی خدا تعالےٰ نے ایسے سامان پیدا کر دئے تھے جن کی وجہ سے آپ نے یُتم محسوس نہیں کیا چنانچہ آپ کے والد کی وفات پر آپ کے دادا نے آپ کو اپنا بیٹا بنا لیا اور آپ اپنی والدہ کے ہی انتظام میں رہے۔ آپ کے دادا نے یہ نہیں کیا کہ آپ کو والدہ سے چھین لیا ہو۔ جیسے بعض ظالم کرتے ہیں

یتامیٰ کے متعلق اسلامی تعلیم کسی ردِّ عمل کا نتیجہ نہیں

ظاہری طور پر تو وہ کہتے ہیں کہ ہم یتیم کی پرورش کر رہے ہیں لیکن در اصل ماں کو دُکھ پہنچانا اُن کا مقصود ہوتا ہے اگر عبد المطلب آپ کو آپ کی والدہ سے لے لیتے تو بظاہر ماں کو دُکھ ہوتا لیکن اِسکا اثر آپ پر بھی پڑتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ردِّ عمل کا سوال پیدا ہو سکتا تھا۔ آپ دوسرے بچوں کو ماں ماں کہتے سنتے اور ماں باپ کا اپنے بچوں سے نیک سلوک دیکھتے تو آپ کے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوتی کہ کاش میری بھی ماں ہوتی یا یہ خیال پیدا ہوتا کہ اگر میرا بھی باپ ہوتا تو مجھے کوئی میری ماں سے کیوں چھینتا۔ لیکن عبد المطلب نے ایسا نہیں کیا۔ آپ کے والد کے فوت ہو جانے کے بعد آپ کو آپکی والدہ کے قبضہ میں ہی رہنے دیا اور کہا کہ اس کے باپ کی جگہ مجھے سمجھو۔ لیکن اِس کی پرورش کا انتظام تم ہی کرو کوئی تکلیف ہو یا کوئی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ۔ یہ نہ سمجھنا کہ اِس کا باپ فوت ہو گیا ہے۔ جب واقعات یہ تھے تو قدرتی بات ہے کہ آپ کے اندر اپنے یتیم ہونے کا ردِّ عمل پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر مکّہ کے دستور کے مطابق بچوں کو کچھ عرصہ کے لئے مکّہ سے باہر بھیج دیا جاتا تھا کہ وہ بچپن گاؤں میں گزاریں تا اُن کی زبان اچھی ہو جائے اور صحت بھی اچھی ہو جائے۔ گاؤں والوں کی زبان زیادہ صاف ہوتی تھی۔ عرب اور دوسرے ملکوں میں یہ فرق ہے کہ دوسرے کسی ملک کی دیہاتی زبان صاف نہیں ہوتی بلکہ شہری زبان صاف ہوتی ہے۔ لیکن عرب میں شہروں کی زبان ادنیٰ سمجھی جاتی تھی اور گاؤں کی زبان اعلیٰ سمجھی جاتی تھی۔ اصل میں تو سب کا سب عرب ہی زبان کے لحاظ سے ایک سطح پر تھا شہر اور گاؤں کی بولی ایک ہی قسم کی تھی لیکن شہر والے لوگ چونکہ غیر ممالک کے لوگوں سے ملتے جلتے رہتے تھے اِس لئے اُن کی زبان میں دوسری زبانوں کے بعض الفاظ مل گئے تھے اِس لئے عرب میں یہ دستور تھا کہ بچپن میں پانچ سات سال تک کیلئے

بچوں کو مکّے سے باہر بھیج دیا جاتا تھا تا مضبوط ماں کا دُودھ پینے کی وجہ سے اُن کی صحت اچھی ہو جائے اور گاؤں میں رہنے سے زبان بھی دوسری زبانوں کے اختلاط سے محفوظ رہے۔ مکّے سے باہر جو گاؤں تھے اُن کی عورتیں آتی تھیں اور مکّہ والے انہیں اپنے بچے دے دیتے تھے اور وہ اُن کو پال کر لے آتی تھیں۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی والدہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ آپ کی والدہ نے بھی چاہا کہ وہ اپنا بچہ کسی عورت کو دے دیں تا وہ اُسے پالکر لے آئے۔ لیکن چونکہ آپ یتیم تھے اِس لئے کوئی عورت اِس خیال سے آپ کو لینے کے لئے تیار نہیں تھی کہ اُن کے پالنے کے بعد انعام کون دے گا۔ اُن باہر کر آنے والی عورتوں میں سے ایک حلیمہ بھی تھیں۔ آپ غریب خاندان کی فرد تھیں۔ آپ اِس لئے مکّہ آئی تھیں کہ کسی مالدار کا بچہ مل جائے تو پال پوس کر اچھا انعام حاصل کریں۔ آپ حضرت ﷺ کی والدہ کے پاس بھی گئیں اُنہوں نے اُن کو سب حالات ٹھیک ٹھیک بیان کر دئے جس پر وہ مایوس ہو کر دوسرے بچہ کی تلاش میں چلی گئیں۔ لیکن چونکہ بچہ والے بھی دایوں سے پوچھتے تھے کہ کیا وہ کھاتے پیتے لوگ ہیں کیونکہ اگر وہ خود کھاتے پیتے نہ ہوں تو بچہ کی پرورش اچھی طرح نہیں کر سکتے لیکن حلیمہ چونکہ خود بھی غریب تھیں مکّہ کی کسی عورت نے اُن کو اپنا بچہ دینا پسند نہ کیا۔ غرض ایک طرف آپ کو یتیم ہونے کی وجہ سے ہر دائی ردّ کرتی گئی اور دوسری طرف حلیمہ کو غریب ہونے کی وجہ سے سب گھر ردّ کرتے گئے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ سارا دن پھر کر اور ناکام رہ کر حلیمہ آخر آپ ﷺ کی والدہ کے پاس آئیں اور کہا کہ لاؤ بچہ ہم اِسے پالینگے۔ چونکہ دوسری دائیاں آپ ﷺ کو ردّ کر چکی تھیں آپ کی والدہ نے بھی اس تجویز کو پسند کر لیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حلیمہ خوش قسمت، حلیمہ جس کی قسمت میں ایک تاریخی وجود ہونا لکھا تھا کی گود میں ڈال دئے گئے۔ یہ ایک الٰہی تدبیر تھی۔ اگر آپ کو دائی نہ ملتی اور بچپن میں کچھ سال گذارنے کے لئے آپ کو کسی گاؤں میں نہ بھیجا جاتا۔ تب تو ہو سکتا تھا کہ آپ کے اندر یتیم کا خیال پیدا ہوتا۔ آپ دوسرے بچوں کو دیکھتے کہ وہ مکّہ سے باہر گاؤں میں رہے ہیں، اچھے ماحول میں رہے ہیں، اُن کی زبان اچھی ہے، اُن کی صحتیں اچھی ہیں تو خیال کرتے کہ مجھے بھی کوئی بچپن میں گاؤں بھیجتا، میں بھی ورزش کرتا، دُودھ پیتا تو میری بھی صحت اچھی ہوتی، زبان صاف ہوتی مگر ایسا نہیں ہُوا۔ اِس لئے کہ میں یتیم تھا۔ اچھا اب میں اِس کا بدلہ لوں گا۔ مگر آپ ﷺ کے دل میں تو یہ زخم پیدا ہی نہیں ہوتے تھے اور جب آپ کو اپنے یُتم کا احساس ہی نہیں ہُوا تو آپ کے اندر اُس کا ردِّ عمل کس طرح پیدا ہُوا۔

جب آپ حلیمہ کے گھر میں گئے تو اُس کی حالت آپ کے جانے سے بدل گئی اور گھر میں برکت آگئی اور اُس نے سمجھ لیا کہ یہ سب کچھ اس بچہ کی برکت سے ہے۔ حلیمہ، اُس کا خاوند اور سب گھر کے چھوٹے بڑے آپ کے گرویدہ ہو گئے اور آپ ﷺ پر نثار ہونے لگے اگر گھر میں غربت رہتی اور آپ کو دوسرے بچوں سے کم آرام ملتا تب تو ممکن تھا کہ آپ کے دل میں ردِّ عمل پیدا ہوتا۔ اِسی طرح جب آپ اپنے گھر واپس آئے تو دادا دل و جان سے فدا ہو کر آپ کی خدمت کرتے۔

آپ کی والدہ فوت ہو گئیں تو آپ کے دادا عبد المطلب آپ کو اپنے پاس لے گئے۔ عبد المطلب کے بیٹے بیان کرتے ہیں کہ جب آپ مجلس میں بیٹھتے تو آپ کا اتنا رُعب ہوتا تھا کہ ہم میں سے جوان سے جوان کی بھی طاقت نہیں ہوتی تھی کہ آپ کے سامنے آنکھ اُٹھائے۔ عرب میں بڑوں کا بہت ادب کیا جاتا تھا اور کروایا جاتا تھا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بچپن کی وجہ سے بعض دفعہ دادا سے کھیلتے ہوئے اُن کے کندھوں پر چڑھ جاتے۔ آپ کے بیٹے سُرخ سُرخ آنکھوں سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے مگر حضرت عبدالمطلب فرماتے خبردار میرے اِس بچے کو بُری نگاہ سے نہ دیکھنا۔ غرض رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایک بھی ایسا لمحہ نہیں آیا کہ جب آپ کو اپنے یُتم کا احساس پیدا ہُوا ہو۔ جب حضرت عبدالمطلب فوت ہوئے آپؐ کی عمر اُس وقت آٹھ نو سال کی تھی۔ وفات سے کچھ دیر پہلے اُنہوں نے اپنے بیٹے ابوطالب کو بلایا اور فرمایا مَیں تم پر دوسرے بچوں کی نسبت زیادہ اعتبار کرتا ہوں۔ یہ میری امانت ہے اِسے اپنے بچوں کی طرح پالنا۔ دیکھنا اس کا دل مَیلا نہ ہو۔ ابوطالب نے بھی اپنے عہد کو نباہا۔ آپ اپنے بچوں کو اپنے بچے نہیں کہتے تھے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنا بچہ کہا کرتے اور آپ سے بہت پیار کیا کرتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ آپؐ کو وقار تھے۔ آپ کی چچی کو تو آپ سے اتنی محبت نہیں تھی اور نہ ہی آپ کے دادا نے اُسے آپ کے متعلق کوئی وصیت کی تھی اور نہ ہی چچی کا رشتہ کوئی خونی رشتہ ہوتا ہے۔ لیکن تاریخ سے یہ ثابت نہیں کہ آپ کی چچی نے آپ پر کبھی کوئی سختی کی ہو آپ کی چچی جب گھر میں کوئی چیز بچوں میں تقسیم کرتیں تو سب سے پہلے اپنے بچوں کو دیتیں شاید اس لئے کہ وہ چھوٹے تھے۔ اُس وقت سب بچے اپنی ماں کو چمٹ جاتے اور کہتے ہمیں بھی دو، ہمیں بھی دو۔ لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک طرف بیٹھے رہتے اور اِس شور میں حصہ نہ لیتے تھے بعض دفعہ ایسے موقعہ پر ابوطالب بھی آجاتے تھے آپ کو ایک طرف بیٹھا ہُوا دیکھکر ابوطالب خیال کرتے کہ شاید اس بچہ کا خیال ہو کہ میرا اِس گھر میں کوئی حصہ نہیں۔ گو آپ کا اِس طرح بیٹھنا وقار کی وجہ سے تھا جو بچپن سے آپ کو حاصل تھا بہرحال ابوطالب کے دل میں محبت جوش مارتی اور آپ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پکڑ کر آگے لاتے اور کہتے تم نے میرے بچہ کو اب تک کچھ نہیں دیا۔ ابوطالب ہمیشہ آپؐ کو اپنا بچہ ہی کہتے تھے۔ اِس حالت میں آپکو یُتم کا احساس کس طرح ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی احساس ہو سکتا تھا تو یہی کہ میرے رشتہ داروں نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے۔ خواہ اُن سے وہ سلوک خدا نے ہی کروایا تھا لیکن آپ تو یہ سمجھتے تھے کہ جس گھر میں مَیں جاتا ہوں وہ میرے ساتھ محبت اور پیار سے پیش آتے ہیں اور میرے ساتھ نیک سلوک کرتے ہیں۔ غرض ایسا موقعہ کوئی آیا ہی نہیں کہ آپ کے اندر یُتم کا احساس پیدا ہو سکتا ہو۔ پس یُتم کے احساس کی وجہ سے یہ تعلیم پیدا نہیں ہوئی کہ اِسے انتقامی کہا جائے یا نفسیاتی۔ لیکن اگر بفرضِ محال اِسے نفسیاتی بھی مان لیا جائے تو پھر یہ اصلاحی تھی انتقامی نہیں تھی۔ اِس صورت میں یہ کہا جائے گا آپ نے خیال کیا کہ میرے رشتہ دار اتنے شریف اور اچھے تھے کہ اُنہوں نے میرے اندر یُتم کا احساس پیدا نہیں ہونے دیا۔ اب میرا بھی فرض ہے کہ مَیں اِس دُکھ کو دُور کروں۔ یہ احساس تو پیدا ہو سکتا ہے اور عقل بھی اِسے مان سکتی ہے لیکن اِس کے سوا کسی نفسانی اثر کو عقل نہیں مان سکتی۔ لیکن حقیقت وہی ہے جو مَیں اُوپر لکھ آیا ہوں کہ تمام عقلی دلائل اور نقلی براہین اِس امر پر شاہد ہیں کہ یہ تعلیم آسمانی ہے انسانی نہیں۔

دوسرا اعتراض یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم یہ کیسے تسلیم کر لیں کہ دین کے انکار کا طبعی نتیجہ یتیم کو دھتکارنا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لفظِ دین کا نتیجہ تو بے شک یتیم کو دھتکارنا نہیں مگر جو بارہ معنے مَیں اوپر بیان کر آیا ہوں اُن میں سے ہر ایک کے انکار کا نتیجہ یتیم کا دھتکارنا بھی اور دوسری بدیاں بھی ہیں۔

لفظِ دِین کو بھی دین کے معنوں میں نہیں لینا چاہیئے بلکہ اُن بارہ معنوں کو مدِنظر رکھنا چاہیئے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک کے انکار کا نتیجہ بدی اور گناہ ہے اور بدیوں اور گناہوں میں سے ایک اہم بدی یتیم کو دھتکارنے کی ہے اور اس کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ فعل گناہ ہی نہیں بلکہ اِس میں دنایت بھی پائی جاتی ہے اور اس فعل کا مرتکب انسانیت سے بہت ہی گرا ہوا شخص معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ گناہ قومی گناہ ہے اِس سے قومی شیرازہ بکھرتا ہے اور آئندہ نسل کے اخلاق اور موجودہ نسل کی قربانیوں پر اس کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ پس اللہ تعالٰے نے اِس گناہ کو بطور معیّن نتیجہ کے بیان نہیں کیا بلکہ بطور مثال بیان کیا ہے۔ دین کے انکار کے کئی نتیجے ہوتے ہیں۔ اُن میں سے ایک نتیجہ یہاں بطور مثال کے لیا گیا ہے اور پھر اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جیسا کہ اُوپر بطور اشارہ لکھا جا چکا ہے یتیم کی طرف توجہ نہ کرنا قوم کو تنزّل کی طرف لے جاتا ہے۔ قوم افراد کے ایثار اور قربانی سے بنتی ہے اور افراد کے پیچھے رہنے والی چیز اولاد ہوتی ہے۔ انسان قوم کی خاطر مرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے مگر جب وہ دیکھتا ہے کہ میری اولاد پیچھے رہ جائے گی اُن کی کوئی پرورش نہیں کریگا اور وہ یُونہی ضائع ہو جائیگی تو وہ قربانی کرنے سے رُک جاتا ہے۔ اگر صرف اُس کی جان کا سوال ہوتا تو وہ پرواہ بھی نہ کرتا مگر چونکہ اولاد کا سوال اُس کے سامنے آجاتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ اُس کی پرورش کون کرے گا تو وہ قربانی سے رُک جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جان کی قربانی کے موقعہ پر اکثر جوان ہی آگے آتے ہیں۔ اِس لئے نہیں کہ نوجوان زیادہ عقلمند ہوتے ہیں بلکہ صرف اِس لئے کہ وہ یا تو شادی شدہ نہیں ہوتے اور اگر شادی شدہ بھی ہوتے ہیں تو اُن کی اولاد نہیں ہوتی۔ اِس لئے انہیں اپنی موت کے بعد کسی کا فکر نہیں ہوتا۔ اور کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جو اُنہیں قربانی سے روکنے والی ہو۔ لیکن بڑی عمر والوں کے بیوی اور بچے ہوتے ہیں وہ خیال کرتے ہیں کہ اگر وہ مارے گئے تو اُن کی بیویاں بیوہ رہ جائینگی اولاد یتیم ہو جائے گی، کوئی اُن سے حسنِ سلوک نہیں کرے گا اور وہ یونہی ضائع ہو جائے گی۔ یہ خیال جب اُن کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے تو وہ قربانی کرنے سے رُک جاتے ہیں۔ پس اگر یتیم کی طرف توجہ کی جائے تو اِس سے قوم کے اندر ایثار کا مادہ بڑھ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کی قربانی کا معیار اُس کے یتامیٰ کی خبرگیری کے مطابق ہوتا ہے۔ جتنا یتامیٰ کا خیال کسی قوم میں ہوگا اُتنا ہی زیادہ ایثار کا مادہ اُس کے افراد میں پایا جائے گا۔

یتامیٰ کی خبرگیری مذہبی طور پر ہی نہیں کیجاتی دنیوی طور پر بھی کی جاتی ہے۔ یورپ میں یتامیٰ کی بڑی خبرگیری کی جاتی ہے۔ بعض لوگ اپنی جانیں قربان کر کے یتامیٰ کی خبرگیری کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو یتامیٰ کی خبرگیری کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ بڑے بڑے یتیم خانے کھولتے ہیں اور اپنے روپے سے اور بعض دفعہ چندہ اکٹھا کر کے بھی یتامیٰ کی پرورش کرتے ہیں مگر ہمارے ملک میں یتیم خانے روٹی کمانے کے لئے کھولے جاتے ہیں اور بچوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ درحقیقت کسی قوم کا معیارِ قربانی اُس وقت تک نہیں بڑھ سکتا جب تک اُس میں یتامیٰ کی خبرگیری کا انتظام نہ ہو۔ اِسی لئے اللہ تعالٰے نے اِس ضرورت کا یہاں خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص دین کا منکر ہے یعنی دین کے کسی معنے کا بھی منکر ہے وہ فردی اور قومی نیکیوں سے محروم ہو جاتا ہے جن میں سے ایک یتامیٰ کی خبرگیری اور دوسری مساکین کی امداد ہے۔ لیکن جو دین کو مانتا ہے اُس کے اندر

فردی پاکیزگی اور قومی خدمت کا جذبہ پایا جاتا ہے وہ علاوہ اور نیکیوں کے اِس امر کی اہمیت کو بھی سمجھتا ہے کہ اگر یتامیٰ کے ساتھ بدسلوکی کی گئی تو اُس کا نتیجہ اُس کو اور اُس کی اولاد کو بھی بھگتنا پڑیگا ایسا آدمی کبھی بھی یتامیٰ کے ساتھ بدسلوکی نہیں کرسکتا۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یتامیٰ کی خبرگیری کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی۔ مشرکین مکہ مارے جاتے تھے تو اُن کے یتیم بچوں کی کوئی دیکھ بھال نہیں کرتا تھا۔ مگر مدینہ کے لوگ اپنے یتامیٰ کو سر پر اُٹھا لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مدینہ کے لوگ ایثار اور قربانی سے ڈرتے نہیں تھے۔ اُنہیں یہ فکر نہیں تھا کہ ہم مارے گئے تو ہمارے بچوں کی نگہداشت کون کرے گا۔ مگر مکہ والے لوگ ڈرتے تھے اِس لئے کہ اُن کے بعد اُن کے بچوں کی پرورش کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ آج کل کثرت سے ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ بیوہ عورت سے کوئی شادی نہیں کرتا مگر اُس زمانہ میں کیا ہوتا تھا۔ اِدھر بیوہ کی عدت گذری اور اُدھر اُس کے اور اُس کے بچوں کی پرورش کے خیال سے لوگوں نے اُن سے شادی کی درخواست پیش کردی۔ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اکثر بیواؤں سے شادی کی اور یتامیٰ کی پرورش کی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک نوجوان سے پوچھا کہ تُونے نوجوان لڑکی سے شادی کیوں نہیں کی۔ تو اُس نے جواب دیا۔ یا رسول اللہ میرے بھائی کے یتیم بچے تھے اُن کی پرورش کے لئے تجربہ کار عورت کی ضرورت تھی۔ اِس لئے میں نے بیوہ سے شادی کرلی ہے۔ جب کوئی صحابی شہید ہو جاتا یا فوت ہو جاتا تو لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے اور عرض کرتے یا رسول اللہ میری فلاں عورت سے شادی کرا دیجئے۔ تا میں اِن یتیم بچوں کی پرورش کرکے ثواب حاصل کرسکوں۔ غرض وہاں یہ سوال ہی نہیں تھا کہ اولاد یتیم رہ جائے گی۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب کسی کام کیلئے بازار سے گذرتے تو یتامیٰ آپ کو بازو سے پکڑ لیتے اور کہتے۔ یا رسول اللہ ہمیں فلاں ضرورت ہے آپ وہیں رک جاتے۔ اُن کے ساتھ تشریف لے جاتے اور فرماتے چلو تمہارا کام پہلے کردوں۔ یہی وجہ تھی کہ صحابہؓ قربانی میں دریغ نہیں کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ نہ رہے تو اور بہت سے ایسے دوست ہوں گے جو اُن کی اولاد کی پرورش اور نگہداشت کریں گے۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ صحابہؓ نے بیوہ سے شادی کی اور شادی کے بعد اپنی جائداد بیوی کے پہلے بچوں کو دے دی۔ اِسی قربانی کا نتیجہ تھا کہ صحابہؓ نے کبھی مرنے سے احتراز نہیں کیا۔ بے شک جان قربان کرنے کے جذبہ کے پیچھے جذبۂ ایمان و خواہشِ وصالِ الٰہی بھی تھی مگر جب اس کے ساتھ دنیوی سامان بھی مل جائیں تو یہ اور بھی زیادہ شاندار ہو جاتی ہے۔

ہماری جماعت میں بھی یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ وہ یتامیٰ کی خبرگیری پوری طرح نہیں کرتی۔ اِسی وجہ سے ہماری جماعت بھی مرنے سے گھبراتی ہے۔ اگر یتامیٰ کی خبرگیری کی جائے اور لوگ سمجھ جائیں کہ اگر ہم مرگئے تو ہماری اولاد ضائع نہیں ہوگی اور اسکی باقاعدہ پرورش کی جائے گی تو جماعت میں قربانی کا مادہ بڑھ جائے گا۔ میں اِس ڈر سے یتیم خانہ نہیں کھولتا کہ کئی دفعہ یتیم خانے کھولے مگر لوگوں نے بچوں سے ذاتی کام لینا شروع کردیا۔ اِسی لئے میں ایسے بچوں کو عام بورڈنگ میں ہی رکھنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں ٭

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝

اور مسکین کے کھانے کے لئے (لوگوں کو) ترغیب نہیں دلاتا ۝

۴ حل لغات۔ یَحُضُّ۔ حَضَّ سے مضارع کا صیغہ ہے اور حَضَّہٗ عَلَی الْاَمْرِ کے معنے ہیں حَمَلَہٗ عَلَیْہِ۔ اُس کو کسی بات کی ترغیب دلائی (اقرب) پس لَا یَحُضُّ کے معنے ہوں گے وہ آمادہ نہیں کرتا۔ ترغیب نہیں دلاتا۔

تفسیر۔ اِس آیت میں اللہ تعالےٰ نے دَعَّ کا لفظ نہیں استعمال کیا حَضَّ کا لفظ استعمال کیا ہے یہ نہیں کہا کہ جو شخص دین کی تکذیب کرتا ہے تُو دیکھے گا کہ وہ مسکینوں کو دھتکارتا ہے۔ بلکہ فرمایا وہ مسکینوں کو کھانا کھلانے کی دوسروں کو تلقین نہیں کرتا۔ اِس میں اِس طرف اشارہ ہے کہ وہ مسکینوں کو کھانا کھلا تو دیتا ہے مگر خلوصِ نیت سے نہیں۔ کیونکہ اگر وہ سچے دل سے کھانا کھلاتا تو دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دلاتا کیونکہ جو اچھی چیز ہو اُس کی دوسروں کو بھی تلقین کی جاتی ہے مگر وہ آپ تو کھانا کھلا دیتا ہے لیکن دوسروں کو اس کی ترغیب نہیں دیتا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص شرم اور لحاظ کے مارے ایسا کرتا ہے سچے دل سے ایسا نہیں کرتا اور اُس کے دل میں اِس کام کے کرنے کی تڑپ نہیں ہے۔ گویا سوال کرنے پر مسکین کو کھانا کھلا دیتا ہے خود غرباء کی خدمت کا شوق نہیں رکھتا۔ تحریک کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غرباء کو بغیر مانگے روٹی مل جاتی ہے۔ جب لوگ ایک دوسرے کو غرباء کی امداد کی تلقین کرتے رہیں تو غرباء کو مانگنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یتیم کے لئے تو اللہ تعالےٰ نے دھتکارنے کے الفاظ بولے لیکن مسکین کے لئے ترغیب دلانے کے لفظ استعمال کئے اِس میں کیا حکمت ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ یتیم تو بچہ ہوتا ہے اگر کوئی اُسے دھتکار دے تو وہ کوئی احتجاج نہیں کر سکتا۔ کوئی شور نہیں کرتا، لوگوں میں پروپیگنڈا نہیں کرتا مگر بڑی عمر کے آدمی کو دھتکارنے سے لوگ ڈرتے ہیں مسکین کو اگر کوئی دھتکار دے تو وہ شور مچا دیتا ہے اور اس کے خلاف لوگوں میں احتجاج کرتا ہے مگر یتیم کو کوئی دھتکار دے تو وہ زیادہ سے زیادہ رو کر دوسری جگہ جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ پس چونکہ مساکین کو لوگ یتیم سے کم دھتکارتے ہیں اس لئے انکے مناسب حال لفظ استعمال کیا گیا۔

یتیم کیلئے یَدُعُّ اور مسکین کیلئے یَحُضُّ کے الفاظ استعمال کرنے میں حکمت

ایک اور سوال اس آیت کے متعلق یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصولی نیکیوں کے مقابلہ میں اِن جُزوی باتوں کی مثال کیوں دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ قومی نظام پر زور دینا مقصود تھا۔ یتامیٰ اور غرباء کی طرف سے لاپرواہی برتنا قومی جذبہ کی کمزوری پر دلالت کرتا ہے اگر قومی خدمت کا جذبہ نہ ہو تو پھر قومی جتھہ کمزور ہو جاتا ہے اور اگر یتامیٰ کی خبر گیری نہ کی جائے تو لوگ قربانی کرنے سے رُکتے ہیں۔ اور پھر غرباء کی مدد اِس لئے بھی کی جاتی ہے تا وقت پر اُن کی مدد مل جائے اگر اُن کی مدد نہ کی جائے تو وہ بھی وقت پر ساتھ نہیں دیتے۔ جس قوم میں غرباء کے ساتھ سلوک اچھا ہوتا ہے اُس کے غرباء بھی جوش میں آکر قربانی کرنے لگ جاتے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ اور فرانس میں مزدوروں کو مزدوری بہت کافی ملتی ہے اِس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کا بھی ملک میں حصہ ہے اور وہ اُس کے لئے ہر ممکن قربانی کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ پس اگر غرباء کا خیال نہ رکھا جائے تو قومی جتھہ کمزور ہو جاتا ہے اور اگر

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝

پس ہلاکت ہے اُن نمازیوں کے لئے ۵

یتامیٰ کی خبرگیری نہ کی جائے تو جذبۂ قربانی کم ہوجاتا ہے اور یہ دونوں نقص کسی قوم کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دینے کے لئے کافی ہیں۔

وَیْلٌ

۵ حل لغات۔ وَیْلٌ کلمہ عذاب ہے۔ جب عذاب یا کسی کام کے بدنتائج کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو تو وَیل کا لفظ بولتے ہیں اور یہ لفظ وَیْلٌ۔ وَیْلاً اور وَیْلٍ تینوں طرح استعمال کیا جاتا ہے۔

تفسیر۔ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ میں وَیْلٌ کے لفظ سے پہلے جو فاء لائی گئی ہے وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ پہلے حالات بھی نمازی کے ہی ہیں اگر پہلے حالات نمازی کے نہ مانے جائیں تو پھر اس آیت کا پہلی آیات سے کوئی جوڑ معلوم نہیں ہوتا۔ تکذیب کرے کوئی، دھتکارے کوئی اور لعنت ہو نمازی پر۔ یہ خلاف عقل بات ہے۔ پس ظاہر ہے کہ پہلی آیات میں بھی نمازی کا ہی ذکر ہے۔

وَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ میں مسلمانوں کا ہی ذکر ہے

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں تیسویں پارہ کی آخری سورتیں باری باری پہلے اور آخری زمانہ پر دلالت کرتی ہیں۔ سورۃ الفیل آخری زمانہ کے متعلق تھی اور سورۃ قریش محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے متعلق تھی۔ اس اصول کے مطابق یہ سورۃ پھر آخری زمانہ کے متعلق ہے۔ اس حقیقت سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ پہلی آیات میں جس کا ذکر تھا وہ بھی مسلمان تھا اور نمازی تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مسلمان اور نمازی دین کا منکر کس طرح ہو سکتا ہے واقعات بتاتے ہیں کہ آج مسلمانوں میں سے ایک گروہ باوجود قرآنی تعلیم کے حشر ونشر پر یقین نہیں رکھتا۔ مسلمانوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں "ایہہ جگ مٹھا تے اگلا کس نے ڈٹھا۔ (پنجابی مثل ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ یہ دُنیا تو میٹھی ہے اگلا جہان کس نے دیکھا ہے کہ اُس کی خاطر اس دنیا کی لذّت کو چھوڑے) ایسے لوگوں کے سامنے اگر اسلام کے اصول پیش کئے جائیں تو وہ مُنہ سے تو اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہہ دیں گے لیکن دل میں اس پر یقین نہیں رکھیں گے۔ یہ آخری زمانہ کے ہی مسلمان ہیں جو مُنہ سے تو اسلام کا اقرار کرتے ہیں لیکن دلوں میں اُن کے میل ہے۔ یتامیٰ کو دھتکارتے ہیں مسکینوں کی طرف توجہ نہیں۔ سینما دیکھتے ہیں، ناچ اور گانوں میں جاتے ہیں۔ لیکن جب باہر آتے ہیں تو اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہیں اور کہتے ہیں جو حکومت شریعت پر عمل نہیں کرتی اُسے توڑ ڈالو۔ اُن کی عورتیں سینماؤں میں جاتی ہیں ناچ اور گانوں میں جاتی ہیں، وہاں گندے سے گندے افعال دیکھتی ہیں۔ سینماؤں میں مرد عورت کو بوسہ دیتے ہیں۔ اسلام نے تو یہاں تک تعلیم دی ہے کہ جس وقت میاں بیوی آرام سے بیٹھے بات چیت کر رہے ہوں تو اُس وقت اُن کا اپنا بچہ بھی آواز دے کر اندر آتے مگر یہاں تو ایکٹروں کے بچے نہیں غیروں کے بچے ہوتے ہیں۔ سینما میں گندے سے گندے افعال کئے جاتے ہیں بوسے دئے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی شریعت اسلامیہ کے نعرے لگائے جاتے ہیں یہ کیسی پاگل پن کی بات ہے منہ سے تو اقرار کیا جاتا ہے مگر عمل کوئی نہیں۔ پس تکذیب دین کے الفاظ سے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ یہاں کفار کا ذکر ہے مسلمانوں پر بھی ایسا دن آ سکتا ہے اور آج کل آیا ہوا ہے۔ انہی کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ ایسے لوگ لعنتی ہیں۔ نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور ایسی حرکتیں بھی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر اسلام سے ہی انکار

الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝

جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے ہیں ۵۶

کردیتے تو یہ بہتر تھا کم ازکم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو بدنام نہ ہوتے۔ اب تو سارا الزام آپ پر آتا ہے۔ پس فاء نے یہ بتادیا کہ پہلا ذکر بھی مسلمانوں کا ہے ابوجہل کا نہیں۔ ابوجہل تو نمازیں نہیں پڑھا کرتا تھا۔ اَلْمُصَلِّيْن پر اَلْ معہود ذکری ہے اور اس کے یہ معنے ہیں کہ لعنت ہو اُن مسلمانوں پر جن کا پہلے ذکر آچکا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نمازیوں پر لعنت کیوں۔ نماز پڑھنے کا یہ نتیجہ تو نہیں نکلتا جو یہاں بتایا گیا ہے قرآن کریم میں دوسری جگہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ۔ کہ نماز بُرائیوں اور بدیوں سے بچاتی ہے۔ لیکن یہاں فرماتا ہے وَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ کہ نمازیوں پر خدا تعالیٰ کی لعنت ہو۔ سو اس کا جواب اگلی آیت میں دیا گیا ہے۔

۵۶ حل لغات۔ سَهَا کے دو صلے آتے ہیں۔ (۱) فِیْ (۲) عَنْ۔ جب سَهَىٰ فِي الصَّلٰوةِ کہیں تو معنے یہ ہوتے ہیں۔ اُس نے اپنی نماز کا کچھ حصہ غلطی سے چھوڑ دیا۔ یا زیادہ کردیا۔ لیکن سَهَا عَنْهُ اُس وقت استعمال ہوتا ہے جب جان بوجھ کر کوئی نماز کو چھوڑ دے یا اُس میں نقص پیدا کرے۔

تفسیر۔ فرمایا یہ لوگ وہ ہیں جو صرف ظاہری نمازیں پڑھتے ہیں هُمْ کی ضمیر پھیر کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ کبھی کبھی نمازیں چھوڑ بھی دیتے ہیں اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنِ الصَّلٰوةِ سَاهُوْنَ یعنی وہ نماز سے غفلت نہیں برتتے بلکہ اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ وہ نماز کے کلی تارک نہیں تبھی اپنی نماز کے الفاظ استعمال کئے یہ اشارہ کرنے کیلئے کہ وہ نماز کے مدعی ہیں لیکن اپنی نماز کبھی کبھی ترک بھی کردیتے ہیں اور اپنی نماز کی طرف بے توجہی برت کر اُسے خراب بھی کردیتے ہیں۔

عَنْ کو بطور صلہ استعمال کرکے بھی یہ بتایا ہے کہ وہ غلطی سے نہیں جان بوجھ کر نمازوں کو چھوڑ دیتے ہیں اُنہیں نمازوں سے کوئی محبت نہیں۔ گویا ایسے لوگوں میں دو قسم کے نقص پیدا ہوجاتے ہیں۔ ایک تو وہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ خدا کی نماز پڑھ رہے ہیں مگر پڑھتے اپنی نماز ہیں اور دوسرے وہ نماز پڑھتے ہوئے اسکی طرف دھیان نہیں دے رہے ہوتے۔ اُن کے دل میں اس کے متعلق کوئی احساس نہیں ہوتا۔ محض رسم و رواج کی خاطر نماز پڑھ لیتے ہیں۔ اِس لئے نماز پڑھ لیتے ہیں کہ اگر وہ نماز نہیں پڑھیں گے تو قوم کیا کہیگی۔ رشتہ دار ناراض ہوجائیں گے۔ بیوی اگر نماز پڑھتی ہے تو وہ طعنے دیگی۔ باپ اگر نماز پڑھتا ہے تو وہ بُرا منائیگا بھائی اگر نماز پڑھتا ہے تو وہ بُرا منائیگا۔ حالانکہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے ڈر کر نماز پڑھتے ہیں۔ مُلّاں مقتدی کی وجہ سے نماز پڑھتا ہے اور مقتدی مُلّاں کی وجہ سے نماز پڑھتا ہے۔ غرض قوم کی قوم اِلّا ماشاء اللہ صرف ایک دوسرے کو دکھانے کے لئے نماز پڑھتی ہے۔ اِسی وجہ سے جب یہی لوگ کفار کے ملک میں جاتے ہیں تو نماز ترک کردیتے ہیں سوائے اس کے کہ کوئی اسلامی مجمع ہو ایسا ہو تو خوب طرہ دار پگڑیاں باندھ کر جاتے ہیں اور مجلس میں چکر لگا کر اپنے نمازی ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں یا پھر کوئی بڑا آدمی مرجائے تو اُس کے جنازہ میں شریک ہوکر اپنے مذہب کا اعلان کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر اُن کو آخرت پر یقین ہوتا تو نماز گندے دار کیوں پڑھتے اور اگر نماز پر یقین نہیں تو اُخروی زندگی پر کس طرح یقین ثابت ہوسکتا ہے۔ اور جب اُخروی زندگی پر یقین نہیں تو جنازہ کے معنے ہی کیا ہیں۔ اصل میں یہ جنازے مرنیوالے

ع ۳۲

اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝

(اور) جو (ایک دوسرے کے مقابل) دکھاوے میں لگے رہتے ہیں ؎ اور جو گھر کے معمولی سامان تک کے دینے سے (اپنے نفسوں کو اور دوسروں کو) روکتے

کے لئے نہیں ہوتے خود اپنے ایمان کا جھوٹا ڈھنڈورا پیٹنے کے لئے ہوتے ہیں کیونکہ بڑے آدمیوں کی وفات پر زیادہ اجتماع ہوتا ہے اور اُن کو اپنے ایمان کے مظاہرہ کا اچھا موقعہ مل جاتا ہے۔

مُرَآءَاۃ

؎ حل لغات ۔ مُرَاءَاۃ کہتے ہیں دکھاوے کیلئے کوئی کام کرنا۔ چنانچہ کہتے ہیں رَاءَيْتُهٗ مُرَاءَاةً اَیْ اَرَیْتُهٗ عَلٰی خِلَافِ مَا اَنَا عَلَیْهِ۔ میں نے اُسے وہ دکھایا جو میرے اندر نہیں پایا جاتا (اقرب)

اَلْمَاعُوْن سے مراد عام استعمال کی اشیاء

تفسیر ۔ آج کل کے بعض مسلمان تو ایسے ہیں جو بالکل ہی نمازوں کو چھوڑ چکے ہیں۔ کچھ گنڈے دار نماز پڑھتے ہیں جو محض دکھاوے کے لئے نمازیں پڑتے ہیں اُن کے دل میں کوئی شوق نہیں پایا جاتا۔ یعنی ایک تو وہ ہیں جو بالکل بے دینی میں پڑ گئے ہیں اور وہ اسلام اور نماز کو مانتے ہی نہیں۔ بعض پبلک مواقع تک دیندار ہیں اور بعض رسم کو تو چمٹے ہوئے ہیں مگر مغز کو پھینک دیا ہے۔ صرف قوم کے سامنے نیک بننے کی خواہش ہے۔

اَلْمَاعُوْن

؎ حل لغات ۔ اَلْمَاعُوْنُ کے معنے ہیں اَلْمَعْرُوْفُ یعنی نیکی۔ معروف۔ احسان۔ نیز مَاعُوْن کے معنے ہیں كُلُّ مَا انْتَفَعْتَ بِهٖ۔ ہر وہ چیز جس سے تو فائدہ اٹھائے اَوْ كُلُّ مَا يُسْتَعَارُ مِنْ فَاْسٍ وَ قُدُوْمٍ وَ قِدْرٍ وَنَحْوِهِمَا مِنْ مَنَافِعِ الْبَيْتِ۔ گھر کی وہ چھوٹی چھوٹی چیزیں جو عام استعمال کی ہوتی ہیں اور وقتاً فوقتاً ہمسایوں سے مستعار لے لی جاتی ہیں مثلاً کلہاڑی ہنڈیا وغیرہ ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ اسلام سے پہلے مَاعُوْن ہر اُس چیز کو کہتے تھے جو نفع رساں اور فائدہ مند ہو مگر اسلام میں اس کے معنے اطاعت اور فرماں برداری کے ہیں۔

تفسیر ۔ اِس آیت کے معنے یوں ہوں گے کہ وہ لوگوں کو احسان کرنے سے روکتے ہیں یا لوگوں کو چھوٹی چھوٹی اور معمولی اشیاء بھی مستعار دینے سے روکتے ہیں یا یہ کہ چھوٹی چھوٹی استعمال کی چیزوں کو روکتے ہیں یعنی لوگوں کو دینے سے خود اجتناب کرتے ہیں۔ گویا ایک زمانہ میں مسلمانوں کی ذلت کی انتہاء ہو جائے گی۔ بدیوں میں ترقی کرتے کرتے اُن میں اتنی خرابی پیدا ہو جائیگی کہ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ احسانات بھی قوم کے فائدہ کے لئے نہیں کر سکیں گے۔ ہم روز دیکھتے ہیں کہ ایسی ذلیل حرکتیں ہوتی رہتی ہیں۔ دیہات میں عموماً ایسا ہوتا ہے۔ اگر کسی کی چیز کو کوئی ہاتھ لگا دے تو وہ آنکھیں سرخ کر لیتا ہے۔ پس اِس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے یہی بیان فرمایا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب مسلمانوں کی حالت اتنی گر جائے گی کہ وہ نمازیں بھی پڑھیں گے تو ریاء کی پڑھیں گے۔ قومی فکر اُن میں بالکل باقی نہیں رہیگا اور وہ اپنی قوم کی خاطر معمولی سے معمولی قربانی بھی نہیں کر سکیں گے۔

ابو عبیدہ کی تفسیر کے مطابق اِس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ مسلمانوں میں سے اطاعت اور فرمانبرداری کا مادہ اُٹھ جائے گا اور یہ بھی بیّن طور پر اس زمانہ میں نظر آ رہا ہے۔ ہر شخص میں خود سری ہے۔ قومی نظریہ کلّی طور پر مٹ چکا ہے۔ شخصیات اور ذاتیات ہر ایک کے سامنے ہیں یا نفس ہی یا دوست ہے۔ قوم کا خیال کوسوں دُور ہے ہاں قوم کا نام ضرور ہے مگر یہ نام وہیں لیا جاتا ہے جبکہ اپنے آپ کو یا اپنی پارٹی کے آدمی کو فائدہ پہنچتا ہو۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ کوثر۔ یہ سورۃ مکی ہے [1]

وَهِيَ ثَلٰثُ اٰيَاتٍ دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے علاوہ تین آیات ہیں اور ایک رکوع ہے

[1] سورۃ کوثر اکثر رُواۃ کے نزدیک مکی سورتوں میں سے ہے۔ حسن بصریؒ۔ عکرمہؓ اور قتادہ اسے مدنی قرار دیتے ہیں۔ یورپین مستشرقین کے نزدیک یہ سورۃ مکی ہے اور اسلام کے بالکل ابتدائی زمانہ کی ہے

جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ کیا تو مشرکین مکہ میں سے کچھ لوگ آپکو نعوذ باللہ دیوانہ سمجھتے تھے اور اس لئے وہ آپ سے کچھ سروکار نہیں رکھتے تھے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یہ کہتے تھے کہ یہ شخص عرب کے قومی مذہب کو بگاڑنے کی تدبیریں کررہا ہے اس کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اس لئے وہ آپ کو ایذائیں دیتے، دُکھ دیتے اور مارتے پیٹتے تھے۔ پھر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی تم مخالفت کروگے اور اُسے مارو پیٹو گے تو خواہ مخواہ لوگوں کی توجہ اُس کی طرف منعطف ہوگی۔ کیونکہ باہر کے لوگ مکہ آتے ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ تم محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو ایذائیں دیتے ہو۔ مارتے ہو۔ پیٹتے ہو۔ تو وہ اس کے متعلق پوچھنے لگ جاتے ہیں اور اس کے معاملہ میں دلچسپی لینے لگ جاتے ہیں۔ اس طرح سے اہمیت اور عظمت حاصل ہوتی جارہی ہے۔ گو اس کی باتیں ہمیں پسند نہیں ہیں۔ گو اس کی تعلیم سارے عرب کے قومی مذہب کے خلاف ہے مگر مصلحتاً ہمیں اسے کچھ نہیں کہنا چاہیئے تا اُسے اہمیت وعظمت حاصل نہ ہوجائے ان لوگوں میں سے عاص بن وائل بھی تھا جو مکہ کا ایک بڑا سردار تھا۔ اُس کا بھی یہی خیال تھا کہ مخالفت کی وجہ سے چونکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اہمیت حاصل ہورہی ہے اور لوگوں کی توجہ انکی طرف مبذول ہورہی ہے اس لئے ہمیں مخالفت سے رُک جانا چاہیئے اور اُنہیں کچھ نہیں کہنا چاہیئے۔ اگرچہ ہمیں انکی حرکات پسند نہیں اور اگرچہ اُن کی تعلیم ہمارے مذہب کے خلاف ہے۔ مگر پھر بھی مصلحت اسی میں ہے کہ انہیں کچھ نہ کہیں چنانچہ عاص بن وائل کہا کرتا تھا کہ دَعُوْهُ اِنَّمَا هُوَ رَجُلٌ اَبْتَرُ لَا عَقِبَ لَهٗ لَوْ هَلَكَ اِنْقَطَعَ ذِكْرُهٗ وَاسْتَرَحْتُمْ مِنْهُ (البحر المحیط) یعنی محمد (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) کو چھوڑ دو یہ تو ایک ایسا شخص ہے جس کی کوئی نرینہ اولاد نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی پیچھے رہنے والا ہے جو اس کی تعلیم کو اس کی وفات کے بعد قائم رکھ سکے۔ اگر یہ وفات پاگیا تو اس کا ذکر خود بخود منقطع ہوجائے گا اور تم اس کے وعظوں اور نصیحتوں سے محفوظ ہوجاؤ گے۔

سورۃ کوثر مکی سورۃ ہے

مفسرین کے نزدیک سورۃ کوثر کا شانِ نزول

گویا عاص بن وائل کے نزدیک آپ کی تعلیم ایک صحبت بندی والی بات تھی اور نرینہ اولاد ہی اُسے قائم رکھنے میں ممد ہوسکتی تھی۔ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نرینہ اولاد نہیں تھی صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں اور لڑکیوں کی عرب میں کوئی وقعت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ عرب لوگ سمجھتے تھے کہ لڑکیاں تو دوسرے خاندانوں میں چلی جائیں گی جہاں وہ انہی کی مرضی کے مطابق چلیں گی۔ باپ کی یاد کو قائم رکھنے والے تو اس کے

لڑکے ہی ہوتے ہیں اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
کی چونکہ نرینہ اولاد نہیں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں
اس لئے جب آپ وفات پا جائیں گے تو آپ کی تعلیم بھی ختم
ہو جائے گی۔ خواہ مخواہ آپ کی مخالفت کرنے میں آپ کو
اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے ۔ انہیں چھوڑ دو۔ وفات
کے بعد آپ کا قائم کردہ سلسلہ خود بخود منقطع ہو جائیگا
پس مخالفت کر کے آپ کی تعلیم پھیلانے کی کیا ضرورت
ہے کیونکہ مخالفت کو دیکھ کر لوگوں کی توجہ خواہ مخواہ انکی
طرف پھر جاتی ہے ۔ اسی وجہ سے عاص بن وائل یہ کہا کرتا
تھا کہ آپ ابتر ہیں ۔ آپ کی نرینہ اولاد نہیں جو آپ کی
وفات کے بعد آپ کے سلسلے کو قائم رکھ سکے مفسرین
کے نزدیک اللہ تعالےٰ نے اُس کے اور اُس کے
ہم خیال لوگوں کی تردید میں ہی یہ سورۃ اُتاری۔

۲۶۱ سورۂ کوثر کو مدنی کہنے والوں کی تردید

تاریخوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپکو ابتر کہنے والا
صرف عاص بن وائل ہی نہیں تھا بلکہ اور لوگ بھی تھے
جو آپ کو ابتر کہا کرتے تھے ۔ ابو جہل کے متعلق بھی آتا ہے
کہ وہ بھی آپ کو ابتر کہا کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن
سب کی نرینہ اولاد تھی لڑکے تھے ۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کا کوئی لڑکا نہیں تھا ۔ اور جتھہ بندی کے لحاظ
سے عرب میں لڑکے کی قدر ہوتی تھی۔ ان لوگوں کا خیال
تھا کہ جب آپ وفات پا جائیں گے تو ساتھ ہی آپ کا
قائم کردہ سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ وہ آپ کے سلسلہ کو
عارضی شورش سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ کی مخالفت
کی کوئی ضرورت نہیں ۔ مخالفت سے خواہ مخواہ اس سلسلہ
کو ترقی مل رہی ہے ۔

اس سورت میں چونکہ ایسے لوگوں کی تردید کی گئی
ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ابتر کہا کرتے
تھے ۔ اس لئے بعض لوگوں نے غلطی سے اسے مدنی قرار
دے دیا ہے ۔ اور وہ کہتے ہیں کہ جب رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کے بیٹے ابراہیم فوت ہوئے اُس وقت کفار نے
یہ کہا تھا کہ آپ ابتر ہو گئے ہیں ۔ اور اُس وقت یہ سورۃ
اُن کے خیال کی تردید میں نازل ہوئی تھی۔ لیکن جب روایات
سے یہ ثابت ہے کہ یہ سورۃ مکّی ہے تو محض ابتر کے لفظ
سے یہ قیاس کر لینا کہ یہ سورۃ مدنی ہے درست نہیں۔
کفار آپ کے بیٹے ابراہیم کی پیدائش تک کیوں خاموش
رہے تھے ۔ ابراہیم آپ کی وفات سے تین سال پہلے پیدا
ہوئے تھے ۔ گویا آپ کی وفات سے تین سال قبل تک آپکو
کوئی بھی ابتر نہیں کہتا تھا۔ کون عقلمند یہ کہہ سکتا ہے کہ
آپ کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہو اور وہ وفات پا جائے تو پھر
آپ کو ابتر کہیں ۔ ابراہیم کی پیدائش سے پہلے بیس سال
میں بھی تو آپ کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ اور پھر آپ پر
بڑھاپا بھی آیا ہوا تھا۔ اُس وقت کفار نے آپ کو ابتر
کیوں نہیں کہا ۔ جب ابراہیم کی پیدائش تک وہ انتظار
کرتے رہے تو اس کی وفات کے بعد انہوں نے کیوں انتظار
نہیں کیا ۔ ابراہیم ڈیڑھ سال کی عمر میں فوت ہوئے
تھے تو کیا اس کے بعد آپ کی نرینہ اولاد نہیں ہو سکتی
تھی ۔ کیا ڈیڑھ سال کے عرصہ میں انسان ناکارہ ہو جاتا
ہے ؟ یہ محض قیاسات ہیں عقل ان کی تائید نہیں کرتی ۔

یہ سورۃ میرے مقرر کردہ اصول کے مطابق (جو میں
نے پہلے بیان کیا ہے کہ قرآن کریم کی آخری چند سورتوں
میں سے باری باری ایک سورۃ زیادہ تر محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے ابتدائی زمانہ سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری
زیادہ تر آپ کی اُمت کے آخری زمانہ سے تعلق رکھتی ہے)
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانہ سے تعلق
رکھتی ہے ۔ یہ ضروری نہیں کہ جو سورۃ آپ کے ابتدائی زمانہ
کے ساتھ تعلق رکھتی ہو اُس میں آپ کی اُمت کے آخری
زمانہ کا ذکر نہ ہو ۔ یا جو سورۃ آپ کی اُمت کے آخری زمانہ
سے تعلق رکھتی ہو اُس میں آپ کے ابتدائی زمانہ کا ذکر نہ ہو
ذکر تو دونوں زمانوں کا پایا جا سکتا ہے ۔ لیکن مضمون میں
زیادہ تر اہمیت ابتدائی زمانہ کو ہوگی یا آخری زمانہ کو ہوگی ۔

چونکہ سورۃ ماعون رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے آخری زمانہ کے ساتھ متعلق ہے جبکہ اُس کی حالت خراب ہو جانی تھی اور آپ کی اُمت کے ایک حصہ نے ریا کی نمازیں پڑھنے لگ جانا تھا۔ یعنی نمازوں کا مغز جاتے رہنا تھا اور آپ کی اُمت نے دیگر خرابیوں کا شکار ہو جانا تھا۔ اس لئے اب سورۂ کوثر میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ابتدائی زمانہ کا ذکر ہے۔

سورۂ کوثر کے بعد صرف چھ چھوٹی چھوٹی سورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ میرے نزدیک چونکہ اب قرآن کریم کا خاتمہ نزدیک آگیا ہے اس لئے جیسا کہ سمجھدار مصنفوں کا قاعدہ ہے کہ وہ کتاب کے آخر میں آکر مضمون کو سمیٹتے ہیں کبھی خلاصہ بیان کرتے ہیں اور کبھی مضمون کے مغز کو بیان کرتے ہیں تا وہ قارئین پر اثر ڈال سکیں۔ اسی طرح قرآن کریم اب خاتمہ کے قریب آ پہنچا ہے۔ اس سورۃ کے بعد صرف چھ سورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے مضمون سمیٹنے شروع کر دئے ہیں (میں نے پہلے لکھا ہے کہ یہ سورۃ زمانۂ نبوت کے ابتداء میں نازل ہوئی تھی مگر اب میں نے لکھا ہے کہ اس سورۃ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اب قرآن کریم ختم ہو رہا ہے۔ بظاہر اس میں اختلاف نظر آتا ہے مگر دراصل اختلاف نہیں۔ میں پہلے سیپارہ کی تفسیر میں اس امر کو ثابت کر چکا ہوں کہ قرآن کریم کی دو ترتیبیں ہیں۔ ایک ترتیب زمانۂ نزول کے ابتدائی دور کے لحاظ سے ہے اور دوسری اسلام کی عمر یعنی زمانۂ قیامت تک کے حالات کے لحاظ سے ہے اور وہی اصلی ترتیب ہے۔ قرآن کریم کا یہ معجزہ ہے کہ دونوں زمانوں کی ترتیب اُس کی بلیغ حکمتیں رکھتی ہے۔ پس گو یہ سورۃ ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی تھی مگر اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ دوسری ترتیب میں اسے قرآن کریم کے آخر میں رکھا جائے گا۔ اس لئے اس کا مضمون اس طرح نازل کیا گیا کہ وہ قرآن کریم کے آخر میں رکھا جا کر قرآنی ترتیب کی شان کو ظاہر کرے چنانچہ اس کا مضمون باوجود اس کے کہ یہ سورۃ ابتداء میں نازل ہوئی تھی بعد میں نازل ہونے والی سورتوں کے ساتھ اس طرح جُڑ جاتا ہے کہ گویا یہ سورۃ ان بعد میں نازل ہونے والی سورتوں کے بعد میں نازل ہوئی ہے) اور سورۃ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ قرآن کریم اب ختم ہونے والا ہے۔ سارے مضامین اس میں آگئے ہیں۔ سب مطالب اس میں بیان کر دئے گئے ہیں اور تمام قسم کی خوبیاں اور اوصاف اس میں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے اس سورۃ کو اگر کوثر کہدیں تو بے جا نہ ہوگا۔ سورۃ کوثر میں درحقیقت قرآن کریم کا نام بتایا گیا ہے اور یہ مضمون لوگوں کے سامنے رکھا گیا ہے کہ جب شروع میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ کیا تھا اور قرآن کریم کی ابھی چند چھوٹی چھوٹی سورتیں نازل ہوئی تھیں۔ اُسوقت جب یہ کہا جاتا تھا کہ اس کتاب میں سب معارف پائے جاتے ہیں۔ سب مضمون پائے جاتے ہیں اور یہ انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے والی ہے۔ تو تم کہا کرتے تھے اس میں ہے کیا چند اخلاقی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اب اللہ تعالےٰ اُنہیں بتاتا ہے کہ ابتداء میں تو یہ کتاب تمہارے نزدیک چند اخلاقی باتوں کا مجموعہ تھی لیکن اب جبکہ یہ کتاب ختم ہو رہی ہے۔ بولو۔ کیا یہ چند اخلاقی باتیں ہیں۔ کیا اس میں تمام معارف اور مطالب بیان نہیں کئے گئے۔ کیا اس میں سارے مضامین نہیں آگئے۔ کیا یہ انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے والی نہیں؟ گویا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے خاتمہ پر اُس کے نزول کے مقصد کے تمام وکمال طور پر پورا ہو جانے کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ جو دعویٰ ابتداء اسلام میں کیا گیا تھا اب وہ قرآن کریم

کے مکمل ہونے سے لفظاً لفظاً پورا ہوگیا ہے۔

پھر اس سورۃ میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جن پر یہ کتاب نازل ہوئی ہے وہ بھی تمام علوم کے جامع ہیں گویا اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ میں اللہ تعالیٰ نے اِس طرف توجہ دلائی ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی عمر گذار لی ہے اور قرآن کریم کا نزول بھی ختم ہو رہا ہے یعنی آپ بھی عمر کے خاتمہ پر ہیں اور قرآن کریم بھی خاتمہ پر ہے اب تم دیکھو کیا قرآن کریم اپنے اندر غیر معمولی وسعتِ مضامین رکھتا ہے یا نہیں؟ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق تم خیال کرتے تھے کہ یہ ابتر ہیں۔ اب دیکھو کیا آپ کے وجود نے اپنے آپ کو پھیلایا ہے یا نہیں اور جہاں تک آپ کے اخلاق فاضلہ کا تعلق ہے آپ نے اُن کے اندر کامیابی حاصل کی ہے یا نہیں۔ اب بتاؤ کہ آپ کو کوثر مل گیا یا نہیں ملا؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک دفعہ پوچھا گیا کہ کیا آپ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے متعلق کچھ بتا سکتی ہیں آپ کے اخلاق کیسے تھے؟ تو حضرت عائشہ رضی نے جواب میں فرمایا کَانَ خُلُقُہٗ کُلُّہٗ الْقُرْاٰنُ (الجزء الاول فی کتاب الطبقات الکبیر القسم الثانی ص۹۰ ص۹۱) کہ مجھے آپ کے اخلاق بتانے کی کیا ضرورت ہے قرآن کریم پڑھو اس سے تمہیں آپ کے اخلاق کا پتہ لگ جائیگا۔ قرآن کریم نے جہاں حکم دیا ہے کہ یُوں کرنا چاہیئے وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے اور قرآن کریم نے جس امر سے منع کیا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم وہ کام نہیں کیا کرتے تھے قرآن کریم پڑھو اسی سے آپ کے اخلاق کا پتہ لگ جائیگا۔ قرآن کریم اگر کہتا ہے کہ نمازیں پڑھو تو سمجھ لو کہ آپ نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ قرآن کریم اگر کہتا ہے کہ روزے رکھو تو سمجھ لو کہ آپ روزے رکھا کرتے تھے قرآن کریم اگر صدقہ وخیرات کا حکم دیتا ہے تو سمجھ لو کہ آپ صدقہ وخیرات دیا کرتے تھے۔ قرآن کریم اگر نرمی کا حکم دیتا ہے تو سمجھ لو کہ آپ نرمی کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم اگر حکم دیتا ہے کہ مجرم کو ایسی سزا دو جس سے اُس کی اصلاح ہو جائے تو سمجھ لو کہ آپ مجرم کو سزا اسی شکل میں دیا کرتے تھے کہ اس کی اصلاح ہو جائے۔ قرآن کریم اگر حکم دیتا ہے کہ قصوروں کو معاف کر دو تو سمجھ لو کہ آپ لوگوں کے قصور معاف کر دیا کرتے تھے۔ آپ کی تاریخ پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں آپ کے سوانح بیان کرنیکی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کی سیرت بیان کرنیکی کوئی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم آپ کی کمل تصویر ہے۔ گویا قرآن کریم اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم دو موتی ہیں جو ایک ہی سیپ سے توأم نکلے ہیں جیسے توأم بچے ہوتے ہیں اُن کی شکلیں ایک جیسی ہونے کی وجہ سے بعض دفعہ وہ الگ الگ پہچانے تک نہیں جاتے۔ اُنکی پیدائش کے وقت ڈاکٹر اُن پر نشان لگا دیتے ہیں تا معلوم ہو کہ کونسا بچہ پہلے پیدا ہُوا ہے اور کونسا بچہ بعد میں پیدا ہُوا ہے یہی حال قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ ایک کو دیکھو اور دوسرے کو پہچان لو اور دوسرے کو دیکھو تو پہلے کو پہچان لو۔ حضرت عائشہ رضی کے قول کے بھی یہی معنے ہیں کہ قرآن کریم اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم گویا جڑواں بچے ہیں، ایک ہی سیپ کے دو موتی ہیں۔ قرآن کریم کو دیکھنا ہو تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لو اور اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھنا ہو تو قرآن کریم کو دیکھ لو۔ جو باتیں اس میں پائی جاتی ہیں وہ سب آپ کے وجود میں پائی جاتی ہیں اور جو فعل محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کرتے تھے وہ قرآن کریم میں پایا جاتا ہے اور جو آپ نہیں کرتے تھے وہ قرآن کریم

میں نہیں پایا جاتا۔ گویا ایک سے دوسرے کو روشنی ملتی ہے۔ قرآن کریم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جلا دیتا ہے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کریم کو جلا دیتے ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ سورۃ کوثر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ نبوت کے ابتداء میں نازل ہوئی ہے لیکن اس میں آخری زمانہ کی خبر اس تفصیل سے دی گئی ہے کہ انسان محوِ حیرت ہو جاتا ہے۔ اس سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کیوقت آپ کی کیا شان ہوگی اور قرآن کریم کی تکمیل کے وقت اسکی کیا شان ہوگی۔ جب یہ سورت آپ کی نبوت کے دوسرے یا تیسرے سال نازل ہوئی تو آپ کی حیثیت کیا تھی۔ آپکو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ آٹھ دس آدمی آپ پر ایمان لائے تھے۔ پندرہ بیس چھوٹی چھوٹی سورتیں آپ پر نازل ہوئی تھیں آپ کے کیریکٹر اور نبوت کے مطابق اخلاق فاضلہ کے مظاہرے کے کوئی مواقع نظر نہیں آتے تھے۔ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی وہ پیشگوئیاں جن کے متعلق آپ کہتے تھے کہ وہ آپ کے متعلق ہیں یا وہ پیشگوئیاں جو آپ خود اپنے متعلق کیا کرتے تھے وہ ابھی پوری نہیں ہوئی تھیں۔ آپکا وجود ایسا تھا جیسے کسی بڑے درخت کی گٹھلی سے صرف ایک کونپل نکلتی ہے۔ وقت سے پہلے کون کہہ سکتا ہے کہ وہ چھوٹی سی کونپل ایک دن ایک عظیم الشان درخت بنے گی۔ لوگ اُس کے پھل کھائیں گے۔ اس کے سایہ میں بیٹھیں گے اُس وقت اُسے ایک بکری بھی اپنے پاؤں سے دبا سکتی ہے۔ ایک کیڑا بھی اُسے کاٹ کر گرا سکتا ہے۔ قرآن کریم کی ابھی چند ہی سورتیں نازل ہوئی تھیں اور چند گنتی کے آدمی ہی آپ پر ایمان لائے تھے۔ اُس وقت جب آپ کی کوئی حیثیت نہیں تھی اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔ اے محمد والو تم یہ خیال نہ کرو کہ قرآن کریم کیا ہے چند اخلاقی باتیں ہیں۔ ایسا نہیں۔ یہ تو ایک مکمل کتاب بننے والی ہے۔ یہ خیال مت کرو کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ تو ایک عظیم الشان مقام پر پہنچنے والے ہیں جسے کوثر کہا جاتا ہے۔ کوثر کے لفظ میں آپ کی زندگی، آپ کو عطا شدہ علوم، اخلاق فاضلہ اور فتوحات سب شامل ہیں۔ اُس وقت جبکہ آپکو اور آپ کے پاس بیٹھنے والوں کو لوگ مارتے تھے، پیٹتے تھے۔ آپ کے اخلاق کی برتری کو کوئی کیا ثابت کر سکتا تھا۔ اُس وقت اگر کوئی کہتا کہ آپ رحیم وکریم ہیں تو دشمن کہہ سکتے تھے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو اتنے کمزور ہیں کہ لوگ انہیں مارتے ہیں پیٹتے ہیں اور مختلف قسم کی ایذائیں دیتے ہیں۔ جب دشمن زبردست ہے تو پھر معافی دینے اور رحم کرنے کے کیا معنے۔ جب تک آپ کو وہ مقام حاصل نہ ہوتا کہ آپ غالب ہوتے اور آپ کا دشمن زیر ہوتا اور پھر آپ رحم کرتے۔ اُس وقت آپ کی یہ صفت کیسے ثابت ہو سکتی تھی جب آپ کے ساتھ چند آدمی تھے اور وہ بھی کمزور تھے۔ اور اُن کی کوئی پوزیشن نہ تھی۔ جب وہ اکٹھے ہو کر بیٹھتے تھے تو اُن سے کون اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ جماعت لاکھوں لاکھ کی تعداد تک پہنچ جائیگی۔ یہ کتنی بڑی خوبی ہے اور کتنا بڑا نشان ہے کہ اُس ابتدائی زمانہ میں جب آپ کے اخلاق اور آپ کی کتاب کے مکمل ہونے کا کوئی ثبوت نہیں مل سکتا تھا اُس وقت یہ کہہ دیا گیا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب یہ ماننا پڑے گا کہ قرآن کریم بھی کوثر ہے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی کوثر ہیں۔

دعویٔ نبوت کے ابتداء میں آپ کے ساتھ خدا تعالےٰ نے کا سلوک کیا تھا۔ صرف چند وحیاں تھیں چند وعدے تھے۔ اُس وقت یہ کہنا کہ دیکھو خدا تعالےٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کتنا عظیم الشان سلوک کرتا ہے

کہاں تک لوگوں کو یقین دلا سکتا تھا اور اس پر کون اعتبار کر سکتا تھا۔ آپ کا وجود اس صورت میں اُسی وقت پیش کیا جا سکتا تھا جب ساتھ یہ بھی بتایا جاتا کہ خدا تعالیٰ نے آپ کی کیا کیا مدد اور نصرت فرمائی اور یہ کہ خدا تعالیٰ کا معاملہ آپ کے ساتھ کیسا ہے کیا بلحاظ کلام کے اور کیا بلحاظ آپ کے ذاتی جوہر کے۔ یہ معاملہ دو قسم کا ہو سکتا تھا (۱) خدا تعالیٰ کا براہِ راست معاملہ۔ (۲) بندوں کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کا معاملہ۔ یہ سب باتیں جب تک ظاہر نہ ہوتیں اس دعویٰ کی اہمیت ظاہر نہیں ہو سکتی تھی۔ خدا تعالیٰ نے ابتدائی زمانہ میں ہی آپ سے یہ کہہ دیا کہ ساری کی ساری بہترین اور بے حساب چیزیں آپ کو ملیں گی۔ ہر امر میں آپ کو کوثر ملے گا۔ آپ کی خوبیاں جگمگانی چلی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ بے انتہاء کرم کا مظاہرہ کرے گا اور آپ کو ایسی کتاب ملے گی جس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکیگی۔ یہ سب باتیں آپ کی زندگی میں ہی آپ کی ذات میں پوری ہوئیں اور دوست و دشمن نے اس کی گواہی دی۔ یہ اپنی ذات میں کتنا بڑا معجزہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کے انبیاء جب دنیا میں آتے ہیں تو اُن میں سے ہر ایک کے ساتھ اللہ یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ فاتح رہے گا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی کہا کہ میں فاتح رہوں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی کہا کہ میں فاتح رہوں گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی یہ دعویٰ کیا کہ میں اپنے دشمنوں پر فتح پاؤنگا۔ اسی طرح دوسرے انبیاء علیہم السلام نے بھی دعویٰ کیا کہ وہ اپنے دشمنوں پر فتح پائینگے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سُنّت ہے کہ جب بھی اس کے مامور آتے ہیں وہ اپنے دشمنوں پر غالب آتے ہیں لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں کفارِ مکہ اور عرب والوں پر غالب آجاؤں گا بلکہ آپ نے فرمایا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت زیادہ غالب رہونگا۔ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت بھی زیادہ غالب رہوں گا۔ میں حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی نسبت بھی زیادہ غالب رہوں گا۔ اگر آپ فرماتے کہ میں غالب آجاؤں گا تو اس کے صرف یہ معنے تھے کہ میں اپنے دشمنوں پر غالب آجاؤنگا۔ ایسا ہی جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام غالب آئے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام غالب آئے۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام غالب آئے یا دوسرے تمام انبیاء غالب آئے لیکن اللہ تعالےٰ نے اس سُورۃ میں اس سے بڑھ کر دعویٰ فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اُن کے دشمنوں پر ہی غالب نہیں کرے گا بلکہ آپ کو وہ غلبہ ملے گا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ وہ صرف غلبہ نہیں کہلائے گا وہ کوثر کہلائے گا۔ آپ کو ایک کتاب ہی نہ ملے گی بلکہ ایسی کتاب ملیگی جو غیر محدود مطالب پر حاوی ہوگی۔ آپ کے اخلاق دوسرے انبیاء سے بھی اعلیٰ اور بلند پایہ ہوں گے۔ خدا تعالےٰ کا معاملہ آپ سے غیر محدود ہوگا اور یہ وہ چیز نہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام میں پائی جاتی تھی۔ یہ وہ چیز نہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام میں پائی جاتی تھی۔ یہ وہ چیز نہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا دوسرے انبیاء میں پائی جاتی تھی۔ یہ فرق اس لئے تھا کہ آپ کا دعویٰ صرف نبی ہونے کا نہیں تھا بلکہ آپ کا دعویٰ خاتم النبیین ہونے کا تھا یہ دعویٰ آپ نے اُس وقت کیا جب آپ کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ آپ کی ذات کو بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ آپ کی حیثیت ایک معمولی انسان کی تھی۔ اُس وقت خدا تعالےٰ فرماتا ہے کہ آپ کا انجام صرف نبیوں والا نہیں ہوگا بلکہ نبیوں کے سرداروں والا ہوگا۔ دیکھو یہ کتنا بڑا دعویٰ ہے اور کتنا بڑا چیلنج ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ

صرف دشمن کے مقابلہ میں جیتنے کا سوال نہیں۔ آپ اِس طرح جیتیں گے کہ پہلے انبیاء کی کامیابی کی آپ کے مقابل پر کوئی نسبت نہیں ہوگی۔ کتنا کھلا چیلنج ہے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اور جوں جوں حالات بدلتے گئے سورۂ کوثر کا ایک ایک مفہوم پورا ہونے لگا۔ وہ کتاب جو پہلے چند سورتوں کی نظر آتی تھی جس میں چند علمی اور اخلاقی مضامین بیان کئے گئے تھے اب اُس کے اندر تمام دنیا کے علوم آنے لگے اور جب وہ کتاب خاتمہ کو پہنچی تو اُس کے مقابلہ میں دوسرے انبیاء کی تمام کتابیں ہیچ رہ گئیں۔

جب قرآن کریم کا نزول ختم ہُوا تو اُس نے صرف مکّہ والوں کی باتوں کو ہی جھوٹا ثابت نہیں کیا۔ اُس نے شعرائے عرب کے کلام کو ہی ہیچ ثابت نہیں کیا۔ بلکہ جب قرآن کریم کا نزول ختم ہُوا تو کیا زبور، کیا تورات کیا انجیل، کیا وید اور کیا ژند واوستا سب کتابیں اُس کے مقابلہ میں ہیچ رہ گئیں۔ یا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عمر کے آخر کو پہنچے تو آپ نے اخلاق کی بلندی اور روحانیت کی شان کے ساتھ ابوجہل اور عاص بن وائل کو ہی آپ نے شرمندہ نہیں کیا۔ اور اُن پر ہی اپنی برتری کو ثابت نہیں کیا بلکہ آپ کی زندگی کے حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ جو کوثر آپ کو ملا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کو بھی نہ مل سکا۔ آپ کو خدا تعالیٰ کی جو نصرت اور تائید حاصل ہوئی وہ دوسرے انبیاء کو بھی حاصل نہ ہوئی۔ آپ کی وفات کے وقت ابوجہل اور عاص بن وائل وغیرہ کے مقابلہ میں ہی آپ کو نصرتِ الٰہی اور تائیدِ غیبی نہیں ملی بلکہ جب آپ کا مشن کمال کو پہنچا تو ابوجہل اور عاص بن وائل وغیرہ تو کیا موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی نسبت بھی آپ کو زیادہ نصرتِ الٰہی اور تائیدِ غیبی مل چکی تھی۔

ابتداء میں چند آدمی آپ پر ایمان لاتے تھے اُس وقت خدا تعالیٰ نے آپ سے کہا کہ میں تیری جماعت میں اتنی برکت دُوں گا کہ انسانوں کے لحاظ سے دنیا کی کوئی طاقت اور کوئی جماعت تیرا مقابلہ نہیں کر سکیگی۔ زمانہ ترقی کرتا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں آپکی محبت اور عشق پیدا کیا۔ ایک طرف آپ کا دائرہ وسیع ہوگیا، اور دوسری طرف تمام ملک میں آپکی تعلیم نے وہ اثر کیا کہ آپ کی وفات کے وقت دنیا نے دیکھا کہ نہ صرف یہ کہ ابوجہل اور عاص بن وائل کے ساتھیوں کے مقابلہ میں ہی آپ کو اچھے اتباع ملے بلکہ آپ کی وفات کے وقت دنیا نے یہ مان لیا کہ جو اتباع آپ کو ملے ہیں اُن کے مقابلہ میں موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے ساتھی بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں لَوْ کَانَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی حَیَّیْنِ لَمَا وَسِعَهُمَا اِلَّا اِتِّبَاعِیْ (الیواقیت والجواہر صـ۲۴) اگر حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام بھی زندہ ہوتے تو اُن کو میرے صحابہؓ میں شامل ہوئے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا۔ گویا حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام بھی آپ کے زمانہ میں زندہ موجود ہوتے تو وہ بھی آپ کے فرمانبردار اور مطیع ہوتے۔ دیکھو کتنا بڑا کوثر ہے جو آپ کو عطا کیا گیا۔ اگر آپکی ابتدائی حالت کو دیکھا جائے، اللہ تعالیٰ کا آپ کے ساتھ جو ابتدائی سلوک تھا اُسے دیکھا جائے، آپ کے اخلاق کے مظاہروں کو دیکھا جائے اور پھر آپ کے آخری انجام کو دیکھا جائے تو دل ایمان سے لبریز ہو جاتا ہے

سورۂ کوثر کا سورۂ ماعون سے دوسرا تعلق

دوسرا تعلق سورۂ کوثر کا سورۂ ماعون سے یہ ہے کہ سورۂ ماعون میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص تکذیبِ دین کرتا ہے اُس میں چار نقص پیدا ہو جاتے ہیں (۱) بخل جیسے فرمایا فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ۔ یعنی وہ یتیم کو دھتکارتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی دوسروں کو ترغیب

نہیں دینا (۲) ترکِ صلوٰۃ۔ گویا ایک طرف بُخل پیدا ہو جاتا ہے اور دوسری طرف اللہ تعالےٰ کی محبت کم ہو جاتی ہے (۳) کمزوریٔ ایمان پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجہ میں انسان کے اندر شرک کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے اور خدا تعالےٰ کی طرف سے اُس کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ اوّل تو لوگ نماز پڑھتے ہی نہیں اور اگر پڑھتے ہیں تو پوری توجہ سے نہیں پڑھتے وہ سمجھتے ہیں کہ انسان ہی خدا ہیں سو وہ اس لئے نمازیں پڑھتے ہیں تا انسان یہ کہیں کہ فلاں بڑا نمازی ہے۔ لوگ اُسے بُرا بھلا نہ کہیں۔ گویا ایک طرف وہ اللہ تعالےٰ کی عبودیت سے انکار کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ انسان کو اُلوہیت کے مقام پر لے جاتے ہیں (۴) آسان ترین نیکیوں سے روکنا جیسے فرمایا وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ یعنی ادنیٰ سے ادنیٰ سلوک بھی جو بغیر تکلیف اٹھائے کسی ہمسایہ سے کیا جا سکتا ہے وہ بھی نہیں کرتے۔ بخل میں تو یہ تھا کہ وہ کارآمد چیز خرچ نہیں کرتے مگر یہاں بتایا کہ وہ معمولی سے معمولی چیز جس سے اُنہیں کوئی نقصان نہیں ہوتا وہ بھی دوسرے کو نہیں دیتے۔ کسی نے تھوڑی دیر کے لئے ہتھوڑا مانگ لیا تو اس سے دینے والے کا کیا نقصان ہو جاتا ہے یا تھوڑی دیر کے لئے پھونکنی لے لی تو اس سے کیا نقصان ہو جاتا ہے مگر وہ اس کی توفیق نہیں پاتا۔

سورۂ کوثر کی آیت فَصَلِّ لِرَبِّكَ میں فاء لانے کی وجہ

یہ چار بدیاں ہیں جو کمزور مسلمانوں اور منافقوں میں پائی جاتی ہیں اور جنہیں پہلی سورۃ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِن کے مقابلہ میں اس سورۃ میں اللہ تعالےٰ بتاتا ہے کہ مومن کے اندر جس کی بہترین مثال محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں، چار خوبیاں پائی جاتی ہیں (۱) کوثر یعنی سخاوت۔ کوثر کے معنے جہاں زیادہ کے ہوتے ہیں وہاں زیادہ دینے کے بھی ہوتے ہیں۔ جب آپ کو کوثر ملا تو آپ نے دوسروں کو بھی کوثر دیا۔ گویا مومن کی پہلی خوبی یہ بیان فرمائی کہ وہ بہت زیادہ سخاوت کرتا ہے (۲) ترکِ صلوٰۃ کے مقابلہ میں فرمایا۔ فَصَلِّ۔ تُو نمازوں کی طرف توجہ کر۔ پہلی سورۃ میں کمزور مسلمانوں اور منافقوں کے متعلق فرمایا تھا کہ وہ نمازیں نہیں پڑھتے اور اگر پڑھتے بھی ہیں تو پوری توجہ سے نہیں پڑھتے۔ اِس کے مقابلہ میں اس سورۃ میں فرماتا ہے کہ جب کوئی کوثر کے مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ نمازوں کا پابند ہو جاتا ہے۔ تیسرے پہلی سورۃ میں بتایا تھا کہ جو لوگ کمزور ایمان والے ہیں وہ لوگوں کو دکھانے اور ریا کے لئے نمازیں پڑھتے ہیں مگر اس کے مقابلہ میں یہاں فرمایا لِرَبِّكَ یعنی مومن کامل کی نمازیں لوگوں کے لئے نہیں ہوتیں بلکہ اپنے رب کے لئے ہوتی ہیں۔ چوتھے پہلی سورۃ میں بتایا تھا وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ کہ وہ لوگ اپنے ہمسایہ کو ادنیٰ سے ادنیٰ احسان اور سلوک سے بھی محروم رکھتے ہیں۔ یہاں فرمایا وَانْحَرْ۔ اے میرے مومن بندے تُو قربانیاں کر اور اپنی قوم کی ہر رنگ میں مدد کر۔ گویا پہلی سُورۃ میں چار عیب کمزور مسلمانوں اور منافقوں کے بیان کئے تھے اس کے مقابلہ میں اِس سُورۃ میں مومن کی چار خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور اس طرح قریب کی پہلی سُورۃ اور سورۂ کوثر کے مضامین میں ایک لطیف تطابق پیدا کر دیا ہے۔

سورۂ کوثر کی آیت فَصَلِّ لِرَبِّكَ میں فَصَلِّ پر فاء لائی گئی ہے۔ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ اس بات میں بھی اس سورۃ کو پہلی سورۃ سے مشابہت ہے وہاں بھی فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ فرمایا اور یہ نتیجہ تھا پہلی باتوں کا اور یہاں بھی فَصَلِّ فرمایا۔ پس یہاں بھی یہی مراد ہے کہ کوثر (یعنی جس کا خدا تعالےٰ سے تعلق مضبوط ہو) کے نتیجہ میں دین میں ترقی کرنے کی توفیق ملتی ہے جس طرح تکذیبِ دین کے نتیجہ میں انسان نیکیوں سے محروم رہ جاتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ○

(اے نبی) یقیناً ہم نے تجھے کوثر عطا کیا ہے - ۵۲

۵۲ حل لغات - اَلْکَوْثَرُ کے معنے ہیں (۱) اَلْکَثِیْرُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ۔ ہر چیز کا کسی کے پاس کثرت سے پایا جانا (۲) اَلسَّیِّدُ اَلْکَثِیْرُ الْخَیْرِ قوم کا سردار جس کے اندر بڑی خیر اور برکت پائی جاتی ہو (۳) اَلرَّجُلُ الْکَثِیْرُ الْعَطَاءِ وَ الْخَیْرِ ایسا انسان جو بڑا سخی ہو اور دنیا میں بڑی کثرت سے نیکیاں پھیلانے والا ہو۔ (۴) نَھْرٌ فِی الْجَنَّۃِ۔ کوثر ایک نہر کا بھی نام ہے جو جنت میں پائی جاتی ہے -

اقرب الموارد کے مؤلف نے جو کوثر کے ایک معنے نَھْرٌ فِی الْجَنَّۃِ کے کئے ہیں یہ معنے لغت کے نہیں اور نہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت سے پہلے جو لفظ کوثر عرب میں استعمال ہوتا تھا اُس کے یہ معنے سمجھے جاتے تھے۔ بلکہ جب کوثر کا لفظ قرآن کریم اور احادیث میں استعمال ہوا اور مسلمانوں نے بتایا کہ کوثر ایک نہر کا نام ہے جو جنت میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوگی تو عرب میں یہ معنے بھی رائج ہو گئے اور لغت والوں نے مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق اِن معنوں کو بھی کتبِ لغت میں درج کر دیا۔ ورنہ اِس لفظ کے اصل معنے وہی تین ہیں جو اُوپر درج کئے گئے ہیں۔

کوثر کےان معنوں کی بنیاد کہ یہ جنت کی ایک نہر کا نام ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض احادیث پر ہے جو بخاری اور مسلم دونوں میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ روایت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے معراج کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا

اَتَیْتُ عَلٰی نَھْرٍ حَافَتَاہُ قِبَابُ اللُّؤْلُؤِ مُجَوَّفٍ فَقُلْتُ مَا ھٰذَا یَا جِبْرِیْلُ قَالَ ھٰذَا الْکَوْثَرُ (بخاری ابواب التفسیر) یعنی میں ارتقاء کرتے کرتے جنت میں ایک مقام پر پہنچا جہاں مجھے ایک نہر نظر آئی جس کے کنارے کھوکھلے موتیوں کے بنے ہوئے گنبدوں کی مانند تھے میں نے جبریل سے پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے؟ جبریل نے کہا یہ کوثر ہے - یہ حدیث مسلم میں بھی آتی ہے مگر حدیث کے وہ الفاظ جو میں نے اُوپر درج کئے ہیں بخاری کے ہیں۔

ابن جریر تابعی جو ایک مشہور مفسر گذرے ہیں اور جنہوں نے فتح البیان کے نام سے تیس جلدوں میں تفسیر لکھی ہے وہ حضرت انسؓ سے روایت درج کرتے ہیں کہ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ عَنِ الْکَوْثَرِ فَقَالَ ھُوَ نَھْرٌ اَعْطَانِیْہُ اللّٰہُ فِی الْجَنَّۃِ تُرَابُہٗ مِسْکٌ اَبْیَضُ مِنَ اللَّبَنِ وَ اَحْلٰی مِنَ الْعَسَلِ تَرِدُہٗ طَیْرٌ اَعْنَاقُھَا مِثْلُ اَعْنَاقِ الْجُزُرِ۔ قَالَ اَبُوْ بَکْرٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّھَا لَنَاعِمَۃٌ قَالَ اٰکِلُھَا اَنْعَمُ مِنْھَا (ابن جریر تفسیر سورۃ الکوثر)

الکوثر

الکوثر کے لغوی معنے نہر کے نہیں۔

کوثر کے معنے نہر فی الجنۃ کے کرنے کی بنیاد

یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کوثر کیا چیز ہے ؟ آپ نے فرمایا کوثر جنت کی ایک نہر کا نام ہے جو اللہ تعالے نے مجھے عطا فرمائی ہے۔ اُس کی مٹی مشک کی طرح ہے اور پانی دُودھ سے بھی زیادہ سفید اور شہد سے بھی زیادہ میٹھا ہے اُس پر ایسے پرندے آتے ہیں جن کی گردنیں گاجر کی طرح نرم ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر اُن پرندوں کی گردنیں گاجر کی طرح نرم ہیں تب تو وہ بہت ہی نرم ہوئیں۔ آپ نے فرمایا جو اُن جانوروں کے کھانے والے ہیں وہ اُن سے بھی زیادہ نرم ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ نے بھی اپنی مسند میں یہی روایت نقل کی ہے لیکن اُس میں یہ فرق ہے کہ انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کی بجائے حضرت عمرؓ کا نام لیا ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا۔

ایک روایت حضرت عائشہؓ سے بھی آتی ہے بخاری میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ سے سوال کیا گیا کہ کوثر کیا چیز ہے ؟ آپ نے فرمایا کوثر ایک نہر ہے جو جنت میں ہوگی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو خصوصیت کے ساتھ عطا کی جائے گی۔ (بخاری ابواب التفسیر)

۲۷۰ کوثر کی آواز سنے جانے کے متعلق حضرت عائشہؓ کی ایک روایت اور اس کے صحیح معنے۔

ایک اور روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جو شخص کوثر کی آواز سُننا چاہے وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لے تو اُسے کوثر کی آواز آنے لگ جائے گی۔ یہ ابو کریب کی روایت ہے جو ایک بہت بڑے محدث گذرے ہیں (ابن جریر تفسیر سورۃ الکوثر) عام طور پر لوگ اس کے یہ معنے سمجھتے ہیں کہ کانوں میں انگلیاں ڈالنے سے جو شُوں شُوں کی آواز آتی ہے وہی کوثر کی آواز ہے۔ لیکن یہ معنے عقل کے بالکل خلاف ہیں۔ اِس لئے کہ وہ آواز کان کے اندر سے پیدا ہوتی ہے کسی بیرونی چیز کا اس میں دخل نہیں ہوتا اور کوثر کی آواز ایک بیرونی چیز ہے۔ پس یہ معنے تو قطعی طور پر جاہلانہ ہیں اور کوئی شخص جو ذرا بھی عقل و فہم رکھتا ہو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف اِن کو منسوب نہیں کر سکتا۔ خود شُراح ان معنوں سے گھبرا گئے ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کانوں میں انگلیاں ڈالنے سے جو شُوں شُوں کی آواز آتی ہے وہ کوثر کی آواز ہے بلکہ اِس سے مراد یہ ہے کہ کان کی آواز کوثر کی آواز کے مشابہ ہے (ابن کثیر صفحہ ۳۰۵)

میرے نزدیک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بالکل صحیح ہے مگر جس نے اِس کے یہ معنے کئے ہیں کہ کانوں میں انگلیاں ڈالنے سے جو شُوں شُوں کی ہلکی سی آواز پیدا ہوتی ہے وہ کوثر کی آواز ہے اُس نے احمقانہ معنے کئے ہیں اور وہ اپنی جہالت کا آپ ذمہ وار ہے۔ نہ حضرت عائشہؓ نے اِس کے یہ معنے کئے ہیں اور نہ شُراحِ حدیث نے اس کے یہ معنے کئے ہیں۔ بلکہ میرے نزدیک جو معنے شراحِ حدیث نے کئے ہیں وہ بھی صحیح نہیں۔ آخر ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ حضرت عائشہؓ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ میں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ایسا سُنا ہے اور نہ معراج میں حضرت عائشہؓ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں کہ انہوں نے کوثر کو دیکھا ہو اور اُس کی آواز کو سُنا ہو۔ اُس وقت تو آپ کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ جب معراج میں آپ اکیلے ہی تشریف لے گئے تھے اور آپ نے ہی کوثر کو دیکھا اور اُسکی آواز کو سُنا تو پھر آپ ہی بتا سکتے تھے کہ کوثر کی آواز کیسی ہے۔ پھر اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ فرماتیں

کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ بتایا ہے کہ کوثر کی آواز ایسی ہے تب بھی کوئی بات تھی۔ مگر حضرت عائشہؓ نے اس قسم کا بھی کوئی فقرہ استعمال نہیں کیا۔ پھر سوال یہ ہے کہ اگر کوثر ایک نہر ہے تو اُس کی آواز کوئی نئی قسم کی نہیں ہو سکتی بہر حال جیسے دنیا کی تمام نہروں کی آواز ہوتی ہے ویسی ہی کوثر کی آواز ہوگی۔ اُس کے لئے کانوں میں انگلیاں ڈال لینا اپنے اندر کوئی معقولیت نہیں رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان بعض دفعہ استعارہ میں بات کرتا ہے اور سُننے والے اُس کے کچھ اور معنے کر لیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ جلسہ سالانہ کے ایام میں مَیں نماز پڑھا کر گھر جا رہا تھا کہ ہجوم میں سے کسی شخص نے مجھے انگور دئے۔ مجھے اُس وقت معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کس شخص نے دئے ہیں۔ انگور بہت میٹھے تھے مگر چونکہ دینے والے کو مَیں نے دیکھا نہیں تھا میں نے گھر آکر کہہ دیا کہ یہ انگور مجھے کوئی فرشتہ دے گیا ہے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالےٰ نے بھجوائے ہیں مگر لوگوں میں یہ روایت چل پڑی کہ مجھے واقعہ میں کوئی فرشتہ انگور دے گیا ہے اور بعض دوستوں نے تو مجھے پیغام بھیجنے شروع کر دئے کہ اگر وہ انگور آپ کے پاس ہوں تو ہمیں بھی بطور تبرک کچھ بھجوا دیں۔ مَیں نے دوستوں کو بتایا کہ انگور تو مجھے کسی آدمی نے دئے تھے لیکن ہجوم میں مجھے پتہ نہیں لگ سکا تھا کہ وہ کون ہے اِس لئے میں نے کہہ دیا کہ فرشتے نے دئے ہیں ورنہ دینے والا ایک انسان تھا کوئی فرشتہ نہیں تھا۔ اِسی طرح یہاں بھی استعارہ میں کلام کیا گیا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے کسی شخص نے اپنی حماقت سے سوال کر دیا کہ کوثر کی آواز کیسی ہے۔ آپ نے اُسے استعارہ میں جواب دیا کہ تم اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لو تمہیں کوثر کی آواز آنے لگ جائے گی۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ جب انسان دنیا سے اپنے کان بند کر کے دل کی آواز سُنتا ہے یعنی فطرتِ صحیحہ یا اسلام کی آواز کو سُنتا ہے تو وہ کوثر کی آواز کو سُن لیتا ہے یعنی کوثر تک پہنچنے کے قابل ہو جاتا ہے مگر سننے والوں نے اِس کا یہ مطلب لے لیا کہ کانوں میں انگلیاں ڈال لو تو اس کے نتیجہ میں جو شُوں شُوں کی آواز پیدا ہوگی وہ کوثر کی آواز ہے۔

احادیث میں کوثر کے معنے جو نَهْرٌ فِي الْجَنَّةِ کے کئے گئے ہیں یہ چونکہ رسول کریم صلے اللہ وسلم سے ثابت ہیں اِس لئے اُن کا انکار نہیں کیا جا سکتا گو زیادہ تر روایات حضرت انس بن مالکؓ سے آتی ہیں لیکن بعض احادیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہیں۔ بہر حال یہ احادیث صحیح ہیں۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ (۱) اِس سُورۃ میں اُسی کوثر کا ذکر ہے جس کے معنے نَهْرٌ فِي الْجَنَّةِ کے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کوثر کیا چیز ہے آپ نے فرمایا مَیں معراج کی رات ارتقاء کرتے کرتے ایک مقام پر پہنچا وہاں میں نے ایک نہر دیکھی مَیں نے جبریل سے پوچھا یہ کیا ہے؟ جبریل نے بتایا کہ یہ کوثر ہے۔ اِس جواب سے یہ کیونکر نتیجہ نکل آیا کہ یہ وہی کوثر ہے جس کا سورۃ الکوثر میں ذکر آتا ہے جبکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ سورۃ اَور وقت میں نازل ہوئی ہے اور معراج اَور وقت میں ہُوا ہے۔ یہ سورۃ بھی مکّی ہے اَور معراج بھی مکّی ہے مگر یہ سورۃ معراج سے چھ سات سال پہلے کی نازل شدہ ہے۔ دو ملتی جُلتی چیزوں کو دیکھتے ہوئے ایک کے ذکر سے دوسری چیز کا خیال کر لینا تو طبعی بات ہے مگر اس پر حصر کر لینا خلافِ عقل ہے ہمارے ہاں ایک اُستانی تھیں جو بہت ہی مخلص عورت

تھیں۔ اُن کے دماغ میں کچھ نقص پیدا ہوگیا تھا۔ ایک دن وہ ہمارے گھر میں بیٹھی تھیں کہ زلزلہ آیا۔ ہماری نانی اماں، وہ مجنون اُستانی اور دو اَور عورتیں چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ نانی اماں مرحومہ نے فرمایا زلزلہ آیا ہے اِس پر وہ اُستانی کہنے لگیں آپ اطمینان سے بیٹھی رہیں زلزلہ کوئی نہیں آیا صرف میرا سر چکرایا ہے۔ اب دیکھو اگر اُس عورت کا سر کبھی کبھی چکراتا تھا تو اس کے یہ معنے تو نہیں تھے کہ اگر زلزلہ کی وجہ سے چارپائی ہلی ہے تب بھی اُس کا سر چکرایا ہے چارپائی نہیں ہلی۔ یہاں بھی بالکل ویسی ہی بات ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ جنّت میں ایک نہر ہے جس کی مٹی مشک جیسی ہے۔ پانی دُودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے اور اُس کا نام کوثر ہے لوگوں نے اِس سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ سورۃ کوثر میں بھی اِسی کا ذکر آیا ہے حالانکہ سورۃ کوثر والی کوثر اَور چیز ہے اور جنّت والی کوثر اَور۔ سورۃ کوثر کی کوثر کو جنّت والی کوثر سے محدود نہیں کیا جا سکتا۔

غرض اگر یہ تسلیم بھی کیا جائے کہ اس سورۃ میں بھی اُسی نہر کا ذکر ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جنّت میں عطا ہوگی تو پھر یہ معنے بطور حصر کے نہیں ہوں گے۔ یعنی اِس کے یہ معنے نہیں ہونگے کہ اس جگہ کوثر سے صرف وہی نہر مراد ہے بلکہ مراد یہ ہوگی کہ کوثر مذکور فی القرآن کی ایک آئندہ زندگی کی مثال وہ نہر ہے جو جنّت میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دی جائے گی۔

جنّت کی نعماء کے متعلق قرآن کریم نے یہ اصل بیان فرمایا ہے کہ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوا هٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا (بقرہ ع ۳) یعنی جب کبھی جنتیوں کو جنت کے پھلوں میں سے کوئی پھل کھلایا جائیگا تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی پھل ہے جو ہمیں پہلے بھی ملتا رہا ہے اور وہاں اُنہیں ملتی جُلتی چیزیں دی جائیں گی۔ یہ آیت سورۃ بقرہ کی ہے۔ اس کے بعد سورۃ سجدہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ (السجدۃ ع ۲) یعنی جنت میں جو چیزیں مومنوں کیلئے مخفی رکھی گئی ہیں اور جن سے اُن کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچے گی اُنہیں کوئی بھی نہیں جانتا۔ اب ایک طرف اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ جنت کی نعماء کا کسی کو علم نہیں اور دوسری طرف مومنوں کا اُن چیزوں کو دیکھ کر یہ کہنا کہ یہ تو وہی چیزیں ہیں جو ہمیں پہلے بھی دنیا میں ملتی رہی ہیں بظاہر بڑی تذلیل کا فقرہ ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے دوست سے ملنے کے لئے جائے اور وہ دوست اُسے یہ کہے کہ ہم تمہیں ایسا پھل کھلائیں گے جو تم نے پہلے کبھی نہیں کھایا ہوگا تو اُس پھل کو دیکھ کر بڑی اُجڈ طبیعت والا ہی کوئی انسان ہوگا جو یہ کہے کہ یہ پھل میں نے پہلے بھی کھایا ہُوا ہے۔ عام حالات میں ایسا انسان جو سلجھے ہوئے اخلاق رکھتا ہو اس قسم کا فقرہ استعمال نہیں کرسکتا کہ یہ پھل میں نے پہلے بھی کھایا ہُوا ہے۔ بلکہ وہ یہی کہے گا کہ یہ پھل نہایت لذیذ اور عمدہ ہے اگر انسان اپنے ایک معمولی دوست سے بھی ایسی بات نہیں کہہ سکتا تو خدا تعالیٰ کے متعلق یہ بات کیسے کہی جا سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ تو کہتا ہے کہ اگلے جہان میں تمہیں وہ پھل دئے جائیں گے جو تم نے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ ایسے پھلوں کو دیکھکر مومنوں کا یہ کہنا کہ ہم نے یہ پھل پہلے بھی کھائے ہوئے ہیں بالکل جھوٹ بن جاتا ہے اور چونکہ کوئی جنتی ایسی

بات نہیں کہہ سکتا جو جھوٹ ہو۔ اس لئے معلوم ہُوا کہ اس آیت کے وہ معنے نہیں جو عام طور پر کئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے وَ اُتُوْا بِہٖ مُتَشَابِہًا کہ وہ چیزیں جو مومنوں کو جنت میں ملیں گی دنیا کی چیزوں کے مشابہ ہونگی گویا ایک طرف انہیں متشابہ قرار دیا اور دوسری طرف اُن کو بالکل مختلف قرار دیا۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ اس جگہ مادی نعماء اور پھل مراد نہیں۔ بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو روحانی نعمتیں اُنہیں ملی تھیں وہی متشکل ہو کر انہیں اگلے جہان میں پھلوں اور باغات کی صورت میں مل جائیں گی جب ایک مومن جنت میں انگور کھائے گا تو وہ کہیگا یہ تو وہ انگور ہیں جو ہمیں دنیا میں دیئے گئے تھے یعنی جو مزہ ہمیں نمازوں میں آتا تھا وہی ان انگوروں کا ہے۔ جو مزہ روزوں کا ہمیں دنیا میں آتا تھا وہی مثلاً اس سردے کا ہے۔ گویا دنیا میں جو عبادتیں کسی نے کی ہوں گی وہی متشکل ہو کر اگلے جہان میں اُس کے سامنے آجائیں گی۔ احادیث میں ہمیں اس کی بعض مثالیں بھی ملتی ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ رویاء میں دیکھا کہ میں جنت میں گیا ہوں۔ جب میں وہاں گیا تو ایک فرشتہ جنت کے انگوروں کے دو خوشے میرے پاس لایا اور اُن میں سے ایک مجھے دیکر کہنے لگا کہ یہ آپ کے لئے ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ دوسرا خوشہ کس کے لئے ہے؟ اُس فرشتے نے جواب دیا یہ ابوجہل کے لئے ہے۔ آپ فرماتے ہیں یہ سُنکر میں اتنا گھبرایا کہ میری آنکھ کھل گئی اور میں نے کہا کیا اللہ تعالےٰ کے نزدیک اُس کا رسول اور اُس کا دشمن دونوں ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کے لئے بھی جنت کے انگوروں کا ایک خوشہ آیا اور اُس کے دشمن کے لئے بھی جنت کے انگوروں کا ایک خوشہ آیا۔ بعد میں ابوجہل کے مارے جانے کے بعد جب فتح مکہ ہوئی تو عکرمہؓ نے جو ابوجہل کا بیٹا تھا غصہ کے مارے وہاں رہنا پسند نہ کیا اور وہ وہاں سے بھاگ گیا۔ اُس کی بیوی اُسے لانے کے لئے گئی اور اُسے کہا تم بے وقوفی کر رہے ہو جو اپنا وطن چھوڑ کر جا رہے ہو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو بہت اچھے انسان ہیں۔ انہوں نے ہمارے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے۔ ایسا اچھا سلوک خدا تعالےٰ کے رسول کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر تم واپس لَوٹ چلو تو وہ تمہیں معاف کر دیں گے اور تمہارے دین میں بھی کوئی دخل نہیں دیں گے۔ عکرمہؓ کو یہ یقین نہیں آتا تھا کہ ایک ایسے شخص کو جسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے اتنی دشمنی ہے کہ اُس نے آپ کی وجہ سے مکہ میں رہنا بھی پسند نہیں کیا آپ معاف فرما دینگے بلکہ اُس کے دین میں بھی کوئی دخل نہیں دیں گے۔ مگر بیوی نے اُسے یقین دلایا اور وہ اُس کے کہنے پر واپس آیا اور اپنی بیوی کو ساتھ لیکر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا اور عرض کیا کہ میری بیوی کہتی ہے آپ نے میرے متعلق یہ فرمایا ہے کہ اگر میں مکہ میں ہی رہوں تو آپ میرے دین میں کوئی دخل نہیں دیں گے اور مجھے معاف فرما دیں گے۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں جو کچھ تمہاری بیوی نے کہا ہے وہ درست ہے۔ یہ بات عکرمہؓ کی امیدوں کے بالکل خلاف تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ ناممکن بات ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک ایسے دشمن کو معاف کر دیں جس نے آپ کو اور آپ کے ماننے والوں کو

ہر قسم کا دُکھ دیا اور آپ کے ماننے والوں کا خون بہایا اور پھر فتح مکّہ کے بعد وہ یہ بھی برداشت نہ کر سکا کہ وہ مکّہ میں رہے۔ عکرمہؓ سمجھتا تھا کہ آپ مجھے کسی طرح معاف نہیں کر سکتے کیونکہ میں نے آپ کی مخالفت میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی اور میرے باپ نے بھی آپ کو ہر قسم کے دکھ دئے ہیں جن کی مثال دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی۔ مگر جب آپ نے فرمایا کہ جو کچھ تمہاری بیوی نے کہا درست ہے تو اس کا عکرمہؓ پر ایسا اثر ہُوا کہ اُس نے کہا اگر آپ نے ایسا کہا ہے تو پھر میں بھی کہتا ہوں کہ خدا تعالےٰ کے نبی کے سوا اور کوئی شخص ایسا کام نہیں کر سکتا اور میں آپ پر ایمان لاتا ہوں۔ جب وہ ایمان لایا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب میرے خواب کی تعبیر مجھ پر کھل گئی ہے اور میں نے سمجھ لیا ہے کہ اُس خوشے سے مراد یہ تھی کہ عکرمہ ایمان لے آئے گا گویا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جنّتی انگوروں کا ایک خوشہ دکھائی دیا مگر اس سے مراد ایمان تھا اور آپ کو ابوجہل دکھایا گیا مگر اس سے مراد اُس کا بیٹا تھا۔ اِسی طرح ایک دفعہ آپؐ نے رویاء میں دیکھا کہ آپ کو دُودھ دیا گیا جسے آپ نے پیٹ بھر کر پیا۔ پھر حضرت عمرؓ خواب میں آئے تو اُنہیں اپنا پس خوردہ دیا۔ جسے انہوں نے بھی پیا۔ آپ نے اس خواب کی تعبیر یہ کی کہ دُودھ سے مراد علم ہے۔ گویا خواب میں دُودھ پینے سے مراد علمِ دین کا میسّر آ جانا ہوتا ہے۔ اِن مثالوں سے ظاہر ہے کہ اگلے جہان کے نعماء کی کیا حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک طرف تو یہ فرماتا ہے کہ لَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ (السجدۃ ع۲) کوئی شخص نہیں جانتا کہ اُس کے لئے اگلے جہان میں کیا کچھ رکھا گیا ہے جس سے اُس کی آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہوگی اور دوسری طرف فرماتا ہے وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا کہ انہیں دنیا میں جو چیزیں ملتی تھیں اُن کے مشابہ چیزیں اگلے جہان میں دی جائیں گی۔ گویا پہلی آیت کی خود ہی تردید کر دی پھر احادیث میں بھی آتا ہے کہ جنت کی نعماء ایسی ہوں گی کہ لَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ (بخاری ابواب التفسیر) نہ تو کسی آنکھ نے انہیں دیکھا ہے نہ کسی کان نے اُنہیں سُنا ہے اور نہ ہی دل کے کسی گوشہ میں اُس کا تصور آ سکتا ہے۔ جب وہ ایسی مخفی چیزیں ہیں تو پھر اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا کے کیا معنے ہوئے؟ اِس کے وہی معنے ہیں جن کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے۔ یعنی اس کا یہ مطلب نہیں کہ جنت میں دنیا کی چیزوں کے مشابہ چیزیں مومنوں کو ملیں گی بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں جو روحانی نعمتیں اُنہیں ملتی رہی ہیں وہی اگلے جہان میں مختلف پھلوں کی شکل میں متشکل ہو کر اُن کے سامنے آ جائیں گی جس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے رویاء میں ایمان کو انگور کے خوشہ کی شکل میں دیکھا یا آپ نے رُوحانی علم کو دُودھ کی صورت میں دیکھا۔ اِسی طرح وہاں روحانی انگور کھانے سے ایمان میں ترقی ہوگی (اس مضمون کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام بانیٔ سلسلۂ احمدیہ نے نہایت لطافت سے اپنی کتاب 'اسلامی اصول کی فلاسفی' میں بیان فرمایا ہے فجزاہ اللہ احسن الجزاء) اسی طرح رُوحانی دُودھ پینے سے انتڑیوں میں نفخ پیدا نہیں ہوگا بلکہ علمِ دین ترقی کرے گا اور روحانیت میں اضافہ ہوگا بہرحال قرآنی آیات بتاتی ہیں کہ اگلے جہان میں انسان

کو جو کچھ نعمتیں ملیں گی وہ سب کی سب اِس جہان کی روحانی نعماء کا ایک تمثّل ہوں گی۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے ایک اور مقام پر بھی واضح کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (الرحمٰن) یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کا خوف اپنے دل میں رکھتا ہے اُس کے لئے دو جنّتیں ہیں۔ ایک جنّت اُسے اِس دنیا میں ملے گی اور دوسری جنّت اگلے جہان میں ملیگی۔ یہ آیت بھی بتاتی ہے کہ اگلے جہان میں اُسی وقت کوئی چیز مل سکتی ہے جب اُس جیسی کوئی چیز اِس دنیا میں بھی ملے۔ پھر ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل ع ۸) جو شخص اس دنیا میں اندھا ہوگا وہ اگلے جہان میں بھی اندھا ہوگا۔ اِس آیت میں اندھوں سے مراد اگر جسمانی اندھے لئے جائیں تب تو بڑے ظلم کی بات ہے کہ ایک شخص اگر پیدائشی اندھا ہے یا اس دنیا میں کسی بیماری کی وجہ سے ہی اندھا ہوا ہے تو اُسے اگلے جہان میں بھی اندھا ہی رکھا جائے یہ معنے ہرگز درست نہیں۔ اندھے سے مراد اِس جگہ روحانی اندھا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ اس دنیا میں روحانی لحاظ سے اندھے ہیں وہ اگلے جہان میں بھی اندھے ہی اُٹھائے جائیں گے اللہ تعالیٰ کا قرب اُنہیں نصیب نہیں ہوگا۔ اِس آیت سے بھی ثابت ہُوا کہ ہر وہ چیز جو اگلے جہان میں ملتی ہے اُس کا اِس جہان میں بھی ملنا ضروری ہے۔ اِس تشریح کو سامنے رکھتے ہوئے بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ جب جنّت کی نعماء اس دنیا کی رُوحانی نعماء کی تمثیل ہوں گی تو ضرور ہے کہ کوثر کی بھی کوئی تمثیل ہو جو متشکل ہو کر اگلے جہان میں آپ کو نہر کی شکل میں عطا کی جائے۔ جس طرح اس دنیا کا ایمان اگلے جہان میں انگور کی شکل میں ملیگا۔ اِس دنیا کا روحانی علم جنّت میں دُودھ کی شکل میں ملیگا۔ اِسی طرح ماننا پڑیگا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اِس جہان میں بھی کوئی ایسی ہی چیز ملیگی تبھی تو وہ اگلے جہان میں نہر کی شکل میں متمثّل کر کے آپ کو دی جائیگی۔ پس کوثر کے معنے اگر یہاں نَهْرٌ فِي الْجَنَّةِ کے کئے جائیں تو ہمیں ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اِس دنیا میں بھی کوئی ایسی ہی چیز ملنے والی تھی۔ جو اگلے جہان میں آپ کو نہر کی شکل میں متمثّل ہو کر عطا کی جائے گی۔ بہر حال صرف نہر والے معنوں پر کوثر کا حصر نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ اس کا ثبوت صحابہؓ کے خیالات سے بھی ملتا ہے۔

بخاری میں جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ سمجھی جاتی ہے حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت آتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں قَالَ فِي الْكَوْثَرِ هُوَ الْخَيْرُ الَّذِيْ اَعْطَاهُ اللّٰهُ اِيَّاهُ (بخاری باب التفسیر) یعنی کوثر سے مراد وہ اعلیٰ درجہ کی بھلائیاں ہیں جو اِس دنیا میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دی گئی تھیں۔ دیکھو حضرت ابن عباسؓ بھی تسلیم فرماتے ہیں کہ جو معنے مَیں نے اُوپر کئے ہیں وہی درست ہیں۔ جب دنیا میں آپ کو اِس قسم کی کوئی چیز ملیگی تبھی وہ اگلے جہان میں نہر کی شکل میں متمثّل ہو کر آپ کو عطا ہوگی۔

اِسی طرح بخاری میں آتا ہے کہ ابوالبشر نے ایک دفعہ حضرت سعید بن جبیر سے جو اعلیٰ درجہ کے تابعی اور علمِ حدیث کے بہت بڑے ماہر تھے کہا کہ فَاِنَّ نَاسًا يَزْعُمُوْنَ اَنَّهٗ نَهْرٌ فِي الْجَنَّةِ۔ آپ تو ہمیں سُنا رہے ہیں کہ وہ تمام اعلیٰ درجہ کی بھلائیاں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اِس دنیا میں ملیں اُن کا

نام کوثر ہے۔ لیکن لوگ کہتے ہیں کہ کوثر جنت کی ایک نہر ہے یہ کیا بات ہے؟ سعید بن جبیر نے جواب دیا کہ اَلنَّهَرُ الَّذِیْ فِی الْجَنَّةِ مِنَ الْخَیْرِ الَّذِیْ اَعْطَاهُ اللّٰهُ اِیَّاهُ (بخاری ابواب التفسیر) وہ نہر جو جنت میں آپ کو ملے گی وہ بھی تو اسی کا ایک حصہ ہے یعنی میں یہ نہیں کہتا کہ جنت کی وہ نہر جو آپ کو ملے گی کوثر نہیں۔ بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ کوثر بہت سے ہیں اور یہ نہر بھی اُن کا ایک حصہ ہے۔ یہ روایت بھی میری تفسیر کے مطابق ہے اور بتاتی ہے کہ کوثر کے معنے نَهَرٌ فِی الْجَنَّةِ کے بے شک کئے جائیں مگر ان معنوں پر حصر نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ نہر بھی سورۂ کوثر والی کوثر کا ایک حصہ ہے جو تمثیل کے طور پر آپ کو عطا ہوگی۔

پھر بخاری میں حضرت ابن عباس سے روایت آتی ہے کہ اَلْکَوْثَرُ اَلْخَیْرُ الْکَثِیْرُ کوثر کے معنے خیر کثیر کے ہیں۔ ابو الفداء ابن کثیر اس پر لکھتے ہیں هٰذَا التَّفْسِیْرُ یَعُمُّ النَّهَرَ وَغَیْرَهٗ۔ ان معنوں میں نہر اور اُس کے علاوہ دوسری چیزیں بھی شامل ہیں لِاَنَّ الْکَوْثَرَ مِنَ الْکَثْرَةِ وَهُوَ الْخَیْرُ الْکَثِیْرُ۔ کیونکہ کوثر کثرت سے نکلا ہے اور اس کے معنے خیر کثیر کے ہیں۔ پھر کہتے ہیں وَمِنْ ذٰلِكَ النَّهَرُ۔ اس خیر کثیر میں سے ایک جنت والی نہر بھی ہے جو آپ کو خصوصیت کے ساتھ جنت میں ملے گی۔ كَمَا قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَعِكْرَمَةُ وَسَعِيْدُ ابْنُ جُبَيْرٍ وَمُجَاهِدٌ وَمُحَارِبٌ وَالْحَسَنُ ابْنُ اَبِی الْحَسَنِ الْبَصْرِیِّ۔ جیسے ابن عباسؓ اور عکرمہؓ اور سعید بن جبیر اور مجاہد اور محارب اور حسن بن ابی الحسن بصری نے فرمایا ہے کہ کوثر سے مراد بہت سی بھلائیاں ہیں۔ حتّٰی قَالَ الْمُجَاهِدُ هُوَ الْخَیْرُ الْکَثِیْرُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ۔ مجاہد نے تو اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ کوثر کے معنے بہت بڑی بھلائی کے ہیں جو اس دنیا میں بھی آپ کو ملے گی اور آخرت میں بھی آپ کو ملے گی۔ وَقَالَ عِكْرَمَةُ هُوَ النُّبُوَّةُ وَالْقُرْاٰنُ وَثَوَابُ الْاٰخِرَةِ۔ اور عکرمہؓ کہتے ہیں کہ کوثر میں نبوت، قرآن کریم اور آخرت کا ثواب بھی شامل ہے گویا کوثر کے وسیع معنے ہیں اور انہیں محدود کرنا جائز نہیں اور جو معنے میں نے کئے ہیں اُن میں میرے ساتھ صحابہؓ اور دوسرے تابعین بھی شامل ہیں یا یوں کہو کہ چونکہ اُنہوں نے وہ معنے پہلے کئے ہیں اس لئے میرے معنے اُن کے موافق ہیں۔ اگرچہ انہوں نے اَور رنگ میں نتیجہ نکالا ہے اور مَیں نے اور رنگ میں۔ میرے دلائل اَور ہیں اور اُن کے دلائل اَور ہیں میں نے اُن دلائل کو ردّ نہیں کیا بلکہ اُن کے علاوہ اور بھی بہت سے دلائل پیش کئے ہیں۔

پھر ابن جریر کہتے ہیں کہ عطاء بن سائب سے محارب بن دثار نے پوچھا کہ سعید بن جبیر کا کوثر کے بارہ میں کیا قول ہے۔ سعید بن جبیر کو احادیث کے بارہ میں بہت ملکہ تھا اس پر عطاء بن سائب نے کہا سعید بن جبیر نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے هُوَ الْخَیْرُ الْکَثِیْرُ۔ یعنی کوثر وہ اعلیٰ درجہ کی بھلائیاں ہیں جو دنیا میں آپ کو دی گئیں۔ فَقَالَ صَدَقَ وَاللّٰهِ۔ اس نے کہا انہوں نے بالکل ٹھیک کہا ہے اِنَّهُ الْخَیْرُ الْکَثِیْرُ۔ کوثر سے مراد خیر کثیر ہی ہے مگر ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ هُوَ نَهَرٌ فِی الْجَنَّةِ۔ کوثر جنت میں ایک نہر ہے۔ یہ معنے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے خیر کثیر کے معنوں کے خلاف نہیں بلکہ یہ بھی اس میں شامل ہیں جیسے کوئی کہے فلاں کے پاس بہت

مال ہے اور پھر کسے اُس کے پاس ایک گھڑی بھی ہے تو یہ بات پہلی بات کے مخالف نہیں ہوگی۔ کیونکہ گھڑی بھی مال میں شامل ہے۔

جیساکہ میں پہلے بتا چکا ہوں جنت کی وہ نہر جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خصوصیت کے ساتھ ملے گی وہ بھی اِن معنوں میں جو میں نے کئے ہیں شامل ہے اور یہ بھی ایک کوثر ہے۔ 'یہ ہے' اور 'یہی ہے' میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں یہ دینار زید کا ہے۔ اب اس پر قیاس کرکے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ دینار یہی ہے اور کوئی دینار نہیں۔ اسی طرح وہ نہر جو آپ کو اس پیشگوئی کے نتیجہ میں ملے گی اُس کے علاوہ اور بھی کئی کوثر ہیں جو آپ کو ملے۔ بہرحال واقعہ یہی ہے کہ قرآن کریم کے وسیع معنوں کو محدود کرنے کی کوئی وجہ نہیں جبکہ خیر کثیر کے معنے پیش کردہ روایت کے مخالف بھی نہیں۔ روایت صرف ایک مثال دیتی ہے اُس پر حصر نہیں کرتی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ اگر کوثر کے معنے صرف نَهْرٌ فِي الْجَنَّةِ کے نہیں بلکہ اور بھی ہیں تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن معنوں کو بیان کیوں نہیں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی ساری تفسیر تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں اور نہ ہی سارے معنے ثابت ہیں۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے سات بطن ہیں اور ہر بطن کے سات معنے ہیں۔ گویا قرآن کریم کی ہر آیت کے کم از کم ۴۹ معنے ہونے چاہئیں۔ اب کوثر کے ایک معنے تو نَهْرٌ فِي الْجَنَّةِ کے ہوئے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بتادئے باقی ۴۸ معنے آپ نے کہاں بیان کئے ہیں۔ جب ایک ہی معنے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں تو باقی ۴۸ معنوں کی ہمارے لئے گنجائش ہوئی اور اگر ہم صرف ایک بطن تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھیں تب بھی باقی چھ معنے کہاں ہیں؟ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے سات بطن بیان فرمائے ہیں جن میں سے ایک آپ نے بیان فرمادیا باقی چھ کی ہمارے لئے بہرحال گنجائش ہے۔

(۲) یہ سوال کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک معنے کیوں بیان کردئے باقی کیوں بیان نہیں کئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کے معانی تدبّر اور استنباط سے کھلتے ہیں۔ سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ جب قرآن کریم کی کسی آیت کا مفہوم معلوم کرنے میں لوگوں کو مشکلات پیش آتی ہیں تو جو لوگ راسخ فی العلم ہوتے ہیں وہی اُن مشکلات کو حل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں عوام الناس اُن کو حل نہیں کرسکتے (آل عمران ع۱)

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے معنے غور و فکر اور تدبّر سے نکلتے ہیں۔ مگر اس آیت میں کوثر کے جو معنے تھے اُن میں سے ایک معنے ایسے تھے جو غور و فکر اور تدبّر سے نہیں نکل سکتے تھے اور وہ جنت والی نہر کے معنے ہیں۔ یہ معنے تو وہی بتا سکتا تھا جس نے جنت جاکر دیکھی ہو یا اس بارہ میں اُسے وحی ہوئی ہو۔ باقی سارے معنے غور و فکر سے معلوم ہوسکتے تھے پس جو معنے غور اور تدبّر سے معلوم ہوسکتے تھے اُن کے بتانے کی خاص ضرورت نہ تھی اور جو معنے مخفی واقعات سے تعلق رکھتے تھے صرف اُن کے بتانے کی ضرورت تھی سو وہ آپ نے بتادئے۔ یہ واضح بات ہے کہ ہم معراج پر نہیں گئے۔ ہم نے وہ نہر نہیں دیکھی

جس کی نسبت آپؐ سے کہا گیا کہ آپ کو ملے گی اِس لئے یہ معنے سوائے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اَور کوئی شخص نہیں بنا سکتا تھا۔

اب مَیں اس بات کے دلائل پیش کرتا ہوں کہ میرے نزدیک اِس جگہ کوثر کے معنے صرف نہر کے نہیں ہو سکتے۔

اِس بارہ میں میری پہلی دلیل یہ ہے کہ جیسا کہ میں بارہا بتا چکا ہوں قرآن کریم میں جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں اُن کے متعلق قاعدہ یہ ہے کہ جتنے معنے لُغت میں کسی لفظ کے ہوں وہ سب کے سب وہاں مراد لئے جاتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ کوئی معنے ایسے ہوں جن کو خدا تعالےٰ نے اُس جگہ پر یا قرآن کریم کے دوسرے مقامات پر ردّ کر دیا ہو۔ اگر وہ معنے جو ابن عباسؓ نے کئے ہیں اور سعید بن جبیر جیسے عالم نے کئے ہیں اور حسن بصری جو ایک ولی اللہ تھے انہوں نے کئے ہیں اور مجاہد اور محارب جیسے محدثین نے کئے ہیں اور عکرمہؓ نے کئے ہیں اور میں نے کئے ہیں غلط ہوتے تو خدا تعالےٰ انہی آیات میں کوئی ایسا توڑ رکھ دیتا جس سے وہ معنے باطل ہو جاتے یا کسی اَور جگہ پر قرآن کریم میں اُن کی تردید کر دیتا۔ لیکن اُس کا ایسا نہ کرنا صاف بتاتا ہے کہ صرف جنّت کی نہر والے معنوں پر یہاں حصر نہیں کیا گیا۔

۲۷۶
اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ میں الکوثر کے معنے صرف نہر کے نہیں ہو سکتے۔

دوسری دلیل اس بات کی کہ یہاں کوثر کے معنے صرف نَھَرٌ فِی الْجَنَّۃِ کے نہیں یہ ہے کہ اِس سورت میں فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ اور اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ کے الفاظ آتے ہیں اور یہ تین باتیں ایسی ہیں جو کوثر کے نتیجہ کے طور پر بتائی گئی ہیں۔ فَصَلِّ میں فاء تعقیب کی ہے جس کے معنے نتیجہ کے ہوتے ہیں جیسے کہتے ہیں تَزَوَّجَ فَوُلِدَ لَہٗ۔ اُس نے شادی کی جس کے نتیجہ میں اُس کے ہاں بچہ پیدا ہوا یا ذَھَبْتُ اِلٰی بَیْتِہٖ فَسَاَلْتُہٗ میں اُس کے گھر گیا تو اُس سے میں نے سوال کیا یعنی سوال کرنا گھر جانے کا نتیجہ تھا۔ اِسی طرح اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ۔ اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ۔ ہم نے تجھے کوثر دیا ہے اِس کے نتیجہ کے طور پر تُو یہ کام کر۔ اب یہاں یہ معنے چسپاں ہی نہیں ہو سکتے کہ ہم نے تجھے جنت میں نہر دی ہے اِس کے نتیجہ میں تُو نماز پڑھ اور قربانی دے۔ تیرا دشمن ابتر ہو جائے گا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ فلاں نے شادی کی ہے جس کے نتیجہ میں کوئٹہ میں زلزلہ آیا۔ ہر شخص کہے گا کہ زلزلہ کا شادی کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ یہ تو ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ والی بات ہے۔ اِسی طرح نماز، قربانی اور دشمن کا ابتر رہنا نہر کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ نہر کا نتیجہ ہوتا تو پھر کوئی روایت ایسی بھی آنی چاہیئے تھی کہ فلاں وقت نہر کے بدلہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو نفل پڑھے یا اُونٹ کی قربانی کی یا اُس کے نتیجہ میں فلاں دشمن کا بیٹا مر گیا لیکن ایسی کوئی روایت نہیں۔ ہم یہ معنے تو کر سکتے ہیں کہ ہم نے تجھے خیر کثیر دیا ہے اِس لئے تُو نماز پڑھ اور قربانی دے اور ہم رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل سے یہ ثابت بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن جو شخص یہ کہتا ہے کہ کوثر سے یہاں نہر مراد ہے اُس کو یہ بھی ثابت کرنا پڑے گا کہ فلاں دن رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنّت میں نہر ملنے کے شکریہ میں نفل پڑھے یا قربانی دی۔ یا فلاں دشمن کا بیٹا اس کے نتیجہ میں مر گیا اور اگر وہ یہ ثابت نہیں کر سکتا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ

نعوذ باللہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے ایک حکم کی خلاف ورزی کی۔ خدا تعالےٰ نے تو کہا تھا کہ اس کے شکریہ میں آپ نماز پڑھیں مگر آپ نے اِس شکریہ میں نماز نہیں پڑھی۔ خدا تعالےٰ نے تو کہا تھا کہ آپ اس کے شکریہ میں قربانی دیں مگر آپ نے اس کے شکریہ میں قربانی نہیں دی اور یہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف ہے۔ پھر یہ روایت بھی ہونی چاہیئے تھی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے مجھے اللہ تعالےٰ نے جنت میں ایک نہر دی ہے اُس کے نتیجہ میں فلاں دشمن کے بیٹے مرجائیں گے اور میرے زندہ رہنے والا بیٹا پیدا ہوجائے گا۔ مگر اس قسم کی کوئی روایت نہیں۔ بہرحال اگر کوثر سے محض نہر مراد لی جائے تو اِن تینوں باتوں کا اس کے ساتھ کوئی جوڑ نظر نہیں آتا۔

اگر کہو کہ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کا حکم آپ کو اس لئے دیا گیا تھا تاکہ آپ اس نہر کے ملنے پر اللہ تعالےٰ کا اِس رنگ میں شکریہ ادا کریں تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ کوئی بڑا انعام تھا جس کے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو شکریہ کا حکم دیا گیا؟ اِس سے بڑا انعام تو قرآن کریم تھا۔ اِس سے بڑا انعام تو لقاءِ الٰہی تھا۔ اس کے حاصل ہونے پر تو فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کا حکم نہ دیا گیا اور نہر ملنے پر یہ حکم دے دیا گیا۔ کیا یہ بات کسی انسان کی عقل میں آسکتی ہے؟ آخر خدا تعالےٰ سے مقدم اور کونسی چیز ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت قریب آیا تو اُس وقت جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے آپ کا سر حضرت عائشہ رضؓ کے سینہ پر تھا اور حضرت عائشہ رضؓ نے آپ کو سہارا دیا ہوا تھا تاکہ آپ کو سانس کی تکلیف نہ ہو۔ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں آپ کی وفات سے پہلے میں یہ خیال کیا کرتی تھی کہ وفات کے وقت جسے زیادہ تکلیف ہوتی ہے وہ بڑا گنہگار ہوتا ہے۔ لیکن جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نزع کے وقت تکلیف ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو ملامت کی اور میں نے سمجھ لیا کہ اس کا ایمان یا عدمِ ایمان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ بہرحال حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے فرمایا اِلَى الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى۔ اِلَى الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى۔ میں خدا کے پاس جارہا ہوں۔ میں خدا کے پاس جارہا ہوں۔ اُس وقت آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اِلَى الْكَوْثَرِ میں کوثر کے پاس جارہا ہوں۔ گویا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت بھی جس خواہش کا اظہار فرمایا وہ لقاءِ الٰہی تھی۔ مگر لقائے الٰہی کی نعمت ملنے پر تو آپ کو صلوٰۃ و نحر کا حکم نہ دیا گیا اور جنت کی نہر ملنے پر یہ حکم دے دیا گیا۔ کیا اس نہر کو کوئی چھین سکتا تھا کہ اس کے لئے قربانیوں کی ضرورت تھی یا نمازوں اور دعاؤں کی ضرورت تھی۔ یا کیا جنت کی نہر اُن روحانی انعامات سے بڑھ کر تھی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملے۔ کہ اس کے شکریہ میں صلوٰۃ و نحر کا حکم دے دیا گیا؟ آپ پر قرآن کریم نازل ہوا، آپکو نبوت ملی، آپ کو ختمِ نبوت ملی، آپ کو تمام نبیوں کی سرداری ملی۔ یہ بڑے بڑے انعامات تھے جو آپ پر نازل ہوئے۔ نہر اس کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتی ہے؟ مگر مفسرین کے خیال کے مطابق آپ کو نفل پڑھنے کا حکم ملا تو ایک نہر کے لئے۔ حالانکہ شکریہ کے نفل بڑے انعاموں کے لئے پڑھے جاتے ہیں نہ کہ چھوٹے انعاموں کے لئے؟ یہ امور بتا رہے ہیں کہ

اِس آیت کا یہ مفہوم نہیں کہ جنّت میں ایک نہر ملنے کے نتیجہ کے طور پر تُو نماز پڑھ اور قربانی دے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ کوثر ملنے کے نتیجہ میں جو مشکلات پیدا ہونے والی ہیں اُن سے بچنے کے لئے ہم یہ حکم تجھے دیتے ہیں۔ اور درحقیقت اُسی کوثر کے راستہ میں روک ہوسکتی تھی جو دنیا سے تعلق رکھتا ہو اور انسان و شیطان اُس میں روک بن سکتے ہوں۔ اُخروی کوثر کے راستہ میں تو نہ انسان روک بن سکتا ہے نہ شیطان۔ اور چونکہ یہ کوثر دنیا سے تعلق رکھتا تھا اِس لئے اللہ تعالیٰ اِس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہم تجھ پر بڑے بڑے انعامات نازل کرنے والے ہیں اور جسے بڑے بڑے انعامات ملا کرتے ہیں اُس کے لوگ دشمن ہو جاتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اُسے اِن انعامات سے محروم کردیں۔ دنیا میں کوئی تحصیلدار بن جائے تو لوگ اُس پر حسد کرنے لگ جاتے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر بن جائے تو اُن کی جان نکل جاتی ہے لیکن ہم تجھے وہ نعمت دیں گے جو آدمؑ سے لیکر آج تک کسی کو نہیں ملی اور نہ قیامت تک کسی کو ملے گی۔ تجھ پر دنیا حسد کرے گی اور تیرے راستہ میں بڑی بڑی روکیں پیدا کرے گی۔ لیکن ہم تمہیں اِس کا علاج بھی بتا دیتے ہیں فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ تُو نماز پڑھ اور قربانی دے پھر تُو کامیاب رہے گا۔ اِسی طرح اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ کا تعلق بھی نہر سے نہیں۔ اِس کا تعلق بھی کسی دنیوی کوثر سے ہی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اگر کوثر اُخروی ہو تو پھر دشمن کے ابتر ہونیکا پتہ بھی اگلے جہان میں ہی لگے گا اور کوئی دشمن اِس دلیل کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوسکتا کہ چونکہ اگلے جہان میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کوثر ملے گا اس لئے اُن کا دشمن وہاں ابتر رہے گا۔ یہ جملہ صاف بتاتا ہے کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ اِس دنیا میں ثابت ہوگا اور چونکہ یہ نتیجہ ہے کوثر ملنے کا اِس لئے کوثر بھی اِسی دنیا میں ملنا چاہیئے۔ ورنہ جو چیز دنیا میں موجود ہی نہیں اُس پر ابوجہل کو کس طرح حسد ہوسکتا تھا۔ اُسے اگر آپ کہتے کہ مجھے جنّت میں نہر ملے گی تو ابوجہل کہتا میں تو جنّت کا قائل ہی نہیں مَیں نے حسد کیا کرنا ہے۔ حسد تو اُنہی انعامات پر ہوسکتا تھا جو آپ کو دنیا میں ملے۔ سو اُنہی انعامات کے متعلق اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ ہم تجھے وہ کچھ دینگے کہ تیرے دشمن ہر وقت انگاروں پر لوٹتے رہیں گے مگر اس کے ساتھ ہی ہم تجھے اس کا علاج بھی بتا دیتے ہیں جو یہ ہے کہ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ تُو نماز پڑھ اور قربانی دے۔ اِس طرح تُو دشمنوں کے حسد سے محفوظ رہے گا اور ہمارے فضلوں کے زیر سایہ ترقی کرتا چلا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جو خیر کثیر ملا انسان کے لئے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے جس کو خدا تعالےٰ کوثر کہے۔ جو کثیر سے بھی زیادہ ہوتا ہے تو اُس کے اندازہ کی بندے میں طاقت ہی کہاں ہوسکتی ہے۔ پس کوثر کی تفسیر کرنا انسان کے لئے ناممکن ہے۔ نہ کوئی کوثر کی تفسیر بیان کرسکتا ہے اور نہ ہی اس کی تفسیر لکھ سکتا ہے۔ یہ تو خدا تعالےٰ ہی بیان کرے تو کرے لیکن چند مثالیں تقریبِ مفہوم کے لئے بیان کی جاسکتی ہیں اور انہی کو ذیل میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ کے جملہ کو اِنّا کے لفظ سے شروع کرنے کی وجہ

تفسیر۔ اِس سُورۃ کو اِنّا کے ساتھ شروع کیا گیا ہے۔ جو اِنَّ اور نَا سے بنا ہے۔ اِنَّ تاکید کے لئے آتا ہے اور "نا" جمع کا صیغہ ہے۔ حالانکہ خدا تعالےٰ جو یہ کلام کررہا ہے واحد ہے۔ "نا" کے

معنے ہوتے ہیں ’ہم‘ اور ’نی‘ کے معنے ہیں ’میں‘ پس بظاہر یہاں اِنَّا کی بجائے اِنِّیْ کہنا چاہیئے تھا کیونکہ قرآن کریم جس ہستی کی طرف سے نازل ہوا ہے وہ واحد اور لاشریک ہے۔ مگر بجائے ’اَنَا‘ یعنی ’میں‘ کہنے کے اِنَّا کہا گیا ہے یعنی یقیناً ’ہم نے‘ ایسا کیوں کہا گیا؟ اس میں حکمت یہ ہے کہ جس نعمت کا یہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے وعدہ کیا گیا تھا وہ بہت بڑی تھی اور انسان محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی حالت کو دیکھ کر حیران ہوتا تھا کہ کیا یہ چیز آپ کو مل جائے گی؟ اس لئے اِنَّ کے لفظ سے اس وعدہ کے یقینی ہونے پر زور دیا گیا۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک گمنام فرد تھے، جب دنیا میں آپ کی کوئی حیثیت نہ تھی اور جب آپ کو ماننے والے صرف دس بارہ انسان تھے اُس وقت خدا تعالےٰ کا یہ کہنا کہ ہم نے تجھے کوثر عطا کیا ہے۔ ایک ایسی بات ہے جو بالکل بعید از قیاس معلوم ہوتی تھی۔ ہر شخص حیران ہوتا تھا کہ کیا وہ چیز جس کا اُنہوں نے دعویٰ کیا ہے اُنہیں مل جائے گی اس لئے اللہ تعالےٰ نے اِنَّ کا لفظ استعمال فرما کر اس وعدہ کے یقینی اور قطعی ہونے پر زور دیا۔ اِسی طرح اَعْطَیْنٰـنَا جو ماضی کا صیغہ ہے یہ بھی تاکید کے لئے ہے۔ کیونکہ ماضی جب مضارع کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے تو وہ بھی تاکید کے معنے دیتی ہے۔ جب کوئی چیز آئندہ ملنے والی ہو۔ اور اُس کے متعلق کہدیا جائے کہ وہ چیز ہم نے دے دی تو اس کا مفہوم یہی ہوتا ہے کہ وہ چیز ہم ضرور دے دینگے جیسا کہ ہمارے ہاں ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے میں آپ کی لڑکی اپنے لڑکے کے لئے مانگنے آیا ہوں۔ تو وہ بعض دفعہ تو یہ کہدیتا ہے کہ اچھا میں یہ رشتہ کر دوں گا اور بعض دفعہ کہتا ہے بس میں نے اپنی لڑکی دے دی۔ شادی تو بعد میں ہوتی ہے مگر الفاظ وہ یہ استعمال کرتا ہے کہ میں نے لڑکی دے دی۔ جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ میرا آپ کو رشتہ دینا بالکل قطعی اور یقینی ہے۔ غرض ماضی کا صیغہ جب مضارع کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو وہ تاکید کے معنے دیتا ہے۔ اس سے پہلے ’اِنَّ‘ کا لفظ بڑھا کر بار بار زور دے دیا۔ ایک طرف ماضی کا صیغہ استعمال کرکے اس میں تاکید کے معنے پیدا کئے گئے اور دوسری طرف اِنَّ کا لفظ لاکر اس میں تاکید کے معنے پیدا کئے گئے اور اس طرح بتا دیا کہ گو یہ چیز ملنی تو آئندہ زمانہ میں ہے مگر یہ وعدہ ہمارا ایسا یقینی ہے کہ یوں سمجھو کہ ہم وعدہ نہیں کر رہے بلکہ ایک واقعہ شدہ امر کا ذکر کر رہے ہیں۔ ان دو تاکیدوں کے علاوہ جب ہم اس امر کو دیکھیں کہ جس کی زبان سے یہ وعدہ کروایا گیا ہے وہ خدا تعالےٰ کی ذات ہے تو عبارت میں اور بھی زور پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ جو بات کہے اُسے یقیناً پورا کر سکتا ہے اور یہ عذر بھی نہیں ہو سکتا کہ وعدہ کرنے والے نے وعدہ تو پختہ کیا تھا مگر مجبوریوں کی وجہ سے پورا نہ کر سکا۔

دوسرا سوال ’نا‘ کے متعلق پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے جمع کا لفظ یہاں کیوں استعمال فرمایا؟ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ یہاں جمع کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ یہ وعدہ اپنے اندر بڑا تنوع رکھتا ہے اور اس میں خدا تعالےٰ کے ساتھ ملائکہ اور اُس کے قوانین قدرت کی مدد کی طرف بھی اشارہ ہے اور قرآن کریم کا یہ قاعدہ ہے کہ جس وعدہ میں خدا تعالےٰ کے فرشتے یا قوانین قدرت بھی شریک ہوں وہاں مضمون کی وسعت پر دلالت کرنے کے لئے وہ جمع کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یہ بتلانے کے لئے کہ

اِس کام کے پُورا کرنے کے لئے فرشتوں اور قوانینِ قدرت کو بھی حکم دے دیا گیا ہے اور ہم سب مل کر یہ کام کرینگے۔

اگر کوئی سوال کرے کہ کیا فرشتوں اور قوانین کی قدرت خدا تعالےٰ کی قدرت سے کچھ علیحدہ قسم کی ہے کہ اُس کے ساتھ ملنے سے جمع کا لفظ بولا گیا ہے وہ تو خدا تعالےٰ ہی سے طاقت حاصل کرتے ہیں اِس لئے اُن کے ملنے سے کوئی نئی طاقت تو پیدا نہیں ہوتی پھر جمع کا لفظ کیوں استعمال ہُوا ہے ؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ بے شک خدا تعالیٰ کے نقطۂ نگاہ سے تو کوئی زائد طاقت پیدا نہیں ہوتی۔ فرشتے اور قوانینِ قدرت بھی اُس کے تابع ہیں اور وہ کوئی کام براہِ راست نہیں کر سکتے۔ فرشتے بھی خدا تعالےٰ نے بنائے ہیں اور قوانینِ قدرت بھی اُسی نے بنائے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ہی یہ قانون مقرر کیا ہے کہ پانی غرق کرتا ہے یا پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ پانی کے مل جانے سے کوئی نئی طاقت پیدا نہیں ہوتی۔ یا اُس نے آگ کے لئے یہ قانون بنایا ہے کہ وہ جلاتی ہے یا کھانا پکاتی ہے۔ یہ بھی ایک قدرتی چیز ہے۔ خدا تعالےٰ کو اِس سے کوئی زائد طاقت حاصل نہیں ہو جاتی۔ لیکن دنیا میں کئی قسم کے لوگ ہیں اور وہ سب قرآن کریم کے مخاطب ہیں۔ دنیا میں وہ لوگ بھی ہیں جو خدا تعالےٰ کو مانتے ہیں لیکن فرشتوں کو نہیں مانتے اور وہ بھی ہیں جو خدا کو مانتے ہیں اور فرشتوں کو بھی مانتے ہیں لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالےٰ کا رسول یا فرشتوں کا مُوَیّد وجود نہیں مانتے اور وہ بھی ہیں جو نہ خدا تعالےٰ کو مانتے ہیں اور نہ فرشتوں کو۔ ہاں ایک قانونِ قدرت کو ضرور تسلیم کرتے ہیں۔ چونکہ اِس آیت میں بیان کردہ مضمون پر خاص زور دینا مقصود تھا اِس لئے اِن سب قسم کے لوگوں کی تسلّی کا طریق اختیار کیا گیا۔ جو لوگ خدا تعالےٰ کو مانتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا تعالےٰ پر جھوٹ بولنا کوئی معمولی کام نہیں عام شریف آدمی بھی ایسا نہیں کرتا اُنہیں اِس طرف توجہ دلا دی کہ محمد رسول اللہ اللہ تعالیٰ کو گواہ رکھکر اُس کی طرف سے یہ دعویٰ کر رہا ہے۔ جو لوگ خدا تعالیٰ سے زیادہ اخلاقی دلائل کو تسلیم کرتے ہیں اُن کو مدِنظر رکھ کر فرشتوں کے وجود کو ساتھ شامل کر لیا کہ نفسِ لوّامہ اور ناطقہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دعوےٰ کی تصدیق کر رہا ہے اور جو لوگ خدا تعالیٰ اور فرشتوں دونوں کے منکر ہیں اُن کے لئے قانونِ قدرت کو شامل کر لیا گیا کہ قانونِ قدرت بھی اس کی تائید کر رہا ہے کہ یہ شخص بہت کچھ برکتیں پانے والا ہے۔ پس چونکہ تین گواہوں کو اس وعدہ کے پُورا ہونے کی تائید میں پیش کیا گیا تھا۔ اس لئے بجائے اِنّیْ یعنی 'ضرور میں نے' کے اِنَّا یعنی 'ضرور ہم نے' کے الفاظ استعمال کئے۔ اِس جگہ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وعدہ نے تو کسی آئندہ وقت میں پورا ہونا تھا پھر اِن تین گواہوں کے ذکر سے کونسا ایسا مضمون پیدا ہوتا تھا جو ایک منکر کو ایک حد تک امید دلاتا تھا کہ یہ وعدہ آئندہ ضرور پُورا ہوگا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے ایک مذہبی آدمی کے لئے تو یہ ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ ایک شخص جو راستباز ہے دھوکے باز نہیں عقلمند ہے پاگل نہیں۔ قانع ہے لالچی نہیں۔ کسی غیر منطقی اور غیر عقلی عقیدہ کا قائل نہیں۔ اپنے ہوش و حواس میں یہ اعلان کرتا ہے کہ مجھے خدا تعالےٰ نے یہ بات کہی ہے۔ ایک مذہبی آدمی تو اِن حالات میں محض خدا تعالےٰ کا نام لے کر دعویٰ کرنے کو ہی مدّعی کی سچائی کی دلیل سمجھتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت خدیجہ اور حضرت علی اور حضرت زید رضوان اللہ علیہم اجمعین نے

مجرد یہ دعویٰ سُنکر کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے آپ کے دعویٰ کو قبول کر لیا اور کوئی مزید دلیل طلب نہیں کی۔ اسی طرح اور کئی لوگوں نے اِس دلیل سے فائدہ اٹھایا۔ ایک اعرابی سلیم الطبع آپ کا دعویٰ سُن کر مدینہ میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یہ فرمائیے کہ کیا آپ اللہ تعالےٰ کی قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو اللہ تعالےٰ نے بھیجا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں میں اللہ تعالےٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ اِس جواب کو سُن کر وہ آپ پر ایمان لے آیا۔ پس مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ جب کوئی شخص خدا تعالےٰ کی طرف سے ہونے کا یا خدا تعالےٰ کے وعدہ کا ذکر کرے تو ایک مذہبی آدمی کے لئے یہ دلیل ہی کافی ہوتی ہے اور اس کی فطرت اسے نہیں مان سکتی کہ مذکورہ بالا حالات میں کوئی شخص جھوٹا دعویٰ کرے گا یا غلط دعویٰ کرے گا اور یہ بات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھی۔

مگر اس فطرتِ صحیحہ کے مالک شخص سے اُتر کر ایک گروہ ایسا بھی ہوتا ہے جو مزید روحانی ثبوت چاہتا ہے۔ یہ مزید روحانی ثبوت اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا تعالےٰ کی طرف سے کوئی مامور آتا ہے تو اُس زمانہ کے نیک اور اعلیٰ درجہ کے مانے ہوئے لوگوں میں سے متعدد افراد کے دل میں اُس کی محبت پیدا کر دی جاتی ہے اور وہ اُسے قبول کر لیتے ہیں یا بعض خواہ سے متاثر ہو کر بعض ایسے لوگ جو پہلے نیکی میں معروف نہ تھے اُسے قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن اُس کو قبول کرتے ہی اُن کی ایسی کایا پلٹ جاتی ہے کہ وہ اِس دنیا میں چلتے پھرتے فرشتے نظر آنے لگتے ہیں اور عقلِ سلیم رکھنے والے کو ماننا پڑتا ہے کہ اُن کا فرشتہ بن جانا اِس امر کا ثبوت ہے کہ فرشتے اُن کے ساتھ ہیں اور اُن کے ملکوتی تاثرات اُن پر نازل ہو رہے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بھی حاصل تھی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تو پہلے ہی مکہ کے لوگ فرشتہ سمجھتے تھے مگر بہت سے ایسے لوگ جو بداعمالیوں اور فتنہ و فساد اور ظلم میں انتہاء کو پہنچے ہوئے تھے جب اُن کے دل میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت گھر کر گئی تو انہوں نے یکدم اپنے حالات کو بدل دیا اور ایک دن میں عابد و زاہد اور متقی اور حلیم اور منکسر المزاج اور رحیم و کریم اور صادق و وفادار اور خیر خواہ خلائق ہو گئے۔ یہ امر یقیناً آپ کی صداقت کا ثبوت تھا اور اس امر کی دلیل تھا کہ آپ کے ساتھ ملائکہ کی مدد ہے جو آپ کے ساتھیوں پر اپنا اثر ڈال کر انکو بھی ملائکہ بنا دیتے ہیں۔

تیسری دلیل جو یہ بیان فرمائی کہ قانونِ قدرت بھی آپ کی مدد کرے گا اس کے اثرات بھی ظاہر تھے۔ آپکی تعلیم قانونِ قدرت کے مطابق تھی اور اس میں وہ ازلی سچائیاں پائی جاتی تھیں جن کو فطرتِ صحیحہ ماننے سے باز نہیں رہ سکتی۔ وہم اور ڈھکوسلہ کا نام نہ تھا۔ ایک طرف خالص منطقی اور دوسری طرف خالص رُوحانی تعلیم جس نے عقل و روحانیت کے امتزاج سے ایسی چاشنی حاصل کر لی تھی کہ کوئی شخص ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے تعصب کی پٹی کو اتار کر رکھتا تھا تو وہ تیر کی طرح اُس کے دل میں گھس جاتی تھی اور وہ اس کا شکار ہو جاتا تھا اِس کی متعدد مثالیں مکہ والوں کے سامنے تھیں۔ حضرت عمرؓ آپ کے قتل کے لئے نکلے اور راستہ ہی میں آپ کی صداقت کے خنجر کا شکار ہو گئے اور گنہگاروں کی طرح گلے میں ندامت کا پٹکا ڈال کر آپکے سامنے حاضر ہوئے۔ پس آئندہ جو ہونے والا تھا وہ تو جب ظاہر ہوتا لوگ اُسے دیکھتے، جس وقت یہ سورت نازل ہوئی ہے اُس وقت بھی اِس کا ثبوت مکہ والوں کے

سامنے موجود تھا کہ خدا تعالیٰ نے آپ کے لئے بول رہا ہے اُس کے ملائکہ آپ کی مدد پر ہیں اور قانونِ قدرت آپ کی تائید کر رہا ہے۔ پس فرماتا ہے کہ میں خدا تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں بھی میرے ملائکہ بھی اور میرا قانونِ قدرت بھی اُس کو کوثر عطا کرنے والے ہیں۔ تم میری آواز نہیں سُنتے تو کیا ملائکہ کی آواز بھی نہیں سُنتے۔ میرے فرشتوں کی آواز نہیں سُنتے تو یہ بھی نہیں دیکھتے کہ دنیا کے تمام مذاہب اِس وقت تو ہم پرستی اور خلاف عقل عقیدوں میں مبتلا ہیں اور خلاف فطرت اعمال میں مشغول ہیں مگر اس کے مقابل پر اس شخص کی تعلیم نہ تو وہم اور نہ خلاف عقل عقیدے بیان کرتی ہے اور نہ خلاف فطرت احکام پیش کرتی ہے۔ پھر کیوں نہیں سمجھتے کہ اس کے مخالفوں کے گھر ویران ہو جائیں گے۔ اُن کے معبد سرنگوں ہو جائیں گے اور وہ طوعاً یا کرہاً آخر اُس کے قدموں پر آگریں گے اور اُسی کا زور اور اُسی کا غلبہ ہو جائے گا۔ پس یقین کرو کہ میں اور میرے فرشتے اور میرا قانونِ قدرت ہم سب اس رسول کو کوثر دینے والے ہیں وہ پھیلاؤ وہ رفعت اور وہ بلندی جو کسی انسان کو نہ کبھی نصیب ہوئی نہ آئندہ ہوگی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ بادشاہ اپنے کلام میں مفرد کی جگہ جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے تتبع میں قرآن کریم میں بھی جہاں خدا تعالیٰ کی بادشاہت پر زور دینا مقصود ہو خدا تعالیٰ کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ بادشاہ جمع کا لفظ اِس امر پر دلالت کرنے کے لئے بولتا ہے کہ مَیں یہ بات کہنے والا اکیلا نہیں تمام میرے ماتحت لوگ وُہی کہیں گے جو میں کہوں گا اور وُہی کریں گے جو مَیں کروں گا۔ اِنہی معنوں میں اللہ تعالیٰ بھی لفظ جمع سے کبھی کبھی اپنی نسبت کلام فرماتا ہے۔ بادشاہوں کے علاوہ مصنفین بھی کبھی ’ہم‘ کا لفظ بولتے ہیں اور اُن کا مطلب بھی یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ بھی اور اُن کے ہم خیال لوگ بھی اس امر کا اظہار کرتے ہیں۔ پس یہ ایک محاورہ ہے جو دنیا میں عام استعمال ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی دماغ فرد سے جماعت کو قوی سمجھتا ہے۔ اِس لئے جب قدرت پر زور دینا ہو اللہ تعالیٰ ہمیشہ جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ یہ بتلانے کے لئے کہ ہم وجود میں فرد ہیں لیکن طاقت میں جماعتوں سے بھی زیادہ ہیں چونکہ اس آیت میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے جو وعدہ کیا گیا تھا وہ بہت بڑا تھا اِس لئے خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم اپنی شاہانہ حیثیت میں فرماتے ہیں کہ اس وعدہ کے پورا کرنے میں تمام قدرتیں لگ جائیں گی اور یہ بات پوری ہو کر رہے گی۔

اب میں بتاتا ہوں کہ کوثر میں کیا کیا چیزیں شامل ہیں۔ اُوپر کی تشریح کے مطابق وہ تمام امور جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں وہ سب کے سب کوثر کا حصہ ہیں اور اس لفظ میں یہ دعویٰ ہے کہ وہ تمام کمالات جو نبوت کا حصہ ہیں یا نبوت سے اُن کا گہرا تعلق ہے اُن سب میں آپ کو کوثر ملی ہے۔ اگر کوئی ایک امر مراد ہوتا تو یہ کوئی انعام نہیں تھا۔ کیونکہ کسی بات میں کسی کا اور کسی بات میں کسی کا بڑھ جانا تو ایک طبعی امر ہے یہ کوثر نہیں کہلا سکتا۔ اس طرح تو ہر نبی کو کسی ایک بات میں دوسرے کے مقابلہ میں فضیلت حاصل ہو سکتی ہے۔ اِس میں آپ کی کوئی خصوصیت نہیں رہتی۔ پس اگر یہاں صرف یہی مراد ہوتا کہ ہم تجھے کسی ایک بات میں فضیلت دے دیں گے تو یہ کوئی خاص بات نہ ہوتی۔ ایک گاؤں میں پچاس ساٹھ آدمی اکٹھے رہتے ہیں تو اِن میں سے کئی ایک کو دوسروں پر کسی نہ کسی رنگ میں فضیلت حاصل ہوگی۔ مثلاً اگر وہاں پانچ دس زمیندار ہیں تو اُن میں سے کسی نہ کسی کی زمین

دوسروں سے زیادہ ہوگی اور یہ ایک فضیلت ہے جو اسے دوسرے زمینداروں پر حاصل ہوگی۔ یا پھر گاؤں میں معمار ہوتا ہے اُسے سب زمینداروں پر یہ فضیلت حاصل ہوتی ہے کہ وہ معماری جانتا ہے اور زمیندار معماری نہیں جانتا۔ پھر نجار کو معمار اور زمیندار دونوں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہ نجاری جانتا ہے معمار اور زمیندار نجاری نہیں جانتے۔ لوہار کو اِن تینوں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے اُسے لوہار کا کام آتا ہے اِن تینوں کو آہنگری نہیں آتی۔ پھر کوئی سقہ ہوتا ہے اُسے سقے کا کام آتا ہے جو دوسروں کو نہیں آتا۔ دھوبی کو اُس پر فضیلت حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہ دھوبی کا کام جانتا ہے اور سقہ یہ کام نہیں جانتا۔ اسی طرح عطار ہے اُسے جو فضیلت حاصل ہے وہ معمار کو حاصل نہیں نہ بڑھئی، لوہار، سقے اور دھوبی کو حاصل ہے۔ غرض قریباً ہر انسان دوسرے پر کسی نہ کسی رنگ میں فضیلت رکھتا ہے۔ کوئی موٹا ہوتا ہے کوئی دُبلا ہوتا ہے۔ کوئی چھوٹے قد کا ہوتا ہے اور کوئی لمبے قد کا ہوتا ہے۔ کوئی عالم ہوتا ہے اور کوئی جاہل ہوتا ہے۔ غرض اُس میں کوئی نہ کوئی ایسی خوبی پائی جاتی ہے جو دوسرے میں نہیں پائی جاتی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی ایک بات میں بھی فضیلت کا حاصل ہونا اللہ تعالےٰ کا ایک انعام ہے۔ مگر ایسا انعام نہیں جو اُسے تمام لوگوں پر فوقیت دیدے اور چونکہ اس آیت میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اُس فوقیت کا ذکر ہے جو آپ کو تمام انبیاء پر حاصل ہے لیکن چونکہ اس بات کا معیّن ذکر یہاں نہیں کیا گیا اس لئے ماننا پڑے گا کہ یہاں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ تمام کمالاتِ نبوت میں آپ کو کوثر عطا ہوا ہے اور کوئی نبی کسی کمالِ نبوت میں بھی آپ کا ہم پایہ اور ہم رتبہ نہیں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّ بَارِكْ وَسَلِّمْ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔

کوثر کے معنے الخیر الکثیر کے — کوثر کے معنے جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اَلْخَيْرُ الْكَثِيْرُ کے ہیں اور اَلْخَیْر کا لفظ اسم تفضیل یعنی سب سے زیادہ کے معنوں پر دلالت کرتا ہے۔ پس اس میں دنیوی امور کا ذکر نہیں۔ کیونکہ دنیوی امور کا کوئی ریکارڈ دنیا میں نہیں جسے دیکھ کر فیصلہ کیا جا سکے کہ فلاں بڑا ہے یا فلاں۔ یہ ریکارڈ صرف روحانی اور آسمانی انعامات کا ہی ہے۔ پس جب مقابلہ کا ذکر ہے تو اس جگہ وہی اشیاء مراد ہیں جن کا مقابلہ کیا جانا ممکن ہے اور وہ امور نبوت اور امور مذہبیہ ہی ہیں۔

اَلْخَیْر کے معنے — اسی طرح اَلْخَیْر کے معنے ہوتے ہیں وِجْدَانُ الشَّيْءِ بِجَمِيْعِ كَمَالَاتِهِ اللَّائِقَةِ۔ کسی چیز کا مع اُن تمام کمالات کے ملنا جو اُس میں پائے جاتے ہوں اور جن کی وجہ سے اُس کا کوئی نام رکھا گیا ہو۔ گویا خیر ایسی خوبی یا بھلائی کو کہتے ہیں جس میں وہ تمام کمالات پائے جاتے ہوں جن کی وجہ سے اس خوبی کو خوبی کہا جاتا ہے۔ مثلاً ہم کہیں ہمیں خربوزہ خیر ملا۔ تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ جو جو خوبیاں ایک خربوزہ میں پائی جانی چاہئیں وہ ساری کی ساری اُس میں موجود ہیں اور جب یہ لفظ نبوت کے لئے استعمال ہوگا تو اس کا یہ مفہوم ہوگا کہ جو جو کمالات اصطلاحِ نبوت میں شامل ہیں وہ سارے کے سارے اپنی پوری شان کے ساتھ آپ کے اندر پائے جائیں گے۔ وَقِيْلَ حُصُوْلُ الشَّيْءِ بِمَا مِنْ شَأْنِهٖ اَنْ يَّكُوْنَ حَاصِلًا لَهٗ۔ یعنی بعض ائمۂ لغت یہ کہتے ہیں کہ خیر کے معنے ہیں کسی چیز کا اس طرح ملنا کہ اُس کا ذاتی جوہر تمام و کمال اس میں پایا جائے۔ گویا اس لفظ میں وسعت اور عظمت دونوں قسم کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

پس جب نبوت کے لئے یہ لفظ بولا جائیگا تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ تمام کمالات جو نبوت میں پائے جانے چاہئیں وہ (۱) سارے کے سارے (۲) اور اپنی پوری شان کے ساتھ آپ کے اندر پائے جائیں گے اور وہ تمام نقائص جن کی نبوت نفی کرتی ہے وہ آپ میں ہرگز نہ ملیں گے اور چونکہ لفظ کوثر کے معنوں میں خیر اور کثیر دو معنے پائے جاتے ہیں اس لئے کوثر کے معنے یہ ہونگے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نبوت اپنے تمام کمالات کے ساتھ ملی اور ہر ہر کمال بہت بہت ملا۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہیں گے کہ جو نبوت آپ کو ملی وہ کیفیت کے لحاظ سے بھی اعلیٰ تھی اور کمیت کے لحاظ سے بھی اعلیٰ تھی۔ گویا جو جو کمالاتِ نبوت آپ کو عطا ہوئے وہ دوسرے نبیوں کے کمالات سے اعلیٰ تھے اور پھر وہ تعداد میں بھی دوسرے نبیوں سے زیادہ تھے۔

آنحضرت صلعم کو نبوت کے کمالات کا اعلیٰ صورت میں ملنا

اگر غور کیا جائے تو یہ لفظ ختمِ نبوت پر دلالت کرتا ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع ہی سے صحابہؓ ایک کامل اور آخری نبی موعود سمجھتے تھے اور پھر یہ دیکھتے ہیں کہ خاتم النبیین کا لفظ سورۃ احزاب میں استعمال ہوا ہے جو ہجرت کے چھٹے سال میں نازل ہوئی تو تعجب ہوتا ہے کہ اس قدر آخری زمانہ میں جو اظہار ہوا تھا اُس کا علم صحابہؓ کو پہلے سے کیونکر ہوگیا۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے کیونکر ہوگیا۔ اِس کا جواب اس سُورت سے مل جاتا ہے کیونکہ یہ سورۃ دعویٰ کے چوتھے پانچویں سال ہی نازل ہوگئی تھی اور اس میں درحقیقت ختم نبوت کا دعویٰ تھا۔ یعنی یہ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے کمالات اعلیٰ شکل میں ملے اور بہت ملے اور جس کو یہ چیز ملی وہ یقیناً سب نبیوں سے افضل تھا اور خاتم النبیین تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب سورۃ احزاب نازل ہوئی اور آپ کو خاتم النبیین کا لقب دیا گیا تو صحابہؓ میں اس پر کسی قسم کا کوئی شور نہیں پڑا۔ اُن کے نزدیک یہ کوئی نیا لقب نہیں تھا جو آپ کو دیا گیا۔ اگر یہ نئی بات ہوتی تو اس پر شور پڑ جاتا۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ ایسا کوئی شور نہیں پڑا۔ کیونکہ صحابہؓ آپ کو پہلے ہی خاتم النبیین سمجھتے تھے اور آپ کا بھی یہی خیال تھا۔ اس لئے سورۃ احزاب کے اُترنے پر استعجاب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سورۃ کوثر نازل ہوئی تو اُسی وقت سے آپؐ اور صحابہؓ سمجھ گئے تھے کہ آپؐ خاتم النبیین ہیں اور تمام نبیوں سے افضل ہیں۔

اِن معنوں کے علاوہ لغت میں کوثر کے معنے ایک ایسے سخی وجود کے بھی ہیں جس میں بڑی خیر پائی جائے۔ اِن معنوں کے لحاظ سے اس سورۃ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ دیا گیا تھا کہ ہم تجھے ایک خیر کثیر والا سخی وجود دینگے۔ دینے سے مراد یہی ہو سکتی ہے کہ آپ کے اتباع میں سے ایک بہت بڑا سخی وجود پیدا ہوگا۔ ورنہ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ کہنے کا کوئی مطلب ہی نہیں رہتا۔ اب ہم باری باری دونوں معنوں کو لیتے ہیں۔

(۱) پہلے معنے یہ تھے کہ نبوت کے کمالات کا اعلیٰ صورت میں ملنا اور بہت ملنا۔ اس مضمون کی وسعت کی کوئی انتہاء نہیں اور خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی اسے مکمل طور پر بیان نہیں کرسکتا لیکن مثال کے طور پر کچھ باتیں بیان کی جاسکتی ہیں۔ اس بارہ میں ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ آپ کا دعویٰ کیا تھا کیونکہ کسی کی خوبیوں کا پتہ لگانے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اُس کے دعویٰ کا پتہ لگایا جائے۔ مثلاً اگر ایک شخص ہمارے پاس آکر کہتا ہے کہ میں سب سے بڑا اُستاد ہوں۔ تو ہم دیکھیں گے کہ آیا اُستاد ہونے کی

سب شرائط اس میں پائی جاتی ہیں یا نہیں۔ اگر وہ شرطیں دوسروں کی نسبت اُس میں زیادہ پائی جاتی ہوں تو ہم مان لیں گے کہ وہ سب سے بڑا اُستاد ہے۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ میں سب سے بڑا اُستاد ہوں اور جب سوال کیا جائے کہ تم میں کون کون سے کمالات پائے جاتے ہیں اور وہ مثلاً کہے کہ میں انڈے زیادہ کھا جاتا ہوں تو ہر شخص اُس کو بے وقوف سمجھے گا۔ یا وہ کہے کہ میں ڈُنٹر زیادہ پیلتا ہوں یا بیٹھکیں زیادہ نکالتا ہوں تو سب لوگ اُس پر ہنسیں گے۔ مگر جب وہ کہے کہ میں بڑا پہلوان ہوں اور پھر وہ کہے کہ میں خوراک زیادہ کھاتا ہوں، بوجھ زیادہ اُٹھا سکتا ہوں، ڈُنٹر زیادہ پیلتا ہوں اور کئی قسم کے جسمانی کرتب دکھاتا ہوں تو ہم کہیں گے ٹھیک کہتا ہے۔ پھر ہم اُس سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ کیا تو کینٹ کا فلسفہ جانتا ہے۔ اگر ہم اُس سے پوچھیں گے کہ کیا تو کینٹ کا فلسفہ جانتا ہے؟ تو وہ فوراً کہہ دے گا کہ میرا فلسفہ سے کیا تعلق ہے میں نے تو پہلوانی کا دعویٰ کیا ہے فلسفہ دانی کا نہیں کیا۔ پس جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا کہ میں سب سے بڑا ہوں۔ تو ہم دیکھیں گے کہ آپ کا دعویٰ کیا ہے اور کون کون شخص آپ کے دعویٰ میں شریک ہے۔ تاکہ ہم اُس سے آپ کا مقابلہ کر کے دیکھیں اور معلوم کریں کہ آیا آپ واقعی سب سے بڑے ہیں یا نہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم غور کرتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ کیا تھا تو ہمیں قرآن کریم میں یہ آیت نظر آتی ہے کہ

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ؕ (المزمل ع)

یعنی اے لوگو ہم نے تمہاری طرف ایک شخص کو رسول بنا کر بھیجا ہے جو تمہارا نگران ہے اور وہ ویسا ہی رسول ہے جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف موسیٰ (علیہ السلام) کو رسول بنا کر بھیجا تھا۔ دنیا میں جتنے نبی گذرے ہیں اُن میں معروف نبی موسوی سلسلہ کے انبیاء ہی ہیں۔ حضرت کرشنؑ اور حضرت رام چندرؑ کی نبوت کو دوسرے مسلمان تو مانتے ہی نہیں، ہم مانتے ہیں لیکن ہمارے پاس اُن کی تاریخ محفوظ نہیں۔ اُن کی تعلیمیں کیا تھیں ہمیں اُن کی تفصیلات کا کچھ علم نہیں۔ صرف گیتا ایک ایسی کتاب ہے جو حضرت کرشن علیہ السلام کی طرف منسوب کی جاتی ہے مگر اُس میں بھی عام طور پر لڑائیوں اور تاریخی واقعات کا ہی ذکر ہے۔ آپ کے دعوے کی تفصیلات اُس سے نہیں ملتیں۔ بہرحال اسرائیلی نبی جن کی تاریخ ایک حد تک محفوظ ہے۔ اُن کے سردار حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے اور اللہ تعالےٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ تو بھی موسیٰ جیسا نبی ہے یعنی حضرت موسےٰ علیہ السلام اُس جنس میں شامل تھے جس جنس میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شامل تھے۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو کمالاتِ نبوت عطا کئے گئے تھے اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات اُن سے زیادہ ثابت ہو جائیں تو لازماً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو کوثر کا ملنا بھی ثابت ہو جائے گا۔ کیونکہ خدا تعالےٰ نے صرف یہی نہیں فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک ہی قسم سے ہیں اور آپ کے کمالات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کمالات کے مشابہ ہیں بلکہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ۔ جو چیز محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ملی ہے وہ دوسروں سے بڑھ کر ہے۔ یعنی

۲۸
آنحضرت کی حضرت موسیٰ سے مماثلت اور آپ کی حضرت موسیٰ پر فضیلت

حضرت موسیٰ علیہ السلام والے کمالات بھی آپ کو ملے اور پھر اُن سے بڑھ کر ملے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بڑے بڑے واقعات کیا گذرے تھے اور پھر اُن کا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے واقعات سے مقابلہ کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم کرسکیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے کس کس رنگ میں کوثر عطا فرمایا ہے۔ اس بارہ میں جب ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ

آنحضرت صلعم کو حضرت موسیٰ پر پہلی فضیلت

(۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام کلام الٰہی پھیلانے اور لوگوں کو روحانی علوم سکھانے کے لئے آئے تھے اور یہ سیدھی بات ہے کہ ظاہری علوم اس کام میں بہت ممد ہوتے ہیں۔ علم سکھانیکے کام میں پڑھے لکھے آدمی کے لئے بہت آسانی ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب نبی بنایا گیا تو آپ پڑھے لکھے تھے۔ قرآن کریم اور تورات دونوں سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب نبیوں کا کام دیا گیا تو دنیوی ہتھیار آپ کے پاس موجود تھا یعنی آپ پڑھے لکھے تھے اور اپنے کام کو احسن طریق پر سرانجام دے سکتے تھے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جب وہی کام سپرد ہوا تو آپ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ مگر اَن پڑھ ہونے کے باوجود آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔ یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حاصل ہے۔

دوسری فضیلت

(۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایسی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے جو متمدن تھی۔ آپ جب مصر میں تشریف لائے اُس وقت مصری قوم چوٹی کی قوم سمجھی جاتی تھی اور چونکہ بنی اسرائیل بھی اُس کے ساتھ رہتے تھے اِس لئے اسرائیلی قوم بھی پڑھی لکھی اور متمدن تھی اور پڑھے لکھے اور متمدن لوگوں کو دینی علوم سکھانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اُن میں نظام کو قائم کرنا اور اُن کے اندر جماعتی روح پیدا کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک ایسی قوم کی طرف آئے تھے جو غیر متمدن تھی اور ظاہری علوم سے بالکل ناآشنا تھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ کا یہ واقعہ ہے کہ جب مسلمانوں کی کسریٰ سے لڑائی ہو رہی تھی تو ایک دفعہ کسریٰ نے درباریوں سے کہا تم ان لوگوں کو میرے پاس لاؤ۔ معلوم ہوتا ہے تم اُن سے اچھا سلوک نہیں کرتے، مَیں انہیں روپے دے دونگا اور یہ خوش ہو کر واپس چلے جائیں گے چنانچہ کسریٰ نے اسلامی لشکر کے جرنیل کو کہلا بھیجا کہ میرے پاس اپنا وفد بھیجو۔ جب وہ وفد کسریٰ کے دربار میں آیا تو کسریٰ نے کہا کہ تم لوگ وحشی اور مردار خور ہو اور گوہیں کھاتے ہو تمہارا بادشاہتوں کے ساتھ کیا واسطہ ہے۔ میں تم کو روپے دیتا ہوں تم واپس جاکر انہیں خرچ کرو اور گھروں میں آرام سے بیٹھو۔ اگر تم واپس جانے کے لئے تیار ہو جاؤ تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ مَیں تمہارے ہر افسر کو دو اشرفیاں اور ہر سپاہی کو ایک اشرفی دوں گا۔ جب کسریٰ اپنی بات ختم کر چکا تو وفد کے سردار نے جو ایک صحابیؓ تھے جواب دیا کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہے۔ ہم واقعہ میں ایسے ہی تھے ہم وحشی تھے، ہم مردار خور تھے، ہم گوہیں کھاتے تھے، ہم یتیموں کے ساتھ بُرا سلوک کرتے تھے، ہم اپنی ماؤں کے ساتھ شادیاں کر لیتے تھے اور ہمارے اندر یہ سارے نقائص موجود تھے لیکن اللہ تعالےٰ نے ہماری طرف ایک رسول بھیجا جس کو ہم نے مان لیا۔ اس لئے اب

ہماری حالت اَور ہے اب ہم وہ نہیں رہے جو پہلے
تھے۔ اب ہم اِس قسم کی لالچوں میں آنے والے نہیں
ہمارے اور تمہارے درمیان لڑائی چھڑ چکی ہے اب
اِس کا فیصلہ میدانِ جنگ میں ہوگا اشرفیوں اور
لالچوں سے نہ ہوگا۔ یا ہم تم کو ماریں گے یا خود اِس
لڑائی میں شہید ہو جائیں گے۔ بادشاہ نے اپنے ایک
نوکر سے کہا جاؤ اور ایک مٹی کا بورا لاؤ۔ وہ نوکر گیا
اور ایک مٹی کا بورا لے آیا۔ کسریٰ نے اُس صحابیؓ سے
سے کہا۔ ذرا آگے آؤ۔ وہ آگے گئے تو بادشاہ نے
اپنے نوکر سے کہا مٹی کا بورا اِن کے سر پر رکھ دو۔
وہ صحابیؓ انکار بھی کر سکتے تھے مگر وہ بڑے ادب سے
جھک گئے اور اس بورے کو اپنے سر پر اُٹھا لیا۔
کسریٰ نے کہا جاؤ مَیں تم کو کچھ بھی دینے کو تیار نہیں
یہ مٹی میں تم پر ڈالتا ہوں۔ وہ صحابیؓ چھلانگ لگا کر
وہاں سے نکلے اور اپنے ساتھیوں سے کہا چلو بادشاہ
نے خود اپنے ہاتھوں سے ایران کی زمین ہمارے حوالہ
کر دی ہے۔ بادشاہ مشرک تھا اور مشرک وہمی ہوتا ہے
وہ یہ الفاظ سُنکر کانپ اٹھا اور اُس نے اپنے درباریوں
سے کہا دوڑو اور انہیں واپس لاؤ۔ مگر وہ اُس وقت
تک گھوڑوں پر سوار ہو کر بہت دُور نکل چکے تھے۔ غرض
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس قوم اور ملک میں کام
کیا وہ قوم اور ملک سب سے زیادہ متمدن تھے۔ اُن کے
جو قدیم آثار ملتے ہیں اُن سے بھی اِس چیز کا پتہ چلتا
ہے۔ اُس زمانہ کی عمارتوں کو لے لو آج کل کی عمارتیں
اُنکے سامنے بالکل ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ سائنس کو دیکھو
تو انہوں نے مُردوں کو مصالحے لگا کر اس طرح رکھا ہے
کہ وہ اب بھی زندہ معلوم ہوتے ہیں۔ مَیں نے وہ
ممیاں خود دیکھی ہیں اُن پر سے کپڑے اُتار دو تو اِس
طرح معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی آدمی سویا ہُوا ہے۔
صرف کچھ دُبلا سا ہو گیا ہے۔ یورپ والے آج تک
کوشش کرتے رہے ہیں کہ وہ بھی ایسا کر سکیں مگر
اِس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اب انہوں نے ممیوں
سے مصالحے نکال کر اُن کا اینیلے سز
ANALYSIS کیا ہے اور وہ ایک حد تک انکو
محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ مگر پھر بھی اُن کا
معاملہ صرف دس بارہ سال تک جاتا ہے۔ لیکن مصری
مُردے ہزاروں سال سے محفوظ چلے آرہے ہیں
۴۳ سَو سال بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ کے مُردے
اب تک محفوظ ہیں۔ یہ کتنی بڑی ترقی تھی جس کا مقابلہ
آج کل کی قومیں بھی نہیں کر سکیں۔ پھر مصری قوم میں
سونے کا کام نہایت اعلیٰ درجہ کا ہوتا تھا جو اُن کی
ترقی کی ایک بیّن علامت ہے۔ اس سے اندازہ لگایا
جا سکتا ہے کہ مصری قوم کے ساتھ رہنے والے
لوگ کتنے متمدن اور ترقی یافتہ ہوں گے۔ پس
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُس قوم سے کام لیا جو
متمدن تھی اور ظاہری علوم سے بہرہ ور تھی۔ مگر
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُس قوم سے
کام لیا جو اپنی ماؤں کا ادب کرنا بھی نہیں جانتے تھے
بلکہ اُن سے شادی کر لیتے تھے اور دوسرے نقائص
بھی اُن میں پائے جاتے تھے۔ پھر آپ اپنے کام میں
کامیاب ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے
بڑھ کر کامیاب ہوئے۔

تیسری فضیلت

(۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب نبوت ملی تو
آپ نے اللہ تعالےٰ سے کہا کہ یہ کام بہت بڑا ہے
مجھ سے نہیں ہو سکے گا میرے ساتھ ایک اَور آدمی
بطور مددگار مقرر کر دیجئے اور پھر آپ نے یہ بھی کہا
کہ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ (طٰہٰ ع۲) وہ
مددگار بھی مجھے میرے رشتہ داروں میں سے ہی

ملنا چاہیئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا احساس دیکھو کہ جب خدا تعالیٰ کی طرف سے آپ کو نبوت کے مقام پر سرفراز کیا گیا تو آپ نے کہا مَیں یہ کام نہیں کر سکتا۔ خدا آپ کے سپرد ایک کام کرتا ہے اور موسیٰ علیہ السلام انکار کرتے ہیں۔ ہم مان لیتے ہیں کہ یہ انکسار تھا مگر انکسار کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔ خدا تعالیٰ نے بار بار آپ سے کہا کہ تم فرعون کی طرف جاؤ مگر جیسا کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے آپ جواب میں انکار ہی کرتے چلے گئے۔ پھر آپ کا اپنے ساتھ ایک مددگار مانگنے پر اصرار کرنا اور یہ کہنا کہ وہ ہو بھی میرے خاندان میں سے ہی، یہ بتاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام باوجود خدا تعالیٰ کے حکم کے اپنے کام میں دنیوی سامانوں کی مدد بھی چاہتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو نبوت کے زمانہ سے کتنے دُور تھے (موسیٰ علیہ السلام کے تو قریب کے ہی زمانہ میں حضرت ابراہیم حضرت اسحاق حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام کئی انبیاء گذرے تھے مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہیں ۲۵۰۰ سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہوئے اس کے بعد آپ کی قوم میں کوئی نبی نہیں آیا) مگر آپ کی معرفت دیکھو آپ کے پاس فرشتہ آیا اور اُس نے کہا اِقْرَاْ۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ تُو پڑھ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ میں تو لکھا پڑھا نہیں ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی کتاب آپکے پڑھنی تھی۔ جبریل علیہ السلام کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی کہ وہ آپ سے کہتے یہ کتاب پڑھو اور جب کوئی

چوتھی فضیلت

وجود بغیر کتاب کے آئے اور کہے پڑھ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ میں کہتا جاتا ہوں تُو اس کو دُہراتا جا پس جب آپ سے فرشتے نے کہا پڑھ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اے شخص (اُس وقت آپ نبی نہیں تھے) جو کچھ مَیں کہتا جاؤں تم اُسے دُہراتے جاؤ۔ لیکن آپ فرماتے ہیں مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ مَیں تو لکھا پڑھا نہیں ہوں۔ یہ بھی آپ کی انکساری۔ آپ سمجھتے تھے کہ میرے سپرد کوئی بڑا کام ہونے والا ہے مگر خدا تعالیٰ بڑی شان والا ہے اور میں بندۂ عاجز ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ مَیں وہ کام پوری طرح سرانجام نہ دے سکوں اِس لئے آپ نے کہا مَیں لکھا پڑھا نہیں ہوں۔ فرشتے نے دوبارہ کہا اِقْرَاْ پڑھ۔ آپ نے پھر فرمایا مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ۔ مَیں لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔ پھر تیسری دفعہ فرشتے نے کہا اِقْرَاْ پڑھ۔ تو آپ پڑھنے لگ گئے۔ یہ تھا انکسار۔ موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپ بار بار انکار نہیں کرتے گئے۔ بلکہ جب آپ نے سمجھا کہ خدا تعالیٰ اس امر کو بہرحال میرے ہی سپرد کرنا چاہتا ہے تو آپ نے اُس کا حکم فوراً مان لیا اور سمجھ لیا کہ اب انکار کرنا سُوءِ ادبی ہے۔ پھر آپ نے یہ نہیں کہا کہ مجھے کوئی مددگار دیں بلکہ کہا کہ جب منشاءِ الٰہی ہی یہ ہے کہ مَیں اِس بوجھ کو اُٹھاؤں تو میں اس کو اکیلا ہی اُٹھاؤں گا۔ یہ ہے آپ کی فضیلت جو آپکے مقام کو نمایاں کرنے والی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے سپرد ایک چھوٹا سا کام ہوا تو انہوں نے مددگار مانگا مگر آپ کے سپرد اُس سے بہت بڑا کام ہوا تو فرمایا مَیں اکیلے ہی اس کام کو سرانجام دُوں گا اور آپ نے کامیاب طور پر وہ کام سرانجام دے دیا۔ یہ کتنی بڑی فضیلت ہے جو آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حاصل ہے۔

(۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب ملی اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی ایک کتاب ملی مگر فرق یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب ملی

باوجود اس کے کہ اُن کے بعد متواتر نبی آتے وہ محفوظ نہ رہ سکی۔ لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جو کتاب ملی باوجود اس کے کہ آپ کے بعد تیرہ سو سال تک کوئی نبی نہیں آیا وہ اب تک محفوظ چلی آرہی ہے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تو یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے کہ تورات بگڑ چکی تھی۔ یہودی کتب میں لکھا ہے کہ جب بخت نصر بادشاہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے شہروں اور گرجوں کو توڑا اور اُس نے یہودیوں کو افغانستان اور ایران میں بسا دیا اور بعض کو کشمیر بھیج دیا تو اُس وقت تورات کے سارے نسخے جل گئے تھے یا پھٹ کر ضائع ہو چکے تھے۔ پھر عزرا نبی اور چار پانچ زود نویسوں نے مختلف حفاظ کے ساتھ مل کر کتاب جمع کی دیکھو APOCRYPHA II ESADRAS 14 گویا چھ سو سال کے بعد ہی کتاب ختم ہو گئی۔ اِس کے علاوہ خود تورات کی اندرونی شہادت اس بات پر موجود ہے کہ وہ محرف و مبتدل ہو چکی تھی چنانچہ استثنار کے آخر میں لکھا ہے۔ "پس خداوند کے بندہ موسیٰ نے خداوند کے کہے کے موافق وہیں موآب کے ملک میں وفات پائی" (۳۴/۵) کیا یہ موسیٰ علیہ السلام کا الہام کہلا سکتا ہے؟ پھر لکھا ہے۔ "اور اُس وقت سے اب تک بنی اسرائیل میں کوئی نبی موسیٰ کی مانند جس سے خداوند نے رُوبرو باتیں کیں نہیں اُٹھا" (۳۴/۱۰) کیا یہ موسیٰ علیہ السلام کا الہام ہو سکتا ہے؟ پھر لکھا ہے۔ "اور اُس نے اُسے موآب کی ایک وادی میں دفن کیا پر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں" (۳۴/۶)۔ یہ بھی ایک ایسا فقرہ ہے جو کسی شخص نے بعد میں لکھ کر تورات میں شامل کر دیا ہے۔ ان حوالہ جات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ وہ کتاب نہیں جو موسیٰ علیہ السلام پر اُتری تھی۔ اگر قرآن کریم میں ہی یہ لکھا ہو کہ پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے تو کیا عیسائی اور ہندو وغیرہ یہ مان لیں گے کہ یہ محفوظ کتاب ہے؟ وہ فوراً یہ حوالہ نکال کر آگے رکھ دیں گے اور کہیں گے کہ تمہاری کتاب محرف و مبتدل ہو چکی ہے مگر تورات میں یہ سب باتیں لکھی ہیں کہ پھر وہ مر گیا اُس کے مرنے پر بنی اسرائیل چالیس دن تک روتے رہے اور یہ کہ اُس جیسا کوئی آدمی اب تک بنی اسرائیل میں پیدا نہیں ہوا۔ اُس کی قبر کا پتہ نہیں چلتا کہ کہاں ہے یہ باتیں بتاتی ہیں کہ یہ وہ کتاب نہیں جو موسیٰ علیہ السلام پر اُتری تھی اور یہ کہ آپ کے بعد آنے والے نبی بھی اُس کو محفوظ نہیں رکھ سکے۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جو کتاب نازل ہوئی وہ تیرہ سو سال کے بعد اب بھی محفوظ ہے اور اُس کا ایک شوشہ بھی تبدیل نہیں ہوا۔ حالانکہ آپ کے بعد اِس عرصہ میں کوئی نبی بھی نہیں آیا۔ میور اور نولڈکے جیسے شدید دشمن بھی اِس بات کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ قرآن کریم اُسی شکل و صورت میں محفوظ ہے جس شکل و صورت میں وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا۔ میور جو اسلام کا شدید ترین دشمن ہے اور جو قدم قدم پر اسلام کی دشمنی کرتا ہے لکھتا ہے کہ

THERE IS OTHERWISE EVERY SECURITY INTERNAL AND EXTERNAL THAT WE POSSESS THE TEXT WHICH MOHAMMAD HIMSELF GAVEFORTH AND USED.

یعنی اس کے علاوہ ہمارے پاس ہر ایک قسم کی ضمانت موجود ہے۔ اندرونی شہادت کی بھی اور بیرونی کی بھی کہ یہ کتاب جو ہمارے پاس ہے وہی ہے جو خود محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے دنیا کے سامنے پیش کی تھی۔

اور اُسے استعمال کیا کرتے تھے LIFE OF MOHAMMAD PAGE: 28 گویا شدید سے شدید دشمن بھی قرآن کریم کی حفاظت کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ یہ کتنی بڑی فضیلت ہے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ آپ بھی تو مانتے ہیں کہ حضرت مرزا صاحب (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نبی ہیں پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کریم کی حفاظت کے لئے کوئی نبی نہیں آیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مرزا صاحب قرآن کریم کی ظاہری شکل کو محفوظ کرنے کے لئے نہیں آئے۔ آپ آتے یا نہ آتے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی ظاہری حفاظت کے سامان بہم پہنچا دئے تھے اور قرآن کریم میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ کا آنا اس معجزہ کو ہرگز مشتبہ نہیں کر سکتا کیونکہ آپ کا قرآن کریم کی حفاظت ظاہری میں کوئی دخل نہیں۔ خواہ قیامت تک ایک مجدد بھی نہ آتا یا نہ آئے تب بھی قرآن کریم کی ظاہری صورت محفوظ رہے گی اور کبھی نہ بدلے گی جس طرح وہ آج تک نہیں بدل سکی۔

پانچویں فضیلت

(۵) حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنے ملک سے نکلے اور فرعون نے آپ کا تعاقب کیا تو جیسا کہ قرآن کریم سے ثابت ہے آپ کی قوم سخت گھبرا گئی اور اُس نے سمجھا کہ اب وہ فرعون کی گرفت سے نہیں بچ سکتی۔ چنانچہ انہوں نے چلا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (شعراء ع ۴) اے موسیٰ ہم تو پکڑے گئے۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُنہیں کہا کَلَّا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (شعراء ع ۴) ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا خدا تعالیٰ میرے ساتھ ہے اور وہ ہمیں دشمنوں کے حملے سے بچائے گا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے انہیں محفوظ رکھا اور فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر میں غرق ہو گیا۔

اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کے وقت مکہ سے نکلے اور غار ثور میں پناہ گزین ہوئے تو دشمن ایک تجربہ کار کھوجی کی راہنمائی میں آپ کو تلاش کرتے کرتے عین اُس غار کے منہ پر جا پہنچا جس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ چھپے ہوئے تھے۔ اُس وقت کھوجی نے انہیں کہا کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) یقیناً یہاں چھپے ہوئے ہیں اور اگر وہ اس غار میں نہیں تو پھر آسمان پر چلے گئے ہیں دشمن اُس وقت آپ سے اتنا قریب تھا کہ حضرت ابوبکرؓ جو آپ کے ساتھ تھے گھبرا گئے۔ اور اُنہوں نے کہا یا رسول اللہ! دشمن تو اس قدر نزدیک ہے کہ اگر وہ ذرا جھک کر اندر جھانکے تو ہمیں دیکھ سکتا ہے۔ آپ نے اُس وقت بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ ابوبکر گھبراتے کیوں ہو اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (توبہ ع ۶) اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے اور وہ ہماری مدد کرے گا۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ دشمن عین اُس مقام پر پہنچ گیا جہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے پھر بھی وہ خائب و خاسر واپس چلا گیا اور وہ آپ کو پکڑنے میں ناکام رہا۔ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی فرمایا کہ خدا تعالیٰ میرے ساتھ ہے اور وہ ہماری مدد کریگا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی کہا کہ خدا تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے وہ ہماری مدد کرے گا لیکن اگر غور کیا جائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دشمن کا تباہ ہو جانا اس طرح تھا کہ دشمن اب بھی کہہ دیتا ہے کہ موسیٰ اور آپ کی قوم سمندر سے گزرے ہی اُس وقت تھے جب جزر کا وقت تھا۔ جب مد TIDE کا وقت آیا تو فرعون اور اُس کے ساتھی ڈوب گئے۔ اس میں معجزہ اور نشان کی کونسی بات ہے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالےٰ نے اس

طرح بچایا کہ دشمن آپ کے قدموں کے نشانات کو دیکھتا ہوا غار ثور پر پہنچا اور پھر بھی وہ آپؐ کو نہ دیکھ سکا حالانکہ اُن کا معتبر کھوجی ساتھ تھا اور اُس نے کہا بھی کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یقیناً یہاں چھپے ہوئے ہیں اور اگر وہ یہاں نہیں تو پھر آسمان پر چلے گئے ہیں۔ مگر اُس کے اِس قدر یقین دلانے کے باوجود دشمن کو اتنی توفیق نہ ملی کہ وہ جھک کر غار کے اندر دیکھ لے اور وہ ناکام و نامراد واپس چلا گیا۔

اِس کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کرنے کے لئے کفارِ مکہ نے ایک سو اُونٹ کا انعام مقرر کر دیا۔ یہ اتنا بڑا انعام تھا کہ اس کو حاصل کرنے کے لئے عرب چاروں طرف دوڑ پڑے۔ انہوں نے خیال کیا کہ اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کہیں مل گئے تو سَو اُونٹ مل جائیں گے اور گھر کی حالت سُدھر جائے گی۔ سَو اُونٹ اُس وقت کے لحاظ سے بڑا بھاری انعام تھا بلکہ آج کل کے لحاظ سے بھی یہ بڑا بھاری انعام ہے۔ آج کل گورنمنٹ مجرموں کو پکڑنے کیلئے پانچ پانچ ہزار یا دس دس ہزار روپیہ انعام رکھتی ہے۔ اگر سَو اونٹ کی قیمت کا اندازہ اس زمانہ کے لحاظ سے کیا جائے تب بھی کم از کم ساٹھ ستّر ہزار روپیہ کا انعام بنتا ہے غرض یہ ایک بہت بڑا انعام تھا جس کو حاصل کرنے کے لئے ویسے تو بہت سے افراد باہر نکلے لیکن ایک شخص اتفاقاً اُس راستہ پر جا پہنچا جس رستہ پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ منوّرہ کی طرف تشریف لے جا رہے تھے۔ اُس شخص نے آپکو دیکھ لیا اور سمجھ لیا کہ وہ آپ کو پکڑنے میں اب ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ جس وقت وہ قریب پہنچا تو اچانک اُس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور گھٹنوں تک زمین میں دھنس گیا۔ اُس نے عرب کے قدیم دستور کے مطابق اِس موقعہ پر فوراً تیر نکال کر فال لی کہ مجھے آگے بڑھنا چاہیئے یا نہیں۔ فال نکلی کہ نہیں بڑھنا چاہیئے مگر سَو اُونٹ کا انعام تھا رہ نہ سکا۔ پھر ایڑ لگا کر پاس پہنچا مگر پھر گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور اب کی دفعہ پیٹ تک دھنس گیا۔ وہ گھبرایا اور سمجھا کہ کوئی اَور بات ہے۔ چنانچہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہایت ادب سے حاضر ہوا اور اُس نے عرض کیا کہ مَیں امان چاہتا ہوں۔ مَیں اب سمجھ گیا ہوں کہ آپ خدا تعالےٰ کے نبی ہیں۔ مَیں آپ کے تعاقب میں آیا تھا مگر واپس جاتا ہوں۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ خدا تعالےٰ کے سچے نبی ہیں اور جب آپ خدا تعالےٰ کے سچے نبی ہیں تو ایک نہ ایک دن آپ ضرور غالب آ جائیں گے اِس لئے مَیں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے ایک کاغذ کا پُرزہ لکھ دیں تاکہ جب خدا تعالےٰ آپ کو غلبہ عطا فرمائے تو میرے ساتھ نیک سلوک کیا جائے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُسی وقت حضرت ابوبکرؓ کو حکم دیا اور آپ نے اُسے لکھ کر دے دیا کہ خدا تعالےٰ جب مسلمانوں کو غلبہ عطا کرے تو اِس شخص سے نیک سلوک کیا جائے۔ گویا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح صرف ایک واقعہ پیش نہیں آیا آپ کے ساتھ دو دفعہ یہ واقعہ ہوا کہ دشمن نے آپ کو پکڑنے کی کوشش کی مگر دونوں دفعہ وہ ناکام رہا۔ پھر فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیچھا کیا تو اُس نے آپ کو دیکھ لیا مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دشمن باوجود پاس پہنچ جانے کے آپ کو دیکھ بھی نہیں سکا۔ دوسری دفعہ جب دشمن نے آپ کو گرفتار کرنا چاہا تو اُس وقت بھی وہ ناکام رہا۔ اور نہ صرف ناکام رہا بلکہ اُس نے آپکی برتری کو تسلیم کیا۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دشمن فرعون کو خدا تعالےٰ اُس وقت نظر آیا جب وہ ڈوب رہا تھا چنانچہ قرآن کریم میں ذکر آتا ہے کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو اُس نے کہا میں موسیٰ اور ہارون کے خدا پر ایمان لاتا ہوں۔ اُس کے جواب میں خدا تعالےٰ نے فرمایا تو آخری وقت میں ایمان لایا ہے اب تجھے نجات تو نہیں دی جا سکتی مگر تیرے بدن کو نجات دے دی جائے گی تاکہ تُو دوسروں کے لئے عبرت کا موجب ہو۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو پکڑنے کیلئے جو دشمن نکلا وہ زندہ رہا اور اپنی زندگی میں اُس نے تسلیم کر لیا کہ آپ خدا تعالےٰ کے سچے نبی ہیں۔ بلکہ اُس نے آپ سے یہ اقرار نامہ لکھوا لیا کہ جب خدا تعالےٰ آپکو غلبہ عطا کرے تو مجھ سے حُسن سلوک کیا جائے اور پھر خدا تعالےٰ نے اُسے آپ کے غلبہ تک زندہ رکھا اور مسلمانوں نے اُس سے حسن سلوک کیا۔ یہ کتنی بڑی فضیلت ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حاصل ہے۔

چھٹی فضیلت

(۶) ایک فرق حضرت موسیٰ علیہ السلام اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم میں یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دشمن تو تباہ ہوا لیکن دشمن کے تباہ ہو جانے کے بعد اُس کے ملک پر آپ کو غلبہ میسّر نہیں آیا۔ بے شک بعض جاہل علماء یہ کہہ دیتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بعد میں اُس ملک پر قبضہ مل گیا تھا اور ایک آیت کے غلط معنے کر کے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا نہ قرآن کریم سے یہ ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی بائبل سے ثابت ہوتا ہے۔ یُونہی کہہ دینے سے کہ آپ کو مصر کے ملک پر غلبہ حاصل ہو گیا تھا کیا بنتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جیسا کہ قرآن کریم سے ثابت ہے بعد میں وہ جنگلوں میں پھرتے رہے اور اپنی منزل مقصود کو ایک لمبے عرصہ تک نہ پا سکے۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں نے جب شکست کھائی تو آپ اُن کے مُلک پر بھی قابض ہو گئے اور یہ آپ کی موسیٰ علیہ السلام پر برتری ہے۔

(۷) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو سب سے پہلا مقابلہ ریڈسی RED SEA میں پیش آیا لیکن وہاں کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ بنی اسرائیل بھاگتے ہوئے آ رہے تھے وہ دل میں ڈر رہے تھے کہ کہیں فرعون اُنکے تعاقب میں نہ آ جائے چنانچہ جب انہوں نے فرعون اور اُسکے لشکر کو دیکھا تو انہوں نے گھبرا کر کہا کہ اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ۔ اے موسیٰ ہم تو پکڑے گئے وہاں موسیٰ کی قوم نے کوئی بہادری نہیں دکھائی۔ پھر جب لڑائی کا وقت آیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ جاؤ اور دشمن سے لڑو۔ تو انہوں نے لڑائی کرنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ کنعان کا ملک بہت چھوٹا ہے۔ سارے فلسطین کا رقبہ دس ہزار مربع میل ہے مگر کنعان کا رقبہ دو تین ہزار مربع میل ہے۔ اِتنے چھوٹے سے علاقہ کو فتح کرنے کے لئے خدا تعالےٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو حکم دیا مگر قرآن کریم اور بائبل دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسےٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو کہا کہ تم نے تائیدات سماوی کو دیکھ لیا ہے تم اِس ملک پر حملہ کرو اور اسے فتح کر کے اِس میں اللہ تعالےٰ کی بادشاہت قائم کرو۔ تو اُن کی قوم نے کہا اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (مائدہ ع ۴) اے موسیٰ جاؤ تم اور تمہارا خدا دشمن سے لڑتے پھرو ہمیں تو ملک فتح کر کے دے دو گے تو ہم لے لیں گے لڑائی کرنے کے لئے ہم تیار نہیں۔ تم کہتے تھے کہ خدا تعالےٰ تم کو

یہ ملک دے گا۔ اب وہ خود ہی دے تو دے ہم کیوں لڑتے پھریں۔ کیا اُس کا ہمارے ساتھ وعدہ نہیں تھا۔ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آٹھ دس سال کی صحبت نے اُن کے اندر اتنا بھی عرفان پیدا نہ کیا کہ خدا تعالےٰ کے وعدوں کو پورا کرنے کے لئے بندے کو بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے موسیٰؑ کو صاف جواب دے دیا اور کہہ دیا کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ (مائدہ ع۴) اے موسیٰ جاؤ تم اور تمہارا رب دونوں دشمن سے لڑتے پھرو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر ملی کہ شام سے ایک قافلہ آ رہا ہے اور وہ قبائل کو مسلمانوں کے خلاف اُکساتا آ رہا ہے تو آپ اپنے ساتھ کچھ آدمی لے کر اُس کی شرارتوں کا سدّ باب کرنے کے لئے نکلے۔ سارے صحابہؓ آپ کے ساتھ نہیں گئے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ چھوٹا سا قافلہ ہے جس کے اثر کو زائل کرنا مقصود ہے تا عرب کے لوگ مسلمانوں پر حملہ کرنے میں دلیر نہ ہو جائیں کوئی لڑائی تو ہے نہیں اِدھر آپؐ کو الہام میں بتایا گیا کہ مکہ سے بھی ایک بڑا بھاری لشکر اس قافلہ کی مدد کے لئے آ رہا ہے۔ مگر اللہ تعالےٰ نے ساتھ ہی اشارہ کر دیا کہ صحابہ کو بتانا نہیں یہ اُن کے لئے امتحان کا وقت ہے۔ آپؐ چلتے چلے گئے۔ جب آپ کئی منزلیں آگے نکل گئے تو آپ نے صحابہؓ کو جمع کیا اور فرمایا اللہ تعالےٰ کی طرف سے مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ دشمن کا ایک بڑا بھاری لشکر مکہ سے آ رہا ہے اور اللہ تعالےٰ تمہارا مقابلہ یا تو اُس لشکر کے ساتھ کرا دے گا اور یا شام سے آنیوالے قافلہ کے ساتھ کرا دے گا۔ ابھی آپ پر اس کا پورا اظہار نہیں ہوا تھا کہ آخر کس سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ پھر آپ اور آگے چلے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتا دیا

کہ مقابلہ یقینی طور پر مکہ سے آنے والے لشکر کے ساتھ ہوگا قافلہ کے ساتھ نہیں ہوگا۔ یہ لشکر مسلمانوں سے تعداد میں کئی گنا زیادہ تھا اور طاقت میں بھی اُن سے بڑھ کر تھا۔ وہ سب آزمودہ کار سپاہی تھے اور پھر پوری طرح مسلح تھے اور اگر تمدن کے لحاظ سے دیکھا جائے تو دونوں لشکر برابر تھے۔ مسلمان بھی عرب تھے اور مقابلہ پر دشمن بھی عرب تھا۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت کنعانی لوگ محض قبائلی گروہ تھے اور بنی اسرائیل ایک متمدن اور منظم قوم تھی یعنی کنعانی لوگ جاہل اور غیر تعلیمیافتہ تھے اور اُن کے مقابلہ میں بنی اسرائیل منظم اور متمدن لوگ تھے۔ مگر باوجود اس کے جب لڑائی کا وقت آیا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قوم نے یہ نہیں کہا حالانکہ طاقت کو دیکھا جائے تو دشمن بہت زیادہ مضبوط اور طاقتور تھا اور پھر مسلمانوں سے بہت زیادہ تجربہ کار بھی تھا۔ مسلمان اتنے تجربہ کار نہیں تھے بلکہ اُن میں سے ایک حصہ تو مدینہ والوں کا تھا جنہوں نے کسی بڑی لڑائی میں کبھی بھی حصہ نہیں لیا تھا۔ پھر تعداد کو لیا جائے تو مسلمان صرف تین سَو تیرہ تھے اور دشمن کا لشکر ایک ہزار تھا۔ پھر دشمن کے پاس سامانِ جنگ بھی موجود تھا اور اُس کے پاس گھوڑے بھی تھے اور جتنا گھوڑا جنگ میں کام آ سکتا ہے اُتنا اُونٹ کام نہیں آ سکتا۔ مسلمانوں کے پاس سارے لشکر میں صرف ایک گھوڑا تھا۔ گویا مسلمانوں کا لشکر کلی طور پر کمزور تھا اور دشمن کئی گنا طاقتور تھا۔ اُس وقت آپؐ نے صحابہؓ کو جمع کیا اور فرمایا اب مجھے یقینی طور پر معلوم ہو گیا ہے کہ ہمارا اُس لشکر سے مقابلہ ہوگا جو مکہ سے ابوجہل کی کمان میں آ رہا ہے آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟ مہاجرین یکے بعد دیگرے اُٹھے اور انہوں نے کہا یا رسول اللہ ہم لڑینگے ایک مہاجر جب بیٹھ جاتا تو دوسرا اُٹھتا پھر تیسرا اُٹھتا پھر

پوچھا اُٹھتا۔ لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یہی فرماتے جاتے بتاؤ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے۔ انصار بھی اِس لشکر میں تھے مگر وہ خاموش تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ مکّہ سے جو لشکر آرہا ہے اُس میں مہاجرین کے بھائی بند ہیں۔ اگر ہم نے کہا کہ ہم لڑیں گے تو مہاجرین کے چونکہ وہ بھائی بند ہیں۔ کوئی چچا ہے، کوئی بھائی ہے اور کوئی بھتیجا ہے۔ اِس لئے اُن کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ انصارؓ کو ہم سے محبت نہیں تبھی وہ اِس جوش سے ہمارے رشتہ داروں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بار بار فرمایا کہ اے لوگو مجھے مشورہ دو۔ تو ایک انصاری اُٹھے اور اُنہوں نے کہا۔ یارسول اللہ شاید آپ کی مراد ہم انصار سے ہے ورنہ آپ کو رائے تو مل رہی ہے آپ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ اُس انصاریؓ نے کہا۔ یارسول اللہ ہم تو مہاجرین کے ادب کی وجہ سے ابتک چُپ تھے۔ ہم ڈرتے تھے کہ اگر ہم نے کہا کہ ہم لڑائی کے لئے تیار ہیں تو مہاجرین کے جذبات کو ٹھیس لگے گی۔ پھر اُس انصاریؓ نے کہا یارسول اللہ جب ہم میں سے پہلی دفعہ بہتّر آدمی آپ کے پاس گئے اور انہوں نے آپ کی بیعت کی اُس وقت ہم نے آپ سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ اگر دشمن نے مدینہ پر حملہ کیا تو ہم آپ کی اپنی جان و مال سے حفاظت کریں گے۔ لیکن اگر آپ مدینہ سے باہر نکل کر دشمن سے لڑے تو پھر ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی کیونکہ ہم میں اتنی طاقت نہیں کہ دشمن سے باہر نکل کر لڑ سکیں۔ آپ جو بار بار پوچھتے ہیں تو شاید آپ کا اشارہ اُس معاہدہ کی طرف ہے کیونکہ یہ لڑائی مدینہ سے باہر ہونے والی ہے۔ آپ نے فرمایا تمہاری بات ٹھیک ہے۔ اُس انصاریؓ نے کہا یارسول اللہ جب ہم نے آپ سے وہ معاہدہ کیا تھا اُس وقت آپ کی شان ہم پر ظاہر نہیں ہوئی تھی اب ہم کچھ عرصہ تک آپ کے ساتھ رہے ہیں اور ہم نے آپ کے اخلاق اور تعلق باللہ کو دیکھ لیا ہے اور آپکی شان ہم پر ظاہر ہوچکی ہے اِس لئے اب کسی معاہدے کا سوال ہی نہیں۔ یارسول اللہ سامنے سمندر ہے (بدر کے میدان سے کچھ فاصلہ پر سمندر تھا جس کیطرف اُس انصاری نے اشارہ کیا اور یہ بھی اس لئے کہ عرب لوگ پانی سے بہت ڈرتے تھے) آپ ہمیں حکم دیجئے کہ ہم سمندر میں اپنے گھوڑے ڈال دیں تو ہم اپنے گھوڑے سمندر میں ڈال دیں گے اور ذرا بھی چون و چرا نہیں کریں گے۔ پھر اُس نے کہا یارسول اللہ اگر لڑائی ہی مقدر ہے تو ہم آپ کے دائیں بھی لڑیں گے اور آپ کے بائیں بھی لڑیں گے۔ آپ کے آگے بھی لڑیں گے اور آپ کے پیچھے بھی لڑیں گے اور دشمن آپ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ ہماری لاشوں کو رَوندتا ہوا نہ گذرے۔ اِس واقعہ کو دیکھیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے اُس واقعہ کو سامنے رکھیں جب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ۔ اور پھر غور کریں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہؓ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں کتنا عظیم الشان فرق ہے۔ معلوم ہوتا ہے اُسوقت خدا تعالیٰ نے اُس انصاریؓ کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ کہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یہ نہ سمجھتے ہوں کہ آپ کی اُمّت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمّت کی طرح پیچھے ہٹ رہی ہے۔ چنانچہ اُس انصاریؓ نے کہا یارسول اللہ ہم موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح یہ نہیں کہیں گے کہ تو جا اور تیرا رب دونوں دشمن سے لڑتے پھرو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ بلکہ ہم آپ کے دائیں بھی لڑیں گے

اور بائیں بھی لڑیں گے۔ آپ کے آگے بھی لڑیں گے اور آپ کے پیچھے بھی لڑیں گے اور دشمن ہماری لاشوں پر سے گذرے تو گذرے ورنہ جب تک ہم زندہ ہیں دشمن آپ تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ کتنی زبردست فوقیت ہے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حاصل ہے۔

(۸) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب آپ کی قوم نے کہا اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ (مائدہ ع) تو خدا تعالے نے فرمایا اے موسیٰ تیری قوم نے بہت بڑی گستاخی کی ہے اس گستاخی کی وجہ سے ہم اُسے اس فتح سے محروم کرتے ہیں جس کا ہم نے وعدہ کیا تھا۔ جاؤ اب چالیس سال تک جنگلوں میں آوارہ پھرو اور اپنے گناہوں کی معافیاں مانگو۔ پھر اللہ تعالے تمہیں معاف کریگا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو چالیس سال تک جنگلوں میں بھٹکنے کے بعد کنعان ملا لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قوم کو آپ کی وفات کے بارہ سال کے عرصہ میں ہی ساری متمدن دنیا پر حکومت مل گئی۔ یہ بھی ایک بہت بڑی فضیلت ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حاصل ہے۔

(۹) ایک اور امتیازی خصوصیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں یہ حاصل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سلسلہ ختم ہو گیا مگر آپ کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موسوی سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک ممتد رہا بلکہ اس کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک بھی پہنچا مگر صرف نام کے طور پر۔ ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی لوگ یہ کہنے لگ گئے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے ہیں۔ بلکہ انہوں نے آپ کو خدا تعالے کا بیٹا قرار دینا شروع کر دیا تھا لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا اور قیامت تک چلتا چلا جائیگا۔

دسویں فضیلت

(۱۰) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آخری خلیفہ یعنی مسیح ناصری کی جماعت نے آپ کو جواب دیدیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی افضلیت کا انکار کر دیا۔ اس میں کچھ دخل اس بات کا بھی تھا کہ حضرت مسیح کی زبان سے بعض ایسے ذُو معنے فقرے نکلے جن سے آپ کی قوم دھوکا کھا گئی اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چھوڑ بیٹھی لیکن ہمارے سلسلہ کے بانی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو محمدی سلسلہ کے آخری خلیفہ ہیں اگر کچھ کہا تو یہ کہ

آٹھویں فضیلت

وہ ہے مَیں چیز کیا ہوں بس فیصلہ یہی ہے

یعنی مجھے جو بھی کمالات ملے ہیں وہ سب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی غلامی کے طفیل ہیں یہ خیال نہ کرنا کہ مَیں آپ کے مد مقابل کی چیز ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے آپکو خدا تعالے کا بیٹا کہا۔ لیکن ہمارے بانئ سلسلہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے آخری خلیفہ نے نہایت ادب کے ساتھ کہا۔ ع

نویں فضیلت

وہ ہے میں چیز کیا ہوں بس فیصلہ یہی ہے

یعنی مجھے اپنے آقا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی نسبت ہی نہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک شعر ہے جس پر لوگ اعتراض کرتے ہیں لیکن ہمیں تو اس میں لطف ہی آتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں ؎

ابنِ مریم کے ذکر کو چھوڑ دو
اس سے بہتر غلامِ احمد ہے

اِس پر لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے آپ کو ابنِ مریمؑ سے افضل بتایا ہے۔ حالانکہ آپ نے اپنے آپ کو ابنِ مریمؑ سے افضل نہیں بنایا بلکہ احمدؐ کے غلام کو افضل قرار دیا ہے اور ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ یہاں احمد سے مراد محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ فرماتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام بھی بڑا ہے اور جس کا غلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بڑا ہو اور افضل ہو وہ خود تو اُن سے بدرجہا افضل ہو گا۔ غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام پر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک یہ بھی فضیلت ہے کہ موسوی سلسلہ کے آخری خلیفہ کی جماعت نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے سلسلہ کے بانی سے افضل قرار دے دیا۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے آخری خلیفہ نے اپنے آقا کی شان اور عظمت کو قائم کیا اور اُس نے دنیا میں بڑے زور سے یہ اعلان کیا کہ ہم نے جو کچھ پایا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے فیضان سے ہی پایا ہے۔

۱۲ بارھویں فضیلت

۱۱ گیارھویں فضیلت

(۱۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جتنے نبی آئے وہ مستقل نبی تھے۔ گو وہ کوئی نئی شریعت نہیں لائے مگر نبوت کا مقام انہوں نے براہِ راست حاصل کیا تھا۔ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے توسط کے بغیر اُنہیں یہ مقام ملا تھا۔ موسوی تعلیم ایسی نہ تھی کہ وہ کسی کو نبوت کے مقام تک پہنچا سکتی۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو آپ پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ آپؐ کے اتباع خواہ نبی ہوں آپؐ کے فیض سے نبی بننے والے ہیں اور اُنہیں جو کچھ ملے گا فیضِ محمدیؐ سے ہی ملے گا حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تابع تو تھے مگر نبوت کے مقام پر وُہ براہِ راست پہنچے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں یہ خوبی نہ تھی کہ وہ کسی کو نبوت کے مقام تک پہنچا سکے لیکن قرآن مجید میں یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ اس پر عمل کرنے سے انسان نبوت کے مقام پر بھی پہنچ سکتا ہے مگر وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا تابع اور قرآن کریم کا خادم ہی رہتا ہے۔

(۱۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا ملا۔ جو بعض اوقات سانپ بن جاتا تھا جو ایک کاٹنے والی چیز ہے۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو شمشیرِ قرآن ملی جو ہمیشہ رحمت ہی رحمت بنی رہتی ہے۔ اللہ تعالےٰ اس شمشیر کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم میں فرماتا ہے وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيرًا (فرقان ع۵) تُو قرآن کریم کو لے اور اس سے جہاد کرتا چلا جا۔ مادی تلواروں کی لڑائیاں تو معمولی ہوتی ہیں اور جلد ختم ہو جاتی ہیں مگر قرآن کریم ایک ایسی تلوار ہے جو دشمن کے مقابلہ میں ہمیشہ کام آنے والی ہے اور جس کے اثرات رحمت کی صورت میں ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو بار بار رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے اور آپ نے تعلیم بھی ایسی ہی دی ہے جس میں نرمی اور محبت کو تعذیب اور انتقام پر ترجیح دی گئی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم یہ تھی کہ اگر تمہیں کوئی تھپڑ مارے تو تم بھی اُسے تھپڑ مارو۔ اگر کوئی شخص تمہاری آنکھ نکال دے تو تم بھی اُس کی آنکھ نکال دو۔ اگر کوئی شخص تمہارا دانت توڑ دے تو تم بھی اُس کا دانت توڑ دو۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ تم جو بھی قدم اُٹھاؤ سوچ سمجھ کر اور حالات کو دیکھ کر اُٹھاؤ۔ اگر مصلحت اس میں ہو کہ معاف کر دیا جائے تو اپنے دشمن کو معاف کر دو۔ اسے سزا دینے پر اصرار نہ کرو۔ کیونکہ

تمہاری غرض محض اصلاح ہونی چاہیئے نہ کہ انتقام۔

(۱۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یدِ بیضا کا معجزہ دیا گیا تھا یعنی آپ کا ہاتھ کبھی کبھی چمکا کرتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سِرَاجًا مُّنِیْرًا (احزاب ع ۶) کہا ہے اور سورج سارا چمکا کرتا ہے اس کا کوئی ایک حصہ نہیں چمکا کرتا گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا صرف ہاتھ چمکا کرتا تھا مگر آپ کا سارا جسم روشن اور منور تھا۔ پھر سورج ہر وقت روشنی دیتا ہے کبھی کبھار نہیں۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ صرف کبھی کبھی چمکتا تھا یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تمام امور میں راہنما تھے اور ہر وقت آپکی راہنمائی قائم رہنے والی ہے یہ نہیں کہ کبھی ختم ہو جاتے اور کبھی شروع ہو جاتے۔

(۱۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صرف بنی اسرائیل کیطرف نبی بنا کر بھیجا گیا تھا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (سباع ۳) ہم نے تجھے تمام بنی نوع انسان کو ایک ہاتھ پر جمع کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ یہ بھی آپ کی فضیلت اور برتری کی ایک روشن دلیل ہے۔

(۱۵) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک یہ معجزہ دیا گیا تھا کہ آپ کی قوم کے بوڑھے مرے۔ بوڑھوں کا مرنا کوئی بڑا نشان نہیں۔ مرنا تو ہر ایک ہی ہے۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جو معجزہ دیا گیا اس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے بوڑھے ہی نہیں مرے بلکہ انکی ساری اولادیں ہی مر گئیں اور پھر زندہ ہو کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مل گئیں۔ کتنا بڑا دشمن تھا ولید۔ وہ آپ سے لڑنے کے لئے قبائل کو اکساتا رہتا تھا اور کہتا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مار ڈالو۔ پھر کتنا بڑا دشمن تھا عاص بن وائل۔ وہ ہر وقت آپ کے خلاف منصوبے سوچتا رہتا تھا اور لشکر تیار کروایا کرتا تھا۔

تیرھویں فضیلت

پھر کتنا بڑا دشمن تھا ابوجہل۔ اس نے اپنی ساری عمر ہی آپ کے مقابلہ میں گذار دی۔ لیکن ولید کا بیٹا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا اور ایسا ایمان لایا کہ اس کا نام مسلمان بطور یادگار کے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے بیٹوں کا نام خالدؓ رکھتے ہیں اور غیر مسلموں کو ڈراتے ہیں کہ اب بھی ہم میں خالد موجود ہیں۔ یہ خالدؓ اس ولید کا بیٹا تھا جس نے قسم کھائی تھی کہ میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ذلیل کر کے رہوں گا اور یہ خالدؓ وہی شخص ہے جس نے اُحد کے موقعہ پر تاڑ لیا تھا کہ مسلمانوں کی پشت ننگی ہے اور اس نے موقعہ پا کر اوپر سے حملہ کر دیا جس سے مسلمانوں کی فتح عارضی طور پر شکست سے بدل گئی۔ مگر پھر یہی خالدؓ اسلام میں داخل ہوئے اور ایسے فدائی اور جان نثار ثابت ہوئے کہ تاریخ بتاتی ہے جب خالدؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو ایک دوست جو ان سے ملنے کے لئے آیا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ خالدؓ رو رہے ہیں۔ اس نے تعجب سے کہا خالدؓ تمہارا رونے سے کیا کام؟ تم نے اسلام کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں اب تمہیں خوش ہونا چاہیئے کہ تمہیں بڑے بڑے انعامات ملیں گے خالدؓ نے کہا ذرا آگے آؤ اور میری پیٹھ پر سے کپڑا اٹھاؤ۔ اس نے کپڑا اٹھایا تو خالدؓ نے کہا کیا میری پیٹھ پر کوئی جگہ ایسی ہے جہاں زخم کا نشان نہ ہو؟ اس نے کہا نہیں کوئی بھی ایسی جگہ نہیں جہاں تلوار کے زخم کے نشان نہ ہوں۔ خالدؓ نے کہا اچھا اب میرے سینے پر سے کپڑا اٹھاؤ۔ اس نے آپ کے سینے پر سے کپڑا اٹھایا۔ خالدؓ نے کہا دیکھو میرے سینہ اور پیٹ پر

چودھویں فضیلت

کوئی جگہ ایسی ہے جہاں تلوار کے زخم کا نشان نہ ہو؟
اُس نے کہا نہیں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں زخم کا نشان
نہ ہو۔ اُنہوں نے کہا اچھا اب میری دائیں ٹانگ پرسے
کپڑا اٹھا کر دیکھو کہ کیا میری ٹانگ اور پاؤں پر کوئی ایسی
جگہ ہے جہاں تلوار کے زخم کے نشان نہ ہوں۔ اُس نے
کپڑا اٹھا کر دیکھا اور کہا ہر جگہ تلوار کے زخموں کے نشان
ہیں۔ انہوں نے کہا اچھا اب میری دوسری ٹانگ دیکھو
اُس نے دوسری ٹانگ دیکھی تو وہاں بھی کوئی جگہ ایسی
نہیں تھی جہاں تلوار کے زخم کے نشانات نہ ہوں۔ جب
وہ اپنے جسم کے تمام نشانات دکھا چکے تو خالدؓ پھر
رو پڑے اور انہوں نے کہا۔ اے میرے دوست مَیں
اِس لئے نہیں روتا کہ مَیں مرنے لگا ہوں بلکہ مَیں اس لئے
رو رہا ہوں کہ مَیں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا کفر
کی حالت میں مقابلہ کیا۔ پھر خدا تعالیٰ نے مجھے اسلام
کی توفیق عطا فرمائی اور مَیں نے کوشش کی کہ مَیں اپنا اور
اپنے خاندان کا کفّارہ شہادت سے ادا کروں اور تم گواہی
دے سکتے ہو کہ مَیں نے اِس میں کوئی کمی نہیں کی۔
میرے سر سے پاؤں تک ایک انچ بھی ایسی جگہ نہیں جہاں
زخم کا نشان نہ ہو۔ پھر آپ کی ہچکی بندھ گئی اور آپ نے
سسکیاں بھرتے ہوئے فرمایا میری بدقسمتی کہ مَیں
اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہوا اور بجائے میدان جنگ
میں شہید ہونے کے مَیں اب چارپائی پر مر رہا ہوں۔
یہ کتنا عظیم الشان نشان تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وآلہٖ وسلم کو دیا گیا۔ آپ کے شدید ترین دشمن
آپ پر ایمان لائے اور پھر انہوں نے اتنی شاندار
قربانیاں کیں کہ دنیا میں اس قسم کی کوئی مثال نہیں
مل سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام
کے دشمنوں کے بیٹوں کو مارا اور اس طرح مارا کہ انہیں
آپ سے کوئی محبت نہیں تھی لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی قوم کے بیٹوں کو اُس نے ایمان اور محبت کے ساتھ
مارا اور ایسا مارا کہ مرتے ہوئے بھی اگر انکو کچھ حسرت
تھی تو یہی کہ وہ چارپائی پر کیوں مر رہے ہیں میدانِ جنگ
میں لڑتے ہوئے انہیں شہادت کیوں نصیب نہ ہوئی۔
عمرو بن عاص جو بعد میں عمرو بن عاص کہلائے
جب اُن کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ کے بیٹے
نے جو آپ سے پہلے مسلمان ہو گئے تھے اور بڑے
عظیم الشان صحابیؓ تھے دیکھا کہ وہ تڑپ رہے ہیں۔
بیٹے نے کہا باپ آپ کیوں اتنا تڑپتے ہیں خدا تعالیٰ
نے آپ کو کتنا بڑا رتبہ دیا ہے کہ آپکو ایمان نصیب ہوا۔
عمروؓ بن عاص نے آہ بھری اور کہا میرے بیٹے ایمان
سے پہلے میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اتنا شدید
دشمن تھا کہ آپ کی شکل دیکھنے کو بھی میں بُرا سمجھتا تھا۔ اگر
آپ میرے پاس سے گذرتے تو مَیں اپنی آنکھیں نیچی
کر لیتا تھا تا نعوذ باللہ آپ کی منحوس شکل نظر نہ آئے۔
اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے ایمان بخشا مگر اُس
وقت مجھے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے اتنی محبت
ہو گئی کہ شدّتِ محبت کی وجہ سے مَیں نے آپ کی شکل
کو نہیں دیکھا۔ میں ہمیشہ اپنی نظریں نیچی رکھتا تھا۔
گویا کفر کی حالت میں بُغض کی وجہ سے مَیں نے آپ کی
شکل کو نہیں دیکھا اور ایمان کی حالت میں شدّتِ محبت کی
وجہ سے مَیں نے آپ کی شکل کو نہیں دیکھا۔ چنانچہ آج اگر
کوئی شخص مجھ سے آپ کا حُلیہ پوچھے تو مَیں نہیں بتا سکتا
میرے بیٹے! بیشک خدا تعالیٰ نے مجھے بہت سی نیکیوں
کی توفیق دی ہے لیکن آپ کی وفات کے بعد جھگڑے
ہوتے رہے اور بعض غلطیاں بھی ہم سے ہوئیں نہ معلوم
اب میں کس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو شکل
دکھاؤں گا۔ دیکھو یہ کتنے بڑے دشمن تھے جو دن اور
رات آپ کی دشمنی کرتے تھے مگر بعد میں اُنہیں ایسا ایمان

نصیب ہوا کہ انہوں نے اپنے آپ کو محبت کی چھری سے ذبح کرلیا۔

پھر ابوجہل کو دیکھو۔ وہ کتنا بڑا دشمن تھا اُس کا بیٹا عکرمہؓ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا۔ اور پھر اُس نے جو قربانی صحابہؓ کو بچانے کے لئے کی وہ بھی ایسی شاندار ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی آپ صحابہؓ کی جانوں کو بچانے کیلئے ایک ایسے لشکر میں گھس گئے جسکی تین لاکھ سے دس لاکھ تک تعداد بتائی جاتی ہے قلب لشکر میں جاتے ہی آپ نے کمانڈر انچیف کو زخمی کیا اور حملہ کرکے قلب لشکر میں انتشار پیدا کردیا اور پھر وہیں لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

ابوسفیان تو آپ کی زندگی میں ہی آپ کا شکار ہوگیا تھا۔ پھر اُسی کا بیٹا معاویہؓ تھا جو اسلام کا ایک پہلوان ہوا۔ بے شک اُن سے بعض غلطیاں بھی ہوئیں مگر انہوں نے اسلام کی نہایت شاندار خدمت سرانجام دی ہے۔ غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے تو صرف پلوٹھے مرے مگر یہاں دشمن کی ساری اولادیں مرگئیں۔ وہ آپ پر ایمان لے آئیں اور اپنے باپوں سے کٹ کر روحانی طور پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل میں شامل ہو گئیں۔

(۱۶) پھر قحط کا نشان حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں پر ایک سال کا قحط آیا۔ ٹڈی آئی اور فصلوں کو کھا گئی۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قوم پر سات سال کا قحط پڑا۔ آخر اُنہوں نے آپؐ سے دعائیں کروائیں تب اس عذاب سے اُنہیں نجات حاصل ہوئی۔

(۱۷) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہاڑ پر اللہ تعالےٰ کی تجلی دیکھی مگر جیسا کہ قرآن کریم اور تورات دونوں سے معلوم ہوتا ہے آپ اُسے برداشت نہ کرسکے اور بے ہوش ہوکر گر گئے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام کیا تھا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (النجم) محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں اللہ تعالےٰ کی ملاقات کی تڑپ پیدا ہوئی اور انہوں نے خدا تعالےٰ کی طرف اُس کی ملاقات کے لئے صعود شروع کیا ادھر خدا تعالےٰ کے دل میں آپ کی وہ محبت موجزن تھی کہ وہ خود نیچے اُتر آیا تاکہ ملاقات میں دیر نہ ہو۔ پھر وہ دونوں مل کر ویسے ہی نہیں آ گئے بلکہ فرمایا فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى۔ عرب میں یہ رواج تھا کہ جب دو آدمیوں میں پیار و محبت ہو جاتی تھی تو وہ ایک ہی کمان سے تیر چلاتے تھے اور اِس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ جدھر اُس کا تیر جائے گا اُدھر ہی میرا تیر جائیگا اور جدھر میرا تیر جائے گا اُدھر ہی اُس کا تیر جائیگا۔ اِسی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف اللہ تعالےٰ کو دیکھا نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کے معاہدہ کیا کہ اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) آج سے جدھر تمہارا تیر چلے گا اُدھر ہی میرا تیر چلے گا اور جدھر میرا تیر چلے گا اُدھر ہی تیرا تیر چلے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اُدھر ہی تیر چلایا جدھر خدا تعالےٰ نے تیر چلایا۔ خواہ آپ کا وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو اور خدا تعالےٰ کو بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اتنا پیار تھا کہ اُس نے بھی اُدھر ہی تیر چلایا جدھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیر چلایا مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (انفال ع ۲) میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) جب تُو نے دشمن کی طرف کنکروں کی مٹھی پھینکی تو وہ کنکر تُو نے نہیں پھینکے ہم نے پھینکے تھے کیونکہ ہمارا تم سے یہ وعدہ تھا کہ جدھر تمہارا تیر چلے گا

سولھویں فضیلت

سترھویں فضیلت

اُدھر ہی ہمارا تیر چلے گا۔ یہ تو دشمن کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کا سلوک تھا۔ اب دوستی کا حال دیکھو خدا تعالیٰ فرماتا ہے یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (فتح ع ۱) تیری بیعت کرنے والوں اور تیری غلامی میں شامل ہونے والوں پر ہمارا ہاتھ ہے کیونکہ انہوں نے تیرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا ہے۔ غرض محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالےٰ دونوں ایک ہو گئے تھے۔ اس طرح کہ اگر تیر چلتا تھا تو دونوں کا ایک طرف چلتا تھا اور اگر کسی طرف نگاہِ لطف اُٹھتی تھی تو دونوں کی اُسی طرف اُٹھتی تھی۔ یہ کتنی بڑی تجلّی ہے جو اللہ تعالےٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر کی۔ اس کے مقابلہ میں موسوی تجلّی کیا حقیقت رکھتی ہے۔

اظہار نفس فضیلت ۱

(۱۸) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صرف کتاب ملی مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کتاب کے علاوہ کلام اللہ بھی دیا گیا اور ان دونوں میں بڑا بھاری فرق ہے۔ کتاب کے معنے حکم کے ہوتے ہیں اور اُسے دوسرے الفاظ میں بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن کلام اللہ تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ گویا کتاب کے مفہوم میں الفاظ کی شرط نہیں مگر کلام اللہ میں الفاظ کی شرط ہے۔

شاہانِ عرب میں یہ رواج تھا کہ وہ بڑے بڑے ادیبوں کو وزیر مقرر کیا کرتے تھے۔ ایک بادشاہ کا وزیر بات کرتے وقت ہکلاتا تھا اور وہ 'ر' نہیں بول سکتا تھا جیسے بعض بچے 'ر' کی جگہ 'ل' بول دیتے ہیں مثلاً 'میری کتاب' کہنا ہو تو وہ کہیں گے 'میلی کتاب' اسی طرح وہ وزیر بھی 'ر' کی بجائے 'ل' بولتا تھا۔ کسی نے بادشاہ کو طعنہ دیا کہ تُو نے بڑا ادیب رکھا ہوا ہے اُس کی تو زبان میں نقص ہے اگر کوئی بادشاہ تمہارے پاس آ گیا تو تمہاری ذلّت ہوگی۔ بادشاہ نے کہا مجھے تو ابھی تک محسوس نہیں ہوا کہ میرا وزیر یہ نقص اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ ہر وقت میرے پاس رہے اور مجھے اُس کے اِس نقص کا علم نہ ہو۔ اُس شخص نے کہا مَیں اس کا ثبوت بہم پہنچا دیتا ہوں آپ اُسے 'ر' والے الفاظ لکھوا کر دیکھ لیں۔ بادشاہ نے وزیر کا امتحان لینے کے لئے ایک فقرہ بنایا اور اُسے بُلایا۔ اُس وقت یہ دستور تھا کہ بادشاہ وزراء کو آرڈر دیتے تھے اور وزیر آگے آرڈر دیا کرتا تھا۔ اگر کاتب کو کوئی چیز لکھوانی ہوتی تھی تو بادشاہ بولتا جاتا تھا اور وزیر آگے کاتب کو لکھواتا جاتا تھا۔ کاتب کی یہ شان نہیں ہوتی تھی کہ وہ بادشاہ سے براہِ راست مخاطب ہو بادشاہ نے کہا لکھو اَمَرَ اَمِیْرُ الْاُمَرَاءِ اَنْ یُّحْفَرَ الْبِئْرُ فِی الطَّرِیْقِ لِیَشْرَبَ مِنْہُ الْمَارُّ الصَّادِرُ وَالْوَارِدُ یعنی بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ فلاں راستہ میں ایک کنواں کھودا جائے تاکہ شہر سے باہر جانیوالے اور شہر کی طرف آنے والے سب لوگ اُس سے پانی پی سکیں اِس فقرہ میں اُس نے سب 'ر' والے الفاظ جمع کر دئے بادشاہ سے سُن کر وزیر نے فوراً یہ حکم اس طرح لکھوانا شروع کیا حَکَمَ حَاکِمُ الْحُکَّامِ اَنْ یُّقْلَبَ الْقَلِیْبُ فِی السَّبِیْلِ لِیَنْتَفِعَ مِنْہُ الْغَادِیْ وَالْبَادِیْ۔ بادشاہ سخت حیران ہوا شکایت کرنیوالا بھی پاس کھڑا تھا اُس نے کہا دیکھا یہ 'ر' نہیں بول سکتا۔ بادشاہ نے کہا مجھے تو وزیر کے کسی نقص کا پتہ نہیں لگا اُس کے کمال کا پتہ لگا ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ کتنی جلدی اُس نے میرے حکم کو دوسرے الفاظ میں بدل دیا جس کے بعینہٖ وہی معنے ہیں مَیں ایسا قابل آدمی نہیں چھوڑ سکتا۔ پس حکم کے الفاظ کو سننے والا بدل سکتا ہے اور اُس میں غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں فلاں حدیث باللفظ ہے اور فلاں حدیث بالمعنیٰ۔ محدّث کہتے ہیں کہ حدیث باللفظ

وہ ہوتی ہے جس میں بعینہٖ وہی الفاظ ہوں جو دوسرے سے سُنے ہوں۔ مثلاً ایک روایت کو شام والوں نے بھی بیان کیا ہو، بخارا والوں نے بھی بیان کیا ہو مصر والوں نے بھی بیان کیا ہو اور اُس کے الفاظ ایک ہی ہوں اور ہم یہ کہہ سکیں کہ یہ وہی الفاظ ہیں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنے گئے ہیں تو یہ روایت باللفظ ہوگی۔ ایسی حدیثیں عموماً چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں جن کا یاد رکھنا آسان ہوتا ہے۔ یا اُن میں وزن ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ آسانی سے یاد ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ایک حدیث ہے کَلِمَتَانِ خَفِیْفَتَانِ عَلَی اللِّسَانِ ثَقِیْلَتَانِ فِی الْمِیْزَانِ حَبِیْبَتَانِ اِلَی الرَّحْمٰنِ۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ۔ یعنی دو کلمے ایسے ہیں جن کا زبان سے ادا کرنا بہت آسان ہے مگر میزان میں وہ بہت بھاری ہیں اور خدائے رحمان کو بہت محبوب ہیں۔ وہ کلمے یہ ہیں سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ۔ اِس حدیث کا وزن ایسا ہے کہ دماغ پر بغیر کسی قسم کا بوجھ ڈالنے کے یاد ہو جاتی ہے پس مختلف راویوں سے جو روایت ایک ہی الفاظ میں پہنچی ہو اُسے روایت باللفظ کہتے ہیں اور روایت بالمعنیٰ وہ ہوتی ہے جس کو بیان کرتے وقت راوی نے اپنے الفاظ استعمال کئے ہوں۔ غرض موسیٰ علیہ السلام کو کتاب ملی جس کے معنے حکم کے ہوتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احکام دئے جن میں سے آپ کو کچھ احکام تو لفظاً لفظاً یاد رہ گئے اور باقی کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا اور وہ تورات میں درج ہو گئے مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کلام اللہ دیا گیا جس کے الفاظ اوّل سے آخر تک وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے ہیں۔ گویا سورۃ فاتحہ کی 'ب' سے لیکر سورۃ النّاس کی 'س' تک نہ کوئی لفظ ایسا ہے اور نہ کوئی زیر اور زبر جسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاس سے شامل کر دیا ہو۔ بلکہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے الفاظ ہیں۔ یہ محمد رسول اللہ صلے اللہ وسلم کی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کتنی بڑی فضیلت ہے کوئی عیسائی یا یہودی تورات کے متعلق قسم نہیں کھا سکتا کہ یہ وہی کتاب ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ کوئی عیسائی یا یہودی بھلا یہ قسم کھا کر کہہ تو دے کہ میرے بیوی بچوں کو خدا تعالیٰ تباہ کرے اور اگلے جہان میں بھی اُن پر لعنت ہو اگر تورات کے الفاظ وہی نہ ہوں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اُترے تھے۔ کوئی عیسائی یا یہودی ایسی قسم نہیں کھا سکتا۔ لیکن ہم قرآن کریم کے متعلق یہ قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں آج بھی اور آئندہ بھی۔ کہ اگر یہ وہی الفاظ نہ ہوں جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے تھے تو ہمارے بیوی بچوں کو خدا تعالیٰ تباہ کرے اور اگلے جہان میں بھی اُن پر لعنت ہو۔ یہ کتنی بڑی فضیلت ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حاصل ہوئی۔

(۴) علاوہ مذکورہ بالا معجزات و کرامات کے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف قرآن کریم اور بائبل میں منسوب کی گئی ہیں اور جن میں مقابلہ کر کے ہم نے بتایا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو جو علاوہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بہت زیادہ تھا ایک اور ذریعہ مقابلہ کا بھی ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سے ملتا ہے۔

سورۂ بقرہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک دعا کا ذکر آتا ہے جو انہوں نے بنو اسمٰعیل کے موعود نبی کی

نسبت کی ہے اُس کے الفاظ یہ ہیں :-

حضرت ابراہیمؑ کی آنحضرتؐ کے متعلق دعا

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ (بقرہ ع ۱۵)

اے ہمارے رب تُو ان لوگوں میں اپنا ایک رسول مبعوث فرما جو اِن پر تیری آیات کی تلاوت کرے۔ انہیں کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کا تزکیہ نفوس کرے تُو بڑا غالب اور حکمت والا خدا ہے۔ یہ دعا جو سورۃ بقرہ میں آئی ہے اس میں درحقیقت انبیاء کے فرائض اور اُن کے مخصوص کام کا ذکر ہے اور سورۃ کوثر میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے نہ صرف یہ کہ ابراہیمؑ کی یہ دعا پوری ہوئی بلکہ انتہائی کمال یا کوثر ان صفات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہُوا۔ اس سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف تلاوت آیات کی، نہ صرف تعلیم کتاب کی، نہ صرف تعلیم حکمت کی، نہ صرف تزکیہ قوم کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان چاروں صفات میں آپ کو کوثر عطا فرمایا ہے اور اس طرح تمام انبیاء سابقین پر آپکو فضیلت عطا فرمادی گئی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور کوثر کا تعلق

میرے نزدیک قرآن کریم کی بعض آیات دوسری آیات کے لئے بطور کنجی ہوتی ہیں جن سے سارا مضمون نکل آتا ہے۔ جس طرح تمام سورتوں کی ایک مشترک کنجی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے اسی طرح ہر سُورت میں ایک ایک آیت اُس سورۃ کے لئے بطور کنجی ہے جس سے تمام سورۃ کو حل کیا جا سکتا ہے۔ مَیں ابھی نوجوان ہی تھا کہ بعض دوستوں نے مجھ سے خواہش کی کہ مَیں اُنہیں قرآن کریم پڑھاؤں۔ ہم نے سورۃ بقرہ شروع کی۔ پڑھاتے پڑھاتے میرے دل میں ڈالا گیا کہ سورۃ بقرہ کی کنجی یہ آیت ہے کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ پھر مَیں نے اس آیت کے مضمون کو ساری سورۃ پر چسپاں کیا تو مجھے معلوم ہُوا کہ واقعہ میں ساری سورۃ اِسی آیت کے گرد چکر کھاتی ہے۔ اب مجھ پر اللہ تعالیٰ نے یہ کھولا ہے کہ سورۃ کوثر اس دعائے ابراہیمی کا جواب ہے جس کا سورۃ بقرہ میں ذکر آتا ہے اور اس سُورۃ میں اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ وہ وعدہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہم نے کیا تھا وہ نہ صرف پورا ہو گیا ہے بلکہ ہم نے ہر صفت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوثر عطا فرمایا ہے۔ دُعائے ابراہیمی یہ تھی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اے ہمارے رب ہم تجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ تُو مکہ والوں میں اپنا ایک نبی اور رسول مبعوث فرما جو انہی میں سے ہو غیر قوم میں سے نہ ہو۔ رَسُوْلًا کا لفظ بتاتا ہے کہ دعا آئندہ زمانہ کے متعلق تھی۔ کیونکہ جب یہ دعا کی گئی تھی اُس وقت دو رسول تو موجود تھے یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام دونوں نبی تھے۔ اُن کا اپنی موجودگی میں یہ دعا کرنا کہ اے خدا تُو ان میں سے ایک رسول مبعوث فرما تبھی درست ہو سکتا ہے جب یہ دعا آئندہ زمانہ کے متعلق ہو۔ ورنہ ایک چیز کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ اے اللہ تو ہمیں وہ چیز دے عجیب بات معلوم ہوتی ہے اور یا پھر یہ دعا کی جاتی کہ رُسُلًا مِّنْهُمْ تب بھی ہم کہہ سکتے تھے کہ پے درپے رسول آنے کی دعا ہے۔

مگر اس آیت میں رُسُلًا مِّنْهُمْ نہیں کہا رَسُوْلًا مِّنْهُمْ کہا ہے۔ جس سے آئندہ زمانہ میں کسی خاص رسول کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ چنانچہ اس جگہ رَسُوْلًا کی تنوین تعظیم کے لئے ہے پس رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ کے یہ معنے ہوں گے کہ اے ہمارے رب تو اسمٰعیل (علیہ السلام) کی نسل میں سے عظیم الشان رسول مبعوث فرما مِنْهُمْ جو انہی میں سے ہو۔ تیرے وعدے بنو اسحاق سے بھی ہیں مگر بنو اسمٰعیل کو بھی فراموش نہ کر دینا بلکہ انہی میں سے ایک عظیم الشان رسول بھیجو جس کے کام یہ ہوں کہ (۱) يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وہ اُن کو تیری آیات پڑھ کر سنائے (۲) وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ اور وہ ان کو ایک کامل کتاب سکھائے (۳) وَالْحِكْمَةَ اور احکام کی اغراض اور فلسفہ سکھائے (۴) وَيُزَكِّيْهِمْ اور اُن کے دلوں کو پاک کرے اور دنیوی ترقی کے راستے بتلائے اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ تُو بڑا غالب اور حکمتوں والا خدا ہے اور اس غلبہ اور حکمت کے ماتحت تجھ سے رسی التجا کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔

یہ دعا سورۂ بقرہ کے پندرھویں رکوع میں آتی ہے اِس کے بعد اِسی سُورت کے اٹھارھویں رکوع میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ
يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَ
يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔

یعنی ہم نے تمہارے اندر وہ رسول بھیج دیا ہے جس کی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی اور آگے وہی باتیں بیان کی ہیں جو دعائے ابراہیمی میں بیان کی گئی تھیں وہاں کہا تھا يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وہ اُن کو تیری آیات پڑھ پڑھ کر سنائے۔ یہاں فرمایا يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وہ تم کو ہماری آیات پڑھ پڑھ کر سناتا ہے وہاں فرمایا تھا يُزَكِّيْهِمْ وہ اُن کے دلوں کو پاک کرے۔ یہاں فرماتا ہے يُزَكِّيْكُمْ وہ تمہارا تزکیہ کرتا ہے۔ وہاں فرمایا تھا يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وہ اُن کو کتاب اور حکمت سکھائے یہاں فرماتا ہے يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وہ تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ غرض جو دعائیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا تعالےٰ سے مانگی تھیں، وہ سب کی سب یہاں بیان کر دی ہیں جس سے صاف طور پر اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا کی وہ خدا تعالےٰ نے سُن لی۔ گویا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ یہ ہُوا کہ وہ دعائے ابراہیمی کے پورا کرنیوالے ہیں اور دعا میں چار باتیں کہی گئی تھیں (۱) تلاوت آیات (۲) تعلیم کتاب (۳) تعلیم حکمت (۴) تزکیہ نفوس۔ گویا آپ کی بعثت کی غرض یہ چار عظیم الشان کام تھے۔ مگر ظاہر ہے کہ دنیا میں جو نبی بھی آئے گا وہ یہی چاروں کام کرے گا۔ ان کے علاوہ اُس کا کوئی کام ہی کیا ہو سکتا ہے۔ پس محض اتنی بات سے آپ کو کوثر کا ملنا ثابت نہیں ہو سکتا۔ آپ کو کوثر کا ملنا تب ثابت ہو سکتا ہے جب ہر کام میں آپ کو ایسا نمایاں مقام حاصل ہو کہ دوسرے انبیاء میں اس کی مثال تلاش کرنے سے بھی نہ مل سکتی ہو۔ اگر آپ نے لوگوں کو آیات پڑھ کر سنا دیں تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وعدہ پُورا ہو گیا۔ لیکن اگر آپ نے دوسرے انبیاء سے بڑھ کر آیات سُنائی ہیں تو بے شک یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپکو کوثر ملا۔ اِسی طرح اگر آپ نے کتاب سکھائی تو ابراہیمی دعا پوری ہو گئی لیکن اگر آپ نے ایسی کتاب سکھائی کہ دوسرے انبیاء میں

اس کی مثال نہیں ملتی۔ تو یہ بات اس بات کا ثبوت ہوگی کہ آپ کو کوثر ملا۔ پھر اگر آپ نے حکمت سکھائی تو حکمت سکھانے سے وعدۂ ابراہیمی تو پورا ہوگیا۔ لیکن اگر آپ نے حکمت سکھائی اور اتنی سکھائی کہ دوسرے انبیاء میں سے کسی نبی نے نہیں سکھائی تو یہ آپ کو کوثر ملا۔ پھر اگر آپ یُزَکِّیْھِمْ کے مطابق تزکیۂ نفوس کر دیتے تو وعدۂ ابراہیمی پورا ہو جاتا۔ لیکن اگر آپ ایسا تزکیہ کریں کہ اس کی دنیا میں کوئی مثال نہ ملے تو یہ ثبوت ہوگا اس بات کا کہ آپ کو کوثر ملا۔ پس کوثر کے یہ معنے ہوئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا کی تھی اور جو وعدہ ہم نے اُن سے کیا تھا وہ نہ صرف ہم نے پورا کر دیا ہے بلکہ اپنے پاس سے زائد بھی دیا ہے اور اس قدر دیا ہے کہ کسی اور نبی میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ غرض سورۂ بقرہ رکوع ۱۵ میں جس دعا کا ذکر کیا گیا تھا چونکہ اُس دعا کے مطابق رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مبعوث ہوئے تھے اس لئے یہاں سورۃ کوثر میں جہاں قرآن کریم اپنے اختتام پر پہنچ رہا ہے، بتایا کہ اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کیا وہ دعائیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھیں وہ ہم نے پوری کر دیں یا نہیں اور کیا وہ چیزیں جو دعامیں مانگی گئی تھیں، ہم نے تجھے وہ اتنی نہیں دیں کہ کسی اَور نبی کو اتنی نہیں ملیں۔

دعائے ابراہیمی چونکہ ایک اہم دعا ہے جس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بنیاد ہے اس لئے اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم کی مختلف آیات میں مختلف رنگوں میں اس دعا کے پورا ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔ سورۃ آل عمران رکوع ۱۷ میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝

اللہ تعالےٰ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا جبکہ اُس نے اُن کی قوم میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن کو اللہ تعالےٰ کی آیات پڑھ کر سُناتا ہے، اُن کے دلوں کو پاک کرتا ہے، قوم کو ترقی کے ذرائع بتلاتا ہے، کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ اِس سے پہلے نہایت خطرناک گمراہی میں مبتلا تھے اس جگہ پھر وہی چاروں چیزیں بیان کی گئی ہیں جن کا دعائے ابراہیمی میں ذکر آتا تھا۔ پھر سورۂ جمعہ رکوع ۱ میں فرماتا ہے۔

ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ۗ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝

وہ خدا ہی ہے جس نے اُس قوم میں اُنہی میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن کو اللہ تعالےٰ کی آیات پڑھکر سناتا ہے اور اُن کے دلوں کو پاک کرتا ہے اور انکو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ اس سے پہلے بڑی گمراہی میں مبتلا تھے۔

اِسی طرح قرآن کریم میں بعض اور مقامات پر بھی اِس دعا کے ٹکڑوں کو بیان کیا گیا ہے سورۂ نساء رکوع ۸ میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ۚ فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰھِیْمَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاٰتَیْنٰھُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا ۝

فرمایا، کیا یہود اس بات پر حسد کرتے ہیں کہ مکہ والوں کو بھی ہم نے اپنے فضل سے کچھ عطا فرمایا ہے۔ بیشک بنو اسحاق بھی ابراہیم کی اولاد ہیں اور

اُن پر بھی ہم نے بڑے بڑے فضل کئے ہیں کیونکہ مکہ والے بھی تو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں کیا خدا تعالےٰ اُن پر فضل نازل نہ کرتا۔ یہود کو تو اس بات پر خوش ہونا چاہیئے تھا کہ اللہ تعالےٰ نے اُن کے سارے خاندان کو عزت بخشی ہے۔ مگر یہ لوگ بجائے خوش ہونیکے مکہ والوں پر حسد کرتے ہیں کہ اُن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے کیوں نوازا ہے۔ اُنہیں سوچنا چاہیئے تھا کہ ہم نے آلِ ابراہیم کو کیا کیا دیا تھا اور یہی اس آل کا ہی ایک ٹکڑہ ہیں جس طرح اُنہیں حکومت ملی تھی انہیں بھی ملنی چاہیئے تھی اور اب جبکہ ہم انکو بھی اپنے فضل سے حصہ دینے لگے ہیں انکو غصہ کیوں آرہا ہے۔

اِس بات کا ثبوت کہ اِس آیت میں بنو اسمٰعیل کا ہی ذکر ہے پہلی آیات سے ملتا ہے۔ اللہ تعالےٰ اس سے پہلے اِسی رکوع میں فرماتا ہے

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝

تُو دیکھ تو سہی اُن لوگوں کو جنہیں ہم نے کتاب میں سے ایک حصہ دیا ہے وہ لغو باتوں اور شیطانی تعلیموں کو مانتے ہیں اور وہ کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ مومنوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں حالانکہ وہ مشرک ہیں اور مومن موحد۔ اِس کے بعد فرماتا ہے اگر بنو اسمٰعیل کو خدا تعالےٰ کے فضل سے کچھ مل گیا تھا تو انہیں تو خوش ہونا چاہیئے تھا کہ اُن کے خاندان کی عزت ہوگئی نہ کہ اُن کے دلوں میں غصہ پیدا ہو جاتا۔

پھر سورۃ نساء رکوع ۱۷ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝

اللہ تعالےٰ نے تجھ پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور تجھے وہ کچھ سکھایا ہے جو اس سے پہلے تُو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر اللہ تعالےٰ کا بہت بڑا فضل ہے اِس میں بھی کتاب اور حکمت کے نزول کا ذکر کیا گیا ہے

پھر سورۃ احزاب ع۴ میں اہل بیت کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۝

اے اہل بیت جو کچھ تمہارے گھروں میں اللہ تعالےٰ کی آیات اور حکمت میں سے پڑھایا جاتا ہے اُس کو یاد رکھو۔ یقیناً اللہ تعالےٰ بڑا مہربان اور خبر رکھنے والا ہے

سورۃ لقمان ع۱ میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝

یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں۔

سورۃ آل عمران ع۶ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ۝

ہم تجھے اپنی آیات اور حکمت والا ذکر پڑھ کر سناتے ہیں۔

پھر سورۃ یونس ع۱ میں فرماتا ہے

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝

یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

اسی طرح سورۃ یٰس ع۱ میں آتا ہے

وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ قسم ہے قرآن کی جو حکمت والا ہے

آنحضرت صلعم کی بعثت کی چار اغراض اور آنحضرت کیلئے اغراض کو پورا ہونا

اُوپر کی آیتوں سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں بار بار یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ کی بعثت کی چار غرضیں تھیں (۱) تلاوت آیات (۲) تعلیم کتاب (۳) تعلیم حکمت اور (۴) تزکیۂ قوم۔ اور پھر متواتر قرآنی آیات نے بتایا ہے کہ یہ ... آپ نے پورا کر دیا جیساکہ

ہستی باری تعالیٰ کے ثبوت

میں اُوپر بیان کر چکا ہوں تمام نبیوں کا اپنے اپنے رنگ میں یہی کام ہوتا ہے۔ اِس جگہ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ کیا آپ کو ان چاروں صفات میں کوثر بھی عطا ہُوا ہے یا نہیں۔

آیاتک میں خدا تعالیٰ کیطرف راہنمائی کرنے والے عقلی امور اور معجزات کی طرف اشارہ

یَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ میں اٰيٰتِكَ سے دو طرف اشارہ ہو سکتا ہے (۱) اُن عقلی امور کیطرف جو خدا تعالےٰ کی طرف یا اُس کی صفات کی طرف راہنمائی کرنے والے ہیں (۲) اُن معجزات کی طرف جو خدا تعالیٰ کی طرف سے اپنے پاک بندوں کی شان نمایاں کرنے کے لئے ظاہر ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ دونوں چیزیں اِس آیت میں شامل ہیں یعنی وہ دلائل عقلیہ جو خدا تعالیٰ کی معرفت عطا کرتے ہیں وہ بھی اسمیں شامل ہیں اور وہ معجزات و نشانات جو خدا تعالیٰ کیطرف سے ظاہر ہوتے ہیں وہ بھی اسمیں شامل ہیں۔

دین کی معرفت کے لئے مندرجہ ذیل اہم امور کا علم ضروری ہے:۔

(۱) ثبوت ہستی باری تعالیٰ۔ جب مذہب کی بنیاد ہی اللہ تعالےٰ کی ذات پر ہے تو ہر مذہب کا فرض ہے کہ وہ ایسے ثبوت دے جن سے اللہ تعالےٰ کی ذات پر انسان کا یقین بڑھے یعنی یہ بتایا جائے کہ کیا خدا موجود ہے؟ اور اگر ہے تو اُس کے وجود کے دلائل کیا ہیں؟

دین کی معرفت کے لئے ضروری امور

(۲) اُس کی صفات کی صحیح تشریح اور اُن کا باہمی تعاون۔ اگر صرف یہ کہدیا جائے کہ خدا تعالےٰ کے اندر مختلف صفات پائی جاتی ہیں تو اس سے انسان کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ کہ خدا تعالےٰ کیا کیا صفات رکھتا ہے اور اُن کا ثبوت کیا ہے یہ اَور چیز ہے اور مذہب کا فرض ہے کہ وہ اس پہلو پر بھی روشنی ڈالے۔

(۳) ملائکہ (۴) انبیاء (۵) قضاء و قدر۔ (۶) بعث بعد الموت۔

اگر صفات الٰہیہ کو تشریح کے طور پر لیں تو یہ پانچ چیزیں بن جاتی ہیں اور اگر علیحدہ لیا جائے تو یہ چھ باتیں بن جاتی ہیں۔ بہرحال بڑی بڑی باتیں یہی ہیں۔ ان امور کے متعلق جو تعلیم اسلام میں پائی جاتی ہے وہ کسی اور مذہب میں نہیں پائی جاتی اور یہ اسلام کو دوسرے مذاہب پر ایک نمایاں فوقیت حاصل ہے۔

سب سے پہلی اور بڑی چیز ہستی باری تعالیٰ ہے اِس کے متعلق میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ دوسری کتابوں میں خدا تعالےٰ کا ذکر نہیں۔ مذہب کی تو بنیاد ہی خدا تعالےٰ پر ہے جب خدا تعالےٰ کا ذکر ہی کسی مذہب میں نہ ہو تو وہ مذہب قائم نہیں رہ سکتا۔ بائبل۔ ژند اوستا۔ اور وید وغیرہ کتابوں کو اگر ہم الہامی کتب تسلیم کرتے ہیں تو یہ لازمی بات ہے کہ اُن میں خدا تعالیٰ کا ذکر ہو۔ پس یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ دوسری مذہبی کتب میں خدا تعالےٰ کا ذکر نہیں۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ آیا انہوں نے خدا تعالیٰ کی ہستی کے دلائل بھی پیش کئے ہیں یا نہیں۔ ورنہ محض خدا تعالےٰ کا نام لے دینے سے لوگوں کو یہ یقین نہیں آ سکتا کہ خدا تعالیٰ فی الواقعہ موجود بھی ہے اور اس میں کئی قسم کی صفات بھی پائی جاتی ہیں اس کے لئے مختلف دلائل کی ضرورت ہوتی ہے جن کا مہیا کرنا خود الہامی کتاب کے ذمہ ہوتا ہے۔ مگر ہستی باری تعالےٰ کے ثبوت سوائے قرآن کریم کے اَور کسی الہامی کتاب نے پیش نہیں کئے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی ہندو سے پوچھو تو وہ بھی خدا تعالےٰ کے وجود کی دلیلیں دیگا۔ عیسائی سے پوچھو تو وہ بھی خدا تعالےٰ کے وجود کا کچھ نہ کچھ ثبوت دیگا مگر سوال یہ ہے کہ وہ دلیلیں آیا اُن کی الہامی کتب کی ہیں؟ وہ صاف کہہ دیں گے کہ یہ دلائل ہماری کتاب نے تو نہیں دئے ہم خود پیش کر رہے ہیں۔ گویا اُن کا

اپنے پاس سے اِن امور کے دلائل دینا ثابت کرتا ہے کہ اُن کے پیرووں نے خدا تعالےٰ کو کوثر دیا ہے نہ یہ کہ خدا تعالےٰ نے اُن کو کوثر دیا ہے۔ لیکن قرآن کریم جب بھی کوئی بات پیش کرتا ہے ساتھ ہی اُسکے دلائل بھی دیتا ہے اور یہ ایک بہت بڑا فرق ہے جو قرآن کریم اور دوسری کتب میں ہے۔ قرآن کریم صرف خدا تعالےٰ کے وجود کو ہی پیش نہیں کرتا بلکہ بنی نوع انسان کو اُسکی ہستی کے دلائل بھی دیتا ہے اور ایسے ثبوت پیش کرتا ہے جن کا انکار کوئی سلیم الفطرت انسان نہیں کر سکتا لیکن دوسری کتب میں ہستی باری تعالیٰ پر کوئی دلیل نہیں۔

اسی طرح اللہ تعالےٰ کی صفات ہیں۔ صرف یہ کہہ دینا کہ ہمارا رب رحیم ہے۔ دیالو ہے۔ کرپالو ہے خدا تعالےٰ کی صفات کا حقیقی نقشہ نہیں کہلا سکتا۔ یہ تو محض دنیوی خیالات کا بھی نتیجہ ہو سکتا ہے اگر سُن لیا کہ لوگ سخی کو اچھا سمجھتے ہیں تو کہہ دیا کہ خدا تعالیٰ دیالو ہے۔ اگر سُن لیا کہ لوگ حسنِ سلوک کو اچھا جانتے ہیں تو کہہ دیا خدا تعالےٰ کرپالو ہے۔ اصل چیز تو یہ ہے کہ صفاتِ الٰہیہ کی صحیح تشریح کی جائے اور اُن کا باہمی تعلق واضح کیا جائے۔ مثلاً تورات میں خدا تعالیٰ یہ تو کہتا ہے کہ میں سزا دوں گا مگر وہ کیوں سزا دیتا ہے اِس کے متعلق تورات خاموش ہے اور پھر اگر وہ سزا دیتا ہے تو رحم کرنے والا کیسے ہوا؟ اور اگر رحم کرتا ہے تو پھر سزا دینے والا کیسے ہوا؟ اِن دونوں صفات کا باہمی ربط کیا ہے؟ اس کے متعلق وہ بالکل خاموش ہے۔ یہ صرف قرآن کریم ہی ہے جس نے ہمیں تفصیل کے ساتھ صفاتِ الٰہیہ کا علم دیا ہے اور تفصیل کے ساتھ خدا تعالےٰ کی ہستی کے دلائل دئے ہیں۔ میں دوسرے مذہب والوں کو چیلنج دیتا ہوں کہ وہ خدا تعالےٰ کے وجود کی کوئی ایک دلیل ہی اپنی کتاب سے نکال دیں مگر وہ ایسا کبھی نہیں کر سکیں گے اور اگر اُن کے ماننے والے اپنے پاس سے خدا تعالےٰ کے وجود کی دلیلیں دیتے ہیں خود کتاب کوئی دلیل نہیں دیتی تو یہ بندوں کا خدا تعالےٰ پر احسان ہوا نہ کہ خدا تعالےٰ کا بندوں پر احسان۔

۲ ملائکۃ اللہ

(۲) ملائکہ کو لو تو دوسری کتابوں میں ملائکہ کا ذکر بے شک آتا ہے مگر یہ کہ اُن کا کام کیا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرشتے کیوں بناتے ہیں۔ اُن کا اور خدا تعالےٰ کا اور اُن کا اور بندوں کا تعلق کیسا ہے؟ اِن سوالات پر اُن کتب نے کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ لیکن قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے جو صرف ملائکہ پر ایمان لانے کی ہی ہدایت نہیں دیتی۔ بلکہ ساتھ ہی یہ بھی بتاتی ہے کہ ملائکہ کیوں بنائے گئے ہیں اور اُن کی ضرورت کیا ہے۔ آخر خدا تعالےٰ خود بھی کام کر سکتا تھا، فرشتوں کے بنانے کی ضرورت اُسے کیوں پیش آئی۔ اسی طرح وہ اُن کے کام بتاتا ہے۔ اُن کے وجود کے دلائل دیتا ہے۔ اُن کا اور خدا تعالےٰ کا تعلق واضح کرتا ہے، اُن کا اور بندوں کا تعلق بیان کرتا ہے۔ غرض ملائکۃ اللہ کا مسئلہ بھی صرف قرآن کریم نے ہی حل کیا ہے کسی اور کتاب نے اِسے چھوا تک نہیں۔

۳ نبوت

(۳) تیسری چیز نبوت ہے۔ یوں تو نبوت کو ساری قومیں مانتی ہیں۔ ہندو بھی کہتے ہیں اوتار آئے، عراقی بھی کہتے ہیں نبی آئے، یہودیوں اور عیسائیوں کا بھی یہ دعویٰ ہے کہ نبی آئے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اُدھر تو کہتے ہیں نبی آئے اِدھر نبوت کے متعلق وہ کچھ بھی روشنی نہیں ڈالتے۔ صرف کتاب میں نبی اور اوتار کے الفاظ پائے جانے سے تو کسی کی تسلی نہیں ہو سکتی۔ جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ وہ کیا ہیں۔ اُن کا کیا کام ہوتا ہے، اُنکی تعریف کیا ہے

اُن کے آنے کی اغراض کیا ہوتی ہیں، انکی صداقت کی کیا علامات ہوتی ہیں، کس حد تک ہمیں انکی اطاعت کرنی چاہیئے، اُن کا کیا مقام ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اور اُن کے درمیان کیا تعلق ہوتا ہے، اُن کے اور بندوں کے درمیان کیا تعلق ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں کا جب تک تفصیلاً پتہ نہ لگے کوئی شخص تسلی کس طرح پا سکتا ہے۔ مسئلہ نبوت کے متعلق میں نے ایک دفعہ یہودیوں اور مسیحیوں کو رجسٹری خطوط لکھ کر سوال کئے مگر کسی ایک شخص نے بھی نبوت کی تعریف اپنی کتاب سے ثابت نہ کی۔ بلکہ ایک بشپ نے جو لاہور کا رہنے والا تھا تسلیم کیا کہ ہماری کتب اس بارہ میں بالکل خاموش ہیں۔ یہ قرآن کریم کی دوسری کتب پر کتنی بڑی فضیلت ہے۔ قرآن کریم دوسری کتابوں کے مقابلہ میں بہت چھوٹی سی کتاب ہے مگر اس میں تمام ضروری مسائل کا ذکر ہے۔ اور باتوں کو جانے دو اگر نبی کے نام پر ہی غور کیا جائے تو انبیاء کا کام بآسانی سمجھا سکتا ہے۔ عربی میں رسول اور نبی دو نام ہیں اور ان ناموں میں ہی اُن کا کام بتا دیا گیا ہے۔ رسول کے معنے ہوتے ہیں۔ بھیجا ہوا۔ اور نبی کے معنے ہوتے ہیں بڑی خبر دینے والا۔ مسلمانوں نے بدقسمتی سے یہ بحث شروع کر دی ہے کہ رسول اور نبی الگ الگ ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ اگر ان لفظوں پر ہی غور کر لیتے تو اس بحث میں نہ پڑتے۔ کیا کوئی شخص یہ مان سکتا ہے کہ جو خبر دیتا ہے اُسے خدا تعالیٰ نے نہیں بھیجا اگر اُسے خدا تعالیٰ نے نہیں بھیجا تو وہ خبر کیا دے سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی خدا تعالیٰ کی طرف سے بھیجا گیا ہے تو کیا وہ منہ بند کر کے بیٹھ جائیگا؟ لازماً وہ کچھ خبریں بھی دیگا۔ درحقیقت رسول اور نبی یہ دو نام اُس کی دو الگ الگ حیثیتوں کی وجہ سے رکھے گئے ہیں

قرآن کریم کا ہستی باری تعالیٰ ملائکہ۔ نبوت وقضاء وقدر کے متعلق بیان کرنا اور اس کے بیان سے دوسری الہامی کتب پر فضیلت

جب اُس کا مُنہ خدا تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے تو وہ رسول کہلاتا ہے اور جب اُس کا مُنہ لوگوں کی طرف ہوتا ہے تو وہ نبی کہلاتا ہے۔ کیا چٹھی رساں ایسا کر سکتے ہیں کہ ڈاک لے کر وہیں بیٹھ جائیں اور کہہ دیں کہ ڈاک ہم نے لینی تھی وہ لے لی ہے۔ کیا افسر انہیں یہ نہیں کہینگے کہ تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ ڈاک تو تمہیں لوگوں کو پہنچانے کیلئے دی گئی ہے نہ کہ تھیلہ میں بند کرنے کے لئے۔ اسی طرح جو خدا تعالیٰ کی طرف سے رسول ہے کیا وہ وہیں بیٹھ جائیگا یا لوگوں کو خدا تعالیٰ کا پیغام بھی پہنچائے گا اور اگر لوگوں کو وہ خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچائے گا تو وہ نبی ہو جائیگا اور اگر وہ خدا تعالیٰ کا پیغام نہیں سناتا تو پھر نبی کیسا وہ تو جھوٹا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی کہتا ہے کہ میں نبی ہوں لیکن ساتھ ہی وہ یہ کہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول نہیں ہوں تو وہ جھوٹا ہے اور اگر سچا ہے تو وہ ضرور اللہ تعالیٰ کا رسول ہے۔ غرض رسول اور نبی الگ الگ وجود نہیں ہوتے بلکہ دو حیثیتوں کی وجہ سے اُن کے یہ دو الگ الگ نام ہوتے ہیں بہرحال قرآن کریم میں تمام تفصیلات اس طرح بیان کی گئی ہیں کہ انسان کی روح مطمئن ہو جاتی ہے۔ اُس نے نہ صرف نبی کی تعریف بیان کی ہے بلکہ تفصیلی طور پر انکی آمد کی غرض، اُن کے فرائض، اُن کی صداقت کی علامات اُن کے اور خدا تعالیٰ کے تعلقات کی تفصیل، اُن کے اور بنی نوع انسان کے تعلقات کی تفصیل، انکی خصوصیات سب بیان کی ہیں اور سیر حاصل طور پر بیان کی ہیں۔

(۴) قضاء و قدر کے متعلق بھی قرآن کریم کے سوا باقی سب کتابیں خاموش ہیں۔ اگر کسی غیر مذہب والے سے پوچھا جائے کہ قضاء و قدر کے کیا معنے ہیں تو وہ اس کے متعلق کوئی بھی روشنی اپنی الہامی کتاب سے

پیش نہیں کر سکتا - حالانکہ یہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے اور اس کا رُوحانیت کے ساتھ گہرا تعلق ہے - زیادہ سے زیادہ لوگ یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہمارا کچھ اختیار نہیں جس طرح خدا تعالیٰ چاہتا ہے ہو جاتا ہے اور یہی قضاء و قدر کے معنے ہیں - حالانکہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہم نے اپنے کاموں میں کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ یہ کام ہم سے کون کروا رہا ہے اور جب ہم محسوس ہی نہیں کرتے تو ہم کس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے کاموں میں خدا تعالےٰ کا دخل ہے اور اگر اس کا دخل ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا ثبوت کیا ہے اور پھر یہ کہ کیا سب کاموں میں خدا تعالےٰ کا دخل ہے یا بعض کاموں میں؟ اگر کسی کام میں خدا تعالےٰ کا دخل ہے اور کسی کام میں نہیں تو ہمیں کس طرح پتہ لگ سکتا ہے کہ فلاں کام میں خدا تعالیٰ کا دخل ہے اور فلاں میں نہیں؟ اگر ہم کہیں گے کہ سب کاموں میں خدا تعالےٰ کا دخل ہے تو چوری ہم کر رہے ہونگے اور اطمینان سے کہہ دیں گے کہ خدا تعالےٰ ہم سے چوری کروا رہا ہے - فریب ہم کر رہے ہونگے اور کہہ دیں گے کہ خدا تعالےٰ ہم سے فریب کروا رہا ہے اور اگر ہم کہتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کا کسی کام میں بھی دخل نہیں تو ہماری عبادتیں اور دعائیں لغو ہو جاتی ہیں - اب صرف تیسری صورت ہی رہ جاتی ہے کہ خدا تعالےٰ بعض کاموں میں دخل دیتا ہے اور بعض کاموں میں نہیں - لیکن اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر مذہب کو بتانا چاہیئے کہ وہ کون سے کاموں میں دخل دیتا ہے اور کون سے کاموں میں دخل نہیں دیتا - ورنہ معاملہ مشتبہ ہو جائے گا اور یہ پتہ نہیں لگ سکیگا کہ کس کام میں بندہ آزاد ہے اور کس کام میں وہ خدا تعالےٰ کی تقدیر کے ماتحت ہے -

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس ایک دفعہ ایک شخص آیا اور اُس نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پرندے پیدا کیا کرتے تھے - حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُس کو سمجھایا اور بتایا کہ یہ عقیدہ قرآن کریم کے خلاف ہے - وہ نہ مانا اور اپنی بات پر اصرار کرتا چلا گیا - آخر تنگ آ کر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا کہ اچھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر پرندے پیدا کیا کرتے تھے تو اُن کے پیدا کئے ہوئے پرندے کہاں ہیں اُس شخص نے جواب دیا کہ وہ تو چھتے ہی رَل مِل گئے تھے (یعنی خدا تعالےٰ کے پرندوں سے مِل جُل گئے ہیں) ویسی ہی بات یہاں ہو جاتی ہے - اگر ہمیں پتہ نہ ہو کہ خدا تعالےٰ کا دخل انسانی کاموں میں کس حد تک ہے تو انسانی اعمال کی حقیقت مشتبہ ہو جاتی ہے اس لئے لازماً مذہب کو بتانا چاہیئے کہ وہ کون سے کام ہیں جنہیں خدا تعالیٰ دخل دیتا ہے اور وہ کون سے کام ہیں جن میں خدا تعالیٰ دخل نہیں دیتا مگر یہ بات صرف قرآن کریم ہی بتاتا ہے باقی سب کتب اس بارہ میں خاموش ہیں کہ قضاء و قدر کے معنے کیا ہیں، قضاء و قدر اور تدبیر کا کیا تعلق ہے، قضاء و قدر کی غرض کیا ہے، قضاء و قدر سے کیوں جبر نہیں نکلتا اور کس طرح اس کے باوجود انسان آزاد ہے اور جہاں آزاد نہیں وہاں اُسے سزا نہیں ملتی - قضاء و قدر کا دائرہ کیا ہے - اِن تمام امور کے بارہ میں صرف قرآن کریم میں روشنی ڈالی گئی ہے باقی سب کتب خاموش ہیں اگر کسی غیر مذہب والے کا دعویٰ ہو کہ قضاء و قدر کے متعلق صحیح تعلیم اس کی الہامی کتاب میں موجود ہے تو ہم اُسے چیلنج کرتے ہیں کہ

وہ قرآن کریم کے مقابلہ میں اپنی کتاب سے اس مسئلہ
کو واضح کرے۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ کوئی دوسرا مذہب
اپنی کتاب سے یہ مسئلہ نہیں نکال سکتا۔ یہ صرف
قرآن کریم کی ہی خوبی ہے جو اُسے تمام الہامی کتب
پر فضیلت دیتی ہے۔

بَعثُ بَعدَ المَوت

(۵) بعث بعد الموت کو لو تو اس بارہ میں بھی
باقی کتابیں یا تو خاموش ہیں جیسے بائبل اور وید
اور یا پھر اُن میں صرف بعض تفصیلات کا ذکر ہے
اُس کے ثبوت نہیں دیئے، اُس کی حکمتیں بیان نہیں
کیں، نہ اُخروی زندگی کے مقاصد بیان کئے ہیں نہ
سزا و جزاء کی غرض اور اُس کی حکمتیں بیان کی ہیں۔
ژند اوستا نے ایک حد تک اس مسئلہ کو بیان کیا
ہے۔ لیکن بائبل اور وید دونوں اُخروی زندگی کے متعلق
بالکل خاموش ہیں۔ ژند اوستا کو پڑھیں تو اس میں
دوزخ اور جنت کا ذکر پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے
جیسے قرآن کریم اور ژند اوستا میں ایک گہرا رشتہ
ہے۔ لیکن دنیوی زندگی کو لیں تو اُس کا قرآن کریم کے
ساتھ کوئی جوڑ ہی معلوم نہیں ہوتا۔ دنیوی زندگی کے متعلق
بائبل قرآن کریم سے مشابہت رکھتی ہے اور اُخروی زندگی
کے متعلق ژند اوستا قرآن کریم سے مشابہت رکھتی ہے
بہرحال دوسری کتابیں یہ نہیں بتاتیں کہ اُخروی زندگی
اور دنیوی زندگی میں فرق کیا ہے۔ جزاء وسزا کی کیا
غرض اور حکمت ہے یا جزاء وسزا کن اصولوں پر مبنی
ہے۔ لیکن قرآن کریم نے بعث بعد الموت کے ثبوت
بھی دیئے ہیں۔ اس کی حکمتیں بھی بیان کی ہیں اُخروی
زندگی کے مقاصد بھی بیان کئے ہیں۔ جزاء وسزا کی
اغراض بھی بیان کی ہیں۔ اُن کی حکمتیں بھی بیان کی
ہیں۔ جنت و دوزخ کی صحیح تفصیلات بھی بیان کی
ہیں۔ غرض آیات الٰہیہ کے بیان کرنے میں
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جو کوثر ملا ہے
وہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اُسے معین طور پر
بتایا جا سکتا ہے اور سب مذاہب پر اسلام کی
اور سب نبیوں پر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی
فضیلت ثابت کی جا سکتی ہے۔

مَیں اُوپر بتا چکا ہوں کہ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ
میں اُن دلائل عقلیہ کی طرف بھی اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ
کی شناخت اور دین کے امور مہمہ کے سمجھانے کے
لئے ضروری ہیں اور ان معجزات و نشانات کی طرف
بھی اشارہ ہے جو عقلی دلائل کو مشاہدہ اور یقین کامل
کا رنگ بخشتے ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں قرآن کریم نے
دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے امور دینیہ مہمہ کے ثبوت میں
ایک سیر کن بحث کی ہے وہاں اُس نے ان مسائل
کے ثبوت کے لئے وہ معجزات و نشانات بھی پیش
کئے ہیں جن کو دیکھنے کے بعد اور جن پر غور کرنے
کے بعد انسان کا علم ذہنی، علم عینی اور یقینی بن جاتا
ہے اور اس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زبردست
فضیلت انبیاء سابقین پر ثابت کردی ہے۔

آنحضرتؐ کا سب سے بڑا معجزہ آپ کا خاتم النبیین ہونا ہے

سب سے بڑا معجزہ جو اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ
نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا ہے
وہ آپ کا خاتم النبیین ہونا ہے یعنی تمام کمالات نبوت
آپ پر ختم کر دیئے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ ختم نبوت
محض ایک دعویٰ نہیں جیسا کہ مسلمان عوام خیال کرتے
ہیں بلکہ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے جسے نشان کے
طور پر ہر زمانہ کے لوگ دیکھ اور پرکھ سکتے تھے۔ ظاہر
ہے کہ جو معنے عوام میں خاتم النبیین کے مشہور ہیں
وہ تو ایسے معنے ہیں کہ شاید قیامت کے دن کسی پر
حجت ہوں تو ہوں اس سے پہلے کسی غیر مسلم سے

وہ دعویٰ نہیں منوایا جا سکتا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اگر یہود و نصاریٰ سے یہ کہا جاتا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ان معنوں میں ہیں کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ آسکے گا تو اس کی کیا دلیل اُن کے سامنے پیش کی جا سکتی تھی اور وہ اُسے کب مان سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ فضیلت تو وہ ہوتی ہے جسے ثابت کیا جا سکے۔ جسے ثابت نہ کیا جا سکے وہ فضیلت کیا ہوتی۔ ختم نبوت کا دعوےٰ مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شانِ نبوت میں سے سب سے بڑا دعویٰ ہے۔ اگر سب سے بڑا دعویٰ ثابت نہ ہوسکے تو بڑائی کس طرح ثابت ہوگی۔ صحابہؓ کا نصاریٰ یا یہود سے یہ کہنا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو تمہارے نبیوں پر یہ فضیلت ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ آئیگا کس قدر مضحکہ خیز ہو جاتا تھا۔ وہ ہنس کر کہتے کہ (۱) تم تو خود ایک مسیح کی آمد کے معتقد ہو (۲) کہ آمدی دکے پیرفدی ابھی آپ کے رسول کو آئے ہوئے کتنی مدت ہوئی کہ کہتے ہو اُن کے بعد نبی نہ آئے گا۔ گزشتہ انبیاء کے بعد بھی تو فوراً نبی نہ آیا کرتے تھے بالعموم ایک عرصہ کے بعد نبی آتے تھے تمہارے نبی مسیح علیہ السلام کے چھ سو سال بعد آئے ہیں چھ سو سال تو انتظار کرو۔ اس کا جواب مسلمان کیا دے سکتے تھے گویا ختم نبوت کے اس مفہوم کے منوانے کیلئے چھ سو سال کا انتظار ضروری تھا چھ سو سال تک آپ کا ختم نبوت کا دعویٰ بے دلیل رہتا تھا۔ مگر چھ سو سال کے بعد بھی تو مسلمان کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ یہ دلیل نصاریٰ و یہود کی پھر بھی موجود تھی کہ تم اُس آنے والے نبی کے حق میں کیا کہتے ہو جسے تم مسیح کا نام دیتے ہو اور پھر وہ اس وقت کہہ سکتے تھے کہ موسیٰؑ کے مرنے کے چند سال بعد یوشعؑ نبی ظاہر ہوا لیکن یوسفؑ نبی کے اڑھائی تین سو سال بعد موسیٰؑ نبی ظاہر ہوئے۔ حتیٰ کہ بنی اسرائیل نے کہنا شروع کر دیا کہ اب یوسفؑ کے بعد کوئی نبی پیدا نہ ہوگا۔ پس معلوم ہؤا کہ کبھی ایک نبی کے بعد جلد دوسرا نبی آجاتا ہے اور کبھی لمبے وقفہ کے بعد۔ خود تمہارے نبی تمہارے اپنے دعویٰ کے مطابق حضرت مسیح کے چھ سو سال بعد آئے پس صدیوں کا خالی گذر جانا تو کوئی ثبوت نہیں کہ فلاں مُدعی کے بعد کوئی نبی نہ آئے گا۔ غرض گو یہ درست ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی صاحب شریعت نبی نہ آئیگا۔ مگر دشمن پر ہم ان معنوں میں نبی کریمؐ کی فضیلت کو ثابت نہیں کر سکتے اور قیامت تک ختم نبوت کا یہ مفہوم ایک دشمن اسلام پر بطور حجت کے ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ آپ آخری نبی ہیں پس ختم نبوت کے اگر یہ معنے لئے جائیں تو ختم نبوت کی فضیلت جو آنحضرتؐ کی سب سے بڑی فضیلت ہے پردہ خفا میں ہی قیامت تک چلی جائیگی اور قیامت کو اس کا ثابت ہونا کسی کے لئے بھی فائدہ بخش نہ ہوگا ہاں اگر ختم نبوت کے یہ معنی کئے جائیں کہ پہلے نبی ایک ایک قوم کے نبیوں کی تعلیم کو ختم کرتے تھے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے سب دنیا کے اور سب قوموں کے نبیوں کی نبوت کو ختم کیا ہے تو یہ دعویٰ آپ کا پہلے دن سے ہی ثابت کیا جا سکتا تھا اور اب تک اور قیامت تک ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اس دعویٰ میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کیونکہ سچے نبی کی علامت سابق کتب اور قرآن کریم اور عقل سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُس کا خدا تعالےٰ سے تعلق ہو اور اُس کے تعلق کی نسبت سے اس کے پیرووں کا بھی خدا تعالیٰ سے تعلق ہو تا منکروں پر حجت قطعیہ سے ثابت کیا جا سکے کہ اُس کا منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ سچا اور حق پر مبنی ہے۔ اب اس دلیل کو اگر صحیح سمجھا جائے اور

اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا تو ایک مسلمان سب مذاہب کے لوگوں کو پہلے دن سے چیلنج دے سکتا تھا کہ ہمارے نبی کے خاتم النبیین ہونے کا یہ ثبوت ہے کہ اُس نے سب نبیوں کی نبوت کو ختم کر دیا ہے اب کسی نبی کی اُمت میں کوئی شخص خدا رسیدہ نہیں ہو سکتا صرف آپ ہی کے اتباع کا براہ راست تعلق خدا تعالیٰ سے ہے۔ سیدھی بات ہے کہ یا تو اسلام کے منکر اس کا یہ جواب دیتے کہ خدا تعالیٰ سے براہِ راست تعلق ہو ہی نہیں سکتا اور یا یہ جواب دیتے کہ ہمارے اندر بھی ایسے لوگ موجود ہیں کہ جن کا خدا تعالیٰ سے براہِ راست تعلق ہے۔ دونوں صورتوں میں فیصلہ آسان ہو جاتا ہے۔ پہلے جواب کی صورت میں مسلمان آسانی سے اپنے برگزیدہ وجودوں کے نشانات پیش کر کے ثابت کر سکتے تھے کہ خدا تعالےٰ کا ہم سے براہ راست تعلق ہے اور چونکہ دوسرے مذاہب کے لوگ اس راستہ کو بند قرار دے چکے ہوتے لازماً اس ثبوت کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو جاتا کہ خدا تعالےٰ کا براہ راست تعلق انبیاء کی جماعتوں سے ضرور ہوتا ہے مگر اس وقت وہ تعلق صرف اُمتِ محمدیہ سے ہے اور کسی اُمت کے افراد سے نہیں پس معلوم ہُوا کہ اُن نبیوں کی نبوت ختم ہو چکی اور صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت جاری ہے اور آپ کا ختم نبوت کا دعویٰ ثابت ہو جاتا اور دوسرے جواب کی صورت میں مسلمان ان لوگوں سے مطالبہ کرتے کہ اپنے موجودہ بزرگوں کے الہامات اور وحی کو پیش کرو تاکہ اُن کے صدق و کذب کو پرکھا جا سکے اور چونکہ فی الواقعہ دعویٰ محمدیت کے بعد باقی تمام اقوام سے براہِ راست تعلق (سوائے ایک عارضی تعلق کے) خدا تعالےٰ کا قطع ہو چکا ہے اس لئے لازماً وہ لوگ اس مطالبہ کو پورا نہ کر سکتے تھے اور اس طرح بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ختمِ نبوت کا دعویٰ ثابت ہو جاتا تھا اور یہ معنے جو مَیں نے کئے ہیں صرف ایک دعویٰ نہیں بلکہ ایک نشان اور آیت ہے۔ کیونکہ محض دعوےٰ وہ ہوتا ہے جسے انسان اپنی طرف سے پیش کرتا ہے اور خارج میں اُس کا ثبوت نہیں ملتا لیکن نشان اور آیت کا ثبوت خارج میں موجود ہوتا ہے اور ختم نبوت کے وہ معنے جو مَیں نے اُوپر کئے ہیں وہ ایسے معنے ہیں کہ اُن کا وجود خارج میں موجود تھا اور مسلمانوں اور غیر اقوام میں دونوں میں موجود تھا مسلمانوں میں مثبت حیثیت سے اور غیر مسلموں میں منفی کی حیثیت میں۔

ختمِ نبوت کے دوسرے معنے کمالِ نبوت کے ہیں اور یہی معنے متبادر ہیں کیونکہ ختمِ نبوت کی آیت میں خاتَم تا کی زبر سے آیا ہے اور خاتَم تا کی زبر سے آئے تو اس کے معنے مُہر کے ہوتے ہیں اور مُہر تصدیق کے لئے لگائی جاتی ہے پس خاتم النبیین کے معنے ہوئے کہ یہ نبی نبیوں کی مُہر ہے اِس کی تصدیق کے بغیر کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ یہ معنے بھی ہر وقت ثابت تھے۔ سابق نبیوں کے بارہ میں اس طرح کہ کسی نبی کی نبوت قرآن کریم کی شہادت کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتی۔ مسیح کو انجیل سے موسیٰؑ کو تورات سے کرشنؑ اور رامچندرؑ کو اُن کی کتب سے زردشتؑ کو اوستا سے سچا نبی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنی دلائل اور نشانات سے ہی اِن لوگوں کی سچائی ثابت کی جا سکے گی اور آئندہ کوئی نبی آئے تو اُس کے لئے آپؐ مُہر تھے یعنی آپ سے باہر جا کر اور آپ سے الگ ہو کر کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی کہے کہ کیوں ایسا نہیں ہو سکتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن زندہ دلیل موجود ہے۔

دوسرا آزاد نبی تبھی آیا کرتا ہے جبکہ پہلے نبی کی کتاب میں خرابی پیدا ہو گئی ہو مگر قرآن کریم پہلے دن کی طرح اپنے الفاظ میں اور تاثیر میں محفوظ ہے۔ اس کے الفاظ کی حفاظت کے دشمن بھی اقراری ہیں۔ اُس کی تاثیر کے شاہد وہ روحانی بزرگ ہیں جو ہر وقت اسلام میں موجود رہتے ہیں۔ وہ کبھی مجدد کہلاتے ہیں کبھی اُمتی نبی کبھی ولی اللہ مگر رہتے ہمیشہ ہیں اور سب کے سب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی کا اقرار کرتے ہیں۔ پس اس سے زیادہ نبوت اور ختم نبوت کا کیا ممکن ہے۔

خلاصہ یہ کہ ختم نبوت سب سے بڑا نشان رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کا ہے جو میرے بیان کردہ معنوں کے رُو سے ہمیشہ ہی ثابت ہے اور ہر وقت دشمنوں پر اس کی صداقت ثابت کی جا سکتی ہے اور ہماری طرف سے کی جا رہی ہے۔

دوسری آیت جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے خدا تعالےٰ نے ظاہر کی وہ یہ ہے کہ آپ کو دَنَا فَتَدَلّٰی کا بلند مقام ملا۔ گویا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی وہ شخص ہیں جن پر اللہ تعالےٰ نے اپنی کامل تجلی ظاہر کی۔ پھر آپ کے متعلق ہی اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ع) اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) تو ان لوگوں سے کہہ دے کہ اگر تمہارے دلوں میں اللہ تعالےٰ کی محبت موجزن ہے اور تم چاہتے ہو کہ وہ تم سے پیار کرے تو تم میری اطاعت کرو خدا تعالےٰ تم سے محبت کرنے لگ جائیگا۔ پھر اللہ تعالےٰ ایک اور مقام پر آپ کی شان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (النساء ع) یعنی جو شخص بھی اللہ تعالےٰ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرے وہ اُس گروہ میں شامل ہو جاتا ہے جس پر اللہ تعالےٰ نے اپنے انعامات نازل کئے یعنی نبیوں میں یا صدیقوں میں، شہیدوں میں یا صلحاء میں اور یہ لوگ بہترین رفیق ہیں۔ دیکھو یہ کتنا بڑا انعام ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ملا۔ کہ آپ کی متابعت اور پیروی میں اللہ تعالےٰ نے نبوت اور صدیقیت اور شہادت اور صالحیت کا مقام رکھ دیا۔ اور درحقیقت بڑا آدمی وہی ہوتا ہے جس کے ماتحت بڑے بڑے آدمی ہوں۔ ایک پرائمری کے مدرس اور ایم اے کے پروفیسر میں کیا فرق ہوتا ہے۔ یہی کہ پرائمری کے مدرس سے پڑھنے والے چھوٹے چھوٹے طالب علم ہوتے ہیں اور ایم اے کے پروفیسر سے پڑھنے والے بڑے بڑے طالب علم ہوتے ہیں۔ لفظ اُستاد میں تو دونوں شریک ہوتے ہیں لیکن اُن میں سے ایک کو بڑا کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ بڑے لوگوں کو پڑھاتا ہے اور اُس کے شاگرد بڑے درجہ کے ہوتے ہیں اور دوسرے کو چھوٹا کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ چھوٹوں کو پڑھاتا ہے اور اس کے شاگرد چھوٹے درجہ کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح نبی تو سارے ہیں مگر بڑا نبی وہی ہوگا جس کے مخاطب بڑی قابلیت کے ہوں۔ اس حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالےٰ کی اطاعت کرے اور اُس کے رسول یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے وہ ایسے گروہ میں شامل

آنحضرت صلعم پر خدا تعالےٰ کی کامل تجلی

ہو جاتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص انعامات
نازل کئے یعنی نبیوں صدیقوں شہیدوں اور صلحاء
کے گروہ میں اور یہ بہترین رفیق ہیں گویا محمد رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں کے متعلق فرمایا کہ وہ
نبیوں میں شامل ہوں گے، وہ صدیقوں میں شامل
ہوں گے، وہ شہیدوں میں شامل ہوں گے، وہ
صلحاء میں شامل ہوں گے لیکن جہاں باقی نبیوں کا
ذکر فرمایا ہے وہاں نبیوں کا لفظ استعمال نہیں کیا
بلکہ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَاۗءُ عِنْدَ
رَبِّهِمْ (حدید ع ۲) یہاں رسول نہیں کہا بلکہ رُسل
کا لفظ استعمال کیا ہے جس میں انبیاء سابقین کی طرف
اشارہ ہے اور فرماتا ہے کہ دوسرے رسولوں کے کامل
متبع صرف صدیق اور شہید بن سکتے تھے نبی نہیں
بن سکتے تھے۔ گویا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ نمایاں سلوک ہے کہ آپ
کے کامل متبع نعمت نبوت بھی حاصل کر سکتے ہیں جبکہ
پہلے نبیوں کی اتباع میں صرف صدیقیت اور شہادت
کا درجہ مل سکتا تھا۔

اس بات کا ثبوت اُس حدیث سے بھی ملتا ہے
جس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ
لَوْ كَانَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى حَيَّيْنِ لَمَا وَسِعَهُمَا
اِلَّا اتِّبَاعِيْ یعنی اگر موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام زندہ
ہوتے تو میری اطاعت اور فرمانبرداری کے سوا اُن
کے لئے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ غرض اللہ تعالیٰ نے
آپ کو دوسرے نبیوں پر یہ مقام فضیلت عطا فرمایا ہے
کہ آپ کے کامل شاگرد نبوت کے مقام پر پہنچ سکتے
ہیں۔ مگر ایسی نبوت جو ظلی اور بروزی ہو یعنی نبی ہونے
کے باوجود وہ آپؐ کے کامل غلام اور شاگرد ہونگے۔

بعض لوگ یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ ہم
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہتک کرتے ہیں
کیونکہ نبی کے نام میں ہم اوروں کو بھی آپ کا شریک
ٹھہراتے ہیں۔ مگر یہ اعتراض قلت تدبر کا نتیجہ ہے
دنیا میں ہزاروں جگہ یہ نظارہ نظر آتا ہے کہ اُستاد
بھی ایم اے ہوتا ہے اور اُس کا شاگرد بھی ایم اے
ہوتا ہے مگر کیا وہ دونوں ایک ہوتے ہیں؟ کیا لوگ
یہ نہیں دیکھتے کہ کالج کا پرنسپل بھی ایم اے ہوتا
ہے۔ دوسرے پروفیسر بھی ایم اے ہوتے ہیں۔
اور آگے اُن کے شاگرد بھی ایم اے پاس کر لیتے
ہیں اس میں اُن کی کیا ہتک ہو جاتی ہے۔ جس
پروفیسر کے زیادہ شاگرد پاس ہو کر ایم اے بن جائیں
اُس کی زیادہ عزت کی جاتی ہے حالانکہ وہ سب کے
سب بظاہر اُس کے نام میں شریک ہو جاتے ہیں۔
پس نام کی شرکت کوئی معنے نہیں رکھتی اصل چیز درجہ
کی شرکت ہے اور ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ کوئی شخص اپنے
درجہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہیں
بڑھ سکتا وہ بہرحال آپ کا غلام ہی رہیگا۔ پس
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی شاگرد نے اگر
آپ کی غلامی میں نبوت کو پالیا تو وہ آپ کی عزت کو
بڑھانے کا موجب ہے، گھٹانے کا موجب نہیں۔
جیسے ایک پرنسپل کے شاگردوں کا ایم اے ہو جانا کوئی
ہتک نہیں ہوتی بلکہ اُس کی عزت اسی میں ہوتی ہے
کہ وہ جن کو پڑھائیں وہ بھی ایم۔اے ہوں۔ غرض
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے شاگرد تو نبی
بن سکتے ہیں مگر باقی نبیوں کے شاگرد صرف صدیق
اور شہید کے درجہ تک پہنچ سکتے تھے اور یہ آپ کو
انبیائے سابقین پر ایک بہت بڑی فضیلت
حاصل ہے۔

(۲) اب ہم دعائے ابراہیمی کے يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ والے حصہ کو لیتے ہیں۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ انبیاء دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک صاحبِ شریعت اور ایک بے شریعت۔ دونوں کا کام تعلیم کتاب ہوتا ہے۔ صاحب شریعت نبی کا کام بھی تعلیم کتاب ہوتا ہے اور بے شریعت نبی کا کام بھی تعلیم کتاب ہوتا ہے۔ ہاں صاحب شریعت نبی کتاب بھی لاتے ہیں اور غیر صاحب شریعت نبی کتاب نہیں لاتے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم چونکہ صاحب شریعت نبی تھے اس لئے آپ کا مقابلہ سب نبیوں سے تھا خواہ وہ شریعت لائے یا نہ لائے لیکن اس جگہ ہم آپ کا مقابلہ صاحب شریعت نبیوں سے کرتے ہیں۔ جب صاحب شریعت انبیاء پر آپ کی فضیلت ثابت ہو جائے گی تو یہ لازمی بات ہے کہ غیر شرعی نبیوں سے آپ خود بخود افضل ثابت ہو جائیں گے کیونکہ ایسے نبی بہرحال اپنے سابق شریعت والے نبی سے درجہ میں ادنیٰ ہوتے ہیں۔

قرآن کریم کی رُو سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جو صاحبِ شریعت انبیاء آئے وہ دو[۲] نبی ہیں (۱) حضرت نوح علیہ السلام اور (۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب تورات تو موجود ہے لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی کتاب موجود نہیں۔ قرآن کریم میں صرف اتنا ذکر آتا ہے وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ (صافات ع۳) یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی جماعت میں سے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے شریعت نوح علیہ السلام کی تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے تابع نبی تھے۔ حضرت داؤد حضرت زکریا حضرت سلیمان اور یحییٰ علیہم السلام موسوی شریعت کے تابع تھے

مگر ان دو صاحبِ شریعت نبیوں کے علاوہ قرآن کریم نے یہ اصول بیان فرمایا ہے کہ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر ع۳) دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس میں ہمارا کوئی نہ کوئی نبی نہ آیا ہو۔ اگر کوئی شخص آکر ہمیں کہے کہ فلاں نبی بھی دنیا میں گزرا ہے اور اُس کے حالات بظاہر نبیوں سے ملتے ہوں سوائے اُن قصّوں کے جو عام طور پر ساتھ ملا لئے جاتے ہیں تو اگر ہم کہہ دیں کہ وہ نبی نہیں تو ہم اپنے دین کا آپ انکار کرتے ہیں۔ مثلاً ایک ہندو آکر کہتا ہے کہ وید خدا تعالےٰ کی کتاب ہے اور ہم میں بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی آتے رہے ہیں اور ہم کہہ دیں کہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ وہ کہے رام چندر جی نبی تھے اور ہم کہیں جھوٹے تھے۔ وہ کہے کرشن جی نبی تھے اور ان کی کتاب گیتا بھی موجود ہے جس میں اُن کے بعض الہامات درج ہیں اور ہم کہیں یہ بالکل جھوٹ ہے۔ پھر بدھ ہمارے پاس آئیں اور کہیں کہ بدھ نام کے ایک نبی ہندوستان میں آئے ہیں جن سے خدا تعالیٰ باتیں کرتا تھا اور ہم کہہ دیں کہ وہ نعوذ باللہ فریبی تھے تو وہ فوراً قرآن کریم سے یہ آیت نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیں گے اور کہیں گے تمہارا قرآن تو کہتا ہے کہ ہر قوم میں نبی آئے۔ اب بتاؤ اگر کرشن جی نبی نہیں، اگر رامچندر جی نبی نہیں، اگر بدھ نبی نہیں تو ہندوستان میں پھر کون سا نبی آیا ہے۔ ہم نے اِن تینوں کو تو جھوٹا کہہ دیا اور نبی ہم کہاں سے لائیں گے۔ سوائے اس کے کہ ہم کہہ دیں۔ ہمیں معلوم نہیں۔ وہ کہیں گے تمہارے قرآن نے تو کہا ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم میں نبی آئے ہیں تم اس کا ثبوت دو۔ اِس صورت میں ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ یا تو ڈھیٹ آدمی کی طرح نہیں نہیں کرتے رہیں اور یا ہم بھی اُس پٹھان کا

دو قسم کے انبیاء

آنحضرت کی جملہ شریعت لانیوالے انبیاء پر فضیلت [۱،۲]

طریق عمل اختیار کریں جس کے متعلق مشہور ہے کہ اُس نے ایک روپیہ کے خربوزے خریدے۔ وہ خربوزے میٹھے نہیں تھے تو اُس نے غصہ میں آکر سب پر پیشاب کر دیا اور پھر مزدوری کرنے چلا گیا۔ جب پیٹ خالی ہوا اور بھوک نے ستایا تو وہ خربوزوں کے پاس واپس آیا۔ ایک خربوزہ اُٹھایا اور یہ کہہ کر کہ اس پر تو میں نے پیشاب نہیں کیا تھا اُس نے کھا لیا۔ اسی طرح باری باری وہ تمام خربوزے کھاتا گیا جب صرف ایک خربوزہ رہ گیا اور اُسے بھوک نے پھر ستایا تو وہ کہنے لگا خواہ جن خربوزوں پر میں نے پیشاب کیا تھا وہ تو میں کھا گیا اس پر تو پیشاب ہی نہیں کیا تھا یہ کہہ کر وہ خربوزہ بھی کھا گیا۔ یہی حال ہمارا ہوگا۔ پہلے تو ہم سب کو جھوٹا کہہ دیں گے اور جب وہ کہیگا بولو ہندوستان میں پھر کون سا نبی آیا ہے؟ تو اس کے سوا ہم کہہ بھی کیا سکتے ہیں کہ اچھا رامچندر جی کو ہی نبی مان لیتے ہیں۔ کرشن جی کو ہی نبی مان لیتے ہیں۔ بدھ کو ہی نبی مان لیتے ہیں اور جب مجبور ہو کر ہم نے یہ کہنا ہے تو کیوں نہ سیدھی طرح ہم انہیں پہلے ہی نبی مان لیں۔

کرشن جی اور رامچندر جی کے متعلق ہمارے صوفیاء اور اولیاء نے بھی خوابیں دیکھی ہیں۔ حضرت مظہر جانِ جاناں کے پاس ایک شخص آیا اور اُس نے کہا رام چندر جی اور کرشن جی جھوٹے ہیں۔ چنانچہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آگ جل رہی ہے حضرت کرشن آگ کے وسط میں کھڑے ہیں اور رامچندر جی کنارے پر کھڑے ہیں معلوم ہوا کہ یہ دونوں جھوٹے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ خواب کی تعبیر خواب کی زبان میں ہی ہوتی ہے۔ آگ کے معنے ہیں محبتِ الٰہی۔ حضرت کرشن جی کے آگ میں کھڑا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ محبتِ الٰہی کے مرکز میں کھڑے ہیں اور رامچندر جی چونکہ آپ سے چھوٹے درجہ کے ہیں اس لئے وہ کنارے پر کھڑے ہیں۔

غرض قرآن کریم کی طرف سے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہر قوم میں نبی گذرے ہیں۔ اب اگر کوئی آکر کہے کہ ہماری قوم میں فلاں نبی گزرا ہے اور اُس کے واقعات نبیوں کے سے ہوں تو ہم کہیں گے سبحان اللہ کتنی بڑی آسانی پیدا ہو گئی۔ میں تو عیسائیوں اور یہودیوں اور ہندوؤں سے ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ قرآن کریم نے ہمارا کام آسان کر دیا ہے۔ آپ کا کام بہت مشکل ہے۔ مثلاً جب یہودی کہیں گے کہ موسیٰ علیہ السلام نبی تھے تو ہندو کہیں گے رام رام وہ نبی کیسے ہوئے۔ اگر ہم کہیں گے کہ ایران میں زردشت علیہ السلام پیدا ہوئے تو یہودیوں اور ہندوؤں دونوں کو پیٹنا پڑ جائے گا۔ ہندو رام رام کہنے لگ جائیں گے اور یہودی ایلو ہیم ایلو ہیم۔ اے اللہ میں کیا کروں۔ اچھا کوئی تدبیر سوچو جس سے زردشت علیہ السلام نبی ثابت نہ ہوں۔ اگر ہم زردشتیوں سے کہیں گے کہ ہندوستان میں بدھ نبی آیا ہے تو وہ کہیں گے ہم مارے گئے۔ اچھا کوئی تدبیر سوچو جس سے اُس کی نبوت ثابت نہ ہو لیکن قرآن کریم نے اِنۡ مِّنۡ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیۡہَا نَذِیۡرٌ (فاطر ع۳) کہہ کر بڑی آسانی پیدا کر دی ہے۔ اگر کوئی ہندو آکر کہے کہ ہندوستان میں رامچندر جی نبی گزرے ہیں۔ کرشن جی نبی گزرے ہیں تو میں کہونگا سبحان اللہ کتنی بڑی آسانی پیدا ہو گئی ہے مجھے محنت نہیں کرنی پڑی۔ تم نے خود بتا دیا۔ میرے قرآن نے بھی تو یہی کہا ہے۔ اگر تم کہتے کہ بتاؤ ہندوستان میں کونسا نبی گزرا ہے تو مجھے مصیبت پڑ جاتی۔ میں حیرت میں جاتا کہ

اور سنتا ہوں کہ بہاں کنفیوشس علیہ السلام خدا تعالےٰ کے ایک نبی گزرے ہیں تو عیسائی اور یہودی شور مچادیتے ہیں کہ یہ کہاں کے نبی ہوگئے۔ لیکن میں کہتا ہوں، سبحان اللہ کیا ہی آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ اگر وہ مجھ سے پوچھتے کہ اچھا بتاؤ ہم میں کون سا نبی آیا تھا تو میں مشکل میں پڑ جاتا۔ انہوں نے خود بتادیا اور میں محنت سے بچ گیا۔ قرآن کریم بھی تو یہی کہتا ہے اِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ ۔ میں ایران جاتا ہوں تو وہاں کے لوگ کہتے ہیں۔ یہاں زردشت علیہ السلام نبی ہوئے ہیں۔ یہ سنکر یہودی اور عیسائی اور ہندو تو سر پیٹ لیتے ہیں کہ یہ کیا ہوا ہم تو سمجھتے تھے کہ ہمارے ہاں ہی نبی گزرے ہیں لیکن یہ سن کر میرا چہرہ بشاش ہو جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں سبحان اللہ آپ نے خود ہی بتادیا ورنہ مجھے بہت محنت کرنی پڑتی۔ میرے قرآن میں بھی یہی لکھا ہے۔ غرض جن قوموں میں کوئی نبی گزرا ہے اور اُس نے اپنے وقت میں اُن کی اصلاح کی ہے اور اُس پر عذاب بھی نازل نہیں ہوا۔ کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ جھوٹے نبیوں پر عذاب آتا ہے۔ ہم الحمد للہ کہہ کر اُسے قبول کرلیں گے۔

پس اصولاً ہر قوم میں نبی آئے ہیں لیکن اُن میں سے حضرت زردشتؑ اور حضرت موسیٰؑ دو معلوم نبی ہیں جن کی شریعت موجود ہے۔ ویدوں کے رشیوں کا کچھ پتہ نہیں۔ ویدوں نے شریعت ضرور پیش کی ہے مگر نبی کے نام کا سوال رہ جاتا ہے اور یہ پتہ نہیں لگتا کہ وید کس پر نازل ہوئے۔ اس لئے ہم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا اُن سے مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت موجود نہیں البتہ ایک اور شخص ہے جس کے متعلق پتہ چلتا ہے کہ اُس نے کچھ قوانین پیش کئے لیکن شریعت کا پورا پتہ نہیں لگتا۔ الہام کا ذکر اُس کی تحریروں میں ضرور ہے اور یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ وہ توحید کا قائل تھا اور اُس نے اخلاق کے بہت عمدہ اصول پیش کئے ہیں وہ حمورابی تھا۔ جس کے بعض احکام عمدہ تعلیم پر مشتمل ہیں لیکن پوری تفصیل معلوم نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ پتہ لگتا ہے کہ اُس نے کوئی نئی شریعت پیش کی تھی یا اپنے سے پہلے کسی نبی کی شریعت پیش کی تھی پس حقیقتاً صرف دو ہی نبی رہ جاتے ہیں جنکی شریعت معلوم ہے (۱) حضرت زردشت علیہ السلام (۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں ہوسکتا جو تعلیم کو چھپائے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خدا تعالےٰ ایک شخص کو پیغام دے کر لوگوں کی طرف بھیجے اور وہ اُس کو چھپائے۔ پس وہ شریعت کو تو نہیں چھپا سکتا۔ ہاں دوسرے الہاموں کو مصلحت وقتی کے ماتحت چھپایا جاسکتا ہے جیسے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بدر کی طرف نکلے تو آپ کو رستہ میں بتایا گیا تھا کہ آپ کا مقابلہ مکّہ سے آنے والے لشکر کے ساتھ ہوگا۔ مگر ساتھ ہی یہ سمجھا دیا گیا کہ یہ الہام ابھی ظاہر نہ کیا جائے۔ بعد میں جب آپ نے مناسب سمجھا تو صحابہ رض کو وہ الہام بتایا۔ یہ امتحان کی ایک صورت تھی لیکن شریعت والی تعلیم نہیں چھپائی جاسکتی۔ پس تعلیم کتاب کا کام درحقیقت تمام انبیاء کرتے ہیں۔ اس لئے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سب نبی ہی کتاب سکھانے آئے تھے اور اُن میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہیں تو پھر آپؐ کی اُن پر فضیلت کیسے ثابت ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مقابلہ اظہارِ تعلیم میں نہیں بلکہ کمالِ تعلیم میں ہے۔ اظہارِ تعلیم میں تو سب برابر ہیں لیکن کمالِ تعلیم کے

لحاظ سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ ملا اُس میں کوئی دوسرا نبی آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا چنانچہ اَلْکِتَاب کے لفظ میں الف لام کمال کے معنے دیتے ہیں جو لغتِ عرب سے ثابت ہیں اور اِسی کی طرف يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ نبی تم کو کامل کتاب سکھاتا ہے ۔

جیسا کہ میں اُوپر بتا آیا ہوں شریعت والے معلوم نبی صرف دو ہیں ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت زردشت علیہ السلام ۔ اُن میں سے ایک نبی کی کتاب تورات ہے اور دوسرے نبی کی کتاب اوستا ۔ جب ہم قرآن کریم کا مقابلہ اِن دونوں کتابوں سے کرتے ہیں تو ہمیں یہ عظیم الشان فرق نظر آتا ہے کہ اوّل تعلیم کی جو اصل غرض ہے وہ قرآن کریم کے سوا باقی تمام کتابوں میں مفقود ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ شریعت خدا تعالےٰ نے کسی اپنے لطف کے لئے نازل نہیں کی ۔ جیسے سپین میں لوگوں کو بیل لڑوانے کا شوق ہے یا ہندوستان میں لوگ ہاتھی لڑوایا کرتے تھے اور بادشاہ پاس بیٹھ کر تماشا دیکھا کرتے تھے ۔ یہ تو خدا تعالےٰ کی غرض نہیں ہو سکتی تھی کہ ہم سخت سردی کے موسم میں وضو کے لئے ہاتھ دھو رہے ہوں اور خدا تعالےٰ آسمان پر ہنس رہا ہو ۔ ہم روزے رکھ رہے ہوں اور وہ یہ دیکھ کر کہ ہمارے قدم نہیں اُٹھ رہے اور بھوک کی وجہ سے ہماری آنکھیں زرد ہو رہی ہیں آسمان پر قہقہے مار رہا ہو ۔ یہ تو اُس سے امید نہیں کی جا سکتی ۔ بہر حال اُس نے شریعت ہمارے فائدہ کے لئے نازل کی ہے ۔

دنیا میں حکومتیں بھی خواہ وہ کتنی ہی معمولی ہوں جب کوئی قانون بناتی ہیں تو اُن میں سے کوئی شاذ و نادر ہی لغو ہوتا ہے ۔ بالعموم اُن میں کوئی نہ کوئی رعایا کا فائدہ مدنظر ہوتا ہے ۔ اِسی طرح خدا تعالیٰ کے احکام میں بھی انسان کے لئے کوئی نہ کوئی بھلائی ضرور مدنظر ہوتی ہے ۔ لیکن سوائے قرآن کریم کے جتنی بھی الہامی کتب ہیں اُنکو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شریعت کو ایک چٹی کے طور پر پیش کیا ہے ۔ وید تو بالکل پردوں تلے ہیں سو اِن سے شریعت کا کوئی پتہ نہیں لگتا ۔ تورات اور ژند اوستا کو پڑھنے سے بھی یہ تو پتہ چلتا ہے کہ اِن میں شریعت موجود ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شریعت اس لئے نہیں کہ اُس میں انسان کا نفع ہے بلکہ اس لئے ہے کہ خدا یُوں چاہتا ہے ۔ جس کی وجہ سے شریعت کی اصل غرض جو اصلاح ہے فوت ہو جاتی ہے ۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُن میں بعض احکام ایسے بھی ہیں جو انسان کے نفع کے لئے ہیں ۔ لیکن اتفاقی طور پر کسی ایسے حکم کا نکل آنا اَور بات ہے ۔ یہ صرف قرآن کریم نے ہی بتایا ہے کہ سب احکام انسان کے فائدہ کے لئے ہیں ۔ بیشک وہ بعض دفعہ بندے کا امتحان بھی لیتا ہے مگر اصل حکم انسان کے فائدہ کے لئے ہی ہوتا ہے ۔ وہ فرماتا ہے لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (الحج ع ۵) قربانیوں کو ذبح کرنے کا حکم دینے سے ہمارا یہ مقصد نہیں کہ اللہ تعالےٰ کو اُن کی بوٹیاں پہنچتی ہیں ، خدا تعالےٰ کو اُن کا خون اور بوٹیاں نہیں پہنچتیں بلکہ وہ تقویٰ پہنچتا ہے جس کے ماتحت تم قربانی کرتے ہو ۔ ورنہ گوشت تو ہم تمہیں ہی کھلا دیتے ہیں ۔ ہم اگر تم سے قربانیاں کرواتے ہیں تو اس لئے تا تمہارے اندر اخلاص پیدا ہو ، تمہارے اندر خشیت پیدا ہو ، تمہارے اندر نیکی اور صلاحیت پیدا ہو ۔ یہ احکام محض چٹی کے طور پر نہیں ۔

(۲) شریعت کا دائرہ کیا ہے۔ وہ کن امور میں حکم دیتی ہے اور کن میں نہیں۔ اِس بارہ میں بھی سب کتب خاموش ہیں۔ صرف قرآن کریم ہی روشنی ڈالتا ہے۔ آخر یہ واضح بات ہے کہ شریعت بعض کاموں میں دخل دیتی ہے اور بعض میں دخل نہیں دیتی۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیوں دخل نہیں دیتی۔ بھول کر چھوڑ دیتی ہے یا جان بوجھ کر چھوڑ دیتی ہے؟ ان چیزوں کا صرف قرآن کریم نے ہی ذکر کیا ہے باقی سب کتابیں خاموش ہیں اور یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے جو قرآن کریم کو دوسری کتب پر حاصل ہے۔

(۳) شریعت کے ہوتے ہوئے انسانی عقل کی ضرورت یا عقل کے ہوتے ہوئے شریعت کی ضرورت۔ یہ بھی ایک اہم سوال ہے جس کے حل کئے بغیر شریعت کی ضرورت تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ جاہل تو ہر بات مولوی سے پوچھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ عقل کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ علاج خصوصاً یوپی میں پایا جاتا ہے۔ اِس پر بعض مولوی اپنے پاس سے ہی مسئلہ بنا کر بتا دیتے ہیں۔ میرے ایک عزیز ڈاکٹر ہیں وہ ایک دن شکار کے لئے باہر گئے اور انہوں نے ایک ہرن مارا۔ ایک زمیندار بھاگا بھاگا اُن کے پاس آیا اور کہا بابو جی! کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس کی تکبیر کیا ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا وہی تکبیر ہے جسے پڑھ کر ہم بکرے اور مرغے ذبح کرتے ہیں۔ اُس نے کہا نہیں سب کی تکبیر ایک نہیں بلکہ الگ الگ ہے۔ ہم کو جو مُلّاں نے ہرن کی تکبیر بتائی ہے وہ یہ ہے کاہے کو اُچھلت کاہے کو کودت کاہے کو کھاوت پرایو کھیت۔ تجھ کو آئی جلّت ہم کو آئی اِجّت اللہ اکبر۔ غرض عوام الناس تو سمجھتے ہیں کہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کا حکم موجود ہے اور وہ اپنے مولوی سے پوچھتے ہیں کہ مولوی صاحب چھپائیے نہ ہمیں بتا دیجئے کہ اس بارہ میں اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مولوی لوگ ہم سے اصل مسئلہ چھپاتے ہیں بتاتے نہیں۔ اب جو عالم ہوگا وہ تو ان کو کہہ دیگا کہ جاؤ میاں اِس کا بھی وہی حکم ہے جو فلاں کام کا ہے اور جو جاہل مولوی ہوگا وہ اپنے پاس سے کوئی ڈھکوسلہ بتا دے گا تاکہ اُس کی عزت بنی رہے۔ ہندوستان کے بعض علاقوں میں رواج ہے کہ ہر گھر میں ایک چُھری رکھی ہوئی ہوتی ہے جس سے وہ جانور ذبح کرتے ہیں۔ نہ بسم اللہ اور نہ اللہ اکبر کچھ نہیں پڑھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اِس چُھری پر مُلّاں تکبیر پڑھ گیا تھا اس لئے اب نئی تکبیر کی ضرورت نہیں۔ یہودیوں میں بھی یہی رواج تھا اور ہے۔ اُنہوں نے چُھریاں رکھی ہوئی ہیں۔ علماء ایک دفعہ اُن پر تکبیر پڑھ جاتے اور پھر اُنہی سے وہ جانور ذبح کر لیا کرتے ہیں تکبیر پڑھنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ اِس کے مقابلہ میں تعلیم یافتہ طبقہ یہ کہتا ہے کہ ہمارے کاموں سے خدا تعالیٰ کا کیا تعلق۔ کیا ہم احمق ہیں۔ کسی زمانہ میں جاہلوں کے لئے خدا تعالیٰ نے احکام نازل کئے تھے۔ ہم تو ہر قسم کے اصولوں کو جانتے ہیں۔ علوم وفنون سے آگاہ ہیں۔ عقل ہمارے پاس ہے۔ ہمارے ساتھ اِن احکام کا کوئی تعلق نہیں۔ غرض عوام الناس تو شریعت کو اُن حدود میں لے جانا چاہتے ہیں جن میں خدا تعالیٰ اُسے نہیں لے جانا چاہتا اور تعلیم یافتہ طبقہ عقل کو اُن حدود میں رکھنا چاہتا ہے جن میں خدا تعالیٰ اُسے نہیں رکھنا چاہتا۔ اب یہ خدا تعالیٰ کا کام ہے کہ وہ بتاتے کہ شریعت کے ہوتے ہوئے انسانی عقل کی کیوں ضرورت ہے یا عقل کے ہوتے ہوئے شریعت کی کیوں ضرورت ہے۔ مگر سوائے قرآن کریم کے اور کوئی کتاب اس پر روشنی نہیں ڈالتی۔

اب ہم تفصیلات کو لیتے ہیں۔ پہلے اصول شرائع ہیں۔ اسلام نے اصول شرائع پانچ قرار دیئے ہیں۔ (۱) ایمان باللہ۔ جس میں صفات۔ ملائکہ۔ انبیاء، قضاء و قدر۔ بعث بعد الموت سب چیزیں شامل ہیں۔ اس کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے۔

(۲) عبادت۔ یہ تین قسم کی ہوتی ہے (۱) عبادت مشتمل بر حرکات جسم و ذکر الٰہی جیسے نماز (۲) عبادت ذکری جیسے ذکر الٰہی (۳) عبادت فکری یعنی تدبّر در صفات الٰہیہ۔ قرآن کریم نے اِن سب قسموں کی عبادت کا ذکر کیا ہے۔ نماز اسلامی کچھ حرکاتِ جسم اور کچھ اذکار پر مشتمل ہے اور اسلامی نماز کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ اُس کی تمام حرکات با وقار، با غرض اور با فائدہ ہیں اور اس میں وہ تمام طریق اختیار کئے گئے ہیں جو مختلف اقوام میں اظہار ادب کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ایرانی اقوام میں ہاتھ چھوڑ کر کھڑے ہو جانا اظہارِ ادب کی علامت ہے۔ ترکی نسل کی اقوام میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جانا اظہار ادب کی علامت ہے۔ ہندوؤں اور بعض دوسری اقوام میں جھکنا اظہار ادب کی علامت ہے۔ ہندوستان اور افریقہ میں سجدے کے طور پر گر جانا اظہار ادب کی علامت ہے اور یوروپین اقوام گھٹنے کے بل بیٹھ جانے کو اظہار ادب کی علامت سمجھتی ہیں۔ ہندو اور سکھ اب تو الگ ہو گئے ہیں پہلے وہ جب کبھی ملنے کے لئے آتے تھے تو خواہ اُنہیں کتنا بھی منع کرتے رہو وہ پیروں میں گر جاتے تھے۔

ایک سکھ جس کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے عقیدت تھی ایک دن میرے زمانۂ خلافت کی ابتداء میں روتا ہوا میرے پاس آیا اور کہنے لگا آپ کی جماعت نے مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے۔ میں نے سمجھا کہ شاید کوئی لڑائی ہو گئی ہے اور کسی نے مارا ہے۔ مَیں نے اُسے تسلی دی اور کہا کہ مَیں فوراً تحقیقات کروا کے سزا دُونگا آپ مجھے بتائیں کہ ہُوا کیا ہے۔ اُس نے کہا میں بہشتی مقبرہ گیا تھا وہاں مرزا صاحب کی قبر پر سجدہ کر رہا تھا کہ احمدیوں نے پکڑ کر مجھے باہر نکال دیا۔ میں نے کہا یہ تو انہوں نے ٹھیک کیا۔ ہمارے مذہب میں یہ ناجائز ہے وہ کہنے لگا۔ میرا مذہب میرے ساتھ ہے اور آپ کا مذہب آپ کے ساتھ ہے مَیں جیسا چاہوں کروں اُن کا کیا حق تھا کہ مجھے روکتے۔ غرض بڑی دیر تک اُسے سمجھانا پڑا اور پھر کہیں اُس کا غصّہ فرو ہُوا۔

اِسی طرح افریقہ میں اظہار عقیدت کے طور پر سب لوگ سجدہ میں گر جاتے ہیں۔ ترکوں میں مَیں نے دیکھا ہے کہ جب وہ مثنوی رومی پڑھتے ہیں تو ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مغل بھی تعظیم کے لئے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایران میں سیدھا کھڑا ہو جانا اظہارِ ادب کی علامت تھا غرض ہر قوم میں اظہار عقیدت کی کوئی نہ کوئی علامت مقرر ہے مگر نماز ایک ایسا شعار ہے جس میں اسلام نے اس قسم کے تمام آداب کو جمع کر دیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ یوں تو ایک مومن کو ساری نماز میں ہی لذّت آتی ہے مگر جب کوئی شخص اپنے قومی شعار میں پہنچے گا تو اُسے کمال لذّت محسوس ہوگی۔ عیسائی تشہّد کے وقت کو پسند کرتا ہے کیونکہ اُن میں تشہّد کا رواج ہے۔ ہندوستانی کو سجدے کی حالت میں بڑا تذلّل معلوم ہوتا ہے۔ ایرانی کو ہاتھ چھوڑ کر کھڑا ہونے میں تذلّل معلوم ہوتا ہے۔ یہودی کو رکوع میں بڑا تذلّل معلوم ہوتا ہے۔ غرض جو قوم بھی اسلام میں داخل ہوتی ہے وہ اپنی روح کی تسکین اسلامی نماز میں پاتی ہے۔ دیکھو یہ کتنی بڑی خوبی ہے جو اسلام میں پائی جاتی ہے۔ اس نے بتا دیا کہ اسلام میں ساری دنیا نے شامل ہونا ہے

باقی قوموں کی عبادتوں میں یہ چیز اتنے لطیف طریق پر نظر نہیں آتی۔

پھر وضو کو لے لو۔ اسلام نے نماز سے پہلے وضو مقرر کیا ہے جو ایک نہایت اہم ذریعہ عبادت کی تکمیل کا ہے۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ جب خیالات کا اجتماع ایک چیز پر ہو جاتا ہے تو اس کے مختلف حصوں سے جہاں اعصاب کے سرے ختم ہوتے ہیں NERVES ENDS اُس کی طاقت ضائع ہونی شروع ہو جاتی ہے اور خیالات میں پراگندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر پانی کا چھینٹا دیا جائے تو اعصاب کو سکون حاصل ہو کر خیالات مجتمع ہو جاتے ہیں۔ وضو کے ذریعہ سے انتشار خیالات کو روکا گیا ہے۔ پھر یہی نہیں کہ صرف وضو کا حکم دیا گیا ہے بلکہ نماز کے ابتداء اور انتہاء میں اللہ تعالےٰ نے نوافل بھی رکھ دئے ہیں۔ اسی طرح نماز کے بعد ذکر الٰہی کی تاکید کی ہے۔ اس طرح نہ صرف اُس نے پہلے خیالات کو نماز میں پیدا ہونے سے روک دیا ہے بلکہ بعد میں آنے والے خیالات کو بھی ایک وقت تک دُور رکھنے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر کام وقت سے کچھ دیر پہلے شروع کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً ہم نے دس بجے کی گاڑی سے جانا ہے تو آٹھ بجے سے ہی اُس کا خیال آنا شروع ہو جائے گا۔ ہم روزہ رکھتے ہیں تو سورج غروب ہونے سے پندرہ بیس منٹ پہلے ہی ہم روزہ کھولنے کی تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ یہی حال دوسرے کاموں کا ہے یعنی پہلے کام کا اثر کچھ دیر تک چلا جاتا ہے اور اگلا کام کچھ دیر پہلے شروع ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر نماز سے پہلے وضو اور بعد میں نوافل وغیرہ نہ رکھے جاتے تو آدھی نماز تو پہلے خیالات میں ضائع ہو جاتی اور آدھی دوسرے خیالات میں۔ اس نقص کے ازالہ کیلئے خدا تعالےٰ نے پہلے وضو رکھا اور فرائض سے پہلے سنتیں اور نوافل رکھ دئے۔ اسی طرح فرائض کے بعد کچھ سنتیں اور نوافل رکھ دئے۔ اس طرح نماز کو اُس نے دو دیواروں کے درمیان محفوظ کر دیا۔ اگر ان تدابیر کے ہوتے ہوئے پھر بھی کسی کی نماز ضائع ہو جائے تو یہ اُس کا اپنا قصور ہو گا۔ بہرحال خدا تعالیٰ نے انسان کے لئے اس بات کا موقع بہم پہنچا دیا ہے کہ وہ دنیوی خیالات سے علیحدہ ہو کر نماز ادا کر سکے اور اُس نے عبادت کو شیطانی حملہ سے ہر ممکن طریق پر محفوظ کر دیا ہے۔ اس کے مقابل پر ہندو اور سِکھ عبادت گانے بجانے کا نام ہے جو محض تلذّذ ہے عبادت نہیں۔ یا چند بیہودہ رسُوم کا نام عبادت رکھ دیا گیا ہے۔ مثلاً آگ جلائی اور اُس میں تیل ڈالا شعلہ نکلا اور مُنہ سے کوئی لفظ کہدیا۔ اس سے قلب کی کیا صفائی ہوگی سُبحانَ اللہِ العَظِیم کہنے سے تو دل کی صفائی کا تعلق نظر آتا ہے مگر آگ کا شعلہ نکلنے پر صاحا کہہ دینے سے ہمیں کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

اسی طرح زرتشتی نماز سورج اور پانی کی طرف مُنہ کر کے پڑھی جاتی ہے اور بے شک وہ چند ادعیہ پر مشتمل ہے مگر مشرکانہ رنگ پکڑ گئی ہے اور یہودی نماز تو سجدہ سے ہی خالی ہے پھر وہ کسی اصل پر بھی مبنی نہیں۔ غرض اسلامی نماز میں (۱) سب ارکانِ ادب کو شامل کیا گیا ہے (۲) اسلام نے ایک قبلہ قائم کیا ہے جو اتحاد کے لئے ضروری ہے۔ دوسری قوموں میں یہ چیز نہیں پائی جاتی۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ جہاں اجتماعی دعا ہوتی ہے وہاں دوسری اقوام بھی کسی نہ کسی طرف مُنہ کر کے بیٹھتی ہیں۔ لیکن اُنہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ دنیا کے سب لوگ اُن کے ساتھ شریک ہو کر یہ کام کر رہے ہیں لیکن مسلمانوں میں سے افریقہ والے مشرق کی طرف مُنہ کرتے ہیں

یورپ والے جنوب کی طرف مُنہ کرتے ہیں۔ ایران والے
شمال کی طرف مُنہ کرتے ہیں ہندوستان والے مغرب
کی طرف مُنہ کرتے ہیں اور اُن کی حالت بالکل ویسی ہی ہوتی
ہے جیسے ہندو لوگ ہَون کے چاروں طرف بیٹھ جاتے
ہیں سو وہ سب کے سب ایک ہی سمت کی طرف مُنہ کر لیتے
ہیں خواہ دنیا کے کسی گوشہ میں رہتے ہوں لیکن یہودی
عیسائی اور ہندو جدھر بھی چاہتا ہے منہ کر لیتا ہے۔
کسی کا منہ شمال کی طرف ہوتا ہے تو کسی کا جنوب کی
طرف، کسی کا مُنہ مشرق کی طرف ہوتا ہے تو کسی کا مغرب
کی طرف۔ کسی کی کرسی اِدھر پڑی ہوئی ہوتی ہے تو کسی
کی اُدھر۔ پادری جب عبادت کرواتا ہے تو کچھ آدمی اُس
کے دائیں طرف ہوتے ہیں اور کچھ اُس کے بائیں طرف ہوتے
ہیں۔ کچھ نمائندے اور مددگار اُس کے پیچھے کھڑے ہوجاتے
ہیں۔ کوئی پانی لئے کھڑا ہوتا ہے تو کوئی شمع ہاتھ میں
لئے کھڑا ہوتا ہے۔ غرض انہیں اس بات کا کوئی احساس
نہیں ہوتا کہ وہ آپس میں یک جہتی اور اتحاد رکھتے ہیں لیکن
ساری دنیا کے مسلمانوں میں خواہ وہ شمال میں رہتے ہوں
یا جنوب میں۔ مشرق میں رہتے ہوں یا مغرب میں۔ یہ
احساس پایا جاتا ہے کہ وہ ایک سمت کی طرف مُنہ کرکے
کھڑے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا اتحاد کا ذریعہ ہے بشرطیکہ
مسلمان اس سے فائدہ اُٹھائیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی
اسلام نے یہ بھی کہہ دیا کہ قبلہ اپنی ذات میں کوئی خوبی
نہیں رکھتا تاکہ شرک پیدا نہ ہو۔ وہ فرماتا ہے لِلّٰهِ
الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ
اللّٰهِ (بقرہ ع۱۴) اللہ تعالیٰ کے لئے مشرق اور مغرب
سب برابر ہیں جدھر مُنہ کرکے نماز پڑھو اُدھر ہی تم
اللہ تعالیٰ کو پاؤ گے۔ غرض عبادت کو اس کمال
تک اور کسی مذہب نے نہیں پہنچایا اور یہ اس کی فضیلت
کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔

(۳) پھر اسلامی عبادت میں جماعت کا اصل قائم
کیا گیا ہے۔ جو مذہب کی اصل غرض ہے۔ ظاہر ہے کہ
انسانی زندگی دو پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ انفرادی اور اجتماعی
مذہب، سیاست، قومیت، اخلاق، تمدن تمام امور
میں اِن دونوں پہلوؤں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے
ورنہ انسانی سوسائٹی خراب ہو جاتی ہے۔ جن اقوام نے
مثلاً سیاست میں اجتماعی زندگی اور ذمہ واریوں کا خیال
نہیں رکھا وہ کمزور ہوگئی ہیں۔ اسی طرح جن اقوام نے
انسان کو محض مشینِ سیاست کا ایک پُرزہ تجویز کر دیا ہے
انہوں نے بھی انسانی ترقی کے راستوں کو مسدود کر دیا ہے
جیساکہ کمیونسٹ جماعت ہے۔ اصل اور کامیاب طریقہ
یہی ہے کہ انفرادیت اور اجتماعیت دونوں کو ایک وقت
میں اور توازن کے ساتھ قائم رکھا جائے۔ مذہب میں
بھی یہی طریقہ کامیاب اور مفید ہو سکتا ہے اور اسلام
ہی ہے جس نے کہ اس طریقہ کو مدنظر رکھا ہے اور تمام
مذاہب میں سے پہلی دفعہ مذہب میں اجتماعی رُوح کو
ایک مقرر اور معزز مقام عطا کیا ہے۔ مثلاً نماز ہے
یُوں تو جیساکہ میں نے بتایا ہے دوسری قوموں کے لوگ
بھی عبادت کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ عیسائی گرجوں میں
ہندو مندروں میں اور سکھ گوردواروں میں۔ لیکن وہ جماعتی
رنگ جو اسلام کی نماز میں پایا جاتا ہے وہ دوسری
قوموں میں نہیں۔ پھر اُن کے نزدیک جماعت فرض نہیں
یہ نہیں کہ جو شخص عبادت کے لئے جماعت میں شامل نہ ہو
گنہگار ہو جاتا ہے۔ لیکن اسلام میں نماز باجماعت کو
فرض قرار دیا گیا ہے اور اس میں سوائے معذوروں کے
سب کا آنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ آج بیشک مسلمانوں
میں الحاد پیدا ہو گیا ہے اور وہ نماز کے لئے مسجدوں
میں نہیں آتے۔ لیکن سوال اُن کے عمل کا نہیں بلکہ اسلامی
تعلیم کا ہے اور اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ نماز باجماعت

فرض ہے اور ہر مسلمان باوجود اپنی عملی کمزوریوں کے یہ تسلیم کرتا ہے کہ نماز باجماعت فرض ہے پس اسلامی عبادت اور دوسرے مذاہب کی عبادات میں یہ ایک بہت بڑا فرق ہے کہ اسلام نے باجماعت نماز فرض قرار دی ہے جبکہ دوسرے مذاہب نے اسے فرض قرار نہیں دیا یہ امر اُن کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ عبادت کے لئے آئیں یا نہ آئیں۔ پھر ہماری نماز اتنے اوقات میں مقرر ہے کہ دوسرے مذاہب میں اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ مثلاً (۱) سورج نکلنے سے پہلے نماز ہے (۲) زوال کے بعد نماز ہے (۳) سورج کے غروب کے قریب نماز ہے (۴) سورج کے غروب ہونے کے بعد نماز ہے (۵) رات کو سونے سے پہلے نماز ہے اور یہ پانچ نمازیں فرض ہیں۔ یہ نہیں کہ ان کی ادائیگی کسی کی مرضی پر منحصر ہو اس قدر عبادت اور پھر باجماعت عبادت اور دل میں کہاں پائی جاتی ہے۔ اس وقت مسلمان بے دین ہو چکے ہیں لیکن اب بھی جو تھوڑے بہت مسلمان مسجدوں میں آتے ہیں اُن کی نمازوں کو اگر جمع کیا جائے اور وہ عیسائیوں پر دس سال میں پھیلا دی جائیں تو تمام عیسائیوں نے دس سال میں اتنی نمازیں نہیں پڑھی ہوں گی جتنی مسلمانوں نے ایک سال میں پڑھی ہوں گی۔ مثلاً سو میں سے اگر پانچ مسلمان نمازیں پڑھتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ چالیس کروڑ میں سے دو کروڑ مسلمان روزانہ نماز پڑھتے ہیں۔ یہ دو کروڑ مسلمان دس کروڑ نمازیں روزانہ ادا کرتے ہیں ہفتہ میں ستر کروڑ نمازیں ہوئیں اور پھر یہ ستر کروڑ نمازیں وہ ہیں جو باجماعت ہیں۔ عیسائیوں میں صرف دو چار فی صدی لوگ نمازیں پڑھتے ہیں۔ ہندوستان میں تو یہ لوگ زیادہ نمازیں پڑھتے ہیں کیونکہ یہاں عموماً وہ دکھاوا زیادہ کرتے ہیں لیکن یورپ میں یہ دو فی صدی بھی نہیں ہوتے۔ بڑے بڑے گرجوں میں صرف پانچ پانچ چھ چھ آدمی اکٹھے ہو جاتے ہیں اور عبادت کر لیتے ہیں لیکن اگر اُن کی اوسط بھی پانچ فی صدی فرض کی جائے تب بھی پانچ فی صدی عیسائیوں کی ہفتہ میں صرف پانچ نمازیں ہوتی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں صرف ایک مسلمان ہفتہ میں ۷ × ۵ نمازیں پڑھتا ہے یعنی پانچ پانچ روزانہ اور ہفتہ میں پانچ فی صدی مسلمانوں کی نمازیں ۱۷۵ ہو جاتی ہیں۔ یہ کتنا بڑا فرق ہے جو مسلمانوں اور عیسائیوں کی نمازیں پایا جاتا ہے کہ پانچ فی صدی عیسائی ہفتہ میں ایک نماز پڑھتے ہیں اور پانچ فی صدی مسلمان ہفتہ میں ۱۷۵ نمازیں پڑھتے ہیں۔ گویا مسیحیوں کی تعداد اگر مسلمانوں کے برابر ہو اور مسیحی گرجوں میں اتنے فی صدی جاتے ہوں جتنے مسلمان نماز پڑھتے ہیں گو ایسا نہیں ہے تو پھر بھی مسلمان مسیحیوں سے ۱۷۵ گُنے زیادہ نماز باجماعت ادا کرتے ہیں۔ پھر ہندوؤں میں تو اتنا بھی نہیں۔ زرتشتیوں میں پادری جاتے ہیں اور سمندر کے کنارے تھوڑی سی دُعا کر لیتے ہیں۔ پس اسلام نے جو نماز مقرر کی ہے اُس کے مقابلہ میں دوسرے تمام مذاہب کی نمازیں ہیچ ہیں۔ عیسائیوں میں تو اب ہفتہ والی نماز بھی نہیں رہی۔ پادری اعلان کرتے ہیں کہ فلاں دن گرجا میں گانا ہو گا اور گانے کی خاطر کچھ لوگ جمع ہو جاتے ہیں لیکن مسلمانوں میں امام خاموشی کے ساتھ مسجد میں آجاتا ہے، نماز پڑھنے والے بھی آجاتے ہیں اور جماعت ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں مسلمانوں میں سے اکثر اب نمازیں نہیں پڑھتے مگر پھر بھی دوسروں کے مقابلہ میں اُن کی نسبت کم نہیں بلکہ بہت زیادہ ہے۔ پس اسلام نے جماعت کا جو عمل قائم کیا ہے اور جس کے ذریعہ اسلام نے قومی اجتماع کی صورت پیدا کی ہے اس کی دنیا میں اَور کہیں مثال نہیں ملتی۔

پھر اس کے ساتھ اسلام نے یہ شرط بھی رکھ دی ہے

کہ اگر اپنے محلہ میں ہو تو اپنے محلہ کی مسجد میں نمازیں
پڑھو۔ دوسرے مذاہب میں یہ بات نہیں بلکہ جس گرجا
میں چاہیں نماز پڑھ لیتے ہیں اور اس طرح دوسرے
ہمسایوں اور خود امام نماز سے اختلاف کی روح نمازوں
تک میں پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اسلام نے جماعت میں
جو فوائد ہو سکتے ہیں اُن کو مکمل کرنے کی کوشش کی ہے
روایات میں آتا ہے کہ ایک صحابیؓ سے کسی نے کہا
کہ چلو فلاں محلہ میں جاکر نماز پڑھیں۔ اُس صحابیؓ نے
کہا میں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے
کہ اپنے محلہ کی مسجد میں نماز ادا کرنی چاہیئے۔ اس لئے
میں تو اپنے ہی محلہ کی مسجد میں نماز ادا کروں گا۔ پس
اسلام کہتا ہے کہ سوائے اس کے کہ کوئی جلسہ کسی دوسری
مسجد میں ہو رہا ہو یا وعظ و نصیحت کا کوئی خاص موقعہ
میسر آئے اپنے محلہ کی مسجد میں نمازیں ادا کرو۔ یہ چیز
عیسائیوں میں نہیں۔ پارسیوں میں نہیں۔ زردشتیوں اور
سکھوں میں نہیں۔ ادھر اُدھر چلے جانے سے جماعت نہیں
بنتی اور نہ نماز باجماعت کی جو غرض ہے وہ پوری ہوتی
ہے۔ ایک مسلمان اگر اپنے محلہ کی مسجد میں نماز نہیں
پڑھتا تو فوراً پکڑا جائے گا۔ اگر وہ کہیگا کہ میں فلاں
مسجد میں نمازیں پڑھتا ہوں تو اُس سے پوچھا جائیگا کہ
تم وہاں نمازیں کیوں ادا کرتے ہو۔ تم اس محلہ میں رہتے
ہو اور اسی میں تمہیں نمازیں ادا کرنی چاہئیں۔ اس کے
بعد اگر تحقیق کی جائے گی تو کوئی نہ کوئی بات ضرور نکل
آئے گی۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ وہ کہدے کہ مجھے اس مسجد
کے امام سے ناراضگی ہے۔ اس صورت میں پھر جماعت
اور نظام کا فرض ہوگا کہ وہ اس مناقشت کو دُور کرے
اور اس طرح پھر قومی جتھہ قائم ہو جائے گا۔ بہر حال یہ
اسلام کی ایک ایسی خوبی ہے جس کی مثال کسی اور مذہب
میں نہیں۔

(۴) پھر اسلامی نماز میں اللہ تعالےٰ نے
صفاتِ الٰہیہ پر غور کرنے کا رستہ کھول دیا ہے۔ مسلمان
اپنی نماز میں روزانہ قرآن کریم پڑھتا ہے۔ دعائیں کرتا
ہے۔ رکوع و سجود میں دعائیں کرتا ہے۔ سورۂ فاتحہ کے
کلمات رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ
نَسْتَعِيْنُ۔ اُس کے سامنے آتے رہتے ہیں اور وہ
اُن پر غور کرتا ہے۔ عیسائیوں میں ایک مقررہ دعا ہے
جو پادری پڑھ دے گا مگر مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ
خود پڑھیں۔ اس طرح اسلام نے صفاتِ الٰہیہ پر فکر کا
راستہ کھول دیا ہے۔

(۵) اسلامی نماز کو اللہ تعالےٰ نے اپنے لقاء کا
ایک ذریعہ بنایا ہے۔ اللہ اکبر کہہ دینے کے بعد گویا
وہ خدا تعالےٰ کے سامنے حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ کسی
سے بات نہیں کرتا۔ مگر گرجوں میں اگر کوئی خوبصورت
لڑکی آ جائے تو سب اُس کی طرف دیکھنا شروع کر دیتے
ہیں لیکن ہماری نماز میں ادھر اُدھر جھانکنا منع ہے۔
نماز پڑھنے والے کلّی طور پر عبادت میں محو ہو جاتے ہیں
دوسرے کے سلام کا جواب بھی نہیں دے سکتے۔ حتّٰی کہ
باہر والے کا بھی حق نہیں ہوتا کہ نمازی کی غلطی پر اس
کو توجہ دلائے۔ مثلاً کوئی نمازی ایک سجدہ زیادہ کر دے
یا کم کر دے تو ایک ایسا آدمی جو نماز میں شامل نہیں
اُسے اس غلطی پر آگاہ نہیں کر سکتا۔ گویا ایک مسلمان
جب نماز پڑھتا ہے تو وہ خدا تعالےٰ کے دربار میں حاضر
ہو جاتا ہے اور کسی باہر والے کا یہ حق نہیں رہتا کہ وہ
اُس کے کام میں دخل دے۔ ہاں وہ شخص غلطی نکال سکتا
ہے جو اُس کے ساتھ جماعت میں شامل ہو۔ اسی طرح
وہ ادھر اُدھر جھانک بھی نہیں سکتا۔ رسول کریم صلے اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو نمازی ادھر اُدھر دیکھے گا

خدا تعالے اُس کا سر گدھے کا سر بنا دیگا۔ اس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسے انسان کی حماقت کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس میں کیا شبہ ہے کہ ایسا شخص اول درجہ کا احمق ہوتا ہے۔ وہ نماز میں اِدھر اُدھر کیوں دیکھتا ہے۔ اِسی لئے کہ اُسے کوئی عجیب چیز نظر آتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جیسی عجیب چیز اَور کون سی ہے اور اگر وہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر اور چیزوں کو دیکھتا ہے تو وہ یقیناً گدھا ہے۔ اُس کے سامنے خدا تعالےٰ جیسا حسین چہرہ ہے اور وہ دیکھ رہا ہے بِلّی یا چوہے کو۔ تو اُس کے گدھا ہونے میں کیا شک ہے۔ پس اسلامی نماز لقاء الٰہی کا ایک زبردست ذریعہ ہے۔ مگر دوسرے مذاہب کی نمازوں میں لقاء الٰہی والی صورت ہی نہیں۔ گرجا میں پادری نماز پڑھا رہا ہوتا ہے تو اُس کا کوئی ساتھی لیمپ اٹھائے ہوئے ہوتا ہے، کوئی پانی اٹھائے ہوئے ہوتا ہے، کوئی اَور کاموں میں مشغول ہوتا ہے مگر نماز اُن سب کی ہو جاتی ہے۔ لیکن اسلامی نماز میں کلام کرنا اور اِدھر اُدھر دیکھنا منع ہے۔ جو دوسرے مذاہب کی نمازوں میں منع نہیں۔

شروع میں صحابہ کرامؓ بھی ایک دوسرے کے ساتھ نماز میں بول لیا کرتے تھے کیونکہ ابھی وہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے پوری طرح واقف نہیں ہوئے تھے۔ نماز پڑھتے ہوئے اگر کوئی آجاتا تو وہ نماز پڑھنے والے سے پوچھ لیا کرتا تھا کہ اب کونسی رکعت ہے اور وہ اُسے بتا دیتا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جب اس بات کا علم ہوا تو آپ نے منع فرمایا۔ چنانچہ اسلام کے رُو سے باہر سے آنے والے کے السلام علیکم کا جواب دینے کی بھی اجازت نہیں۔ کسی کا باپ آجائے، بھائی آجائے، بچہ آجائے، افسر آجائے یا کوئی اَور عزیز آجائے اور وہ السلام علیکم کہے تو وہ اُس کا جواب نہیں دے سکتا۔ وہ تو اِس دنیا میں نہیں ہوتا۔ اِس دُنیا میں ہو تو جواب دے وہ تو خدا تعالےٰ کے سامنے چلا گیا جواب کیا دے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم نماز شروع کرتے ہیں تو اللہ اکبر کہتے ہیں جس کے معنے یہ ہیں کہ اے میرے بھائیو اور میرے عزیزو اور رشتہ دارو! تم بھی مجھے عزیز ہو مگر تم سے زیادہ مجھے خدا تعالےٰ عزیز ہے۔ مَیں اُس کے سامنے جاتا ہوں اور تم سے قطع تعلق کرتا ہوں۔ جب نماز ختم ہوتی ہے تو وہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں اب واپس آگیا ہوں۔ جیسے کوئی باہر سے آنے پر السلام علیکم کہتا ہے اُسی طرح وہ بھی کہتا ہے میں باہر گیا ہوا تھا اب واپس آگیا ہوں۔ یہ کتنی خالص اور مکمل نماز ہے۔

۲۷۱
اسلامی نماز اور دوسرے مذاہب کی نمازوں میں فرق

۲۷۲
اسلامی نماز کی دعاؤں کے لحاظ سے فضیلت

(۶) نماز کے ذریعہ اسلام نے دُعا کا رستہ کھولا ہے۔ دُعائیں دو قسم کی ہوتی ہیں (۱) مقررہ اور (۲) مرخصہ۔ مقررہ میں اعلیٰ درجہ کی دعائیں شامل ہیں جن کو ممکن تھا ہم دُعا کرتے وقت چھوڑ دیتے اور مرخصہ وہ ہیں جو ہم اپنی ضرورتوں کے لئے اپنی زبان میں کر سکتے ہیں۔ ممکن تھا کہ ہم بعض ضروری اور اہم دعاؤں کو چھوڑ دیتے یا وہ ہمارے ذہن میں نہ آتیں۔ سو وہ اللہ تعالےٰ اور اُس کے رسول نے خود مقرر کر دیں مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے ضَآلِّيْنَ تک جو دعا ہے وہ ہمارے ذہن میں نہ آسکتی تھی یا سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ۔ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ وغیرہ کلمات ہیں۔ یہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے تھے اُن کو تو خدا اور اُس کے رسول نے مقرر کر دیا اور باقی اگر ہمارا مالی نقصان ہو جائے، ملازمت میں خرابی واقع ہو جائے، تجارت میں ترقی نہ ہو یا اور کوئی ضرورت درپیش ہو تو اس کیلئے اپنی زبان میں اور اپنی ضروریات کے مطابق دعائیں مانگنے

کی اجازت دے دی۔ اس رنگ کی انفرادی یا قومی طور پر دُعائیں دوسری قوموں کی عبادتوں میں نہیں پائی جاتیں۔

(۷) قرأت بالجہر اور قرأت بالسّر بھی اسلامی نماز کی ایک خصوصیت ہے۔ عیسائیوں کو دیکھو تو پادری وعظ کردے گا۔ بائبل کی ایک آیت کو لے لیگا اور اُسی پر تقریر کردے گا اور یہ اُن کا گرجا ہو جائیگا۔ اس کے بعد وہ اپنی مقررہ دعائیں کریں گے۔ اے خدا تو مجھے کل کی روٹی آج دیدے۔ یا اے خدا جس طرح تیری بادشاہت آسمان پر ہے ویسی ہی زمین پر بھی قائم ہو۔ اس قسم کی چند مقررہ دعائیں ہیں جو وہ کرتے ہیں۔ مگر

اسلامی نماز میں قرأت بالجہر اور قرأت بالسّر

اسلام نے نمازوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ (۱) بالجہر اور (۲) بالسّر۔ اسی طرح بعض حصے ایسے ہیں جن میں امام قرأت بالجہر سے کام لیتا ہے اور ہم اُس کے پیچھے وقفوں میں بالسّر بھی پڑھتے ہیں۔ مثلاً سورۂ فاتحہ اور بعض حصے ایسے ہیں جن میں صرف امام پڑھتا ہے ہم اُسے دُہراتے نہیں۔ خاموشی سے سُنتے ہیں جیسے تلاوت قرآن۔ پھر امام کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم میں سے جو زیادہ متقی ہو وہ امام بنے۔ اب یہ لازمی بات ہے کہ جب زیادہ متقی انسان نماز پڑھائے گا تو اُس کے اندر جو سوز اور درد ہوگا اُس کا دوسروں پر بھی اثر پڑے گا اور اُن میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ حضرت خلیفۃ المسیح اول رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ راولپنڈی میں ایک مؤذن تھا اُس کی آواز بہت سُریلی تھی۔ مسجد کے پاس ہی ایک سکھ رہتا تھا ایک دن اس سکھ کی لڑکی کہنے لگی باپو جی میں تو مسلمان ہو جاؤنگی۔ باپ نے پوچھا۔ تم نے اسلام میں کیا دیکھا ہے؟ وہ کہنے لگی اس مذہب میں بہت سچائی ہے۔ مؤذن اذان دیتا ہے تو ہمیں ایسا درد ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ کی محبت پر دلالت کرتا ہے۔ وہ سکھ رئیس آدمی تھا اُس نے مؤذن کو کسی اَور کام پر لگا دیا۔ مثلاً پہلے اگر وہ پندرہ روپے لیتا تھا تو اب اُس نے کہا اچھا تم پچیس ۲۵ روپے لے لو اور میرے فلاں کام پر چلے جاؤ۔ چنانچہ وہ چلا گیا اور کوئی دوسرا مؤذن آگیا اُسکی آواز اتفاقاً اچھی نہ تھی۔ چند دنوں کے بعد باپ نے پوچھا بیٹی اب اسلام کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ کہنے لگی اب مجھے اسلام کی طرف کوئی رغبت نہیں رہی اور میری سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ مسلمانوں میں اچھے آدمی بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ جیسے ہمارے سکھوں میں اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ پس امامت کے ذریعہ جب ہم زیادہ متقی انسان کی سوز کی آواز سُنیں گے تو ہمارے اندر زیادہ سوز پیدا ہوگا اور اس طرح دُعا کی طرف زیادہ متوجہ ہو جائیں گے۔

(۸) پھر امامت کے لئے اسلام نے کسی خاندان یا کسی خاص قوم کی خصوصیت نہیں رکھی۔ عیسائیوں میں مقررہ ORDAINED پادری کے سوا کوئی دوسرا آدمی نماز نہیں پڑھا سکتا۔ ہندوؤں میں خاص نسل کے پنڈت کے سوا کوئی دوسرا آدمی نماز نہیں پڑھا سکتا۔ سکھوں میں گرنتھی کے سوا کوئی دوسرا آدمی گرنتھ صاحب کا پاٹ نہیں کرا سکتا۔ لیکن اسلام نے کسی خاص گروہ میں سے ہونے کے اصول کو توڑ دیا ہے۔ اُس کے نزدیک ہر انسان جو دیندار ہو امام بن سکتا ہے۔ اُس کے لئے کسی خاص نظام، کسی خاص نسل یا کسی خاص خاندان میں سے ہونا ضروری نہیں۔

یورپین لوگ جب ادھر آتے ہیں اور وہ مسلمانوں کی اس خصوصیت کو دیکھتے ہیں تو وہ حیران ہوتے ہیں۔ اُن میں سے جب تک کسی کے پاس سند نہ ہو نماز نہیں پڑھا سکتا لیکن مسلمانوں میں خدا تعالیٰ نے ہر ایک کو امامت کا حقدار بنا کر اپنے دربار میں مساوات کو قائم کر دیا ہے اور سند صرف تقویٰ کی رکھی ہے۔

پھر اسلامی مساجد میں نماز ادا کرتے وقت کسی قومی یا نسلی امتیاز کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ انگریزوں کے گرجوں میں جگہیں بنی ہوئی ہوتی ہیں اور اُن کے اُوپر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ جگہ فلاں خاندان کے لئے مخصوص ہے۔ یہ جگہ فلاں لاٹ صاحب کے لئے ہے (کیونکہ وہ مثلاً پچیس پونڈ سالانہ چندہ گرجا کو دیتے ہیں) فلاں جگہ فلاں کی ہے اور فلاں جگہ فلاں کی ہے گویا خدا تعالیٰ کی عبادت گاہ بھی بکتی ہے یہی حال دوسری قوموں کا ہے۔ بڑے آدمیوں کے لئے اچھی جگہ رکھی جاتی ہے۔ پاٹ ہو رہا ہے پنڈت بول رہا ہے۔ گرنتھی گرنتھ پڑھ رہا ہے تو ایک بڑے آدمی کو دیکھ کر وہ فوراً بول اُٹھتا ہے۔ سردار صاحب آگئے سردار جی یہاں تشریف لائیے لیکن مسلمانوں میں اگر کوئی ایسا کرے تو سب اُس کے پیچھے پڑ جائیں گے اور کہیں گے جاؤ تمہاری نماز باطل ہو گئی ہے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد جب مسلمانوں میں دولت بڑھ گئی اور غرور آنا شروع ہوا تو بادشاہ ایسا کیا کرتے تھے کہ وہ جب حج کے لئے جاتے تو پہلے اُن کا نوکر آکر مسجد میں اُن کا مصلیٰ بچھا دیتا۔ ایک دفعہ بادشاہ کا مصلیٰ بچھا ہوا تھا کہ ایک غریب آیا اور اُس پر کھڑا ہو گیا سپاہی نے کہا یہ بادشاہ کا مصلیٰ ہے اِس پر تم کیوں کھڑے ہوتے ہو۔ اُس نے جواب دیا یہ بادشاہ کا دربار نہیں۔ اِس دربار میں ہم سب برابر ہیں۔ تب سپاہی نے زیادہ دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تو سارے نمازی کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کہا یہ بڑے بادشاہ یعنی خدا تعالیٰ کا دربار ہے اِس میں دنیاوی بادشاہ کی بھی وہی حیثیت ہے جو ایک نوکر کی ہے۔ کمزور بھی یہاں ایسا ہی ہے جیسا طاقتور ہے مسجد میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور آخر بادشاہ کو بھی جھکنا پڑا۔ چنانچہ اب وہاں باہر ایک جگہ بڑی ہوئی ہے جہاں بادشاہ نماز پڑھ لیتے ہیں مسجد میں نہیں گھستے کیونکہ اگر وہ مسجد میں جائیں تو انہیں وہاں دوسروں کے برابر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ آج تک کئی اسلامی حکومتیں گزری ہیں مگر کسی پر پابندی نہیں لگا سکیں۔ کوئی دھوبی ہو، نائی ہو کمہار ہو اُسے بادشاہ کے پاس کھڑا ہونے سے کوئی شخص روک نہیں سکتا بلکہ بادشاہ تک نہیں روک سکتا پس جہاں اسلام نے امامت کے متعلق کہہ دیا کہ سب مسلمان اس حق میں مساوی ہیں وہاں یہ قانون مقرر کر کے کہ مسجد میں ہر ایک برابر کا حقدار ہے انسانوں میں مساوات قائم کر دی۔

اسلامی نماز میں مساوات

(۹) پھر اسلام نے ایک اور حد بندی بھی توڑ دی۔ عیسائی نے اگر نماز پڑھنی ہو تو وہ گرجے میں جائے گا۔ ہندو نے اگر نماز پڑھنی ہو تو وہ مندر میں جائیگا سکھ نے اگر نماز پڑھنی ہو تو وہ گوردوارہ میں جائے گا لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا میرے لئے ساری زمین مسجد بنا دی گئی ہے۔ عیسائیوں میں صرف گرجوں میں عبادت ہوتی ہے۔ ہندوؤں میں صرف مندروں میں عبادت ہوتی ہے۔ مگر ساری زمین کے چپہ چپہ پر صرف مسلمانوں نے سجدہ کیا ہے۔ ہم جب پہاڑوں پر جاتے ہیں تو جان بوجھ کر مختلف جگہوں پر نماز پڑھتے ہیں تا کوئی جگہ ایسی نہ رہ جائے جہاں خدا تعالیٰ کی عبادت نہ کی گئی ہو۔ دیکھو کتنی نعمت ہے جو اسلام میں پائی جاتی ہے۔ جہاں خدا تعالیٰ نے امامت میں ہر ایک کو حقدار بنا کر اپنے دربار میں مساوات قائم کر دی۔ جہاں مسجدوں میں ہر ایک کو برابر کا حقدار بنا کر انسانوں میں مساوات قائم کر دی وہاں جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا کہہ کر زمین کے چپہ چپہ میں مساوات قائم کر دی۔

اسلامی نماز کے ادا کرنے کے لئے کسی خاص جگہ کی قید نہیں۔

(۱۰) پھر ایک طرف جہاں جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا کہہ کر اُس نے ساری زمین کو مسجد میں تبدیل کر دیا وہاں فرائض کے ساتھ نوافل ملا کر اُس نے

ہر گھر کو مسجد بنا دیا ۔ کیونکہ نوافل کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ پسند فرمایا ہے کہ وہ گھر میں پڑھے جائیں۔ جیسے فرمایا لَا تَجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ مَقَابِرَ۔ اپنے گھروں کو مقبرے نہ بناؤ۔ یعنی جیسے مقابر پر نماز پڑھنی جائز نہیں اسی طرح تم گھروں کو بھی مت سمجھو۔ بلکہ کچھ نمازیں مسجد میں ادا کیا کرو اور کچھ گھروں میں ادا کیا کرو۔ اس طرح خدا تعالےٰ نے چپہ چپہ زمین پر عبادت کے لئے رستہ کھول دیا۔

پھر علاوہ معیّن صورت کی عبادت کے جیسا کہ میں نے بتایا ہے ایک عبادت غیر معیّن صورت میں بھی ہوتی ہے اور وہ ذکر وفکر ہے۔ یہ عبادت غیر معین صورت میں اس لئے رکھی کہ معین صورت کی نماز تو ہر وقت ادا نہیں ہو سکتی۔ لیکن غیر معین صورت کی نماز ہر وقت ادا کی جا سکتی ہے سوتے جاگتے، چلتے پھرتے ہر حالت میں ذکر ہو جاتا ہے۔ کسی شخص نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ اگر ہم عبادت ہی کرتے رہیں تو ہم کام کیسے کریں؟ انہوں نے فرمایا دست در کار و دل با یار۔ اپنے کاموں کو بھی کرتے جاؤ اور ذکر الٰہی بھی کرتے رہو پیشے کرو۔ تجارتیں کرو۔ دوسرے دنیوی کاروبار کرو۔ مگر ساتھ ہی خدا تعالےٰ کو بھی یاد کرتے جاؤ حضرت مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں۔ آپ شاعر بھی تھے۔ آپ کے ایک شاگرد میاں غلام علی تھے جو آپ کے بہت مقرب مُرید تھے ایک دن آپ مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کوئی شخص آیا اور آپ کے لئے بالائی کے لڈو تحفہ کے طور پر لایا۔ آپ کو بالائی کے لڈو بہت پسند تھے۔ حضرت مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ نے اُن میں سے دو لڈو اُٹھا کر اپنے شاگرد میاں غلام علی کو دے دئے اور کہا تمہیں بھی یہ پسند ہوں گے بڑے مزیدار ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ دو لڈو تم بھی لے لو۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ نے پوچھا۔ میاں غلام علی تم نے وہ لڈو کیا کئے؟ میاں غلام علی نے کہا حضور میں نے وہ کھا لئے۔ آپ نے فرمایا اتنی جلدی کھا لئے؟ میاں غلام علی نے کہا وہ چیز ہی کیا تھے۔ ایک ہی دفعہ مُنہ میں ڈالے اور گھُل گئے۔ آپ نے حیرت سے پوچھا۔ اچھا وہ دونوں لڈو تم نے کھا لئے معلوم ہوتا ہے تمہیں لڈو کھانے نہیں آتے۔ اُنہوں نے کہا آپ ہی بتا دیجئے کہ لڈو کس طرح کھائے جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اچھا پھر کسی دن لڈو آئے تو میں تمہیں لڈو کھانے سکھاؤں گا۔ چوتھے پانچویں دن پھر کوئی اور مُرید لڈو لے آیا اور میاں غلام علی نے حضرت مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ تمہیں لڈو کھانے سکھاؤں گا اب لڈو کھانا سکھا دیجئے۔ حضرت مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت ولی اللہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو صفائی کا خاص طور پر بہت خیال رہتا تھا۔ حضرت ولی اللہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو ہر روز دھلوا کر نیا جوڑا پہنا کرتے تھے۔ جب دہلی کا بادشاہ آپ کا مُرید ہُوا تو وہ روزانہ آپ کو ایک نیا جوڑا سلوا کر بھیجا کرتا تھا۔ حضرت مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ بھی بڑی نفیس طبیعت کے تھے۔ کسی چیز کو ٹیڑھی پڑی ہوئی دیکھ کر آپ غصہ میں آ جاتے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص نے اس کو ٹیڑھا رکھا ہے اُس کا دل کیسے صاف ہوگا۔ ایک دفعہ آپ کے پاس ایک بادشاہ ملاقات کے لئے آیا۔ اُس کے وزیر کو پیاس لگی اُس نے آبخورہ اُٹھایا اور پانی پی لیا۔ پانی پی کر اُس نے آبخورہ اُلٹا رکھ دیا۔ حضرت مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کو یہ دیکھ کر

سخت غصہ آیا اور انہوں نے بادشاہ سے فرمایا آپ نے
کیسا بے وقوف وزیر رکھا ہوا ہے جسے آبخورہ بھی سیدھا
رکھنا نہیں آتا۔ غرض آپ کو صفائی کا بہت خیال رہتا تھا
آپ نے جیب سے رومال نکالا اور بڑی احتیاط کے ساتھ
اُسے فرش پر بچھایا۔ پھر اُس پر دو لڈو رکھے اور
ایک لڈو سے چھوٹا سا ٹکڑا لیا۔ مُونہہ میں ڈالا اور
سبحان اللہ سبحان اللہ کہنے لگ گئے۔ پھر فرمایا
میاں غلام علی کیا تم نے کبھی غور کیا کہ یہ لڈو کیسے بنا
مظہر کی حیثیت ہی کیا تھی۔ ذلیل پانی سے پیدا ہوا پھر
لوتھڑا بنا، گوشت پوست بنا اور آخر ایک دن یہ فنا
ہو جائے گا۔ لیکن خدا تعالیٰ کو دیکھو عرش پر بیٹھا
ہوا ہے۔ اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ زمین کو بھی
پیدا کیا، آسمان کو بھی پیدا کیا اور ان کے علاوہ
دوسری چیزوں کو بھی اُس نے پیدا کیا۔ ہر چیز
اُس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اگلے پچھلے علوم اُسے
حاصل ہیں۔ جو چاہے وہ کر سکتا ہے۔ اُس نے خیال
کیا کہ مظہر ایک دن پیدا ہو گا اور بالائی کے لڈو
اُسے اچھے لگیں گے۔ اِس لئے ہم اس کیلئے بالائی
کے لڈو تیار کروائیں۔ میاں غلام علی کیا تم نے کبھی سوچا
کہ پھر اُس نے کہاں سے میٹھا پیدا کیا۔ اُس نے
زمیندار کے دل میں خیال پیدا کیا اُس نے گنا
بویا پھر شکر بنی اور سینکڑوں آدمیوں کو اُس نے اِس
کام میں لگا دیا۔ محض اس لئے کہ مظہر جانِ جاناںؒ
ایک لڈو کھا لے۔ غرض اسی طرح ایک ایک کر کے
تفصیلات بیان کیں اور پھر فرمایا۔ بالائی کو دیکھو جانور
نے کیا کیا کھایا۔ اُس سے دُودھ بنا دُودھ سے
بالائی تیار ہوئی۔ پھر بالائی اور میٹھے سے حلوائی نے
لڈو تیار کئے اور اس لئے کئے تا کہ مظہر جانِ جاناںؒ
ایک لڈو کھا لے۔ آپ اسی ذکر میں لگے جا رہے تھے

اور اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر کر رہے تھے کہ
اذان ہو گئی اور آپ نماز کے لئے تشریف لے گئے
اور لڈو وہیں پڑا رہ گیا۔ غرض اگر ہم نمازیں ہی
پڑھتے رہیں تو دوسرے کام کس طرح کر سکتے ہیں۔
وعظ و نصیحت بھی کرنا ہوتا ہے۔ دنیا کے دوسرے
کام بھی کرنے ہوتے ہیں۔ لیکن ذکر ہر وقت ہو سکتا
ہے۔ ایک روٹی پکانے والا روٹی پکاتا جائے اور
ساتھ ساتھ سبحان اللہ سبحان اللہ بھی کہتا جائے تو
اُس کا کیا حرج ہے۔ پیڑا بنائے اور سبحان اللہ کہے
آٹا پھیلا کر کپڑے پر لگائے تو سبحان اللہ کہے۔
تنور میں لگائے تو سبحان اللہ کہے۔ سیخ کے ساتھ روٹی
ہلائے تو سبحان اللہ کہے۔ روٹی کو نکالے تو سبحان اللہ
کہے۔ اس طرح روٹی بھی پک جائے گی اور ذکر الٰہی
بھی ہوتا رہے گا۔ بجائے باتیں کرنے کے اگر وہ
اس کام میں لگ جائے تو اُس کا کیا حرج ہے یا
مثلاً چکی پیسنے والی عورت ہے وہ چکی بھی پیستی جائے
اور ساتھ ساتھ اللہ اکبر۔ سبحان اللہ۔ الحمد للہ۔
لاحول ولا قوۃ الا باللہ یا جو ذکر بھی مناسب ہو
کرتی جائے تو آٹا کم نہیں ہو جائے گا۔ یا یہ ذکر کرنے
سے آٹا خراب نہیں ہو جائے گا۔ ڈاکٹر اپریشن
کرتا جائے اور ساتھ ساتھ سبحان اللہ سبحان اللہ
کرتا جائے اور غور کرے کہ خدا تعالیٰ نے انسانی جسم
میں کیسا عظیم الشان نظام قائم کیا ہوا ہے۔ اسی طرح
ہر پیشے والا تسبیح کو بھی جاری رکھ سکتا ہے اور اپنا
کام بھی کر سکتا ہے لیکن نمازیں ہر وقت نہیں پڑھی
جا سکتیں۔ ہم کھڑے ہوں تب بھی سبحان اللہ کہہ سکتے
ہیں۔ تیر رہے ہوں تب بھی سبحان اللہ کہہ سکتے ہیں۔
بندوق سے نشانہ کر رہے ہوں تب بھی سبحان اللہ
کہہ سکتے ہیں۔ دوڑ رہے ہوں تب بھی سبحان اللہ کہہ سکتے ہیں

اسلامی ذکر اور اس کے لحاظ سے اسلامی عبادت کی فضیلت

مگر اس قسم کا ذکر اسلام کے علاوہ اور کسی مذہب میں نہیں۔ ہندو کو کہو کہ وہ اپنی کتاب سے نکالے۔ زرتشتی کو کہو کہ وہ اپنی کتاب سے نکالے۔ تمہیں اس قسم کے ذکر کا دوسرے مذاہب میں کہیں نام ونشان بھی نہیں ملے گا۔ غرض خدا تعالیٰ نے اس طرح عبادت کے راستے کھول دئے ہیں کہ اگر کوئی دیانتدار ہو تو وہ مجبور ہے کہ ذکر الٰہی کرے۔

(۱) سب سے بڑا ذکر تو بِسْمِ اللّٰہ ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب کوئی کام کرو تو اُس کے شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لیا کرو۔ بسم اللہ کے بغیر وہ کام بے برکت ہو جائے گا۔ انسان کپڑے پہنے تو پہلے بسم اللہ کہے۔ جوتی پہنے تو پہلے بسم اللہ کہے۔ پانی پئے تو پہلے بسم اللہ کہے۔ برتن مانجے تو پہلے بسم اللہ کہے۔ جانور ذبح کرے تو پہلے بسم اللہ کہے۔ گوشت پکائے تو پہلے بسم اللہ کہے۔ غرض ہر کام شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ کہے۔ بسم اللہ میں اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ دنیا میں جس قدر چیزیں پائی جاتی ہیں یہ سب کی سب اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں اور میں اُس کی اجازت کے ماتحت اُن کو اپنے استعمال میں لا رہا ہوں مثلاً جانور ذبح کرتے وقت جب وہ بسم اللہ کہتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ یہ جانور میں نے کسی سے چھینا نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کا مالک ہے اس نے مجھے کہا ہے کھالو۔ اس لئے میں اِسے ذبح کرتا ہوں۔ پھر مرچ ہے وہ بھی خدا تعالیٰ کی دی ہوئی ہے۔ کوئلہ ہے وہ بھی خدا تعالیٰ کا دیا ہُوا ہے۔ برتن ہیں وہ بھی خدا تعالیٰ کے دئے ہوئے ہیں۔ مَیں تو مستعار طور پر اُس کی ملکیتی چیزوں سے فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ حضرت سید عبد القادر جیلانیؒ کے متعلق آتا ہے کہ آپ اعلیٰ سے اعلیٰ کھانا کھاتے تھے اور اچھے سے اچھا کپڑا پہنتے تھے۔ بعض لوگوں نے آپ پر اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا میں کیا کروں جب تک خدا تعالیٰ مجھے نہیں کہتا۔ اے عبد القادر جیلانیؒ تجھے میری ذات ہی کی قسم تُو کھا۔ اُس وقت تک میں نہیں کھاتا اور جب تک خدا تعالیٰ مجھے یہ نہیں کہتا کہ اے عبد القادر جیلانیؒ تجھے میری ذات ہی کی قسم تو فلاں کپڑا پہن۔ تب تک میں کپڑا نہیں پہنتا۔ سید عبد القادر جیلانیؒ کو تو خدا کہتا ہو گا کہ تُو ایسا کر۔ مگر ہر مسلمان جب کسی کام کے کرنے سے پہلے بسم اللہ کہتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے حکم سے ہی ایسا کہتا ہے پس ہر مسلمان ہی درحقیقت ہر کھانا خدا تعالیٰ کے حکم سے کھاتا ہے اور ہر کپڑا اُس کے حکم سے پہنتا ہے۔

(۲) دوسرا ذکر اَلْحَمْدُ لِلّٰہ ہے جو ہر کام کے ختم ہونے پر کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاٰخِرُ دَعْوٰھُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (یونس ع۱) مومنوں کا آخری قول یہی ہوتا ہے کہ سب تعریفیں اُس خدا کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

(۳) تیسرا ذکر سُبْحَانَ اللّٰہِ ہے جو ہر تعجب انگیز اور بڑے کام پر کیا جاتا ہے۔ اگر اس پر بھی غور کیا جائے تو یہ ذکر اپنے اندر بڑی حکمتیں رکھتا ہے۔

(۴) پھر مصیبت کے اوقات کے لئے اسلام نے یہ ذکر سکھایا کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ یعنی جب تم پر کوئی مصیبت آئے تم اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہو۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ ہم اُسی کے ہیں اور بالآخر ہم نے بھی اُسی کی طرف جانا ہے اگر کوئی عزیز مجھے مل گیا تھا تو یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ملا تھا اور اب جبکہ اُس نے واپس لے لیا ہے میرے لئے

غم کی کون سی بات ہے۔ پھر اگر کوئی گلاس ٹوٹ گیا تو کہہ دیا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ یہ گلاس بھی آخر خدا تعالےٰ نے ہی دیا تھا ہم نے بھی اُسی کے پاس جانا ہے وہاں اور گلاس مل جائیں گے۔ غرض ہر نقصان کے وقت اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہنا انسانی فطرت کو زنگ سے صاف کر دیتا ہے۔

(۵) پھر اگر کوئی مکروہ بات یا مکروہ نظارہ پیش آجائے تو اس موقعہ کو اسلام نے ذکر کے بغیر نہیں چھوڑا بلکہ ہدایت دی کہ جب کوئی مکروہ چیز دیکھو تو لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کہو۔

(۶) پھر انسان کے اندر گناہ کی کوئی تحریک پیدا ہو تو ایسے موقعہ پر اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ کا ذکر رکھ دیا۔ یعنی میں شیطانی حملوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں۔

(۷) پھر اَعُوْذُ بِاللّٰہِ ایک ذکر ہے جو ہر ایسے اہم کام کے شروع کرنے پر کیا جاتا ہے جس کے راستہ میں شیطانی روکوں کا امکان ہو۔ مثلاً قرآن کریم پڑھنا ایک اہم کام ہے اور چونکہ شیطان اس میں روکیں پیدا کرتا ہے اس لئے فرمایا فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ (نحل ع)

(۸) اس کے علاوہ انسان سونے لگے تب بھی ذکر موجود ہے۔ چنانچہ ہدایت ہے کہ آیۃ الکرسی اور تینوں قُل پڑھو اور اپنے سینہ پر پھونک لو۔

(۹) آنکھ کھلے تب ذکر موجود ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ۔

(۱۰) اسی طرح بیماری کے وقت بھی ذکر موجود ہے اور شفا ہونے پر بھی ذکر الٰہی موجود ہے۔

(۱۱) پاخانہ جانا بظاہر کتنا گندہ فعل ہے مگر وہاں بھی مناسب حال ذکر موجود ہے یعنی اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ۔

(۱۲) پھر غسل کرنے لگو تب بھی ذکر موجود ہے۔

(۱۳) میاں بیوی کے مخصوص تعلقات کو لو تو اُس موقعہ پر بھی ہمارے کو ثر والے آقا نے کہا کہ جب تم آپس میں ملنے لگو تو خدا تعالےٰ کا پہلے ذکر کرو۔ یعنی اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنِی الشَّیْطٰنَ وَجَنِّبِ الشَّیْطٰنَ مِنْ مَّا رَزَقْتَنَا پڑھ لیا کرو۔

غرض انسانی زندگی کا کوئی حصہ بھی ایسا نہیں خواہ وہ جذبات کے اظہار کا ہی ہو جہاں کوئی نہ کوئی ذکر موجود نہ ہو۔

اس کے علاوہ اسلام نے عبادت کے بعض اور حصے بھی بتلائے ہیں جو دس قسم کے ہیں۔

اسلامی عقیدہ عبادت کے علاوہ اسلامی عبادت کے بعض حصے

(۱) تفکر۔ یہ خدا تعالےٰ کی ہستی تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔ تفکر کے معنے ہیں ذہنی اور فلسفیانہ الجھنوں پر غور کرنا۔

(۲) شکر۔ خدا تعالےٰ فرماتا ہے لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ (ابراہیم ع) جذبۂ شکر فکر کو مدد دیتا ہے اور قرب الٰہی کی راہیں انسان پر کھلنے لگ جاتی ہیں۔

(۳) تذکّر۔ تذکّر اور تفکّر میں فرق ہے تفکّر کسی ذہنی مسئلہ پر غور کرنے کو کہتے ہیں اور تذکّر کسی پچھلے واقعہ کو یاد کر کے نتیجہ نکالنے کو کہتے ہیں جس کو عبرت بھی کہتے ہیں۔ یہ بھی دل کی صفائی کا ایک بھاری ذریعہ ہے۔

(۴) شعور۔ انسان کی فطرت میں جو جذبات ہیں اُن پر غور کر کے اُنہیں باہر نکالنا شعور کہلاتا ہے فطرت میں بہت سے احساسات اور جذبات پائے جاتے ہیں اگر ہم اُن کو اُبھاریں تو وہ بڑی ترقی کا موجب

ہو سکتے ہیں۔

(۵) **علم**۔ یہ جگ بیتی کا نام ہے ستذکرہ آپ بیتی کو کہتے ہیں اور علم جگ بیتی کو۔ کہانیوں میں بھی آتا ہے کہ آپ بیتی کہوں یا جگ بیتی۔ اگر یہ علم ہو جائے کہ فلاں آدمی نے یہ یہ اعمال کئے تھے جن سے خرابیاں پیدا ہوئیں تو بہت کچھ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

(۶) **فقہ**۔ فقہ کا جذبہ بھی انسان کو نیکی کی طرف لے جاتا ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ فقہ ہر اُس مسئلہ علمیہ کو کہتے ہیں جو ظاہر پر دلالت کرے اور اُس کے ساتھ ہم اُس کے باطنی اثرات کو سوچیں فکر مسئلہ فلسفیہ کے لئے آتا ہے اور تفقہ مسئلہ علمیہ کے لئے آتا ہے۔

(۷) **عقل**۔ اِس سے بھی اگر کام لیا جائے تو انسان کے اندر ایک ایسا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو اُسے بُرے اور بھلے کی تمیز کروا دیتا ہے اور برائیوں سے روک دیتا ہے۔ جیسے موٹر کی بریک ہوتی ہے عقل بھی انسانی دماغ کی بریک ہے۔

(۸) **اِبصار**۔ قرآن کریم میں آتا ہے اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (قصص ع - زخرف ع - ذاریات ع) اس کے معنے ہیں رُوحانی آنکھ سے دیکھنا۔ اِس سے بھی بڑی بڑی باتیں نکلتی ہیں۔ جن سے انسان کی اصلاح ہوتی ہے۔

(۹ و ۱۰) **رویت و نظر**۔ یہ دونوں قریب قریب معنوں والے الفاظ ہیں۔ لیکن اِن میں فرق بھی ہے۔ جہاں تک ظاہر معنوں کا سوال ہے یہ آپس میں مشترک ہیں اور دیکھنے کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں لیکن اِن میں فرق یہ ہے کہ رویت اُس دیکھنے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ شعور قلبی شامل ہو اور نظر اُس دیکھنے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ قوتِ فکریہ شامل ہو۔

غرض تفکر، شکر، تذکر، شعور، علم، فقہ، عقل، اِبصار، رویت اور نظر یہ دس اسلامی عبادات کے حصے ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں الگ الگ موقعوں پر بیان کیا ہے۔ دنیا کا اور کوئی مذہب نہیں جس میں اِس عبادت کا ایک حصہ بھی بیان ہوا ہو۔

زکوٰۃ اور اس کی حکمت

زکوٰۃ۔ نماز فرض و نفل اور معین اور غیر معین کے بعد اب ہم زکوٰۃ کو لیتے ہیں۔ اِس مسئلہ کو بھی قرآن کریم نے جس تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے اُس کی مثال کسی اور کتاب میں نہیں ملتی۔ یوں تو بائبل میں بھی لکھا ہے کہ دسواں حصہ زکوٰۃ دی جائے اور ہندوؤں میں بھی صدقہ و خیرات کی تعلیم ہے لیکن اُن میں وہ تفصیلات بیان نہیں کی گئیں جو اسلام نے پیش کی ہیں۔

(۱) اسلام سب سے پہلے یہ اصل بیان فرماتا ہے کہ تمام ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ وہ یہ تعلیم پیش کرتا ہے کہ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (مائدہ ع، عمران ع) آسمانوں اور زمین کی حقیقی مالکیت اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے کسی انسان کو حاصل نہیں۔

(۲) دوسرا اصل اسلام یہ پیش کرتا ہے کہ تمام ملکیت اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام بندوں کیلئے پیدا کی ہے۔

(۳) تیسرا اصل وہ یہ پیش کرتا ہے کہ اُس کے سب بندوں کا حق سب ملکیت میں شامل ہے۔ جیسے شاملات دیہہ ہوتی ہے اور اُس میں ہر ایک کا حصہ ہوتا ہے۔ اِسی طرح اِس ملکیت میں سب لوگ حصہ دار ہیں۔ مگر شاملات دیہہ میں تو بعض کا حصہ زیادہ ہوتا ہے اور بعض کا کم۔ خدا تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ اُس نے سب کا حق سب ملکیت میں مساوی قرار دیا ہے

ان تین اصول کے نتیجہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام بنی نوع انسان کا تمام ملکیت میں حق ہے تو وہ اپنے حقوق کو کس طرح حاصل کر سکتے ہیں مثلاً امریکہ میں ایک پہاڑی ہے جس میں ہمارا حصہ ہے لیکن ہم ہندوستان میں رہتے ہیں ہم اپنا حصہ نہیں لے سکتے امریکہ والوں نے اس پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ اس صورت میں ہم کیا کریں۔ اسلام اس مشکل کو حل کرنے کیلئے

(۴) چوتھا اصل یہ پیش کرتا ہے کہ چونکہ قبضہ اور عمل بھی ایک حق رکھتا ہے اس لئے قابض اور عامل کو کچھ زائد حق ملے گا۔ مثلاً امریکہ والوں نے اگر اُس پہاڑی پر قبضہ کر لیا ہے تو وہ کچھ شرائط کے ساتھ اُس قبضہ کو قائم رکھ سکتے ہیں اور وہ شرائط یہ ہیں۔

اوّل۔ جو قبضہ کرنے والے ہیں وہ تسلیم کریں کہ اس میں دوسروں کا بھی حق ہے

دوم۔ جب اُن کے پاس اپنے اقل حق سے زیادہ ہو تو وہ باقی حقداروں کیلئے ایک کیپیٹل لیوی ادا کریں۔ جس کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنی آمد میں سے چالیسواں حصہ دوسروں کے لئے نکال دیا کریں اور یہ بھی ایک دفعہ نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے یہ حکم ہے اور ظاہر ہے کہ ہمیشہ دینے کا تو سوال نہیں صرف چالیس سال کے قبضہ میں ہر سال چالیسواں حصہ دے کر وہ چیز اصل حقداروں کی طرف لوٹ آئے گی اور بعد کی آمد زائد آمد ہو گی۔ یہی وہ چیز ہے جسے زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔

(۵) پانچواں اصل اسلام نے یہ مقرر کیا ہے کہ کوئی شخص مال کو روپیہ کی صورت میں جمع نہ کرے بلکہ اُسے چکر میں رکھے تاکہ دوسرے لوگ اُس سے فائدہ اُٹھاتے رہیں۔

(۶) چھٹا اصل اسلام نے یہ مقرر کیا کہ باوجود زکوٰۃ کی ادائیگی کے اُمراء، غرباء کی خبرگیری کے ذمہ دار ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ اگر کوئی غریب باقی رہ جائیگا تو اس کی ذمہ داری تم پر ہو گی اور اس کے متعلق خدا تعالیٰ تم سے قیامت کے دن سوال کرے گا۔ احادیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ اپنے بعض بندوں سے کہے گا کہ مَیں تم پر بہت خوش ہوں۔ اِس لئے کہ میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کھلایا۔ میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی پلایا۔ میں ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا پہنایا۔ مَیں بیمار تھا تم نے میری تیمار داری کی۔ بندے استغفار کریں گے اور کہیں گے یا اللہ بھلا تو کہاں اور ہم کہاں۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ تُو بھوکا، پیاسا ننگا اور بیمار ہو۔ اللہ تعالیٰ فرمائیگا اے میرے بندو! جب تمہارے پاس میرا ایک غریب بندہ آیا اور تم نے اُسے کھانا کھلایا تو گویا میں ہی بھوکا تھا جسے تم نے کھانا کھلایا اور جب تمہارے پاس میرا ایک غریب بندہ آیا اور وہ ننگا تھا اور تم نے اُسے کپڑے پہنائے تو گویا میں ہی ننگا تھا جسے تم نے کپڑے پہنائے اور جب میرا کوئی بندہ تمہارے پاس آیا اور وہ پیاسا تھا اور تم نے اُسے پانی پلایا تو گویا میں ہی پیاسا تھا جسے تم نے پینے کو دیا اور جب میرا کوئی بندہ بیمار ہوا اور تم اس کی عیادت کے لئے گئے تو گویا وہ بیمار مَیں ہی تھا جس کی تم نے عیادت کی۔ پھر اللہ تعالیٰ بعض اور بندوں سے مخاطب ہو گا اور اُن سے کہے گا کہ دیکھو میں بھوکا تھا مگر تم نے مجھے کھانا نہ کھلایا۔ مَیں پیاسا تھا مگر تم نے مجھے پانی نہ دیا۔ میں ننگا تھا مگر تم نے مجھے کپڑا نہ پہنایا۔ مَیں بیمار تھا مگر تم نے میری عیادت نہ کی۔ اِس پر وہ کہیں گے کہ خدایا ایسا کب ہُوا۔ تُو تو بڑی شان والا ہے اور تُو بھوک اور پیاس اور بیماری اور ننگے ہونے سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیگا۔

کہ جب تمہارے پاس میرے غریب بھوکے، پیاسے ننگے اور بیمار بندے آئے اور تم نے اُن کی خبرگیری نہ کی تو گویا میری ہی خبرگیری نہ کی۔ اِس لئے جاؤ اور اب اُس کی سزا برداشت کرو۔ پس صرف زکوٰۃ کا ہی سوال نہیں۔ اگر زکوٰۃ دینے کے بعد بھی کوئی غریب نظر آتا ہے تو اسلام اُس کی خبر کرنا ہر مسلمان پر فرض قرار دیتا ہے۔

دوسرے مذاہب کے روزوں کے مقابلہ میں اسلامی روزے

(۷) پھر اسلام نے مختلف غلطیوں کا کفارہ غرباء کی مدد کی صورت میں مقرر کیا ہے۔ بعض مقامات پر غلاموں کی آزادی ضروری قرار دی تھی اور بعض جگہ انہیں کھانا اور لباس وغیرہ دینا کفارۂ گناہ کے طور پر لازمی قرار دیا ہے۔

(۸) اِس کے علاوہ اسلام نے ہر عبادت کے موقع پر غرباء کا حق مقرر کیا ہے۔ مثلاً فرمایا تمہیں اللہ تعالیٰ نے روزے رکھنے کی توفیق عطا فرمائی ہے تو غریبوں کو کھانا بھی کھلاؤ۔ عید آرہی ہے تو غرباء کے لئے بھی صدقہ دو۔ حج کے لئے چلے ہو تو غرباء کا بھی خیال رکھو۔

(۹) فتوحات حاصل ہوں تو اُس وقت بھی اسلام نے غرباء کے حقوق کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ اموال میں اُن کو بھی حصہ دار قرار دیا ہے۔

حج اور اس کی حکمت

(۱۰) پھر بچہ کی پیدائش ہو تو حکم دیا کہ عقیقہ کرو اور غریبوں کو کھانا کھلاؤ۔

(۱۱) شادی پر حکم دیتا ہے کہ ولیمہ کرو اور غریبوں کو کھانا کھلاؤ۔

(۱۲) کسی کی وفات ہو جائے تو حکم دیا کہ تقسیم ورثہ کے علاوہ میّت کے مال میں سے کچھ یتیموں کو بھی دو۔

(۱۳) ہر نئی فصل یا نئے پھل کے پیدا ہونے پر غرباء کا حق مقرر کیا اور حکم دیا کہ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (انعام ع ۱۷) آم، انگور، گیہوں، مکئی

اور کپاس غرض جو بھی چیز اپنے گھر لاؤ اُس میں سے پہلے غرباء کا حق نکالو اور پھر اپنے استعمال میں لاؤ۔

غرض ہر اہم موقعہ پر اسلام نے غرباء کے حقوق کو مدنظر رکھا ہے اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی مثال اور کسی مذہب میں نہیں ملتی۔ دنیا کا کوئی مذہب نہیں جس نے اس عبادت کو اس طرح پیش کیا ہو۔ بلکہ اُن کی تعلیموں میں اسلام کی تعلیم کا سواں حصہ بھی موجود نہیں۔

روزے۔ پھر روزہ ہے۔ اجتماعی روزہ کسی اَور قوم میں نہیں۔ چند روزے عیسائیوں میں ہیں اور وہ بھی نامکمل شکل میں۔ ہندوؤں میں بھی ایسے ہی روزے ہیں۔ پنڈت کہے گا چُولھے کی پکی نہیں کھانی اور اِدھر چھ سیر کچا دُودھ پی جائے گا اور پھر کہیگا میرا روزہ ہے۔ لیکن اسلام میں ایک مہینہ متواتر اور لگاتار روزے ہیں اور پھر ساتھ ہی یہ ہدایت ہے کہ صرف روزے ہی نہ رکھو بلکہ رمضان کے مہینہ میں خوب عبادتیں کرو اور دعاؤں پر زور دو۔ بالخصوص رمضان کے آخری ہفتہ میں جس میں لیلۃ القدر ہوتی ہے پس روزہ میں بھی اسلام دوسرے مذاہب پر فضیلت رکھتا ہے۔

حج۔ اسلام کا ایک رُکن حج ہے جو اجتماعِ قومی کا زبردست ذریعہ ہے۔ دنیا کے کسی مذہب میں حج فرض نہیں۔ لیکن اسلام نے سال میں ایک دفعہ تمام صاحبِ استطاعت لوگوں کو ایک مرکز میں اکٹھا ہونے کا حکم دیا ہے۔ اِس سے کئی قسم کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ جب امیر اور غریب۔ حاکم اور محکوم عالم اور جاہل سب ایک جگہ اکٹھے ہوں گے تو وہ قومی ضروریات پر غور کریں گے۔ نئی ضروریات پر نگاہ دوڑائیں گے اور اُن کو دُور کرنے کی کوشش کریں گے۔ اِسی طرح

حج کے ذریعہ اسلام نے مرکز کی اصلاح کی طرف بھی
توجہ دلائی ہے جس سے آگے قوم کی درستی ہوتی ہے
اور وہ ترقی کی طرف اپنا قدم بڑھا سکتی ہے۔ غرض
عبادت کو لے لو یا زکوٰۃ کو لے لو یا روزہ کو لے لو یا
حج کو لے لو. سب میں اسلام نے بنی نوع انسان کو جو
تعلیم دی ہے اُس کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے
مذہب میں نہیں پایا جاتا۔

اُصولِ شرائع میں قرآن کریم کی فضیلت ثابت
کرنے کے بعد اب مَیں تفصیلِ شرائع کو لیتا ہوں اور
یہ بتانا چاہتا ہوں کہ صرف اصولی اُمور میں ہی قرآن کریم
کو کتب سابقہ پر فوقیت حاصل نہیں بلکہ تفصیلِ شرائع
میں بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو کوثر عطا ہوا ہے
اور کوئی دوسری کتاب اس پہلو کے لحاظ سے بھی
قرآن کریم کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

تفصیلِ شرائع میں جو چیز سب سے پہلے آتی ہے
وہ عورتوں کے حقوق کا مسئلہ ہے۔ قرآن کریم میں
حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ
نے آپ کے جوڑے کا بھی ذکر کیا ہے جس سے آگے
سلسلۂ مخلوقات چلا۔ لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
سے پہلے کی تمام کتابوں کو پڑھ جاؤ اُن میں عورتوں
کے حقوق کا پتہ ہی نہیں چلے گا اور نہ کسی کتاب نے
اِس بات پر زور دیا ہے کہ عورت بھی انسانیت کا
ایک جزو ہے۔ قرآن کریم وہ پہلی کتاب ہے جس نے
عورت کے حقوق کو تسلیم کیا ہے اور صرف تسلیم ہی
نہیں کیا بلکہ اِس پر اتنا زور دیا ہے کہ یُوں معلوم ہوتا
ہے کہ نئے علوم کا ایک دروازہ کھل گیا ہے۔ مثلاً
نکاح کے موقعہ پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے
جو تین آیات منتخب فرمائیں (ہم سمجھتے ہیں کہ آپ کا یہ
انتخاب الہامی تھا) اُن میں عورت کے حقوق پر بڑا
زور دیا گیا ہے اور اس کی اہمیت پوری طرح واضح
کی گئی ہے۔ چنانچہ پہلی آیت کو ہی لے لو۔ اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ
الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ
مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا
وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ
بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ
رَقِيبًا (نساء ع ۱) اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے
یہ حقیقت بیان فرمائی ہے کہ اُس نے سب انسانوں کو
نفسِ واحدہ سے پیدا کیا ہے یعنی مرد اور عورت دونوں
ایک جنس سے ہیں۔ دونوں ایک ہی قسم کا دماغ لیکر
آتے ہیں۔ ایک ہی قسم کے احساسات لے کر آتے
ہیں اور ایک ہی قسم کے جذبات لے کر آتے ہیں۔
دیکھو پہلے فقرہ میں ہی عورت کے حقوق پر کتنا زور دیا
گیا ہے اور کس طرح بنی نوع انسان کو اس امر کی طرف
توجہ دلائی گئی ہے کہ تم یہ مت سمجھو کہ عورت میں دماغ
نہیں اور تم جس طرح چاہو اُس پر حکومت کر سکتے ہو یا
جس طرح چاہو اُس سے سلوک کر سکتے ہو۔ عورت بھی
تمہاری طرح جذبات اور احساسات رکھتی ہے اور وہ
بھی تمہاری طرح دماغ رکھتی ہے۔ اِس لئے اُسے اپنے
جیسا سمجھو۔ ادنیٰ اور ذلیل قرار نہ دو۔ اس اصولی تعلیم کے
علاوہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے متبعین کو
یہ ہدایت بھی دی ہے کہ اُنہیں اہم امور میں عورتوں سے
مشورہ لینا چاہیئے اور آپ خود بھی عورتوں سے مشورہ
لیا کرتے تھے اور اس بارہ میں اُنہیں اس قدر آزادی
حاصل تھی کہ احادیث میں آتا ہے آپ نے ایک دفعہ
گھر سے باہر رہنے کا فیصلہ کیا۔ صحابہؓ میں یہ چرچا ہوگیا
کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو
طلاق دے دی ہے۔ حضرت عمرؓ کی ایک بیٹی بھی

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں تھیں۔ اُنہیں ایک دوست نے یہ اطلاع دی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی سب بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ حضرت عمرؓ یہ سنتے ہی پہلے اپنی بیٹی کے پاس گئے۔ دیکھا تو وہ رو رہی تھیں۔ آپ نے پوچھا کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا بات یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے گھر سے باہر رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور آپ گھر سے چلے گئے ہیں۔ پھر حضرت عمرؓ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ بات یہ ہے کہ ہم تو عورتوں کو ڈنڈے سے سیدھا کیا کرتے تھے۔ پھر آپ نے ایسی تعلیم دینی شروع کر دی کہ عورتیں ہمارے سر چڑھنے لگیں۔ میں نے ایک دن اپنی بیوی سے کہا کہ تُو اِس معاملہ میں نہیں بول سکتی۔ تو میری بیوی نے کہا چل چل وہ دن گئے جب ہمارا کوئی حق نہیں تھا۔ اب تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی اپنی بیویوں سے مشورہ لیتے ہیں۔ تم کون ہو جو مجھے روکو۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کا نتیجہ کسی دن بُرا ہی نکلے گا۔ چنانچہ یہ اسی بات کا نتیجہ ہے کہ آپکو اپنی بیویوں کو طلاق دینی پڑی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے اور آپ نے فرمایا۔ عمرؓ میں نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی۔ صرف مصلحتاً کچھ وقت کے لئے اُن سے علیحدہ رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ گویا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عورت کے حقوق پر اتنا زور دیا کہ عورتوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ وہ مردوں سے کم نہیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ کے واقعات سے تو پتہ چلتا ہے کہ آپ اگر کوئی حکم دیتے تو بعض دفعہ عورتیں صاف صاف کہہ دیتیں کہ یہ حکم آپ کس طرح دے رہے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تو یوں فرمایا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ صحیح کہتی تھیں یا غلط اِس سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ اسلام نے عورت کو اجتماعی معاملات میں رائے دینے کا حق دیا ہے اور اس پر اتنا زور دیا ہے کہ اس کی مثال دنیا کی کسی اور کتاب میں نہیں مل سکتی۔

پھر فرمایا۔ عورت کی مرضی کے بغیر اسکی شادی نہیں ہو سکتی۔ اسلام سے پہلے یہ رواج تھا کہ والدین جہاں چاہتے عورت کی شادی کر دیتے۔ اُس کی مرضی کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھا اور عورت کو اُن کی بات ماننی پڑتی تھی۔ مسلمانوں نے بھی اس زمانہ میں اگرچہ یہ حق تلف کر دیا ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اسلامی تعلیم ناقص ہے۔ اسلام نے یہاں تک کہا ہے کہ عورت کی مرضی کے بغیر اگر کوئی شادی ہو تو وہ باطل ہے۔ کتنا بڑا حق ہے جو قرآن کریم نے عورتوں کو دیا ہے۔ پھر قرآن کریم میں دیکھ لو۔ بچے کا دودھ چھڑانا بھی عورت کی مرضی پر رکھا ہے اور اسے ایسی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اُس کی مثال اور کسی کتاب میں نہیں ملتی۔ پھر عورت کو الگ گھر کا حق دیا ہے۔ اُس کا مہر مقرر کیا ہے اور کہا ہے کہ عورت اپنی جائداد کی آپ وارث ہے۔ یورپ میں اب قریبًا پچاس سال سے عورتوں کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے عورت کی جائداد اُس کی اپنی جائداد نہیں سمجھی جاتی تھی۔ بلکہ بعض لوگ نواب اور رئیس بن کر اور اپنے آپ کو مالدار ظاہر کر کے دھوکہ سے اُن سے شادی کر لیتے تھے اور عورت کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ خاوند کو اختیار ہوتا تھا کہ وہ اسکی جائداد کو بیچے یا رکھے۔ لیکن اسلام نے عورت کی جائداد کو اُس کی ذاتی ملکیت قرار دیا ہے اور اس پر اتنا زور دیا ہے کہ صحابہؓ کو شبہ پڑ گیا کہ مرد کیلئے

یہ بھی جائز نہیں کہ عورت کی جائداد میں سے کچھ اُس
کی مرضی سے ہی لے لے۔ چنانچہ اس کے لئے اسلام
نے علیحدہ حکم دیا اور بتایا کہ تم عورت کا خوشی سے دیا
ہُوا تحفہ استعمال کر سکتے ہو۔ غرض اسلام نے عورت
کے حقوق کی جس طرح حفاظت کی ہے ویسی حفاظت
اور کسی مذہب نے نہیں کی۔

پھر سب سے مقدم ماں باپ ہیں۔ ماں باپ
کے ذریعہ سے نسل چلتی ہے۔ انسان میں جو قابلیت
پیدا ہوتی ہے وہ ماں باپ کے ذریعہ سے ہی پیدا
ہوتی ہے۔ اگر ماں باپ اپنی اولاد کو نہ پڑھائیں تو
وہ کس طرح دنیا میں عزت حاصل کر سکتی ہے۔ ماں
باپ اگر اپنے بچوں کی پرورش نہ کریں تو وہ کس طرح
بڑے ہو سکتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ عجیب
بات ہے کہ کوئی مذہب ایسا نہیں جس نے اولاد کے
مال میں ماں باپ کا حق تسلیم کیا ہو۔ تورات میں
بے شک ایسے احکام پائے جاتے ہیں کہ ماں باپ
کا ادب کرو۔ مگر اولاد کے مال میں اُن کا حق نہیں
رکھا۔ یہ قرآن کریم ہی ہے جس نے اُن کا حق رکھا ہے
اور بڑا اہم حق رکھا ہے۔ قرآن کریم نے والدین کو
اولاد کے ورثہ کا حقدار تسلیم کیا ہے۔ بلکہ بعض صورتوں
میں جب اولاد زیادہ ہو تو ماں باپ کو اولاد سے
زیادہ حق ملتا ہے۔ یعنی اگر مرنے والے کی اولاد
زیادہ ہو تو اولاد کا حق کم ہو جائے گا اور ماں باپ
کا حق زیادہ ہو جائے گا۔ یہ ایک ایسی چیز ہے
جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ کوئی مذہب ایسا
نہیں جس نے ماں باپ کے ایسے حقوق مقرر کئے
ہوں۔ یہ تو سب کہتے ہیں کہ ماں باپ کا لحاظ کرو۔
ادب کرو۔ عزت کرو۔ مگر تمام باتیں صرف زبانی
جمع خرچ تک محدود ہوتی ہیں۔ اسلام ہی ہے جس نے
اولاد کے مال میں والدین کا حق قائم کر کے اُن کے
مرتبہ کو تسلیم کیا ہے۔

پھر لڑکی کو وراثت کا حق نہیں تھا۔ اسلام نے
اس کے حق کو بھی قائم کیا اور فرمایا کہ لڑکی بھی جائداد
کی ویسی ہی وارث ہو سکتی ہے جیسے لڑکا۔ اور وہ
اُس جائداد پر پورا حق رکھتی ہے۔

درحقیقت اسلام بنی نوع انسان کو اس نکتہ
کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ کہ جس طرح دنیا کی دولت
مشترک ہے کسی ایک کی حقیقی ملکیت نہیں۔ اس طرح
تمہاری کمائی میں بھی ہر ایک کا حق ہے۔ کیونکہ کوئی
اکیلا نہیں کما سکتا۔ بلکہ اُسے دوسروں کو اپنے ساتھ
شامل کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے وہ جب بھی کمائے گا
اُس میں دوسروں کا حق ہو گا۔ اس کی موٹی مثال یہ
ہے کہ بڑی بڑی تجارتیں شہروں میں ہی ہوتی ہیں۔
گاؤں میں نہیں ہوتیں۔ شہروں میں کیوں زیادہ ہوتی
ہیں۔ اس لئے کہ شہروں میں نقل و حرکت کے سامان
موجود ہوتے ہیں۔ پکی سڑکیں ہوتی ہیں۔ ریل ہوتی ہے
لاریاں ہوتی ہیں اور دوسرے ذرائع نقل و حمل موجود
ہوتے ہیں۔ شہروں میں کیوں ہوٹل کھولے جاتے ہیں
اِس لئے کہ وہاں بہت لوگ ہوتے ہیں۔ گاؤں میں اگر
ہوٹل کھولا جائے تو وہ نہیں چل سکتا۔ پھر شہروں میں
سرائیں ہوتی ہیں لوگ آتے ہیں اور اُن میں ٹھہرتے
ہیں۔ گاؤں میں سرائے نہیں ہوتی۔ پھر گاؤں میں بڑے
بڑے سٹور نہیں ہوتے کہ جہاں کوئی مال رکھ سکے۔
یہ ساری چیزیں فردی طور پر نہیں بلکہ مجموعی آبادی
کی وجہ سے لوگوں کو میسر آتی ہیں۔ اس لئے جو کچھ شہری
کماتا ہے اُس میں دوسروں کا بھی حصہ ہوتا ہے اِس
لئے اسلام نے یہ قانون بنا دیا کہ جو کوئی کمائی کرتا
ہے اُس میں اُس کے ہمسایوں کا بھی حق ہے کیونکہ

اگر وہ نہ ہوتے تو وہ کما نہ سکتا - پھر فرمایا یہ حق ہمسائیوں کو مفت نہیں دیا جا رہا - بلکہ اس لئے دیا گیا ہے کہ اُن کا وجود تمہیں فائدہ پہنچا رہا ہے - اگر گھر نہ ہوتا تو کمائی بھی نہ ہوتی - پس دوسرے لوگ چونکہ کمائی کا موجب ہیں اس لئے اُن کا بھی اس کمائی میں حصّہ ہے - اِسی طرح کوئی خاندان اکیلا کمائی نہیں کر سکتا - جب تک اُس کے ساتھ باقی افرادِ خاندان بھی شریک نہ ہوں - مثلاً دیکھ لو کوئی شخص تجارت کے لئے باہر کیسے جا سکتا ہے جب تک اسکی بیوی نہ ہو - اُس کی بیوی گھر کا انتظام کرتی ہے تب وُہ کماتا ہے - پھر اُس کے بچے ہیں وہ اُس کا کچھ نہ کچھ بوجھ اُٹھاتے ہیں - چھوٹی موٹی تجارت میں بھی حصہ لے لیتے ہیں - ایک بسا بسایا گھر ہوتا ہے جس کی وجہ سے اُس کا مال محفوظ رہتا ہے - اِسی لئے اس کے مال میں اِن سب کا حق ہوتا ہے - پھر بھائی ہے وُہ کام تو نہیں کرتا مگر جب وہ کسی کو قرض دیتا ہے اُس کی وصولی میں اُس کے بھائیوں کا دخل بھی ہوتا ہے - اعلیٰ اخلاق والا اور شریف انسان تو خود بخود قرض واپس کر دیتا ہے لیکن ادنیٰ اخلاق والا آدمی اس لئے قرض واپس کرتا ہے کہ اگر اُس نے قرض واپس نہ کیا تو اُس کی قوم اور اُس کے بھائی بند میرے ساتھ لڑیں گے گویا قوم اور جتھے نے اُس کا مال واپس دلوایا - اگر اُس مقروض پر قوم اور جتھہ بازی کا رعب نہ ہوتا تو وُہ کبھی مال واپس نہ کرتا - یہی حکمت ہے جس کی بناء پر قرآن کریم نے تمام رشتہ داروں کا جن کا قریبی تعلق ہوتا ہے ورثہ میں حصہ مقرر کر دیا ہے - مثلاً ماں باپ بیوی - بیٹا - بیٹی - بھائی - بہن وغیرہ - پھر اُن کے فقدان کی صورت میں دُور کے رشتہ دار وارث ہو جاتے ہیں - جیسے دادا - دادی - نانا - نانی - پوتا - پوتی بھتیجے وغیرہ - اور یہ نکتہ کہ ہر ایک کی کمائی میں عائلی حق ہوتا ہے قرآن کریم نے ہی بیان کیا ہے - اور کسی کتاب نے بیان نہیں کیا -

پھر اسلام نے لڑکیوں کی تعلیم پر زور دیا - جیسے فرمایا جس کی دو لڑکیاں ہوں اور وہ اُن کی اچھی تربیت کرے تو خدا تعالےٰ اُس کے سارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے - احادیث میں آتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ایک غریب عورت میرے پاس آئی - اُس کی دو لڑکیاں تھیں ایک لڑکی کو اُس نے اپنی دائیں طرف بٹھایا اور دوسری لڑکی کو اُس نے اپنی بائیں طرف بٹھایا اور کہا مجھے کچھ کھانے کے لئے دو - ہمارے گھر میں کوئی چیز موجود نہ تھی - میں نے تلاش کیا تو ایک کھجور نکل آئی - مَیں وہ کھجور لے کر اُس کے پاس آئی اور کہا اس وقت ہمارے گھر میں یہی ایک کھجور ہے یہ لے لو - اُس عورت نے وہ کھجور اپنے مُنہ میں ڈالی اور اندازہ سے اُس کے دو برابر حصے کئے اور پھر نصف کھجور ایک لڑکی کو دے دی اور نصف کھجور دوسری کو دی خود بھوکی رہی - رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ ذکر سُنا تو فرمایا - اگر کسی کی دو بیٹیاں ہوں اور وُہ اُنکی اچھی تربیت کرے اور اُن کو تعلیم دلوائے تو اللہ تعالیٰ اُس پر جنّت واجب کر دیتا ہے - دیکھو اسلام نے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر کتنا زور دیا ہے - لڑکوں کو تو لوگ اس لئے تعلیم دلواتے ہیں کہ یہ بڑے ہو کر نوکریاں کرینگے مگر عورتوں کے فرائض خدا تعالےٰ نے نوکریوں والے مقرر نہیں کئے - اگرچہ آج کل مسلمان لڑکیاں بھی نوکری کر لیتی ہیں - مگر اسلام نے عورت پر گھر کی ذمہ واریاں رکھی ہیں اس لئے اُس کی تعلیم کمائی میں مد نہیں ہو سکتی - مگر اس کے باوجود اسلام نے عورتوں کی تعلیم پر زور دیا اور یہ چیز دوسری کتابوں میں نہیں پائی جاتی -

پھر بیوی کے حقوق ہیں۔ اسلام نے اُن کی بھی تفصیلات بیان کی ہیں اور ہدایت دی ہے کہ بیوی کے ساتھ محبت اور پیار کا سلوک ہونا چاہیئے۔ بیوی سے محبت تو سب کرتے ہیں بلکہ بعض لوگ اپنی بیویوں کے عاشق ہو کر مذہب کو بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اُن کے مذہب نے اُن کا کیا حق رکھا ہے۔ محبت تو ایک فطرتی چیز ہے اور فطرت گمراہی کی طرف بھی لے جاتی ہے اور ہدایت کی طرف بھی لے جاتی ہے۔ اصل سوال مذہب کا ہے مگر دوسرے مذاہب نے بیوی کے کوئی حقوق مقرر نہیں کئے۔ یہ حقوق صرف اسلام نے ہی مقرر کئے ہیں۔ اسلام نے ہی یہ حکم دیا ہے کہ بیوی کو مارو پیٹو نہیں بلکہ اُس کی دلجوئی کرو۔ پھر فرمایا۔ اُس کے کھانے پینے کی ذمہ واری تم پر ہے۔ اب تک یوروپ میں عام طور پر یہی دستور رہا ہے کہ بیوی کا مال خاوند کا ہوتا ہے اور وہ جس طرح چاہے اُسے خرچ کر سکتا ہے۔ خواہ وہ اُسے لُٹا دے یا رکھ لے۔ عورت کا اس میں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ مگر اسلام نے اُسے یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنی جائداد کی آپ مالک ہے وہ جس طرح چاہے اُسے خرچ کرے اور جس کو چاہے دے۔ وہ خود اس کی ذمہ وار ہے۔ لیکن مرد اُس کا کفیل ہے۔ عورت کے پاس اگر لاکھ روپیہ ہو اور مرد کے پاس پانچ روپے ہوں تو مرد اُسے پانچ روپوں میں سے ہی کھلائے گا۔ کیونکہ اُس نے اُس سے شادی کی ہے اور اُسے اپنی بیوی بنایا ہے۔ وہ اُس کی روٹی اور کپڑے کا آپ ذمہ وار ہے۔ اُس کا کوئی حق نہیں کہ وہ عورت سے اُس کی رقم میں سے کچھ جبراً لے لے۔

پھر طلاق کا مسئلہ لے لو۔ اسلام نے اس پر کئی قسم کی پابندیاں لگا دی ہیں تاکہ عورت کی حق تلفی نہ ہو۔ سزا کے متعلق ہدایت دی کہ اُس میں احتیاط سے کام لو اور ایسی سزا نہ دو جس کا بدن پر نشان پڑ جائے غرض اسلام نے جس تفصیل کے ساتھ ان حقوق کو بیان کیا ہے۔ اُس کی مثال کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جس کا معاملہ اپنی بیوی سے بہتر ہے۔

پھر اولاد کے متعلق احکام دئے ہیں۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ اولاد باپ کا حق ہے کیونکہ وہ اُس کے نطفہ سے پیدا ہوئی ہے اور یہ جائز سمجھا جاتا تھا کہ اگر کوئی چاہے تو اپنی اولاد کو بیچ ڈالے چاہے تو اُسے مار ڈالے۔ چنانچہ لڑکیوں کو مارنے کا بعض قبائل عرب میں رواج تھا۔ اسی طرح اولاد کو فروخت کر دینے کا بھی رواج تھا۔ اسلام نے اس پر پابندی لگا دی اور کہا کہ اگر کوئی آزاد کو بیچے تو وہ واجب القتل ہے۔ اور لڑکیوں کے متعلق سختی سے فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ تم لڑکی کو مار دوگے تو پھر چھوڑ دئے جاؤ گے۔ بلکہ قیامت کے دن تم سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا اور یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ وہ تمہاری لڑکی تھی اور تمہارے نطفہ سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ تمہاری لڑکی بعد میں بنی تھی پہلے ہماری بندی تھی۔ تمہیں کیا حق تھا کہ تم اُسے مار ڈالتے۔ فرمایا وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ (التکویر) تمہارا کوئی حق نہیں کہ تم اُن کو مار ڈالو ہم نے اُسے نسلِ انسانی کو جاری رکھنے کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ اگر تم لڑکیوں کو مار ڈالوگے تو قیامت کے دن تم اس کے متعلق سوال کئے جاؤ گے۔ غرض وہ حقوق جو اسلام نے عورت کو دئے ہیں وہ پہلی کتابوں میں کہیں نظر نہیں آتے۔

پھر شہریت کے حقوق ہیں۔ جب انسان خاندان سے نکلتا ہے تو شہریت کی طرف آتا ہے۔ شہریت میں

سب سے متقدم اور سب سے پہلے ہمسائے ہیں۔ دیگر مذاہب میں بھی ہمسایوں کے متعلق تعلیم آتی ہے مگر جس رنگ میں اسلام نے ہمسایہ کے حقوق کو بیان کیا ہے اُس رنگ میں اور کسی مذہب نے بیان نہیں کیا۔ اسلام نے اِس مسئلہ پر اتنا زور دیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جبریل میرے پاس آیا اور اُس نے ہمسائے کے حقوق پر اتنا زور دیا کہ مَیں نے سمجھا وہ اُسے وارث قرار دے دیگا۔ پھر اسلام نے ہمسائے کے حقوق کے متعلق تفصیلی احکام دیئے ہیں اور اُن کا خیال رکھنے کی اس قدر تاکید کی ہے کہ حضرت عباسؓ کے متعلق آتا ہے کہ آپ جب گھر آتے تو پوچھتے کہ کیا ہمارے یہودی ہمسائے کو بھی کچھ دیا ہے؟ آپ کے ہمسایہ میں ایک یہودی رہتا تھا آپ اُس کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ اُس کو نظر انداز کرنا گناہ سمجھتے تھے۔

شہریت کے حقوق

پھر شہریت کے حقوق کے ماتحت شہروں کی غذا اور ہوا اور پانی کا مسئلہ آتا ہے۔ اگر یہ تینوں چیزیں اچھی نہیں ہوں گی تو لازماً لوگوں کی صحت خراب ہو جائے گی۔ اِس لئے اسلام نے اس پر بڑا زور دیا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ کھڑے پانی میں پیشاب نہ کرو۔ کھڑے پانی میں گندی چیزیں نہ ڈالو۔ یہ صاف بات ہے کہ جب پانی گندہ نہیں ہوگا تو پانی کی کمی والے علاقوں میں لوگوں کی صحتیں نہیں بگڑیں گی۔ آج کل تو لوگ حفظانِ صحت کے اصول سے بہت حد تک واقف ہیں مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم آج سے ساڑھے تیرہ سَو سال پہلے اُس وقت دیا جب لوگوں کو اِن اصول کا کچھ بھی علم نہیں تھا۔ دیکھو یہ کتنی بڑی فضیلت ہے جو اسلام کو دوسرے مذاہب پر حاصل ہے۔

پھر تنگ اور گنجان آبادی میں رہنے سے صحت گر جاتی ہے۔ اس کے متعلق بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ گلیاں اور سڑکیں کھُلی ہونی چاہئیں تاکہ گندی ہوا سے لوگوں کی صحت پر بُرا اثر نہ پڑے۔ آپ نے اس زمانہ میں جب اونٹوں اور گھوڑوں کا رواج تھا سڑکوں کے متعلق جو اصول مقرر فرمائے اُن کے مطابق چھوٹی گلی کم سے کم آٹھ فٹ سے دس فٹ کی بنتی ہے اور بڑی گلی کم سے کم پندرہ سے بیس فٹ کی۔ جب اونٹ اور گھوڑے کے لئے اتنی بڑی سڑک کی ضرورت تھی تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ لاریوں اور موٹروں کے لئے اس سے تین گُنا سڑک ہونی چاہیئے۔ اِس صورت میں چھوٹی گلیاں کم سے کم ۲۱ سے ۳۰ فٹ کی بن جائیں گی اور بڑی گلیاں کم سے کم ۴۵ سے ۶۰ فٹ کی۔

پھر فرمایا جہاں لوگ اکٹھے ہوں وہاں گند نہیں پھینکنا چاہیئے۔ آپ نے فرمایا اگر مسجد میں کوئی شخص تھوک دے تو اُس کا فرض ہے کہ وہ اُسے وہاں سے اُٹھائے اور دوسری جگہ جا کر دفن کرے۔ اِس سے ایک عام قانون نکل آیا کہ جہاں بھی اجتماع ہو وہاں کوئی گندی چیز نہیں پھینکنی چاہیئے۔

پھر راستوں کے متعلق فرمایا کہ راستوں پر کوئی ضرر رساں چیز پڑی ہوئی ہو تو اُس کو اُٹھانا نیکی اور ثواب کا کام ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم خود راستوں سے کانٹے چُن چُن کر ایک طرف کر دیتے تھے اسی طرح راستوں پر پاخانہ پھرنے کی آپ نے ممانعت فرمائی اور اِسے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو بھڑکانے والا فعل قرار دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جسے جاہلیت کا زمانہ کہتے ہیں۔ مگر آج لاہور، کوئٹہ، راولپنڈی، پشاور اور دوسرے بڑے بڑے شہروں کو دیکھ لو۔ لوگ گھروں سے

گندا اُٹھا کر دروازوں کے سامنے پھینک دیتے ہیں مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اِسے ناجائز ہی قرار نہیں دیا بلکہ اس فعل کو قابلِ مؤاخذہ قرار دیا ہے۔ غرض پانی کے متعلق آپ نے حکم دیا کہ کھڑے پانی میں پیشاب نہ کرو اور نہ اُس میں گند پھینکو۔ گلیاں کشادہ رکھنے کا اصول مقرر فرمایا۔ نجاست کو پھیلانے سے منع فرمایا۔ اجتماع کی جگہ پر گند پھینکنے سے منع فرمایا۔ اجتماع کے مواقع پر جانے سے پہلے یہ ہدایت فرمائی کہ نہاؤ، دھوؤ اور خوشبو لگاؤ تا جسموں اور سانسوں سے جو بدبو پیدا ہو جاتی ہے وہ خوشبو سے دُور ہو جائے بلکہ فرمایا کہ یہ پسندیدہ امر ہے کہ اجتماع سے پہلے اُس جگہ پر خوشبو جلائی جائے تاکہ ہوا میں خوشبو پھیل جائے اور جرم فنا ہو جائیں۔ اِسی طرح لوگوں کی بغلوں اور کپڑوں وغیرہ سے جو بُو آتی ہے وہ نہانے دھونے سے دُور ہو جائے گی اور جو باقی رہ جائے گی وہ عطر لگانے سے دُور ہو جائے گی۔ دیکھو یہ کتنی بڑی حکیمانہ تعلیم ہے جو آپ نے دی اور اِس وجہ سے دی کہ کہیں لوگوں کی صحتیں خراب نہ ہو جائیں اور وہ بیمار ہو کر دنیا میں ترقی کرنے سے نہ رہ جائیں۔

پھر شہری حقوق میں یہ بھی داخل ہے کہ لین دین کے معاملات میں خرابی نہ ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے اِس حق کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ چنانچہ اسلام نے بھاؤ کو بڑھانے اور مہنگا سودا کرنے سے روکا ہے۔ اِسی طرح دوسروں کو نقصان پہنچانے اور اُن کو تجارت میں فیل کرنے کے لئے بھاؤ کو گرا دینے سے بھی منع فرمایا۔ ایک دفعہ مدینہ میں ایک شخص ایسے ریٹ پر انگور بیچ رہا تھا جس ریٹ پر دوسرے دوکاندار نہیں بیچ سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ پاس سے گذرے تو انہوں نے اُس شخص کو ڈانٹا کیونکہ اِس طرح باقی دوکانداروں کو نقصان پہنچتا تھا۔ غرض اسلام نے سودا مہنگا کرنے سے بھی روک دیا اور بھاؤ کو گرا دینے سے بھی روک دیا تاکہ نہ دوکانداروں کو نقصان ہو اور نہ پبلک کو نقصان ہو۔

پھر اسلام نے وبا زدہ شہر سے دوسرے شہر میں جانے سے روک دیا۔ کیونکہ اِس طرح وہاں بھی بیماری پھیل جاتی ہے۔ آج کل غلطی سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ بیماری والے شہر سے نکلنا منع ہے حالانکہ وبا زدہ شہر سے نکلنا منع نہیں بلکہ جائز ہے اور صحابہؓ نے خود اِس پر عمل کیا ہے۔ جو چیز منع ہے وہ ایک شہر سے نکل کر دوسرے شہر میں جانا ہے۔ جنگلوں میں پھیل جانے سے شریعت میں کہیں منع نہیں کیا گیا۔

اسلام کی حکیمانہ تعلیم

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد جب قیصر سے جنگ ہوئی جس میں حضرت ابو عبیدہؓ فوج کے کمانڈر تھے اُس وقت لشکر میں طاعون پھیل گئی اور بہت سے آدمی طاعون سے فوت ہو گئے۔ آپ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا اور مقامی لوگوں سے بھی پوچھا۔ مقامی لوگوں نے مشورہ دیا کہ ایسے مواقع پر شہروں سے نکل کر کھلے علاقوں میں چلے جانا چاہیئے۔ چنانچہ اکثر صحابہ نے اِس کی تصدیق کی اور پہاڑوں پر چلے گئے لیکن ابو عبیدہؓ وہیں رہے اور آخر بیماری سے شہید ہوئے۔ صحابہؓ نے اُس وقت بھی استدلال کیا کہ اسلام کی تعلیم کے رُو سے وبا زدہ علاقوں سے نکل کر دوسرے شہروں میں جانا منع ہے تا دوسروں کو بیماری نہ لگ جائے جنگلوں میں جانا منع نہیں۔ یہ کتنا بڑا قانون ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا۔ اُس وقت متعدی امراض کی ابھی دریافت نہیں ہوئی تھی اِن امراض کی دریافت بہت دیر بعد ہوئی ہے مگر آپ نے الٰہی نور اور فیوض قرآنیہ سے حصہ لے کر حکم دے دیا کہ بیماری کے وقت ایک شہر سے دوسرے شہر میں بھاگ کر نہیں جانا چاہیئے تاکہ وہاں بھی بیماری نہ پھیل جائے ہاں میدانوں اور جنگلوں میں اِدھر اُدھر پھیل جانے کی ممانعت نہیں۔

پھر تعلیم کا انتظام ہے پہلے لوگ فرداً فرداً اپنی اولاد کو تعلیم دلواتے تھے۔ قومی طور پر تعلیم دلوانے کا حق صرف اسلام نے ہی تسلیم کیا ہے۔ بدر کے موقع پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جنگی قیدیوں سے کہا کہ ہم تم سے

کوئی معاوضہ نہیں لیتے تم مدینہ کے دس دس لڑکوں کو پڑھا دو اس کے بدلہ میں تمہیں رہا کر دیا جائیگا۔ اُن قیدیوں نے دس دس لڑکوں کو پڑھایا اور پھر انہوں نے آگے پڑھایا پھر جو اُن سے پڑھے انہوں نے آگے پڑھایا۔ اس طرح ہر انصاری لکھنا پڑھنا سیکھ گیا۔ قیدی کا روپیہ قومی روپیہ ہوتا ہے اِس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں سے تعلیم دلوا کر یہ ثابت کر دیا کہ قومی روپیہ قومی تعلیم پر خرچ ہو سکتا ہے اور یہ کہ تعلیم دلانے کی ذمہ واری حکومت پر ہے۔

ملکی حقوق کے متعلق اسلامی تعلیم

پھر اسلام ہی ہے جس نے ملکی حقوق بھی قائم کئے ہیں۔ اسلام کے نزدیک ہر فرد کی خوراک، رہائش اور لباس کی ذمہ وار حکومت ہے اور اسلام نے ہی سب سے پہلے اس اصول کو جاری کیا ہے۔ اب دوسری حکومتیں بھی اس کی نقل کر رہی ہیں مگر پورے طور پر نہیں۔ بیمے کئے جا رہے ہیں، فیملی پنشنیں دی جا رہی ہیں۔ مگر یہ کہ جوانی اور بڑھاپے دونوں میں خوراک اور لباس کی ذمہ وار حکومت ہوتی ہے یہ اصول اسلام سے پہلے کسی مذہب نے پیش نہیں کیا۔ دنیوی حکومتوں کی مردم شماریاں اس لئے ہوتی ہیں تا ٹیکس لئے جائیں یا فوجی بھرتی کے متعلق یہ معلوم کیا جائے کہ ضرورت کے وقت کتنے نوجوان مل سکتے ہیں۔ مگر اسلامی حکومت میں سب سے پہلی مردم شماری جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کروائی گئی تھی۔ وہ اس لئے کروائی گئی تھی تاکہ تمام لوگوں کو کھانا اور کپڑا مہیا کیا جائے۔ اس لئے نہیں کہ ٹیکس لگایا جائے یا یہ معلوم کیا جائے کہ ضرورت کے وقت فوج کے لئے کتنے نوجوان مل سکیں گے۔ بلکہ وہ مردم شماری محض اس لئے تھی کہ تا ہر فرد کو کھانا اور کپڑا مہیا کیا جائے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک مردم شماری رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ہوئی تھی مگر اُس وقت ابھی مسلمانوں کو حکومت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے اُس مردم شماری کا مقصد محض مسلمانوں کی تعداد معلوم کرنا تھی۔ جو مردم شماری اسلامی حکومت کے زمانہ میں سب سے پہلے ہوئی وہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوئی اور اس لئے ہوئی تاکہ ہر فرد کو کھانا اور کپڑا مہیا کیا جائے۔ یہ کتنی بڑی اہم چیز ہے جس سے تمام دنیا میں امن قائم ہو جاتا ہے۔ صرف یہ کہہ دینا کہ درخواست دے دو اُس پر غور کیا جائیگا اسے ہر انسان کی غیرت برداشت نہیں کر سکتی اس لئے اسلام نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ کھانا اور کپڑا حکومت کے ذمہ ہے اور یہ ہر امیر اور غریب کو دیا جائیگا خواہ وہ کروڑ پتی ہی کیوں نہ ہو اور خواہ وہ آگے کسی اور کو ہی کیوں نہ دیدے تاکہ کسی کو یہ محسوس نہ ہو کہ اُسے دونی خیال کیا جاتا ہے۔

تجارت کے متعلق اسلامی تعلیم

پھر تجارت ہے۔ اس کے متعلق بھی اسلام نے کئی قسم کے اصول مقرر کر دئے ہیں تاکہ کوئی تجارت ایسی نہ ہو جس میں دھوکا ہو۔ اسلام کہتا ہے کہ بغیر دیکھے مال نہیں لینا چاہیئے۔ مثلاً کوئی تھان ہو تو کوئی دوکاندار اُسے یونہی نہیں بیچ سکتا۔ بلکہ خریدار اگر اُسے دیکھنا چاہے تو دوکاندار کا فرض ہوگا کہ دکھائے پھر یہ بھی جائز نہیں کہ کوئی دوکاندار اپنے گاہک سے کہے کہ تم اگر اسے اسی طرح لے لو تو میں تمہیں کم قیمت پر دیدونگا یا کوئی کنکر مار دے اور کہے کہ جس چیز پر یہ کنکر پڑے وہ میری چیز ہے یا کوئی کہے کہ میں یہ ڈھیر خریدتا ہوں اور اُس کا وزن نہ کرے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ بازار گئے وہاں لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ ڈھیر گندم کا اتنے کا ہے اور یہ ڈھیر اتنے کا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ مارا تو نیچے کے دانے گیلے تھے۔ آپ کو غصہ آگیا اور فرمایا یہ دانے گیلے کیوں ہیں؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ بارش ہو گئی تھی جس کی وجہ سے دانے گیلے ہو گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا گیلا حصہ اندر کیوں ڈال دیا گیا ہے۔ پھر آپ نے اس قسم کے سودے کو ناجائز قرار دیدیا۔ اسی طرح فرمایا کہ لین دین میں کسی قسم کا دھوکا نہ ہو۔

پھر اسلام نے جوئے کو حرام قرار دے دیا کیونکہ اس کے ذریعہ بھی انسان ایسے طور پر کماتا ہے جس سے بہت لوگوں کو نقصان پہنچ جاتا ہے اور صحیح تجارت سے رغبت ہٹ جاتی ہے۔ لاٹریاں بھی اسی میں شامل ہیں۔ آج کل مسلمان یہ کام کرتے ہیں مگر یہ بھی جوئے میں شامل ہے اور جوا ناجائز ہے خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ خواہ قرعہ ڈالکر کھیلا جائے یا نشانہ مار کر کھیلا جائے اسلام نے اُسے ناجائز قرار دیا ہے۔

پھر قرآن کریم نے کہا ہے کہ جب بھی تم سودا کرو اُس کی تحریر کر دو۔ انگریزی قوم میمو دیتی ہیں اور سارا یورپ فخر کرتا ہے کہ ہمارے ہاں میمو لئے جاتے ہیں مگر یہ اصول سب سے پہلے قرآن کریم نے پیش کیا تھا۔ اگر مسلمان اسے چھوڑ بیٹھے ہیں تو یہ انکی بدقسمتی ہے۔

پھر سُود ہے اسے بھی اسلام نے منع فرمایا ہے۔ سُود بھی حقیقی تجارت سے روکتا ہے۔ اس میں جتھہ والے لوگ آگے نکل جاتے ہیں اور دوسرے لوگ گھاٹے میں پڑ جاتے ہیں۔

پھر رہن ہے۔ اس کے متعلق فرمایا کہ وہ با قبضہ ہو اور اُس کی تحریر ہو۔

پھر اسلام نے بیع سلم کا جواز رکھا۔ عجیب بات ہے کہ آج کل کے مسلمان سود تو لیتے ہیں مگر بیع سلم کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اسلام نے سُود کے مقابلہ میں بیع سلم کو جائز قرار دیا ہے۔ آج کل سود کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ تو بنکوں کا سُود ہے اس کے لینے میں کیا حرج ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ نام خواہ کچھ رکھ لیا جائے وہ بہرحال سُود ہے اور اُس کا لینا ناجائز اور حرام ہے۔ اسی طرح اسلام نے تجارت کے اور کئی اصول مقرر کئے ہیں جن کی پابندی تجارتی ترقی کے لئے نہایت ضروری چیز ہے۔ یہ مسلمانوں کی غفلت کا نتیجہ ہے کہ بنک جاری ہو گئے جن کو اب ایک دم بند نہیں کیا جاسکتا۔ اگر آج بنک بند ہو جائیں تو ملک کا دیوالہ نکل جائے۔ اگر مسلمان شروع سے ہی بیع سلم کو جاری رکھتے تو اُن پر بنکوں کی حکومت نہ ہوتی۔ لیکن عقل کے ساتھ اب بھی کئی ایسے طریق معلوم کئے جاسکتے ہیں جن سے تجارت جاری رہے۔ پہلے بھی لوگ تجارت کرتے تھے اور مسلمانوں میں بڑے بڑے تاجر پائے جاتے تھے اور وہ سود کے بغیر ہی تجارت کرتے تھے۔ بنکوں کا اُس وقت رواج نہ تھا۔

پھر زمینداریاں ہیں۔ اُن کے متعلق بھی اسلام نے بڑے بھاری قوانین مقرر کئے ہیں۔ مثلاً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی چیز پکنے سے پہلے نہ بیچی جائے کیونکہ اس طرح دھوکا ہو جاتا ہے۔ ہوائیں چلتی ہیں اور پھل گر جاتا ہے یا غلہ کم ہو جاتا ہے خصوصاً باغوں کے متعلق آپ نے حکم دیا کہ پھل پکنے سے پہلے نہ بیچا جائے سوائے اس کے کہ نیچے والی زمین بھی خریدار کو ہی دے دی جائے تاکہ وہ زراعت کر کے کسر پوری کر لے۔ بہرحال پھل کو پکنے سے پہلے بیچنا منع ہے۔ پھر زراعت کے متعلق فرمایا وَاٰتُوْا حَقَّہٗ یَوْمَ حَصَادِہٖ (انعام ع ۱۷) اور اُس کی کٹائی کے وقت اُس کا حق ادا کرو۔ اگر پہلے غربا کا حق ادا کروگے تب وہ فصل تمہارے لئے جائز ہوگی ورنہ نہیں۔ پھر دوسرے کے کھیت سے پانی لے جانے کا مسئلہ ہے۔ اسلام نے کہا ہے کہ اگر کوئی تمہاری زمین میں سے پانی لے جانا چاہے تو اُسے مت روکو۔ اگر زمین میں سے دوسرے کو پانی لے جانے سے روکا جائے تو اس صورت میں آبادی تباہ ہو جاتی ہے۔

پھر شادی بیاہ ہے۔ اسلام نے اس کے متعلق بھی کئی اصول مقرر کئے ہیں۔ مثلاً عورت کا مہر مقرر کرنا اور پھر عورت کو شادی سے پہلے دیکھنا۔ تاکہ بعد میں جو فتنے پیدا ہو سکتے ہیں وہ نہ ہوں۔ شادی کے موقعہ پر جب سب باتیں رشتہ داروں میں طے ہو جائیں تو لڑکی کو دیکھ لینا بہت سے فتنوں کا سدِّباب کر دیتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم

کے زمانہ میں ایک نوجوان نے کسی لڑکی سے شادی کرنی چاہی لڑکی والوں کے سب حالات اُسے پسند تھے۔ اُس نے لڑکی کے باپ سے کہا کہ مجھے اور تو سب باتوں سے اتفاق ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں لڑکی کو بھی دیکھ لوں۔ اُس وقت پردہ کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ لڑکی کے باپ نے کہا میں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ وہ نوجوان رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور اُس نے عرض کیا کہ میں فلاں لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور تو مجھے سب باتیں پسند ہیں میں صرف لڑکی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے لڑکی کے باپ سے اس کا ذکر کیا تھا مگر اُس نے لڑکی دکھانے سے انکار کر دیا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اُس نے جو کچھ کیا ہے غلط کیا ہے۔ شادی کے متعلق اگر سب باتیں طے ہو گئی ہیں تو تم لڑکی کو دیکھ سکتے ہو وہ نوجوان پھر گیا اور لڑکی کے باپ کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سُنایا۔ اُس نے کہا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہوگا مگر میری غیرت یہ برداشت نہیں کرتی تو لو تم شادی کرو یا نہ کرو میں تمہیں لڑکی دیکھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ باتیں اندر لڑکی بھی سُن رہی تھی جب اُس کے باپ نے کہا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہوگا مگر میری غیرت یہ بات برداشت نہیں کر سکتی تو وہ پردہ ہٹا کر باہر آگئی اور لڑکے سے مخاطب ہو کر کہنے لگی جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم مجھے دیکھ سکتے ہو تو میرا باپ کون ہے جو اس میں روک بنے۔ میں سامنے کھڑی ہوں تم مجھے دیکھ لو۔ اِس چیز کا اُس نوجوان پر اتنا اثر ہوا کہ اُس نے نظریں نیچی کر لیں اور اُس لڑکی کی طرف نہیں دیکھا اور کہا کہ جس لڑکی کے دل میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اتنی محبت ہے کہ وہ اس کے مقابلہ میں اپنے باپ کی محبت کو بھی ٹھکرا سکتی ہے میں اُسے بن دیکھے ہی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اُس نے بن دیکھے ہی اُس سے شادی کر لی۔ غرض ایک طرف اسلام نے پردہ رکھ کر مسلمانوں کو اُن فتنوں سے بچایا ہے جو عورت کی وجہ سے پیدا ہو سکتے تھے تو دوسری طرف اندھادھند شادی کر لینے سے جو خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں مثلاً رنگ، نقش اور شکل کی وجہ سے اُن کو یہ کہہ کر دُور کر دیا کہ شادی سے پہلے اگر لڑکی کو دیکھ لیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

پھر حکومت کے حقوق ہیں۔ قرآن کریم نے اُن کو بھی بیان کیا ہے۔ حاکم کو کیا کیا اختیار ہوتے ہیں کس حد تک وہ اپنی رعایا کو حکم دے سکتا ہے اور کس جگہ وہ حکم نہیں دے سکتا۔ یہ تمام قواعد اسلام نے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ پھر اسلام یہ ہدایت دیتا ہے کہ حکومت انتخابی ہونی چاہیئے۔ دنیا کے کسی اور مذہب نے انتخابی حکومت کو پیش نہیں کیا۔ پھر اسلام نے حاکم کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ پبلک کی رائے کا احترام کرے۔ ہاں اگر اُس رائے سے دین یا ملک پر کوئی زد پڑتی ہو تو وہ اُس کے خلاف بھی فیصلہ دے سکتا ہے بعض حکمران کہہ دیتے ہیں کہ ہم پبلک کے منتخب شدہ ہیں اس لئے ہمیں رائے لینے کی ضرورت نہیں اسلام اس کو جائز قرار نہیں دیتا۔ اُس کے نزدیک پھر بھی ایک کمیٹی بنانی پڑے گی جو مشورہ دیگی اور اُس کمیٹی کی اکثریت کی رائے کا وہ حاکم پابند ہوگا۔ سوائے اس کے کہ وہ کسی مشورہ کو مصلحت کے خلاف سمجھے تب وہ اُس کمیٹی کے مشورہ کے خلاف بھی فیصلہ کر سکتا ہے۔ یہ صاف بات ہے کہ جب حاکم پبلک کا منتخب شدہ ہوگا تو بلا وجہ انکی رائے کے خلاف نہیں چلیگا۔ وہ اُسی وقت انکی کثرت رائے کو رد کرے گا جب وہ اُس تجویز کو قومی اور ملکی مفاد کے خلاف سمجھیگا اور ایسا قدم وہی شخص اُٹھائیگا جو بڑا دیانتدار اور خدا رسیدہ ہو۔ غرض اسلام نے مشورہ کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (آل عمران ع ۱۷)

قرآن سے اہم امور میں مشورہ ملے۔ اور یہ چیز کسی دوسرے مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ ڈیماکریسی جس کے آج جمہوریت والے دعویدار ہیں اُس کو درحقیقت صحیح معنوں میں اسلام نے ہی قائم کیا ہے اور اس میں کوئی مذہب اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اب ہم اسلام کی اُس تعلیم پر نظر ڈالتے ہیں جو اُس نے دشمنوں کے متعلق دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب بھی دنیا کی ہدایت کے لئے انبیاء آتے ہیں تو بعض لوگ اُن پر ایمان لاتے ہیں اور بعض اُن کے دشمن بن جاتے ہیں۔ یہ دوستی اور دشمنی کا سلسلہ صرف انبیاء کی جماعتوں سے مخصوص نہیں سیاسی جماعتوں کو ہی لے لو بعض قومیں انکی دوست ہونگی اور بعض دشمن بن جائیں گی۔ لیکن کوئی مذہب ایسا نہیں جس نے دوست اور دشمن دونوں کے حقوق بیان کئے ہوں۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے دوستوں کے متعلق بھی قواعد بیان کئے ہیں اور دشمنوں کے متعلق بھی قواعد بیان کئے ہیں۔ تورات میں آتا ہے کہ جب تُو اپنے دشمن کے گھر میں گھسے تو تُو تمام بالغ مردوں کو قتل کر دے اور عورتوں اور بچوں کو قید کر لے۔ بلکہ بعض حالات میں تو یہاں تک حکم ہے کہ اُن کے جانور بھی ذبح کر دئے جائیں۔ گویا اس تعلیم میں تشدد کی انتہا ہے لیکن اسلام نے جو تعلیم دی ہے وہ نہایت ہی منصفانہ اور اعلیٰ درجہ کی ہے۔ مثلاً لڑائی کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ (البقرہ ع۲۴) تم ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑ رہے ہیں۔ جو شخص تمہارے مقابلہ میں تلوار نہیں اُٹھاتا تمہارا کوئی حق نہیں کہ تم اُس سے لڑو اور اُس پر تلوار اُٹھاؤ۔ پھر اِن لڑنے والوں کو بھی اسلام نے یہ اجازت نہیں دی کہ وہ کسی عورت پر وار کریں خواہ وہ عورت جنگ میں شامل ہی کیوں نہ ہو سوائے نہایت اہم استثنائی حالات کے۔

اسلام کی دشمنوں کے متعلق تعلیم

چنانچہ تاریخ میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے میدانِ جنگ میں دیکھا کہ کفار میں سے ایک شخص لوگوں کو لڑائی کے لئے بھڑکا رہا ہے اور مسلمانوں پر حملہ کرنے اور اُن کو قتل کرنے کے لئے جوش دلاتا ہے۔ چنانچہ آپ اُس کی طرف بڑھے اور چاہا کہ اُس پر وار کریں مگر ابھی آپ نے وار نہیں کیا تھا کہ آپ نے محسوس کیا کہ وہ عورت ہے جو مردوں کے لباس میں ملبوس ہے۔ آپ فوراً واپس آ گئے۔ اُن کے ساتھیوں نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا اُسے چھوڑ کیوں دیا۔ انہوں نے کہا میں جب اُس کے پاس گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک عورت ہے جو مردوں کے لباس میں ملبوس ہے اور میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اُس عورت پر وار کروں (سیرۃ حلبیہ جلد دوم غزوۂ احد) حالانکہ وہ عورت کفار کو لڑائی پر برانگیختہ کر کے کئی مسلمانوں کو نقصان پہنچا چکی تھی مگر اُس صحابی نے اُسے کچھ نہیں کہا اس لئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت پر تلوار اُٹھانے سے منع فرمایا ہے۔

اسی طرح احادیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم میدانِ جنگ کا معائنہ فرما رہے تھے کہ آپ نے ایک عورت کی لاش دیکھی۔ صحابہؓ کہتے ہیں اُس عورت کی نعش دیکھ کر آپ کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور آپ نے فرمایا جس نے بھی یہ فعل کیا ہے اُس نے ناپسندیدہ فعل کیا ہے ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیئے (بخاری کتاب الجہاد)

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب کوئی لشکر دشمن کے مقابلہ کے لئے بھجواتے تھے تو اُسے ہدایات دیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جنگ کرو اور بددیانتی نہ کرو اور دھوکہ بازی سے کام نہ لو اور نہ کسی دشمن کے اعضاء کاٹو اور نہ کسی نابالغ کو قتل کرو اور نہ عورتوں کو قتل کرو اور نہ عبادت گاہوں میں بیٹھنے والوں کو قتل کرو اور نہ کسی بڈھے کمزور کو قتل کرو اور نہ چھوٹے بچہ کو اور نہ کسی اور بچہ کو اور نہ کسی بھی عورت کو (ابو داؤد) گویا اسلام نے دشمن کے حقوق کو بھی قائم کیا اور اُس کے ساتھ بھی انصاف مدنظر رکھا۔ میرے نزدیک

اِس رحم دلی کی مثال دنیا کے کسی مذہب میں نہیں مل سکتی۔ اب تو انٹرنیشنل INTERNATIONAL LAW جاری ہوگیا ہے جس کی بناء پر بہت سے اصول وضع کر لئے گئے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب یہ سیاسی قواعد ابھی نہیں بنے تھے اور کوئی شخص اس نظام کو نہیں جانتا تھا اُس وقت کس نے دنیا کو اِن زرّیں ہدایات سے نوازا اور کس نے اسے وحشت اور بربریّت کے دائرہ سے نکالکر انسانیت اور مؤاخات کا درس دیا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب بھی باہر حملہ کے لئے جاتے تو حملہ سے پہلے آپ ٹھہر جاتے تاکہ دشمن کو آپ کی آمد کا پتہ لگ جائے اور تا ایسا نہ ہو کہ دشمن سے دھوکا ہو جائے اور اُس کی بے خبری میں اُس پر حملہ ہو جائے۔ چنانچہ آپ صبح ہو جانے پر حملہ کرتے اور اگر دشمن کی طرف سے اذان کی آواز آتی تو حملہ نہ کرتے لیکن اگر اذان کی آواز اُدھر سے نہ آتی تب صبح ہو جانے پر حملہ کرتے تا ایسا نہ ہو کہ کوئی دوست نقصان اُٹھائے۔ آج کل لوگ شبخون مارتے اور اچانک حملہ کرتے ہیں لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایسا نہ کرتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان بھی بعض دفعہ شبخون مارتے تھے لیکن شبخون مارنے میں وہ پہل نہیں کرتے تھے۔ جب دشمن پہل کر دیتا تو جوابی طور پر وہ ایسی کارروائی کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے بہرحال ابتدائی قدم مسلمانوں کی طرف سے نہیں اُٹھتا تھا۔ کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ واضح ہدایات تھیں کہ رات کو اور بے اطلاع حملہ نہیں کرنا۔ عورتوں کو قتل نہیں کرنا۔ بچوں کو قتل نہیں کرنا۔ بوڑھوں کو قتل نہیں کرنا۔ پادریوں اور دنیا چھوڑ کر عبادت کرنے والے لوگوں کو قتل نہیں کرنا۔ جو اپنے گھروں میں بیٹھے ہیں اُن کو قتل نہیں کرنا۔ صرف جنگ میں شامل ہونے والوں سے لڑائی کی جائے۔

پھر اسلام نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ اعلانِ جنگ کے بغیر کسی قوم سے لڑائی کرنا جائز نہیں۔ اب تو انٹرنیشنل لاء بھی اس کا مطالبہ کرتا ہے کہ اعلانِ جنگ ضرور ہونا چاہیئے مگر سب سے پہلے یہ اصول اسلام نے ہی مقرر کیا ہے کہ جب تمہارے ہمسایہ میں کوئی قوم رہتی ہو اور اُس سے تمہارے معاہدات ہوں تو فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ (انفال ع) پہلے اعلان کر دو اور اُس قوم کو اطلاع دو کہ اب پیش آمدہ حالات کی وجہ سے ہماری تمہارے ساتھ صلح نہیں رہ سکتی۔ تاکہ اُسے موقع مل جائے کہ وہ اس کا ازالہ کر سکے اور اگر وہ ازالہ نہ کرے تو پھر اُس کے ساتھ لڑائی کرو۔

پھر یہ بھی اسلامی قانون ہے کہ جب دشمن ہتھیار پھینک دے تو تم بھی لڑائی بند کر دو۔ قرآن کریم میں آتا ہے اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (انفال ع) کہ جب کوئی قوم تم سے صلح کرنا چاہے تو تم انکار مت کرو۔ اعلانِ صلح کے بعد اُس سے جنگ کرنا جائز نہیں۔

اِسی طرح غیر حکومتوں کے ساتھ جو تعلقات ہوتے ہیں اُن کے متعلق بھی اسلام نے ایسے قوانین مقرر کئے ہیں جن کا کوئی مذہب مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مثلاً اسلام نے حکومتوں کے آپس کے اختلافات کو دور کرنے کے لئے بعض اہم اصول تجویز کئے ہیں۔ جو اتنے مکمل ہیں کہ اُنکا مقابلہ نہ پہلی لیگ آف نیشنز کر سکتی تھی اور نہ اب جو یونائیٹڈ نیشنز کی انجمن بنی ہے یہ اس کا مقابلہ کر سکتی ہے کیونکہ قرآن کریم کے مقرر کردہ اصولوں کو نہ پوری طرح اُس پہلی انجمن نے اخذ کیا اور نہ موجودہ انجمن اُن کو اختیار کر رہی ہے (اس کا تفصیلی ذکر میں نے اپنی کتاب "احمدیت" میں کیا ہے) قرآن مجید میں آتا ہے اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (حجرات ع) یعنی جب دو قومیں آپس میں لڑ پڑیں تو دوسری حکومتوں کو

چاہیئے کہ وہ اِن دونوں پر دباؤ ڈالیں اور اُن کے آپس کے اختلافات کو دور کریں اور اگر فیصلہ ہوجانیکے بعد دونوں میں سے کوئی قوم اُس فیصلہ کو ماننے سے انکار کرے اور دوسری قوم پر حملہ کر دے۔ تو پھر سب حکومتوں کو چاہیئے کہ وہ متحدہ طور پر اُس پر لشکر کشی کریں تا وہ لڑائی سے رُک جائے اور اُس فیصلہ کو تسلیم کرے جو مختلف اقوام کے نمائندوں نے کیا ہے اور اگر وہ اپنی غلطی کو تسلیم کر کے لڑائی چھوڑ دے تو صلح کرانے والی حکومتوں کو چاہیئے کہ وہ اپنا پہلا فیصلہ ہی نافذ کریں۔ دوسری حکومت سے کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں اور اُس کو لوٹنے کی کوشش نہ کریں۔ یہی کافی ہے کہ دنیا میں امن قائم ہوگیا۔

جب لیگ آف نیشنز قائم ہوئی اُن دنوں مَیں انگلستان گیا ہوا تھا۔ مَیں نے اُسی وقت کہہ دیا تھا کہ یہ کبھی کامیاب نہیں ہوگی۔ کیونکہ قرآن کریم نے یہ شرط رکھی ہے کہ جب دو قوموں میں اختلاف ہو جائے اور اُن میں سے کوئی تمہارا فیصلہ نہ مانے تو باقی سب حکومتیں اُس پر مل کر لشکر کشی کردیں۔ لیکن لیگ آف نیشنز میں اِس قسم کی لشکر کشی کی کوئی صورت نہیں رکھی گئی اور اب جو یونائیٹڈ نیشنز کی انجمن بنی ہے اس کے متعلق بھی مَیں وہی کچھ کہتا ہوں کہ یہ بھی کبھی کامیاب نہیں ہوگی جب تک کہ وہ اپنے قواعد نہ بدلے۔ کیونکہ اس میں بھی وہ شرائط پورے طور پر نہیں پائی جاتیں جو اسلام نے تجویز کی ہیں۔ اِس میں لشکر کشی کے لئے اختیارات تو رکھے ہیں مگر پھر بھی کوئی معیّن فیصلہ نہیں کیا گیا اور پھر اس میں بعض حکومتوں کو شامل کیا گیا ہے اور بعض کو شامل نہیں کیا گیا۔ مثلاً سپین کی حکومت ہے اُس کو انہوں نے شامل نہیں کیا۔ جب وہ کہتی تھی کہ مَیں تمہارے احکام ماننے کے لئے تیار ہوں تو چاہیئے تھا کہ اُسے بھی شامل کر لیتے۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ اِسی طرح بعض کو کم اختیارات دیئے گئے ہیں اور بعض کو زیادہ۔ گویا اب بھی ایسے امتیازات رکھے گئے ہیں جن کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ اِس لئے یہ بھی کامیاب نہیں ہوگی۔ آج یورپ بڑا خوش ہے کہ اُس نے ایسا قانون مقرر کر دیا ہے۔ مگر اُسے کیا معلوم کہ وہ قانون جو ہر لحاظ سے مکمل اور قابلِ عمل ہے آج سے تیرہ سو سال پہلے کی نازل شدہ قرآنی آیات میں موجود ہے۔ اگر اُس قانون پر عمل کیا جائے تو وہ جھگڑے جنہوں نے آج دنیا کو ہلاکت اور بربادی کے گڑھے میں گرا رکھا ہے بالکل دور ہو جائیں اور دنیا ایک بار پھر امن اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائے۔

اُوپر میں نے جو کچھ بیان کیا ہے یہ اسلام کی اُس تعلیم کا حصہ ہے جو اُس نے بنی نوع انسان کے متعلق پیش کی ہے اور جس کی مثال کوئی اور مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ اب میں یہ بتاتا ہوں کہ اسلام نے صرف انسانوں کے متعلق ہی تعلیم نہیں دی بلکہ اُس نے جانوروں کا بھی خیال رکھا ہے اور اُن سے بھی حسن سلوک کی تعلیم دی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (ذاریات ع) تمہارے مالوں میں مانگنے والوں اور نہ مانگنے والوں دونوں کا حق ہے۔ محروم کے معنے انسانوں میں سے اُن لوگوں کے بھی ہو سکتے ہیں کہ جو مانگ نہیں سکتے مگر زیادہ تر اس سے اشارہ اُن بے زبان جانوروں کی طرف ہے جو مانگ ہی نہیں سکتے۔ مثلاً بلّی، کتا اور دوسرے جانور۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض غیر قومیں جانوروں سے بڑا پیار کرتی ہیں۔ مثلاً انگریز ہیں وہ کتے کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ایک کتا دس ایشیائیوں سے بھی بہتر ہوتا ہے مگر کتے سے پیار وہ اس لئے نہیں کرتے کہ انہیں حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ تعلیم دی ہے بلکہ وہ اپنے شوق کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اسلام نے جانوروں کے متعلق مستقل احکام دیئے ہیں اور جو مسلمان اُن سے حسن سلوک کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت

کرتا ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ ایک عورت کو ایک بلّی کی وجہ سے سزا دی گئی۔ اُس عورت نے ایک بلّی کو باندھ دیا اور اُسے کھانے پینے کے لئے کچھ نہ دیا اور وہ بھوکی پیاسی مرگئی۔ خدا تعالیٰ نے اِس فعل کی وجہ سے اُسے جہنّم میں داخل کر دیا (بخاری و مسلم) اسی طرح احادیث میں آتا ہے کہ ایک شخص کہیں جا رہا تھا کہ اُس نے ایک کتّے کو دیکھا جو پیاسا تھا لیکن وہ پانی تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اُس شخص نے سوچا کہ جس طرح میں پیاسا تھا یہ بھی پیاسا ہے اور نشیب جگہ میں اُتر کر جُوتی میں پانی بھرا اور اُس کتّے کو پلایا۔ اللہ تعالیٰ اُس کے اِس فعل سے خوش ہؤا اور اُس نے اُس کے سارے گناہ معاف کردئے (بخاری کتاب الادب)

ایک صحابی کہتے ہیں قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَفَرٍ فَانْطَلَقَ لِحَاجَتِهٖ فَرَاَيْنَا حُمَّرَةً مَعَهَا فَرْخَانِ فَاَخَذْنَا فَرْخَيْهَا فَجَاءَتِ الْحُمَّرَةُ فَجَعَلَتْ تُفَرِّشُ فَجَاءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَنْ فَجَعَ هٰذِهٖ بِوَلَدِهَا رُدُّوْا وَلَدَهَا اِلَيْهَا (ابو داؤد جلد ثانی باب کراہیۃ حرق العدو بالنار) ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم سفر کر رہے تھے۔ آپ کسی کام کے لئے اِدھر اُدھر ہوئے تو ہم نے ایک فاختہ کو دو بچوں سمیت دیکھا۔ ہم نے اُس کے بچے پکڑ لئے فاختہ نے زمین پر لوٹنا شروع کیا۔ اتنے میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے اور اُسے دیکھ کر فرمایا اِس فاختہ کو کس نے اِس کے بچے کے ذریعہ سے دکھ پہنچایا وہ شخص فوراً اس کا بچہ واپس کرے

اسی طرح احادیث میں آتا ہے اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلَيْهِ بِحِمَارٍ قَدْ وُسِمَ فِيْ وَجْهِهٖ فَقَالَ اَمَا بَلَغَكُمْ اَنِّيْ لَعَنْتُ مَنْ وَسَمَ الْبَهِيْمَةَ فِيْ وَجْهِهَا اَوْ ضَرَبَهَا فِيْ وَجْهِهَا فَنَهٰى عَنْ ذَالِكَ (ابو داؤد کتاب الجہاد) کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک گدھے کے مُنہ پر لوگوں کو نشان لگاتے دیکھا۔ آپ نے فرمایا کیا کرتے ہو کیا تم کو معلوم نہیں کہ میں نے مُنہ پر نشان لگانے والے یا مُنہ پر مارنے والے کو بُرا قرار دیا ہے پس ایسا نہ کیا کرو۔ غرض اسلام نے صرف انسانوں کے حقوق کی ہی نہیں بلکہ جانوروں کے حقوق تک کی حفاظت کی ہے۔

حکمت تیسری بات جو دعائے ابراہیمی کے جواب میں مذکورہ بالا آیت میں بتائی گئی ہے یہ ہے کہ یہ حکمت سکھاتا ہے۔ حکمت کے معنے عربی زبان میں وہی ہیں جو انگریزی میں فلسفہ کے ہیں۔ جس طرح ہسٹری اَور چیز ہے اور فلاسفی آف دی ہسٹری اَور چیز ہے فیلالوجی اور چیز ہے اَور فلاسفی آف دی فیلالوجی اَور چیز ہے سلاء اَور چیز ہے اور فلاسفی آف دی لاء اَور چیز ہے۔ اسی طرح احکام اَور چیز ہیں اور اُن کی حکمت اَور چیز ہے۔ ایک چیز واقعات اور تفصیلات کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور دوسری اُس کے پس منظر کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ مثلاً نماز کیا ہے ایک خاص رنگ کی عبادت ہے جو بعض شرائط کے ساتھ مشروط ہے یعنی وضو کیا۔ نیت باندھی۔ سورۃ فاتحہ پڑھی۔ رکوع کیا۔ سجود کئے۔ کچھ ٹکڑے قرآن کریم کے پڑھے۔ دعائیں کیں اور سلام پھیر دیا۔ مگر یہ تو ہے دُعا لیکن اس کا فلسفہ یا حکمت الگ شے ہے۔ اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ نماز کیا شے ہے تو ہم اُسے نماز پڑھنے کی تفصیل بتائیں گے لیکن اگر کوئی پوچھے کہ نماز کیوں پڑھی جاتی ہے تو ہم اُسے یہ نہیں بتائیں گے کہ ہم اس طرح وضو کرتے ہیں اور پھر قیام کرتے ہیں۔ رکوع کرتے ہیں۔ سجود کرتے ہیں۔ بلکہ ہم یہ بتائیں گے کہ نماز کیوں مقرر کی گئی ہے۔ اس کے فوائد کیا ہیں۔ اس کا مقصد کیا ہے۔ اس کی غرض کیا ہے پس کسی چیز کا فلسفہ وہ چیز ہے جس میں اُس کے موجبات اور

اُس کی غرض و غایت کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے یا فلسفہ اُن محرکات کو کہتے ہیں جو ماضی میں ہوتے ہیں یعنی فعل سے پہلے وقوع پذیر ہوتے ہیں یا اُن نتائج کو کہتے ہیں جو فعل کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص نے احسان کیا اُس کا ہم شکریہ ادا کریں گے۔ تو شکریہ کا محرک پہلے موجود ہوگا لیکن جب ہم کسی کی خدمت کرتے ہیں تو مزدوری پہلے ہوگی اور اس فعل کا نتیجہ یعنی اُجرت بعد میں ملے گی۔ پس کبھی غایت انسان کے لئے محرک بن جاتی ہے اور کبھی ابتداء محرک بن جاتی ہے۔ فلاں چیز کیوں ہے اور کس لئے ہے۔ اس کا جو جواب ہوگا وہ فلسفہ کہلاتا ہے۔ اسی طرح یہ بتانا کہ فلاں کام کے اندر کیا کیا مصلحتیں پوشیدہ ہیں کیا کیا خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے اس کا حکم دیا گیا ہے یا اُسے اختیار کیا گیا ہے۔ یہ سب حکمت کے ماتحت آتے ہیں۔ کتب الہامیہ میں قرآن کریم ہی وہ پہلی کتاب ہے جس نے یہ اصول پیش کیا ہے کہ ہر کام حکمت کے ماتحت ہونا چاہیئے اور یہ صرف انسان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ خدا تعالےٰ بھی کوئی کام بلاوجہ نہیں کرتا۔ اللہ تعالےٰ خود فرماتا ہے مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (نوح ع ۱) تمہیں کیا ہوگیا کہ تم خدا تعالےٰ کی حکمت کو تسلیم نہیں کرتے۔ تم اپنے متعلق تو یہ برداشت نہیں کرسکتے کہ تمہیں یہ کہا جائے کہ تم بغیر کسی مقصد اور مُدعا کے کام کرتے ہو لیکن اللہ تعالےٰ کے متعلق تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ خدا تعالےٰ نے زمین و آسمان کو یونہی پیدا کر دیا ہے۔ اِسی لئے خدا تعالےٰ کا ایک نام حکیم بھی ہے اور اُس نے ہر جگہ اپنے احکام کی وجہ بیان کی ہے صرف یہ نہیں کہا کہ چونکہ میں خدا ہوں اس لئے میں تمہیں حکم دیتا ہوں کیونکہ انسان دلائل کا محتاج ہے۔ اگر خدا تعالےٰ حکم دیتا کہ فلاں کام کرو اور پھر اُس کی وجہ بیان نہ کرتا تو انسانی ایمان بہت حد تک کمزور رہتا اور وہ کہتا کہ خدا تعالےٰ نے جو حکم دیا ہے میری سمجھ میں تو اس کی وجہ نہیں آئی۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ نے اپنا نام حکیم رکھا ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میں کوئی بھی ایسا کام نہیں کرتا جس کی کوئی غرض نہ ہو۔ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا میں اسی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ دیکھو اگر تم سمجھدار ہو تو تم کوشش کرتے ہو کہ تمہارا ہر کام معقول ہو اور کسی حکمت کے ماتحت ہو۔ لیکن اللہ تعالےٰ کے متعلق تم یہ خیال کرتے ہو کہ وہ اندھا دُھند کام کرتا چلا جاتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ اُس نے ایک بیٹا بنا لیا ہے۔ آخر غور کرو کہ اُسے بیٹا بنانے کی ضرورت کیا تھی۔ بیٹے کی خواہش تو انسان کے دل میں اس لئے ہوتی ہے کہ اگر وہ مرجائے تو اُس کی یاد کو قائم رکھنے والا کوئی وجود اس دنیا میں ہو کیا نعوذ باللہ خدا تعالےٰ نے مرجانا تھا کہ اُس نے بیٹا بنا لیا۔ پھر دوسری وجہ اس خواہش کی یہ ہوتی ہے کہ انسان کو جتھے کی ضرورت ہوتی ہے وہ خیال کرتا ہے کہ آٹھ دس بیٹے ہونگے تو میری مدد کریں گے کیا نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کمزور تھا اور اُسے دُشمنوں سے خطرہ تھا یا اپنا کام اکیلے چلانا اُس کے لئے مشکل تھا کہ اُس نے بیٹا بنا لیا۔ آخر غور کرو اور سوچو کہ تم تو اپنے کام کے لئے حکمتیں تلاش کرتے ہو مگر خدا تعالےٰ کے متعلق تم سمجھتے ہو کہ وہ اندھا دُھند اور بلاوجہ کام کرتا ہے۔ کیا یہ معقول بات ہے؟

فلسفۂ گناہ کا بیان

اب میں چند موٹی موٹی مثالیں دیتا ہوں جن سے یہ ظاہر ہوگا کہ قرآن کریم نے کس طرح اپنے تمام احکام کی بنیاد فلسفہ پر رکھی ہے۔ اسلام نے بنی نوع انسان کو مختلف قسم کی بدیوں سے روکا ہے اور قرآن کریم اور احادیث میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ گناہ کیوں پیدا ہوتا ہے اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہونی چاہیئے۔ قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے جس نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ بدی کے کچھ دروازے ہوتے ہیں پہلے اُن دروازوں کو بند کرو پھر تم اُس بدی پر غالب آسکو گے۔ مسیح ناصری کہتے ہیں کہ کسی عورت کی طرف

بدنیتی سے نگاہ مت ڈال۔ سوال یہ ہے کہ بدنیتی تو اسی لئے پیدا ہوتی ہے کہ انسان کسی ایسی عورت کی طرف دیکھتا ہے جو خوبصورت ہوتی ہے۔ دیکھنے سے پہلے تو بدنیتی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اگر دیکھنے سے پہلے بدنیتی پیدا نہیں ہوتی تو پھر اس کے کیا معنے ہوئے کہ تُو کسی غیر محرم کو بدنظری سے نہ دیکھ لو اگر اس کے کوئی معنے نہیں تو پھر یہ حکم بے فائدہ ہُوا۔ مگر قرآن کریم کہتا ہے کہ تم کسی غیر محرم عورت کی طرف مت دیکھو نہ نیک نیتی سے نہ بُری نظر سے۔ نہیں کیا پتہ کہ وہ تمہارے لئے کشش رکھتی ہے یا نہیں۔ اگر وہ تمہارے لئے کشش رکھتی ہے تو پھر ناجائز محبت پیدا ہو گی۔ اس لئے تم اس کا دروازہ ہی بند کر دو تاکہ تمہارا دل ہر قسم کی آلودگی سے محفوظ رہے۔ اسی طرح اسلام صرف یہ نہیں کہتا کہ بدکاری نہ کر۔ بلکہ وہ ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ غیر محرم عورت اور مرد ایک جگہ اکٹھے نہ ہوں دوسرے مذاہب کہتے ہیں اکٹھے بے شک ہو جاؤ مگر بدکاری نہ کرو۔ حالانکہ جب بدی کے سامان موجود ہوں اُس وقت بدی سے بچنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے مذاہب نے کہا ہے کہ تم روپیہ کو ناجائز طور پر خرچ نہ کرو۔ لیکن جب روپیہ جمع ہو گیا تو وہ خرچ کیوں نہ ہو گا۔ اسلام کہتا ہے کہ تم روپیہ جمع ہی نہ کرو۔ جب روپیہ جمع ہی نہ ہو گا تو وہ ناجائز طور پر خرچ بھی نہیں ہو گا۔ اسلام نے بے شک عورت کو آرائش اور زینت کے لئے تھوڑا سا زیور رکھنے کی اجازت دی ہے مگر اُس کا زیورات سے لدا پھندا رہنا اسلامی شریعت کی رُو سے ناجائز ہے۔ پھر کھانے پینے پر حد بندی لگا دی۔ فرمایا كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا (اعراف ع ۳) کھانے پینے میں اسراف نہ کرو۔ غرض روپیہ خرچ کرنے کے جو ذرائع تھے اُن سے روک دیا۔ مثلاً کھانے پینے میں اسراف سے روک دیا۔ زیادہ زیور بنانے سے روک دیا۔ خود عورت کو کہہ دیا کہ زیادہ آرائش نہ کرو۔ راگ رنگ اور ناچ گانے سے روک دیا۔ شراب سے منع کر دیا۔ غرض لذت کے وہ تمام

فلسفہ عبادت

ذرائع جن سے اسراف پیدا ہوتا ہے اسلام نے ممنوع قرار دے دئے۔ گویا اسلام صرف گناہ سے نہیں روکتا بلکہ گناہ کے دروازہ کو بھی بند کرتا ہے اور اس طرح فلسفہ گناہ کو لطیف رنگ میں بیان کر دیتا ہے۔

اسی طرح عبادات ہیں۔ اُن کا فلسفہ بھی اسلام نے پیش کیا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ نماز کوئی چٹی نہیں بلکہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (عنکبوت ع ۵) نماز اس لئے مقرر کی گئی ہے کہ یہ انسانوں کو بدیوں سے روکتی ہے۔ گویا اسلام یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ تُو نماز پڑھ مگر اس لئے نہیں کہ تیرا خدا چاہتا ہے کہ تُو دس پندرہ منٹ تک اُٹھک بیٹھک کرے بلکہ اس لئے کہ یہ تمہاری اصلاح کا موجب ہے اور یہ بدیوں کو مٹانے والی چیز ہے۔ یہ مضمون کہ نماز بدیوں سے کس طرح روکتی ہے چونکہ لمبا ہے میں اس جگہ بیان نہیں کرتا۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ قرآن کریم صرف نماز کا حکم نہیں دیتا بلکہ اس حکم کی حکمت اور وجہ بھی بیان کرتا ہے۔

پھر روزہ کے متعلق فرمایا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ ع ۲۳) تم روزہ رکھو۔ اس لئے کہ اس سے اتقاء پیدا ہوتا ہے اور جب تم میں اتقاء پیدا ہو جائے گا تو تم ہر قسم کی خرابیوں سے بچ جاؤ گے۔ روزہ کی حالت میں انسان کچھ وقت کے لئے بھوکا رہتا ہے اور اس کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ جب دو وقت کا کھانا مل جانے کے باوجود مجھے اتنی تکلیف ہوتی ہے تو اس شخص کا کیا حال ہو گا جسے کئی کئی وقت کے فاقے برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اس طرح غرباء پروری کا مادہ اُس کے اندر پیدا ہوتا ہے جو قومی ترقی کے لئے ایک نہایت ضروری چیز ہے۔ غرض اسلام نے عبادات کا صرف حکم ہی نہیں دیا بلکہ اُن کی حکمت بھی بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ تمام عبادات انسان کے فائدہ کے لئے مقرر کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکومت منوانے کے لئے

نہیں کیں۔ پھر قرآن کریم کی ایک اور خوبی جو اپنے اندر بڑی بھاری حکمت رکھتی ہے یہ ہے کہ اُس نے اپنے تمام احکام میں اعتدال کو مدنظر رکھا ہے تاکہ انسانی نفس پر ایسا بوجھ نہ پڑے جو اُس کے ملال کا موجب بن جائے۔ اُس نے روٹی کھانے میں بھی اعتدال کا حکم دیا ہے۔ اُس نے پانی پینے میں بھی اعتدال کا حکم دیا ہے۔ بلکہ یہاں تک فرمایا کہ اگر تم نماز بھی پڑھو تو اس میں اعتدال سے کام لو۔ روزہ بھی رکھو تو اس میں بھی اعتدال سے کام لو۔ مال بھی خرچ کرو تو اس میں بھی اعتدال سے کام لو۔ چنانچہ جہاں اسلام نے مال جمع کرنے سے منع فرمایا وہاں ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ تم ایسے بھی نہ بنو کہ بالکل خالی ہاتھ ہو جاؤ اور بعد میں تمہیں حسرت ہو کہ ہائے میں کنگال ہو گیا۔ جہاں روزے کا حکم دیا وہاں ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ہر روز روزہ رکھنا منع ہے۔ احادیث میں آتا ہے اِنَّ عَبْدَ اللّٰہِ ابْنَ عَمْرٍو قَالَ اُخْبِرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ اَقُوْلُ وَاللّٰہِ لَاَصُوْمَنَّ النَّھَارَ وَلَاَقُوْمَنَّ اللَّیْلَ مَا عِشْتُ فَقُلْتُ لَہٗ قَدْ قُلْتُہٗ بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ قَالَ فَاِنَّکَ لَا تَسْتَطِیْعُ ذَالِکَ فَصُمْ وَاَفْطِرْ وَقُمْ وَنَمْ وَصُمْ مِنَ الشَّھْرِ ثَلَاثَۃَ اَیَّامٍ فَاِنَّ الْحَسَنَۃَ عَشْرُ اَمْثَالِھَا وَذَالِکَ مِثْلَ صِیَامِ الدَّھْرِ قُلْتُ اِنِّیْ اُطِیْقُ اَفْضَلَ مِنْ ذَالِکَ قَالَ فَصُمْ یَوْمًا وَاَفْطِرْ یَوْمَیْنِ قُلْتُ اِنِّیْ اُطِیْقُ اَفْضَلَ مِنْ ذَالِکَ قَالَ فَصُمْ یَوْمًا وَاَفْطِرْ یَوْمًا فَذَالِکَ صِیَامُ دَاؤدَ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَھُوَ اَفْضَلُ الصِّیَامِ فَقُلْتُ اِنِّیْ اُطِیْقُ اَفْضَلَ مِنْ ذَالِکَ۔ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا اَفْضَلَ مِنْ ذَالِکَ (بخاری کتاب الصوم باب صوم الدہر) یعنی حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو کسی نے بتایا کہ عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ میں ہر روز روزہ رکھوں گا اور ہر رات عبادت کیا کروں گا۔ آپ نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اس امر کی تصدیق کی۔ آپ نے فرمایا تم میں یہ طاقت نہیں۔ کبھی روزہ رکھا کرو اور کبھی افطار کیا کرو اور کبھی سویا کرو کبھی عبادت کیا کرو اور مہینہ میں تین دن روزہ رکھنا کافی ہے۔ کیونکہ ایک نیکی کا دس گنے بدلہ ملتا ہے۔ اس طرح تیس دن کے روزے پورے ہو گئے اور گویا دائمی روزہ ہو گیا۔ میں نے کہا یا رسول اللہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ فرمایا ایک دن روزہ رکھو دو دن چھوڑ دو۔ میں نے کہا میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ فرمایا اچھا پھر ایک دن روزہ رکھو ایک دن چھوڑ دو اور حضرت داؤدؑ اسی طرح روزے رکھا کرتے تھے۔ میں نے کہا میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں آپ نے فرمایا اس سے زیادہ روزے رکھنا اچھا کام نہیں۔ حضرت عبداللہؓ جب بوڑھے ہوئے تو کہا کرتے تھے کاش میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نصیحت پر عمل کرتا۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن چھوڑنا مجھ پر دوبھر گزرتا ہے۔ اسی طرح آپ نے فرمایا عید کے دن روزہ رکھنا انسان کو شیطان بنا دیتا ہے (بخاری کتاب الصوم)

پھر نماز ہے۔ آپ نے فرمایا جب سورج سر پر ہو یا سورج چڑھ رہا ہو یا سورج ڈوب رہا ہو اس وقت نماز نہ پڑھو (نسائی کتاب الصلوٰۃ و مسند احمد حنبل جلد سادس ص ۱۲، ص ۱۲۵) دراصل اس میں حکمت یہ ہے کہ کوئی وقت ایسا بھی ہونا چاہیئے جس میں انسان کا دماغ فارغ ہو ورنہ وہ بے کار ہو جاتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ اپنے گھر تشریف لے گئے تو آپ نے دیکھا کہ آپ کی ایک بیوی نے جن کا نام زینبؓ تھا چھت کے ساتھ رسہ لٹکایا ہوا ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ رسہ کیسا ہے؟ تو حضور کو بتایا گیا کہ حضرت زینبؓ جب نماز پڑھتی پڑھتی تھک جاتی ہیں تو اس سے سہارا لے لیتی ہیں۔ آپ نے فرمایا اسے فوراً اتار دو۔ یہ کوئی نماز نہیں۔ جب نماز پڑھتے پڑھتے انسان تھک جائے تو اُسے چاہیئے کہ آرام کرے (بخاری

کتاب التہجد باب ما یکرہ فی التشدید فی العبادۃ)
اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے حج کی نذر مانی تھی اور اس کے ساتھ بعض اور شرطیں بھی لگائی تھیں۔ آپ نے دیکھا کہ اُسے اُس کے لڑکے سہارا دے کر چلا رہے ہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا اِسے کیا ہوا؟ لوگوں نے عرض کیا کہ اس شخص نے حج کی نذر مانی ہوئی تھی اس کو ہم اٹھا کر لے جا رہے ہیں تاکہ اس کی نذر پوری ہو جائے۔ آپ نے فرمایا یہ لغو بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی عبادتوں سے غنی ہے (بخاری ابواب المحصر، باب من نذر المشی الی الکعبۃ)

اسی طرح آپ کے زمانہ میں غنیمت کے اموال آتے تو اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ ان اموال کا ایک حصہ غرباء کیلئے مخصوص کر دیا جائے۔ چونکہ سوال ہو سکتا تھا کہ امراء کو غنیمت میں سے کیوں برابر کا حصہ نہ دیا جائے جبکہ وہ بھی جنگ میں حصہ لیتے ہیں؟ اس کے جواب میں فرمایا کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ (الحشر ع) ہم نے غنیمت کا ایک حصہ غرباء کے لئے اس لئے مخصوص کر دیا ہے کہ اُمراء کے پاس تو پہلے ہی روپیہ ہے اگر غنیمت کے اموال میں بھی اُن کا برابر حصہ رکھا جائے تو اُن کے ہاتھوں میں روپیہ جمع ہوتا جائیگا پس ہر مجاہد کو اس کا حصہ دینے کے بعد ایک حصہ غرباء کیلئے الگ بھی مخصوص کر دیا گیا۔

پھر اسلام نے یہ بھی بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے ہے جیسے فرمایا وَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ (جاثیہ ع) زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ اُس نے تمہارے فائدہ کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ نکتہ اسلام نے آج سے تیرہ سو سال قبل بیان کر دیا تھا جبکہ دنیا موجودہ علوم سے بالکل ناآشنا تھی۔ مگر اب جو تحقیقاتیں ہو رہی ہیں وہ اسلام کے اس پیش کردہ اصل کی سچائی کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرتی چلی جا رہی ہیں اور ایسی ہزاروں چیزوں کے فوائد ثابت ہو رہے ہیں جن کو پہلے سخت نقصان دہ سمجھا جاتا تھا یا جن کا کوئی خاص فائدہ معلوم نہیں تھا۔ مثلاً سانپ ایک زہریلی چیز ہے مگر اس زمانہ میں اس کے زہر سے بھی بڑے بڑے بھاری کام لئے جا رہے ہیں اور اسے سل کیلئے مفید بتایا جاتا ہے۔ بہاول پور میں ایک مریض کو ڈاکٹروں نے لاعلاج سمجھ کر جواب دے دیا۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے کہہ دیا کہ وہ طاقت کے لئے میٹھے کا استعمال کرتا رہے۔ اُس نے اس مقصد کے لئے گنے کھانے شروع کئے اور وہ تندرست ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُن گنوں کے نیچے کوئی سانپ دفن تھا جس کا اثر گنوں میں آیا اور اُن گنوں کے استعمال سے اُس کا مرض جاتا رہا۔ ہومیوپیتھی میں یہ زہر ستر سال سے استعمال ہو رہا ہے۔ میں نے خود بھی کئی مریضوں کو دیا ہے اور اس نے غیر معمولی فائدہ دیا ہے۔ پھر سنکھیا کو لے لو اس کے کھانے سے آدمی مر جاتا ہے لیکن خدا تعالیٰ نے اسے مارنے کیلئے نہیں بنایا بلکہ بیماروں کو اچھا کرنے کے لئے بنایا ہے۔ ڈاکٹروں نے اس سے قسم قسم کی دوائیں ایجاد کی ہیں۔ مثلاً پرانے بخاروں میں جو ہلکے ہلکے رہتے ہوں سنکھیا استعمال ہوتا ہے اور اس سے لاکھوں لاکھ بیمار شفا پاتے ہیں۔ پھر پاخانہ بظاہر کتنی گندی چیز ہے لیکن کھیت اسی سے پکتے ہیں۔ میونسپل کمیٹی والے گندے نالوں کو بڑی بڑی قیمتوں پر فروخت کرتے ہیں حالانکہ ہم اُسے ردّی اور لغو سمجھتے ہیں۔ پھر بلغم ہے اس کے ذریعہ مائیکروسکوپ MICROSCOPE سے ڈاکٹر مرض کی تشخیص کرتے ہیں۔ اگر بلغم نہ آئے تو ڈاکٹر گھبراتا ہے اور کہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح بلغم پیدا کرو تا مرض کی تشخیص ہو سکے۔ پھر اس سے آٹو ویکسین تیار ہوتی ہے جو بعض پرانے امراض کو دور کرنے میں بڑی مفید ثابت ہوئی ہے۔ پس کوئی چیز اپنی ذات میں بُری نہیں بلکہ حالات کے ماتحت وہ بُری ہو جاتی ہے اور حالات کے ماتحت اچھی ہو جاتی ہے اور قرآن کریم نے اس نکتہ کو سائنس کی دریافت سے بہت پہلے بیان فرما دیا تھا۔

پھر اخلاق فاضلہ کے متعلق فرمایا کہ یہ انسانی فطرت کے صحیح استعمال کا نام ہے۔ طاقتیں وہی ہوتی ہیں لیکن بُرے استعمال سے بدی بن جاتی ہے اور اچھے استعمال سے نیکی بن جاتی ہے۔ مثلاً ہاتھ میں اُٹھانے کی طاقت رکھی گئی ہے جب وہ بغیر اجازت دوسرے کی چیز اُٹھائے گا تو وہ چوری کہلائے گی لیکن اپنی چیز اُٹھانے کا نام محنت اور مزدوری ہے اور مزدوری کو کوئی شخص بُرا نہیں کہتا اگر طاقت نہ ہوتی تو ہم کام کیسے کرتے۔ مگر طاقت کا غیر محل استعمال اُسے چور بنا دیتا ہے۔ غرض اسلام یہ بتاتا ہے کہ فطرتِ انسانی نیکی پر مبنی ہے صرف اُس کا غلط استعمال خرابی پیدا کرتا ہے۔ جب طبعی قوتوں کو مطابقِ موقعہ مطابق ضرورت اور بطریق مناسب استعمال کیا جائے تو وہ اخلاق فاضلہ کہلاتے ہیں یہ حکمت بھی سوائے اسلام کے اور کسی مذہب نے بیان نہیں کی۔

تزکیۂ نفوس چوتھی بات جس کا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اندر پایا جانا ضروری تھا اور جس کی التجاء دعائے ابراہیمی میں کی گئی تھی وہ تزکیۂ نفوس کا کام تھا۔ اللہ تعالےٰ نے اِس دُعا کے جواب میں فرمایا تھا کہ ہم نے ایسا رسول تم میں مبعوث کر دیا ہے جو تمہارے دلوں کو پاک کرتا اور اُنہیں محبتِ الٰہی کی آگ سے روشن رکھتا ہے۔ اب اس جگہ پر فرماتا ہے کہ اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ۔ وہ تزکیۂ قوم کی دعا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی صرف اُسے ہی ہم نے قبول نہیں کیا بلکہ اس وقت میں ہم نے اپنے رسول کو کوثر عطا فرمایا ہے۔

تزکیہ تین قسم کا ہوا کرتا ہے (۱) عمل کا (۲) جذبات کا (۳) فکر کا۔ یعنی جہاں تک نفسِ انسانی کی پاکیزگی کا سوال ہے اُسے تین قسم کی پاکیزگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اوّل جذبات کی پاکیزگی۔ کیونکہ سب سے پہلے جذبات ہی رونما ہوتے ہیں بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُس وقت جذبات کی وجہ سے ہی وہ تمام کام کرتا ہے عمل اور فکر کا زمانہ ابھی دُور ہوتا ہے۔ بھوک لگتی ہے تو چیخیں مارتا ہے۔ ماں کی جدائی پر روتا ہے اور یہ تمام کام اُس کے جذبات پر مبنی ہوتے ہیں۔ جب وہ چلنا پھرنا شروع کر دیتا ہے تو پھر کچھ عمل شروع ہوتا ہے اور جب وہ بلوغت کے زمانہ تک پہنچتا ہے تو پھر وہ تدبّر کرتا۔ سوچتا اور کچھ نتائج اخذ کرتا ہے اور جب یہ تینوں چیزیں مکمل ہو جاتی ہیں تو اُس کا جسم بھی اپنی تکمیل حاصل کر لیتا ہے۔

اُوپر جو امور بیان ہو چکے ہیں اُن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تزکیہ اسلام کی اتباع کا لازمی نتیجہ ہے اور حقیقی تزکیہ صرف اسلام ہی پیدا کر سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی مذہب کی تعلیم درست ہے اور لوگ اُس پر عمل کرتے ہیں تو وہ ضرور اُن کا تزکیہ کرے گا۔ لیکن اگر مذہب کی تعلیم ہی درست نہ ہو تو پھر اُس پر عمل کر کے انسان ضرور ٹھوکر کھائیگا مثلاً اسلام نے کہا ہے کہ اگر تم عفو میں فائدہ دیکھو تو معاف کر دو اور اگر سزا میں فائدہ دیکھو تو سزا دو۔ اب جو شخص اِس پر عمل نہیں کرتا وہ نہ کرے۔ لیکن جو اِس پر عمل کریگا وہ یقیناً بہترین عمل والا انسان ہوگا لیکن یہودیت کہتی ہے کہ ہر ایک کو سزا دو ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اب جو شخص اس تعلیم پر عمل نہیں کرتا وہ نہ کرے لیکن جو شخص اس تعلیم پر عمل کریگا وہ ضرور غلطی میں مبتلا ہوگا اور ہزاروں دفعہ ظلم اور تعدی سے کام لے گا۔ یا مثلاً انجیل کہتی ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم اپنا دوسرا گال بھی اُس کی طرف پھیر دو اگر تم سے کوئی کُرتہ مانگے تو تم اُسے اپنی چادر بھی اُتار دو اور اگر تمہیں کوئی ایک میل بیگار لے جانا چاہے تو تم اُس کے ساتھ دو میل تک چلے جاؤ۔ اس تعلیم پر اگر کوئی شخص عمل نہیں کرتا تو وہ نہ کرے لیکن عمل کرنے والا کئی دفعہ گناہ میں مبتلا ہو جائیگا مثلاً ڈاکو آئیں اور گھر کا مالک اپنا سامان نکال نکال کر اُن کے سامنے رکھ دے اور کہے کہ آپ نے غلطی سے یہ سامان تو دیکھا نہیں میں یہ سامان بھی آپ کو دیتا ہوں۔ تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ملک کا امن تباہ ہو جائے گا۔ بدامنی کا دَور دَورہ ہو جائے گا۔ ہر طرف فساد پھیل جائے گا۔ ڈاکہ زنی اور چوریوں کے واقعات

تزکیہ کی تین اقسام

بڑھ جائیں گے اور لوگ جرائم کے عادی ہو جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اسلامی تعلیم یہ بھی ہے کہ مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ وَعِرْضِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ۔ جو شخص اپنے مال اور عزت کی حفاظت کرتا ہوا مارا جاتا ہے وہ شہید ہے۔ یہ وہ تعلیم ہے جو دنیا میں امن قائم کرنے والی ہے۔ جب کہیں ڈاکہ پڑے گا سارے شہر والے باہر نکل کر مقابلہ کے لئے آجائیں گے اور ڈاکو آئندہ اس شہر میں آنے کی جرأت نہیں کریں گے کیونکہ وہ سمجھ لیں گے کہ اس شہر کے لوگ ہوشیار ہیں۔ پھر جب ہر شخص کو یہ نظر آئے گا کہ اگر وہ اپنے مال اور عزت کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے گا تو شہید ہوگا تو ایسا شخص ڈریگا کیوں۔ وہ سمجھے گا کہ اگر میں مقابلہ کرتے کرتے مارا گیا تو شہید ہو جاؤنگا اور اگر بچ گیا تو مال بھی محفوظ رہے گا اور عزت بھی قائم رہیگی غرض امن اگر قائم ہوگا تو اسلام کی تعلیم کے مطابق ہوگا۔ عیسائیوں اور یہودیوں کی تعلیم کے مطابق نہیں ہوگا۔ اسی طرح یہودیوں کی کتاب میں یہ حکم ہے کہ جب تو کسی ملک پر حملہ کرے اور اُسے فتح کرے تو تو اُس ملک کے تمام مردوں کو مار ڈال حتیٰ کہ جانوروں کو بھی مار ڈال اور اُس ملک کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالے یہ کیسی وحشیانہ تعلیم ہے اور کیا اس سے ملک میں امن قائم ہو سکتا ہے؟ جب یہ اُن کے سارے مرد مار دیں گے اور اُن کی عورتیں اور بچے قید کرلیں گے تو یہ صاف بات ہے کہ جب اُن کا داؤ چلے گا وہ بھی ایسا کرینگے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ انسان کے اندر ہر چیز کا ردِ عمل پیدا ہوتا ہے اگر اس تعلیم کے مطابق یہودی کسی کے ساتھ ایسا سلوک کرینگے تو جب دوسری قوم کا غلبہ ہوگا وہ بھی اُن سے ویسا ہی سلوک کرے گی۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کھیتی باڑی تباہ ہو جائے گی فصلیں برباد ہو جائیں گی۔ قوم کے افراد کم ہو جائیں گے۔ محنت کرنے والے کہیں نہیں ملیں گے کیونکہ سب لوگ مارے جا چکے ہوں گے لیکن اس کے مقابلہ میں اسلام یہ کہتا ہے کہ اگر بحالت مجبوری تمہیں لڑنا بھی پڑے تو قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ (بقرہ ع ۲۴) تم صرف اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑ رہے ہوں۔ وہ لوگ جو قانونِ ملک اور اخلاقِ فاضلہ کو بالائے طاق رکھ دیں تم اُن سے بےشک لڑو۔ لیکن جو لڑائی میں شامل ہی نہیں اُن کو مارنے کا کیا مطلب؟ جو تمہیں مارنا چاہتا ہو اور تم پر اپنا ہاتھ اٹھاتا ہے اُس کو تم بھی مارو۔ اگر وہ مر جائے گا تو کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ وہ تمہیں مارنا چاہتا تھا لیکن جو گھروں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور لڑائی میں شامل نہیں ہوئے خواہ وہ اس قوم کے ہی افراد ہوں جس سے لڑائی ہو رہی ہے وہ کیوں مارے جائیں۔ وہ تمہارے مقابلہ پر نہیں آئے، وہ تم سے لڑے نہیں، تمہارے مقابلہ پر انہوں نے تلوار نہیں اُٹھائی۔ پھر اُن کو مارنے کا کیا مطلب؟ پھر اسلام کہتا ہے عورتوں اور بچوں کو بھی نہ مارو۔ کمزوروں کو بھی نہ مارو۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی جنگ میں بھی نہ سارے صحابہؓ لڑے اور نہ ہی سارے کفار لڑے۔ اُس وقت عرب کی دو تین لاکھ آبادی تھی مگر تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ لڑنے والے صرف چند ہزار افراد ہوتے تھے۔ اگر صحابہؓ فتح کے بعد سب کفار کو مار دیتے تو عرب میں چند گنتی کے ہی مسلمان رہ جاتے اور اگر سارے کفار مر جاتے تو اسلام کہاں پھیلتا۔ پس یہودیت کی تعلیم ناقص تعلیم ہے۔ صرف اسلام کی تعلیم ہی ایسی ہے جو دنیا میں حقیقی امن قائم کرنے والی ہے۔ پھر یہیں تک بس نہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ فتح کیا تو اُس وقت آپ نے سب دشمنوں کو معاف فرما دیا۔ سوائے سات آدمیوں کے جنہوں نے شرافت اور اخلاق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انسانیت کے خلاف حرکات کی تھیں اُن کے متعلق حکم تھا کہ وہ جہاں کہیں ملیں مار ڈالے جائیں مگر پھر اُن سات کو بھی معاف کر دیا گیا۔ انہی میں سے ایک ہندہ تھی جو ابوسفیان کی بیوی تھی۔ جس نے حضرت حمزہؓ کے ناک اور کان کٹوائے تھے اور آپ کا کلیجہ نکلوا کر چبایا تھا چونکہ ہندہ نے وہ کام کیا تھا جو لڑائی کے ساتھ ضروری نہیں۔ لڑائی

ہوتی ہے تو لوگ ایک دوسرے کو مارتے ہی ہیں لیکن جو کام ہندہؓ نے کیا تھا وہ نہایت ظالمانہ اور انسانیت کے خلاف جرم تھا اِس لئے آپ نے اس کے متعلق حکم دیا کہ اُسے قتل کر دیا جائے یُوں بھی وہ لوگوں کو ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف اُکساتی رہتی تھی فتح مکہ کے بعد آپ جب عورتوں سے بیعت لینے لگے تو چونکہ پردے کا حکم نازل ہو چکا تھا اور تمام عورتیں منہ پر پردہ ڈالے بیعت کے لئے آتی تھیں اُن کے ساتھ مل کر ہندہ بھی آگئی اور وہ بھی بیعت کے الفاظ دُہراتی گئی جب آپ اس فقرہ پر پہنچے کہ ہم شرک نہیں کریں گی تو ہندہ بول اٹھی کہ یا رسول اللہ کیا اب بھی ہم شرک کریں گی۔ ہم ہزاروں ہزار تھے اور آپ کے ماننے والے صرف چند آدمی تھے۔ ہم طاقتور تھے اور آپ کمزور تھے۔ ہمارے پاس لڑائی کا ہر قسم کا سامان موجود تھا اور آپ کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر ہمارے بُت طاقتور ہوتے تو خواہ وہ مقابلہ نہ کرتے، غیر جانبدار رہتے تب بھی آپ جیت نہیں سکتے تھے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بُت بے طاقت تھے اور آپ کا خدا طاقت ور تھا اِسی لئے آپ جیت گئے۔ آپ نے فرمایا ہندہ ہے؟ ہندہ آپ کی رشتہ دار بھی تھی اور آپ اُس کی آواز کو پہچانتے تھے۔ وہ تیز طبیعت تو تھی ہی فوراً بول اُٹھی یا رسول اللہ بے شک آپ نے حکم دیا ہوا ہے کہ جہاں مَیں پائی جاؤں ماری جاؤں۔ مگر مَیں اب مسلمان ہو چکی ہوں آپ مجھے مار نہیں سکتے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ٹھیک ہے اب تم پر وہ حکم نہیں چل سکتا۔

دوسرا شخص ابو جہل کا بیٹا عکرمہؓ تھا اُس کے بھی مارے جانے کا حکم تھا۔ جب مکہ فتح ہوا تو یہ وہاں سے بھاگ گیا۔ اِس نے حبشہ کی طرف بھاگ جانے کی کوشش کی اور ساحلِ سمندر پر چلا گیا۔ اُس کی بیوی کافی دیر سے دل سے مسلمان ہو چکی تھی وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ مَیں تو کافی دیر سے مسلمان ہوں میرا خاوند آپ کا مقابلہ کرتا رہا ہے۔ لیکن یا رسول اللہ وہ آپکی مخالفت اِسی لئے کرتا تھا کہ وہ سمجھتا تھا جو کچھ آپ کہتے ہیں وہ غلط ہے۔ اگر وہ اُسے درست سمجھتا تو لڑتا کیوں۔ آپ رحیم وکریم ہیں اُسے معاف کر دیں۔ آپ نے حکم دیا ہے کہ وہ جہاں پایا جائے مارا جائے۔ یا رسول اللہ وہ کسی اَور ملک کو نکل جائیگا اور برباد ہو جائے گا۔ کیا یہ بہتر ہے کہ آپ کا ایک رشتہ دار تباہ و برباد ہو جائے یا یہ بہتر ہے کہ وہ ہدایت پا جائے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر وہ ہدایت پا جائے تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے مذہب پر قائم رہے اور عرب میں رہے تب بھی اُس کے مذہب میں کوئی دخل نہیں دیا جائے گا۔ اُس نے کہا یا رسول اللہ اگر اجازت ہو تو میں اُسے لے آؤں۔ مگر آپ وعدہ فرمائیں کہ اُسے معاف کر دیں گے۔ آپ نے فرمایا اگر وہ واپس آ جائے گا تو اُسے معاف کر دیا جائے گا سو وہ عکرمہؓ کی تلاش میں نکلی۔ عکرمہؓ ابھی حبشہ جانے کے لئے کشتی میں سوار ہی ہو رہا تھا کہ وہ وہاں پہنچی۔ اُسے بیوی کے ساتھ بڑی محبت تھی جب دونوں آپس میں ملے تو بیوی نے کہا۔ اے میرے خاوند تُو اتنا تو سوچ کہ کیا ایک غیر عرب کی غلامی سے یہ بہتر نہیں کہ تُو ایک عرب بھائی کی غلامی اختیار کرلے۔ پھر اتنا تو سوچ کہ تُو نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اتنی مخالفت کی کہ حد کر دی۔ مگر آپ نے فرمایا ہے کہ اگر عکرمہؓ واپس آ جائے تو میں اُسے معاف کر دوں گا اور اُس کے مذہب میں بھی کوئی دخل نہیں دوں گا۔ عکرمہؓ نے کہا کیا آپ نے ایسا کہا ہے؟ بیوی نے کہا آخر تم میرے خاوند ہو مَیں تمہاری دشمن تو نہیں ہوں۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر تم واپس آ جاؤ تو وہ تمہیں معاف کر دیں گے۔ عکرمہؓ نے کہا مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ مجھے معاف کر دیں۔ مَیں نے تو آپ کی اتنی مخالفت کی ہے کہ اس کے بعد میری معافی کا کوئی امکان ہی نہیں رہتا۔ بیوی نے کہا میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے وعدہ لے آئی ہوں۔ اگر مجھ پر یقین نہ ہو تو خود چل کر پوچھ لو۔ عکرمہؓ واپس لوٹا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دربار میں

حاضر ہوا۔ چونکہ وہ ابھی آپ پر ایمان نہیں لایا تھا اس لئے آپ کا نام ہی لیتا تھا۔ چنانچہ اُس نے آپ کا نام لے کر کہا میری بیوی میرے پاس گئی تھی اور اس نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے اُس سے وعدہ کیا ہے کہ اگر میں واپس آ گیا تو آپ مجھے معاف کر دیں گے اور میرے مذہب میں بھی دخل نہیں دینگے کیا یہ ٹھیک ہے؟ آپ نے فرمایا جو کچھ تمہاری بیوی نے تم سے کہا ہے وہ درست ہے۔ عکرمہؓ کے لئے یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ وہ یہ خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ آپ اُسے اپنے مذہب پر چھوڑ دیں گے اور کسی قسم کا جبر نہیں کریں گے۔ آپ کا جواب سُنتے ہی اُس کا دل صاف ہو گیا۔ اُس نے کہا یا رسول اللہ میں سچے دل سے یہ سمجھتا ہوں کہ یہ معافی اور نیک سلوک ایک نبی کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا اس لئے میں آپ پر ایمان لاتا ہوں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو عکرمہؓ کے ایمان لانے سے بہت خوشی ہوئی اور آپ نے فرمایا۔ عکرمہ تم جو کچھ مانگنا چاہتے ہو مانگ لو آپکا مطلب یہ تھا کہ تمہیں اپنی جلاوطنی کو بچانے کی خواہش ہو تو بتادو تمہاری خواہش قبول کر لی جائے گی۔ مگر کجا وہ عکرمہؓ جو آپ کا دشمن تھا اور کجا اُس کی یہ حالت کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کہی تو اُس نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے دنیا کی حاجت نہیں۔ میں آپ کی بہت مخالفت کر چکا ہوں میری صرف اتنی ہی خواہش ہے کہ آپ خدا تعالیٰ سے یہ دعا فرمائیں کہ وہ میری خطائیں معاف کر دے۔ اس کے علاوہ مجھے اور کسی چیز کی حاجت نہیں۔ یہ دوسرا شخص تھا جس کے مارے جانے کے متعلق حکم تھا۔

تیسرا شخص شام کی طرف بھاگ گیا تھا اور وہاں دھکے کھا رہا تھا۔ لوگوں نے اُس سے کہا تو اپنے محسن کو چھوڑ کر کہاں بھاگا پھرتا ہے جا اور اُس سے معافی مانگ۔ اُس نے کہا میں معافی کیا مانگوں میرے متعلق تو یہ حکم ہے کہ جہاں بھی پایا جاؤں مارا جاؤں۔ انہوں نے کہا تم ذہین آدمی ہو بھیس بدل کر کسی نہ کسی طرح پہنچ جاؤ اور معافی مانگ لو۔ وہ شاعر تھا اور بڑے شاعر کا بیٹا تھا۔ وہ بھیس بدل کر آپ کے دربار میں حاضر ہوا۔ چونکہ وہ مہاجرین کا رشتہ دار تھا اس لئے انہوں نے پہچان لیا۔ لیکن جنہوں نے بھی اُسے دیکھا انہوں نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ میں آپ کی خدمت میں کچھ شعر لایا ہوں اجازت ہو تو سُنا دوں۔ آپ نے اجازت مرحمت فرمائی اور اُس نے وہ اشعار پڑھے جو قصیدہ بُردہ کے نام سے مشہور ہیں۔ عربوں کے عام دستور کے مطابق اپنی محبوبہ اور اونٹنی کا ذکر کرتے ہوئے اُس نے گریہ اختیار کی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا۔ پھر کہا لوگ مجھے کہتے تھے کہ اے ابن کلثوم تو اپنے آپ کو شیر کی غار میں ڈال رہا ہے تو گیا تو مارا جائیگا لیکن میں نے کہا جانے بھی دو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تو معاف کرنے والے انسان ہیں۔ جب اُس نے یہ کہا تو انصار سمجھ گئے کہ یہ شخص اُن سات اشخاص میں سے ہے جن کے قتل کئے جانے کا حکم تھا۔ سب نے اپنی تلواریں میانوں سے نکال لیں مگر انتظار میں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔ کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ادب مد نظر تھا۔ پھر اُس نے چند اشعار کے بعد یہ شعر پڑھا کہ

اِنَّ الرَّسُوْلَ لَسَیْفٌ یُسْتَضَاءُ بِہٖ
مُھَنَّدٌ مِنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ مَسْلُوْلُ

یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک ایسی تلوار ہیں جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے اور وہ تلوار اللہ تعالیٰ کی تلواروں سے ایک تلوار ہے جو ہندی نمونہ کی ہے اور سونتی ہوئی ہے۔ پھر اُس نے قرآن کریم کی تعریف کی کہ یہ اللہ تعالےٰ کا کلام ہے۔ اس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر اُتاری اور اُس کے اُوپر ڈال دی۔ جس کے معنے یہ تھے کہ آپ نے اُسے معاف کر دیا۔ اس پر صحابہؓ میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

غرض اتنی خونریزی اور ایذا دہی کے بعد جس میں آپکی

ایک صاحبزادی حاملہ ہونے کی حالت میں فوت ہوگئیں۔ آپکی
پیاری بیوی حضرت خدیجہؓ فاقوں کی وجہ سے وفات پاگئیں
آپ کے چچا ابوطالب جو اگرچہ ایمان نہیں لائے تھے مگر آپکے
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بہت خدمت کی تھی وہ بھی فاقوں
کی وجہ سے فوت ہوگئے۔ آپ کے چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کیا
گیا اور آپ کے ناک کان کاٹ دیئے گئے اور پیٹ پھاڑ کر
جگر نکال لیا گیا۔ اسی طرح آپ کو اور بھی بہت سی تکلیفیں دی
گئیں۔ صرف سات آدمی ایسے تھے جن کے متعلق آپ نے حکم
صادر فرمایا تھا کہ وہ جہاں کہیں ملیں اُن کو مار ڈالا جائے۔ مگر اُن
میں سے بھی تین کی معافیاں تاریخ سے ثابت ہیں اور بعض
دوسروں کا قتل تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا۔ یہ پاک نمونہ جو
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کے سامنے پیش کیا
یہی وہ نمونہ تھا جس نے صحابہ کے دلوں کو پاک کیا اور اُنہیں
بھی دنیا کا ہادی اور رہنما بنا دیا۔

پھر یہودیت کہتی ہے کہ تو یہودی سے سُود نہ لے۔ غیر
یہودی سے سُود لے سکتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ تو کسی سے
بھی سُود نہ لے۔ نہ مسلم سے سُود لے اور نہ کسی غیر مسلم سے سُود
لے۔ اگر یہ بُری چیز ہے تو پھر اپنوں اور غیروں کی تخصیص
بالکل بے معنی بات ہے۔ پس تزکیۂ عمل جو اسلام نے کیا ہے کوئی
دوسرا مذہب اِس قسم کے تزکیہ کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔

پھر جذبات کا تزکیہ ہے۔ اخلاق کی تعریف جو اسلام
نے کی ہے وہ کسی اور مذہب نے نہیں کی۔ اسلام نے یہ کہا
ہے کہ بعض مخصوص اعمال کو بُرا کہنا غلطی ہے۔ عمل اپنی ذات
میں بُرا نہیں ہوتا بلکہ فطرتی قویٰ کا غلط استعمال اس کو بُرا بنا دیتا
ہے اور اُس کا صحیح استعمال اُسے اچھا بنا دیتا ہے مثلاً عیسائیت
کہتی ہے کہ رہبانیت اختیار کرو۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے
خود انسان کے اندر شہوت پیدا کی ہے۔ اگر کوئی مذہب یہ کہتا
ہے کہ تم اپنی نسل نہ چلاؤ اور جو چیز خدا تعالےٰ نے خود پیدا
کی ہے اس کا استعمال نہ کرو تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر
خدا تعالےٰ نے شہوت کا مادہ انسان کے اندر کیوں پیدا کیا۔ جس
طرح کھانے کی بھوک ہوتی ہے۔ اسی طرح عورت اور مرد کے
تعلقات کی بھی بھوک ہوتی ہے۔ جب بغیر کھانے کے انسان زندہ
نہیں رہ سکتا تو میاں بیوی کے تعلقات کے بغیر اخلاق میں درستی
کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ حماقت سے دوسرے مذاہب نے یہ سمجھ
لیا ہے کہ عورت اور مرد کا تعلق بُرا ہے۔ مگر جن قوموں نے یہ قانون
جاری کیا انہی کے ڈاکٹروں نے یہ ثابت کیا ہے کہ قوتِ رجولیت
اور دماغی طاقت کا آپس میں نہایت گہرا تعلق ہے جب کسی شخص کا
دماغ پریشان رہنے لگتا ہے، خیالات پراگندہ ہو جاتے ہیں تو
ڈاکٹر کہتے ہیں پینڈرین کے ٹیکے کرو تو۔ پنڈرین کیا ہے۔ یہ اُسی
مادہ کا کیمیاوی مرکب ہے جس پر قوتِ رجولیت کا انحصار ہے۔ ڈاکٹر
کہتے ہیں کہ جب کسی انسان کی رجولیت کمزور ہو جائے تو اُس کا
دماغ بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ گویا تصدیق ہے اسلام کی۔ یہ
ثبوت ہے اسلام کی سچائی کا۔ عیسائیت کہتی ہے جذبات کو مار دینا
چاہیئے۔ رجولیت کو اُس نے گناہ قرار دیا ہے اور کہا ہے شادی نہ
کرو تمہارا درجہ بڑے گا۔ مگر اسلام کہتا ہے جذبات کو مارنا
اور شادی نہ کرنا گناہ ہے۔ شادی کرو، بچے پیدا کرو اور اپنی
نسل کو بڑھاؤ۔ عیسائیت کہتی ہے ایک عورت اگر شادی نہ کرے
تو یہ اُس کی نیکی ہے۔ مگر اسلام کہتا ہے عورت اگر شادی نہ کرے
تو یہ بدی ہے۔ بلکہ اسلام نے تو یہاں تک کہا ہے کہ عورت اگر
شادی نہ کرے تو اُسے مجبور کرو کہ وہ شادی کرے۔ مرد کے متعلق
بھی اسلام یہی حکم دیتا ہے کہ وہ ضرور شادی کرے بلکہ رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تَزَوَّجُوْا وَلُوْدًا وَدُوْدًا
ایسی عورت سے شادی کرو جو خوب بچے پیدا کرنے والی ہو اور
خوب محبت کرنے والی ہو۔ گویا عیسائیت نے فطرت کو مارا ہے
اور اسلام نے فطرت کو اُبھارا ہے۔ اب تو دہی فیصلہ کر لو کہ
تزکیہ کون کرتا ہے۔ جو شخص شادی نہیں کرتا وہ جہاں بھی عورت
کو دیکھے گا چونکہ اُس کے اندر عورت کی بھوک ہوگی اُس کا تزکیہ
مٹ جائے گا لیکن اگر وہ شادی شدہ ہوگا تو وہ کسی غیر عورت کے

نگاہِ بد نہیں ڈالے گا۔ کیونکہ اُس کے لئے بھوک کا سوال ہی نہیں۔ جیسے اگر کوئی شخص بھوکا ہے تو وہ جب بھی دوسروں کو کھانا کھاتے دیکھے گا اُس کا دل للچائے گا۔ مگر جب اُس کا اپنا پیٹ بھرا ہوا ہو گا تو دوسروں کو کھانا کھاتے دیکھ کر اُس کے اندر خواہش بھی پیدا نہیں ہوگی۔ اس طرح شادی شدہ آدمی کی بھوک مٹ جاتی ہے اور وہ غیر عورت کو دیکھ کر اُس کی خواہش نہیں کرتا۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی بہت زیادہ حریص ہو تو وُہ شادی شدہ ہونے کے باوجود غیر عورتوں کو بھی بُری نگاہ سے دیکھتا رہے جیسے عام طور پر جب پیٹ بھرا ہُوا ہو تو انسان دوسروں کے کھانے کی طرف نگاہ نہیں اُٹھاتا۔ لیکن بعض حریص ایسے بھی ہوتے ہیں جنہوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہُوا ہوتا ہے مگر پھر بھی دوسروں کو دیکھ کر اُن کا جی للچانا شروع کر دیتا ہے۔ بہرحال عام قانون یہی ہے کہ شادی انسان کے اندر تقویٰ پیدا کرتی ہے یہی حکمت ہے جس کی بناء پر اسلام نے رہبانیت سے منع کیا ہے۔ مگر عیسائیت غیر شادی شدہ ہونا افضل قرار دیتی ہے۔ عیسائیت کہتی ہے تو اپنے جذبات کو کچل دے اور اسلام کہتا ہے تُو اپنے جذبات کا صحیح استعمال کر۔ کیونکہ اِس کے بغیر تزکیہ پیدا نہیں ہو سکتا۔

اِسی طرح ورثہ کے احکام ہیں۔ ورثہ کے متعلق دوسرے مذاہب کی یہ تعلیم ہے کہ جائداد کا باپ مالک ہے وہ جسے چاہے اپنی جائداد دیدے۔ مگر اسلام کہتا ہے ورثہ میں سب کا حق ہے۔ یہ درست نہیں کہ تم سب مال اور جائداد ایک کو ہی دے دو۔ اِسی وجہ سے اسلام نے ہر ایک کے الگ الگ حصے مقرر کئے ہیں جو ہر ایک کو ملنے ضروری ہیں جو ان حصوں کو بلا وجہ (یعنی بلا دینی وجہ کے) توڑے وہ گنہگار ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف عیسائی ممالک میں عام طور پر جائداد کا صرف بڑا لڑکا وارث ہوتا ہے۔ مگر اس صورت میں دوسرے لڑکے کیا سمجھتے ہیں وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ہمارا باپ بڑا نالائق تھا جس نے ہمیں اپنی جائداد سے محروم کر دیا بلکہ یورپ میں تو ممکن ہے لوگ سمجھ لیں کہ اس میں اُن کے باپ کا کوئی قصور نہیں حکومت نے خود ایسا قانون بنا رکھا ہے۔ مگر یہاں تو اس قسم کا کوئی عذر بھی نہیں ہو سکتا بہرحال اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ سب اولاد کو اپنی جائداد سے حصہ دو اور کسی کو اُس کے جائز حق سے محروم نہ کرو۔ اس طرح اسلام نے نہ صرف اولاد کے حقوق کو محفوظ کر دیا بلکہ اُن کے جذبات کا بھی تزکیہ کیا ہے جس بچے کو ورثہ نہیں ملیگا وہ تو ماں باپ کو ساری عمر گالیاں ہی دیتا رہے گا۔ اُس کے دل سے دُعا کیسے نکلے گی۔ غرض اسلام نے بنی نوع انسان کو جو تعلیم دی ہے وہی تعلیم جذبات کا تزکیہ کرتی اور دل میں صحیح نیکی پیدا کرتی ہے۔

فکر کا تزکیہ

تیسری چیز فکر کا تزکیہ ہے۔ فکر بھی ایک بڑی طاقت ہے۔ جذبات وہ چیزیں ہیں جو انسان کے اندر وقتی طور پر ایک جوش پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً بھوک پیاس اور شہوت وغیرہ اور فکر میں ہم پچھلے علوم کو لے کر اُن پر غور کرتے اور اُن سے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ جذبات کا تعلق دل کے ساتھ ہے اور فکر کا دماغ کے ساتھ۔ اسلام نے جو تعلیم دی ہے اس کے ذریعہ وہ انسانی فکر کو بھی ساتھ ہی درست کر دیتا ہے اور اس کے لئے اُس نے کئی طریق تجویز کئے ہیں سب سے پہلے اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ جب بچہ پیدا ہو اُسی وقت اُس کے کانوں میں اذان اور اقامت کہی جائے۔ اب بظاہر یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک بچہ جو بولتا نہیں جو دوسرے کی زبان کو سمجھ نہیں سکتا اُس کے کان میں اذان کہی جا رہی ہے۔ لیکن علم النفس کے ماتحت موجودہ زمانہ میں یہ حقیقت روشن ہوگئی ہے کہ بچہ کے کان میں جو آوازیں پڑتی ہیں وہ اُس پر نہایت گہرا اثر کرتی ہیں۔ فرانس میں ایک عورت تھی وہ بعض اوقات ایسی اعلیٰ درجہ کی جرمن زبان بولتی تھی کہ سُننے والے حیران رہ جاتے تھے حالانکہ وہ جرمن بالکل نہیں جانتی تھی بعضوں نے کہنا شروع کیا کہ اس پر جِنّ سوار ہیں جو جرمن زبان میں بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ جب اس کا چرچا ہُوا تو علم النفس کا ایک ماہر وہاں گیا اور اُس نے دیکھا کہ وہ عورت واقعہ میں بعض دفعہ جرمن زبان میں تقریر

کرنے لگی ہے۔ اُس نے عورت سے مختلف سوالات کئے اور پوچھا کہ آیا اُس کی والدہ کہیں کسی جرمن کے پاس نوکر تو نہیں تھی؟ آخر اُسے معلوم ہُوا کہ اُس کی والدہ ایک پادری کے ہاں ملازم تھی جو جرمن تھا۔ اُس وقت اُس لڑکی کی عمر ڈیڑھ سال کی تھی۔ وہ اُس پادری کو ملنے کے لئے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ریٹائر ہو کر وطن چلا گیا ہے۔ وہ اُس کے وطن گیا تو معلوم ہُوا کہ وہ مر گیا ہے آخر وہ اُس کے بیٹے کے پاس پہنچا اور اُس نے دریافت کیا کہ کیا اُس کے پاس اپنے باپ کی کوئی تقریریں موجود ہیں۔ بیٹے نے گھر سے کچھ سرمن نکال کر دئے جو جرمن زبان میں تھے۔ اُس نے اُن سرمنوں کا مطالعہ شروع کیا تو اُسے معلوم ہُوا کہ جو تقریر وہ عورت کرتی ہے وہ لفظ بلفظ اُن سرمنوں کی نقل ہے۔ پھر اُسے معلوم ہُوا کہ جب وہ جرمن پادری یہ تقریریں کیا کرتا تھا تو یہ لڑکی اپنی ماں کی گود میں ہُوا کرتی تھی اور اگرچہ اُس کی عمر اُس وقت ڈیڑھ سال کی تھی مگر پھر بھی وہ تقریریں اُس کے دل و دماغ پر نقش ہوتی چلی گئیں۔ غرض اس زمانہ میں علم النفس نے بتایا ہے کہ انسان کے دماغ میں ایسے پردے ہیں جن پر ہر آواز منعکس ہو جاتی ہے خواہ عمر کے لحاظ سے وہ ایک دن کا ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اسلام نے آج سے تیرہ سو سال پہلے جبکہ دنیا موجودہ علوم سے بالکل ناآشنا تھی اس کی طرف توجہ دلائی اور پہلے دن بچہ کے کان میں اذان دینے کا حکم دے کر بتایا کہ بچہ کی تربیت اُس کی پیدائش کے وقت سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اُس کے کان میں ہمیشہ نیک باتیں ڈالو۔ اگر پہلے دن اُس کے کان میں اذان کی آواز پڑتی ہے تو دوسرے دن اُس کے کان میں جو آواز پڑے وہ پہلے دن کی آواز سے اچھی ہو اور تیسرے دن جو آواز پڑے وہ دوسرے دن کی آواز سے اچھی ہو۔ گویا اسلامی نقطۂ نگاہ سے فکر کی پاکیزگی ایسی ہی چیز ہے کہ پہلے دن سے ہی بچے کے کان میں نیک باتیں ڈالنا خواہ اُن کو سمجھنے کی اہلیت اُس میں بعد میں پیدا ہو ہر مومن کا فرض ہے۔ تا کہ بڑے ہو کر بھی اُسے فکرِ صحیح کی عادت پڑے۔

حقیقت یہ ہے کہ غلط فکر انسان کے عقائد کو بھی خراب کر دیتا ہے۔ مثلاً اس زمانہ میں بدقسمتی سے مسلمانوں میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں اور وہ دوبارہ اس دنیا میں آئیں گے اور دوسرے لوگوں کا مال لوٹ کر انہیں دے دیں گے۔ اس عقیدہ کی وجہ سے تمام قوم میں خطرناک سستی اور غفلت پیدا ہو گئی ہے۔ اگر اُن کا فکر درست ہوتا تو وہ سمجھتے کہ بغیر قربانی کے دنیا پر فتح حاصل نہیں ہو سکتی اور آج تک کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں گذری جس نے تکالیف برداشت کئے بغیر کامیابی حاصل کی ہو۔ سب سے بڑے تو اللہ تعالےٰ کے نبی ہوتے ہیں مگر انہیں بھی قربانیاں کرنی پڑیں۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے۔ مہدی ہو یا عیسیٰ آپ کا غلام ہی ہوگا۔ مگر جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قربانیاں کرنی پڑیں تو اُس کو کیوں نہ کرنی پڑیں گی۔ پس فکر کی خرابی کا عقائد کی درستی اور صحت پر بھی اثر پڑتا ہے اسی لئے اسلام نے فکر کی درستی پر خاص طور پر زور دیا ہے۔

پھر حیاتِ مسیح کے عقیدہ میں ہی نہیں بلکہ کئی اور عقائد میں بھی مسلمانوں کے فکر کی خرابی کا دخل ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ جب مسیح آئے گا تو تلوار کے زور سے تمام کفار کو مسلمان بنائیگا اور جو نہیں مانیں گے انہیں موت کے گھاٹ اُتار دے گا۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جبر کے نتیجہ میں دوسرا شخص زبان سے تو سچائی کا اقرار کرے گا مگر اُس کے دماغ پر کیسے اثر پڑے گا اور اگر وہ دل سے اقرار نہیں کرے گا تو اُس کے ایمان لانے کا فائدہ کیا ہُوا وہ تو منافق بن جائے گا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے میرے رسول تیرے پاس منافق آتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ تعالےٰ کے رسول ہیں اور اللہ تعالےٰ بھی یہی گواہی دیتا ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کا رسول ہے مگر منافق جھوٹے ہیں۔ اگر جبری طور پر کسی کو منوا لینا درست ہوتا تو پھر منافق کہہ تو رہے تھے کہ تو سچا نبی ہے۔ آپکو

تو خوش ہونا چاہیئے تھا کہ یہ بھی اب کہنے لگے ہیں کہ میں اللہ کا رسول ہوں مگر باوجود اس کے کہ انہوں نے تسلیم کر لیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُن کا صرف مُنہ سے گواہی دے دینا کافی نہیں۔ اُن کے دل اقرار نہیں کرتے اس لئے وہ جھوٹے ہیں۔ اگر لٹھ سے تم کسی کو منواؤ گے تو وہ ایمان تو لے آئے گا لیکن اُس کے دماغ پر کوئی اثر نہیں ہوگا اور اُس کا ایمان کسی کام کا نہیں ہوگا۔ مثلاً تم کہتے ہو خدا تعالےٰ ایک ہے اور وہ تین خدا مانتا ہے۔ اگر تم اُسے لٹھ سے ایک خدا منواؤ گے تو وہ منہ سے تو کہہ دے گا کہ خدا ایک ہے مگر وہ دل سے یہی کہیگا کہ خدا تین ہیں۔ گویا جبر سے اُس کے اندر ایمان پیدا کرنے کی بجائے ہم منافقت پیدا کر دینگے اور یہ کوئی خوشی کی بات نہیں ہوگی۔ جب تک وہ اپنے عقائد پر قائم تھا اور اس کا ظاہر و باطن ایک تھا خواہ اس کا عقیدہ غلط ہی کیوں نہ تھا اِس بات کا امکان تھا کہ اسے سمجھا کر سیدھے راستہ پر لایا جائے۔ لیکن اگر ہم جبر کر کے اُسے منواتے ہیں تو گویا ہم اُسے کہتے ہیں کہ تم مُنہ سے کچھ کہو اور دل میں کچھ رکھو اِس طرح منافقت میں ہم اُسے پکّا کر دیتے ہیں۔ جب تک وہ سچ بولتا ہے اِس بات کا امکان ہے کہ اگر ہم دلیل دیں گے تو وہ مان جائیگا مگر ہم نے اُسے منافقت کی عادت ڈال کر بے ایمانی میں اور بھی پختہ کر دیا۔ پس فکر کی درستی نہایت ضروری چیز ہے اور یہ اسلام نے ہی دی ہے کسی اَور مذہب نے ایسی تعلیم نہیں دی جو فکر کی اصلاح کرنے والی ہو۔ غرض تزکیہ اسلام کی اتباع کا لازمی نتیجہ ہے اور یہ چیز کسی اَور مذہب میں نہیں پائی جاتی پس ثابت ہُوا کہ تزکیہ صرف اسلام ہی کر سکتا ہے۔

اب تک تو اصولی طور پر میں نے تزکیہ قلوب کے متعلق اسلامی تعلیم کو پیش کیا ہے۔ اب ہم عملاً دیکھتے ہیں کہ کیا اسلام تزکیہ کرتا ہے۔ کیا اس کے بالمقابل دوسرے مذاہب نے سابق زمانوں میں ویسا تزکیہ کیا ہے یا کیا اب وہ مذاہب تزکیہ کر سکتے ہیں۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کے پہلے مخاطب عرب تھے اور آپ پر ایمان لانے والوں میں کچھ عورتیں کچھ بچے اور کچھ مرد تھے۔ اُن مردوں میں سے کچھ غلام تھے جن کی کوئی پوزیشن اور حیثیت نہیں تھی، اُن کا کوئی گھر نہیں تھا، کوئی شہری حقوق اُنہیں حاصل نہیں تھے، آقا اُن کو مار ڈالتے تو انکو کوئی پوچھنے والا نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے آقاؤں کی ملکیت سمجھے جاتے تھے۔ اُس وقت کوئی قانون نہیں تھا جو اُن کی حفاظت کر سکتا۔ جب بعض غلام رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تو تپتی ریتوں پر انہیں لٹایا جاتا۔ پتھروں پر گھسیٹا جاتا یہاں تک کہ اُنکے جسم چھل جاتے اور وہ شدید زخمی ہو جاتے۔ جب کچھ عرصہ کے بعد اُن کے زخم مندمل ہو جاتے تو پھر دوبارہ اُن کو پتھروں پر گھسیٹتے اور یہ سلوک اُن سے متواتر جاری رکھا جاتا۔ یہاں تک کہ اُن میں سے بعض کی کھال بھینسے کی کھال کی مانند ہو گئی حضرت بلالؓ کے متعلق آتا ہے کہ آپ کا آقا آپ کو پیٹھ کے بل لٹا کر جُوتیوں سمیت آپ کے سینہ پر کُودا کرتا اور کہتا۔ کہو خدا تعالیٰ کے سوا اور بھی بہت سے خدا ہیں اور اس پر بار بار اصرار کرتا حضرت بلالؓ حبشی تھے اور اس وجہ سے عربی اچھی طرح نہیں بول سکتے تھے۔ جب کفار زیادہ ظلم کرتے اور اصرار کرتے تو آپ کہتے اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔ جب آپکو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں مؤذن مقرر کیا اور آپ اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہتے تو نوجوان ہنس پڑتے۔ انہوں نے وہ نظارے نہیں دیکھے تھے جب کفار اُن کے سینہ پر کُودا کرتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ کہو۔ خدا کے سوا اور بھی معبود ہیں۔ مگر آپ کہتے اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بعض نوجوانوں کو ہنستے دیکھا تو آپ نے فرمایا خدا تعالےٰ کو بلالؓ کا اَشْھَدُ کہنا اتنا پیارا ہے کہ اس کے مقابلہ میں تمہارا اَشْھَدُ کہنا کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا۔ تمہیں کیا معلوم کہ کن حالات میں یہ اَشْھَدُ کہا کرتا تھا۔ اس کی نہ ماں تھی نہ باپ تھا۔ نہ

بھائی تھا۔ نہ بیٹا تھا۔ نہ قبیلہ تھا اور نہ کوئی خیرخواہ تھا جو اُس کی مدد کرتا۔ کفار اُس کے سینے پر ناچتے تھے۔ اُسے گلیوں میں گھسیٹتے تھے اور کہتے تھے۔ کہو خدا ایک نہیں بلکہ بہت سے معبود ہیں۔ مگر یہ کہتا اَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ میں یہی گواہی دیتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ دیکھو کتنا شاندار ایمان ہے جس کا نمونہ حضرت بلالؓ نے دکھایا۔ اِس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے وہ نظارہ دیکھا ہے یا جن کے دلوں میں خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ نے اذان دینی چھوڑ دی تھی کیونکہ آپ کی اذان کا حقیقی قدردان دنیا میں نہیں رہا تھا۔ ایک عرصۂ دراز کے بعد جب نئے لوگ آئے تو انہوں نے اصرار کیا کہ بلالؓ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں اذان دیا کرتا تھا اُسے کہو کہ وہ اذان دے تاکہ ہم بھی اُس کی آواز سُن لیں۔ صحابہؓ آپ کے پیچھے پڑ گئے۔ آپ انکار کرتے رہے۔ لیکن جب صحابہؓ نے زیادہ زور دیا تو آپ مان گئے اور آپ نے اذان دی۔ اُن کا اذان دینا تھا کہ صحابہؓ کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانہ یاد آ گیا اور وہ اس طرح بلبلا کر روئے جس طرح کوئی ماتم برپا ہو جاتا ہے اور اُن کی گھگی بندھ گئی حضرت بلالؓ نے اذان ختم کی تو وہ بے ہوش ہو گئے اور پھر اسی بیماری میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ سو دیکھو کتنی پاکیزگی صحابہؓ کے اندر پائی جاتی تھی اور کتنی محبت انہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود سے تھی۔ اَور کون سا نبی ہے جس کے متبعین میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نظر آ سکے۔ مگر یہاں تو اس قسم کی ہزاروں مثالیں پائی جاتی ہیں۔

ابوبکرؓ جیسا انسان جس کا سارا مکہ ممنونِ احسان تھا۔ وہ جو کچھ کماتے تھے غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کر دیتے تھے آپ ایک دفعہ مکہ کو چھوڑ کر جا رہے تھے کہ ایک رئیس آپ سے راستہ میں ملا اور اُس نے پوچھا ابوبکر تم کہاں جا رہے ہو آپ نے فرمایا اس شہر میں اب میرے لئے امن نہیں میں اب کہیں اور جا رہا ہوں۔ اُس رئیس نے کہا تمہارے جیسا نیک آدمی اگر شہر سے نکل گیا تو شہر برباد ہو جائے گا۔ میں تمہیں پناہ دیتا ہوں تم شہر چھوڑ کر نہ جاؤ۔ آپ اُس رئیس کی پناہ میں واپس آ گئے۔ آپ جب صبح کو اُٹھتے اور قرآن پڑھتے تو عورتیں اور بچے دیوار کے ساتھ کان لگا لگا کر قرآن سُنتے۔ کیونکہ آپ کی آواز میں بڑی رقت، سوز اور درد تھا اور قرآن کریم چونکہ عربی میں تھا ہر عورت، مرد، بچہ اس کے معنے سمجھتا تھا اور سننے والے اُس سے متاثر ہوتے تھے۔ جب یہ بات پھیلی تو مکہ میں شور پڑ گیا کہ اس طرح تو سب لوگ بے دین ہو جائیں گے۔ آخر لوگ اُس رئیس کے پاس گئے اور اُس سے کہا کہ تم نے اس کو پناہ میں کیوں لے رکھا ہے۔ اُس رئیس نے آ کر آپ سے کہا کہ آپ اس طرح قرآن نہ پڑھا کریں مکہ کے لوگ اس سے ناراض ہوتے ہیں حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا پھر اپنی پناہ تم واپس لے لو میں تو اس سے باز نہیں آ سکتا۔ چنانچہ اس رئیس نے اپنی پناہ واپس لے لی۔ یہ آپ کے تقویٰ اور طہارت کا کتنا زبردست ثبوت ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وہ لوگ شدید دشمن تھے اور آپ کو گالیاں بھی دیا کرتے تھے۔ لیکن ابوبکرؓ کی پاکیزگی کے وہ اتنے قائل تھے کہ اُس رئیس نے کہا آپ کے نکل جانے سے شہر برباد ہو جائے گا۔ حضرت عمرؓ کی بھی لوگ تعریفیں کیا کرتے تھے اور آپ کو بہت نیک سمجھتے تھے۔ دشمن کی زبان سے ان کی تعریف کا نکلنا بتاتا ہے کہ اُن کی پاکیزگی کمال کو پہنچ گئی تھی حضرت علیؓ کے متعلق بھی آتا ہے کہ انہیں بہت نیک سمجھا جاتا تھا اسی طرح باقی صحابہ کے متعلق لوگوں کا یہی خیال تھا کہ یہ بڑے نیک لوگ ہیں۔

پھر صحابہؓ نے نیکی کا وہ نمونہ دکھایا جس کی مثال دنیا کی کسی اَور قوم میں نہیں ملتی۔ جنگِ بدر، حُنین اور احزاب میں جو صحابہؓ نے قربانیاں کیں اُن کی مثال کسی اَور قوم میں کہاں مل سکتی ہے۔ احزاب میں مسلمان صرف سات سو کی تعداد میں تھے اور کفار کا لشکر پندرہ ہزار کے قریب تھا۔ تیرہ جیسا دشمنِ اسلام

لکھتا ہے کہ حیرت آتی ہے کہ تھوڑے سے آدمی اتنے بڑے لشکر کو کس طرح روکے ہوئے تھے۔ پھر وہ لکھتا ہے کہ اصل میں اتنے بڑے لشکر کو اگر کسی نے روکا تو اُس دیوانہ وار محبت نے جو صحابہ کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے تھی۔ وہ خود لکھتا ہے کہ بارہا ایسا ہوا کہ دشمن خندق پھاند کر آگے بڑھ آیا اور قریب تھا کہ وہ مدینہ کو تباہ کر دیتا مگر جب وہ ہزاروں کا لشکر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خیمہ کی طرف رُخ کرتا تو یُوں معلوم ہوتا تھا کہ صحابہؓ دیوانے ہو گئے ہیں۔ وہ آپؐ کے خیمہ کے گرد جمع ہو جاتے اور آپ کے گرد گرنا شروع کرتے اور اس بے جگری سے لڑتے کہ ہزاروں کے لشکر کو تتر بتر کر دیتے اور پھر ایک دفعہ نہیں بلکہ متواتر یہ نظارہ نظر آتا ہے اور جس طرف بھی نگاہ پڑتی صحابہؓ پروانوں کی طرح قربان ہوتے نظر آتے تھے۔

ایک دفعہ دو صحابہؓ کو کفار دھوکا سے لے گئے اور ایسے لوگوں کے ہاتھ انہیں بیچ دیا جن کے باپ جنگوں میں مارے گئے تھے جب اُن میں سے ایک کو کفار مارنے لگے تو سارے لوگ اکٹھے ہو گئے تاکہ اس نظارہ کو دیکھیں۔ ابو سفیان بھی بلایا گیا جب اُس صحابی کی گردن لکڑی پر رکھی گئی اور وہ اُسے مارنے لگے تو اُس نے کہا ذرا مجھے نماز پڑھ لینے دو۔ انہوں نے کہا اچھا تم نماز پڑھ لو۔ جب اُس صحابیؓ نے نماز پڑھ لی تو اُس نے کفار سے مخاطب ہو کر کہا۔ مَیں نے لمبی نماز پڑھنی تھی مگر اس لئے جلدی جلدی پڑھ لی ہے تاکہ تم یہ نہ سمجھو کہ میں موت سے ڈرتا ہوں۔ پھر اُس صحابیؓ نے دو شعر پڑھے جن کا مفہوم یہ تھا کہ جب اللہ تعالےٰ کے راستہ میں موت آجائے تو پھر اس بات کا سوال ہی کیا ہے کہ سر کٹ کر دائیں طرف گرتا ہے یا بائیں طرف گرتا ہے۔ جو حالت بھی ہو اُس میں خوش رہنا چاہیئے ایک دوسرے صحابی سے جو اسی طرح مکہ والوں کے ہاتھ میں آگیا تھا کفار نے پوچھا کیا تمہارا دل چاہتا ہے کہ تم تو اس وقت اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے ہوتے اور تمہاری جگہ اس وقت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) ہماری قید میں ہوتے۔ اُس صحابیؓ نے کہا تم تو یہ کہتے ہو کہ مَیں مدینہ میں آرام سے بیٹھا ہُوا ہوں اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میری جگہ ہوں خدا کی قسم میرا دل تو یہ بھی نہیں چاہتا کہ میں آرام سے گھر میں بیٹھا ہُوا ہوں اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کی گلیوں میں چلتے ہوئے کوئی کانٹا بھی چُبھ جائے۔ یہ آپ کے تزکیہ کا کتنا شاندار ثبوت ہے کہ صحابہؓ کے اندر آپ کی ایسی محبت قائم ہو گئی جس کی مثال دنیا کے پردہ پر اور کہیں نظر نہیں آسکتی۔ ہمارے ہاں مرد جنگ پر جاتے ہیں تو عورتیں روتی ہیں مگر اُس وقت عورتیں اپنے خاوندوں کو مجبور کرتی تھیں کہ وہ جہاد کے لئے باہر جائیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب جنگ تبوک کے لئے تشریف لے گئے تو ایک صحابی جو کئی دنوں سے باہر کسی سفر پر گئے ہوئے تھے گھر آئے۔ خاوند کو بیوی سے محبت ہوتی ہے آپ نے گھر میں داخل ہوتے ہی چاہا کہ بیوی سے پیار کریں لیکن جب آگے بڑھے تو بیوی نے آپ کو زور سے دھکا دیکر پیچھے ہٹا دیا اور کہا تمہیں شرم نہیں آتی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تو جنگ کے لئے تشریف لے گئے ہیں اور تمہیں بیوی سے پیار سُوجھ رہا ہے۔ وہ صحابی اُسی وقت پیچھے ہٹ گئے۔ دروازہ کھولا اور جنگ کے لئے چلے گئے۔ کتنا بڑا عشق ہے جو صحابہؓ کے دلوں میں پایا جاتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو دیکھو۔ جب اُنہیں مقابلہ کرنا پڑا تو اُس نے کہہ دیا اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (مائدہ ع۴) جاؤ تم اور تمہارا رب دونوں لڑتے پھرو۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ شہر فتح کر کے دے دو گے تو ہم اُس میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر مسیح علیہ السلام کے حواریوں کو دیکھو جب حضرت مسیح علیہ السلام کو روما کے سپاہی پکڑ کر لے گئے تو آپ کے سب سے بڑے حواری جو بعد میں آپ کے خلیفہ بھی ہوئے یعنی پطرس۔ وہ آپ کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے کہ کسی نے کہا یہ بھی اس کا حواری ہے اسے بھی قید کر لو۔ تمام ہجوم

ادھر آ گیا اور پطرس کو پکڑ لیا۔ اُس نے کہا مَیں تو اس پر لعنت بھیجتا ہوں۔ مَیں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ کون ہے۔ پھر وہ آگے چلے تو پھر کسی نے کہا کہ یہ بھی اس کا حواری ہے اسے بھی پکڑ لو۔ پطرس نے پھر دوسری دفعہ آپ پر لعنت کی جس پر اُسے چھوڑ دیا گیا۔ مگر پھر لوگوں کی توجہ اُس کی طرف پھری اور انہوں نے پھر پکڑ لیا۔ پطرس نے پھر مسیح علیہ السلام پر لعنت کی جب وہ تیسری بار لعنت کر چکا تو اُس وقت مُرغ نے اذان دے دی۔ یہ دراصل حضرت مسیح علیہ السلام کی ایک پیشگوئی کا ظہور تھا۔ پطرس نے حضرت مسیح علیہ السلام سے کہا تھا کہ مجھے آپ سے اتنی محبت ہے کہ میں آپ کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ اس پر حضرت مسیح نے کہا پطرس تُو تو یہ کہتا ہے اور میں تجھے یہ کہتا ہوں کہ تُو آج رات مُرغ کے اذان دینے سے پہلے تین دفعہ مجھ پر لعنت کریگا چنانچہ ادھر اُس نے تین دفعہ لعنت کی اور اُدھر مرغ نے اذان دے دی اور آپ کی پیشگوئی پوری ہو گئی۔ اب کجا یہ نمونہ اور کجا صحابہ کی فدائیت دونوں میں کوئی بھی تو نسبت نہیں۔

پھر آپ کی زندگی کے بعد بھی ایسے نظارے نظر آتے ہیں جو صحابہؓ کے بلند کیریکٹر کے شاہد ہیں۔ جب یروشلم فتح ہُوا تو ایک وقت ایسا آیا جبکہ مسلمان اُسے اپنے قبضہ میں نہ رکھ سکے اور اُنہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ یہ حضرت عمرؓ کا زمانہ تھا یروشلم عیسائیوں کا مرکز تھا اور عیسائیوں سے ہی آباد تھا۔ مسلمانوں نے اُنہیں بُلا کر اُن کا ٹیکس واپس کر دیا اور کہا اب ہم واپس جا رہے ہیں اور چونکہ ہم نے یہ ٹیکس تمہاری حفاظت کے لئے لیا تھا اس لئے ہمارا کوئی حق نہیں کہ ہم تمہارا روپیہ اپنے پاس رکھیں۔ تاریخ میں آتا ہے کہ مسلمان جب یروشلم سے باہر نکلے تو عیسائی عورتیں اور بچے دو تین میل تک اُن کے پیچھے پیچھے آئے تاکہ اُنہیں روک لیں اور وہ دعائیں کرتے تھے کہ خدا مسلمانوں کو پھر واپس لائے۔ گویا وہ ایک غیر حکومت کا تسلط چاہتے تھے اس لئے کہ اُن کے اندر نیکی پائی جاتی تھی اس لئے کہ اُن کے اندر انصاف پایا جاتا تھا لیکن دُنیوی حکومتوں کے لشکر جب کسی جگہ سے لوٹتے ہیں تو وہ شہر کو لوٹ لیتے ہیں مگر یہاں مسلمان فوج کے کمانڈر نے وہ روپیہ بھی شہر والوں کو واپس دے دیا جو اُن سے بطور ٹیکس وصول کیا گیا تھا۔ یہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے تزکیہ کا کتنا زبردست ثبوت ہے۔ اسی طرح ایک دفعہ کفار نے دھوکہ سے ایک حبشی مسلمان سے معاہدہ کر لیا اور انہوں نے قلعہ کے دروازے کھول دئے جب لشکر آگے بڑھا تو انہوں نے کہا ہمارا تم سے معاہدہ ہو چکا ہے۔ کمانڈر نے کہا مجھے تو پتہ نہیں۔ انہوں نے کہا ہم نے ایک حبشی سے معاہدہ کر لیا تھا۔ اسلامی لشکر کے کمانڈر نے کہا کمانڈر تو میں ہوں اُسے معاہدہ کا کیا اختیار تھا۔ کفار نے کہا ہم نہیں جانتے ہم اُس سے معاہدہ کر چکے ہیں۔ آخر حضرت عمرؓ کو لکھا گیا کہ ایسا واقعہ ہُوا ہے اب کیا کیا جائے۔ آپ نے جواب دیا مَیں یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی مسلمان کی زبان جھوٹی ہو۔ اس دفعہ تم اس معاہدہ کو پورا کرو لیکن آئندہ کے لئے احتیاط رکھو۔

پھر یہ واقعات صرف زمانہ صحابہؓ تک ہی نہیں تھے بلکہ بعد میں بھی مسلمانوں نے اس تزکیہ کی بڑی بڑی شاندار مثالیں پیش کی ہیں۔ گبن جو یورپ کا ایک مشہور مؤرخ ہے وہ مسلمانوں کے ایک بادشاہ مالک ارسلان کی نسبت لکھتا ہے کہ جب اُس کا باپ مر گیا تو اس کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد مالک کے چچا اور بھائی نے بغاوت کر دی اور کہا کہ بادشاہت کا حق ہمارا ہے۔ علامہ نظام الدین طوسی جو اُس کے وزیر اعظم تھے اور جو شیعہ عقائد کے تھے انہوں نے مالک سے کہا کہ آپ حضرت موسیٰ رضا کی قبر پر تشریف لے چلیں اور دعا کریں خدا تعالیٰ آپ کو فتح عطا فرمائے گا۔ مالک نے یہ بات مان لی اور وہ دونوں موسیٰ رضا کی قبر پر گئے اور دعا کے لئے جُھکے۔ نظام الدین طوسی جب سجدہ سے اُٹھا اور دعا سے فارغ ہُوا تو اپنے اخلاص کو ظاہر کرنے کیلئے اُس نے کہا

بادشاہ سلامت! میں نے دعا کی ہے کہ خدا تعالیٰ کل کی جنگ میں آپ کو فتح عطا فرمائے اور آپ کا دشمن ہلاک ہو۔ الپ ارسلان نے کہا میرے اُستاد! میں نے تو یہ دعا نہیں کی۔ نظام الدین طوسی نے پوچھا آپ نے کیا دعا کی ہے؟ ملک نے کہا میں نے تو یہ دعا کی ہے کہ اے میرے خدا میں نہیں جانتا کہ دین اور مُلک کے لئے میں مفید ہوں یا کوئی اور شخص۔ اگر تُو جانتا ہے کہ میں ملک کے لئے مفید وجود نہیں ہوں تو اے خدا کل کی جنگ میں تُو مجھے فتح نہ دے بلکہ مجھے موت دیدے تا کہ بنی نوع انسان کا نقصان نہ ہو۔ گبن اس واقعہ کا ذکر کر کے لکھتا ہے کہ کافر تو یہ کہتا ہے (وہ عموماً مسلمانوں کو کافر ہی لکھتا ہے) مگر مجھے ساری عیسائی مومن دنیا میں بڑے سے بڑے بادشاہوں میں بھی یہ مثال نہیں ملتی جو اس چھوکرے نے پیش کی ہے۔ یہ کس بات کا نتیجہ تھا۔ اس تزکیہ کا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ اور جس کی مثال دنیا کے کسی اور مذہب میں نظر نہیں آتی۔ گویا اس پہلو کے لحاظ سے بھی اللہ تعالےٰ نے آپ کو وہ کوثر بخشا جو آپ کی فضیلت اور برتری کا ایک زندہ ثبوت ہے۔

پھر اسلام اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی افضلیت اس امر سے بھی ظاہر ہے کہ قربِ الٰہی جو تزکیۂ نفس کا حقیقی ثبوت ہے اُس کا دعویٰ صرف اسلام میں ہی پایا جاتا ہے اور وہی دنیا کے سامنے یہ اعلان کرتا ہے کہ خدا تعالےٰ اب بھی اپنے مومن بندوں سے کلام کرتا ہے، اب بھی خدا تعالےٰ کے ملائکہ اُس کے پاک بندوں پر نازل ہوتے ہیں اور اب بھی وہ اُنہیں مستقبل کی خبریں دیتا اور اُن کی تکالیف کے اوقات میں اپنے نشانات سے اُن کی تائید کرتا ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور کوئی دعویٰ اُس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتا جب تک اُسکے ساتھ دلیل نہ ہو۔ یوں کہنے کو ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اور خدا تعالیٰ اُس سے محبت کرتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اسکا ثبوت کیا ہے؟ صرف قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کامل متبعین کے لئے وہ علامات بیان کرتی ہے جن سے ہر دیدۂ بینا رکھنے والا انسان یہ معلوم کر سکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ اُن سے پیار کرتا ہے اور اُس کا قرب اُنہیں حاصل ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کی اس عظیم الشان امتیازی خوبی کو فراموش کر دیا اور بجائے اس کے کہ ہندو اور یہودی اور عیسائی اُنہیں کہتے کہ یہ صفت تم میں نہیں پائی جاتی خود انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ صفت ہم میں نہیں پائی جاتی لیکن قرآن کریم فرماتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ (حٰم سجدہ ع۴) وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے اور اللہ کو رب کہنے کی وجہ سے اُن پر ظلم کیا جاتا ہے، انکو تکالیف دی جاتی ہیں، اُن کو قسم قسم کی ایذائیں پہنچائی جاتی ہیں اور وہ اُنہیں برداشت کر کے استقامت اور صبر کا اعلیٰ نمونہ دکھلاتے ہیں۔ اُن پر اللہ تعالےٰ کے فرشتے نازل ہوتے ہیں جو اُنہیں یہ پیغام دیتے ہیں کہ آئندہ جو کچھ ہونے والا ہے اُس سے ڈرو نہیں اور پیچھے جو کچھ نقصان ہو چکا ہے اس پر غم نہ کرو اور اُس جنت کے ملنے پر خوشی مناؤ جس کا اللہ تعالےٰ نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا تھا کہ وہ جنت کہاں ہوگی اِس جہان میں یا اگلے جہان میں یا دونوں جہانوں میں؟ اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے کہ جنت صرف اگلے جہان میں نہیں ہوگی جیسا کہ غیر احمدیوں کا عقیدہ ہے بلکہ خدا تعالےٰ کے فرشتے مومنوں سے یہ کہتے ہیں کہ تم کو جنت ملے گی اور ہم اِس دنیا میں بھی تمہاری مدد کریں گے اور آخرت میں بھی تمہارے ساتھ ہونگے اللہ تعالیٰ ہمیں دونوں جہانوں میں تمہاری تائید کا

حکم دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جنت کا لفظ اس دنیا کے لئے بھی بولا گیا ہے اور اگلے جہان کے لئے بھی۔ یہ ہے وہ سلوک جو اُمّتِ محمدیہ کے کامل افراد کے ساتھ ہوتا ہے اور ہوتا رہیگا صرف اگلے جہان میں نہیں بلکہ اِس دُنیا میں بھی ہوگا اور اگلے جہان میں بھی ہوگا۔ ایک اور مقام پر اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ (الرحمٰن ع ۳) وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی خشیت اپنے دلوں میں رکھتے ہیں اُن کو دو جنتیں ملیں گی۔ ایک اِس جہان میں اور ایک اگلے جہان میں۔ یہ محض ڈھکوسلہ ہے کہ جنت صرف اگلے جہان میں ملتی ہے خدا تعالیٰ صاف طور پر فرماتا ہے کہ مومن کو اگلے جہان میں جنت ملے گی اور اس جہان میں بھی جنت ملے گی۔ اگر جنت صرف اگلے جہان میں ہی ہو تو ہم کسی غیر مذہب والے کو کیا ثبوت دے سکتے ہیں۔ وہ کہہ دے گا کہ میں تو اگلے جہان کو مانتا ہی نہیں۔ جب تک ہم خدا تعالےٰ کا وہ سلوک اور تائید جو ہمیں اس دنیا میں حاصل ہے اُسے نہ دکھائیں وہ اگلے جہان کے وعدوں پر اعتبار نہیں کر سکتا لیکن اگر ہم اُسے اپنے ساتھ خدا تعالیٰ کا امتیازی سلوک اور اُسکی وہ تائیدات جو ہمیں اس دنیا میں حاصل ہیں دکھادیں تو پھر اُسے ماننا پڑے گا کہ اگلے جہان میں بھی خدا تعالےٰ کا سلوک ہمارے ساتھ ایسا ہی ہوگا اور اُس کی تائید ہمارے شاملِ حال ہوگی۔

یہ ایک عظیم الشان وعدہ ہے جو مومنوں سے کیا گیا ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ کمزور ہوں گے۔ باوجود اس کے کہ دنیا میں اُن کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی پھر بھی جو کچھ وہ چاہیں گے وہی ہوگا اور اُنہی کی بات دنیا میں پھیلے گی اور اُن کے مخالف بالکل کمزور اور ذلیل ہو جائیں گے۔ قربِ الٰہی کے حصول کا یہ دعویٰ اور اُس کی یہ نمایاں علامات جو قرآن کریم نے بیان فرمائی ہیں سوائے اسلام کے اور کسی مذہب میں نہیں پائی جاتیں۔ جو ثبوت ہے اس بات کا کہ حقیقی تزکیہ صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں میں ہی پایا جاتا ہے۔

پھر تزکیہ کے لئے ضروری ہے کہ تزکیہ کرنے والا خود مزکّی ہو۔ لکھا پڑھا آدمی ہی دوسرے کو پڑھا سکتا ہے اِس لئے جو شخص دوسرے کا تزکیہ کرتا ہے اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود بھی تزکیہ یافتہ ہو۔ اس لحاظ سے بھی جب ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو تزکیہ کے بارہ میں بھی کوثر عطا فرمایا ہے بلکہ خود اللہ تعالےٰ نے اپنی حکمت اور مشیت کے ماتحت آپ کو ہر حالت میں سے گذارا تاکہ آپ کے مزکّی ہونے کا ثبوت اہل دنیا کو مل سکے۔

(۱) اس تزکیہ کا ایک ثبوت تو آپ کی عمر کے ابتدائی زمانہ میں ہی نظر آتا ہے اور وہ اس طرح کہ آپ پچیس سال تک کنوارے رہے اور اس عرصہ میں آپ نے ایسی غیر معمولی عفّت کا ثبوت دیا کہ دشمن بھی آپ پر یہ الزام نہیں لگا سکا کہ آپ کا کسی عورت کے ساتھ ناجائز تعلق تو کیا معمولی خلا ملا ہی ہو۔ یا آپ نے کسی عورت سے ایسی باتیں کی ہوں جن سے آپ کی بے تکلفی ثابت ہو۔ آپ نے عمر کا مضبوط ترین حصہ غیر شادی شدہ ہونے کی صورت میں گزار دیا مگر آپ پر کوئی الزام نہیں آیا۔ اس کے مقابلہ میں اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا جائے جنہیں بعض کے نزدیک خدا تعالےٰ نے زندہ آسمان پر اُٹھا لیا اور بعض کے نزدیک آپ صلیب پر فوت ہو کر دوبارہ زندہ ہوئے اور آسمان کی طرف اٹھائے گئے تو اُن کے متعلق خود انجیل کہتی ہے کہ اُن کے اردگرد ہمیشہ عورتیں رہتی تھیں سو وہ آپ کو مالش کرتی تھیں۔ آپ کا سر جھستی تھیں اور آپ کو خوشبو مَلا کرتی تھیں۔ اب کجا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پچیس سالہ زندگی کہ اُس پر کوئی دشمن بھی الزام نہیں لگا سکا اور کجا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی جس کے متعلق خود انجیل ایسی باتیں کہتی ہے جو آپ کی شان کو

بڑھ کر ثابت ہونے والی ہیں۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم اعتقاداً یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی بھی پاک تھی مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی آپؑ سے زیادہ پاک تھی اور صرف پاک ہونا اَور چیز ہے اور زیادہ پاک ہونا اَور چیز ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پاکیزگی حاصل تھی مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اِس میں کوثر عطا ہُوا تھا۔ یعنی آپ کو پاکیزگی کی انتہاء ملی تھی اور اِن دونوں میں بڑا بھاری فرق ہے۔

(۲) پھر آپ غریب تھے لیکن غربت کے باوجود آپ نے غیر معمولی استغناء کا ثبوت دیا۔ آپ اُس خاندان میں سے تھے جو خانہ کعبہ کا محافظ تھا۔ مگر کوئی شخص یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ آپ نے کسی سے کبھی کوئی چیز مانگی ہو یا اُس کے مانگنے یا حاصل کرنے کی خواہش ہی کی ہو۔ آپ کے والد جب وفات پا گئے تو پہلے آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپکو پرورش میں لے لیا۔ پھر اُن کے فوت ہو جانے کے بعد آپ اپنے چچا کے پاس رہے لیکن کہیں سے بھی یہ ثبوت نہیں ملتا کہ آپ نے کبھی کسی سے سوال کیا ہو۔ ابوطالب کو اپنے باپ کی وصیت اور آپ کی ذاتی نیکی کی وجہ سے آپ سے بے حد محبت تھی اور وہ آپ کو اپنے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ آپ کی عمر اُس وقت آٹھ نو سال کی تھی بعض دفعہ جب ابوطالب گھر آتے اور دیکھتے کہ اُن کی بیوی اپنے بچوں میں کوئی چیز بانٹ رہی ہے اور آپ ایک طرف کو وقار سے بیٹھے ہیں تو اُن کی محبت جوش میں آجاتی اور وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنی گود میں اُٹھا لیتے اور اپنی بیوی سے کہتے۔ میرے بچے کو تم نے نہیں دیا۔ میرے بچے کو تم نے نہیں دیا۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ یہ تو آپ کی بچپن کی حالت کا نقشہ ہے۔ آپ جب بڑے ہوئے تو یہ آپؐ کے استغناء کا ہی نتیجہ تھا کہ سارے ملک نے آپ کا نام امین رکھا ہُوا تھا۔ یعنی لالچ آپ میں بالکل نہیں اور یہ کہ آپؐ پورے طور پر دوسرے کی امانت اُس کے سپرد کر دیتے ہیں۔ آپ کا نام صدوق بھی رکھا گیا تھا یعنی آپ راستباز بھی ہیں اور یہ ثبوت ہے آپ کے تزکیہ یافتہ ہونے کا جو آپ کی زندگی میں نظر آتا ہے۔

(۳) پھر آپ کے پاکیزہ اخلاق کا ثبوت اِس بات سے بھی ملتا ہے کہ آپ نے شادی کی تو ایسی عورت سے جس کی عمر چالیس سال کی تھی اور ایسی بھر پُور جوانی میں کی جب کہ آپ پچیس سال کے تھے اور پھر اس تعلق کو نہایت خوبی کے ساتھ نبھایا۔ دشمن کہہ سکتا ہے کہ آپ نے دولت کے لالچ سے ایسا کیا مگر واقعات بتاتے ہیں کہ دولت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا حضرت خدیجہؓ نے محض آپ کی نیکی اور دیانت دیکھ کر آپ سے شادی کی۔ درحقیقت اُس زمانہ میں یہ دستور تھا کہ تجارت کا قافلہ جب شام کو جاتا تو اُمراء اپنے نمائندے اُس میں بھیجتے تھے جو اُن کی طرف سے تجارت کیا کرتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ چونکہ ایک مالدار شخص کی بیوہ تھیں اور خود بھی مالدار تھیں وہ بھی اس قافلہ میں اپنے آدمی بھجوایا کرتی تھیں۔ جب اُنہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور شہرت سُنی تو آپ کو اپنی طرف سے نمائندہ مقرر کر کے تجارت کے لئے بھیج دیا۔ اس تجارت میں حضرت خدیجہؓ کو اتنا نفع ہُوا کہ اس سے قبل اتنا نفع کبھی نہیں ہوا تھا اُنہوں نے آپ کی واپسی پر اپنے غلاموں سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ یہ اس شخص کی برکت ہے۔ باقی لوگ جاتے ہیں تو نفع والا سودا دیکھ کر اپنی تجارت کر لیتے ہیں لیکن انہوں نے اپنا کام نہیں کیا۔ جہاں نفع کی صورت ہوتی وہاں آپ کا مال لگا دیتے اور پھر پہلے تو ہم کھا پی بھی لیتے تھے اِس دفعہ انہوں نے ہمیں ناجائز طور پر کھانے بھی نہیں دیا اور خود بھی نہیں کھایا۔ یہ کہتے تھے کہ مال سب مالک کا ہے اور جتنا خرچ تمہارے لئے مقرر ہے اس سے زیادہ مَیں نہیں دوں گا۔ اِس کا قدرتی طور پر یہ نتیجہ ہُوا کہ نفع زیادہ آیا ہے۔ اِس چیز کا حضرت خدیجہؓ کے دل پر خاص طور پر اثر ہُوا اور اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ

میں اس نوجوان سے شادی کر لوں۔ آپ نے اپنی سہیلیوں سے مشورہ کیا۔ اُنھوں نے بھی کہا کہ تعریف تو اس کی بہت سُنی ہے آپ شادی کر لیں تو کوئی حرج نہیں۔ اس کے بعد آپ نے اپنی ایک سہیلی ابوطالب کے پاس بھیجی۔ اُس نے آپ سے جا کر کہا کہ اگر خدیجہؓ کے ساتھ آپ کے بھتیجے کی شادی ہو جائے تو کیا آپ راضی ہیں۔ ابوطالب نے کہا کہ خدیجہؓ سے میرے بھتیجے کی شادی ہو جائے یہ ناممکن بات ہے۔ وہ مالدار عورت ہے اور میرے بھتیجے کے پاس کچھ بھی نہیں۔ بھلا اس سے خدیجہؓ کی شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ خدیجہؓ کی سہیلی نے کہا اگر شادی ہو جائے تو پھر؟ ابوطالب نے کہا اگر ہو جائے تو بڑی اچھی بات ہے۔ پھر وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس گئی اور کہا آپ کی اگر خدیجہؓ سے شادی ہو جائے تو کیا آپ راضی ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ وہ تو مالدار عورت ہے اور میں ایک غریب آدمی ہوں میرا اور اُس کا کیا جوڑ ہے۔ حضرت خدیجہؓ کی سہیلی نے کہا اگر وہ خود شادی کی خواہش کرے تو کیا آپ اُس سے شادی کرنے کے لئے تیار ہیں؟ آپ نے فرمایا اگر اُسے خود خواہش ہو تو مجھے منظور ہے۔ چنانچہ اس کے بعد رشتہ داروں میں گفتگو ہوئی اور آپ کا نکاح ہو گیا۔ گویا یہ نکاح محض آپ کی نیکی کا نتیجہ تھا۔ اِس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آپ نے مال کی وجہ سے خدیجہؓ سے شادی کی تھی۔ پھر باوجودیکہ آپ کی عمر اور حضرت خدیجہؓ کی عمر میں ۱۵ سال کا فرق تھا۔ آپ پچیس سال کے تھے اور حضرت خدیجہؓ چالیس سال کی اور باوجودیکہ عورت قریباً پچاس سال کے بعد شادی کی عمر سے نکل جاتی ہے یعنی صرف دس سال کے بعد آپ ۳۵ سال کے ہو گئے اور حضرت خدیجہؓ پچاس سال کی ہو گئیں جو ادھیڑ عمر ہوتی ہے لیکن پھر بھی آپ نے ایسی غیر معمولی وفا کا ثبوت دیا اور اس تعلق کو ایسی خوبی سے نبھایا کہ دنیا کے پردے پر بہت کم لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جو ایسی وفا کرتے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ نے ہجرت سے اڑھائی تین سال قبل وفات پائی ہے۔ گویا حضرت خدیجہؓ کی عمر وفات کے وقت ۶۵ سال کی تھی اور اس عمر میں عورت بالکل بُڑھیا ہو جاتی ہے اور اُس میں کوئی جسمانی دلکشی باقی نہیں رہتی کہ اُس کا خاوند اُسے یاد کرے۔ پھر اس کے بعد آپ کی کئی شادیاں بھی ہوئیں اور جوان لڑکیوں سے ہوئیں۔ اُن میں سے بعض ایسی بھی تھیں جو اپنے گرد و پیش میں حُسن کا شہرہ رکھتی تھیں مگر آپ کی یہ حالت تھی کہ آپ ہمیشہ انتہائی محبت اور پیار کے ساتھ حضرت خدیجہؓ کا نام لیتے اور فرماتے۔ خدیجہؓ کی یہ بات ہے خدیجہؓ کی وہ بات ہے۔ حضرت عائشہؓ جوان بھی تھیں، خوبرو بھی تھیں، فرمانبردار اور وفا شعار بھی تھیں اور پھر وہ حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی تھیں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی حضرت عائشہؓ سے محبت تھی لیکن حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں آپ کی اِن باتوں سے عموماً چڑ جاتی تھی اور کہا کرتی تھی یا رسول اللہ آپ کو خدیجہؓ سے کئی اچھی بیویاں ملیں پھر آپ اُس کو کیوں یاد کرتے ہیں۔ مگر آپ ہمیشہ فرماتے عائشہ تمہیں معلوم نہیں خدیجہؓ نے کس وفاداری کے ساتھ میرے ساتھ معاملہ کیا۔ تمہیں یہ باتیں بیشک بُری لگتی ہیں لیکن میں مجبور ہوں کہ اُس کا ذکر کروں یہ اُس وقت کا حال ہے جب آپ نے نوجوان عورتوں سے شادیاں کی ہوئی تھیں۔

ایک دفعہ آپ بیٹھے ہوئے تھے حضرت عائشہؓ آپ کے پاس تھیں جو حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی تھیں۔ خوبصورت اور نوجوان تھیں اور آپ کی مخلص خادمہ تھیں کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی۔ کیا میں اندر آجاؤں۔ یہ آنے والی حضرت خدیجہؓ کی چھوٹی بہن تھیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا رنگ یکدم متغیر ہو گیا۔ آپ بیقرار ہو کر اُٹھے اور آپ نے فرمایا الٰہی میری خدیجہ! بہن کی آواز حضرت خدیجہؓ کی آواز سے ملتی تھی۔ آپ کو اُس کی آواز سُن کر حضرت خدیجہ یاد آگئیں اور آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں۔ حالانکہ حضرت خدیجہؓ کی وفات پر اُس وقت

بارہ سال گذر چکے تھے۔ یہ وہ وفاداری ہے جس کا نمونہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا۔ اُس وقت حُسن کی یاد کا کوئی سوال ہی نہیں تھا کیونکہ وہ ۶۵ سال کی عمر میں فوت ہوئی تھیں اگر کوئی نوجوان بیوی مرجائے تو خاوند اُس کو یاد کرتا ہے لیکن یہاں تو صورت ہی اَور تھی۔ بیوی فوت ہوئی اور ایسی عمر میں فوت ہوئی کہ اُس میں کوئی جسمانی دلکشی باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن آپ کی محبت کا یہ حال ہے کہ بارہ سال بعد بھی آپ کے کان میں ایک آواز پڑتی ہے جو حضرت خدیجہؓ کی آواز سے ملتی جلتی ہے تو آپ کہہ اُٹھتے ہیں۔ الٰہی میری خدیجہ! اور آپ کا چہرہ متغیر ہو جاتا ہے۔ پھر یکدم کوئی خیال آیا اور فرمایا۔ تم فلاں تو نہیں ہو؟ جواب ملا۔ یا رسول اللہ میں ہوں خدیجہؓ کی بہن۔ یہ آپ کی وفاداری کا ثبوت ہے جو آپ کو حضرت خدیجہؓ سے تھی اور یہ ایک ایسی بے نظیر چیز ہے کہ جس کی عوام میں تو کیا انبیاء میں بھی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ اس کی مثال عیسائی دنیا کیا پیش کر سکتی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے تو ۳۳ سال کی عمر تک جو انجیل سے ثابت ہے شادی ہی نہیں کی۔ ہاں آپ کے گرد جو ہر وقت عورتیں رہتی تھیں شبہ پڑتا ہے کہ وہ آپ کی بیویاں تھیں مگر یہ تو ایک مشتبہ بات ہے۔ پھر اُن سے بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی وفاداری کا کوئی سلوک ثابت نہیں وفاداری کا شاندار مظاہرہ صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا اور ایسا کیا کہ دنیا اُس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

(۴) پھر جب حضرت خدیجہؓ نے آپ سے شادی کی تو آپ سمجھ گئیں کہ میں مالدار ہوں اور یہ غریب ہیں۔ آپ کو جب ضرورت ہوگی مجھ سے مانگنا پڑے گا اور یہ بات شاید آپ برداشت نہ کر سکیں پھر زندگی کیسے گذرے گی تب بڑی ہوشیار اور سمجھدار خاتون تھیں۔ آپ نے خیال کیا کہ اگر ساری دولت آپ کی نذر کر دوں تو پھر آپ کو کوئی ایسا احساس نہیں ہوگا کہ یہ چیز بیوی نے مجھے دی ہے بلکہ آپ جس طرح چاہیں گے خرچ کر سکیں گے۔ چنانچہ شادی کو ابھی چند دن ہی گذرے تھے کہ حضرت خدیجہؓ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا میں ایک تجویز پیش کرنا چاہتی ہوں اگر آپ اجازت دیں تو پیش کروں۔ آپ نے فرمایا وہ کیا تجویز ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنی ساری دولت اور اپنے سارے غلام آپ کی خدمت میں پیش کر دوں اور یہ سب آپ کا مال ہو جائے۔ آپ قبول فرمالیں تو میری بڑی خوش قسمتی ہوگی۔ آپ نے جب یہ تجویز سُنی تو آپ نے فرمایا خدیجہؓ کیا تم نے سوچ سمجھ لیا ہے؟ اگر تم سارا مال مجھے دے دوگی تو مال میرا ہو جائے گا تمہارا نہیں رہے گا۔ حضرت خدیجہؓ نے عرض کیا میں نے سوچ کر ہی یہ بات کی ہے اور میں نے سمجھ لیا ہے کہ آرام سے زندگی گذارنے کا بہترین ذریعہ یہی ہے آپ نے فرمایا پھر سوچ لو۔ حضرت خدیجہؓ نے عرض کیا ہاں ہاں میں نے خوب سوچ لیا ہے آپ نے فرمایا اگر تم نے سوچ لیا ہے اور سارا مال اور سارے غلام مجھے دے دئے ہیں تو میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میرے جیسا کوئی دوسرا انسان میرا غلام کہلائے۔ میں سب سے پہلے غلاموں کو آزاد کروں گا حضرت خدیجہ نے عرض کیا اب یہ آپ کا مال ہے جس طرح آپ چاہیں کریں۔ آپ یہ سُن کر بے انتہاء خوش ہوئے۔ آپ باہر نکلے خانہ کعبہ میں آئے اور آپ نے اعلان فرمایا کہ خدیجہؓ نے اپنا سارا مال اور اپنے سارے غلام مجھے دے دئے ہیں میں اُن سب غلاموں کو آزاد کرتا ہوں آج کل اگر کسی کو مال مل جائے تو وہ کہے گا چلو موٹر خرید لیں، کوٹھی بنائیں، یورپ کی سیر کریں۔ لیکن آپ کے اندر جو خواہش پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ جو میری طرح خدا تعالےٰ کے بندے ہیں اور عقل اور دماغ رکھتے ہیں وہ غلام ہو کر کیوں رہیں۔ عرب کے لحاظ سے ہی نہیں ساری دنیا کے لحاظ سے یہ ایک عجیب بات تھی مگر اس عجیب بات کا آپ نے اعلان فرمایا اور اس طرح آپ نے مال ملنے پر غیر معمولی سخاوت کا ثبوت دیا۔

(۵) رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب یہ اعلان فرمایا کہ

میں تمام غلاموں کو آزاد کرتا ہوں تو اس پر آور تو سب غلام چلے گئے۔ صرف زید بن حارثہؓ جو بعد میں آپ کے بیٹے مشہور ہو گئے تھے وہ آپ کے پاس آئے اور انہوں نے کہا۔ آپ نے تو مجھے آزاد کر دیا ہے مگر میں آزاد نہیں ہونا چاہتا میں آپکے پاس ہی رہوں گا۔ آپؐ نے اصرار کیا کہ وطن جاؤ اور اپنے رشتہ داروں سے ملو اب تم آزاد ہو۔ مگر حضرت زیدؓ نے عرض کیا جو محبت اور خلاص میں نے آپ میں دیکھا ہے اُس کی وجہ سے آپ مجھے سب سے زیادہ پیارے ہیں۔ زید ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن چھوٹی عمر میں اُن کو ڈاکو اٹھا لائے اور انہوں نے آپ کو آگے بیچ دیا۔ اس طرح پھرتے پھراتے وہ حضرت خدیجہؓ کے پاس آ گئے۔ آپ کے باپ اور چچا کو بہت فکر ہوا اور وہ آپ کی تلاش میں نکلے۔ انہیں پتہ لگا کہ زید وہاں ہیں سو وہاں گئے تو پتہ لگا کہ اب عرب میں ہیں۔ عرب آئے تو پتہ لگا کہ مکہ میں ہیں۔ مکہ میں آئے تو پتہ لگا کہ آپ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ہیں۔ وہ آپؐ کے پاس آئے اور کہا ہم آپ کے پاس آپ کی شرافت اور سخاوت سن کر آئے ہیں۔ آپ کے پاس ہمارا بیٹا غلام ہے اس کی قیمت جو کچھ آپ مانگیں ہم دینے کے لئے تیار ہیں آپ اُسے آزاد کر دیں اُس کی ماں بڑھیا ہے اور وہ جدائی کے صدمہ کی وجہ سے رو رو کر اندھی ہو گئی ہے آپ کا بڑا احسان ہو گا اگر آپ منہ مانگی قیمت لے کر اُسے آزاد کر دیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آپ کا بیٹا میرا غلام نہیں میں اُسے آزاد کر چکا ہوں پھر آپ نے زید کو بلایا اور فرمایا تمہارے ابا اور چچا تمہیں لینے کیلئے آئے ہیں۔ تمہاری ماں بڑھیا ہے اور رو رو کر اندھی ہو گئی ہے۔ میں تمہیں آزاد کر چکا ہوں تم میرے غلام نہیں ہو تم ان کے ساتھ جا سکتے ہو۔ حضرت زیدؓ نے جواب دیا۔ آپ نے تو مجھے آزاد کر دیا ہے مگر میں تو آزاد ہونا نہیں چاہتا میں تو اپنے آپ کو آپ کا غلام ہی سمجھتا ہوں۔ آپ نے پھر فرمایا تمہاری والدہ کو بہت تکلیف ہے اور دیکھو تمہارے ابا اور چچا کتنی دور سے اور کتنی تکلیف اُٹھا کر تمہیں لینے آئے ہیں تم ان کے ساتھ چلے جاؤ۔ زیدؓ کے والد اور چچا نے بھی بہت سمجھایا مگر حضرت زیدؓ نے اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور فرمایا آپ بے شک میرے باپ اور چچا ہیں اور آپ کو مجھ سے محبت ہے مگر جو رشتہ میرا ان سے قائم ہو چکا ہے وہ اب ٹوٹ نہیں سکتا۔ مجھے یہ سُن کر کہ میری والدہ سخت تکلیف میں ہیں بہت دُکھ ہوا مگر ان سے جدا ہو کر میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ جب زیدؓ نے یہ باتیں کیں تو آپ خانہ کعبہ میں تشریف لے گئے اور اعلان کیا کہ زید نے جس محبت کا ثبوت دیا ہے اس کی وجہ سے آج سے وہ میرا بیٹا ہے۔ اس پر زیدؓ کا باپ اور چچا دونوں خوش خوش واپس چلے گئے کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا کہ وہ نہایت آرام اور سکھ کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ غرض محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کمال اخلاق کا یہ ثبوت ہے کہ جب زیدؓ نے وفاداری کا مظاہرہ کیا تو آپ نے غیر معمولی احسان مندی کا ثبوت دیا۔

(۶) پھر جب آپ پر وحی نازل ہوئی تو آپ نے غیر معمولی انکسار کا ثبوت دیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کو اگر کوئی الہام ہوتا ہے یا کوئی خواب آ جاتی ہے تو وہ بے تحاشا دوسرے کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور اُسے بتاتے ہیں کہ ہمیں یہ الہام ہوا ہے یہ خواب آئی ہے مگر آپ کے پاس جبریل آتا ہے اور وہ کہتا ہے اِقْرَاْ پڑھ۔ تو آپ فرماتے ہیں مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ۔ میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ تین دفعہ آپ نے یہی کہا۔ مگر جب آپ نے دیکھا کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے اس بات پر اصرار ہو رہا ہے تو پھر آپ نے حکم کی تعمیل کی اور ایسی جرأت سے کی کہ آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح یہ نہیں کہا کہ میرے رب مجھے کوئی اور ساتھی دے بلکہ آپ نے اکیلے ہی اس بوجھ کو اٹھا لیا اور مدد کے لئے کوئی ساتھی نہیں مانگا۔

(۷) پھر جب آپ نے اپنا دعویٰ لوگوں کے سامنے پیش کیا تو آپ کی غیر معمولی مخالفت ہوئی اور اس کے مقابلہ میں

آپ نے غیر معمولی صبر کا نمونہ دکھایا۔ آپ پر طرح طرح کے ظلم ہوئے قسم قسم کی تکلیفیں آپ کو دی گئیں مگر آپ نے اس خاموشی کے ساتھ انہیں برداشت کیا کہ حیرت آتی ہے۔ ایک دفعہ آپ خانہ کعبہ کے باہر ایک پتھر پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ابوجہل آیا اور اُس نے آپ کو بے تحاشا گالیاں دینی شروع کر دیں۔ آپ نے اپنے گال پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ وہ گالیاں دیتا رہا اور آپ خاموشی سے سُنتے رہے۔ جب اُس کی گالیوں کا آپ نے کوئی جواب نہ دیا تو ابوجہل کا غصہ اَور بھی تیز ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک سوٹی تھی اُس نے وہ سوٹی آپ کو ماری اور ساتھ ہی اور زیادہ گالیاں دینی شروع کر دیں۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی ہاتھ نہیں اُٹھایا صرف اتنا کہا کہ میں نے آپ کا کیا قصور کیا ہے صرف خدا تعالےٰ کا پیغام ہی آپ لوگوں تک پہنچاتا ہوں۔ لیکن اُس کا جوش ٹھنڈا نہ ہوا وہ آپ کو برابر گالیاں دیتا چلا گیا اور آخر تھک کر واپس چلا گیا۔ حضرت حمزہؓ کی ایک لونڈی تھی وہ یہ شور سُن کر باہر نکل آئی اور اُس نے گھر کے دروازے سے یہ سارا نظارہ دیکھ لیا۔ اُس کو یہ ظلم دیکھکر سخت دُکھ ہوا اور غصہ میں وہ اُبلتی رہی۔ حضرت حمزہؓ شکار کرنے گئے ہوئے تھے۔ آپ کی زندگی سپاہیانہ تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں تو انہوں نے سُنی ہوئی تھیں مگر اُن پر کبھی غور نہیں کیا تھا بس رات دن شکار میں لگے رہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ مزے کی زندگی ہے۔ شام کو اکڑتے ہوئے آپ شکار سے واپس آئے۔ کمان کندھے پر تھی ہاتھ میں شکار تھا اور آپ گھر میں اس طرح داخل ہو رہے تھے جیسے کوئی جرنیل میدان مار کر گھر آتا ہے۔ وہ لونڈی اسی انتظار میں تھی کہ حمزہؓ شکار سے واپس آئیں تو میں اُن سے بات کروں۔ پُرانی لونڈیاں گھروں میں زیادہ دیر رہنے کی وجہ سے رشتہ داروں کی طرح ہو جاتی تھیں اور بے تکلفی سے بات کر لیتی تھیں۔ اُس لونڈی نے آپ کو دیکھ کر کہا۔ بڑے بہادر بنے پھرتے ہیں جانور مارنا بھی کوئی کام ہے ایسا تو ہر کوئی کر سکتا ہے۔ آج تمہارے بھتیجے کو ابوجہل نے گالیاں دیں اور مارا اور وہ خاموشی کے ساتھ بیٹھا رہا۔ اُس نے اُف تک نہیں کی۔ مگر تم اس طرف توجہ ہی نہیں کرتے اور ہر وقت شکار کے خیال میں لگے رہتے ہو۔ حضرت حمزہؓ نے پوچھا کیا ہوا۔ لونڈی نے سارا واقعہ سُنا دیا۔ آخر وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار تھے اور آپ کی باتیں انہوں نے سُنی ہوئی تھیں مگر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ اب جو یہ واقعہ ہوا تو غیرت جوش میں آگئی اور وہ اُسی وقت واپس گئے اور خانہ کعبہ میں پہنچے جہاں ابوجہل اور مکہ کے دوسرے رؤوساء بیٹھے ہوئے تھے اور اسلام کے خلاف باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے جب حضرت حمزہؓ کو دیکھا تو آپ کے بیٹھنے کے لئے جگہ بنا دی کیونکہ وہ بھی ایک رئیس تھے۔ مگر حضرت حمزہؓ نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اور آگے بڑھ کر ابوجہل کے مُنہ پر کمان مار کر کہا تُو نے آج میرے بھتیجے کو مارا ہے۔ اُس نے تجھے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اب میں نے ساری قوم کے سامنے تیرے مُنہ پر کمان ماری ہے اگر ہمت ہے تو مجھے مار۔ مذہبی تعصب کی وجہ سے دوسرے رؤوساء کو غصہ آگیا اور اُنہوں نے حضرت حمزہؓ کو مارنا چاہا مگر ابوجہل نے روک دیا اور کہا واقعہ میں آج مجھ سے کچھ زیادتی ہو گئی تھی اور میں اسے محسوس کرتا ہوں۔ اس کے بعد اسی جوش کی حالت میں حضرت حمزہؓ خانہ کعبہ سے لوٹے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لے گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ میں آپ پر ایمان لاتا ہوں۔ یہ ایمان جو حضرت حمزہ کو نصیب ہوا کس بات کا نتیجہ تھا۔ اُسی غیر معمولی صبر کا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھایا۔

(۸) جب لوگوں نے آپ کی باتیں سننے سے انکار کر دیا تو آپ مایوس نہیں ہوئے۔ ایسی حالت میں عام طور پر کمزور لوگ گھبرا کر یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ لوگ تو ہماری باتیں سنتے ہی نہیں ہم تبلیغ کیسے کریں۔ مگر آپ گھبرائے نہیں بلکہ استقلال کے ساتھ آپ نے اپنے کام کو جاری رکھا۔ آپ اپنی زندگی اس غرض کے لئے وقف سمجھتے تھے اور دن رات اسی

کام میں لگے رہتے تھے۔ عکاظ کے میلہ پر آپ جاتے اور خدائے واحد کی تبلیغ کرتے۔ اسی طرح جہاں کہیں آپ کو کچھ آدمی اکٹھے نظر آتے آپ اُن کے پاس پہنچ جاتے اور فرماتے اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو خدا تعالےٰ کی باتیں سناؤں۔ مکہ والوں نے لوگوں میں یہ مشہور کر رکھا تھا کہ آپ پاگل ہیں۔ جب آپ کہتے کہ اگر آپ چاہیں تو میں خدا تعالےٰ کی باتیں آپکو سناؤں تو وہ ایک دوسرے کو آنکھ مار کر کہتے کہ یہ وہی مکہ والا پاگل ہے اور کھسک جاتے۔ پھر آپ دوسرے گروہ کے پاس جاتے اور فرماتے۔ اگر آپ چاہیں تو میں خدا تعالےٰ کی باتیں آپکو سُناؤں۔ وہ بھی یہ بات سُنتے اور آنکھ مار کر ایک دوسرے سے کہتے۔ یہ وہی مکہ کا پاگل ہے اور کھسک جاتے۔ اِس طرح آپ سارا دن وہاں چکر لگاتے رہتے۔ کبھی ایک گروہ کے پاس جاتے اور کبھی دوسرے کے پاس۔ مگر لوگ آپکی باتیں سُننے سے انکار کر دیتے۔ لیکن پھر انہی میں سے ایسے لوگ پیدا ہوگئے جو آپ پر ایمان لائے اور جنہوں نے اسلام کی نہایت شاندار خدمات سرانجام دیں۔ یہ وہ غیر معمولی استقلال تھا جس نے آپ کو کامیاب کیا اور یہی وہ استقلال ہے جس کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب سے بڑا معجزہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک دیوانگی اور جنون پیدا نہ ہو اُس وقت تک تبلیغ کامیاب نہیں ہوا کرتی۔

(۹) جب لوگوں نے آپ کو ایذائیں دیں اور آپ پر مظالم توڑے تو آپ نے غیر معمولی ضبطِ نفس اور خیر خواہی کا ثبوت دیا۔ آپ جب طائف تشریف لے گئے اور لوگوں کو تبلیغ کی تو انہوں نے آپ کے پیچھے کتے لگا دیئے اور آپ پر پتھراؤ کیا۔ آپ واپس تشریف لے آئے۔ مگر ایسی حالت میں کہ لوگ آپ کو پتھر مارتے جاتے تھے اور آپ کے پیچھے کتے لگے ہوئے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی غیرت نے جوش مارا اور اُس نے فرشتوں کو حکم دیا کہ جاؤ اور میرے رسول کی مدد کرو۔ چنانچہ آپ کو ایک فرشتہ دکھائی دیا اور اُس نے کہا میں اِس پہاڑی پر مقرر ہوں جو آپ کے سامنے ہے اور خدا تعالےٰ نے مجھے آپ کی مدد کے لئے بھیجا ہے۔ اگر حکم ہو تو اس پہاڑی کو اُٹھا کر طائف والوں پر پھینک دوں اور انہیں تباہ کر دوں۔ آپ نے فرمایا۔ نہیں نہیں۔ اگر یہ لوگ تباہ ہوگئے تو پھر ایمان کون لائے گا۔ سر سے پاؤں تک آپ زخمی ہیں، ٹخنوں سے خون بہہ رہا ہے۔ مگر ہمدردی کا یہ عالم ہے کہ اس حالت میں بھی طائف والوں کی خیر خواہی مدنظر ہے اور یہ نہیں چاہتے کہ وہ اللہ تعالےٰ کے عذاب سے ہلاک ہوں۔

مکہ والوں نے کچھ جائداد طائف کے پاس بھی خریدی ہوئی تھی۔ چونکہ طائف کی زمین میں زراعت ہو سکتی تھی اس لئے مکہ کے رؤسا نے وہاں زمینیں خریدی ہوئی تھیں اور باغ وغیرہ لگائے ہوئے تھے۔ طائف سے سات آٹھ میل باہر مکہ کے ایک رئیس کا باغ تھا جو آپ کا شدید ترین دشمن تھا وہاں آکر آپ بیٹھ گئے۔ زیدؓ بھی آپ کے ساتھ تھے۔ وہ رئیس اِس نظارہ کو دیکھ کر برداشت نہ کر سکا۔ اُس نے اپنے ایک غلام کو بلایا اور کہا وہ جو دو آدمی بیٹھے ہیں باغ سے اچھے اچھے انگور توڑ کر انہیں کھلاؤ۔ وہ غلام نینوا کا باشندہ تھا جب آپ کے پاس پہنچا تو آپ نے اُس سے پوچھا تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اُس غلام نے جواب دیا میں نینوا کا باشندہ ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا تم میرے بھائی یونس علیہ السلام کے ملک کے ہو آؤ میں تمہیں خدا تعالیٰ کی باتیں سُناؤں۔ آپ کو اپنے زخم بھول گئے، بھاگنا بھول گیا، تھکاوٹ بھول گئی اور تبلیغ شروع کر دی۔ وہ غلام عیسائی تھا اور اُس نے آنے والے موعود کے متعلق باتیں سُنی ہوئی تھیں۔ اُس پر آپکی تبلیغ کا اتنا اثر ہوا کہ وہ آپ کے قدموں میں جا پڑا اور اپنے بالوں سے آپ کے پاؤں کا خون پونچھنے لگا اور انہیں چومنے لگ گیا۔ آپ کا دشمن رئیس بھی اُس کے پیچھے آیا۔ اس سے ہمدردی کا اثر زائل ہو چکا تھا۔ اُس نے غلام سے کہا یہ تو مکہ کا پاگل ہے اور میرا رشتہ دار ہے اِس کی باتوں میں نہ آجانا۔ اُس غلام نے کہا نہیں یہ پاگل نہیں۔ اس کی باتیں تو نبیوں والی باتیں ہیں۔

دیکھو آپ میں کتنی خیر خواہی کا جذبہ تھا اور پھر کتنا غیر معمولی ضبط آپ میں پایا جاتا تھا۔ ایک طرف آپ پر طائف والے ظلم کر رہے تھے، انہوں نے کتے چھوڑے ہوئے تھے، پتھر اؤ کر رہے تھے اور دوسری طرف آپ اُن کیلئے دعائیں کر رہے تھے کہ اے میرے رب تو ان پر رحم کر۔ یہ جانتے نہیں کہ میں تیرا نبی ہوں اگر جانتے تو یہ کام نہ کرتے۔

(۱۰) پھر جب صحابہؓ پر ظلم ہوئے تو آپ نے کتنی خیر خواہی کا ثبوت دیا۔ دوسرے لوگوں پر ظلم ہوتے ہیں تو وہ اپنے ساتھیوں کو پاس بلا لیتے ہیں تاکہ جتھہ بن جائے اور لوگ زیادہ تکلیف نہ دے سکیں۔ مگر آپ نے صحابہؓ کو بُلا کر کہا تم ہجرت کر کے حبشہ کی طرف چلے جاؤ مجھ پر جو گذرے گی گذر جائے گی۔ چنانچہ اکثر صحابہؓ ہجرت کر گئے اور آپ صرف چند صحابہ کے ساتھ مکہ میں رہنے لگے۔

(۱۱) پھر جب ہجرت کا وقت آیا تو مکّہ جیسا عزیز وطن جس کی وجہ سے آپ کے آباء و اجداد کی عزت چلی آئی تھی جس میں خانہ کعبہ تھا۔ جس میں آپ کبھی کبھار عبادت کر لیا کرتے تھے اس کی آپ نے قربانی کی اور ایسی دلیری سے کی کہ اس حب الوطنی کی قربانی کی مثال بھی کسی اور جگہ نہیں مل سکتی۔ آپ کو اپنے وطن سے کتنی محبت تھی یہ اس بات سے ظاہر ہے کہ جب آپ غارِ ثور سے نکلے اور مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا۔ خدا لعنت کرے اُس شہر والوں پر جنہوں نے اپنے نبی کی مخالفت کی اور اس کو شہر سے نکال دیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ ابو بکرؓ ایسا مت کہو۔ پھر آپ نے مکّہ کی طرف دیکھا اور فرمایا اے مکّہ! تُو مجھے بہت ہی پیارا ہے۔ مگر تیرے بسنے والوں نے مجھے یہاں رہنے نہیں دیا۔ کیسی اعلیٰ درجہ کی حُبّ الوطنی کی مثال ہے جو آپؐ نے پیش کی ہے۔ مگر پھر اس محبت کو خدا تعالےٰ کے لئے کس دلیری اور جرأت کے ساتھ قربان کر دیا۔

(۱۲) پھر جب آپ مدینہ تشریف لے گئے تو آپ کی عقل کا کمال ظاہر ہُوا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے وہاں جاتے ہی مدینہ والوں کی تنظیم کی۔ انہیں اکٹھا کیا اور یہودیوں سے معاہدات کئے۔ تاکہ اُن کی شرارتوں کا سدِ باب ہو۔ اس طرح آپکی غیر معمولی ذہانت اور دانشمندی کا ثبوت ملا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ موقع کہاں ملا۔ آپ کی زندگی تو غلامی میں ہی گذر گئی لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے وہاں جاتے ہی مدینہ والوں کی تنظیم کی۔ یہودیوں سے معاہدات کئے۔ مہاجرین کے حقوق قائم کئے اور ایسا عقل کا ثبوت دیا جس کی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی۔ مکّہ میں آپ کو ایک محلہ کی بھی تنظیم کا موقعہ نہیں ملا تھا مگر یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا آپ پہلے ہی بادشاہ تھے اور تنظیم کا دیرینہ ملکہ رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ مدینہ والے جو ہر وقت دوسرے قبائل سے پٹتے رہتے تھے اور کمزور سمجھے جاتے تھے اِس تنظیم کی بدولت عرب کی ایک بڑی طاقت بن گئے۔

(۱۳) پھر لڑائیاں شروع ہوئیں تو اُن میں آپؐ نے غیر معمولی بہادری کا ثبوت دیا۔ اگر آپ حکومت ملنے سے پہلے فوت ہو جاتے تو لوگ سمجھتے کہ آپ کمزور تھے اس لئے آپ نے دُکھوں کو برداشت کر لیا۔ مگر حکومت ملنے کے بعد آپ نے دنیا پر ثابت کر دیا کہ میرا معاف کرنا کمزوری کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ وسعتِ حوصلہ کی وجہ سے تھا۔ آپ جب مدینہ تشریف لے گئے تو مکّہ والوں نے اپنی ذلت محسوس کر کے آپ کے چاروں طرف لشکر پھیلانے شروع کر دئے جس کی وجہ سے آپ کو بھی اُنکے مقابلہ کے لئے نکلنا پڑا۔ لیکن ان لڑائیوں میں بھی آپ نے بے مثال نمونہ قائم فرمایا۔ بڑے بڑے بادشاہ بھی شبخون مار دیتے ہیں۔ لیکن آپ نے کبھی شبخون نہیں مارا۔ آپ کی غیر معمولی فطانت کا ایک بڑا نمونہ اس میں ملتا ہے کہ آپ نے آٹھ سال تک لڑائیاں کیں اور درجنوں کیں مگر ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ملتا جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حملہ کیا ہو اور کفار کو پتہ لگ گیا ہو اور ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ملتا جب کفار نے حملہ کیا ہو اور آپ کو پہلے پتہ نہ لگ گیا ہو کتنی بڑی ذہانت ہے کتنی بڑی ہوشیاری ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ کفار نے خود حملہ کی تیاریاں کیں اور آپ کو پتہ لگ گیا۔ بنی مصطلق نے ایک لشکر تیار کیا

اور جنگی تیاریاں مکمل کریں تاکہ آپ پر اچانک حملہ کر دیا جائے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُس وقت دس بارہ منزل پر تھے مگر وہ تو ابھی تیاریوں میں مشغول تھے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بنی مصطلق پر اس حالت میں حملہ آور ہو گئے کہ انکی عورتیں ابھی آٹا گوندھ رہی تھیں اور اُن کو اس حملے کا خیال تک نہ تھا پھر آپ جب فتح مکہ کے لئے گئے تو آپ کا یہ جانا ایسا اچانک تھا کہ کفار نے دور سے لشکر دیکھ کر ابوسفیان سے پوچھا کہ یہ کہیں اسلامی لشکر تو نہیں؟ ابوسفیان نے کہا میں تو ابھی مدینہ سے آرہا ہوں اُن کی تو حملہ کی کوئی تیاری ہی نہیں تھی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ اسلامی لشکر ہو لیکن ابوسفیان ابھی باتیں ہی کر رہا تھا کہ اسلامی سپاہیوں نے اُسے گرفتار کر لیا۔ مکہ والے اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ ابوسفیان مدینہ گیا ہوا ہے ابھی لڑائی کہاں ہو سکتی ہے۔ مگر دوسرے ہی دن ایک لشکر جرار کے ساتھ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہو گئے۔ غرض آٹھ سال کی درجنوں لڑائیوں میں کوئی بھی ایسی مثال نہیں ملتی۔ کہ آپ نے حملہ کیا ہو اور دشمن کو پہلے پتہ لگ گیا ہو۔ یا دشمن نے حملہ کیا ہو اور آپ کو پہلے پتہ نہ لگ گیا ہو۔ اس کی مثال نہ دنیاوی تاریخوں میں ملتی ہے اور نہ مذہبی تاریخوں میں ملتی ہے۔

(۱۴) پھر آپ جب مدینہ تشریف لے گئے تو آپکے غیر معمولی استغناء اور تقوٰی کا بھی ثبوت ملا۔ آپ نے ایک ٹکڑہ زمین پسند کیا جو یتیموں کا تھا۔ آپ نے اُس کے مالک کو بلایا۔ وہ آیا تو اُس نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ زمین میرے یتیم بھتیجوں کی ہے اور میں اس کا نگران ہوں۔ میرے یتیم بھتیجے خوشی سے یہ زمین آپ کو دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہم یتیموں کا مال نہیں لے سکتے۔ ہاں قیمت مقرر کرو تب لیں گے۔

(۱۵) دوسروں کے جذبات کا آپ اِس طرح خیال رکھتے تھے کہ جب آپ مدینہ تشریف لے گئے اور حضرت ابو ایوب انصاری کے مکان پر ٹھہرے تو حضرت ابو ایوب انصاری نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ اُوپر کی منزل میں رہیں ہم نیچے کی منزل میں رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا نہیں میں نیچے کی منزل میں ہی رہوں گا۔ مجھے آدمی ملنے کے لئے آئیں گے تو آپ کو تکلیف ہوگی۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ میں یہ کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ آپ نیچے رہیں اور مَیں اُوپر رہوں۔ آپنے فرمایا نہیں نہیں مَیں نچلی منزل میں ہی رہوں گا۔ ایک رات چھت پر غلطی سے کچھ پانی گر گیا اور یہ خطرہ محسوس ہُوا کہ کہیں پانی ٹپک کر نیچے نہ چلا جائے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو تکلیف نہ ہو حضرت ابو ایوب انصاری اور اُن کی بیوی نے فوراً اپنے لحاف اتار کر پانی میں ڈال دئے اور اس کو خشک کیا اور خود ساری رات ننگے بیٹھے رہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جب اس بات کا علم ہُوا۔ تو آپ کو بہت تکلیف ہوئی اور آپ نے فرمایا اچھا مَیں اُوپر چلا جاتا ہوں تم نیچے آجاؤ۔ گویا دونوں حالتوں میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نہایت اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ پہلے آپ نے اس لئے اُوپر کی منزل میں رہائش اختیار نہ کی کہ اس طرح حضرت ابو ایوب انصاری کو تکلیف ہوگی اور جب آپ کو اُن کی ایک دوسری تکلیف کا علم ہُوا تو پھر آپ نے اُوپر کی منزل میں رہنا منظور کر لیا تاکہ انکو تکلیف نہ ہو۔

(۱۶) اس کے بعد ہم آپ کے جذبۂ توحید کو دیکھتے ہیں تو اس میں بھی ہمیں آپ کا بے مثال نمونہ نظر آتا ہے۔ یُوں تو ہر نبی دنیا میں اسی غرض کے لئے آتا ہے کہ خدائے واحد پر ایمان قائم ہو اور دنیا کے تمام مذاہب اِس کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں صرف عیسائیت ایک ایسا مذہب ہے جس کے پیرو آج کل یہ دعوٰی کرتے ہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام تثلیث کا عقیدہ قائم کرنے کے لئے آئے تھے۔ مگر حضرت عیسٰی علیہ السلام کی اپنی باتوں سے جو اناجیل میں درج ہیں تثلیث کا پتہ نہیں لگتا۔ بلکہ اُن کا مطالعہ انسان پر اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ وہ توحید کے قیام کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ یہ مت سمجھو کہ مَیں تورات یا دوسرے نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے

آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ اور جب وہ تورات کی تعلیم کے تابع تھے اور تورات کا ایک شوشہ بھی بدل نہیں سکتے تھے۔ تو تورات میں توحید کا ہی ذکر ہے تثلیث کا ذکر نہیں۔ بہرحال ہر نبی دنیا میں توحید کے قیام کیلئے مبعوث ہوتا ہے۔ لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جس رنگ میں توحید کو قائم کیا ہے اور جو جذبۂ غیرت اللہ تعالےٰ کی توحید کے متعلق آپ کے اندر پایا جاتا تھا اُس کی مثال کسی اور نبی میں ہمیں نظر نہیں آتی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو توحید کو اس رنگ میں پیش کیا کہ اس سے شرک کا شبہ پیدا ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائی رفتہ رفتہ مشرک ہوگئے اور وہ توحید کو کلی طور پر چھوڑ بیٹھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں میں بھی کچھ شرک پیدا ہوگیا ہے۔ لیکن مسلمانوں میں جو شرک پایا جاتا ہے وُہ جُہّال کا شرک ہے۔ خواہ یہ جاہل طبقہ عوام الناس میں سے ہو یا علماء کہلانے والوں میں سے ہو۔ مگر عیسائیت میں جو شرک پایا جاتا ہے وہ اُن کے چوٹی کے علماء میں بھی پایا جاتا ہے۔ پھر مسلمانوں کے شرک اور اس شرک میں ایک اور فرق یہ ہے کہ مسلمانوں میں شرک پیدا ہو جانے کے باوجود اسکے مخالف علماء پائے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً سید عبدالقادر صاحب جیلانیؒ ہیں۔ اُن کی کتابوں میں توحید ہی توحید بھری ہوئی ہے۔ اب اگر اُن کے معتقد شرک کرنے لگ جائیں تو کوئی دھوکا نہیں لگ سکتا۔ اگر کوئی کہے گا کہ میں جیلانی صاحبؒ کا معتقد ہوں تو ہم آپ کی کتابیں نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیں گے کہ دیکھو آپ تو بڑے موحّد تھے تمہیں بھی اُن کی پیروی کرنی چاہیئے گویا مسلمانوں کی غلطیوں کو ظاہر کرنے کے مواقع موجود ہیں مگر عیسائیت کو لو۔ تو اُن کے بڑے سے بڑے عالم حتیٰ کہ پوپ میں بھی شرک موجود ہے اور اس پوپ سے دس درجے پہلے جو پوپ تھا اُس میں بھی شرک پایا جاتا تھا۔ یہ جُہّال کا شرک نہیں بلکہ چوٹی کے علماء میں بھی یہ شرک پایا جاتا ہے۔ اس وجہ سے مسلمانوں پر اُن کی غلطی کو واضح کرنا آسان بات ہے مگر عیسائیوں پر اُن کی غلطی کو ظاہر کرنا آسان بات نہیں۔ بہرحال رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اُس غیرت کا جو آپ کو توحید کے متعلق تھی اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے نازک سے نازک مواقع پر بھی توحید کا سبق دیا۔ جنگِ اُحد کے موقعہ پر مسلمانوں کو خدا تعالیٰ نے فتح دی اور کفار بھاگ گئے۔ خالدؓ بن ولید اور عمروؓ بن عاص جو اسلام کے عظیم الشان جرنیل گذرے ہیں ابھی اسلام نہیں لائے تھے اور اس جنگ میں کفار کی طرف سے شامل تھے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے ایک گروہ کو ایک درّہ میں کھڑا کیا اور انہیں تاکیدی حکم دیا کہ تم نے اس جگہ سے نہیں ہٹنا۔ خواہ ہمیں فتح ہو یا شکست۔ ہم مارے جائیں یا زندہ رہیں تم نے اس جگہ کو نہیں چھوڑنا۔ مسلمانوں میں جہاد کا بڑا جوش تھا اور اب بھی ہے۔ جب اسلام کو فتح حاصل ہوئی تو جو لوگ اس درّے پر کھڑے تھے انہوں نے اپنے افسر سے کہا کہ ہمیں بھی تھوڑا بہت جہاد میں حصہ لینے کی اجازت دیں۔ اسلام کو فتح حاصل ہوگئی ہے اور اب کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔ اُس نے کہا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ خواہ فتح ہو یا شکست۔ ہم مارے جائیں یا زندہ رہیں۔ اس جگہ سے نہ ہٹیں۔ اس لئے ہمیں یہیں رہنا چاہیئے۔ انہوں نے کہا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ خواہ فتح ہو جائے تب بھی یہاں سے نہیں ہٹنا۔ آپ نے تو ہمیں احتیاطاً یہاں کھڑا کر دیا تھا۔ دشمن اب بھاگ گیا ہے اور اسلام کو فتح حاصل ہوگئی ہے۔ اب اس میں کوئی حرج نہیں کہ ہم اس جگہ کو چھوڑ دیں اور جہاد میں تھوڑا بہت حصہ لے لیں۔ افسر نے کہا جب حاکم حکم دے دیتا ہے تو ماتحت کا یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ اپنی عقل کو دوڑائے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فرمایا تھا کہ یہاں سے نہیں ہلنا۔ خواہ فتح ہو یا شکست۔ ہم مارے جائیں یا زندہ رہیں اور تاکید فرمائی تھی کہ اس جگہ کو نہ چھوڑا جائے اس لئے آپ کی ہدایت کے مطابق ہمیں یہیں ٹھہرنا چاہیئے۔ مگر انہوں نے یہ بات نہ مانی اور اپنی غلطی پر انہوں نے اِس قدر

اصرار کیا کہ اپنے افسر سے کہا۔ آپ ٹھہرے رہیں ہم تو جاتے ہیں۔ چنانچہ اکثر اُن میں سے چلے گئے۔ صرف افسر اور اس کے چند ساتھی باقی رہ گئے۔ جب کفار کا لشکر بھاگا۔ خالدؓ بن ولید بڑے ذہین اور ہوشیار تھے۔ اسلام میں بھی آپ نے شاندار کام کئے ہیں اور کفار میں بھی آپ بڑے پایہ کے جرنیل تھے آپ جب اپنے لشکر کے ساتھ بھاگے جا رہے تھے تو اچانک ان کی نگاہ اس درہ پر پڑی اور وہ خالی نظر آیا۔ آپ کے ساتھ عمروؓ بن العاص بھی تھے۔ آپ نے عمروؓ سے کہا ہمیں اعلیٰ درجہ کا موقعہ مل گیا ہے۔ عمروؓ نے بھی اس طرف دیکھا اور دونوں اپنا اپنا دستہ لے کر واپس لوٹے۔ خالدؓ بن ولید نے ایک طرف سے چکر لگا کر درہ پر حملہ کیا اور عمروؓ بن عاص نے دوسری طرف سے۔ اور درہ پر جو چند آدمی موجود تھے اُن کو مار کر انہوں نے مسلمانوں پر پشت کی طرف سے حملہ کر دیا۔ مسلمان اُس درہ کی طرف سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے اور تتر بتر ہو چکے تھے صفیں ٹوٹ چکی تھیں اور بچے کھچے دشمن کا پیچھا کر رہے تھے جب خالدؓ بن ولید اور عمروؓ بن عاص نے اُن کی پیٹھ پر حملہ کیا تو اکیلا اکیلا مسلمان پورے دستہ کے سامنے آگیا کچھ مسلمان مارے گئے اور کچھ زخمی ہو گئے اور باقیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے خصوصاً جب حملہ کرتے کرتے دشمن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچا تو آپ کے پاس اُس وقت صرف بارہ آدمی تھے۔ ان دونوں جرنیلوں یعنی خالدؓ بن ولید اور عمروؓ بن عاص نے اپنے دوسرے افسروں کو بھی اطلاع کر دی تھی کہ تم بھی حملہ کر دو چنانچہ تین ہزار کا لشکر ریلا کرتے ہوئے آگیا۔ اُس وقت دشمن کی طرف سے پتھراؤ ہو رہا تھا تیر برس رہے تھے۔ تلواریں چل رہی تھیں اور تمام اسلامی لشکر میں ایک بھاگڑ اور کھلبلی مچی ہوئی تھی ایسی حالت میں صحابہؓ نے بے نظیر قربانیاں کیں مگر تین ہزار کے تازہ دم لشکر کے سامنے وہ تاب نہ لا سکے۔ اس حملہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دو دانت بھی ٹوٹے اور آپ کی خود میں بھی ایک پتھر لگا جس کی وجہ سے خود کا ایک کیل آپ کے سر میں دھنس گیا جس سے آپ بے ہوش ہو کر ایک گڑھے میں گر گئے آپ کے پاس جو صحابہؓ کھڑے تھے اُن کی لاشیں آپ کے اوپر آپڑیں اور آپ کا جسمِ اطہر نیچے چھپ گیا۔ اور مسلمانوں میں شور مچ گیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں مسلمانوں کے قدم پہلے ہی اُکھڑے ہوئے تھے اس خبر نے ان کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دئے مگر اللہ تعالےٰ کی حکمت کہ جب کفار میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مارے جا چکے ہیں تو اس کے بعد انہوں نے مزید حملہ نہ کیا۔ بلکہ یہی مناسب سمجھا کہ اب جلدی مکہ کو لوٹ چلیں اور لوگوں کو یہ خوشخبری سنائیں کہ نعوذ باللہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مارے جا چکے ہیں۔

جب مسلمانوں کے کانوں میں یہ آواز پڑی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں تو وہ جلدی جلدی واپس لوٹے اور انہوں نے آپ کے اوپر سے لاشوں کو ہٹایا معلوم ہوا کہ آپ ابھی زندہ ہیں اور سانس لے رہے ہیں۔ اُس وقت سب سے پہلے آپ کے خود کا کیل نکالا گیا۔ یہ کیل نکلتا نہیں تھا آخر ایک صحابیؓ نے اپنے دانتوں سے نکالا جس کی وجہ سے اُن کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ پھر آپ کے مُنہ پر پانی چھڑکا گیا تو آپ ہوش میں آگئے۔ اکثر صحابہؓ تو تتر بتر ہو چکے تھے صرف چند صحابہؓ کا گروہ آپ کے پاس تھا۔ آپ نے اُن سے فرمایا ہمیں اب پہاڑ کے دامن میں چلے جانا چاہیئے۔ چنانچہ آپ اُن کو لے کر ایک پہاڑی کے دامن میں چلے گئے اور پھر باقی لشکر بھی آہستہ آہستہ اکٹھا ہونا شروع ہوا۔ کفار کا لشکر جب واپس جا رہا تھا۔ تو ابوسفیان نے بلند آواز سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا نام لیا اور کہا ہم نے اُسے مار دیا ہے۔ صحابہؓ نے جواب دینا چاہا مگر آپ نے اُن کو روک دیا اور فرمایا۔ یہ موقعہ نہیں ہمارے آدمی تتر بتر ہو چکے ہیں۔ کچھ مارے گئے ہیں اور کچھ زخمی ہیں۔ ہم تھوڑے سے آدمی یہاں ہیں اور پھر تھکے ماندے ہیں۔ کفار کا لشکر تین ہزار کا ہے اور وہ بالکل سلامت ہے

ایسی حالت میں جواب دینا مناسب نہیں۔ وہ اگر کہتے ہیں کہ انہوں نے مجھے مار دیا ہے تو کہنے دو۔ چنانچہ آپ کی ہدایت کے مطابق صحابہؓ خاموش رہے جب ابوسفیان کو کوئی جواب نہ ملا تو اُس نے کہا ہم نے ابوبکرؓ کو بھی مار دیا ہے۔ آپ نے صحابہؓ کو پھر جواب دینے سے روک دیا اور فرمایا خاموش رہو۔ وہ کہتا ہے تو کہنے دو۔ چنانچہ صحابہؓ اس پر بھی خاموش رہے۔ ابوسفیانؓ کو جب پھر کوئی جواب نہ ملا تو اُس نے کہا ہم نے عمرؓ کو بھی مار دیا ہے۔ حضرت عمرؓ بڑے تیز طبیعت کے تھے آپ بولنے لگے لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے آپ کو منع کر دیا۔ بعد میں آپ نے بتایا کہ میں کہنے لگا تھا کہ تم کہتے ہو ہم نے عمرؓ کو مار دیا ہے حالانکہ عمرؓ اب بھی تمہارا سر توڑنے کے لئے موجود ہے۔ بہرحال رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بھی جواب دینے سے منع کر دیا۔ جب ابوسفیان نے دیکھا کہ کوئی جواب نہیں آیا تو اس نے نعرہ مارا اُعْلُ هُبُل۔ اُعْلُ هُبُل یعنی ہُبل دیوتا جسے ابوسفیان بڑا سمجھتا تھا اُس کی شان بلند ہو۔ ہُبل کی شان بلند ہو (یعنی آخر ہمارے ہُبل نے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اور اس کے ساتھیوں کو مار ہی دیا) صحابہؓ کو چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بولنے اور جواب دینے سے منع فرمایا تھا اس لئے وہ اب بھی خاموش رہے۔ مگر خدا کا وہ رسول جس نے اپنی موت کی خبر سُن کر کہا تھا کہ خاموش رہو جواب مت دو۔ حضرت ابوبکرؓ کی موت کی خبر سُن کر کہا تھا۔ خاموش رہو جواب مت دو۔ حضرت عمرؓ کی موت کی خبر سُن کر کہا تھا خاموش رہو جواب مت دو اور جو بار بار کہتا تھا کہ اس وقت ہمارا لشکر پراگندہ ہے اور خطرہ ہے کہ دشمن پھر حملہ نہ کر دے۔ اس لئے خاموشی کے ساتھ اُس کی باتیں سُنتے چلے جاؤ۔ اُس مقدس انسان کے کانوں میں جب یہ آواز پڑی اُعْلُ هُبُل۔ اُعْلُ هُبُل۔ ہُبل کی شان بلند ہو۔ ہُبل کی شان بلند ہو۔ تو اُس کے جذبۂ توحید نے جوش مارا کیونکہ اب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا سوال نہیں تھا۔ اب ابوبکرؓ اور عمرؓ کا سوال نہیں تھا۔ اب اللہ تعالےٰ کی عزت کا سوال تھا۔ آپ نے بڑے جوش سے فرمایا تم کیوں جواب نہیں دیتے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم کیا جواب دیں؟ آپ نے فرمایا کہو اَللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ۔ اَللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ۔ ہُبل کیا چیز ہے۔ خدا تعالےٰ کی شان بلند ہے۔ خدا تعالیٰ کی شان بلند ہے۔ یہ کتنا شاندار مظاہرہ آپ کے جذبۂ توحید کا ہے۔ آپ نے تین دفعہ صحابہؓ کو جواب دینے سے روکا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو خطرہ کی اہمیت کا پورا احساس تھا۔ آپ جانتے تھے کہ اسلامی لشکر تتر بتر ہو گیا ہے اور بہت کم لوگ آپ کے ساتھ ہیں۔ اکثر صحابہ زخمی ہو گئے ہیں اور باقی تھکے ہوئے ہیں۔ اگر دشمن کو یہ معلوم ہو گیا کہ اسلامی لشکر کا ایک حصہ جمع ہے تو وہ کہیں پھر حملہ کرنے کی جرأت نہ کرے۔ مگر اِن حالات کے باوجود جب خدا تعالےٰ کی عزت کا سوال آیا تو آپ نے خاموش رہنا برداشت نہ کیا اور سمجھا کہ دشمن کو خواہ پتہ لگے یا نہ لگے۔ خواہ وہ حملہ کرے اور ہمیں ہلاک کر دے اب ہم خاموش نہیں رہیں گے۔ چنانچہ آپ نے صحابہؓ سے فرمایا تم خاموش کیوں ہو جواب کیوں نہیں دیتے کہ اَللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ اَللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ۔

(۱۷) کمزوروں کی حفاظت کا جذبہ بھی آپ کے اندر بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔ جنگ احزاب میں کفار کی تعداد پندرہ ہزار کی تھی۔ اور مسلمان لشکر کی تعداد صرف بارہ سو۔ بعض نے دشمن کا اندازہ اس سے زیادہ بتایا ہے اور بعض نے کم۔ یورپ والے صرف دس ہزار بتاتے ہیں تاکہ بڑے لشکر کی شکست سے وہ شرمندہ نہ ہوں۔ اس کے مقابلہ میں بعض مسلمانوں نے ۲۴ ہزار تک بھی تعداد لکھی ہے لیکن میرا اندازہ پندرہ ہزار کے قریب قریب ہے۔ اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی بھی مختلف تعدادیں بتائی گئی ہیں۔ بعض نے مسلمانوں کی تعداد زیادہ بتائی ہے اور بعض نے کم بتائی ہے۔ لیکن مجھے جہاں تک تاریخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے اسلامی لشکر کی بارہ سو کی تعداد زیادہ درست معلوم

ہوتی ہے۔ اس جنگ میں کفار نے مدینہ کے ایک یہودی قبیلہ سے جو باقی رہ گیا تھا خفیہ معاہدہ کر لیا کہ جب حملہ بڑھ جائے تو وہ پیچھے سے مسلمانوں پر حملہ کر دیں۔ مدینہ کے ایک طرف میدان تھا جس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خندق کھدائی ہوئی تھی۔ ایک طرف یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا جس سے مسلمانوں کا معاہدہ تھا۔ آپ نے خیال کیا کہ یہ قبیلہ بھی ہمارے ساتھ ہے اس لئے یہ طرف بھی محفوظ ہے۔ تیسری طرف ایک پہاڑ تھا جس کے متعلق خیال تھا کہ دشمن اس طرف سے نہیں آئے گا اور اگر آیا تو ہمیں پتہ لگ جائے گا اور ہم اُن کے حملہ کو روک سکیں گے چوتھی طرف متواتر مکان واقع تھے اور ایک دیوار سی بنی ہوئی تھی۔ گویا ایک طرف پہاڑ کی حفاظت تھی۔ دوسری طرف معاہد یہودی قبیلہ تھا۔ ایک طرف مکانوں کی دیوار بنی ہوئی تھی اور ایک طرف میدان تھا جس میں آپ نے خندق کھدوائی تھی۔ جب کفار کے لشکر نے دیکھا کہ سامنے سے مقابلہ کرنے میں ہم کامیاب نہیں ہو سکتے تو انہوں نے یہودیوں سے ساز باز کی اور انہیں مسلمانوں کے خلاف اُکسایا اور وہ بھی اُن کے ساتھ مل گئے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یہودیوں کی طرف سے مطمئن تھے انصار نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا بھی کہ یہودیوں کا اعتبار نہیں مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہمارا اُن سے معاہدہ ہے تم کیوں اُن پر بدظنی کرتے ہو۔ مگر جب زیادہ خبریں آنی شروع ہو گئیں تو دو انصاری صحابی جو اُن سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے پتہ لینے کے لئے بھجوائے گئے۔ اُن سے جو یہودیوں نے باتیں کیں اُن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ضرور غداری کریں گے۔ اُن دو صحابیوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس رپورٹ کی کہ حالات اچھے نظر نہیں آتے لیکن آپ نے پھر بھی معاہدہ کا احترام کیا اور فرمایا ہمارا حق نہیں کہ ہم معاہدہ توڑیں۔ ان ایام میں آپ نے عورتوں کو حفاظت کے لئے دو جگہ پر اکٹھا کر دیا تھا۔ کچھ عورتوں کو تو دو محفوظ مکانات پر جمع کر دیا گیا تھا اور اپنے خاندان کی عورتوں یا اُن صحابہ کی عورتوں کو جن کے متعلق خیال تھا کہ دشمن زیادہ زور کے ساتھ اُن پر حملہ کرے گا اور جن کی بے حرمتی سے قوم کی بے حرمتی ہو سکتی تھی اُن کو آپ نے ایک جگہ پر اکٹھا کر دیا تھا۔ وہ جگہ جہاں یہ عورتیں جمع تھیں یہودیوں کی طرف تھی۔ حضرت صفیہؓ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی ...... تھیں ایک دفعہ پھر رہی تھیں کہ اُنہوں نے دیکھا کہ ایک یہودی دیوار پر سے جھانک رہا ہے۔ حضرت صفیہؓ نے حسانؓ بن ثابت کو جو پہرہ پر مقرر تھے کہا کہ ایک یہودی دیوار پر سے جھانک رہا ہے اُٹھو اور اُس کو مارو حضرت حسانؓ کمزور دل آدمی تھے انہوں نے کہا کہ کوئی راہگیر ہوگا آپ کو یونہی وہم ہو گیا ہے۔ حضرت صفیہؓ نے تو خود دیکھا تھا کہ وہ جھانک رہا ہے انہوں نے ایک بانس اُٹھایا اور پیچھے سے جا کر اُس کے سر پر مارا اور وہ گر گیا۔ جب وہ گرا تو ننگا ہو گیا حضرت صفیہؓ نے حسانؓ بن ثابت سے کہا اب تو چلو۔ حسانؓ نے کہا میں تو نہیں جا سکتا تم خود ہی مارو شاید اُس میں کوئی دم باقی ہو حضرت صفیہؓ نے پردہ کیا۔ مُنہ پر چادر ڈالی اور چونکہ وہ ننگا ہو چکا تھا اس لئے پہلے اُس پر کپڑا ڈالا اور پھر اُس کے سر کو کچل دیا۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو متواتر ایسی اطلاعات پہنچیں کہ یہودیوں نے مخالفانہ کارروائی شروع کر دی ہے اور اُنہوں نے جاسوس بھی بھیجنے شروع کر دئے ہیں اور شاید جلد حملہ ہو جائے گا تو آپ نے عورتوں کی حفاظت کے لئے پانچ سو کے دو لشکر مقرر کر دئے جن میں سے ایک دو سو کا تھا اور ایک تین سو کا تھا اور دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے صرف سات سو مسلمان رہ گئے۔ یہ ایک کمزور طبقہ کی امداد کے لئے کتنی شاندار قربانی تھی جو آپ نے کی کہ فوج کے ایک معتد بہ حصہ کو جس نے شہر کی حفاظت کرنی تھی لشکر سے کاٹ کر عورتوں کی حفاظت کے لئے بھیج دیا۔ یہ ثبوت تھا اِس بات کا کہ آپ عورتوں کی حفاظت کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لئے بھی تیار رہتے۔

(۱۸) جنگِ بدر کے موقعہ پر بھی آپ نے اپنے خُلقِ عظیم کا ثبوت دیا۔ حضرت عباسؓ جو ان دنوں مسلمان نہیں ہوئے تھے وہ بھی اس جنگ میں شریک تھے۔ آپ خفیہ طور پر تو مسلمان

بوچکے تھے مگر جب کفار لڑائی کے لئے آنے لگے تو ان کو بھی ساتھ لے آئے۔ یہ آنے کو تو آ گئے مگر اِدھر اُدھر وقت ٹلاتے رہے۔ جب کفار کو شکست ہوئی تو مسلمانوں نے حضرت عباسؓ کو بھی قید کر لیا اُس زمانہ میں ہتھکڑیاں تو تھیں نہیں اور نہ ہی کال کوٹھڑیاں ہوا کرتی تھیں۔ رسیوں سے ہی قیدیوں کو باندھ کر ان کی حفاظت کرتے تھے اور رسیاں ذرا زور سے باندھتے تھے جس سے قیدی کو تکلیف ہوتی تھی۔ صحابہؓ کہتے ہیں کچھ دُور جا کر ہم نے منزل کی تو ہم نے دیکھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نیند نہیں آتی۔ ہم نے آپس میں مشورہ کیا کہ بات کیا ہے۔ بعض نے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ حضرت عباسؓ سے محبت ہے اُن کے کراہنے کی وجہ سے آپکو تکلیف ہو رہی ہے۔ اس پر صحابہؓ نے فیصلہ کیا کہ حضرت عباسؓ کی رسیاں ڈھیلی کر دی جائیں۔ چنانچہ انہوں نے آہستہ سے جا کر حضرت عباسؓ کی رسیاں ڈھیلی کر دیں۔ جب اُن کی رسیاں ڈھیلی کر دی گئیں تو اُنھوں نے کراہنا بند کر دیا۔ جہاں محبت ہوتی ہے وہاں وہم بھی ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر تک جب حضرت عباسؓ کے کراہنے کی آواز رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نہ آئی تو آپ نے خیال کیا کہ شاید آپ تکلیف کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے ہیں یا فوت ہو گئے ہیں۔ آپ گھبرائے اور صحابہؓ کو بلا کر کہا عباسؓ کی آواز کیوں نہیں آتی انہوں نے جواب دیا۔ یا رسول اللہ عباسؓ کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی جس سے ہم نے محسوس کیا کہ آپ کو تکلیف ہو رہی ہے اس لئے ہم نے عباسؓ کی رسیاں ڈھیلی کر دی ہیں۔ یہ آپ کی مرضی کی بات تھی اور چاہیئے تھا کہ آپ خوش ہوتے مگر آپ نے فرمایا میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ یا تو سب قیدیوں کی رسیاں ڈھیلی کر دی جائیں اور یا پھر عباسؓ کی رسی بھی ڈھیلی نہ کی جائے۔ تکلیف اُٹھائیں تو سب اُٹھائیں اور آرام پائیں تو سب پائیں۔ اگر ایک کو آرام دیا گیا ہے تو دوسروں کو بھی یہی آرام ملنا چاہیئے۔ گویا پہلے تو آپ حضرت عباسؓ کی تکلیف کو برداشت نہ کر سکے اور جب اُنکی رسیاں ڈھیلی کر دی گئیں تو پھر آپ یہ برداشت نہ کر سکے کہ آپ کے چچا کی رسیاں تو ڈھیلی کر دی جائیں اور دوسرے قیدیوں کی رسیاں ڈھیلی نہ کی جائیں۔ اِس طرح آپ نے اپنے عمل سے مساواتِ اسلامی کا ایک شاندار نمونہ قائم کر دیا۔

(۱۹) جب فتح مکہ ہوئی اور آپ مکہ میں تشریف لائے تو ایک عجیب نظارہ دیکھنے میں آیا۔ ابوسفیان کو مکہ کے باہر ہی قید کر لیا گیا تھا لیکن آخر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُس کو اجازت دے دی کہ مکہ میں جا کر اعلان کر دو کہ جو شخص خانہ کعبہ کے اندر آ جائے گا اس کو معاف کر دیا جائے گا۔ جو ابوسفیان کے گھر چلا جائے گا اُس کو معاف کر دیا جائے گا۔ جو بلالؓ کے جھنڈے تلے آ جائیگا اُسے معاف کر دیا جائے گا اور جو اپنے گھروں کے دروازے بند کر لینگے انہیں بھی معاف کر دیا جائے گا جب صبح کے وقت لشکر مکہ کی طرف چلا تو ابوسفیان نے جو حضرت عباسؓ کے دوست تھے آپ سے کہا کہ مکہ جانے سے پہلے مجھے ذرا اپنے لشکر کا نظارہ تو کرا دو۔ انہوں نے یہ بات مان لی اور ابوسفیانؓ کو ایک جگہ پر بٹھا دیا گیا تا کہ وہ لشکر اچھی طرح دیکھ سکیں۔ ابوسفیان کے آگے سے جو لشکر بھی گذرتا۔ وہ کہتا یہ فلاں قوم معلوم ہوتی ہے۔ حضرت عباسؓ فرماتے۔ ٹھیک ہے۔ اسی طرح جو لشکر نکلتا ابوسفیان پہچان لیتا اور کہتا یہ فلاں قوم ہے یہ فلاں قوم ہے۔ اتنے میں ایک بڑا لشکر ابوسفیان کے سامنے سے گذرا۔ ابوسفیان نے حیرت سے پوچھا۔ عباسؓ یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے بتایا یہ انصارؓ ہیں جو مدینہ کے رہنے والے ہیں۔ یہ بات انصاری لشکر کے کمانڈر نے جو ایک انصاری ہی تھے سُن لی اور انہوں نے جوش میں آ کر کہا۔ تم پوچھتے ہو ہم کون ہیں۔ ہم انصار ہیں اور تھوڑی دیر میں ہی تم لوگوں کا سر کچلنے کے لئے پہنچ رہے ہیں۔ ابوسفیان رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس دوڑا دوڑا گیا اور اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ نے تو مجھے معاف کر دیا ہے بلکہ یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جو شخص میرے گھر میں داخل ہو جائے گا اُسے بھی معاف کر دیا جائے گا۔ جو بلالؓ کے جھنڈے تلے آ جائے گا اُسے بھی معاف کر دیا جائیگا۔ جو خانہ کعبہ میں داخل ہو جائیگا اُسے بھی معاف کر دیا جائیگا۔

جو گھر کے دروازے بند کر لیگا اُسے بھی معاف کر دیا جائے گا اور آپ کے فلاں جرنیل نے کہا ہے کہ ہم تم لوگوں کا سر کچلنے کے لئے جا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا مکہ والوں کو کوئی ذلیل نہیں کر سکتا خدا تعالیٰ نے جنہیں عزت دی ہے انہیں کون ذلیل کر سکتا ہے۔ پھر آپ نے اس کمانڈر کو بلایا اور اُسے معزول کر دیا۔ اس لئے کہ اُس نے ابوسفیان کا دل دکھایا ہے اور اس کمانڈر کا بھی لحاظ رکھا کہ اُس نے اسلام کی محبت کے جوش میں یہ بات کی تھی اور اُسی کے بیٹے کو اُس کی جگہ کمانڈر مقرر کر دیا عین حملہ کے وقت ایک کمانڈر کا بدل دینا اس لئے کہ اُس نے کسی دشمن کی دل شکنی کی ہے یہ معمولی چیز نہیں۔ ایسا کرنے سے بسا اوقات لشکر میں بغاوتیں ہو جاتی ہیں مگر آپ نے کوئی پروا نہ کی اور اس نازک موقعہ پر بھی آپ نے اپنے خلق عظیم کا ایسا نمونہ دکھایا جس کی مثال کوئی اور نبی پیش نہیں کر سکتا۔

(۲۰) فتح مکہ کے موقعہ پر جس عفو و کرم سے آپ نے کام لیا اور اپنے جانی دشمنوں کو لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ کہا۔ وہ بھی آپ کے اخلاق فاضلہ کی ایک بہترین مثال ہے لیکن اس سلسلہ میں ایک اور چیز بھی ہے جس کی طرف عام طور پر توجہ نہیں کی جاتی۔ میں خدا تعالیٰ کے فضل سے علم النفس کا بہت ماہر ہوں۔ یُوں تو مَیں پرائمری پاس بھی نہیں مگر علم النفس کے ماہر لوگ بھی گفتگو میں مجھ سے خدا تعالیٰ کے فضل سے دبتے ہیں اور وہ سینکڑوں کتابیں پڑھ لینے کے باوجود بھی میرے علم النفس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میں نے دیکھا ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی علم النفس کے لحاظ سے ایک ایسی شاندار مثال ملتی ہے کہ اگر چہ وہ بظاہر چھوٹی سی ہے مگر علم النفس کے ماتحت وہ نہایت عظیم الشان چیز ہے اور وہ یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد آپ نے حضرت بلال کو جھنڈا دیا اور فرمایا جو شخص اس کے جھنڈے تلے آ جائے گا۔ اُسے معاف کر دیا جائے گا۔ علم النفس کے لحاظ سے آپ کے اخلاق فاضلہ کی یہ ایک زبردست مثال ہے ہر شخص جانتا ہے

کہ حضرت بلالؓ ایک غلام تھے اور غلامی کی حالت میں اُن کا آقا انکو سخت تکالیف اور دُکھ دیا کرتا تھا۔ پتھروں پر گھسیٹتا تھا۔ گرم ریت پر لٹاتا تھا اور جوتوں سمیت اُن کے سینہ پر چھلانگیں مارتا اور کُودتا اور کہتا کہ تم اقرار کرو کہ بُتوں میں بھی طاقت ہے مگر وہ ان سب تکالیف کے باوجود یہی کہتے کہ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ خدا تو ایک ہی ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ حضرت بلالؓ پر جو ظلم ہوئے تھے اور جو ایذائیں اُن کو دی گئی تھیں اُن کو دیکھتے ہوئے یقیناً وہ خیال کرتے ہونگے کہ جب اسلام کو فتح حاصل ہو گی تو میں ان کفار سے بدلہ لوں گا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مسلمان بھی میرا بدلہ بڑی سختی سے کفار سے لیں گے۔ یہ ایک قدرتی بات تھی جو اُن کے دل میں پیدا ہوئی ہوگی۔ لیکن جب فتح مکہ ہوئی اور ابوسفیان نے کہا ہم آپ کی قوم ہیں ہمیں معاف کر دیا جائے۔ تو آپ نے فرمایا اچھا جو خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے گا اُسے معاف کر دیا جائیگا جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اُسے معاف کر دیا جائے گا اور جو اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیں گے اُنہیں بھی معاف کر دیا جائے گا۔ اس کے یہ معنے تھے کہ سب کے لئے ہی معافی کا راستہ کھول دیا گیا تھا اور بلالؓ کا تو لہو کھولتا ہوگا اور اُسکے دل ہی میں سڑ جانے والے تھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جنہوں نے اپنے دشمنوں کے جذبات کا اتنا خیال کیا اپنے ایک مخلص سپاہی کو کب نظر انداز کر سکتے تھے۔ آپ نے اوپر کے تین احکام کے ساتھ ایک چوتھا حکم اور دیا کہ میں بلالؓ کے ہاتھ میں ایک جھنڈا دیتا ہوں جو شخص بلالؓ کے جھنڈے تلے آکر کھڑا ہو جائے گا اُسے بھی کچھ نہیں کہا جائے گا اس طرح آپ نے اپنی طرف سے دی گئی معافی کو بلالؓ کی طرف منتقل کر دیا اور معافی کی شکل یہ بنا دی کہ میں معاف نہیں کرتا بلال معاف کرتا ہے۔ اس طرح بلالؓ کا دل ٹھنڈا کر دیا اور اُسے یہ فخر بخش دیا کہ اس پر ظلم کرنے والے اس کی پناہ میں آئے اور اس کے معافی دینے سے بخشے جائینگے اس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ کا بدلہ بھی

لے لیا اور مکہ والوں کو معافی بھی دے دی۔ آپ نے حضرت بلالؓ کا بھی خیال رکھا اور اُس کے جذبات کو مجروح نہ ہونے دیا اور مکہ والوں کا بھی خیال رکھا اور انہیں معاف فرما دیا گویا اس رنگ کے انتقام کے ذریعہ آپ نے ایک طرف حضرت بلال کا سر اونچا کیا اور دوسری طرف مکہ والوں کو بھی عذاب سے نجات دلوا دی

(۲۱) بہادری اور توحید کا مظاہرہ جو آپ نے جنگ حنین کے موقعہ پر کیا اس کی مثال بھی دوسرے انبیاء پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ سینکڑوں تیرانداز دو رویہ کھڑے تھے اسلامی لشکر تتر بتر ہو چکا تھا اور چار ہزار کے لشکر میں آپ گھرے ہوئے تھے۔ ایسی خطرناک حالت میں آپ نے دشمن کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے اکیلے اُس کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا یا رسول اللہ آپ آگے نہ بڑھیں۔ پہلے پیچھے ہٹ کر لشکر کو اکٹھا کیا جائے اور پھر حملہ کیا جائے مگر آپ نے فرمایا۔ ابوبکرؓ میرے گھوڑے کی لگام چھوڑ دو۔ پھر آپ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور باآواز بلند کہا

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِب۔ اَنَا ابنُ عبدِ المطلب

میں نبی ہوں۔ جھوٹا نہیں۔ مگر اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ دشمن کے تیروں اور تلواروں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میں اکیلا آگے بڑھ رہا ہوں تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ مجھ میں خدائی صفات آگئی ہیں بلکہ یاد رکھنا کہ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں اور تمہارے جیسا ہی ایک انسان ہوں گویا آپ نے ایک طرف انتہائی دلیری کا اظہار کیا اور دوسری طرف توحید کو قائم رکھا۔

(۲۲) اسی طرح ایک اور مقام پر آپ نے بہادری اور ایثار کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ صحابہؓ فرماتے ہیں ہمیں خبریں آرہی تھیں کہ قیصر کی فوجیں آرہی ہیں اور وہ مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہتی ہیں۔ ہم روزانہ حفاظت کی تدابیر کرتے تھے۔ ایک رات یکدم شور پڑا اور لوگ گھروں سے باہر بھاگے کچھ مسجد نبوی میں جمع ہو گئے اور کچھ میدان کی طرف دوڑ پڑے۔ اسی طرح لوگ متفرق طرف دوڑ رہے تھے کہ ہم نے دیکھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے باہر سے تشریف لا رہے ہیں۔ آپ نے ہمیں دیکھ کر فرمایا میں نے شور سنا تھا اِس لئے باہر چلا گیا مگر کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ غور کرو آدھی رات کا وقت ہے اور آپ اکیلے باہر نکل جاتے ہیں کسی کو ساتھ نہیں لیتے اور جبکہ صحابہؓ ابھی تجویزیں سوچ رہے تھے کہ ہم کیا کریں، آپ پتہ لگا کر واپس بھی آجاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کوئی خطرہ کی بات نہیں۔

(۲۳) لوگوں کے حقوق کا آپ کو اس قدر خیال رہتا تھا کہ ایک دفعہ نماز پڑھ کر سلام پھیرتے ہی آپ گھر کی طرف جلدی جلدی تشریف لے گئے۔ صحابہؓ کہتے ہیں اُس دن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پھلانگیں مارتے ہوئے ہمارے سامنے سے گذرے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ واپس تشریف لائے تو آپ نے ایک دینار اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا غنیمت اور صدقات کا جو مال آیا ہوا تھا وہ ہم تقسیم کر رہے تھے کہ اُس میں سے ایک دینار نیچے گر گیا اور یاد نہ رہا کہ کہاں گرا ہے۔ اب جب میں نماز پڑھا رہا تھا تو خیال آیا کہ وہ دینار اُٹھایا نہیں گیا۔ چنانچہ مَیں جلدی جلدی گھر گیا تاکہ بھول نہ جاؤں اور خدا تعالےٰ کے بندوں کا حق ضائع نہ ہو۔

اسی طرح تاریخ میں آتا ہے کہ حضرت امام حسنؓ ابھی تین سال کے تھے کہ آنحضرت صلے اللہ کے پاس زکوٰۃ کی کچھ کھجوریں آئیں۔ حضرت امام حسنؓ دوڑے دوڑے آئے اور ایک کھجور اُٹھا کر منہ میں ڈال لی۔ آپ نے دیکھ لیا اور فرمایا تھو کو۔ وہ ابھی بچے ہی تھے اور کھجور میٹھی تھی بچے میٹھی چیز کہاں پھینکتے ہیں۔ انہوں نے نہ تھوکا۔ آپ نے زور سے اُن کے منہ میں انگلی ڈال کر کھجور کو باہر نکالا اور فرمایا یہ لوگوں کا حق ہے تمہارا نہیں۔

(۲۴) آپ کے جذبۂ احسان مندی کا ثبوت اِس سے ملتا ہے کہ آپ نے ایک لشکر طے قبیلے پر حملہ کیا۔ انہیں شکست ہوئی اور وہ سب قید ہو گئے۔ جب وہ قیدی بنا کر آپ کے سامنے لائے گئے تو آپ کے سامنے ایک لڑکی پیش ہوئی

اُس نے آگے بڑھ کر کہا۔ آپ جانتے ہیں میں کون ہوں؟
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں میں نہیں جانتا۔
اُس لڑکی نے کہا میں اُس باپ کی بیٹی ہوں جس کی سخاوت
کے ذکر سے سارا عرب گونج رہا ہے۔ وہ حاتم طائی کی بیٹی تھی
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کا باپ محسن تھا اور
وہ دنیا کے ساتھ نیکی کا سلوک کرتا تھا۔ ہم ایسے باپ کی
لڑکی کو قید کرنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ آپ نے اُسے آزاد کر دیا
اُس لڑکی نے پھر عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں یہ ناپسند کرتی
ہوں کہ میں تو آزاد ہو جاؤں اور میرے قبیلے کے سب افراد
قید رہیں۔ آپ نے فرمایا اچھا وہ بھی آزاد ہیں۔ پھر اُس لڑکی
نے اپنے بھائی کی سفارش کی جو بھاگا ہوا تھا۔ رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم نے اُس کی سفارش کو بھی مان لیا حالانکہ حاتم طائی
کا اسلام پر کوئی احسان نہیں تھا وہ صرف اپنے علاقہ میں
سخاوت کے لئے مشہور تھا۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
اور آپ کی جماعت کے لئے اُس نے کوئی کام نہیں کیا تھا اُس
کی قوم آپ سے لڑی تھی اور لڑائی میں قید ہو کر آئی تھی۔ لیکن
آپ نے محض اس وجہ سے کہ وہ غریبوں پر احسان کیا کرتا تھا اُس
کے سارے قبیلے کو معاف کر دیا اور فرمایا ہم ایسے شخص کی
قوم کو قید نہیں کر سکتے جو اپنی زندگی میں غریبوں پر احسان
کیا کرتا تھا۔

(۲۵) آپ کی مہمان نوازی کا یہ حال تھا کہ آپ کے پاس
ایک دفعہ ایک یہودی آیا اور اُس نے کہا میں آپ کے اسلام
کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔ آپ نے اُسے اپنے ہاں ٹھہرایا اور
بڑی خاطر مدارات کی۔ وہ یہودی ایک دو دن آپ کے پاس رہا
اور آپ اُسے تبلیغ کرتے رہے۔ ایک دن وہ چپکے سے چلا گیا اور
اس کپڑے پر جو اُسے فرش پر بچھانے کے لئے دیا گیا تھا پاخانہ
پھر گیا (اُن دنوں چارپائیوں کا رواج نہ تھا) رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم نے خود بیٹھ کر اُس کپڑے کو دھلوایا۔ ایک عورت جو
پانی ڈال رہی تھی اُس نے اس یہودی کے متعلق سخت کلامی کی
اور کہا خدا تعالےٰ اُس شخص کا بیڑا غرق کرے جو اس طرح
کپڑے پر پاخانہ کر گیا ہے۔ آپ نے فرمایا ایسی بد دعائیں
مت دو تمہیں کیا پتہ ہے کہ اُسے کیا تکلیف تھی۔ شاید اُس
کے پیٹ میں خلل ہو۔

(۲۶) آپ بادشاہ ہوئے مگر بادشاہت میں بھی آپ
نے غربت کو پسند کیا۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت فاطمہؓ آپ کے
پاس تشریف لائیں اور انہوں نے آپ کو اپنے ہاتھ دکھلائے
اُن کے ہاتھوں پر چھالے پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا
یا رسول اللہ میں سارے کام خود ہی کرتی ہوں۔ بچوں کو پالتی
ہوں، کھانا پکاتی ہوں، چکی پیستی ہوں۔ آپ مجھے کوئی خادم
عنایت فرمائیں تا کہ اِن کاموں میں مجھے مدد مل سکے۔ اُن دنوں
چونکہ کوئی خاص محکمہ قیدی رکھنے کا نہ تھا اس لئے جو قیدی
آتے تھے وہ لوگوں میں تقسیم کر دئے جاتے تھے۔ حضرت فاطمہؓ
کا اشارہ بھی اسی بات کی طرف تھا کہ مجھے بھی کوئی قیدی دے
دیا جائے جو گھر کے کاموں میں میری مدد کر سکے۔ رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیٹی تم کیوں غمگین ہوتی ہو نماز کے
بعد ذکر الٰہی کیا کرو۔ اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے تمہاری ان
تکلیفوں کو دُور فرما دے گا۔ اس طرح آپ نے اُن کی دلجوئی
بھی کر دی اور بادشاہ بن کر بھی غربت کو ہی پسند کیا۔

(۲۷) رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اندر جو بے مثال
تقویٰ پایا جاتا تھا اُس کا اس امر سے پتہ چل سکتا ہے کہ جب
آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے ایک دن اپنے
صحابہؓ سے فرمایا کہ انسان خواہ کتنا بڑا ہو اُس سے غلطی ہو جاتی
ہے لیکن اللہ تعالےٰ اُس کا بدلہ نہیں چھوڑتا۔ میں ڈرتا ہوں
کہ مجھ سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچی ہو جس کی وجہ سے میں
خدا تعالےٰ کے سامنے مجرم بنوں۔ اگر تم میں سے کسی کو مجھ سے
کوئی تکلیف پہنچی ہو تو وہ مجھ سے بدلہ لے لے۔ صحابہؓ کو جو
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے عشق تھا اس کا اندازہ دوسرے
لوگ کہاں کر سکتے ہیں۔ اُن کے تو ہوش اُڑ گئے۔ مگر ایک صحابیؓ

نہایت اطمینان سے آگے بڑھے اور انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ مجھے آپ سے ایک تکلیف پہنچی ہے۔ ایک دفعہ ایک لڑائی میں آپ صفیں ٹھیک کروا رہے تھے میں بھی صف میں کھڑا تھا کہ آپ میرے پیچھے سے آئے اُس وقت آپ کی کہنی مجھے لگی تھی۔ یارسول اللہ میں اُس کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا ہاں لے لو۔ یہ دیکھکر دوسرے صحابہ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور شاید اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُس وقت سامنے نہ ہوتے تو وہ اُس صحابی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔ مگر اس صحابیؓ نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور اُس نے کہا یارسول اللہ میرے جسم پر اُس وقت کُرتہ نہیں تھا آپ کا تو کرتہ ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا کُرتہ اُٹھا لو۔ اُس نے کُرتہ اُٹھایا اور آگے بڑھکر نہایت ادب اور پیار کے ساتھ اُس نے آپ کی پیٹھ پر بوسہ دیا اور پھر اشکبار آنکھوں کے ساتھ اُس نے کہا یارسول اللہ آپ سے بدلہ کیسا۔ یہ تو میں نے پیار کرنے کا ایک بہانہ بنایا تھا اور چاہتا تھا کہ آپ کی اجازت سے اس طرح فائدہ اُٹھا لوں شاید مجھے پھر پیار کا موقعہ ملے یا نہ ملے۔ یہ نظارہ دیکھکر باقی صحابہؓ جو بہت غصہ میں تھے وہ اس صحابی پر رشک کرنے لگے کہ کاش یہ بہانہ ہمیں بھی سُوجھتا اور آج ہم بھی پیار کر لیتے۔ لیکن آپ کا تقویٰ دیکھو کہ اتنی خدمات کے باوجود آپ نے فرمایا۔ اگر کوئی ادنیٰ سا بھی دُکھ مجھ سے کسی کو پہنچا ہو تو وہ آکر مجھ سے بدلہ لے لے۔

(۲۸) آپ کے انکسار کی یہ حالت تھی کہ آپ اپنے آنے پر لوگوں کو کھڑے ہونے سے منع فرمایا کرتے تھے اور فرماتے تھے یہ تو ایرانیوں کا رواج ہے۔ میں بادشاہ نہیں بلکہ خدا تعالےٰ نے مجھے نبی بنایا ہے۔

آپ کے انکسار کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک دن ایک انصاریؓ بیمار ہو گئے۔ آپ اُس کی تیمار داری کے لئے تشریف لے گئے۔ واپسی پر اُس انصاری نے آپ کو سواری کیلئے ایک گھوڑا دیا اور اپنے بیٹے سے کہا کہ تم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جاؤ شاید آپ کو اور آدمی تلاش کرنے میں دقت ہو اور آتی دفعہ گھوڑا واپس لے آنا۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکا بیٹا واپس آگیا۔ باپ نے بیٹے سے دریافت کیا کہ میں نے تو تمہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھیجا تھا۔ تا راستہ میں حفاظت بھی ہو جائے اور گھوڑا بھی نہ رہے اور تم واپس آگئے ہو۔ بیٹے نے جواب دیا۔ میں مجبور تھا جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے گئے تو آپ نے مجھ سے فرمایا تم بھی میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ میں نے کہا یارسول اللہ مجھ سے اتنی بے ادبی نہیں ہو سکتی۔ آپ نے فرمایا پھر مجھ سے بھی برداشت نہیں ہو سکتا کہ تم پیدل چلو اور میں گھوڑے پر سوار ہوں۔ یا تو تم بھی میرے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو جاؤ اور یا پھر واپس چلے جاؤ۔ چنانچہ میں واپس آگیا۔

(۲۹) اپنے غریب صحابہؓ سے جو آپ کو محبت تھی اور اُن کے احساسات اور جذبات کا آپ جس قدر خیال رکھتے تھے اُس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ایک صحابیؓ بہت بدصورت تھے۔ وہ بیچارے مزدور تھے۔ ایک دفعہ مزدوری کے لئے کہیں کھڑے تھے پسینہ آیا ہُوا تھا اور چہرے پر افسردگی طاری تھی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور جس طرح بچے آپس میں کھیلا کرتے ہیں آپ نے اُن کے پیچھے سے آکر اُن کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے وہ صحابیؓ بھی سمجھ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ میں غریب ہوں پھر پسینہ آیا ہُوا ہے۔ مٹی سے میرا جسم لت پت ہے اور ویسے بھی میں بدصورت ہوں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہوگا جو مجھ سے پیار کرے۔ پھر انہوں نے ہاتھ پھیر کر بھی پہچان لیا تھا کہ یہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ کیونکہ آپ کا جسم بہت ملائم تھا۔ مگر آپ کی محبت کو دیکھ کر انہیں بھی جوش آگیا اور انہوں نے اپنا جسم آپ کے ساتھ خوب رگڑا۔ جب آپؐ نے دیکھا کہ اُن کا دل خوش

ہوگیا ہے تو آپ بول پڑے اور فرمایا۔ ہم ایک غلام بیچتے ہیں اسے کون لے گا۔ اس صحابیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کون خرید سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا خدا اور اُس کے رسول کی نظر میں تمہاری بڑی قیمت ہے۔

اسی قسم کا حضرت ابو ہریرہؓ کا واقعہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ہمیشہ مسجد میں رہتے تھے تا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب بھی کوئی بات کریں وہ اس کے سننے سے محروم نہ رہیں چونکہ آپ کوئی کمائی نہیں کرتے تھے اس لئے کچھ دیر تو ان کا بھائی کھانا پہنچاتا رہا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ اب تو ملاں ہی بن گیا ہے کوئی کام نہیں کرتا تو اُس نے کھانا دینا بند کر دیا۔ اس وجہ سے بعض دفعہ آپ کو کئی کئی وقت کا فاقہ ہو جاتا تھا اور بھوک کی وجہ سے آپ کی بُری حالت ہو جاتی تھی۔ ایک دن جب آپ کو شدت کی بھوک لگی ہوئی تھی آپ مسجد کی ایک کھڑکی میں کھڑے ہوگئے اور خیال کیا کہ رستہ سے جو صحابی گذرے گا میں اُس سے اُس آیت کا مطلب پوچھوں گا جس میں غریبوں کو کھانا کھلانے کا حکم ہے شاید اُسے میرا خیال آجائے اور مجھے کھانا کھلا دے۔ اتفاقاً سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ گذرے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے آپ سے پوچھا قرآن کریم میں یہ جو آیت ہے وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر) اس کا کیا مطلب ہے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ دوسروں کا بہت خیال رکھتے ہیں اور خود بھوکے رہتے ہیں اور اپنا کھانا دوسرے کو دے دیتے ہیں۔ آپ نے یہ جواب دیا اور چلے گئے۔ پھر حضرت عمرؓ گذرے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے اُن سے بھی یہی سوال کیا۔ انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو حضرت ابوبکرؓ نے دیا تھا اور پھر آگے چلے گئے۔ حضرت ابو ہریرہ رضؓ غصّے میں آگئے اور کہنے لگے۔ یہ کوئی مجھ سے زیادہ قرآن کریم جانتے ہیں۔ میں نے تو خیال کیا تھا کہ شاید میری شکل دیکھ کر انہیں میرا خیال آجائے گا اور کھانا کھلا دیں گے مگر یہ منہ پر تاتے ہوئے آگے چلے جاتے ہیں۔ وہ غصہ میں کھڑے ہی تھے کہ پیچھے سے ایک پیار کی آواز آئی۔ ابو ہریرہؓ تم بھوکے ہو! یہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی آواز تھی گویا ابوبکرؓ اور عمرؓ ابو ہریرہؓ کا چہرہ دیکھ کر بھی یہ نہ پہچان سکے کہ وہ بھوکے ہیں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف اُن کی آواز سے پہچان لیا کہ وہ بھوکے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ پیچھے مڑے اور انہوں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ سخت بھوک لگی ہوئی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابو ہریرہؓ ہم بھی بھوکے تھے مگر ایک دوست نے دُودھ کا ایک پیالہ بھیج دیا ہے آؤ ہم دُودھ پئیں۔ ابو ہریرہؓ بہت خوش ہوئے اور آپ کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ آپ نے فرمایا۔ ابو ہریرہؓ مسجد میں جاؤ اور دیکھو شاید کچھ اور لوگ بھی بھوکے ہوں اور اگر ایسا ہو تو اُن کو بھی ساتھ لے آؤ۔ ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں مجھے یہ سُن کر سخت افسوس ہوا کہ ایک پیالہ بھر دُودھ ہے اُسے بھلا کون کون پئے گا۔ لیکن چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا اس لئے میں چلا گیا۔ میں نے دیکھا تو مسجد میں میرے جیسے چھ آدمی اور تھے اُن کو بھی میں نے ساتھ لیا اور چل پڑا۔ مجھے رہ رہ کر افسوس آرہا تھا کہ اب کیا بنے گا۔ میں نے خیال کیا تھا کہ ایک پیالہ دُودھ کا ہے میں خوب پیٹ بھر کر پی لوں گا۔ مگر اب تو چھ اور بھی حاجتمند مل گئے ہیں دو دو گھونٹ ہی حصہ میں آئیں گے خیر ہم آپؐ کے پاس چلے گئے۔ مگر میں نے خیال کیا کہ میں چونکہ بہت بھوکا ہوں اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم شاید مجھے پہلے پیالہ دیں گے۔ مگر آپ نے پیالہ اُٹھایا اور اُن چھ میں سے ایک کو دے دیا جس سے میری رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔ جب وہ آدمی پی چکا تو آپ نے فرمایا کیا پیٹ بھر گیا ہے۔ اَور پیو۔ اُس نے پھر پیا اور کہا حضور اب تو پیٹ بھر گیا ہے میں اور نہیں پی سکتا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے وہ پیالہ اُس سے لے کر دوسرے شخص کو دیدیا

پھر تیسرے کو۔ پھر چوتھے کو۔ میں نے خیال کیا اب تو میری خیر نہیں۔ میرے لئے کیا بچے گا۔ مگر اُن چھ آدمیوں کے پی لینے کے بعد بھی جب دُودھ کا پیالہ میرے پاس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ ویسا ہی بھرا ہوا ہے۔ کچھ تو ویسے ہی وہ پیالہ بڑا تھا اور پھر انبیاء کی چیزوں میں خدا تعالےٰ برکت بھی دے دیتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ابوہریرہؓ اب تم پیو۔ میں نے دُودھ پیا اور میرا پیٹ خوب بھر گیا۔ جب میں پی چکا تو آپؐ نے فرمایا۔ ابوہریرہؓ پھر پیو۔ میں نے پھر پیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ ابوہریرہؓ پھر پیو۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ اب تو میری انگلیوں میں سے بھی دُودھ نکلنے لگا ہے۔ پھر آپ نے ہم ساتوں آدمیوں کا جھوٹا خود پیا۔ اس واقعہ سے بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ کو اپنے صحابہؓ کی دلجوئی اور خدمت کا کتنا احساس تھا۔

(۳۰) شرک کے خلاف آپ کے دل میں جو جذبۂ نفرت پایا جاتا تھا اُس کا اس امر سے پتہ چلتا ہے کہ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا۔ تو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ بے چینی اور اضطراب کے ساتھ بار بار کروٹیں بدلتے اور فرماتے۔ خدا تعالےٰ لعنت کرے یہود اور نصاریٰ پر جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہیں بنا لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی مراد صرف یہود اور نصاریٰ کو ملعون کرنا نہیں تھا بلکہ اپنی اُمت کو توجہ دلانا تھا کہ مجھے یہ فعل اتنا ناپسند ہے کہ میں مرتے وقت بھی اس پر لعنت بھیج رہا ہوں یہ نہ ہو کہ تم میری قبر کو بھی اُن کی طرح عبادت گاہ بنا لو۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اِس کرب کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں اگرچہ ہزاروں قسم کی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ مگر خدا تعالےٰ نے آپ کے مزار مبارک کو ہمیشہ کے لئے شرک سے بچایا۔ مسلمان عقائد میں بے شک شرک کرنے لگ گئے ہیں۔ چنانچہ بعض مسلمان رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب مانتے ہیں اور بعض آپ کو مُردوں کا زندہ کرنے والا تسلیم کرتے ہیں مگر خدا تعالےٰ نے آپ کے مقبرہ کو شرک سے ہمیشہ محفوظ رکھا ہے۔

اُوپر جو واقعات بیان کئے جا چکے ہیں انکو اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے بلکہ میں سمجھتا ہوں اگر انفرادی طور پر بھی دیکھا جائے تب بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی دوسرے انبیاء پر فضیلت اور برتری میں کوئی شبہ نہیں رہتا اور انسان کو اس حقیقت پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فی الحقیقت افضل النبیین تھے۔ بلکہ میں کہتا ہوں اگر ان امور کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی ایک چیز تو یقینی طور پر ایسی ہے جو دنیا کے کسی اور نبی کو میسّر نہیں آئی اور وہ یہ ہے کہ سوائے آپ کے کوئی اور وجود تاریخی ہے ہی نہیں۔ آپ کی ساری زندگی ایک کھلے ورق کی طرح دنیا کے سامنے ہے پیدائش سے لے کر وفات تک آپ کی ساری زندگی کا ایک سیکنڈ بھی ایسا نہیں جو دنیا کے سامنے نہ آیا ہو۔ باقی انبیاء کی زندگی اس طرح تاریخ میں کہاں محفوظ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتب میں آپ کے گھر کے حالات تو نہیں دئے گئے کہ آپ کا بیوی کے ساتھ کیسا سلوک تھا۔ بچوں کے ساتھ کیسا سلوک تھا ہمسایوں کے ساتھ کیسا معاملہ تھا۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھوکنا اور آپ کا پیشاب کرنا اور پاخانہ کرنا تک بھی نہیں چھوڑا گیا۔ غرض آپ کا کوئی فعل ایسا نہیں خواہ وہ اندرونی ہو یا بیرونی جو چُھپا ہُوا ہو۔ آپکی بیویوں نے حدیثیں بیان کی ہیں جن میں انہوں نے بتایا ہے کہ آپ رات کو کیسے اُٹھتے تھے۔ آپ تہجد کیسے پڑھتے تھے۔ آپ کیسے سوتے تھے۔ کیسے کھاتے تھے۔ پھر آپ اپنی بیویوں سے کیسے پیار کرتے تھے۔ بلکہ انہوں نے یہاں تک بیان کیا ہے کہ آپ کے بیویوں کے ساتھ جنسی تعلقات کس رنگ کے تھے۔ نہاتے تھے تو آپ کس طرح نہاتے تھے گھر کے متعلق

آپ کا کیا رویہ تھا۔ بچوں کے متعلق آپ کا کیا رویہ تھا۔ آپکا کپڑا کیسا تھا۔ پہننا کیسا تھا۔ کھانا کیسا تھا۔ بستر کیسا تھا۔ غرض آپکی زندگی کا کوئی عمل بھی ایسا نہیں اور نہ کوئی لمحہ ایسا ہے جو ہمارے سامنے نہ ہو۔ دنیا میں اَور کونسا نبی ایسا پایا جاتا ہے جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس طرح لوگوں کے سامنے ہو۔ ایسا کوئی نبی نہیں پایا جاتا۔ کسی نبی کے موٹے موٹے واقعات لے لینے سے تو اُس کی زندگی پاکیزہ ثابت نہیں ہوتی پاکیزہ زندگی اُسی وقت ثابت ہو سکتی ہے جب کسی کی ساری زندگی سامنے ہو۔ اور آپ کے سوا کوئی نبی ایسا نہیں جس کی ساری زندگی ہمارے سامنے ہو۔ گویا آپ شیشے کے ایک مکان میں سے گذر رہے تھے اور ساری دنیا آپکی طرف جھانک رہی تھی۔ دو چار گھنٹے تو کوئی ریا سے بھی کام کر سکتا ہے مگر ۲۴ گھنٹے کوئی ریا سے کام نہیں کر سکتا۔ ایک دن بھی کوئی ریا سے گذار سکتا ہے۔ مگر یہاں تو مہینوں اور سالوں کا سوال ہے۔ جبتک بھی آپ زندہ رہے آپ کی ساری زندگی جس طرح گذری وہ ہمارے سامنے ہے۔ گھر میں آپ کی بیویاں آپکی جاسوس تھیں اور وہ بتلا دیتی تھیں کہ آپ کس طرح نہاتے تھے۔ کس طرح کھاتے تھے۔ کس طرح پہنتے تھے۔ اپنی بیوی کے ساتھ کس طرح پیار کرتے تھے۔ بچوں کے ساتھ آپ کا کیسا رویہ تھا۔ ہمسایوں اور رشتہ داروں کے ساتھ آپ کا کیسا معاملہ تھا۔ باہر سے آنے والی عورتوں کے ساتھ آپکا کیسا معاملہ تھا۔ غرض گھر میں آپ کوئی بھی حرکت کرتے بیویاں اس کو بیان کر دیتیں۔ آپ باہر تشریف لے جاتے تو وہاں ابو ہریرہؓ جیسے صحابی موجود ہوتے جنھوں نے قسمیں کھا رکھی تھیں کہ وہ آپ کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے اور آپ کی ہر بات کو یاد رکھیں گے اور دوسروں سے بیان کریں گے۔ ہر بات جو آپ بیان کرتے۔ ہر حرکت جو آپ کرتے صحابہؓ اُسے یاد کر لیتے اور پھر دوسرے لوگوں سے بیان کرتے۔ کسی نے آپ سے سوال کیا ہو۔ آپ نے سختی کی ہو یا نرمی کی ہو۔ کسی سے کوئی معاملہ کیا ہو کسی نے آپ سے کوئی چیز مانگی ہو۔ آپ نے کسی کو کوئی چیز عطا کی ہو۔ کوئی چندہ لایا ہو۔ یہ سب واقعات آپ کے صحابہؓ نے بیان کر دئے ہیں۔ غرض آپ کی زندگی کا کوئی پہلو بھی پوشیدہ نہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صرف ۳۳ سال زندگی تسلیم کی جاتی ہے۔ مگر آپ کی ۳۳ سالہ عمر کے واقعات بھی انجیل میں پوری طرح بیان نہیں کئے گئے۔ درمیان میں کئی کئی مہینوں کا بلکہ کئی کئی سالوں کا خلا آ جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ایلیاؑ ہیں۔ سلیمانؑ ہیں۔ ذکریاؑ ہیں اور دوسرے انبیاء ہیں جن کا قرآن کریم میں ذکر آیا ہے یا تورات میں اُن کا ذکر آیا ہے۔ اِن میں سے کوئی بھی نبی ایسا نہیں جس کا وجود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وجود کی طرح تاریخی ہو۔ پھر اُن انبیاء کو لے لو جن کا تورات اور قرآن کریم میں تو ذکر نہیں مگر ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنے اپنے وقت کے مامور اور مرسل تھے۔ مثلاً کرشن علیہ السلام ہیں۔ رامچندر علیہ السلام ہیں۔ بدھ علیہ السلام ہیں۔ زردشت علیہ السلام ہیں۔ اُن کی بھی ساری زندگی کے حالات ہمیں نہیں ملتے۔ لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک فعل ہمارے سامنے آ گیا ہے جیسے کوئی کوٹ کو پھاڑ کر دکھا دے کہ اس کے اندر کی تہیں بھی ایسی ہیں جیسے اُس کے باہر کا حال ہے

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے مزکّی تھے اور بوجہ اس کے کہ آپ سب سے بڑے مزکّی تھے۔ آپ سب سے بڑے مزکّی بھی تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں جس قدر باتوں کا مطالبہ کیا گیا تھا اور جس کی قبولیت کا سورۂ بقرہ میں اعلان کیا گیا تھا اُس دعا کے متعلق اللہ تعالیٰ اس سورۂ کوثر میں فرماتا ہے کہ وہ دعا صرف قبول ہی نہیں ہوئی بلکہ اس شان اور عظمت سے پوری ہوئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام

کی دعا کی اُس سے کوئی نسبت ہی نہیں رہی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے صرف دعائے ابراہیمی کو ہی پورا نہیں کیا بلکہ آپ کو کوثر عطا فرمایا ہے اور ہر چیز آپ کی خواہش اور مطالبہ اور دعا سے بہت بڑھ کر دی ہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

میں اُوپر بتا چکا ہوں کہ کوثر کے ایک معنے اَلرَّجُلُ الْکَثِیْرُ الْعَطَاءِ وَالْخَیْرِ کے بھی ہیں یعنی ایسا آدمی جو بہت بخشش کرنے والا اور بہت بھلائی والا ہو اور یہ معنے لغت کی کتاب المفردات فی غریب القرآن میں بھی بیان ہوئے ہیں جو مسلمانوں میں سب سے معتبر کتاب لغت قرآن کی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے مؤلف کا نام ابوالقاسم الحسین ابن محمد الراغب الاصفہانی ہے۔ جو عام طور پر امام راغب کہلاتے ہیں اور بعض مورخین اُن کو صرف اصفہانی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میں اِس کتاب کا حوالہ اپنی تفسیر میں کم دیتا ہوں کیونکہ ہماری کتب میں یورپین لوگوں کے زہریلے اثرات کا دفاع زیادہ مدنظر ہوتا ہے اور وہ ایسی لغات پر کم یقین رکھتے ہیں جو تفسیری رنگ رکھتی ہیں۔ اس لئے اُن کے خیال سے میں زیادہ تر ایسی لغات کا حوالہ دیتا ہوں جو خالصًا ادبی ہوں اور خصوصًا جن کے مصنّف مسیحی ہوں تا یورپین لوگوں یا مغرب زدہ لوگوں کے لئے محلِ انکار باقی نہ رہے۔ مگر چونکہ یہ معنے جن کا میں ذکر کرنے لگا ہوں مسلمانوں سے خاص تعلق رکھتے ہیں میں نے اس لغت کا خاص طور پر حوالہ دیا ہے۔ یُوں یہ معنے اس لغت سے مخصوص نہیں بلکہ اس کے علاوہ تاج العروس وغیرہ بڑی لغت کی کتب میں بھی مذکور ہیں اور ادیب گروہ کی بھی کامل تائید اِن کو حاصل ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔ قِیْلَ ھُوَ نَھْرٌ فِی الْجَنَّۃِ یَتَشَعَّبُ مِنْھَا الْاَنْھَارُ۔ یعنی کوثر جنّت کی ایک نہر کو کہتے ہیں جس سے دوسری نہریں نکلتی ہیں وَقِیْلَ بَلْ ھُوَ الْخَیْرُ الْعَظِیْمُ اَعْطَاہُ اللّٰہُ الرَّسُوْلَ الْکَرِیْمَ۔ اور بعض کے نزدیک کوثر وہ خیرِ عظیم ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی۔ وَقَدْ یُقَالُ لِلرَّجُلِ السَّخِیِّ اَلْکَوْثَرُ اور کوثر سخی آدمی کو بھی کہا جاتا ہے۔

اقرب الموارد نے بھی علاوہ ان معنوں کے جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ یہ معنے بیان کئے ہیں کہ اَلسَّیِّدُ الْکَثِیْرُ الْخَیْرِ۔ ایسا سردار جو خیرِ کثیر والا ہو۔ اَلرَّجُلُ الْکَثِیْرُ الْعَطَاءِ وَالْخَیْرِ ایسا شخص جو بہت سخی ہو اور بڑی خیر والا ہو۔ گویا نَھْرٌ فِی الْجَنَّۃِ اور اَلْکَثِیْرُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ کے علاوہ کوثر کے ایک تیسرے معنے بھی ہیں جن کو مفسرین نے بھی تسلیم کیا ہے اور لغتِ قرآن والوں نے بھی تسلیم کیا ہے اور وہ یہ ہیں کہ اَلرَّجُلُ الْکَثِیْرُ الْعَطَاءِ وَالْخَیْرِ۔ ایسا آدمی جس میں عطاء و خیر کثرت سے پائی جاتی ہو اور جو انتہا درجہ کا سخی انسان ہو۔ پس اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ کے ایک معنے یہ ہوئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت میں سے ایک ایسا شخص پیدا ہوگا جو کثیر العطاء والخیر ہوگا۔ ان معنوں کے رُو سے اس آیت کی یہ صورت ہوگی کہ اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ رَجُلًا کَثِیْرَ الْعَطَاءِ وَالْخَیْرِ۔ ہم تجھے ایک ایسا آدمی دیں گے جس میں عطاء و خیر کثرت سے پائی جائے گی۔ اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ اور فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ کے الفاظ سے جن کی تشریح آگے کی جائے گی۔ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ شخص جو آپ کو دیا جائے گا آپ کا روحانی فرزند ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتا کہ ایک شخص ظاہر ہونے والا ہے بلکہ وہ فرماتا ہے اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ ہم نے تجھ کو بخشا ہے اور جو کسی کو بخشا جاتا ہے وہ اُس کا غلام ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کے لحاظ سے دو نام تھے۔ آپ کا نام احمدؐ بھی تھا اور آپ کا نام محمدؐ بھی تھا

اب اِنَّا اَعْطَیْنٰكَ الْکَوْثَرَ میں "كَ" کی جگہ احمد رکھ دو تو آیت یوں بن جائے گی۔ اِنَّا اَعْطَیْنَا اَحْمَدَ ہم نے بخشا ہے احمد کو اور چونکہ بخشا جانے والا وجود غلام کہلاتا ہے۔ پس دوسرے لفظوں میں یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ایک غلامِ احمد دنیا میں آئیگا جو کثیر العطاء والخیر ہوگا۔ اس آنیوالے وجود کا آپ کے غلاموں میں سے ہونا اوّل تو اِنَّا اَعْطَیْنٰكَ کے الفاظ سے ہی ظاہر ہوتا ہے کیونکہ دے دینے کا دو ہی لفظوں میں ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ یا تو یہ ترجمہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ آپ کا صُلبی بیٹا ہوگا اور یا یہ ترجمہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ آپ کا روحانی فرزند یعنی غلام ہوگا۔ اور چونکہ سورۂ احزاب میں صلبی بیٹے کی نفی کی گئی ہے اس لئے صرف یہ معنے رہ گئے کہ وہ آپ کا روحانی فرزند یعنی غلام ہوگا۔ اگلی آیت بھی اسی مفہوم کو واضح کرتی ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ہم تجھے غلامِ احمد بخشنے والے ہیں اس کے نتیجہ میں تُو دعائیں کر اور قربانیاں دے۔ قربانیاں اور دعائیں ہمیشہ بیٹے کی پیدائش پر کی جاتی ہیں۔ چنانچہ جب کسی کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسلامی تعلیم کے مطابق اُس کا سر مونڈا جاتا ہے، قربانی کا بکرا بطور عقیقہ دیا جاتا ہے اور کچھ صدقہ خیرات بھی کیا جاتا ہے گویا دعا بھی ہوتی ہے اور قربانی بھی ہوتی ہے۔ پس فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہاں کسی روحانی بیٹے کا ذکر ہے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ایسا آدمی ملنے کے یہ معنے ہیں کہ وہ آپ کی روحانی اولاد میں سے ہوگا۔ صرف ظاہری خادم نہیں ہوگا کیونکہ مادی خادم کے متعلق یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے آقا کے طریق کا بھی پابند ہو۔ جیسے کئی لوگ مسلمان ہوتے ہیں لیکن وہ کسی ہندو یا عیسائی کو بھی خادم رکھ لیتے ہیں۔ پس خادم کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے آقا کے طریق کا بھی پابند ہو۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اِنَّ اللّٰهَ لَيُؤَيِّدُ هٰذَا الدِّيْنَ بِالرَّجُلِ

الْفَاجِرِ (بخاری کتاب المغازی) بعض دفعہ ایک فاجر انسان کے ذریعہ بھی اللہ تعالےٰ اپنے دین کی تائید کا کام لے لیتا ہے۔ مگر اس سے مراد دنیوی تائید ہے دینی تائید نہیں کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ دینی تائید کے مستحق دینداروں کو اللہ تعالےٰ چھوڑ دے اور کسی بے دین کو اس کیلئے چن لے۔ پس اس امداد سے مراد مالی مدد یا لڑائی وغیرہ میں مدد ہو سکتی ہے دینی مدد نہیں۔

یہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو چونکہ یہ خوشخبری دی گئی ہے کہ وہ آنے والا صرف آپ کا خادم نہیں ہوگا بلکہ آپ کی روحانی اولاد میں سے ہوگا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے یہ الفاظ بھی رکھ دئے کہ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ تُو دعائیں کر اور قربانیاں دے۔ یعنی جس طرح بیٹے کی پیدائش پر شکریہ کے طور پر دعائیں کی جاتی ہیں اور عقیقہ میں قربانی کی جاتی ہے اسی طرح یہ جو تیسرا روحانی خادم ظاہر ہونے والا ہے اُس کی آمد پر بھی تُو خدا تعالےٰ کا شکریہ ادا کر اور اُس کے حضور میں قربانیاں گزار۔ اس آیت میں ان لوگوں کا بھی ردّ ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اُمتِ محمدیہ کی اصلاح کے لئے جس شخص کے آنیکا وعدہ ہے وہ باہر سے آئے گا۔ اُمتِ محمدیہ میں سے نہیں ہوگا کیونکہ یہ آیت بتا رہی ہے کہ جس شخص کا یہاں ذکر ہے وہ اِسی اُمت میں سے ہوگا باہر سے نہیں آئے گا۔ مسلمانوں میں یہ غلط خیال پھیل گیا ہے کہ آخری زمانہ میں جس آنے والے کی پیشگوئی کی گئی ہے اُس سے مراد حضرت مسیح ناصریؑ ہیں۔ حالانکہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہی آنا تھا جو اُمتِ موسوی کے ایک فرد تھے۔ تو پھر اِنَّا اَعْطَیْنٰكَ الْکَوْثَرَ نہیں کہنا چاہیئے تھا بلکہ اِنَّا اَعْطَیْنَا مُوْسٰی الْکَوْثَرَ کہنا چاہیئے تھا حضرت عیسیٰؑ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملے تھے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو نہیں ملے تھے۔ مگر یہاں خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّا اَعْطَیْنٰكَ الْکَوْثَرَ ہم نے تجھے کوثر بخشا ہے۔

تو دعائیں کر۔ تو عقیقہ اور قربانیاں کر۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ کوثر سے مراد محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا روحانی بیٹا ہے کیونکہ عقیقہ اور قربانیاں اور دعائیں اپنے بیٹے کی پیدائش پر کی جاتی ہیں کسی غیر کے بیٹے کیلئے نہیں کی جاتیں۔

اوپر کے استدلال پر دو اعتراض ہو سکتے ہیں اول یہ کہ اگر إِنَّآ أَعْطَيْنَٰكَ ٱلْكَوْثَرَ میں کسی موعود کا ذکر ہے تو کیوں نہ سمجھا جائے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوا کوئی اور ہے یعنی ہم یہ کیوں مانیں کہ اس پیشگوئی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہی ذکر ہے کسی اور کا ذکر نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی واضح پیشگوئی ایک آنیوالے مسیح اور مہدی کے متعلق احادیث میں موجود ہے آپ فرماتے ہیں کہ آخری زمانہ میں مسیح اور مہدی پیدا ہوگا جو اُمّتِ محمدیہ کی اصلاح کرے گا۔ اب یا تو یہ پیشگوئی ایک شخص کے متعلق ہے یا دو شخصوں کے متعلق ہے جو ایک ہی زمانہ میں آئیں گے۔ ہمارے نزدیک یہ ایک ہی شخص کے متعلق پیشگوئی ہے جو مسیح بھی ہوگا اور مہدی بھی۔ اور عام مسلمان اسے دو شخصوں پر چسپاں کرتے ہیں۔ بہرحال یہ پیشگوئی خواہ ایک فرد کے متعلق ہو جو ہمارے نقطۂ نگاہ سے مسیح بھی ہوگا اور مہدی بھی۔ یا عام مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ کے مطابق دو شخصوں کے متعلق ہو۔ جو ایک ہی زمانہ میں ظاہر ہوں گے اور جن میں سے ایک مسیح ہوگا اور دوسرا مہدی۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلامی لٹریچر میں اتنی بڑی پیشگوئی اسلامی زمانہ کے کسی اور شخص کی نسبت نہیں اور جب ان کے علاوہ کوئی اور شخص ایسا ہے ہی نہیں جس کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی پیشگوئی کی ہو تو ثابت ہوا کہ جس شخص کا قرآن کریم میں ذکر آتا ہے وہ بھی ان دونوں موعودوں میں سے کوئی ایک ہے اور یا پھر ہمارے عقیدہ کے مطابق وہی شخص ہے جو بیک وقت مہدی بھی ہوگا اور مسیح بھی۔ ہم یہ نہیں مان سکتے کہ یہ پیشگوئی کسی غیر معروف شخص کے متعلق ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تو اس پیشگوئی کو اتنی عظمت دیتے ہیں کہ آپ فرماتے ہیں جب سے نبوت کا سلسلہ جاری ہوا ہے دنیا میں جتنے بھی انبیاء آئے ہیں وہ سب کے سب اُس بڑے فتنے کی خبر دیتے آئے ہیں جو آخری زمانہ میں ظاہر ہوگا اور یہ ایک فطرتی امر ہے کہ جتنا بڑا فتنہ ہوگا اُس کو دور کرنے والا بھی اتنا ہی بڑا انسان ہوگا۔ بہرحال رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے سارا زور اُس آخری زمانہ میں آنے والے کے متعلق دیا ہے اور احادیث اِن پیشگوئیوں سے بھری پڑی ہیں۔ اگر کوثر سے کوئی غیر معروف آدمی مراد لیا جائے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جس شخص کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے اس کے متعلق خدا تعالیٰ خاموش ہے اور جس کے متعلق خدا تعالیٰ نے خبر دی اُس کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم خاموش ہیں اور یہ عقل کے خلاف ہے۔ بہرحال رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی اُسی چیز پر زور دے سکتے تھے جس پر خدا تعالےٰ نے زور دیا اور خدا تعالےٰ بھی اُسی خبر کی تائید کر سکتا تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دی پس کوثر کے لفظ میں جو پیشگوئی ہے وہ اُسی کے متعلق سمجھی جا سکتی ہے جسے مسیح اور مہدی کہا گیا ہے۔

(۲) دوسری دلیل ان معنوں کی تائید میں یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا جو سورۃ بقرہ میں آتی ہے اور جس کا یہ جواب ہے۔ وہ یہ تھی کہ اے اللہ تو اسمٰعیل (علیہ السلام) کی اولاد میں سے ایسا انسان پیدا کر جو يُعَلِّمُهُمُ ٱلْكِتَٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ کا مصداق ہو۔ یہ دعا جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق کی گئی تھی درحقیقت اُس دعا کے مقابل میں تھی جو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دوسرے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام کے متعلق کی تھی اور جس کا بائبل میں ذکر آتا ہے بس

دعا کے طفیل حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں موسوی سلسلہ چلا جس کی پہلی کڑی حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے اور آخری کڑی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ اب ضروری تھا کہ حضرت اسحٰق اور حضرت اسمٰعیل کا توازن قائم رکھنے کے لئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں بھی کوئی ایسا انسان ہوتا جو حضرت موسیٰ کا جواب ہوتا اور کوئی ایسا انسان ہوتا جو حضرت عیسیٰؑ کا جواب ہوتا بلکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی اور اُن سے کئے گئے وعدوں کی بڑی شان کو دیکھتے ہوئے دونوں اسمٰعیلی موعود اپنے مثیلوں سے بڑھ کر ہوتے۔ چنانچہ اسی امر کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل کے خاندان سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مثیل تھے مگر شان میں اُن سے بڑھ کر اور پھر آپ کے ذریعہ سے ایک اور مامور کی خبر دلوائی جو مسیح کا نام پانے والا تھا جس طرح کہ قرآن کریم میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو موسیٰ علیہ السلام کا نام دیا گیا تھا اور آپؐ نے اس موعود کے بارہ میں یہاں تک فرمایا کہ کَیْفَ تَھْلِكُ اُمَّـةٌ اَنَا فِیْ اَوَّلِھَا وَالْمَسِیْحُ اٰخِرُھَا (ابن ماجہ) کہ وہ اُمّت ہلاک نہیں ہو سکتی جس کے شروع میں مَیں ہوں اور جس کے آخر میں مسیح ہوگا۔ گویا وہی چیز جو حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں موسوی سلسلہ کو دی گئی تھی وہ آپ کو بھی ملی اور بنو اسمٰعیل اور بنو اسحاق کے دو سلسلوں میں کامل مشابہت بھی پیدا ہوگئی اور بنو اسمٰعیل کو فضیلت بھی حاصل ہوگئی غرض حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد کے بارہ میں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی تھی اُس کے نتیجہ میں موسوی سلسلہ چلا جس کی بنیاد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رکھی اور خاتمہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہُوا۔ اسی طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کے بارہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا کی تھی اس کے نتیجہ میں محمدی سلسلہ چلا جس کی بنیاد محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رکھی اور آخری زمانہ میں مسیح ثانی یا مسیح موعود کی بعثت کی خبر دی گئی تا مماثلت مکمل ہو جائے۔ پس اس آیت میں ایک سخی اور بہت بڑی خیر کے مالک غلام یا فرزند عطا کئے جانے کی جو خبر دی گئی ہے اس سے مراد یہی ہے کہ **محمدی سلسلہ کی مشابہت موسوی سلسلہ سے ثابت** کرنے کے لئے بہ آخری کڑی زنجیر کی بھی ضرور مکمل ہو کر رہے گی بلکہ موسوی سلسلہ کے نقش آخر سے محمدی سلسلہ کا نقش آخر زیادہ نمایاں، زیادہ شاندار اور زیادہ موجب مسرّت و خوشی اور نیک انجام ہوگا۔

۳۱۱ مسیح موعود کے آنے میں موسوی سلسلہ اور محمدی سلسلہ میں مشابہت

تیسری دلیل اِن معنوں کی تائید میں یہ ہے کہ اس آیت میں ایک معطار یعنی بہت بڑے صدقہ دینے والے اور سخاوت کرنے والے وجود کی پیشگوئی ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں بھی ایک ایسے ہی شخص کی خبر دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص اور اس آیت میں بیان کردہ شخص ایک ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ پیشگوئی کی علامات اگر مشترک ہوں تو مشارٌ الیہ بھی ایک ہی شخص ہو سکتا ہے جبکہ دونوں پیشگوئیاں ایک ہی سلسلہ اور ایک ہی زمانہ کے متعلق ہوں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبر کے الفاظ یہ ہیں وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَیُوْشِکَنَّ اَنْ یَّنْزِلَ فِیْکُمُ ابْنُ مَرْیَمَ حَکَمًا عَدْلًا فَیَکْسِرُ الصَّلِیْبَ وَ یَقْتُلُ الْخِنْزِیْرَ وَیَضَعُ الْجِزْیَۃَ وَیُفِیْضُ الْمَالَ حَتّٰی لَا یَقْبَلَہٗ اَحَدٌ (بخاری) حدیث کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنی اُمّت کے آخری زمانہ میں آنے والے مسیح کے بارہ میں خبر دیتے ہیں کہ وہ اموال لٹائے گا۔ ان الفاظ کو اور کوثر کے معنوں کو آمنے سامنے رکھو تو دونوں الفاظ بالکل ہم معنے ہیں۔ "مال لٹانیوالا" اور "بے انتہا صدقہ و خیرات کرنیوالا" دونوں الفاظ صاف طور پر ایک ہی وجود پر دلالت کرتے ہیں اور چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی میں اُس شخص کی تعیین بھی کر دی گئی ہے۔ اس تعیین کو ہم سورۃ کوثر کی پیشگوئی پر

چسپاں کرنے پر مجبور ہیں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعیین کے مطابق "کوثر" کی خبر کا مصداق مسیح موعود کو قرار دینے میں نہ صرف حق بجانب ہیں بلکہ اس کے سوا ہمارے لئے اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہی مہبطِ وحیٔ قرآن ہیں اور آپ سب سے اوّل حقدار ہیں کہ قرآن کریم کے معنے کریں۔ پس جب آپ نے اُمّتِ اسلامیہ میں آخری زمانہ میں ظاہر ہونے والے مسیح کو اموال لٹانے والا وجود قرار دیا ہے تو سورۂ کوثر میں کوثر کے لفظ سے جس بہت سخاوت کرنے والے روحانی فرزند کی خبر دی گئی ہے اس سے بھی مسیح محمدی ہی مراد لیا جائے گا۔

شاید اس جگہ کوئی سوال کرے کہ کیا کوئی ایسا شخص ہو سکتا ہے جو لوگوں کو اموال دے اور کوئی قبول نہ کرے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی پیشگوئی میں تو صرف کوثر کا لفظ ہے یعنی بڑا سخی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اِس کے ساتھ یہ بات زائد فرمائی ہے کہ وہ سخی مال لٹائے گا مگر لوگ اُسے قبول نہ کریں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی پیشگوئی سے بعض لوگوں نے غلط معنے لینے تھے (نادانوں نے نہ کہ عقلمندوں نے) اِس لئے ایسے کوتہ اندیشوں کے سمجھانے کے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ تشریح زائد کر دی تا سورۂ کوثر کی پیشگوئی کو اس تشریح کے ساتھ ملا کر لوگ ٹھوکر سے بچ جائیں اور وہ اس طرح کہ جن خزانوں کو لوگ ردّ کرتے ہیں وہ روحانی خزانے ہوتے ہیں مادی نہیں۔ پس اموال کے ردّ کرنے کے الفاظ نے سورۂ کوثر کی تشریح کی ہے کہ اس میں جس بڑے سخی آدمی کی خبر دی گئی ہے وہ سونے چاندی کے سکّے نہیں تقسیم کرے گا جن کو لینے سے لوگ عام طور پر انکار نہیں کرتے۔ بلکہ وہ رُوحانی خزانے تقسیم کریگا جن کے قبول کرنے سے اکثر لوگ انکار کیا کرتے ہیں۔ روحانی علوم اور معارف کو خزانوں یا اموال سے مشابہت دینا قدیم سُنّت الہامی کتب کی ہے اور انبیاء کا محاورہ ہے۔ چنانچہ انجیل میں آتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے پاس اُن کے دشمن آئے اور کہا کہ روم کا بادشاہ اُن سے خراج طلب کرتا ہے وہ اُسے دیں یا نہ دیں؟ اس پر حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا کہ وہ کیا چیز طلب کرتا ہے وہ مجھے دکھاؤ۔ انہوں نے رومی سکّہ دکھایا جس پر رومی قیصر کی تصویر تھی۔ حضرت مسیحؑ نے کہا کہ یہ تو مال ہی اُس کا ہے جو اس کا مال ہے وہ اُسے دو اور جو خدا کا مال ہے وہ اُسے دو۔ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیحؑ روحانیت اور روحانی علوم کو اموال اور خزانہ سے تشبیہہ دیتے تھے اور روحانیت کا مالیہ اپنی قوم سے طلب کرتے تھے مگر اُن کی تمثیلی زبان کی وجہ سے اُن کے مخالف یہ سمجھتے تھے کہ یہ سرکاری ٹیکس خود طلب کرتا ہے اور حکومت کا مخالف ہے اور اس بات کو پختہ کرنے اور حکومت کا مجرم ثابت کرنے کے لئے وہ اُن کے پاس گئے اور اس رنگ میں سوال کیا کہ مالیہ ہم رومی حکومت کو دیں یا آپ کو دیں۔ حضرت مسیحؑ انکی شرارت کو سمجھ گئے اور انہوں نے اپنے مالیہ کی تشریح اس طرح کر دی کہ سکّہ پر تو رومی قیصر کی تصویر ہے یہ تو ہے ہی اُسی کا حق۔ میں اس سکّہ کا مطالبہ کس طرح کر سکتا ہوں۔ میں تو وہ مال طلب کرتا ہوں جس پر آسمانی حکومت کی مہر ہے یعنی میں تو روحانی قربانیوں اور عرفان کا مطالبہ کرتا ہوں۔ اس تمام واقعہ سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام عام طور پر اموال اور سکّوں کا لفظ روحانی معنوں میں استعمال کرتے تھے اور یہ ایک بلیغ اور فصیح کلام کی شان ہے کہ جب اُس نے مسیح علیہ السلام کے ایک بروز اور مثیل کی خبر دی تو اُس نے اُس کی خبر دیتے وقت اُسی زبان کو استعمال کیا جسے مسیح ناصری خود استعمال کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم میں بھی خزانہ کا لفظ ظاہری دولت کے سوا دوسری اشیاء کے لئے استعمال ہوا ہے چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرماتا ہے قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (ع۱۱)

اِس آیت سے پہلے مذہبی امور کا ذکر ہے اور کلام الٰہی کے نزول اور بعثتِ انبیاء پر بحث کی گئی ہے۔ پس اموال وخزائن میں اول نمبر پر کلام الٰہی اور روحانی علوم مراد ہیں۔ اِسی طرح سورۂ طور میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق بحث کرتے ہوئے فرماتا ہے اَمْ عِنْدَ هُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ (ع۲) یعنی اپنے انعامات اور روحانی کمالات اور اسرارِ روحانیہ کا بخشنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے اُن کا نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے اِن اموال کے ذخیرے اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے ہیں اُن کو نہیں دئے ہوئے۔ پس یہ کون ہیں جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس مقام پر فائز ہونے پر معترض ہے کیا یہ خدا تعالےٰ کے روحانی خزانوں پر قابض ہیں کہ جس کو یہ چاہیں وہ خزانے دینگے دوسروں کو نہ مل سکیں گے۔

اُوپر کے حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ کتبِ سماویہ اور محاورۂ انبیاء میں علومِ روحانیہ کو اموال یا خزانہ کہا جاتا ہے اور درحقیقت خزانہ تو ہے ہی وہی۔ حضرت مسیحؑ نے فرمایا ہے تم روٹی سے زندہ نہیں رہتے جو کھاتے ہو بلکہ تم کلام الٰہی سے زندہ رہتے ہو (متی باب ۴ آیت ۵) پس کوثر کی پیشگوئی اور مسیحؑ کے خزانہ لٹانے کے اصل معنے یہ ہیں کہ وہ آنے والا علوم ومعارف کے خزانے لٹائیگا۔ مگر لوگ جیسا کہ سب ماموروں کے وقتوں میں ہوتا چلا آیا ہے اس کے بھیجے ہوئے خزانوں کو قبول کرنے سے انکار کریں گے۔

اُوپر کوثر کے ایک معنے اَلْخَيْرُ الْكَثِيْرُ کے بھی بتلائے جاچکے ہیں اور خیر کا لفظ اسلام اور دین کے معنوں میں ہی آتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک الہام بھی ہے کہ اَلْخَيْرُ كُلُّهٗ فِي الْقُرْاٰنِ تمام قسم کی خیر اور بھلائی قرآن کریم میں ہی ہے۔ پس جو شخص قرآنی معارف لٹاتا ہے وہ بالفاظ دیگر خیر تقسیم کرتا ہے اور یہی کام مسیح موعودؑ کا بتایا گیا تھا۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ قرآنی دولت اِس قدر لٹائی ہے کہ جس کا کوئی انتہا نہیں۔ اِس دولت کا انکار غیروں نے تو کرنا ہی تھا خود مسلمانوں نے بھی بدقسمتی سے اس کو لینے سے انکار کر دیا۔ وہ لوگ جنہوں نے اس دولت کو نہیں لیا وہ اس کی عظمت کو کیا سمجھ سکتے ہیں ہم لوگ جنہوں نے اِس دولت کو قبول کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کی کیا عظمت ہے اور کتنی قیمتی اور بیمثال چیز ہے۔ ہم نے تو اس دولت سے اس قدر حصہ پایا ہے کہ ہمارے گھر بھر گئے ہیں۔

مثلاً میرا اپنا وجود ہی ہے۔ دنیوی لحاظ سے مَیں پرائمری فیل ہوں۔ مگر چونکہ گھر کا مدرسہ تھا اس لئے اُوپر کی کلاسوں میں مجھے ترقی دے دی جاتی تھی۔ پھر مڈل میں فیل ہوا مگر گھر کا مدرسہ ہونے کی وجہ سے پھر مجھے ترقی دے دی گئی۔ آخر میٹرک کے امتحان کا وقت آیا تو میری ساری پڑھائی کی حقیقت کھل گئی اور مَیں صرف عربی اور اُردو میں پاس ہوا اور اِس کے بعد پڑھائی چھوڑ دی گویا میری تعلیم کچھ بھی نہیں۔ مگر آج تک ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے میرے سامنے قرآن کریم کے خلاف کوئی اعتراض کیا ہو اور پھر اُسے شرمندگی نہ ہوئی ہو بلکہ اُسے ضرور شرمندہ ہونا پڑا ہے اور اب بھی میرا دعویٰ ہے کہ خواہ کوئی کتنا بڑا عالم ہو سو اگر قرآن کریم کے خلاف میرے سامنے کوئی اعتراض کرے گا تو اُسے ضرور شکست کھانی پڑے گی اور وہ شرمندہ اور لاجواب ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ مَیں یوروپ بھی گیا ہوں، مَیں مصر بھی گیا ہوں، مَیں شام بھی گیا ہوں اور میں ہندوستان میں بھی مختلف علوم کے ماہرین سے ملتا رہا ہوں مگر ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے علمی اور مذہبی میدان میں خدا تعالےٰ کے فضل سے فتح نہ پائی ہو۔ بلکہ جب بھی انہوں نے مجھ سے کوئی گفتگو کی ہے انہیں ہمیشہ میری فوقیت اور میرے دلائل کی مضبوطی کو تسلیم کرنا پڑا ہے۔

محاورۂ انبیاء میں علوم روحانیہ کو اموال سے تشبیہ

ایک دفعہ کچھ لوگ مجھے ملنے کے لئے قادیان گئے۔ اُن میں سے ایک مسٹر لیوکس تھے جو اسوقت فورمن کرسچن کالج

کے پرنسپل تھے۔ بعد میں ہندوستانی طلباء نے انکی مخالفت کی کہ ہمیں انگریز پرنسپل نہیں چاہیئے اس لئے اُن کی جگہ مسٹر دتہ کو لگادیا گیا۔ اُن کے ساتھ مسٹر ہیوم بھی تھے جو وائی۔ ایم سی۔ اے کے سیکرٹری تھے اور مسٹر والٹر بھی تھے جو اُن کے لٹریری سیکرٹری تھے۔ میرے سامنے انہوں نے بعض سوالات کئے جن کا میں نے جواب دیا اور اُن کو ایسا شرمندہ کیا کہ مسٹر ہیوکس نے سیلون میں جاکر ایک تقریر کی جس میں اُنہوں نے کہا کہ عیسائیت اور اسلام کے درمیان جو جنگ جاری ہے اُس کا فیصلہ کسی بڑے شہر میں نہیں ہوگا بلکہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوگا جس کا نام قادیان ہے۔

مَیں ابھی چھوٹا سا تھا۔ میری عمر پندرہ سولہ سال کی ہوگی کہ مَیں نے رویا میں دیکھا کہ جیسے کوئی کٹورہ ہوتا ہے اور اُس کے اُوپر کوئی چیز آکر گرے تو اُس میں سے ٹن کی آواز نکلتی ہے اسی طرح اُس میں سے ٹن کی آواز آئی۔ پھر وہ آواز پھیلنی شروع ہوئی۔ پھر مجسّم ہوئی۔ پھر وہ ایک فریم بن گئی پھر اُس میں ایک تصویر بنی۔ پھر وہ تصویر متحرک ہوگئی اور اُس میں سے ایک وجود نکل کر میرے سامنے آیا اور اُس نے کہا مَیں خدا تعالیٰ کا فرشتہ ہوں اور میں آپ کو سورۃ فاتحہ کی تفسیر سکھانے کے لئے آیا ہوں۔ میں نے کہا سکھاؤ۔ اُس نے سورۃ فاتحہ کی تفسیر مجھے سکھانی شروع کی جب وہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پر پہنچا تو کہنے لگا۔ آج تک جتنی تفسیریں لکھی ہیں وہ اس آیت سے آگے نہیں بڑھیں۔ کیا میں آپ کو آگے بھی سکھاؤں۔ مَیں نے کہا۔ ہاں۔ چنانچہ اُس نے مجھے اگلی آیات کی بھی تفسیر سکھادی۔ میری عمر اُسوقت پندرہ سال کی تھی اور اب اس رؤیا پر چالیس سال گذر گئے ہیں۔ اِس عرصہ دراز میں جو علوم خدا تعالیٰ نے مجھے سورۃ فاتحہ سے سکھائے ہیں اُن کے ذریعہ میں خدا تعالیٰ کے فضل سے ہر مذہب کا رد اس سورت سے کرسکتا ہوں اور پھر میرا دعویٰ ہے کہ سورۃ فاتحہ میں دنیا کی تمام اقتصادی تھیوریوں کا جواب موجود ہے خواہ وہ بالشوزم ہو یا کیپٹل ازم ہو یا کوئی اَور ہو

میں نے بچپن کے ایام میں ہی یہ رؤیا سب لوگوں کو سُنادیا تھا اور اُنہیں بتادیا تھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے سورۃ فاتحہ کی تفسیر سکھائی ہے۔ ایک دفعہ ہم امرتسر گئے۔ ہمارے سکول کا خالصہ کالج امرتسر سے میچ ہوا جس میں ہم نے خالصہ کالج امرتسر کو شکست دی۔ ہمارے لڑکے اچھے فٹ بال کھیلنے والے تھے۔ ویسے تو وہاں احمدیت کی بہت مخالفت تھی مگر ایسے مواقع پر مختلف فرقے اکٹھے ہوجایا کرتے ہیں۔ جب ہماری ٹیم سکھوں کے مقابلہ میں جیت گئی تو وہاں کے دوسرے مسلمانوں کو بھی بہت خوشی ہوئی اور انجمن اسلامیہ امرتسر نے ہمیں ایک پارٹی دی میں اس ٹیم میں شامل نہیں تھا۔ صرف میچ دیکھنے کے لئے ساتھ چلا گیا تھا لیکن تھا طالب علم ہی۔ پارٹی کے بعد انہوں نے مجھے کہا کہ آپ کوئی تقریر کریں۔ مَیں نے اس سے پہلے عام مجلس میں کبھی تقریر نہیں کی تھی۔ مدرسہ میں تقریریں کی تھیں۔ مگر وہاں بڑے بڑے لوگ بیٹھے تھے اور شہر کے رؤسا موجود تھے اِس لئے میں نے عذر کیا اور کہا کہ اس وقت مَیں تیار نہیں۔ انہوں نے کہا کچھ بھی ہو آپ کسی موضوع پر تقریر کردیں مَیں نے دُعا کی کہ خدایا تُو نے اپنے فرشتہ کے ذریعہ مجھے سورۃ فاتحہ کی تفسیر سکھائی ہے اور اس کے یہ معنے ہیں کہ مجھے ہمیشہ اس سورۃ کے نئے معنے معلوم ہوتے رہیں گے اور میں اس کا لوگوں میں اظہار کرچکا ہوں۔ اب امتحان کا وقت ہے۔ تُو مجھے اپنے فضل سے کوئی ایسا مضمون سمجھا جو اس سے پہلے کسی کے ذہن میں نہ آیا ہو۔ اِس دُعا کے بعد میں نے تقریر شروع کی اور یکدم خدا تعالیٰ نے میرے دماغ میں ایک ایسا مضمون ڈالا جو آج تک کسی تفسیر میں بیان نہیں ہوا۔ مَیں نے کہا خدا تعالیٰ نے ہمیں سورۃ فاتحہ میں ایک دعا سکھاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اے خدا نہ ہم مغضوب بنیں اور نہ ضال بنیں۔ احادیث سے ثابت ہے کہ مغضوب علیہم سے مراد یہودی ہیں اور ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں۔ پس ہم سے یہ دعا کروائی گئی ہے

کہ اے خدا تُو ہمیں یہودیوں اور عیسائیوں کے نقش قدم پر
چلنے سے بچا۔ دوسری طرف اس بات پر تمام لوگوں کا اتفاق
ہے کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور پھر یہ ابتدائی سورتوں
میں سے ایک ہے۔ اب یہ ایک عجیب بات ہے کہ جب یہ سورۃ
نازل ہوئی تھی۔ اُس وقت نہ یہودی آپ کے مخالف تھے نہ عیسائی۔
آپ کے مخالف صرف مکہ کے مشرکین تھے اور اس وقت آپ کو
دُعا یہ سکھانی چاہیئے تھی کہ اے اللہ ہمیں مشرک نہ بنا۔ مگر بجائے
اس کے قرآن کریم دعا یہ سکھاتا ہے کہ اے اللہ ہمیں یہودی اور
عیسائی نہ بنا۔ اس میں کیا راز ہے اور کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ
نے مشرکین کا تو ذکر نہ کیا جن کی مخالفت کا مکہ میں شدید زور
تھا اور یہود و نصاریٰ کا ذکر کر دیا جو وہاں آٹے میں نمک
کے برابر تھے۔ اس میں یہ راز ہے کہ قرآن کریم کا نازل کرنے والا
عالم الغیب خدا جانتا تھا کہ اس کی تقدیر کے ماتحت مکہ کا
مذہب ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیا جانے والا تھا اور آئندہ زمانہ
میں اس کا نام و نشان تک نہ ملنا تھا۔ پس جو مذہب ہی مٹ
جانا تھا اُس سے بچنے کی دعا سکھانے کی ضرورت ہی نہ تھی
جو مذاہب زندہ رہنے تھے اور جن سے رُوحانی یا مادی رنگ میں
اسلام کا ٹکراؤ ہونا تھا اُن کے بارہ میں دعا سکھا دی گئی۔
پس کفار کا ذکر ترک کر کے اس سورۃ میں کفار مکہ کے مذہب کے تباہ
ہونے اور یہودیوں اور مسیحیوں کا ذکر کر کے ان دو مذاہب کے
قائم رہنے کی پیشگوئی کی گئی ہے جسے بعد کے واقعات نے
نہایت روشن طور پر ثابت کر دیا ہے۔ پس اس سورۃ کے ذریعہ
سے ابتدائی ایام نبوت میں ہی اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کی کامل
تباہی کا اس سُورۃ میں اعلان فرما دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ آئندہ
اسلام کا خصوصیت سے مقابلہ یہود اور نصاریٰ سے ہوگا اس
لئے انہی کی شرارتوں سے تمہیں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیئے
اور اس طرح قرآن کریم کی صداقت کا ایک عظیم الشان ثبوت
سورۃ فاتحہ میں مہیا کر دیا گیا۔ یہ نکتہ اللہ تعالیٰ نے اُس
وقت میرے دل میں ڈالا اور واقعہ یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ سے
یہ استدلال ایسا عجیب ہے کہ اس سے پہلے کبھی کسی مفسر کا
ذہن اس طرف نہیں گیا۔ اس کے بعد اور بھی سینکڑوں مضامین
مجھے سورۃ فاتحہ سے سمجھائے گئے اور میرا دعویٰ ہے کہ اگر مجھ پر
کوئی اعتراض کیا جائے اور مجھے اس وقت کوئی اور آیت یاد نہ
ہو تو خدا تعالیٰ مجھے اِس سورت سے ہی اُس کا جواب سمجھا دیگا۔
یہ وہ خزانہ ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیں
دیا اور جس سے ہمارے گھر بھر گئے۔ مگر افسوس کہ دوسرے
مسلمان اس دولت کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔

چوتھی دلیل ان معنوں کی تائید میں یہ ہے کہ آیۃ الکوثر
کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ وہ آنیوالا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
کا روحانی بیٹا ہوگا کیونکہ اَعْطَیْنٰکَ کے الفاظ کا مفہوم
یہی ہوسکتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے کلام میں بھی ایک روحانی بیٹے کی خبر پائی جاتی ہے چنانچہ
احادیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت سلمان فارسیؓ رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے حضرت
سلمان فارسیؓ کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور فرمایا سَلْمَانُ مِنَّا
اَهْلَ الْبَیْتِ لَوْ کَانَ الْاِیْمَانُ عِنْدَ الثُّرَیَّا لَنَالَهٗ
رِجَالٌ اَوْ رَجُلٌ مِنْ هٰؤُلَاءِ (بخاری کتاب التفسیر سورۃ الجمعہ)
یعنی سلمان ہمارے اہل بیت سے ہے اگر کسی وقت ایمان ثریا
تک اُڑ گیا تو اُس کے خاندان کے لوگ اُسے وہاں سے واپس
لے آئیں گے۔ ظاہر ہے کہ سلمانؓ ایرانی النسل تھے اور رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے نہ تھے۔ اُن کو اولاد میں سے
قرار دینا روحانی رشتہ کی طرف ہی اشارہ کرتا ہے۔ پھر آپ کا
یہ کہنا کہ اس کی نسل یا خاندان کے لوگ ایمان کو آسمان سے
واپس لے آئیں گے۔ اس کے یہی معنے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ
علیہ وسلم کے روحانی فرزند اہل فارس میں سے ایک یا بعض وجود
ایسا کام کریں گے۔ چونکہ ایمان کے اُٹھنے کا زمانہ احادیث سے
مسیح اور مہدی کا زمانہ معلوم ہوتا ہے اس حدیث سے ظاہر ہے
کہ یہ فارسی الاصل ایمان لانیوالا شخص مہدی آخر زمان ہوگا اور

آیت کوثر میں مہدی ہی کی خبر دی گئی ہے اور اسے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا روحانی بیٹا قرار دیا گیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ پیشگوئی تو زیادہ سے زیادہ مہدی کی نسبت ثابت ہوتی ہے اور آپ آیت کوثر کو مسیح موعود پر چسپاں کرتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ابن ماجہ میں ایک حدیث آتی ہے کہ لَا الْمَهْدِيُّ اِلَّا عِيْسٰى یعنی مہدی اور عیسیٰ ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ یہ دو الگ الگ وجود نہیں اور کوثر کا لفظ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ایک ہی وجود ہوگا۔ یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ہم نے تجھے ایک وجود عطا کیا ہے۔ اگر دو الگ الگ وجود ہوتے تو اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ کی بجائے اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَيْنِ فرمانا چاہیئے تھا اور یہ کہنا چاہیئے تھا کہ ہم نے تجھے دو وجود جو کوثر ہیں عطا کئے ہیں۔ غرض ابن ماجہ کی روایت اور قرآن کریم کی یہ آیت دونوں کو ایک ثابت کرتی ہیں۔ دوسرے معطاء کا لفظ جس کے معنے بڑے سخی کے ہیں مہدی کی نسبت نہیں مسیح کی نسبت ہے پس جب قرآنی پیشگوئی میں معطاء کا نام رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے روحانی فرزند کو دیا گیا اور سخاوت کی پیشگوئی حدیث میں مسیح کی نسبت ہے تو ثابت ہوا کہ آنے والا ایک ہی شخص ہے۔ دو نہیں۔ تیسرے اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ آنے والا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا بیٹا ہوگا۔ مگر موسوی مسیح آپ کا بیٹا نہیں ہوسکتا وہ تو موسوی سلسلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ آنیوالا آسمان سے نہیں آئے گا اور جب مسیح نے بھی زمین سے ہی آنا ہے تو اُسے دوسرا وجود قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ چوتھے حدیث میں مہدی کو بھی آسمان سے آنے والا کہا گیا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَنَالَهٗ رَجُلٌ مِّنْ فَارِسَ اُس وقت دین کو ایک فارسی الاصل آدمی آسمان سے واپس لائے گا اور یہ پیشگوئی مہدی کے متعلق ہے۔ جب مہدی کو بھی اسلام نے آسمان سے آنے والا قرار دیا ہے تو پھر دو وجود

مسیح اور مہدی ایک ہی شخص ہے

قرار دینے کی کیا ضرورت ہے آسمان سے آنے ہی نے ساری مشکل پیدا کی تھی۔ جب مہدی کی نسبت بھی آسمان پر جانا اور پھر وہاں سے ایمان کو واپس لانا ثابت ہوا تو پھر مسیح بھی اُسی کو کہیں گے۔

ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہو کہ یہاں کوثر سے مراد سُنیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت ابوبکرؓ یا شیعوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت علیؓ کیوں نہیں ہوسکتے۔ اِسے مسیح اور مہدی پر ہی کیوں چسپاں کیا جاتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ (۱) یہاں آنے والے کے متعلق معطاء کا لفظ آتا ہے جس کے معنے بہت دینے والے کے ہیں اور یہ علم اِن دونوں کو نہیں مل سکتا۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں فتوحات تو شروع ہوگئی تھیں مگر دولت نہیں آئی تھی۔ دولت حضرت عمرؓ کے زمانہ میں آئی تھی۔ اِس لئے معطاء کا لفظ حضرت ابوبکرؓ پر چسپاں ہی نہیں ہوسکتا۔ باقی رہے حضرت عمرؓ سو اُن کو کوئی بھی حضرت ابوبکرؓ سے بڑا نہیں سمجھتا۔ اِس لئے یہ خیال بھی نہیں ہوسکتا کہ ممکن ہے معطاء حضرت عمرؓ ہی ہوں۔ پھر حضرت علیؓ کو بھی معطاء نہیں کہا جاسکتا۔ اِس لئے کہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں بجائے اور دولت آنے کے مسلمانوں کی پہلی دولت بھی جاتی رہی تھی۔ تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے زمانہ میں شام اور مصر نے بغاوت کر دی تھی اور یہ دونوں نہایت مالدار علاقے تھے اور انہی کی وجہ سے دولت آتی تھی۔ چونکہ یہ مالدار علاقے اُن کے قبضہ سے نکل گئے اس لئے حجاز کی ضروریات بھی اُنہیں بڑی مشکل سے پورا کرنی پڑتی تھیں۔ پس حضرت علیؓ بھی معطاء نہیں کہلا سکتے۔ دولت صرف حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں آئی تھی لیکن اُن کو سب سے بڑا نہ سُنی کہتے ہیں نہ شیعہ۔ علاوہ ازیں اس پیشگوئی کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ یہ پیشگوئی عالمِ اسلام کے بعد از آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے وجود کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہ وجود متفقہ عقیدہ کے مطابق مسیح اور مہدی کا ہے۔ مسیح اور مہدی کا ہی وہ زمانہ ہے کہ

جس کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نہ معلوم اُس زمانہ کے لوگ اچھے ہیں یا میرے زمانہ کے۔ اسی طرح آپ فرماتے ہیں کہ مہدی کے باپ کا نام میرے باپ کا نام ہوگا اور اُس کی ماں کا نام میری ماں کا نام ہوگا یعنی اُس کا مجھ سے کامل اتحاد ہوگا۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ مسیح میری قبر میں دفن ہوگا۔ مسلمان اس کے معنے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ظاہری طور پر آپ کی قبر میں دفن ہوگا حالانکہ یہ معنے بالبداہت باطل ہیں وہ کون بے حیا انسان ہوگا جو پھاوڑا لے کر کھڑا ہو جائیگا اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قبر کو کھود دے گا تا کسی اور کو اُس میں دفن کرے۔ کیا اُس پر بجلی نہیں گرے گی؟ درحقیقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ کلام استعارہ کا رنگ رکھتا تھا اور آپ کی مراد یہ تھی کہ اُس کا وجود اور میرا وجود کوئی الگ الگ چیز نہیں۔ اُسے اللہ تعالےٰ میرے پاس جگہ عنایت فرمائے گا۔ مگر بعض مسلمانوں نے اپنی نالائقی سے اس کے یہ معنے کرنے شروع کر دئے کہ نعوذ باللہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کو کھودا جائے گا اور اُس میں مسیح کو دفن کیا جائے گا۔

وہ معنے جو میں نے کئے ہیں قرآن کریم سے بھی ثابت ہیں چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (طور ع۱) یعنی جن لوگوں کی اولاد پاک ہوگی اُن کی اولاد کو بھی اپنے والدین کے پاس رکھا جائے گا۔ یہی مراد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تھی کہ وہ آنے والا آپ کا روحانی بیٹا ہوگا اور اُس کو آپ کے روحانی مقام کے پاس رکھا جائے گا۔ اولاد کا باپ کے پاس ہونا انسان کے لئے راحت اور خوشی کا موجب ہوتا ہے خواہ وہ اُس درجہ کی ہو یا نہ ہو۔

اسی طرح قرآن کریم میں آنے والے کا نام طارق رکھا گیا ہے اور طارق اُسے کہتے ہیں جو رات کے اندھیرے میں آئے یعنی وہ گمراہی اور تاریکی کے زمانہ میں آئیگا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ تو روشنی کی حالت میں آئے تھے وہ اس کے کس طرح مصداق ہو سکتے ہیں۔ غرض اس پیشگوئی کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ یہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد عالَمِ اسلام کے سب سے بڑے وجود کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو اُمّتِ محمدیہ میں ظاہر ہونے والا تھا۔ تبھی تو اُس کا نام کوثر رکھا گیا یعنی اُس کا وجود اُمّتِ محمدیہ کو دوسرے انبیاء کے سلسلوں پر فضیلت دے گا اور اُس کی آمد سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ کوثریت کا مقام بخشے گا۔ یعنی آپ کی اُمّت کو دوسری اُمّتوں پر برتری بخش دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک اُمّتِ محمدیہ میں کوئی ایسا وجود نہ ہو۔ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مستثنیٰ کرتے ہوئے باقی تمام رسولوں سے افضل ہو اُس وقت تک اُمّتِ محمدیہ دوسری اُمّتوں سے افضل ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ آپ سب سے بڑے رسول ہیں مگر بڑے آدمی کی اولاد ضروری تو نہیں کہ بڑی ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا لڑکا ایک عظیم الشان باپ کی اولاد میں سے تھا مگر خراب نکلا۔ پس یہ ضروری نہیں کہ اولاد ہمیشہ اپنے باپ جیسی ہو۔ اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت دوسری اُمّتوں سے اُسی وقت افضل ثابت ہو سکتی ہے جب اُس میں کوئی ایسا فرد پیدا ہو جائے جو آپ کا اُمّتی ہوتے ہوئے دوسرے تمام انبیاء سے افضل ہو اور جب کوئی ایسا آدمی پیدا ہو جائے گا تو خود بخود آپ کی اُمّت بھی افضل ثابت ہو جائیگی۔

غرض ان آخری معنوں کے رُو سے اس آیت میں مسیح اور مہدی کی جو ایک ہی وجود ہیں پیشگوئی کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہم آپ کو ایک روحانی بیٹا عطا کرنے والے ہیں جس کے پیدا ہونے پر آپ کی اُمّت دوسرے انبیاء کی اُمّتوں پر فضیلت پا جائے گی۔ کیونکہ وہ بیٹا آپ کی اُمّت سے ہوگا اور پہلے لوگوں سے افضل۔ پس اُس کی افضلیت سے آپ کی اُمّت کو فضیلت ملے گی یہی وہ نکتہ ہے جس کی وجہ سے رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَوْ كَانَ مُوسٰى وَعِيسٰى

حَیَّیْنِ لَمَا وَسِعَهُمَا اِلَّا اِتِّبَاعِیْ ۔ اگر موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام زندہ ہوتے تو وہ بھی میری اطاعت کرتے۔

اعتراض کرنے والے کہہ سکتے تھے کہ ان الفاظ میں یونہی ایک دعویٰ کر دیا گیا ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں اور حضرت عیسیٰؑ بھی۔ اب یہ کیونکر پتہ لگے کہ اگر وہ دونوں زندہ ہوتے تو آپ کی اطاعت کرتے۔ زندہ شخص کے ساتھ تو مقابلہ بھی ہو سکتا ہے لیکن مرنے والے کے ساتھ کیا مقابلہ ہو سکتا ہے اور کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے جو بات کہی ہے وہ درست ہے۔ یہ سوال اس حدیث کے متعلق طبعی طور پر پیدا ہوتا ہے اور اس کا حل اسی طرح ہو سکتا ہے کہ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں کوئی ایسا شخص ہو جو اپنے آپ کو آپؐ کا غلام کہے اور پھر موسےٰ اور عیسےٰ علیہما السلام سے افضلیت کا دعوےٰ کرے۔ پھر بے شک یہ ثابت ہو جائے گا کہ چونکہ آپ کی اُمت میں سے ایک ایسا آدمی پیدا ہو گیا ہے جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام سے افضل ہے اور پھر وہ آپ کا غلام ہے۔ اس لئے اگر موسےٰ اور عیسےٰ علیہما السلام واقعہ میں زندہ ہوتے تو وہ بھی آپ کے غلام ہی ہوتے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے کہ لَوْ کَانَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی حَیَّیْنِ لَمَا وَسِعَهُمَا اِلَّا اِتِّبَاعِیْ ہمارے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے اور آپ نے فرمایا کہ میں موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام سے افضل ہوں اور پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا کامل غلام ہوں مسلمان کہتے ہیں کہ حضرت مرزا صاحب نے یہ لکھ کر حضرت مسیحؑ کی توہین کی ہے کہ

ابن مریم کے ذکر کو چھوڑو ۔ اس سے بہتر غلام احمد ہے

حالانکہ یہ توہین نہیں بلکہ اس حدیث کی تشریح ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام دونوں زندہ ہوتے تو اُن کو میری اطاعت کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں ؎

ابن مریم کے ذکر کو چھوڑو ۔ اس سے بہتر غلام احمد ہے

میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں لیکن مجھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر فضیلت حاصل ہے اس دعویٰ سے نتیجہ نکلا کہ جب وہ شخص جو حضرت مسیح ناصریؑ سے افضل ہے وہ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہے تو اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے ۔ تو وہ کیوں نہ آپ کے غلام ہوتے۔ اسی طرح اگر ایک شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام سے افضل ہو کر پھر یہ کہتا ہے کہ میں آپ کا غلام ہوں تو یہ لازمی بات ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام خود ہوتے تو وہ بھی آپ کے غلام ہوتے۔ پس مسیح موعودؑ کا ایک ایک دعویٰ قرآنی آیات اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے عین مطابق ہے اور آپ ہی وہ وجود ہیں جن کی اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی تھی۔

اس جگہ ایک یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ یہاں ماضی کا صیغہ استعمال ہوا ہے اور اَعْطَیْنٰکَ کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ لڑکا اُس وقت مل چکا تھا پھر اس سے حضرت مرزا صاحب کس طرح مراد ہو سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو چیز یقینی طور پر ملنے والی ہو اُس کے لئے ماضی کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر ہم کسی کو کہیں کہ میں یہ چیز تمہیں ضرور دوں گا اور وہ کہے کہ آخر کب ملے گی تو ہم کہتے ہیں سمجھ لو کہ گویا مل گئی۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ نے یہاں ماضی کا صیغہ استعمال کر کے اس خبر کے یقینی ہونے پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ کوثر ہم تمہیں ضرور دیں گے اور اسے ایسی پکّی بات سمجھو کہ گویا یہ چیز تمہیں مل گئی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ میں یہ معنے ماننے کے لئے تیار نہیں تو ہم اُسے کہیں گے کہ تم جو کوثر کے معنے جنت کی نہر کے کرتے ہو تو کیا یہ اُس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مل چکی تھی؟ یہ کوثر بھی تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو آپ کی زندگی میں نہیں ملی تھی۔ اگر کہو کہ خدا تعالےٰ نے دے دی تھی گو اُس کا قبضہ بعد میں وفات پر ملے گا تو ہمارا جواب یہ ہے

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ

سو تُو (اُس کے شکریہ میں) اپنے رب کی (کثرت سے) عبادت کر اور اُسی کی خاطر قربانیاں کر ۳۵

کہ خدا تعالیٰ کی تقدیر نے بھی یہ بیٹا آپ کو دے دیا تھا گو اُس کا ظہور آخری زمانہ میں ہونا تھا۔

اِسی طرح بعض لوگوں نے کوثر سے مراد قرآن کریم کی برکات لی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی تھی کیا اُس وقت قرآن کریم کی تمام برکات آپ کو حاصل ہو گئی تھیں؟ یہ سورۃ تو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی تھی اور اُس وقت قرآن کریم ابھی پورے طور پر نازل ہی نہیں ہوا تھا۔ پھر اُس کی برکات آپ کو کیسے حاصل ہو گئیں۔ اس کا جواب یہی دیا جائے گا کہ چونکہ یہ قطعی بات تھی اور آپ کو قرآن کریم کے برکات ضرور ملنے تھے اس لئے یہاں ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ برکات تمہیں ضرور ملیں گی یا دوسرے لفظوں میں تم یہ سمجھ لو کہ یہ برکات گویا تمہیں مل گئی ہیں۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ اَعْطَیْنٰکَ کے الفاظ میں یہ نہیں کہا گیا کہ وہ لڑکا اُس وقت آپ کو مل چکا تھا بلکہ چونکہ اُس کا ظہور آخری زمانہ میں یقینی طور پر مقدر تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ماضی کا صیغہ استعمال کیا اور بتایا کہ خدا تعالیٰ کی ازلی مشیت نے یہ روحانی فرزند آپ کو دے ہی دیا ہے گو اُس کا ظہور ایک وقت کے بعد مقدر ہے۔

۳۵ حل لغات - صَلٰوۃ کے معنے نماز کے بھی ہوتے ہیں اور دعا کے بھی۔ فَصَلِّ میں جو فاء ہے یہ عربی زبان میں عطف یعنی اَور کے معنوں میں بھی آتی ہے اور عاقبت یعنی سو اس لئے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتی ہے جب اَور کے معنوں میں آئے تو بالعموم اس میں ترتیب مدنظر ہوتی ہے یعنی اس میں یہ اشارہ ہوتا ہے کہ فاء کے بعد جو کام ہوا ہے وہ پہلے بیان کردہ فعل کے بعد ہوا ہے۔ اِس جگہ فاء عاقبت کے معنوں میں استعمال ہوئی ہے اور مراد یہ ہے

کہ ہم نے تجھے کوثر بخشا ہے اس لئے تو نمازیں پڑھ اور قربانیاں دے۔ یا دعائیں کر اور قربانیاں پیش کر۔

(حاشیہ: ۲ اِنْحَرْ) نَحَرَ کے کئی معنے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں (۱) نَحَرَ الصَّلٰوۃَ۔ اور اس کے معنے صَلَّاهَا فِیْ اَوَّلِ وَقْتِهَا کے ہوتے ہیں یعنی اُس نے نماز اوّل وقت میں ادا کی۔ ہر نماز کے دو وقت ہوتے ہیں۔ ایک ابتدائی اور ایک انتہائی جیسے ظہر کی نماز ہے۔ زوال سے چند منٹ بعد ظہر کا وقت شروع ہوتا ہے اور اُس وقت تک چلا جاتا ہے جب تک سایہ سوا گنا نہ ہو جائے۔ پھر وہاں سے عصر کا وقت شروع ہوتا ہے اور اُس وقت تک چلا جاتا ہے جب تک دھوپ زرد نہیں ہو جاتی پھر سورج غروب ہونے کے بعد مغرب کی نماز کا وقت شروع ہوتا ہے اور اُس وقت تک چلا جاتا ہے جب تک شفق کی روشنی غائب نہیں ہو جاتی۔ پھر عشاء کا وقت شروع ہوتا ہے بعض کے نزدیک اس کا وقت ساڑھے بارہ بجے تک رہتا ہے اور بعض کے نزدیک عشاء کا وقت صبح کی نماز تک رہتا ہے۔ پھر پو پھٹنے کے بعد فجر کی نماز کا وقت شروع ہوتا ہے اور اُس وقت تک چلا جاتا ہے جب تک کہ سورج نہ نکلے۔ پس ہر نماز کا کچھ ابتدائی وقت ہوتا ہے اور کچھ آخری وقت ہوتا ہے۔

(حاشیہ: ۱ فَصَلِّ) فقہاء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کہ آیا نماز کا حقیقی وقت ابتدائی اور انتہائی اوقات کے درمیان چکر کھاتا ہے یا اوّل وقت حقیقی ہوتا ہے اور بعد میں نماز کی قضاء چلتی ہے بعض فقہاء کے نزدیک پہلا وقت ہی اصل وقت ہے اور پھر جتنی دیر ہوگی قضاء چلے گی۔ لیکن جب دوسری نماز کا وقت شروع ہو جائیگا تو پھر قضاء بھی نہیں ہوگی اور بعض فقہاء کے نزدیک پہلے وقت میں نماز پڑھ لینا بہتر ہے مگر اُس کا ابتدائی وقت اصل نہیں۔ یعنی اگر انسان ابتدائی وقت میں نماز پڑھ لے تو یہ زیادہ بہتر ہے

اور اگر آخری وقت میں پڑھے تو یہ جائز ہوگا۔ قضاء نہیں ہوگی وہ فقہاء جن کے نزدیک نماز کا اصل وقت ابتدائی ہے اور بعد میں نماز کی قضاء پڑھی جاتی ہے اُن کے نزدیک نماز کے ابتدائی پندرہ منٹ جس میں وہ خیال کرتے ہیں کہ نماز پڑھی جا سکتی ہے اگر گذر جائیں اور کوئی شخص فوت ہو جائے اس صورت میں کہ اُس نے اپنی نماز نہ پڑھی ہو تو وہ تارک نماز ہوگا کیونکہ اُسے موقعہ ملا اور اُس نے نماز نہ پڑھی اس لئے وہ گنہگار ہے۔ لیکن وہ فقہاء جو اس بات کے حق میں ہیں کہ آخری وقت میں بھی نماز پڑھنا جائز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ وقت لمبا تھا اور وہ ایسی حالت میں فوت ہُوا جبکہ نماز کا وقت ابھی باقی تھا اس لئے وہ گنہگار نہیں ہوگا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی سُنّت سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے سارے وقت کو ہی نماز کا وقت قرار دیا ہے۔ چنانچہ احادیث سے ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دفعہ دیدہ و دانستہ نماز کو آخری وقت میں ادا کیا۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی صحابی آپ کی مجلس سے اُٹھ کر نماز پڑھنی شروع کر دیتا۔ اس لئے کہ نماز میں دیر ہو رہی ہے۔ اُسے بہرحال انتظار کرنا پڑتا تھا۔ پس اگر یہ بات درست ہوتی کہ اگر کوئی شخص اوّل وقت یعنی نماز کے ابتدائی چند منٹ گزرنے کے بعد فوت ہو جائے اور وہ نماز نہ پڑھ سکے تو وہ گنہگار ہے۔ تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھے بیٹھے اگر کسی کا ہارٹ فیل ہو جاتا اور وہ اوّل وقت میں نماز نہ پڑھ سکتا تو وہ گنہگار ہوتا اور گنہگار بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے فعل کی وجہ سے ہوتا اور یہ عقل کے خلاف ہے۔ پس درحقیقت نماز کا سارا وقت ہی اصلی ہوتا ہے۔ اگر کوئی وقت کو پیچھے کرتا ہے تو وہ گنہگار نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ پہلے وقت میں نماز پڑھنے میں زیادہ برکت ہوتی ہے پس فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کے یہ معنے ہوئے کہ تُو اپنے رب کے حضور نماز پڑھ اور اوّل وقت میں پڑھ (۲) دوسرے معنے نَحَرَ کے یہ ہیں کہ

نماز کا اصل وقت

وَضَعَ يَمِيْنَهٗ عَلٰى شِمَالِهٖ۔ اُس نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھا یعنی نماز پڑھتے ہوئے جس طرح ہم ہاتھ باندھتے ہیں اس کو نحر کہتے ہیں۔ چاہے وہابیوں کی طرح اُوپر باندھے جائیں یا حنفیوں کی طرح نیچے باندھے جائیں۔ بہرحال دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھنے والا نحر کرنے والا کہلائیگا اور اس آیت کے یہ معنے کئے جائیں گے کہ تُو دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر نماز پڑھ (۳) تیسرے معنے نحر کے گردن سے نیچے اور سینہ سے اُوپر کے حصے کے ہیں اور وَانْحَرْ کے معنے ہوں گے تو سینہ کے اُوپر کے حصہ کو چھو یا اُسکے پاس ہاتھ رکھ۔ بعض محدثین اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ جو طریقہ محدثین میں نماز کے وقت ہاتھ رکھنے کا ہے وہی درست ہے مگر اس قسم کے استدلال بہت بودے اور کچے ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہم لوگ بھی اہل حدیث کی طرح نماز کے وقت سینہ پر ہاتھ رکھتے ہیں مگر اس وجہ سے کہ اکثر احادیث سے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اکثر تعامل سے یہ بات ثابت ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس آیت سے یہ مضمون نکلتا ہے۔ اس قسم کے استدلال ایک سچے امر کو تقویت نہیں پہنچاتے بلکہ مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں۔ (۴) ایک معنے نحر کے یہ ہیں کہ اِنْتَصَبَ بِنَحْرِهٖ اِزَاءَ الْقِبْلَةِ۔ وہ قبلہ رُو ہو کر کھڑا ہو گیا۔ (۵) پانچویں معنے اس لفظ کے یہ ہیں کہ اِنْتَصَبَ وَنَهَدَ صَدْرَهٗ۔ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا اور اُس نے اپنے سینہ کو تان لیا۔ یعنی اکڑ کر کھڑا ہو گیا اور اِدھر اُدھر نہ دیکھا۔ ان مختلف معنوں کے رُو سے فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کے معنے ہوں گے تو اپنے رب کے لئے جو ہمیشہ احسان کرتا ہے نماز پڑھ۔ اوّل وقت میں پڑھ۔ ہاتھ باندھ کر پڑھ۔ قبلہ رو ہو کر پڑھ اور اِدھر اُدھر نہ دیکھ یا تُو اپنے رب سے یقین، وثوق اور اعتماد کے ساتھ دعائیں کر۔

اُوپر کے معنوں کے علاوہ نحر کے معنے اونٹ کی قربانی کے بھی ہیں۔ یہ معنے اس لئے ہیں کہ اونٹ کو ذبح کرنے سے پہلے

اس کے منحر یعنی زیریں گردن میں نیزہ مارتے ہیں جس سے اس کی شاہ رگ سے یکدم خون نکلتا ہے اور اونٹ بے ہوش ہوکر گر پڑتا ہے۔ اس کے بعد اُسے ذبح کر لیا جاتا ہے اور چونکہ یہ لفظ اُونٹ یا اُونٹ جیسے بڑے جانوروں کی قربانی کے لئے بولا جاتا ہے۔ مثلاً زیبرا ہے اُس کا بھی اُونٹ پر قیاس کرکے نحر کیا جائے گا۔ لیکن بکرے اور گائے اور اسی قسم کے چھوٹے جانوروں کی قربانی کے لئے نحر کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا اس لئے اَنْحَرْ کے معنے یہ ہوں گے کہ تُو بڑی قربانی کر۔

تفسیر۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ نماز یعنی اظہارِ اطاعت یا دعا یعنی طلبِ حاجات یہ دونوں چیزیں ایسی ہستیوں سے وابستہ ہیں جو مقتدر ہوں مثلاً ایک فقیر کسی اجنبی علاقہ میں جاتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ فلاں مکان شاندار ہے۔ دروازے پر چند ملازم بھی کھڑے ہیں تو وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مالک صاحبِ مقدرت ہے اور وہ یہ سمجھ کر اُس دروازہ پر جاتا ہے کہ مجھے یہاں سے کچھ مل جائیگا بعض دفعہ وہ مالک کچھ نہیں دیتا اور پاس ایک بُڑھیا کی جھونپڑی ہوتی ہے وہ بالکل غریب اور کنگال ہوتی ہے لیکن اس کے دل میں رحم ہوتا ہے۔ وہ اس فقیر کو دیکھتی ہے تو اُسے آواز دیتی ہے کہ اِدھر آؤ اور جب وہ اُس کے پاس جاتا ہے تو وہ کوئی بچی کھچی روٹی یا کچھ آٹا اس کی جھولی میں ڈال دیتی ہے۔ لیکن عدمِ علم کی وجہ سے وہ پہلے اُس سے نہیں مانگتا۔ وہ پہلے ایسے شخص سے ہی مانگتا ہے جس کے متعلق وہ سمجھتا ہے کہ وہ دے سکتا ہے۔ گویا وہ اندھیرے میں ایک تیر چلاتا ہے اور بظاہر یہ سمجھتا ہے کہ یہاں سے کچھ ملے گا مگر یہ کہ ضرور ملے گا اس کا اُسے علم نہیں ہوتا۔ لیکن اگر وہ جانتا ہو کہ مجھے یہاں سے اکثر کچھ نہ کچھ ملا کرتا ہے تو جب وہ آواز دے گا اُسے یقین، وثوق اور اعتماد بھی ہوگا اور وہ سمجھے گا کہ میں خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ میں اللہ تعالیٰ اعتماد پیدا کرنے کیلئے فرماتا ہے کہ تُو اپنے 'رب' کی عبادت کر یا اپنے 'رب' کے حضور دعا کر۔ یہاں رب کا لفظ استعمال کرکے بتایا کہ وہ خدا ایسا ہے جو تمہاری تربیت کرتا ہے۔ تمہاری ربوبیت کرتا ہے اور تمہیں ترقی دیتا ہے اس طرح رب کا لفظ استعمال کرکے دعا کرنے والے کے دل میں یہ احساس پیدا کیا کہ جس خدا سے تم مانگنے لگے ہو وہ نہ صرف صاحبِ مقدرت ہے اور تم جو کچھ مانگو وہ تمہیں دے سکتا ہے۔ بلکہ وہ سابق زمانہ سے تمہارا مربی و محسن چلا آیا ہے اور ہمیشہ اپنے بندوں کو دیا کرتا ہے۔ مگر یہاں پھر سوال پیدا ہوتا تھا کہ سخی بھی تو سب کو نہیں دیتے صرف کسی کسی کو دیتے ہیں۔ ان کے ہمسایہ میں کئی غریب ہوتے ہیں مگر اُن میں سے کوئی کوئی ہی ہوتا ہے جس کی ضروریات کا وہ خیال رکھتے ہیں کیا خدا تعالیٰ بھی ایسا تو نہیں کہ وہ کسی کا خیال رکھے اور کسی کا نہ رکھے اس شبہ کے ازالہ کے لئے فرمایا۔ لِرَبِّكَ۔ وہ نہ صرف سخی ہے اور خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا بلکہ اے مخاطب اس کا تمہارے ساتھ خصوصیت کے ساتھ تعلق ہے۔ اس لئے تم یقین رکھو کہ تمہاری دعا رد نہیں ہوگی کیونکہ وہ صاحبِ مقدرت بھی ہے صاحبِ سخاوت بھی ہے اور پھر تُمسے خاص طور پر تمہارا خیال بھی ہے اس کے بعد فرمایا وَانْحَرْ۔ کوثر کے نتیجہ میں جہاں تُو نماز پڑھ اور دعائیں کر وہاں تو نحر بھی کر۔ یعنی بڑی بڑی قربانیاں کر۔

میں اُوپر بتا چکا ہوں کہ کوثر کے تین معنے کئے جاتے ہیں جن میں سے ایک معنے یہ ہیں کہ کوثر جنّت کی ایک نہر کا نام ہے ان معنوں کے ساتھ فَصَلِّ لِرَبِّكَ کا کوئی جوڑ نظر نہیں آتا۔ یہ کہنا کہ تجھے جنّت میں نہر ملے گی اس لئے تُو نماز پڑھ اور بڑی بڑی قربانیاں دے۔ یہ ایک ایسا مفہوم ہے جو مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے آپ سے کوثر سے بھی بڑی بڑی چیزوں کا وعدہ کیا مگر وہاں فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کا حکم نہیں دیا۔ مثلاً لقاءِ الٰہی ہے۔ اس کا آپ سے وعدہ کیا گیا لیکن وہاں نماز اور قربانی کا ذکر نہیں حالانکہ کجا نہر اور کجا محبوب کی ملاقات۔ اگر ایک چھوٹے انعام پر نمازوں اور قربانیوں کا حکم

دیا گیا تھا تو چاہیئے تھا کہ بڑے انعام پر اُس سے بھی زیادہ زور کے ساتھ نمازوں اور قربانیوں کا حکم دیا جاتا۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ پس معلوم ہوا کہ نہر والے معنوں کے ساتھ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کا کوئی جوڑ نہیں۔ لیکن اگر یہ معنے کئے جائیں کہ تجھے خیر کثیر ملے گی تو پھر اس آیت کا جوڑ باقی سورۃ سے نظر آ جاتا ہے۔ کیونکہ جب بھی اللہ تعالیٰ کسی کو اپنے انعامات سے حصہ دیتا ہے تو اس کے بہت سے حاسد پیدا ہو جاتے ہیں ملک میں ہزاروں ہزار علماء ہوتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم بڑے تعلیم یافتہ ہیں۔ ہم فلاں فلاں کالج کے پرنسپل ہیں۔ فلاں فلاں کالج کے پروفیسر ہیں۔ فلاں فلاں جامع مسجد کے امام ہیں لیکن ایک گمنام شخص جس کی کوئی بھی حیثیت نہیں ہوتی وہ ان کے سامنے یہ دعویٰ پیش کر دیتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے مجھے مامور کیا ہے تم سب میری بیعت کرو۔ یہ سُن کر اُن کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے کہ ہم اس کی بیعت کیوں کریں۔ اِسے ہمارے مقابلہ میں کونسی پوزیشن حاصل ہے۔ گویا نبوت کے دعویٰ کے ساتھ ہی دنیا کے دوسرے لوگوں میں حسد پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اے ہمارے رسول جو انعامات تم کو ملے ہیں یا آئندہ ملیں گے ایسے انعامات پر لوگ حسد کیا کرتے ہیں اور مخالفتیں کرتے ہیں۔ اِن مخالفتوں کو دیکھتے ہوئے ابھی سے تیار ہو جاؤ اور دعائیں کرو۔ نماز پڑھو اور قربانیاں کرو تاکہ وہ بلائیں ٹل جائیں اور وہ آفات مٹ جائیں چنانچہ کوثر کے پہلے معنوں کے رُو سے ہم دیکھتے ہیں کہ جوں جوں قرآن کریم نازل ہوتا گیا دشمن کا بُغض بھی بڑھتا گیا۔ مگر اس کے مقابل پر مسلمانوں میں بھی دعاؤں اور قربانیوں کا زور بڑھتا گیا اور انہوں نے اسلام کی اشاعت کے لئے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کو اس طرح قربان کیا کہ اس کی مثال دنیا میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔ ایک دفعہ بعض لوگوں نے صحابہؓ سے پوچھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سب سے زیادہ دلیر اور بہادر کون شخص تھا۔ جس طرح آج کل شیعہ سُنی کا سوال ہے اسی طرح اس زمانہ میں بھی جس کسی کے ساتھ تعلق ہوتا تھا لوگ اُس کی تعریفیں کیا کرتے تھے۔ جب صحابہؓ سے یہ سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم میں سے سب سے بہادر وہ شخص سمجھا جاتا تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا ہوتا تھا۔ یہ نکتہ ایک جنگی آدمی ہی سمجھ سکتا ہے دوسرا آدمی نہیں۔ بات یہ ہے کہ جو شخص ملک اور قوم کی روح رواں ہو دشمن چاہتا ہے کہ اُسے مار ڈالے تاکہ اس کی موت کے ساتھ تمام جھگڑا ختم ہو جائے اس لئے جس طرف بھی ایسا آدمی کھڑا ہوگا دشمن اُس طرف پورے زور کے ساتھ حملہ کرے گا اور ایسی جگہ پر وہی شخص کھڑا ہو سکتا ہے جو سب سے زیادہ بہادر ہو۔ پھر صحابہؓ نے کہا کہ آپ کے پاس اکثر حضرت ابوبکرؓ کھڑے ہوا کرتے تھے اور ہمارے نزدیک وہی سب سے زیادہ بہادر تھے

میور جیسا اسلام کا شدید ترین دشمن لکھتا ہے کہ جب جنگِ احزاب ہوئی مسلمانوں کی تعداد اتنی کم تھی اور دشمن کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ یہ بات سمجھ میں ہی نہیں آتی کہ وہ دشمن سے لڑائی کس طرح کرتے تھے۔ دشمن کی بہت بڑی تعداد تھی اور پھر وہ متواتر حملے کرتا تھا کئی دن باریاں مقرر کر کے دشمن حملہ کرتا رہتا تھا تا چوبیس ۲۴ گھنٹے متواتر حملہ ہو سکے اور مسلمان تھک جائیں اُس وقت مسلمان صرف بارہ سو کی تعداد میں تھے جن میں سے پانچ سو عورتوں کی حفاظت پر مقرر تھے۔ لڑنے والے لشکر کے صرف سات سو آدمی تھے لیکن دشمن کی تعداد پندرہ ہزار تھی۔ دشمن اگر اپنے لشکر کو پانچ حصوں میں بھی تقسیم کرتا تو ایک ایک وقت میں مسلمانوں کے سامنے کم از کم تین تین ہزار کا لشکر آتا تھا اور ہر حصہ کی قریباً پانچ پانچ گھنٹے باری آتی تھی۔ اس طرح وہ متواتر ۲۴ گھنٹے لڑائی کر سکتا تھا لیکن مسلمانوں کا لشکر اتنا تھوڑا تھا کہ وہ لشکر کو آدھا آدھا بھی نہیں کر سکتے تھے اور پھر ایک میل کا لمبا فرنٹ تھا جس پر وہ پھیلے ہوئے تھے۔ پس جب دشمن باری باری پانچ گھنٹے کے لئے حملہ کرتا تو مسلمانوں کو بغیر آرام چوبیس ۲۴ گھنٹے لڑنا پڑتا اور پھر بھی وہ دشمن کے مقابلہ پر صرف اس کی تعداد سے چوتھا حصہ لشکر لا سکتے تھے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ لوگوں کو سونے کا موقعہ نہ ملتا۔

ع ۱ ۳۳

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَالْاَبْتَرُ

(اور) یقین رکھ کہ تیرا مخالف ہی نرینہ اولاد سے محروم (ثابت) ہوگا ۵۔

خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک دفعہ اس جنگ میں کئی دن سونے کا موقعہ نہ ملا۔ تاریخ میں آتا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جاگتے ہوئے کئی دن گذر گئے تو آپ نے اپنی ایک بیوی سے جو آپ کے پاس تھیں کہا کہ مجھے اتنے دن بغیر سوئے گذر گئے ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ مجھے اب کچھ سو لینا چاہیئے تاکہ میری صحت قائم رہ سکے لیکن دشمن چاروں طرف سے حملہ کر رہا ہے ہوشیاری سے کام لینا بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی ایسا آدمی مل جائے جو خیمے کا پہرہ دے تو میں تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤں اتنے میں باہر سے ہتھیاروں کی جھنکار کی آواز آئی۔ آپ نے پوچھا کون ہے؟ ایک انصاری صحابیؓ بولے یا رسول اللہ میں نے دیکھا کہ آپ بہت دنوں سے سو نہیں سکے، لڑائی میں اب کچھ وقفہ تھا میں نے خیال کیا کہ میں چل کر خیمہ کا پہرہ دوں تا آپ تھوڑا سا سو لیں۔ یہ قربانی اور ایثار کی کتنی شاندار مثال ہے کہ آپ متواتر کئی دن جاگتے رہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں سوتے اور پھر جب آپ تھک گئے تو ایک صحابی جو خود آپ کی طرح جاگتا رہا تھا فوراً آپہنچا کہ میں پہرہ دیتا ہوں آپ سو جائیں۔ یہی بات خدا تعالیٰ نے یہاں بیان فرمائی ہے کہ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ تُو دعائیں کر اور بڑی بڑی قربانیاں پیش کر۔ تمہارا مقابلہ بڑا سخت ہوگا۔ اگر تُو دعائیں کرتا گیا اور قربانیاں پیش کرتا رہا تو لازماً تیری خیر کثیر دشمن پر غالب آجائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ان دعاؤں اور قربانیوں کا یہ نتیجہ ہُوا کہ کوثر قائم ہوگیا اور دشمن کی مخالفت ختم ہوگئی۔ اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے آخری زمانہ کی اخبار اللہ تعالےٰ سے معلوم کرکے اُس کے لئے اللہ تعالےٰ کے حضور میں بہت دعائیں کیں اور مسیح موعود کو حوصلہ بھی دلایا کہ فرمایا جب مسیح و مہدی ظاہر ہوں تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ اُن کے پاس گھٹنوں کے بل چل کر بھی جانا پڑے تو جائیں۔ اور یہ بھی فرمایا کہ میرا سلام اُن کو پہنچائیں اور سلام کے معنے سلامتی کی دعا کے ہوتے ہیں۔ پس سلام پہنچانے سے یہ مراد ہے کہ اُن کو کہہ دینا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ کے لئے اور آپ کے کام کی کامیابی کے لئے دعائیں کرتے گئے ہیں اس لئے مخالفتوں سے خوف نہ کرنا اور تسلّی سے اپنا کام کئے جانا۔

آخری معنوں کے رُو سے اس آیت کے یہ معنے بنتے ہیں کہ اے ہمارے رسول خدا تعالےٰ تجھے ایک روحانی بیٹا عطا فرمانے والا ہے جو بہت بڑی شان کا ہوگا۔ پس تو جس طرح جسمانی بیٹے کی پیدائش پر لوگ شکر خدا کرتے ہیں اور بکروں کی قربانی کرتے ہیں اس شاندار بیٹے کی پیدائش پر اللہ تعالےٰ کا خاص طور پر شکر ادا کر اور بڑی بڑی قربانیاں پیش کر۔ کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے تیرا نام قائم رکھے گا

۵ حل لغات۔ احادیث میں آتا ہے کہ بعض کفار رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا کرتے تھے کہ یہ تو نعوذ باللہ ابتر ہے۔ اس کا سلسلہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَالْاَبْتَرُ۔ لیکن چونکہ آپ کی بیٹیاں تھیں بیٹے نہیں تھے۔ اس لئے مفسرین کہتے ہیں کہ ابتر اُسے کہتے ہیں جس کا کوئی بیٹا نہ ہو۔ لیکن اس کے عام معنے یہی ہیں کہ خواہ بالکل بے اولاد ہو یا نرینہ اولاد سے محروم ہو اُسے ابتر کہتے ہیں تاج العروس جو عربی لغت کی دو بڑی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس میں لکھا ہے اَلْاَبْتَرُ اَلْمُنْبَتِرُ الَّذِیْ لَا وَلَدَ لَہٗ۔ ابتر اسے کہتے ہیں جو لاولد ہونے کی صورت میں وفات پا جائے وَقَدْ یُقَالُ لَمْ یَکُنْ یَوْمًا وُلِدَ لَہٗ اور اس شخص کو بھی ابتر کہا جاتا ہے جس کی کبھی بھی کوئی اولاد نہ ہوئی ہو۔ وَفِیْہِ نَظَرٌ لیکن یہ درست نہیں۔ لِاَنَّہٗ وُلِدَ لَہٗ قَبْلَ الْبَعْثِ وَالْوَحْیِ کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم

کو دشمن ابتر کہتے تھے حالانکہ بعثت اور وحی سے قبل دونوں دفعہ دونوں میں آپ کے اولاد پیدا ہوئی تھی سوا اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ اَوْلَادٌ لَمْ یَعِشْ لَہٗ وَلَدٌ ذَکَرٌ۔ ہاں آپ کی نرینہ اولاد زندہ نہیں رہی تھی۔ گویا اگر کسی کی پہلے نرینہ اولاد موجود ہو لیکن بعد میں مر جائے تب بھی وہ ابتر کہلائے گا اور اگر پیدا ہی نہ ہو تب بھی وہ ابتر کہلائے گا۔

تفسیر ۔ ابتر کے معنے اُوپر بتائے جا چکے ہیں کہ جس کی اولاد نہ ہو یا جس کے ہاں کوئی لڑکا نہ ہو۔ چونکہ روایت میں آتا ہے کہ دشمن کے اعتراض کے جواب میں یہ آیت ہے اور دشمن کا اعتراض یہ نہ تھا کہ آپ کے اولاد نہیں بلکہ یہ تھا کہ آپ کے ہاں لڑکا نہیں اس لئے اس آیت میں لڑکے کے معنے ہی کئے جائیں گے اور اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ کے یہ معنے ہوں گے کہ دشمن کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاں لڑکا نہیں اور اُس کے ہاں ہے۔ یہ دشمن جھوٹا ثابت ہوگا اور دنیا دیکھے گی کہ دشمن تو بغیر بیٹے کے رہے گا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاں لڑکا ہوگا کیونکہ "تیرا دشمن ہی بغیر لڑکے کے ہوگا" کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ دشمن کے ہاں لڑکا نہ ہوگا اور آپ کے ہاں ہوگا مگر جب ہم واقعات کو دیکھتے ہیں۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے جتنے دشمن تھے وہ سب صاحبِ اولاد تھے بلکہ اُن کی اولاد کی بھی آئندہ نسلیں چلیں اور اُن میں سے کوئی بھی ابتر نہ رہا۔ ابوجہل کو ہی لو۔ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا کتنا شدید دشمن تھا۔ مگر اُس کا لڑکا عکرمہؓ موجود تھا جو جوان تھا اور اُس کی اولاد اب تک موجود ہے۔ مگر وہ ابوجہل کی طرف اپنے آپ کو منسوب نہیں کرتی سو درمیان میں کسی اور دادا کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتی ہے۔ اُس کی اولاد عرب میں بھی پائی جاتی ہے ہندوستان میں بھی پائی جاتی ہے اور پنجاب کے ضلع سرگودھا میں بھی پائی جاتی ہے۔

نبی کریمؐ کے دشمن کے ابتر رہنے کا مطلب

پھر آپ کے بڑے دشمن عتبہ اور ولید تھے۔ عتبہ کی اولاد کا مجھے علم نہیں لیکن ولید کے بیٹے حضرت خالدؓ تھے ۔ جن پر مسلمان آج تک فخر کرتے ہیں۔ پھر اُن کی بھی آگے اولاد چلی۔ وہ عبدالرحمٰن خالدؓ کا ہی بیٹا تھا جس کو انگریزی کتب میں بگیشس قلمی لکھا جاتا ہے یعنی عقلمند جج۔ حضرت عبدالرحمٰن بڑے ذہین اور سمجھدار تھے۔ بڑے دبدبہ والے تھے اور انہوں نے اسلام کی بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔

پھر آپ کا بڑا دشمن عاصی تھا۔ حضرت عمروؓ بن عاص عاصی کے ہی بیٹے تھے جو اسلام کے ایک بڑے جرنیل گذرے ہیں۔ انہوں نے مصر فتح کیا۔ شام کی لڑائیاں لڑیں اور اپنے پیچھے اولاد چھوڑی۔ آپ کے بیٹے عبداللہؓ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مقرب صحابی تھے اور وہ اپنے باپ سے بھی پہلے چودہ سال کی عمر میں ایمان لے آئے تھے۔ باپ کفار کی طرف سے لڑائی میں شامل ہوتا تھا تو بیٹا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لڑائی میں شامل ہوتا تھا پھر حضرت عبداللہؓ کی بھی آگے اولاد چلی۔ پھر اسلام کے دشمن ابوسفیان کی بھی اولاد تھی۔ آپ کا بیٹا معاویہؓ تھا جس سے بنو امیہ ہوئے جنہوں نے سپین میں حکومت کی اور اب تک بھی ابوسفیانؓ کی نسل پائی جاتی ہے۔ غرض آپ کے شدید سے شدید دشمن کی بھی اولاد چلی۔ بلکہ جن لوگوں کے متعلق روایت میں یہ آتا ہے کہ انہوں نے آپ کو ابتر کہا وہ بھی صاحبِ اولاد ہوتے اور ان کی نسل چلی مگر اُن کے مقابلہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نرینہ اولاد زندہ نہیں رہی بیٹے ہوئے مگر فوت ہو گئے۔ آخری عمر میں ماریہ قبطیہؓ سے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔ مگر وہ بھی دو سال زندہ رہ کر فوت ہو گئے۔ اب یہ ایک عجیب بات ہے کہ قرآن کریم تو کہتا ہے کہ ہم نے تجھے کوثر عطا فرمایا ہے جس کے نتیجہ میں تیرا دشمن ہی ابتر ہوگا اور اس کی نرینہ اولاد نہیں چلے گی۔ مگر واقعات اس کے خلاف ہیں۔ آپ کے ہر دشمن کے ہاں قریباً لڑکے تھے اور انکی نسلیں قائم رہیں۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کوئی لڑکا زندہ نہیں رہا اور اس طرح آپ کی جسمانی نسل ختم ہو گئی پس اس آیت پر یہ ایک بڑا بھاری اعتراض پیدا ہوتا ہے اور ایک مسلمان حیران ہوتا ہے کہ اس کا جواب کیا دے ۔

اِس اعتراض کے جواب میں یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ دراصل اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ کے مقابلہ میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہم نے تجھے کوثر عطا کیا ہے۔ پس تو دعائیں مانگ اور قربانیاں پیش کر اس کے نتیجہ میں تیرا دشمن ہی بے اولاد رہے گا۔ میں بتا چکا ہوں کہ لغت میں کوثر کے معنے اَلرَّجُلُ الْمِعْطَاءُ کے بھی آتے ہیں جس کے معنے ہیں بڑا سخی آدمی یا صاحب الخیر الکثیر۔ وہ آدمی جس کے اندر بڑی خیر اور برکت پائی جائے۔ پس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم تجھے ایک بہت بڑی خیر و برکت رکھنے والے اور سخی انسان دینے کی خبر دیتے ہیں اُس انسان کے ملنے کے شکریہ میں تو دعائیں مانگ اور قربانیاں پیش کر اس کے نتیجہ میں تیرا دشمن تو نرینہ اولاد سے محروم رہے گا اور تو نرینہ اولاد والا ہو جائے گا۔ میں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ یہ علامتیں جو یہاں بیان کی گئی ہیں کہ رجل معطار ہوگا اور صاحب الخیر الکثیر ہوگا یہ مسیح اور مہدی کی علامات ہیں اور اُسی کے لئے فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کا حکم ہے۔ پس جس طرح اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ میں جسمانی اولاد مراد نہیں بلکہ روحانی اولاد مراد ہے اسی طرح اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ میں بھی جسمانی اولاد مراد نہیں بلکہ روحانی اولاد مراد ہے اور اللہ تعالیٰ اس امر کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ تیرا دشمن اپنے عقائد کو چلانے والی نسل سے ہمیشہ کیلئے محروم رہیگا لیکن تو صاحب اولاد ہوگا چنانچہ دیکھ لو عکرمہؓ جسمانی طور پر ابوجہل کا بیٹا تھا لیکن وہ مسلمان ہو کر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بیٹا بن گیا۔ گویا بیٹا ہوتے ہوئے بھی ابوجہل یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میری اولاد موجود ہے۔ آخر یہ سوچنے والی بات ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ابتر کہنے سے دشمن کی مراد کیا تھی۔ اُس کی مراد یہی تھی کہ ہمارے عقائد کو ہمارے بعد قائم رکھنے والی اولاد موجود ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو قائم رکھنے والی اولاد موجود نہیں۔ اِس لئے اُن کا قائم کردہ سلسلہ جلد ہی تباہ ہو جائے گا لیکن جب ابوجہل کا بیٹا عکرمہؓ مسلمان ہو گیا اور اسلام کے لئے اُس نے قربانیاں کیں تو جو دعویٰ ابوجہل نے کیا تھا وہ جھوٹا ہو گیا کیونکہ اس کا اپنا بیٹا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقائد کو پھیلانے لگ گیا۔ ابوجہل سمجھتا تھا کہ میں مر جاؤں گا تو میرے خیالات اور عقائد کو قائم رکھنے کے لئے اولاد موجود ہے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم قائم نہیں رہے گی اس لئے کہ آپکی اولاد موجود نہیں مگر جب اُس کا اپنا بیٹا مسلمان ہو گیا تو اس کا یہ دعویٰ غلط ہو گیا۔ پھر ولید اسلام کا بڑا دشمن تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ میری اولاد میرے عقائد کو قائم رکھے گی لیکن اُس کا بیٹا خالدؓ مسلمان ہو گیا اور اُس نے اسلام کے لئے ایسی شاندار قربانیاں کیں کہ آج بھی ہم بہادری کی مثال دیتے وقت کہتے ہیں کہ تم خالدؓ ہو۔ یہ خالدؓ وہی ہے جو ولید کا بیٹا تھا۔ وہ ولید جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شدید ترین مخالفت کیا کرتا تھا جو آپ پر گند پھینکا کرتا تھا اور جو نماز پڑھتے وقت آپ پر جانوروں کی اوجھریاں ڈال دیتا تھا۔ اُس کا اپنا بیٹا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا فدائی اور جاں نثار ثابت ہوا۔ اور اُس نے ساری عمر اسلام کی خدمت میں بسر کر دی۔ جب خالدؓ آپؐ کے متبع ہوئے اور آپ پر قربان اور فدا ہوئے تو گویا خالدؓ آپ کا بیٹا بن گیا اور ولید اولاد سے محروم ہو گیا پھر عاص ہے یہ بڑھا رات دن لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف اُکساتا رہتا تھا اور اسلام کا شدید ترین دشمن تھا مگر اُس کے بیٹے حضرت عمروؓ آپؐ پر ایمان لائے اور وہ بڑے پایہ کے صحابیؓ ثابت ہوئے۔ مصر آپ نے ہی فتح کیا تھا اور شام کی لڑائیاں بھی آپ نے ہی لڑیں۔ گویا عاص بے اولاد رہا کیونکہ اُس کی اپنی اولاد محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اولاد بن گئی۔ پھر ابوسفیان تو خود ہی مسلمان ہو گیا تھا اِس لئے اُس کی دشمنی کا کوئی سوال ہی نہ رہا۔ اُس کے بیٹے حضرت معاویہؓ تھے وہ بھی اسلام کے بڑے خدمتگزار ثابت ہوئے۔ غرض گو جسمانی اولاد کے لحاظ سے اس آیت کے کوئی معنے نہیں بنتے لیکن اگر روحانی معنے

مراد لئے جائیں تو یہ آیت ایک زندہ حقیقت ثابت ہوتی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابو جہل لاولد تھا۔ کیونکہ اس کے خیالات اور عقائد کو چلانے والی اولاد موجود نہیں تھی۔ ولید لاولد تھا کیونکہ اُس کی اولاد بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی متبع ہو گئی عاص لاولد تھا کیونکہ گو اُس کی اولاد چلی مگر اُس کے عقائد اور خیالات کو اُس نے نہیں پھیلایا۔ بلکہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پھیلانے میں لگ گئی۔ پس یہاں اولاد سے جسمانی اولاد مراد نہیں بلکہ روحانی اولاد ہے۔ اگر جسمانی اولاد مراد لی جائے تو آیت کی دونوں دلالتیں غلط ہو جاتی ہیں کیونکہ اس میں کہا گیا ہے کہ آپ کے دشمن کی نرینہ اولاد نہیں ہو گی حالانکہ اُس کی اولاد تھی اور پھر کہا گیا ہے کہ آپ کی نرینہ اولاد ہو گی حالانکہ آپکی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ لیکن اگر روحانی معنے مراد لئے جائیں تو دونو باتیں صحیح ہو جاتی ہیں یہ بات بھی صحیح ہو جاتی ہے کہ ابو جہل کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ولید کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ عاص کی کوئی اولاد نہیں تھی اور یہ بات بھی صحیح ہو جاتی ہے کہ آپ کی روحانی اولاد کا سلسلہ اللہ تعالےٰ نے قائم رکھا۔ عُقبہ کی نسل کے متعلق مجھے اِس وقت یاد نہیں کہ اُس کی ظاہری نسل چلی تھی یا نہیں۔ لیکن اگر اُس کی نسل ہو گی بھی تو وہ مسلمانوں میں ہی چھپی ہو گی بہرحال اللہ تعالےٰ اِس آیت میں یہ مضمون بیان فرماتا ہے کہ ہم تجھے ایک خیر کثیر رکھنے والا روحانی بیٹا عطا فرمائیں گے جس سے دنیا پر یہ ظاہر ہو جائے گا کہ تو نہیں بلکہ تیرا دشمن ہی نرینہ اولاد سے محروم ہے۔

یہاں ایک اور بات بھی مدنظر رکھنے والی ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو مسلمانوں کی مائیں قرار دیا ہے جب وہ مومنوں کی مائیں ہوئیں تو لازماً محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مومنوں کے باپ ہوئے اور تمام مومن آپ کی اولاد میں شامل ہو گئے۔ اب اولاد میں لڑکیاں بھی شامل ہوتی ہیں اور لڑکے بھی شامل ہوتے ہیں۔ مگر اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَؕ اور اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ میں یہ خبر دی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ہم ایک خیر کثیر رکھنے والا روحانی بیٹا عطا فرمائیں گے اور اُس کا دشمن نرینہ اولاد سے محروم ہو گا۔ اب لازماً کوئی ایسا رتبہ اور عہدہ بھی ہونا چاہیئے جو اس اولاد کو نرینہ اولاد ثابت کر دے اور جس کے وجود سے یہ ثابت ہو جائے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نرینہ اولاد سے محروم نہ تھے۔ اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مومن کا عہدہ تو لڑکیوں کے لئے بھی ہے اور لڑکوں کے لئے بھی۔ شہادت اور صدیقیت کے مقامات بھی مردوں کی طرح عورتیں بھی حاصل کر سکتی ہیں لیکن نبوت ایک ایسا عہدہ ہے جو کبھی کسی عورت کو نہیں ملا اور یہ مرد کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ یہاں چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک بہت بڑے روحانی بیٹے کی خوشخبری دی گئی ہے اس لئے آیت کا یہ مفہوم ہو گا کہ تیرے دشمن کی اولاد کٹ جائے گی لیکن تیری نسل میں سے اللہ تعالےٰ ایک ایسا انسان پیدا کریگا جو نبوت کے مقام پر فائز ہو گا۔

یہ مضمون ایک اور جگہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ وَلٰـكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمًا (احزاب ع ۵) یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ تعالےٰ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ تعالےٰ ہر چیز سے واقف اور آگاہ ہے۔ یہ آیت سورۃ احزاب کی ہے جو ہجرت کے چھٹے سال میں نازل ہوئی تھی۔ اِس آیت میں اللہ تعالےٰ یہ مضمون بیان فرماتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔ لیکن سورۃ کوثر میں جو ابتدائی ایام نبوت میں نازل ہوئی تھی اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ۔ تیرا دشمن ہی نرینہ اولاد سے محروم رہے گا تو نرینہ اولاد سے محروم نہیں ہو گا۔ اب

بظاہر اِن دونوں آیات میں بڑا تضاد نظر آتا تھا اور انسان حیران ہوتا تھا کہ یہ بات کیا ہے کہ وہاں تو کہا گیا تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نرینہ اولاد ہوگی مگر یہاں یہ کہا گیا ہے کہ آپ کی نرینہ اولاد نہیں ہوگی۔ گویا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ وہ اعتراض جو کفار مکہ کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ ابتر ہیں اِس اعتراض کو خود قرآن کریم نے تسلیم کر لیا اور کہدیا کہ آپؐ مردوں میں سے کسی کے باپ نہ ہیں نہ آئندہ ہوں گے

رَجُلٌ کے معنے مرد اور کامل انسان کے ہوتے ہیں اور اکثر اہل لُغت اِسے جوان مرد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اور گو بعض ذَکر کے معنے بھی لیتے ہیں لیکن عربی کا عام استعمال مرد کے لئے ہی ہے۔ تاج العروس میں لکھا ہے اِنَّمَا هُوَ فَوْقَ الْغُلَامِ وَ ذَالِكَ اِذَا احْتَلَمَ وَ شَبَّ یعنی لڑکا جب بالغ ہو جائے اور جوانی کی عمر کو پہنچ جائے تو اسے رَجُل کہتے ہیں۔ گو اس کے برخلاف محض ذکر کے معنے بھی لکھے ہیں مگر محاورہ میں اس کی سند نہیں صرف بعض علماء کا قول ہے پس مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ سے مراد یہی ہے کہ آپ کی ذکور اولاد میں سے کوئی بلوغ کو نہیں پہنچا۔ اِس وقت بھی نہیں ہے اور آئندہ بھی نہیں پہنچے گا۔ پس پہلی نرینہ اولاد اور بعد کی اولاد اس آیت کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اُن میں سے کوئی بھی بلوغ کو نہیں پہنچا۔ اِس آیت سے پہلے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نرینہ اولاد یہ تھی (۱) سب سے پہلے قاسم ہوئے جن سے آپ کی کنیت مشہور ہے اور آپ ابو القاسم کہلاتے تھے۔ صحیح تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی وہ چھوٹے بچے تھے کہ فوت ہوگئے گو بعض روایتوں سے پتہ لگتا ہے کہ آپ سواری پر چڑھنے کے قابل ہوگئے تھے تب بھی بلوغ کسی تاریخ اور حدیث سے ثابت نہیں اور یہ روایت بھی کمزور ہے (۲) دوسرے بیٹے عبد اللہ تھے۔ اُن کے لقب الطیّب اور الطاہر بھی ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ دعویٰ نبوت سے پہلے پیدا ہوئے تھے اور بعض مؤرخین کے نزدیک یہ دعویٰ نبوت کے بعد پیدا ہوئے تھے زیادہ صحیح یہی ہے کہ دعویٰ نبوت کے بعد پیدا ہوئے تھے کیونکہ مضبوط اور قوی روایتوں سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ الطیّب اور الطاہر ناموں کے متعلق یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آیا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہی یہ نام رکھے تھے۔ یا آپ نے تو ایک ہی نام رکھا تھا مگر ابوطالب یا حضرت خدیجہؓ نے پیار سے دوسرے نام بھی رکھدئے تھے معتبر روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی بچے کے دو نام تھے۔ گو بعض کمزور روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ دونوں نام الگ الگ بچوں کے تھے۔ قاسم اور طیّب دونوں ہی بچپن میں فوت ہوگئے تھے۔ قاسم نے جب وفات پائی اُن کی عمر سات آٹھ برس کی تھی اور عبد اللہ دو تین سال کی عمر میں ہی فوت ہوگئے تھے (۳) تیسرا بچہ آپکے ہاں اِس آیت کے بعد ماریہ قبطیہؓ سے ہوا جسے مقوقس گورنر مصر نے بطور ہدیہ بھجوایا تھا۔ اِس بچہ کا نام ابراہیم تھا۔ یہ ۸ھ میں پیدا ہوئے اور اُن کی وفات ۹ شوال ۱۰ھ کو ہوئی (انگریزی مہینوں کے حساب سے یہ تاریخ ۲۷ جنوری ۶۳۲ء بنتی ہے) گویا ۲ سال کے قریب آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم زندہ رہے۔ اِن تینوں لڑکوں کی عمروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سے کوئی بھی رَجُل نہیں ہوا اور یہی اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ آپ کسی مرد کے باپ نہ کبھی ہوئے ہیں، نہ اب ہیں اور نہ آئندہ ہوں گے۔ گویا ماضی میں بھی آپکی کوئی اولاد بلوغت کو نہیں پہنچی تھی اور جب یہ سورت نازل ہوئی اُس وقت بھی آپکے ہاں بالغ نرینہ اولاد موجود نہ تھی اور آئندہ بھی کوئی لڑکا بلوغت کو نہیں پہنچیگا۔ گویا تینوں زمانوں کے لحاظ سے آپ کی ابوّت کی نفی کیگئی ہے اور اس طرح لے پالک کے طریق کا جو عرب میں رائج تھا اور جس کے ذریعہ سے پالے ہوئے بچہ کو صلب سے پیدا ہونیوالے بچہ کا رتبہ دیا جاتا تھا رد کیا گیا ہے مگر اس اعلان نے لوگوں کے دلوں میں ایک نیا شک پیدا کر دیا

اگر تو آیت یہ ہوتی کہ لَيْسَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ تب تو کوئی شبہ نہ ہوتا کیونکہ یہ ایک امر واقعہ تھا کہ آپ کے ہاں اولادِ نرینہ بالغ نہ تھی۔ اس سے مستقبل پر کوئی روشنی نہ پڑتی تھی مگر مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ کہہ کر مستقبل کے متعلق بھی پیشگوئی کر دی گئی اور اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ کی پیشگوئی کی گویا واضح طور پر تردید ہو گئی۔

یہ آیات ۵ھ ہجری کے شروع میں نازل ہوئی ہیں۔ اس کے بعد ۸ھ ہجری میں حضرت ابراہیم پیدا ہوئے جو ۱۰ھ میں فوت ہو گئے۔ گویا دشمن کو دو خوشیاں نصیب ہوئیں۔ پہلی خوشی تو اُس نے ابتر کہہ کر حاصل کی۔ اس کے بعد جبکہ ۱۶ سولہ سال تک آپ کے ہاں اولاد نہ ہوئی اور بظاہر مایوسی ہو گئی یہ آیت نازل ہوئی اور دشمن نے یہ کہنا شروع کیا کہ اب چونکہ اولاد سے مایوسی ہو گئی ہے پہلی پیشگوئی کو بدل کر ایک نئی پیشگوئی کر دی گئی ہے۔ تاکہ اس الزام کو کہ آپ کے ہاں اولادِ نرینہ نہیں اپنے فائدہ کے لئے استعمال کیا جائے اور کہا جائے کہ گویا نرینہ اولاد کا نہ ہونا ہماری پیشگوئی کے نتیجہ میں ہے اور ہماری سچائی کی علامت ہے لیکن اولاد کا انقطاع جو سولہ سال سے چلا آتا تھا اس پیشگوئی کے نزول کے بعد یکدم ختم ہو گیا اور ۱۹ اُنیس سال بعد آپ کے ہاں ایک نرینہ اولاد پیدا ہو گئی یعنی حضرت ابراہیم پیدا ہو گئے۔ اب پھر دشمن کے لئے ایک اور خوشی کا موقعہ بہم پہنچا کہ دیکھو جو دوسری پیشگوئی کی گئی تھی وہ بھی غلط ہو گئی اور لڑکا پیدا ہو گیا۔ کون مسلمان اُس وقت کہہ سکتا تھا کہ کیا معلوم یہ لڑکا زندہ بھی رہے گا یا نہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت یہ فقرہ زبان پر کب آنے دے سکتی تھی۔ مگر آخر دسویں سال ہجری میں وہ لڑکا بھی فوت ہو گیا اور یہ اعتراض بھی دور ہو گیا لیکن پہلا اعتراض کہ آپ تو کہتے تھے کہ اولادِ نرینہ ہو گی باقی رہ گیا۔ اس اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ لٰكِنْ کا لفظ استدراک کے لئے آتا ہے یعنی پہلے جملہ سے جو وہم یا شبہ پیدا ہو اُس کا ازالہ اس کے بعد کے جملہ سے کیا جاتا ہے خواہ وہ شبہ خود عبارت سے پیدا ہوتا ہو یا اُس کے متعلقات سے پیدا ہوتا ہو۔ یہ لٰكِنْ کا لفظ کبھی خالی آتا ہے اور کبھی اس سے پہلے واؤ لایا جاتا ہے جیسے وَلٰكِنْ۔ پھر کبھی یہ مشدد ہوتا ہے اور کبھی غیر مشدد ہوتا ہے۔ لیکن جب بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے ازالۂ شبہ کے لئے ہی ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پہلے فقرہ یعنی مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ سے کونسا شبہ پیدا ہوتا تھا جس کا ازالہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ سو جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اس جگہ یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ سورۂ کوثر میں تو یہ بتایا گیا تھا کہ آپ کا دشمن ابتر رہیگا اور آپ کے ہاں نرینہ اولاد ہو گی۔ مگر اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ آپ کی بالغ نرینہ اولاد نہ پہلے تھی نہ اب ہے اور نہ آئندہ ہو گی۔ گویا پہلے تو کہا کہ آپ کے ہاں اولاد ہو گی۔ مگر بعد میں اس کے اُلٹ کہہ دیا کہ اولاد نہیں ہو گی۔ اس شبہ کا ازالہ خدا تعالیٰ نے دو لفظوں سے کرتا ہے یعنی رسول اللہ اور خاتم النبیین سے۔ یہاں واؤ عطف کا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جس غرض کے لئے پہلا لفظ یعنی رسول آیا ہے اُسی غرض کیلئے دوسرا لفظ یعنی خاتم النبیین لایا گیا ہے۔ اُردو میں بھی ہم کہتے ہیں زید گیا اور بکر۔ اور ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو فعل زید سے ہوا وہی بکر سے ہوا۔ یا کہا جاتا ہے میں نے گوشت کھایا اور روٹی۔ اس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ میں نے گوشت بھی کھایا اور روٹی بھی۔ پس عطف کے بعد کا جملہ عطف سے پہلے کے جملہ سے معنوں میں شریک ہوتا ہے۔ اِس لحاظ سے وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ میں رسول کا لفظ جس شبہ کے ازالہ کے لئے آیا ہے اُسی شبہ کے ازالہ کے لئے خاتم النبیین کا لفظ آیا ہے اور وہ شبہ یہ تھا کہ اگر یہ درست ہے کہ آپ کے ہاں بالغ نرینہ اولاد نہ پہلے تھی نہ اب ہے اور نہ آئندہ ہو گی۔ تو پھر سورۃ کوثر والی

پیشگوئی جھوٹی نکلی اور اگر وہ پیشگوئی جھوٹی ثابت ہوئی ہے تو پھر آپ اُس کے رسول نہیں ہو سکتے۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے اللہ تعالےٰ نے ایک تو یہ دلیل دی کہ آپ رسول اللہ ہیں یعنی آپ کی رسالت دوسرے بیسیوں دلائل سے ثابت ہے کسی ایک دلیل سے آپ خدا تعالےٰ کے رسول ثابت نہیں ہوئے آپ کی صداقت کے بیسیوں دلائل ہیں۔ قرآن کریم میں بھی آپکی صداقت کے دلائل پائے جاتے ہیں۔ تورات سے بھی آپ کی صداقت کے دلائل ملتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا بھی آپ کی صداقت کی دلیل ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئیاں بھی آپ کی صداقت واضح کر رہی ہیں۔ یسعیاہؑ نے بھی آپ کے متعلق پیشگوئیاں کی ہیں۔ یرمیاہؑ نے بھی آپ کے متعلق پیشگوئیاں کی ہیں۔ حزقیلؑ نے بھی آپ کے متعلق پیشگوئیاں کی ہیں اور ان کے علاوہ کئی دوسرے انبیاء نے بھی آپ کے متعلق پیشگوئیاں کی ہیں اور وہ سب کی سب آپ پر پوری ہو رہی ہیں۔ کسی ایک پیشگوئی میں شبہ پڑ جانے سے دوسری پیشگوئیاں کس طرح باطل ہو گئیں۔ اگر کسی شخص کی آنکھ کے عصبہ پر فالج پڑے اور دوپہر کا وقت ہو تو اُسے اردگرد اندھیرا نظر آنے گا۔ مگر اس دلیل سے یہ تو ثابت نہیں ہوگا کہ واقعہ میں رات پڑ گئی ہے کیونکہ دن کی دوسری علامات موجود ہوتی ہیں۔ مثلاً تمازتِ آفتاب ہے، گرمی ہے، لوگوں کا ادھر اُدھر کاموں میں مشغول ہونا ہے۔ اگر یہ علامات موجود ہوں تو صرف اس وجہ سے کہ اس شخص کو تاریکی دکھائی دے رہی ہے یہ ثابت نہیں ہو جائے گا کہ واقعہ میں رات پڑ گئی ہے۔ جس طرح وہاں ایک دلیل کے پائے جانے سے رات ثابت نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہاں کسی ایک پیشگوئی میں شبہ پیدا ہونے سے آپ کی رسالت پر اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہی دلیل قرآن کریم نے ایک اَور مقام پر بھی دی ہے جب جنگِ اُحد میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ خبر مشہور ہوئی کہ آپ شہید ہو گئے ہیں اور کئی صحابہؓ اپنی ہمت ہار بیٹھے تو خدا تعالےٰ نے یہ آیت نازل کی وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِىْٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ (آل عمران ع ۵)

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کے ایک رسول ہیں اور آپ سے پہلے بہت سے اور رسول بھی گذر چکے ہیں اگر آپ قتل ہو جائیں یا فوت ہو جائیں تو کیا اس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ آپ نعوذ باللہ راستباز نہیں اور تم مُرتد ہو جاؤ گے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کو اگر آپ کی نبوت میں کوئی شبہ پڑ سکتا تھا تو اس وجہ سے نہیں کہ آپ فوت کیوں ہوئے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ آپکے متعلق یہ پیشگوئی موجود تھی کہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اللہ تعالےٰ آپ کو انسانوں کے ہاتھ سے قتل نہیں ہونے دے گا اگر آپ مارے جاتے تو یہ پیشگوئی غلط ثابت ہو جاتی۔ اللہ تعالیٰ اسی پیشگوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ کسی ایک پیشگوئی کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جھوٹے ثابت نہیں ہو سکتے۔ آپ کا جھوٹا ہونا تو تب ثابت ہوگا جب آپ میں نبوت کی شرائط نہ پائی جائیں اور قتل نہ ہونا نبوت کی شرط نہیں۔ جب قتل نہ ہونا نبوت کی شرط نہیں تو پھر ایک پیشگوئی کے غلط ہونے سے آپ جھوٹے ثابت کیسے ہوئے۔ آپکی صداقت کے لئے بھی تو بیسیوں دلائل اور براہین ہیں۔ جب وہ دلائل آپ کو سچا ثابت کرتے ہیں تو ہمیں سمجھنا پڑے گا کہ یہ پیشگوئی جو ہمارے زعم میں جھوٹی ثابت ہوئی ہے اس کے کوئی اَور معنے تھے جو ہماری سمجھ میں نہیں آئے۔ اگر آپ جھوٹے ہوتے تو دوسری علامات آپ میں کیوں پوری ہوتیں اور دوسرے دلائل آپ کی صداقت پر کیوں موجود ہوتے۔ یہاں بھی وہی دلیل دی گئی ہے کہ آپ کی صداقت اور رسالت تو اَور دلائل سے بھی ثابت ہے۔ موسیٰؑ کی پیشگوئیاں موجود ہیں، عیسیٰؑ کی پیشگوئیاں موجود ہیں، داؤدؑ کی پیشگوئیاں موجود ہیں، یسعیاہؑ کی پیشگوئیاں موجود ہیں، یرمیاہؑ کی پیشگوئیاں موجود ہیں، دانیالؑ کی پیشگوئیاں موجود ہیں اور دوسرے کئی انبیاء کی پیشگوئیاں موجود ہیں۔ پھر آپ کو ایک بے مثال کلام دیا گیا۔ قوتِ قدسیہ عطا کی گئی۔ آپ کو دشمنوں پر غلبہ حاصل ہوا۔ آپکو نصرتِ الٰہی حاصل ہوتی رہی ان سب دلیلوں کے ہوتے ہوئے

اگر ایک دلیل کسی شخص کی سمجھ میں نہیں آتی تو اُسے سمجھنا چاہیئے کہ کہیں غلطی لگی ہے یہ بہر حال جھوٹا نہیں پس وَلٰکِن رَّسُوْلَ اللّٰہِ کہہ کر اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ اگر آپ کی نرینہ اولاد زندہ نہیں رہی تو اِس سے آپ جھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ تمہارا یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ باوجود اس کے کہ آیت اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ کے بظاہر خلاف یہ آیت مضمون رکھتی ہے پھر بھی اس کے سچا ہونے میں شک نہیں کیونکہ یہ رسول اللہ ہے یعنی اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایک تفصیلی پیغام لایا ہے اگر ایک بات میں شک ہو تو تم اَور ہزاروں پیغاموں کو کدھر لے جاؤ گے۔ حق تو یہ ہے کہ ایک بات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ثابت ہو جائے اور دس میں مشتبہ ہو جائیں تو تقویٰ چاہتا ہے کہ ہم تکذیب میں جلدی نہ کریں۔ کیونکہ جو سچ ہوئی اُس کی ہم تاویل کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن جب بات یہ ہو کہ کلام کے بعد کلام پُورا ہُوا ہو۔ تو اگر ایک بات نہ بھی سمجھ میں آئے تو اس کی بنا پر ہم تکذیب ہرگز نہیں کر سکتے بلکہ اپنی عقل کا قصور قرار دیں گے اور اسے غلط نہیں کہیں گے، تشریح طلب کہیں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ مان لیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ جھوٹے ہیں، آپ بہر حال سچے ہیں اور آپ کی راستبازی پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن ایک کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ میرے شبہ کو دُور کرنا بھی تو خدا تعالےٰ کا کام ہے۔ آخر جو مجھے شبہ پیدا ہوا ہے اُس کا کیا جواب ہے ؟ اس کے لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ آپ خاتم النبیین ہیں خاتم کے معنے مُہر کے ہوتے ہیں اور مہر کی غرض تصدیق کرنا ہوتی ہے۔ چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مختلف بادشاہوں کو تبلیغی خطوط لکھے تو واقف کار صحابہؓ نے عرض کیا کہ بادشاہ بغیر مہر کے خط کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتے۔ اس پر آپ نے ایک مُہر بنوائی جس میں سب سے اُوپر اللہ لکھا ہُوا تھا اُس کے نیچے رسول کا لفظ تھا اور اُس کے نیچے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا لفظ تھا۔ گویا اس کی شکل یہ تھی [اللہ / رسول / محمد] یہ مہر آپ نے اِسی لئے بنوائی کہ آپ اُسے خطوط پر ثبت کر کے تصدیق کر سکیں کہ یہ خط واقعہ میں میری طرف سے لکھا گیا ہے۔ آج کل عدالتیں بھی یہ لکھا کرتی ہیں کہ فلاں اشتہار بمہر عدالت جاری ہُوا۔ یعنی عدالت اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ اشتہار ہماری طرف سے ہے پس نبیوں کی مہر کے یہ معنے ہوتے کہ آپ نبیوں کی تصدیق کرنے والے ہیں جس پر آپ کی مہر ہوگی وہ نبی ہوگا اور جس پر آپ کی مہر نہیں ہوگی وہ نبی نہیں ہوگا۔ پھر مُہر ہر کسی چیز پر نہیں لگائی جاتی بلکہ صرف اُس چیز پر لگائی جاتی ہے جو اپنی ہو پس خاتم النبیین کے الفاظ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ آپؐ کے بعد صرف وہ نبوت جاری ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی متابعت اور غلامی میں ہو۔ اگر آپ کے بعد کوئی ایسا آدمی کھڑا ہو جاتا ہے جو کہتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت نعوذ باللہ ختم ہو گئی ہے تو وہ جھوٹا ہے۔ کیونکہ آپ کی نبوت کا زمانہ قیامت تک ختم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اگر وہ کہتا ہے کہ میں نبوت میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے برابر ہوں تب بھی وہ جھوٹا ہے کیونکہ کوئی شخص درجہ میں آپ کے برابر بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ شخص جو کہتا ہے کہ مجھے خدا تعالےٰ نے اس مقام پر اس لئے فائز کیا ہے تا میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی اشاعت کروں اور مجھے جو کچھ ملا ہے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی غلامی اور اطاعت میں ملا ہے۔ اگر قرآن کریم اور احادیث نبوی اس کی تصدیق کریں تو اُس کا دعویٰ نبوت سچا ہوگا۔ کیونکہ ایسے شخص پر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مُہر ہوگی اور جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہر ہو وہ اُمتی اور شاگرد ہونے کی وجہ سے آپ کا روحانی بیٹا ہوگا اور درحقیقت یہی وہ بیٹا تھا جس کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۃ کوثر میں بشارت دی گئی تھی۔ مگر لوگوں نے غلطی سے اسے ظاہری اولاد پر چسپاں کر لیا۔ اللہ تعالےٰ نے سورۃ احزاب میں اس شبہ کا ازالہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ یہ تمہاری اپنی غلطی تھی کہ تم نے اس آیت کو ظاہری اولاد پر چسپاں کر لیا ہماری مُراد تو

روحانی اولاد سے تھی اور ہم یہ بتانا چاہتے تھے کہ یہ مقام صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی حاصل ہے کہ آپکی غلامی اور متابعت میں انسان نبوت کا مقام بھی حاصل کر سکتا ہے جو مقام صرف مردوں کو ملتا ہے عورتوں کو نہیں پس ایسے شخص کے پیدا ہونیسے ثابت ہو جائیگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روحانی اولاد کے باپ ہیں اور آپ کا دشمن اس اولاد سے محروم ہے۔ گویا آپکی روحانی اولاد کا سلسلہ ہمیشہ ایسے رنگ میں جاری رہیگا کہ آپکی غلامی میں انسان بڑے سے بڑا روحانی مقام بھی حاصل کر سکیگا اور یہ ثبوت ہوگا اس بات کا کہ آپکو تو اللہ تعالیٰ نے اولاد نرینہ عطا فرمائی ہے مگر آپکا دشمن اس سے کلی طور پر محروم ہے۔ پھر پچھلے انبیاء کی نبوت بھی آپکی تصدیق کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتی۔ اور نبیوں کو جانے دو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی نبوت ہی ہم کیسے مان سکتے تھے اگر قرآن کریم نہ کہتا کہ وہ نبی ہیں۔ تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو حالات درج ہیں اُن سے تو آپکی نبوت ثابت نہیں ہو سکتی۔ لیکن قرآن کریم ہمیں کہتا ہے کہ وہ سچے نبی تھے اور اس تصدیق کی وجہ سے ہم موسیٰؑ کی نبوت پر ایمان لاتے ہیں۔ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے اس لئے نہیں مانا کہ تورات کہتی ہے کہ وہ نبی ہیں بلکہ ہم نے آپکو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مُہر کی وجہ سے نبی مانا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا کہ وہ نبی تھے تو ہم نے بھی اُنہیں نبی مان لیا ورنہ انجیل پڑھکر ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی نہیں مان سکتے تھے۔ انجیل میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ آپ شراب پی رہے تھے۔ حضرت مریم صدیقہ بھی اُسی محفل میں شریک تھیں کہ شراب ختم ہو گئی۔ حضرت مریم بہت گھبرائیں کہ مہمان بیٹھے ہوئے ہیں اور شراب ختم ہو گئی ہے بہت بدنامی ہوگی۔ اُنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ذکر کیا جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پانی کے مشکوں پر ہاتھ پھیرا اور وہ شراب کے بن گئے۔

پھر لکھا ہے کہ آپ کے شاگرد ایک دفعہ کسی کے کھیت میں گھس گئے اور مالک کی اجازت کے بغیر انہوں نے پھل کھایا۔ لوگوں نے شکایت کی تو بجائے اِس کے کہ آپ اپنے ساتھیوں کو سمجھاتے آپنے کھیت والوں کو ڈانٹا اور کہا۔ دُولہا کی موجودگی میں کوئی اعتراض نہیں کر سکتا۔ اِسی طرح انجیل میں لکھا ہے کہ سؤروں کا ایک ریوڑ چر رہا تھا۔ آپنے اُنپر بھوت چڑھا دئے اور وہ سب کے سب دریا میں کُود کر ڈوب گئے۔ گویا دوسرے کا آپ نے شدید مالی نقصان کیا۔ ان انجیلی واقعات کی موجودگی میں ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہاں نبی مان سکتے تھے۔ ہم تو اُن کو اگر نبی مانتے ہیں تو اِس لئے کہ قرآن کریم کہتا ہے کہ وہ نبی تھے۔ جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آپ نبی تھے، جب قرآن کریم نے کہا کہ آپ نبی تھے تو ہم نے بھی مان لیا کہ آپ نبی تھے۔ اِسی طرح اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی ایسا شخص آتا ہے جو آپکی تعلیم کو جھوٹا قرار دیتا ہے یا آپ پر عیب چینی کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہوگا۔ کیونکہ اس کی نبوت پر آپکی مُہر نہیں ہوگی۔ ہاں اگر وہ آپ کے نقشِ قدم پر چلنے والا ہوگا اور آپکی پیشگوئیاں اُس کے حق میں ہونگی تو ایسے نبی کے آنے سے آپکی ہتک نہ ہوگی۔ کیونکہ وہ آپ کے کمالات کو ظاہر کرنیوالا ہوگا۔ وہ کوئی غیر وجود نہیں ہوگا بلکہ آپ کا ہی روحانی بیٹا ہوگا۔

میں اس موقعہ پر یہ ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ عام مسلمان خاتم النبیین کے یہ معنے کرتے ہیں کہ آپ آخری نبی ہیں۔ اور وہ اسکی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اَنَا اٰخِرُ الْاَنْبِیَآءِ وَمَسْجِدِیْ اٰخِرُ الْمَسَاجِدِ میں نبیوں میں سے آخری نبی ہوں اور میری مسجد مسجدوں میں سے آخری مسجد ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا مفہوم کیا ہے سو اس بارہ میں یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اس حدیث کا دوسرا حصہ اس کے پہلے حصہ کے معنوں کی وضاحت کر دیتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ نہیں فرمایا کہ اَنَا اٰخِرُ الْاَنْبِیَآءِ بلکہ اِس کے ساتھ ہی آپنے یہ بھی فرمایا ہے کہ مَسْجِدِیْ اٰخِرُ الْمَسَاجِدِ۔ میری مسجد تمام مساجد میں آخری مسجد ہے۔ اب کیا کوئی مسلمان اس کے یہ معنے کر سکتا ہے کہ مسجد نبوی کے بعد اور کوئی مسجد نہیں بن سکتی۔ خود مسلمانوں نے دنیا میں ہزاروں ہزار مسجدیں بنوائی ہیں۔ جن کی تقدیس کا کوئی شخص انکار نہیں کرتا۔

اگر اٰخِرُ الْمَسَاجِدِ کے یہی معنے ہوتے کہ مسجد نبوی کے بعد کوئی مسجد نہیں بن سکتی تو مسلمان ہر ملک اور ہر علاقہ اور ہر شہر اور ہر قصبہ بلکہ ہر گاؤں میں کیوں مساجد بناتے۔ اُن کا جگہ جگہ مسجدیں بنانا بتاتا ہے کہ وہ اٰخِرُ الْمَسَاجِد کے یہی معنے سمجھتے ہیں کہ آئندہ وہی مسجد مسجد کہلا سکتی ہے جو مسجد نبوی کی نقل میں بنائی گئی ہو۔ اگر آپ کی مسجد کے بعد دوسری مساجد کا بننا اِس صورت میں کہ وہ آپ کی مسجد کی نقل ہوں، اس حدیث کو رد نہیں کرتا تو ایک ایسے نبی کا آنا جو آپ سے الگ نہ ہو بلکہ آپ کا تابع اور اُمتی ہو، وہ آپ کے آخرالانبیاء ہونے کو کس طرح رد کر سکتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ زمانہ میں لوگوں کے دلوں میں جو وساوس پیدا ہونے والے تھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو دیکھتے ہوئے اَنَا اٰخِرُ الْاَنْبِیَاءِ کہنے کے ساتھ ہی وَمَسْجِدِیْ اٰخِرُ الْمَسَاجِدِ بھی کہہ دیا۔ تا لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اٰخِر کے کیا معنے ہیں جس طرح وہ مسجد جو آپ کی مسجد کی نقل میں بنائی گئی ہو آپکی مسجد کی آخریت کو نہیں توڑتی۔ اِسی طرح وہ نبی جو آپ کے نقش قدم پر آئے، آپ کا تابع اور اُمتی ہو۔ وہ آپ کی آخریت کو نہیں توڑتا گویا ایسا نبی جو آپ کے نقش قدم پر نہ آئے جو اپنے آپ کو مستقل نبی قرار دے اور جو آپکے فیضان کا انکار کرے وہ تو آپ کی نبوت کی آخریت کو توڑنے والا ہے لیکن ایسا نبی جو آپ کے نقش قدم پر چلنے والا ہو، آپکی شریعت کو جاری کرنے والا ہو اور اُس کا وہی کلمہ ہو جو اسلام کا کلمہ ہے۔ وہی نمازیں ہوں جو اسلام میں پائی جاتی ہیں۔ وہی تعلیم ہو جو اسلام کی تعلیم ہے تو وہ آپ کی نبوت کی آخریت کو توڑنیوالا نہیں ہوگا۔ جیسے ایک مسجد جس کا قبلہ وہی ہو جو آپ کی مسجد کا قبلہ تھا اُس میں اُسی طرح نمازیں پڑھی جائیں جس طرح آپ کی مسجد میں پڑھی جاتی تھیں اور اُن نمازوں میں وہی الفاظ ادا کئے جائیں جو آپ نے ادا کئے وہ آپکی مسجد کی آخریت کی ناقض نہیں اور نہ ایسی مسجد کے بنانے سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ آپ کی مسجد آخری مسجد نہیں۔ وہ تو دراصل آپ کی مسجد کا ہی ایک حصہ ہوگی۔

اور کسی چیز کا حصہ ہونا اصل کا ناقض نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ نبی جو آپ کا شاگرد ہو، آپ کا روحانی فرزند ہو۔ آپکے فیوض سے اُسے یہ مقام حاصل ہوا ہو، آپکی شریعت کو جاری کرنیوالا ہو، آپ کے لائے ہوئے دین کو قائم کرنے والا ہو، وہ بھی آپ کے آخری نبی ہونے کو نہیں توڑتا۔ بلکہ وہ آپ کے وجود میں ہی شامل ہوگا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے۔ جیسے ہاتھ جسم کا ایک حصہ ہے۔ اِس کے متعلق کوئی شخص یہ نہیں کہا کرتا کہ جسم الگ چیز ہے اور ہاتھ الگ۔ یا سائے کو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کوئی نیا آدمی ہے پس مَسْجِدِیْ اٰخِرُ الْمَسَاجِدِ کے فقرہ نے اَنَا اٰخِرُ الْاَنْبِیَاءِ کے فقرہ کو حل کر دیا جس طرح آپ کی مسجد کی نقل میں کوئی مسجد بنانا آپکی مسجد کی آخریت کو نہیں توڑتا۔ اِسی طرح ایسا نبی جو آپ کا ماتحت ہو وہ بھی آپکی نبوت کی آخریت کو نہیں توڑتا۔

اِسی طرح مسلمانوں کی طرف سے لَانَبِیَّ بَعْدِیْ والی حدیث بھی پیش کی جاتی ہے۔ اگر اس کے یہ معنے کئے جائیں۔ کہ میری وفات کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آپ کے زمانہ میں کوئی نبی آ سکتا تھا؟ جب آپ ساری دُنیا کی طرف مبعوث کئے گئے تھے تو یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ آپکے زمانہ میں کوئی دوسرا نبی نہیں آ سکتا اور جب آپکے زمانہ میں کوئی دوسرا نبی نہیں آ سکتا تھا تو پھر یہ کہنا کہ میری وفات کے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا کیا مفہوم رکھتا تھا۔ دراصل اس کا بھی یہی مفہوم تھا کہ میری نبوت پر کوئی ایسا زمانہ نہیں آ سکتا جس میں وہ ختم ہو جائے اور یہ بالکل درست ہے اور ہمارا عقیدہ بھی یہی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا زمانہ قیامت تک ممتد ہے۔ چنانچہ اگر ایک طرف ہم حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت پر ایمان رکھتے ہیں تو اُس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ آپ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کامل غلام تھے اور آپ کی شریعت کو جاری کرنے والے تھے۔ آپکا کوئی علیحدہ کلمہ نہیں تھا، کوئی علیحدہ نمازیں نہیں تھیں چونکہ لوگ قرآن کریم کی تعلیم کو بھول گئے تھے۔

اِس لئے خدا تعالےٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا تا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دین کا آپ دوبارہ احیاء کریں گویا یہ ظلّی نبوت ہے اور ظلّ کوئی الگ وجود نہیں ہوتا بلکہ اصل چیز کا ہی عکس ہوتا ہے۔ پس لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ کا بھی وہی مفہوم ہے جو مَسْجِدِیْ اٰخِرُ الْمَسَاجِدِ کا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صرف اُس نبوت میں ہتک ہے جس کا مدعی یہ اعلان کرے کہ میں آپ کی نبوت کو منسوخ کرتا ہوں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اس نبوت میں ہتک ہے جس کا مدعی یہ اعلان کرے کہ میں نے آپ سے کوئی فیضان حاصل نہیں کیا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اُس نبوت میں ہتک ہے جس کا مدعی یہ اعلان کرے کہ اُس نے براہ راست نبوت حاصل کی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اُس نبوت میں ہتک ہے جس کا مدعی یہ اعلان کرے کہ اُس نے آپ کے بنائے ہوئے اصُولوں کو منسوخ کر دیا ہے خواہ وہ اُن کو جزدی طور پر منسوخ کرے یا کلّی طور پر منسوخ کرے۔ بلکہ اگر وہ آپ کا کوئی ایک حکم بھی بدلتا ہے تب بھی وہ آپ کی شریعت کو منسوخ کرنے والا ہے اور لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ والی حدیث اُسے جھوٹا قرار دیتی ہے۔ ایسے آدمی کو یقیناً ہم بھی کافر اور دجّال کہیں گے اور اُسے نبی چھوڑ ایک معمولی مسلمان بھی ماننے کے لئے تیار نہیں ہونگے۔ بلکہ دوسرے مسلمانوں سے ہمارا جھگڑا ہی اس بات پر ہے کہ دوسرے مسلمان یہ کہتے ہیں کہ آخری زمانہ میں آسمان سے حضرت عیسےٰ علیہ السلام نازل ہوں گے۔ ہم کہتے ہیں کہ وہ مسیح موسوی سلسلہ کے نبی ہیں اور انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے فیض کے بغیر نبوت پائی ہے اس لئے ایسے نبی کے واپس آنیکا عقیدہ رکھنا جو آپ کا غلام نہیں آپکی شدید ہتک ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمت بگڑی تو اُس کی اصلاح کے لئے آپ کی اُمت میں سے تو کوئی شخص کھڑا نہ ہوا بلکہ دو ہزار سال پہلے کا نبی لانا پڑا۔ ایسا عقیدہ رکھنا یقیناً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خطرناک ہتک ہے۔ اس طرح محمدی سلسلہ کو موسوی سلسلہ کا دستِ نگر بننا پڑتا ہے جسے کوئی سچا مسلمان برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو سید وُلدِ آدم اور سیدالانبیاء کہا جاتا ہے اور دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ جب آپ کی اُمت بگڑیگی تو آپ کی اُمت کی اصلاح کیلئے باہر سے ایک نبی آئیگا جو موسوی سلسلہ کا ہوگا۔ اُمتِ محمدیہ میں کوئی ایسا شخص نہیں ہوگا جو اُن مفاسد کی اصلاح کر سکے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی غنیم چڑھ کر آجائے تو کہا جائے کہ ہمارا بادشاہ بے شک طاقتور ہے مگر اس کے پاس کوئی فوج نہیں جو اس غنیم کا مقابلہ کر سکے اس لئے دوسرے بادشاہ سے فوج منگوائی جائے۔ حیرت آتی ہے کہ ان لوگوں کی عقلیں کس طرح ماری گئی ہیں اور وہ کس طرح یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر جب شیطان کا حملہ ہوگا تو اُس کا مقابلہ کرنے کے لئے آپ کے پاس کوئی فوج نہیں ہوگی۔ ہاں موسوی سلسلہ کا ایک نبی (عیسےٰ علیہ السلام) آئیگا اور وہ دشمن کا مقابلہ کریگا اور اس طرح آپ کو اپنے احسان کے نیچے لائیگا۔ ہمارے نزدیک ایسا عقیدہ رکھنا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خطرناک ہتک ہے اور جس شخص کے دل میں ذرا بھی ایمان اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت ہو وہ ایسا ظالمانہ عقیدہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔

اِس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ آخرالانبیاء کے اگر یہ معنے کئے جائیں کہ آپ تمام نبیوں کے آخر میں آئے ہیں تو اس کے صرف اتنے معنے ہونگے کہ آپ نبیوں کی قطار میں آخر میں کھڑے ہیں جیسے نیچے کے نقشہ سے ظاہر ہے۔

اللہ تعالیٰ .... مختلف انبیاء .... محمد رسُول اللہؐ .... انسان

اب ظاہر ہے کہ قطار میں جو آخری آدمی ہوتا ہے وہ دوسروں سے افضل نہیں ہوتا کہ اسے کوئی خوبی کی بات سمجھا جائے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے بہت سے سپاہی ایک قطار میں کھڑے ہوں تو اُن میں سے جو آخری سپاہی ہو اس کے متعلق یہ کہنا شروع کر دیا جائے کہ وہ تمام سپاہیوں پر فضیلت رکھتا ہے کیونکہ وہ آخر میں کھڑا ہے حقیقتاً اُسے کوئی فضیلت حاصل

نہیں ہوگی بلکہ وہ بھی دوسروں کی طرح ایک سپاہی ہوگا۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو غیر احمدیوں کے علماء کے قول کے مطابق قطار میں آخری نبی تسلیم کر لیا جائے تو اس سے آپ کی کوئی فضیلت ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ آپ بھی دوسرے نبیوں کی مانند ایک نبی قرار پاتے ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس حدیث میں تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو آخر الانبیاء کہا گیا ہے۔ مگر ایک اور حدیث ایسی ہے جس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اوّل الانبیاء کہا گیا ہے اور وہ حدیث یہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں کُنْتُ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَ اٰدَمُ مُنْجَدِلٌ فِیْ طِیْنَتِہٖ۔ میں اس وقت بھی خاتم النبیین تھا۔ جب آدم ابھی مٹی کے ڈھیلے میں پڑا ہوا تھا گویا آپ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے بھی پہلے خاتم النبیین تھے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ آپ اوّل النبیین تھے۔ اب اگر غیر احمدی علماء کے قول کے مطابق آپکو نبیوں کی قطار کے آخر میں مان لیا جائے تو آپ اول الانبیاء نہیں ہو سکتے اور اگر اوّل الانبیاء مانا جائے تو آخر الانبیاء نہیں ہو سکتے۔ لیکن اِن دونوں حدیثوں کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ایک اور کشف کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو دونوں حدیثیں واضح ہو جاتی ہیں یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا اول الانبیاء ہونا بھی ثابت ہو جاتا ہے اور آپ کا آخر الانبیاء ہونا بھی ثابت ہو جاتا ہے اور پھر یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ آپ سب انبیاء سے افضل ہیں۔ مسند احمد بن حنبل میں ایک روایت آتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ جب معراج ہوا تو میں پہلے آسمان پر گیا۔ وہاں حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ میں اُن سے بھی اُوپر نکل گیا اور دوسرے آسمان پر پہنچا۔ وہاں حضرت عیسیٰ السلام تھے میں اُن سے بھی اُوپر نکل گیا اور تیسرے آسمان پر پہنچا۔ وہاں حضرت یوسف علیہ السلام تھے میں اُن سے بھی اوپر نکل گیا اور چوتھے آسمان پہ گیا۔ وہاں حضرت ادریس علیہ السلام تھے۔ میں اُن سے بھی اُوپر نکل گیا اور پانچویں آسمان پر پہنچا وہاں حضرت ہارون علیہ السلام تھے میں اُن سے بھی اُوپر نکل گیا اور چھٹے آسمان پر پہنچا وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے میں اُن سے بھی اُوپر نکل گیا اور ساتویں آسمان پر پہنچا وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے تب جبریل علیہ السلام نے مجھ سے کہا۔ اب آور اُوپر چلیں۔ میں اُوپر گیا اور سدرۃ المنتہیٰ میں جا کر کھڑا ہو گیا اور وہاں اللہ تعالےٰ سے ملاقات ہوئی۔ یہ سیر الی اللہ اس نقشہ سے ظاہر ہو سکتی ہے۔

اَللّٰہ

سدرۃ المنتہیٰ	محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	
ساتواں آسمان	حضرت ابراہیم علیہ السلام	
چھٹا آسمان	حضرت موسیٰ علیہ السلام	
پانچواں آسمان	حضرت ہارون علیہ السلام	
چوتھا آسمان	حضرت ادریس علیہ السلام	
تیسرا آسمان	حضرت یوسف علیہ السلام	
دوسرا آسمان	حضرت عیسیٰ علیہ السلام	حضرت یحییٰ علیہ السلام
پہلا آسمان	حضرت آدم علیہ السلام	
	اہلِ زمین	

اب اِس نقشہ کو دیکھو تو مخلوق کے مقام پر جو شخص کھڑا ہو کر دیکھے گا اُسکی نظر سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام پر پڑے گی اور سب سے آخر اُسکی نظر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر پڑیگی۔ گویا سب نبیوں میں سے آخری نبی وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو قرار دیگا۔ اِس طرح آپکی یہ حدیث بھی درست ثابت ہو جاتی ہے کہ اَنَا اٰخِرُ الْاَنْبِیَاءِ اور آپ دوسرے انبیاء سے بھی افضل ثابت ہو جاتے ہیں۔ آپ حضرت آدم علیہ السلام سے افضل ہیں کیونکہ آپ اُن سے بھی اُوپر نکل گئے۔ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی افضل ہیں کیونکہ آپ اُن سے بھی اُوپر نکل گئے۔ آپ حضرت یوسف علیہ السلام سے بھی افضل ہیں کیونکہ آپ اُن سے بھی اُوپر نکل گئے۔ آپ حضرت ادریس علیہ السلام سے بھی افضل ہیں کیونکہ

آپ اُن سے بھی اُوپر نکل گئے۔ آپ حضرت ہارون علیہ السلام سے بھی افضل ہیں کیونکہ آپ اُن سے بھی اُوپر نکل گئے۔ آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی افضل ہیں کیونکہ آپ اُن سے بھی اُوپر نکل گئے۔ آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی افضل ہیں کیونکہ آپ اُن سے بھی اُوپر نکل گئے۔ لیکن اگر اُوپر کے نقشہ کو اللہ تعالیٰ کے مقام سے دیکھا جائے تو پھر سب سے اول رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا مقام نظر آئیگا۔ آپکے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا۔ پھر حضرت ہارون علیہ السلام کا۔ پھر حضرت ادریس علیہ السلام کا پھر حضرت یوسف علیہ السلام کا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اور پھر حضرت آدم علیہ السلام کا۔ پس آپ آخر الانبیاء بھی ہیں اور آپ اول الانبیاء بھی ہیں۔ مگر انہی معنوں میں جن کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے۔ ورنہ پیدائش کے لحاظ سے آپ کُنْتُ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَ اٰدَمُ مُنْجَدِلٌ فِیْ طِیْنِہٖ کا مصداق کیونکر ہوسکتے ہیں۔

اِن معنوں کے رُو سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی کہ اُوْتِیْتُ فَوَاتِحَ الْکَلِمِ وَجَوَامِعَہٗ وَخَوَاتِمَہٗ حل ہوجاتی ہے کیونکر سب سے اقرب مقام پر جس کو کلام ہوا یقیناً اُسے فواتح الکلم ملے اور بندوں کی طرف سے جسے سب سے اوپر جاکر کلام ملا اُسے خواتم الکلم ملے۔ کیونکہ باقی سب کلام اس سے نچلے مقام پر ہوئے ہیں اور چونکہ وہ ہر مقام پر سے گزر کر اوپر پہنچا اُسے جوامع الکلم ملے۔ درحقیقت لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ اور اَنَا اٰخِرُ الْاَنْبِیَاءِ۔ یہ دو حدیثیں معراج کے واقعہ پر مبنی ہیں۔ اور حدیثِ معراج ہی انکو حل کرتی ہے۔ مگر مسلمانوں نے غلطی سے اُن سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر قسم کی نبوت بند ہے معلوم ہوتا ہے کہ خود صحابہ کو بھی احساس تھا کہ ختم نبوت کے بارہ میں لوگ مغالطہ سے کام لینگے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زور دینے کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکینگے چنانچہ اس بارہ میں مندرجہ ذیل حوالہ جات مفید روشنی ڈالتے ہیں۔

اوّل۔ ابن ابی شیبہ سے درِّ منثور میں ایک حدیث منقول ہے کہ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے صحابہ کو یہ کہتے سن لیا کہ اِنَّہٗ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ وَ لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ۔ آپ خاتم النبیین ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا۔ آپ نے بڑے جوش سے فرمایا قُوْلُوْا خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَلَا تَقُوْلُوْا لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین تو کہو مگر یہ مت کہو کہ آپکے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا۔ اب یہ ایک سیدھی بات ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو الفاظ فرمائے تھے حضرت عائشہؓ انکی تردید نہیں کرسکتی تھیں یہ کس طرح ہوسکتا تھا کہ آپ تو کہیں لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ مگر حضرت عائشہؓ اسکی تردید فرمائیں اور کہیں وَلَا تَقُوْلُوْا لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ۔ حضرت عائشہؓ جیسے وجود سے اس چیز کا امکان ہی نہیں ہوسکتا۔ آپ کا مطلب درحقیقت یہی تھا کہ خاتم النبیین قرآن کریم کا لفظ ہے جس سے کوئی غلطی نہیں لگ سکتی مگر لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ سے غلط فہمی ہوسکتی ہے۔ اس لئے خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ تو بیشک کہو مگر یہ نہ کہو کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا۔ ورنہ ایک عارف تو سمجھ جائیگا کہ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ اور لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ سے صرف اتنی مراد ہے کہ میرے بعد کوئی ایسا نبی نہیں آسکتا جو میرے سلسلہ کو ختم کردے اور میری شریعت کو منسوخ کرے۔ مگر ایک عامی شخص یہ نتیجہ نکال لیگا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسا نبی بھی نہیں آسکتا جو آپ کا شاگرد ہو اور آپ کے دین کو قائم کرنیوالا ہو یہی وجہ

خاتم النبیین کے معنے صحابہؓ کے نزدیک

تھی کہ باوجود اس کے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا تھا لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ قُوْلُوْا خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَلَا تَقُوْلُوْا لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ۔ یہ نہ کہو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔

حضرت عائشہؓ کا لوگوں کو لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ کہنے سے روکنا تاکہ وہ کسی غلط عقیدہ پر قائم نہ ہوجائیں بالکل ویسا ہی ہے جیسے احادیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ اُٹھ کر کہیں باہر تشریف لے گئے اور آپکو واپس آنے میں بہت دیر ہوگئی صحابہؓ گھبرائے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہاں تشریف لے گئے ہیں۔ اُن دنوں شام کی

طرف سے خطرہ تھا کہ کہیں عیسائی مدینہ پر حملہ نہ کر دیں۔ اس لئے صحابہؓ کے دلوں میں خیال پیدا ہوا کہ کہیں دشمن نے حملہ نہ کر دیا ہو چنانچہ وہ ادھر اُدھر آپؐ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں آپؐ کی تلاش کرتے کرتے ایک باغ کی طرف چلا گیا۔ دیکھا تو اُس کا بڑا دروازہ بند تھا۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں بلی کی طرح ایک سوراخ میں سے اندر گھس گیا۔ دیکھا تو وہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ ہم تو بہت گھبرا گئے تھے کہ نہ معلوم آپ کہاں تشریف لے گئے ہیں۔ اب آپکو دیکھا ہے تو جان میں جان آئی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابوہریرہؓ جاؤ اور جو بھی تم سے ملے اُسے کہو مَنْ قَالَ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ جو بھی لا اِلٰہ اِلّا اللہ کہیگا وہ جنت میں داخل ہو جائیگا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ۔ اتنی بڑی بات کون مانیگا آپ مجھے اپنی کوئی نشانی دیدیں۔ آپنے اپنی جوتیاں انہیں دیدیں۔ جب وہ دروازے سے نکلے تو حضرت عمرؓ آرہے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا ہے کہ مجھے جو بھی ملے میں اُسے یہ خوشخبری سُنا دوں کہ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ حضرت عمرؓ نے یہ سُنتے ہی انکے سینہ پر زور سے ہاتھ مارا اور فرمایا تم لوگوں کا ایمان خراب کرنا چاہتے ہو۔ حضرت ابوہریرہؓ دوڑے دوڑے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ مجھے تو عمرؓ نے مار ڈالا۔ آپ ہی نے فرمایا تھا کہ جو تم سے ملے اُسے کہدو کہ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ مگر عمرؓ سے میں نے کہا تو انہوں نے مجھے تھپڑ مارا۔ اتنے میں حضرت عمرؓ بھی تشریف لے آئے۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ کیا آپ نے ایسا فرمایا ہے کہ جو لا اِلٰہ اِلّا اللہ کہے گا جنت میں داخل ہو جائیگا؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اس طرح تو کمزور لوگ عمل چھوڑ دینگے۔ آپنے فرمایا۔ بہت اچھا اعلان روک دو۔ گویا خود ہی ایک بات کہی اور پھر خود ہی فرما دیا کہ اس کی اشاعت نہ کرو۔ بعض لوگ کہدیتے ہیں کہ یہ خوشخبری حضرت عمرؓ کے متعلق ہی تھی اور چونکہ یہ بات انکو پہنچ گئی اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب اور لوگوں کو یہ بات نہ کہو مگر یہ درست نہیں۔ درحقیقت اس کا مخاطب ہر مومن تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص سچے دل سے لا اِلٰہ اِلّا اللہ کہے اور پھر اس پر عمل کرے وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص خدا کو بھی مانے اور پھر اس کے احکام پر عمل بھی نہ کرے اس کا مطلب یہی تھا کہ اگر کوئی شخص صدقِ نیت اور اخلاص کے ساتھ یہ کلمہ کہے۔ تو وہ ضرور جنتی ہوگا۔ یہ مطلب نہیں تھا کہ صرف مُنہ سے لا اِلٰہ اِلّا اللہ کہہ دینے سے انسان جنت میں چلا جاتا ہے جیسے آج کل مسلمان خیال کرتے ہیں کہ مُنہ سے لا اِلٰہ اِلّا اللہ کہدیا تو پھر کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ بہرحال لوگوں کی غلط فہمی کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت عمرؓ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ یا رسول اللہ لوگ نقلی معنوں کو لے لینگے اور سمجھ لینگے کہ اب کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ اس پر آپنے خود ہی اس سے روک دیا۔ اسی طرح حضرت عائشہؓ نے بھی خیال کیا کہ کہیں لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ سے لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ اسلام میں بڑے آدمی پیدا ہی نہیں ہونگے اور نبوت کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند ہو چکا ہے۔ چنانچہ آپنے لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ کہنے سے روکدیا اور خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ چونکہ قرآن کریم کا لفظ تھا اور اس سے کوئی دھوکا نہیں لگ سکتا تھا آپنے فرمایا تم خاتم النبیین بیشک کہو مگر یہ مت کہو کہ آپکے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا۔ اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ یقین رکھتی تھیں کہ کلی طور پر نبوت کا انقطاع تسلیم کرنا اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ ورنہ اگر ہر قسم کی نبوت کا دروازہ بند ہونا تو پھر آپکو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ لَا تَقُوْلُوْا لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ حالانکہ یہ الفاظ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ آپنے اسی لئے یہ کہا کہ آپکے نزدیک خاتم النبیین کے الفاظ زیادہ محفوظ تھے اور غلط فہمی کا امکان ان میں کم تھا اور پھر قرآنی الفاظ تھے بس آپنے کہا کہ یہ لفظ بولا کرو اور دوسرے الفاظ یعنی لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ ایسے ہیں کہ جو ایک معنوں سے ٹھیک ہیں لیکن بعض دوسرے معنوں سے اُن کی وجہ سے غلط فہمی ہوتی ہے اس لئے اُن لفظوں کو عام طور پر استعمال

نہ کیا کرو۔ اس روایت پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ فرمائے ہیں تو حضرت عائشہؓ کو روکنے کا کیا حق تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ کا علم نہ ہوگا اسی وجہ سے انہوں نے منع کیا اور اس قسم کا عدم علم کا فتویٰ قابل قبول نہیں ہوا کرتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امر تو قرآن کریم کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اس کے بارہ میں کثرت سے احادیث موجود ہیں اور صرف ایسے ہی مسائل سے صحابہ کی ناواقفیت فرض کی جا سکتی ہے جن کا علم چند لوگوں میں محدود ہو۔ مگر یہ تو ایسے مسائل میں سے نہیں۔ اس لئے اُس وجود کو اس سے ناواقف قرار دینا جس کی نسبت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ آدھا دین اُس سے سیکھو۔ درست نہیں۔

نیز الفاظ روایت بتاتے ہیں کہ ایک جماعت کو حضرت عائشہؓ نے یہ ارشاد فرمایا ہے یا یہ کہ وہ اکثر ایسا فرمایا کرتی تھیں اور یہ امر فرض کرنا اور بھی مشکل ہے کہ حضرت عائشہؓ کی یہ رائے لوگوں میں پھیلی اور کسی نے بھی انکی رائے کو رد نہ کیا۔ پس معلوم یہی ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ اس علم کے باوجود کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے ان الفاظ کے عام استعمال سے روکتی تھیں تا لوگوں میں غلط فہمی نہ ہو جائے۔

یہ اعتراض کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کہے ہوئے کو کون روک سکتا ہے درست نہیں کیونکہ الفاظ سے نہیں روکا جاتا بلکہ اُن کے بے موقع استعمال سے روکا جاتا ہے جیسے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حضرت عمرؓ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ کہنے سے روکتے ہیں۔ اس لئے تو نہیں کہ وہ فقرہ غلط تھا۔ عمرؓ اُسے غلط کہنے والے کون تھے بلکہ اس لئے کہ وہ ایسے الفاظ میں تھا کہ سمجھدار آدمی تو اس کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں لیکن عوام کے متعلق خطرہ تھا کہ وہ غلطی میں مبتلا ہو جائینگے۔ یہی مطلب حضرت عائشہؓ کا تھا۔

دوسری روایت بھی ابن ابی شیبہ سے ہے اس کے الفاظ یہ ہیں قَالَ رَجُلٌ عِنْدَ الْمُغِیْرَۃِ ابْنِ شُعْبَۃَ صَلَّی اللّٰہُ عَلٰی مُحَمَّدٍ خَاتَمَ الْاَنْبِیَآءِ لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ یعنی حضرت مغیرہ ابن شعبہ کے پاس کسی شخص نے یہ الفاظ کہے اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام و درود بھیجے جو خاتم الانبیاء تھے اور جن کے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا فَقَالَ الْمُغِیْرَۃُ حَسْبُکَ اِذَا قُلْتَ خَاتَمَ الْاَنْبِیَآءِ مغیرہ بن شعبہ نے فرمایا کہ جب تُو نے خاتم الانبیاء کہہ دیا تھا تو یہ کافی تھا لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ کہنے کی ضرورت نہیں تھی فَاِنَّا کُنَّا نُحَدِّثُ اَنَّ عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ خَارِجٌ۔ کیونکہ ہم باتیں کیا کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ ظاہر ہونیوالے ہیں فَاِنْ ھُوَ خَرَجَ فَقَدْ کَانَ قَبْلَہٗ وَبَعْدَہٗ پس اگر وہ نکل آئے تو وہی آپکے پہلے بھی ہونگے اور آپکے پیچھے بھی ہوں گے۔ (الدر المنثور) اس حدیث سے یہ امور ظاہر ہیں (۱) مغیرہ بن شعبہ کے نزدیک خاتم النبیین کے الفاظ کے یہ معنے نہیں تھے کہ آپکے بعد نبی نہیں آسکتا (۲) انکے نزدیک لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ کے الفاظ ویسے محفوظ نہیں جیسے خاتم النبیین کے الفاظ محفوظ ہیں (۳) مغیرہ بن شعبہ کے نزدیک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کے آنیکا امکان تھا (۴) وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ آسمان پر ہونیکے قائل نہ تھے۔ تبھی آپ یہ نہیں کہتے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہونگے۔ بلکہ آپ یہ فرماتے ہیں کُنَّا نُحَدِّثُ اَنَّ عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ خَارِجٌ ہم یہ باتیں کیا کرتے تھے کہ وہ زمین سے ظاہر ہونگے معلوم ہوتا ہے انکا خیال تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں مگر وہ پھر زندہ کر کے واپس بھجوائے جائیں گے اِس لئے انہوں نے نَازِلٌ مِّنَ السَّمَآءِ نہیں کہا بلکہ خارج کا لفظ استعمال کیا ہے۔

تیسری روایت ابن الانباری نے کتاب المصاحف میں بیان کی ہے کہ عبدالرحمٰن سلمی کہتے ہیں کُنْتُ اُقْرِئُ الْحَسَنَ وَالْحُسَیْنَ میں حضرت حسن اور حسین کو قرآن کریم پڑھانے پر مقرر کیا گیا تھا فَمَرَّ بِیْ عَلِیُّ ابْنُ اَبِیْ طَالِبٍؓ ایک دن میرے پاس سے حضرت علی ابن ابی طالبؓ گذرے اَنَا اُقْرِئُھُمَا خَاتِمَ النَّبِیّٖنَ بِکَسْرِ التَّاءِ۔ اور میں انہیں خاتِم النبیین بکسر التاء پڑھا رہا تھا جس کے معنے ختم کرنیوالے کے ہوتے ہیں فَقَالَ لِیْ اَقْرِءْھُمَا وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ بِفَتْحِ التَّاءِ وَاللّٰہُ الْمُوَفِّقُ حضرت علیؓ نے یہ سنکر فرمایا۔ تم میرے بیٹوں کو

خاتم النبیین بکسرِ تاء نہ پڑھاؤ بلکہ بفتحِ التاء پڑھاؤ۔ اللہ توفیق عطا فرمائے۔ یہ حضرت علیؓ کا فتویٰ ہے کہ خاتم النبیین کی بکسرِ التاء والی قرأت بفتح التاء والی قرأت کے تابع ہے لیکن علماء کہتے ہیں کہ خاتم النبیین کی بفتح التاء والی قرأت بکسرِ التاء والی قرأت کے تابع ہے۔ اگر ختم کے وہ معنے ہوتے جو علماء لیتے ہیں تو حضرت علیؓ کو تو خوش ہونا چاہیئے تھا کہ عبدالرحمٰن اسلمی آپ کے بیٹوں کو بکسرِ التاء پڑھاتے ہیں مگر آپ فرماتے ہیں میرے بیٹوں کو بکسرِ التاء نہ پڑھاؤ بفتحِ التاء پڑھاؤ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کے نزدیک خاتم النبیین بفتح التاء کے الفاظ زیادہ محفوظ تھے۔ یوں بکسرِ التاء بھی جائز ہے۔ لیکن چونکہ اس سے ڈر ہو سکتا تھا کہ کہیں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ یہ نہ سمجھ لیں کہ آپ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئیگا خواہ وہ آپ کا شاگرد ہی کیوں نہ ہو اس لئے آپ نے اُستاد سے کہا کہ میرے بیٹوں کو بفتح التاء پڑھاؤ بکسرِ التاء نہ پڑھاؤ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کے نزدیک خاتم النبیین کے وہ معنے نہیں تھے جو بکسرِ التاء سے نکلتے ہیں یعنی نبیوں کو ختم کرنیوالا۔ ورنہ آپ بکسرِ التاء پڑھانے سے اُستاد کو منع نہ فرماتے۔

چوتھی حدیث جس سے اس پر روشنی پڑتی ہے یہ ہے۔ ابن ماجہ اور ابن مندہ میں روایت درج ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بیان کیا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند حضرت ابراہیم فوت ہوئے تو آپ نے فرمایا لَوْ عَاشَ لَكَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (ابن ماجہ جلد ۱ کتاب الجنائز) اگر ابراہیم زندہ رہتا تو وہ ضرور نبی ہوتا۔ یہاں علماء کو بہت مشکل پیش آئی ہے۔ کیونکہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی نے نہیں آنا تھا تو پھر آپ نے یہ کیوں فرمایا کہ اگر ابراہیم زندہ رہتا تو ضرور نبی ہوتا۔ اس مشکل کو حل کرنے کیلئے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہر نبی کا بیٹا نبی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپکی اولاد کو اس لئے وفات دیدی کہ وہ نبی نہ ہو جائیں اور آیت خاتم النبیین پوری ہو۔ مگر یہ درست نہیں۔ اگر نبی کا بیٹا نبی ہوتا ہے تو دنیا کا ہر شخص نبی ہونا چاہیئے کیونکہ تمام حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں اگر حضرت آدمؑ کو نبی نہ کہا جائے تب بھی دنیا میں نصف یا چوتھائی تو ضرور نبی ہونے چاہئیں کیونکہ اکثر بنی آدم حضرت نوحؑ کی اولاد سے ہیں۔ بلکہ بنی اسرائیل کی روایات کے مطابق تو ساری دنیا ہی حضرت نوحؑ کی اولاد سے ہے۔ اسی طرح اگر یہ اصل درست ہے تو حضرت یعقوب علیہ السلام کی ساری اولاد کو نبی ہونا چاہیئے تھا لیکن ہمیں تو اُن میں وہ لوگ بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بیچ دیا۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے جھوٹ بولا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے بیٹے نبی کیوں نہ بنے بلکہ آپ کی وفات کے بعد تو یہ بات عام طور پر مشہور ہو گئی تھی کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اگر آپ کی اولاد نے نبی بننا ہوتا تو یہ کیوں کہا جاتا۔ پس یہ کہنا کہ نبی کا بیٹا نبی ہوتا ہے واقعات کے خلاف ہے۔

پھر بعض لوگ کہتے ہیں کہ چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہونا تھا اور ادھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ خیال تھا کہ اگر ابراہیم زندہ رہا تو نبی بن جائے گا۔ اس لئے خدا تعالےٰ نے انہیں وفات دیدی تاکہ وہ نبی نہ بن سکیں مگر یہ بھی نہایت غیر معقول بات ہے۔ کیونکہ جو چیز ہونی ہی نہ تھی اُس کے لئے اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے درست ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ آخر نبوت جبکہ طبعی امر نہیں بلکہ شرعی امر ہے اور اس کا دروازہ بند ہو چکا تھا تو پھر ابراہیم کس طرح نبی ہو سکتے تھے۔ اگر خدا تعالیٰ کا یہ فیصلہ تھا کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا تو وہ نبی کس طرح بن جاتے۔ وہ خواہ زندہ بھی رہتے نبی نہیں بن سکتے تھے۔ پس یہ بالکل غلط ہے کہ ابراہیم کو اس لئے وفات دی گئی کہ وہ کہیں نبی نہ بن جائیں بلکہ وہ قانونِ قدرت کے مطابق فوت ہوئے اور پیشگوئی مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ بعد میں ظاہر ہونیوالے واقعات کے مطابق تھی نہ کہ اس کو پورا کرنے کے لئے واقعات پیدا کئے گئے گو بعض دفعہ واقعات پیشگوئی کی خاطر پیدا بھی کئے جاتے ہیں۔ بہرحال اس حدیث سے اِمکانِ نبوت ثابت ہے۔ ورنہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ کبھی نہ فرماتے کہ اگر ابراہیم زندہ رہتا تو ضرور نبی بنتا ؂

سُوْرَۃُ الْکٰفِرُوْنَ مَکِّیَّۃٌ

سورۂ کافرون - یہ سورۃ مکی ہے

وَھِیَ سَبْعُ اٰیَاتٍ مَعَ الْبَسْمَلَۃِ

اور بسم اللہ سمیت اس کی سات آیات ہیں -

لہ ابن مسعودؓ کے نزدیک سورۃ کافرون مکی ہے اور حسن اور عکرمہ بھی یہی کہتے ہیں - ابن عباس اور قتادہ اور ضحاک اور ابن زبیر کہتے ہیں کہ یہ مدنی ہے - ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ یہ سورۃ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز اور مغرب کی نماز میں چوبیس۲۴ دفعہ پڑھی ہے - مسند احمد - ترمذی - نسائی - ابن ماجہ اور دوسری کتب میں یہ حدیث بیان ہوئی ہے - میرے نزدیک چوبیس سے مراد چوبیس نہیں بلکہ کثرت مراد ہے - اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جہاں کثرت سے فجر کی نماز میں لمبی سورتیں پڑھا کرتے تھے وہاں کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی سورتیں بھی پڑھ لیا کرتے تھے جیسے سورۃ کافرون اور قل ھو اللہ احد۔

مسند حاکم میں ابی ابن کعبؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم الوتر کی تین رکعتوں میں سے پہلی میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی دوسری میں قُلْ یٰۤاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ اور تیسری میں قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ پڑھا کرتے تھے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ قرآن شریف کے تیسرے حصہ کے برابر ہے اور قُلْ یٰۤاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ قرآن کے چوتھے حصہ کے برابر ہے اور آپ کئی دفعہ صبح کی دو رکعتوں میں یہ دو سورتیں پڑھا کرتے تھے (یہ روایت طبرانی نے اپنی کتاب الاوسط میں نقل کی ہے) اس حدیث کا بھی یہ مطلب نہیں کہ قرآن کریم کے تیسرے حصہ کے برابر قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ہے اور چوتھے حصہ کے برابر قُلْ یٰۤاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ ہے - کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو باقی قرآن کے نازل ہونے کی ضرورت کیا تھی؟ اس کا مطلب یہی ہے کہ صداقتیں اپنی جڑ کے لحاظ سے بہت مختصر ہوتی ہیں - مثلاً اگر مذہب کا خلاصہ نکالا جائے تو اتنا ہی ہوگا کہ خدا تعالےٰ سے محبت اور بندوں سے شفقت۔ یہی قرآن کریم سے اور حدیثوں سے دین کا خلاصہ معلوم ہوتا ہے - اب اگر کوئی شخص کہدے کہ بندوں پر شفقت آدھا دین ہے تو اس کے یہ معنے نہیں ہوں گے کہ اس فقرہ کے بعد آدھے دین کی ضرورت نہیں رہتی اور نہ یہ کہنے سے کہ خدا تعالےٰ کی محبت بڑی اہم چیز ہے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دین کے نصف حصہ کا ذکر ہوگیا - اب اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں - پس قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ کو ثلثِ قرآن قرار دینا یا قُلْ یٰۤاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ کو رُبع قرار دینے کے معنے یہی ہیں کہ اُن کے مطالب نہایت اہم ہیں - اور اگر ان کے مطالب پر صحیح طور پر غور کیا جائے تو دین کی بہت سی مشکلات حل ہوجاتی ہیں - مثلاً قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ میں توحید پر زور ہے حقیقت یہی ہے کہ توحید مذہب کی جان ہے - اگر کوئی شخص توحید کو اچھی طرح سمجھ لے تو مذہب کا بہت سا حصہ اُس پر روشن ہوجاتا ہے اور اس کی فطرت اُسے مذہب کی بہت سی تفصیلات

سورۃ کافرون مکی سورۃ ہے

سورۃ کافرون قرآن مجید کے چوتھے حصے کے برابر ہے

کی طرف خود راہنمائی کر دیتی ہے۔ اسی طرح قُلۡ یٰۤاَیُّھَا الۡکٰفِرُوۡنَ میں مذہب پر استقلال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اس میں بھی کیا شبہ ہے کہ سچائی کے مان لینے سے سچائی پر قائم رہنا کم اہم نہیں۔ جتنی خرابی دنیا میں سچائی کے نہ ماننے سے پیدا ہوتی ہے اتنی ہی یا اُس سے زیادہ خرابی سچائی پر قائم نہ رہ سکنے سے پیدا ہوتی ہے۔

اسلام آیا۔ لوگوں نے اس کو قبول کیا۔ خدا نے اُس کی طاقت اور قوت کو ظاہر کیا۔ وہ دنیا کے کناروں میں پھیل گیا۔ باوجود اس کے کہ دنیا کے نصف سے زیادہ حصہ نے ابھی اُسے تسلیم نہیں کیا تھا وہ ساری دنیا پر غالب آگیا اور بظاہر کوئی چیز اس کو کمزور کرنیوالی باقی نہیں رہی تھی مگر پھر وہ سمٹ سمٹا کر بقول رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم آسمان پر چلا گیا۔ آخر یہ کیوں ہوا؟ اس لئے نہیں کہ عیسائیت نے اسلام کو کوئی شکست دی۔ اس لئے نہیں کہ یہودیت نے اسلام کو کوئی شکست دی۔ اس لئے نہیں کہ بُدھ مذہب نے اسلام کو کوئی شکست دی۔ یا ہندو مذہب نے اسلام کو کوئی شکست دی۔ بلکہ محض اور محض اس وجہ سے کہ مسلمانوں نے اسلام پر قائم رہنے کو غفلت برتی اور ایک لباس پارینہ کی طرح اس کو اُتار کر پھینک دیا۔ اگر مسلمان اسلام پر قائم رہتے تو آج ساری دنیا مسلمان ہوتی۔ اور مسلمانوں کی جو بیکسانہ حالت اس وقت نظر آتی ہے اس کی بجائے وہ غالب اور مقتدر وجود نظر آتے۔ پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اگر اس وجہ سے اس سورۃ کو ربع قرآن قرار دیا تو بالکل سچ فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ اس سے بھی زیادہ اس سورۃ کی اہمیت قرار دیتے تب بھی درست ہوتا۔

مسند احمد حنبل۔ مسند ابوداؤد اور سنن ترمذی اور سنن نسائی میں لکھا ہے۔ نوفل بن معاویۃ الاشجعی نے ایک دن کہا۔ یا رسول اللہ مجھے وہ بات سکھائیے جو میں بستر پر لیٹتے وقت کہا کروں قَالَ اِقۡرَأۡ قُلۡ یٰۤاَیُّھَا الۡکٰفِرُوۡنَ ثُمَّ نَمۡ عَلٰی خَاتِمَتِھَا فَاِنَّھَا بَرَاءَۃٌ مِّنَ الشِّرۡکِ۔ آپ نے فرمایا قُلۡ یٰۤاَیُّھَا الۡکٰفِرُوۡنَ پڑھا کرو اور پھر اس کے آخری حصہ کو پڑھتے پڑھتے سو جایا کرو۔ کیونکہ اس میں شرک سے بیزاری کا ذکر ہے۔ اس حدیث سے بھی میرے اُس استدلال کی تصدیق ہوتی ہے جو میں نے اُوپر کیا ہے۔ مومن کا یہ پختہ ارادہ کہ وہ کبھی بھی باطل کو قبول نہیں کرے گا۔ اور خواہ کچھ ہو جائے وہ سچ کو نہیں چھوڑے گا ایک حیرت انگیز طاقت اس کے اندر پیدا کر دیتا ہے۔ اگر اس کی بجائے لوگ یہ ارادہ کر لیں کہ ہم اپنے سابق خیالات یا اپنے باپ دادا کے خیالات کو نہیں چھوڑیں گے یا مولویوں کے خیالات کو نہیں چھوڑیں گے تو پھر ان کی تباہی اور بربادی میں کوئی شک وشبہ ہی نہیں رہتا۔ اسی طرح اس حدیث سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان جن خیالات پر سوتا ہے وہ بہت مضبوطی کے ساتھ اس کے ذہن میں راسخ ہو جاتے ہیں۔ اسلام ہی ہے جس نے یہ نکتہ سب سے پہلے بیان کیا ہے۔ مگر مسلمان ہی ہیں جو اس نکتہ کو بھول گئے ہیں۔ انسانی دماغ صرف اُسی وقت کسی چیز کو نہیں سوچتا جب وہ اس کے کان میں کہی جاتی ہے۔ بلکہ جب بھی وہ فارغ ہوتا ہے وہ اس پر عقلی جگالی کرتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے بچہ کی پیدائش کے وقت اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہنے کا شریعت نے حکم دیا ہے اور اسی وجہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ جس وقت تم اپنے دنیوی کاموں سے فارغ ہو کر بستر پر لیٹو تو اور تمام باتوں کی طرف سے توجہ ہٹا کر کچھ دعائیں پڑھا کرو اور اُنہی کو سوچتے سوچتے سو جایا کرو۔ اس میں اسی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ رات کے وقت انسان کا دماغ فارغ ہوتا ہے اُس وقت وہ دن کی باتوں کو دہراتا ہے

اور اسی وجہ سے بعض دفعہ ایسے واقعات کے متعلق انسان کو خواب آجاتے ہیں جو دن کے وقت اُس نے دیکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ یا ایسے خیالات کے متعلق انسان کو رات کے وقت خواب آجاتے ہیں جو دن کے وقت اُس کے دل میں گذرے ہوتے ہیں یا ایسے نظاروں کے متعلق اُسے خواب آجاتے ہیں جو دن کے وقت اس کی آنکھوں کے سامنے سے گذرے ہوتے ہیں۔ اگر انسان سوتے وقت بعض اعلیٰ قسم کی دعائیں اور تسبیح اور تحمید کے کلمات دہراتے ہوئے اور سوچتے ہوئے سو جائے تو یقیناً اس کے دماغ میں رات کے فارغ اوقات میں وہی خیالات اور وہی باتیں گھومتی رہیں گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک لمبے عرصہ تک ان خیالات کے دماغ میں گھومنے کی وجہ سے وہ جڑ پکڑ جائیں گے اور مضبوطی سے قائم ہو جائیں گے اور آسانی سے نکالے نہیں جاسکیں گے۔ اور انسان کا ایمان مضبوط ہو جائیگا اور اس کو استقلال کی توفیق ملے گی۔

طبرانی اور ابو یعلیٰ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی کَلِمَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِنَ الْاِشْرَاکِ بِاللّٰہِ تَقْرَءُوْنَ قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ عِنْدَ مَنَامِکُمْ" یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایسی بات نہ بتاؤں جو تم کو اللہ تعالیٰ کے شرک سے بالکل بچالے، وہ بات یہ ہے کہ سوتے وقت تم قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ پڑھو۔ یہ حدیث بھی میرے اوپر کے استدلال کی تائید کرتی ہے۔

ابن مردویہ نے زید بن ملقم سے روایت کی ہے کہ جو شخص دو سورتیں لے کر خدا تعالےٰ کے سامنے حاضر ہوگا اس سے کوئی حساب نہیں لیا جائیگا اور وہ دو سورتیں قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ہیں۔ اِس حدیث کا بھی یہی مطلب ہے کہ جو شخص توحید پر قائم ہوگا اور استقلال سے اس پر قائم رہیگا جو ان دونوں سورتوں کا مضمون ہے تو وہ ہر ایک حساب سے بالا ہوگا۔

طبرانی۔ بزار اور ابن مردویہ نے خباب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب لیٹتے تو قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ پڑھا کرتے تھے (یعنی ساری سورۃ) اور ایسا کبھی بھی نہیں ہوتا تھا کہ آپ لیٹیں اور قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ کی ساری کی ساری سورۃ نہ پڑھیں۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ کی دونوں سورتیں طواف کی دونوں رکعتوں میں بھی پڑھا کرتے تھے۔

مسند احمد حنبل میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مہینہ پورا صبح کی دونوں رکعتوں میں قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ پڑھتے دیکھا ہے۔

اس سورۃ کے فضائل کے متعلق جبیر بن مطعم سے بھی ایک روایت ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا اَتُحِبُّ یَا جُبَیْرُ اِذَا خَرَجْتَ سَفَرًا اَنْ تَکُوْنَ اَمْثَلَ اَصْحَابِکَ ھَیْئَۃً وَاَکْثَرَھُمْ زَادًا یعنی اے جبیرؓ کیا تم پسند کرتے ہو کہ جب تم سفر کے لئے نکلو تو اپنے ساتھیوں میں سے سب سے زیادہ شان تمہارے چہرہ سے ٹپک رہی ہو اور سب سے زیادہ زادِ راہ تمہارے ساتھ ہو۔ جبیرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہاں! اس پر آپ نے فرمایا تب تم سفر میں یہ پانچ سورتیں پڑھا کرو یعنی سورۃ الکٰفرون سے لے کر قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ تک۔ سورۃ الکافرون سے آخر تک چھ سورتیں ہیں پس پانچ کے یہ معنے ہیں کہ سورہ تبّت کو اس گنتی میں سے آپ نے

نکال دیا ہے اور یا پھر الکافرون کے بعد کی سورتوں کو آپ نے پانچ قرار دیا ہے۔ یا پانچ راوی کی غلطی ہے اور مراد یہ ہے کہ الکافرون سمیت چھ یا الکافرون کو نکال کر اس کے بعد کی پانچ سورتیں۔

پھر آپ نے فرمایا جب پڑھنا شروع کرو تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر تلاوت شروع کیا کرو (یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہر سورۃ کا حصہ ہے) جُبیرؓ کہتے ہیں کہ میں مالدار نہ تھا اور جب میں سفر کرتا تھا تو سب ساتھیوں سے بُرا حال میرا ہوتا تھا۔ اور سب سے کم زاد میرے پاس ہوتا تھا۔ مگر اس کے بعد ان سورتوں کی برکت کی وجہ سے میرا حال سب ساتھیوں سے اچھا ہو گیا اور سب سے زیادہ زاد میرے پاس ہوتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم کی سورتوں کے پڑھنے میں برکات ہیں۔ جو شخص قرآن کریم پڑھتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اُس پر اپنا فضل نازل کرتا ہے مگر اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ ان سورتوں میں زیادہ تر غیر مذاہب کا مقابلہ ہے اور اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور مصائب کے وقت میں استقلال قائم رکھنے کی تلقین ہے اور توحید پر زور دیا گیا ہے اور باہمی لڑائی اور جھگڑے سے روکا گیا ہے۔ اور جب انسان ان مضامین کو بار بار اپنے ذہن میں لاتا ہے تو اس کے اندر یہ خصلتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور ان خصلتوں کی وقعت اور اہمیت بھی اس پر ثابت ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور جب وہ ان خصلتوں پر عمل کرتا ہے۔ تو غیروں کی نگاہ میں معزز ہو جاتا ہے اور اپنوں کی نگاہ میں اتحاد کا باعث بن جاتا ہے۔ جب بھی غیر دیکھیں کہ یہ شخص ہمارے حالات سے مرعوب ہو گیا ہے تو اُن کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں اور اس کی قوم کی عزت ان کی نظروں سے گر جاتی ہے۔ ۱۹۲۴ء میں میں انگلستان تبلیغ اسلام کے مواقع دیکھنے کے لئے گیا تھا۔ میں نے اُس وقت وہی لباس پہنے رکھا جو میں ہندوستان میں پہنتا تھا اور یورپین لوگ نہ صرف یہ کہ اس لباس کو ذلیل سمجھتے ہیں بلکہ چونکہ اُن کا رات کا لباس ایسا کھلا ہوتا ہے جیسے ہماری قمیص اور سلوار۔ اس لئے وہ ہماری قمیص اور سلوار کو رات کا لباس سمجھتے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ ہمیں اس لباس میں ننگا سمجھتے ہیں کیونکہ وہ رات کے لباس میں دوسروں کے سامنے نہیں آتے۔ ایک دن ہمارے مبلغ انچارج میرے پاس آئے اور بڑی تشویش سے کہنے لگے کہ آپ کے اس لباس کی وجہ سے یہاں لوگوں کو بہت ٹھوکر لگ رہی ہے۔ آپ اگر پتلون نہیں پہن سکتے تو کم سے کم علی گڑھ فیشن کا گرم پاجامہ پہن لیں اور قمیص کو اس کے اندر ٹھونس لیا کریں۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ آخر میں ایسا کیوں کروں۔ ان لوگوں کو میرے قومی لباس پر اعتراض کرنے کا حق کیا ہے؟ مبلغ صاحب نے کہا کہ حق ہو یا نہ ہو بہر حال اس سے بہت بُرا اثر پڑتا ہے اور ہماری قومی تحقیر ہوتی ہے۔ اُسی دن مجھ سے ملنے کے لئے لنڈن کے اورینٹل کالج کے پرنسپل[۱] سر ڈینی سن راس اور کچھ اور بڑے بڑے آدمی آئے۔ میں نے اُن کے سامنے یہی سوال رکھا اور کہا کہ کیا آپ لوگ اس لباس کو ذلیل سمجھتے ہیں؟ جیسا کہ یورپین تہذیب ہے انہوں نے کہا نہیں نہیں یہ کس طرح ہو سکتا ہے ہم آپ کے لباس کو بڑا اچھا سمجھتے ہیں۔ میں نے سمجھ لیا کہ محض مغربی تہذیب کے نتیجہ میں یہ ایسا کہہ رہے ہیں۔ ان کے دل میں یہ بات نہیں۔ میں نے پھر اصرار سے کہا کہ آپ میرے دوست ہیں سچ سچ بتایئے کہ آپ کی قوم پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے؟ اس پر انہوں نے کہا کہ سچی بات تو یہی ہے کہ ہمارے ملک کے لوگ اس لباس میں لوگوں کے سامنے آنے کو بُرا سمجھتے ہیں اور اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سر ڈینی سن راس علی گڑھ

[۱] SCHOOL OF ORIENTAL STUDIES

اور کلکتہ میں بھی پروفیسر رہ چکے تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ سر ڈینی سن آپ یہ بتائیے کہ جب آپ ہمارے ملک میں تھے تو کیا سلوار یا دھوتی پہنا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا تو پھر آپ یہ بتائیں کہ آپ ہمارے ملک میں جا کر اپنا ہی لباس رکھیں تو حرج نہیں اور ہم آپ کے ملک میں آکر اپنا لباس رکھیں تو یہ بُری بات ہے۔ کیا اس کے یہ معنے نہیں بنتے کہ آپ اپنی قوم کو بڑا سمجھتے ہیں اور ہماری قوم کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ اس لئے آپ ہم سے وہ مطالبہ کرتے ہیں جس مطالبہ کو انہی حالات میں آپ پورا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اور جب یہ بات ہے تو ایک ہندوستانی کی قومی غیرت کب برداشت کر سکتی ہے کہ وہ آپ کو خوش کرنے کیلئے اپنے لباس کو بدل لے۔ پھر میں نے اُن سے کہا کہ سچ سچ بتائیے جب ایک ہندوستانی کوٹ اور پتلون پہنتا ہے تو آپکا دل خوش نہیں ہوتا کہ اس نے ہماری قومی برتری کو تسلیم کر لیا ہے اور ہمارے لباس کو اختیار کر لیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ معیّن صورت میں یہ خیال آئے یا نہ آئے لیکن دماغ کے پس پردہ تو یہ خیال ضرور ہوتا ہوگا اور ہوتا ہے۔ میں نے کہا اس سے دوسرے لفظوں میں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص اپنا لباس آپ کے ملک میں نہیں چھوڑتا آپکو اس پر غصہ بھی آتا ہے۔ آپ اپنی ہتک بھی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن آپکے دماغ کے پس پردہ یہ خیال بھی رہتا ہے کہ یہ شخص ہم سے اور ہماری تہذیب سے ڈرا نہیں۔ اس پر وہ کچھ کھسیانے سے ہو کر کہنے لگے کہ بات تو ٹھیک ہے تب میں نے ان سے کہا کہ میں ہندوستان سے چلتے ہوئے یہاں کی سردی کا خیال کر کے گرم کپڑے کے ایسے پاجامے سلوا کر اپنے ساتھ لایا تھا جو علی گڑھ فیشن کے ساتھ ملتے تھے وہ دیکھنے میں پتلون نما معلوم ہوتے ہیں گو ان کے اندر ازار بند استعمال ہوتا ہے لیکن اب میں وہ کپڑے نہیں پہنونگا اور اسی طرح واپس لے جاؤنگا کیونکہ میں انگریز کے ہندوستان پر حاکم ہو جانے کی وجہ سے نہ اپنے ملک کے لوگوں کو انگریز سے کمتر سمجھتا ہوں اور نہ اپنے ملک کی تہذیب کو اس کی تہذیب سے کمتر سمجھتا ہوں اور انگریزی تہذیب اور اس کے تمدن کی نقل کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو تجیز فرمایا ہے یہ بات فرمائی کہ تم یہ سورتیں پڑھو تو تمہارا رعب بڑھ جائیگا۔ اس سے درحقیقت اسی طرف اشارہ تھا کہ ان سورتوں میں اسلام کی مرکزی تعلیم کو پیش کیا گیا ہے اور اس پر مخالفت کے باوجود مستقل رہنے کی ہدایت کی گئی ہے اور جو شخص بھی مخالفانہ ماحول میں اپنے خیالات پر قائم رہنے کی جرأت دکھلائے گا لازماً وہ اپنی اور اپنی قوم کی عزت قائم کر دے گا۔ اور یہ جو فرمایا کہ اس سے تمہارا زاد راہ بڑھ جائے گا۔ اس میں بھی درحقیقت اسی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص دوسروں کے آگے سرنگوں ہونے سے انکار کر دے گا اُسے یہ کبھی خیال نہیں آئے گا کہ کوئی میری خبرگیری کرے گا اور میری مدد کرے گا اور جب وہ لوگوں کی امداد کے خیال سے اپنے خیالات کو آزاد کرے گا تو لازماً وہ حلال روزی اور باعزت روزی کے لئے کوشش بھی کرے گا۔

کاش ہمارے نوجوان مغربی ممالک کی طرف سفر کرتے ہوئے یا ان ملکوں میں سفر کرتے ہوئے ان سورتوں کو پڑھیں اور اُن کے مضمون پر غور کریں تو یقیناً وہ کفر کی طاقتوں سے کبھی متاثر نہ ہوں اور اپنی بے بسی اور اپنی ذلت اور اپنی قوم کی کمتری کا احساس اُن کے دلوں سے جاتا رہے۔ حق یہ ہے کہ انسان ظاہری حالات سے اُتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا کہ وہ اپنی شکست خوردہ ذہنیت سے متاثر ہوتا ہے۔ حالات کی کمزوری کو بڑی آسانی سے بدلا جا سکتا ہے لیکن شکست خوردہ ذہنیت کا بدلنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ ایشیا کی گری ہوئی مالی حالت میں بھی لاکھوں لکھ پتی اور کروڑپتی موجود ہیں لیکن شکست خوردہ ذہنیت سے محفوظ بہت کم لوگ ہیں۔ باوجود یورپ کے شدید مقابلہ کے

دولت تو ہم نے کھالی لیکن اپنی ذہنیت کو اُن کے حملے سے محفوظ نہیں کرسکے اور یہی شکست خوردہ ذہنیت ہے جس کی اصلاح کی طرف ان سورتوں میں توجہ دلائی گئی ہے اور جس کا سامان ان سورتوں میں پیدا کیا گیا ہے۔

سورۃ کافرون کا ایک اور نام

اصمعی کہتے ہیں کہ پہلے زمانہ کے لوگ (یعنی تابعی اور صحابہؓ) کہا کرتے تھے کہ سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص مقشقشتان ہیں (یعنی یہ سورتیں نفاق سے بچانے والی ہیں اور قوت ایمانیہ پیدا کرنے والی ہیں) اور ابو عبیدہؓ کہتے تھے کہ جس طرح رال کھجلی کو دور کرکے تندرست کر دیتی ہے۔ اسی طرح یہ سورتیں انسان کو شرک سے صحت بخشتی ہیں۔ (قرطبی)

سورۃ کافرون کا وقتِ نزول

وقتِ نزول:- نولڈکے کا خیال ہے کہ یہ سورۃ مکی زندگی کے پہلے دور کے آخری زمانہ کی ہے یعنی چوتھے سال کے قریب کی۔ اور اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ اسی وقت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کفار سے بحث کرنے کے قابل ہوئے تھے۔ کیونکہ مسلمانوں اور مشرکوں میں بحث اور مجادلہ کے ابتدائی زمانہ کے بعد دونوں فریق کے اصولی خیالات متعین ہو گئے تھے اور وہی وقت درحقیقت مذہبی بحث کا ہوتا ہے۔

نولڈکے کا یہ خیال اس حد تک ٹھیک ہے کہ کسی مذہب کے ابتدائی زمانہ میں چونکہ اس کے پیش کردہ خیالات کی جدت کی وجہ سے اسکے منکرین اسکی حقیقت کو پوری طرح نہیں سمجھتے اس لئے اس مذہب کے متعلق بحث محض سطحی ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ تبادلہ خیالات کے بعد نئے مذہب کے ماننے والے بھی اپنی باتوں کو ایک معیّن صورت میں پیش کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور مخالفین بھی اپنے پراگندہ خیالات کو ایک معیّن صورت دیدیتے ہیں۔ پس ایک جدید تحریک جو ایک سابقہ شکستہ تحریک کی جگہ لینے کیلئے پیدا ہوتی ہے اس کے اعلان کے چند سال بعد لوگ اس قابل ہوتے ہیں کہ زیادہ معیّن اور مشخص صورت میں دونوں قسم کے خیالات کا جائزہ لے سکیں اور اندازہ کرسکیں۔ اور چونکہ اس سورۃ میں ایک قطعی چیلنج اپنے مخالفین کو دیا گیا ہے۔ اس لئے نولڈکے اس اندرونی شہادت کی بناء پر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ یہ سورۃ پہلے دور کے آخری زمانہ کی ہے۔

ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کا نزول حالات کے تابع نہیں بلکہ وہ تو اصولی ضرورت کو دیکھتا ہے۔ بدیوں کا رد کرتا ہے اور نیکیوں کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ لیکن باوجود اس خیال کے ظاہر کرنے کے ہم اس سورۃ کے متعلق تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں کہ جہاں تک اس کے چیلنج کا سوال ہے وہ اُسی وقت دیا گیا ہو جبکہ اسلام کے مخالف اس چیلنج کو قبول کرنے اور سمجھنے کے قابل ہو گئے ہوں۔ پس اس سورۃ کے متعلق ہمیں اس بات کے تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ نولڈکے کے خیال کے مطابق اگر تاریخ کی شہادت اس کے خلاف نہ ہو تو یہ سورۃ چوتھے سال کے شروع میں یا اس سے کچھ پہلے نازل ہوئی ہو۔ کیونکہ وہی وقت تھا جبکہ مخالف اسلام کے دعویٰ کو ایک معیّن صورت میں اپنے ذہنوں میں لانے کے قابل ہو گئے اور اس کے مقابلہ میں اپنے مذہب کے بھی کوئی معیّن اصول انہوں نے طے کر لئے اور اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر کسی نہ کسی رنگ میں اس سے صلح کرنے کا خیال ان کے دلوں میں پیدا ہونے لگا (گو جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے اس سورۃ کا صرف اتنا ہی مضمون نہیں ہے بلکہ اس سورۃ میں بہت زیادہ وسیع مطالب پائے جاتے ہیں۔ مگر یہ بعید نہیں کہ اس کے ایک مضمون کی وجہ سے اس کے مناسبِ حال وقت پر اس سورۃ کا نزول ہو گیا ہو) بہرحال نولڈکے مستشرقین میں سے ایک بہت بڑی اہمیت رکھنے والا شخص ہے بلکہ مستشرقین کا سردار سمجھا جاتا ہے۔ پس مستشرقین کو اس بات کے ماننے سے انکار نہیں ہو سکتا کہ انکی اپنی جماعت

کے اصول کے مطابق یہ سورۃ چوتھے یا حد سے حد پانچویں سال کے شروع میں نازل ہوئی ہے اور یہ امر تسلیم کر لینے کے بعد سورۂ نجم کے متعلق جو روایات وہ نقل کرتے ہیں انکی تردید آپ ہی آپ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ سورۂ نجم پانچویں سال یا اس کے بعد کی ہے۔ پس لازماً سورۂ کافرون اس سے پہلے کی ہے۔ اور اگر سورۂ نجم سورۂ کافرون سے بعد کی ہے جیسا کہ ہمارا بھی یقین ہے اور جیسا کہ مستشرقین کے تسلیم کردہ اصول کے مطابق بھی یہ بات ثابت ہے تو پھر کوئی عقلمند یہ بات کس طرح مان سکتا ہے کہ مشرکین کے جس مطالبہ کا رد سورۂ کافرون میں قطعی طور پر کر دیا گیا تھا سورۂ نجم میں اُسی مطالبہ سے متاثر ہو کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان پر کوئی ایسے الفاظ جاری ہو گئے جو کہ شرک کی کسی قدر تائید کرتے تھے۔ نعوذ باللہ من ذالک

غرض اس سورۃ کے وقتِ نزول کے متعلق جو مستشرقین نے بحث کی ہے وہ سورۂ نجم کے مشہور واقعہ کی تردید کے لئے ایک بہت بڑا ثبوت بہم پہنچا دیتی ہے۔

ترتیب :- یہ سورۃ اپنے محل کے لحاظ سے جیسا کہ میں اُوپر لکھ آیا ہوں آخری زمانہ کے متعلق معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ پہلی سورۃ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ساتھ تعلق رکھتی تھی۔ پس گو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے لوگ بھی اس میں شامل ہو سکتے ہیں اور ہیں لیکن زور آئندہ زمانہ کے متعلق ہے۔

اس سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ ایک زمانہ میں کفر پھر اسلام پر غالب آجائیگا اور جہانتک مادی حالات کا سوال ہے اسلام قریباً قریباً ختم ہو جائیگا۔ لیکن اس وقت پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی روح دوبارہ دنیا میں کسی اپنے مثیل اور شاگرد کے ذریعہ سے ظاہر ہو گی اور دنیا کو پھر وہی چیلنج دیگی جو پہلے آپ نے دیا تھا اور کہے گی کہ خواہ کتنا زور لگا لو میں کفر سے مغلوب نہیں ہونگا اور کفر کی باتوں کو تسلیم نہیں کرونگا۔ یہ وہی زمانہ ہے جس کو مہدی یا مسیح کا زمانہ کہا جاتا ہے اور جس وقت دجّال یا یاجوج و ماجوج نے یعنی عیسائیت کے مذہبی اور سیاسی ظہور نے اسلام پر غلبہ پانا تھا اور بظاہر اسلام کی شان و شوکت کو مٹا کر عیسائیت کی حکومت کو مستحکم طور پر قائم کر دینا تھا۔ یہ سورۃ بتاتی ہے کہ جہاں عام طور پر مسلمان مغربی خیالات سے متاثر ہو کر اس کے آگے ہتھیار ڈال دیں گے وہاں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی روح غیر اسلامی خیالات کے آگے ہتھیار ڈالنے سے کلّی طور پر انکار کر دیگی اور باوجود اس کے کہ تشدد اور زبردستی سے اس زمانہ میں اسلام بالکل کام نہیں لیگا پھر بھی وہ کفر پر غالب آجائیگا اور انسانوں کے دل کفر و الحاد سے پاک ہو کر پھر اسلام کی طرف راغب ہو جائیں گے۔

اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے ایک قریب کا تعلق بھی ہے پہلی سورۃ میں یہ بتایا گیا تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر بڑے بڑے انعامات نازل کئے جائیں گے۔ ایسے بڑے بڑے انعام جن کی مثال دنیا میں اور کہیں نہیں ملیگی اور آپ کو اللہ تعالیٰ ایک نئے آدم کی حیثیت کے طور پر دنیا میں پیش کرے گا جس کے مقابلہ میں اس کے دشمنوں کی نسل تباہ ہو جائے گی اور صرف آپ کی نسل باقی رہ جائے گی۔ سورۂ کافرون میں اللہ تعالےٰ اس پہلی سورۃ کے مضمون کی طرف اشارہ کر کے فرماتا ہے کہ اے محمد رسول اللہؐ کے منکرو! تم اتنے بڑے انعامات کو دیکھ کر بھی مسلمان نہیں ہوتے تو اتنا تو سوچو کہ محمد رسول اللہؐ اور اُن کے اتباع کے متعلق تم یہ کس طرح خیال کر سکتے ہو کہ تمہاری واہی اور کمزور عقائد اور تمہاری بے دلیل باتوں سے متاثر ہو کر وہ اپنا دین چھوڑ دیں گے۔ اگر وہ ہم اپنے مقام کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تو مشاہدہ اپنے مقام کو کس طرح چھوڑ سکتا ہے۔ پس تمہاری یہ سب کوششیں خلاف عقل ہیں۔ اِن حالات میں تو تم کو خاموش ہو کر بیٹھ جانا چاہیئے تھا۔ اور خدا تعالیٰ کے فیصلہ کا انتظار کرنا چاہیئے تھا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝۱

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الۡکٰفِرُوۡنَ ۝۲

(ہم ہر زمانہ کے مسلمان سے کہتے ہیں کہ) تو (کفار سے) کہتا چلا جا (کہ) سنو اے کافرو!

لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۝۳

میں تمہارے طریق عبادت کے مطابق عبادت نہیں کرتا۔

وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۝۴

اور نہ تم میرے طریق عبادت کے مطابق عبادت کرتے ہو

وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۝۵

اور نہ میں (ان کی) عبادت کرتا ہوں جن کی تم عبادت کرتے چلے آئے ہو۔

وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۝۶

اور نہ تم (اس کی) عبادت کرتے ہو جس کی میں عبادت کر رہا ہوں ؎۲

الکٰفرون سے مراد ہر زمانہ کے کافر ہو سکتے ہیں

؎۲ **تفسیر۔** اَلۡکٰفِرُوۡن سے مراد خاص کافر بھی ہو سکتے ہیں اور سارے کافر جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ہوں یا بعد کے زمانہ کے وہ بھی مراد ہو سکتے ہیں اور جیسا کہ اوپر کے نوٹ سے ظاہر ہے اس جگہ دونوں ہی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے کفار کو بھی مخاطب کیا گیا ہے اور آپ کے زمانہ کے بعد آنیوالے کفار کو بھی مخاطب کیا گیا ہے اور مکہ کے کفار کو بھی مخاطب کیا گیا ہے اور عیسائیوں اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو بھی مخاطب کیا گیا ہے جن کا زور آخری زمانہ میں ہونا تھا پس اس آیت میں الکٰفرون کے دونوں ہی معنے ہیں یہ بھی معنے ہیں کہ اے مکہ کے کافرو! میں تم سے مخاطب ہو کر یہ بات کہتا ہوں اور یہ معنے بھی ہیں کہ اے قیامت تک کے کفار! خصوصاً زمانہ آخر کے کفار! جن کے زمانہ میں پھر اسلام کمزور ہو کر ان کے رحم و کرم تلے آچکا ہوگا میں تم سے مخاطب ہو کر یہ بات کہتا ہوں۔

لفظ قُلۡ کہنے میں حکمت

قُلۡ :۔ قُلۡ کے لفظ سے اللہ تعالےٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ تو ان لوگوں کو مخاطب کر کے یہ کہہ دے۔ حالانکہ اس آیت کے الفاظ وسیع ہیں اور اس میں مخاطب آئندہ زمانہ کے لوگ بھی ہیں۔ صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے لوگ مراد نہیں ہیں۔ اس سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت بروزی طور پر بار بار دنیا میں ظاہر ہوگی۔ اگر خدا تعالیٰ

بندوں سے خطاب کرتا تب تو اور بات تھی لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنا کہ تُو ہر زمانہ کے لوگوں سے یہ کہہ دے یہ ایک واضح اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسیہ ہر زمانہ میں دنیا میں ظاہر ہوتی رہے گی۔ کبھی چھوٹے پیمانہ پر۔ کبھی بڑے پیمانہ پر۔ اسی کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اشارہ فرمایا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَاْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا (ابو داؤد کتاب الملاحم) یعنی اللہ تعالیٰ میری اُمت میں ہر سو سال کے بعد کوئی نہ کوئی شخص ایسا مبعوث کرے گا جو اُس صدی کی غلطیوں کو جو کہ دین کے بارہ میں لوگوں کو لگ گئی ہوں گی دُور کر دیگا۔ یہ قُلْ بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ گویا اس حدیث کے مطابق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کم سے کم ہر صدی کے سر پہ دنیا میں ظاہر ہوں گے اور وہ لوگ جو آپ کے بتلائے ہوئے رستے کے خلاف چلنے والے ہونگے اُن کو چیلنج کریں گے کہ میں تمہارے طریق کو کبھی اختیار نہیں کروں گا اور اُسی طریق کو اختیار کروں گا جو خدا نے مجھے بتایا ہے اور اس طرح اسلام ہر زمانہ میں دُھل دُھلا کر پھر نیا بن جایا کرے گا۔ مسیح اور مہدی کے زمانہ میں یہ بات زیادہ نمایاں طور پر ہونے والی ہے کیونکہ اس زمانہ کے متعلق بہت بڑے فتنوں کی پیشگوئی ہے یہاں تک کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مَا بُعِثَ نَبِیٌّ اِلَّا وَ قَدْ اَنْذَرَ اُمَّتَهُ الدَّجَّالَ (کتاب الملاحم لابی داؤد باب خروج الدجال) یعنی جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے تمام انبیاء نے دجال کے فتنے سے اپنی اُمت کو ڈرایا ہے۔

یا حرفِ نداء ہے اور جب اس کے بعد الف لام تعریف کا آتے تو چونکہ تعریف کے الف لام کا ہمزہ وصلی ہوتا ہے اور یا کو اس کے ساتھ جوڑنے میں عرب غرابت محسوس کرتا ہے اس لئے یا اور اس الف لام کے درمیان اَيُّهَا کا لفظ بڑھا دیا جاتا ہے۔ بعض نحویوں نے تو صرف اتنی ہی غرض اس کی بتائی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں ھا کی وجہ سے ایک زائد معنے تنبیہ کے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر بہرحال تنبیہ ہو یا نہ ہو عرب لوگ یا کے بعد تعریف کے الف لام سے پہلے اَيُّهَا کا لفظ بڑھا دیتے ہیں۔ صرف لفظ اَللّٰه سے پہلے اَيُّهَا کا لفظ نہیں بڑھایا جاتا حالانکہ اس سے پہلے بھی الف لام ہے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اَللّٰه میں جو الف لام ہے وہ تعریف کا الف لام نہیں بلکہ اسم ذات کا حصہ ہے۔ جو لوگ اَيُّهَا کو تاکید کے معنوں میں لیتے ہیں وہ اس جگہ پر یہ معنے کرتے ہیں "سُن رے اے شخص" یا "سنو رے! اے لوگو" گویا عام محاورہ کے رُو سے تو يَا اَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کے معنے ہوں گے "اے تمام کے تمام کافرو! خواہ وہ عرب کے ہو یا کسی اور ملک کے یا اس زمانہ کے ہو یا آئندہ کسی زمانہ میں آنے والے ہو" لیکن اَيُّهَا کو تنبیہ کے معنوں میں قرار دیکر اس کے یہ معنے بن جائیں گے کہ اے کفار خواہ تم کسی زمانہ سے تعلق رکھتے ہو کان کھول کر سُن رکھو۔

اَلْكٰفِرُوْنَ۔ كَفَرَ کے معنے انکار کے ہوتے ہیں خواہ وہ کسی چیز کا انکار ہو۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اچھے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (البقرۃ ع) جو لوگ شیطانوں اور شیطانی لوگوں کی باتیں ماننے سے قطعی طور پر انکار کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر سچے دل سے ایمان لے آتے ہیں وہ ایک مضبوط چٹان پر قائم ہو جاتے ہیں اور قرآن کریم میں يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ (النساء ع) بھی آتا ہے کہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں پس جہاں تک اس لفظ کے ظاہر کا تعلق ہے یہ نہ بُرا ہے نہ اچھا ہے۔ اصل معنے تو اس کے ڈھانپ دینے کے ہوتے ہیں۔ بدی کا ڈھانپنا بھی کفر کہلائیگا اور نیکی کا ڈھانپنا بھی کفر کہلائے گا۔ بدی کا چھپانا بھی کفر کہلائے گا اور نیکی کا چھپانا بھی کفر کہلائے گا۔ لیکن چونکہ

کثرت سے قرآن کریم میں یہ لفظ نیکی کے انکار کے متعلق استعمال ہوا ہے۔ اس لئے جب کسی قرینہ کے بغیر یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے بُرے ہی لئے جاتے ہیں جس طرح مومن کے معنے بھی ایسے ہی ہیں لیکن وہ زیادہ تر نیکی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے جب مومن کا لفظ بغیر قرینہ کے استعمال ہو تو اس کے معنے ہمیشہ نیک کے لئے جائیں گے۔ حالانکہ قرآن کریم میں مومن کا لفظ بھی بُرے معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ فرماتا ہے يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ (النساء ع) وہ شیطان اور شیطانی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور یہ جو قرآنی استعمال ہے یہ بلا وجہ نہیں اس کے اندر بھی حکمت ہے۔ چنانچہ ایمان کے لفظ میں گو ماننے کے معنے پائے جاتے ہیں لیکن اصل معنے اِیْمَان کے امن دینے اور برکت دینے کے ہیں۔ اور امن اور برکت اچھے لفظ ہیں پس چونکہ ابتدائی معنوں کے لحاظ سے یہ لفظ اچھا ہے اس لئے اکثر طور پر اسے اچھے ہی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور جب کوئی اس کے ساتھ قرینہ نہ ہو تو اس کے اچھے ہی معنے سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں کفر کے معنے چھپا دینے کے ہیں اور چھپانے کا مفہوم اپنی ذات میں اچھا مفہوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ بُرائی کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ بالخاصہ اکثر برائی ہی چھپائی جاتی ہے۔ پس جب تک کوئی خلاف قرینہ نہ ہو یہ لفظ اپنے اصلی معنوں کے لحاظ سے بُرے ہی معنوں میں سمجھا جائے گا ہاں قرینے کے ساتھ کبھی اس کے اچھے معنے بھی ہو جائیں گے پس لفظ کُفر بغیر قرینے کے بُرا ہے اور لفظ ایمان بغیر قرینہ کے اچھا ہے گو دونوں ہی بُری یا اچھی نسبت کے ساتھ اُلٹے معنے بھی دے دیتے ہیں۔

(الف) اس جگہ پر اَلْكَافِرُوْنَ کے معنے تمام مفسرین نے کفارِ مکہ کے کئے ہیں۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے دُرِّ منثور میں ایسی روایات نقل کی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورۃ مکہ کے مشرکوں کے بعض سوالات کے جواب میں نازل ہوئی تھی۔

علامہ شوکانی جو فتح القدیر کے مصنف ہیں وہ لکھتے ہیں کہ الف لام اس جگہ پر جنس کا آیا ہے یعنی تمام کافروں کی طرف اشارہ ہے لیکن مراد وہ کفار مکہ ہیں جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارہ میں کچھ سوالات کئے تھے اور جو کفر کی حالت میں مرے۔

علامہ ابن جریر بھی اپنی تفسیر جامع البیان میں یہی لکھتے ہیں کہ اس کے معنے یہ ہیں کہ قُلْ يَا مُحَمَّدُ لِهٰؤُلَاءِ الْمُشْرِكِيْنَ الَّذِيْنَ سَأَلُوْكَ۔ یعنی اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) ان مشرکوں سے جنہوں نے تجھ سے بعض سوالات کئے ہیں یوں کہدے۔

تفسیر روح البیان میں شیخ اسمٰعیل حقی بروسوی لکھتے ہیں وَهُمْ كَفَرَةٌ مَخْصُوْصَةٌ۔ اور وہ لوگ جن کا اس آیت میں ذکر ہے وہ ایک مخصوص جماعت کفار کی ہے جن کے متعلق یہ فیصلہ تھا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ پھر آگے لکھتے ہیں فَلَا يَرِدُ اَنَّ مُقْتَضٰى هٰذَا الْاَمْرِ اَنْ يَقُوْلَ كُلُّ مُسْلِمٍ ذٰلِكَ لِكُلِّ جَمَاعَةٍ مِّنَ الْكُفَّارِ۔ یعنی اس آیت کا مخصوص ہونا یہ لازمی نہیں قرار دیتا کہ ہم اس کا مخاطب ہر مسلمان کو نہ سمجھیں اور یہ نہ سمجھیں کہ ہر مسلمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہر قسم کے کافر کو یہ بات کہہ دے۔

علامہ آلوسی اپنی کتاب تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں قَالَ اَجِلَّةُ الْمُفَسِّرِيْنَ الْمُرَادُ بِهِمْ كَفَرَةٌ مِّنْ قُرَيْشٍ مَخْصُوْصُوْنَ قَدْ عَلِمَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنَّهُمْ لَا يَتَاَتّٰى مِنْهُمُ الْاِيْمَانُ اَبَدًا۔ یعنی تمام بڑے مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں الکٰفرون سے مراد قریش کے وہ کافر ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ وہ کبھی بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

علامہ قرطبی اپنی تفسیر الجامع لاحکام القرآن میں لکھتے ہیں الف لام یہاں معہود ذہنی کے لئے آیا ہے یعنی ایسے کفار جن کا ذکر ذہن میں موجود ہے اور اگر اس کو جنس کے لئے سمجھا جائے

تب بھی اس سے مراد یہ ہے کہ وہ کفار جن کے متعلق خدا تعالےٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ کافر ہی مریں گے پس یہ خصوص معنوں پر دلالت کرتا ہے جس کا ذکر عام الفاظ میں آیا ہے۔

ماوردی نے بھی لکھا ہے کہ عَنِیَ بِالْکٰفِرِیْنَ قَوْمًا مُّعَیَّنِیْنَ لَا الْجَمِیْعُ اَلْکٰفِرِیْنَ۔ یعنی اَلْکٰفِرُوْن کے لفظ سے ایک معیّن جماعت مراد ہے نہ کہ سارے کفار۔ لِاَنَّ مِنْھُمْ مَّنْ اٰمَنَ فَعَبَدَ اللّٰہَ کیونکہ ان کفار میں سے بعض ایمان بھی لے آئے اور انہوں نے اللہ تعالےٰ کی عبادت کی وَمِنْھُمْ مَّنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ عَلٰی کُفْرِہٖ اور اُن میں سے بعض ایسے تھے جو مر گئے یا کفر کی حالت میں قتل کئے گئے اور وہی اس قول یٰۤاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ کے مخاطب ہیں۔

علامہ زمخشری اپنی تفسیر کشاف میں لکھتے ہیں۔ اَلْمُخَاطَبُوْنَ کَفَرَۃٌ مَّخْصُوْصَۃٌ قَدْ عَلِمَ اللّٰہُ مِنْھُمْ اَنَّھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔ مخاطب اس آیت کے چند مخصوص کفار ہیں جن کے متعلق اللہ تعالےٰ کو یہ علم ہو گیا تھا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

علامہ محمد ابن حیّان اپنی تفسیر البحر المحیط میں لکھتے ہیں وَالْکٰفِرُوْنَ نَاسٌ مَّخْصُوْصُوْنَ اور کفار سے اس جگہ پر مراد کچھ مخصوص لوگ ہیں جنہوں نے آپ سے سوالات کئے تھے۔

ان حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مفسرین کے نزدیک یہ آیت مشرکین مکہ کے متعلق ہے اور مشرکین مکہ بھی سارے کے سارے مخاطب نہیں بلکہ اُن میں سے ایک خاص جماعت مخاطب تھی جنہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کچھ سوالات کئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خاص دلائل کی وجہ سے یا سیاق و سباق کی وجہ سے ایک عام لفظ کو خاص معنوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے اور قرآن کریم میں ایسی مثالیں موجود ہیں لیکن بلا وجہ ایسا کرنا جائز نہیں کیونکہ اس کے یہ معنے ہو جاتے ہیں کہ ہم قرآن کریم کے معنوں کو محدود کرتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں اس کے وسیع مطالب کو تنگ دائرہ میں لے آتے ہیں اور اس کے سمندر کو ایک چھوٹا دریا بنانے کی کوشش کرتے ہیں جو قرآن کریم کی خدمت نہیں بلکہ اس سے دشمنی ہے۔ پس ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا کوئی ایسی دلیل موجود ہے جو ہمیں مجبور کرتی ہو کہ اس جگہ پر ہم ان وسیع معنوں کو جو لغت اور محاورہ قرآن کے لحاظ سے نکلتے ہیں محدود کر سکیں۔ لغت کے لحاظ سے کافر کے معنے انکار کرنے والے کے ہوتے ہیں اور اس میں مشرک یا غیر مشرک۔ مکی یا غیر مکی کا کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا۔ ہر شخص جو کسی بات کا انکار کرے کافر کہلائے گا۔ اور اَلْکٰفِرُوْن سے مراد وہ تمام کے تمام لوگ ہوں گے جو منکرین میں شامل ہوں گے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زبان عربی کے محاورہ کے مطابق بلکہ قریبًا ہر زبان کے محاورہ کے مطابق کبھی الفاظ بظاہر حدبندی ظاہر کرتے ہیں لیکن معنوں میں عمومیت ہوتی ہے اور کبھی الفاظ عمومیت ظاہر کرتے ہیں لیکن معنوں میں محدودیت ہوتی ہے اور یہ طریق استعمال اختصار کی وجہ سے اختیار کیا جاتا ہے مثلاً کبھی ہم کسی ایک شخص کو ذہن میں رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شریر ہمیشہ سزا پاتا ہے۔ ہمارے لفظ عام ہوتے ہیں لیکن مراد کوئی خاص شخص ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی ہم کسی جھوٹے کو مخاطب کر کے یہ کہتے ہیں کہ تم نے جھوٹ بولا ہے اب تم ذلیل ہو جاؤ گے لیکن مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ ہر جھوٹ بولنے والا ذلیل ہوتا ہے اس لئے وہ بھی ذلیل ہو جائیگا پس مخصوص کو عام کر دینا اور عام کو مخصوص کر دینا یہ ایک ایسا قاعدہ ہے جو قریبًا ہر زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ یہ زبان کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اگر اس طریق کو استعمال نہ کیا جائے تو بعض چھوٹے چھوٹے مضمونوں کے لئے بڑے بڑے فقرے اور لمبی لمبی عبارتیں استعمال کرنی پڑیں۔ بے شک غلط فہمی کا امکان ہو سکتا ہے لیکن عبارت کا سیاق و سباق یا کلام کا موقعہ و محل

غلطی کے امکان کو دُور کر دیتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی یہ طریق استعمال کیا گیا ہے لیکن اصول فقہ کے علماء نے عام اصول یہ لکھا ہے کہ گو عام الفاظ سے خاص جماعت بھی مراد ہو سکتی ہے اور خاص جماعت سے عام جماعت بھی مراد ہو سکتی ہے لیکن غالب قاعدہ یہ ہوگا کہ عمومیت کو خصوصیت کے اوپر فائق سمجھا جائے گا یعنی جب ایک مضمون عام ہے تو مخصوص الفاظ کی وجہ سے اُس کو مخصوص جماعت کے ساتھ وابستہ نہیں کیا جائیگا بلکہ باوجود مخصوص الفاظ کے اس کے مضمون کو عام قرار دیا جائے گا اور اس سے دلیل پکڑی جائے گی لیکن عام الفاظ کو مخصوص کرنے کے لئے نہایت واضح قرینہ کی ضرورت ہوگی اور بغیر کسی زبردست دلیل کے اس عام مضمون کو محدود نہیں کیا جاسکیگا چنانچہ علامہ سیوطی اپنی کتاب اتقان میں لکھتے ہیں کہ اِخْتَلَفَ اَھْلُ الْاُصُوْلِ ھَلِ الْعِبْرَۃُ بِعُمُوْمِ اللَّفْظِ اَوْ بِخُصُوْصِ السَّبَبِ وَالْاَصَحُّ عِنْدَنَا اَلْاَوَّلُ۔ (اتقان) یعنی اصول فقہ کے علماء نے اس بارہ میں اختلاف کیا ہے کہ الفاظ کی عمومیت کی وجہ سے معنے بھی عام لئے جائیں گے یا جو مخصوص سبب کلام کا موجب ہُوا ہوگا اس کی وجہ سے معنوں کو مخصوص کر دیا جائے گا۔ پھر وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہی درست ہے کہ اگر لفظ عام ہوں تو خواہ سبب خاص ہو معنے عام ہی لئے جائیں گے خاص سبب کی وجہ سے معنوں کو محدود نہیں کیا جائے گا۔

شیخ محمد الخضری پروفیسر تاریخ اسلامی جامعہ مصری لکھتے ہیں اَلْعَامُ اِذَا وَرَدَ اُخِذَ عَلٰی عُمُوْمِہٖ اِلَّا اِذَا قَامَ دَلِیْلُ التَّخْصِیْصِ وَھُوَ الْمُخَصِّصُ۔ یعنی جب الفاظ عام ہوں تو معنے بھی عام ہی لئے جائیں گے سوائے اس کے کہ تخصیص کی کوئی دلیل ہو اور اگر ایسا ہو تو معنے اس تخصیص کی دلیل کی وجہ سے مخصوص ہو جائیں گے نہ کہ الفاظ کی وجہ سے (کتاب اصول فقہ صـ۲۳۴)

لیکن جیسا کہ بتایا گیا ہے یہ بات ہی درست ہے کہ بعض جگہ مضمون عام ہوتا ہے لیکن بات ایک خاص گروہ کے متعلق ہوتی ہے اور بعض جگہ پر ایک خاص گروہ کو مخاطب کیا ہوتا ہے لیکن مضمون تمام لوگوں پر منطبق ہوتا ہے بشرطیکہ ایسا کرنے پر کوئی قرینہ دلالت کرتا ہو۔ اس لئے ہم اُن مفسرین کو جنہوں نے اس آیت کو خاص قوم یا خاص افراد پر منطبق کیا ہے اگر اُن کے پاس دلیل ہو غلطی پر نہیں کہیں گے کیونکہ یہ چیز جائز ہے اور قرآن کریم میں بھی مستعمل ہے اور دنیا کی باقی زبانوں میں بھی مستعمل ہے۔ پس اصل سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آیا اس سورۃ کے متعلق کوئی ایسا قرینہ موجود ہے جس کی وجہ سے ہم یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ کے الفاظ کو ایک محدود جماعت کی طرف منسوب کر دیں اور عمومیت سے اس کو خارج کر دیں۔ سو اس کے سمجھنے کے لئے پہلے ہم خود قرآنی عبارت کو لیتے ہیں۔ اس سورۃ میں یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ کے الفاظ رکھے گئے ہیں اور قرآن کریم میں غیر مشرکوں کو بھی کافر قرار دیا گیا ہے چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَۃُ (پ۳۰ سورۃ البینۃ ع۱) اس آیت میں کافر کا لفظ جس طرح مشرکوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے اسی طرح یہود و نصاریٰ اور باقی کفار کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ پس قرآنی محاورہ کے رو سے اَلْکٰفِرُوْنَ کا لفظ عام ہے خاص نہیں۔ اب ہم مضمون کو لیتے ہیں تو اس سورۃ کی اگلی آیتوں میں یہ مضمون ہے کہ نہ تو میں اس چیز کی عبادت کروں گا جس چیز کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم اس چیز کی عبادت کرو گے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ مضمون بھی عام ہے کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ صرف بتوں ہی کی پوجا سے پرہیز نہیں کرتے تھے بلکہ عبادت کے اُس مفہوم سے بھی پرہیز کرتے تھے جو یہود اور نصاریٰ اور دوسرے اہل مذاہب میں پایا جاتا تھا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کبھی یہود کے طریقہ پر نماز نہیں پڑھی۔ کبھی عیسائیوں کے طریقہ پر نماز نہیں پڑھی نہ یہود

اور نصاریٰ نے کبھی اسلام کے طریقہ پر نماز پڑھی۔ پس اِس آیت میں جو یہ امر بیان کیا گیا ہے کہ نہ تم میرے طریق پر عبادت کرو گے نہ میں تمہارے طریق پر عبادت کروں گا۔ یا یہ کہ نہ تم میرے معبود کی عبادت کرو گے نہ میں تمہارے معبود کی عبادت کروں گا جیسے مشرکین مکہ پر منطبق ہوتا ہے ویسے ہی باقی دنیا کے کفار پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ کیونکہ اول تو اسلام کے سوا کوئی مذہب دنیا میں ہے ہی نہیں جو توحید کامل کو پیش کرتا ہو۔ اگر ظاہری رنگ میں توحید کسی مذہب میں پائی بھی جاتی ہے تو وہ مذہب بھی صفاتِ الٰہیہ کے بیان کرنے میں قرآن کریم سے بہت اختلاف رکھتا ہے مثلاً یہودی مذہب خدا کو اس رنگ میں پیش کرتا ہے کہ وہ صرف یہودی نسل کے لوگوں کو اپنا قرب عطا کرتا ہے کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا مسلمان کسی صورت میں بھی اس خدا کی پرستش کر سکتے تھے جس کے متعلق یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اس نے بنو اسرائیل کو اپنی پیاری قوم قرار دے لیا تھا اور بنو اسرائیل اور دوسری قوموں کے ساتھ سلوک میں وہ امتیاز اور فرق سے کام لیتا تھا۔ ایسے خدا کی پرستش کے تو صاف معنے یہ تھے کہ اسلام جھوٹا ہے کیونکہ اس کا بانی غیر اسرائیلی تھا۔ اسی طرح مجوسی مذہب جو کہ یقیناً اہل کتاب میں سے ہے وہ بھی خدا تعالےٰ کی صفات کی تشریح میں بہت اختلاف رکھتا تھا۔ پس اگر مشرکین مکہ کے سوا دوسرے مذاہب اسلام کے بتائے ہوئے خدا یا اسلامی طریقۂ عبادت کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو سکتے یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اتباع دوسرے مذاہب کے معبودوں یا اُن کے طریقِ عبادت کو اختیار کرنے کے لئے تیار ہو سکتے تھے تو پھر تو کہا جا سکتا تھا کہ گو الفاظ عام ہیں لیکن چونکہ بعض مذاہب ایسے ہیں جو اسلامی طریقِ عبادت کو اختیار کر سکتے ہیں اور چونکہ بعض مذاہب ایسے ہیں جنھوں نے خدا کا مفہوم ایسے رنگ میں پیش کیا ہے کہ مسلمان اُن کی عبادت کر سکتا ہے اس لئے اس آیت میں ہم اَلْکٰفِرُوْن کے لفظ کے عام معنے نہیں لے سکتے بلکہ اسے صرف ایسے کافروں کے لئے مخصوص کرنا پڑے گا جو نہ ہماری عبادت کر سکتے ہیں نہ ہم اُن کی عبادت کر سکتے ہیں۔ لیکن یا ایسا نہیں ہے اور سارے کے سارے غیر مسلم اُس مضمون کے نیچے آتے ہیں جو اس سورۃ میں لکھا گیا ہے۔ تو جب یہ بات ہے تو پھر اِس سورۃ کے مفہوم کے لحاظ سے اَلْکٰفِرُوْن کے لفظ کو محدود اور مخصوص کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

عربی زبان۔ قرآن کریم کے محاورہ اور اس سورۃ کے مضمون پر غور کرنے کے بعد اب ہم خارجی شہادتوں کو لیتے ہیں جن کی وجہ سے اس سورۃ میں مفسرین نے اَلْکٰفِرُوْن کو مخصوص اور محدود کرنے کی ضرورت سمجھی۔

ابن جریر۔ ابن ابی حاتم اور طبرانی نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے اَنَّ قُرَیْشًا دَعَتْ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلٰی اَنْ یُّعْطُوْہُ مَالًا فَیَکُوْنُ اَغْنٰی رَجُلٍ بِمَکَّۃَ وَیُزَوِّجُوْہُ مَا اَرَادَ مِنَ النِّسَآءِ فَقَالُوْا ھٰذَا لَکَ یَا مُحَمَّدُ وَکُفَّ عَنْ شَتْمِ اٰلِھَتِنَا وَلَا تَذْکُرْ اٰلِھَتَنَا بِسُوْءٍ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَاِنَّا نَعْرِضُ عَلَیْکَ خَصْلَۃً وَّاحِدَۃً وَّلَکَ فِیْھَا صَلَاحٌ قَالَ مَا ھِیَ قَالُوْا تَعْبُدُ اٰلِھَتَنَا سَنَۃً وَّنَعْبُدُ اِلٰھَکَ سَنَۃً قَالَ حَتّٰی اَنْظُرَ مَا یَاْتِیْنِیْ مِنْ رَّبِّیْ فَجَآءَ الْوَحْیُ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ الاٰیۃ وَاَنْزَلَ اللّٰہُ قُلْ اَفَغَیْرَ اللّٰہِ تَاْمُرُوْنِّیْٓ اَعْبُدُ اَیُّھَا الْجٰھِلُوْنَ اِلٰی قَوْلِہٖ الشّٰکِرِیْنَ (در منثور)

یعنی ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ قریش نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا کہ وہ آپ کو اتنا مال دیں گے کہ آپ مکہ کے سب آدمیوں سے زیادہ امیر ہو جائیں گے اور آپ کی شادی جس عورت سے چاہیں وہ کرا دیں گے۔ پھر انہوں نے آپ سے کہا کہ اے محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ سب کچھ آپ کو مل سکتا ہے آپ اس کے بدلہ میں صرف ہمارے معبودوں کو گالیاں دینی چھوڑ دیں اور آئندہ اُن کا ذکر بُری طرح

نہ کیا کریں لیکن اگر آپ ایسا نہ کریں تو ہم آخری بار آپ کے سامنے ایک بات رکھ دیتے ہیں وہ بات ایسی ہے کہ اُس میں ہمارا اور آپ کا دونوں کا فائدہ ہے۔ آپ نے فرمایا وہ کیا ہے؟ اس پر انہوں نے کہا کہ ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں اور دوسرے سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کرلیں گے۔ آپ نے فرمایا میں اُس وقت تک جواب نہیں دے سکتا جب تک کہ میرے رب کی طرف سے اس کے متعلق ارشاد نہ آجائے۔ اس پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے آپ پر یہ وحی نازل ہوئی کہ قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ آخر سورۃ تک۔ اسی طرح یہ کہ قُلْ اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّیْۤ اَعْبُدُ اَیُّهَا الْجٰهِلُوْنَ۔ وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْكَ وَاِلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ (سورۂ زمر آیت ۶۵ تا ۶۷ ع ۷) (بہ حوالہ الدر المنثور)

اسی طرح سعید بن منیاء مولیٰ ابی البختری سے ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اور ابن ابی حاتم نے اپنی مسند میں اور ابن الانباری نے مصاحف میں یہ روایت نقل کی ہے کہ لَقِیَ الْوَلِیْدُ بْنُ الْمُغِیْرَةِ وَالْعَاصِی بْنُ وَائِلٍ وَالْاَسْوَدُ بْنُ الْمُطَّلِبِ وَاُمَیَّةُ بْنُ خَلَفٍ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا یَا مُحَمَّدُ هَلُمَّ فَلْنَعْبُدْ مَا تَعْبُدُ وَتَعْبُدُ مَا نَعْبُدُ وَلْنَشْتَرِكْ نَحْنُ وَاَنْتَ فِیْ اَمْرِنَا كُلِّهٖ فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ نَحْنُ عَلَیْهِ اَصَحَّ مِنَ الَّذِیْ اَنْتَ عَلَیْهِ كُنْتَ قَدْ اَخَذْتَ مِنْهُ حَظًّا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ حَتّٰى انْقَضَتِ السُّوْرَةُ۔ یعنی ولید بن مغیرہ اور عاصی بن وائل اور اسود بن المطلب اور امیہ بن خلف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ اے محمدؐ آئیے ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں اور آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں اور ہم دین کے معاملہ میں سب کے سب شریک ہو جائیں اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ اگر وہ چیز جس پر ہم ہیں آپ کی چیز سے زیادہ اچھی ہوئی تو آپ اس میں شریک ہو جائیں گے اور اس سے اپنا حصہ لے لیں گے اور اگر وہ چیز جس پر آپ ہیں ہماری چیز سے زیادہ اچھی ہوئی تو ہم اس میں شریک ہو جائیں گے اور اس سے اپنا حصہ لے لیں گے۔ اس پر اللہ تعالےٰ نے سورۃ الْكٰفِرُوْنَ نازل فرمائی (الدر المنثور)

عبدالرزاق اور ابن منذر دونوں نے اپنی کتب میں وہب سے یہ روایت نقل کی ہے کہ قریش نے ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اِنْ سَرَّكَ اَنْ نَتَّبِعَكَ عَامًا وَتَرْجِعَ اِلٰى دِیْنِنَا عَامًا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اِلٰۤى اٰخِرِ السُّوْرَةِ۔ یعنی اگر آپ کو پسند ہو تو ہم ایک سال آپ کے پیچھے چلنے کیلئے تیار ہیں اور ایک سال آپ ہمارے پیچھے چلیں۔ اس پر اللہ تعالےٰ نے قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ والی سورۃ نازل فرمائی۔

اسی طرح عبد بن حمید اور ابن المنذر نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے اِنَّ قُرَیْشًا قَالَتْ لَوِ اسْتَلَمْتَ اٰلِهَتَنَا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ السُّوْرَةَ كُلَّهَا۔ یعنی قریش نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اگر آپ ہمارے معبودوں کو مان لیں تو ہم آپ کے معبود کی عبادت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کی ساری سورۃ نازل کی۔

اِن روایتوں کی بناء پر مفسرین کی یہ رائے ہے کہ اس سورۃ میں یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ سے مراد خاص وہ کفار ہیں جنہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے عبادت کے متعلق مذکورہ بالا سوال کیا تھا۔

جہاں تک اس امر کا سوال ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے سامنے کفار نے بعض دفعہ ایسی تجاویز پیش کی تھیں جن میں اپنے معبودوں سے نرمی کرنے کی خواہش کی گئی تھی اور اس کے بدلہ میں آپ کا اعزاز و اکرام کرنے کے وعدے کئے گئے تھے۔ تو یہ امر نہ صرف احادیث سے ہی ثابت ہے بلکہ کثرت سے تاریخی روایتیں بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں اور یہ واقعہ ایک تواتر کا رنگ رکھتا ہے لیکن جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ یہ سورۃ اِسی غرض کے لئے اتاری گئی تھی یہ امر قابلِ غور بھی ہے اور مشکوک بھی ہے۔ ہم اِن مذکورہ بالا روایتوں میں سے آخر کی تین روایتوں کو لے لیتے ہیں جو مختصر ہیں اور اُن کا مضمون صرف یہ ہے کہ ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں گے۔ یا سعید بن منیاء اور ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق سال کی شرط نہیں انہوں نے صرف یہ کہا کہ تم ہمارے معبودوں کی عبادت کرو ہم تمہارے معبود کی عبادت کریں گے۔

بظاہر کفار کے مُنہ سے ایسی بات کا نکلنا عجیب نہیں معلوم ہوتا جب ایک انسان خلافِ عقل بات کرتا ہے اور اُدھر یہ بھی دیکھتا ہے کہ میری بات بے اثر ہو رہی ہے اور لوگ میرے عقیدہ سے پھرے جا رہے ہیں تو اس قسم کی خلاف عقل باتیں کہنے پر وہ مجبور ہو جاتا ہے لیکن سوال صرف یہ ہے کہ کیا یہ سورۃ ان مطالبات کے نتیجہ میں اتری اور کیا اس مطالبہ کے نتیجہ میں کسی سورۃ کے اترنے کی ضرورت تھی اور کیا اس مطالبہ کے نتیجہ میں ایک مستقل سورۃ کا اترنا کوئی معقول بات تھی؟ سو پہلی بات کا جواب تو یہ ہے کہ صحاحِ ستہ میں اس حدیث کا کہیں ذکر نہیں۔ اتنا اہم واقعہ کہ کفار نے ایک سوال کیا اور اس کے جواب میں ایک سورۃ اُتری اس کا ذکر صحاحِ ستہ میں نہ ہونا قابلِ تعجب معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا اس مطالبہ کے جواب میں کسی سورۃ کے اُترنے کی عقلاً کوئی ضرورت تھی اس کا جواب بھی بالکل واضح ہے۔ توحید کے متعلق پہلے دن سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر الہامات نازل ہوئے ہیں۔ مثلاً جو پہلی سورۃ اُتری تھی اس میں گو توحید کا لفظ نہیں ہے لیکن ایک خدا کی عبادت کا ذکر ہے چنانچہ فرماتا ہے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ۔ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ (پ ۳۰ سورۃ العلق) یعنی تُو اس خدا کا نام لے کر دنیا میں تبلیغ کر جس نے سب دنیا کو پیدا کیا ہے اور جس نے انسان کی پیدائش میں اپنی محبت مخفی کر دی ہے۔ ہاں اُسی کے نام کو دنیا میں پھیلا جو سب سے زیادہ معزز ہے جس نے انسان کو علوم تحریر سے سکھاتے ہیں۔ یعنی ایک لمبے عرصہ تک قائم رہنے والی تعلیمات سے نوازا ہے اور ایسے علوم انسان کو سکھائے ہیں جن کو وہ پہلے نہ جانتا تھا۔ اس مضمون میں ایک تو نبوت کے کامل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی الہام کے ذریعہ بنی نوع انسان کو ہدایت دیتا رہا ہے۔ تیسرے یہ بتایا ہے کہ الٰہی کلام میں ایسے علوم ہوتے ہیں کہ مخلوق کا کوئی فرد اُن علوم تک خود بخود نہیں پہنچ سکتا۔ اب یہ سب باتیں شرک کی بیخ کنی کر دیتی ہیں۔ کیونکہ جب خدا تعالیٰ نبیوں کے ذریعہ سے تعلیم دیتا رہا ہے اور کامل تعلیم اس کی طرف سے آتی رہی ہے تو بُتوں کے لئے اس نظامِ روحانی میں گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے۔

پھر اس کے بعد قریب میں اُترنے والی سورتیں سورۂ مزمل اور سورۂ مدثر ہیں۔ سورۂ مزمل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا (پ ۲۹ ع ۱۲) خدا مشرق کا بھی خدا ہے اور مغرب کا بھی خدا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بس اُسی پر اپنا سارا توکل کر۔

پھر سورۂ مدثر میں فرماتا ہے وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (پ ۲۹ ع ۱۴) صرف اپنے رب ہی کی بڑائی بیان کر وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ

اور شرک کو بالکل دُور کر دے۔ پس ایسے واضح بیان کے بعد کہ شرک کو ترک کرو صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کرو اور مشرق و مغرب کا صرف ایک خدا ہے کوئی دوسرا خدا نہیں اُس کے اُوپر توکل کرو کفار کے اس مزعومہ سوال کے جواب کے لئے کسی اور سورۃ کے نازل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم چار سال سے ایک خدا کی عبادت کرتے چلے آرہے تھے آپ کا عمل بھی یہی تھا کہ ایک خدا کے سوا دوسرا کوئی نہیں اور سارے مکہ والوں کی لڑائی ہی اس بات پر تھی کہ خدا ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ ان تمام باتوں کی موجودگی میں یہ کہنا کہ لوگوں نے آپ سے آکر یہ سوال کیا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ سے رہبری طلب کی تب خدا تعالےٰ نے یہ سورۃ اُتار کر بتایا کہ ان کے معبودوں کی عبادت نہیں کرنی کتنی فضول اور خلاف عقل بات ہے۔

کیا کوئی شخص اس کہانی کو مان سکتا ہے کہ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان سے کسی نے کہا کہ آؤ کچھ دن تم ہمارے عیسٰیؑ کو خدا مان لیا کرو کچھ دن ہم تمہارے خدا کو خدا مان لیا کریں گے تو اس مسلمان نے کہا کہ اچھا مَیں اپنے علماء سے پوچھ کر اس کا جواب دُوں گا؟ اگر ایک جاہل سے جاہل مسلمان بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا تو عقل مندوں کے سردار اور توحید کے علمبردار محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ خیال کر لینا کہ آپ اِس سوال کو سُن کر (میں اس سوال کو عجیب نہیں سمجھتا۔ ایک شکست خوردہ قوم اپنی گھبراہٹ میں کئی بے وقوفی کی باتیں کر لیتی ہے مَیں صرف اس بات کو خلاف عقل قرار دے رہا ہوں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کو سُن کر کسی قسم کے تردد کا اظہار کیا اور خدا تعالےٰ کے جواب کا انتظار کیا) اس کے جواب کے لئے خدا تعالیٰ کی راہنمائی کے منتظر رہے یا یہ کہ آپ کے دعویٰ کے چار سال بعد بھی آپ کو ایسی راہنمائی کی ضرورت تھی، کم سے کم میرے نزدیک تو یہ ایک ایسی بات ہے جس کو کوئی معقول انسان ایک منٹ کے لئے بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔

یہ سوال نہ صرف ایسا تھا جس کا جواب پہلے سے قرآن کریم میں آچکا تھا بلکہ اس میں اور بھی بہت سے نقائص تھے جن کا جواب دینے کے لئے کسی وحی کی ہدایت کی ضرورت نہیں تھی۔ مثلاً سوال یہ تھا کہ ہم آپ کے معبود کی عبادت کرنے لگ جاتے ہیں آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کرنے لگ جائیں۔ کیا اس سوال میں کوئی اہمیت تھی جس کے جواب کے لئے اللہ تعالےٰ کی راہنمائی کی ضرورت ہوتی۔ اِس سوال میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے تو یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ آپ جن معبودوں کو نہیں مانتے اُن کی عبادت کریں اور اپنی طرف سے یہ پیشکش کی گئی ہے کہ جس خدا کو ہم مانتے ہیں اور جس کی ہم عبادت بھی کرتے ہیں اس کی ہم عبادت کرنے لگ جائیں گے۔ یہ پیشکش تو ایسی ہی ہے جیسے ہمارے ملک میں مشہور ہے کہ کوئی عورت دوسری عورت کے گھر گئی جس کے پاس چکی تھی اور اُس سے درخواست کی کہ کچھ دیر کے لئے وہ اسے چکی سے فائدہ اُٹھانے کی اجازت دے تاکہ وہ اپنے دانے پیس لے۔ جب وہ دانے پیسنے لگی تو گھر والی عورت کو بھی خیال آگیا کہ میں بھی تھوڑی دیر چکی پیسوں۔ اس پر دانے پسوانے کیلئے جو عورت آئی تھی اُس سے گھر والی نے کہا کہ اُٹھو میں تمہاری جگہ دانے پیستی ہوں۔ جب چکی والی دانے پیسنے میں مشغول ہوئی تو جو دانے پیسنے کے لئے لائی تھی اُس نے گھر والی کے کھانے پر سے کپڑا اٹھایا اور یہ کہہ کر اُسے کھانا شروع کر دیا کہ بہن مجھے شرم محسوس ہوتی ہے کہ تم میرا کام کرو اور مَیں تمہارا کوئی کام نہ کروں۔ اِس لئے تم میرے دانے پیسو مَیں تمہارا کھانا کھاتی ہوں۔ یہ لطیفہ لوگوں نے بعض فاتر العقل لوگوں کی سادگی یا بے وقوفی ظاہر کرنے کے لئے بنایا ہوا ہے۔ مگر کیا کوئی شخص اس لطیفہ کو سُن کر اس حیرت میں پڑ سکتا ہے کہ جو بات اس بیوقوف عورت نے کہی تھی اس کو کس طرح حل کیا جائے۔ اس کا کیا جواب دیا جائے؟ کفار کا سوال بھی اُس عورت کے اس فقرہ سے کم بیہودہ نہیں تھا۔ شاید ہمارے مفسرین نے یہ خیال

کرلیاہے کہ مکہ کے مشرک صرف اپنے بُتوں کو مانتے تھے خدا کو نہیں مانتے تھے اس لئے اُن کا یہ مطالبہ کہ تم ہمارے معبودوں کو ماننے لگ جاؤ ہم تمہارے معبود کو ماننے لگ جائیں گے۔ خواہ خلافِ ایمان اور خلافِ دین تو ہو لیکن خلافِ عقل نہیں تھا۔ حالانکہ یہ مطالبہ خلافِ دین اور خلافِ ایمان ہی نہیں خلافِ عقل بھی تھا کفارِ مکہ خدا تعالےٰ کو اسی طرح مانتے تھے جس طرح مسلمان مانتے تھے اور اس کو سب بُتوں کا سردار اور آقا سمجھتے تھے۔ غلطی صرف یہ تھی کہ وہ اس کے ہوتے ہوئے کچھ اور چھوٹے معبودوں کی بھی ضرورت سمجھتے تھے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ صاف فرماتا ہے کہ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (رکوع ۱ سورۃ زمر ع) یعنی وہ لوگ جو خدا تعالےٰ کے سوا دوسرے معبود بناتے ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ ہم تو اُن کی صرف اس لئے عبادت کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ تعالےٰ کے قریب کردیں۔ اس آیت سے صاف پتہ لگتا ہے کہ مکہ کے لوگ اللہ کو مانتے تھے اور یہ بھی مانتے تھے کہ خدا ہی تمام دنیا کا بادشاہ ہے اور صرف یہ دعویٰ کرتے تھے کہ خدا کے سوا جو اور معبود ہیں وہ خدا کے پیارے ہیں اور ہم اُن کی اس لئے عبادت کرتے ہیں کہ وہ ہمیں خدا کا مقرب بنادیں اور ہمارے سفارشی بن جائیں۔

پس جبکہ مشرکین خدا تعالےٰ کو مانتے تھے۔ خدا تعالےٰ کے قرب کو ضروری سمجھتے تھے اور معبودانِ باطلہ کی محض اس لئے عبادت کرتے تھے کہ وہ اُن کی خدا تعالےٰ کے پاس سفارش کردیں تو اِن حالات میں یہ کیونکر سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ خدا کی عبادت نہیں کرتے تھے اور اگر وہ خدا کی عبادت کرتے تھے تو پھر اُن کا یہ کہنا کہ آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کرلیں ہم آپ کے معبود کی عبادت کرلیں گے، کتنا احمقانہ سوال بن جاتا ہے۔ خدا تعالےٰ پر ایمان تو مشرکوں اور مسلمانوں میں مشترک تھا مابہ النزاع صرف معبودانِ باطلہ کی ذات تھی۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کرنا کہ تم اس چیز کو مان لو جس پر جھگڑا ہے تو ہم اُس چیز کو مان لیں گے جس کو ہم بھی مانتے ہیں ایک ایسی بات تھی جس کو شاید ایک نیم عقل آدمی بھی سن کر ہنس پڑے اور پوچھے کہ میاں تم دیتے کیا ہو اور مانگتے کیا ہو؟ دیتے تو تم وہ چیز ہو جو پہلے ہی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہے اور مانگتے وہ ہو جس پر نہ تمہارا حق ہے نہ کسی اور کا حق ہے تو یہ صلح کیا ہوئی اور یہ فیصلہ کیا ہُوا ؟

غرض کفار کا مطالبہ جو اِن حدیثوں میں بیان کیا گیا ہے وہ ایسا خلافِ عقل ہے اور ایسے امور کے متعلق ہے جن کا فیصلہ قرآن شریف میں پہلے سے ہو چکا تھا جن کی موجودگی میں کسی سورت کے اُترنے کی ضرورت نہیں تھی۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو الگ رہے آپ کے غلام بھی اس سوال کا جواب بڑی عمدگی سے دے سکتے تھے۔ پس کفار نے مذکورہ بالا سوال کرنے کی ضرور حماقت کی ہوگی مگر اس حماقت کے جواب میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کبھی یہ نہ کہا ہوگا کہ یہ ایک اہم سوال ہے میں خود اس کا جواب نہیں دے سکتا اللہ تعالےٰ سے پوچھ کر جواب دوں گا۔ اور نہ خدا تعالیٰ نے یہ خلافِ عقل بات کی ہوگی کہ اس کے جواب میں ایک سورۃ نازل کردی جس میں صرف وہ مضمون تھا جو چار سال سے مسلمانوں کی طرف سے پیش ہو رہا تھا اور جس کی تائید میں مسلمان مرد بھی اور مسلمان عورتیں بھی اور مسلمان آزاد بھی اور مسلمان غلام بھی یکے بعد دیگرے اپنی جانیں قربان کر رہے تھے۔

میرا اُوپر کے مضمون سے یہ مطلب نہیں کہ کفار اللہ تعالےٰ کی عبادت اُسی رنگ میں کیا کرتے تھے جس میں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ اس رنگ میں تو نام نہاد موحد قومیں بھی عبادت نہیں کرتی تھیں۔ مثلاً یہودی بھی اس رنگ میں عبادت نہیں کرتے تھے۔ عیسائیوں میں سے موحد بھی اس رنگ میں عبادت نہیں کرتے تھے۔ اسلامی طریقِ عبادت تو ایک نو ایجاد طریقہ ہے۔ پہلے اس طریق کی عبادت دنیا میں کہیں نہیں تھی۔ کیونکہ توحیدِ کامل کا نظریہ ہی اسلامی نظریہ ہے۔

اس سے پہلے دنیا میں توحید کامل پائی ہی نہیں جاتی تھی۔ پس یہ ٹھیک ہے کہ مکّہ کے لوگ خدا تعالیٰ کی اس شکل میں عبادت نہیں کرتے تھے جس شکل میں مسلمان کرتے تھے مگر وہ خدا تعالیٰ کی عبادت ضرور کرتے تھے۔ مثلاً اُن کے ہاں عبادت کا ایک ذریعہ نذر ماننا تھا۔ قرآن کریم سے صاف ثابت ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی نذر مانا کرتے تھے چنانچہ سورۃ انعام ع ۱۶ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۔ یعنی کفارِ مکّہ اپنی کھیتی اور اپنے جانوروں کے گلّوں میں سے ایک حصہ اللہ کی نذر میں دے دیا کرتے ہیں اور یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ یہ اللہ کا ہے اور کچھ حصہ معبودانِ باطل کے نام پر وقف کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اُن کا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ جو اُن کے معبودانِ باطل کا ہو وہ خدا تعالیٰ کے نام پر نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن جو اللہ کے نام کا ہے وہ اُن کے معبودانِ باطل کے نام پر دیا جا سکتا ہے۔ یہ کیسا بُرا فیصلہ ہے جو وہ کرتے ہیں (ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ کی شان بڑی ہے اور معبود اس کے تابع ہیں جس طرح باپ کا مال بیٹوں کو جا سکتا ہے اسی طرح خدا کا مال معبودانِ باطل کو جا سکتا ہے لیکن معبودانِ باطل کے حصہ کا مال خدا کے نام پر نہیں دیا جا سکتا کیونکہ وہ چھوٹے ہیں اور چھوٹے کا مال بڑے کی طرف نہیں جاتا) اب اس آیت سے دیکھو خدا تعالیٰ کی عبادت بالکل ثابت ہے۔ رکوع سجود تو وہ بُتوں کے لئے بھی نہیں کرتے تھے۔ بُتوں کی عبادت کا طریق بھی اُن میں یہی تھا کہ اُن کی تعریف میں شعر کہتے اور اُن کے نام پر نذریں دیتے اور چونکہ بُت نظر آتے تھے کبھی کبھار ہاتھ جوڑ کر اُن کے آگے دعا بھی کر لیا کرتے تھے پس مکّہ کے لوگ بُت پرست تو ضرور تھے مگر اللہ کی عبادت کے تارک نہیں تھے۔ اپنی عقل اور روایتوں کے مطابق وہ اپنے بُتوں کی بھی پوجا کر لیا کرتے تھے اور اپنی عقل اور روایتوں کے مطابق وہ خدا کی بھی پوجا کر لیا کرتے تھے۔ تاریخ سے بھی اس کے متعلق بہت سے واقعات مل سکتے ہیں اور ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عملاً مکّہ کے لوگ خدا تعالیٰ کی عبادت بھی کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبدالمطلب کا ایک مشہور واقعہ ہے جس کی تفصیل تاریخ ابن ہشام میں یوں لکھی ہے کہ

حضرت ابوطالب بیان کرتے ہیں کہ میرے والد عبدالمطلب نے مجھ سے ذکر کیا کہ میں ایک دفعہ سو رہا تھا کہ ایک شخص مجھے نظر آیا اور اُس نے مجھے کہا کہ طیبہ کا کنواں کھودو۔ میں نے کہا کہ طیبہ کیا شے ہے تو میں جاگ پڑا۔ اسی طرح کئی راتیں خواب آتی رہی اور ہر دفعہ فرشتہ کنوئیں کا دوسرا نام لیتا تھا۔ (تاریخ میں تفصیل موجود ہے۔ اختصار کے خیال سے چھوڑا جاتا ہے) آخری روز اُس نے زمزم کا نام لیا اور اس جگہ کی علامتیں بتائیں جہاں وہ کنواں موجود ہے۔ اس خواب کی بناء پر حضرت عبدالمطلب نے کدال لیا اور اپنے بیٹے الحرث کو ساتھ لیا (اُس وقت تک اُن کے یہی ایک بیٹے تھے) اور کنواں کھودنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کنوئیں کا گھیر نظر آ گیا۔ (زمزم کا کنواں حضرت اسمٰعیل کے ذریعہ خدا تعالیٰ نے ظاہر کیا تھا حضرت ہاجرہؓ نے اس کی منڈیر بنادی تھی اور بعد میں عزلیوں نے اُسے کنوئیں کی شکل میں تبدیل کر دیا تھا مگر یہ کنواں بعد میں بند ہو گیا یعنی مٹی نے اُسے بھر دیا تھا۔ حضرت عبدالمطلب کو اللہ تعالیٰ نے خواب میں پھر دکھایا۔ جب کنوئیں کا گھیر نظر آ گیا۔ تو حضرت عبدالمطلب نے شکریہ سے نعرۂ تکبیر بلند کیا (یہ ثبوت ہے کہ وہ لوگ اللہ کو مانتے تھے اور اُسکا نام بھی بلند کرتے تھے) جب قریش نے یہ نعرہ سُنا تو سمجھ گئے کہ خواب کی ہدایت کے مطابق کنواں مل گیا ہے اور دوڑے ہوئے آپ کے پاس آئے اور کہا کہ اس کنوئیں میں ہمارا بھی حصہ تسلیم کریں۔ حضرت عبدالمطلب نے انکار کیا اور کہا کہ خدا تعالیٰ نے یہ کنواں خاص طور پر

مجھے دیا ہے میں تم کو کس طرح شریک کرلوں۔اس پر قریش نے جھگڑنا شروع کر دیا اور کہا کہ ہم اپنا حق لئے بغیر نہ رہیں گے۔اس پر حضرت عبدالمطلب نے کہا کہ اچھا کوئی ثالث مقرر کرلو۔انہوں نے کہا کہ بنو سعد بن ہذیم کی کاہنہ کو ثالث مقرر کرتے ہیں۔آپ نے منظور کیا اور ایک جماعت قریش کی ساتھ لے کر چلے راستہ میں پانی ختم ہو گیا۔بہت کوشش کی نہ ملا۔کنوئیں کھودے تو پھر بھی پانی نہ نکلا۔حضرت عبدالمطلب نے کہا اس طرح بیکار بیٹھنے سے فائدہ نہیں چلو ادھر اُدھر پھر کر پانی تلاش کریں۔جب سب قوم سوار ہو گئی حضرت عبدالمطلب بھی سوار ہو گئے۔چلتے ہوئے ایک جگہ آپ کی اونٹنی کے پاؤں کی ٹھوکر سے پانی نکل آیا۔آپ نے قریش کو آواز دی اور کہا "قد سقانا اللہ"۔اللہ تعالیٰ نے ہمیں پینے کے لئے پانی دیا ہے (اس سے بھی ظاہر ہے کہ وہ اصل معبود اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھتے تھے) اس پر انہوں نے کہا کہ "اللہ کی قسم" (دیکھو کفار مکّہ بھی اللہ کی قسم کھاتے تھے) ہمارے خلاف تجھے ڈگری مل گئی ہے۔"اللہ کی قسم" ہم تجھ سے اب زمزم کے بارہ میں نہیں جھگڑیں گے۔جس خدا نے تجھے یہاں پانی دیا ہے اُسی نے تجھے زمزم دیا ہے۔اس کے بعد سب مکّہ لوٹ آئے۔جب مکّہ پہنچے تو حضرت عبدالمطلب نے کہا کہ قریش نے یہ جھگڑا اس لئے کیا تھا کہ میرا ساتھی کوئی نہ تھا۔اگر مجھے دس لڑکے ملیں اور وہ سب جوان ہو جائیں اور اس قابل ہو جائیں کہ میرے ساتھ مل کر میرے دشمنوں کا مقابلہ کر سکیں تو لَيَنْحَرَنَّ أَحَدَهُمْ لِلّٰهِ عِنْدَ الْكَعْبَةِ ،، تو خدا کی قسم عبدالمطلب ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس شکریہ میں کعبہ کے پاس قربان کر دے گا۔جب خدا تعالیٰ نے اُن کو دس بیٹے دے دئے تو وہ کعبہ میں آئے۔سرداران قریش کو جمع کیا اور خواہش کی کہ انکی نذر پورا کرنے میں اُن کی مدد کریں۔انہوں نے کہا کس طرح۔تو آپ نے جواب دیا کہ ہُبل بُت کے پیالوں کے ذریعہ (یہ ہُبل بُت کعبہ کے پہلو میں تھا اور اس کے پاس سات پیالے رکھے تھے جن کے ذریعہ قرعہ ڈالا جاتا تھا) چنانچہ قرعہ ڈالا گیا اُس وقت عبدالمطلب ہُبل کے پاس کھڑے ہو کر" اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے لگے" (غور کرو ان لوگوں میں اللہ تعالیٰ سے ہی دُعا کا رواج تھا) جب قرعہ نکلا تو وہ عبداللہ کے نام کا تھا۔مکّہ والوں نے کہا ہم اسے ذبح نہیں کرنے دیں گے۔چنانچہ بڑے جھگڑے کے بعد مدینہ کی ایک کاہنہ کے پاس فیصلہ کے لئے لے گئے۔اس نے فدیہ کی تجویز کی اور کہا کہ کعبہ میں دس۱۰ اونٹ ذبح کر دو۔مگر عبدالمطلب کو بغیر قرعہ ڈالنے کے یہ گوارا نہ تھا اس لئے انہوں نے عبداللہ اور دس اونٹوں کے درمیان قرعہ ڈالا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی شروع کی مگر قرعہ پھر عبداللہ کے نام کا نکلا۔پھر اور دس۱۰ اونٹ بڑھائے گئے پھر قرعہ عبداللہ کے نام کا نکلا۔آخر بڑھاتے بڑھاتے سَو۱۰۰ اونٹ پر جا کر قرعہ اونٹوں کے نام کا نکلا۔سبحان اللہ حضرت عبداللہ محمد رسول اللہؐ کے والد بننے والے تھے۔فرشتے بھی اللہ تعالیٰ سے کہہ رہے ہوں گے ؎

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

بہرحال اس فیصلہ پر مکّہ والوں نے کہا لو اب" تمہارا رب" راضی ہو گیا ہے۔چنانچہ سَو اونٹ ذبح کر دئے گئے۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ مکّہ والے خدا تعالیٰ پر ایمان رکھتے تھے۔اُس کی نذریں مانتے تھے۔اُس سے دعائیں کرتے تھے اور بُتوں کو صرف اس کے تابع معبود سمجھتے تھے پس مکّہ والوں کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بتوں کے پجاری تھے خدا تعالیٰ کے نہیں۔پس اُن کا یہ کہنا کہ تم ہمارے بتوں کی پوجا کر لیا کرو ہم اللہ کی پوجا کر لیا کریں گے ایک احمقانہ مطالبہ تھا کیونکہ محمد رسول اللہؐ اُن کے بُتوں کو نہیں مانتے تھے مگر وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خدا کو مانتے

تھے پس ایسے احمقانہ مطالبہ پر کسی سورۃ کے نزول کی خواہش خلاف عقل تھی۔ ہر مسلمان بچہ بھی اس کا جواب دے سکتا تھا۔

تیسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس سوال کے جواب میں ایک مکمل سورۃ اُتر سکتی تھی؟ اس سوال کا جواب بھی یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔ کیونکہ اگر ہم اس سورۃ کو اِن سوالوں کے جواب میں نازل شدہ مانیں تو اس سورۃ کی کوئی اہمیت ہی باقی نہیں رہتی۔ تب اس سورۃ کا صرف اتنا مضمون بن جاتا ہے کہ اے کافرو! میں تمہارے معبودوں کی عبادت نہیں کرتا تم میرے معبود کی عبادت نہیں کرتے۔ تمہارا دین تمہارے ساتھ اور میرا دین میرے ساتھ۔ قرآن جیسی اہم کتاب کی ایک سورۃ کو صرف اتنے سے مضمون کے لئے محدود کر دینا جو تمام معارف اور باریکیوں اور روحانی امور سے خالی ہو بہت ہی تنگ نظری کا ثبوت ہوگا۔ قرآن کریم کی تو کوئی سورۃ بھی ایسی نہیں جو کہ لطیف اور وسیع معارف سے خالی ہو اور یہ مضمون جو اِن روایتوں کی وجہ سے اس سورۃ کا بن جاتا ہے اوّل تو پامال مضمون ہے دوسرے نہایت محدود مضمون ہے اور اگر اس کو مختصر طور پر بیان کریں تو یہی بنتا ہے کہ جاؤ تم نے میری نہیں سُنی میں تمہاری نہیں سنوں گا۔ قرآن شریف کی تو کوئی آیت یا سورۃ ایسی نظر نہیں آتی جس میں اس قسم کا مضمون ہو۔ وہاں تو ایک ایک لفظ کے نیچے سے معارف کے دریا بہتے چلے جاتے ہیں۔ پس یہ روایتیں جس طرح اس سورۃ کے مضمون کو تنگ اور محدود کر دیتی ہیں اس کو دیکھ کر بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اِن روایتوں کے اندر مذکور سوالوں کے جواب میں کوئی سورۃ نازل نہیں ہو سکتی تھی۔ بلکہ اگر اس سورۃ کو ان سوالوں کے جواب میں سمجھا جائے تو اس سورۃ کے وسیع مطالب بالکل چھپ جاتے ہیں اور اسی وجہ سے میں اس خیال کی تردید اس تفصیل کے ساتھ کر رہا ہوں ورنہ کوئی ضرورت نہ تھی کہ میں اس کے پیچھے پڑتا۔

اب میں سب سے پہلی روائت کو لیتا ہوں جسے میں چھوڑ کر آیا تھا اور جو حضرت ابن عباسؓ سے ابن جریر نے نقل کی ہے۔ اس میں دو باتیں جمع ہیں اوّل یہ کہ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو اتنا مال دیں گے کہ جو آپ کو مکّہ میں سب سے زیادہ امیر بنا دے گا اور جس عورت کو آپ پسند کریں اس سے ہم آپ کی شادی کر دیں گے اس کے بدلہ میں آپ ہمارے معبودوں کو گالیاں دینے سے باز آجائیں اور اگر آپ ہماری اس بات کو نہ مانیں تو پھر ہم آپ سے یہ کہتے ہیں کہ ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کر لیں گے اور دوسرے سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں۔

اس روایت کا پہلا حصّہ تاریخی طور پر بہت سی روایتوں سے ثابت ہے لیکن اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس پیغام کے سنتے ہی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ اگر سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں کھڑا کر دیں تب بھی میں خدائے واحد کی پرستش کو نہ چھوڑوں گا۔ اس جواب کے ہوتے ہوئے زیر بحث حدیث میں یہ فقرہ کتنا بھونڈا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کہا کہ "میں اپنے رب کے جواب کے بعد جواب دوں گا۔" تمام دوسری احادیث اور تاریخ اس امر پر متفق ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ مطالبہ سنتے ہی کہہ دیا تھا کہ میں اسے ماننے کو تیار نہیں کفار جو چاہیں کر لیں میں خدائے واحد کی عبادت کو ترک نہیں کر سکتا۔ جس شخص نے یہ جواب دیا ہو کیا وہ ساتھ ہی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ٹھہر جاؤ میں اصل جواب خدا تعالےٰ کی ہدایت کے بعد دونگا۔ پس دوسری احادیث اور تاریخ کی روشنی میں یہ حصہ اِس حدیث کا بالکل غلط اور خلاف عقل ثابت ہوتا ہے۔

خود اس حدیث کے مضمون میں بھی اختلاف ہے۔ بعض محدثین نے اسی مضمون کی حدیث نقل کی ہے لیکن اس حصہ کو ترک کر دیا ہے کہ خدا تعالےٰ کا جواب آنے پر میں جواب دونگا چنانچہ علامہ زمخشری نے اس حدیث کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔ "بعض قریش نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا

کہ اے محمد (صلعم) آ تیں آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں ہم آپ کے معبود کی عبادت کرلیں گے۔ آپ ایک سال ہمارے معبودوں کی عبادت کریں اگلے سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں گے۔ اس پر آپ نے فرمایا میں کسی کو خدا تعالیٰ کا شریک قرار دینے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں الخ۔" اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بجائے اس کے کہ آپ یہ کہتے کہ اچھا ٹھہرو میں دیکھتا ہوں کہ خدا تعالیٰ اس سوال کا کیا جواب دیتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے غیرت ایمانی کے عین مطابق فوراً جواب دیا کہ خدا کی پناہ۔ میں ایسا گناہ کس طرح کرسکتا ہوں۔

یہ حدیث کشاف ہی کے مطابق علامہ آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں اور مولانا شیخ اسمٰعیل بروسوی نے اپنی تفسیر روح البیان میں لکھی ہے۔ علامہ ابن حیان نے اپنی تفسیر بحر محیط میں گو حدیث کے الفاظ میں معاذ اللہ کے الفاظ تو نہیں لکھے مگر یہ حصہ کہ ٹھہرو خدا کا حکم آجائے جو اصل میں قابل اعتراض الفاظ ہیں درج نہیں کئے۔ گویا ان الفاظ کو حذف کرکے اُن کے غلط ہونے کی تصدیق کردی ہے۔ امام ابن کثیر نے بھی اپنی تفسیر میں اس ٹکڑے کا کہیں ذکر نہیں کیا جہانتک احادیث کا تعلق ہے امام مذکور سب اُن محدثین پر فوقیت رکھتے ہیں کہ جو تفسیر کے متعلق احادیث جمع کرتے ہیں کیونکہ یہ ہمیشہ ثقہ روایات لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ علامہ قرطبی نے بھی جو بڑے فقیہ ہیں اس ٹکڑے کا ذکر نہیں کیا۔

بڑے مفسرین میں سے (جو درایت سے بھی کام لیتے ہیں اور صرف احادیث خواہ وہ کسی طبقہ کی ہوں جمع کرنیکی کوشش نہیں کرتے) صاحب تفسیر رازی ایسے ہیں جنہوں نے اس مضمون کو نقل ہی نہیں کیا بلکہ اس پر نمک مرچ بھی لگایا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ قوم تیرے پاس آئی اور تجھے لالچ دی کہ وہ تیری اتباع کریں گے اور تو اُن کے دین میں اُن کی اتباع کر اس پر تو نے انکار نہ کیا اور اُن کی بات کو رد نہ کیا حالانکہ میں نے تجھ سے اس پاس طرح نیک سلوک کیا تھا۔ نعوذ باللہ من ھٰذہ الخرافات۔

بہرحال رازی کے سوا باقی جید مفسرین نے جو نقل کے ساتھ عقل سے بھی کام لینا جائز سمجھتے ہیں یا تو ان روایات کے خلاف روایات نقل کی ہیں (گو افسوس انہوں نے رواۃ حدیث درج نہیں کئے) یا روایت کے قابل اعتراض حصہ کو ترک کرکے اپنی رائے ظاہر کردی ہے کہ وہ اسے معیوب اور غلط سمجھتے ہیں پس ان سب امور پر غور کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان احادیث کے قابل اعتراض حصہ کے خلاف دوسری روایات بھی موجود ہیں اور تاریخ بھی تواتر سے اُن کے قابل اعتراض حصہ کو رد کرتی ہے۔

گو اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ کفار نے اپنی حماقت سے یہ پیشکش تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے کی تھی کہ آپ انکے معبودوں کے معاملہ میں نرمی سے کام لیں تو وہ آپ کو اپنا سردار بنانے کو تیار ہیں مگر آپ نے اُسی وقت اس امر کو سختی سے رد کردیا تھا اور جب بات یوں ہے تو ظاہر ہے کہ یہ سورۃ اس سوال کے جواب میں نہیں اُتری بلکہ اس کا مضمون اس سوال سے الگ اور بالا ہے گو الفاظ ایسے ہیں کہ ایک ناواقف آدمی دھوکہ کھا سکتا ہے کہ شاید اس سوال کے ساتھ اس مضمون کا تعلق ہو۔

(ب) بعض لوگوں نے یہ شبہ پیدا کیا ہے کہ اس سورۃ کے پہلے قُلْ آتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ کسی سوال کے جواب میں نازل ہوئی ہے لیکن اگر یہ درست ہے تو سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کس سوال کے جواب میں نازل ہوئی ہیں یہی مفسر ان سورتوں کے بارہ میں خاموش ہیں اور کسی انسان کے سوال کے جواب کی وہاں ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

اصل بات یہ ہے کہ قُلْ کا لفظ اعلان کے لئے آیا ہے یعنی اس سورۃ کے مضمون کا خوب اعلان کر۔ یوں تو سب سورتوں کا مضمون اعلان کے قابل ہے اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ (مائدہ ع۱۰) اے رسول جو کلام قرآنی تجھ پر نازل ہوتا ہے وہ سب کا سب لوگوں

تک پہنچادے۔ پس قرآن کا کوئی حصہ چھپانے والا نہیں لیکن
بعض مضمون وقت کے لحاظ سے خوب پھیلانے والا ہوتا ہے
اس لئے اُس کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی جاتی ہے چنانچہ
پانچ سورتیں قرآن کریم کی ایسی ہیں جن کے شروع میں قُلْ
کے لفظ آتے ہیں جس کے یہ معنے ہیں کہ اُن کے مضمون کا خوب
اچھی طرح اعلان کر دو۔ یہ سورتیں سورۃ جن۔ سورۃ کافرون
سورۃ اخلاص۔ سورۃ فلق اور سورۃ الناس ہیں۔ اِن سورتوں
کے علاوہ کم و بیش تین سو چھ آیتوں سے پہلے بھی یہ لفظ آتا
ہے اور جہاں بھی آتا ہے مابعد کے مضمون کی اہمیت بتانے کے
لئے آتا ہے۔ مجموعی نظر اِن آیات اور سورتوں پر ڈالی جائے تو
ایک لطیف مضمون نکل آئے مگر تفسیر ایسے مضامین بیان کرنے کا
مقام نہیں۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ قُلْ کا لفظ بعد
کے مضمون کی اہمیت بتانے اور اس کے اعلان کرنے کا حکم
دینے کے لئے استعمال کیا گیا ہے کسی سوال کے جواب پر اشارہ
کرنے کے لئے نہیں۔

قرآن کریم کی آخری تین سورتوں سے پہلے اس لفظ کا
استعمال بھی یہی بتاتا ہے کہ چونکہ قرآن کریم ختم ہو رہا تھا اس
کا خلاصہ آخر میں پیش کر دیا گیا اور ان سورتوں کے مضمون
کی اشاعت کی طرف خاص توجہ دلادی تاکہ خلاصہ کے ذریعہ
سے سارے مضمون سے اجمالاً لوگ واقف ہو جائیں۔

ایک سوال اس جگہ یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ
نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے خطاب کیا تو اُس وقت
تو قُلْ کا لفظ اچھا لگتا تھا۔ جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
نے وہ وحی تلاوت کی یا دوسروں کو سُنائی تو پھر قُلْ پڑھنے
کا کیا فائدہ؟ چاہیئے تو یہ تھا کہ وحی کے وقت قُلْ کہہ کے
وحی شروع کی جاتی۔ مگر قُلْ کے لفظوں کو قرآنی وحی میں
شامل نہ کیا جاتا۔ اب تو یہ لطیفہ بن گیا ہے کہ مثلاً سورۃ
کافرون کوئی شخص پڑھتا ہے تو وہ پہلے کہتا ہے "کہہ"۔ یہ
'کہہ' کا لفظ کہنے والا کون ہوتا ہے اور کسے کہتا ہے۔ اگر
تلاوت کے وقت اس لفظ کو اُڑا دیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے "قُلْ"
کا لفظ ان مضامین یا سورتوں سے پہلے آتا ہے جن کے اعلان
عام کا ارشاد ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کسی امر کا اعلان عام ایک
آدمی نہیں کر سکتا۔ ایسے اعلان کا ذریعہ ایک جماعت ہی ہو سکتی ہے۔ جو
نسلاً بعد نسلٍ یہ کام کرتی چلی جائے تاکہ ہر قوم و ملک کو بھی وہ پیغام
پہنچ جائے۔ اور ہر نسل اور ہر زمانہ کے لوگوں کو بھی وہ پیغام پہنچ جائے
اگر وحی متلو میں یعنی قرآن میں قُلْ کا لفظ نہ رکھا جاتا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
تک یہ حکم چلتا۔ آپ کے بعد یہ حکم نہ چلتا۔ لیکن جبکہ قرآن کی وحی
میں یہ لفظ شامل کر دیا گیا تو اب اس کے متواتر تا قیامت جاری
رہنے کی صورت پیدا ہو گئی۔ جب اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ
تو کافروں کو مخاطب کر کے کہہ دے کہ اے کافرو! میں تمہارے
معبود کی عبادت قطعاً نہیں کرتا اور نہیں کر سکتا۔ تو آپ نے
یہ اعلان کافروں میں کر دیا مگر قُلْ کا لفظ پہلے نہ ہوتا تو
مسلمان سمجھتے یہ محمد رسول اللہ کا کام تھا ختم ہو گیا۔ لیکن جب
آپ نے اپنی وحی مسلمانوں کو سُنائی اور اُنہوں نے پڑھا قُلْ یٰۤا
اَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ تو ہر مسلمان نے سمجھ لیا کہ یہ حکم محمد رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات کے لئے نہ تھا بلکہ میرے لئے بھی تھا
کیونکہ میرے سامنے جب وحی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
نے پڑھی ہے تو اس کے پہلے قُلْ کہا ہے جس کا مخاطب میں ہی ہو سکتا
ہوں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نہیں۔ کیونکہ وہ تو پڑھ رہے
ہیں سُن تو میں رہا ہوں۔ پس اُس نے اس حکم کی تعمیل میں یہ
پیغام آگے پہنچا دیا۔ لیکن چونکہ قُلْ کا لفظ وحی میں تھا اُس
نے بھی اگلے شخص کے سامنے اسی طرح پیغام پہنچا دیا کہ قُلْ
کا لفظ بھی دُہرایا اور اُس تیسرے شخص کے سامنے جب قُلْ
کا لفظ کہا گیا تو اُس نے سمجھ لیا کہ صرف مجھے پیغام نہیں پہنچایا
گیا بلکہ مجھ سے یہ بھی خواہش کی گئی ہے کہ میں آگے دوسروں
تک یہ پیغام پہنچا دوں۔ پھر اُس تیسرے آدمی نے جو تھے کو

جب پیغام دیا تو پھر قُلْ کہا کیونکہ یہ وحی کا حصہ ہے اسے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ اس لفظ کے سُننے سے پانچویں نے بھی سمجھ لیا کہ میں نے ہی اس حکم پر عمل نہیں کرنا بلکہ آگے دوسروں تک بھی یہ حکم پہنچانا ہے۔ غرض اس طرح تاقیامت اس حکم کے دہرانے کا انتظام کر دیا گیا۔ پس دیکھو کہ قُلْ کے لفظ کو وحی کا حصہ بنا کر کتنا بڑا کام کیا گیا ہے۔ جب عام قرآنی سورتوں کو انسان پڑھتا ہے تو اُسے وہ حکم پہنچ جاتا ہے جو ان میں ہے۔ مگر جب وہ اُس سورۃ یا آیت کو پڑھتا ہے جس سے پہلے قُلْ لکھا ہو تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ اسے آگے پہنچاتے چلے جانا میرا فرض ہے اور وہ خود عمل کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی عمل کی نصیحت کرتا ہے اور ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ تم یہ پیغام اپنے بعد کے لوگوں تک اور وہ اپنے بعد کے لوگوں تک پہنچا دیں۔ اب اس حکمت کو دیکھ کر سمجھ لو کہ وہ لوگ کتنے دھوکے میں ہیں جو کہتے ہیں کہ قُلْ کا لفظ وحی میں کیوں رکھا گیا ہے۔ محمد رسول اللہ صلعم سے بات کہنی تھی اُن سے کہہ دی پھر قُلْ کا کیا فائدہ۔ اگر یہ لفظ وحیٔ متلو میں شامل نہ کر دیا جاتا تو اعلانِ عام کی غرض فوت ہو جاتی اور غیر متناہی تبلیغ کا راستہ کبھی نہ کھلتا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس حکمت کی جو لفظ قُلْ کو وحی میں شامل کرنے سے پیدا کی گئی ہے ایک خاص پیرایہ میں نقل کی ہے اپنے آخری حج میں جو حجۃ الوداع کہلاتا ہے آپ نے منیٰ میں صحابہؓ میں ایک وعظ فرمایا اور اس کے آخر میں فرمایا اَلَا لِیُبَلِّغُ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَلَعَلَّ بَعْضَ مَنْ يُبَلِّغُهُ يَكُونُ أَوْعَى لَهُ مِنْ بَعْضِ مَنْ سَمِعَهُ ثُمَّ قَالَ اَلَا بَلَّغْتُ (مسلم کتاب الدیات جلد ۵ صفحہ مطبوعہ محمد علی صبیح و اولادہٗ) یعنی آخر میں فرمایا کہ جو حاضر ہیں وہ غیر حاضروں تک میری بات پہنچا دیں کیونکہ ممکن ہے کہ جو غیر حاضر ہے وہ حاضر سے اس معاملہ کی اہمیت سمجھنے پر زیادہ قادر ہو۔ پھر فرمایا سُنو کیا میں نے تم کو یہ حکمِ الٰہی پہنچا دیا ہے۔ اِس وعظ میں بھی آپ نے قُلْ کا اختیار کردہ طریق استعمال کیا ہے کہ ہر حاضر غیر حاضر تک بات پہنچاتا جائے کیونکہ بعض دفعہ بعد میں آنے والے پہلوں سے زیادہ حکم کی اہمیت سمجھنے والے اور اُسے جاری کرنیوالے ہوتے ہیں۔

آج کل لوگ بے نام کارڈ ڈال کر بھجوا دیتے ہیں اور اُن میں لکھ دیتے ہیں کہ اس خط کا مضمون نقل کر کے دس اور آدمیوں کو بھجوا دو۔ کچھ لوگ اس پر عمل کر کے دس اَور کو وہ مضمون لکھ کر بھجوا دیتے ہیں اور سارے ملک میں وہ بات پھیل جاتی ہے۔ آج کل بہت سی لغو باتوں کے متعلق یہ طریق اختیار کیا جاتا ہے مگر اشاعت کے لئے یہ طریقہ عمدہ ہے۔ بعض قرآنی سورتوں یا آیتوں سے پہلے قُلْ کا لفظ رکھ کر قرآن نے بھی یہی طریق اختیار کیا ہے اور گویا اس طریق کی ایجاد کا سہرا بھی قرآن کے سر پر ہے۔

اب میں حدیث کے دوسرے حصہ کو لیتا ہوں جو یہ ہے کہ کفار نے پہلی تجویز کے بعد دوسری تجویز یہ پیش کی کہ ایک سال تم ہمارے معبودوں کی عبادت کر لو دوسرے سال ہم تمہارے معبود کی عبادت کر لیں گے۔ یہ حصہ بھی بتاتا ہے کہ کسی نے دو سچائیوں کو بے موقع جوڑ دیا ہے کیونکہ جب ایک بالمقابل تجویز پیش کی جاتی ہے تو وہ ہمیشہ پہلی تجویز کے زیادہ آسان اور سہل ہُوا کرتی ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اگر یہ بات منظور نہیں تو یوں منظور کر لو تو اس کے یہی معنے ہُوا کرتے ہیں کہ اگر پہلی بات میں کچھ مشکلات ہیں تو یہ دوسری اُس سے سہل ہے اسے مان لو مگر ہر عقلمند سوچ سکتا ہے کہ اس جگہ پہلی تجویز میں کچھ چیز تو کافر بھی دیتے تھے یعنی وہ مال دیتے تھے، بیٹی دیتے تھے، حکومت دیتے تھے اور مانگتے صرف یہ تھے کہ ہمارے معبودوں کو گالی نہ دو یہ نہیں کہ ہمارے معبودوں کی عبادت کرو لیکن دوسری تجویز جو منطقی طور پر اس سے سہل ہونی چاہیئے اس میں وہ دیتے تو کچھ نہیں یہ کہتے ہیں کہ ہم تمہارے معبود کی عبادت کریں گے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو

معبود یعنی اللہ کی عبادت وہ پہلے ہی کیا کرتے تھے اور اُس پر
ایمان رکھتے تھے لیکن محمد رسول اللہ ؐ سے مانگتے وہ چیز ہیں جو
پہلی تجویز سے زیادہ سخت ہے یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
سے یہ نہیں کہتے کہ ہمارے معبودوں کو گالیاں نہ دو بلکہ یہ
کہتے ہیں کہ ہمارے معبودوں کی عبادت کرو یعنی دوسرے مطالبہ
کے دونوں حصے پہلے مطالبہ کے دونوں حصوں سے زیادہ سخت
ہیں اور اس صورت میں اس کو متبادل تجویز کہنا نہایت حماقت
اور بے وقوفی ہے پس یہ دیکھتے ہوئے کہ پہلی تجویز کا جواب ہی
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے سختی سے دے دیا تھا اور
اسے ان تاریخی الفظوں میں رد کر دیا تھا کہ اگر سورج کو میرے
دائیں اور چاند کو میرے بائیں لاکر کھڑا کر دو تب بھی
میں ایک خدا کی عبادت نہ چھوڑوں گا اور تمہارے معبودوں
سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا۔ اس کے مقابلہ دوسری تجویز
پیش کرنے کی کوئی عقلمند جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا اور
یہ دیکھتے ہوئے کہ دوسری تجویز جو منطقی طور پر پہلی تجویز کی
نرم ہونی چاہیئے پہلی تجویز سے بدرجہا زیادہ سخت ہے اور
اسے متبادل تجویز قرار دینا عقل کے بالکل خلاف ہو۔ ماننا
پڑتا ہے کہ درحقیقت یا تو حضرت ابن عباس نے دو مختلف
وقتوں میں یہ باتیں بتائی ہیں اور راوی نے سوچنے کے بغیر
ان کو جوڑ کر ایک ہی روایت کے طور پر پیش کر دیا ہے یا یہ کہ کسی
کم عقل راوی نے دو روائتیں مختلف لوگوں سے سن کر انکو ایک ہی جگہ
پر جمع کر دیا ہو اور پھر انکو ابن عباسؓ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

چونکہ اس جگہ اُس روایت کا ذکر آ گیا ہے جس میں کفار
نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ ہم آپ کو دولت بھی دیں گے بیوی بھی
دیں گے۔ حکومت بھی دیں گے لیکن آپ ہمارے معبودوں کو
گالیاں نہ دیں اس لئے یہاں اس سوال کا جواب دینا بھی مناسب
ہے کہ کیا اُن کا یہ مطالبہ صحیح تھا۔ کیا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
اُن کے معبودوں کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ ہم قرآن کریم کو
دیکھتے ہیں تو اس میں معبودان باطلہ کے بارہ میں کہیں گالیاں نظر نہیں
آتیں۔ بلکہ اگر نظر آتا ہے تو یہ کہ معبودان باطلہ کو گالیاں دینے سے
اپنے اتباع کو بھی منع کر دیا ہے چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ كَذٰلِكَ
زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ (پ۸ سورۃ الانعام ع۱۳)
یعنی جن کی پرستش یہ لوگ خدا کے سوا کرتے ہیں انکو گالیاں
نہ دو ورنہ یہ لوگ بے جانے بوجھے دشمنی کی وجہ سے اللہ کو
گالیاں دیں گے۔ ہم نے اسی طرح ہر قوم کو اُس کا عمل خوبصورت
کر کے دکھایا ہے یعنی جب کسی کو چڑایا جائے تو وہ جواب دیتے
وقت اس بات کا خیال نہیں کرتا کہ جو کچھ میں جواب دیتا ہوں
وہ خود میرے اپنے مسلّمات پر بھی حملہ بن جاتا ہے بلکہ غصّہ
میں ایسا جواب دے جاتا ہے جو ایک مشترک وجود پر حملہ کرنیوالا
ہوتا ہے۔ پس اگر تم اُن کو جنہیں معبود سمجھا جاتا ہے گالیاں دوگے
تو کفار غصہ میں آ کر کہیں گے کہ تمہارا معبود بھی ایسا ہی ہے۔
حالانکہ درحقیقت تمہارا معبود اور اُن کا معبود ایک ہی ہے
یہ فعل اُن کا جہالت پر مبنی ہو گا۔ لیکن اُن کی اس گالی کا
محرک تم بن جاؤ گے اس لئے تم کو اس سے بچنا چاہیئے۔ پس
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تو گالیاں نہیں دیتے تھے بلکہ گالیاں
دینے سے آپ پر نازل ہونے والی کتاب روکتی تھی۔ پھر کفار
کیوں کہتے تھے کہ یہ ہمارے معبودوں کو گالیاں دیتا ہے۔
اس کا جواب یہ ہے کہ جب کسی وجود کے متعلق کسی غلط مقام کا
دعویٰ کیا جاتے تو اس مقام میں جن خصوصیتوں کا پایا جانا ضروری
ہو اُن کا رد کرنا ضروری ہوتا ہے ورنہ اُس غلط دعوے کی
تردید نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اگر کسی شخص کو غلط طور پر ڈاکٹر کہا جاتا
ہے تو یہ کہنا پڑے گا کہ وہ ڈاکٹری کے کالج میں نہیں پڑھا۔
اور اس کو طب نہیں آتی اور یہ دونوں باتیں اس کی شان کو
گرانے والی ہیں لیکن گالی نہیں کیونکہ ضرورت کے طور پر استعمال
کی گئی ہیں اور بطور دلیل کے استعمال کی گئی ہیں اور اس کے
دعویٰ کو رد کرنے کے لئے اس کے بغیر چارہ نہیں۔ اسی طرح

قرآن کریم میں معبودان باطلہ کے وہ نقائص بیان کئے گئے ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ معبود نہیں ہوسکتے۔ اگر وہ نقائص بیان نہ کئے جاتے۔ تو یہ بات ثابت نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ معبود نہیں ہیں۔ پس ایسی بات کہنا جس کے ذریعہ سے ایک غلط دعوے کی تردید مقصود ہو اور جس کے بغیر اس دعوے کی تردید نہ ہوسکتی ہو گالی نہیں ہوتی۔ بلکہ اظہارِ حقیقت ہوتا ہے۔ لیکن ایسی بات کہنا جو حقیقت کے خلاف ہو یا جس کے کئے بغیر بھی دوسرے کی غلطی ثابت ہوسکتی ہو اور جس کے کہنے سے بلاوجہ دوسرے کا دل دکھانا مقصود ہو وہ گالی کہلاتی ہے۔ قرآن کریم میں ایسا کوئی لفظ معبودانِ باطلہ کے متعلق استعمال نہیں کیا گیا۔

اس زمانہ میں بھی بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے علماء کی بعض غلطیوں کی طرف انہیں توجہ دلائی ہے اور وہ اپنی کثرت کے گھمنڈ میں لوگوں کو اشتعال دلادیتے ہیں کہ بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے علماء یا مسلمانوں کو گالیاں دی ہیں حالانکہ نہ انہوں نے علماء اور مسلمانوں کو کچھ کہا ہے نہ انہوں نے کوئی گالی دی ہے۔ انہوں نے صرف ان علماء اور ان مسلمانوں کے متعلق کچھ کہا ہے جنہوں نے بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے متعلق ظلم اور تعدّی اور بہتان سے کام لیا۔ اور گالیوں کے انبار لگادیئے۔ نیز آپ نے صرف اظہارِ حقیقت کیا ہے۔ گو بعض جگہ پر اظہارِ حقیقت کے لئے آپ نے ایسے الفاظ ضرور استعمال کئے ہیں جو عربی محاورہ کے مطابق ایک استعارہ ہیں۔ اور دوسرے صلحاء نے بھی ان کو اسی رنگ میں استعمال کیا ہے۔ لیکن مفسد مولوی جہلاء کو غصہ دلانے کے لئے ان کا غلط ترجمہ کرکے لوگوں کے سامنے پیش کردیتے ہیں اور اس کو سُن کر عوام الناس بِھڑ جاتے ہیں لیکن جن لوگوں کو اسلامی لٹریچر اور اسلامی بزرگوں کی تحریرات سے مس ہے اور جو عربی جانتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ الفاظ استعارۃً استعمال ہوئے ہیں اور طبیعتوں کو نیکی کی طرف مائل کرنے کے لئے صرف نشتر کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔

(ج) اس آیت کے متعلق مفسرین میں ایک عجیب اختلاف پیدا ہوا ہے۔ بعض مفسرین نے جن میں علامہ قرطبی اور دوسرے کئی مفسرین شامل ہیں کہا ہے۔ کہ بعض لوگوں نے قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کی تفسیر یہ کی ہے کہ قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا تو کافروں سے کہہ دے۔ لیکن یہ تعبیر غلط اور خدا تعالیٰ پر افتراء ہے۔ اور اس سورۃ کے مضمون کو کمزور کرنے کی غرض سے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس مقصد کو باطل کرنے کے لئے ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کا نبی مشرکوں کو سامنے بلا کر حقارت کے ساتھ مخاطب کرکے رسوا کرے اور ان پر ایسا الزام لگائے۔ جس سے ہر عقلمند بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ علامہ قرطبی اور ان کے ہم خیال دوسرے مفسرین کا خیال ہے۔ کہ قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا کے الفاظ کا مفہوم یہ ہوتا ہے۔ کہ اگر حکم کا مخاطب کسی ایک شخص کو بھی کہہ دے یا کسی مجلس میں تقریر کردے۔ تو ایسا کرنے سے یہ حکم پورا ہو جائیگا لیکن قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کے الفاظ سے یہ مفہوم نکلتا ہے۔ کہ ان کو سامنے بٹھا کر کہا جائے کہ اے کافرو تم ایسے ہو اور ایسے ہو۔

جہاں تک قرأت کا سوال ہے میرے نزدیک یہ کوئی بحث ہی نہیں ہے کہ قرآن کریم میں قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ہے یا قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ہے۔ کیونکہ کوئی ایسی قرأت میرے علم میں نہیں ہے۔ اور کتب قرأت میں ہم نے کوئی ایسی قرأت نہیں دیکھی۔ پس جس نے

قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا کہا ہے اس نے بھی قُلْ يَاۤ اَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کے معنوں سے درحقیقت ایک استدلال کیا ہے اور یہ بتانا چاہا ہے کہ قُلْ يَاۤ اَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کا مفہوم اتنا ہی ہے۔ کہ کافروں سے کہہ دو۔ یہ مفہوم نہیں کہ ان کو بلا کر ذلیل کرو اور ان پر سختی کرو اور جنہوں نے يَاۤ اَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کے الفاظ پر زور دیا ہے۔ انکا مطلب یہ ہے کہ اَيُّهَا تنبیہ کے لئے ہوتا ہے اس لئے ان الفاظ میں اس امر پر زور دیا گیا ہے۔ کہ کفار کو مخاطب کر کے اُن پر اچھی طرح یہ بات واضح کر دو اور اُن کی بے عقلی کو اُن پر ظاہر کر دو۔

میرے نزدیک یہ بحث محض ایک لفظی بحث ہے اس میں کوئی حقیقت مخفی نہیں۔ کیونکہ مفہوم تو آگے بیان ہی ہے اور اس میں زور بھی ہے اور اس میں تنبیہ بھی ہے۔ خواہ یہ مضمون کافروں کو کسی کے ذریعہ سے پہنچا دیا جائے۔ خواہ بلا کر کہہ دیا جائے۔ اس کا مفہوم تو انکو پہنچ ہی جاتا ہے۔ اور اس زور سے تو انکار کیا ہی نہیں جا سکتا جو اس عبارت میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ جس شخص کو یہ پیغام پہنچایا جائے گا۔ کہ جس چیز کی عبادت تم کرتے ہو اُس کی میں نہیں کرتا اور جس کی میں عبادت کرتا ہوں اس کی تم نہیں کرتے اور نہ ایسا ممکن ہو سکتا ہے اُسے اور زیادہ دھتکارنے کی اور کیا صورت باقی رہ جاتی ہے؟

یاد رہے کہ يَاۤ اَيُّهَا کے الفاظ ہمیشہ زور دینے کے موقع پر استعمال ہوتے ہیں اور یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن کسی تذلیل یا تحقیر کا سوال نہ اَيُّهَا کے الفاظ میں ہے نہ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا کے الفاظ میں ہے۔ تذلیل اور تحقیر تو انسان کا فعل کرتا ہے ہمارے کہنے سے کیا بنتا ہے۔ جب کفار کے فعل کی صورت کو بیان کر دیا گیا اور جب اپنے عقیدہ کی حقیقت کو بیان کر دیا گیا تو اپنی خوبی اور اُن کی ضد کا ذکر آپ ہی آ گیا۔

ان مفسرین نے یہ نہیں سوچا کہ وہ خود بھی تو اس مضمون کو محدود کر کے کمزور کر رہے ہیں۔ کیونکہ جب یہ مضمون کفار مکہ کے چند افراد کے لئے مخصوص تھا تو پھر وہ کون سا مضمون اس میں پایا جاتا ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی عقلمند ایسا نہیں کر سکتا۔ اس سورۃ میں تو یہی بتایا گیا ہے۔ کہ تم اس خدا کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں کرتا ہوں اور تم اس طریق سے عبادت نہیں کرتے جس طریق سے میں کرتا ہوں۔ اس ادّعا اور اس بیان میں کونسی دلیل دی گئی ہے۔ جس سے معلوم ہو کہ کوئی معقول آدمی ایسا نہیں کر سکتا۔ پہلے سورۃ کا مضمون ایسا بتانا چاہیئے جو ایسے امور پر دلالت کر رہا ہو جن سے کفار کی سُبکی ہوتی ہو۔ تو پھر بے شک یہ مفہوم نکلے گا۔ خالی اَيُّهَا کے الفاظ سے کس طرح نکل آئے گا۔ اور اس مفہوم کے پیدا کرنے میں تو وہ آپ رمک بنے ہیں کہ اس کو چند افراد کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے۔ اور سورۃ کا خلاصہ صرف اتنا بن گیا ہے۔ کہ اے چند لوگو! نہ تم میری سنتے ہو نہ میں تمہاری سنتا ہوں تمہارا دین تمہارے ساتھ ہے اور میرا دین میرے ساتھ۔ اس میں کونسی دلیل عقلی ہے جس کی وجہ سے کفار کی بے عقلی اور بے وقوفی ثابت ہوتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اتنا زور اس بات پر دیا ہے کہ یہ مضمون چند افراد کے ساتھ مخصوص نہیں اور اس کا وہ مفہوم نہیں جو مفسرین نے لیا ہے۔ کیونکہ صرف اسی صورت میں ہماری نظر اصل مضمون کی طرف جاتی ہے اور اس کی وسعت ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔

يَاۤ اَيُّهَا کے متعلق یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ عربی میں تنبیہ کا مفہوم یہ نہیں ہُوا کرتا کہ کسی بُری بات سے روکا جاتا ہے بلکہ اس میں محض توجہ دلانے کے معنے

ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں یَا اَیُّھَا کے الفاظ قریباً پچاس ساٹھ جگہ پر استعمال ہوئے ہیں کسی جگہ پر ان الفاظ سے مجرموں کو مخاطب کیا گیا ہے تو کسی جگہ پر مومنوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔ کسی جگہ پر مخالفین اسلام کو مخاطب کیا گیا ہے تو کسی جگہ پر تمام بنی نوع انسان کو مخاطب کیا گیا ہے اور کسی جگہ پر رسولوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور کسی جگہ پر نبیوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور اس بات سے ظاہر ہے کہ اَیُّھَا کے معنے ڈانٹنے کے نہیں ہیں۔ بلکہ اَیُّھَا کا لفظ صرف توجہ دلانے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اور توجہ انبیاء کو بھی دلائی جاسکتی ہے۔ توجہ مومنوں کو بھی دلائی جاسکتی ہے۔ توجہ مجرموں کو بھی دلائی جاسکتی ہے۔ توجہ کافروں کو بھی دلائی جاسکتی ہے اور توجہ تمام بنی نوع انسان کو بھی دلائی جاسکتی ہے۔ اسی طرح توجہ محبت کے موقع پر بھی دلائی جاسکتی ہے اور توجہ غصہ کے موقع پر بھی دلائی جاسکتی ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے یَآ اَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا (احزاب ع ۶) یہ محبت کے اظہار کا موقع ہے۔ یہاں کسی ڈانٹ کا کوئی سوال ہی نہیں۔ صرف اس مضمون کی عظمت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کہ اتنا بڑا انعام ہم نے تم پر کیا ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے یَآ اَیُّھَا الرَّسُوْلُ لَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ (مائدہ ع ۶) یہاں بھی ڈانٹنے کا کوئی موقع نہیں بلکہ ہمدردی کا مضمون ہے۔ پس یَا اَیُّھَا کے معنوں میں زجر اور توبیخ اور تحقیر اور تذلیل نہیں پائی جاتی۔ بلکہ محض مضمون کی اہمیت کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قُلْ یَآ اَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ کہہ کر بتایا گیا ہے۔ کہ اے کافرو! جس مضمون کی طرف ہم توجہ دلاتے ہیں۔ وہ نہایت اہم ہے مگر ہماری کتنی بدقسمتی ہے کہ وہ مضمون جس کے متعلق خدا کہتا ہے کہ نہایت اہم ہے۔ ہم اس کی تفصیل یہ بیان کرتے ہیں۔ کہ اے کافرو میں تمہاری نہیں سنتا تم میری نہیں سنتے۔ تمہارا دین تمہارے ساتھ ہے اور میرا دین میرے ساتھ۔ اس مضمون میں کونسی اہمیت ہے۔ آخر کوئی دلیل بیان ہونی چاہیئے۔ کہ کیوں تم میری نہیں سنتے اور کیوں میں تمہاری نہیں سنتا اور اس کے کچھ نتائج بیان ہونے چاہئیں۔ تب جاکر اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اس مضمون کو محدود کر کے انہی تینوں چیزوں کا راستہ بند کر دیا گیا ہے۔

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ۔ اس سورۃ کا مضمون ایسا ہے کہ الگ الگ آیتوں کی تفسیر کرنی مشکل ہے بلکہ اگر الگ الگ آیتوں کی تفسیر کی جائے تو میرے نزدیک مضمون غلط ہو جائے گا یا کم سے کم میں اپنے اندر ایسی طاقت نہیں پاتا کہ الگ الگ آیتوں کی تفسیر بھی کروں اور وہ تسلسل بھی قائم رہے جو اس سورۃ کی آیتوں میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے خواہ یہ کہہ لو کہ اس سورۃ کی آیتوں میں بڑا شدید اتصال ہے یا یہ کہہ لو کہ مجھ میں قدرت نہیں ہے کہ میں ان کے مضمونوں کو الگ الگ بھی بیان کر دوں اور تسلسل بھی قائم رکھوں۔ بہرحال کوئی وجہ ہو میں مجبور ہوں کہ ساری سورۃ کی تفسیر اکٹھی بیان کروں۔ اس لئے بجائے الگ الگ آیتوں پر نوٹ لکھنے کے میں اسی آیت کے نیچے ساری آیتوں کے متعلق اکٹھا نوٹ لکھ دیتا ہوں۔

اس سورۃ میں ایک مضمون کو دو شکلوں میں ادا کیا گیا ہے۔ اور دو دفعہ دہرایا گیا ہے۔ ایک حصہ مضمون کا یہ ہے۔ کہ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ۔ جس کی تم عبادت کرتے ہو اس کی میں عبادت نہیں کرتا۔ اور دوسرا حصہ اس کا یہ ہے کہ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ جس کی میں عبادت کرتا ہوں اس کی تم عبادت نہیں کرتے۔

اور تیسری بات یہ کہی گئی ہے کہ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ۔ نہ میں اس کی عبادت کرتا ہوں جس کی تم عبادت کر چکے ہو۔ اور چوتھی بات یہ کہی گئی ہے کہ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۔ نہ تم عبادت کرتے ہو یا کروگے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ بظاہر اس میں ایک مضمون کو دو دفعہ دہرا دیا گیا ہے۔ ایک حصہ کو تو الفاظ میں تغیر قلیل کر کے دہرایا گیا ہے اور دوسرے حصہ کو جوں کا توں دُہرا دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں تو تکرار نہیں ہوا کرتی۔ پھر ایسا کیوں کیا گیا ہے؟ جن مفسرین نے اپنی تفسیر کی بنیاد اوپر کی روایتوں پر رکھی ہے انہوں نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ چونکہ کفار نے دو صورتوں میں اپنا سوال پیش کیا تھا اس لئے دو ہی دفعہ ان کو جواب دیا گیا ہے۔ دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ تکرار تاکید کے لئے ہے اور ان کی طمع کو دور کرنے کے لئے ہے۔ اور تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ پہلے دو جملے حال کی عبادت کی نفی کے لئے ہیں اور دوسرے دو جملے استقبال کی عبادت کی نفی کے لئے ہیں۔ اس لئے تکرار نہیں۔ یہ قول ثعلب اور زجاج کا ہے۔ مگر اس کے خلاف زمخشری کہتے ہیں کہ لَا اَعْبُدُ سے مراد مستقبل کی عبادت ہے۔ کیونکہ لا سوائے اُس مضارع کے جس کے معنے استقبال کے ہوں کسی اور مضارع پر داخل نہیں ہوتا پس پہلے دو جملے (نہ کہ دوسرے دو جملے) مستقبل کی عبادت کی نفی کے لئے ہیں اور دوسرے دو جملے (نہ کہ پہلے) ماضی کی عبادت کی نفی کیلئے ہیں۔

علامہ زمخشری کے مخالفوں نے کہا ہے۔ کہ ان کا یہ دعویٰ کہ آخری دو جملے ماضی کی عبادت کی نفی کے لئے ہیں یہ درست نہیں۔ کیونکہ اسم فاعل منوّن (جیسا کہ اس آیت میں وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ ہے) جو فعل کا عمل کرتا ہو۔ وہ حال اور استقبال کے سوا کوئی معنے نہیں دیتا اور یہاں عَابِدٌ کا لفظ مَا پر فعل کا عمل کر رہا ہے اور اسی طرح دوسری آیت میں عَابِدُوْنَ کا لفظ بھی مَا پر عمل کر رہا ہے۔ یعنی دونوں اسم فاعل فعل کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے قاعدہ کے رُو سے ان کے معنے حال اور استقبال کے ہو سکتے ہیں۔ ماضی کے نہیں ہو سکتے۔ علامہ زمخشری کے ہم خیالوں نے اس کا یہ جواب دیا ہے۔ کہ جب حکایت کے طور پر مضمون بیان کیا جائے۔ تو اس وقت ماضی کے معنے لینے جائز ہوتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ (کہف ع ۳) یہاں بَاسِطٌ اسم فاعل کا صیغہ ہے جو ذِرَاعَيْهِ کے لفظ پر عمل کر رہا ہے۔ لیکن باوجود اس کے اس کے معنے ماضی کے ہیں۔ حال اور مستقبل کے نہیں۔

بعض نے اس جگہ پر یہ بھی اعتراض کیا ہے۔ کہ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ۔ تو کیا وجہ ہے کہ جب پہلے جملہ میں مَا کے بعد عَبَدْتُّمْ ماضی کا لفظ استعمال کیا گیا تھا تو دوسرے جملہ میں مَآ اَعْبُدُ مضارع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ماضی کا لفظ کیوں استعمال نہیں کیا گیا۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ ماضی کے معنے اس جگہ پر نہیں لے گئے۔

علامہ زمخشری کے خیال کی تائید کرنے والوں نے کہا ہے۔ کہ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ کفار آپ کی بعثت سے پہلے بتوں کو پوجتے تھے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی عبادت اس وقت شروع کی جبکہ آپ مبعوث ہوئے۔ اس لئے آپ کے متعلق مضارع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ ماضی کا صیغہ استعمال نہیں کیا گیا۔ اس خیال کے مخالفوں نے پھر اس پر یہ جرح کی ہے کہ عبادت سے مراد یہ نماز تو نہیں جو ہم پڑھتے ہیں۔

بلکہ اصل عبادت خدا تعالےٰ کو ایک سمجھنا ہے اور سارے انبیاء اپنی عقلوں کے ذریعہ سے اپنی بعثت سے پہلے موحد ہی ہُوا کرتے تھے۔ پس یہ کہنا درست نہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے اس لئے حال کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہ آپ بعثت سے پہلے خدائے واحد کی عبادت نہیں کیا کرتے تھے۔ خدائے واحد کی عبادت کا عام مفہوم یعنی اس کی توحید کا اقرار اور اس پر اصرار یہ بعثت سے پہلے بھی آپ میں موجود تھا۔ اس لئے جس طرح آپ کی بعثت سے پہلے کفار بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے آپ بھی اپنی بعثت سے پہلے خدائے واحد کی پرستش کیا کرتے تھے گو اس کی شکل اور تھی۔ اور شکل کے بدل جانے کی وجہ سے عبادت کو عبادت کے دائرہ سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ عیسیٰؑ اور موسیٰؑ کی نماز اور تھی۔ نوحؑ کی اور تھی۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اور تھی۔ لیکن پھر بھی یہی کہا جائے گا کہ سب انبیاء خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے۔

جیسا کہ اوپر کے مضمون سے ظاہر ہے مفسرین کی اِن تشریحات سے مضمون کچھ غلط سا ہو جاتا ہے اور پڑھنے والا یہ نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ پھر اصل بات کیا ہے۔ مَیں اس کے متعلق ذیل میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔

لَا جس کے معنے نہیں کے ہوتے ہیں جب مضارع پر آئے تو اس کے معنے ائمۂ ادب کے نزدیک مستقبل کے کر دیتا ہے۔ سوائے مالکؔ کے کہ اُن کے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ چنانچہ وہ مثال دیتے ہیں کہ عرب کہتے ہیں کہ جَآءَ زَیْدٌ لَا یَتَکَلَّمُ۔ زید آیا مگر وہ خاموش تھا بولتا نہ تھا۔ (اقرب الموارد) گویا لَا یَتَکَلَّمُ اس جگہ ماضی کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ مالک کی رائے درحقیقت استثناء کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے جس امر کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس میں بعض خصوصیات ہیں (۱) وہ لَا ایک دوسرے جملہ کے تتمہ کے طور پر استعمال ہُوا ہے۔ (۲) وہ ایک ماضی کے ساتھ وابستہ ہے اور معنوں کے لحاظ سے حال ہے۔ گو زمانہ کے لحاظ سے حال نہیں یعنی جس وقت کے متعلق ذکر کیا گیا ہے اس وقت وہ گذرنے والی حالت پر دلالت کرتا تھا نہ کہ کسی سابق میں گذری ہوئی حالت پر۔ ان سب دلائل کی وجہ سے ہم اس قسم کے استعمال کو قاعدہ کا رَدّ کرنے والا نہیں کہیں گے۔ بلکہ یہ کہیں گے۔ کہ جب صرف مضارع کے ساتھ لَا مستعمل نہ ہو بلکہ بعض اور قیود اس کے ساتھ شامل ہو جائیں تو وہ حال کے معنے بھی دے دیتا ہے۔ لیکن خالی مضارع کے ساتھ اس کا استعمال ہمیشہ استقبال کے معنے دیتا ہے۔ پس لَآ اَعْبُدُ کے معنے اس آیت میں یہی ہونگے کہ میں کبھی بھی عبادت نہ کرونگا۔ دوسرا حرف اِن آیات میں مَا کا استعمال ہُوا ہے۔ مَا علاوہ نافیہ ہونے کے جس صورت میں کہ وہ حرف ہوتا ہے اسمیہ بھی ہوتا ہے۔ اور اس وقت وہ موصول کے معنے دیتا ہے۔ یعنی اس کے معنے "جو" "جس کی" کے ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ غیر ذوی الارواح کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن کبھی ذوی العقول کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے۔ یعنی انسانوں۔ فرشتوں اور خدا تعالےٰ کی ذات کے متعلق بھی۔ اس وقت اس کے معنے مَنْ کے سمجھے جاتے ہیں۔ جو لفظ جاندار اور عاقل اشیاء کے لئے عام طور پر استعمال ہوتا ہے اور کبھی مَا حرفیہ جب فعل پر آئے تو اس کے معنے مصدر کے بنا دیتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَادُمْتُ حَیًّا (مریم عٔ) یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کہتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی تاکید میرے تمام زمانۂ حیات کے لئے کی ہے اس جگہ مَا جو ماضی پر آیا ہے۔ اس نے ماضی کے معنے مصدر کے کر دئے ہیں۔ اسی طرح جب عرب کہے گا۔

لَا اَصْحَبُكَ مَا دُمْتُ حَيًّا تو کو دُمْتُ فعل
ہے۔ مگر اس کے معنے ہوں گے" زندگی تک" یا "میرے
زندہ رہنے تک"۔ آیات زیر تفسیر میں "مَا تَعْبُدُوْنَ"
"مَا اَعْبُدُ"۔ "مَا عَبَدْتُّمْ"۔ "مَا اَعْبُدُ"
چاروں جگہ یہ مصدری معنے بھی ہو سکتے ہیں اور مَا موصولہ
کے معنے بھی۔ اور پھر مَا کے عام معنے بھی جو غیر ذوی العقول
کے ہیں اور کبھی کبھار استعمال ہونے والے معنے بھی۔
یعنی ذوی العقول کی طرف اشارہ کرنیوالے معنے۔

ان تشریحات کے رو سے آیت لَآ اَعْبُدُ مَا
تَعْبُدُوْنَ کے معنے یوں ہو سکتے ہیں۔ میں کبھی عبادت
نہیں کروں گا ان وجودوں کی خواہ جاندار عقل والے ہوں
یا غیر جاندار عقل سے خالی جن کی تم عبادت کرتے ہو
یا میں کبھی عبادت نہیں کروں گا تمہارے طریق عبادت
کے مطابق (مصدری معنے) وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ
مَآ اَعْبُدُ کے معنے ہوں گے۔ اور نہ تم عبادت کرسکتے
ہو یا عبادت کرنے کا ارادہ رکھتے ہو اس خدا کی عبادت
کا جس کی میں عبادت کرتا ہوں یا یہ کہ نہ تم عبادت کروگے
یا عبادت کرسکتے ہو اس طریق پر جس طریق پر میں عبادت
کرتا ہوں۔

اور وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ کے
معنے ہوں گے اور نہ میں عبادت کرنے کا ارادہ رکھتا
ہوں یا عبادت کرسکتا ہوں اس کی جس کی تم عبادت
کرتے ہو یا عبادت کرتے رہے ہو۔ اور وَلَآ اَنْتُمْ
عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ کے معنے یہ ہوں گے۔ کہ نہ تم
عبادت کرسکتے ہو یا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو اس کی عبادت
کا جس کی میں عبادت کرتا ہوں یا جس طریق سے میں
عبادت کرتا ہوں۔

اب اگر یہ مختلف چسپاں ہونے والے معنے
چاروں آیتوں میں لیں تو دوسری اور چوتھی آیت میں
تکرار پایا جاتا ہے۔ پہلی اور تیسری آیت کے الفاظ الگ
الگ قسم کے ہیں۔ ان میں تکرار واقعہ نہیں ہوتا لیکن اگر
اس کے برخلاف ہم یہ قرار دیں کہ چونکہ خدا تعالےٰ
کے کلام میں فضول تکرار نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ مَا
کے دو معنے ہو سکتے ہیں۔ موصولہ کے بھی اور مصدریہ کے
بھی۔ اللہ تعالےٰ نے وسعت معانی پیدا کرنے کے لئے
آیتوں کے پہلے جوڑے میں ما موصولہ استعمال کیا ہے اور
دوسرے جوڑے میں مصدریہ تو تکرار کا سوال اُڑ جاتا ہے
اس کے مطابق آیات کے یہ معنے ہو جاتے ہیں کہ میں کبھی
عبادت نہ کروں گا اس کی جس کی تم عبادت کرتے ہو اور
نہ تم کبھی عبادت کروگے نہ کرسکتے ہو اس کی جس کی میں
عبادت کرتا ہوں۔ اور اسی طرح میں عبادت نہیں کرونگا
یا عبادت نہیں کرسکتا اس طریق پر جس طریق پر تم عبادت
کرتے ہو اور نہ تم عبادت کروگے یا کرسکتے ہو اس طریق
پر جس طریق پر میں عبادت کرتا ہوں۔

ان معنوں کے رو سے سب تکرار مٹ جاتی ہے
اور ہر ہر لفظ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے اور اسکی واضح
غرض اور مقصد نظر آتا ہے۔ گو یہ معنے عربی کے لحاظ
سے بالکل واضح ہیں اور ہر ایک پر روشن ہونے چاہیئے
تھے۔ مگر ایک خاص معنوں نے دماغ پر اس قدر غلبہ حاصل
کر لیا تھا کہ پہلے مفسرین کا ذہن اس طرف نہیں گیا۔
یہ سہرا ابو مسلم کے سر ہے کہ اس نے ایک واضح نحوی مسئلہ
کو یہاں چسپاں کر کے تکرار کے اعتراض کو دور کر کے
اس سورۃ کے معنوں کو بادل کے ٹکڑے تلے سے نکال لیا۔
یہ وہی شخص ہے جو مرتد اور زندیق خیال کیا جاتا ہے۔
لیکن کبھی کبھی قرآن کریم کی ایسی تفسیر اس کی طرف منسوب
کی جاتی ہے کہ شک پڑ جاتا ہے کہ اس کا ایمان تعصب
کی چادر سے تو نہیں ڈھانپ دیا گیا۔ یہی وہ منفرد شخص
ہے جس نے قرآن کریم میں نسخ کا انکار کیا ہے گو اس نے

صرف دعوے کیا ہے۔ جس طرح سر سید علی گڑھی نے وفاتِ مسیحؑ کا صرف دعوے کیا تھا۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے نسخ قرآن کو بدلائل بیّنہ رد کیا ہے اسی طرح جس طرح وفاتِ مسیحؑ کو بدلائل بیّنہ ثابت کیا ہے۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ ان پہلے دو شخصوں نے ان مضامین میں ستارۂ صبح کو دیکھ کر قیاس کیا مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سورج کو ہماری آنکھوں کے آگے لا کھڑا کیا۔ فَجَزَاہُ اللّٰہُ خَیْرًا عَنِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالنَّاسِ کُلِّھِمْ وَاَخْزٰی اَعْدَاءَہٗ وَمُعَانِدِیْہِ۔

سورۂ کافرون کے متعلق جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ قرآن کریم کا چوتھا حصہ ہے۔ بظاہر یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ چند آیتوں کی ایک سورۃ ہو اور اُسے قرآن کریم کا چوتھا حصہ قرار دے دیا جائے۔ بہرحال اس سے یہ تو مراد نہیں ہو سکتی کہ یہ سورۃ قرآن کریم کے حجم کے لحاظ سے اس کا چوتھا حصہ ہے۔ یہی مراد ہو سکتی ہے کہ اس میں اتنے اہم مطالب آگئے ہیں کہ گویا یہ قرآن کریم کا چوتھا حصہ ہے۔ چنانچہ آگے چلکر ہم نے جو اس سورۃ کی تفسیر کی ہے اس سے پتہ لگ سکتا ہے کہ اس چھوٹی سی سورۃ میں اتنے وسیع مطالب بیان کر دیئے گئے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اگر اسے قرآن کریم کا چوتھا حصہ قرار دیا ہے۔ تو اس میں کسی قسم کے مبالغہ سے کام نہیں لیا۔

پھر علاوہ اہم مطالب کے ذکر کے اس سورۃ کو بعض اور خصوصیات بھی حاصل ہیں جو کسی اور سورۃ کو حاصل نہیں۔ وہ خصوصیات یہ ہیں :-

اوّل وہ مضمون جو اس سورۃ کے پہلے حصہ میں بیان ہوا ہے اور وہ مضمون جو اس کی پہلی سورۃ یعنی سورۂ کوثر میں بیان ہوا ہے آپس میں ایسے جُڑے ہوئے ہیں کہ قرآن کریم میں اور کوئی سورۃ ایسی نہیں ہے جس کی ابتدائی آیتیں پہلی سورۃ کے تمام مضامین کا نتیجہ کہلا سکیں۔ صرف یہی ایک سورۃ ہے جس کی ابتدائی آیات پہلی سورۃ کے تمام مضامین کا نتیجہ ہیں۔

دوسری خصوصیت اس میں یہ ہے کہ جو اس کے بعد سورۃ آئی ہے یعنی سورۂ نصر اس کے سب مضامین کلی طور پر اس سورۃ کے بیان کردہ دعاوی کی دلیلیں ہیں۔ گویا اس سے پہلی سورۃ بھی اس کے دعاوی کی دلیل ہے اور اس کے بعد کی سورۃ بھی اس کے دعاوی کی دلیل ہے۔ مزید برآں یہ کہ اس سورۃ کی آخری آیت بھی اس کے دعاوی کی دلیل ہے جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا۔ یہ ایسی خصوصیات ہیں جو قرآن کریم کی کسی اور سورۃ کو حاصل نہیں۔ الغرض اس کو قرآن کریم کا چوتھا حصہ قرار دینا بالکل صحیح اور درست ہے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

اب میں اس کی کچھ مزید تشریح کرتا ہوں۔

اس سورۃ کی پہلی آیتیں یہ ہیں کہ قُلْ یٰۤاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ ۔ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۔ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۔ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۔ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ

یعنی اے کفار جن بتوں کی تم پوجا کرتے ہو اُن بتوں کی میں کبھی پوجا نہیں کروں گا اور نہ میرے ساتھی کریں گے اور جس طریق عبادت کو تم بجالاتے ہو میں اس طریق عبادت کو کبھی نہیں بجالاؤں گا اور نہ میرے ساتھی اُس طریق عبادت کو بجا لائیں گے اور نہ تم اس ہستی کی عبادت کرو گے جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ تم اس طریق عبادت کے مطابق عمل کرو گے جس طریق عبادت کے مطابق مَیں عمل کرتا ہوں۔

بظاہر یہ ایک تعلی معلوم ہوتی ہے جو قرآن کریم کی شان کے خلاف نظر آتی ہے۔ قرآن کریم میں حضرت شعیبؑ کے متعلق اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ کہ انہوں نے اپنے مخالفوں سے کہا کہ مَا یَکُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْھَآ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّنَا (اعراف ع۱۱) یعنی میں اپنے دین سے کبھی مرتد نہیں ہوں گا سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ چاہے۔ مگر اس سورۃ میں حضرت شعیبؑ کے طریق کے خلاف یہ کہا گیا ہے کہ یہ قطعی طور پر ناممکن بات ہے کہ میں یا میرے ساتھی کبھی بھی تمہارے معبودوں کی عبادت کریں. یا تمہارے طریق عبادت کو اختیار کریں۔ اور نہ یہ ممکن ہے کہ تم کبھی ہمارے معبود کی عبادت کرو یا ہمارے طریقِ عبادت کو اختیار کرو۔

جہاں تک تاریخی واقعات کا سوال ہے۔ یہ تو درست ہے کہ نہ صحابہؓ نے کبھی بتوں کی پوجا کی اور نہ کبھی کفار کے طریقِ عبادت کو اختیار کیا۔ مگر دوسرا حصہ تاریخی شواہد کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ہزارہا کفار نے ایمان لاکر خدائے واحد کی بھی عبادت کی. اور مسلمانوں کے طریق عبادت کو بھی اختیار کیا پس بظاہر ایسا معلوم ہوتا کہ یہ مضمون غلط ہو گیا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس جگہ کفار کے بڑے بڑے سردار مراد ہیں لیکن یہ بھی غلط ہے جیسا کہ اس سورۃ کی تفسیر میں بیان کیا جا چکا ہے۔ پس لازماً ان آیات میں کسی اور مضمون کا ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں اور مشرکوں کی فطرت کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان فطرتاً توحید کی طرف مائل ہے اور کافر نے ایک لمبی رسم و عادت کی وجہ سے مشرکانہ فطرت پالی ہے۔ اس لئے وہ اپنی عادت اور رسم کی وجہ سے شرک کی طرف تو مائل ہو سکتا ہے۔ لیکن توحید کی طرف نہیں جا سکتا۔

سورۃ کوثر میں یہ مضمون تھا کہ اے محمد رسول اللہ صلعم ہم نے تجھ کو دین و دنیا میں بہتات بخشی ہے اور جہاں اس میں روحانی فتوحات کا ذکر تھا وہاں دنیوی فتوحات کا بھی ذکر کیا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ تیری نسل یعنی تیرے مذہب پر چلنے والے لوگ ہمیشہ موجود رہیں گے۔ جس میں گویا اس آیت کا مضمون تھا کہ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ یعنی ہمیشہ ہی آپ کے تابعین دنیا میں موجود رہیں گے جو شرک سے بیزار ہوں گے۔ پس لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ تعلی نہیں بلکہ سورۂ کوثر میں جو خدا تعالےٰ نے خبر دی تھی اس کا اظہار ہے۔ اور یہ حضرت شعیبؑ کے طریق کے بھی خلاف نہیں بلکہ اس کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ حضرت شعیبؑ یہی کہتے ہیں کہ میں اپنے طریق کو نہیں چھوڑ سکتا جب تک کہ خدا کی مشیت مجھ سے یہ نہ چاہے یعنی جب تک خدا کی مشیت مجھ سے اس مذہب پر قائم رہنے کا مطالبہ کرے گی میں ہرگز اس مذہب کو نہیں چھوڑوں گا۔ اور سورۂ کوثر نے خدا کی مشیت بتادی ہے کہ محمد رسول اللہؐ اور اُن کے اتباع ہمیشہ توحید پر قائم رہیں گے۔ پس لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ اس کی تفسیر ہے اور سورۂ کوثر اس دعویٰ کی وجہ ہے

پھر سورۂ کوثر کے آخر میں فرمایا تھا کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ۔ جو لوگ تیرے دشمن ہیں انکی اولادیں انکی اولادیں نہیں رہیں گی۔ یعنی روحانی طور پر وہ انکی اولاد سے خارج ہو جائیں گی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو اختیار کر لیں گی۔ اس حصہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وَلَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ والا مضمون درست نہیں۔ کیونکہ جب کفار کی اولادیں مسلمان ہو جائیں گی تو لازمی طور پر وہ اس طریق پر عبادت کرنے لگ جائیں گی جس طرح مسلمان کرتے تھے۔ پس جہاں تک اس پیشگوئی کا سوال ہے وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ سے

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝ ع

(اُوپر کا اعلان نتیجہ ہے اس کا کہ) تمہارا دین تمہارے لئے (طریق کار مقرر کرتا) ہے اور میرا دین میرے لئے (طریق کار مقرر کرتا) ہے ؎۵۳

یہ نہیں نکل سکتا۔ کہ قرآن جھوٹا نکلا۔ کیونکہ اس سے پہلی سورۃ نے ہی بتا دیا تھا۔ کہ ایک دن آئے گا کہ کفار اور ان کی اولادیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے طریق کو اختیار کریں گی۔ اور اس طرح وہ اپنے باپ دادا سے کٹ جائیں گی اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی روحانی اولاد بن جائیں گی۔ جیسے عاص کا بیٹا عمرو مسلمان ہوا۔ ولید کا بیٹا خالد مسلمان ہوا۔ ابو جہل کا بیٹا عکرمہ مسلمان ہوا اور ابوسفیان خود مسلمان ہو گیا۔

پس درحقیقت وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ میں یہ پیشگوئی تھی کہ مکّہ والے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دین کو اختیار نہیں کریں گے۔ ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ پیشگوئی جھوٹی نہیں نکلی۔ کیونکہ وہ مسلمان اپنی مرضی سے نہیں ہوئے۔ بلکہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ کی پیشگوئی کے ماتحت خدا تعالےٰ نے ان کو پکڑ کر مسلمان کیا اور خدائی تصرّف کے ماتحت وہ ایمان لائے۔ پس عرب کا مسلمان ہو جانا قرآن کریم کے دعویٰ کے خلاف نہیں بلکہ قرآنی دعویٰ کی تصدیق ہے۔

اسی طرح میں نے یہ بیان کیا تھا۔ کہ اس سورۃ کے بعد کی جو سورۃ ہے وہ بھی ان دعاوی کی دلیل ہے جو قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کے شروع میں بیان کئے گئے ہیں۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کے بعد کی یہ سورۃ ہے کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ یعنی ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت تجھے حاصل ہوگی اور عرب پر غلبہ تجھے عطا ہو جائیگا اور تو دیکھے گا کہ فوج در فوج عرب لوگ دین اسلام میں داخل ہونگے۔ یہ آیت بھی سورۃ کافرون کی اس پہلی آیت کی دلیل ہے کہ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ یہ ظاہر ہے کہ جب باوجود کمزوری کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ دشمنانِ اسلام پر فتح بخشیگا اور ہزاروں ہزار آدمی مسلمان ہو جائینگے۔ تو اس نشان کے دیکھنے کے بعد کوئی مسلمان کفار کی طرف جا ہی کس طرح سکتا ہے۔ یہ تو روحانی بات ہوئی۔ ظاہری سبب کو بھی اگر دیکھو تو انسان اگر کسی کی طرف جاتا ہے تو لالچ کی وجہ سے جاتا ہے۔ جب اسلام کو غلبہ حاصل ہو جائیگا اور کفار خود مسلمانوں کے محتاج ہو جائینگے تو ایسا کون بیوقوف مسلمان ہو سکتا ہے جو ان مقہور اور مغلوب کفار کے ساتھ ملے اور فاتحین کا ساتھ چھوڑ دے؟ پس سورۃ کوثر بھی جو اس سے پہلے ہے اور سورۃ نصر بھی جو اس کے بعد ہے دونوں سورۃ کافرون کی پہلی آیتوں کیلئے بطور دلیل ہیں۔ اسی طرح اس سورۃ کا جو دوسرا حصہ ہے کہ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ اس کا بھی حل اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ سے ہو جاتا ہے۔ یعنی کفار اپنی فطرت کے لحاظ سے تو شرک پر ہی قائم تھے۔ مگر جب نصرت اور فتح کے ذریعہ اسلام کی صداقت روزِ روشن کی طرح ظاہر ہو گئی تو ان کو حالات نے مجبور کر کے اسلام کی طرف دھکیل دیا۔ پس باوجود ان کے اسلام لے آنے کے وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ والی آیت جھوٹی نہیں ہوئی بلکہ سورۃ کوثر بھی سچی ہوئی۔ سورۃ نصر بھی سچی ہوئی اور سورۃ کافرون بھی سچی ہوئی۔

؎۵۳ حل لغات:- دِيْنٌ۔ دِيْنٌ کے عربی زبان میں مندرجہ ذیل معنے ہیں:-

(۱) اَلطَّاعَةُ۔ فرمانبرداری (۲) اَلسُّلْطَانُ وَالْمُلْكُ

دِيْنٌ

وَالْحُکْمُ۔ غلبہ، بادشاہت اور حکومت (۳) اَلسِّیْرَۃُ طریقہ۔ مذہب اور لوگوں سے معاشرت کی کیفیت (۴) اَلتَّدْبِیْرُ۔ تدبیر کرنا (۵) اِسْمٌ لِجَمِیْعِ مَایُعْبَدُ بِہٖ اللّٰہُ۔ دین نام ہے ان تمام طریقوں کا جن کے ذریعے خدا تعالےٰ کی عبادت کی جاتی ہے۔ مثلاً مسلمانوں میں نماز پڑھنا یا حج بیت اللہ کے لئے جانا یا اموال کی مقرر مقدار پر ایک خاص نصاب سے غریبوں اور مسکینوں کے لئے زکوٰۃ کا ادا کرنا اللہ تعالےٰ کی عبادت قرار دیا جاتا ہے۔ یہ طریق عبادت عربی زبان کے لحاظ سے دین کہلائے گا۔ اسی طرح ہندوؤں کے طریق عبادت کی جو بھی شکل ہو وہ دین کہلائے گی۔ یہودیوں اور زرتشتیوں وغیرہ کے طریق عبادت کی جو بھی شکل ہو وہ دین کہلائیگی گویا عبادت الٰہی خواہ کسی طریق سے کی جائے اس کا نام دین ہوتا ہے۔ (۶) اَلْمِلَّۃُ۔ نظام جماعت (۷) اَلْوَرَعُ۔ بدیوں اور ممنوعات سے بچنا (۸) اَلْمَعْصِیَۃُ اطاعت سے نکلنا (۹) اَلْحَالُ۔ حالت یا کیفیت (۱۰) اَلشَّاْنُ (۱۱) ایک خاص حالت۔ شان کے معنے حالت کے ہوتے ہیں۔ لیکن اَلشَّاْنُ کا لفظ عام حالت سے کسی قدر بلند معنوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جیسے ہمارے ملک میں بڑی شان کہتے ہیں (ب) بہت ہی اہم امر (۱۲) اَلْعَادَۃُ۔ عادت۔

تفسیر: سورہ کافرون کی پہلی پانچ آیات میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اعلان کر دیں کہ کفار کے ساتھ انکا اتحاد فی العبادۃ ناممکن ہے۔ زیر تفسیر آیت لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ میں ایسا اعلان کرنے کا سبب بتایا گیا ہے۔ اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین کا یہ اعلان دھینگا مشتی کا فعل نہیں۔ نہ کسی عناد کے نتیجہ میں ایسا کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ اعلان اس بات کا نتیجہ ہے۔ کہ کفار کا دین اُن کے لئے عبادت کا اور طریق مقرر کرتا ہے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین کا دین اُن کے لئے عبادت کا اور طریق مقرر کرتا ہے۔ اور چونکہ ہر دو طریق کار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس لئے دونوں فریق کا اجتماع فی العبادۃ ناممکن ہے۔

۱ لکم دینکم ولی دین میں کفار کی عبادت اختیار نہ کرنے کی دلیل کا بیان

سورہ کافرون کی ابتدائی آیات میں پہلے ایک اصولی فیصلہ کا اعلان کیا گیا ہے۔ اور پھر اس اعلان کی دلیل لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ یہی طریق بیان ہماری زبان میں بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک میں کہتے ہیں کہ فلاں بات اس طرح ہے کیونکہ فلاں نے یوں کہا ہے۔ یعنی کلام کا آخری حصہ پہلے حصہ کے لئے وجہ اور سبب ہوتا ہے اور پہلا حصہ ایک نتیجہ ہوتا ہے جس کی بنیاد دوسرے حصہ پر رکھی جاتی ہے۔ عربی زبان میں چونکہ اختصار کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اس لئے بعض اوقات اِن الفاظ کو جو 'چونکہ' اور 'کیونکہ' کا مفہوم ادا کرتے ہیں اُڑا دیتے ہیں۔ اور اس سارے مفہوم کو جملہ کی بندش سے ادا کیا جاتا ہے۔ یہی طریق زیر تفسیر آیت میں اختیار کیا گیا ہے۔ پہلے فرمایا قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ۔ لَآ اَعْبُدُ مَاتَعْبُدُوْنَ۔ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ۔ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ۔ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ۔ یعنی ہم ہر زمانہ کے مسلمان سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے زمانہ کے کفار کو کہتا چلا جائے۔ کہ وہ ان معبودوں کی عبادت نہیں کر سکتا جن کی کفار عبادت کرتے ہیں اور نہ کفار اس ہستی کی عبادت کر سکتے ہیں جن کی مومن عبادت کر رہا ہے اور نہ مسلمان اس طریق عبادت کو اختیار کر سکتا ہے جس کو کافر اختیار کئے ہوئے ہیں

اور نہ کافر ہی مسلمان کے طریقِ عبادت کو اختیار کرسکتا ہے۔

اس اہم اعلان پر طبعًا یہ سوال پیدا ہوتا تھا۔ کہ آخر اس اعلان کی ضرورت کیا پیش آئی۔ کیا کوئی ذاتی عناد ہے جو مسلمانوں اور کافروں میں ہے یا کوئی منافشت اور جھگڑا ہے؟ فرمایا ایسا نہیں بلکہ اس اعلان کی وجہ یہ ہے کہ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ مسلمان کا دین عبادت کا اور طریق پیش کرتا ہے اور کافر کا دین اور طریق پیش کرتا ہے۔ اور ہر دو طریق کار چونکہ بالکل متضاد اور مختلف ہیں۔ اس لئے دونوں گروہوں کا جمع ہونا ناممکن اور محال ہے۔ گویا لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کے فقرہ نے سابق آیات کے مفہوم کو کھول دیا اور وہ خلش اور سوال جو طبیعت میں پیدا ہوتا تھا کہ آخر اس اعلان میں براءۃ کی کیا ضرورت پیش آئی تھی اس کو جامع مانع الفاظ کے ساتھ حل کر دیا۔

حل لغات میں لفظ دین کے گیارہ معنے لکھے گئے ہیں اور وہ سارے کے سارے اس آیت پر چسپاں ہوتے ہیں اور ان معنوں کو چسپاں کرنے کے بعد یہ مضمون واضح ہو جاتا ہے کہ کس طرح اس سوال کو جو قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ۔ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ کے بعد طبعًا دل میں پیدا ہوتا تھا حل کر دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین مجبور ہیں کہ وہ اعلان کر دیں۔ کہ وہ اپنے مذہب کے اصولِ عبادت کو چھوڑ کر کفار کے ساتھ متحد فی العبادۃ نہیں ہو سکتے کیونکہ اس کی زبردست وجوہات ہیں جو اختصارًا لفظ دین میں ہی بیان کر دی گئی ہیں اور جن کا ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں:-

اوّل مسلمان جس قادر و قیوم ہستی کو مانتے ہیں اُن کے نزدیک اس کی اطاعت کے اصول اَور ہیں اور کافروں کے نزدیک اُن کے معبودوں کی پیروی کے اصول اَور۔ (دِيْنٌ بمعنی اَلطَّاعَةُ)

دوم مسلمانوں کا طریقِ عبادت اَور ہے اور کافروں کا طریقِ عبادت اَور۔ (دِيْنٌ بمعنی مَا يُتَعَبَّدُ بِهِ اللّٰهُ)

سوم مسلمانوں کے اصولِ حکومت اَور ہیں اور کافروں کے اَور۔ (دِيْنٌ بمعنی اَلسُّلْطَانُ وَالْمُلْكُ وَالْحُكْمُ)

چہارم مسلمانوں کے نزدیک تقوی اور نیکی اور بدی کی تعریف اَور ہے اور کافروں کے نزدیک اَور۔ اسی طرح مسلمانوں کے نزدیک حلال اور حرام کے اصول اور ہیں اور کافروں کے نزدیک اَور (دِيْنٌ بمعنی اَلْوَرَعُ وَالْمَعْصِيَةُ)

پنجم مسلمانوں کے لوگوں سے معاشرت کے اصول اَور ہیں اور کافروں کے اَور (دِيْنٌ بمعنی اَلسِّيْرَةُ)

ششم مسلمانوں کی تدبیر اَور ہے اور کافروں کی اَور (دِيْنٌ بمعنی اَلتَّدْبِيْرُ)

ہفتم مسلمانوں کی عادات اَور ہیں اور کافروں کی اَور (دِيْنٌ بمعنی اَلْعَادَةُ)

لفظ دین میں ۹ وجوہات کیطرف اشارہ

ہشتم مسلمانوں کے روزمرہ کے کاموں کے اصول اَور ہیں اور کافروں کے اَور (دِيْنٌ بمعنی اَلْحَالُ)

گویا لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ مسلمانوں اور کافروں کے نہ اصول ملتے ہیں۔ اور نہ طریقِ کار۔ اس لئے مسلمانوں کی طرف سے یہ اعلان کہ ہم کفار کے ساتھ عبادت میں اتحاد نہیں کرسکتے بالکل صحیح اور درست ہے۔ اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا

کفار اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو صرف یہ کہ جو اصول اور طریقِ کار مسلمانوں نے اختیار کئے ہیں وہ غلط ہیں۔ اگر اُن کی یہ بات ثابت ہو جائے تو بیشک اسلام کا دعویٰ

باطل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اسلام کے پیش کردہ اصول اور طریق کار صحیح اور اہم ہیں۔ تو پھر مسلمانوں کا کافروں سے عبادت میں علیحدگی اختیار کرنا بالکل درست اور ایک ضروری امر ہو جاتا ہے۔ اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اُسے دھینگا مشتی کا فعل قرار دیا جا سکتا ہے۔

اب ہم اس مضمون کو جو مجملاً اوپر بیان کیا گیا ہے وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ کس طرح لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کی آیت پہلی آیات کے لئے بطور سبب اور وجہ کے ہے اور یہ کہ کس طرح اس آیت کے مضمون سے پہلی آیات کے مضمون کو واضح اور مدلّل کیا گیا ہے۔

سو جاننا چاہیئے۔ کہ حلِ لغات میں بتایا جا چکا ہے کہ لفظ دِیْن کے پہلے معنے اَلطَّاعَۃُ یعنی فرمانبرداری کے ہیں۔ اِن معنوں کی رو سے لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کا مفہوم یہ ہو گا۔ کہ اے منکرو! چونکہ تمہارا طریقِ اطاعت اور اصولِ اطاعت اور میرا طریقِ اطاعت اور اصول اطاعت الگ الگ ہے اس لئے میں تمہارے معبودوں کی عبادت نہیں کر سکتا اور تم میرے معبود کی اطاعت کرنے سے عملاً قاصر ہو۔ کیونکہ میرے اصول کے ماتحت بُتوں کی اطاعت نہیں ہو سکتی اور تمہارے اصول کے ماتحت خدائے واحد کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین کے اصولِ اطاعت جو قرآن کریم سے مستنبط ہوتے ہیں یہ ہیں:۔

(۱) اس دنیا کا خالق و مالک خدائے واحد ہی اس کے احکام کی ہر شخص کو فرمانبرداری کرنی چاہیئے۔ چنانچہ فرمایا فَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ فَلَہٗٓ اَسْلِمُوْا (حج ع۵) کہ اے لوگو! تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کی فرمانبرداری کرو۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح فرمانبرداری کی جائے؟ کیونکہ خدا تعالےٰ اپنے احکام دینے کے لئے خود دنیا میں نہیں آتا۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ بے شک وہ خود دنیا میں نہیں آتا۔ لیکن وہ اپنے رسول بھیجتا ہے اور ان کے ذریعہ لوگوں کو تعلیم دیتا ہے۔ جیساکہ وہ فرماتا ہے لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ (انعام ع۱۳) یعنی عقلیں اُس تک نہیں پہنچ سکتیں۔ مگر وہ خود عقلوں تک پہنچنے کے ذرائع اختیار کرتا ہے۔ پس ایک رسول کی آواز سنکر یا تو یہ کہنا پڑے گا کہ وہ جھوٹا ہے اور اس پر کلامِ الٰہی اور شریعت نازل نہیں ہوئی۔ اس صورت میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ رسول ہی نہیں ہے۔ اور اگر وہ سچا ہے اور اس پر الہامی شریعت نازل ہوئی ہے۔ تو پھر اس کا انکار کر کے کوئی شخص خدا تعالیٰ کا مطیع نہیں کہلا سکتا۔ پس جو لوگ رسولوں کو مان لیتے ہیں وہی اللہ تعالےٰ کے احکام کی فرمانبرداری کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور جو انکار کرتے ہیں وہ صحیح راستہ سے بھٹک جاتے ہیں۔

اب چونکہ اللہ تعالےٰ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ دنیا کی ہدایت کا سامان محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہو۔ اس لئے جو ان کی اتباع کرے گا وہی اللہ تعالےٰ کا متبع اور مطیع قرار پا سکتا ہے۔ اسی مضمون کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاَرْسَلْنٰکَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا۔ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (نساء ع۱۱) کہ اے محمد رسول اللہ! اب ہم نے ساری دنیا کی ہدایت کا سامان تیرے ذریعہ سے کیا ہے۔ جو شخص چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری کرے

اُسے چاہیئے کہ محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرے۔ کیونکہ ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔

پھر اسی مضمون کا اعلان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کر دیا گیا ہے۔ فرمایا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (آل عمران ع۴) یعنی اے ہمارے رسول لوگوں کو یہ کھول کر سُنا دو کہ اگر تم اللہ تعالےٰ سے محبت رکھتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ بھی تم سے محبت کا اظہار کرے۔ تو اس کا یہ طریق ہے کہ اس نے جو احکام میرے ذریعے دنیا کے لئے بھیجے ہیں اُن پر چلو اور میری پیروی کرو خدا تعالےٰ تم سے محبت کرنے لگ جائیگا اور تمہاری کمزوریوں کو نہیں دیکھے گا بلکہ تمہاری ان کمزوریوں کے باوجود اپنا جلوہ تمہیں دکھائے گا اور اپنے فضلوں سے تمہیں ڈھانپ لیگا۔ پھر فرمایا قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۔ کہ اے لوگو! اچھی طرح سے سُن لو۔ کہ اللہ کی اطاعت کرو اور اس رسول کی اطاعت کرو۔ اس فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت رسول کی اطاعت کے ذریعہ سے کرو۔ رسول چونکہ خدا تعالےٰ کی طرف سے نازل کردہ تعلیم لاتا ہے اس لئے جو اس پر ایمان لاتا ہے درحقیقت وہی خدا تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔ پس ضروری ہوا کہ احکام الٰہی کی وہ تفصیلات جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہیں اُن کے مطابق اطاعت کی جائے اور اگر اُن کے مطابق اطاعت نہ کی جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کہلا سکتی۔ پس جو الہامی شریعت کو مانتا ہے صرف وہی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا مدعی ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ مل کر عبادت بھی کی جا سکتی ہے۔ اسلام کا منکر چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی تعلیمات کو تسلیم نہیں کرتا اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر ہی نہیں سکتا۔ اور جو شخص ایسے انسان کی روحانی امور میں اطاعت کرے گا اور اس کے ساتھ عبادت میں شریک ہوگا وہ خدا تعالےٰ کے منشاء کے خلاف کرے گا۔

(۲) جس شخص کے دل میں محبت الٰہی کا جذبہ نہ ہو یا وہ کامل توحید پر نہ چلتا ہو۔ اس کی بھی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (کہف ع۴) یعنی اے مخاطب تو اس شخص کی اطاعت مت کر جس کے دل میں ہماری محبت نہیں اور وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی اطاعت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خدائے واحد سے دُور لے جائے گا۔ پس یہ لازمی امر ہے کہ انسان اُسی کی اطاعت کرے اور اسی کے ساتھ مل کر عبادت کرے جس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور ذکرِ الٰہی کرنے کا وہ عادی ہو اور خدا تعالےٰ کی توحید پھیلانے کا وہ شغل رکھتا ہو۔ اگر اس میں ایسی کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ تو اس کی صحبت اور اس کا لیڈر ہونا لوگوں کو خدا تعالےٰ سے دور کرتا چلا جائے گا اور عبادت بجائے قائم ہونے کے ختم ہو جائے گی۔ چونکہ کفار توحید کو نہیں مانتے۔ نہ اُن کے دل میں محبت الٰہی کا جذبہ ہے۔ اس لئے مومنوں کا اُن سے اتحاد فی العبادۃ نہیں ہو سکتا۔

(۳) جو شخص بجائے واقعات پر بنیاد رکھنے کے صرف قسمیں کھا کر اپنے دعویٰ کو ثابت کرنا چاہتا ہے اس کے ساتھ تعاون کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ (سورۃ القلم ع۱) یعنی اے مخاطب ہر قسم کھانیوالے کی پیروی مت کر۔ گویا اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر بات

واقعات وحقائق پر مبنی ہونی چاہیئے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرمایا قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف ع۱۲) یعنی ہمارے رسول یہ اعلان کر دے کہ میں اور میرے متبعین اپنے دعویٰ کے ساتھ شواہد، بیّنات اور دلائل رکھتے ہیں اور ہماری ہر بات حقائق و واقعات پر مبنی ہے۔ پس ہر بات واقعات پر مبنی ہونی چاہیئے۔ خالی قسموں پر نہیں۔ بے شک قرآن مجید نے بھی قسمیں کھائی ہیں لیکن قرآن کریم نے جو قسمیں کھائی ہیں وہ درحقیقت بطور شہادت کے ہیں۔ مثلاً فرمایا وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ (سورۃ البروج) کہ ہم قسم کھاتے آسمان کی جو بروج والا ہے۔ یعنی ہم شہادت کے طور پر آسمان کو پیش کرتے ہیں جس میں بہت سے مدارج ہیں۔ اس بات کی تائید کے لئے کہ آسمان روحانی بھی مختلف مدارج رکھتا ہے یعنی روحانی ترقیات بھی مختلف درجوں میں تقسیم ہیں۔ اور ان سب کا مدِنظر رکھنا ضروری ہے۔ اگر تم اس پر غور کرو گے تو تمہیں پتہ لگ جائیگا کہ مختلف زمانوں میں انسانوں کی ضرورتوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے الگ الگ شریعتیں کیوں بھیجیں۔ اگر اس امر کو سمجھ لیا جائے تو تمہیں ابراہیم۔ موسےٰ اور عیسیٰ علیہم السلام اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ لیکن اگر اس نکتہ کو نہ سمجھو گے تو تمہارے دل میں فوراً سوال پیدا ہوگا کہ ابراہیمؑ کے بعد موسیٰؑ کی کیا ضرورت تھی اور موسیٰؑ کے بعد عیسیٰؑ کی کیا ضرورت تھی اور پھر عیسیٰؑ کے بعد محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کیا ضرورت ہے ؟

پس محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین چونکہ اپنی باتوں کی بنیاد واقعات۔ دلائل اور شواہد پر رکھتے ہیں۔ اسلئے انکا کفار سے اتحاد فی العبادۃ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ اپنی باتوں کی بنیاد واقعات پر نہیں رکھتے بلکہ مطلق قسموں پر رکھتے ہیں جنکا واقعات وحقائق سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔

(۴) جو شخص شریعتِ الٰہی کی ضرورت کو تسلیم نہ کرتا ہو وہ بھی خدا تعالےٰ کی اطاعت نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی کرتا ہے اس لئے ایسے شخص کے پیچھے چلنے والا بھی درحقیقت حقیقی عبادت نہیں کرتا۔ بلکہ عبادت سے دور چلا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (دہر ع۲) اے مخاطب خدا تعالےٰ کی شریعت کے خلاف چلنے والے اور اس کے احکام کی نافرمانی کرنے والے کی اطاعت تمہیں خدا سے دور پھینک دیگی۔ اس اصل کے ماتحت جب کفار شریعتِ الٰہی کے خلاف چل رہے ہیں تو ان سے اتحاد فی العبادۃ کر کے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ انسان خدا تعالےٰ سے دور چلا جائے۔

(۵) بعض لوگ ایک دفعہ تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے صداقت کو مان لیا، لیکن پھر اپنا رُخ بدلتے رہتے ہیں ایسے انسانوں کی اطاعت بھی اسلامی اصول کے مطابق اطاعت نہیں کہلا سکتی اور نہ ان کی عبادت حقیقی عبادت کہلا سکتی ہے کیونکہ ان کے اندر ایمان نہیں ہوتا۔ اگر ایمان ہوتا تو بدلتے کیوں ؟ تبدیلی بتاتی ہے کہ ان کے اندر ایمان کامل نہیں۔ ایسے ہی لوگوں کا حال بیان کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ (نور ع۶) کہ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لے آئے اور ہم نے صداقت کو مان لیا لیکن پھر اپنا رُخ بدل لیتے ہیں۔ یاد رکھو ایسے لوگ حقیقی مومنوں کی صف میں کھڑے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ کچھ عرصہ آپ کے ساتھ مل کر عبادت کریں۔ جیسا کہ اوپر کی روایات میں

بعض کفار کا ذکر آیا ہے کہ وہ اس قسم کی بے ہودہ باتیں کر لیتے تھے۔ چونکہ اسلام اس طریق کو درست نہیں سمجھتا اس لئے مومن ایسے لوگوں کے ساتھ متحد فی العبادۃ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ایسے لوگ مخلص فی العبادۃ نہیں ہوتے اور اسلام پکا مومن انہی کو کہتا ہے جو کہ مخلص فی العبادۃ ہوں اور عبادت پر دوام اختیار کرنے والے ہوں اور دلی یقین سے عبادت بجالائیں۔

(۶) بعض الامر کی اطاعت بھی اطاعت نہیں کہلاتی

بعض الامر کی اطاعت کے معنے یہ ہیں۔ کہ وہ احکام جو اپنی مرضی کے مطابق ہوں اُن پر عمل کر لیا جائے اور باقی کو رد کر دیا جائے۔ وہ شخص جو بعض الامر کی اطاعت کرتا ہے اس کے متعلق یہی سمجھا جائے گا کہ وہ خدا تعالیٰ کی مرضی پر نہیں بلکہ اپنی مرضی پر چلتا ہے۔ اور اس کے صاف یہ معنے ہیں کہ وہ خدا تعالےٰ کی پوری اطاعت کرنے کیلئے تیار نہیں۔ صرف اپنے نفس کی اطاعت کرتا ہے ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ وہ کہتے ہیں سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْاَمْرِ (محمدع) اے لوگو! ہم تمہاری ان امور میں جو ہماری طبیعت کے مناسب حال ہیں اطاعت کرنے کو تیار ہیں۔ بہرحال ایسے لوگ جو اُن امور میں اطاعت کریں جنہیں ان کے اپنے نفس بھی ماننے کے لئے تیار ہوں پوری طرح خدا تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے نہیں کہلا سکتے۔ اس کے مقابلہ میں وہ شخص جو خدا تعالےٰ کی اطاعت اس لئے نہیں کرتا کہ اس کے احکام اس کی مرضی کے مطابق ہیں۔ بلکہ خواہ وہ اس کی مرضی کے مطابق ہوں یا نہ ہوں۔ وہ ان کی اطاعت کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا ایسے لوگوں کے ساتھ جو اس اصل کے منکر ہوں اتحاد فی العبادۃ نہیں ہو سکتا۔

(۷) انسان اس لئے اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری نہ کرے کہ اُن احکام پر چلنے کی وجہ سے اُسے مادی فوائد حاصل ہو جائیں گے۔ مثلاً زکوٰۃ دے تو اس لئے نہیں کہ برادری سے تعلقات مضبوط ہو جائینگے بلکہ اس لئے دے کہ خدا تعالےٰ کی خوشنودی حاصل ہو جائیگی جب تک اس اصل کے مطابق اطاعت نہ کی جائے انسان اپنے ایمان میں کامل نہیں کہلا سکتا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيعُونَ اللّٰهَ (توبہ ع) یعنی کامل الایمان لوگ وہ ہیں جو زکوٰۃ دیتے ہیں۔ لیکن مادی فوائد کے لئے نہیں۔ رشتہ داریاں بڑھانے اور تعلقات قائم کرنے کے لئے نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کی اطاعت کی غرض سے اور اس لئے کہ اس کی خوشنودی اور اس کی رضاء حاصل ہو جائے۔ یعنی جن امور کو خدا تعالیٰ پسند کرتا ہے ان کو بھی وہ خدا تعالےٰ کی رضاء کے لئے سرانجام دیتے ہیں یعنی کام خواہ ان کی فطرت کے مطابق ہوں یا قومی ضرورتوں کے مطابق ہوں۔ پھر بھی وہ ہر اچھا کام اس لئے نہیں کرتے کہ وہ کام ان کی فطرت کے مطابق ہے یا اس کے کرنے سے قوم خوش ہو جائے گی۔ بلکہ وہ اس لئے ان اعمال کو بجا لاتے ہیں کہ ان کا خدا خوش ہو جائے گا بہرحال وہ شخص جو اپنے اعمال کے بجا لانے میں اس نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھتا ہے وہ ان کے ساتھ مل کر کیونکر عبادت کر سکتا ہے۔ جو احکام الٰہی پر صرف اس لئے عمل کرتے ہیں کہ ان کو مادی یا قومی فوائد حاصل ہو جائیں۔

پھر یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ لفظ اَلطَّاعَۃ کے معنے محض فرمانبرداری نہیں۔ بلکہ ایسی فرمانبرداری کے ہیں جو بشاشتِ قلب کے ساتھ کی جائے اور اس میں نفس کی مرضی اور پسندیدگی بھی پائی جاتی ہو۔ چنانچہ کہتے ہیں جَآءَ فُلَانٌ طَوْعًا: اَیْ غَیْرَ مُکْرَہٍ (اقرب) یعنی فلاں شخص اپنی مرضی اور اختیار سے خود بخود آگیا نہ کہ جبراً۔ اور طَوْعٌ کے مقابل پر کَرْہٌ کا لفظ بولا جاتا ہے جس کے معنے ہیں مَا اَکْرَهَتْ نَفْسَكَ عَلَيْهِ (اقرب) کہ

انسان کوئی کام دل سے نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ بیرونی دباؤ کی وجہ سے اُسے سرانجام دینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور یہ صاف ظاہر ہے کہ ایسے کام میں بشاشت پیدا نہ ہوگی۔

طَوْعٌ مادہ سے بننے والے دوسرے کلمات اس مفہوم کو مزید واضح کر دیتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں طَاوَعَهٗ فِيْهِ وَعَلَيْهِ مُطَاوَعَةً : وَافَقَهٗ۔ کہ فلاں نے فلاں کی کسی امر میں مطاوعت کی۔ اور اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس نے دل سے اس کی موافقت کی۔ اس طور پر نہیں کہ اس موافقت کے لئے اُس نے اپنے نفس پر جبر کیا ہو۔

اسی طرح کہتے ہیں طَاوَعَ لَهُ الْمُرَادُ - اَتَاهُ طَائِعًا سَهْلًا یعنی طَاوَعَ لَهُ الْمُرَادُ کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس کا مقصد۔ اس کی مراد اور دلی خواہش بغیر تکلیف اور جد و جہد کے خود بخود پوری ہوگئی۔ پھر کہتے ہیں اَطَاعَ الْمَرْتَعُ اَیْ اِتَّسَعَ وَ اَمْكَنَهُ الرَّعْیَ یعنی جب اَطَاعَهُ الْمَرْتَعُ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں کہ چراگاہ نہایت وسعت والی ہوگئی اور جانوروں نے بغیر کسی روک ٹوک کے چراگاہ کی گھاس سے اپنے پیٹوں کو بھر لیا۔ گویا اس میں مجازاً اس مضمون کو ادا کیا گیا ہے۔ کہ چراگاہ اپنے آپ کو خود بخود پیش کر رہی تھی کہ اس سے جانور گھاس کھا کر سیر ہو سکیں۔

الغرض اَلطَّاعَةُ کے معنے وضع لغت کے لحاظ سے خالی فرمانبرداری کے نہیں۔ بلکہ اس فرمانبرداری کے ہیں جو پسندیدگی اور خوشی سے ہو نہ کہ جبر اور اکراہ سے۔ اور جو تکلف سے اطاعت کی جاتے یعنی عمل کرتے ہوئے اگر شرح صدر نہیں تو نفس کو عمل پر آمادہ کیا جائے اور بشاشت کا اظہار تکلف سے کیا جائے۔ اس کیلئے عربی زبان میں عام طور پر تَطَوَّعَ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی آتا ہے فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ (بقرہ ع۲۳) کہ جو پورے شوق اور رضاء سے اور شرح صدر سے نیکی نہیں کر سکتا۔ اسے کم از کم تکلف سے ہی نیکی کرنی چاہیئے اور نیکی کرتے وقت بشاشت کا اظہار کرنا چاہیئے۔ تاکہ یہ ظاہر نہ ہو کہ وہ اس کو بوجھ سمجھ رہا ہے اور اگر ایسا کرے گا۔ تو بہرحال اس کیلئے بہتری کے وہ راستے جو شرح صدر سے اعمال کرنے والے کے لئے کھلتے ہیں کھل جائیں گے۔

امام راغب اپنی کتاب مفردات میں لکھتے ہیں کہ تَطَوَّعَ کے گو اصل معنے تکلف سے کام کرنے کے ہیں مگر محاورہ میں غیر واجب کام کے نفلی طور پر کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس آیت میں یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ جو شخص نفلی طور پر نیکی کرے وہ اس کے لئے بہتر ہوگی۔

پس اطاعت کے اس مفہوم کے لحاظ سے لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کے معنے یہ ہوں گے کہ اے منکرو! تمہارا اطاعت کا مفہوم اور ہے اور میرا اور ہے یعنی تم صرف ظاہری آداب بجالانے کو اطاعت سمجھ رہے ہو اور میں اطاعت صرف اسے کہتا ہوں کہ بشاشتِ قلب سے اللہ تعالےٰ کے احکام بجالائے جائیں اور ان کو بجالاتے ہوئے انسان کو لذت اور سرور محسوس ہو۔

یہ امر ظاہر ہے کہ احکام کی تعمیل میں بشاشتِ قلبی تبھی پیدا ہو سکتی ہے جب مندرجہ ذیل امور موجود ہوں :-

۱۔ احکام کے فلسفہ کو سمجھنا۔

۲۔ رحمت کا پہلو تعلیم میں غالب ہونا۔

۳۔ احکام کی تعمیل میں ایسے فوائد کا موجود ہونا جو اس تکلیف اور مشقت سے بڑھ کر ہوں جو اعمال کے بجالانے میں اٹھانی پڑتی ہے۔

۴۔ شریعت کا خود انسان کے حق میں مفید ہونا جس کو اُسے اپنا مقصود نظر آجائے۔

یہ چاروں باتیں صرف اسلام میں پائی جاتی ہیں دوسرے

مذاہب اِن باتوں سے خالی ہیں۔ چنانچہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کے سارے احکام فلسفہ پر مبنی ہیں۔ یعنی اسلام صرف کوئی حکم ہی نہیں دیتا بلکہ ساتھ ہی یہ بتاتا ہے کہ اس حکم کی غرض کیا ہے۔ اس کے فوائد کیا ہیں اور اس کا مقصد کیا ہے۔ تا ان احکام پر عمل کرنے والا اپنے دل میں ایک لذت محسوس کرے اور سمجھ لے کہ وہ لغو کام نہیں کر رہا یا صرف حکم کی تعمیل نہیں کر رہا۔ بلکہ ایسے حکم کی تعمیل کر رہا ہے جو اپنے اندر بیشمار انفرادی اور قومی فوائد رکھتا ہے۔ یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ صرف حکم ہی نہیں بلکہ اس کا فلسفہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر احکام کے ساتھ ساتھ آسمان سے نازل کیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا (نساء ع) یعنی اے ہمارے رسول ہم نے تجھ پر احکام پر مشتمل ایک کمل کتاب نازل کی ہے اور ان احکام کا فلسفہ بھی آسمان سے نازل کیا ہے اور تجھے وہ کچھ سکھایا ہے جو اس سے پہلے تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر اللہ کا بہت بڑا فضل واحسان ہے۔

پھر فرمایا کہ احکام کا یہ فلسفہ ہم نے صرف اپنے رسول پر اس کے ذاتی علم کے لئے ہی نہیں نازل کیا بلکہ اس لئے نازل کیا ہے تا وہ اپنے متبعین کو یہ فلسفہ بتائیں اور انکو سمجھائیں۔ چنانچہ فرمایا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ۚ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (آل عمران ع۱۷) یعنی اللہ تعالےٰ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا جبکہ اس نے انہی کی قوم میں سے ایک رسول مبعوث کیا۔ جو ان کو اللہ تعالےٰ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کے دلوں کو پاک کرتا ہے اور قوم کو ترقی کے ذرائع بتاتا ہے کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ اس سے پہلے نہایت ہی خطرناک گمراہی میں مبتلا تھے۔ پس اسلام کو دوسرے مذاہب کے مقابل پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ اپنے احکام کی اغراض اور اُن کے فلسفہ کو بھی بیان کرتا ہے۔ تا کہ ان احکام کی تعمیل میں بشاشت قلبی قائم رہے اور تعمیل کرنے والوں کو لذت و سرور حاصل ہو۔ اور یہ فلسفہ ایک دو احکام میں نہیں بلکہ اسلام کے جملہ احکام میں اس کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ اسلام کے سارے احکام کو گننا اور ان کے فلسفہ کو بیان کرنا ایک لمبا وقت چاہتا ہے۔ اس لئے یہ مضمون تفصیل کے ساتھ تو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں ذیل میں چند ایک مثالیں بیان کر دیتے ہیں تا مفہوم واضح ہو سکے۔

(۱) سو جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمْ وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا وَصَلِّ عَلَیْھِمْ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ ۔ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (توبہ ع۱۳) یعنی اے ہمارے رسول! مسلمانوں کے اموال میں سے کچھ رقم بطور صدقہ یعنی زکوٰۃ لیا کر تاکہ اس طریق سے تو ان کو پاک کرنے اور ان کے اموال میں ترقی دینے کا راستہ کھول سکے اور ان کی قربانی کا مظاہرہ دیکھ کر اُن کے لئے دعائیں کر سکے۔ کیونکہ تیری دعائیں اُن کے لئے اطمینان وتسکین کا موجب ہوتی ہیں اور اللہ تعالےٰ تیری دعائیں سُنتا اور قربانی کرنے والوں کے حالات کو خوب جانتا ہے۔

اِن آیات میں پہلے فرمایا خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً کہ اے رسول! مسلمانوں کے اموال سے زکوٰۃ لیا کر۔ اس کے بعد اس حکم کی غرض وغایت ان الفاظ میں

بیان کی کہ تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا۔ یعنی زکوٰۃ کی پہلی غرض تُطَهِّرُهُمْ کے ماتحت یہ ہے کہ انسان کا مال دوسروں کے حقوق ادا کرکے پاک ہو جائے۔ کیونکہ تمام انسانوں کی دولت دوسرے لوگوں کی مدد سے کمائی جاتی ہے اور اس کمائی میں دوسروں کا حق شامل ہوتا ہے جو (باوجود مزدوری ادا کرنے کے) پھر بھی دولتمند کے مال میں باقی رہ جاتا ہے۔ مثلاً ایک مالدار آدمی ایک کان سے فائدہ اٹھاتا ہے وہ کان کے مزدوروں کو ان کی مزدوری پوری طرح ادا بھی کردے تو بھی وہ جو کچھ ان کو ادا کرتا ہے وہ اُن کی مزدوری ہے۔ مگر قرآنی تعلیم کے مطابق وہ لوگ بھی اس کان میں حصہ دار تھے۔ کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (بقرہ ع۳)
کہ دنیا کے سب خزانے تمام بنی نوع انسان کے لئے پیدا کئے گئے ہیں نہ کہ کسی خاص شخص کے لئے۔ پس مزدوری ادا کر دینے کے بعد بھی حق ملکیت جو مزدوروں کو حاصل تھا ادا نہیں ہوتا۔ اس کی ادائیگی کی یہ صورت ہو سکتی تھی کہ اُن مزدوروں کو کچھ زائد رقم دے دی جائے۔ مگر اس سے بھی وہ حق ادا نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس طرح اُن چند مزدوروں کو تو اُن کا حق ادا ہو جاتا۔ مگر باقی دنیا جو اس میں حصہ دار تھی اس کا حق ادا ہونے سے رہ جاتا۔ پس اسلام نے یہ حکم دیا کہ اس قسم کی کمائی میں سے کچھ حصہ حکومت کو ادا کیا جائے تاکہ وہ اُسے تمام لوگوں میں مشترک طور پر خرچ کرے۔

اسی طرح زمیندار جو زمین میں سے اپنی روزی پیدا کرتا ہے گو اپنی محنت کا پھل کھاتا ہے مگر وہ اس زمین سے بھی تو فائدہ اٹھاتا ہے جو تمام بنی نوع انسان کے لئے بنائی گئی تھی۔ پس اس کی آمد میں سے بھی ایک حصہ حکومت کو قرآن کریم دلواتا ہے تاکہ تمام بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے اُسے خرچ کیا جائے۔ اس قانون کے مطابق مزارع عشر دیتا ہے اور پھر جو مالک ہے۔ جب اس کے پاس روپیہ جمع ہوتا ہے۔ وہ بھی اس میں سے زکوٰۃ دیتا ہے۔

اسی طرح تجارت کرنے والا بظاہر اپنے مال سے تجارت کرتا ہے۔ لیکن اس کی تجارت کا مدار ملکی امن پر ہے۔ اور اس امن کے قیام میں ملک کے ہر شخص کا حصہ ہے پس اس حصہ کو دلانے کے لئے کمائے ہوئے مال پر اسلام نے زکوٰۃ مقرر کر دی۔ تاکہ کمائے ہوئے مال دوسروں لوگوں کے حصہ سے پاک ہوتے رہیں۔

دوسری غرض تُزَكِّيهِمْ کے ماتحت (جس کے معنے بڑھانے اور ترقی دینے کے ہیں) یہ قرار دی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ افراد اور ملک و قوم کی ترقی کا راستہ کھولا جائے۔

اس آیت میں تُطَهِّرُهُمْ کے بعد تُزَكِّيهِمْ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ پس اس کے وہ معنے لینے پڑیں گے جو ہوں تو لغت کے مطابق لیکن تُطَهِّرُ سے مختلف ہوں۔ تاکہ قرآن کریم کی فصاحت قائم رہے۔ سو جب ہم لغت کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ تزکیہ کے معنے علاوہ تطہیر کے ترقی دینے کے بھی ہوتے ہیں پس آیت کے یہ معنے ہوں گے۔ کہ اموال زکوٰۃ لے کر تم دلوں کی صفائی کرو اور ان کے اموال میں جو دوسروں کا حق ہے اس سے اُن کے اموال کو پاک کرو۔ اور قوم اور ملک کی ترقی کے سامان بہم پہنچاؤ۔ گویا زکوٰۃ صرف عبادت ہی نہیں بلکہ حقوق العباد کی ادائیگی کا بھی ایک ذریعہ ہے۔

پھر قرآن کریم نے زکوٰۃ کے مصارف بھی خود بیان کر دئے تاکہ یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے۔ کہ کس طرح زکوٰۃ کے اموال کے ذریعہ اہم قومی ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے۔ اگر یہ اموال ان ضروریات کے لئے خرچ نہ کئے جاتے تو قوم بے دست و پا ہو کر رہ جاتی۔

فرمایا۔ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِیْلِ فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ (توبہ ع) یعنی زکوٰۃ کے خرچ کرنے کی مندرجہ ذیل آٹھ مدات ہیں :۔

۱۔ فقراء
۲۔ مساکین
۳۔ زکوٰۃ کے کام پر مامور عملہ
۴۔ مؤلفۃ القلوب۔ یعنی جن لوگوں کی تالیف قلب مدنظر ہو۔
۵۔ فی الرقاب۔ یعنی جو غلام ہوں یا مصائب میں پھنسے ہوئے ہوں انکی گلو خلاصی کرانے میں۔
۶۔ غارمین۔ یعنی وہ لوگ جو اپنے کسی قصور کے بغیر مالی ابتلاء میں پھنس گئے ہوں۔
۷۔ فی سبیل اللہ۔ یعنی اللہ تعالےٰ کے بتلائے ہوئے یا اس کی رضاء کے کاموں میں۔
۸۔ ابن السبیل۔ یعنی مسافر۔

زکوٰۃ کا پہلا مصرف فقراء ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو کلّی طور پر یا جزوی طور پر اپنا گذارہ چلانے کے لئے دوسروں کی مدد کے محتاج ہیں۔ مثلاً اپاہج ہیں۔ معذور ہیں۔ یتامیٰ و بیوگان ہیں۔ ایسے تمام لوگوں کی ذمہ داری قوم پر ہوتی ہے۔ اگر ان کا خیال نہ رکھا جائے تو قوم ذلیل ہو جاتی ہے۔ پس اللہ تعالےٰ نے ایسا حکم دے دیا جس سے دائمی طور پر قابلِ امداد لوگوں کی امداد ہوتی رہے اور قوم اور ملک میں ضعف پیدا نہ ہو۔

قرآنی آیت میں فقراء کا لفظ اللہ تعالیٰ نے پہلے رکھا ہے۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ ہر حالت میں اس کو تمام دوسرے اخراجات پر ترجیح دی جاتی گی۔ بلکہ اس کے صرف یہ معنے ہیں کہ عام حالات میں اسکو ترجیح دی جائے گی۔ ورنہ ایسے حالات بھی آسکتے ہیں۔ جبکہ حکومت کو خود اپنی ذات میں خطرہ ہو۔ ایسے وقت میں افراد خواہ کتنے ہی غریب ہوں۔ انہیں ملّت کے لئے قربانی کی دعوت دی جائے گی۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جہاد کے لئے غریبوں اور امیروں سب کو بلاتے تھے اور انہیں دیا کچھ نہیں جاتا تھا۔ پس معلوم ہوا کہ اگر قوم و ملک کی آزادی خطرے میں ہو۔ تو اُس وقت غرباء کو بھی قربانی کے لئے بلایا جا سکتا ہے۔ پس یہ ترتیب جو قرآنی آیت میں فقراء کو نمبر اول پر رکھ کر قائم کی گئی ہے فرض نہیں مرجح ہے۔

آیت میں فقراء کے بعد مساکین کا لفظ ہے۔ لُغت میں مسکین کے معنے بھی درحقیقت فقیر ہی کے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مسکین ساکن فقیر کو کہتے ہیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ساکن فقیر کے یہ معنے کئے ہیں کہ وہ جو اپنے گھر میں بیٹھ جائے اور سوال کے ذریعہ کسی کو اپنی غربت کا پتہ نہ لگنے دے۔ یعنی صرف اس کے حالات سے علم ہو کہ وہ قابلِ امداد ہے۔

باوجود اس کے کہ فقیر اور مسکین کے الفاظ ایک ہی قسم کی غربت پر دلالت کرتے ہیں۔ انہیں الگ الگ بیان کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اسلامی حکومت کا یہ فرض مقرر کیا گیا ہے۔ کہ وہ صرف نادار لوگوں کا ہی فکر نہ کرے بلکہ ایسے لوگوں کی بھی جستجو کرے جو نادار ہیں لیکن اپنی ناداری لوگوں پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ اور تلاش کر کے ان کی مدد کرے۔

تیسری مدخرچ کی وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے یعنی جو لوگ زکوٰۃ کا انتظام کرنے پر مقرر ہوں انکی تنخواہیں وغیرہ بھی اس سے ادا کی جائیں۔

درحقیقت وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا کے الفاظ میں وسعت ہے۔ ملکی فوج بھی عاملین کی ذیل میں آجاتی ہے۔ کیونکہ اگر فوج نہ ہوگی تو ملک کا امن برقرار نہ رہ سکے گا۔ نہ تجارت ہو سکے گی نہ زمینداری۔ اور اگر تجارت و زمینداری نہ ہوگی تو زکوٰۃ کہاں سے آئے گی۔ پس زکوٰۃ کے جمع ہونے میں فوج کا بھی بڑا دخل ہے۔ بہرحال زکوٰۃ کے نظم و نسق کے کارکن اول درجہ پر عاملین کی ذیل میں آتے ہیں۔

چوتھی مد مؤلفۃ القلوب کی بیان کی گئی ہے یعنی وہ لوگ جن کے دل ملے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ملے ہوئے دلوں کا ذکر کرنے کے یہی معنے ہو سکتے ہیں۔ کہ انکا ظاہر ملا ہوا نہ ہو۔ پس مؤلفۃ القلوب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دل اسلام یا اسلامی حکومت کی طرف مائل ہو چکے ہوں لیکن کفار کے ملک میں ہونے کی وجہ سے اپنے اسلام یا اپنی ہمدردی کو پوری طرح ظاہر نہ کر سکتے ہوں اُن کو اسلامی ملک میں لانے یا ان کی دلی حالت کو قائم رکھنے میں مدد دینے کے لئے بھی زکوٰۃ کا روپیہ خرچ کیا جا سکتا ہے۔ یا ایسے لوگ جن کے دل اسلام کی صداقت کے قائل ہو چکے ہیں۔ لیکن اگر وہ اسلام کو ظاہر کر دیں تو غیر ممالک میں ان کی ملازمتیں خطرے میں پڑ جاتی ہیں اور گذارے کی صورتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کی بھی مدد کی جا سکتی ہے مؤلفۃ القلوب سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ کسی کو روپیہ دیکر اسلام کی طرف مائل کیا جائے۔ کیونکہ اسلام روپیہ دیکر لوگوں کو مسلمان بنانے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اسکی ذاتی خوبیاں ہی اس کے پھیلانے کے لئے کافی ہیں۔

پانچویں مد فی الرقاب بیان کی گئی ہے یعنی غلاموں کے آزاد کرانے میں بھی زکوٰۃ کا روپیہ خرچ کیا جا سکتا ہے ابتدائے اسلام میں عرب میں غلامی کا رواج تھا اس لئے ان کے آزاد کروانے کا حکم تھا کیونکہ اسلام بیع و شراء والی غلامی کو مطلقاً حرام کرتا ہے لیکن اس کے یہ معنے بھی ہیں۔ کہ اگر کوئی جابر قوم ظالمانہ طور پر کسی کمزور قوم کو روند ڈالے اور اُن کے ملک پر قبضہ کرلے اور ان کو غلام بنالے تو کمزور قوم کی مدد کی جائے اور ان کو ظالموں کے ہاتھوں سے آزاد کرایا جائے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کا قرض ادا نہ کر سکنے کی صورت میں مصیبت میں مبتلا ہو تو اس کی زکوٰۃ کے مال سے گلو خلاصی کرائی جائے۔

چھٹی مد غارمین کی بیان کی گئی ہے۔ اس کی ذیل میں وہ لوگ آجاتے ہیں۔ جن کو بعض اوقات ایسی رقوم ادا کرنی پڑ جاتی ہیں جن کے براہ راست وہ ذمہ وار نہیں ہوتے۔ مثلاً کسی کی ضمانت دی اور جس کی ضمانت دی تھی وہ فوت ہو گیا یا کسی اور طرح سے غائب ہو گیا۔ تو ضامن کے پاس مال نہ ہو سکنے کی صورت میں اس کی امداد کی جا سکتی ہے۔

اسی طرح اس کی ذیل میں وہ تاجر بھی آسکتے ہیں جن کی تجارت ملک کے لئے مفید ہو۔ مگر کسی اتفاقی حادثہ کی وجہ سے ان کا نقصان ہو جائے اور تجارت بند ہو جانے کا خطرہ ہو۔ ایسی صورت میں حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان لوگوں کو روپیہ دے۔ تاکہ وہ اپنی تجارت کو بحال کرکے ملک کو فائدہ پہنچا سکیں۔

ساتویں مد فی سبیل اللہ کی ہے۔ اس مد میں وہ تمام کام شامل ہیں۔ جو قومی یا ملکی تنظیم۔ استحکام۔ حفاظت یا ان کی ترقی کے لئے کئے جائیں۔ اس میں فوجیں بھی شامل ہیں اور تعلیم بھی شامل ہے۔ سڑکیں۔ ہسپتال اسی قسم کے وہ تمام کام جو صرف کسی فرد کے فائدہ کے لئے نہیں بلکہ تمام قوم کے فائدہ کے لئے ہوتے ہیں۔ شامل ہیں۔ فقراء مساکین۔ عاملین علیہا۔ مؤلفۃ القلوب اور غارمین کے ذکر میں درحقیقت فردی امداد کا ذکر ہے۔ اور اس کے بعد ابن السبیل کا لفظ رکھ کر یہ بتایا گیا ہے

کہ بعض اوقات ایسے کام پیش آجاتے ہیں جو کسی فرد کی طرف منسوب نہیں کئے جاسکتے۔ بلکہ قوم کی طرف یا ملک کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ اور اس قسم کے کاموں میں اجتماعی خرچ ہوتا ہے جو ملک اور ملت کے استحکام اور ترقی کے لئے کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ ایسے خرچ کئی قسم کے ہوسکتے ہیں اس لئے اس کی تفصیل بیان نہیں کی بلکہ ایک مجمل اور جامع لفظ رکھ دیا تاکہ ضرورت پیش آنے پر ذمہ وار لوگ اس کو خرچ کرسکیں۔

آٹھویں مد ابن السبیل کی ہے۔ ابن السبیل کے معنے مسافر کے ہیں۔ یعنی مسافروں کی امداد کرنا حکومت کا فرض ہے۔ یعنی سڑکوں کا بنانا اور ان کی مرمت وغیرہ کا خیال رکھنا۔ مسافر خانے اور ڈاک بنگلے بنانا اپنے ملک میں سفر کرنے کے لئے معلومات اور سہولتیں بہم پہنچانا۔ اس کے متعلق لٹریچر شائع کرنا۔ تاکہ غیر ملکوں کے لوگ آئیں اور اسلامی حکومت کو دیکھیں اور مسلمان غیر مسلمانوں سے واقف ہوں اور غیر مسلمان مسلمانوں سے واقف ہوں۔ اور سیاحوں کے آنے کی وجہ سے ملک کی دولت بڑھے اور غیر ملکوں کے ساتھ تعلقات قائم ہونے کی وجہ سے اسلامی ملک کی ساکھ دوسرے ممالک میں قائم ہو اور بین الاقوامی تعلقات بہتر ہوں۔ گویا یہ سب اغراض ابن السبیل کی مد میں آجاتی ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیل کو پیش نظر رکھ کر دیکھیں۔ کہ اسلام نے صرف زکوٰۃ کا حکم نہیں دیا بلکہ بتایا کہ یہ حکم اپنے اندر گہرا فلسفہ رکھتا ہے اور یہ کہ اگر قوم صحیح طور پر اس حکم پر عمل پیرا رہے گی تو اس کے لئے بے شمار ترقی کے ذرائع کھلتے چلے جائیں گے۔

(۲) اسی طرح اسلام نے روزہ کا حکم دیا ہے وہ فرماتا ہے یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ (بقرہ ع ۲۳)

یعنی اے مسلمانو تم پر روزے رکھنے فرض کئے گئے ہیں اور یہ کہ تم ایک مہینہ متواتر اکٹھے روزے رکھو۔ اسکے بعد فرمایا کہ یہ حکم بے فائدہ نہیں۔ صرف اس لئے نہیں ہے کہ تم سارا دن بھوکے پیاسے رہو اور تکلیف اٹھاؤ بلکہ یہ حکم اپنے اندر بہت سی حکمتوں کو لئے ہوئے ہے جو قوم کے لئے بہت سے مفید پہلو اپنے اندر رکھتی ہیں۔ چنانچہ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ ع ۲۳) کہ ان روزوں کے نتیجہ میں تمہیں تقویٰ حاصل ہوجائے گا۔ تَتَّقُوْنَ کا لفظ قرآن کریم میں تین معنوں میں استعمال ہوا ہے (۱) دکھوں سے بچنے کے معنے میں (۲) گناہ سے بچنے کے معنے میں اور (۳) روحانیت کے اعلیٰ مدارج کے حاصل کرنے کے متعلق۔ پس اس لفظ کے ذریعہ روزہ کی تین حکمتیں بھی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیں۔

پہلی حکمت یہ ہے کہ انسان روزہ کے ذریعہ دکھوں سے بچ جاتا ہے۔ بظاہر یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ روزہ سے تو انسان اور بھی تکلیف اٹھاتا ہے۔ کیونکہ سارا دن اس کی وجہ سے بھوکا پیاسا رہنا پڑتا ہے۔ مگر جب غور کیا جائے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ روزہ درحقیقت انسان کو دو سبق سکھاتا ہے۔ اول سبق یہ کہ مالدار لوگ جو سارا سال عمدہ غذائیں کھاتے رہتے ہیں اور ان کو فاقہ کی تکلیف کا علم نہیں ہوتا ان کو بھی معلوم ہو کہ فاقہ کیا ہوتا ہے اور وہ لوگ جو فاقوں میں مبتلا رہتے ہیں ان کو کیا تکلیف ہوتی ہے۔ گویا روزہ کے ذریعہ سے اپنے غریب بھائیوں کی حالت کا صحیح اندازہ ہوجاتا ہے اور ان کی ہمدردی کا جوش پیدا ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ قوم کی ترقی اور حفاظت ہوتا ہے۔ اور قوم کی حفاظت درحقیقت فرد کی حفاظت ہی ہوتی ہے۔

دوسرا سبق یہ ہے کہ اسلام چاہتا ہے کہ اس کے

ماننے والے سُست اور غافل نہ ہو جائیں بلکہ ان کے اندر
مشقت برداشت کرنے کی عادت قائم رہے۔ چنانچہ
روزوں کے ذریعہ ہر سال مسلمانوں کی تربیت ہوتی رہتی
ہے۔ گویا اسلام کے اس حکم پر چلنے والے کبھی عیاشی
اور غفلت میں مبتلا ہو کر ہلاک نہیں ہو سکتے۔

دوسرا امر کہ روزوں سے انسان گناہ سے بچتا
ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ گناہ درحقیقت مادی لذات
کی طرف جھکنے کا نام ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے۔ کہ جب
انسان کسی کام کا عادی ہو جائے تو وہ اسکو چھوڑ نہیں
سکتا۔ مگر جب اس میں یہ طاقت ہو کہ اپنی مرضی پر اس
کو چھوڑ بھی دے۔ تو پھر وہ خواہش غلبہ نہیں پاتی۔ پس
جب کوئی شخص روزوں میں ان تمام لذتوں کو جو اس
کو بعض اوقات گناہ کی طرف کھینچتی ہیں خدا تعالیٰ کے
لئے چھوڑ دیتا ہے اور ایک مہینہ تک برابر اپنے نفس
پر قابو پانے کی عادت ڈالتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ
ہوتا ہے کہ وہ ان لالچوں کا مقابلہ آسانی سے کر سکتا
ہے۔ جو اُسے گناہ کی طرف کھینچتے ہیں۔

پھر تقویٰ کے قیام میں روزوں سے اس طرح مدد
ملتی ہے کہ ان دنوں میں چونکہ روزوں کے ساتھ تہجد کا
بھی التزام کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے دعاؤں اور عبادت
کا زیادہ موقع مل جاتا ہے۔ نیز جب بندہ خدا تعالیٰ
کے لئے اپنے آرام کو چھوڑتا ہے تو خدا تعالیٰ بھی اسکو
اپنی طرف کھینچتا ہے اور اسکی روح کو طاقت بخشتا ہے۔

پھر روزہ کی ایک اور حکمت اللہ تعالیٰ ان الفاظ
میں بیان فرماتا ہے لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (بقرہ ع ۲۳) کہ تم پر روزہ اس
لئے فرض کیا گیا ہے تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا اظہار
کرو۔ اس وجہ سے کہ اس نے تم کو سچا راستہ دکھایا
ہے اور تاکہ تم میں شکر کرنے کا مادہ پیدا ہو۔ یعنی
ایک فائدہ تو یہ ہے کہ سارا دن کھانے پینے کے مشاغل
سے فارغ رہنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ذکر کا
زیادہ سے زیادہ موقعہ مل سکے گا۔ دوسرے بھوک کی
تکلیف محسوس کر کے تمہارے اندر شکر گذاری کا مادہ پیدا
ہوگا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سال بھر بھوکے رہنے کی
تکلیف سے بچائے رکھا ہے۔

(۳) اسی طرح حج ہے۔ اس عبادت کی اغراض بھی
لوٹنے سے ملتی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے وطن
چھوڑنے کی عادت ڈالنی اور اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں
سے الگ ہونے کا خوگر ہونا اور عالمی و بین الاقوامی
اخوت کے احساس کو پیدا کرنا اور مضبوط کرنا۔ علاوہ
ازیں قرآن کریم نے اس کی یہ حکمت بھی بتائی ہے کہ اس
عبادت سے شعائر اللہ کی عظمت پیدا ہوتی ہے اور انکی
یاد تازہ رہتی ہے۔ حج دراصل اس واقعہ کی یاد تازہ کرتا
ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹے حضرت
اسمٰعیل علیہ السلام کو جنگل میں چھوڑ دینے کے سبب سے
پیش آیا۔ اور دوسرے خانہ کعبہ کی نسبت قرآن کریم
فرماتا ہے کہ وہ سب سے پہلا گھر ہے جو خدائے واحد کی
عبادت کے لئے بنایا گیا۔ پس حج میں جا کر انسان کے
سامنے وہ نقشہ کھنچ جاتا ہے کہ کس طرح خدا تعالیٰ کیلئے
قربانی کرنے والے بچائے جاتے ہیں اور انکو اللہ تعالیٰ
عزت دیتا ہے اور حج کرنے والے کے دل میں خدا کا
جلال اور اس کی ذات کا یقین بڑھتا ہے۔ دوسرے
وہ اپنے آپ کو اس گھر میں دیکھ کر جو ابتدائے دنیا سے
خدا تعالیٰ کی یاد کے لئے بنایا گیا ہے ایک عجیب روحانی
تعلق ان لوگوں سے پاتا ہے جو ہزاروں سال سے اس
روحانی سلک میں پروئے چلے آتے ہیں جس میں یہ شخص
پرویا ہوا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کی یاد اور اس کی محبت کا
رشتہ جو سب کو باندھے ہوئے ہے خواہ پرانے ہوں یا نئے۔

غرض اسلام نے عبادات کا صرف حکم ہی نہیں دیا۔ بلکہ ان کی حکمت بھی بیان کی ہے اور بتایا ہے۔ کہ تمام عبادات انسان کے فائدہ کے لئے مقرر کی گئی ہیں اللہ تعالےٰ نے اپنی حکومت منوانے کے لئے ان کا حکم نہیں دیا۔ جب یہ صورت ہے تو پھر عبادت کرنے والے کے دل میں کیوں بشاشت پیدا نہ ہوگی۔ اور کیوں وہ خوشی سے ہر ایک حکم پر عمل نہیں کریگا ؟

قرآن مجید کے علاوہ دوسری الہامی کتب کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شریعت کو ایک چٹی کے طور پر پیش کیا ہے۔ وید تو بالکل پردوں تلے ہیں اُن سے شریعت کا کوئی پتہ نہیں لگتا۔ تورات، ژند اوستا کو پڑھنے سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں شریعت موجود ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شریعت اس لئے نہیں کہ اس میں انسان کا نفع ہے۔ بلکہ اس لئے ہے کہ خدا یوں چاہتا ہے جس کی وجہ سے شریعت کی اصل غرض جو اصلاح نفس ہے فوت ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان میں بعض احکام ایسے بھی ہیں جو انسان کے نفع کے لئے ہیں۔ لیکن اتفاقی طور پر کسی ایسے حکم کا نکل آنا اور بات ہے یہ صرف قرآن کریم نے ہی بتایا ہے کہ سب احکام انسان کے فائدہ کے لئے ہیں۔

دوسرا امر جس سے احکام کی تعمیل میں بشاشت پیدا ہوتی ہے یہ ہے کہ جس تعلیم کو انسان مانے اس میں رحمت کا پہلو غالب ہو۔ کیونکہ رحمت کا پہلو غالب ہونے کی وجہ سے یہ فائدہ حاصل ہوگا کہ اگر اس کے عمل میں کوئی کمزوری رہ جائے گی تو رحمت کا پہلو اس کی تلافی کر دے گا اور یہ بات صرف اسلام میں ہی پائی جاتی ہے باقی مذاہب اس سے خالی ہیں۔

مثلاً ہندو تناسخ کے قائل ہیں۔ تناسخ کے عقیدہ کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ خدا تعالےٰ کسی انسان کا گناہ معاف نہیں کر سکتا اور کسی کو اس کے نیک عمل کا بدلہ اس کے نیک عمل سے زائد نہیں دے سکتا۔ تناسخ کے قائلین گناہوں کے مرتکب ہونے والے انسانوں کے لئے چوراسی لاکھ جونوں کے قائل ہیں۔ گنہگار انسان انسانیت کے جامہ کی بجائے حیوانیت کے مختلف جاموں میں داخل ہوتا ہے اور اپنے گناہ کی سزا بھگتتا ہے۔ یہ عقیدہ اسی بناء پر ہے کہ ان کے نزدیک ایشور یعنی خدا کی جزا و سزا میں رحمت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ اگر ویدک فلاسفی پر غور کیا جائے تو کسی انسان کے لئے نجات پانا ممکن نہیں رہتا کیونکہ ویدوں کو پڑھے بغیر کوئی شخص صحیح طور پر نیکی اور بدی کا علم حاصل نہیں کر سکتا اور بغیر علم حاصل کئے کوئی شخص بدی سے بچ نہیں سکتا۔ ویدوں کے پڑھنے کے لئے بلوغت کی عمر کے بعد کم از کم چھتیس برس کی وہ مدت ہے جسے پنڈت دیانند بانی آریہ سماج نے اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش میں مقرر کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"آٹھویں سال سے آگے چھتیسویں سال
تک یعنی ایک ایک وید کو معہ اس کے انگوں
اور اپانگوں کے پڑھنے میں بارہ بارہ سال
مل کر چھتیس اور آٹھ مل کے چوالیس خواہ
اٹھارہ سال کا برہمچاریہ اور آٹھ سابق مل کر
چھبیس یا نو سال یا جب تک پوری تعلیم
حاصل نہ کرے تب تک برہمچاریہ رہے۔" (ص۸۹)

اس تعلیمی عرصہ میں وید پڑھنے والے سے جو گناہ ہوں گے کیا وہ گناہ معاف کئے جائیں گے اور کیا ایشور اپنے بھگتوں کے گناہ معاف کر دیتا ہے ؟ اس کا جواب پنڈت دیانند جی مصنف ستیارتھ پرکاش کے بیان کے مطابق حسب ذیل ہے :

"سوال: ایشور اپنے بھگتوں کے پاپ معاف کرتا ہے یا نہیں ؟

جواب: نہیں۔ کیونکہ اگر وہ پاپ معاف کرے تو اس کا انصاف جاتا رہے اور تمام انسان سخت پاپی ہو جائیں۔ کیونکہ در گذر کے سنتے ہی ان کو پاپ کرنے میں بے خوفی اور حوصلہ پیدا ہو جائے۔ مثلاً اگر راجہ گناہ معاف کر دیا کرے تو لوگ حوصلہ پاکر اور بھی بڑے بڑے پاپ کرنے لگیں۔ کیونکہ راجہ گناہ بخش دیا کرے گا اور ان کو بھی بھروسہ ہو جائے گا کہ ہم راجہ سے بذریعہ حرکات ہاتھ جوڑنے وغیرہ کے اپنے قصور معاف کرالیں گے۔ تو جو لوگ قصور نہیں کرتے وہ بھی تقصیروں سے نڈر کر پاپ کرنے میں راغب ہو جائیں گے۔ اسلئے ایشور کا کام اعمال کا مناسب پھل دینا ہے نہ کہ معاف کرنا" (باب ۷)

گویا ایشور اپنے بھگتوں کے بھی گناہ معاف نہیں کر سکتا۔ اب غور کر لیا جائے کہ انسان کے لئے مکتی حاصل کرنے کی کونسی صورت باقی رہ جاتی ہے۔ کیونکہ انسان سے غلطی اور گناہ کا ہو جانا بالخصوص جب کہ اسے ابھی وید وں کا پوری طرح علم نہیں ہے قرین قیاس ہے۔ اور جب انسان حیوانی قالبوں میں جاتا ہے تو اس میں انسانی شعور باقی نہیں رہتا۔ جب وہ از سر نو انسانی جامہ میں آئے گا تو پھر اس کیلئے یہی تسلسل اور چکر جاری رہے گا اور اس کے لئے کسی مرحلہ پر بھی نجات پانا ممکن نہ ہو گا۔

ہندو مذہب کے مطابق اگر کوئی شخص نجات پا بھی لے تب بھی اس کی وہ نجات اور مکتی دائمی نہیں ہے۔ بلکہ ایک عرصہ کے بعد اس انسان کو مکتی خانہ سے نکال کر پھر دنیا میں جونوں کے چکر میں ڈال دیا جاتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایشور نجات پانے والی روح کا کوئی گناہ پوشیدہ طور پر رکھ لیتا ہے اور اس کو علت قرار دے کر پھر اس روح کو مکتی خانہ سے باہر نکال دیتا ہے۔ کیونکہ کسی گناہ کے لئے ہندو دھرم میں عفو کی گنجائش نہیں اور نہ کسی نیکی کے بدلہ میں زیادہ یا غیر محدود بدلہ دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ویدک دھرم میں مکتی کو بھی محدود مانا گیا ہے۔

یہی حال عیسائی مذہب کا ہے۔ عیسائیوں کا اعتقاد ہے کہ حضرت آدم نے گناہ کیا اور ان کے گناہ کی وجہ سے ساری نسل آدم گنہگار قرار پائی اور ہر پیدا ہونے والا بچہ آدم زاد ہونے کی وجہ سے گناہ سے ملوث ہوتا ہے کیونکہ وہ آدم کا وارث ہے۔

عیسائیوں کے نزدیک ورثہ کا یہ گناہ خدا کے عفو کی چادر کے نیچے نہیں آسکتا جب تک اس کا بدلہ ادا نہ کیا جائے۔ عیسائی جب ساری نسل آدم کو گنناہ گار مانتے ہیں تو وہ انبیاء اور مرسلین کو بھی معصوم نہیں سمجھتے۔ بلکہ انہیں بھی گناہ گار ٹھہراتے ہیں۔ جب سب نسل آدم گناہ گار ٹھہری اور کوئی گناہ بغیر بدلہ کے معاف نہیں ہو سکتا تو مجبوراً خدا تعالیٰ نے اپنا بیٹا دنیا میں بھیجا تا وہ بے گناہ ہونے کے باعث سب انسانوں کا گناہ اٹھالے اور ان کی جگہ سزا بھگتے۔

عیسائیوں کا یہ عقیدہ بھی عفو اور رحمت سے بالکل خالی ہے۔ بلکہ اس میں صریح بے انصافی نظر آتی ہے کیونکہ گناہ گار آدم زادوں کی بجائے معصوم ابن اللہ کو سزا دینا ہرگز انصاف نہیں ہے۔ بہرحال کفارہ کا نظریہ واضح طور پر بتا رہا ہے۔ کہ عیسائیوں کے ہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عفو کے خیال معدوم ہیں۔

لیکن اسلامی تعلیم اس کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام جس خدا کو پیش کرتا ہے اس کی صفات میں سے غفوریت، ودودیت اور رحیمیت بھی ہے۔ یعنی اگر عمل کرتے ہوئے کوئی کمزوری رہ جائے تو وہ اس کمزوری کو نظر انداز کرتے ہوئے انسان کیلئے ترقیات کے

دروازے کھولتا رہتا ہے اور وہ اپنے بندوں کے ساتھ ایسی محبت و رافت کا سلوک کرتا ہے۔ جیسے ایک مشفق باپ اپنے بچے کے ساتھ کرتا ہے۔ بچہ خواہ کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو۔ باپ نہیں چاہتا کہ میرا بچہ ضائع ہو جائے اسی طرح اللہ تعالےٰ بھی اپنے بندوں کے متعلق یہی چاہتا ہے کہ وہ نجات پاتے چلے جائیں خواہ اُن کے اعمال میں کچھ کمزوریاں ہی رہ گئی ہوں۔ اور درحقیقت ایسی ہی تعلیم پر عمل کرنے سے انسانی قلوب میں بشاشت قائم رہتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص نماز پڑھتا ہے اور بالفرض نماز میں اس کی توجہ پوری طرح قائم نہیں رہتی تو اسلامی تعلیم کے نتیجہ میں وہ یہ نہیں سمجھیگا کہ میری نماز بیکار گئی۔ بلکہ وہ یہ سمجھیگا کہ اگر تھوڑی بہت خامی بھی رہ گئی ہوگی۔ تو تھوڑی سی توجہ اور انابت سے اللہ تعالیٰ اسکو نظرانداز کر دے گا۔ اور اس کے لئے اپنے فضلوں کے دروازے بند نہیں کرے گا۔

اسی اصل کے ماتحت اسلام نے توبہ کے مسئلہ کو پیش کیا ہے۔ کہ اگر کسی وقت انسان سے کوئی کمزوری سرزد ہو جائے تو ضروری نہیں ہے کہ اس کی سزا ہی بھگتے۔ بلکہ اگر اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور آئندہ کے لئے وہ اپنی اصلاح کا اقرار کرے اور ایسی کمزوریوں سے بچنے کا تہیّہ کرے۔ تو اس کی کمزوریوں کی بناء پر ترقیات کے جو دروازے بند ہو جاتے ہیں وہ پھر کھول دئے جاتے ہیں اور انسان نیچے کی طرف نہیں جاتا بلکہ اوپر کی طرف اٹھتا ہے۔ اس اصل کو پیش کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ○ (آل عمران ع۱۴)

یعنی وہ لوگ جو کسی وقت خدا کے احکام کی نافرمانی کر بیٹھتے ہیں اور اس ذریعے سے اپنے نفسوں کا حق مار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد پھر اللہ تعالےٰ کو یاد کرتے ہیں اور اپنی اصلاح کر لیتے ہیں اور خدا تعالےٰ سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں۔ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے جو گناہوں سے اور کمزوریوں سے بچا سکے۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ آگے فرماتا ہے وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔ وہ خدا تعالےٰ سے اپنی کمزوریوں پر پردہ پوشی چاہتے ہیں اور اپنے اس گناہ پر اصرار نہیں کرتے اور جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کمزوریوں پر پردہ پوشی فرما کر ان کے لئے رحمت کے دروازے کھول سکتا ہے ان لوگوں کی جو اس نکتہ کو سمجھتے ہیں یہ جزاء ہوگی کہ اللہ تعالےٰ ان کی کمزوریوں پر پردہ ڈال دے گا اور اُن کے لئے اپنی رحمت کے دروازے بند نہیں کرے گا اور وہ نجات پاکر خدا تعالےٰ کو پائیں گے اور انکو مغفرت حاصل ہو جائے گی اور رہنے کو ایسے باغات ملیں گے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی اور یہ انعام عارضی نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ ان باغات میں ہمیشہ رہیں گے اور محنت کرنے والوں کا بدلہ اچھا ہی ہوتا ہے۔

دیکھو کیسی اعلیٰ اور شاندار تعلیم ہے۔ انسان کے لئے مایوسی کے تمام دروازے بند کر دئے گئے ہیں اور اُسے یقین دلایا گیا ہے کہ وہ ہر وقت ترقی کی شاہراہ پر گامزن رہ سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اپنے اندر احساس صحیح پیدا کرے۔

انسان کے دل میں یہ حیال آ سکتا تھا کہ ممکن ہے

خدا تعالیٰ ایک دو کمزوریوں کو تو نظرانداز کر دے لیکن اگر کسی انسان سے بہت سی کمزوریاں سرزد ہو چکی ہوں اور اس نے اپنے خیال میں نجات کا دروازہ اپنے لئے بند کر لیا ہو تو اس کا کیا ہوگا؟ ایسے لوگوں کی تسلی کیلئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (زمر ع ۶)

اے ہمارے رسول! ان لوگوں کو اچھی طرح کھولکر سنا دے جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کمزوریوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور وہ نکل نہیں سکتے اور اب ان کے لئے نجات کا دروازہ بند ہو چکا ہے کہ اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ اللہ کی شان تو ایسی ہے کہ خواہ کس قدر کمزوریاں کیوں نہ سرزد ہو چکی ہوں۔ اُن سب سے درگذر کر سکتا ہے۔ اُن سب کو معاف کر سکتا ہے اور نجات کا دروازہ کھول سکتا ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ انسانی اندازوں سے بڑھکر پردہ پوشی کرنیوالا اور بیحد و حساب رحمت کرنیوالا ہے اسکی رحمت بہت وسیع ہے اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے ہر مقام کے لوگوں کے لئے اپنی رحمت کو پیش کیا ہے اور مایوس ہونے سے روکا ہے اور فرمایا ہے کہ ہر شخص خدا کی رحمت کو حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ اصل چیز اسکی صفات میں سے رحمت ہی ہے۔

احادیث میں آتا ہے اِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِيْمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ رَجُلٌ قَتَلَ تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ نَفْسًا فَسَأَلَ عَنْ اَعْلَمِ اَهْلِ الْاَرْضِ فَدُلَّ عَلٰى رَاهِبٍ فَاَتَاهُ فَقَالَ اِنَّهٗ قَتَلَ تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ نَفْسًا فَهَلْ لَهٗ مِنْ تَوْبَةٍ فَقَالَ لَا. فَقَتَلَهٗ فَكَمَّلَ بِهٖ مِائَةً ثُمَّ سَأَلَ عَنْ اَعْلَمِ اَهْلِ الْاَرْضِ فَدُلَّ عَلٰى رَجُلٍ عَالِمٍ فَقَالَ اِنَّهٗ قَتَلَ مِائَةَ نَفْسٍ فَهَلْ لَهٗ مِنْ تَوْبَةٍ فَقَالَ نَعَمْ وَمَنْ يَحُوْلُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ التَّوْبَةِ۔ اِنْطَلِقْ اِلٰى اَرْضِ كَذَا وَكَذَا فَاِنَّ بِهَا اُنَاسًا يَعْبُدُوْنَ اللّٰهَ تَعَالٰى فَاعْبُدِ اللّٰهَ مَعَهُمْ وَلَا تَرْجِعْ اِلٰى اَرْضِكَ فَاِنَّهَا اَرْضُ سُوْءٍ۔ فَانْطَلَقَ حَتّٰى اِذَا نَصَفَ الطَّرِيْقَ اَتَاهُ الْمَوْتُ فَاخْتَصَمَتْ فِيْهِ مَلٰٓئِكَةُ الرَّحْمَةِ وَمَلٰٓئِكَةُ الْعَذَابِ فَقَالَتْ مَلٰٓئِكَةُ الرَّحْمَةِ جَآءَ تَائِبًا مُقْبِلًا اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى وَقَالَتْ مَلٰٓئِكَةُ الْعَذَابِ اِنَّهٗ لَمْ يَعْمَلْ خَيْرًا قَطُّ۔ فَاَتَاهُمْ مَلَكٌ فِيْ صُوْرَةِ اٰدَمِيٍّ فَجَعَلُوْهُ بَيْنَهُمْ فَقَالَ قِيْسُوْا مَا بَيْنَ الْاَرْضَيْنِ فَاِلٰى اَيَّتِهِمَا كَانَ اَدْنٰى فَهُوَ لَهٗ فَقَاسُوْهُ فَوَجَدُوْهُ اَدْنٰى اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ اَرَادَ فَقَبَضَتْهُ مَلٰٓئِكَةُ الرَّحْمَةِ۔ وَفِيْ رِوَايَةٍ فِي الصَّحِيْحِ فَكَانَ اِلَى الْقَرْيَةِ الصَّالِحِ اَقْرَبُ بِشِبْرٍ فَجُعِلَ مِنْ اَهْلِهَا۔ وَفِيْ رِوَايَةٍ فِي الصَّحِيْحِ فَاَوْحَى اللّٰهُ تَعَالٰى اِلٰى هٰذِهٖ اَنْ تَبَاعَدِيْ وَاِلٰى هٰذِهٖ اَنْ تَقَرَّبِيْ وَقَالَ قِيْسُوْا مَا بَيْنَهُمَا فَوُجِدَ اِلٰى هٰذِهٖ اَقْرَبَ بِشِبْرٍ فَغُفِرَ لَهٗ۔

(ریاض الصالحین باب التوبہ)

یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں پہلے زمانہ میں ایک شخص تھا جس نے ننانوے قتل کئے تھے وہ توبہ کے لئے کسی عالم کے پاس گیا۔ وہ اس کے پاس جاکر کہا کہ کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ اس نے کہا کہ تیری توبہ قبول نہیں ہو سکتی۔ اس شخص نے کہا۔ کہ اگر میری توبہ قبول نہیں ہو سکتی تو میں تجھے بھی ماردونگا ایک گناہ اور زیادہ ہو گیا تو پھر کیا ہوا۔ یہ کہہ کر اس نے اس عالم کو قتل کر دیا۔ پھر اس نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا کوئی اور ایسا عالم ہے جس سے وہ مسئلہ دریافت

کر سکے۔ تو اُسے ایک عالم شخص کا پتہ بتایا گیا۔ وہ اس کے پاس پہنچا اور بتایا کہ اس نے سَو قتل کئے ہیں۔ کیا اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ عالم نے جواب دیا۔ کیوں نہیں۔ کون ہے جو بندہ کے اور توبہ کے درمیان حائل ہو سکے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم فلاں جگہ چلے جاؤ۔ وہاں کئی خدا کے بندے مل کر عبادت کرتے ہیں تم بھی اُنکے ساتھ مل کر عبادت کرو اور اپنے ملک میں مت لَوٹو۔ کیونکہ وہ اچھی جگہ نہیں۔ یہ سُنکر وہ شخص اس جگہ پہنچنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ جب نصف راستے پر پہنچا تو اس کو موت نے آلیا تب رحمت کے فرشتے بھی آگئے اور عذاب کے فرشتے بھی پہنچ گئے۔ دونوں میں بحث شروع ہو گئی۔ دوزخ والے فرشتے کہتے تھے۔ کہ یہ شخص دوزخی ہے۔ اسے توبہ ابھی نصیب نہیں ہوئی اور جنت والے فرشتے کہتے تھے کہ یہ جنتی ہے کیونکہ یہ توبہ کرنے کے لئے جا رہا تھا کہ راستہ میں مر گیا۔ تب اُن کے پاس ایک فرشتہ آیا اور انہوں نے اس کو منصف بنایا۔ تو اس نے کہا کہ زمین کو ماپو۔ جس طرف سے یہ شخص توبہ کرنے کے لئے چلا تھا اگر وہ جگہ قریب ہو تو یہ دوزخی ہے اور اگر وہ جگہ جہاں یہ توبہ کرنے کے لئے جا رہا تھا قریب ہے تو یہ جنتی ہے تب اللہ تعالےٰ نے اپنی رحمت کے ماتحت زمین کی طنابیں کھینچ دیں اور اس جگہ کو جہاں وہ توبہ کرنیکے لئے جا رہا تھا زیادہ قریب کر دیا۔ فرشتوں نے دونوں طرف کی زمین کو ماپا اور دیکھا کہ وہ زمین جس طرف یہ شخص توبہ کرنے کیلئے جا رہا تھا چھوٹی ہے خدا تعالےٰ نے حکم دیا کہ تب اُسے جنت میں لے جاؤ۔

اس تمثیل میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو کسی حالت میں بھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ خدا تعالےٰ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ اس کا اندازہ انسان نہیں لگا سکتا۔ اور یہ کہ اسلام بھی ایسے ہی خدا کو پیش کرتا ہے جس کی رحمت کا پہلو ہمیشہ انسان کی طرف جھکا رہتا ہے۔ چنانچہ خود اللہ تعالےٰ قرآن مجید میں اس کو پیش کرتا ہے۔ فرماتا ہے رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (اعراف ع ۱۹) کہ میری رحمت ہر ایک چیز پر وسیع ہے۔ پھر فرمایا۔ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (انعام ع ۲) کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت کو فرض کر لیا ہے۔ یعنی یہ کہ اس کی رحمت کا پہلو زیادہ جھکا ہوا ہے۔ پھر فرمایا وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ (ہود ع ۱۰) کہ اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو اُمتِ واحدہ بنا دیتا مگر وہ ہمیشہ مختلف رہیں گے۔ سوائے اُن کے جن پر تیرا رب رحم کرے اور اس نے ان لوگوں کو رحم کے لئے ہی پیدا کیا ہے وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ سے رحم ہی مراد ہے۔ ابن کثیر نے حضرت ابن عباسؓ نے روایت کی ہے۔ لِلرَّحْمَةِ خَلَقَهُمْ وَلَمْ يَخْلُقْهُمْ لِلْعَذَابِ کہ اللہ تعالےٰ نے رحم کے لئے ہی بندوں کو پیدا کیا ہے عذاب کے لئے نہیں پیدا کیا۔

غرض اسلام کی پیشکردہ تعلیم میں رحمت کا پہلو غالب ہے اور جس تعلیم میں یہ بات پائی جائے کبھی بھی اس پر عمل کرنے میں انقباض پیدا نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کا ماننے والا ہمیشہ ہی پُرامید رہے گا اور یہ سمجھ کر عمل کریگا کہ اگر اس کے اعمال میں کوئی کمزوری رہ گئی تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کو تھام لے گی۔ لیکن دوسرے مذاہب کی کی تعلیم میں ایسی بات نہیں پائی جاتی۔ اس لئے اُن کے احکام پر عمل کرتے ہوئے بشاشتِ قلب پیدا نہیں ہو سکتی۔

تیسری بات جس سے احکام کی تعمیل میں بشاشت پیدا ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ تعمیلِ احکام میں ایسے فوائد موجود ہوں

جو جزائے اعمال کو اعمال کی نسبت سے زیادہ بتلاتے ہوں اور یہ بات بھی صرف اسلامی تعلیم میں پائی جاتی ہے۔ دوسرے مذاہب اس سے خالی ہیں۔

اسلام جس خدا کو پیش کرتا ہے اس کی صفات میں سے ایک صفت رحیمیت کی ہے۔ اور رحیمیت کے معنے یہ ہیں کہ تھوڑا سا کام بندہ کرتا ہے اور غیر منتھی نتیجہ خدا پیدا کرتا ہے۔ مثلاً انسان روٹی کھاتا ہے۔ روٹی کھانے کا یہی نتیجہ نہیں ہوتا کہ پیٹ بھر جاتا ہے بلکہ اس کے نتیجہ میں خون پیدا ہوتا ہے جو مہینوں اور سالوں انسانی جسم میں کام کرتا ہے۔ اسی خون سے اس کے دماغ کو طاقت ملتی ہے۔ اس کی نظر کو طاقت ملتی ہے۔ اس کے ذہن کو طاقت ملتی ہے۔ اس کے کانوں کو طاقت ملتی ہے جو مہینوں اور سالوں اس کے کام آتی ہے۔ اور پھر وہ کام مہینوں اور سالوں تک مزید نتائج پیدا کرتے ہیں پھر اسی میں سے نطفہ پیدا ہوتا ہے جس سے اس کی نسل پیدا ہوتی ہے۔ پھر اسی نسل سے اگلی نسل اور اگلی نسل سے اور اگلی نسل پیدا ہوتی ہے۔ گویا ایک فعل متواتر نتائج پیدا کرتا ہے۔ یہ رحیمیت ہے۔ اگر دنیا میں صرف یہی سلسلہ ہوتا کہ جب کوئی شخص کام کرتا تو اسی وقت اس کا ایک نتیجہ پیدا ہو جاتا تو ہم اس کو بدلہ تو کہہ سکتے تھے جیسے مزدور مزدوری کرتا ہے تو اپنی اُجرت لے لیتا ہے۔ مگر ہم اسے رحیمیت نہیں کہہ سکتے تھے۔ رحیمیت کی مثال ایسی ہی ہے جیسے پنشن ہوتی ہے۔ لوگ ملازمت کرتے ہیں تو انہیں اس کا بھی ایک بدلہ مل رہا ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اُن کے کھاتے میں یہ بھی لکھا جاتا ہے کہ آئندہ اس کام کا متواتر نتیجہ پیدا ہوگا۔ یہ چیز ہے جو رحیمیت کے مشابہ ہے یعنی کام کا بدلہ نقد ہی نہیں ملا بلکہ آئندہ کیلئے اور نیک نتائج کی بنیاد بھی ساتھ ہی رکھ دی گئی۔ غرض رحیمیت میں تھوڑا سا کام بندہ کرتا ہے۔

اور غیر منتھی نتیجہ خدا تعالیٰ پیدا کرتا ہے۔ اور اگر انسان کو یہ نظر آ جائے کہ مجھے میرے اعمال کی جو جزاء ملنے والی ہے وہ میرے اعمال کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوگی تو انسان طبعی طور پر چاہے گا کہ وہ خدا کے ارشاد کے مطابق اعمال کو بجالائے تاکہ اُسے اس کے اعمال کا غیر محدود بدلہ ملتا جائے اور جب انسان کو اچھی طرح یہ سمجھ آ جاتا ہے اور اس پر یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب جزاء دیتا ہے تو متواتر دیتا چلا جاتا ہے۔ تو وہ اپنے اندر ایک خوشی اور لذت کی لہر محسوس کرتا اور نیک اعمال کے بجالانے میں بہت زیادہ جدوجہد کرتا ہے تاکہ وہ خدا تعالیٰ کی غیر محدود جزاء سے حصہ لے سکے۔

قرآن کریم نے متعدد مقامات پر اس مضمون کو بیان فرمایا ہے کہ مومنوں کے اعمال کا بدلہ اُن کے اعمال سے بہت بڑھ کر ہوگا۔ چنانچہ فرمایا:۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (سورۃ تین) کہ وہ لوگ جو مومن ہیں اور نیک عمل کرنے والے ہیں انکو نہ کٹنے والا انعام ملے گا۔

پھر فرمایا:۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (انعام ع۲۰) یعنی جو شخص نیکی کریگا اُسے اس نیکی سے دس گنے زیادہ بدلہ ملے گا اور جو بُرائی کرے گا اس کو اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنی اس نے بُرائی کی ہوگی۔ نیکی کا کم بدلہ دے کر اس کا حق نہیں مارا جائیگا اور نہ بدی کا بدلہ زیادہ دیکر اس پر ظلم کیا جائیگا۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ایک نیک عمل کے بدلہ میں دس گنا اجر ملے گا۔ بہرحال عمل سے

بڑھ کر جزاء ہوگی۔

پھر فرمایا۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (البقرہ ع ۳۶) یعنی وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں یعنی قومی اور ملی مفاد کے لئے اپنے اموال کو خرچ کرتے ہیں اُن کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ زمین میں ڈالا جائے اور وہ سات بالیاں اگائے اور ہر ایک بالی میں سو دانہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ جس کے مال کو جتنا چاہے بڑھا سکتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ وسعت والا اور حالات کو جاننے والا ہے۔

اِن آیات میں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اموال خرچ کرنے والے کو سات سو گنے بلکہ اُس سے بھی زیادہ بدلہ ملیگا۔ اور وہ انسان کی قربانی کو دیکھ کر اُسے نوازے گا اور ان حالات کو جن حالات میں اس نے قربانی کی ہے مدّ نظر رکھیگا۔

بہر حال جس شخص کو یہ علم ہو کہ اس کے عمل کا سات سو گنا اجر مل سکتا ہے وہ کیوں بشاشت قلبی سے اعمال کو بجا نہ لائے گا۔

چوتھی چیز جس سے احکام کی تعمیل میں بشاشت قلبی پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو خود سمجھ آجائے کہ شریعت کے احکام اس کے حق میں مفید ہیں اور یہ کہ اُن پر چل کر اُسے اس کا مقصود مل سکتا ہے پس جب اس کو یہ سمجھ آجائے گی تو وہ شریعت پر خوشی سے عمل کریگا اور اسے چٹی نہیں سمجھے گا۔

یہ بات بھی صرف اسلام کی پیشکردہ تعلیم میں ہی ہے۔ کہ نہ صرف اس پر چل کر خدا تعالیٰ بندہ سے راضی ہو جاتا ہے بلکہ ان احکام پر عمل کرنے کی وجہ سے اس عمل کرنے والے کی ذات کو بھی فائدہ پہنچتا ہے اور اسکی قوم کو بھی۔ مثلاً نماز ہے۔ نماز پڑھنے سے صرف یہی نہیں ہوتا کہ خدا تعالیٰ کی تعلق ہوتی ہے۔ بلکہ انسان کو ذاتی فائدہ یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ بہت سی خرابیوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ (العنکبوت ع ۵) کہ حقیقی نماز انسان کو بدیوں اور برائیوں سے روکتی ہے۔ پس جو شخص نماز پڑھتا ہے اس کو ذاتی طور پر یہ فائدہ پہنچیگا کہ وہ کئی قسم کی بدیوں سے بچ جائے گا۔ جس سے دوسرے لوگ محفوظ نہیں رہ سکتے۔ گویا نماز پڑھنے والا ایک محفوظ قلعہ میں داخل ہو جائیگا جس کے اندر شیطان داخل نہیں ہو سکتا۔

پھر نماز سے کئی قومی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ یہ امر ہر وقت سامنے رہتا ہے کہ ہم نے اپنے شیرازہ کو قائم رکھنا ہے۔ ہمارا ہر وقت ایک واجب الاطاعت امام ہونا چاہیئے جس کے ہاتھ پر قوم جمع رہ کر اسلامی جھنڈے کو بلند رکھ سکے۔ اسی طرح مسجد میں جانے کی وجہ سے ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ گویا وہ مقصد جس کو ہر عقلمند قوم چاہتی ہے مسلمانوں کو زائد طور پر حاصل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح روزہ اور زکوٰۃ ہیں۔ ان سے صرف روزہ رکھنے والے اور زکوٰۃ دینے والے کا ہی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ کسی قوم کی تنظیم اور اس کی مضبوطی کے لئے جن باتوں کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کو مفت میں حاصل ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح اسلامی عبادات میں سے ایک حج بھی ہے اس میں ذاتی فوائد کے علاوہ سیاسی فائدے بھی ہیں۔ کہ ذی اثر لوگوں میں سے ایک جماعت ہر سال جمع ہو کر

تمام عالم کے مسلمانوں کی حالت سے واقف ہوتی رہتی ہے اور اخوت و محبت ترقی کرتی ہے اور ایک دوسرے کی مشکلات سے آگاہ ہونے اور آپس کے تعاون کے حاصل کرنے اور ایک دوسرے کی خوبیاں اخذ کرنے کا موقع ملتا ہے اور اگر تمام عالم اسلامی کے مسلمان مل کر باہمی فائدے کے لئے کوئی مشورہ کرنا چاہیں۔ تو کر سکتے ہیں۔

پس وہ تمام باتیں جو احکام کی تعمیل میں بشاشت قلبی اور حقیقی اطاعت کی روح پیدا کر سکتی ہیں صرف اسلام کی پیش کردہ تعلیم میں ہیں اور کسی مذہب کے احکام میں نہیں۔ اس لئے شرک یا دوسرے مذاہب کی موجودہ حالت میں فرمانبرداری تو ہو سکتی ہے۔ مگر اطاعت نہیں ہو سکتی جس چیز کو غیر مذاہب کے ماننے والے اطاعت کا نام دیتے ہیں وہ درحقیقت پیروی کرنا ہے جس کا نام غلطی سے اطاعت رکھ لیا گیا ہے۔

مثلاً مشرکین کو لے لیں (اس سورۃ میں صرف مشرکین کا ذکر نہیں بلکہ سب کفار کا ذکر ہے) مشرکین کے مذہب کی بنیاد (۱) رسم و رواج پر (۲) اوہام پر اور (۳) دائمی زندگی کے انکار پر ہے اور شرح صدر اور احکام کی تعمیل کا شوق ان امور کی موجودگی میں ناممکن ہے۔ جو شخص صرف اس لئے کوئی کام کرتا ہے کہ اس کے باپ دادا ایسا کرتے تھے وہ ایک قسم کے جبر کے ماتحت ایسا کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو لوگ ناخلف سمجھیں گے۔ قوم میں ناک کٹ جائے گی۔ پس رسم و رواج کی اطاعت بشاشت سے نہیں ہوتی۔

اسی طرح جو شخص محض وہم کی بناء پر کسی امر کو سرانجام دیتا ہے وہ بھی بشاشت سے اس کو بجا نہیں لاتا۔ کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ کل کو کوئی اور وہم اُسے اس کام کے خلاف کام کرنے پر مجبور کر دے چنانچہ مشرکین روزانہ اپنے طریق کو بدلتے ہیں۔ کوئی کسی بُت کو مانتا ہے۔ کوئی کسی کو۔ کوئی کسی طریق کو اختیار کرتا ہے کوئی کسی طریق کو۔

تیسرے۔ دائمی زندگی کے انکار کی وجہ سے بھی اعمال محض ایک محدود دائرہ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور عمل میں وہ قربانی اور بشاشت نظر نہیں آتی جو ایک دائمی زندگی پر ایمان لانے والے کو نصیب ہو سکتی ہے۔

ان تمام باتوں کے خلاف اسلام رسم و رواج کا سخت مخالف ہے۔ کیونکہ بہت سی رسوم بھی بدی کا ایک راستہ بن جاتی ہیں۔ بہت سی بدیاں انسان اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ رسوم میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔ مثلاً اس کے پاس روپیہ کافی نہیں ہوتا اور ملک کی رسم چاہتی ہے کہ خاص قسم کا لباس پہنے۔ وہ اس رسم کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے ناجائز ذرائع سے روپیہ کماتا ہے۔ اس لئے اسلام رسموں سے منع کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ وہ ایک بوجھ ہیں جن کو قومی خوف کی وجہ سے انسان اٹھاتا ہے ورنہ وہ بوجھ طاقت سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں غریب اور امیر۔ مقروض اور آزاد کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اور لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی خیالی عزت کی حفاظت اور اپنے ہم عصر لوگوں میں ذلیل ہونے سے بچنے کی غرض سے گناہ اور بدی میں مبتلا ہوں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی آمد کی ایک غرض یہ بھی بیان فرماتا ہے کہ تا آپ کے ذریعہ لوگوں کو رسوم کے پھندے سے نکالا جائے چنانچہ فرمایا۔ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ

عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف ع[19]) یعنی اللہ تعالےٰ کی رحمت خاص طور پر ان لوگوں کو ملے گی جو کامل طور پر اس موعود رسول کی اطاعت کریں گے جس کی بعثت کی بشارات کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ رسول وقت پر مبعوث ہو کر انہیں نیک کاموں کی تلقین کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام قرار دیتا ہے اور وہ ان سے سخت حکموں کے بوجھوں کو اور رسومات کے پھندوں کو جو ان کی گردنوں میں پڑے ہوئے تھے دُور کرتا ہے۔

چونکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی ایک غرض رسم و رواج کو مٹانا تھا۔ اس لئے اسلام نے صرف رسوم کی مخالفت ہی نہیں کی بلکہ ان کو مختلف دلائل کے ذریعے جڑسے اُکھیڑنے کی پوری کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر کے ماتحت رسم و رواج کے پیچھے چلنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (المائدہ ع[14]) یعنی جب لوگوں کو یہ دعوت دی جاتی ہے۔ کہ اس شریعت کی پیروی کرو۔ جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے۔ تو اس کے جواب میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ جن رسوم و عادات پر ہم نے اپنے باپ دادا کو چلتے ہوئے پایا وہی طریق ہمارے لئے کافی ہے۔ کیا اپنے باپ دادا کی تقلید کا دعویٰ کرنے والے یہ نہیں سمجھتے۔ کہ ہو سکتا ہے کہ ان رسوم کے ترویج دینے والے نہ تو کوئی ذاتی علم رکھتے ہوں جس کی بناء پر انہوں نے ان رسوم کو چلایا اور نہ انہیں خدا کی طرف سے کوئی ہدایت ملی ہو کہ وہ ان رسوم کو رائج کریں۔ بلکہ ان کی جاری کردہ رسوم سراسر جہالت پر مبنی ہوں تو کیا یہ لوگ پھر بھی لکیر کے فقیر بنے رہیں گے۔ گویا اسلام رسم و رواج کی تقلید کرنے کو جہالت قرار دیتا ہے اور بار بار کہتا ہے کہ ہر کام کی بنیاد واقعات۔ حقائق اور بیّنات و شواہد پر ہونی چاہیئے۔ جیسے فرمایا۔ اے ہمارے رسول اعلان کر دو کہ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف ع[12]) میرے اور میرے متبعین کے عقائد کی بنیاد رسم و رواج پر نہیں بلکہ ہماری بنیاد حقائق و شواہد اور بیّنات پر ہے۔ کیونکہ کامیابی رسم و رواج پر چل کر نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے آمدہ ہدایت ہی کامیابیوں کے راستے کھولتی ہے پس اسلام رسم و رواج کو مٹاتا اور اس کی سخت مخالفت کرتا ہے اور رسم و رواج پر چلنے والوں اور اس کی ترویج کرنے والوں کو جاہل قرار دیتا ہے اور اس کے مقابل پر خدائی ہدایت پر چلنے کی دعوت دیتا ہے۔ کیونکہ حقیقی اطاعت کا مادہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے نازل ہونے والی ہدایت سے ہی پیدا ہو سکتا ہے اور رسم و رواج کی پیروی جبر و اکراہ سے ہوتی ہے نہ کہ بشاشتِ قلب سے۔

(۲) پھر ایک حقیقی مسلم مشرکوں کے معبودوں کی اطاعت کر کیسے سکتا ہے جبکہ انکی طرف منسوب ہونے والے خیالات وہموں کا مجموعہ ہیں۔ بتوں کے متعلق یہ خیالات کہ اگر انکی عبادت نہ کی گئی تو نقصان پہنچائیں گے سوائے اوہام کے اور کیا قرار دئے جا سکتے ہیں اور ایسے ہی اوہام کی بناء پر لوگ ان بتوں کے سامنے اپنی اولاد کی قربانی دے دیتے ہیں۔ حالانکہ بُت ان کے اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے ہوتے ہیں۔ پر وہ اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔

حضرت حکیم مولوی نور الدین صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو جماعت احمدیہ کے پہلے خلیفہ تھے اور ایک عرصہ تک مہاراجہ کشمیر کے طبیب خاص بھی رہے۔ ان کو ایک دن مہاراجہ کشمیر نے کہا کہ آپ کچھ نہیں کرتے تو کالی دیوی کی

ہو جا تو ضرور کر لیا کریں کیونکہ وہ بڑی سخت ہے بحضرت خلیفہ اول فرمانے لگے۔ مہاراج یہ دیوی ہمیں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد مہاراجہ خود ہی کہنے لگا کہ ہاں مولوی صاحب بات میری سمجھ میں آگئی جو شخص میری حکومت میں نہیں رہتا ہیں اس کو کوئی سزا نہیں دے سکتا۔ اسی طرح چونکہ آپ کالی دیوی کی حکومت تسلیم نہیں کرتے اور اپنے آپ کو اس کی حکومت سے باہر قرار دیتے ہیں اس لئے وہ آپکو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

غرض بتوں کی طرف منسوب ہونے والی باتیں محض توہم پرستی کا نتیجہ ہوتی ہیں اور ایک غور وفکر کرنیوالا انسان توہم پرستی کا شکار نہیں بن سکتا۔

چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر ہندہ جو ابوسفیان کی بیوی تھی اور مسلمانوں کی سخت مخالف تھی۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی مخالفت کی بنا پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ کا کلیجہ کچا چبایا تھا۔ وہ عورتوں کے جھنڈ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچی اور بغیر اپنا نام بتانے کے بیعت کر لی۔ چونکہ وہ ایک دلیر عورت تھی اس لئے بیعت کے وقت خاموش نہ رہ سکی جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ فرمائے۔ کہ اے عورتو! اقرار کرو کہ ہم شرک نہ کریں گی۔ تو ہندہ بے ساختہ بول اُٹھی، کہ جب یہ واضح ہو چکا ہے کہ بتوں کی کچھ طاقت نہیں۔ آپ کو خدا نے کامیابی و کامرانی دی اور ہم ذلیل ہوئے تو اب اس کے بعد ہم کس طرح شرک کر سکتی ہیں۔

پس بتوں کی طرف منسوب ہونے والی تعلیم محض وہم ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں سورۂ انعام ع۱۷ میں تفصیل کے ساتھ اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مشرکوں میں بعض باتیں محض اوہام کی بناء پر رائج تھیں۔ مثلاً یہ کہ اس اس قسم کے جانور فلاں قسم کے لوگ کھا سکتے ہیں اور فلاں قسم کے لوگ ان جانوروں کو نہیں کھا سکتے۔ جن لوگوں کو منع کیا گیا کہ اگر وہ ان جانوروں کو کھائیں گے تو انکو نقصان پہنچیگا۔ اسی طرح بعض سواری کے جانوروں کو وہ محض اوہام کی بناء پر چھوڑ دیتے اور کہتے تھے کہ فلاں فلاں جانوروں پر سواری نہیں کرنی چاہیئے۔ اور جن جانوروں کو مشرک لوگ بتوں کا چڑھاوا قرار دے کر اُن سے کام لینا حرام قرار دے دیتے تھے۔ اُن میں سے بعض دفعہ نر کو اور بعض دفعہ مادہ کو اور بعض دفعہ جو بچہ انکے پیٹوں میں ہوتا اُسے مردوں کے لئے حلال اور عورتوں کے لئے حرام قرار دے دیتے اور یہ سب کچھ وہم کا نتیجہ تھا اور کچھ نہیں۔ کیونکہ اُن کے پاس اس کی کوئی عقلی دلیل نہ تھی۔

قرآن کریم ان کی رسوم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے :-

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۭ قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ نَبِّـُٔـوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ۭ قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِھٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (انعام ع۱۸)

یعنی اللہ تعالے نے آٹھ جوڑوں کو پیدا کیا ہے۔ دُنبہ میں سے دو کو اور بکرے میں سے دو کو (یعنی نر و مادہ کو) تو ان سے کہہ کہ کیا اس نے دو نروں کو حرام کیا ہے۔ یا دو مادینوں کو یا اس چیز کو جو مادینوں کے رحموں میں پائی جاتی ہو۔ اگر تم سچے ہو۔ تو مجھے کسی علم کی بناء پر یہ بات بتاؤ۔

اور اس نے اونٹ میں سے دو کو اور گائے میں سے دو کو پیدا کیا ہے (یعنی نر و مادہ کو) تو ان سے کہہ کہ کیا اس نے دو نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادینوں کو یا اس چیز کو جو مادینوں کے رحموں میں پائی جاتی ہے۔ کیا تم اس وقت جب تمہیں اللہ نے اس امر کا حکم دیا تھا موجود تھے؟ اگر نہیں تو پھر اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے جو جان بوجھ کر اللہ پر اس لئے جھوٹ باندھے کہ لوگوں کو علمی دلیل کے بغیر گمراہ کر دے۔ اللہ ظالم لوگوں کو یقیناً راہ نہیں دکھاتا۔

ان آیات میں قرآن کریم نے مشرکوں کی جاری کردہ رسوم کو جو بتوں کے نام پر کی جاتی تھیں صرف وہموں کا مجموعہ قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بات صرف عرب کے ساتھ مخصوص نہیں تھی۔ کہ وہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو ہم پرستی تھی بلکہ اور ملکوں میں اب بھی ایسی رسومات پائی جاتی ہیں جو محض وہم کی بناء پر ہوتی ہیں۔ قرآن کریم نے ایسی تمام باتوں کی سختی سے مخالفت کی ہے۔ کیونکہ اس کا پیش کردہ اصل یہ ہے کہ ہر بات حکمت کی بناء پر ہونی چاہیئے تا کہ اس پر عمل کرتے ہوئے دل میں بشاشت پیدا ہو۔ اور اوہام کی باتوں کی اطاعت اکراہ اور جبر ہوتی ہے نہ کہ بشاشت سے۔

(۳) پھر مشرکین کے عقائد کے خلاف اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہماری زندگی صرف اس دنیا کی نہیں بلکہ مرنے کے بعد ایک غیر منقطع زندگی ملے گی۔ اور موت در حقیقت اس دنیا سے اگلی دنیا میں نقل مکانی کا نام ہے اور یہ دنیا مزرعۃ الآخرۃ ہے یعنی جیسے جیسے اعمال کئے ہوں گے ویسا ہی بدلہ ہمیں ملے گا۔ جو بوئیں گے وہی کاٹیں گے۔ بہر حال وہ شخص جو حیاۃ بعد الموت کا قائل نہیں۔ اس کے اعمال محض محدود دائرہ کے لئے ہوں گے اور ان کے کرنے سے اس میں بشاشت پیدا نہ ہوگی۔ لیکن ایک مومن جو حیاۃ الآخرۃ کو مانتا ہے اس کے اعمال قربانی پر منحصر ہوں گے اور اس کے اندر بشاشت ہوگی۔ پس حیاۃ بعد الموت کا عقیدہ مومن کو بشاشت سے اعمال بجالانے کے لئے ایک خاص تقویت بخشتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے اس عقیدہ کو بار بار پیش کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ (توبہ ع ۹)

یعنی مومن مردوں اور مومن عورتوں سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ مرنے کے بعد ان کو ایسی جنات عطا کی جائیں گی۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہتے چلے جائیں گے اور بہترین رہنے کی جگہیں انہیں دی جائیں گی اور یہ باغات اور نہریں ہمیشہ کے لئے ہوں گی نہ کہ عارضی۔ پس اسلام اس نظریہ کو پیش کرتا ہے کہ صرف اس دنیا کی زندگی نہیں بلکہ مرنے کے بعد ایک اور زندگی ملے گی اور اصل زندگی وہی ہے اور یہ کہ اس کے لئے اس دنیا میں اعمال بجا لانے چاہئیں۔ چنانچہ فرمایا:-

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۚ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (عنکبوت ع ۷) کہ یہ دنیا تو عارضی ہے اور اصل زندگی تو بعد از موت حاصل ہوگی۔ کاش لوگ اس بات کو جان لیں۔

ان تمام امور کے علاوہ اسلام ایسے خدا کو پیش کرتا ہے جو سراپا محبت ہے۔ وہ اپنے عبادت گذاروں کی دعائیں سنتا اور ان کی مشکلات کے وقت انکے مصائب کو دور کرتا ہے اور اپنے محبت بھرے کلام سے دلوں کو اطمینان بخشتا ہے۔ جیسے فرمایا اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ

إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ (نمل ع۵) کہ اللہ کے سوا وہ کونسی ہستی ہے جو لاچار کی دعا کو سنتی ہے اور اس کی تکلیف کو دور کر دیتی ہے یعنی ایسی ہستی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں۔ صرف اللہ ہی کی ذات ہے جس میں یہ وصف پایا جاتا ہے۔ پھر فرمایا:-

إِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ، أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ (بقرہ ع۲۳)

یعنی میں اپنے بندوں کے قریب ہوں اور ان کی پکار کو سنتا ہوں۔ پس جب عبادت کرنے والے کو یہ پتہ ہو کہ میرے معبود میں یہ وصف پایا جاتا ہے کہ وہ میری دعاؤں کو سنیگا اور وہ طاقت رکھتا ہے کہ میری ہر قسم کی مشکلات کو دور کرے۔ تو وہ احکام عبادت خوشی سے بجا لائیگا اور دوڑتے ہوئے اپنے معبود کے آستانہ پر گریگا۔

اس کے مقابل پر مشرک جن بتوں کی عبادت کرتے ہیں وہ اپنے عبادت گذاروں کی نہ تو دعائیں سنتے ہیں اور نہ اُن سے بولتے ہیں اور نہ اُن کی مشکلات میں اُنکے کام آتے ہیں۔ اس قسم کی ہستیوں کو ماننا یا نہ ماننا برابر ہوتا ہے چہ جائیکہ ان کی عبادت کی جائے۔ قرآن کریم بھی بتوں کے معبود نہ بن سکنے کی یہی دلیل بیان فرماتا ہے۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر تشریف لے گئے اور سامری نے ان کی قوم کے سامنے زیورات بناکر بچھڑا معبود کے طور پر پیش کیا اور قوم کا کچھ حصہ گمراہ ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع ملی تو آپ واپس تشریف لائے اور اس بچھڑے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس بچھڑے کے معبود نہ بن سکنے اور اس کو معبود سمجھنے والوں پر اُن کی غلطی واضح کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا (طٰہٰ ع۱۳)

یعنی کیا یہ بچھڑے کے عبادت گذار نہیں سمجھتے کہ معبود تو اس ہستی کو بنانا چاہیئے جو دعائیں سُنے۔ تکالیف کو دُور کرے اور اپنی محبت کا اظہار کرے۔ لیکن یہ بچھڑا تو اِن صفات کا مالک نہیں۔ نہ وہ دُعا سنکر جواب دیتا ہے اور نہ کوئی نفع دے سکتا ہے اور نہ کسی نقصان سے بچا سکتا ہے۔ پس ایسی کمزور چیز کو معبود بنانا سراسر غلطی ہے۔

پس اسلام نے خدا تعالیٰ کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے وہ ہر مومن کے اندر ایسا جذبہ پیدا کرتا ہے کہ وہ دوڑتا ہوا اس کے آستانے پر آگرتا ہے اور احکام کے بجالانے میں ایک لذت محسوس کرتا ہے۔ جبکہ کافر اپنے معبودوں کی عبادت کو ایک بوجھ سمجھتا ہے اور احکام کو ایک چٹی تصور کرتا ہے۔

اسلام کے مقابلہ میں عیسائیت کا بھی یہی حال ہے کہ اس کے احکام بے حکمت قرار پاتے ہیں مسیحیت کی بنیاد شریعت کے لعنت ہونے پر ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:-

"مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا۔ اس نے
ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے
چھڑایا" (گلتیوں باب۳ آیت ۱۴)

جب شریعت لعنت ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ احکام شریعت بے حکمت اور بے مغز ہیں اور محض اللہ تعالیٰ نے انسان سے اپنی خدائی منوانے کے لئے یہ احکام دئے تھے۔ انسان کا ان میں کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اگر روزہ کا حکم دیا تو محض اس لئے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا حکم بجالاتے ہوئے بھوکا پیاسا تڑپتا رہے۔ ورنہ اس کا کوئی روحانی فائدہ نہیں تھا۔ پس عیسائیت شریعت کے احکام کے متعلق یہ سمجھتی ہے کہ نہ وہ انفرادی طور پر فائدہ مند ہیں اور نہ قومی طور پر۔ اور جب یہ حقیقت ہو۔ تو احکام کا بجالانا واقعی ایک مصیبت اور

لعنت بن جاتا ہے۔ احکام تبھی رحمت ہوتے ہیں جب انکی
تعمیل کے نتیجہ میں انفرادی اور قومی فائدہ بھی ہو۔ جیسے
اسلام کے احکام ہیں۔ کہ نماز۔ روزہ۔ حج اور زکوٰۃ
سب اپنے اندر گہرا فلسفہ رکھتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ
وہ خدا تعالےٰ سے ملاتے ہیں بلکہ قومی ترقی اور محافظت
کے لئے بھی بہترین سامان مہیا کرتے ہیں۔

الغرض مسلمانوں اور کافروں کا طریق عبادت بالکل
مختلف ہے۔ مسلمانوں کے طریق عبادت میں قلبی بشاشت
قائم رہتی ہے۔ کیونکہ ان کی شریعت کے تمام احکام حکمت پر
مبنی ہیں۔ اور ان کے اندر معقولیت پائی جاتی ہے۔ پس
ان حکمتوں اور معقولیت کی بناء پر مسلمانوں کی عبادت
کافروں اور مشرکوں کی وہمی عبادت کی طرح نہیں ہو سکتی۔
گویا دونوں فریق بالطبع ایک دوسرے کے طریق کو اختیار
نہیں کر سکتے۔ مسلم بعبیرۃ کا عادی ہے وہ بے بصیرت
عبادت کس طرح کر سکتا ہے اور کافر بے بصیرت عبادت
کا عادی ہے وہ بصیرت والی عبادت کس طرح کر سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جو شخص اس عقیدہ پر قائم ہو کہ اِنْ
تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ
فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ (ابراہیم ع) یعنی خدا تعالیٰ
انسانوں کی فرمانبرداری کا محتاج نہیں۔ بلکہ وہی احکام
اس نے نازل کئے ہیں جو لوگوں کے لئے انفرادی طور پر اور
اجتماعی طور پر مفید ہیں۔ اور پھر جو شرک کو وجود باری کے
منافی جانتا ہو۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ کیونکر عبادت
میں متحد ہو سکتا ہے۔ جن کے اوّل تو کوئی اصول ہی نہیں
اور اگر کوئی اصول ہیں تو ان کا اپنا اختراع ہیں۔

غرض اللہ تعالےٰ نے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ
وسلم اور آپ کے متبعین کو حکم دیا ہے کہ وہ کسی زمانے
میں کفر کے سامنے جھکیں نہیں بلکہ ان کی طرف سے پورے
زور سے یہ اعلان ہونا چاہیئے کہ یٰٓاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ
لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ۔ اے منکرو! تم جو امیدیں
لگائے بیٹھے ہو کہ مسلمانوں کو اپنے ادیان کی طرف مائل
کر لوگے یہ غلط امیدیں ہیں۔ تم ہماری طرف سے کلیۃً
مایوس ہو جاؤ۔ ہم تمہارے طریق عبادت کو کبھی اختیار
نہیں کر سکتے۔ یعنی تم جن اصول پر عبادت کرتے ہو۔ ہم
اُن اصول پر عبادت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اور اس
اعلان کی وجہ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ میں
بتادی۔ کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جس طوعی
اطاعت کے طریق کو پیش کیا ہے تم اس کے منکر ہو۔
حالانکہ اس پر عمل کرنے سے بشاشت قلب قائم رہتی ہے
اور صحیح الفکر انسان کا دل خود یہ چاہتا ہے کہ وہ ان پیش کردہ
طریقوں پر گامزن ہو۔ کیونکہ احکام کے ساتھ ساتھ
اُن کی علت اور وجہ بھی بتادی گئی ہے اور یہ بتادیا گیا
ہے کہ ان احکام پر چلنے والے کو خدا تعالےٰ کی رضاء
کے علاوہ کون کون سے قومی اور ملی فوائد حاصل
ہو سکتے ہیں۔ اس کے مقابل پر دوسرے مذاہب کے
متبعین کے پاس جو احکام عبادت ہیں ان کی تعمیل میں
نہ تو بشاشت قلب قائم رہ سکتی ہے اور نہ انسان خوشی خوشی
اُن کو اختیار کر سکتا ہے۔ کیونکہ اُن احکام کی علت
اور وجہ نہیں بتائی گئی اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ ان احکام
پر چلنے والوں کو قومی یا ملی طور پر کیا فوائد حاصل ہو سکتے
ہیں۔ اور جب یہ باتیں احکام میں نہ ہوں۔ تو ایک
عقل اور فکر سے کام لینے والا انسان ان احکام عبادت
کو کیسے اختیار کر سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ عقل اور
قوت فکر کو جواب دے دے۔ پس ایک مسلمان اعلیٰ درجہ
کے احکام عبادت کی موجودگی میں غیر معقول احکام کو
کیسے اختیار کر سکتا ہے اور اپنے بہترین دین کو چھوڑ کر
ناقص ادیان کی اتباع کا خیال بھی ذہن میں کیسے لا سکتا
ہے اور اسی بات کو لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ میں

پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

لفظ دِیْن کے دوسرے معنے اَلسُّلْطَانُ وَ الْمُلْکُ وَالْحُکْمُ کے ہیں۔ اَلسُّلْطَانُ کے معنے لغت میں اَلْحُجَّۃُ وَ التَّسَلُّطُ کے لکھے ہیں۔ یعنی دلیل اور غلبہ اور اَلْمُلْکُ وَالْحُکْمُ کے معنے بادشاہت کے ہیں۔

اِن معنوں کے اعتبار سے لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کی یہ تشریح ہوگی کہ (۱) اے منکرو! اپنے معبودوں کی عبادت منوانے اور اپنی عبادت کے طریقوں پر دوسروں کو کاربند کرنے کے لئے تمہارے دلائل اور قسم کے ہیں اور توحید کو قائم کرنے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کو دنیا میں رائج کرنے کے لئے میرے دلائل اور قسم کے ہیں۔

(۲) تمہارے تسلط کا نتیجہ اَور ہے اور میرے تسلط کا نتیجہ اَور۔

(۳) تمہارا طریق حکومت اَور ہے اور میرا طریق حکومت اَور۔ تمہارے اصول حکومت اَور ہیں اور میرے اصول حکومت اَور۔

گویا دِین کے ان تینوں معنوں میں تین اور مضبوط دلائل اس امر کے مہیا کئے گئے ہیں۔ کہ کیوں ایک سچا مومن غیر مسلم کے ساتھ عبادت میں اشتراک نہیں کر سکتا۔ اور کیوں وہ ہر موقعہ پر ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے کہ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ یعنی میں تمہارے ساتھ متحد فی العبادۃ نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے دِین کے ایک معنے حجت کے بھی ہیں۔ ان معنوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے آیت لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کی تشریح یہ ہوگی کہ اسلام کے منکرین کے پاس اپنے معبودوں کی عبادت منوانے اور اپنی عبادت کے طریقوں پر دوسروں کو کاربند کرنے کے لئے سوائے اکراہ اور جبر کے کچھ نہیں۔ اگر ان کے معبودوں کی عبادت سے کوئی سرتابی کرتا ہے یا اس سے روگردانی اختیار کرتا ہے تو وہ اس کو جبر اور اکراہ اور ڈنڈے کے زور سے اپنے معبودوں کی طرف لانا چاہتے ہیں اور یہ طریق کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ خواہ وقتی طور پر انسان جبر کے آگے سر جھکا دے۔ لیکن جب دل سے اس کا مطیع نہیں ہوتا۔ تو ہر موقعہ پر وہ اس قید سے آزاد ہونے کے لئے پوری جد و جہد کرتا ہے۔ انسان اس چیز کے سامنے صحیح طور پر جھکتا ہے جس کی دلیل اس کی سمجھ میں آجائے۔ اور جب وہ کسی چیز کو دلیل سے مانتا ہے تو پھر اس کا دل اور دماغ تسلّی پا جاتا ہے لیکن منکرین اسلام اس کے خلاف اپنے معبودوں کی عبادت منوانے اور اُسے رائج کروانے کے لئے کوئی ایسی دلیل تو پیش نہیں کرتے جو انسانی دل و دماغ کو مطمئن کر دے۔ ہاں اُن کے پاس صرف ایک ہی طریق ہے کہ جو اُن کے مذہب سے ذرا بھی ہٹا۔ اس کو مارا پیٹا اور ذلیل کرنے کی کوشش کی اور اس کے آزار کے درپے ہوگئے اور اگر وہ انکے سامنے نہ جھکا تو اس کی جان لینے کے منصوبے کرنے لگے چنانچہ ابتدائے اسلام میں جب مسلمان پورے طور پر غیر مسلموں کے رحم پر تھے۔ اُن کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا تھا۔
تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ مسلمانوں پر جو مظالم قریشِ مکہ کرتے تھے۔ وہ محض اس لئے تھے کہ وہ ان بتوں کی عبادت کی طرف پھر سے رجوع کریں جن کو چھوڑ کر وہ توحید اختیار کر چکے ہیں۔ چنانچہ **بلال بن رباح** جو امیہ بن خلف کے ایک حبشی غلام تھے جب انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور بتوں کی عبادت کو ترک کر کے خدائے واحد کی عبادت کا اقرار کیا۔ تو امیہ ان کو عین دوپہر کے وقت جبکہ اوپر سے آگ برستی تھی اور مکہ کا پتھریلا میدان بھٹی کی طرح تپتا تھا، باہر لے جاتا تھا اور ننگا کر کے زمین پر لٹا دیتا تھا اور بڑے بڑے گرم پتھر

اُن کے سینے پر رکھ کر کہتا تھا کہ لات اور عزّیٰ کی پرستش کرو اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) سے علیحدہ ہو جاؤ۔ ورنہ اسی طرح عذاب دے دے کر مار دونگا۔ بلالؓ زیادہ عربی نہ جانتے تھے۔ ان کے ظلم کے جواب میں وہ صرف اتنا کہتے احد۔ احد۔ یعنی اللہ ایک ہی ہے۔ اللہ ایک ہی ہے۔ امیہ یہ جواب سنکر اور تیز ہو جاتا اور اُن کے گلے میں رسّی ڈال کر انہیں شریر لڑکوں کے حوالہ کر دیتا اور وہ ان کو مکہ کی پتھریلی گلی کوچوں میں گھسیٹتے پھرتے جس سے اُن کا بدن خون سے تربتر ہو جاتا مگر ان کی زبان پر سوائے احد۔ احد کے کوئی اور لفظ نہ ہوتا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اُن پر یہ جور و ستم دیکھ کر اُن کو خرید لیا اور آزاد کر دیا۔

اسی طرح خبابؓ بن الارت جو پہلے غلام تھے پھر آزاد ہو گئے تھے۔ آہنگری کا کام کرتے تھے اور وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ قریش مکہ نے ایک دفعہ اُن کو انکی بھٹی کے کوئلوں پر اُلٹا لٹا دیا اور ایک شخص اُن کی چھاتی پر چڑھ گیا تاکہ وہ کروٹ نہ بدل سکیں۔ چنانچہ وہ کوئلے اسی طرح جل کر اُن کے نیچے ٹھنڈے ہو گئے اور اُن کا چمڑہ اس طرح ہو گیا جس طرح بھینسے کا ہوتا ہے۔

الغرض مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ہوتے تا وہ توحید کو چھوڑ کر بتوں کی عبادت کریں۔ حتیٰ کہ انکو اپنی جائدادوں سے محروم ہو کر اور اپنے محبوب شہر مکہ کو چھوڑ کر مدینہ جانا پڑا اور پھر بھی مشرکین نے اُن کا پیچھا نہ چھوڑا۔ بلکہ لشکر اکٹھے کر کے ان پر حملہ آور ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ ایک کثیر تعداد مسلمانوں کی جنگوں میں شہید ہو گئی۔ پس یہ سب کچھ اس لئے تھا۔ کہ مشرکین اپنے طریقِ عبادت کو دوسروں کے گلے زبردستی منڈھنا چاہتے تھے اور اپنی اکثریت اور طاقت کو اپنے حق پر ہونے کی دلیل سمجھتے تھے لیکن مسلمان یہ کہتے تھے کہ عبادت کے منوانے اور اس پر کاربند کروانے میں زبردستی نہیں ہونی چاہیئے۔ بلکہ پوری آزادی دی جانی چاہیئے اور دلائل سے قائل کرنا چاہیئے۔ کہ کیوں عبادت کا فلاں طریق اختیار کیا جائے۔ اگر مخاطب کی سمجھ میں وہ بات آجائے تو اس کو تسلیم کرے وگرنہ چھوڑ دے۔ اور مسلمان اپنے مذہب کی تبلیغ کے ضمن میں اسی طریق کو اختیار کرتے تھے۔ بتوں کی عبادت کے خلاف جو وعظ ہوتا اس میں یہی بات بیان کی جاتی۔ کہ یہ پتھر کے بُت تم اپنے ہاتھوں سے بناتے ہو۔ یہ نہ کسی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں اور نہ کوئی فائدہ دے سکتے ہیں اور نہ دعا کو قبول کرتے ہیں۔ پس اُن کی عبادت کرنے کا کیا فائدہ۔ عبادت تو اُس ہستی کی کرنی چاہیئے جو دعاؤں کو سُنے۔ تکلیف کو دور کرے اور احسان کرنے اور نفع پہنچانے پر قادر ہو۔ اور ایسی ہستی سوائے خدا تعالےٰ کے اور کوئی نہیں۔ مسلمان قرآن کریم کے اس حکم پر پوری طرح عامل تھے کہ لَا اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ (بقرہ ع ۳۴) یعنی عبادت کے معاملہ میں جبر نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ دلائل سے سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ قرآن کریم اس تعلیم کو بار بار پیش کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے :-

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ (انفال ع ۵) یعنی جنگ بدر میں جو معجزات ہم نے دکھلائے وہ محض اس لئے تھے تاکہ جو ہلاک ہو وہ صرف تلوار سے ہلاک نہ ہو بلکہ دلیل سے ہلاک ہو۔ اور جو زندہ ہو۔ وہ صرف تلوار سے بچ کر زندہ نہ ہو بلکہ دلیل سے زندہ ہو۔ گویا اس آیت میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ شکست و فتح دلائل کے رو سے ہونی چاہیئے اور اصل شکست یہی ہے کہ انسان کے پاس دلائل نہ ہوں۔ اور اصل جیت یہی ہے کہ انسان کے پاس دلائل ہوں اور وہ دوسروں کو قائل کرے۔

پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ○ قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ (انعام ع) یعنی اے نبی اعلان کر دو کہ مجھے تمہارے بتوں کی عبادت کرنے سے روکا گیا ہے۔ تم محض اپنی خواہشات کو پورا کرنے کیلئے انکی عبادت بجالاتے ہو۔ تمہارے پاس دلیل کوئی نہیں اور اگر میں بھی تمہارے پیچھے چلوں تو میں بھی سیدھے راستے سے بھٹک جاؤں۔ اے نبی اعلان کر دو کہ میں نے تو جس راستے کو اختیار کیا ہے یعنی توحید کو۔ اس کے لئے میرے پاس کھلے کھلے دلائل ہیں لیکن تم ان کا انکار کر رہے ہو۔ پس اسلام تو دلائل کو پیش کرتا ہے اور ان دلائل کے پیش کرنے کے بعد کہتا ہے۔ مَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ (کہف ع) کہ جس کی سمجھ میں یہ دلائل آتے ہیں وہ اسلام کی پیش کردہ تعلیم کو مان لے اور جس کی سمجھ میں وہ دلائل نہیں آتے، بیشک وہ اپنی اختیار کردہ راہ پر قائم رہے۔

کفار کے زغہ میں جب کوئی مسلمان پھنس جاتا اُسکو زبردستی اقرار کرانے کی کوشش کرتے کہ وہ خدائے واحد کو چھوڑ کر بتوں کی عبادت کریگا لیکن قرآن کریم یہ کہتا ہے۔ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰی یَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ (توبہ ع) کہ اگر اللہ تعالےٰ تمہیں طاقت دے اور پھر کوئی مشرک تمہارے ہاں پناہ گزین ہو تو اسکو پناہ دو اور اسکی بہترین مہمانی اس طور پر کرو کہ قرآنی تعلیم کو اس کے سامنے پیش کرو۔ پھر اس پر اسکو منوانے کے لئے کوئی جبر نہ کرو بلکہ اس کے اپنے علاقہ میں جہاں اُسے امن حاصل ہو پہنچا دو۔

مسلمان مذہبی آزادی قائم رکھنے پر پوری طرح عامل تھے۔ چنانچہ مدینہ میں جب اسلام پھیلا اور مسلمانوں کو طاقت حاصل ہوئی تو انہوں نے جبر و اکراہ سے کام نہیں لیا۔ مدینہ میں یہ طریق تھا کہ کسی اوسی یا خزرجی (مشرکین مدینہ) کے ہاں اگر اولاد نرینہ نہ ہوتی تو وہ منت مانتا تھا کہ اگر اس کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہو تو وہ اُسے یہودی بنا دے گا۔ اس طرح اوس اور خزرج کے کئی بچے یہودی بن گئے۔ مسلمانوں کی طاقت کے زمانہ میں جب بنو نضیر یہودی اپنی شرارتوں کی وجہ سے مدینہ سے جلاوطن کئے گئے تو ان میں وہ بچے بھی تھے جو انصار کی اولاد تھے اور انصار نے انہیں روک لینا چاہا۔ لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ کی آیت کے ماتحت ایسا کرنے سے روک دیا۔ پھر مدینہ میں نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا تو انکی عبادت کا وقت آنے پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کے اندر انکو عبادت بجالانے کی اجازت دیدی۔ اور جب بعض صحابہؓ نے روکنا چاہا تو آپ نے ان صحابہ کو منع فرمادیا۔ چنانچہ ان عیسائیوں نے مشرق رُو ہو کر عین مسجد نبوی میں اپنی عبادت کے مراسم ادا کئے۔ (زرقانی جلد ۴ حالات وفد نجران)

پس اسلام مذہبی آزادی کا قائل ہے۔ وہ اپنی تعلیم اور عبادت کو دلائل قویہ کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش تو کرتا ہے لیکن اس پر چلانے کے لئے جبر و اکراہ کا قائل نہیں اور اگر کوئی ایسی تعلیم کو قبول کر لینے کے بعد پھر اس کو چھوڑنا چاہتا ہے تو اس پر کسی قسم کی گرفت نہیں کرتا لیکن مشرکین اس کے مقابل پر اپنی عبادت کو ڈنڈے کے زور سے منواتے اور اس پر کاربند ہونے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی انکی عبادت سے نفرت کرتے ہوئے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے تو اسکی جان لینے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

اَلتَّسْلُّطَان کے دوسرے معنے اَلتَّسَلُّط کے ہیں اس معنے کے اعتبار سے لَكُمْ دِیْنُكُمْ وَلِیَ دِیْنِ کی

یہ تشریح ہوگی۔ کہ اے منکرو! تمہارا تسلط کا طریق اور ہے اور میرا تسلط کا طریق اور۔ تمہارے تسلط کے نیچے حریتِ ضمیر باقی نہیں رہتی۔ لیکن میرے تسلط میں حریتِ ضمیر کو قائم کیا جاتا ہے۔ ان دو متضاد نظریوں کے ساتھ ہم عبادت کس طرح اکٹھے کر سکتے ہیں۔ تم تو خدا سے یہ دعا کرو گے کہ الٰہی ہم کو اپنے مخالفوں پر غلبہ بخش۔ تاکہ جبراً ان کا مذہب بدلوا دیں اور میں یہ دعا کروں گا کہ الٰہی مجھے منکروں پر غلبہ بخش۔ تاکہ میں حریتِ ضمیر کا اعلیٰ نمونہ پیش کر سکوں۔

پھر اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ (حجر ع ۳) کہ میرے بندوں پر شیطان کا تسلط نہیں ہوتا یعنی غیر مومنوں پر شیطان کا تسلط ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جن پر شیطان کا تسلط ہو جائے وہ دوسروں پر غالب آکر شیطانی تسلط کو قائم کریں گے۔ پس تسلط کے اس معنے کے مدنظر لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کے یہ معنے بھی ہوں گے۔ کہ میں خدا کا تسلط دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہوں اور منکرین اسلام شیطان کا تسلط قائم کرتے ہیں پس دونوں فریق متحد فی العبادۃ کس طرح ہو سکتے ہیں۔

(۲) جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے لفظ دِیْن کے ایک معنے اَلْمُلْکُ وَالْحُکْمُ یعنی بادشاہت اور حکومت کے ہیں اس مفہوم کے لحاظ سے لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کے یہ معنے ہوں گے۔ کہ اے اسلام کے منکرو! تمہارا طریق حکومت اور اصول حکومت اور ہے اور میرا طریق حکومت اور اصول حکومت اور ہے۔ یعنی تمہارے ہاں استبداد جائز ہے لیکن میرے نزدیک ہر فرد کو حکومت میں رائے دینے کا حق ہے۔ اور انتخاب کا طریق جائز ہے۔ تم لٹھ بازی سے کام چلاتے ہو اور اپنے جتھوں کے سہارے ملکوں پر قبضہ کر لیتے ہو۔ تمہاری حکومتیں اول تو نیابتی نہیں ہوتیں اور اگر کہیں ہوں بھی تو سارے ملک کی نمائندہ نہیں ہوتیں۔ تم اپنی حکومتوں میں اپنے ماتحتوں کے حقوق کا پوری طرح خیال نہیں رکھتے اور اس وجہ سے ہمیشہ تمہارے خلاف ملکوں میں بغاوتیں ہوتی رہتی ہیں اور رعایا اور حکومت کی چپقلش رہتی ہے۔ تم میں سے جب کوئی حاکم ہو جاتا ہے تو وہ اپنے مقام کو عام لوگوں سے بہت بلند خیال کرنے لگتا ہے۔ تم لوگ جب کسی دوسری حکومت سے معاہدہ کرتے ہو تو اس کی پروا نہیں کرتے اور جب تمہیں اپنا مفاد ضائع ہوتا نظر آتا ہو تو وہاں فوراً معاہدہ کو توڑ دیتے ہو۔ تمہارے پاس کوئی ایسے صحیح قوانین اور ٹھوس ذرائع نہیں۔ جن سے تمہارے اپنے ملک کے اندر اور تمہارے ہمسایہ ملکوں میں امن برقرار رہ سکے۔ ہم تو ایسی جابرانہ حکومتوں کے خلاف ہیں اور ہم اُن سے لوگوں کو آزاد کروا کر ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جو خدا تعالےٰ کی مرضی کے عین مطابق ہو۔ وہ اپنے ملک کی نمائندہ ہو۔ اپنے ماتحتوں کی ضروریات کا پوری طرح خیال رکھے۔ لوگ اس کے ماتحت رہنا فخر و عزت خیال کریں۔ اس میں حاکم و محکوم کے درمیان کوئی خلیج حائل نہ ہو۔ وہ اپنے معاہدوں کی پابندی کرنے والی ہو۔ اور صرف اپنے ملک میں ہی نہیں بلکہ اپنے ہمسایہ ملکوں میں بھی امن کو قائم کرنے کا فیصلہ کر چکی ہو۔ پس اس اختلاف کے ہوتے ہوئے ہمارے اور تمہارے درمیان اتحاد فی العبادۃ کیونکر ہو سکتا ہے۔ تمہاری عبادت کے نتیجہ میں دنیا میں ظلم کے راستے کھلتے ہیں اور میری عبادت ظلم کے راستوں کو بند کرتے ہوئے امن کی علمبردار ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب سورۃ کافرون نازل ہوئی تھی۔ اس وقت تو مسلمانوں کی حالت نہایت کمزور تھی اور وہ مکہ میں جا بجا ماریں کھاتے پھرتے تھے۔ اس وقت مسلمانوں کو یہ خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ ہم ایسی حکومت قائم کر لیں گے جو امن کا گہوارہ ہو اور جنت کا نمونہ ہو۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بے شک مسلمانوں کی حالت نہایت ضعف کی تھی اور ان کے مخالفین پورے جوبن پر تھے۔

عرب میں قبائلی حکومت تھی اور عرب سے باہر دو اہم طاقتیں تھیں (۱) کسریٰ ایران کی طاقت (۲) اور قیصر روم کی طاقت لیکن مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ شروع سے ہی بتا دیا تھا کہ جلد ہی مسلمانوں کی ضعف کی حالت طاقت میں تبدیل ہو جائیگی اور وہ ساری دنیا پر چھا جائیں گے اور مسلمان اس وعدے پر پورا یقین اور وثوق رکھتے تھے اور اس دن کو قریب سمجھتے تھے جب انکی ایک ایسی طاقتور حکومت قائم ہو جائیگی جو جبر و استبداد کا قلع قمع کرکے دنیا میں امن قائم کر دیگی۔

چنانچہ مسلمانوں کے ساتھ جو یہ وعدہ کیا گیا تھا۔ اس کا ذکر واضح الفاظ میں سورۂ نور میں (جو مدینہ میں نازل ہوئی) کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ؀ (نور ع ۷) کہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں اور نیک اعمال بجالانے والوں سے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں ضرور ملک میں بادشاہ بنا دے گا۔ وہ ایسی شان اور عظمت رکھنے والے بادشاہ ہوں گے جیسے پہلی منعم علیہ قوموں میں ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اسلام کے اعلیٰ اور افضل احکام جاری کر دے گا اور اس وقت جو مسلمانوں کی خوف کی حالت ہے یا آئندہ جو بھی خوف کی حالت پیدا ہوگی اس کو امن میں بدل دے گا۔ یہ بادشاہ میری عبادت کو دنیا میں قائم کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ پس ان انعامات کے بعد جو میری نعمتوں کی ناشکری کریگا اور صحیح طریق حکومت کو چھوڑ کر غلط راستہ اختیار کریگا وہ فاسق ہوگا۔

مذکورہ بالا آیات میں مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا ہے کہ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ یعنی وہ انکو ملک میں خلفاء بنا دیگا۔ خلفاء خلیفہ کی جمع ہے اور خلیفہ کے معنے ہیں:۔

۱۔ مَنْ يَّخْلُفُ غَيْرَهٗ وَيَقُوْمُ مَقَامَهٗ یعنی جو کسی کے قائمقام ہوکر وہی کام کرے جو اصل وجود کام کر رہا ہوتا ہے۔

۲۔ وَالسُّلْطَانُ الْاَعْظَمُ۔ سب سے بڑا بادشاہ۔

۳۔ وَفِی الشَّرْعِ الْاِمَامُ الَّذِیْ لَيْسَ فَوْقَهٗ اِمَامٌ اور شرعی اصطلاح میں خلیفہ اس امام کو کہتے ہیں جس کے اوپر اس زمانہ میں کوئی امام نہ ہو (اقرب)

پھر اَلْخِلَافَةُ کے معنے کرتے ہوئے اقرب الموارد میں لکھا ہے:۔

۱۔ اَلْاِمَارَةُ۔ یعنی خلافت کے ایک معنے حکومت کے ہیں۔

۲۔ اَلنِّیَابَةُ عَنِ الْغَیْرِ اِمَّا لِغَیْبَةِ الْمَنُوْبِ عَنْهُ اَوْ لِمَوْتِهٖ۔ کہ خلافت کے معنے ہیں کسی کا نائب اور قائمقام ہوکر وہی کام کرنا جو اصل وجود کام کر رہا تھا۔ اور یہ نیابت یا تو اس لئے ہو کہ اصل وہاں موجود نہیں یا اصل وفات پا گیا ہے اب اس کے کام کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے (اقرب)

پس لغت کے ان معنوں کے لحاظ سے لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ کے مندرجہ ذیل معنے ہوں گے:۔

۱۔ اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ تمہیں ضرور ملک میں بہت بڑے خلفاء اور بادشاہ بنا دے گا۔

۲۔ یہ بادشاہت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں ہوگی۔ یعنی جو کام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سرانجام دے رہے ہیں۔ وہی کام انکو سرانجام دینا ہوگا۔

الغرض مومنوں سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں حکومت عطا کرے گا اور وہ حکومت بھی الٰہی منشاء کے مطابق ہوگی۔ پھر مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ کے الفاظ میں یہ بھی بتا دیا کہ خلافت درحقیقت خدا تعالیٰ کی نمائندگی میں ہوتی ہے اور خدا کی صفات کو ظاہر کرنے والی ہوتی ہے۔ جو اس کا انکار کرتا ہے وہ درحقیقت خدا تعالیٰ سے عہد مودت توڑتا ہے۔

احادیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آپ کے بعد خلافت ہوگی یعنی ایسے وجود ہونگے۔ جو اللہ تعالیٰ کی صفات کو جاری رکھنے والے ہوں گے۔ لیکن ان کے بعد یہ حالت بدل جائے گی۔ اور دوسری قوموں کی نقل میں مسلمان بھی استبدادی حکومت کے شائق ہو جائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ دوبارہ صحیح خلافت کو قائم کرے گا جو خدا تعالیٰ کے منشاء کو پورا کرنے والی ہوگی چنانچہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَا شَآءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ مَا شَآءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اَنْ يَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً فَيَكُوْنُ مَا شَآءَ اللّٰهُ اَنْ يَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ (مشکوٰۃ باب تغیر الناس ص ۴۵۳)

یعنی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ کچھ عرصہ جب تک اللہ تعالیٰ چاہے نبوت کا زمانہ رہے گا۔ پھر خلافت نبوت کے طریق پر قائم ہوگی اور اس وقت تک رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ کا منشاء ہوگا۔ پھر وہ ختم ہو جائے گی اور بادشاہت کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور یہ کچھ عرصہ تک جب تک اللہ تعالیٰ چاہیگا کھلا رہے گا۔ پھر اس کے بعد جابر حکومتیں شروع ہو جائیں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کو ختم کر دے گا اور اس کے بعد دوبارہ نبوت کے طریق پر خلافت قائم ہوگی۔

چنانچہ یہ وعدے پورے ہوئے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مسلمانوں کو حکومت مل گئی۔ اور آپ کے بعد کچھ عرصہ تک یہ حکومت قائم رہی۔ لیکن بعدازاں یہ حکومت عام دنیوی حکومتوں کی طرح بن گئی۔ اب اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا ہے اور پیشگوئی کے مطابق آپ کے ذریعہ ایسی حکومتوں کی بنیاد پڑے گی جو بجائے دنیا کی طالب ہونے کے روحانی اور اخلاقی قدر کو قائم کرنے کی کوشش کریں گی اور ظلم و استبداد کا خاتمہ ہو جائے گا۔

غرض یہ سب وعدے چونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے تھے۔ اس لئے بہرحال ہوں نے پورا ہونا تھا اور مسلمان ان پر پورے وثوق و یقین سے قائم تھے اور اسی کے پیش نظر آں کو ابتدائی زمانہ میں ہی یہ اعلان کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ کہ اے منکرو! لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۔ تمہاری ظالمانہ حکومت تمہی کو سجتی ہے۔ ہم تو ظلم و استبداد کو جائز نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس کو مٹانے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ تمہاری حکومتوں میں مذہبی آزادی نہیں اور مسلمان ایسی حکومتوں سے نہ صرف خود آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ بلکہ دوسروں کو بھی آزاد کرائیں گے اور ایسی حکومت قائم کرینگے جو ہر قسم کی خیر و برکت اپنے اندر لئے ہوئے ہوگی چنانچہ اسلام کے ذریعہ جو حکومت قائم ہوئی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی اور یہودی خود چاہتے تھے کہ اسی حکومت کے ماتحت رہیں۔

تاریخوں میں آتا ہے کہ ملک شام کی فتوحات میں جب حمص پر قبضہ کے بعد دوبارہ دشمن کے حملہ کا خطرہ ہوا تو

مسلمانوں نے حمص کو خالی کر دیا اور وہاں کے عیسائی باشندوں سے جو جزیہ لیا گیا تھا وہ سب کا سب واپس کر دیا۔ اور اُن کو کہہ دیا کہ یہ رقم ہم نے اس معاہدہ کے ماتحت لی تھی کہ مسلمان تمہاری حفاظت کریں گے۔ لیکن اس وقت ہماری ایسی نازک حالت ہے کہ ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے اس لئے تمہیں تمہاری رقم واپس کی جاتی ہے۔ چنانچہ کئی لاکھ کی رقم جو وصول کی گئی تھی واپس کر دی گئی۔ عیسائیوں پر اس واقعہ کا اس قدر اثر ہوا کہ وہ روتے جاتے تھے اور جوش کے ساتھ کہتے جاتے تھے۔ کہ خدا تم کو واپس لائے۔ یہودیوں پر اس سے بھی زیادہ اثر ہوا۔ انہوں نے کہا کہ توراۃ کی قسم جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ (فتوح البلدان بلاذری ص۱۴۳ وکتاب الخراج للامام ابی یوسف ص۸۱)

پس ان واقعات سے اور ان جیسے دوسرے واقعات سے جو تاریخوں میں ملتے ہیں یہ ثابت ہے۔ کہ اسلامی حکومت لوگوں کے دلوں کو فتح کرتی تھی۔ ملک سے ظلم و استبداد کو ختم کرتی تھی۔ مذہبی آزادی برقرار رکھتی تھی۔ اپنے معاہدوں کی پابندی کرتی تھی جس کی وجہ سے وہ ملک امن کا گہوارہ بن جاتا تھا۔ اور ملکوں کے باشندے دل سے اس حکومت کو چاہتے تھے۔

۲۵۱
اسلامی حکومت کے گیارہ اصول

پھر اسلام نے حکومت کے جو اصول پیش کئے ہیں۔ وہ اتنے اعلیٰ اور ارفع ہیں کہ جو حکومت ان اصولوں پر قائم ہو گی وہی دنیا کی ترقی اور امن کی ضامن ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ اصول یہ ہیں۔

۱۔ پہلا اصل اسلام نے حکومت کا یہ پیش کیا ہے کہ حکومت انتخابی ہو اور حکومت کی بنیاد اہلیت پر ہو۔

۲۔ دوسرا اصل اسلام نے حکومت کا یہ پیش کیا ہے کہ حکومت کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ ایک امانت ہے۔ گویا اسلام کے نزدیک نسلی اور موروثی بادشاہت نہیں ہے۔

۳۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کی عزت۔ جان اور مال کی حفاظت کرے۔

۴۔ حاکم کے لئے ضروری ہے کہ وہ افراد اور اقوام کے درمیان عدل کرے۔

۵۔ قومی معاملات مشاورت سے طے ہوں۔

۶۔ حکومت ہر ایک شخص کے لئے خوراک۔ لباس اور مکان مہیا کرنے کی ذمہ دار ہو۔

۷۔ دوسروں کے ممالک پر طمع کی نظر نہ رکھی جائے۔ جنگ صرف دفاعی ہو۔

۸۔ مفتوح کے ساتھ عدل کا سلوک کیا جائے۔

۹۔ جنگی قیدیوں کو خاص طور پر مراعات دی جائیں

۱۰۔ معاہدات کی پابندی کی جائے۔

۱۱۔ ملک میں مذہبی آزادی قائم کی جائے۔

یہ وہ اصول ہیں جن کو اسلام نے حکومت کیلئے ضروری قرار دیا ہے۔ چنانچہ پہلے چار اصولوں کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ۝ (نساء ع) یعنی اے لوگو اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ جب تمہیں موقعہ ملے کہ تم حکومت کی امانتیں کسی کے سپرد کرو۔ تو یاد رکھو کہ تم یہ امانتیں ہمیشہ ان لوگوں کے سپرد کرو۔ جو تمہارے نزدیک حکومت کے اہل ہوں۔ اور جن کے اندر یہ قابلیت پائی جاتی ہو۔ کہ وہ حکومتی کاموں کو عمدگی سے سرانجام دے سکیں۔ اور جب اے حاکمو! تم حاکم ہو جاؤ تو تم انصاف کے ساتھ حکمرانی کرو۔ اللہ تعالیٰ جس امر کی تم کو نصیحت فرماتا ہے وہ بہت اچھا ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اس آیت میں پہلے تو عامۃ الناس کو مخاطب کیا ہے۔ کہ حاکم بنانا تمہارا کام ہے اور تمہارے اختیار میں ہے۔ تمہارے سوا اور کوئی شخص حاکم بنانے کا مجاز نہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص زبردستی حاکم بن جائے اور پھر وراثۃً حکومت چل پڑے۔ یہ طریق درست نہیں اور نہ کسی شخص کا حق ہے کہ محض کسی کا بیٹا ہونے کی وجہ سے لوگوں کی گردنوں پر حکومت کا جُوا رکھے۔

دوسرا امر یہ بتایا کہ یہ حکومت کے حقوق ایک قیمتی چیز ہیں جس طرح کہ امانت قیمتی ہوتی ہے پس فرقہ وارانہ جذبات سے علیحدہ ہوکر اس امانت کو حق دار کے سپرد کرنا چاہیئے۔ کسی ایسے شخص کے سپرد نہ کرنا جو اس کے قابل نہ ہو۔ اور یہ مدنظر نہ ہو کہ یہ شخص ہماری پارٹی کا نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس کو یہ امانت نہیں دیں گے بلکہ اس شخص کے سپرد کرو۔ جو دیانتداری سے امانت کی حفاظت کرسکے۔

تیسرا حکم یہ دیا گیا ہے کہ چونکہ حکومت کوئی مستقل چیز نہیں ہے بلکہ ان حقوق کو کسی شخص کے سپرد کردینے کا نام ہے۔ جن کو بوجہ بہت سے لوگوں کے اشتراک کے لوگ فرداً فرداً ادا نہیں کرسکتے۔ اس لئے اس کو امانت خیال کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ حقوق و فرائض جن کے مجموعہ کا نام حکومت ہے کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں۔ بہ حیثیت مجموعی جماعت اُن کی مالک ہے۔

چوتھا حکم حاکم کو یہ دیا گیا ہے۔ کہ جو کچھ تم کو دیا جاتا ہے۔ وہ چونکہ بطور امانت کے ہے۔ اس لئے اس کو اسی طرح محفوظ بلا خراب یا تباہ کرنے کے اپنی موت کے وقت واپس دینا ہوگا۔ یعنی حکومت کی پوری حفاظت اور اہل ملک کے حقوق کی نگرانی کرنی ہوگی اور یہ تمہارا اختیار نہ ہوگا کہ اس حق کو ضائع کردو۔

پانچواں امر اس آیت سے یہ نکلتا ہے۔ کہ حکام کو چاہیئے کہ دوران حکومت میں لوگوں کے حقوق کو پوری طرح ادا کریں اور کسی قسم کا فساد پیدا نہ کریں۔ یہ نہ ہو کہ کسی فرد کی ناجائز طرفداری کرتے ہوئے اُسے بڑھا دیں اور کسی کو نیچے گرادیں۔ کسی قوم کو اونچا کردیں اور کسی قوم کو نیچا کردیں۔ کسی قوم میں تعلیم پھیلا دیں۔ اور کسی قوم کو جاہل رکھیں۔ کسی کی اقتصادی ضروریات کو پورا کریں اور کسی کی اقتصادی ضروریات کو نظرانداز کردیں۔ بلکہ جب لوگوں کے حقوق کا فیصلہ کیا جائے تو ہمیشہ عدل اور انصاف سے فیصلہ کیا جائے۔ رعایت یا بے جا طرفداری سے کام نہ لیا جائے۔

الغرض اسلام یہ کہتا ہے۔ کہ حکومت انتخابی ہونی چاہیئے اور ساتھ ہی نیابتی بھی۔ یعنی حکمران ملک کے لوگوں کا ان کی مجموعی حیثیت میں نہ کہ بحیثیت افراد نائب ہے۔

پھر جو شخص منتخب ہو۔ وہ حکومت کو اپنی اولاد میں نسلاً یا وراثۃً منتقل نہیں کرسکتا۔ بلکہ اس کی وفات پر وہ امانت قوم کے سپرد ہوگی اور قوم جس کو اس کا اہل سمجھے گی۔ انتخاب کرے گی۔

یورپ اور دیگر ممالک میں آجکل یا تو ڈکٹیٹرشپ ہے یا وراثتی بادشاہت۔ یا خالصتہً جمہوریت۔ لیکن اسلام ڈکٹیٹرشپ اور وراثتی بادشاہت کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام جمہوریت کو پیش کرتا ہے۔ لیکن اس جمہوریت سے قدرے مختلف جس کو آجکل کے متمدن ممالک اپنی فوقیت کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ ان ممالک میں پارٹی بازی ہوتی ہے اور ہر فریق یہ چاہتا ہے کہ ان کی پارٹی کا لیڈر منتخب ہوجائے۔ خواہ قابل اور حکومت کا اہل دوسرے

فریق کا لیڈر ہو۔لیکن اسلام اسیات کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ فرقہ دارانہ جذبات سے الگ ہو کر محض قابل۔ لائق اور اہل شخص کو منتخب کیا جائے۔

پھر ان ممالک میں پریذیڈنٹوں کا انتخاب محض چند سالوں کے لئے ہوتا ہے اور اس کے بعد ایک قابل دماغ بے کار ہو جاتا ہے اور اس کو ٹھکرا دیا جاتا ہے لیکن اسلامی آئین کی رُو سے جو منتخب ہوگا وہ ساری عمر کے لئے ہو گا۔ اور اس شخص کا فرض ہو گا کہ اپنی ساری عمر کو ملک کی بہتری کے لئے صرف کر دے۔ نہ کہ اپنی بڑائی کے حصول کے لئے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جبکہ خلافت روحانی اور ملکی اختیارات ایک شخص کے ہاتھ میں ہوں۔ دوسری صورت میں جبکہ صرف ملکی اختیارات کا سوال ہو۔ پریذیڈنٹ یا صدر مملکت تھوڑے عرصہ کے لئے بھی مقرر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے انتخاب میں پھر بھی یہی بات مدنظر رہنی چاہیئے۔ کہ اس کا انتخاب موجودہ مغربی ممالک کی پارٹی بازی کے طریق پر نہ کیا جائے۔ بلکہ خالصۃً اہلیت کو مدنظر رکھا جائے۔ اور یہ کوشش کی جاتی رہے۔ کہ ہمیشہ ملک کا بہترین دماغ قومی خدمت کے لئے آگے آتا رہے۔

پس اسلامی اصول حکومت آج کل کے متمدن ممالک کے اصولوں سے مختلف ہیں اور ان سے بہتر ہیں۔ اور ہمارے نزدیک جمہوریت کے مدعی ممالک میں جو طریق حکومت رائج ہے وہ درست نہیں۔

پھر اسلام کا حکم ہے کہ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (شوریٰ ع ۴) کہ حکومت کے معاملات مشورہ سے طے ہونے چاہئیں۔ یعنی منتخب شدہ شخص کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ ایک مجلس شوریٰ کے ذریعہ ملک کی عام رائے کو معلوم کرتا رہے اور جب ضرورت ہو۔ عام اعلان کر کے تمام افراد سے ان کی رائے دریافت کرے۔ تا کہ اگر کسی وقت ملک کے نمائندوں اور ملک کی عام رائے مخالف ہو جائے۔ تو ملک کی عام رائے کا علم ہو سکے۔

پھر اگر نیابتی فرد کے وجود میں روحانی اور ملکی اختیارات دونوں جمع ہوں۔ تو وہ مشیر کاروں کی کثرت رائے کو رد کر سکتا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کے بیان کے مطابق ایسے شخص کو خدا تعالےٰ کی طرف سے خاص نصرت ملتی ہے۔ اور اس کو ہر قسم کی سیاسی جنبہ داری سے بالا سمجھا جاتا ہے اور اس کی رائے کی نسبت یقین کیا گیا ہے کہ وہ تعصب سے پاک ہوگی اور محض ملک و ملت کا فائدہ اُسے مدنظر ہوگا۔ لیکن اگر وہ انتخابی فرد صرف پریذیڈنٹ یا صدر مملکت ہو۔ تو وہ اس آئین کا پابند ہو گا جس کے ماتحت اس کا تقرر ہوا۔

پھر اسلام نے یہ بھی بتایا ہے۔ کہ اسلامی حکومت اسیات کی ذمہ دار ہے کہ وہ ہر ایک شخص کے لئے خوراک۔ لباس اور مکان مہیا کرے۔ یہ ادنیٰ سے ادنیٰ ضروریات ہیں جن کا پورا کرنا حکومت کے ذمہ ہے کیونکہ اس کے بغیر۔ وہ چیز جس کی حفاظت اس کے سپرد کی گئی ہے۔ زندہ نہیں رہ سکتی۔ مکان اور خوراک کے بغیر جسمانی زندگی محال ہے اور لباس کے بغیر اخلاقی اور تمدنی زندگی محال ہے۔

اسلام کا یہ حکم قرآن کریم کی اس آیت میں پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝ (طٰہٰ ع ۷) یہ آیت آدم علیہ السلام کا واقعہ بیان کرتے ہوئے آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے آدم ہم نے تمہارے جنت میں رکھے جانے کا

فیصلہ کر دیا ہے۔ تم اس میں بھوکے نہیں رہوگے تم اس میں ننگے نہیں رہوگے۔ تم اس میں پیاسے نہیں رہوگے اور تم اس میں رہنے کی وجہ سے دھوپ میں نہیں پھروگے۔ لوگ اس آیت سے غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد اُخروی جنت ہے اور آیت کا یہ مطلب ہے۔ کہ جب انسان جنت میں جائے گا تو وہاں اس کا یہ حال ہوگا۔ حالانکہ قرآن کریم سے صاف ظاہر ہے۔ کہ آدم اسی دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (بقرہ ع۴) میں دنیا میں اپنا خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔ اور دنیا میں جو شخص پیدا ہوتا ہے۔ وہ بھوکا بھی ہوسکتا ہے سو وہ پیاسا بھی ہوسکتا ہے۔ وہ ننگا بھی ہوسکتا ہے۔ وہ دھوپ میں بھی پھر سکتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ دنیا میں تو پیدا ہو اور بھوک اور پیاس اور لباس اور مکان کی ضرورت اُسے نہ ہو۔ اور جبکہ یہ آیت اسی دنیا کے متعلق ہے۔ تو لازماً ہمیں اس کے کوئی اور معنے کرنے پڑیں گے اور وہ معنے یہی ہیں۔ کہ ہم نے اپنا پہلا قانون جو دنیا میں نازل کیا۔ اس میں ہم نے آدمؑ سے یہ کہہ دیا تھا۔ کہ ہم ایک ایسا قانون تمہیں دیتے ہیں۔ کہ جو تجھ کو اور تیری امت کو جنت میں داخل کردیگا اور وہ قانون یہ ہے۔ کہ ہر ایک کے کھانے پینے لباس اور مکان کا انتظام کیا جائے۔ آئندہ تم میں سے کوئی شخص بھوکا نہیں رہنا چاہیئے بلکہ یہ سوسائٹی کا کام ہے۔ کہ ہر ایک کے لئے غذا مہیا کرے۔ آئندہ تم میں سے کوئی شخص ننگا نہیں رہنا چاہیئے بلکہ یہ سوسائٹی کا کام ہونا چاہیئے۔ کہ ہر ایک کے لئے کپڑا مہیا کرے۔ آئندہ تم میں سے کوئی شخص پیاسا نہیں رہنا چاہیئے۔ بلکہ یہ سوسائٹی کا کام ہونا چاہیئے کہ وہ تالابوں اور کنوؤں وغیرہ کا انتظام کرے۔ آئندہ تم میں سے کوئی شخص بغیر مکان کے نہیں رہنا چاہیئے۔ بلکہ یہ سوسائٹی کا کام ہونا چاہیئے کہ وہ ہر ایک کے مکان کا انتظام کرے۔ گویا یہ وہ پہلا تمدن ہے۔ جو حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعہ دنیا میں قائم کیا گیا۔ اور اللہ تعالےٰ نے دنیا پر اس حقیقت کو ظاہر فرمایا کہ خدا سب کا خدا ہے۔ وہ امیروں کا بھی خدا ہے۔ وہ غریبوں کا بھی خدا ہے۔ کمزوروں کا بھی خدا ہے اور طاقتوروں کا بھی خدا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ دنیا کا ایک طبقہ تو خوشی میں اپنی زندگی بسر کرے اور دوسرا روٹی اور کپڑے کے لئے ترستا رہے۔

چنانچہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو آدم ثانی ہیں۔ ان پر بھی قرآن کریم میں یہ آیات نازل کرکے آپ کو کہا گیا کہ آپ کو بھی ایسا تمدن قائم کرنا ہوگا جس میں ہر ایک کے لئے لباس۔ مکان اور خوراک کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ مدنی زندگی میں جب عرب کے علاقہ بحرین کا رئیس مسلمان ہوا۔ تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُسے ہدایات بھجوائیں، اور لکھا:-

اِفْرِضْ عَلٰی کُلِّ رَجُلٍ لَیْسَ لَہٗ اَرْضٌ اَرْبَعَۃُ دَرَاھِمَ وَعَبَاءَۃٌ۔

(زرقانی بحوالہ ابن مندہ جلد ۳ صفحہ ۳۵۲)

یعنی جن لوگوں کے پاس زمین نہیں ہے۔ اُن میں سے ہر ایک کو ملکی خزانہ میں سے چار درہم اور لباس گذارہ کے لئے دے دیا جایا کرے (اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جس کے پاس زمین نہیں صرف اسی کی مدد کرنی چاہیئے۔ بلکہ جس کی زمین ہو۔ اور وہ تباہ ہوجائے یا فصل ہو اور وہ تباہ ہوجائے۔ وہ بھی بمنزلہ اس کے ہوگا جس کی زمین نہیں کیونکہ

نتیجہ میں وہ اس سپ کے مشابہ ہے جس کی زین نہیں)

پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالٰے عنہ کے زمانہ خلافت میں جب نظام مکمل ہُوا۔ تو اس وقت اسلامی تعلیم کے ماتحت ہر فرد بشر کے لئے روٹی اور کپڑا مہیا کرنا حکومت کے ذمہ تھا اور وہ اپنے اس فرض کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کیا کرتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالٰے عنہ نے اس غرض کے لئے مردم شماری کا طریق جاری کیا اور رجسٹرات کھولے جن میں تمام لوگوں کے ناموں کا اندراج ہوا کرتا تھا۔ یوروپین مصنفین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ پہلی مردم شماری حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کی۔ اور انہوں نے ہی رجسٹرات کا طریق جاری کیا۔ اس مردم شماری کی وجہ یہی تھی کہ ہر شخص کو روٹی کپڑا دیا جاتا تھا اور حکومت کے لئے ضروری تھا۔ کہ وہ اسباب کا علم رکھے کہ کتنے لوگ ملک میں پائے جاتے ہیں۔ آج یہ کہا جاتا ہے کہ سویٹ رشیا نے غرباء کے کھانے اور ان کے کپڑے کا انتظام کیا ہے حالانکہ سب سے پہلے اس قسم کا اقتصادی نظام اسلام نے جاری کیا تھا۔ اور عملی رنگ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہر گاؤں ہر قصبہ اور ہر شہر کے لوگوں کے نام رجسٹر میں درج کئے جاتے تھے۔ ہر شخص کی بیوی اس کے بچوں کے نام اور ان کی تعداد درج کی جاتی تھی۔ اور پھر ہر شخص کے لئے غذا کی بھی ایک حد مقرر کر دی گئی تھی۔ تاکہ تھوڑا کھانے والے بھی گذارہ کر سکیں اور زیادہ کھانے والے بھی اپنی خواہش کے مطابق کھا سکیں۔

تاریخوں میں ذکر آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابتداء میں جو فیصلے فرمائے اُن میں دودھ پیتے بچوں کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ اور ان کو اس وقت غلّہ وغیرہ کی صورت میں مدد ملنی شروع ہوتی تھی جب مائیں اپنے بچوں کا دُودھ چھڑا دیتی تھیں۔ ایک رات حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے گشت لگا رہے تھے۔ کہ ایک خیمہ میں سے کسی بچہ کے رونے کی آواز آئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں ٹھہر گئے۔ مگر بچہ تھا کہ روتا چلا جاتا تھا۔ اور ماں اُسے تھپکیاں دے رہی تھی کہ وہ سو جائے جب بہت دیر ہوگئی۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس خیمہ کے اندر گئے اور عورت سے کہا کہ تم بچے کو دُودھ کیوں نہیں پلاتیں یہ کتنی دیر سے رو رہا ہے؟ اس عورت نے آپ کو پہچانا نہیں۔ اس نے سمجھا کہ کوئی عام شخص ہے۔ چنانچہ اس نے جواب میں کہا کہ تمہیں معلوم نہیں۔ عمر نے فیصلہ کر دیا ہے کہ دودھ پینے والے بچے کو غذا نہ ملے۔ ہم غریب ہیں ہمارا گذارہ تنگی سے ہوتا ہے۔ میں نے اس بچے کا دُودھ چھڑا دیا ہے تاکہ بیت المال سے اس کا غلّہ بھی مل سکے۔ اب اگر یہ روتا ہے تو روتے عمر کی جان کو جس نے ایسا قانون بنایا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُسی وقت واپس آتے اور راستے میں نہایت غم سے کہتے جاتے تھے۔ کہ عمر! معلوم نہیں تُو نے اس قانون سے کتنے عرب بچوں کا دودھ چھڑا کر آئندہ نسل کو کمزور کر دیا ہے۔ ان سب کا گناہ اب تیرے ذمہ ہے۔ یہ کہتے ہوئے آپ سٹور میں آئے اور دروازہ کھولا اور ایک بوری آٹے کی اپنی پیٹھ پر اُٹھالی کسی شخص نے کہا کہ لائیے میں اس بوری کو اُٹھا لیتا ہوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ نہیں غلطی میری ہے۔ اور اب ضروری ہے کہ اس کا خمیازہ بھی میں ہی بھگتوں۔ چنانچہ وہ بوری آٹے کی انہوں نے اس عورت کو پہنچائی اور دوسرے ہی دن حکم دے دیا کہ جس دن بچہ پیدا ہو۔ اُسی دن سے اس کے لئے

غذا مقرر کیا جائے کیونکہ اُس کی ماں جو اسکو دودھ پلاتی ہے زیادہ غذا کی محتاج ہوتی ہے۔ اب دیکھو یہ انتظام اسلام نے شروع دن سے ہی کیاہے گو یہ نظام زیادہ دیر جاری نہیں رہا۔ مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ دنیا میں جتنے بڑے بڑے کام ہیں۔ اُن میں یہی قانون پایا جاتا ہے۔ کہ وہ کئی لہروں سے اپنی بلندی کو پہنچتے ہیں۔ ایک دفعہ وہ دنیا میں قائم ہو جاتے ہیں۔ تو کچھ عرصہ کے بعد پُرانے رسم و رواج کی وجہ سے مٹ جاتے ہیں۔ مگر دماغوں میں اُن کی یاد قائم رہ جاتی ہے اور ایک اچھا بیج دنیا میں بویا جاتا ہے اور ہر شریف اور منصف مزاج انسان تسلیم کرتا ہے۔ کہ وہ اچھی چیز تھی مجھے دوبارہ اس چیز کو دنیا میں واپس لانا چاہیئے۔ پس گو یہ نظام ایک دفعہ مٹ گیا مگر اب اسی نظام کو دوبارہ دنیا میں قائم کرنے کے لئے احمدیت کا درخت لگایا گیاہے۔ اور وہ دن دُور نہیں جب تمام دنیا اس کے شیریں اثمار کھا کر لذت حاصل کرے گی اور دنیا سے بھوک اور دُکھ مٹ جائیں گے اور دنیا جنت کا نمونہ ہوگی۔

پھر اسلامی حکومت کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ دوسروں کے ملک پر طمع کی نظر نہ رکھے چنانچہ فرمایا:۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۝ (طٰہٰ ع) یعنی اے مسلم تو اپنی آنکھیں دنیاوی منافع کی طرف جو تمہارے سوا دوسری اقوام کو ہم نے دئے ہیں۔ اُٹھا اُٹھا کر نہ دیکھ اور تیرے رب نے جو تجھے دیا ہے وہی تیرے لئے اچھا ہے اور زیادہ دیر تک رہنے والا ہے۔ یعنی مرنے کے بعد بھی وہی کام آئے گا۔ اور جو دوسری اقوام پر تعدّی کر کے مال لوگے تو وہ نفع نہیں دیگا اور نہ قائم رہے گا۔

گویا اسلام آج کل کی حکومتوں کے طریق عمل کے خلاف اِن اسباب سے روکتا ہے۔ کہ یونہی دوسرے ممالک پر حملہ کر کے اُن کو اپنے قبضہ میں لیا جائے ہاں اِن اسباب کی اجازت دیتاہے۔ کہ اگر اسلامی حکومت پر حملے ہوں یا حملوں کا خطرہ ہو تو اس کا دفاع کیا جائے (الحج ع) نیز یہ حکم دیا گیا ہے۔ کہ سرحدیں مضبوط رکھی جائیں (آل عمران ع) پھر اگر کوئی قوم حملہ کرے اور دفاع کے وقت مغلوب ہو جائے تو موجودہ حکومتوں کی طرح یہ اجازت نہیں دی گئی۔ کہ مفتوحین سے عدل نہ کیا جائے اور اُن کو معاف نہ کیا جائے بلکہ اسلامی حکومت کو یہی حکم ہے کہ وہ عدل سے کام لے۔ چنانچہ فرمایا:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ (مائدہ ع) اے مومنو! اپنے تمام کاموں کو خدا کے لئے سرانجام دو۔ اور انصاف سے دنیا میں معاملہ کرو۔ اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس امر پر نہ اکسا دے کہ تم عدل کا معاملہ نہ کرو تم بہرحال انصاف سے کام لو۔ یہ بات تقویٰ کے مطابق ہے اور اللہ تعالےٰ کو اپنی ڈھال بناؤ اللہ تعالےٰ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔

پس اسلام نے یہ حکم دیا ہے کہ:۔

(۱) کسی ملک کو غصب کرنے کیلئے حملہ نہ کرو۔

(۲) اگر دفاعی جنگ کرنی پڑے تب بھی دشمن کے

مغلوب ہونے پر انصاف سے کام لو۔

پھر یہ حکم ہے۔ کہ اگر دفاعی جنگ کرنی پڑے تو جب تک خون ریز جنگ نہ ہو۔ کوئی قیدی نہ پکڑے جائیں (انفال ع۹) اور جب خون ریز جنگ ہو جائے اور جنگی قیدی پکڑے جائیں۔ تو ان کے متعلق حسب ذیل احکام دئے گئے ہیں

جنگی قیدیوں کے متعلق اسلام کے احکام

۱۔ یا تو ان قیدیوں کو احسان کر کے چھوڑ دیا جائے (سورۂ محمد) اور یہ ایسے قیدیوں کے متعلق ہی ہو سکتا ہے۔ جو اپنی غلطی کا اقرار کریں اور آئندہ جنگ میں شامل نہ ہونے کا معاہدہ کریں۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ایک قیدی ابوعزہ نامی کو رہا کیا۔ یہ شخص جنگ بدر میں پکڑا گیا تھا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس سے یہ عہد لے کر چھوڑ دیا تھا۔ کہ وہ آئندہ مسلمانوں کے خلاف کسی جنگ میں شامل نہیں ہوگا۔ مگر وہ جنگ اُحد میں مسلمانوں کے خلاف پھر لڑنے کے لئے نکلا۔ اور آخر حمراءالاسد کی جنگ میں مارا گیا۔

۲۔ اگر اسلامی حکومت کی مالی حالت ایسی نہ ہو۔ کہ وہ احسان کر کے چھوڑ دے۔ تو پھر قیدی کو حق ہے کہ وہ فدیہ دے کر اپنے آپ کو چھڑا لے۔ لیکن اگر قیدی کو فدیہ کی طاقت نہ ہو۔ تو پھر حکم ہے کہ اسلامی ملک کی زکوٰۃ میں سے اگر ممکن ہو تو اس کا فدیہ دے کر اس کو آزاد کر دیا جائے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو۔ تو قیدی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ مکاتبت کرے یعنی حکومت سے یہ عہد کرے کہ وہ کمائی کر کے آہستہ آہستہ اپنا فدیہ دیدیگا اور اُسے آزاد کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ اس معاہدہ کے بعد فوراً آزاد ہو جائے گا اور قسط وار اپنا فدیہ ادا کر دے گا۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ پرانے زمانہ میں جنگیں افراد کرتے تھے۔ اور اپنے اخراجات جنگ وہ خود برداشت کرتے تھے۔ اس لئے ان کا بوجھ اتارنے کے لئے دوسری قوم سے تاوان نہیں لیا جاتا تھا۔ بلکہ افراد پر حسب طاقت تاوان ڈالا جاتا تھا۔ اب چونکہ قومی جنگ ہوتی ہے اور حکومت خرچ کی ذمہ وار ہوتی ہے۔ لازماً اس نظام میں بھی موجودہ حالات کے لحاظ سے تبدیلی کرنی ہوگی۔ اور قیدی سے تاوان نہیں لیا جائے گا۔ بلکہ حملہ آور قوم سے بحیثیت قوم تاوان لیا جائے گا۔

۳۔ جب تک تاوان جنگ ادا نہ کرے۔ اس سے خدمت لی جا سکتی ہے۔ لیکن کام لینے کی صورت میں مندرجہ ذیل احکام اسلام دیتا ہے۔

(ا) تم کسی قیدی سے اسکی طاقت سے زیادہ کام نہ لو

(ب) جو کچھ خود کھاؤ۔ وہی قیدی کو کھلاؤ۔ اور جو کچھ خود پہنو وہی قیدی کو پہناؤ۔

(ج) کسی قیدی کو مارا پیٹا نہ جائے۔

(د) اگر کوئی شادی کے قابل ہو۔ اور انہیں علم نہ ہو کہ کب تک وہ جنگی قیدی رہیں گے تو انکی شادی کر دو۔

یہ اصول نہایت ہی عادلانہ اور اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ اس زمانہ میں حکومتیں متمدن سمجھی جاتی ہیں لیکن جنگی قیدیوں کے ساتھ اُن کا سلوک اسلامی تعلیم کے مقابلہ میں بہت ہی ناقص ہے۔ مثلاً اُن کے ہاں احسان سے چھوڑنا نہیں پایا جاتا۔ تاوان جنگ لینا مقدم سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح خوراک اور پوشاک کے معاملہ میں انہیں وہ کچھ کھلایا اور پہنایا نہیں جاتا جو خود آزاد لوگ کھاتے پیتے اور پہنتے ہیں۔ پھر جنگی قیدیوں کی شادی کرانا تو کجا ان کی اپنی بیویوں کو بھی پاس آنے نہیں دیتے۔

الغرض اسلام کے پیش کردہ قوانین باقی تمام قوانین پر فضیلت رکھتے ہیں۔

پھر اسلام نے یہ حکم دیا ہے۔ کہ اگر جنگ ہو تو بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں اور مذہبی خدمت پر مامور لوگوں کو کچھ نہ کہا جائے۔ اسی طرح مذہبی عبادت خانوں کی حفاظت کی جائے (مسلم۔ طحاوی۔ ابوداؤد) نیز یہ بھی کہا ہے کہ مذہبی امور میں پوری آزادی ہونی چاہیئے۔ کسی پر جبر نہ کیا جائے۔

پھر بار بار قرآن کریم میں معاہدات کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔ آج کل کی حکومتیں معاہدات تو کر لیتی ہیں۔ لیکن خفیہ طور پر اُن کے ارادے کچھ اور ہوتے ہیں۔ لیکن اسلام یہ کہتا ہے۔ کہ اگر معاہدہ ہو۔ تو اس کی پابندی کرو۔ اور اگر خطرہ ہو کہ معاہد قوم شرارت کرے گی۔ تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اچانک اُس پر حملہ نہ کرو۔ بلکہ پہلے نوٹس دو کہ ہم معاہدہ ختم کرتے ہیں۔ کیونکہ تمہاری طرف سے معاہدہ کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ اس کا اعلان کرنے کے بعد اگر پھر بھی وہ باز نہ آئیں۔ تو پھر بے شک جنگ کر سکتے ہو۔ یونہی نہیں۔ چنانچہ فرمایا :۔

وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ (انفال ع) کہ اگر کسی معاہد قوم کی طرف سے یہ خطرہ ہو کہ وہ معاہدہ کی پرواہ کئے بغیر حملہ کر کے خیانت کی مرتکب ہوگی۔ تو مساوات کا لحاظ رکھ کر اُن کے عہد کو انہی کی طرف واپس پھینک دو۔ بیشک اللہ تعالیٰ دغا بازوں اور معاہدہ توڑنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ پھر فرمایا کہ اگر کوئی قوم صلح کرنا چاہے۔ تو صلح کر لینا۔ یہ نہیں کہ ان کا ضرور مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ فرماتا ہے :۔

وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (انفال ع) اے مسلم! اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف جھکو اور اللہ کی مدد اور اس کی حفاظت پر بھروسہ رکھو۔

پھر اسلامی حکومت کو یہ ہدایت کی گئی ہے۔ کہ کسی قوم کو حقیر نہ سمجھا جائے۔ جیسے آج کل کی متمدن کہلانے والی حکومتیں کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ فلاں کالے رنگ کے لوگ ہیں۔ اس لئے اُن کے انسانیت کے کوئی حقوق نہیں اور انکو ہم اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ (حجرات ع) کہ کوئی قوم دوسری قوم کو حقیر سمجھ کر اسکو پامال نہ کرے شاید وہ کل کو اس قوم سے اچھی ہو جائے۔

پھر چونکہ ضروری نہیں۔ کہ ایک وقت میں ساری دنیا میں ایک ہی نظام ہو۔ اس لئے قرآن کریم نے یہ تعلیم دی ہے کہ :۔

إِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۖ فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۚ فَإِن فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (حجرات ع) یعنی اگر دو قومیں آپس میں لڑ پڑیں تو انکی آپس میں صلح کرا دو۔ یعنی دوسری قوموں کو چاہیئے کہ بیچ میں پڑ کر اُن کو جنگ سے روکیں اور جو جنگ کی وجہ ہو اس کو مٹائیں اور ہر ایک کو اس کا حق دلائیں۔ لیکن اگر باوجود اس کے ایک قوم باز نہ آئے اور شترکہ انجمن کا فیصلہ نہ مانے۔ تو اس قوم سے جو زیادتی کرتی ہے سب دوسری قومیں مل کر لڑیں۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف لوٹ آئے یعنی ظلم کا خیال چھوڑ دے۔

پس اگر وہ اس امر کی طرف مائل ہو جائے۔ تو اُن دونوں قوموں میں صلح کرا دو۔ مگر عدل سے اور انصاف سے کام لو۔ اللہ تعالےٰ انصاف کرنیوالوں کو پسند کرتا ہے۔

اِن آیات سے مندرجہ ذیل اصول مستنبط ہوتے ہیں:-

۱- اگر دنیا میں کئی حکومتیں ہوں اور اُن میں سے کسی دو حکومتوں میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اسلامی اصول کی روشنی میں اُن کا فرض ہوگا۔ کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے ایسی لیگ بنائیں جو اُن دونوں میں صلح کرائے۔

۲- اگر صلح ہو جائے تو بہتر ورنہ باقی حکومتوں کی پنچائت مل کر ایک عادلانہ فیصلہ دے۔ جس کو ماننے کے لئے مخالف حکومت کو مجبور کیا جائے۔

۳- اگر ایسے فیصلہ کو کوئی فریق نہ ملنے یا ماننے کے بعد اس پر عمل کرنے سے انکار کر دے تو ساری طاقتیں مل کر اُس سے لڑیں اور اُسے مجبور کریں کہ وہ دنیا کے امن کی خاطر حکومتوں کی پنچائت کے فیصلہ کو تسلیم کرے۔

۴- جب اس پنچائتی دباؤ یا لڑائی سے وہ حکومت صلح کی طرف مائل ہو جائے۔ تو یہ حکومتوں کی پنچائت بغیر کسی ذاتی فائدہ اٹھانے کے صرف اس امر کے متعلق فیصلہ نافذ کرے جس سے جھگڑے کی ابتداء ہوئی تھی۔ اور مغلوب ہونے والی حکومت سے کوئی زائد فائدے اپنے لئے حاصل نہ کرے۔ کیونکہ اس سے نئے فسادات کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں۔

یہ اصول ایسے زرین ہیں کہ ان اصولوں کی موجودگی میں دنیا کی جنگوں کے امکان بالکل کم ہو جاتے ہیں۔ اور دنیا امن کا گہوارہ بن سکتی ہے۔

پھر اسلام نے مذہبی آزادی پر زور دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (بقرہ ع۳۴) دینی معاملات میں کوئی جبر نہیں ہونا چاہئے بلکہ پوری آزادی ہونی چاہیئے۔ جو شخص جبر کر کے دین میں داخل کیا جائے۔ وہ بے شک ظاہراً تو جماعت میں داخل ہو سکتا ہے لیکن دل سے اس جماعت کے عقائد کا قائل نہیں ہوتا اور نہ دل سے اُن کے ساتھ ہوتا ہے اور اسلام چونکہ دلائل سے قائل کرنے اور قلوب کو فتح کرنے کا حکم دیتا ہے اس لئے وہ لوگ جو دل سے اسلام کے قائل نہیں ہوتے اور دکھاوے کے لئے اسلام کو قبول کرتے ہیں۔ انکی بُرائی کو بیان کیا گیا ہے۔ اور ان کو منافق کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پس اسلام مذہبی آزادی پر زور دیتا ہے۔ اور بار بار یہ تعلیم دیتا ہے کہ اصل فتح دلائل کی فتح ہے نہ کہ اجسام کی فتح۔

خلاصہ کلام یہ کہ اسلام کے پیش کردہ نظام حکومت اور کفار کے نظام حکومت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اول الذکر اگر قائم ہو جائے تو دنیا امن کا گہوارہ بن سکتی ہے اور ثانی الذکر دنیا کے امن کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ جن فریقوں کے اصول میں اتنا بیّن فرق ہو۔ وہ کبھی متحد فی العبادۃ نہیں ہو سکتے۔

تیسرے معنے دِیْن کے اَلسِّیْرَۃُ کے ہیں اور سِیْرَۃُ الْاِنْسَانِ کی تشریح کرتے ہوئے لغت میں لکھا ہے کَیْفِیَّۃُ سُلُوْکِہٖ بَیْنَ النَّاسِ (اقرب) یعنی انسان کی سیرۃ کے یہ معنے ہیں کہ وہ لوگوں کے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے آیت لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کی یہ تشریح ہوگی۔ کہ اے منکرو! تمہارے لوگوں سے معاشرت کے طریق اور ہیں اور اسلام کے معاشرت کے طریق اور۔ اور یہ مسلمانوں اور اُن کے مخالفوں کا ایک بڑا اختلاف ہے۔

اس اختلاف کے ہوتے ہوئے کبھی دونوں فریق متحد فی العبادۃ نہیں ہو سکتے۔

اسلام کی رُو سے جو نیک سلوک دوسرے لوگوں سے کیا جائے وہ بھی عبادت کہلاتا ہے چنانچہ حدیث میں آتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے مُنہ میں ثواب کی نیت سے لقمہ ڈالے تو اس کا بھی خدا تعالےٰ ایسا ہی بدلہ دے گا جیسا کہ صدقہ کا۔ یعنی بیوی کے مُنہ میں لقمہ ڈالنا بھی عبادت سمجھا جائیگا۔ پس اسلام کی رُو سے بنی نوع انسان سے نیک سلوک بھی عبادت کا حصہ ہے اور جب اسلام کی تعلیم بنی نوع انسان سے نیک سلوک کرنے کے متعلق دوسروں سے مختلف ہے۔ تو لازماً مسلمان اس قسم کی عبادت میں غیر مسلموں کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ اسلامی حسن سلوک کے قائل نہیں۔

چوتھے معنے دین کے تدبیر کے ہیں اور لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ کا مفہوم اِن معنوں کے اعتبار سے یہ ہوگا۔ کہ اے منکرو! ہمارا اور تمہارا اتحاد فی العبادۃ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تمہاری تدبیر اور ہماری تدبیر میں بہت فرق ہے۔ تمہاری تدبیر اور رنگ کی ہے اور ہماری تدبیر اور رنگ کی۔

یہ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں ہر فرد کچھ نہ کچھ جدوجہد اور تدبیر کرتا ہے۔ کبھی اس لئے کہ وہ خدا تعالیٰ کو راضی کرے اور اس کی مشیت کو دنیا میں جاری کرے اور یہ تدبیر عبادت کہلاتی ہے۔ کیونکہ اس میں خدا تعالیٰ کی مشیت کو قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور کبھی بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے تدبیر ہوتی ہے اور اس میں خود اپنا نفس اور خاندان بھی مدنظر ہوتا ہے چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں وَلِنَفۡسِکَ عَلَیۡکَ حَقٌّ۔ یعنی خدا تعالےٰ نے ایک مسلم پر بعض ذمہ واریاں اس کے اپنے نفس سے حسن سلوک کے لئے ڈالی ہیں۔ اور کچھ ذمہ واریاں بیوی سے حسن سلوک کے لئے بھی ڈالی ہیں اور کچھ ذمہ واریاں اپنے پڑوسی سے حسن سلوک کے لئے ڈالی ہیں۔ پس ایک مسلم خواہ بظاہر اپنے نفس سے سلوک کرے یا اپنی بیوی سے سلوک کرے یا اپنے ہمسایہ سے حسن سلوک کرے۔ وہ اسلامی تعلیم کے مطابق عبادت میں شامل ہے۔ اور ان امور میں غیر مسلموں کی تعلیم اَور ہے اور اسلام کی تعلیم اَور۔ اس لئے اگر یہ عبادت ہے تو لازماً غیر مسلموں کے ساتھ مسلم اس قسم کی عبادت میں شریک نہیں ہو سکتا۔

پانچویں معنے دین کے مَا یُعۡبَدُ بِہِ اللّٰہُ کے ہیں۔ یعنی دین نام ہے ان تمام طریقوں کا جن کے ذریعے خدا تعالےٰ کی عبادت کی جاتی ہے۔ مثلاً مسلمانوں میں نماز پڑھنا یا حج۔ بیت اللہ کے لئے جانا اللہ تعالےٰ کی عبادت سمجھا جاتا ہے۔ یہ طریق عبادت عربی زبان کے لحاظ سے دین کہلائے گا۔ اِن معنوں کے اعتبار سے لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ کی تفسیر یہ ہوگی۔ کہ اے منکرو! تمہارے عبادت کے طریق اور ہیں اور میرے عبادت کے طریق اَور ہیں۔

چونکہ اسلام کے سارے عبادت کے طریق پُر حکمت ہیں اور اس کے مقابلہ میں جو عبادات غیر مذاہب نے بتلائی ہیں۔ وہ بغیر حکمت کے ہیں۔ اس لئے ایک مسلمان اپنے طریقوں کو چھوڑ کر اُن کے طریق کو اختیار نہیں کرے گا۔ اور غیر مذاہب والے چونکہ اسلام کو نہیں مانتے۔ اس لئے وہ اسلامی طریق عبادت کو اختیار نہیں کریں گے۔

ایک مسلمان تو معقول طور پر اُن کی عبادت میں شامل نہیں ہوگا اور دوسرے لوگ ضد اور مخاصمت

کی وجہ سے مسلمانوں کی عبادت میں شریک نہیں ہونگے پس مسلمانوں کی طرف سے لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کا اطلاق صحیح اور درست ہے۔

چھٹے معنے دین کے اَلْمِلَّۃُ کے ہیں۔ اَلْمِلَّۃُ کے ایک معنے شریعت اور مذہب کے ہیں۔ اور دوسرے معنے قومیت۔ قومی نظام اور جماعت بندی کے ہیں۔ پس لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کے معنے اس مفہوم کے اعتبار سے یہ ہوں گے کہ اے منکرو! تمہاری شریعت اور ہے اور میری شریعت اور۔ تمہاری جتھے بندی اور اصولوں پر مبنی ہے اور میرا قومی نظام اور اصولوں پر مبنی ہے۔ پس اس تفاوت کی بناء پر ہمارا تمہارا اجتماع فی العبادۃ ناممکن ہے۔

اگر مِلَّۃ کے معنے شریعت اور مذہب کے لئے جائیں۔ تو یہ امر واضح ہے کہ مشرکین کے پاس تو کوئی شریعت تھی ہی نہیں۔ سوائے چند رسم و رواج کی باتوں کے۔ اور وہ لوگ جو کسی مذہب کی طرف منسوب ہوتے ہیں اُن کے پاس جو کچھ شریعت کی باتیں ہیں۔ وہ اتنی نامکمل ہیں کہ انسانی زندگی میں پیش آمدہ مشکلات کا حل پوری طرح پیش نہیں کرتیں۔ لیکن اس کے خلاف اسلام کی پیش کردہ شریعت ایک مکمل شریعت ہے۔ اللہ تعالےٰ سورۂ مائدہ ع میں فرماتا ہے:-

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

اے مسلمانو! میں نے تمہاری شریعت کو مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنے احسان کو پورا کر دیا ہے۔ اور تمہارے لئے دین کے طور پر اسلام کو پسند کر لیا ہے پس اسلام کا دعویٰ ہے۔ کہ دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اس کی شریعت مکمل ہے اور جن امور کو دوسرے مذاہب نے چھوا تک نہیں، اسلام نے انکی جزئیات تک کو بیان کر دیا ہے۔ اور ایک مسلمان کیلئے جن امور میں راہنمائی کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ اُن سب کو مفصل طور پر واضح کر دیا اور ابدالآباد کے لئے اُسے اور شرائع سے مستغنی کر دیا۔

الغرض ایک مسلم اپنی اعلیٰ شریعت کی موجودگی میں رسم و رواج کی باتوں پر چلنے والوں یا غیر مکمل اور ناقص تعلیم رکھنے والوں کے ساتھ عبادت میں کیونکر شامل ہوسکتا ہے اور اس کی اُن کے پاس جاکر کیسے تسلی ہوسکتی ہے۔

دوسرا حصہ مِلَّۃ کے لفظ کا قومیت اور جتھے بندی کے مفہوم پر مشتمل ہے۔ کسی ملک یا قوم کے افراد کے اندر خواہ کتنی ہی ذمہ داری کا احساس ہو جب تک کسی کام کو اجتماعی رنگ میں نہ کیا جائے اس وقت تک عظیم الشان نتائج نہیں پیدا ہوسکتے۔ اسلام نے اس نقطہ کو بار بار پیش کیا ہے اور امت محمدیہ کو اس طرف توجہ دلائی ہے۔ کہ تمہارا ایک ہاتھ پر جمع رہنا ضروری ہے۔ تاکہ تم اس مقصد اور ذمہ داری کے لئے جو اللہ تعالےٰ نے تمہارے سپرد کی ہے اجتماعی رنگ میں کوشش کرسکو۔ ہماری نماز میں بھی اسی سبق کو دُہرایا گیا ہے۔ چنانچہ جب تک ایک امام نہ ہو۔ نماز نہیں ہوتی۔ اسی طرح اجتماعیت کی ہدایت کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:-

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران ع)

یعنی اے مسلمانو! خدا کی طرف سے نازل کردہ شریعت کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور اس کے ساتھ ہی تم ایک ہاتھ پر جمع رہو اور تمہارے اندر تفرقہ پیدا نہ ہو بلکہ اجتماعی رنگ ہو۔ تا تمہاری کوششیں صحیح ثمر لاسکیں۔

پس اسلام نظام اور اجتماعی زندگی پر زور

دیتا ہے اور اس بات کا حکم دیتا ہے کہ یہ ہر حال
میں قائم ہونی چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ارشاد
فرماتا ہے:۔

تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا
تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدۃ ع۱)

یعنی تمہاری اجتماعی کوششیں نیکی کے پھیلانے پر
صرف ہونی چاہئیں اور اس بات پر توجہ ہونی چاہیئے
کہ لوگوں کے دلوں میں تقوٰی پیدا ہو۔ اور گناہ اور
ظلم اور بدی کے کاموں میں ہرگز کسی کی مدد نہ کی جائے۔

اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کے متبعین
اور دوسری قومیں اس بات کو ضروری نہیں سمجھتیں۔
اور نہ اس کو محفوظ رکھتی ہیں۔ بلکہ اپنے ساتھی کے ساتھ
خواہ وہ ظالم ہی ہو مل جاتی ہیں۔ اور اس کو غالب کرنے کی
پوری کوشش کرتی ہیں۔ لیکن اسلام کی یہ تعلیم نہیں
بلکہ وہ کہتا ہے کہ کبھی بھی ایسے لوگوں کے ساتھ جو ظالم
ہوں تعاون نہ کیا جائے۔ اور اگر کوئی ظالم ہو۔ تو
اس کو ظلم سے روکا جائے۔ اور جو مظلوم ہو اس کی
مدد کی جائے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
فرماتے ہیں:۔

اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا فَقَالَ
رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنْصُرُهٗ اِذَا كَانَ
مَظْلُوْمًا اَفَرَءَیْتَ اِذَا كَانَ ظَالِمًا كَیْفَ
اَنْصُرُهٗ قَالَ تَحْجُزُهٗ اَوْ تَمْنَعُهٗ مِنَ الظُّلْمِ
فَاِنَّ ذٰلِكَ نَصْرُهٗ (بخاری کتاب الاکراہ)

یعنی اے مسلم تیرا فرض ہے۔ کہ تو اپنے بھائی کی
ہر حالت میں مدد کر خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ ظالم
ہونے کی صورت میں اس کے ہاتھ کو ظلم سے روکا جائے
اور اس کو جہنم کی آگ سے بچایا جائے اور مظلوم کی
امداد کرکے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو حاصل کیا جائے۔
عام طور پر لوگ اس اصول پر نہیں چلتے۔ بلکہ اپنا
اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔ لیکن اسلام کا یہ سنہرا اصل
زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے کہ نظام
کے ساتھ ساتھ نیکی اور تقوٰی کے پھیلانے کے لئے
کوششیں ہونی چاہئیں۔ جو تحریک نیکی پھیلانے کی
ہو اس کے ساتھ تعاون ہو اور کوشش کی جائے کہ
تمام لوگ اس میں شامل ہو جائیں۔ اور اگر کوئی تحریک
نقصان رساں اور ضرر رساں ہو۔ تو قطعًا اس کے ساتھ
تعاون نہ کیا جائے۔ پس جن لوگوں کا نقطۂ نظر یہ ہو
کہ جس بات میں کوئی فائدہ دیکھو اُدھر ہو جاؤ۔ خواہ
اس میں دوسرے لوگوں پر ظلم ہی ہوتا ہو۔ ان کے ساتھ
مسلمان کیونکر شامل ہو سکتے ہیں۔

ساتویں معنے اَلدِّیْن کے اَلْوَرَع کے ہیں
اور آٹھویں معنے اَلْمَعْصِیَةُ کے ہیں۔ وَرَع کے معنے
تقوٰی کے ہیں اور اَلْمَعْصِیَةُ کے معنے ہوتے ہیں
اطاعت سے نکلنا اور کسی امر کی خلاف ورزی کرنا گویا
وَرَع اور مَعْصِیَة دونوں ایک دوسرے کی ضد
ہیں۔ لیکن چونکہ اَلدِّیْن کے معنے جزاء سزا کے
بھی ہیں۔ اور جزا نیکی پر ملتی ہے اور سزا بدی پر۔
اس لئے دِیْن کے معنے تفصیلی رنگ میں وَرَع اور
مَعْصِیَة کے کر دیئے گئے ہیں۔

مذکورہ بالا معنوں کے اعتبار سے لَكُمْ دِیْنُكُمْ
وَلِیَ دِیْنِ کا مفہوم یہ ہوگا۔ کہ تمہارے لئے تمہارا طریق
تقوٰی ہے اور میرے لئے میرا طریق تقوٰی ہے۔ یعنی
میں تو اللہ تعالیٰ کا تقوٰی اختیار کرتا ہوں۔ اور تم
خدا تعالیٰ کی توحید کے منکر ہو اور بتوں سے ڈرتے ہو۔
اس لئے جبکہ دونوں کا ڈر مختلف ہستیوں سے ہے۔
اور دونوں کی امید مختلف ہستیوں سے ہے۔ تو ہماری
اجتماعی عبادت اکٹھی کس طرح ہو سکتی ہے۔ تم اپنے اعمال میں

بُتوں کی خوشنودی مدنظر رکھو گے۔ یعنی جو تمہارے باپ دادا نے ڈھکو سلے بنا رکھے ہیں کہ بتوں سے ان ان باتوں میں ڈرنا چاہیئے اور ان ان باتوں میں اُن سے امید رکھنی چاہیئے۔ تم اس کی پیروی کرو گے اور مَیں اپنے تمام اعمال میں اس امر کو مدنظر رکھوں گا کہ الٰہی کلام کے مطابق کن کن باتوں سے خدا تعالےٰ خوش ہوتا ہے اور کن کن باتوں سے وہ ناراض ہوتا ہے پس تمہارا اور میرا اتحاد فی العبادۃ کس طرح ہو سکتا ہے۔

نویں معنے اَلدِّین کے اَلْحَال کے ہیں۔ اس مفہوم کے اعتبار سے لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کے یہ معنے ہونگے۔ کہ تمہاری حالت اور ہے اور میری حالت اور۔ یعنی میرے روزمرہ کے کام اور اصول پر سرانجام رہے ہیں اور تمہارے روزمرہ کے کام اور اصول پر ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَأْ بِبِسْمِ اللّٰہِ فَھُوَ اَبْتَرُ۔ یعنی ہر کام جو اللہ کا نام لے کر نہ شروع کیا جائے وہ بے نتیجہ ہوتا ہے۔ گویا ہر کام میں خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا کیونکہ اس کی مدد کے بغیر انسان ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ اور اگر اس کی مدد شامل حال ہو۔ تو ایک کمزور آدمی بھی بہت کچھ کر جاتا ہے۔

پھر بسم اللہ کا حکم ہر کام سے پہلے دے کر گویا ایک مسلمان کو یہ بتایا گیا ہے۔ کہ اس کی ہر حرکت خدا تعالیٰ کے لئے ہونی چاہیئے۔ کیونکہ بُرے کام سے پہلے تو کوئی بھی بسم اللہ نہیں پڑھے گا۔ لازماً بسم اللہ ایسے ہی کام کے متعلق پڑھی جائے گی جس میں اللہ کی ذات بندہ کے ساتھ شریک ہو سکتی ہے۔ پس اس حکم کے ذریعہ سے اُن تمام بدیوں کی جن کے لوگ مرتکب ہوتے ہیں روک تھام ہو جائے گی۔ جب کوئی مسلمان بسم اللہ پڑھے گا۔ اور اس کا بُرا ارادہ ہو گا۔ تو فوراً اُسے یاد آجائے گا۔ کہ اس کو تو خدا تعالےٰ نے اس کام سے روکا ہوا ہے۔ اس لئے وہ لازماً اس سے رُک جائیگا۔ اور ناجائز کاموں کی طرف قدم نہیں بڑھائے گا۔

پھر بنی نوع انسان کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے عفو اور رحم کو مدنظر رکھے گا۔ کیونکہ اللہ کی صفات رحمٰن اور رحیم اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ بندے بھی اس کی مخلوق کے ساتھ رحم کا معاملہ کریں۔

پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہر کام کیلئے دعائیں سکھلائی ہیں۔ ان سے ایک طرف تو انسان کی توجہ اللہ تعالیٰ کیطرف رہتی ہے اور وہ دست در کار و دل با یار کا مصداق ہو جاتا ہے۔ دوسرے اس میں یہ حکمت ہے کہ کسی مسلمان کو کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیئے جو اللہ تعالےٰ کے حکم کے خلاف ہو۔ کیونکہ اگر وہ کوئی بات اللہ تعالےٰ کے حکم کے خلاف کر رہا ہوگا تو وہ دعا نہیں کر سکے گا۔ پس ایک مسلم کے روزمرہ کے اصول جن پر اس کے کام سرانجام پا رہے ہیں۔ وہ اَور ہیں اور دوسرے مذاہب والوں کے اَور۔ غیر مذاہب والے نہ جائز طریقوں کو دیکھتے ہیں نہ ناجائز کو۔ انکی ساری توجہ اسی طرف ہوتی ہے کہ کسی طرح سے اُن کا مقصد حاصل ہو خواہ کسی ذریعے سے ہو۔ اور خواہ اس ضمن میں ہزاروں لوگوں کی جانیں تلف ہو جائیں اور خدا تعالےٰ کی مخلوق کو تکلیف پہنچے۔ لیکن اسلام اس بات سے منع کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ۔ کہ مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے تمام لوگ محفوظ رہیں۔ اور اُن کو کسی قسم کا دُکھ نہ پہنچے۔ پس مسلمان اپنے روزمرہ کے کام اس نقطہ کو مدنظر رکھ کر کر رہا ہے کہ کسی کو دکھ نہ پہنچے اس کے مقابل ہر کافر نہ اس کا دھیان رکھتا ہے اور

نہ اس چیز کو کوئی اہمیت دیتا ہے۔ پس ان حالات میں مسلمانوں کا لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کہنا بالکل برمحل ہوگا۔

دسویں معنے اَلدِّیْن کے اَلشَّانُ کے ہیں۔ اور اَلشَّانُ کے معنے لغت میں اَلْخَطْبُ الْعَظِیْمُ کے لکھے ہیں۔ (اقرب) یعنی اہم کام۔ بہت بڑی مہم۔ اس مفہوم کے اعتبار سے لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کے معنے یہ ہوں گے۔ کہ اے منکرو! تمہارے لئے بھی تمہارا ایک اہم مقصد ہے اور میرے لئے بھی میرا ایک اہم مقصد ہے۔ تمہارے مدنظر بھی ایک سکیم اور مہم ہے اور میرے مدنظر بھی ایک سکیم اور مہم ہے۔ اور ہر دو سکیموں اور مقصدوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اس لئے ہمارا اجتماع ناممکن ہے۔

کافروں کا اہم مقصد کیا ہے؟ صرف یہ کہ لوگ رسم و رواج کے پیچھے چلیں۔ لیکن قرآن کریم اسبات کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ رسم و رواج کچھ چیز نہیں۔ بلکہ رسم و رواج کی تقلید ایک جہالت کی بات ہے اس کے مقابل پر مسلمانوں کا اہم مقصد یہ ہے۔ کہ تمام دنیا پر توحید پھیل جائے اور خدا تعالیٰ کی بادشاہت زمین پر پوری طرح قائم ہو جائے۔ اس کی نازل کردہ شریعت پر تمام لوگ چل پڑیں۔ اور مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے رہنے والے سب کے سب ایک ہی نقطۂ مرکزی پر جمع ہو جائیں۔ ایک ہی معبود ہو۔ اور ایک ہی رسول ہو اور ایک ہی شریعت۔ اور سب لوگ اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنے اندر لے لیں۔ تا دنیا جنگوں کی لپیٹ سے نکل کر امن کا گہوارہ بن جائے اور صرف ذاتی فوائد۔ خاندانی عزت اور قومی اور ملکی کوششوں کو ترک کرکے عالمگیر فوائد کے لئے سب انسان مل کر کوشش کریں اور ایک طرف اُن کا اللہ تعالیٰ سے کامل تعلق ہو اور دوسری طرف بنی نوع انسان کے حقوق پوری طرح ادا ہوں۔

یہودیت۔ عیسائیت اور دیگر مذاہب ایک ایک قوم کے لئے ہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کے لئے مبعوث کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (سبا ع ۳) اے ہمارے رسول ہم نے تجھے ساری دنیا کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔

پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔
اُعْطِيْتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ اَحَدٌ قَبْلِيْ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ وَجُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُوْرًا وَاُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَاُعْطِيْتُ الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً وَفِيْ رِوَايَةٍ بُعِثْتُ اِلَى الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ (مسند احمد جلد ۳ و بخاری کتاب التیمم)

یعنی مجھے پانچ ایسی خصوصیات عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی اور نبی کو نہیں دی گئیں۔ مجھے ایک ماہ کی مسافت تک خداداد رعب عطا کیا گیا ہے۔

(۲) میرے لئے تمام زمین مسجد اور طہارت کا ذریعہ بنائی گئی ہے

(۳) میرے لئے جنگوں میں حاصل شدہ مال غنیمت جائز قرار دیا گیا ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کو حکم تھا کہ جو اموال دشمن کے اُن کے ہاتھ آئیں۔ اُن کو جلا کر راکھ کر دیا جائے مگر مجھے اجازت دی گئی ہے کہ خواہ میں ان اموال کو اپنے ان فوجیوں میں تقسیم کر دوں جو بغیر کسی تنخواہ کے دفاع ملک کے لئے لڑتے ہیں۔ اور خواہ دشمن کو مال لوٹا دوں۔

۴۔ مجھے شفاعت کا مقام عطا کیا گیا ہے۔

۵۔ مجھ سے پہلے ہر نبی اپنی خاص قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا۔ مگر مجھے سب بنی نوع انسان کیلئے مبعوث کیا گیا ہے۔ اور ایک روایت میں یہ آتا ہے کہ میں اسود و احمر یعنی سیاہ و سفید سب کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔

پس محمدی سکیم یہ ہے کہ ساری دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے اور متفرق لوگوں کو جو دنیا کے خواہ کسی کونے میں رہتے ہوں۔ خدائے واحد کے آستانہ پر لا کھڑا کیا جائے تا سب کا ایک نقطۂ نگاہ ہو اور ایک ہی مقصد ہو۔ تا سب دنیا مساوی طور پر ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لَیْسَ لِلْعَرَبِیِّ عَلَی الْعَجَمِیِّ فَضْلٌ یعنی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا یہی مطلب ہے کہ سب قومیں جو عرب کے سوا ہیں۔ اُن کا بھی معیار اونچا کیا جائے۔ تا عربی اور عجمی سب ترقی کی راہوں پر گامزن ہوں۔ پس مسلمانوں کی سکیم سب دنیا کو بہترین پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی ہے۔

اس کے مقابل منکرینِ اسلام کی سکیم محض رسم و رواج کی ترویج یا ایک قوم اور خاندان کے لئے فائدہ حاصل کرنے کی جدّ و جہد ہے۔ پس ان حالات میں جبکہ دونوں فریقوں کا مقصود علیحدہ علیحدہ ہے۔ کیونکر اجتماع فی الحیلوۃ ہو سکتا ہے۔

گیارھویں معنے دِیْن کے اَلْعَادَۃُ کے ہیں۔ عادت اور سیرت درحقیقت ایک ہی مفہوم رکھتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے۔ کہ بعض اوقات انسان کوئی کام اس لئے کرتا ہے کہ اس کے اندر سے ایک رو پیدا ہوتی ہے اور بعض اوقات کوئی کام بیرونی اثرات کے ماتحت کیا جاتا ہے۔ پس جو کام تو اندرونی شعور کے ماتحت کیا جائے وہ سیرۃ کہلاتا ہے اور جو بیرونی اثرات کے ماتحت کیا جائے وہ عادت کہلاتا ہے۔ دِیْن کے ان معنوں کے لحاظ سے لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کا یہ مفہوم ہوگا کہ اے منکرو! تمہارے لئے تمہاری عادات ہیں اور میرے لئے میری عادات۔ یعنی تمہاری عادات میری عادات سے بالکل مختلف ہیں۔ تمہاری عادات اپنے باپ دادا کی تقلید کے ماتحت ہیں۔ جنہوں نے کسی عقلی وجہ پر اپنے لئے قانون نہیں بنایا تھا۔ لیکن میری عادات اُن احکام پر عمل کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہوئی ہیں۔ جو حکیم خدا کی طرف سے زبردست حکمتوں کے ماتحت نازل ہوتے ہیں۔ تم رسم و رواج کے بندے ہو۔ جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ اس کو اپنا لیا اور عادت بنا لیا۔ خواہ وہ عادات صریح طور پر تباہی کی طرف لے جانے والی ہوں۔

اس کے مقابل پر میری عادات کا منبع اللہ تعالےٰ کی صفات ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے یہ حکم دیا ہے صِبْغَۃَ اللّٰہِ (بقرہ ع ۱۶) یعنی تم اپنے اندر اللہ کی صفات پیدا کرو۔ سو میں نے اپنی عادات کو اللہ تعالیٰ کی صفات کے ماتحت ڈھالا ہے اور وہ عادات اس فطرۃ صحیحہ کے مطابق ہیں۔ جس کے متعلق اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا (سورۂ روم ع ۴) یعنی انسان فطرت صحیحہ پر پیدا کیا گیا ہے۔ اور پھر اسلام کے صحیح ماحول میں رہنے کی وجہ سے اس کی فطرت صحیح طور پر نشو و نما پاتی ہے اور الٰہی تعلیم کا پانی جب اُسے دیا جاتا ہے تو وہ بہترین نشو و نما پا کر بہترین پھل لاتا ہے۔ جس سے اسکے اپنے رشتہ دار و اقارب اور دیگر لوگ پورا فائدہ حاصل کرتے ہیں اور وہ بہترین سوسائٹی کا ایک بہترین فرد ہوتا ہے

لیکن تمہارے ہاں پیدا ہونے والا بچہ آتا تو بہترین فطرت کے ساتھ ہے۔ مگر اَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْ یُمَجِّسَانِہٖ اَوْ یُنَصِّرَانِہٖ (الطبرانی فی الجامع الکبیر بحوالہ جامع الصغیر) اگر وہ یہودیوں کے ہاں پیدا ہوتا ہے۔ تو اُن میں رائج شدہ عادات کو لے لیتا ہے اور اگر وہ مجوسیوں کے ہاں پیدا ہوتا ہے تو ان کی عادات کا عادی ہو جاتا ہے اور اگر وہ نصاریٰ کے ہاں جنم لیتا اور پرورش پاتا ہے تو اُن کی عادات کا حامل ہو جاتا ہے۔ گویا اس کا مذہب اس کے باپ دادا کا مذہب ہوتا ہے۔ وہ اپنے ماحول کا اثر لے لیتا ہے مشرک کے گھر پیدا ہونے والا بچہ اپنے مشرک والدین کے اثر کے ماتحت بتوں کو پوجنے لگتا ہے اور رسم و رواج کی تقلید کرنے لگتا ہے۔

پس تمہاری عادات اَور ہیں اور میری عادات اَور۔ عادات کا اتفاق بھی فریقین کے لئے ملنے کا ایک سبب اور وجہ بن جایا کرتا ہے۔ لیکن یہاں یہ وجہ بھی نہیں پائی جاتی۔ پس تمہارا راستہ اَور ہے اور میرا راستہ اَور۔ اس لئے ہم کسی طرح متحد فی العبادۃ نہیں ہو سکتے۔ اور ہماری طرف سے لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کا اعلان ایک کھلی حقیقت ہے۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جو محض عناد اور بُغض کی بناء پر کی گئی ہو۔

خلاصہ کلام یہ کہ سورۃ کافرون میں جو مسلمانوں کو کفار سے عبادت میں انقطاع کلّی کا حکم دیا گیا ہے تو اس کی مکمل وجوہات لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کے فقرہ میں بتائی گئی ہیں۔

ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام کی رو سے محض نماز کا نام عبادت نہیں۔ بلکہ تمام اخلاقی اور روحانی کام خواہ تمدن سے تعلق رکھتے ہوں یا سیاست سے یا معیشت سے۔ جب وہ خدا تعالےٰ کی خاطر کئے جائیں اور روحانی ترقی کے لئے کئے جائیں۔ تو وہ بھی عبادت ہی ہوتے ہیں۔ پس یہ جو اس سورۃ میں فرمایا گیا ہے۔ کہ میں تمہارے ساتھ مل کر عبادت نہیں کر سکتا۔ اس میں وہ تمام امور شامل ہیں۔ جو معیشت سیاست یا تمدّن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سب امور میں اسلام نے محبت۔ پیار۔ انصاف۔ نظم اور خدا تعالےٰ کی رضامندی کو مدنظر رکھ کر احکام دئے ہیں۔ لیکن دوسرے مذاہب نے یا تو صرف جبری احکام دئے ہیں۔ یا باپ دادا کی رسم و رواج کی تقلید کی ہے اور کروانی چاہی ہے۔ اس لئے عبادت یعنی خواہ وہ ایسی عبادت ہو جو نماز کا رنگ رکھتی ہے۔ یا ایسی عبادت ہو جو معیشت یا تمدن یا سیاست پر مشتمل ہو۔ لیکن ہو خدا تعالےٰ کو خوش کرنے کے لئے۔ اس میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کا اتحاد ناممکن ہے۔ کیونکہ دونوں کے اصول احکام ایک دوسرے سے بالکل متباین ہیں۔

الغرض قرآن کریم نے سب سے پہلے ایک حکم دیا۔ کہ ہر مسلمان کو یہ کھلم کھلا اعلان کرنا چاہیئے کہ وہ کافروں کے ساتھ کسی طرح متحد فی العبادۃ نہیں ہو سکتا پھر اس اعلان کی وجوہات لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کے الفاظ میں بیان کر دیں۔

لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کے الفاظ کتنے مختصر ہیں۔ لیکن اس کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ اگر اس مفہوم کو پوری تفصیلات کے ساتھ قلمبند کیا جائے تو اس سے ایک خاصے حجم کی کتاب تالیف ہو سکتی ہے درحقیقت یہ صرف عربی زبان کی ہی خوبی ہے۔ کہ وہ بعض اوقات اپنے ایک لفظ کے ساتھ اتنے بڑے مضمون کو بیان

کرجاتی ہے۔جو دوسری زبانوں میں پوری کتاب لکھنے سے بھی مکمل نہیں ہوتا۔اور یہ بات عربی کے اُمّ الالسنہ ہونے کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ سورۃ کافرون میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ سبق سکھایا ہے۔کہ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کی شریعت ہر طرح سے اکمل اور اعلیٰ ہے۔اُن کے عبادت کے طریق دوسرے مذاہب کی عبادت کے طریقوں سے افضل ہیں۔اُن کا معاشرہ اعلیٰ درجہ کا ہے۔اُن کے حکومت کے اصول بہترین ہیں۔ ان کا نظام جماعت نہایت عمدہ ہے اور ان کا مقصد حیات نہایت ہی مبارک ہے۔پس ان باتوں کے حامل شخص کا فرض ہے کہ وہ ہر موقعہ پر کفر کے سامنے ڈٹ جائے اور اسلام کی فضیلت کو ثابت کرے اور کبھی کسی رنگ میں بھی کفر سے مرعوب اور متاثر نہ ہو۔کیونکہ اگر وہ ایسا کرے گا تو دنیا تباہ ہو جائے گی۔اور اُسے کبھی بھی کامل نظام حاصل نہیں ہوگا پس مسلمان کا اس معاملے میں دوسروں سے علیحدہ ہونا ضد کی وجہ سے نہیں ہوگا۔بلکہ بنی نوع انسان کی خیر خواہی اور ترقی کے لئے ہوگا۔اس کے مقابلے میں دشمنوں کا ایسے پاکیزہ نظام سے الگ ہونا یا تو ضد کی وجہ سے ہوگا۔یا بنی نوع انسان کی ترقی سے آنکھیں بند کرنے کی وجہ سے ہوگا۔

سُوْرَةُ النَّصْرِ مَدَنِيَّةٌ

سورۃ نصر۔ یہ سورۃ مدنی ہے۔

وَهِيَ اَرْبَعُ اٰيَاتٍ مَعَ الْبَسْمَلَةِ

اور بسم اللہ کو شامل کر کے اس کی چار آیات ہیں [1]

[1] سورۃ نصر مدنی سورۃ ہے اور اس کے متعلق کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ سب مفسرین کا اس کے مدنی ہونے پر اتفاق ہے۔ (فتح البیان) ہاں وقتِ نزول کے متعلق تین روایات تفاسیر میں بیان ہوئی ہیں۔

پہلی روایت میں یہ ذکر آتا ہے کہ اِنَّ نُزُوْلَهَا عِنْدَ مُنْصَرَفِهٖ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ خَيْبَرَ (روح المعانی) کہ سورۃ نصر اس وقت نازل ہوئی جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ خیبر سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ اور غزوہ خیبر ۷ھ میں ہوئی ہے۔ گویا اس روایت کے لحاظ سے سورۃ نصر کا نزول ۷ھ میں ہوا ہے۔

دوسری روایت سورۃ نصر کے نزول کے متعلق یہ آتی ہے کہ ابن عباسؓ کہتے ہیں لَمَّا اَقْبَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ غَزْوَةِ حُنَيْنٍ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْهِ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (درمنثور) یعنی جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ حنین سے واپس تشریف لا رہے تھے اس وقت سورۃ نصر نازل ہوئی۔ فتح مکہ رمضان ۸ھ میں ہوئی ہے اور اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنگ حنین میں شامل ہوئے۔ کیونکہ فتح مکہ کے بعد ابھی آپ مکہ میں ہی قیام فرما تھے کہ آپ کو معلوم ہوا کہ ثقیف اور ہوازن کے قبیلے فساد پر تُلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ خبر ملتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان قبائل کی طرف روانہ ہوئے اور حنین کے مقام پر ان سے مقابلہ ہوا۔ پہلے تو مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ لیکن بعد ازاں اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد سے مسلمانوں کو فتح ہو گئی۔ اور مسلمان فاتحانہ شان سے واپس ہوئے۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ سورۃ نصر کے نزول کا وقت جنگِ حنین سے واپسی کا ہے گویا اس لحاظ سے اس سورۃ کا نزول ۸ھ میں ماننا پڑے گا۔

سورۃ نصر مدنی ہے۔

سورۃ نصر کے وقت نزول کے متعلق مختلف روایات

تیسری روایت اس سورۃ کے نزول کے متعلق یہ آتی ہے کہ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ هٰذِهِ السُّوْرَةُ نَزَلَتْ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْسَطَ اَيَّامِ التَّشْرِيْقِ بِمِنًى وَهُوَ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ (درمنثور) یعنی حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ یہ سورۃ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حجۃ الوداع کے موقعہ پر منیٰ کے میدان میں نازل ہوئی۔ (فتح البیان) اور اس سورۃ کے نزول کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف اسّی دن زندہ رہے اور بعض کہتے ہیں کہ ستر دن زندہ رہے۔

اِن سب روایات پر غور کرنے سے صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس سورۃ کا حجۃ الوداع کے موقعہ پر نازل ہونا ہی درست ہے۔ کیونکہ دوسری

روایات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں۔ چنانچہ درمنثور میں یہ روایت آتی ہے کہ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نُعِيَتْ اِلَىَّ نَفْسِىْ اَنِّىْ مَقْبُوْضٌ فِىْ تِلْكَ السَّنَةِ (درمنثور) یعنی ابن عباس کہتے ہیں کہ جب سورۃ نصر نازل ہوئی تو اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سمجھ لیا کہ چونکہ میرا کام اس دنیا میں خدا تعالیٰ کی توحید کو قائم کرنا اور اسلام کو پھیلانا تھا، اور اب جوق درجوق لوگ اسلام میں داخل ہونے لگ گئے ہیں اور اسلام دُنیا میں پھیل گیا ہے اسلئے جتنا کام خدا تعالیٰ نے لینا تھا وہ لے لیا ہے اور آپؐ اب خدا تعالیٰ کے پاس جانے والے ہیں اور آپؐ کی وفات کا وقت قریب ہے۔ پھر آپؐ کو خدا تعالیٰ کی طرف سے بتایا گیا کہ آپؐ اسی سال وفات پاکر اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ جائیں گے۔

مذکورہ بالا روایت سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اگر سورۃ نصر ۸ھ یا ۹ھ میں نازل شدہ ہوتی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ اَنِّىْ مَقْبُوْضٌ فِىْ تِلْكَ السَّنَةِ۔ یعنی میں اس سال وفات پا جاؤں گا کبھی بھی واقعات سے تطابق نہ پا سکتا کیونکہ آپؐ کی وفات ۱۱ھ میں ہوئی ہے اور ۸ھ میں اور ۱۱ھ میں تین چار سال کا فرق ہے نہ کہ ایک سال کا۔ آپؐ کے یہ الفاظ واقعات کے لحاظ سے تبھی درست ہو سکتے ہیں جبکہ آپؐ نے یہ الفاظ ۱۰ھ میں فرمائے ہوں۔ گویا حسابی لحاظ سے بھی حجۃ الوداع کا موقعہ ہی صحیح قرار پاتا ہے جب کہ یہ سورۃ نازل ہوئی۔ پس اس سورۃ کے حجۃ الوداع کے موقعہ پر نازل ہونے کی روایت ہی درست معلوم ہوتی ہے۔ اس روایت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ کی طرف منسوب شدہ پہلی روایت جس میں اس سورۃ کا جنگِ حنین سے واپسی پر نازل ہونا قرار دیا گیا ہے درست نہیں۔ کیونکہ ایک ہی شخص کے دو بیان بیک وقت نہیں ہو سکتے۔

دوسری روایت جو اس بات کا فیصلہ کر دیتی ہے کہ سورۃ نصر حجۃ الوداع کے موقعہ پر ہی نازل ہوئی تھی یہ ہے کہ اَنَّهَا لَمَّا نَزَلَتْ خَطَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ عَبْدًا خَيَّرَهُ اللّٰهُ بَيْنَ الدُّنْيَا وَبَيْنَ لِقَائِهٖ فَاخْتَارَ لِقَاءَ اللّٰهِ فَعَلِمَ اَبُوْبَكْرٍ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ فَقَالَ فَدَيْنَاكَ بِاَنْفُسِنَا وَاَمْوَالِنَا وَاٰبَائِنَا وَاَوْلَادِنَا (روح البیان وکشاف) یعنی جب سورۃ نصر نازل ہوئی اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا اور تمثیلاً یہ بتایا کہ اب آپؐ کی وفات کا وقت قریب ہے۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا ہے کہ خواہ وہ دُنیا میں رہے اور خواہ اللہ تعالیٰ کے پاس چلا جائے۔ تو اس بندے نے خدا تعالیٰ کے پاس جانے کو ترجیح دی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ اس تمثیل کو سمجھ گئے اور بے تاب ہو کر کہنے لگے۔ یا رسول اللہ آپ پر ہماری جانیں، ہمارے ماں باپ اور بیوی بچے سب قربان ہوں۔ آپ کے لئے ہم اپنے اموال اور دوسری سب چیزیں قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ گویا جس طرح کسی عزیز کے بیمار ہونے پر بکرا ذبح کیا جاتا ہے اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی اور سب عزیزوں کی قربانی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پیش کی اور خواہش کی کہ

کاش حضور جیتے رہیں اور ہماری قربانی قبول کرلی جائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبہ کا ذکر بخاری میں بھی آتا ہے۔ لیکن ان مذکورہ بالا الفاظ سے اسکے الفاظ کا قدرے اختلاف ہے۔ بخاری میں بیان شدہ خطبہ کے الفاظ یہ ہیں :۔

اِنَّ اللّٰهَ خَيَّرَ عَبْدًا بَيْنَ الدُّنْيَا وَ بَيْنَ مَا عِنْدَهٗ فَاخْتَارَ ذٰلِكَ الْعَبْدُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ۔ قَالَ۔ فَبَكٰى اَبُوْ بَكْرٍ فَعَجِبْنَا لِبُكَائِهٖ اَنْ يُّخْبِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ عَبْدٍ خُيِّرَ۔ فَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ الْمُخَيَّرُ۔ وَكَانَ اَبُوْ بَكْرٍ اَعْلَمَنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَمَنَّ النَّاسِ عَلَيَّ فِيْ صُحْبَتِهٖ وَمَالِهٖ اَبَا بَكْرٍ وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا غَيْرَ رَبِّيْ۔ لَاتَّخَذْتُ اَبَا بَكْرٍ خَلِيْلًا وَلٰكِنْ اُخُوَّةُ الْاِسْلَامِ وَمَوَدَّتُهٗ لَا يَبْقَيَنَّ فِي الْمَسْجِدِ بَابٌ اِلَّا سُدَّ اِلَّا بَابُ اَبِيْ بَكْرٍ۔ (بخاری باب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو اپنی رفاقت اور دنیوی ترقیات میں سے ایک کے انتخاب کی اجازت دی اور اس نے خدا تعالیٰ کی رفاقت کو ترجیح دی۔ دوسرے صحابہ تو اس تمثیل کو نہ سمجھ سکے لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی چیخیں نکل گئیں۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک ایسے بندے کا ذکر فرماتے ہیں جس کو اختیار دیا گیا ہے کہ خواہ وہ اس دنیا میں رہے اور فتوحات سے لذت اٹھائے اور خواہ اللہ تعالیٰ کے پاس آجائے۔ بھلا یہ کونسا رونے کا مقام ہے کیونکہ اسلام کی فتوحات کا وعدہ پیش کیا جارہا ہے۔ راوی بیان کرتا ہے کہ درحقیقت صحابہ کا قیاس درست نہ تھا۔ بلکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی خداداد فراست سے جو بات معلوم کرلی وہی درست تھی۔ کہ یہ تمثیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے متعلق ہے۔ اور یہ کہ آپ ہی وہ شخص ہیں جن کو اختیار دیا گیا تھا۔ اور آپ نے اللہ تعالیٰ کے پاس جانے کو پسند فرمایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا رونا برمحل تھا۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بے تابی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو آپ کی تسلی کے لئے فرمایا۔ ابوبکر ہی وہ شخص ہیں جنہوں نے سبقت قدمی کرتے ہوئے اپنے مال اور اپنی جان سے میری خدمت کی ہے اور اپنی قربانی کی وجہ سے یہ مجھے اتنے محبوب ہیں کہ اگر اللہ کے سوا کسی کو محبت کا انتہائی مقام دینا جائز ہوتا تو میں ان کو دیتا۔ مگر اب بھی یہ میرے دوست اور صحابی ہیں اور اسلامی رشتہ اور اسلام کی پیدا کردہ محبت ہمیں ملائے ہوئے ہے۔ پھر فرمایا کہ میں حکم دیتا ہوں کہ آج سے سب لوگوں کی کھڑکیاں جو مسجد میں کھلتی ہیں بند کردی جائیں سوائے ابوبکر کی کھڑکی کے۔ اور اس طرح آپ کے عشق کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے داد دی۔ کیونکہ یہ عشق کامل ہی تھا جس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بتادیا کہ اس فتح و نصرت کی خبر کے پیچھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر ہے۔ اور تبھی آپ نے بے اختیار ہوکر کہہ دیا فَدَيْنَاكَ بِاَنْفُسِنَا وَاَمْوَالِنَا

وَاَبْنَائِنَا وَاَوْلَادِنَا۔ کہ اے کاش ہماری اور ہمارے عزیزوں کی جانوں کو قبول کر لیا جائے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس دُنیا میں رہیں۔ بخاری کی شرح ارشاد الباری میں اس حدیث کے ماتحت لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خطبہ اپنی وفات سے تین دن قبل دیا تھا۔ گویا یہ خطبہ آخری وقت کا ہے۔ اور اس خطبہ کی بنا سورۃ نصر تھی۔ پس سورۃ نصر کا نزول بھی وفات کے عرصہ کے قریب ہی ماننا پڑے گا۔ وگرنہ یہ تو قیاس میں نہیں آ سکتا۔ کہ سورۃ نصر ۸ھ میں نازل ہو۔ اور آپ کو علم ہو جائے کہ اب میری وفات قریب ہے لیکن خطبہ تین چار سال بعد دیا جائے۔ اور وفات بھی تین چار سال بعد واقع ہو۔ پس مذکورہ بالا روایت کی موجودگی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سورۃ نصر وفات کے قریبی عرصہ میں نازل ہوئی تھی اور روایات کے مطابق وہ حجۃ الوداع کا موقع ہی بنتا ہے۔ گویا حج کے موقعہ پر سورۃ نصر نازل ہوئی اور حضورؐ نے یہ بات سمجھ لی کہ اب میری وفات کا وقت قریب ہے۔ اور وحی نے بھی اس کو متعین کر دیا۔ سو مدینہ پہنچ کر حضورؐ نے صحابہؓ کرام کو اس کی اطلاع دیدی اور چند ہی دنوں بعد داغِ مفارقت دے کر اللہ تعالیٰ کے حضور چلے گئے۔

سورۃ نصر کے وقت نزول کی تعیین میں مفسرین کی لغزش

تفاسیر میں بعض اور روایات بھی آتی ہیں۔ جو مذکورہ بالا بیان کی تصدیق کرتی ہیں چنانچہ تفسیر رُوح البیان میں لکھا ہے۔ قَالَ عَلِیٌّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ لَمَّا نَزَلَتْ هٰذِهِ السُّوْرَةُ مَرِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَخَرَجَ اِلَى النَّاسِ فَخَطَبَهُمْ وَوَدَّعَهُمْ ثُمَّ دَخَلَ الْمَنْزِلَ فَتُوُفِّيَ بَعْدَ اَيَّامٍ۔ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ جب سورۃ نصر نازل ہوئی تو اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بیماری کا حملہ ہوا۔ اور اس بیماری کے دوران میں آپ گھر سے باہر تشریف لائے اور صحابہ کے مجمع میں ایک تقریر فرمائی اور اپنی موت کی خبر دے کر ان کو الوداع کہا۔ پھر گھر تشریف لے گئے اور اس واقعہ کے چند ہی دنوں بعد آپ کی وفات ہو گئی۔ اِس روایت سے بھی ہمارے اُوپر کے بیان کی پوری تصدیق ہوتی ہے کہ یہ سورۃ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری ایام میں نازل شدہ ہے۔

ہمارے اکثر مفسر ایسے ہیں جنہوں نے اس واضح حقیقت کو چھوڑ کر محض ایک دوسرے کی تقلید کرتے ہوئے سورۃ نصر کو ۸ھ یا اس سے قبل کی نازل شدہ قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ تفسیر رازی میں لکھا ہے۔ اَلْاَصَحُّ هُوَ اَنَّ السُّوْرَةَ نَزَلَتْ قَبْلَ فَتْحِ مَكَّةَ۔ کہ صحیح بات یہ ہے کہ سورۃ نصر فتح مکہ سے قبل نازل ہوئی تھی۔ اسی طرح تفسیر روح البیان میں لکھا ہے۔ اِنَّ السُّوْرَةَ نَزَلَتْ قَبْلَ فَتْحِ مَكَّةَ كَمَا عَلَيْهِ الْاَكْثَرُ۔ کہ یہ سورۃ فتح مکہ سے قبل نازل ہوئی تھی۔ جیسا کہ اکثر مفسرین کی رائے ہے۔

یہ مفسرین جنہوں نے سورۃ نصر کے نزول کے متعلق ان روایات کو ترجیح دی ہے جن میں اسکے نزول کو فتح مکہ سے قبل بتایا گیا ہے۔ کسی چھان بین کے نتیجہ میں نہیں یعنی وہ تفتیش اور بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجہ پر نہیں پہنچے کہ یہ روایات درست ہیں۔ اور

دوسری غلطامیں۔ بلکہ اس کی وجہ درحقیقت ان کی ایک مشکل تھی جس کو وہ حل نہ کر سکے۔ اور مجبور ہو گئے کہ اس سورۃ کو فتح مکہ سے قبل کی نازل شدہ قرار دیں۔ اور وہ وجہ یہ تھی کہ عربی زبان میں یہ قاعدہ ہے کہ جب فعل ماضی سے پہلے اِذَا آجائے تو اس کے معنے عام طور پر مستقبل کے ہو جاتے ہیں اور چونکہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ کی آیت میں اِذَا فعل ماضی پر آیا ہے۔ اسلئے اِس آیت میں مفسرین نے مستقبل کے معنے کرتے ہوئے آیت کا یہ مفہوم قرار دیا۔ کہ اسلام کو آئندہ زمانہ میں فتح اور نصرت حاصل ہوگی اور یہ کہ اسلام میں کثرت سے لوگ داخل ہوں گے۔ اور چونکہ یہ ضروری ہے کہ پیشگوئی اس واقعہ سے پہلے ہو جس پر اس کو چسپاں کیا جاتا ہے۔ وگرنہ وہ پیشگوئی نہیں رہتی۔ اسلئے ایک طرف تو ہمارے مفسرین نے اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ کی آیت کو پیشگوئی قرار دیا۔ اور دوسری طرف انہوں نے اس آیت میں اَلْفَتْحُ سے مراد فتح مکہ اور رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا سے فتح مکہ کے بعد کثرت سے اسلام میں داخل ہونے والے لوگ مراد لے لئے۔ اب اگر مفسرین اس سورۃ کا نزول حجۃ الوداع میں مانتے تو یہ آیت پیشگوئی کی حامل قرار نہ پاتی۔ کیونکہ اس کا مصداق پہلے آچکا تھا۔ یعنی حجۃ الوداع سنہ ۱۰ھ میں ہوا ہے اور فتح مکہ سنہ ۸ ہجری میں۔ پس مفسرین کی بات تبھی بن سکتی تھی جب وہ یہ فیصلہ کرتے کہ سورۃ نصر فتح مکہ سے قبل نازل ہوئی تھی۔ کیونکہ ان کے نزدیک اس آیت کا مصداق فتح مکہ کا واقعہ تھا۔ پس وہ اِس بات پر مجبور ہو گئے کہ یہ قرار دیں۔ کہ سورۃ نصر کا نزول فتح مکہ سے پہلے ہوا تھا۔ وگرنہ اس کے بغیر ان کی تفسیر درست قرار نہ پا سکتی۔ حالانکہ یہ کوئی ضروری نہیں تھا کہ اگر اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ میں اَلْفَتْحُ سے مراد فتح مکہ ہی لی جاتی۔ کیونکہ فتح مکہ کی خبر قرآن کریم کی بعض دوسری آیات میں بڑی وضاحت سے آچکی ہے۔ اس لئے اُس فتح کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کسی خاص سورۃ کے نازل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مثلاً اللہ تعالےٰ نے پیشگوئی کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ (قصص ع ۱۲) یعنی اے محمد رسول اللہ تیرا خدا تجھے پھر مکہ میں واپس لائے گا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ وہ مکہ جس پر آپ کے دشمنوں کا قبضہ تھا۔ اس میں آپ اسی صورت میں واپس آسکتے تھے جبکہ وہ فتح ہو۔ اسی طرح آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ دُعا سکھلائی گئی کہ رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (بنی اسرائیل ع ۹) اب گو یہ ایک دُعا ہے مگر الہامی دُعا ہے۔ اور الہامی دُعا وہی ہو سکتی ہے جو واقعات کے مطابق ہو۔ بہرحال اس میں یہ دُعا سکھلائی گئی ہے۔ کہ الٰہی! میرا مکہ سے نکلنا بھی میری کامیابی کا موجب ہو اور ایسا نشان ہو جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہو۔ اور میرا مکہ میں واپس آنا بھی میری کامیابی کا موجب ہو اور ایسا نشان ہو جو ہمیشہ قائم رہے۔ پس فتح مکہ کی خبر چونکہ سورۃ نصر کے نزول سے بہت عرصہ پہلے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دی جا چکی تھی اسلئے ہمارے لئے کوئی مجبوری نہیں کہ ہم سورۃ نصر کو فتح مکہ پر

چسپاں کریں۔ اور اس لحاظ سے بھی ہم فتح مکہ پر اس کو چسپاں نہیں کر سکتے۔ کہ روایات سے ثابت ہے کہ یہ سورۃ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب نازل ہوئی تھی پس درحقیقت إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کے زمانہ کے متعلق پیشگوئی کی گئی ہے۔ یہ بتانے کے لئے کہ یہ فتوحات جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوئی ہیں ان کا سلسلہ صرف آپؐ کی حیات تک محدود نہیں بلکہ آئندہ بھی ان کا سلسلہ جاری رہے گا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں قیصر روما سے جنگ چھڑی اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کسریٰ اور قیصر کو مکمل طور پر شکست ہوگئی۔ پس إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ میں ان فتوحات کا ذکر تھا۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ہونے والی تھیں۔ اور یہی فتوحات آپؐ کی تسلی اور تشفی کا زیادہ موجب ہو سکتی تھیں کیونکہ انسان جب وفات کے قریب پہنچتا ہے تو اُسے خیال آتا ہے کہ میرا کام میری وفات کے بعد بھی جاری رہیگا یا نہیں۔ پس سورۃ نصر میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے۔ کہ آپ گھبرائیں نہیں۔ کیونکہ اسلام کی فتوحات کا سلسلہ بند نہیں ہوگا بلکہ جاری رہے گا۔ اور اسلام دُنیا پر غالب آجائیگا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا۔ کیونکہ آئندہ اسلام میں لوگ گروہ در گروہ داخل ہونے والے ہیں۔ اسلئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن مسلموں کے لئے دُعا کرنی چاہیئے۔ تا ان کی صحیح تربیت ہو کر اسلام میں کسی خرابی کی بنیاد نہ پڑے۔ اور اگر کوئی خرابی پیدا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح کا سامان پیدا کر دے۔

سورۃ نصر کے متعلق بعض مستشرقین یورپ کی آراء کی تردید

پادری وہیری نے اپنی کتاب کمنٹری آن قرآن میں سورۃ نصر کے ماتحت بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ گو یہ سورۃ مکہ میں بنائی گئی تھی (جیسے کہ جنگ حنین کے بعد نازل ہونے کی روایات بیان ہوئی ہیں) لیکن اس کا سٹائل اور طرز بیان مدنی سورتوں کے ساتھ ملتا ہے۔ پھر نولڈکے کی رائے بیان کرتا ہے کہ اس کی رائے یہ ہے۔ کہ یہ سورۃ اس وقت بنائی گئی تھی جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ پر حملہ کرنے کے لئے بالکل تیار تھے اور ان کو اپنی طاقت پر پورا بھروسہ تھا۔ اور آپ کو فتح کے آثار نظر آتے تھے۔ اس لئے یہ سورۃ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مذہب کی کامیابی کی امید کو ظاہر کرتی ہے۔

اس کے بعد وہیری لکھتا ہے کہ ان امور سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ سورۃ ۸ھ کی ہے۔

مستشرقین یورپ اور دیگر پادری صاحبان چونکہ قرآن کریم کو خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کتاب نہیں سمجھتے بلکہ وہ اس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی بنائی ہوئی کتاب قرار دیتے ہیں اسلئے وہ عام طور پر سورتوں کے سٹائل کو دیکھکر فیصلہ کرتے ہیں۔ کہ یہ مکی ہے یا مدنی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ فلاں سورۃ کا سٹائل اس قسم کا ہے جیسے مکی سورتوں کا ہوتا ہے اسلئے وہ مکی ہے۔ اور کبھی کہتے ہیں کہ فلاں سورۃ کا سٹائل ایسا ہے جیسے مدنی سورتوں کا ہوتا ہے اسلئے وہ مدنی ہے حالانکہ وہ اتنی عربی بھی نہیں جانتے کہ قرآن کریم کی عبارت سے صحیح نتائج اخذ کر سکیں۔ پس عربی زبان سے اتنی

کم واقفیت کے باوجود سورتوں کے سٹائل سے ان کے مکی اور مدنی ہونے کا استدلال کرنا محض ایک ڈھکوسلا ہوتا ہے۔ سورتوں کے سٹائل کو دیکھ کر مکی اور مدنی قرار دینے کا ان کے پاس صرف ایک ہی معیار ہوتا ہے کہ جن سورتوں کی آیات چھوٹی ہوتی ہیں اور اُن میں وزن کا خیال رکھا گیا ہے وہ مکی ہیں اور جن سورتوں کی آیات لمبی ہیں اور ان میں وزن کا خیال نہیں رکھا گیا وہ مدنی ہیں حالانکہ ان کے اس معیار کی تغلیط خود قرآن کریم سے ہی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سورۃ نوح مکی سورتوں میں سے ہے لیکن اس کی آخری آیت خاصی لمبی ہے۔ اسی طرح سورۃ دہر مدنی ہے لیکن اس میں وزن کا خیال رکھا گیا ہے۔ اور اس کی آیات بہت لمبی بھی نہیں ہیں۔ اسی طرح سورۃ انفال کے بعض ٹکڑے ایسے ہیں۔ جن کے متعلق اگر سٹائل کو مدنظر رکھا جائے تو انہیں مکی قرار دینا پڑے گا۔ جیسے یہ آیت کہ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (انفال ع ۶) اگر سٹائل کو مدنظر رکھ کر سورتوں کے مکی اور مدنی ہونے کا فیصلہ کیا جائے تو یہ سورۃ مکی ہونی چاہیئے۔ حالانکہ یہ آیت سورۃ انفال میں ہے جو قطعی طور پر مدنی ہے۔ بلکہ اس وقت کے قریب نازل ہوئی تھی جب مکہ فتح ہوا تھا۔ پس سٹائل والی باتیں محض ڈھکوسلہ ہیں۔ نہ یہ کوئی قانون ہے اور نہ مستشرقین کو اتنی عربی آتی ہے۔ کہ ان کی بات کو معقول قرار دیا جا سکے۔ وہیری کے خود ساختہ غلط معیار پر جب سورۃ نصر پوری نہیں اُتری تو اس نے کہہ دیا کہ گو یہ سورۃ مکہ میں بنائی گئی تھی۔ لیکن اپنے سٹائل کے لحاظ سے یہ مدنی سورتوں سے ملتی ہے حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم خدائے علیم و خبیر کی نازل کردہ کتاب ہے اور یہ کسی انسان کی بنائی ہوئی نہیں ہے اور کسی خاص جگہ و مقام کی وجہ سے اس کے طرزِ بیان پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پس سٹائل سے کسی سورۃ کے مکی اور مدنی ہونے کا اندازہ لگانا ایک غلط طریق ہے۔ جس کو مستشرقین نے اختیار کیا ہے

وہیری نے نولڈکے کی اس رائے کو بھی لکھا ہے۔ کہ یہ سورۃ اس وقت بنائی گئی تھی جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ پر حملہ کے لئے تیار تھے۔ اور آپؐ کو اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ گویا یہ بتانا مقصود ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حالات کو دیکھ کر کہہ دیا کہ آپ کامیاب ہو جائیں گے نولڈکے کی یہ رائے بھی محض تعصب کی بناء پر ہے۔ بھلا اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورۃ آئندہ حالات کو قیاس کر کے بنائی تھی۔ تو آپؐ نے ابتدائی مکی زندگی میں یہ قیاس کس طرح کر لیا کہ میری مخالفت اس قدر شدت اختیار کر جائیگی۔ کہ ایک وقت وہ بھی آجائے گا۔ جب آپؐ مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوں گے اور ہجرت کے کچھ عرصہ بعد فاتحانہ شان میں مکہ میں داخل ہوں گے۔ اور پھر مکہ کو آپؐ مرکز نہیں بنائیں گے بلکہ مدینہ میں ہی قیام فرمائیں گے۔ ایک انسان تو یہ بھی نہیں جانتا کہ آئندہ آنے والے دن میں کیا وہ زندہ بھی رہے گا یا نہیں۔ لیکن اتنی تحدی سے ایسے حالات کا بیان کرنا جو واہمہ میں بھی نہیں آسکتے۔ کسی قیاس کی بناء پر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ سورۃ البلد جو مکی سورۃ ہے اور مستشرقین اس کو ابتدائی مکی قرار دیتے ہیں۔ اس میں لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّ

بِهٰذَا الْبَلَدِ کے الفاظ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے ہجرت کرنے اور پھر مکہ کو فتح کرکے اس میں عارضی قیام کی خبر دی گئی ہے۔ اسی طرح سورۃ قصص مکی سورۃ ہے۔ اور اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی پیشگوئی ہے۔ اور اس کے بعد کہا گیا ہے۔ کہ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ (قصص) اے محمد رسول اللہ وہ خدا جس نے تجھ پر قرآن نازل کیا ہے وہ تمہیں فاتحانہ شان سے واپس مکہ لائے گا۔ پس یہ ساری باتیں غیب کی ہیں۔ جو انسانی قیاس میں نہیں آسکتیں۔ اور نہ انسانی دماغ ان کو سوچ سکتا ہے پس ان غیب کی باتوں کو سامنے رکھ کر اس بات کو ماننے بغیر چارہ نہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا تعلق خدائے علیم و خبیر سے تھا اور اس خدا نے ہی آپ کو یہ باتیں بتائی تھیں۔ اور اس قسم کی باتیں دو تین نہیں بلکہ بیسیوں ہیں۔ جن سے قرآن کریم بھرا پڑا ہے۔ اور ایک غیر متعصب انسان جب ان باتوں پر ادنیٰ سا بھی غور کرتا ہے۔ تو اس کے منہ سے بے ساختہ یہ نکل پڑتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے سچے رسول تھے۔

پھر جنگ احزاب کو ہی لے لو۔ اس میں سب قبائل عرب مدینہ میں حملہ کرنے کے لئے اکٹھے ہوگئے۔ مسلمان ان کے مقابلے میں کچھ حقیقت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کی حفاظت ہوئی اور ان کے مخالفین خود ہی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور مسلمانوں کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ ان سب حالات کی خبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں دی گئی۔ جب کہ یہ قیاس بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ آپ ہجرت کریں گے اور پھر ہجرت کے بعد مقابلے ہوں گے۔ اور عرب اپنی ساری طاقت سے مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے جمع ہو جائیں گے۔ مگر وہ پسپا ہوں گے چنانچہ ان سارے حالات کو سورۃ قمر میں جو مکی سورۃ ہے سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ کے الفاظ سے ادا کیا گیا ہے۔ اس جنگ میں اپنے بچاؤ کے لئے مسلمان خندق کھود رہے تھے اور ایک جگہ پتھر آگیا۔ اور وہ ٹوٹتا نہیں تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی گئی۔ آپ خود توڑنے کے لئے تشریف لائے اور آپ نے کدال مارا۔ اور پتھر سے آگ نکلی تو آپ نے زور سے اللہ اکبر کہا۔ پھر دوسرا کدال مارا تو پھر آگ نکلی اور آپ نے اللہ اکبر کہا۔ پھر تیسرا کدال مارا اور آگ نکلی تو آپ نے اللہ اکبر کہا اور پتھر ٹوٹ گیا۔ لوگوں نے سوال کیا۔ یا رسول اللہ آپ نے اللہ اکبر کیوں کہا؟۔ فرمایا۔ پہلی دفعہ مجھے کسریٰ کے محلات دکھائے گئے۔ اور مجھے جبریل نے بتایا۔ کہ میری اُمت ان پر قابض ہوگی۔ اور دوسری مرتبہ روم اور شام کے سُرخ محلات کا مجھے نظارہ کرایا گیا۔ اور بتایا گیا کہ یہ بھی میری اُمت کے قبضہ میں آئیں گے۔ پھر تیسری مرتبہ صنعاء کے محلات مجھے دکھائے گئے۔ اور بتایا گیا کہ یہ بھی مسلمانوں کو ملیں گے۔

(کامل ابن اثیر)

الغرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے وقت میں فتوحات کی خبریں دیں بلکہ یہ باتیں

قیاس میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔

پھر اس کے بعد ایسے حالات بھی پیش آئے جن میں بظاہر فتح کا سوال نہ تھا۔ بلکہ قیاس سے کام لینے والے منافق یہ کہتے تھے مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا۔ کہ محمد رسول اللہ کے سب وعدے محض فریب ہی تھے۔ اسی طرح منافق کہتے تھے۔ يَٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا (احزاب) کہ اے مدینہ والو۔ اب تمہارے لئے زمین تنگ ہوگئی ہے۔ تم اپنے آپ کو ختم سمجھو۔ تم عرب قبائل کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اسلئے اپنے دین کی طرف لوٹ آؤ۔ لیکن مخالف حالات کے باوجود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سچی ہوئیں اور قیاس کرنے والوں کے قیاسات غلط ثابت ہوئے۔ عرب قبائل میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مسلمانوں کو کوئی آنچ نہ آئی اور اس کے بعد ایسے حالات ہوئے کہ مکہ فتح ہوا۔ اسلام نے ترقی کی اور کسریٰ اور قیصر کے محلات مسلمانوں کے قبضہ میں آئے۔ وہیری اور اسکے ہم خیال یہ بتائیں کہ کیا یہ قیاسات ہیں؟

پھر ان باتوں کو بھی جانے دیجئے۔ ممکن ہے کوئی کہہ دے کہ یہ باتیں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بنالیں۔ لیکن ان خبروں کے متعلق کیا کہو گے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری زمانہ کے متعلق بیان فرمائیں۔ مثلاً فرمایا۔ کہ ایک زمانہ ایسا آئیگا جبکہ مسلمان نام کے مسلمان رہ جائیں گے۔ اور اسلامی حکومتیں ختم ہوجائیں گی۔ اور عیسائی کثرت سے پھیل جائیں گے۔ اور آخر اللہ تعالےٰ اسلام کو دوبارہ ترقی دینے کے لئے مہدی اور مسیح کو مبعوث کرے گا۔ پس، وہیری اور اسکے متبعین بتائیں کہ یہ خبریں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قیاس سے معلوم ہوگئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو امور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے وہ سب خدائے علام الغیوب سے معلوم کرکے بتائے۔ وہ آپ کا قیاس نہیں تھا۔ پس سورۃ نصر کے متعلق یہ کہنا کہ یہ حالات کو دیکھ کر بنائی گئی تھی محض تعصب یا غلط فہمی ہے۔

وہیری نے سورہ نصر کا زمانۂ نزول سنہ ۸ھ مقرر کیا ہے۔ یہ زمانۂ نزول ہماری تحقیقات کے لحاظ سے گو غلط ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اگر یہی زمانۂ نزول مانا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا۔ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کہا تھا وہ پورا ہوا۔ اور جو بات سورۃ نصر میں بیان ہوئی تھی کہ گروہ در گروہ لوگ اسلام میں داخل ہوں گے وہ سنہ ۱۰-۹ھ میں پوری ہوگئی۔ اور یہ بات واضح ہوگئی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ہماری بیان کردہ ترتیب کے مطابق یہ سورۃ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ساتھ خاص طور پر تعلق رکھتی ہے۔ کیونکہ ہماری تحقیقات میں تیسویں پارے کے آخر میں سورتوں کی ترتیب اس طور پر ہے۔ کہ ایک سورۃ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ اولیٰ کا ذکر ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد آنے والی سورۃ میں آپؐ کی بعثتِ ثانیہ کا۔ چنانچہ یہ ترتیب سورۃ البیّنہ سے شروع ہوتی ہے۔ سورۃ البیّنہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ اولیٰ کا ذکر تھا۔ اور سورۃ الزلزال میں آپؐ کی بعثتِ ثانیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس طرح

آگے ترتیب چلتی چلی گئی ہے لیکن اس سے یہ مراد نہیں۔ کہ جس سورۃ میں اسلام کے ابتدائی زمانہ کا ذکر آتا ہے اس میں آخری زمانہ کا ذکر نہیں ہوتا اور نہ یہ کہ جس سورۃ میں اسلام کے آخری زمانہ کا ذکر آتا ہے اس میں ابتدائی زمانہ کا ذکر نہیں ہوتا۔ بالعموم دونوں ہی ذکر ہوتے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ ایک سورۃ میں مدنظر اسلام کا ابتدائی زمانہ ہوتا ہے اور دوسری سورۃ میں خصوصیت کے ساتھ مدنظر اسلام کا آخری زمانہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی ترتیب کے پیش نظر یہ بتایا جا چکا ہے۔ کہ سورۃ نصر سے پہلی سورۃ یعنی سورۃ کافرون میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ثانیہ کا ذکر ہے ـــــ یعنی اس کا مضمون اس موجودہ زمانہ پر زیادہ چسپاں ہوتا ہے۔ ہماری اس ترتیب کے مطابق سورۃ نصر کا مضمون رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ پر زیادہ چسپاں ہونا چاہیئے۔ گویا یہ سورۃ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے لئے مقصود اوّل ہے۔

سورۃ نصر کا پہلی سورۃ کو تعلق۔

اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے یہ تعلق ہے کہ سورۃ کافرون میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو یہ حکم تھا۔ کہ وہ اعلان کر دیں کہ وہ اسلام کے منکروں کے معبودوں کی عبادت نہیں کر سکتے اور نہ ان عبادت کے طریقوں کو اختیار کر سکتے ہیں جن کو اسلام کے منکرین اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح کفار کے متعلق یہ بیان تھا۔ کہ وہ اپنے عبادت کے طریقوں کو چھوڑنے والے نہیں۔ اس کے بعد سورۃ نصر کو رکھ کر اس لطیف مضمون کو بیان فرمایا ہے کہ تھوڑے عرصہ میں اسلام کو عظیم الشان فتوحات حاصل ہونے والی ہیں۔ اور جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اتباع عملی طور پر یہ دیکھ لیں گے کہ جو طریق انہوں نے اختیار کیا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کی تائید کی ہے۔ تو کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اس طریق کو اختیار کریں جس کے ساتھ خدا نہیں۔ اور پھر جو شکست خوردہ طریق بھی ہے۔ اسی طرح جب کفار دیکھ لیں گے کہ ان کی جماعت ٹوٹ گئی اور تمام کارآمد لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملے۔ تو وہ بھی خواہ فطرتاً شرک کے حق میں ہوں مگر ان کی ضمیر ان کو مجبور کر کے اسلام میں داخل کر دے گی پس گو وہ ظاہر میں مسلمانوں کا طریق عبادت اختیار کریں گے مگر درحقیقت یہ خدائی معجزہ کے ماتحت ہوگا۔ ان کی اپنی مرضی سے نہیں۔ اگر اپنی مرضی پر انہیں رہنے دیا جاتا۔ تو اپنے آباؤ اجداد کی تعلیم کے مطابق کبھی وہ اسلامی عبادت اختیار نہ کرتے۔

اسی طرح سورۃ نصر کا سورۃ کافرون کی آخری آیت کے ساتھ بھی ایک تعلق ہے اور وہ یہ کہ سورۃ کافرون کی آخری آیت میں یہ کہا گیا تھا۔ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۔ کہ اے کافرو! تمہارے نزدیک غلبہ کا مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی تمہارے مذہب سے ذرا اِدھر اُدھر ہوا۔ تم لٹھ لیکر کھڑے ہو گئے۔ اس کو مارا پیٹا اور اس کی جان لینے کے درپے ہو گئے۔ اور اس کو جبر و اکراہ سے اپنے بتوں اور معبودوں کی طرف لانے کی کوشش کی۔ اور ہر طرح کا ظلم روا سمجھا۔ لیکن اسلام ایسے غلبہ کو غلبہ نہیں بلکہ شکست سمجھتا ہے۔ اور اسلام کے نزدیک غلبہ کا مفہوم یہ ہے کہ ایسے دلائل پیش کئے جائیں جو دل و دماغ پر قابو پالیں اور ایک ہوشمند انسان ان دلائل کے سامنے ہتھیار ڈال دے اور ہمیشہ کے لئے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

(میں) اللہ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ○

جب اللہ کی مدد اور کامل غلبہ آجائے گا۔ ؎۲

غلام ہوجائے۔ اور یہ کہ مذہب کے بارہ میں جبر سے کام لینے کی بجائے دلائل و براہین سے کام لینا چاہیئے۔ اور مذہب کے اختیار کرنے میں پوری آزادی ہونی چاہیئے۔ اے کافرو! تم نے اپنے ہتھیار کو استعمال کیا۔ اور مسلمانوں نے اپنے ہتھیار کو استعمال کیا۔ اب تھوڑے دنوں میں نتیجہ نکل آئے گا۔ کہ باوجود تمہارے پورے جبر کے تمہاری ساری قوم ٹوٹ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں آگریگی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تمہاری قوم مسلمان ہوجائے گی تو مسلمانوں کو تمہارے ساتھ شامل ہونیکی ضرورت نہیں رہے گی۔ پس جو دعویٰ سورۃ کافرون کی آخری آیت میں کیا گیا تھا وہ ثابت ہوجائیگا۔ کہ غلبہ کے متعلق کفار کا نظریہ اَور ہے اور مسلمانوں کا اَور ہے۔ لیکن سچا نظریہ وہی ہے جو مسلمانوں کا ہے کہ وہی جیتے گا جو دلیل سے کام لے گا۔ اور تلوار اور سونٹا ناکام رہیں گے۔

؎۲ **حل لغات**:۔ نَصَرَ۔ نَصَرَ الْمَظْلُوْمَ نَصْرًا کے معنے ہوتے ہیں اَعَانَهٗ یعنی مظلوم کی مدد کی۔ اور جب نَصَرَ فُلَانًا عَلٰى اَعْدَائِهٖ وَمِنْ عَدُوِّهٖ کہیں تو معنے ہوں گے نَجَّاهُ عَنْهُ وَخَلَّصَهٗ وَاَعَانَهٗ وَقَوَّاهُ عَلَيْهِ۔ کہ فلاں نے فلاں کی مدد کرکے اس کو اس کے دشمن سے نجات دلادی۔ اور دشمن پر غالب کردیا (اقرب)

اَلْفَتْحُ:۔ فَتَحَ الْحَاكِمُ بَيْنَ النَّاسِ کے معنے ہوتے ہیں قَضٰى۔ حاکم نے لوگوں کے درمیان فیصلہ کردیا کہ کون حق پر تھا اور کون ظالم۔ اور جب فَتَحَ السُّلْطَانُ دَارَ الْحَرْبِ کا فقرہ بولیں تو مراد یہ ہوگی۔ کہ غَلَبَ عَلَيْهَا وَتَمَلَّكَهَا یعنی بادشاہ اس علاقہ پر غالب آگیا جس سے جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ نیز فَتَحَ کے معنے ہوتے ہیں۔ اس نے کوشش کی۔ وَاَقْبَلَتْ عَلَيْهِ الدُّنْيَا اور دُنیا اس کے قدموں میں آگری۔ اور جب فَتَحَ اللّٰهُ عَلٰى نَبِيِّهٖ فَتْحًا کہا جائے تو مطلب یہ ہوگا۔ کہ نَصَرَهٗ۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی کی مدد کی۔ اور اس کو اس کے مخالفوں پر غالب کردیا۔ (اقرب)

مفردات امام راغب میں لکھا ہے۔ اَلْفَتْحُ اِزَالَةُ الْاِغْلَاقِ وَالْاِشْكَالِ۔ روکاوٹ اور بند کو دُور کردینا فتح کہلاتا ہے۔ یعنی جب کسی چیز کے آنے کا راستہ بند ہو اور پھر اس کا رستہ کھول دیا جائے تو اس وقت فتح کا لفظ بولتے ہیں (مفردات)

پس اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ کے معنے ہوں گے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ کی نصرت و

نَصَرَ

اَلْفَتْحُ

اعانت آجائے گی۔ اور اللہ تعالیٰ اس بند کو توڑ دے گا جس کی وجہ سے کفار اسلامی طریق عبادت کو قبول نہیں کرتے تھے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ فوج در فوج لوگ اسلام میں داخل ہونے شروع ہو جائیں گے۔ کیونکہ کفار کی فطرتیں بدل دی جائینگی۔ اور اُن کی ضمیر پر اسلام کو غلبہ دیدیا جائیگا۔

تفسیر: قبل ازیں یہ بتایا جا چکا ہے۔ کہ یہ سورۃ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف ستر دن پہلے نازل ہوئی تھی۔ اور یہ کہ اس سورۃ کے نازل ہونے کے ساتھ ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ علم بھی دیدیا گیا تھا کہ اب آپ کی وفات کا وقت قریب ہے۔ یہ طبعی بات ہے۔ کہ جب کسی شخص کو یہ معلوم ہو جائے۔ کہ وہ عنقریب اپنے رشتہ داروں، عزیزوں اور اقرباء کو چھوڑ کر اس دنیا سے جانے والا ہے۔ تو وہ اس لحاظ سے متفکر ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد اسکی اولاد، اس کے عزیزوں، رشتہ داروں اور متعلقین کا کیا بنے گا۔

سورۃ فتح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلام کی حفاظت اور ترقی کا پیشگوئی

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام بخشا تھا۔ اس لحاظ سے آپ کو اپنے جسمانی عزیزوں اور اقرباء کے متعلق تو کوئی فکر و تردد نہیں ہوسکتا تھا۔ ہاں اگر خیال آسکتا تھا تو یہی کہ کہیں آپ کے بعد آپ کی اُمت میں کوئی خلل تو پیدا نہ ہوگا۔ اور اگر پیدا ہؤا تو اس کے متعلق کیا صورت ہوگی۔ اور نبی کی وفات پر عام طور پر اس کے متبعین گھبرا جاتے ہیں اور نبی کی وفات کو بے وقت موت سمجھا جاتا ہے۔ اور مخالفین بھی اس خیال میں ہوتے ہیں کہ اس نبی نے تو اپنے زمانہ میں کام چلا لیا ہے لیکن اس کی وفات کے بعد اس کا لگایا ہؤا پودا ختم ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ نصر میں ایک طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ آپ متفکر نہ ہوں۔ یہ فتوحات جو آپ کے زمانہ میں ہوئی ہیں یہ رُک نہیں جائینگی۔ بلکہ ان کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جائے گا اور اسلام میں اگر آپ کے زمانہ میں بیک وقت سینکڑوں کی تعداد میں لوگ شامل ہوتے ہیں۔ تو آپ کے بعد ہزاروں کی تعداد میں شامل ہوں گے۔ اور حضور کے چشمہ سے فوج در فوج لوگ سیراب ہونگے۔ اور آپ کے بعد اللہ تعالیٰ ایسے وجودوں کو کھڑا کر دے گا جو آپ کی اُمت کو سنبھال لیں گے۔ اور اس میں کسی قسم کا رخنہ پیدا نہ ہونے دینگے۔ اور مخالفین جو سمجھتے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کا سلسلہ ختم ہو جائے گا ان کی خوشیاں پامال ہو جائیں گی۔ اور اسلام دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے گا۔ اور جو مشکلات پیش آئیں گی وہ خس و خاشاک کی طرح اُڑ جائیں گی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے سورۃ نصر کو نازل کرکے ایک طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی اور دوسری طرف آپ کے متبعین کو یہ ہدایت کی کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر گھبرا نہ جائیں۔ جس خدا نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کامیاب و کامران کیا وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا خدا ہے اور وہ آپ کی وفات کے بعد آپ کی اُمت کا محافظ ہوگا۔ اور آپ کے بعد صحابہ کو یتیم کی صورت میں دیکھ کر وہ پہلے سے بھی زیادہ مدد کرے گا۔ اور اس کی نصرت کے دروازے بند نہیں ہوں گے بلکہ اور بھی زیادہ کھل جائیں گے۔ اور اس نصرت کو دیکھ کر لوگ اسلام میں فوج در فوج داخل ہونے

شروع ہوجائیں گے۔ اور آسمانی بادشاہت کا قیام ہوجائے گا۔ اور ساری دُنیا توحید کے نُور سے منور ہوجائے گی۔

مزید برآں مخالفین کی جھوٹی خوشیاں بھی پامال ہوجائیں گی۔ چنانچہ یہ وعدہ جس رنگ میں پورا ہؤا اس کو ہر غیر متعصب آدمی دیکھ کر یہ اقرار کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ واقعی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے رسول تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے بہادر اور مخلص لوگوں کے بھی قدم لڑکھڑا گئے۔ اور اُن پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو بظاہر بے وقت سمجھا جانے لگا۔ اور پھر خلافت کے انتخاب پر بھی فتنہ کے آثار نظر آرہے تھے۔ کیونکہ انصار یہ چاہتے تھے کہ خلیفہ ان میں سے منتخب کیا جائے اور مہاجرین کی یہ رائے تھی۔ کہ عرب لوگ سوائے قریش کے کسی اَور سے دبنے کے نہیں۔ اِس فتنہ کو دیکھ کر مخالفین یہود اور دوسرے لوگ اس خیال سے خوش تھے۔ کہ اسلام اب ختم ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے فوراً گرتی ہوئی قوم کو سنبھال لیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کھڑا کر دیا اور انہوں نے قوم کی باگ ڈور سنبھال لی۔ اور جو لوگ انصار میں سے تھے اور چاہتے تھے کہ ان میں سے خلیفہ کا انتخاب ہو۔ ان کو بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف مائل کر دیا۔

پھر ابھی قوم کا شیرازہ سنبھلنے نہ پایا تھا۔ کہ عرب کے بعض قبائل نے ارتداد کا اعلان کر دیا۔ اور ان کے سرداروں نے خود مختار حکومتیں قائم کرلیں۔ اسی طرح سے متعدد جھوٹے مدعیانِ نبوت اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مزید برآں بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ ان مشکلات کے ساتھ موتہ کی مہم علیحدہ درپیش تھی۔ جس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں رومیوں سے حضرت زیدؓ بن حارثہ کے خون کا انتقام لینے کے لئے ان کے لڑکے اسامہؓ بن زید کی ماتحتی میں شام بھیجنے کا حکم دیا تھا۔ ابھی یہ مہم روانہ نہ ہوئی تھی۔ کہ آپؐ کا انتقال ہوگیا۔ یہ سب حالات اس قسم کے تھے کہ ایسے حالات میں ایک اچھا دلیر اور مضبوط دل والا انسان بھی گھبرا جاتا ہے۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل پر اللہ تعالیٰ نے ایسی سکینت اور اطمینان نازل کیا کہ آپ گھبرائے نہیں اور آپ اسی وثوق اور یقین پر تھے کہ خدا کے وعدے بہرحال پورے ہوں گے۔ زمین و آسمان بے شک ٹل جائیں لیکن خدا کی باتیں نہیں ٹل سکتیں۔ اور اِذَا جَآءَ نَصْرُاللّٰہِ وَالْفَتْحُ کی آیت ان کی ڈھارس کو باندھے ہوئے تھی۔ چنانچہ صحابہ کرام نے ان مخدوش حالات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ حضرت اسامہؓ بن زید کو موتہ کی مہم کے لئے نہ بھجوایا جائے۔ اور سب سے پہلے ان فتنوں کا تدارک کیا جائے جو اندرون عرب پیدا ہوگئے ہیں۔ یعنی مرتدین اور زکوٰۃ کے منکرین کا فتنہ اور جھوٹے مدعیان کا فتنہ۔ مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سختی سے صحابہؓ کی بات کا انکار کر دیا اور فرمایا کہ جس لشکر کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے تیار کیا تھا اس کو روکنے کا حق ابوبکر کو کہاں ہوسکتا ہے۔ وہ لشکر بہرحال اپنی مہم پر روانہ

ہوگا۔ خواہ مدینہ کی یہ حالت ہو جائے۔ کہ اس پر
دشمن ٹوٹ پڑیں اور ہماری لاشوں کو درندے
گھسیٹ رہے ہوں۔ یہ فقرات اس شخص کی زبان
سے ہی نکل سکتے ہیں جو اس یقین سے پُر ہو کہ اسلام
کا غالب آنا خدا کی تقدیروں میں سے ایک تقدیر
ہے۔ اور یہ تقدیر ٹل نہیں سکتی خواہ ساری دُنیا
ہی اس کے مقابلہ کے لئے آکھڑی ہو۔ غور کریں کہ یہ
یقین اور یہ ثبات اور یہ دلیری حضرت ابوبکر
رضی اللہ عنہ کو کہاں سے حاصل ہوگئی۔ یہ محض اس
خدا نے آسمان سے نازل کی تھی جس نے محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات کے وقت تسلّی دی تھی کہ
آپ گھبرائیں نہیں آپ کے بعد ہر لمحہ خدا کے فرشتے
نصرت اور فتح کو لیکر اُتریں گے۔ یہاں تک کہ اسلام
کا عَلَم ساری دُنیا پر لہرا جائے گا۔

چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صحابہ
کی خلافِ مرضی حضرت اسامہ بن زید کو لشکر
سمیت موتہ کی طرف روانہ کر دیا۔ چنانچہ چالیس
دن کے بعد یہ مہم اپنا کام پورا کر کے فاتحانہ شان
سے مدینہ واپس آئی۔ اور خدا کی نصرت اور فتح کو
نازل ہوتے سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

پھر اس مہم کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ
جھوٹے مدعیان کے فتنے کی طرف متوجہ ہوئے اور
اس فتنہ کی ایسی سرکوبی کی کہ اس کو کچل کر رکھ دیا۔
اور یہ فتنہ بالکل ملیا میٹ ہو گیا۔ بعد ازاں یہی
حال مرتدین کا ہوا۔ جو لوگ زکوٰۃ کے منکر تھے انکی
تعداد کافی تھی اور صحابہ کبار بھی ان سے لڑنے کے
بارے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اختلاف
کر رہے تھے۔ اور کہتے تھے کہ جو لوگ توحید اور
رسالت کا اقرار کرتے ہیں اور صرف زکوٰۃ دینے
کے منکر ہیں ان پر کس طرح سے تلوار اُٹھائی جا سکتی
ہے۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے
نہایت جرأت اور دلیری سے کام لیتے ہوئے فرمایا
کہ خدا کی قسم جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
زندگی میں اونٹ کی ایک رسّی بھی زکوٰۃ کے طور پر
دیتا تھا اگر وہ اس کے دینے سے انکار کرے گا
تو آپ اس کا مقابلہ کریں گے۔ آپ کے اصرار پر
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی آپ کی اصابتِ رائے
کا اعتراف کرنا پڑا۔ اور وہ سمجھ گئے کہ اگر آج
زکوٰۃ نہ دینے کی اجازت دیدی گئی تو آہستہ آہستہ
لوگ نماز روزہ کو بھی چھوڑ بیٹھیں گے اور اسلام
محض نام کا رہ جائے گا۔ الغرض ایسے حالات میں
حضرت ابوبکرؓ نے منکرینِ زکوٰۃ کا مقابلہ کیا۔ اور
انجام یہی تھا کہ اس میدان میں بھی آپ کو فتح اور
نصرت حاصل ہوئی۔ اور تمام بگڑے ہوئے لوگ
راہِ حق کی طرف لَوٹ آئے۔ حقیقت یہی ہے کہ اگر
اسلام خدا تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتا اور محمد
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے سچے اور
برگزیدہ رسول نہ ہوتے۔ تو یہ حالات مسلمانوں
کو مٹانے کے لئے کافی تھے۔ لیکن کیا بات تھی کہ مسلمان
آگ کے شعلوں اور موت کے مُنہ سے بھی نکل آئے۔
اور ان کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ اور ہر گھڑی فتح و
نصرت ان کے ساتھ رہی۔ وہ یہی وعدہ تھا جو
اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
کیا تھا۔ کہ اے رسول اللہ آپ گھبرائیں نہیں،
آپ کی قوم کی دستگیری اللہ تعالیٰ کرے گا۔ اور
اسے ہر میدان میں فتح مند کرے گا۔ پھر ابھی اندرونی
خلفشار ختم ہی ہوئی تھی کہ عراق میں ایرانی حکومت
کے ساتھ جنگ شروع ہو گئی۔ ایرانی حکومت ان

دنوں بڑی ترقی یافتہ حکومت تھی۔ اور اس کی فوج تربیت یافتہ اور ان کے پاس بہت ساز و سامان تھا۔ اور مسلمان ان کے مقابلے میں ایسے ہی تھے جیسے باز کے مقابلہ میں چڑیا کی حیثیت ہوتی ہے۔ لیکن جونہی عراق میں معرکے شروع ہوئے یکے بعد دیگرے ایرانیوں کو خطرناک طور پر شکست ہوئی اور ان کو پسپا ہونا پڑا۔ ابھی مسلمان اس طرف سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ شام اور مصر میں رومیوں سے جنگ چھڑ گئی۔ اور دمشق۔ اردن۔ حمص اور فلسطین میں سب طرف فوجوں کو بھیجنا پڑا۔ اور سب طرف جنگ کے شعلے بلند ہونے شروع ہو گئے۔ ایسے نازک حالات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے اور آپ کی وفات ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر مسندِ خلافت پر بٹھا دیا۔ آپ کے عرصۂ خلافت میں سب طرف جنگ کا میدان گرم رہا۔ اور ان جنگوں میں بعض اوقات مسلمانوں میں سے ایک ایک آدمی نے اپنے مخالفوں میں سے ایک ایک ہزار کا مقابلہ کیا اور مخالفوں کی لاکھوں کی تعداد میں آنے والی فوج کو چند ہزار مسلمانوں نے روند ڈالا اور وہ ہر میدان سے کامیاب و کامران آئے۔ اور ایران اور روم جیسی عظیم الشان ترقی یافتہ سلطنتوں کے پرخچے اڑا دیئے۔ اور مصر۔ شام۔ فلسطین اور ہندوستان کی سرحد سے لے کر شمالی افریقہ تک اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا زمانہ خلافت شروع ہوا۔ اور اس میں بھی مسلمان سیلاب کی طرح بڑھتے چلے گئے۔ اور خراسان، افغانستان اور سندھ تک قبضہ کر لیا۔ اور شمالی افریقہ کے علاقے طرابلس، تونس، مراکش اور الجزائر وغیرہ فتح کر لئے اور یورپ کی سرحد تک مسلمان پہنچ گئے۔ اور مسلمانوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے سب علاقوں کو روند ڈالا۔

یہ سب فتوحات اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ کے وعدے کے مطابق تھیں۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے سچے فرستادہ اور رسول نہ ہوتے۔ تو مزید کامیابی تو کجا مسلمانوں کا اپنا شیرازہ بھی آپ کے بعد بکھر جاتا۔ لیکن نہ صرف یہ کہ مسلمان ایک نقطہ پر جمع رہے۔ بلکہ ہر طرف فتح نے ان کی پیشانیوں کو چوما۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ان وعدوں کے مطابق تھا جو اس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وفات کے وقت کئے تھے۔

اِس آیت کے متعلق یہ امر بھی ذکر کے قابل ہے کہ اس میں الفتح پر ال داخل کیا گیا ہے۔ اور عربی زبان میں جب کسی لفظ پر ال داخل کیا جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں کہ مخاطب اس امر کو جانتا ہے۔ جیسے رَجُلٌ کے معنے ہوں گے۔ کوئی آدمی۔ اور جب اس پر ال داخل کر دیں۔ اور کہیں اَلرَّجُلُ تو اس کے معنے ہوں گے وہ خاص آدمی جس کو متکلم اور مخاطب دونوں جانتے ہیں۔ پس آیت اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ میں اَلْفَتْحُ پر ال داخل کرکے یہ کہا گیا ہے کہ یہ فتح جس کے وعدے دیئے جا رہے ہیں ایسی ہے کہ اس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں۔ اور یہ بات درست ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ نظارے کشف میں دکھا دیئے تھے۔ اور بتا دیا تھا کہ

وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِيۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ۙ

اور تو (اس بات کے آثار) دیکھ لیگا کہ اللہ کے دین میں لوگ فوج در فوج داخل ہونگے۔ سلہ

وہ دن دُور نہیں جب کہ ایران اور روم کے ملک مسلمانوں کے قبضہ میں آجائیں گے چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ تشریف لا رہے تھے۔ تو راستے میں ایک شخص سراقہ نے آپ کا تعاقب کیا۔ اسکی نیت خراب تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت فرمائی۔ بار بار سراقہ کا گھوڑا ریت میں دھنس جاتا تھا۔ اس وقت آپ نے سراقہ کو بلایا اور کہا۔ کہ میں تیرے ہاتھوں میں کسریٰ شاہِ ایران کے کنگن دیکھتا ہوں۔ سراقہ ابھی مسلمان نہیں تھا۔ بعد ازاں ان کو قبول اسلام کی توفیق ملی اور بالآخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب کسریٰ شاہِ ایران کے کنگن آئے تو حضرت عمرؓ نے حکماً ان کنگنوں کو سراقہ کے ہاتھوں میں پہنایا۔ پھر اسی طرح جنگِ احزاب میں جب مسلمان اپنی حفاظت کے لئے خندق کھود رہے تھے تو ایک ایسا پتھر آگیا جو ٹوٹتا نہیں تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی اور آپ اپنا کدال لے کر تشریف لائے۔ اور تین بار کدال مارا۔ اور ہر بار اللہ اکبر بلند آواز سے فرمایا۔ اور پتھر ٹوٹ گیا۔ تب آپ نے اپنے صحابہ سے دریافت کیا کہ کیا وہ جانتے ہیں۔ کہ کیوں آپ نے اللہ اکبر کہا۔ تب صحابہ نے کہا کہ آپ ہی بتائیں۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب میں نے پہلی بار کدال مارا تو مجھے کسریٰ کے محلات دکھائے گئے اور مجھے بتایا گیا۔ کہ میری اُمت اس پر قابض ہوگی۔ تب میں نے اللہ اکبر کہا اور پھر دوسری بار کدال مارا۔ تو روم اور شام کے سُرخ محلات کا نظارہ مجھے کرایا گیا۔ اور بتایا گیا کہ یہ بھی میری اُمت کو ملیں گے۔ اس پر میں نے پھر اللہ اکبر کہا۔ پھر تیسری بار جب میں نے کدال مارا تو مجھے صنعاء کے محلات دکھائے گئے اور بتایا گیا کہ اس پر بھی میری اُمت قابض ہوگی۔

الغرض یہ فتوحات جو حضرت ابوبکر۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانے میں ہوئیں سب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کشفاً دیکھ چکے تھے اور ان کو جانتے تھے۔ چنانچہ اس آیت میں اسی وجہ سے اَلۡفَتۡحُ پر ال داخل کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ اے محمد رسول اللہ جب اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت آجائے گی اور موعودہ فتوحات حاصل ہوجائیں گی جن کا نظارہ آپ کو کشفاً دکھا دیا گیا ہے تو اس وقت لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہوں گے نیز اَلۡفَتۡحُ میں ال کمال کے معنوں میں بھی ہو سکتا ہے اور معنے یہ ہوں گے کہ جب کامل فتح آجائے گی۔

سلہ حل لغات:۔ رَاَیۡتَ۔ رَاٰعَ سے فعل ماضی کا صیغہ ہے۔ اور رَاٰی۔ یَرٰی۔ رُؤۡیَةً کے معنے ہوتے ہیں نَظَرَ بِالۡعَیۡنِ اَوۡ بِالۡقَلۡبِ کہ ظاہری آنکھ سے دیکھا یا دل کی آنکھ سے (اقرب) پس رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰهِ کے معنے ہوں گے۔ تو دل کی آنکھ سے دیکھ لے گا۔

رَاٰی

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ

پس اسوقت تو اپنے رب کی تعریف کیساتھ (ساتھ) اسکی پاکیزگی (بھی) بیان کرنے میں مشغول ہو جائیو اور اس سے

اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۟

(اپنی قومی تربیت کی کوتاہیوں پر) پردہ ڈالنے کی دُعا کیجیو۔ وہ یقیناً اپنے بندے کیطرف رحمت کیساتھ لوٹ لوٹ کر آنیوالا ہے۔ ع ۱ ۴۵

اَفْوَاجًا۔ اَفْوَاج فَوْجٌ کی جمع ہے۔ اور اَلْفَوْجُ کے معنے ہوتے ہیں۔ اَلْجَمَاعَةُ مِنَ النَّاسِ لوگوں کا ایک گروہ اور جماعت۔ اَوِ الْجَمَاعَةُ المَارَّةُ السَّرِيْعَةُ۔ یا ایسی جماعت جو جلدی سے گزرجائے۔ اور رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا کے معنے ہوں گے اَیْ طَائِفَةً بَعْدَ اُخْرٰى۔ کہ تو لوگوں کو دیکھے گا کہ وہ گروہ درگروہ اسلام میں داخل ہونگے (اقرب)

تفسیر:۔ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ یعنی جب اللہ تعالےٰ کی نصرت اور موعود فتح آجائیگی اور تو لوگوں کو اللہ کے دین میں گروہ درگروہ داخل ہوتے دیکھ لے گا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے تو آپ نے فوج درفوج لوگوں کو اسلام میں داخل ہوتے کس طرح دیکھا۔ اسکے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ جیسا کہ حلِّ لغات میں لکھا جا چکا ہے۔ رُؤیت کا لفظ صرف آنکھ سے دیکھنے پر استعمال نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ دل سے کسی چیز کو پالینے یا اس کا علم حاصل کر لینے پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور اسی طرح کشفاً کسی چیز کو دیکھنے پر بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ نیز عربی محاورہ میں یقینی اور قطعی خبر کو بھی دیکھنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ (سورۃ الفیل) یعنی اے محمد رسول اللہ کیا تم نے دیکھا نہیں۔ کہ اصحاب الفیل کے ساتھ تیرے رب نے کیا کیا۔ حالانکہ یہ واقعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے بھی ایک سال پہلے ہوا تھا۔ تو گویا یہاں پختہ علم کے لئے رَاَيْتَ کا لفظ استعمال ہوا ہے پس رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا کے معنے یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اسکی فتوحات آجانے کے بعد جس طرح لوگوں نے جوق درجوق اسلام میں داخل ہونا ہے یہ نظارہ اللہ تعالیٰ تجھ کو کشفاً دکھا دیگا۔ یا اس کے آثار پیدا کر کے یہ یقین تیرے دل میں پیدا کر دیگا کہ اسلام غالب ہو کر رہے گا۔ (اَفْوَاجًا)

۴؎ حلِّ لغات:۔ سَبِّحْ۔ سَبَّحَ سے امر کا صیغہ ہے اور سَبَّحَ اللّٰهَ کے معنے ہیں نَزَّهَهٗ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کو تمام معائب اور بُرائیوں سے پاک قرار دیا (اقرب) فَسَبِّحْ کے معنے ہونگے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہر قسم کے معائب اور نقائص سے پاک قرار دیدو۔ (سَبِّحْ)

اِسْتَغْفِرْهُ۔ اِسْتَغْفَرَ۔ غَفَرَ سے باب استفعال کا صیغہ ہے۔ اور غَفَرَ الشَّيْءَ غَفْرًا کے معنے ہوتے ہیں سَتَرَهٗ۔ کسی چیز کو ڈھانپ دیا۔ اور جب غَفَرَ الْمَتَاعَ فِي الْوِعَاءِ کہیں تو معنے (اِسْتَغْفِرْهُ)

ہوں گے اَدْخَلَہٗ وَسَتَرَہٗ ۔ کہ سامان کو تھیلے یا ٹرنک میں رکھ کر محفوظ کر دیا۔ اور غَفَرَ اللّٰہُ لَہٗ ذَنْبَہٗ کے معنے ہوتے ہیں۔ غَطّٰی عَلَیْہِ وَعَفَا عَنْہُ ۔ اس کے قصور کو ڈھانپ دیا اور اس کی کمزوری پر پردہ ڈال دیا۔ تاکہ لوگوں کو نظر نہ آئے۔ (اقرب)

مفردات میں ہے کہ اَلْغَفْرُ کے معنے ہیں۔ اِلْبَاسُ مَا یَصُوْنُہٗ عَنِ الدَّنَسِ کہ جب کسی چیز کو میل اور گرد سے محفوظ رکھنے کے لئے اس پر کوئی چیز ڈالدیں تو اس وقت اس کے لئے غفر کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ اِغْفِرْ ثَوْبَکَ فِی الْوِعَاءِ ۔ کہ اپنے کپڑے کو گرد اور میل سے بچانے کے لئے کسی تھیلے یا ٹرنک میں رکھ دو۔ (مفردات) پس اِسْتَغْفِرْہُ کے معنے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سے اپنی بشری کمزوری پر پردہ پوشی طلب کرو۔ یعنی دُعا کرو کہ تمہارے ماننے والوں میں کسی قسم کی کوئی خرابی پیدا نہ ہو اور وہ صحیح راستہ پر قائم رہیں۔

تفسیر:۔ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ ۔ جیسا کہ حلِّ لغات میں بتایا جا چکا ہے ۔ سَبِّحَ کے معنے اللہ تعالیٰ کی ذات کو تمام عیوب اور نقائص سے مبرّا قرار دینے کے ہوتے ہیں اور حمد کے معنے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں تمام خوبیوں کے ہونے کا اقرار کیا جائے۔ گویا اس آیت میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر ہماری نصرت ختم ہو جاتی اور فتوحات کا سلسلہ بند ہو جاتا تو مسلمان بجا طور پر کہہ سکتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ وفاداری نہیں کی۔ اور اسی طرح کفار بھی یہ کہہ سکتے تھے کہ مسلمانوں

تسبیح کے ساتھ تحمید کرنے کا حکم دینے میں حکمت

کو جو فتوحات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوئیں وہ محض ان کی ذاتی قابلیت کے نتیجہ میں تھیں۔ اور آپؐ کی وفات کے بعد فتوحات کا رُک جانا اسلام کے سچا نہ ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو ان ہر دو امور سے بَری ثابت کرنے کے لئے اپنے رسولؐ کو یہ اطلاع دیدی کہ نہ تو آپؐ کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو بے یار و مددگار چھوڑیگا۔ اور نہ فتوحات کا سلسلہ بند ہو کر مخالفوں کے لئے خوشی کا موقع پیدا ہوگا۔ جب اللہ تعالیٰ نے سورۃ نصر کی آیات کو نازل کر کے اپنے آپ کو ان الزاموں سے بَری ثابت کر دیا ہے تو اے رسول اللہ اب آپ کا بھی فرض ہے کہ آپ پوری طرح اعلان کر دیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر عیب اور نقص سے پاک ہے۔ نہ تو وہ اپنے بندوں کو بے یار و مددگار چھوڑتا ہے کہ اس پر کوئی الزام عائد ہو اور نہ اپنے وعدوں کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اور چونکہ اس نے باوجود مخالف حالات کے مسلمانوں کو غالب کر دیا ہے۔ اور آئندہ بھی غالب کرتا چلا جائیگا۔ اسلئے وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی حمد کے گیت گائے جائیں۔ اور یہ کہا جائے کہ ہر خوبی اس کی ذات میں پائی جاتی ہے۔

پھر اس آیت میں لفظ رَبّ استعمال فرمایا۔ یعنی یہ کہا ہے کہ اپنے رب کی حمد کرو۔ یہ نہیں کہا کہ اللہ کی حمد کرو۔ ربّ کے معنوں کے اندر یہ مفہوم پایا جاتا ہے۔ کہ ادنیٰ حالت سے ترقی دیتے دیتے کمال تک پہنچانا۔ گویا ربّ کا لفظ اس آیت میں استعمال کرنے میں یہ حکمت ہے کہ تا یہ بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ اس لئے حمد کا مستحق ہے کہ اس نے

مسلمانوں کو ضُعف کی حالت سے اُٹھا کر ساری دُنیا کا مالک بنا دیا۔ پس جو کسی پر اتنا فضل کرے وہ بہرحال حمد کا مستحق ہوگا۔

پھر حمد کے لفظ میں یہ اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ اے مسلمانو! فتوحات کو دیکھ کر تمہارے اندر کبر پیدا نہ ہو۔ اور یہ نہ سمجھنا کہ یہ فتوحات تمہاری کسی ذاتی قابلیتوں کی بنا پر ہیں۔ بلکہ یہ سب کچھ خدا کے فضل کے ماتحت تم کو مل رہا ہے اسلئے تمہیں خدا تعالیٰ کی حمد کرتے ہوئے اس کے آستانے پر ہمیشہ جھکے رہنا چاہیئے۔ تا تمہارا یہ شکر ادا کرنا اللہ تعالیٰ کے مزید فضلوں کو نازل کرنیکا موجب ہو۔ الغرض فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ کے الفاظ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اے مسلمانو تم اعلان کردو کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے وعدوں کے مطابق ہماری نصرت کرکے ایک طرف اپنی ذات کو تمام الزامات سے بَری ٹھہرالیا ہے اور دوسری طرف اپنی ذات کو حمد کا مستحق قرار دے لیا ہے۔

اِسۡتَغۡفِرۡهُ :۔ استغفار کا لفظ غَفَرَ سے نکلا ہے۔ اور جیسا کہ حلِّ لغات میں بتا یا جاچکا ہے غَفَرَ کے معنے ڈھانکنے یا حفاظت کرنے کے ہیں۔ اور استغفار کے معنے ہیں حفاظت کے لئے دُعا یا طلبِ حفاظت۔ گویا استغفار کرنے والا شخص اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہے کہ وہ اس کو اپنی حفاظت میں لے لے اور اس کی بشریت کی کمزوریاں ظاہر نہ ہوں۔ یا یہ کہ وہ خدا تعالیٰ کی حفاظت میں اِس طور پر آجائے کہ اس سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو۔

قرآن کریم نے استغفار کے معنے میں وسعت پیدا کرتے ہوئے اس کو ان معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ کہ جو گناہ انسان سے صادر ہو چکے ہوں ان کے بدنتائج اور ان کی سزا سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی حفاظت طلب کی جائے۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہ لفظ اس مفہوم میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اور یہ ادنیٰ لوگوں کے لئے ہے۔ کامل لوگوں کے لئے اس کا یہی مفہوم ہوتا ہے۔ کہ قوم کی اصلاح کرتے ہوئے اگر کوئی امر نظر انداز ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کا ازالہ کردے۔

سورۃ نصر کی زیرِ تفسیر آیت میں اللہ تعالےٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے۔ کہ اے ہمارے رسول! اِسۡتَغۡفِرۡهُ۔ اللہ تعالےٰ سے استغفار کرو۔ اسی طرح قرآن کریم میں بعض مقامات پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اِسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِكَ کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ کہ اپنے ذنب کے لئے استغفار کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے استغفار کرنے کا مطلب

ایسے مقامات کو پڑھتے وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ استغفار کا لفظ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کیا ان معنوں میں کہ آپؐ سے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا اور پھر آپؐ کو حکم ہوا کہ آپؐ اس کی سزا سے بچائے جانے کی دُعا کریں یا کسی اور معنے میں؟

عیسائی صاحبان بھی ہمیشہ اِس قسم کی آیات کو لیکر جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کا حکم دیا گیا ہے مسلمانوں پر اعتراض کرتے چلے آئے ہیں کہ دیکھو تمہارا رسول گنہگار تھا تبھی تو ان کو استغفار کا حکم دیا گیا۔ اور اس کے بعد وہ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ مسیح علیہ السلام کے لئے کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں ہوا اسلئے وہ گناہوں سے پاک تھے۔

اس اعتراض کے جواب میں مسلمانوں کو بڑی دقت پیش آئی۔ اور گو انہوں نے جواب دینے کی بڑی کوشش کی ہے لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے پہلے اس کا جواب دینے میں وہ کامیاب نہیں ہوسکے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ہزارہا مسلمان عیسائی بن گئے۔ اور تو اور سادات میں سے بھی بعض نے بپتسمہ لے لیا غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لفظ استغفار کے استعمال سے عیسائیوں نے مسلمانوں کو دھوکہ دیا اور بجائے اسکے کہ مسلمان عیسائیوں کو جواب دیتے وہ خود ان کے دھوکہ میں آگئے۔

ان آیات کو جن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے استغفار کا لفظ استعمال ہوا ہے حل کرنے کے لئے یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا کی ہدایت اور راہنمائی کے لئے آئے تھے۔ اور اس دُنیا میں اسلئے مبعوث کئے گئے تھے۔ کہ تا گمراہ اور بے دین لوگوں کو باخدا انسان بنائیں اور تا گناہوں اور بدیوں میں گرفتار شدہ انسانوں کو پاک وصاف کریں۔ اور آپ کا درجہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ع ۴/۱۲) اے ہمارے رسول! تم یہ بات لوگوں کو اچھی طرح سُنا دو کہ اگر وہ خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں تو اُن کو چاہیئے کہ وہ تیری اتباع کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیارے اور محبوب بن جائیں گے۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت قرآن کریم میں آتا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب ع ۳/۱۹) کہ اے مسلمانو! اس رسول میں تمہارے لئے ایک نیک نمونہ ہے۔ اگر تم خدا کے حضور مقبول بننا چاہتے ہو اور اگر تم خدا سے تعلق پیدا کرنا پسند کرتے ہو تو اس کا آسان طریق یہ ہے کہ اس رسول کے اقوال، افعال اور حرکات وسکنات کی پیروی کرو۔ کیونکہ آپ کے اقوال و افعال خدا تعالیٰ کے اقوال وافعال ہیں جیسا کہ قرآن کریم نے آپ کے متعلق مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ رَمٰی (انفال ع ۲/۱۴) کہہ کر آپ کے کنکر پھینکنے کو اللہ تعالیٰ کا کنکر پھینکنا قرار دیا ہے۔ پھر آپ کے متعلق یہ بھی فرمایا کہ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (النجم ع ۱) یعنی یہ نبی اپنی خواہش سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہی بات کہتا ہے جو خدا تعالیٰ اس کو بذریعہ وحی حکم دیتا ہے۔ پس وہ شخص جس کی اتباع سے انسان خدا سے ملتا ہی نہیں بلکہ اس کا محبوب بن جاتا ہے۔ اور وہ شخص جو دُنیا کے لئے ایک نمونہ تھا اور جس کے اقوال وافعال خدا کے اقوال و افعال تھے اس کا استغفار ان معنوں میں نہیں ہوسکتا کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا اور اس نے یہ دُعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس گناہ کی سزا سے بچالے۔ کیونکہ یہ ظاہر بات ہے کہ اگر وہ بھی گناہ کا مرتکب ہوسکتا تھا تو خدا تعالیٰ نے اسکی اتباع کا کیوں حکم دیا اور اُسے دُنیا کے لئے نمونہ کیوں قرار دیا؟ پس آپ کو نمونہ قرار دینے کے معنے ہی یہ ہیں کہ آپ ہر ایک بدی اور گناہ سے پاک تھے۔ گویا آپ کا استغفار گناہوں کی سزا سے بچنے کے لئے نہ تھا بلکہ کسی اور معنے میں تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ کونسے معنے ہیں جن کو ادا کرنے کیلئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے لئے استغفار کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ سو جاننا چاہیئے کہ زیرِ تفسیر سورۃ کی ابتدائی دو آیات میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی مسلمانوں کی نصرت کا سلسلہ جاری رہے گا اور فتوحات کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے جائیں گے۔ اور قومیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح برکت پائیں گی جس طرح آپ کی زندگی میں لوگوں نے برکت پائی تھی۔ گویا ان آیات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا تھا کہ آئندہ زمانہ میں ہزاروں ہزار لوگ اسلام میں ایک وقت میں داخل ہوا کریں گے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی قوم کو فتح حاصل ہوتی ہے اور مفتوح قوم کے ساتھ فاتح قوم کے تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ تو ان میں جو بدیاں اور برائیاں ہوتی ہیں وہ فاتح قوم میں بھی آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فاتح قوم جن ملکوں سے گزرتی ہے انکے عیش و عشرت کے جذبات اپنے اندر لے لیتی ہے اور چونکہ عظیم الشان فتوحات کے بعد اس قدر آبادی کے ساتھ فاتح قوم کا تعلق ہوتا ہے جو فاتح سے بھی تعداد میں زیادہ ہوتی ہے۔ اسلئے اس کو فوراً تعلیم دینا اور اپنی سطح پر لانا مشکل ہوتا ہے۔ اور جب فاتح قوم کے افراد مفتوح قوم میں ملتے ہیں تو بجائے اس کو اخلاقی طور پر نفع پہنچانے کے خود اس کے بد اثرات سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ رفتہ رفتہ نہایت خطرناک ہوتا ہے۔ اور درحقیقت جس وقت کوئی قوم ترقی کرتی اور کثرت سے پھیلتی ہے۔ وہی زمانہ اسکے تنزل اور انحطاط کا بھی ہوتا ہے۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان فتوحات کی خبر کو معلوم کر کے طبعی طور پر متفکر ہو سکتے تھے۔ کہ ان فتوحات کے ساتھ ساتھ کہیں مسلمانوں میں انحطاط تو شروع نہ ہو جائے گا اور وہ لوگ جو اسلام میں نئے داخل ہوں گے ان کی پوری طرح تربیت کا کیا سامان ہوگا کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کامل استاد اور نفوس کا تزکیہ کرنے والا اور کامل راہنما ان کو میسر نہ ہوگا۔ پس ان خیالات کے جواب کے طور پر اللہ تعالیٰ نے اِسْتَغْفِرْهُ کے الفاظ نازل فرمائے اور بتایا کہ اے محمد رسول اللہ! جب تک آپ دنیا میں رہے۔ آپ نے اپنی ذمہ داری کو ادا کیا اور تربیت اور تزکیۂ نفوس کا کام کرتے رہے۔ لیکن جب آپ ہمارے پاس آ جائیں گے۔ تو آپ کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی اور اللہ تعالےٰ خود اُمّتِ محمدیہ کا کفیل ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں آپ کو فکر کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں آپ وہ کام کریں جو آپ کی استطاعت میں ہے۔ اور وہ یہ کہ آپ دُعاؤں میں لگ جائیں اور اللہ تعالےٰ سے التجا کریں کہ وہ نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی حفاظت کرے اور ان کی نصرت کرتا رہے بلکہ اسلام میں نئے داخل ہونے والوں کی بھی خود ہی تربیت کا سامان کرے۔ اور ایسی صورت پیدا کر دے کہ تمام مسلمان ٹھوکروں اور غلطیوں سے بچتے رہیں۔ اور اگر کبھی کوئی رخنہ پیدا بھی ہو تو اسکی اصلاح کا سامان خدا تعالیٰ پیدا کرتا رہے۔ گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذات کے لئے استغفار کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ بلکہ اپنی اُمت کے لوگوں کے لئے استغفار کا حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ سے آپ دُعا کریں کہ وہ آپ کی اُمت کی حفاظت

فرمائے اور ان میں کوئی روحانی طور پر رخنہ نہ پڑے۔ اور اگر کوئی خرابی پیدا ہو تو اس کی اصلاح کا سامان پیدا ہو جائے۔ چنانچہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کے مطابق دعا کرنی شروع کر دی۔ اور روایات بتاتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اس دُعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور آپ کی وفات کے بعد جس قدر فتنے پیدا ہوئے ان کی اصلاح کر دی گئی۔ اور آئندہ ایسا انتظام کر دیا گیا کہ ہر فتنے کے پیدا ہونے پر اس کی اصلاح ہو جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کی وفات پر جب بعض قبائل عرب مرتد ہو گئے۔ اور بعض نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کا ایسا سدِّ باب کیا۔ جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ اور پھر سے اسلام صحیح شکل میں قائم ہو گیا۔ اگر اس وقت اس فتنہ کو دبایا نہ جاتا تو اسلام کی صحیح شکل کا قائم رہنا مشکل امر تھا۔

اسی طرح اسلام کی فتوحات کے زمانہ میں جب کثرت سے عیسائی لوگ مسلمان ہوئے تو وہ اپنے ساتھ حیاتِ مسیح اور مسیح کے بے گناہ ہونے اور باقی تمام انسانوں کے (جن میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی آجاتے ہیں) خطا کار ہونے کا عقیدہ بھی لے آئے اور وہ اتنا پھیلا کہ اس غلط فہمی کی وجہ سے عیسائیت کو اسلام پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا اور مسلمان اسلام کو چھوڑ کر عیسائیت میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اس فتنے کے استیصال کے لئے اور اُمت کی حفاظت کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وجود کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چودہ سو سال بعد کھڑا کر دیا۔ اور آپ کے ذریعہ اسلام کو ایسے مقام پر کھڑا کر دیا کہ کجا وہ حالت کہ وہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اور مسلمان اسلام کو چھوڑ رہے تھے۔ اور کجا یہ حالت پیدا ہو گئی کہ تمام مذاہب میدان سے بھاگ گئے اور اسلام عیسائیت پر حملہ آور ہو گیا اور غیر مذاہب کے لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہونے شروع ہو گئے اور وہ دن دُور نہیں جبکہ ہر شخص اسلام کے مادی غلبہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا اور اسلام کا ضعف اس کی طاقت میں تبدیل ہو جائیگا۔ پس یہ سب کچھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے استغفار اور دُعا کا نتیجہ ہے۔

اب ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ جن آیات میں استغفار کے ساتھ ذنب کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کا کیا مطلب ہے۔ کیونکہ ذنب کے معنے لغت میں جُرم کے لکھے ہیں۔ اور اس لحاظ سے اِسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ کے معنے یہ بنیں گے۔ کہ اے محمد رسول اللہ! اپنے جُرم کے لئے آپ استغفار کریں۔ اس بارے میں یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جیسا کہ اس آیت کی تفسیر کے شروع میں اصولی طور پر لکھا جا چکا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ عظیم الشان انسان ہیں جن کی اتباع سے انسان خدا سے ملتا ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہ کہ آپ دنیا کیلئے نمونہ ہیں۔ اور آپ کے اقوال و افعال خدا کے اقوال و افعال ہیں۔ پس آپؐ کے متعلق یہ تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ کہ قرآن کریم نے کہیں یہ کہا ہو کہ آپؐ گناہ گار ہیں۔ کیونکہ آپؐ تو دُنیا کو گناہ سے چھڑانے کے لئے آئے تھے۔ اگر آپ خود ہی گناہ گار تھے

تو دُنیا کو گناہ سے کیسے آزاد کروا سکتے تھے پس وہ آیات جن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ذنب کا لفظ استعمال ہوا ہے اسکے معنے قرآن کریم کے بیان کی روشنی میں یہ نہیں کئے جاسکتے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گناہ کے لئے استغفار کا حکم دیا گیا تھا بلکہ اس کے اور ہی معنے ہیں۔

اب ان معنوں کو معلوم کرنے کے لئے ہم ان آیات پر یکجائی نظر کرتے ہیں جن میں ذنب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ وہ آیات حسب ذیل ہیں:-

۱- اللہ تعالیٰ سورۃ مؤمن میں فرماتا ہے۔
فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ (ع۶)

۲- سورۃ محمدؐ میں یوں آیا ہے۔ فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوَاكُمْ (ع۲)

۳- تیسری آیت جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ذنب کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ سورۃ فتح کی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ (ع۱)

ان آیات میں اور سورۃ محمدؐ اور مؤمن کی آیات میں لفظ ذنب کے استعمال میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ سورۃ محمدؐ اور مؤمن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ اِسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ یعنی اپنے ذنب کے لئے استغفار کر۔ اور سورۃ فتح کی آیات میں غفر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اور فرمایا ہے لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے پہلے اور پچھلے ذنب پر مغفرت کر دی ہے۔

ان آیات کے حل کے لئے سب سے پہلے ہم لغت کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ لغت میں غفر کے معنے ڈھانکنے کے ہیں۔ اور ذَنَبَهٗ ذَنْبًا کے معنے ہوتے ہیں۔ تَلَاهُ فَلَمْ يُفَارِقْ اَثَرَهٗ کہ اس کے پیچھے پیچھے گیا اور اس کی اتباع اور قدم بقدم چلنے کو ترک نہ کیا۔ اور ذَنَّبَ الْعِمَامَةَ کے معنے ہوتے ہیں۔ اَفْضَلَ مِنْهَا شَيْئًا وَ اَرْخَاهُ۔ کہ پگڑی باندھتے وقت اس کا ایک زائد حصہ جو سر پر لپیٹا نہ جا سکتا تھا اس کو لٹکا دیا (اقرب) پس ذنب کے معنے ہوئے پیچھے آنا یا زائد چیز۔ اور غفر ذنب کے معنے ہوئے زائد چیز کا ڈھانپ دینا یا پیچھے آنے والے واقعات کی خرابیوں کا ڈھانپ دینا۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ذنب کے لئے استغفار کرنے سے مراد یہ ہوگی کہ آپ یہ دُعا کریں کہ نبوت کے کام کے وہ بوجھ جو بشری طاقت سے زائد ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اُٹھانے کی طاقت عطا کر دے۔ یا آپ کے بعد آنے والے واقعات کی خرابیوں پر پردہ ڈال دے۔

اب ہم سورۃ مؤمن، سورۃ محمدؐ اور سورۃ

فتح کی ان آیات پر جن میں ذنب کا لفظ رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے استعمال کیا گیا ہے جب
غور کرتے ہیں تو ایک ایسی عجیب بات معلوم ہوتی
ہے۔ جو ان آیات کے مضمون کو اس طرح حل
کر دیتی ہے کہ سب اعتراض دُور ہو جاتے ہیں۔
اور وہ یہ کہ ان سب جگہوں میں رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کے دشمنوں کے ہلاک ہونے اور آپ کی
فتح کا ذکر ہے۔ چنانچہ پہلا مقام سورۃ مومن کا
ہے اور یہ سورۃ مکی ہے۔ اور اس میں آتا ہے کہ
فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ
لِذَنْۢبِكَ۔ یعنی اے رسول اللہ! آپ دشمنوں
کی ایذاؤں پر صبر کریں اور اُس دن کا انتظار
کریں جب آپ کا غلبہ ہوگا اور یہ ایذا دینے
والے شرمندہ ہوں گے۔ اور یہ یاد رکھیں کہ یہ
غلبہ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ اور مکہ بھی آپ
کو ملے گا۔ اور آپ اپنے ذنب کے لئے استغفار
کریں۔

اس آیت سے پہلے مندرجہ ذیل آیات ہیں۔
اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝
يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ
وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ۝
وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا
بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْكِتٰبَ ۝ هُدًى وَّ
ذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝

یہ آیات مکہ میں نازل ہوئی تھیں۔ جب مسلمان
بہت تکلیف اور دُکھ میں تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو
مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ اے مسلمانو! گھبراؤ نہیں
اور یاد رکھو کہ ہم اپنے رسولوں اور ان لوگوں کی
جو اُن پر ایمان لاتے ہیں اسی دُنیا میں مدد کرتے
ہیں اور اس دن بھی ہم ان کی مدد کریں گے جب
فیصلہ کے لئے گواہ اپنی گواہیاں دینے کیلئے کھڑے
ہونگے۔ وہ ایسا دن ہوگا جبکہ نافرمانوں کو ان کی
معذرت کچھ بھی فائدہ نہ دیگی اور ان کے لئے خدا
سے دُوری ہوگی اور انہیں رہنے کو بہت بُرا گھر
ملیگا۔ یاد رکھو ہم نے موسیٰ کو ہدایت دی اور
بنی اسرائیل کو تورات کا وارث کیا جس میں لوگوں
کے لئے ہدایت اور نصیحت تھی۔ یعنی جس طرح بنی اسرائیل
تورات کی برکت سے ارضِ مقدسہ کے وارث
ہوگئے اور خدا کی نعمتیں اُن کو مل گئیں اسی طرح
مسلمانوں کو بھی مکمل کتاب ملیگی اور دُنیا پر ظاہری
غلبہ بھی حاصل ہو جائیگا۔ اور مکہ جو ان کا مقدس
مقام ہے اور جو اسوقت مخالفوں کے قبضہ میں
ہے وہ بھی ان کو مل جائیگا۔ اس غلبہ کی پیشگوئی
کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ
اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ۔ کہ اے
رسول! جلدی نہ کرو کہ یہ غلبہ کا وعدہ کب آئیگا
بلکہ صبر سے کام لو۔ یقیناً یہ وعدہ پورا ہو کر رہیگا
اور اپنے ذنب کے لئے استغفار کرو۔ غرض پہلے
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کی ہلاکت
کی خبر دی اور پھر غلبہ اور فتح مکہ کی خبر دی اور
استغفار کا حکم دیا۔

دوسری جگہ جہاں استغفار کا حکم ہے۔ وہ
سورۃ محمدؐ کی یہ آیت ہے۔ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ
اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ
لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ۔ اس سے پہلے
یہ آیت ہے فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ
اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَاۗءَ اَشْرَاطُهَا

فَأَنّٰى لَهُمْ إِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰهُمْ۔
سورۃ محمدؐ کا سارا مضمون مخالفینِ اسلام کی تباہی کے ذکر میں ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھائیں گے۔ اور اسلام کو فتح ہوگی۔ اِس مضمون کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ هَلْ يَنْظُرُوْنَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً۔ کہ مخالفینِ اسلام تو بس اِس گھڑی کے منتظر ہیں۔ جس میں مسلمانوں اور کافروں کے درمیان فیصلہ ہو جائے گا کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون اور اس سے پہلے پہلے اسلام کے دلائل پر غور کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے اور سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم اُس وقت جب معاملہ کُھل جائے گا ایمان لے آئینگے۔ لیکن انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ فتح مکّہ کی گھڑی اچانک آ جائے گی۔ ہاں یاد رکھو اس کے قریب آنے کی علامات ظاہر ہو چکی ہیں۔ پھر جب وہ گھڑی آ پہنچے گی ان کا ایمان لانا ان کو کیا فائدہ دے سکتا ہے۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ اے نبی! یہ امر یاد رکھو کہ صرف قادر خدا ایک ہی ہے اسی کے اشارے پر ہر ایک چیز حرکت کرتی ہے۔ پس جب وقت آ جائیگا اللہ تعالیٰ کے فرشتے اُتریں گے اور لوگوں کے دلوں کو تمہاری طرف مائل کر دیں گے اور لوگوں کے لئے اسلام میں داخل ہونے کا راستہ کُھل جائے گا۔ پس ایسے وقت میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو استغفار کرنا چاہیئے۔ نہ صرف اپنے لئے بلکہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لئے اللہ تعالیٰ تمہارے حالات سے بخوبی واقف ہے۔
غرض اِن آیات میں بھی پہلے دشمنوں کی تباہی کا ذکر ہے۔ اور پھر مسلمانوں کی کامیابی اور اسکے بعد استغفار کا حکم ہے تیسری جگہ جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ذنب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے تیرے ذنب پر پردہ ڈال دیا ہے وہ سورۃ فتح کی ابتدائی آیات ہیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا۔ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا۔ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا۔ یعنی اے نبی! ہم تجھے ایک ایسی کھلی فتح عطا کریں گے۔ کہ جس کے بعد ہر ایک پر واضح ہو جائے گا۔ کہ دین اسلام سچا دین ہے۔ اور تم صراطِ مستقیم پر تھے۔ اور اس فتح کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک طرف تم پر فتح سے پہلے ایمان لانے والوں کی تربیت ہو کر انکے نقائص دور ہو جائینگے اور تمہاری بشری کمزوریوں کی وجہ سے انکی تربیت میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو وہ دُور کر دی جائیگی اور فتح کے بعد جو لوگ اسلام میں داخل ہوں گے ان کی تربیت میں اگر تمہاری بشری کمزوریوں کی وجہ سے کوئی نقص رہ جائے گا تو اللہ تعالیٰ اسکو بھی دُور کر دے گا اور تمہاری دُعاؤں کے نتیجہ میں تم پر نعمت کو مکمّل کر دیگا۔ یعنی مسلمانوں میں ایسے لوگ بار بار پیدا ہوتے رہیں گے جو اصلاحِ اُمت کا کام سرانجام دیں گے اور اس کی خرابیوں کو دُور کر کے صحیح مقام پر ان کو قائم رکھیں گے اور دُنیاوی لحاظ سے بھی مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائیگی۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو ترقی کی راہ پر گامزن کر دیگا جس سے وہ خدا تعالیٰ کے انعامات کے مورد ہوتے

رہیں گے اور اللہ تعالیٰ تمہاری ایسی نصرت کریگا کہ کوئی مانع اور مزاحم نہ ہوسکے گا۔

اِن آیات میں بھی پہلے فتح و نصرت کا ذکر ہے۔ اور دشمنوں کی ہلاکت کی پیشگوئی کی گئی ہے اور اس کے بعد ذنب پر مغفرت کر دینے کا ذکر کیا گیا ہے۔

غرض اِن تمام آیات کو دیکھ کر بالطبع یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح اور آپ کے دشمنوں کی مغلوبیت کے ساتھ وہ کونسی بات متعلق ہے جس کے لئے استغفار کا حکم ہے۔ یا وہ کونسی بات ہے جس کے متعلق فرمایا ہے کہ ہم نے اس پر مغفرت کر دی ہے۔ سو جاننا چاہیئے۔ کہ نبی باوجود نبی ہونے کے پھر انسان ہی ہوتا ہے اور انسان کے تمام کام خواہ کسی حد تک وسیع ہوں محدود ہی ہوتے ہیں۔ ایک استاد خواہ کتنا ہی لائق ہو اور ایک وقت میں تیس چالیس نہیں بلکہ سَو سَو اسَو لڑکوں کو بھی پڑھا سکتا ہو۔ اگر اسکے پاس ہزار دو ہزار لڑکے لے آئیں تو نہیں پڑھا سکے گا۔ رسول بھی استاد ہی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن شریف میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت آتا ہے۔ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (سورۃ آل عمران عٓ) کہ اس رسول کا کام یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی آیتیں لوگوں کو سنائے کتاب کی تعلیم دے اور اُن کو پاک کرے اور احکام کا فلسفہ سکھائے۔ غرض نبی ایک استاد ہوتا ہے اس کا کام تعلیم دینا ہوتا ہے اسلئے وہ تھوڑے لوگوں کو ہی دے سکتا ہے کیونکہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کو سبق دینا اور پھر یاد بھی کرا دینا کسی انسان کا کام نہیں ہوسکتا۔ پس جب کسی کے سامنے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی جماعت سبق لینے کے لئے کھڑی ہو تو ضرور ہوگا کہ اس کی تعلیم میں نقص رہ جائے اور لوگ پوری طرح علم نہ حاصل کرسکیں۔ یا یہ ہوگا کہ بعض تو پڑھ جائیں گے اور بعض کی تعلیم ناقص رہ جائے گی اور بعض بالکل جاہل کے جاہل ہی رہ جائیں گے اور کوئی تعلیم حاصل نہ کرسکیں گے۔

پس جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے فتوحات کی خبر دی۔ اور بتایا گیا کہ مکہ فتح ہوگا۔ اور اس کے نتیجہ میں بے شمار لوگ اسلام میں داخل ہوں گے تو آپ کے دل میں جو بڑا ہی پاک دل تھا یہ گھبراہٹ پیدا ہوئی کہ ان تھوڑے سے لوگوں کو تو میں اچھی طرح تعلیم دے لیتا تھا، قرآن کریم سکھا سکتا تھا لیکن یہ جو لاکھوں انسان اسلام میں داخل ہوں گے ان کو میں کس طرح تعلیم دونگا۔ اور مجھ میں جو بوجہ بشریت کے یہ کمزوری ہے کہ اتنے کثیر لوگوں کو تعلیم نہیں دے سکتا اس کا کیا علاج ہوگا۔ اس کا جواب خدا تعالیٰ نے یہ دیا۔ کہ اس میں شک نہیں کہ جب فتح ہوگی اور نئے نئے لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہوں گے تو ان میں بہت سی کمزوریاں ہوں گی۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ سب کے سب آپ سے تعلیم نہیں پاسکتے۔ مگر ان کو تعلیم دلانے کا یہ علاج ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگیں کہ اے خدا مجھ میں بشریت کے لحاظ سے یہ کمزوری ہے کہ اتنے لوگوں کو تعلیم نہیں دے سکتا۔ تُو میری اس کمزوری کو ڈھانپ دے اور وہ اس طرح کہ ان سب لوگوں کو خود ہی تعلیم دیدے اور خود ہی انکو پاک کر دے۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اِسْتَغْفِرْ

لِذَنْبِكَ کے الفاظ کہہ کر اس طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ کہ اسلام میں کثرت سے داخل ہونے والے لوگوں کی تعلیم و تربیت کے لئے آپ خدا تعالیٰ سے دُعا کریں۔ اور التجا کریں۔ کہ اب لوگوں کے کثرت سے آنے کی وجہ سے جو بدنتائج نکل سکتے ہیں ان سے آپ ہی بچائیے۔ اور ان کو خود ہی دُور کر دیجئے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ آپ کا لاکھوں انسانوں کو ایک ہی وقت میں پوری تعلیم نہ دے سکنا کوئی گناہ نہیں۔ بلکہ بشری کمزوری کا نتیجہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے متعلق ذنب کا لفظ تو استعمال ہوا ہے لیکن جُنَاحٌ۔ اِثْمٌ یا جرم کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ گناہ اسے کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت اور قوت کے باوجود اس کے حکم کی فرمانبرداری نہ کی جائے۔ اور وہ بات جس کی خدا تعالیٰ کی طرف سے طاقت ہی نہ دی جائے اس کا نہ کر سکنا گناہ نہیں ہوتا بلکہ وہ بشری کمزوری کہلاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص بیمار ہو جاتا ہے تو یہ اس کا گناہ نہیں بلکہ ایک کمزوری ہے جو بشریت کی وجہ سے اُسے لاحق ہوتی۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ گناہ نہ تھا کہ آپ اس قدر زیادہ لوگوں کو پڑھا نہ سکتے تھے۔ بلکہ خدا تعالیٰ نے آپ کو بنایا ہی ایسا تھا۔ اور آپ کے ساتھ یہ ایسی بات لگی ہوئی تھی جو آپ کی طاقت سے بالا تھی۔ اسلئے آپ کو بتایا گیا کہ ایمان لانے والوں کی کثرت کی وجہ سے جو نقص ان کی تعلیم میں رہ جائیگا اس کے دُور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں۔ پس وہ تمام آیات جن میں آپ کیلئے وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی گناہ کا اظہار مقصود نہیں ہے بلکہ بشری کمزوری کے بدنتائج سے بچنے کی آپ کو راہ بتائی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ وہ بوجھ جو آپ پر پڑنے والا ہے اور آپ کی طاقت سے زائد ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں۔ کہ اس کو اٹھانے اور ذمہ واری کو پوری طرح سے ادا کرنے کی توفیق ملے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ وہ لوگ جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر تربیت زیادہ عرصہ نہ رہ سکے تھے۔ ابتلاؤں اور فتنوں کے وقت ان کا ایمان بھی خراب نہ ہوا اور وہ اسلام جیسی نعمت سے محروم نہ ہوئے۔ گو آپ کی وفات پر کچھ لوگ مرتد ہوئے مگر جلدی ہی واپس آ گئے۔ اور ان فسادوں میں شامل نہ ہوئے جو اسلام کو تباہ کرنے کے لئے شریروں اور مفسدوں نے برپا کئے تھے۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جو عظیم الشان فساد ہوا۔ اس میں عراق۔ مصر۔ کوفہ اور بصرہ کے لوگ تو شامل ہو گئے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایمان لائے تھے لیکن یمن۔ حجاز اور نجد کے لوگ شامل نہ ہوئے۔ یہ وہ ملک تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں فتح ہوئے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان ملکوں کے لوگوں کی جو آپ کے زمانہ میں اسلام لائے تھے بُرائیاں اور کمزوریاں دُور کر دی تھیں۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ امیر معاویہ کا زور اور طاقت تھی کہ شام کے لوگ اس فتنہ میں شامل نہ ہوئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کرامت تھی۔ اور دُعا کا اثر تھا۔ کہ شام کے لوگ حضرت عثمان

رضی اللہ عنہ کے خلاف نہیں اُٹھے۔ کیونکہ گو یہ ملک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فتح نہ ہوا لیکن آپؐ نے اس پر بھی چڑھائی کی تھی جس کا ذکر قرآن شریف کی سورۃ توبہ میں ان تین صحابہ کا ذکر کرتے ہوئے آیا ہے جو اس سفر میں شامل نہ ہوئے تھے۔ پس شام کا اس فتنہ میں شامل نہ ہونا امیر معاویہ کی دانائی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اسلئے تھا کہ وہاں اسلام کا بیج رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بویا گیا۔ اور اس سرزمین میں آپؐ نے قدم مبارک ڈالا تھا۔ پس خدا تعالیٰ نے آپؐ کی دعاؤں میں اس ملک کو بھی شامل کر لیا۔

اس عظیم الشان فتنہ میں اس قدر صحابہ میں سے صرف تین صحابہ کے شامل ہونے کا پتہ لگتا ہے۔ اور ان کی نسبت بھی ثابت ہے کہ صرف غلط فہمیوں کی وجہ سے شامل ہو گئے تھے اور بعد میں توبہ کر لی تھی۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ایک ایسی خصوصیت ہے کہ جو کسی اور نبی کو حاصل نہیں ہوئی۔ اسلئے جہاں آپؐ کی فتح کا ذکر آیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے۔ کہ اسلام میں کثرت سے لوگ داخل ہونے والے ہیں وہاں ساتھ ہی استغفار کا حکم بھی آیا ہے جو آپؐ کو اِس طرف متوجہ کرنے کے لئے تھا کہ ہم آپ کو غلبہ اور عزت دینے والے ہیں اور بے شمار لوگ آپ کے ساتھ شامل ہونے والے ہیں۔ پس یاد رکھیں کہ جب آپ کے پاس بہت سے شاگرد ہو جائیں تو آپ خدا تعالیٰ کے حضور گر جائیں اور عرض کریں کہ الٰہی اب کام انسانی طاقت سے بڑھتا جاتا ہے۔ آپ خود ہی ان نو واردوں کی اصلاح کر دیجئے۔ ہم آپ کی دعا قبول کریں گے اور ان کی اصلاح کر دیں گے اور ان کی کمزوریاں اور بدیاں دور کر کے ان کو پاک کر دیں گے۔

پس قرآن کریم کی وہ آیات جن میں یہ ذکر آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ذنب کے لئے استغفار کرنا چاہیئے۔ اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ آپ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے۔ اور اس کے لئے آپ کو استغفار کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس سے صرف یہ مراد ہے کہ فتوحات کی وجہ سے اور اسلام میں لوگوں کے کثرت سے داخل ہونے کی وجہ سے جو تربیت کا کام بڑھنے والا ہے اور وہ آپ کی طاقتوں سے زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو باحسن وجوہ سرانجام دینے کی طاقت عطا کرے اور اگر اس میں کوئی کمزوری رہ جائے تو اس پر پردہ ڈال دے اور اس کی اصلاح اس طور پر کر دے کہ کوئی بُرا نتیجہ پیدا نہ ہو۔ اور چونکہ یہ نو مسلموں کی تربیت کا کام صحابہ اور صحابیاتؓ نے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے ماتحت کرنا تھا۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۃ محمدؐ کی آیات میں یہ بھی فرما دیا۔ کہ نہ صرف اپنے لئے بلکہ آپ کے ماتحت جو مربی کام کرنے والے ہیں ان کے لئے بھی دعا کر دیں کہ وہ صحیح رنگ میں تربیت کر سکیں۔ اور اگر ان کی تربیت میں کوئی نقص رہ جائے تو اس کا بد نتیجہ نہ نکلے بلکہ اس کی بھی پردہ پوشی ہو جائے۔

خلاصہ کلام یہ کہ سورۃ نصر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اِسْتَغْفِرْهُ کا حکم دینے سے مراد یہ ہے کہ آپ دعا کریں کہ فتوحات کے نتیجے میں جو خرابیاں اُمت محمدیہ میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اللہ تعالےٰ خود ان کی اصلاح کا انتظام فرمائے۔

اور وہ آیات جہاں اِسْتَغْفِرْہُ لِذَنْبِكَ کے الفاظ کہے گئے ہیں ان میں یہ حکم ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دُعا کرنی چاہیئے کہ آپ کے زمانہ میں جو فتوحات ہوں گی اور جن کے نتیجہ میں کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہوں گے اللہ تعالیٰ آپ کو اُن کی تربیت پوری طرح کرنے کی توفیق دے اور اگر تربیت میں کوئی کمی رہ جائے تو اس کمی کے نتیجہ میں جو خرابی پیدا ہو سکتی ہے اس کے بد نتائج سے بچالے۔

اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۔ تَابَ کے معنے ہوتے ہیں فضل کے ساتھ رجوع کیا۔ اور تَوَّاب مبالغہ کا صیغہ ہے اسلئے اس کے معنے ہوں گے بار بار فضل کے ساتھ رجوع کرنے والا۔ گویا اس حصۂ آیت میں اسی مضمون کو ادا کیا گیا ہے کہ اے محمد رسول اللہ! اگر آپ دُعاؤں میں لگ جائینگے تو اللہ تعالیٰ آپ کی دُعاؤں کو ضرور سُنے گا اور اپنے فضل کے ساتھ آپ کی قوم پر بار بار رجوع کرے گا۔ نبوّت، صدیقیت، شہیدیت اور صالحیت چار روحانی انعام ہیں جن کو قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ان انعاموں کا ملنا خدا تعالیٰ کے فضل پر منحصر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ٥ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ٥ (نساء ع ۹) یعنی جو اللہ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت کرے گا تو وہ ان لوگوں کے زمرہ میں شامل ہو جائے گا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا یعنی نبی، صدیق، شہید اور صالح۔ اور ان مقامات کا ملنا اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ بوجہ علیم ہونے کے پوری طرح جانتا ہے کہ کون ان فضلوں کا مورد ہونے کا اہل ہے۔

پس اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا کے الفاظ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی گئی ہے کہ جب بھی آپ کی قوم کو حفاظت کی ضرورت ہو گی جب بھی کسی اصلاح کی ضرورت ہو گی اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت اور اصلاح کے ذرائع پیدا کر دیگا۔ اور اس خرابی کے مناسب حال شخص پیدا کر دے گا چنانچہ واقعات بتاتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا سُنی گئی۔ اور اُمت میں جب بھی کوئی خرابی پیدا ہوئی تو اس کی اصلاح کے لئے اللہ تعالےٰ نے اس کے مناسب حال شخص کھڑا کر دیا۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اُس وقت بڑے بڑے صحابہ گھبرا گئے۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسا زبردست شخص بھی گھبرا گیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صدیقیت کے مقام پر کھڑا کر دیا۔ اور تمام مسلمان ایک ہاتھ پر جمع ہو گئے۔ اور جتنے فتنے اس وقت کھڑے ہوئے ان کا مقابلہ کرنے کی قوت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دی گئی۔ باوجود اس کے کہ آپ کی طبیعت نرم تھی لیکن آپ نے فتنوں کو دبانے کے لئے جو کام کیا اسکو دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ پس حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن دُعاؤں کے نتیجہ میں تھی جو آپ نے اللہ تعالےٰ کے حکم کے ماتحت کیں۔

پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے

ع ۲
اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا میں اسلام کی حفاظت کی پیشگوئی۔

بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کھڑا کر دیا۔ چونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اور ایرانیوں اور شامیوں کے ساتھ مڈھ بھیڑ ہو رہی تھی اسلئے آپ کی وفات کو بے وقت سمجھا گیا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت پر متمکن ہوتے ہی ایسی راہنمائی کی۔ کہ مصر، شام اور فلسطین کے سارے علاقے مسلمانوں کے ماتحت آگئے اور قیصر و کسریٰ کی ساری طاقتیں ختم ہو گئیں۔ اور ایک طرف مسلمانوں کی ایک مستحکم سلطنت قائم ہو گئی اور دوسری طرف مسلمان ایک ہاتھ پر اکٹھے رہے۔ اور ان میں کوئی خرابی پیدا نہ ہوئی۔ بلکہ آپ کی خلافت میں اسلام کا وہ رعب و دبدبہ قائم ہوا کہ مسلمان بڑے بڑے بادشاہوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں کا دوسرا اثر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وجود میں ظاہر ہوا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے وجود بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں کا نتیجہ تھے۔ پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز اور مجددینِ اُمت جو مختلف ممالک اور مختلف زمانوں میں اسلام کی حفاظت اور اسلام کی صحیح صورت کو قائم رکھنے کے لئے کھڑے ہوئے سب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں کی بدولت ہی تھے۔ اور پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تیرہ سَو سال بعد جب ایک طرف آپؐ کے ماننے والے اسلام کو چھوڑ بیٹھے اور اس پر عمل کرنا ترک کر دیا اور دوسری طرف مغربی اقوام نے اسلام پر حملہ بول دیا۔ اور چاہا کہ اسلام کا نام تک مٹا دیا جائے۔ ایسی نازک حالت میں اللہ تعالےٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو مبعوث کر دیا اور آپؑ کے ذریعہ مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت قائم کر دی۔ جو ایک طرف صحیح اسلام کا نمونہ تھی۔ اور دوسری طرف وہ اسلام کے لئے اپنے اموال اور اپنی جانوں کو قربان کرنے والے تھے۔ اور اس طرح اسلام از سرِ نو زندہ ہو گیا۔ چنانچہ کجا تو یہ حالت تھی کہ سمندر پار سے عیسائیوں کے پادری مسلمانوں کے مختلف ممالک میں اسلام پر حملے کر رہے تھے اور کجا یہ حالت ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپاہیوں نے اُن کے ممالک میں پہنچ کر اُن پر حملہ شروع کر دیا۔ اور یکے بعد دیگرے مخالفین میں سے ہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشاق پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ اور اب یہ بات نظر آ رہی ہے کہ وہ دن جلد ہی آنے والا ہے جبکہ تمام مغربی اقوام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے تلے جمع ہوں گی۔ اور ایک ہی رسول ہوگا اور ایک ہی شریعت۔ اور خدا تعالیٰ کی بادشاہت جس طرح آسمان پر ہے زمین پر بھی قائم ہو جائے گی۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ فرمایا تھا کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں کو سُنیگا اور بار بار اپنے فضل کیساتھ آپ کی قوم پر رجوع کریگا وہ پوری شان کیساتھ پورا ہوا ہے اور پورا ہوتا رہیگا۔ کیونکہ اسلام قیامت تک کیلئے ہے اور خدا کے وعدے بھی قیامت تک پورے ہوتے رہیں گے۔ انشاء اللہ

روایات میں آتا ہے کہ جب سورۃ نصر نازل ہوئی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو اس سے اطلاع دی تو آپ نے فرمایا لَیَخْرُجُنَّ مِنْهُ اَفْوَاجًا كَمَا دَخَلُوْا فِيْهِ

اَفْوَاجًا (فتح القدیر) کہ اب تو اسلام میں لوگ گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں لیکن ایک وقت ایسا آئے گا۔ جبکہ مسلمان گروہ در گروہ اسلام کو خیرباد کہنے لگ جائیں گے اور اسلام کے حلقہ سے نکل جائیں گے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودہ سَو فی صدی پورا ہوا ہے۔ چنانچہ اس زمانہ میں جب عیسائیت نے اسلام پر حملہ کیا۔ لوگ کثرت سے اسلام کو چھوڑ کر عیسائیت میں داخل ہو گئے تھے۔ اور اسی طرح سے دوسری تحریکیں جو اسلام کے خلاف چلیں اُن کا شکار ہو گئے تھے۔ پس اسلام کا موجودہ تنزّل بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا بیّن ثبوت ہے۔ کیونکہ ایسے وقت میں جب کہ اسلام دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ اور اس کے تنزّل کا خیال بھی نہیں آ سکتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ ایک وقت وہ بھی آئے گا جبکہ اسلام کے ماننے والے اسکو خیرباد کہہ دیں گے۔ اور گروہ در گروہ اسلام سے نکل کھڑے ہوں گے صرف اور صرف خدائے علّام الغیوب کے علم کی بنا پر ہی ہو سکتا تھا۔ پس جہاں خدا تعالیٰ کی یہ بات پوری ہوئی ہے وہاں دوسری بات بھی پوری ہو گی جو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوائی کہ دوبارہ اسلام زندہ کیا جائے گا۔ اور مسیح موعود کی بعثت کے ذریعے اسلام کا سورج پھر وسطِ آسمان میں چمکے گا۔ اور تمام قومیں اسلام میں داخل ہو کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد کے گیت گائیں گی۔ پس جس طرح سے عالم الغیب خدا کی باتیں پہلے پوری ہوئی ہیں اب بھی پوری ہوں گی۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

روایات میں آتا ہے کہ سورۃ نصر کے نزول پر اللہ تعالیٰ کے حکم فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے یہ دعائیہ کلمات اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے پڑھا کرتے تھے کہ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ (درمنثور) یعنی اے اللہ میں تیری تسبیح کرتا ہوں اور تیری ذات میں سب خوبیوں کے ہونے کا اقرار کرتا ہوں اور تجھ سے بشری کمزوری پر پردہ پوشی چاہتا ہوں اور تیری طرف ہی رجوع کرتا ہوں۔ حضرت ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ کہ یا رسول اللہ آپ یہ دعا بار بار کیوں پڑھتے ہیں۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی قسم کی دعا کرنے کا ارشاد فرمایا ہے اور پھر سورۃ نصر کی آیات پڑھیں۔ بہرحال اس روایت سے ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنی اُمت کیلئے کثرت سے دعائیں کیں تا آپ کی اُمت راہِ راست پر قائم رہے اور جب کبھی اسمیں کوئی خرابی پیدا ہو تو اللہ تعالیٰ ایسے اشخاص کو کھڑا کر دے جو اس خرابی کو دور کر دیں اور یہ کہ خود اللہ تعالیٰ اُمتِ محمدیہ کی تربیت کا انتظام کرتا رہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا سُنی گئی اور اسکا نتیجہ جو کچھ نکلا وہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے اور قیامت تک ایسا ہی ہوتا رہیگا اور جب بھی اسلام کی حفاظت کا سوال پیدا ہوگا اللہ تعالیٰ خود اسکی حفاظت کے سامان پیدا کر دیگا ۰

سُوْرَۃُ اللَّھَبِ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ اللھب - یہ سورۃ مکی ہے

وَھِیَ سِتُّ اٰیٰتٍ مَعَ الْبَسْمَلَۃِ

اور اس کی بسم اللہ سمیت چھ آیات ہیں۔ ؎۱

سورۃ لہب مکی ہے۔

؎۱ سورۃ اللھب مکی سورۃ ہے اور اس بارہ میں کوئی اختلاف نہیں۔ ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس۔ حضرت عائشہ اور ابن الزبیر سے روایت کی ہے۔ کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ (فتح القدیر) تفسیر اتقان میں علامہ سیوطی نے جو ترتیب نزول مختلف راویوں سے بیان کی ہے۔ اس میں سورۃ اللھب کو پانچویں نمبر پر بیان کیا ہے یعنی ان کی تحقیقات میں سب سے پہلے سورۃ العلق نازل ہوئی پھر نون والقلم پھر مزمل پھر مدثر پھر سورۃ اللھب۔ (اتقان النوع الاول فی معرفۃ المکی والمدنی)

گویا یہ سورۃ بالکل ابتدائی سورتوں میں سے ہے وہیری کے نزدیک اس سورۃ کا نزول نبوت کے پانچویں یا چھٹے سال ہوا تھا۔

ترتیب و تعلق مضمون کے اعتبار سے سورۃ اللھب قرآن کریم کی آخری سورۃ ہے۔ کیونکہ ہماری ترتیب کے لحاظ سے اس پر قرآن کریم کا مضمون ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کی تین سورتوں میں قرآن کریم کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔

سورۃ لہب کا خلاصہ مضمون

سورۃ لہب کا تعلق پہلی سورۃ سے

؎۲ اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے یہ تعلق ہے کہ پہلی سورۃ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی گئی تھی کہ وہ فتوحات جو آپ کو ہو رہی ہیں وہ آپ کی حیات تک محدود نہیں بلکہ ان فتوحات کے دروازے آپ کی وفات کے بعد بھی کھلے رہیں گے یہاں تک کہ اسلام دنیا پر غالب آجائیگا۔ اور پھر یہ بھی بیان کیا گیا تھا۔ کہ جب بھی اسلام کو کسی ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو اس کی کشتی کو بھنور سے نکالے اور اس کا جھنڈا سرنگوں نہ ہونے دے۔ اللہ تعالےٰ اُسوقت کسی ایسے شخص کو کھڑا کر دے گا۔ اور اُمت محمدیہ کی دستگیری فرمائیگا۔

سورۃ لہب میں سورۃ نصر کے مضمون کو مکمل کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے۔ کہ صرف یہی نہیں ہوگا۔ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فتوحات کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے اور اسلام غالب ہو جائے گا۔ بلکہ اگر کسی نے اسلام کو مٹانے کے لئے اس پر حملہ کیا تو اللہ تعالےٰ اس حملہ آور کو تباہ کر دے گا۔ نہ صرف اس کو بلکہ ان کو بھی جو اس حملہ آور کی تائید میں ہوں گے۔

ایسے لوگ جو اسلام کے خلاف حملہ آور ہونے والے تھے۔ ان کو اس سورۃ میں ابو لہب کے نام سے پکارا ہے۔ اور ان کو جو ایسے لوگوں کی تائید میں ہوں گے۔ بیوی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ گویا ابو لہب سے مراد ائمہ کفر ہیں اور اس کی بیوی سے مراد ان کے اتباع۔ جیسا کہ آدم علیہ السلام کی بیوی سے مراد آدم کے اتباع بھی ہیں۔ گویا اس سورۃ میں سورۂ نصر میں بیان ہونے والے مضمون کو بیدا شدہ ایک سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ اور

وہ یہ کہ طبعی طور پر دل میں خیال آسکتا تھا کہ اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد فتوحات کے دروازے کھل بھی گئے اور اسلام غالب بھی آگیا۔ لیکن پھر کسی وقت کوئی ایسا زبردست دشمن پیدا ہو گیا جس نے اسلام پر حملہ کر کے اس کے غلبہ کو ختم کر دیا۔ تو اس عارضی غلبہ کا کیا فائدہ؟ اس سوال کا جواب سورۃ لہب میں دیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ اے محمد رسول اللہ! یہ امر اچھی طرح یاد رکھیں۔ کہ نہ صرف یہ کہ اسلام غالب آئے گا بلکہ اس کا غلبہ دائمی ہوگا اگر کسی وقت کسی دشمن نے اسلام پر حملہ کر کے اس کو مٹانے کی کوشش کی۔ تو اللہ تعالےٰ اپنی زبردست طاقت سے ایسے دشمن کو تباہ کر دیگا۔ اور اسلام کی کمزوری کو دور کر کے پھر اسکو غالب کر دے گا۔ اور اگر اسلام کے اندر کسی وقت ضعف پیدا ہوا۔ تو وہ تھوڑی دیر کے لئے ہوگا۔ اور اس کے بعد پھر سے اسلام کا سورج ساری دنیا کو منوّر کرنے لگ جائے گا۔

اس سورۃ کا تعلق سورۃ کوثر سے بھی ہے۔ سورۃ کوثر میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے دو وعدے کئے گئے تھے (۱) کثرت جماعت کا وعدہ۔ (۲) دشمنوں کی تباہی کا وعدہ۔ گویا پہلے وعدہ کے پورا ہونے کا ذکر سورۃ نصر میں کیا گیا ہے۔ اور دوسرے وعدے کے پورا ہونے کا ذکر سورۃ لہب میں ہے۔

اللہ تعالےٰ نے اس سورۃ کو بالکل ابتدائی زمانہ میں نازل فرما کر مسلمانوں کی ہمت بندھائی کہ گھبراؤ نہیں گو تم کمزور اور ضعیف ہو لیکن تمہارا مددگار وہ طاقتور خدا ہے کہ جس کے قبضہ کے ماتحت زمین و آسمان کے ذرات حرکت میں آتے ہیں پس جو بھی تمہاری مخالفت کرے گا وہ رسوا و خوار ہوگا۔ اور تباہی کا منہ دیکھے گا۔ پھر مضمون کے اعتبار سے اس سورۃ کو بالکل آخر میں رکھا۔ تا آئندہ آنے والی نسلوں کے حوصلے بلند ہوں۔ اور کسی زمانہ میں کفر کی طاقت کو دیکھ کر مسلمان گھبرا نہ جائیں۔ بلکہ یہ یقین رکھیں کہ اسلام کا خدا غالب خدا ہے۔ اور وہ اس کے دشمنوں کو خود تباہ کر دے گا۔ گویا سورۃ نصر اور سورۃ لہب اُمّت کے نام دو آخری پیغام ہیں۔ ایک زیادتی ایمان اور ترقی ایمان کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا کفر کی ہلاکت کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے۔

سورۃ لہب کا سبب نزول

اس سورۃ کے سبب نزول کے متعلق مختلف روایات تفاسیر میں بیان ہوئی ہیں۔ سب سے پہلی روایت یہ آتی ہے :-

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكْتُمُ أَمْرَهُ فِي أَوَّلِ الْمَبْعَثِ وَيُصَلِّي فِي شِعَابِ مَكَّةَ ثَلَاثَ سِنِيْنَ إِلٰى أَنْ نَزَلَ قَوْلُهُ تَعَالٰى وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ فَصَعِدَ الصَّفَا وَنَادٰى يَا آلَ غَالِبٍ فَخَرَجَتْ إِلَيْهِ غَالِبٌ مِنَ الْمَسْجِدِ فَقَالَ أَبُوْ لَهَبٍ هٰذِهِ غَالِبٌ قَدْ أَتَتْكَ فَمَا عِنْدَكَ ثُمَّ نَادٰى يَا آلَ لُؤَيٍّ فَرَجَعَ مَنْ لَمْ يَكُنْ مِنْ لُؤَيٍّ فَقَالَ أَبُوْ لَهَبٍ هٰذِهِ لُؤَيٌّ قَدْ أَتَتْكَ فَمَا عِنْدَكَ ثُمَّ قَالَ يَا آلَ مُرَّةَ فَرَجَعَ مَنْ لَمْ يَكُنْ مِنْ مُرَّةَ فَقَالَ أَبُوْ لَهَبٍ هٰذِهِ مُرَّةُ قَدْ أَتَتْكَ فَمَا عِنْدَكَ ثُمَّ قَالَ يَا آلَ كِلَابٍ ثُمَّ قَالَ

بَعْدَہٗ یَا اٰلَ قُصَیٍّ فَقَالَ اَبُوْلَھَبٍ ھٰذِہٖ قُصَیٌّ قَدْ اَتَتْکَ فَمَا عِنْدَکَ فَقَالَ اِنَّ اللّٰہَ اَمَرَنِیْ اَنْ اُنْذِرَ عَشِیْرَتِیَ الْاَقْرَبِیْنَ وَاَنْتُمُ الْاَقْرَبُوْنَ۔ اِعْلَمُوْا اَنِّیْ لَا اَمْلِکُ لَکُمْ مِّنَ الدُّنْیَا حَظًّا وَ لَا مِنَ الْاٰخِرَۃِ نَصِیْبًا اِلَّا اَنْ تَقُوْلُوْا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فَاَشْھَدَ بِھَا لَکُمْ عِنْدَ رَبِّکُمْ فَقَالَ اَبُوْ لَھَبٍ عِنْدَ ذٰلِکَ تَبًّا لَکَ اَلِھٰذَا دَعَوْتَنَا فَنَزَلَتِ السُّوْرَۃُ (تفسیر رازی)

یعنی حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ بعثت کے ابتدائی زمانہ میں یعنی تین سال تک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم زیادہ زور سے تبلیغ نہیں فرماتے تھے اور مکہ کی مختلف گھاٹیوں میں نماز ادا کر لیا کرتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ۔ کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو انذار کرو۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کوہ صفا پر چڑھ گئے اور مختلف قبائل کو بلانا شروع کیا۔ سب سے پہلے آل غالب کو بلایا۔ اور وہ مسجد حرام سے نکل کر آ گئے۔ ابولہب نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہا کہ آل غالب تو آ گئے ہیں اب مقصود بیان کریں لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ابولہب کی بات پر توجہ نہ دی اور لوتی قبیلہ کے افراد کو پکارا۔ اس پر وہ بھی پہنچ گئے۔ پھر ابولہب نے کہا۔ کہ اب تو لوتی قبیلہ بھی آ گیا اب آپ بتائیں کہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی بات کی طرف توجہ نہ دی اور آل مُرّہ کو پکارا۔ چنانچہ وہ بھی پہنچ گئے۔ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے آل کلاب اور آل قصی کو بلایا جب سب آ گئے تو آپ نے اُن سب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ اللہ تعالےٰ نے مجھے حکم دیا ہے۔ کہ میں اپنے اقرباء کو آنے والے عذاب سے خبردار کروں۔ سو تم میرے اقرباء ہو۔ اور تمہیں یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ میں تمہارے لئے دنیا اور آخرت سے کسی چیز کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ سوائے اس کے کہ تم خدا تعالےٰ کی توحید کا اقرار کرو۔ اور لا اِلٰہ اِلّا اللہ کہو۔ اس پر ابولہب غصّہ میں آ گیا۔ اور اس نے بڑے جوش سے کہا تَبًّا لَکَ یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم ہلاکت کا مُنہ دیکھو۔ کیا تم نے اسی غرض کے لئے ہمیں جمع کیا تھا؟ ابولہب کے اس قول کے مطابق یہ سورۃ نازل ہوئی۔ اور یہ بتایا گیا۔ کہ تبّاہی ابولہب کے لئے ہوگی نہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے۔

دوسری روایت سبب نزول کے متعلق یہ بیان ہوئی ہے۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ صَعِدَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی الصَّفَا فَجَعَلَ یُنَادِیْ یَا بَنِیْ فِھْرٍ یَا بَنِیْ عَدِیٍّ لِبُطُوْنِ قُرَیْشٍ حَتّٰی اجْتَمَعُوْا فَجَعَلَ الرَّجُلُ اِذَا لَمْ یَسْتَطِعْ اَنْ یَّخْرُجَ اَرْسَلَ رَسُوْلًا لِیَنْظُرَ مَا ھُوَ فَجَاءَ اَبُوْلَھَبٍ وَ قُرَیْشٌ فَقَالَ اَرَاَیْتَکُمْ لَوْ اَخْبَرْتُکُمْ اَنَّ خَیْلًا بِالْوَادِیْ تُرِیْدُ اَنْ تُغِیْرَ عَلَیْکُمْ اَکُنْتُمْ مُصَدِّقِیَّ قَالُوْا نَعَمْ مَا جَرَّبْنَا عَلَیْکَ اِلَّا صِدْقًا قَالَ فَاِنِّیْ نَذِیْرٌ لَّکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ۔ فَقَالَ اَبُوْلَھَبٍ تَبًّا لَکَ سَائِرَ الْاَیَّامِ اَلِھٰذَا جَمَعْتَنَا فَنَزَلَتْ وَیُرْوٰی اَنَّہٗ مَعَ ذٰلِکَ الْقَوْلِ

اَخَذَ بِيَدَيْهِ حَجَرًا لِيَرْمِيَ بِهَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (روح المعانی)

یعنی جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ کی آیت نازل ہوئی۔ تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کوہ صفا پر چڑھے اور عرب کے مختلف قبائل کو پکارنے لگے۔ یہاں تک کہ لوگ کوہ صفا پر پہنچ گئے۔ اور جو خود نہ آسکا۔ اس نے اپنا ایلچی بھیجدیا۔ تا کہ معلوم کرکے اطلاع دے کہ کس غرض کے لئے بلایا گیا ہے چنانچہ اس موقعہ پر قبیلہ قریش اور ابولہب بھی پہنچ گیا۔ تب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے لوگو! اگر میں تم کو یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کے پرے وادی میں ایک لشکر چھپا ہوا ہے جو تم پر شب خون مارنا چاہتا ہے۔ تو کیا تم میری بات مان لوگے؟ لوگوں نے کہا۔ کیوں نہیں۔ ہمارا یہ تجربہ ہے کہ آپ ہمیشہ سچ بولا کرتے ہیں۔ اس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لو سنو! میں تمہیں ایک اہم خبر سناتا ہوں۔ کہ میں اللہ تعالیٰ کیطرف سے رسول بناکر بھیجا گیا ہوں۔ اور میں تم کو آنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں۔ اس پر ابولہب بھڑک اٹھا۔ اور اس نے کہا تَبًّا لَكَ اے محمد (نعوذ باللہ) تم پر ہلاکت ہو۔ کیا تم نے اس معمولی سی بات کے لئے ہم کو جمع کیا تھا؟ چنانچہ اس کے جواب میں یہ سورۃ نازل ہوئی۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے۔ کہ ابولہب نے ایک پتھر اپنے دونوں ہاتھوں سے اٹھاکر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر پھینکنا چاہا۔ اس لئے یہ آیت نازل ہوئی کہ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ کہ ابولہب کے دونوں ہاتھ تباہ ہو گئے۔

غرض یہ دو روایات سورۃ لہب کے سبب نزول کے متعلق بیان کی جاتی ہیں۔ لیکن اس بارہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ آیات کے سبب نزول کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کچھ بھی مروی نہیں۔ صرف صحابہ کرام کی بیان کردہ روایات ہوتی ہیں جنمیں بعض اوقات اُن میں اختلاف بھی ہو جاتا ہے۔ اور ایک آیت کے متعلق کئی کئی سبب نزول بیان ہو جاتے ہیں۔ اس سورۃ کے متعلق بھی جو سبب نزول بیان کیا گیا ہے وہ حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے۔ اور تفاسیر میں اس سورۃ کے متعلق ان کے سوا کسی اور کی طرف سے بیان کردہ روایت نہیں پائی جاتی۔ حالانکہ یہ سورۃ ابتدائی زمانہ کی ہے اور اس زمانہ کے صحابہ میں سے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت علیؓ بڑے پایہ کے ہیں۔ لیکن انہوں نے کوئی روایت نہیں کی۔ حضرت ابن عباسؓ تو اُس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے جب کہ یہ سورۃ نازل ہوئی۔ انہوں نے مدینہ میں جاکر ہوش سنبھالی ہے۔ اور ان کا علم مکی سورتوں کے متعلق صرف سماعی ہے۔ پس ان حالات میں ہم یہ حتمی طور پر نہیں کہہ سکتے۔ کہ اس سورۃ کے متعلق بیان کردہ شان نزول قطعی اور یقینی ہے۔ بیشک قرآن کریم کی ہر سورۃ کے پہلے مصداق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے زمانہ کے لوگ ہی ہیں لیکن جیسا کہ پہلی سورتوں میں بتایا جا چکا ہے آخری چند سورتوں کی ترتیب یہ ہے کہ ایک سورۃ زیادہ تر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی طرف توجہ دلاتی ہے اور ایک زیادہ تر آخری زمانہ کی طرف۔ ہماری ترتیب کے مطابق سورۃ لہب اس مقام پر ہے جو زیادہ تر آخری زمانہ کی طرف توجہ دلاتی ہے کیونکہ سورۃ لہب سے پہلی سورۃ یعنی سورۂ نصر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔

مفسرین کہتے ہیں۔ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ایک چچا کا نام عبدالعزیٰ تھا جسکی کنیت ابولہب پڑ گئی تھی۔ کیونکہ اس کا رنگ بہت سرخ و سفید تھا

قرآن شریف نے سورۃ لہب میں اس کی مخالفتوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ مخالفت کے لحاظ سے ابوجہل جس کا نام ابوالحکم تھا عبدالعزیٰ سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ اور سارے قرآن کریم کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسی مخصوص دشمن یا منافق کا نام قرآن کریم میں نہیں آیا۔ بلکہ اگر کسی دشمن کا ذکر آیا ہے تو اشارہ کے ساتھ آیا ہے۔ جو عام الفاظ میں ہے۔ اور مختلف انسانوں پر چسپاں ہوسکتا ہے۔ مثلاً آدمؑ کے دشمن کو دو صفاتی ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ ایک شیطان اور ایک ابلیس (دیکھو سورۃ بقرہ ع۴ و اعراف ع۲ و طٰہٰ ع۷) یعنی وہ حق سے دور تھا اور خدا کی رحمت سے مایوس تھا۔ اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ایک شدید مخالف کو جو آپ کے خلاف لوگوں کو لڑائی کے لئے اکساتا تھا شیطان کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ لیکن اس کا اصل نام نہیں لیا (سورۃ الانفال ع۶ آیت ۴۸) اس سورۃ میں بھی ایسے الفاظ نہیں ہیں جن سے کسی خاص شخص کی طرف اشارہ ہو۔ بلکہ کئی لوگوں پر یہ مضمون چسپاں ہوسکتا ہے۔

اس طریق کلام کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ عبدالعزیٰ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا وہ مخالفت میں کئی اور دشمنوں سے ادنیٰ تھا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سورۃ میں جہاں تک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے بعض ایسے دشمنوں کا ذکر کیا گیا ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لڑائی پر لوگوں کو اکساتے تھے۔ اور مفسرین کا یہ کہنا کہ اس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ایک ایسے چچا کا ذکر ہے۔ جس کا چہرہ سرخ و سفید تھا درست معلوم نہیں ہوتا۔ ابولہب کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ وہ شخص آگ بھڑکاتا تھا۔ اور آیت وَامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ بھی بتاتی ہے۔ کہ یہاں آگ بھڑکانے کا ذکر ہے؛ چہرہ کی سفیدی کا ذکر نہیں۔ اگر چہرہ کی سفیدی کی وجہ سے کسی کو ابولہب کہا گیا ہے۔ تو اس کی بیوی کے لکڑیاں اٹھا کر لانے اور آگ میں جھونکنے کا کیا مطلب ہے۔ کیا اس کی لکڑیوں سے ابولہب کے چہرہ کی سفیدی بڑھا کرتی تھی؟ پس حقیقت یہ ہے۔ کہ اس سورۃ میں اُن شدید دشمنوں کا ذکر ہے۔ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف فتنہ کی آگ بھڑکاتے رہتے تھے۔ اور بتایا ہے کہ وہ ناکام رہیں گے۔ لیکن سورتوں کی ترتیب کو مدنظر رکھتے ہوئے (جو تفسیر میں سب سے اہم مقام رکھتی ہے) اس سورۃ میں آخری زمانہ کا ذکر ہے۔ اور ایک ایسی قوم کا ذکر ہے۔ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف یا اسلام کے خلاف سخت آگ بھڑکائے گی۔ اور بتایا گیا ہے کہ وہ جماعت کوشش کرکے اپنی ہمسایہ قوموں کو اپنے ساتھ ملائے گی۔ اور وہ اس کے ہاتھ کی مانند ہوں گے یعنی اس کے مددگار ہوں گے۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اس زمانہ میں دو ہی جتھے ایسے ہیں۔ جو کہ اسلام یا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف متحد ہیں۔ ایک جتھہ بعض مغربی طاقتوں پر مشتمل ہے اور ایک جتھہ مشرقی طاقتوں اور ان کے ساتھیوں کا ہے۔ ابولہب سے مراد یہ دونوں جتھے ہیں۔ جو ظاہر میں بھی ابولہب ہیں۔ کیونکہ ان کے رنگ سرخ و سفید ہیں۔ اور باطنی لحاظ سے بھی ابولہب ہیں۔ کیونکہ آگ کی جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اور ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم تیار کر رہے ہیں۔ اور اس لحاظ سے بھی وہ ابولہب ہیں کہ اُن میں سے بعض رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف لٹریچر

پیدا کرتے رہتے ہیں اور اسلامی حکومتوں کے خلاف کارروائیاں کرتے رہتے ہیں۔ اور ایک جتھہ ایسا ہے جو اللہ تعالیٰ کے خلاف کوشش کر رہا ہے۔ اور دہریت پھیلا رہا ہے۔ یعنی مشرقی جتھہ۔ جس نے بہت بڑی اسلامی حکومتوں کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ مثلاً سمرقند۔ بخارا اور سنکیانگ کے علاقے اس نے اپنے قبضہ میں کر لئے ہیں۔ اور ٹرکی اور عراق اور ایران کے خلاف وہ منصوبے کرتا رہتا ہے پس یہ دونوں طاقتیں اس وقت اپنی ظاہری تدبیروں اور مذہبی مخالفتوں کی کی وجہ سے ابولہب کہلانے کی مستحق ہیں۔

اس سورۃ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ابولہب کے نام کی مستحق اقوام جو آخری زمانہ میں پیدا ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اور اُن کے ساتھیوں کو ناکام کر دیگا یہ ایک سیاسی سوال ہے جس میں ہم پڑنا نہیں چاہتے کہ اس وقت مشرقی طاقت کے کون سے دو مؤید ہیں۔ جو اس کی جنگی کارروائیوں میں اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اور مغربی جمہوریت کے کون سے دو مؤید ہیں جو اس کی جنگی طاقتوں میں اس کی مدد کر رہے ہیں۔ بہرحال یہ ظاہر ہے کہ ایک طرف مغربی جمہوریت اپنے ساتھی بڑھا رہی ہے۔ اور ایک طرف اس کے مقابل کی مشرقی طاقت اپنے ساتھی بڑھا رہی ہے۔ اور دونوں جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ یہ سورۃ بتاتی ہے کہ یہ اتحاد کام نہ دیں گے۔ اور جن ہاتھوں پر امیدیں کی جا رہی ہیں۔ اُنہی ہاتھوں کو خدا شل کر دے گا۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ علاوہ غیر قوموں کے جو کہ بطور ہاتھ کے ہیں۔ خود ان ملکوں میں بھی ایسے گروہ پائے جائیں گے جو کہ خدا تعالیٰ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کرنے کے لئے اپنی حکومتوں کو بھڑکائیں گے۔ صاف ظاہر ہے۔ کہ ایسے گروہ مغربی ممالک میں بھی موجود ہیں اور مشرقی ممالک میں بھی موجود ہیں۔ ان گروہوں کا نام اس مناسبت سے کہ وہ اندرونی ہیں اِمْرَاَتُہٗ رکھا گیا ہے یعنی بیوی۔ اور فرماتا ہے کہ ابولہب کی بیوی بھی تباہ ہو جائیگی یعنی ان قوموں کے وہ گروہ بھی کمزور ہو جائیں گے اور نقصان اٹھائیں گے جو لکڑیاں ڈال ڈال کر حکومت کی آگ کی طاقت کو بڑھا رہے ہیں لکڑیاں ڈالنے سے اس جگہ مراد یہ ہے کہ وہ حکومت کو شہ دلاتے ہیں کہ تم ایسے کام کرو۔ جیساکہ مغربی ممالک میں ایسے لوگ موجود ہیں جو کہ اسلام کے خلاف لٹریچر لکھواتے ہیں اور اسرائیل کی تائید کے لئے ان ممالک کو اکساتے رہتے ہیں۔ اسی طرح مشرق میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی قوم کو اور اپنی حکومت کو دہریت کی تائید میں اکساتے رہتے ہیں۔ اور توحید کے خلاف جنگ پر آمادہ کرتے رہتے ہیں۔

اس سورۃ سے پتہ لگتا ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ اِن دونوں فتنوں کو دور کر دے گا۔ نہ مغربی جمہوریت کے اشتعال پسند لوگ محفوظ رہیں گے نہ اس کے مقابل کی مشرقی طاقت کے اشتعال پسند لوگ محفوظ رہیں گے۔

پھر فرماتا ہے۔ کہ باوجود بچنے کی ساری تدبیروں کے ان کو کسی جنگ میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ جو بڑی شعلوں والی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شائد کسی وقت ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی جنگ ہو جائے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ چاہے تو جیساکہ قرآن شریف کی آیات سے پتہ لگتا ہے، عذاب ٹل بھی جایا کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کیطرف رجوع کریں اور سچی توبہ اور استغفار سے کام لیں۔ تو یہ عذاب ٹل بھی سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اسی شکل میں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّ تَبَّ ؕ۝

شعلہ کے باپ کے دونوں ہاتھ ہی شل ہو گئے ہیں۔ اور وہ (خود) بھی شل ہو کر رہ گیا ہے ۲؎

آئے۔ ممکن ہے کہ ایٹم بم کی جگہ اصولوں کی مخالفت اور مقابلہ کی صورت میں ہی یہ پیشگوئی پوری ہو جائے۔

تَبَّتۡ

لَہَب

۲؎ حل لغات:- تَبَّتۡ۔ تَبَّ سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور تَبَّ یَتُبُّ تَبًّا کے معنے ہیں هَلَكَ وَ خَسِرَ۔ تباہ و برباد ہو گیا اور اس نے نقصان اٹھایا۔ اور جب تَبَّتۡ یَدَاہُ کا فقرہ بولیں تو اس کے معنی ہوں گے هَلَكَتَا وَ خَسِرَتَا۔ اس کے دونوں ہاتھوں نے نقصان اٹھایا اور تباہ ہوئے (اقرب)

مفردات امام راغب میں لکھا ہے اَلتَّبُّ وَالتَّبَابُ اَلْاِسْتِمْرَارُ فِی الْخُسْرَانِ۔ یعنی اَلتَّبُّ وَالتَّبَابُ (جو تَبَّ فعل کے مصدر ہیں) کے معنے ہیں ہمیشہ گھاٹا اٹھانا۔ اور تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ کے معنے ہیں اِسْتَمَرَّتْ فِیْ خُسْرَانِہٖ ابولہب کے دونوں ہاتھ ضرور نقصان اٹھائیں گے

اَلۡیَدُ

اَلْیَدُ:- اَلْیَدُ کے معنے ہیں اَلْکَفُّ۔ ہاتھ۔ نیز اس کے معنے ہیں اَلْجَاہُ وَالْوَقَارُ عزت و رتبہ۔ اَلْقُوَّۃُ وَالْقُدْرَۃُ وَالسُّلْطَانُ وَالْوَلَایَۃُ۔ قوت و طاقت۔ بادشاہت اور غلبہ۔ اَلْجَمَاعَۃُ۔ جماعت۔ اَلنِّعْمَۃُ وَالْاِحْسَانُ احسان اور نعمت۔ (اقرب)

آنحضرت صلعم کی صداقت کی ایک عظیم الشان دلیل

اَلۡاَبُ

اَلْاَبُ:- اَلَّذِیْ یَتَوَلَّدُ مِنْہُ اٰخَرُ مِنْ نَوْعِہٖ۔ یعنی اس وجود کو جس سے اسی نوع کی چیز پیدا ہو جس نوع کا وہ خود ہے، اب کہتے ہیں یعنی والد۔ نیز اَبٌ کے معنے ہیں مَنْ کَانَ سَبَبًا فِیْ اِیْجَادِ شَیْءٍ اَوْ اِصْلَاحِہٖ اَوْ ظُھُوْرِہٖ۔ جو کوئی کسی چیز کے ایجاد کرنے یا ظاہر کرنے اور وجود میں لانے کا سبب ہو اسکو بھی اب کہتے ہیں (اقرب)

لَھَبٌ:- لَھَب لَھِبَ کا مصدر بھی ہے اور اسم بھی ہے۔ لَھِبَتِ النَّارُ کے معنے ہوتے ہیں اِشْتَعَلَتْ خَالِصَۃً مِّنَ الدُّخَانِ آگ ایسی تیزی سے بھڑک اٹھی کہ اس میں دھواں باقی نہ رہا۔ اور اَللَّھَبُ کے معنے ہوتے ہیں۔ لِسَانُ النَّارِ۔ یعنی آگ کا شعلہ (اقرب)

پس ابولہب کے معنے ہوں گے شعلوں کا باپ۔ یعنی ایسی چیزوں کا موجد جو آگ کو بھڑکائیں۔

تفسیر:- محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور آپ کے منجانب اللہ ہونے کے دلائل میں سے ایک زبردست دلیل یہ ہے کہ جب آپ نے دعویٰ کیا۔ اس وقت آپ نے اللہ تعالےٰ کی وحی کے مطابق اعلان کیا۔ کہ آپ جس مقصد کو لے کر کھڑے ہوئے ہیں اس میں آپ بہرحال کامیاب ہوں گے۔ گو دنیا آپ کی مخالفت کرے گی لیکن کوئی شخص آپ کا بال تک بیکا نہیں کر سکے گا۔ آپ وہ کونے کا پتھر ہیں کہ جس پر آپ گرے وہ بھی چکنا چور ہو گا

اور جو آپ پر گرے گا وہ بھی چکنا چور ہو جائے گا تاریخ شاہد ہے۔ کہ آپ کا یہ دعویٰ درست نکلا۔ دعویٰ کے بعد مخالفت کے بڑے بڑے طوفان آئے لوگوں نے آپ کے قتل کے منصوبے کئے۔ آپ کے متبعین کو ختم کرنے کی تدبیریں کی گئیں۔ ایسے حالات میں جبکہ کامیابی کی کوئی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بار بار یہی اعلان فرماتے کہ آپ کامیاب ہوں گے۔ اسلام مغرب و مشرق میں پھیل جائیگا ساری دنیا آپ کے جھنڈے تلے جمع ہو گی۔ اور پھر یہی نہیں کہ اسلام کی زبردست حکومت قائم ہو جائے گی بلکہ آخر اس پر ایک ایسا وقت آئے گا۔ جب اسلام کے ماننے والے قرآن کریم پر عمل کرنا چھوڑ دیں گے۔ ان پر تنزل وادبار آ جائے گا۔ انکی حکومتیں ختم ہو جائیں گی۔ اور بعض نئی برسر اقتدار آنے والی قومیں اسلامی ممالک کو دبا لیں گی اور اسلام بے سروسامانی کی حالت میں ہو جائے گا تب اللہ تعالےٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کو دنیا میں دوبارہ بھیجے گا اور پھر اسلام زندہ ہو گا۔ اور اس کے دشمن ختم ہوں گے۔ اور اسلام کا دوبارہ احیاء ہو گا۔ یہ وہ خبریں ہیں۔ جو قرآن کریم میں ہمیں کثرت سے ملتی ہیں اور ایسی خبریں اور اُن کی تفصیلات رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کے سامنے بیان فرمائیں۔ جن میں سے بعض احادیث کی کتب میں محفوظ ہو کر ہم تک پہنچ گئی ہیں۔ اور یہ سب باتیں لفظاً لفظاً پوری بھی ہو گئیں پس ایسے وقت میں جبکہ بظاہر کامیابی کے امکانات نظر نہیں آتے تھے۔ اپنی ترقی اور اپنے عروج کی خبریں دینا اور عروج کے بعد پھر قوم کے تنزل کی پیشگوئی کرنا اور پھر کہنا کہ اس تنزل کے بعد پھر عروج ہو گا یہ سب کچھ محض دماغ کے تصورات نہیں ہو سکتے۔ بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالےٰ نے ہی یہ سب خبریں دی تھیں تبھی تو غیر معمولی حالات میں پوری ہوئیں۔ پس ان سب خبروں کا پورا ہونا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ اور یہ بتاتا ہے کہ آپ منجانب اللہ تھے۔

آج یوروپین ممالک بام عروج پر پہنچے ہوئے ہیں۔ اُن کی تہذیب۔ اُن کا تمدن اور اُن کی ایجادات کو دیکھ کر سب دنیا دنگ ہے اور یہ لوگ خود بھی ان سب باتوں کو اپنی فوقیت میں پیش کرتے ہیں۔ آج ہر ملک کی نگاہ ان کی طرف اٹھتی ہے۔ اور ہر قسم کے علوم کا منبع ان کے ممالک کو سمجھا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی وہ حکومتیں جن سے دنیا کانپ اٹھتی تھی۔ جن کے سامنے یوروپین ملکوں کے لوگ شاگردوں کی طرح بیٹھتے تھے۔ جن کے گھوڑوں نے ان کے ملکوں کو روند ڈالا۔ آج سمٹ سمٹا کر محدود علاقوں میں رہ گئی ہیں۔ وہ شیر جس کے سامنے سب ممالک چوہوں کی طرح تھے۔ آج وہ شیر اتنا کمزور اور ضعیف ہے کہ یہ چوہے اس کے جسم پر دوڑتے پھر رہے ہیں اور اس کو نوچتے ہیں اور شیر میں اتنی قوت نہیں کہ ان چوہوں کو بدن سے ہٹا سکے۔

آج کا مسلمان بھی مایوس ہو چکا ہے اور سمجھتا ہے کہ اسلام آج ہے تو کل نہیں۔ اور جو کوئی یوروپین ممالک میں جاتا ہے اور وہاں کی ترقی اور عروج کو بنظر خود مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ مجسم یاس اور ناامیدی بن جاتا ہے اور واپس پہنچکر یہی پیغام دیتا ہے کہ اسلام کا اب خدا ہی حافظ ہے۔ بظاہر اس کے دوبارہ ترقی کرنے کا امکان نہیں۔ کیونکہ ایک طرف اس کے دشمنوں نے اس کی سیاسی طاقت کو ختم کر دیا ہے اور دوسری طرف اسلام کے ماننے والوں نے خود اسلام کو

خیر باد کہہ دیا اور یورپ کو اپنا امام سمجھ کر اُس کی اقتداء کو فخر خیال کرنے لگ گئے۔ اور انہوں نے یہ بھلا دیا کہ ایک مسلمان کو جو کتاب بطور مکمل ضابطہ حیات کے دی گئی ہے۔ وہ اس لئے نہیں کہ یہ دوسروں سے راہنمائی حاصل کرے۔ بلکہ اس لئے ہے تا لوگ اس کے نور سے منور ہوں اور اس کی پیروی سے دین و دنیا میں فائدہ اٹھائیں۔

اسلام کے عروج و زوال کی پیشگوئیاں

درحقیقت اسلام کا تنزل اور یورپین ممالک کا یہ عروج بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی ایک زبردست دلیل ہے۔ کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ سب خبریں آج سے تیرہ سو سال پہلے بتادی تھیں۔ اور اتنی تفصیل سے بتائیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سینما کی فلم دکھائی جاتی ہے۔ اسی طرح آپ کو وہ تمام حالات پردہ پر دکھا دئے گئے جن سے اسلام دوچار ہونیوالا تھا۔ اور ان سب واقعات کے رونما ہونے نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر مُہر لگادی۔ کیونکہ اتنا علم غیب جتنا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا۔ کبھی کسی شخص کو اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتا جب تک کہ خدا تعالے عالم الغیب اُس کو نہ بتائے۔ پس اسلام کا یہ ضعف، یہ بے کسی اس واسطے نہیں کہ ہم گھبرا جائیں۔ ہم مایوس ہو جائیں بلکہ جس خدا نے اسلام کے تنزل کی خبر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دی اور آپ نے اپنے صحابہ کو بتائی اور وہ لفظ بلفظ پوری بھی ہوئی۔ اُسی خدا کی طرف سے آپ کو ایک اور خبر بھی دی گئی اور وہ یہ کہ اسلام دوبارہ ترقی کرے گا اور اپنے دشمنوں پر غالب آئے گا۔ اس سے ٹکرانے والے پاش پاش ہوں گے۔ اور اسلام کا جھنڈا ساری دنیا پر لہرائیگا لیکن یہ سب کچھ خدا تعالے خود کرے گا۔ جس طرح کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوا تھا اسی طرح آخری زمانہ میں دوبارہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح دنیا میں آئے گی اور خدا کی نصرت اور اس کے فضل کو جذب کرے گی۔ اور ملائکہ کی فوجیں آسمان سے اُتر کر کمزوروں کو طاقتور اور سلطنتوں کا وارث بنادیں گی۔ پس کسی مسلمان کے لئے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اُسے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھنا چاہیئے۔ اور انتہائی کوشش میں لگے رہنا چاہیئے کہ مناسب اسباب اور ذرائع کے اختیار کرنے سے جلد سے جلد وہ مقصد حاصل ہو جائے۔ اور پورے وثوق کے ساتھ اُس وقت کا انتظار کرنا چاہیئے۔ جس کی خبر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دی ہوئی ہے۔

ذیل میں ہم بعض اُن اخبار کا ذکر کرتے ہیں جو قرآن کریم اور حدیث میں موجودہ زمانہ کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔ اور ان کا تعلق سورۂ لہب کے مضمون کے ساتھ ہے۔ تا ایک مسلمان کے لئے اُن کو پڑھ کر زیادتی ایمان کا موجب ہو۔ کہ کس طرح آج سے تیرہ سو سال قبل بیان کی ہوئی خبریں پوری ہو رہی ہیں۔ اور وہ یہ یقین کرلے۔ کہ دوسری خبریں جو اسلام کی ترقی کے متعلق ہیں وہ بھی اسی طرح پوری ہوں گی جس طرح سے یہ خبریں پوری ہوئی ہیں۔

سو جاننا چاہیئے۔ کہ آخری زمانہ میں اسلام نے جن مصائب اور فتنوں سے دوچار ہونا تھا۔ ان فتنوں میں سے دو وجودوں کا خاص طور پر ذکر آتا ہے۔ اور اُن وجودوں کے فتنوں کا خاص طور پر ذکر کرنے کی یہ وجہ ہے کہ اُن سے اسلام کو خاص طور پر نقصان پہنچنا تھا۔ ایک وجود کا نام دجال رکھا گیا ہے۔ اور

اور دوسرے فتنہ کے دو ظہور بیان کئے گئے ہیں۔ ایک ظہور کا نام یاجوج اور ایک کا نام ماجوج بتایا گیا ہے۔ چنانچہ مسلم کی حدیث میں ہے :-

عَنْ حُذَیْفَۃَ ابْنِ اُسَیْدِ الْغِفَارِیِّ قَالَ اِطَّلَعَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَیْنَا وَنَحْنُ نَتَذَاکَرُ فَقَالَ مَا تَذْکُرُوْنَ قَالُوْا نَذْکُرُ السَّاعَۃَ قَالَ اِنَّھَا لَنْ تَقُوْمَ حَتّٰی تَرَوْا قَبْلَھَا عَشْرَ اٰیٰتٍ۔ فَذَکَرَ الدُّخَانَ وَالدَّجَّالَ۔ وَالدَّابَّۃَ وَطُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِھَا۔ وَنُزُوْلَ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ وَیَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ وَثَلٰثَۃَ خُسُوْفٍ خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ وَخَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ وَخَسْفٌ بِجَزِیْرَۃِ الْعَرَبِ۔ وَاٰخِرُ ذٰلِکَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ الْیَمَنِ تَطْرُدُ النَّاسَ اِلٰی مَحْشَرِھِمْ (مسلم بحوالہ مشکوۃ کتاب الفتن باب العلامات بین یدی الساعۃ)

یعنی حذیفہ ابن اسید الغفاری کہتے ہیں کہ ایک دن ہم چند لوگ بیٹھے قیامت کا ذکر کر رہے تھے۔ کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم پر جھانکا اور دریافت فرمایا کہ کیا باتیں کر رہے ہو ہم نے عرض کیا کہ ہم قیامت کا ذکر کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے برپا ہونے سے قبل دس علامات کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔ اور آپ نے حسب ذیل علامات گنوائیں۔

دخان۔ خروج دجال، خروج دابہ۔ طلوع الشمس من المغرب۔ نزول عیسیٰ بن مریم۔ خروج یاجوج و ماجوج۔ اور تین ایسے واقعات جن سے لوگ زمین میں دھنسیں گے۔ ایک ایسا واقعہ مشرق میں ہوگا۔ اور ایک مغرب میں اور ایک جزیرہ عرب میں۔ اور آخری علامت یہ بتائی کہ یمن کی طرف سے ایک آگ نکلے گی۔

ان علامات میں دجال اور یاجوج اور ماجوج کے نکلنے کا ذکر ہے۔ اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ دونوں فتنے آپس میں ملتے جلتے ہیں اور ایک ہی فتنہ کی مختلف شاخیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں یاجوج و ماجوج کا تو ذکر آتا ہے۔ لیکن دجال کا ذکر نہیں آتا۔ حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اہمیت زیادہ بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

ذَکَرَ الدَّجَّالَ فَقَالَ اِنِّیْ لَاُنْذِرُکُمُوْہُ وَمَا مِنْ نَّبِیٍّ اِلَّا اَنْذَرَہٗ قَوْمَہٗ لَقَدْ اَنْذَرَہٗ نُوْحٌ قَوْمَہٗ (کنز العمال جلد ۷ ص۱۹۵ بحوالہ ابوداؤد و ترمذی)

یعنی دجال کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس نے اپنی اُمت کو دجال سے ہوشیار نہ کیا ہو۔ نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو اس سے ہوشیار کیا۔ اور میں بھی اس کی خبر دیتا ہوں اور قوم کو ہوشیار رہنے کی تلقین کرتا ہوں۔

پس اتنے بڑے فتنے کا ذکر قرآن کریم میں نہ آنا اور یاجوج ماجوج کا ذکر آنا بتاتا ہے کہ درحقیقت یاجوج و ماجوج اور دجال کا فتنہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یا ایک ہی فتنہ کی دو شاخیں ہیں۔ اس کی مزید تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ دجال اور یاجوج و ماجوج کا ایک ہی زمانہ ہے۔ اور پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ دونوں ساری دنیا پر غالب آجائیں گے یہ باتیں بتاتی ہیں کہ یہ دجال اور یاجوج و ماجوج کے فتنے کوئی الگ قسم کے فتنے یا الگ زمانوں کے فتنے نہیں تھا

خروج دجال اور یاجوج و ماجوج کے متعلق پیشگوئی

بلکہ ایک ہی فتنہ کے مختلف مظاہر ہیں۔ درحقیقت دجال مذہبی پہلو سے اس فتنہ کا نام رکھا گیا ہے۔ دجّال کے معنے ہوتے ہیں۔ ملمع ساز۔ فریب کرنیوالا۔ پس آخری زمانہ کا فتنہ جس سے کہ بنو اسرائیل کے انبیاء بھی ڈراتے رہے ہیں۔ اس کے دو حصے ہونے تھے۔ ایک حصہ تو مذہبی عقائد اور مذہبی خیالات میں فساد پیدا کرنیکے متعلق تھا اور ایک حصہ سیاسی حالات اور سیاسی امن کو برباد کرنیکے متعلق تھا۔ جو مذہبی عقائد سے متعلق فتنہ تھا اس کے بھڑکانیوالی رُوح کو دجّال کہا گیا ہے یعنی فریب اور دھوکا دینے والی ہستی۔ اور جو فتنہ کہ سیاسی پہلوؤں کے ساتھ تعلق رکھنے والا تھا اس کے بھڑکانیوالی ہستیوں کو یاجوج اور ماجوج کہا گیا ہے۔ یاجوج ماجوج کے الفاظ اجیج سے نکلے ہیں۔ اور اَجَّتِ النَّارُ اَجِیْجًا کے معنے ہیں۔ تَلَھَّبَتْ۔ آگ بھڑک اٹھی اور جب اجّجتِ النَّارَ کہیں تو معنے ہوں گے اَلْھَبْتُھَا فَالْتَھَبَتْ کہ آگ کو بھڑکایا تو وہ بھڑک اٹھی (اقرب) پس لفظ اَجَّ کے معنے آگ بھڑکانے کے ہیں۔ اور یاجوج و ماجوج کے الفاظ ایسی ہستیوں پر دلالت کرتے ہیں جو ایسی طاقت رکھیں گے۔ کہ آتشین اسلحہ کے استعمال سے دنیا پر غلبہ پالیں گے۔ اس تشریح کے بعد ہم سب سے پہلے قرآن کریم کی اُن خبروں کا ذکر کرتے ہیں جو کہ یاجوج و ماجوج کے متعلق آتی ہیں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

خروج یاجوج و ماجوج کا ذکر قرآن مجید میں

حَتّٰی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَھُمْ مِّنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ (انبیاء ع) کہ ایک زمانہ تک یاجوج و ماجوج کو دنیا کے کناروں پر بند رکھا جائے گا۔ اس کے بعد وہ دیوار جو اُن کو روکے ہوئے ہوگی، ٹوٹ جائے گی یعنی اسلام کی حکومت جاتی رہے گی اور اس کا زور ٹوٹ جائے گا۔ اس کی روحانی طاقت بھی کمزور پڑ جائے گی اور مسلمان اپنے دین کو بھول جائیں گے۔ چنانچہ اس زمانہ کی تعیین کے متعلق سورۂ سجدہ میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗٓ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (سجدہ ع) یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسلام ترقی کرے گا اور پھر جیسا کہ حدیثوں میں ہے تین سو سالوں کے بعد وہ کمزور ہونا شروع ہوگا۔ اور ایک ہزار سال تک برابر کمزور ہوتا جائے گا۔ گویا یہ زمانہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے تیرہ سو سال بعد کا ہے۔ پھر آیت حَتّٰی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَھُمْ مِّنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یاجوج و ماجوج سمندر پار رہنے والی اور پہاڑوں کے پرے رہنے والی قومیں ہیں۔ چنانچہ آیت کے الفاظ یہ ہیں وَھُمْ مِّنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ۔ اور حَدَب کے معنے لغت میں موج اور اونچی اور سخت زمین کے لکھے ہیں۔ پس مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ یاجوج و ماجوج جو سمندر پار رہنے والی اور پہاڑوں کے پرے رہنے والی اقوام ہیں۔ وقت موعود پر پہاڑوں سے اور سمندروں کی موجوں پر سوار ہو کر ایشیا میں اُتر پڑیں گی۔ ایشیا کا نام ہم اس لئے لیتے ہیں کہ اس جگہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دشمنوں کا ذکر ہے۔ اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قوم ایشیا میں ہی بستی ہے۔

اسی طرح سورۃ کہف میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

حَتّٰی اِذَا بَلَغَ بَیْنَ السَّدَّیْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِھِمَا قَوْمًا لَّا یَکَادُوْنَ یَفْقَھُوْنَ قَوْلًا ۔ قَالُوْا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِنَّ یَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ

مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْۤ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۝ فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ۝ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ۝ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا ۝ اِلَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ۝ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْۤ اَوْلِيَآءَ ؕ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ۝ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝

(کہف ع ۱۱)

اِن آیات اور اس سے چند پہلی آیات میں ذوالقرنین بادشاہ (یعنی خورس) کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ یاجوج و ماجوج اقوام جو شمالی ایشیا اور مشرقی یورپ کے علاقوں میں رہتی تھیں۔ ایشیا کی زرخیزی کی وجہ سے اس پر حملے کرتی تھیں۔ ذوالقرنین نے ان اقوام کے حملوں کو بڑی سختی سے روک دیا اور یہ اقوام ایشیا کے انتہائی شمال مغرب اور یورپ کے مشرق میں گھر گئیں۔ اور ذوالقرنین نے اس امر کا انتظام کیا۔ کہ ان اقوام کے ایشیا میں آنے کی صورت ہی نہ رہے۔ اور ان کے حملوں سے نجات کے لئے ایک دیوار بنا دی۔

سورۂ کہف کی آیات جو اوپر لکھی گئی ہیں۔ ان میں ذوالقرنین کے اس واقعہ کا ذکر ہے۔ اور اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ کہ ذوالقرنین جب دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا۔ تو اس نے اُن کے ورے کچھ ایسے لوگ پائے جو بمشکل اس کی بات سمجھتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اے ذوالقرنین یاجوج و ماجوج یقیناً اس ملک میں فساد پھیلا رہے ہیں۔ پس کیا ہم لوگ آپ کے لئے کچھ خراج اس شرط پر مقرر کر دیں۔ کہ آپ ہمارے درمیان اور اُن کے درمیان ایک روک بنا دیں۔ اس نے کہا کہ اس قسم کے کاموں کے متعلق میرے رب نے جو طاقت مجھے بخشی ہے۔ وہ دشمنوں کے سامانوں سے بہت بہتر ہے۔ اس لئے تم مجھے اپنی طاقت کے مطابق مدد دو۔ تاکہ میں تمہارے درمیان اور اُن کے درمیان ایک روک بنا دوں۔ تم مجھے لوہے کے ٹکڑے لادو۔ چنانچہ وہ روک تیار ہونے لگی۔ یہاں تک کہ جب اُس نے پہاڑی کی دونوں چوٹیوں کے درمیان دیوار بنادی۔ تو اس نے اُن سے کہا۔ کہ اب مجھے گلا ہُوا تانبا لادو۔ تاکہ میں اس کو اس میں استعمال کر کے اس کو مضبوط کر دوں۔ پس جب وہ دیوار تیار ہوگئی تو یاجوج و ماجوج کے حملے رُک گئے۔ نہ تو وہ اس دیوار پر چڑھ کر اس کو پھاند سکے۔ اور نہ اس میں کوئی سوراخ کر سکے۔ اس پر ذوالقرنین نے کہا۔ کہ یہ کام محض میرے رب کے احسان سے ہُوا ہے۔ پھر جب عالمگیر عذاب کے متعلق میرے رب کا وعدہ پورا ہونے پر آئے گا۔ تو وہ اسے توڑ کر زمین کے برابر کر دیگا۔

اور میرے رب کا وعدہ ضرور پورا ہو کر رہنے والا ہے۔ (یعنی وہ موعود وقت آنے والا ہے جبکہ یہ قومیں جنوب مشرق کی طرف بڑھیں گی اور یہ دیوار بیکار ہو جائے گی۔ کیونکہ اُن قوموں کا داخلہ سمندر کے ذریعہ سے ہوتا تھا اور یہ دیوار اُن کیلئے روک نہ ہوسکتی تھی)

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جب یہ وقت آجائے گا۔ تو ہم ان قوموں کو ایک دوسرے کے خلاف جوش سے حملہ آور ہوتے ہوئے چھوڑ دیں گے اور بگل بجایا جائے گا۔ اور دنیا میں اُبھل مچ جائیگی۔ تب ہم اُن سب کو اکٹھا کر دیں گے۔ اور ہم اُس دن جہنم کو کافروں کے سامنے لے آئیں گے۔ اُن کے سامنے جن کی آنکھیں میرے ذکر یعنی قرآن کریم کیطرف سے غفلت کے پردہ میں تھیں اور وہ سُننے کی طاقت بھی نہیں رکھتے تھے۔ تو کیا یہ سب کچھ دیکھ کر پھر بھی وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے سمجھتے ہیں۔ کہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو مددگار بنا سکیں گے ہم نے تو کافروں کی ضیافت کے لئے جہنم کو تیار کر رکھا ہے۔ تو انہیں کہہ کہ کیا ہم تمہیں اُن لوگوں سے آگاہ کریں جو اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ گھاٹا پانے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی تمام تر کوشش اس دنیاوی زندگی میں ہی لگ گئی ہے۔ اور وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔

ان آیات سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ آخری زمانہ میں ترقی کرتے کرتے یاجوج و ماجوج دونوں قومیں دنیا کے ممالک پر قابض ہو جائیں گی۔ اور پھر آپس میں ان کی رقابت شروع ہو جائیگی۔ اور آخر کار دونوں کی آپس میں مڈ بھیڑ ہو جائیگی اور وہ ایک دوسرے پر آگ برسائیں گی۔ اور اپنی تباہی کا موجب بن جائیں گی۔ پھر فرمایا کہ وہ دونوں بڑی صنعتی قومیں ہونگی اور عجیب در عجیب ایجادیں کریں گی لیکن دین اور خدا کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی طرف سے غافل ہو جائیں گی۔ اور اس وجہ سے اُن کی دنیوی اور علمی ترقی بیکار ہو جائے گی اور اُن کو تباہی سے بچا نہیں سکے گی۔

یہ پیشگوئیاں موجودہ زمانہ پر بالکل صادق آتی ہیں۔ اسلامی حکومت کا تنزل تیرھویں صدی کے شروع میں ہوا ہے۔ اور اس کے بعد مغربی حکومتوں کی سیاسی رسہ کشی شروع ہوئی ہے اور سائنس کی ترقی ہوئی ہے۔ اور فلسفہ اور مادیت نے مذہب پر حملے شروع کئے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں آخر مذہب بالکل بے کار ہو کے رہ گیا۔ مادیت نے خالص منطقی نکتوں کی اتباع کر کے اقتصادی تغیرات کی ایسی ایسی شکلیں پیش کیں کہ دنیا محو حیرت ہوگئی۔ اور انہی میں سے ایک نتیجہ کمیونزم ہے۔ دنیا کے پیدا کرنیوالے ایک خدا اور اس کے نظام کو چھوڑ کر میں سمجھ ہی نہیں سکتا کہ دنیا کمیونزم یا نازی ازم سے ورے کسی اور دلیل کو تسلیم کر سکتی ہو۔ خدا تعالیٰ اور اسکی تعلیمات کو نظر انداز کر کے یا تو ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ تمام انسان برابر ہیں اور دنیا کی سب چیزیں ان میں زور کے ساتھ برابر تقسیم کر دینی چاہئیں اور یا یہ ماننا پڑے گا کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" طاقت ہی اصل چیز ہے جس کے پاس طاقت ہے وہی قابل ہے اور وہی دنیا کی نعمتوں کا مستحق ہے۔ آخر ان دونوں نظریوں کے سوا خالص عقل اور کیا نظریہ پیش کر سکتی ہے۔ صرف مذہب ہی ہے۔ جو خدا اور اخلاق کو درمیان میں لا کر ایک درمیانی راہ پیش کرتا ہے۔ ورنہ عقل تو ان دونوں نظریوں کے سوا کسی جگہ نہیں ٹھہرتی۔

یاجوج و ماجوج کے متعلق بائبل میں بھی پیشگوئی پائی جاتی ہے۔ اور بتایا گیا ہے۔ کہ آخری زمانہ کی اِن دونوں طاقتوں (یعنی یاجوج و ماجوج) میں رقابت بڑھتے بڑھتے آخر لڑائی کا موجب ہو جائے گی۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف آتشین اسلحہ کا استعمال کریں گی۔ چنانچہ حزقی ایل باب ۳۸ آیت ۱۸ تا ۲۲ میں آتا ہے

"کہ اُن ایام میں جب جوج اسرائیل کی مملکت پر چڑھائی کرے گا۔ تو میرا قہر میرے چہرہ سے نمایاں ہوگا۔ خداوند خدا فرماتا ہے۔ کیونکہ میں نے اپنی غیرت اور آتش قہر میں فرمایا۔ کہ یقیناً اس روز اسرائیل کی سرزمین میں سخت زلزلہ آئیگا۔ یہانتک کہ سمندر کی مچھلیاں اور آسمان کے پرندے اور میدان کے چرندے اور سب کیڑے مکوڑے جو زمین پر رینگتے پھرتے ہیں اور تمام انسان جو روئے زمین پر ہیں میرے حضور تھرتھرائیں گے اور پہاڑ گر پڑیں گے اور کراڑے بیٹھ جائیں گے اور ہر ایک دیوار زمین پر گر پڑے گی۔ اور میں اپنے سب پہاڑوں سے اس پر تلوار طلب کروں گا خداوند خدا فرماتا ہے۔ اور ہر ایک انسان کی تلوار اس کے بھائی پر چلے گی۔ اور میں وبا بھیجکر اور خونریزی کرکے اُسے سزا دُوں گا اور اس پر اور اس کے لشکروں پر اور اُن بہت سے لوگوں پر جو اس کے ساتھ ہیں۔ شدّت کا مینہ اور بڑے بڑے اولے اور آگ اور گندھک برساؤں گا۔"

پھر باب ۳۹ آیت ۳ تا ۷ میں لکھا ہے:-

"تو اسرائیل کے پہاڑوں پر اپنے سب لشکر اور حمایتیوں سمیت گر جائے گا اور میں تجھے ہر قسم کے شکاری پرندوں اور میدان کے درندوں کو دُوں گا کہ کھا جائیں۔ تُو کھلے میدان میں گرے گا۔ کیونکہ میں ہی نے کہا۔ خداوند فرماتا ہے اور میں ماجوج پر اور ان پر جو بحری ممالک میں امن سے سکونت کرتے ہیں آگ بھیجوں گا۔"

یاجوج و ماجوج کی لڑائی کے متعلق بائبل میں پیشگوئی

قرآن کریم اور بائبل کی وہ آیات جو اوپر لکھی جا چکی ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بائبل اور قرآن کریم دونوں یاجوج و ماجوج کی لڑائی کے متعلق متفق ہیں۔ لیکن قرآن کریم بائبل سے ایک بات زائد طور پر بیان کرتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ کہ جہاں تک اُن کے سیاسی نظریوں کا سوال ہے وہ دونوں ہی اس لڑائی میں تباہ ہو جائیں گے اور دونوں میں سے کوئی بھی اپنی ہستی کو اس جنگ کے بعد زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکے گا۔

یاجوج و ماجوج کے متعلق قرآن کریم اور بائبل کی پیشگوئیوں میں ایک فرق

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دجّال اور یاجوج و ماجوج کے فتنے برپا ہوں گے۔ اور اسلام کمزور ہو جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ اسلام کی حفاظت کے لئے مسیح موعود کو نازل کرے گا۔ اور وہ مشرق میں ظاہر ہوگا۔ اور اس کے آنے کے بعد دجّال ہلاک ہو جائے گا۔ اس وقت مسلمانوں کے پاس مادی طاقت نہ ہوگی۔ لیکن مسیح موعود کی جماعت دعاؤں اور تبلیغ کے ساتھ کام کرتی چلی جائے گی اور یاجوج و ماجوج آسمانی عذابوں کے ساتھ تباہ ہوں گے اور اللہ تعالیٰ پھر اسلام کو غالب کر دے گا۔ اور وہ دنیا کو کہے گا کہ تیری برکت تجھ میں پھر لوٹ آئے اور تھوڑا رزق لوگوں کے لئے کافی ہوگا حرص مٹ جائیگی

اور لوگ مادیت کی بجائے روحانیت کی طرف مائل
ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ اسلام غالب ہو جائیگا۔
الغرض اسلام کو مٹانے کے لئے جو خطرناک
فتنے آخری زمانے میں پیدا ہونے والے تھے۔
سورۂ لہب میں اللہ تعالےٰ نے اُن کے متعلق اور اُن
کے انجام کے متعلق پیشگوئی فرمائی ہے۔ اور کہا ہے
تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ۔ یعنی اسلام
کے خلاف آگ بھڑکانے والی اقوام جو آخری زمانہ
میں پیدا ہوں گی۔ اللہ تعالےٰ ان کو اور اُن کے
ساتھیوں کو تباہ کرے گا۔

ابولہب سے مراد مغربی اقوام

جیسا کہ حل لغات میں لکھا جا چکا ہے۔ تَبَّ
کے معنے برباد ہونے اور ہلاک ہونے کے ہیں۔ اور
جب کسی کا مقصد حاصل نہ ہو۔ اس وقت بھی تَبَّ
کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مفسرین نے تَبَّتْ
کے معنے صَفِرَتْ مِنْ کُلِّ خَیْرٍ کے بھی کئے
ہیں۔ یعنی ہر قسم کی خیر و برکت سے خالی رہنا۔
یَدٌ کے معنے ہاتھ کے بھی ہیں اور عزت و
رتبہ۔ قوت و طاقت اور غلبہ و بادشاہت کے بھی
ہیں۔ اسی طرح یَدٌ کا لفظ جماعت پر بھی بولا جاتا
ہے۔ پس تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ کے معنے ہونگے

۱۔ ابولہب کے دونوں ہاتھ تباہ ہو گئے۔
۲۔ ابولہب کے دونوں جتھے برباد ہو گئے اور انکو
اُن کا مقصد حاصل نہ ہوا۔
۳۔ ابولہب کی عزتیں۔ قوتیں۔ بادشاہت اور
غلبہ سب ختم ہو گئے۔
۴۔ ابولہب کے ساتھ تعلق رکھنے والی دونوں جماعتیں
ہر قسم کے نفع اور خیر سے محروم رہیں۔

ابولہب کے لفظی معنے ہیں شعلے کا باپ۔ لیکن
محاورے میں اس کے معنے ہوں گے۔ وہ وجود جو
ایسی چیزوں کا موجد ہو۔ جن سے شعلے اور آگ
پیدا ہو۔ یا وہ وجود جس کا انجام یہ ہوگا کہ وہ شعلوں
کی لپیٹ میں آجائے گا۔ مفسرین کہتے ہیں۔ کہ
لفظ ابولہب سے چہرے کا سرخ و سفید رنگ بھی مراد
ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر اشارۃً ذکر کر آئے ہیں کہ سورۃ
تبت میں ابولہب سے مراد کوئی ایک شخص نہیں بلکہ
اس سے مراد وہ قوم ہے۔ جو آخری زمانہ میں
دنیا پر غلبہ حاصل کر کے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
کے خلاف یا اسلام کے خلاف آگ بھڑکائے گی۔
یا وہ ایسی ایجادیں کرے گی جس سے شعلے اور آگ
پیدا ہو۔ اور پھر یہ قوم اپنی ہمسایہ قوموں کو بھی
اپنے ساتھ ملا کر اپنے جتھہ کو مضبوط کرے گی۔ اور
یہ قومیں اس کے ہاتھ کی مانند ہوں گی۔ ہم دیکھتے
ہیں کہ اس زمانہ میں دو ہی جتھے ایسے ہیں۔ جو کہ
اسلام یا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف
متحد ہیں۔ ایک جتھہ بعض مغربی طاقتوں پر مشتمل ہے۔
اور ایک جتھہ بعض مشرقی طاقتوں اور ان کے ساتھیوں
کا ہے۔ ابولہب سے مراد یہ دونوں جتھے ہیں۔ یہ
ظاہر میں بھی ابولہب ہیں کہ ان کے رنگ سرخ و سفید
ہیں اور باطن کے لحاظ سے بھی۔ کہ ایٹم بم اور
ہائیڈروجن بم ایجاد کر رہے ہیں۔ جن کا نتیجہ آگ
اور شعلے ہیں۔ اور اس لحاظ سے بھی ابولہب ہیں۔
کہ ان کا انجام کار جنگ کی آگ کی لپیٹ میں آنیوالے
ہیں۔ اور چونکہ ان لوگوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے خلاف خطرناک لٹریچر پیدا کر کے
ایک آگ لگا دی ہے اس لئے بھی وہ ابولہب
کہلانے کے مستحق ہیں

تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ میں تَبَّتْ ماضی کا صیغہ

مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا کَسَبَ ۝

اس کے مال نے اُسے کوئی فائدہ نہیں دیا۔ اور نہ اس کی کوششوں نے (کوئی فائدہ) دیا ہے [۳]

استعمال ہوا ہے۔ لیکن عربی زبان میں جب کوئی امر یقینی اور قطعی طور پر ہونے والا ہو۔ تو اس کے لئے ماضی کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ گویا یہ بتایا جاتا ہے کہ تم یہ سمجھو کہ یہ کام ہو چکا۔ پس تَبَّتْ کے معنے اس جگہ پر یہ ہوں گے کہ یہ یقینی بات ہے کہ یہ تباہ ہو جائیں گے۔ اور اُن کا یہ مقصد کہ اسلام کو مٹا دیں حاصل نہ ہوگا۔

پھر یہ امر بھی قابل غور ہے۔ کہ آیت زیر تفسیر میں پہلے ابو لہب کے دونوں ہاتھوں کی تباہی کا ذکر ہے اور پھر اس کی اپنی تباہی کا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابو لہب کا نام پانے والی اقوام یعنی مشرقی اور مغربی طاقتیں دونوں پوری کوشش کریں گی کہ مختلف ممالک کو اپنے ساتھ ملالیں اور وہ ممالک اُن کے ساتھ مل بھی جائیں گے اور ان کے لئے بطور ہاتھوں کے ہو جائیں گے۔ اور ابو لہب کہلانیوالی اقوام ان جتھوں پر فخر کریں گی۔ اور ان کو اپنی طاقت شمار کریں گی۔ لیکن اللہ تعالےٰ ایسے اسباب پیدا کرے گا۔ کہ پہلے تو یہ مؤیدین تباہ ہوں گے اور پھر وہ وجود جو ابو لہب کہلانے کا مستحق ہوگا اور ان قوموں کا نقطۂ مرکزی ہوگا، وہ تباہ ہوگا۔

ایک لطیف بات جو اس جگہ قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ احادیث میں جہاں اسلام کے خلاف اُٹھنے والی تحریکات کو بیان کیا گیا ہے وہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان فتنوں کے وقت اللہ تعالےٰ مسیح موعود کو نازل کرے گا اور وہ ان فتنوں کا مقابلہ کرینگے۔ لیکن دعاؤں سے۔ کیونکہ لَا يَدَانِ لِاَحَدٍ بِقِتَالِهِمْ (مشکوٰۃ کتاب الفتن) ان اسلام کے مخالف لوگوں کا مقابلہ مادی ہتھیاروں سے نہ ہوسکے گا۔ اس لئے کہ مسلمانوں کی حالت ضعف وکمزوری کی ہوگی۔ لیکن اللہ تعالےٰ مسیح موعود کی دعاؤں کو سنیگا۔ اور ایسے سامان پیدا کر دے گا کہ جس طرح نمک پانی میں گھل جاتا ہے۔ اسی طرح یہ اسلام کی مخالف اقوام آپس میں لڑکر تباہ ہو جائیں گی۔ قرآن کریم نے ابو لہب کا نام پانے والی اقوام کے مؤیدین کو بھی ہاتھوں سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا ہے تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ اور حدیث میں بھی جہاں آخری زمانہ میں پیدا ہونے والے فتنوں کا ذکر ہے وہاں یَدَانِ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ امر بتاتا ہے۔ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے اُمت محمدیہ کے متعلق آخری زمانہ میں آنے والے ابتلاؤں کا علم دے دیا تھا اور بتا دیا تھا کہ سورۂ لہب میں جن اقوام کے خروج کی خبر دی گئی تھی اُن کا مقابلہ ظاہری طاقت سے نہ ہو سکے گا۔ تبھی تو آپ نے فرمایا کہ لَا يَدَانِ لِاَحَدٍ بِقِتَالِهِمْ

الغرض آیت تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے۔ کہ اسلام پر حملہ کرنے والی اقوام اور اس کی تائید میں اُٹھنے والے لوگ سب تباہی کا منہ دیکھیں گے اور اسلام کو مٹا نہ سکیں گے ؏

[۳] **حل لغات**:۔ مَآ اَغْنٰی عَنْهُ۔ مَآ اَغْنٰی — اَغْنٰی عَنْهُ کے معنے ہوتے ہیں نَابَ عَنْهُ کوئی چیز اس کے قائم مقام ہوگئی۔ اور جب مَا يُغْنِیْ عَنْكَ هٰذَا کا فقرہ بولیں تو معنے ہوں گے اَیْ مَا يُجْدِیْ عَنْكَ یعنی یہ چیز تمہیں نقصان سے بچانے کیلئے

کسب

کوئی فائدہ نہ دے گی۔

نیز اَغْنیٰ عَنْہُ کَذَا کے معنے ہیں نَحَّاہُ وَ بَعَّدَہٗ۔ اُس نے اُس کو کسی چیز سے دور کر دیا۔ اور جب مَا اَغْنیٰ فُلَانٌ شَیْئًا کہیں۔ تو معنے ہوں گے لَمْ یَنْفَعْ فِیْ مُھِمٍّ وَلَمْ یَکْفِ مَؤُوْنَۃً کہ ضرورت اور تکلیف کے وقت فلاں کچھ کام نہ آیا (اقرب)

کَسَبَ: کَسَبَ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں جَمَعَہٗ۔ اس کو جمع کیا۔ اور جب کَسَبَ مَالًا وَ عِلْمًا کہیں۔ تو معنے ہوتے ہیں طَلَبَہٗ وَرَبِحَہٗ مال و علم کو حاصل کیا اور اُن سے فائدہ اُٹھایا۔ اور کَسَبَ لِاَھْلِہٖ کے معنے ہوتے ہیں۔ طَلَبَ الْمَعِیْشَۃَ۔ اپنے اہل و عیال کے لئے معیشت یعنی زندگی بسر کرنیکے سامان حاصل کرنیکی کوشش کی (اقرب)

اَلْکَسْبُ۔ مَا یَتَحَرَّاہُ الْاِنْسَانُ مِمَّا فِیْہِ اِجْتِلَابُ نَفْعٍ وَ تَحْصِیْلُ حَظٍّ کَکَسْبِ الْمَالِ یعنی اَلْکَسْبُ کے معنے ہیں۔ اس چیز کی تلاش کرنا جس میں کسی نفع کی امید ہو۔ جیسے مال وغیرہ کو تلاش کیا جاتا ہے (مفردات)

تفسیر۔ مَا اَغْنیٰ عَنْہُ میں مَا نافیہ بھی ہو سکتا ہے اور مَا استفہامیہ بھی۔ مَا نافیہ ہونے کی صورت میں یہ معنے ہوں گے۔ کہ ابولہب کا مال اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔ اور مَا استفہامیہ کی صورت میں یہ معنے ہوں گے کہ ابولہب کا مال اس کے کس کام آئے گا یعنی وہ اس کو تباہی سے بچا نہ سکیگا۔

مفسرین نے کہا ہے کہ مَا کَسَبَ میں مَا موصولہ بھی ہو سکتا ہے اور مَا مصدریہ بھی۔ موصولہ ہونے کی صورت میں یہ معنے ہوں گے کہ وہ چیزیں بھی اس کے کام نہ آئیں گی جو اس نے محنت کر کے حاصل کی تھیں۔ اور مصدری معنے یہ بنیں گے کہ اس مال کا کمانا اس کے کام نہ آئے گا۔

پہلی آیت میں اسباب کا ذکر تھا۔ کہ اسلام پر حملہ کرنے والی اقوام تباہ ہوں گی اور نہ صرف خود تباہ ہوں گی۔ بلکہ وہ لوگ جو اُن کے ساتھ اس لئے شامل ہوئے تھے کہ ان کو کچھ نفع ہوگا وہ بھی حسرت کے ساتھ تباہ ہوں گے۔ اور اُن کو اُن کا مقصد حاصل نہ ہوگا۔

اس آیت میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ کہ یہ اقوام بڑی مالدار ہوں گی۔ اور نہ صرف یہ کہ انہوں نے ایجادوں اور صنعتوں سے بہت مال پیدا کیا ہوگا بلکہ اپنا راس المال دوسرے ملکوں میں لگا کر اور تجارت کے بہانے دوسرے ملکوں پر قبضہ کر کے اُن ملکوں کا مال بھی اپنے قبضہ میں کر لیا ہوگا۔ مَالُہٗ میں لفظ مال نکرہ رکھا۔ اور نکرہ عظمت شان پر دلالت کرتا ہے۔ گویا اس سے یہ اشارہ کیا کہ اس کا عظیم الشان مال بھی اس کو تباہی سے بچا نہ سکے گا۔ مَالُہٗ کے بعد مَا کَسَبَ کے الفاظ رکھے ہیں۔ اور مَا کَسَبَ کے معنے ہیں۔ مَکْسُوْبُہٗ۔ اس کا کمایا ہوا مال۔ گویا ان اقوام کے مالوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) وہ مال جو اپنے ملکوں میں صنعتوں وغیرہ سے پیدا کریں گے۔ (۲) وہ مال جو دوسرے ملکوں سے حاصل کریں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ آیت مغربی اقوام پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ کیونکہ ایک طرف صنعتی ترقی کر کے وہ مالدار ہو گئی ہیں اور دوسری طرف انہوں نے نہ صرف دوسرے ملکوں میں اپنا راس المال لگا کر ان کا مال چھین لیا۔ بلکہ اس بہانے سے انہوں نے کئی ملکوں پر بھی قبضہ کر لیا۔

مَا اَغْنیٰ عَنْہُ مَالُہٗ وَ مَا کَسَبَ کے الفاظ بھی اس امر کی دلیل ہیں کہ سورۂ لہب کا نزول عبدالعزیٰ کے لئے قرار دینا کسی طرح بھی درست نہیں۔

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝

وہ ضرور آگ میں پڑے گا جو (اسی کی طرح) شعلے مارنے والی ہوگی۔ [۴]

کیونکہ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ کے الفاظ مال کثیر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور عبدالعزیٰ کے پاس تو کوئی ایسا مال نہ تھا۔ جو قابل ذکر ہو۔ اور نہ وہ اپنے زمانہ میں مالدار سمجھا جاتا تھا۔ کسی کے پاس چند اونٹوں کا ہونا اس کو مالدار نہیں بنا سکتا۔ پس مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ کے الفاظ اپنی پوری شان کے ساتھ مغربی اقوام پر ہی صادق آتے ہیں۔ کیونکہ یہی وہ اقوام ہیں۔ جو دنیا کی دولتمند اقوام سمجھی جاتی ہیں۔ مفسرین کے نزدیک مَا كَسَبَ سے مراد اعمال۔ کوششیں اور اولاد بھی ہو سکتی ہے۔ پس اِن معنوں کے اعتبار سے یہ مفہوم ہوگا۔ اِن قوموں کو اپنے جتھوں، اپنے اموال اور اپنی ایجادات پر بڑا ناز ہوگا لیکن تباہی کے وقت یہ چیزیں اُن کے کام نہیں آئیں گی۔ بلکہ یہی چیزیں ان کی تباہی کا موجب ہو جائیں گی۔

[۴] حل لغات:۔ يَصْلٰى صَلِيَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور صَلِيَ النَّارَ کے معنے ہوتے ہیں قَاسٰى حَرَّهَا وَاحْتَرَقَ بِهَا وَدَخَلَ فِيْهَا۔ یعنی آگ کی گرمی کی تکلیف برداشت کی اور آگ میں داخل ہوا، اور اس میں جلا۔ (اقرب)

نَارٌ: اَلنَّارُ تُقَالُ لِلَّهِيْبِ یعنی نار کا لفظ آگ کے شعلوں پر بھی اطلاق پاتا ہے۔ وَلِلْحَرَارَةِ الْمُجَرَّدَةِ وَلِنَارِ جَهَنَّمَ اور گرمی پر بھی اور جہنم کی آگ پر بھی۔ وَلِنَارِ الْحَرْبِ اور لڑائی کے لئے بھی نار کا لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے (مفردات) پس سَيَصْلٰى نَارًا کے معنے ہوں گے وہ ضرور آگ میں پڑے گا یا وہ ضرور جنگ میں پڑے گا۔

تفسیر:۔ جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے نار کے معنے آگ کے ہیں اور نار سے مراد جنگ بھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (مائدہ) یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مخالفوں نے جب بھی لڑائی کی آگ کو برانگیختہ کیا۔ اللہ نے اُسے بجھا دیا۔ پس نَارٌ کا لفظ عربی محاورے میں جنگ کیلئے بھی استعمال کیا جاتا ہے اور سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ کے معنے یہ ہونگے کہ ابولہبی تحریکیں ایک سخت جنگ میں ڈالی جائینگی۔ اور وہ ایسی جنگ ہوگی جو شعلوں والی ہوگی اور ایسی ہوگی جس کی مثال پہلے نہ ملتی ہوگی۔ کیونکہ نار نکرہ ہے۔ اور نکرہ عظمت شان پر دلالت کرتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کا نتیجہ سوائے آگ کے شعلوں اور شدید گرمی کے کیا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے استعمال سے بیک وقت شہروں کے شہر آگ کی لپیٹ میں آ سکتے ہیں۔

پس یہ آیت بتاتی ہے۔ کہ اِن اقوام کو ایک ہولناک جنگ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور آپس میں لڑ کر تباہ ہو جائیں گی۔ عربی زبان میں سَ اور سَوْفَ جب فعل پر داخل ہوتے ہیں۔ تو زمانہ کی مقدار بتاتے ہیں۔ کہ یہ فعل کب واقع ہوگا۔ سَ زمانہ قریب کے لئے آتا ہے۔ اور سَوْفَ زمانہ بعید کے لئے۔ اس آیت میں سَيَصْلٰى فعل پر سَ داخل ہوا ہے۔ جو زمانہ قریب پر دلالت کرتا ہے۔ گویا اس میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ قومیں جو

(حاشیہ) مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ میں یہ دلیل کہ یہ سورۃ ایک شخص کے لئے نازل نہیں ہوئی۔

(حاشیہ) سَيَصْلٰى نَارًا میں جنگ کی پیشگوئی

(حاشیہ) يَصْلٰى

(حاشیہ) نَارٌ

وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۚ

اور اس کی بیوی بھی۔ جو ایندھن اٹھا اٹھا کر لاتی ہے (آگ میں پڑے گی) ۵ؐ

فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۠

ع ۳۶

اس کی (بیوی کی) گردن میں ایک کھجور کا سخت بٹا ہوا رسہ باندھا جائیگا (جو کبھی نہ ٹوٹے گا) ۶ؐ

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف آگ بھڑکائیں گی اور آپ کے مذہب کو تباہ کرنے کی کوشش کریں گی۔ جس وقت اُن کی کوششیں انتہا کو پہنچ جائیں گی۔ تو اس کے بعد جلد ہی وہ لڑائی کی آگ میں جھونکی جائیں گی۔ چنانچہ دیکھ لو۔ کہ مغربی تحریکیں اسلام کے خلاف ۱۹۱۴ء میں کمال کو پہنچیں۔ اور اس کے معاً بعد اُن کی آپس میں جنگ ہو گئی جو ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی۔ اور پھر دوبارہ ۱۹۳۶ء میں اس کے نتیجہ میں پھر ایک جنگ ہوئی جو ۱۹۴۵ء تک چلی گئی اور ۱۹۴۵ء کے بعد ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی ایجاد ہوئی۔ جس سے دنیا ایک اور تباہی کے کنارہ پر کھڑی ہے۔ اور یہ زمانہ اس زمانہ کے بالکل قریب ہے۔ جس میں ان مغربی اقوام کی کوششیں اسلام کے خلاف انتہا کو پہنچ گئی تھیں۔

وَامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ سے مراد مغربی اقوام کے اندرونی موید۔

۵ؐ حل لغات:۔ اَلْحَطَبُ۔ مَا اُعِدَّ مِنَ الشَّجَرِ فَيُوْبًا لِلنَّارِ۔ درخت کی لکڑیاں جو جلانے کے لئے تیار کی جاتی ہیں اور خشک کی جاتی ہیں ان کو حَطَب کہتے ہیں۔ یعنی ایندھن۔ نیز اَلْحَطَبُ کے معنے ہیں اَلنَّمِيْمَةُ۔ چغلخوری۔ (اقرب) پس حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کے معنے ہوں گے ایندھن اُٹھانے والی (۲) چغلخوری کرنے والی۔

حَطَب

تفسیر:۔ اِمْرَاَة کے معنے عورت کے ہیں لیکن یہ لفظ ایسے لوگوں کے لئے بھی استعمال ہو جاتا ہے جو کسی کے ماتحت ہوں اور قوت متاثرہ رکھتے ہوں۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ حضرت آدم علیہ السلام کو فرماتا ہے اُسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ (بقرہ ع۴) کہ تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو۔ اس آیت میں زوج سے مراد صرف بیوی نہیں۔ بلکہ وہ لوگ بھی مراد ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کے متبع تھے۔ اور اُن کی ہر بات کو تسلیم کرتے تھے۔ پس وَامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابولہب کے نام کی مستحق اقوام کے ساتھ نہ صرف بیوی کا اور لوگ بھی اپنے فائدے کے لئے شامل ہو جائیں گے۔ جو اُن کے لئے بطور ہاتھ کے ہوں گے۔ بلکہ بعض ایسے لوگ بھی اُن کے ساتھ ہوں گے جو اُن کے اپنے ملکوں میں ہوں گے۔ اور اپنی حکومتوں کو شہ دلائیں گے۔ کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایسے کام کریں جن سے اسلام ختم ہو جائے۔ یعنی لٹریچر بھی لکھوائیں گے۔ اور اُن کے خلاف جنگ کے لئے بھی اُکسائیں گے۔ گویا ایندھن بھی مہیا کریں گے اور اسلام کے خلاف چغلخوری بھی کریں گے اور غلط باتیں پیش کر کے لوگوں کو اسلام کے خلاف بھڑکائیں گے۔

۶ؐ حل لغات:۔ جِيْدٌ۔ اَلْجِيْدُ۔ اَلْعُنُقُ۔ جِيْدٌ کے معنے گردن کے ہیں۔

جِيْدٌ

مَسَدٌ:۔ حَبْلٌ مِّنْ لِيْفٍ۔ کھجور کے پتوں کا بٹا ہوا رسہ۔ وَقِيْلَ اَلْحَبْلُ الْمَضْفُوْرُ الْمُحْكَمُ

مَسَد

انفَتْلُ۔ اور بعض کہتے ہیں کہ مَسَد اُس رسّہ کو کہتے ہیں۔ جو خوب مضبوط بٹا ہُوا ہو۔ اور ٹوٹ نہ سکے۔ اَلْمِحْوَرُ مِنَ الْحَدِیْدِ۔ لوہے کی وہ سلاخ جس کے اردگرد چرخی گھومتی ہے (اقرب)

تفسیر:۔ فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ کے معنے ہیں۔ کہ وہ لوگ جو ابولہبی اقوام کے لئے بمنزلہ عورت کے ہیں۔ اُن کے گلوں میں ایسی رسیاں ہیں جو ٹوٹ نہیں سکتیں۔ یعنی انکی مخالفت اسلام کے خلاف اتنی شدید ہوگی۔ کہ اسکو دُور کرنا مشکل ہوگا۔ پھر اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے۔ کہ بظاہر ان حکومتوں کی قومیں آزاد کہلائیں گی لیکن درحقیقت اپنے زمانہ کے رسم و رواج کی غلام ہوں گی۔ اور جب تک خدا تعالٰے انکو آزاد نہ کرائے وہ حقیقی آزادی حاصل نہیں کر سکیں گی ؎

فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ کو ملا

سُوْرَةُ الْاِخْلَاصِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ الاخلاص - یہ سورۃ مکی ہے

وَهِيَ خَمْسُ اٰيٰتٍ مَّعَ الْبَسْمَلَةِ

اور اس کی بسم اللہ سمیت پانچ آیات ہیں۔ ؎۱

سورۃ الاخلاص کا زمانہ نزول مستشرقین یورپ کے نزدیک ؎۲

؎۱ ابن مسعودؓ کے نزدیک سورۃ الاخلاص مکی ہے۔ اور حسن۔ عطاء۔ عکرمہ اور جابر بھی یہی کہتے ہیں۔ ابن عباسؓ۔ قتادہ۔ ضحاک اور سدی کہتے ہیں۔ کہ یہ سورۃ مدنی ہے۔ لیکن ابن عباسؓ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ مکی ہے (فتح البیان) اتقان میں ہے۔ کہ بعض مفسرین نے ان ہر دو قسم کی روایتوں کو دیکھکر یہ فیصلہ کیا ہے کہ سورۃ الاخلاص کا نزول دو مرتبہ ہُوا تھا۔ ایک دفعہ مکہ میں اور ایک دفعہ مدینہ میں۔ اتقان کے مصنف علامہ جلال الدین سیوطیؒ کا رجحان اسی طرف ہے کہ یہ سورۃ مدنی ہے۔ ہمارے نزدیک صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے۔ کہ اس سورۃ کا نزول دو مرتبہ ہُوا۔ ایک دفعہ مکہ میں اور ایک دفعہ مدینہ میں۔ حضرت ابن مسعودؓ بالکل ابتدائی صحابہ میں سے ہیں اور تفسیر میں اُن کا پایہ بلند مانا جاتا ہے۔ اُن کی روایت کو بغیر کسی دلیل کے رد نہیں کیا جاسکتا دوسری طرف ابن عباسؓ ہیں۔ گو انہوں نے مدینہ میں جاکر ہوش سنبھالی ہے اور ابتدائی سورتوں کے متعلق اُن کا علم محض سماعی ہے لیکن اُن کا مقام بھی بہت بلند سمجھا جاتا ہے۔ اُن کی بات بھی بلا وجہ رد نہیں ہوسکتی۔ پس بجائے اس کے کہ ہم کسی ایک صحابی کی بات بغیر کسی مضبوط دلیل کے رد کریں۔ ہم اُن مفسرین کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں جنکی رائے یہ ہے کہ اس سورۃ کا نزول دو مرتبہ ہُوا ہے۔

سورۃ اخلاص مکی بھی ہے اور مدنی بھی۔ ؎۱

سورۃ الاخلاص کے متعدد نام ؎۲

وہیری اپنی کتاب کمنٹری آون دی قرآن میں لکھتا ہے۔ کہ میور کے نزدیک یہ سورۃ بالکل ابتدائی مکی سورتوں میں سے ہے۔ اور نولڈکے کے نزدیک یہ چوتھے سال کی نازل شدہ ہے۔ وہیری کا خیال ہے کہ میور کی رائے درست ہے۔ کیونکہ اس کا سٹائل اس قسم کا ہے جیساکہ بالکل ابتدائی نازل ہونے والی سورتوں کا ہے۔

ہمارے مفسرین اور مستشرقین یورپ میں یہ فرق ہے کہ مفسرین سورتوں کے مکی یا مدنی ہونیکی بنیاد تاریخ پر رکھتے ہیں۔ لیکن مستشرقین بجائے تاریخ پر بنیاد رکھنے کے مضمون سورۃ۔ اس کی عبارت اور اس کے سٹائل سے نتائج اخذ کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ نہ وہ قرآن کریم کے مضمون کو صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں اور نہ اتنی عربی جانتے ہیں کہ اس کی عبارت سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ زبان عربی سے اُن کی واقفیت اتنی کم ہے۔ کہ اُن کا آیاتِ قرآنیہ کو دیکھ کر یہ کہنا کہ اُس کی مکہ والی زبان ہے اور اس کی مدینہ والی، محض ایک ڈھکونسلہ ہوتا ہے۔

سُورۃ کے نام اس سورۃ کے متعدد نام مختلف تفاسیر میں مروی ہیں۔ اور یہ ناموں کی کثرت اس کے کثرتِ مضمون کی طرف اشارہ کرتی ہے چنانچہ وہ نام یہ ہیں :-

۱۔ سُورَۃُ التفرید۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کے ایک ہونے

اور فرد ہونے اور تثلیث وغیرہ کی تردید اس سورۃ میں کی گئی ہے۔

۲۔ سُورۃ التجرید۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کے لاثانی ہونے کا اس میں بیان ہے۔

۳۔ سُورۃ التوحید۔ کیونکہ توحید کا ایسا واضح بیان کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے۔

۴۔ سُورۃ الاخلاص۔ کیونکہ یہ انسان کے اندر اخلاص پیدا کرتی ہے اور خدا تعالےٰ کے ساتھ اس کا تعلق جوڑتی ہے۔

۵۔ سُورۃ النجاۃ۔ کیونکہ اس بات پر پورا یقین رکھنے سے کہ خدا ایک ہے انسان نجات پاتا ہے۔

۶۔ سُورۃ الولایۃ۔ کیونکہ یہ سورۃ پورے علم اور عمل اور معرفت کا ذریعہ ہو کر انسان کو درجہ ولایت تک پہنچا دیتی ہے۔

۷۔ سُورۃ المعرفۃ۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کی معرفت اسی کلام کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نماز پڑھتے ہوئے سورۃ الاخلاص کی تلاوت کی تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس سورۃ کو سن کر فرمایا کہ اس شخص نے اپنے رب کی معرفت حاصل کر لی۔

۸۔ سُورۃ الجمال۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ یُّحِبُّ الْجَمَالَ کہ اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ اللہ کا جمال کیا ہے۔ آپ نے فرمایا اس کا احد، صمد۔ لم یلد ولم یولد ہونا۔

۹۔ سُورۃ المُقَشْقِشَۃ۔ مقشقشہ کے معنے ہیں بری کرنیوالی۔ جب کوئی بیمار شفا پاتا ہے تو اہل عرب کہتے ہیں تَقَشْقَشَ الْمَرِیْضُ عَمَّا بِہٖ۔ یعنی بیمار نے اپنی اس بیماری سے شفا پائی جس میں مبتلا تھا۔ چونکہ یہ سورۃ شرک اور نفاق سے انسان کو بری کر کے خدا تعالےٰ کا خالص بندہ بنا دیتی ہے اس واسطے اس سورۃ کا نام مُقَشْقِشَۃ رکھا گیا ہے۔

۱۰۔ سُورۃ المعوّذہ۔ کیونکہ احادیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم حضرت عثمان بن مظعون کے پاس تشریف لے گئے اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ اور سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھ کر ان پر پھونکا۔ اور ان کو یہ ہدایت کی کہ ان سورتوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کیا کریں۔

۱۱۔ سُورۃ الصّمد۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفت صمد کا ذکر آتا ہے جس میں اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ اس کا محتاج ہے۔

۱۲۔ سُورۃ الاساس۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اُسِّسَتِ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرَضُوْنَ السَّبْعُ عَلٰی قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ یعنی ساتوں آسمان اور ساتوں زمینوں کا قیام قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ کی وجہ سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تثلیث کا عقیدہ آسمانوں اور زمین کی بربادی کا موجب ہو جیسے کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے تَکَادُ السَّمٰوٰتُ

يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ
وَتَخِرُّ الْجِبَالُ۔ قریب ہے کہ آسمان
اس گندے عقیدہ کی وجہ سے پھٹ جائیں
اور زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ اور
پہاڑ گر کر ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ اور یہ
مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا
ہے لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ
لَفَسَدَتَا کہ اگر زمین و آسمان میں
اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور بھی معبود ہوتا
تو زمین و آسمان کا نظام درہم برہم ہو جاتا
گویا توحید کا عقیدہ اس دنیا کی آبادی
کی بنیاد ہے۔

۱۳ سورۃ المانعہ ۔ کیونکہ یہ عذاب قبر سے بچاتی ہے حضرت
ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ جب
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوا
تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو کہا اَعْطَيْتُكَ
سُوْرَةَ الْاِخْلَاصِ وَهِيَ مِنْ ذَخَائِرِ
كُنُوْزِ عَرْشِيْ وَهِيَ الْمَانِعَةُ تَمْنَعُ
عَذَابَ الْقَبْرِ وَنَفَحَاتِ النِّيْرَانِ۔
کہ میں نے تمہیں سورۃ الاخلاص دی ہے
اور یہ میرے عرش کے خزانوں کے ذخائر
میں سے ایک ہے۔ اور یہ عذاب قبر اور
آگ کے شعلوں سے بچانیوالی ہے کیونکہ
جو بھی توحید پر قائم ہو جائے۔ اسکو آگ
چھو نہیں سکتی۔

۱۴ سورۃ المحضر ۔ کیونکہ جب یہ پڑھی جائے تو فرشتے
اس کو سننے کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔

۱۵ سورۃ البراءۃ ۔ یعنی آگ سے یا شرک سے محفوظ رکھنے
والی چنانچہ حدیث میں آتا ہے۔ کہ
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص
کو یہ سورۃ پڑھتے سنا۔ تو آپ نے فرمایا
اَمَّا هٰذَا فَقَدْ بَرِئَ مِنَ الشِّرْكِ
کہ یہ شخص تو شرک سے پاک ہو گیا۔ پھر آپ
نے فرمایا جس شخص نے سو مرتبہ اس سورۃ
کو نماز میں یا اس کے علاوہ پڑھا تو وہ
آگ سے محفوظ ہو گیا۔

۱۶ سورۃ المذکرہ ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی توحید کو یاد دلاتی ہے۔

۱۷ سورۃ النور ۔ کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے
ہیں۔ اِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ نُوْرًا وَنُوْرُ
الْقُرْاٰنِ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ کہ ہر
چیز کا ایک نور ہوتا ہے اور قرآن کا نور
قل ھو اللہ احد ہے۔

۱۸ سورۃ الامان ۔ کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا ہے۔ کہ توحید کو ماننے والا قلعہ
میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور اس سورۃ میں
توحید کا ذکر ہے۔ پس یہ عذاب سے امن
میں رکھنے والی ہے۔

۱۹ سورۃ المنفرۃ ۔ یعنی شیطان کو بھگانیوالی (تفسیر رازی)

فضائل سورۃ اخلاص

فضائل رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس
سورۃ کو ثلث قرآن قرار دیا ہے۔ چنانچہ
آپ فرماتے ہیں۔ مَنْ قَرَاَ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ
فَكَاَنَّمَا قَرَاَ ثُلُثَ الْقُرْاٰنِ (فتح القدیر)
یعنی جس نے سورۃ الاخلاص کو پڑھا تو گویا اس نے
قرآن کریم کے تیسرے حصہ کو پڑھا۔ نیز ابوسعید خدریؓ
کہتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنَّهَا لَتَعْدِلُ ثُلُثَ
الْقُرْاٰنِ۔ (فتح القدیر) یعنی وہ ذات
جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں اسکی قسم کھا کر کہتا ہوں

کہ سورۃ الاخلاص قرآن کریم کے تیسرے حصہ کے برابر ہے۔

اس سورۃ کے ثلثِ قرآن ہونے سے یہ مراد نہیں کہ یہ سورۃ قرآن کریم کے حجم کا تیسرا حصہ ہے۔ بلکہ صرف یہ مراد ہے۔ کہ اس کا مضمون خاص اہمیت رکھتا ہے قرآن کریم اور احادیث کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری زمانہ میں دو بڑے فتنے پیدا ہونیوالے تھے۔ ایک دجالی فتنہ اور دوسرا یاجوج وماجوج کا فتنہ۔ اور ان دونوں فتنوں نے یکے بعد دیگرے اسلام کے ساتھ ٹکر لینی تھی۔ ایک فتنہ خدائے واحد کی بجائے تین خداؤں کا عقیدہ ملنے ہوتے ہے یعنی خدا باپ۔ خدا بیٹا۔ خدا روح القدس۔ اور دوسرا فتنہ دہریت کا ہے۔ یعنی دوسرے سے خدا کا منکر ہے قرآن کریم نے اِن ہر دو فتنوں کے عقائد کی تردید کی ہے اور صحیح عقائد کو بیان فرمایا ہے۔ قرآن کریم خدا باپ کی تعریف سے بھرا ہوا ہے۔ اور اسی طرح سے خدا باپ کے رب ہونے اور ایک ہونے کی تائید کرتا ہے۔ اور خدا روح القدس اور خدا بیٹے کی نفی پورے زور سے کرتا ہے۔ گویا قرآن کریم نے خدا باپ کی خدائی کو قائم کیا ہے اور خدا بیٹے اور خدا روح القدس کی تردید کی ہے۔ اس لئے یہ صاف بات ہے کہ چونکہ خدا باپ کی تائید قرآن کریم کا تیسرا حصہ ہے اس لئے سورۃ اخلاص بھی قرآن کریم کا تیسرا حصہ ہے۔ درحقیقت قرآن کریم کا کام توحید کو ثابت کرنا اور غلط عقائد کو مٹانا ہے۔ پس جب اس سورۃ نے نہایت جامع مانع الفاظ کے ساتھ مختصر طور پر وہ مضمون ادا کر دیا۔ جس سے غلط عقائد کا ابطال ہوتا ہے اور توحید کی حقیقت کو بیان کر دیا۔ تو یہ سورۃ ثلث قرآن کیا بلکہ سارے قرآن کے برابر ہوگئی۔ پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا اس سورۃ کو ثلث قرآن قرار دینا مبالغہ نہیں۔ بلکہ اس کے مضمون کی اہمیت کے پیش نظر ہے۔ چنانچہ اسی اہمیت کے پیش نظر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو اعظم السور کے نام سے بھی یاد کیا ہے (روح المعانی)

روایات میں آتا ہے کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے نازل ہوئے (روح البیان) یہ روایت بھی اس سورۃ کی اہمیت پر دلالت کرتی ہے

سورۃ الاخلاص کے ساتھ نزول کے وقت ستر ہزار فرشتے نازل ہوئے

اس قسم کی روایات کے متعلق جن میں سورتوں کے ساتھ فرشتوں کے نزول کا ذکر ہوتا ہے، یاد رکھنا چاہیئے کہ اس سے نزول کے وقت کی حفاظت مراد نہیں ہوتی۔ بلکہ نزول کے بعد کی حفاظت مراد ہوتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ ہر سورۃ کسی خاص مضمون کے بارہ میں ہوتی ہے اور بعض دفعہ اس میں پیشگوئیاں ہوتی ہیں۔ جن کے پورا ہونے پر اس سورۃ کی سچائی کا انحصار ہوتا ہے یہ پیشگوئیاں بعض دفعہ طبعی تغیرات کے متعلق ہوتی ہیں اور بعض دفعہ انسانی اعمال کے متعلق۔ انسانی اعمال کے متعلق جو پیشگوئیاں ہوتی ہیں۔ وہ اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ کہ جن کے عذاب کی اِن پیشگوئیوں میں خبر ہو۔ وہ اس عذاب کو ٹالنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ اور چونکہ بالعموم غیر معمولی طور پر مخالف حالات میں کی جاتی ہیں۔ اس لئے دنیوی سامانوں کے لحاظ سے اُن کا پورا ہونا بظاہر ناممکن یا غیر اغلب نظر آتا ہے۔ اور اسی وقت اُن کے پورا ہونے کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے غیبی امداد کا انتظام کیا جائے پس جس سورۃ میں اس قسم کی پیشگوئیاں ہوں۔ جن کے باطل کرنے کے متعلق زبردست قوموں نے زور لگانا ہو۔ اُن کے بارہ میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے اُن ملائکہ کو جو دنیا کے مختلف کاموں پر بطور مدبر مقرر ہیں، ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ایسے سامان پیدا کریں۔

کہ وہ پیشگوئیاں بغیر روک کے پوری ہو جائیں۔
گو سورۃ الاخلاص میں کوئی پیشگوئی نہیں۔ لیکن چونکہ اس میں توحید باری کا مضمون ہے۔ اور جیساکہ اُوپر کی سطور میں بیان ہو چکا ہے کہ توحید کے خلاف آخری زمانہ میں دو خطرناک فتنے اُٹھنے والے تھے۔ اور وہ ایسے فتنے تھے۔ کہ اگر آسمانی فرشتوں کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اِن فتنوں کے مٹانے کا انتظام نہ فرماتا تو اسلامی طاقتیں اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ اور اِن فتنوں کا مقابلہ مشکل تھا پس اللہ تعالیٰ نے توحید کی حفاظت کے لئے ستر ہزار فرشتوں کو لگا دیا۔ تاکہ جہاں دجّالی فتنہ اور یاجوج و ماجوج کا فتنہ توحید کے خلاف نبرد آزما ہو۔ اور پورے ساز و سامان کے ساتھ اس پر حملہ آور ہو۔ وہاں اُن کے مٹانے کیلئے فرشتے آسمان سے اُتریں اور مخالف حالات میں توحید کو دنیا پر قائم کر دیں۔ اور شرک اور دہریت کا قلع قمع ہو جائے اور جس طرح سے خدا تعالیٰ کی بادشاہت آسمان پر ہے۔ زمین پر بھی قائم ہو جائے۔

اس سورۃ کے فضائل کے متعلق جو روایات بیان ہوئی ہیں۔ اُن میں سے ایک روایت حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں۔ کہ ایک انصاری مسجد قبا میں نماز پڑھایا کرتے تھے۔ جب بھی وہ کوئی سورۃ نماز میں پڑھتے تو اس سے پہلے سورۃ الاخلاص پڑھ لیتے اور اس کے پڑھنے کے بعد پھر کوئی اَور سورۃ پڑھتے۔ مقتدیوں نے کہا کہ جب ایک رکعت میں ایک سورۃ پڑھنی کافی ہے۔ تو دوسری سورۃ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس پر انصاری نے کہا کہ میں تو سورۃ الاخلاص کو پڑھنا نہیں چھوڑ سکتا۔ خواہ مجھے امامت سے فارغ کر دو۔ اور چونکہ اس محلہ میں افضل ترین شخص نماز پڑھانے کے لئے وہی تھے۔ اس لئے اُن کو امامت سے الگ نہ کیا گیا۔ ہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب اس محلہ میں تشریف لے گئے۔ تو آپ کی خدمت معاملہ پیش کر دیا گیا۔ تب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس انصاری شخص سے اس سورۃ کو ہر رکعت میں پڑھنے کی وجہ دریافت کی تو اس صحابی نے جواب دیا اِنِّیْ اُحِبُّهَا یعنی میں اس سورۃ کے مطالب سے محبت رکھتا ہوں۔ کیونکہ یہ خدا تعالیٰ کی توحید کو لئے ہوئے ہے۔ اس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ حُبُّكَ اِيَّاهَا اَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ (فتح البیان) کہ تمہارے اس سورت سے محبت کرنے نے تم کو جنت میں داخل کر دیا۔ پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اگر خالص توحید پر قائم ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل توکل رکھے تو وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح روایات میں آیا ہے۔ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَشَكَا اِلَيْهِ الْفَقْرَ فَقَالَ اِذَا دَخَلْتَ بَيْتَكَ فَسَلِّمْ اِنْ كَانَ فِيْهِ اَحَدٌ وَاِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيْهِ اَحَدٌ فَسَلِّمْ عَلٰى نَفْسِكَ وَاقْرَءْ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ مَرَّةً وَاحِدَةً (روح البیان)

یعنی ایک شخص رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی محتاجی کی شکایت کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا۔ کہ جب تم گھر میں داخل ہو اور گھر میں کوئی موجود ہو۔ تو اس کو السلام علیکم کہا کرو۔ اور اگر گھر میں کوئی موجود نہ ہو۔ تو اپنے نفس پر سلام بھیجو اور اس کے بعد قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ایک دفعہ پڑھو۔ روایات میں آتا ہے۔ کہ اس شخص نے آپ کے ارشاد پر عمل کرتے ہوئے ایسا ہی کیا۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ اس کی غربت دور ہو گئی۔ بلکہ

اس کے پاس روپیہ اور مال کی اتنی کثرت ہو گئی۔ کہ وہ اپنے پڑوسیوں اور ہمسایوں کی بھی مدد کیا کرتا تھا۔

حقیقت یہی ہے۔ کہ جب انسان کو علم ہو کہ ایک خدا ہے۔ جو سب طاقتوں کا مالک ہے۔ وہ میرے کام میں برکت ڈال سکتا ہے۔ تو اس پر توکل کرے گا اور اُسی کے حضور جھکے گا۔ اور جب محنت اور دعا کسی کے اندر جمع ہو جائیں تو اس کی مشکلات دور ہو جاتی ہیں۔ اور اس روایت میں محنت۔ توکل اور دعا کا سبق سکھایا گیا ہے۔

بخاری۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ میں حضرت عائشہ سے روایت کی گئی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب رات کو بستر میں لیٹتے۔ تو آپ دونوں ہتھیلیاں جمع کرتے اور قل ھو اللہ احد قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھنے کے بعد ہتھیلیوں میں پھونکتے اور پھر سارے بدن پر مل لیتے۔ اور یہ فعل آپ تین مرتبہ کرتے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں سورتوں کو اکٹھا پڑھنے اور ان کے ذریعہ دعا کرنے سے اسباب کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ کہ ان تینوں سورتوں کا جو قرآن مجید کے آخر میں رکھی گئی ہیں گہرا اشتراک ہے۔ سورۃ الاخلاص میں توحید کامل کا ثبوت ہے۔ اور دوسری دو سورتوں میں دعاؤں کا ذکر ہے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ اگر انسان کو یہ معلوم نہ ہو کہ ایک خدا ہے جو ساری احتیاجوں کو پورا کرتا ہے۔ اور ہر خیر کے دینے اور ہر شر سے حفاظت میں رکھنے پر قادر ہے۔ تو اس کی توجہ کبھی دعا کی طرف مبذول نہیں ہو گی۔ مثلاً اگر ایک کتا ہمیں کاٹنے کے لئے دوڑے۔ تو جب تک ہمیں اس کے مالک کا پتہ نہ ہو ہم کس طرح کتے کو روکنے کے لئے کسی کو بلا سکتے ہیں۔ ہاں اگر ہمیں اس کے مالک کا علم ہو جائے تو ہم فوراً اُسے آواز دے کر کہہ سکتے ہیں۔ کہ دیکھو تمہارا کتا ہمیں کاٹتا ہے۔ اِسے ہٹاؤ۔ اسی طرح جب ہمیں علم ہو جائے کہ ایک ہستی ایسی ہے جس سے ہماری تمام ضروریات وابستہ ہیں۔ اور وہ اتنی طاقتور ہے کہ ہماری تمام ضروریات کو پورا کر سکتی ہے۔ تو پھر ہمارا دل دعا کی طرف خود بخود راغب ہو جائے گا پس سورۃ الاخلاص اور سورۃ الفلق اور سورۃ الناس میں طبعی ترتیب ہے۔ سورۃ الاخلاص میں اللہ تعالےٰ جیسی قادر ہستی کا علم دیا گیا ہے اور اس کے بعد قل اعوذ برب الفلق میں ہمیں بتایا گیا ہے۔ کہ ہمیں یہ دعا کرنی چاہیئے کہ اے خدا۔ ہر مخلوق تیرے ہی قبضہ قدرت میں ہے۔ اس لئے تجھی سے ہم پناہ مانگتے ہیں۔ انسان ایک ایک چیز کا نام لے کر نہیں کہہ سکتا۔ کہ فلاں فلاں چیز سے مجھے بچائیے۔ مثلاً ہزاروں بیماریاں ہیں۔ سردرد ہے۔ پھر سردرد کی کئی قسمیں ہیں۔ جن کا ڈاکٹروں کو بھی علم نہیں۔ کیونکہ اگر سردرد کی ہر قسم کا ڈاکٹروں کو علم ہو۔ تو پھر درد اچھا کیوں نہ ہو جائے اسی طرح بخاروں کی کئی قسمیں ہیں۔ اگر سارے بخاروں کا ڈاکٹروں کو علم ہو۔ تو پھر بخار کے سارے مریض کیوں اچھے نہیں ہو جاتے۔ ڈاکٹر کہہ دیتے ہیں۔ کہ یہ ملیریا ہے۔ لیکن اب طبی ترقی کے نتیجے میں معلوم ہوا ہے۔ کہ ملیریا کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ اور جن مچھروں سے ملیریا پیدا ہوتا ہے۔ وہ بھی کئی قسم کے ہیں۔ پس جب سارے بخار ڈاکٹروں سے اچھے نہیں ہوتے۔ تو ظاہر ہے کہ ملیریا کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ جن کا ابھی تک پتہ نہیں لگا۔ ہومیو پیتھک والے تو کہتے ہیں۔ کہ ہر انسان کے

بخار کی قسم الگ ہوتی ہے۔ یعنی زید کا بخار الگ قسم کا ہوتا ہے۔ بکر کا الگ قسم کا۔ پھر زید کا ملیریا ایک وقت میں ایک قسم کا ہوتا ہے اور دوسرے وقت میں دوسری قسم کا۔ مثلاً جب وہ ساگ کھاتا ہے تو ملیریا الگ قسم کا ہوتا ہے اور جب کباب کھاتا ہے تو اَور قسم کا۔

غرض حقیقت یہ ہے۔ کہ نہ بیماریوں کا احاطہ کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی اَور شئے کا۔ اس لئے فرمایا دعا کرو کہ خدایا ہمیں تو ہر چیز کا علم نہیں۔ اس لئے تُوہی ہر بُرائی سے ہمیں بچا۔ پھر سورۃ الفلق کے بعد سورۃ الناس رکھ دی۔ اور اس میں یہ نہیں بتایا کہ مجھے زید کے شر سے پناہ دے یا بکر کے شر سے محفوظ رکھ۔ بلکہ فرمایا کہ ہر قسم کے شر سے محفوظ رکھ۔ خواہ وہ کسی زبردست کی طرف سے۔ ملک کی طرف سے یا کسی افسر کی طرف سے ہو۔ اور یہ دعا اُس وقت تک دل سے نہیں نکل سکتی۔ جب تک کوئی شخص اَللّٰهُ اَحَدٌ کا قائل نہ ہو۔ پس ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی آخری تین سورتوں کا باہم جوڑ اور اشتراک ہے اور ان میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ پہلے توحید کو سمجھنا چاہیئے۔ اس کے بعد دُعائے کامل پیدا ہوگی۔ اور جب دعائے کامل پیدا ہوگی تو پھر شر کا خاتمہ ہوگا۔

قرآن کریم کی آخری تین سورتوں کا گہرا اشتراک

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ یہ تینوں سورتیں (یعنی سورۃ الاخلاص۔ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) سورۃ فاتحہ کے مضمون پر مشتمل ہیں۔ پس جس طرح سورۃ فاتحہ سے قرآن کریم شروع کیا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اسے ختم بھی سورۃ فاتحہ پر ہی کیا ہے۔ گویا وہ سارا مضمون جو سورۃ فاتحہ میں بیان کیا گیا تھا آخر میں آکر اُسے دُہرا دیا گیا ہے جس طرح اُستاد آخر میں سبق کو دُہرا دیتا ہے۔ سبق شروع کرنے سے پہلے وہ بیان کر دیتا ہے کہ آج یہ مضمون شروع ہوگا۔ پھر آخر میں اس کا خلاصہ بیان کر کے بتاتا ہے کہ یہ مضمون ہم نے آج ختم کیا ہے۔ گویا سورۃ فاتحہ میں جن مضامین کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ قرآن کریم میں اُن کا حل کرنے کے بعد آخر میں ان کا خلاصہ کر کے بتایا ہے کہ ہم نے یہ بیان کیا ہے اسے یاد رکھنا۔

قرآن کریم کی آخری تینوں سورتوں میں سورۃ فاتحہ کا مضمون دہرایا گیا ہے

سَبَبِ نزول

اس سورۃ کے شانِ نزول کے متعلق تین قسم کی روایات بیان ہوئی ہیں۔ پہلی روایت یہ آتی ہے۔ کہ مشرکین مکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ يَا مُحَمَّدُ اُنْسُبْ لَنَا رَبَّكَ۔ یعنی اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) ہمارے لئے اپنے رب کا نسب نامہ بیان کریں۔ چنانچہ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاخلاص نازل کی۔ اور بتایا۔ کہ نہ اس کا کوئی باپ ہے اور نہ اس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ اس کا کوئی برابری کرنے والا ہے (درمنثور) یہ روایت مختلف طریقوں اور مختلف الفاظ کے ساتھ بیان ہوئی ہے بعض روایات میں یہ بیان ہوا ہے۔ کہ ایک اعرابی نے یہ سوال کیا تھا اور بعض روایات میں یہ آتا ہے۔ کہ یہ سوال قریش مکہ نے کیا تھا۔ بہرحال سوال ایک ہی ہے کہ انہوں نے کہا کہ اُنْسُبْ لَنَا رَبَّكَ یعنی اپنے رب کا نسب نامہ بیان کریں۔ ظاہر ہے۔ کہ یہ روایت اپنے اندر کوئی صداقت نہیں رکھتی۔ کیونکہ یہ سوال عقلاً تبھی ہو سکتا ہے۔ جب ان بُتوں کا کوئی نسب نامہ ہوتا جن کی مشرکین مکہ عبادت کرتے تھے۔ جب بتوں کا کوئی نسب نامہ تھا ہی نہیں۔ تو مشرکین یہ سوال کرہی کیسے سکتے تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا نسب نامہ بیان کیا جائے۔ پس عقلاً یہ سوال قریش مکہ سے ہونا بعید ہے۔

دوسری روایت یہ بیان کی گئی ہے کہ خیبر کے یہود آئے اور انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ کہ خَلَقَ اللّٰهُ الْمَلٰٓئِكَةَ مِنْ نُّوْرِ الْحِجَابِ وَاٰدَمَ مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ وَاِبْلِيْسَ مِنْ لَهَبِ النَّارِ وَالسَّمَآءَ مِنْ دُخَانٍ وَّالْاَرْضَ مِنْ زَبَدِ الْمَآءِ فَاَخْبِرْنَا عَنْ رَّبِّكَ۔ یعنی یہ کہ اللہ تعالےٰ نے ملائکہ کو نور سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے اور ابلیس کو آگ کے شعلے سے اور آسمان کو دخان (گیس) سے اور زمین کو پانی کی جھاگ سے۔ پس ہمیں بتائیں کہ اللہ تعالےٰ کیسے پیدا ہوا۔ اور کس چیز سے پیدا ہوا؟ روایت میں آتا ہے۔ کہ یہ سوال سُنکر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم خاموش رہے اور آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ یہاں تک کہ جبریل سورۃ قل ھو اللہ احد لیکر اُترے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو اُن کے سوال کا جواب دیا۔ (درمنثور)

اگر اس روایت پہ ذرا غور کیا جائے۔ تو عقلی طور پہ وہ سوال جو یہود کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہود اللہ کی ہستی کو مانتے تھے اور وہ جانتے تھے کہ اللہ تعالےٰ خالق تو ہے۔ لیکن یہ سوال اس کے متعلق نہیں کیا جا سکتا۔ کہ وہ خود کس چیز سے پیدا ہُوا۔ ہاں اس کی صفات کے متعلق سوال ہو سکتا ہے۔ کہ اس کے اندر کون کون سی صفات پائی جاتی ہیں۔ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ کہنا کہ یہود کا سوال سنکر خاموش ہو گئے یہ بھی عقلاً درست نہیں۔ کیونکہ اس سوال تک قرآن کریم کا بیشتر حصہ نازل ہو چکا تھا۔ اور اس کے مطابق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جواب دے سکتے تھے۔ یہود کا سوال کوئی ایسا مشکل نہ تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس کو سنکر خاموش ہو جاتے۔ پس شانِ نزول جو سورۃ الاخلاص کا بیان کیا جاتا ہے۔ عقلاً درست معلوم نہیں ہوتا۔

تیسری روایت یہ آتی ہے کہ یہ سوال عیسائیوں کی طرف سے تھا۔ جب وفد نجران مدینہ میں آیا۔ تو انہوں نے کہا۔ صِفْ لَنَا رَبَّكَ اَمِنْ زَبَرْجَدٍ اَوْ يَاقُوْتٍ اَوْ ذَهَبٍ اَوْ فِضَّةٍ فَقَالَ اِنَّ رَبِّيْ لَيْسَ مِنْ شَيْءٍ لِاَنَّهٗ خَالِقُ الْاَشْيَآءِ فَنَزَلَتْ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (راوی)

یعنی ہمارے لئے اپنے رب کا حال بیان کرو کہ وہ زبرجد کا بنا ہُوا ہے یا یاقوت کا یا سونے کا یا چاندی کا۔ اس سوال کو سُنکر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ اللہ تعالےٰ اِن چیزوں سے بنا ہُوا نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سب اس کی مخلوق ہیں اور وہ خالق ہے۔ بعد ازاں سورۃ قل ھو اللہ احد نازل ہوئی جس میں عیسائیوں کے سوال کا جواب بیان ہُوا ہے۔

یہ روایت بھی عقلاً درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ عیسائی بھی خدا تعالےٰ کو مانتے ہیں۔ گو اس کے ساتھ بیٹا خدا اور روح القدس خدا کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ کہ باپ خدا سونے چاندی اور یاقوت وغیرہ کا مجسمہ نہیں۔ پس انکی طرف سے اس سوال کا ہونا عقلاً بعید ہے۔

الغرض سورۃ الاخلاص کے متعلق جو روایات اس کے سبب نزول کے متعلق بیان کی جاتی ہیں وہ محض قیاسی ہیں۔ اور کوئی بھی اُن میں سے ایسی وجہ نہیں۔ جس کی بناء پر اس عظیم الشان سورۃ کا نزول ہوتا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اختصار کے ساتھ اپنی توحید کا اعلان فرمایا۔ تاکہ ہر چھوٹا اور بڑا مسلمان

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○

(ہم ہر زمانہ کے مسلمان کو حکم دیتے ہیں کر) تو (دوسرے لوگوں سے) کہتا چلا جا کہ (پکی اور اصل) بات یہ ہے کہ اللہ اپنی ذات میں اکیلا ہے[۵۵]

اس کو سمجھ لے اور ذہن میں اس کو مستحضر رکھے۔ اور ہر مجلس میں اس کا اعلان کر ... خیال کرے۔

غالباً جن لوگوں نے ... کے متعلق روایات بیان کی ہیں۔ ان کو اس کا شان نزول ڈھونڈنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آتی ہے۔ کہ اس سورۃ سے پہلے قُلۡ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے۔ کہ یہ کسی سوال کا جواب ہے۔ حالانکہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ کسی سوال کے جواب میں ہوا ہے۔ بلکہ عام طور پر جہاں یہ یہ لفظ آتا ہے۔ وہاں یہ حکم ہوتا ہے۔ کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اُمت کے ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ اس کے بعد بیان ہونے والے امر کا پوری طرح لوگوں میں اعلان کرتے جائیں اور اس کے بیان کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔

[۵۵] حل لغات:۔ هُوَ۔ هُوَ اسم ضمیر ہے۔ جو واحد مذکر غائب کے لئے استعمال ہوتا ہے اُردو میں اس کے معنے "وہ" کے ہوتے ہیں۔ لیکن قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ میں هُوَ وہ کے معنوں میں نہیں ہے۔ کیونکہ وہ کے معنے تب ہوتے جب هُوَ سے پہلے کسی ایسی چیز کا ذکر ہوتا جس کے قائمقام وہ بن جاتا۔ یہاں پر هُوَ ضمیر شان ہے۔ اور اس کے معنے ہیں۔ حق یہ ہے سچ یہ ہے۔ شان یہ ہے۔

اصل پکی بات یہ ہے کہ اللہ احد ہے

اَللّٰه:۔ اللہ اس ذات پاک کا نام ہے۔ جو ازلی ابدی اور الحی القیوم ہے۔ اور مالک و خالق اور رب سب مخلوق کا ہے۔ اور اسم ذاتی ہے نہ کہ اسم صفاتی۔ عربی زبان کے سوا کسی اور زبان میں اس خالق و مالک کل کا کوئی ذاتی نام نہیں پایا جاتا۔ صرف عربی میں اللہ ایک ذاتی نام ہے جو صرف ایک ہی ہستی کے لئے بولا جاتا ہے اور بطور نام کے بولا جاتا ہے۔ اللہ کا لفظ اسم جامد ہے مشتق نہیں ہے۔ یعنی نہ یہ اور کسی لفظ سے بنا ہے اور نہ اس سے کوئی اور لفظ بنا ہے۔

اَحَدٌ:۔ عربی زبان میں دو الفاظ "ایک" کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ایک 'واحد' کا لفظ اور دوسرا 'اَحَد' ہے۔ اَلْوَاحِدُ کے متعلق لغت میں لکھا ہے اَلْوَاحِدُ اَوَّلُ الْعَدَدِ يُقَالُ وَاحِدٌ۔ اِثْنَانِ۔ ثَلَاثَةٌ (اقرب) یعنی عربی زبان میں واحد وہ عدد کہلاتا ہے۔ جس سے آگے اور عدد چلتے ہیں یعنی دو۔ تین۔ چار۔ لیکن اَحَد کا لفظ عربی میں اس وقت بولا جاتا ہے۔ جب دوسرے عدد کا ذہن میں کوئی مفہوم ہی پیدا نہ ہو۔ مثلاً اردو میں اس کی مثال لفظ 'اکیلا' ہے اور انگریزی میں اس کو کہتے ہیں ONENESS گویا جب ہم کہتے ہیں۔ ایک تو اسکے ساتھ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ کا

مفہوم بھی ذہن میں آتا ہے۔ لیکن جب کہتے ہیں اکیلا تو اس کے آگے دو کیلا۔ تکیلا کوئی لفظ نہیں ہوتا۔

اقرب میں ہے کہ اَلْفَرْقُ بَيْنَ الْاَحَدِ وَالْوَاحِدِ اَنَّ الْاَحَدَ اِسْمٌ لِمَنْ لَا يُشَارِكُهُ شَيْئٌ فِيْ ذَاتِهٖ وَالْوَاحِدُ اِسْمٌ لِمَنْ لَا يُشَارِكُهُ شَيْئٌ فِيْ صِفَاتِهٖ (اقرب)

یعنی احد اور واحد جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں فرق یہ ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ کے لئے احد کا لفظ استعمال ہو۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی وحدانیت کو بیان کرتا ہو اور بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے۔ جس کا اگر تصور کریں تو دوسری کسی ذات کا خیال بھی دل میں نہیں آتا۔

اور جب اللہ تعالیٰ کے لئے واحد کا لفظ استعمال کیا جائے۔ تو وہاں صفات کی وحدانیت مراد ہوتی ہے۔ کہ وہ صفات میں واحد ہے۔ یعنی اپنی صفات میں کامل ہے۔ اور اس کے سوا کوئی اور وجود نہیں جو صفات کے لحاظ سے کامل ہو۔

پس قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کے معنے ہوں گے اعلان کر دو۔ کہ یکی اور اصلی بات یہ ہے۔ کہ اللہ اپنی ذات میں اکیلا ہے۔

تفسیر:۔ جیسا کہ سورۂ لہب کی تفسیر میں بتایا جا چکا ہے۔ سورۂ لہب پر قرآن کریم کا مضمون ختم ہے گویا سورۃ لہب آخری سورۃ ہے۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ ہر شخص نہ قرآن کریم کے وسیع مطالب کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ان پر پورا عبور حاصل کر سکتا ہے اور نہ اس کو ذہن میں رکھ سکتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بندوں کے فائدہ کے لئے یہ طریق اختیار کیا۔ کہ آخر میں سورۃ لہب کے بعد تین سورتوں میں سارے قرآن کریم کا

خلاصہ بیان کر دیا۔ جیسے ایک قابل مصنف کتاب کو شروع کرنے سے قبل ان مضامین کو اختصاراً بیان کر دیتا ہے جو اس کتاب میں بیان کئے جاتے ہیں اور کتاب کے آخر میں پھر اپنے مضامین کا خلاصہ بیان کر دیتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح قرآن کریم کے ابتداء میں سورۃ فاتحہ کو رکھا گیا ہے۔ اور اس میں اختصاراً ان مضامین کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ جو قرآن کریم میں بیان کئے جانے تھے۔ پھر آخر میں سورۃ الاخلاص۔ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس میں سارے قرآن مجید کا خلاصہ بیان کر دیا۔ گو ایک رنگ میں سورۃ الاخلاص بھی فی ذاتہٖ قرآن کریم کا مکمل خلاصہ ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کے مضامین کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتے گا۔ کہ ان مضامین کا نقطہ مرکزی یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کو ثابت کیا جائے۔ اور اس کی صفات اور شان کو بیان کیا جائے چنانچہ سورۃ الاخلاص میں اختصار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توحید کامل اور اس کی صفات اور شان کو بیان کر دیا گیا ہے۔ گویا ان معنوں میں سورۃ الاخلاص بھی قرآن کریم کا خلاصہ ہے۔ لیکن اگر آخری تینوں سورتوں میں بیان ہونے والے مضمون کو من حیث المجموع دیکھا جائے۔ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تینوں سورتیں سورۃ فاتحہ ہی ہیں۔ گویا جس طرح سورۃ فاتحہ سے قرآن کریم کو شروع کیا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اسے ختم بھی سورۃ فاتحہ پر کیا ہے اور اس طرف توجہ دلائی ہے۔ کہ ہم نے خود قرآن کریم کا خلاصہ کر دیا ہے اب ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس خلاصہ کو یاد رکھے، اپنی نسلوں کو اس کی وصیت کرے۔ اور دنیا میں اس کا اعلان کرتا رہے۔ یہاں تک کہ دنیا ایک مرکزی نقطہ پر جمع ہو جائے۔ اور اس مقصد کی طرف توجہ بدل

سورۃ الاخلاص[1] کے شروع میں قُل کا لفظ لانے میں حکمت

کرانے کے لئے قُلْ کا لفظ آخری تینوں سورتوں سے پہلے رکھ دیا۔ جس کے معنے یہ ہیں۔ کہ یہ پیغام ہمارا آگے دوسرے لوگوں تک پہنچا دو۔ جب دوسروں تک یہ پیغام پہنچے گا۔ تو چونکہ وہ بھی قُلْ کا لفظ پڑھیں گے جس کے معنے ہیں۔ کہو۔ بیان کرو۔ ان پر بھی فرض ہو جائیگا۔ کہ وہ اس کلام کو آگے دوسروں تک پہنچائیں۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے آج کل لوگ خطوں میں لکھتے ہیں کہ جسے وہ پہنچے وہ آگے دس لوگوں تک وہی مضمون پہنچا دے گویا قرآن کریم اور اسلام کی تعلیم کا خلاصہ ان آخری تین سورتوں میں بیان فرما دیا۔ اور واضح کر دیا۔ کہ اے انسان جبکہ تُو سارا قرآن پڑھ چکا اب ہم تمہیں یہ بتاتے ہیں کہ یہ ساری دنیا کے لئے ہے۔ اور اسے لوگوں تک تم نے پہنچانا ہے۔ مگر چونکہ یہ ممکن نہیں۔ کہ ہر انسان اس کے تمام مطالب پر حاوی ہو سکے۔ اور نہ ہر شخص حافظ ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہم تمہاری آسانی کے لئے اس کا خلاصہ بیان کر دیتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ قُلْ۔ یعنی تم اس مفہوم کو آگے دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرو اور تم سے سننے والے کچھ لوگوں کے سامنے بیان کریں اور وہ کچھ اور لوگوں کے۔ یہاں تک کہ اسی طرح ہوتے ہوتے یہ مفہوم سب دنیا تک پہنچ جائے۔ گویا لفظ قُلْ کے ذریعہ ہر مسلمان اس بات کا پابند ہو جاتا ہے۔ کہ وہ اس مضمون کو دوسروں تک پہنچائے۔ یہ نہیں کہ عمر بھر میں ایک دفعہ اس پر عمل کر دیا۔ بلکہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کے جملہ کی بندش بتاتی ہے۔ کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ جس کسی کو ملے۔ جس مجلس میں جائے اور جس مقام پر جائے۔ وہاں یہ اس کا اعلان اس کے مدنظر ہو۔ اور پھر جو اس اعلان کو سنیں وہ آگے دوسروں تک پہنچائیں حتیٰ کہ یہ مضمون ساری دنیا تک پہنچ جائے

اور شاید اسی بناء پر کسی نے اس رسم کا نام قُلْ رکھ دیا ہے۔ جو موت کے بعد مسلمانوں میں ادا کی جاتی ہے

مجھے یاد ہے۔ ایک دفعہ ہمارے ایک غیر احمدی عزیز فوت ہوئے۔ اُن کے متعلقین نے مجھے بھی بلایا۔ میں بھی گیا۔ جب وہاں سب لوگ بیٹھ گئے۔ تو میں نے دیکھا کہ ایک مولوی صاحب نے پہلے کچھ پڑھا۔ اس کے بعد گھر والوں نے لاکے ہاتھ میں قرآن کریم کا ایک نسخہ دیا۔ اُس نے آگے دوسرے کے ہاتھ میں دیا۔ پھر اُس نے میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں اس وقت چھوٹا تھا۔ اور ان امور سے بالکل ناواقف۔ اور مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ کیا بات ہے۔ جائز ہے کہ ناجائز۔ گو مجھے یاد ہے کہ میں دل میں کراہت کر رہا تھا۔ آخر جب انہوں نے مجھے قرآن کریم دیا تو میں نے اُسے لے کر سامنے رکھ دیا۔ کیونکہ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ یہ مجھ سے کچھ چاہتے ہیں۔ اس پر کسی نے خود ہی وہ قرآن مجید اٹھا کر آگے کر دیا۔ یا شاید مجھے کہا کہ یہ آگے دے دو۔ میں نے کسی صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ تھا۔ تو انہوں نے بتایا کہ کہ یہ مرنے والے کو ثواب پہنچانے کا ایک طریق ایجاد کیا گیا ہے۔ لوگوں نے سوچا کہ جو چیز بھی مرنے والے کے لئے صدقہ میں دیں گے وہ دس بیس یا پچاس سو روپیہ کی ہوگی اور اس لئے مرنے والے کو ثواب بھی محدود پہنچے گا۔ اور شاید اس کے گناہوں کا کفارہ نہ ہو سکے اس لئے انہوں نے یہ سوچا۔ کہ قرآن کریم صدقہ میں دیا جائے۔ جس کی قیمت کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اس خیال کو عملی شکل اب یہ دی جاتی ہے۔ کہ ایک شخص قرآن کریم اپنے سے اگلے آدمی کو یہ کہہ کر کہ میں نے تیری ملک کیا۔ دے دیتا ہے اور وہ اگلے کو۔ اس طرح گویا کئی قرآن کریم صدقہ میں دے دیے جاتے ہیں۔ اور سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس طرح مرنے والے کو

بے انتہاء ثواب پہنچا ہوگا۔ اور بے انتہا گناہ اس
کے معاف ہو گئے ہوں گے۔ شاید اس رسم کا
نام قُلْ اسی وجہ سے رکھا گیا۔ کہ اس میں بھی
صدقہ کی چیز چکھی جاتی ہے۔

اگر مسلمان اس تعلیم پر جو اللہ تعالےٰ نے
قُلْ کے لفظ میں ان کو دی ہے عمل کرتے تو یہ ذلت
جو اُن کی اس زمانہ میں ہو رہی ہے کبھی نہ ہوتی۔
اور آج ساری دنیا اللہ تعالےٰ کی توحید کو ماننے
والی اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قدموں
میں ہوتی۔ کتنی چھوٹی سی بات ہے مگر مسلمانوں نے
اسے نظر انداز کر دیا۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع
کے موقعہ پر مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔
اِنَّ اَمْوَالَکُمْ وَدِمَاءَکُمْ وَاَعْرَاضَکُمْ
حَرَامٌ عَلَیْکُمْ کَحُرْمَۃِ یَوْمِکُمْ ھٰذَا فِیْ
شَھْرِکُمْ ھٰذَا فِیْ بَلَدِکُمْ ھٰذَا۔ پھر اس کے
بعد فرمایا اَلَا لِیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ۔

یعنی جو مسلمان حاضر ہیں، وہ سُن لیں اور جو حاضر
نہیں ان کو سننے والے یہ بات پہنچا دیں کہ تمہارے مال
تمہارے خون اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے پر
ویسے ہی حرام ہیں۔ جیسے اِس دن کی، اِس مہینہ کی،
اور اس شہر کی حرمت ہے۔ میں نے جماعت میں یہ
تحریک جاری کی تھی۔ کہ جو دوست اس تعلیم کو سنیں
وہ اسے آگے دوسروں تک پہنچائیں کیونکہ رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی فرمایا تھا۔ گویا یہ
تحریک بھی دراصل قُلْ کی طرح ہی تھی۔ ایک سے
دوسرے تک اگر یہ سلسلہ جاری رہے تو قوم میں
بیداری پیدا ہوتی ہے۔ الغرض قُلْ ھُوَ اللّٰہُ
اَحَدٌ میں یہ کہا گیا ہے۔ کہ اے مسلمان جو ایمان
لاتا ہے۔ ہماری ذات پر۔ ہمارے کلام پر اور اس میں
سے بھی ہمارے قرآن پر۔ ہم تم سے کہتے ہیں
کہ جاؤ اور لوگوں کو جا کر کہو۔ کہ اسلام کی تعلیم کا
مفہوم یہ ہے کہ اللہ ایک ہے۔

۲۔ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ اور سورۃ فاتحہ کے مضامین کا اشتراک

جیسا کہ اوپر کی سطور میں اشارۃً بیان ہو چکا ہے۔
قرآن کریم کی آخری تین سورتوں میں سورۃ فاتحہ
کا مضمون بیان ہوا ہے سورۃ الاخلاص میں اس طور
پر کہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ جو ہے یہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔
اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ اور
اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ صِرَاطَ
الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کے مضمون کی حامل
ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ
نَسْتَعِیْنُ۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ
صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ توحید کامل
اور توکل کامل پر دلالت کرتے ہیں۔ توحید کامل
کا نتیجہ توکل کامل ہوتا ہے۔ جب انسان سمجھ جائے
کہ اور کچھ ہے ہی نہیں۔ تو پھر خدا کے سوا وہ کسی
پر سہارا نہیں کر سکتا۔ کسی مقام پر ڈاکٹر بھی ہو
حکیم اور وید بھی اور ہومیوپیتھک ڈاکٹر بھی۔ تو
ڈاکٹر کے علاج سے آرام نہ ہونے کی صورت میں
بیمار دار حکیم کی طرف بھاگے جاتے ہیں اور اسکی
دوائی سے فائدہ نہ دیکھ کر وید کی طرف۔ اور پھر
ہومیو پیتھک معالج کی طرف۔ پھر ایک ہی قسم کے
ڈاکٹر ہی اگر ایک سے زیادہ ہوں۔ تو کبھی گھبرا کر ایک
کی طرف جاتے ہیں اور کبھی دوسرے کی طرف۔ مگر جب
نظر ہی کوئی نہ آئے تو کوئی دوڑ دھوپ نہیں ہوتی۔
تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ
نَسْتَعِیْنُ۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ
الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ نے توحید کامل کا مضمون

سورۃ الاخلاص میں توحید کامل اور توکل کامل

بیان کیا ہے۔ یا یوں کہو کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ نے توحید کامل اور اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ نے توکل کامل کا مضمون بیان کیا ہے اور یہی مضمون قُلْ ھُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا کہہ دے کہ اللہ ہی احد ہے۔ احد اس ذات کو کہتے ہیں۔ جو ما سوا کو بھلا کر ہمارے سامنے آتی ہے اللہ تعالٰی واحد بھی ہے اور احد بھی۔ واحد کے معنے یہ ہیں کہ وہ سرچشمہ ہے تمام مخلوقات کا۔ اور احد کے معنے ہیں۔ کہ اس کے سامنے ہر چیز غائب ہو جاتی ہے۔ الحمد للہ میں یہی بیان تھا کہ لوگ کہتے ہیں باپ کا احسان ہے۔ مگر ہمیں تو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نظر ہی نہیں آتا۔ سو ہم تو یہی کہتے ہیں کہ الحمد للہ۔ سب تعریف اللہ تعالیٰ کی ہی ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ اُستاد کا احسان ہے۔ مگر ہمیں تو کوئی اُستاد نظر نہیں آتا۔ سوائے اللہ تعالٰی کے۔ سو ہم کہتے ہیں۔ الحمد للہ۔ اسی طرح لوگ کہتے ہیں ہمسایہ کا احسان ہے۔ مگر ہمیں تو سب احسان اللہ تعالٰی کے ہی نظر آتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا۔ اس لئے ہم تو یہی کہتے ہیں۔ کہ الحمد للہ۔ سب تعریف اللہ ہی کی ہے تو قُلْ ھُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ میں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ والا مضمون ہی بیان کیا گیا ہے لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ میں بھی وہی ہے۔ یعنی نہ کوئی اس سے پہلے ہے اور نہ پیچھے ہے۔ وہی وہی ہے۔ پھر وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ میں بھی وہی مضمون ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی کہے۔ کہ یہ سب چیزیں جب نظر آتی ہیں۔ تو پھر یہ کہنا غلط ہے کہ خدا تعالٰی کے سوا نظر کچھ نہیں آتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ٹھیک ہے۔ یہ سب چیزیں نظر آتی ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی بھی خدا تعالٰی کا کفو نہیں۔ یعنی وہ تو سب کچھ اپنے پاس سے دیتا ہے۔ اور باقی لوگ جو کچھ دیتے ہیں خدا کے دئے ہوئے میں سے دیتے ہیں۔ اپنے پاس سے نہیں دیتے۔ اس کے سوا سب محض واسطے ہیں۔ خدا ان کے پیالے میں ڈالتا ہے تو وہ آگے پہنچا دیتے ہیں۔ ماں کی چھاتیوں میں دودھ خدا تعالٰی ڈالتا ہے اور وہ صرف واسطہ بن جاتی ہے۔ باپ کو خدا تعالٰی دیتا ہے تو وہ اولاد پر خرچ کر دیتا ہے۔ تو گویا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اور قُلْ ھُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کا مضمون ایک ہی ہے۔ پھر اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا مضمون اَللّٰهُ الصَّمَدُ میں آگیا ہے۔ صمد وہ ہے۔ جو خود تو کسی کا محتاج نہ ہو۔ مگر باقی سب اس کے محتاج ہوں۔ اور وہ انکی حاجتیں پوری بھی کرتا ہو۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں یہ مضمون آگیا۔ کہ سب خدا کے محتاج ہیں اور نَسْتَعِیْنُ میں یہ مضمون آگیا کہ اللہ تعالٰی سب کی مدد کرتا ہے۔ اور جب اس کے سوا کوئی حاجت پوری کر ہی نہیں سکتا۔ تو ہر ایک کو مجبور ہو کر اسی کی طرف آنا پڑتا ہے۔ پس ظاہر ہے کہ سورۃ فاتحہ اور سورۃ الاخلاص کے مضمون میں ایک اشتراک ہے۔

سورۃ الاخلاص ہے تو بہت مختصر لیکن اس میں کامل توحید کو پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس میں تین امور کو پیش کیا ہے۔

۱۔ خدا تعالٰی کی ذات کو کہ وہ موجود ہے۔

۲۔ خدا تعالٰی کے ذات میں منفرد ہونے کو یعنی یہ کہ وہ اکیلا ہے اور یہ کہ دو یا تین خدا نہیں۔

۳۔ خدا تعالٰی کے واحد فی الصفات ہونے کو۔ یعنی یہ کہ اس کی صفات میں کوئی ہمسری نہیں کر سکتا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ تم کہہ دو کہ خدا کی ہستی کے متعلق تم مختلف خیالات میں مبتلا ہو قسم قسم کی تھیوریاں ایجاد کرتے ہو۔ طرح طرح کے فلسفے اور نکتے معلوم کرتے ہو لیکن خدا تعالیٰ کے متعلق جو یقینی بات ہے اس کا نقطہ مرکزی یہ ہے۔ کہ اَللّٰہُ اَحَدٌ اللہ کی ذات ایسی ہے۔ کہ ہر رنگ میں اور ہر طرح اپنے وجود میں ایک ہی ہے۔ نہ وہ کسی کی ابتدائی کڑی ہے۔ اور نہ آخری سرا۔ نہ کسی کے مشابہ ہے۔ اور نہ کوئی اس کے مشابہ۔

اَحَدٌ کا لفظ اپنے اندر عجیب خصوصیت رکھتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اس میں کسی رنگ میں دُوئی کا خیال نہیں پایا جاتا۔ باقی سب ہندسوں میں دوئی کا خیال پایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ واحد میں بھی اور اوّل میں بھی دوئی پائی جاتی ہے۔ واحد کے معنے ہیں پہلا۔ یعنی دوسروں کی نسبت سے پہلا اور نسبت دوئی کو طلب کرتی ہے۔ کیونکہ اس وقت تک کسی چیز کی نسبت نہیں قائم کی جا سکتی۔ جب تک دوئی نہ ہو۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ دایاں ہے جب تک بایاں نہ ہو۔ اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے یہ شمال ہے جب تک جنوب نہ ہو۔ اسی طرح جو واحد ہے وہ دلالت کرتا ہے۔ کہ دوسرے ہوں۔ مگر احد کے معنے ایک ہیں۔ اور ایک دوسرے کی نفی کر دیتا ہے۔ مگر ایک کے لفظ سے بھی وہ مفہوم ادا نہیں ہو سکتا۔ جو احد میں پایا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کے سوا کوئی اور لفظ اُردو میں نہیں پایا جاتا۔ اس لئے ہم مجبور ہیں کہ ایک کا لفظ استعمال کریں۔ تو اَحد کے معنے ہیں۔ وہ ذات جو ایسی ایک ذات ہے کہ جس کا تصور کریں تو دوسری کسی ذات کا خیال بھی دل میں نہ آ سکے۔ پس اَحد وہ صفت ہے کہ جو سب خلق سے منزّہ ہو اور درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اصل شان احدیت ہی ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ مخلوق سے تعلق کے لئے نیچے اُترتا ہے تو اس کی صفات محدود ہوتی جاتی ہیں جیسے مثلاً سورج ہے۔ اُس کی چوڑائی آٹھ لاکھ میل ہے۔ لیکن آنکھ کے مقابلہ میں آ کر چھوٹا سا رہ جاتا ہے۔ کیونکہ اگر اس کا عکس پوری جسامت میں ہو۔ تو آنکھیں دیکھ نہ سکتیں پس جس طرح آنکھوں کے محدود ہونے کی وجہ سے جب تک سورج چھوٹا نہ ہو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اسی طرح خدا تعالیٰ جو اَحد کی شان رکھتا ہے اور اس کی اصل شان یہی ہے۔ جب بندوں پر ظاہر ہوتا ہے تو ایسا کہ ہم اُسے دیکھ سکیں۔ اور خدا تعالیٰ کی وہ جلوہ گری کامل نہیں ہوتی۔ پس اللہ تعالیٰ کی اصل شان کو جو احدیت ظاہر کرتی ہے کوئی اور صفت بیان نہیں کرتی۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ دو قسم کا رب ہے۔ ایک رب الاحدیت اور ایک رب المخلوق۔ شان اول کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔ مگر دوسری شان محدود ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ رحمان بھی دو قسم کا ہے۔ وہ رحمانیت جو احدیت کے لحاظ سے ہے اور اس کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ لیکن وہ رحمانیت جو بندوں سے تعلق رکھتی ہے اُسے ہر عقل والا دیکھ سکتا ہے۔ یہی خدا تعالیٰ کی مالکیت کا حال ہے اور یہی اُس کے علم کا۔ گویا بندوں کے ساتھ تعلق رکھنے والی صفات محدود ہیں۔ لیکن احدیت کی شان کے ساتھ تعلق رکھنے والی صفات محدود نہیں۔ انہی دو کیفیتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں میں خدا تعالیٰ کے متعلق بڑے جھگڑے چلے آئے ہیں۔ بعض نے تو کہا ہے خدا نظر نہیں آتا۔ بعض نے کہا نظر آتا ہے

اس پر جھگڑنے لگ گئے۔ حالانکہ جنہوں نے کہا۔ نظر
نہیں آتا۔ انہوں نے بھی ٹھیک کہا۔ اور جنہوں نے کہا
نظر آتا ہے انہوں نے بھی ٹھیک کہا۔ جنہوں نے کہا
نظر آتا ہے انہوں نے اس شان کے لحاظ سے کہا جو
بندوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اور جنہوں نے کہا۔ نظر
نہیں آتا انہوں نے ان صفات کے لحاظ سے کہا جو
احدیت کے گرد چکر لگاتی ہے۔ پس خدا تعالیٰ نظر
نہیں آتا اور بے شک نظر نہیں آتا جب تک ان صفات
کو نہ دیکھیں جو بندوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر کوئی یہ
کہتا ہے۔ کہ میں نے خدا تعالیٰ کو ان صفات کے
ساتھ جو احدیت سے تعلق رکھتی ہیں، دیکھا ہے۔ تو وہ
غلط کہتا ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ
رضی اللہ عنہا نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے
دریافت کیا۔ کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے
تو آپ نے جواب دیا۔ نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاہُ۔ کہ وہ
ایک نور ہے۔ میں اس کو کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ پھر
جو یہ کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی شان میں بھی نظر
نہیں آتا۔ وہ بھی غلط کہتا ہے۔ دراصل دونوں قسم
کے لوگ الگ الگ نقطہ نگاہ سے بات کر رہے ہوتے
ہیں۔ الغرض خدا تعالیٰ کی احدیت دو رنگ کی ہے
ایک وہ جسے ہم سمجھنا چاہیں تو نفی سے ہی سمجھ سکتے
ہیں۔ اس لئے ہمیں سمجھانے کے لئے فرمایا اَللّٰہُ
الصَّمَدُ۔ میں صمد ہوں۔ یعنی وہ ہستی جس کی مدد
کے بغیر کوئی کام نہ کیا جا سکے۔ یہ گویا تنزّل کی
احدیت کو بیان کرنا شروع کیا ہے کہ میں وہ خدا
ہوں جس کی مدد کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اور
جب یہ صورت ہے۔ تو یاد رکھو کہ میرے دروازہ
سے بھٹکنا فائدہ مند نہیں ہو سکتا۔ کہیں چلے جاؤ۔ کسی
پیر فقیر کو حاجت روا بناؤ۔ وہ سب میرے محتاج ہیں۔
پس جسے چشمہ ملے وہ گلاس پر کیوں بیٹھ جائے۔
اور میں ہی وہ چشمہ ہوں جس سے تمام لوگ اپنے اپنے
کوزے اور گھڑے بھرتے ہیں۔ جب تم مجھ ہی سے
حاصل کرتے ہو۔ تو تم کیوں مجھ سے تعلق پیدا نہ کرو
اور مجھ ہی سے نہ مانگو۔

جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے۔
اللہ تعالیٰ کی دو صفات ہیں۔ ایک احد ہونا اور
دوسری واحد ہونا۔ اور ان دونوں میں فرق ہے جب
ہم واحد کا لفظ بولتے ہیں۔ تو اس کے ساتھ دو تین
چار یا کم و بیش دوسرے افراد کے وجود کا بھی اقرار
کرتے ہیں۔ انکار نہیں کرتے۔ گویا ہم اس بات کا بھی
اقرار کرتے ہیں کہ باقی جو چیزیں ہیں اسی سے نکلی
ہیں۔ جس طرح دو تین چار وغیرہ سب عدد ایک سے
ہی نکلے ہیں۔ اسی طرح دنیا میں جس قدر بھی اشیاء
ہیں وہ سب کی سب اللہ تعالیٰ سے ہی نکلی ہیں۔ اور
ہر چیز اپنے کمال کے لئے اس کے پرتو کی محتاج ہے۔
جس طرح سورج کی روشنی کے بغیر اور کہیں نور نہیں
اسی طرح خدا تعالیٰ کے فضل کے بغیر اور کوئی وجود
نہیں ہو سکتا۔ یہ تو مفہوم ہے واحد کا۔

احد کا لفظ یہ مضمون بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ
اپنی ذات میں یکتا ہے۔ یہ دو قسم کی نفی کرتا ہے۔ پہلی
یہ کہ وہ دو سے ایک نہیں ہوا۔ اور دوسری یہ کہ
وہ ایک سے بھی دو نہیں ہوا۔ واحد ایک سے دو بنتا
ہے۔ اگر پیچھے کی طرف لوٹیں تو دو سے ایک ہو جاتا
ہے۔ یہاں تک خدا تعالیٰ کی صفات کا تعلق ہے۔
ان کے ساتھ دنیا کا اشتراک پایا جاتا ہے۔ اس کے
پرتو کے ماتحت دوسری اشیاء میں بھی ایک حد تک
وہ صفات مل سکتی ہیں۔ گویا واحد کہنے کے ساتھ ہم اس
امر کا اقرار کرتے ہیں کہ دنیا میں دوسرے وجود بھی موجود ہیں

واحد کے لفظ سے ہم دوسرے کسی وجود کی طرف جا سکتے ہیں مگر احد کے لفظ سے نہیں۔ اسی طرح عربی زبان میں واحد اثنان کہتے ہیں۔ یعنی ایک دو تین۔ احد۔ اثنان نہیں کہتے۔ تو مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی صفات میں اشتراک ہے۔ ذات میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ سنتا ہے اور اس کے پرتو سے ہمیں بھی سننے کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔ کئی نادان کہہ دیا کرتے ہیں۔ کہ یہ کہنا کہ ہم بھی سنتے ہیں اور خدا تعالےٰ بھی سنتا ہے یہ شرک ہے۔ لیکن یہ شرک نہیں۔ کیونکہ ہم جو سنتے ہیں۔ یہ اللہ تعالےٰ کی صفت کا پرتو ہے۔ پس جب ہم واحد کا لفظ بولتے ہیں۔ تو اقرار کرتے ہیں کہ دوسرے وجود بھی دنیا میں ہیں جو اس سے طاقت حاصل کرکے صفات ظاہر کرتے ہیں۔ ایک سے آگے دو۔ تین۔ چار۔ پانچ وغیرہ ہیں۔ اور اگر پھر واپس چلیں تو ایک پر ہی پہنچ جاتے ہیں۔ مگر احد کا لفظ بتاتا ہے۔ کہ نہ اس ایک سے آگے دو تین چار کی طرف جا سکتے ہیں اور نہ واپس ایک کی طرف آسکتے ہیں۔ اور اصل بناء مخاصمت کی یہی ہے۔ بہت سی قومیں ہیں۔ جو ایک سے دو تین کی طرف لے جاتی ہیں اور پھر واپس ایک کی طرف لاتی ہیں۔ چنانچہ عیسائیوں میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ باپ۔ بیٹا اور روح القدس مل کر ایک ہوا گویا وہ کثرت سے وحدت کی طرف لے جاتے ہیں۔ کہ تینوں مل کر ایک ہو گئے۔ سورۃ الاخلاص یہ کہتی ہے کہ واحدیت تو اقنوم ثلاثہ سے پیدا ہو سکتی ہے لیکن احدیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ اور توحید کامل کا یہی مقام ہے۔ چونکہ یہ غلطی خصوصیت کے ساتھ آخری زمانہ میں پیدا ہونے والی تھی۔ اس لئے قرآن کریم کے اختتام پر فرمایا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد

تو کہہ دے اللہ منفرد ہے۔ وہ نہ تو ایک سے بیٹا اور روح القدس بن سکتا ہے اور نہ یہ تینوں واپس ایک ہو سکتے ہیں۔ وہ نہ تو تنوع اختیار کر سکتا ہے اور نہ اس تنوع کو ملانے سے پھر ایک ہوتا ہے۔ الغرض سورۃ الاخلاص اس آخری زمانہ میں خدا تعالیٰ کی احدیت کو ثابت کرنے کے لئے اتاری گئی ہے۔

اس مختصر سی سورۃ کے ذریعہ جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی ہستی کا ثبوت دیا ہے۔ وہاں شرک کا بھی کلیتہً استیصال کر دیا ہے۔ شرک دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ کئی وجود خدا کی حیثیت رکھنے والے ہوں چاہے اس سے چھوٹے ہوں یا بڑے۔ دوسرے یہ کہ خدا کے سوا باقی ہو تو مخلوق ہی۔ مگر اُسے خدائی کا درجہ دیا گیا ہو۔ تو ایک شرک فی الذات ہے۔ اور دوسرا شرک فی الصفات۔ اللہ تعالےٰ نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کہہ کر تمام اُن لوگوں کے عقائد کی تردید کر دی۔ جو تین خدا کہتے ہیں یا دو خداؤں کے قائل ہیں۔ یا خدا کا بیٹا یا بیٹیاں تجویز کرتے ہیں یا اور بتوں کو پوجتے ہیں۔ چنانچہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد کے بعد اَللّٰهُ الصَّمَدُ اور پھر لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ کہہ کر بتا دیا۔ کہ اللہ تعالےٰ کی صفات میں جو لوگ شرک کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کی صفات میں شریک قرار دیتے ہیں۔ یہ اُن کی غلطی ہے۔ خواہ کتنا ہی کوئی بڑا انسان ہو۔ وہ اللہ تعالےٰ کا محتاج ہے۔ نہ اس کے رتبہ کو کوئی پہنچ سکتا ہے۔ اور نہ اس کا کوئی شریک فی الفعل ہو سکتا ہے۔

اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ

اللہ وہ (ہستی) ہے جس کے سب محتاج ہیں (اور وہ کسی کا محتاج نہیں) ۵۳ ع

اَلصَّمَدُ

۵۳ حل لغات :۔ اَلصَّمَدُ: اَلسَّیِّدُ الَّذِیْ لَا یُقْضٰی دُوْنَہٗ اَمْرٌ۔ وہ سردار جس کی مدد کے بغیر کوئی کام نہ کیا جاسکے۔ اَلدَّائِمُ ہمیشہ رہنے والی ذات۔ اَلرَّفِیْعُ۔ بہت بلند ہستی۔ (اقرب) اَلصَّمَدُ: اَلسَّیِّدُ الَّذِیْ یُصْمَدُ اِلَیْہِ۔ وہ سردار جس کی طرف حوائج اور ضروریات کے وقت قصد کیا جاتا ہے (مفردات)

تفسیر:۔ اَللّٰہُ الصَّمَدُ۔ صمد اس ہستی کو کہتے ہیں۔ کہ جو خود کسی کی محتاج نہ ہو بلکہ باقی سب چیزیں اس کی محتاج ہوں۔ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ میں یہ دعویٰ تھا۔ کہ اللہ ہے اور ایک ہے۔ اب اس دعویٰ کی دلیل اَللّٰہُ الصَّمَدُ میں دی گئی ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں۔ کہ یہ محض قافیہ کی رعایت سے لفظ لایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ بلکہ اس سورۃ کی ہر آیت پہلی آیت کے مضمون کی ایک مضبوط دلیل ہے چنانچہ پہلے فرمایا ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ۔ یعنی حقیقت یہ ہے۔ کہ اللہ منفرد ہے اور پھر فرمایا کہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اَللّٰہُ الصَّمَدُ۔ دنیا کی ہر چیز اس کی محتاج ہے۔ اور جب ساری چیزیں اس کی محتاج ہیں۔ اور وہی ہمارے سب کام پورے کرتا ہے تو پھر کسی اور رب کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ لیکن اگر اس کے باوجود کسی کو رب تسلیم کیا جائے۔ تو ماننا پڑے گا۔ کہ وہ لغو خدا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ خدا جو لغو ہے خدا نہیں ہو سکتا جب لغو پانی۔ لغو ہوا اور لغو کھانا بھی بیکار ہوتا ہے۔ تو لغو خدا کی کیا قیمت ہو سکتی ہے۔ پس جب ایک ہی خدا ساری چیزیں پیدا کرتا ہے اور وہی ہر چیز کی احتیاجوں کو پورا کرتا ہے۔ تو کسی اور سے ان احتیاجوں کو وابستہ کرنا لغو ہے۔ غرض اللّٰہ الصمد میں توحید کی دلیل دی گئی ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ کہنا کہ اللہ کسی کا محتاج نہیں۔ ایسا دعویٰ ہے جس کی دلیل لوگوں کے سامنے نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے نہیں۔ اس کی ذات ان مادی آنکھوں سے ہم دیکھ نہیں سکتے اور نہ اس کی ذات کا احاطہ کر سکتے ہیں۔ پس اس کا جواب ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم یہ ثابت کر دیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کا ہر ایک محتاج ہے۔ جب یہ ثابت ہو جائے گا۔ کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے۔ تو یہ بات خود بخود ثابت ہو جائے گی کہ وہ کسی کا محتاج نہیں۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے۔ جو روز روشن کی طرح واضح ہے۔ کہ دنیا کی کوئی ایسی چیز نہیں جو اپنی ذات میں کامل ہو۔ ہر چیز اپنے وجود کے لئے دوسری اشیاء کی محتاج ہے اور بغیر اُن کے قائم نہیں رہ سکتی۔ ELEMENTS کے باریک سے باریک ذرّات کی طرف چلے جائیں۔ تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک ذرّہ کا دوسرے ذرّہ پر اثر پڑ رہا ہے۔ کہیں نور کا اثر پڑ رہا ہے۔ کہیں پتھر کا اثر ہو رہا ہے۔ انسان کامل چیز سمجھی جاتی ہے۔ لیکن یہ پانی۔ روٹی اور ہوا کا محتاج ہے۔ سورج ہے جو گیس کا محتاج ہے اپنے جسم کو قائم رکھنے کے لئے دوسرے سیاروں سے مواد لینے کا محتاج ہے اور بیسیوں اشیاء کا محتاج ہے۔ زمین ہے تو وہ اپنے وجود کے قیام کے لئے

کہیں دوسرے ستاروں کی کشش کی۔ کہیں کرہ ہوا کی۔ پھر ایتھر کے نئے مادہ کی محتاج ہے۔ غرض کسی بڑی سے بڑی چیز کو لے کر باریک در باریک کرتے جاؤ۔ تو محتاج ہی محتاج ثابت ہوگی۔ پس ہر چیز جو ہمیں دنیا میں نظر آتی ہے۔ وہ اپنے وجود کے لئے دوسری اشیاء کی محتاج ہے۔ اور یہ احتیاج بتا رہی ہے کہ دنیا اپنی ذات میں قائم نہیں۔ بلکہ اس کا چلانے والا کوئی اور ہے۔ کیونکہ محتاج الی الغیر چیز اپنی خالق آپ نہیں ہو سکتی۔ اور نہ ہمیشہ سے ہو سکتی ہے۔

کوئی کہہ سکتا ہے۔ کہ چیزوں کی احتیاج موجودہ تحقیقات کی رُو سے ہے جب تحقیقات مکمل ہو جائیگی تو شاید ثابت ہو جائے۔ کہ بحیثیت مجموعی دنیا کسی کی محتاج نہیں۔ اول تو اس کا یہ جواب ہے کہ شاید نئی تحقیقات سے دنیا کی احتیاج اور بھی واضح ہو جائے اور اس کے خالق کا وجود اور بھی زیادہ روشن ہو جائے۔ پس یہ کوئی اعتراض نہیں۔ اس وقت تک تحقیقات کے کئی دور بدلے ہیں۔ مگر یہ مسئلہ زیادہ سے زیادہ قائم ہوا ہے۔ کبھی اس کے خلاف کوئی بات ثابت نہیں ہوئی۔ پس ہر جدید تحقیق کے بعد اس اصل کا اور بھی پختہ ہو جانا ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ آئندہ تحقیق اسے باطل نہیں کریگی بلکہ ثابت کرے گی۔ لیکن اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ کوئی ایسا ذرہ معلوم ہو جائے جو اپنی ذات میں کامل ہو۔ تو پھر بھی اسکے جوڑنے والے کی ضرورت رہے گی۔ لیکن درحقیقت یہ عقلاً محال ہے کہ کوئی ذرہ اپنی ذات میں کامل ہو۔ بغیر بالارادہ ہستی کے اور قادر مطلق وجود کے یہ طاقت کسی میں نہیں پائی جا سکتی۔

پھر یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ مادہ جسے اپنی ذات میں مکمل قرار دیا جائے اس کیلئے دوسری شکل اختیار کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ تغیر کسی دوسری شئے سے ملنے سے ہوتا ہے۔ اور ملنے کی طاقت اس میں ہوتی ہے جو نامکمل ہو۔ کامل شئے چونکہ تغیر قبول نہیں کرتی۔ وہ کسی اور چیز سے حقیقی طور پر مل بھی نہیں سکتی۔ اس کا ملنا ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ جس طرح کہ کھانڈ کے ذرے آپس میں مل کر پھر کھانڈ کی کھانڈ ہی رہتے ہیں۔ پس اگر ایسا کوئی ذرہ فی الواقع ہے۔ تو یہ دنیا اس سے پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ دنیا تو بے تعداد تغیرات کا مقام ہے۔ غرض کائنات عالم پر غور کرنے سے صاف ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہاں کی ہر چیز تغیر پذیر ہے۔ اور اپنی ہستی کے قیام کے لئے دوسروں کی محتاج۔ اس لئے کسی ایسی ہستی کا ماننا جو ان محتاج ہستیوں کو وجود میں لانے والی ہو اور ایک قانون کے ماتحت چلانے والی ہو ضروری ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایک مخفی طاقت سے یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ مخفی طاقت بالارادہ ہے یا بلا ارادہ؟ اگر بلا ارادہ ہے تو وہ خود دوسری چیزوں سے پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ تمام طاقتیں دوسری چیزوں کی حرکت یا باہمی ترکیب سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اگر بالارادہ ہے۔ تو ہمارا دعویٰ ثابت ہے۔ ہم بھی تو ایسی ہی طاقت کو منوانا چاہتے ہیں۔ غرض کہ اَللّٰہُ الصَّمَدُ میں خدا تعالےٰ کے وجود کی ایک نہایت ہی عجیب دلیل دی گئی ہے۔

اَلصَّمَدُ کے دوسرے معنے اَلرَّفِیعُ کے ہیں۔ یعنی بلند درجات والا۔ ان معنوں کے لحاظ سے اَللّٰہُ الصَّمَدُ کے معنے یہ ہوں گے۔ کہ وہ ذات جس کے متعلق ہم نے کہا ہے کہ وہ احدیت کی شان رکھتا ہے۔ وہ رفیع الدرجات ہے اور غیر محدود ہے اور قیاسات سے بالا ہے۔ گویا ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ

جب ہم نے رفیع الدرجات خدا کی طرف پرواز کرنی ہے تو پھر جتنی بھی پرواز کریں کم ہے۔ کیونکہ ہمارا خدا رفیع ہے۔ اور غیر محدود ہے۔ اور اس تک ترقی کرنے کے ذریعے کھلے ہیں۔ اور خواہ کوئی کتنا ہی ترقی کرے وہ اس کے نیچے ہی رہیگا۔ اور کوئی ایسی انتہا نہیں جہاں پر پہنچ کر ہم کہیں کہ اب سفر ختم ہے۔

اَلصَّمَدُ کے ایک معنے تفاسیر میں غنی کے بھی کئے گئے ہیں۔ لیکن غنی کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم نامکمل ہے۔ اس کے مقابل پر صمد دوہرے معنے رکھتا ہے۔ یعنی وہ ہستی جو خود کسی کی محتاج نہ ہو۔ لیکن باقی سب چیزیں اس کی محتاج ہوں۔ پس غنی کا لفظ صمد کے پورے مفہوم کو ادا نہیں کرتا۔ بلکہ آدھے مفہوم کو ادا کرتا ہے۔ اردو میں کوئی مفرد لفظ ایسا نہیں ہے جو صمد کے پورے مفہوم پر حاوی ہو۔ اگر صمد کے مفہوم کو سامنے رکھیں تو اس کا ترجمہ دوسرے لفظوں میں رحمان بن جاتا ہے۔ کیونکہ رحمان کے معنے یہ ہیں کہ وہ بغیر عمل کے بھی ربوبیت کرتا ہے۔ جب ہم کہیں کہ ہر شئے اس کی محتاج ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ رحمِ مادر میں بھی بچہ اس کا محتاج ہے۔ کیونکہ وہ وہاں بھی اس کی ربوبیت کرتا ہے۔ پس جب ہم کہتے ہیں۔ کہ ہر چیز اس کی محتاج ہے تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ بکری۔ اونٹ اور گھوڑے بھی اس کے محتاج ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کی احتیاج پوری کرتا ہے۔ پھر اس کے یہ معنے بھی ہیں۔ کہ وہ گنہگار کا بھی رحمان ہے۔ اور اس سے کفارہ کا ردّ ہو جاتا ہے اسی نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے تناسخ کا مسئلہ قائم ہوا ہے۔ ان آیات میں اس کا بھی ردّ کیا گیا ہے پھر جب ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ ہر چیز خدا تعالیٰ کی محتاج ہے۔ تو پھر چاند سورج اور ستارے اور زمین کے باریک در باریک ذرّات بھی اسی کے محتاج ہیں۔ نام نہاد (جس کو منطق میں بسیط کہتے ہیں) مفرد چیزیں بھی اس کی محتاج ہیں اور مرکب چیزیں بھی۔ پھر مادے کا بھی وہ خالق ہے۔ انسانوں کا بھی اور روح کا بھی۔ پس ثابت ہوا کہ صمدیت کے اندر رحمانیت مضمر ہے۔

اصل بات یہی ہے کہ توحید رحمانیت کا منبع ہے کیونکہ اگر توحید نہ ہو تو رحمانیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس کی ایک موٹی مثال یہ ہے۔ کہ جو قومیں توحید کی قائل نہیں۔ وہ رحمانیت کی بھی قائل نہیں۔ ہندو توحید کو نہیں مانتے لہٰذا وہ رحمانیت کے بھی قائل نہیں۔ اور ان کا عقیدہ ہے۔ کہ انسان کو اس کے گناہوں کی سزا ضرور ملے گی۔ اسی طرح عیسائی توحید کے قائل نہیں اور گناہوں کی معافی کے لئے کفارہ کو ضروری خیال کرتے ہیں پس یہ بات بالکل واضح ہے کہ جو قوم توحید کو نہیں مانتی وہ رحمانیت کی بھی قائل نہیں۔ پھر جتنی جتنی کوئی قوم رحمانیت کی قائل ہے اتنی ہی وہ توحید کی بھی قائل ہے۔ اور جتنی کوئی قوم توحید سے دُور ہے۔ اتنی ہی وہ رحمانیت سے بھی دُور ہے۔ مثلاً اس زمانہ میں یہودی مذہب کسی قدر رحمانیت کا قائل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی قدر توحید کو بھی ماننے والا ہے۔ لیکن باقی مذاہب نہ رحمانیت کے قائل ہیں اور نہ توحید کے۔ سورۃ اخلاص کے شروع میں فرمایا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ کہہ دو اللہ تعالیٰ ایک ہے اور پھر اسکے بعد اَللّٰهُ الصَّمَدُ کہکر فرمایا۔ کہ اس کا فیض جاری ہے اور ہر چیز اس کی رحمانیت سے فائدہ اٹھا رہی ہے اور اس کی محتاج ہے۔ گویا ان دونوں آیات کو یکے بعد دیگرے لانے سے اس طرف اشارہ فرمایا کہ توحید اور رحمانیت

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝

نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ وہ جنا گیا ہے۔ ۵۴

لازم وملزوم ہیں۔ اور یہ کہ صمدیت کے اندر رحمانیت مضمر ہے۔ جو اللہ تعالےٰ کے احد ہونے کی دلیل ہے

صمد کے ایک معنے اَلدَّائِم کے بھی ہیں یعنی ابدی۔ گویا بتایا گیا ہے۔ کہ اللہ ہے اور ایک ہے۔ اور یہ کہ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا نہ اس سے کوئی پہلے وجود تھا اور نہ بعد میں ہوگا بلکہ وہی ہے جو اوّل بھی ہے اور آخر بھی۔

۵۴ تفسیر:- سورۃ الاخلاص کی پہلی آیت قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا۔ کہ اللہ ہے مگر ایک ہے۔ اس دعوےٰ کے بعد اس کی دلیل اَللّٰهُ الصَّمَدُ کہہ کر دی اور بتایا کہ اللہ تعالےٰ کی ہستی کی دلیل یہ ہے۔ کہ دنیا کی کوئی چیز اپنی ذات میں کامل نہیں۔ بلکہ وہ دوسری اشیاء کی محتاج ہے۔ کامل ذات صرف اللہ تعالےٰ کی ہے جو کسی کا محتاج نہیں۔ پس کائناتِ عالم کی یہ احتیاج اللہ تعالےٰ کی ہستی کا ایک زبردست ثبوت ہے۔

اَللّٰهُ الصَّمَدُ کے بعد لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ کہہ کر اللہ تعالےٰ کی صمدیت کی دلیل دی اور بتایا کہ احتیاج دو باتوں کے سبب سے پیدا ہوتی ہے اوّل ابتدائی تعلقات کی وجہ سے۔ دوم آئندہ کے تعلقات کی وجہ سے۔

ابتدائی تعلقات سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کے نیست سے ہست میں آنے اور عالمِ وجود میں ظاہر کئے جانے کا کوئی سبب ہو۔ اور جس کے پیدا ہونے اور نیست سے ہست میں آنے کا کوئی سبب ہوگا لازماً وہ وجود محتاج ہوگا۔ کیونکہ اگر وہ سبب نہ ہوتا۔ تو اُس کا وجود ظاہر نہ ہوسکتا۔ اور آئندہ کے تعلقات سے مراد یہ ہے۔ کہ اس کی کوئی اولاد ہو۔ کیونکہ اولاد کا ہونا نہ صرف عورت کی احتیاج کو ثابت کرتا ہے۔ بلکہ اولاد کا وجود خود اپنے نفس کے فانی ہونے کا بھی ثبوت ہوتا ہے۔ چنانچہ دنیا میں کوئی ہستی ایسی نہیں۔ جو اپنی پیدائش کی غرض کے پورا ہونے تک زندہ رہنے والی ہو۔ اور پھر بھی اس کے ہاں اولاد ہو۔ مثلاً سورج۔ چاند۔ پہاڑ۔ دریا اور زمین وغیرہ ہیں۔ ان چیزوں کی پیدائش ایسی ہے۔ کہ جب تک ان کی ضرورت ہے یہ قائم رہیں گی۔ اِن پر موت نہیں آتی۔ اس لئے ان کی نسل بھی نہیں چلتی لیکن انسان اور حیوانات اور نباتات اپنی ضرورت کے ختم ہونے سے پہلے مرجاتے ہیں۔ اور اُن کی نسل چلتی ہے۔ پس جس کا کوئی باپ نہ ہو یا بیٹا نہ ہو۔ لازماً اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ غیر فانی ہے اور یہ بھی کہ وہ اپنی ذات میں مکمل ہے اور احد ہے۔

غرض لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ کہکر اللہ تعالےٰ نے دونوں قسم کے تعلقات کی نفی کر دی۔ اور ایک طرف تو اس کی صمدیت کا ثبوت دے دیا اور دوسری طرف اس کی احدیت کا ثبوت دے دیا۔ گویا یہ دو آیتیں مل کر پہلی دو آیتوں کا ثبوت ہیں۔

پھر لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ کہکر قرآن کریم نے اللہ تعالےٰ کی صفتِ صمدیت کے متعلق ایک شبہ کا بھی ازالہ کر دیا۔ وہ شبہ یہ پیدا ہوتا تھا۔ کہ بے شک مان لیا۔ کہ خدا تعالےٰ کی مدد کے بغیر کوئی کام سرانجام نہیں دیا جاسکتا۔ مگر کیا یہ ممکن نہیں

ع ۱
۲۷

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۝

اور (اس کی صفات میں) اس کا کوئی بھی شریک کار نہیں ۔ ۵ے

کُفُوًا

کہ اس کی طاقت کبھی ختم ہو جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں بعض لوگ بڑی بڑی طاقتیں رکھتے ہیں مگر ایک زمانہ کے بعد اُن کی طاقتیں سلب ہو جاتی ہیں اور وہ بالکل مقہور اور ذلیل ہو جاتے ہیں۔ پس کیا ایسا کوئی امکان اللہ تعالےٰ کی ذات کے متعلق تو نہیں؟ اس سوال کا جواب اللہ تعالیٰ نے لَمْ یَلِدْ میں دیا اور بتایا کہ اگر آئندہ اس کی طاقتیں ختم ہونے والی ہوتیں۔ تو اس کا قائم مقام کوئی وجود پیدا ہوتا۔ مگر اُس نے کوئی بیٹا نہیں جنا۔ اور بیٹوں سے وہی چیزیں مستغنی ہوتی ہیں۔ جو اپنی ضرورت کے آخر تک قائم رہتی ہیں۔ پس لَمْ یَلِدْ نے ثابت کر دیا۔ کہ اس کی طاقت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ اور اس کی صمدیت ہمیشہ قائم رہے گی۔

اس آیت میں ایک اور بات جو قابل توجہ ہے وہ یہ ہے۔ کہ اس جگہ لَمْ یَلِدْ کے الفاظ پہلے رکھے گئے ہیں۔ اور لَمْ یُوْلَدْ کے بعد میں۔ حالانکہ لَمْ یَلِدْ ابدیت پر دلالت کرتا ہے اور لَمْ یُوْلَدْ ازلیت پر دلالت کرتا ہے۔ اور ازلیت پہلے ہوتی ہے اور ابدیت پیچھے ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ ازلیت کا علم کسی انسان کو نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انسان دورِ حاضر کی پیدائش ہے۔ وہ ازلیت کا علم ابدیت سے ہی حاصل کر سکتا ہے۔ چونکہ تمام گذشتہ تاریخ عالم اس بات کا ایک ثبوت ہے۔ کہ کبھی بھی دنیا خدا کی مدد سے محروم نہیں رہی۔ اور دوسرے یہ ثابت ہے۔ کہ اس کا کوئی لڑکا نہیں۔ اس لئے معلوم ہُوا کہ وہ ابدی ہے۔ اور جب وہ ابدی ہے تو لازماً ازلی بھی ہے۔ کیونکہ آئندہ کی فنا سے وہی محفوظ رہ سکتا ہے جو گذشتہ پیدائش سے بھی محفوظ ہو۔

۵ حل لغات: کُفُوًا: اَلْکُفُوُ اَلْمُمَاثِلُ۔ یعنی کفو کے معنے مثیل اور برابر کا درجہ رکھنے والے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اہلِ عرب جب کہتے ہیں هٰذَا کُفُوُهٗ۔ تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اَیْ مُمَاثِلُهٗ یعنی فلاں فلاں کا مماثل ہے (اقرب)

مفردات امام راغب میں ہے کہ کفو اس کو کہتے ہیں جو کسی کا ہم مرتبہ ہو۔

تفسیر:۔ مفسرین کہتے ہیں کہ لَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ کا جملہ پہلی آیت کے مضمون کو دُہرانے اور اس کی تاکید کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اگر کوئی ہستی پیدا نہ ہوئی ہو۔ اور آگے بھی اُس نے کسی کو پیدا نہ کیا ہو۔ تو یہ شبہ رہتا ہے۔ کہ شاید ایسی ہی کوئی اور ہستی بھی موجود ہو۔ اِس شبہ کا ازالہ اس آیت میں کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے۔ کہ صرف یہی نہیں کہ خدا کسی کا بیٹا نہیں یا خدا کا آگے کوئی بیٹا نہیں۔ بلکہ اس کا مماثل اور مشابہ بھی کوئی نہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کی دلیل کیا ہے۔ سو اس کی دلیل قرآن شریف میں دوسری جگہ پر دی گئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ لَوْ کَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (انبیاء ع ۲) یعنی اگر دو مماثل ہستیاں ہوتیں تو دنیا میں فساد پڑ جاتا کیونکہ دو مماثل ہستیاں ہونے کے یہ معنے ہوتے۔

کہ اُن مماثل ہستیوں میں سے ایک بیکار ہے۔ کیونکہ اگر دونوں ہستیاں ایک سا کام کر سکتی ہیں۔ تو پھر فضول طور پر دو ہستیاں کیوں ہیں۔ پس لَفَسَدَتَا کے یہی معنے ہیں۔ کہ زمین و آسمان کی پیدائش بیکار ہو جاتی۔ دوسرے یہ بتایا ہے کہ اگر مماثل ہستیاں ہوں گی تو وہ متوازی سکیمیں بھی دنیا میں چلائیں گی۔ لیکن اگر متوازی سکیمیں اس دنیا میں چلتیں۔ تو دنیا کا ایک حصہ کسی اور طرف جا رہا ہوتا۔ اور دوسرا حصہ کسی اور طرف جا رہا ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ ساری دنیا میں ہمیں ایک ہی قانون چلتا ہوا نظر آ رہا ہے حتیٰ کہ جو قانون سورج پر جاری ہے وہی زمین پر بھی جاری ہے اور وہی ماوراءھا بھی جاری ہے۔ یعنی ان دونوں کرّوں سے اوپر بھی جاری ہے۔ پس جبکہ ایک ہی قانون دنیا میں جاری ہے۔ تو دو مماثل ہستیاں جو ایک سی طاقت رکھتی ہوں۔ ان کا وجود باطل ہو جاتا ہے۔

پھر اس آیت میں ایک لطیف پیرایہ میں اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہ باوجود اس کے کہ خدا تعالےٰ کی بعض صفات کے مشابہ صفات انسانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ پھر بھی خدا تعالےٰ کا کوئی ہمتا اور ہمسر نہیں۔ کیونکہ انسان کے اندر جو صفات پائی جاتی ہیں۔ وہ ایسے طور پر نہیں پائی جاتیں کہ وہ خدا تعالےٰ کا کفو ہو سکے مثلاً ظاہر ہے کہ انسان بھی اپنے دائرہ میں بصیر ہے۔ اور انسان بھی اپنے دائرہ میں سمیع ہے۔ لیکن انسان کی بصارت اور سماعت اتنی ناقص اور محدود ہے کہ اسے خدا تعالےٰ کی بصارت اور سماعت کے مقابلہ میں قطعاً نہیں کہا جاسکتا جیسے جانور بھی دیکھتا ہے اور انسان بھی دیکھتا ہے۔ اور جانور بھی کھاتا ہے اور انسان بھی کھاتا ہے۔ اور جانور بھی چلتا ہے اور انسان بھی چلتا ہے۔ لیکن پھر بھی جانور اور انسان کو کُفو نہیں کہا جاتا۔ کیونکہ انسان اپنی آنکھوں سے جو کام لیتا ہے وہ جانور نہیں لیتا۔ اور انسان اپنے مُنہ سے جو کام لیتا ہے وہ جانور نہیں لیتا۔ اور انسان اپنے پَیروں سے جو کام لیتا ہے وہ جانور نہیں لے سکتا۔ دیکھو انسان اپنی آنکھوں سے کام لے کر آئندہ کے نظریات قائم کرتا ہے۔ لیکن جانور ایسا نہیں کرتا۔ انسان اپنے مُنہ سے کھاتا ہے لیکن اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ میرا مُنہ کسی ایسی چیز کو نہ کھائے جو میری صحت کیلئے مضر ہو۔ لیکن جانور ایسا نہیں کرتا۔ اسی طرح انسان اپنے پَیروں سے چلتا ہے۔ اور جانور بھی اپنے پَیروں سے چلتا ہے۔ لیکن انسان اسی پَیروں کی حرکت کو جس سے وہ چلتا ہے پیڈل کے استعمال میں بھی کام لے آتا ہے۔ جس کے مطابق اس نے سائیکل ایجاد کیا۔ اور بعض قسم کی کشتیاں ایجاد کیں۔ لیکن جانور ایسا نہیں کرتا۔ اس کے پیروں کی حرکت ایک محدود طور پر چلتی ہے۔ اس لئے وہ انسان کا کفو نہیں۔ اسی طرح اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی سمع اور بصر پر خدا تعالیٰ کی سمع اور بصر کو قیاس نہیں کرنا چاہیئے۔ خدا تعالےٰ کا دیکھنا اور طرح کا ہے اور انسان کا دیکھنا اور قسم کا ہے۔ مثلاً خدا ماوراء الوریٰ دیکھتا ہے انسان نہیں دیکھ سکتا۔ ایک دیوار کے پیچھے جو چیز آتی ہے وہ انسان کی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ لیکن خدا کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتی۔ اسی طرح انسان بولتا ہے تو لازماً دوسرے آدمی اس کو سُن لیتے ہیں۔ لیکن خدا اپنے نبیوں سے بولتا ہے اور اُن کے پاس بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی نہیں سنتے۔ اور وہ ہزار پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی چیزیں اُن کو بتا دیتا ہے۔

جس کو بعض دفعہ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ بھی نہیں جانتے۔ پس انسان باوجود سمیع اور بصیر ہونے کے خدا کا کفو نہیں۔ اور اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اور اس شبہ کا ازالہ کر دیا گیا ہے جیسا کہ اوپر کی سطور میں بتایا جا چکا ہے۔

یہ سورۃ آخری زمانہ میں دہریت اور عیسائیت جیسے خطرناک فتنوں کے مٹانے اور اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی احدیت کو ثابت کرنے کے لئے اور تمام قوموں کو ایک نقطۂ مرکزی پر جمع کرنے کے لئے نازل کی گئی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اللہ تعالیٰ کے مختلف نام دنیا میں بولے جاتے رہے۔ کوئی اُسے گاڈ GOD کہتا۔ اور کوئی پرمیشور۔ کوئی یزدان کہتا اور کوئی الوہیم۔ اور لوگ اپنی نادانی سے یہ سمجھتے تھے کہ فلاں ہندوؤں کا خدا ہے اور فلاں زرتشتیوں کا۔ فلاں یہودیوں کا خدا ہے اور فلاں عیسائیوں کا۔ بلکہ خود ان قوموں کی کتابوں میں بھی لکھا ہوتا تھا۔ کہ تمہارا خدا جو پرمیشور یا الوہیم ہے تمہیں یوں کہتا ہے۔ گویا پہلے زمانوں میں اللہ تعالیٰ کا وجود بھی ایک قومی ہو کر رہ گیا تھا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بنی نوع انسان پر اپنا اسم ذات یعنی لفظ اللّٰہ ظاہر کیا۔ اور دنیا کو بتایا کہ گاڈ اور یزدان اور الوہیم وغیرہ سب اللہ کے نام کی طرف اشارے ہیں۔ ورنہ اصل میں ایک ہی خدا ہے جس کا نام اللہ ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بھی اشارہ فرمایا ہے وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (لقمان ع۳) یعنی اگر تُو ان سے پوچھے کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے۔ تو وہ کہیں گے۔ اللہ نے۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ اللہ کا نام لیں گے بلکہ مراد یہ ہے۔ کہ وہ جو بھی نام لیں گے۔ اُن کا اشارہ اللہ ہی کی طرف ہوگا پس اصل چیز ایک ہی ہے یعنی خواہ ہندو اور عیسائی اس کا کوئی نام رکھیں۔ مراد درحقیقت یہی ہے کہ اللہ سب چیزوں کا خالق ہے پس اللہ قومی نہیں بلکہ رب العالمین ہے۔ اور دنیا کی ساری قومیں کسی نہ کسی نام سے اس کو مانتی اور تسلیم کرتی ہیں ؎

سُوْرَةُ الْفَلَقِ مَدَنِيَّةٌ

سورۃ الفلق۔ یہ سورۃ مدنی ہے۔

وَهِيَ سِتُّ اٰيَاتٍ مَعَ الْبَسْمَلَةِ

اور بسم اللہ سمیت اس کی چھ آیات ہیں لہ

لہ حسن۔ عطاء۔ عکرمہ اور جابر کہتے ہیں۔ کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی۔ حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول یہ ہے۔ کہ یہ سورۃ مدنی ہے اور قتادہؓ بھی یہی کہتے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب اتقان میں لکھا ہے۔ کہ مختار قول یہی ہے کہ یہ سورۃ مدنی ہے۔ جو لوگ اس بات کے حق میں ہیں کہ یہ سورۃ مدنی ہے اُن کی دلیل یہ ہے کہ اس سورۃ اور اس کے بعد کی سورۃ کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بیماری کے ساتھ ہے جس میں یہ سمجھا گیا تھا کہ یہود کی طرف سے آپ پر جادُو کیا گیا ہے۔ اس وقت یہ دو سورتیں نازل ہوئیں اور آپ نے ان کو پڑھ کر پھونکا۔ مفسّرین کہتے ہیں کہ چونکہ یہ واقعہ مدینہ میں ہُوا تھا اسلئے سورۃ الفلق اور سورۃ الناس مدنی ہیں۔ بہرحال ترجیح اسی کو دی گئی ہے کہ یہ دونوں سورتیں مدنی ہیں۔ یہ مفسّرین کا ایک استدلال ہے تاریخی شہادت نہیں۔ گو ہمارے پاس بھی ایسی کوئی یقینی شہادت نہیں کہ جس کی بناء پر ہم کہہ سکیں کہ یہ مکّی سورۃ ہے۔ مگر جو استدلال کیا گیا ہے وہ بھی بودا ہے۔ کیونکہ خواہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوتی تب بھی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیماری کے موقع پر اسکو پڑھ کر اپنے اوپر پھونک سکتے تھے۔ پس محض پھونکنے سے یہ سمجھنا کہ یہ مدینہ میں نازل ہوئی تھی یہ استدلال درست نہیں۔ لیکن چونکہ ان سورتوں سے قرآن کریم کو ختم کیا گیا ہے ہم اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ یہ سورۃ یا تو مکہ اور مدینہ دونوں میں نازل ہوئی ہے اور یا پھر مدنی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کا اختتام مدینہ منوّرہ میں ہُوا ہے۔

سورۃ الفلق مدنی سورۃ ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیمار ہونا اور لوگوں کا یہ سمجھنا کہ آپ پر یہودیوں کی طرف سے جادُو کیا گیا ہے، یہ واقعہ جن الفاظ میں روایت کیا گیا ہے وہ الفاظ یہ ہیں:۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ سُحِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى اَنَّهُ لَيُخَيَّلُ اِلَيْهِ اَنَّهُ فَعَلَ الشَّيْءَ وَلَمْ يَكُنْ فَعَلَهُ حَتّٰى اِذَا كَانَ ذَاتَ يَوْمٍ اَوْ ذَاتَ لَيْلَةٍ دَعَا اللّٰهَ ثُمَّ دَعَا ثُمَّ دَعَا قَالَ اَشَعَرْتِ يَا عَائِشَةُ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدْ اَفْتَانِيْ فِيْمَا اسْتَفْتَيْتُهُ فِيْهِ قُلْتُ وَمَا ذَاكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ جَاءَنِيْ رَجُلَانِ فَجَلَسَ اَحَدُهُمَا عِنْدَ رَاْسِيْ وَالْاٰخَرُ عِنْدَ رِجْلِيْ فَقَالَ الَّذِيْ عِنْدَ رَاْسِيْ لِلَّذِيْ عِنْدَ رِجْلِيْ اَوِ الَّذِيْ عِنْدَ رِجْلِيْ لِلَّذِيْ عِنْدَ رَاْسِيْ مَا وَجَعُ الرَّجُلِ قَالَ مَطْبُوْبٌ قَالَ مَنْ

سورۃ الفلق کے نزول کے متعلق ایک روایت۔

طَبَّهٗ قَالَ لَبِيْدُ بْنُ الْاَعْصَمِ قَالَ
فِيْ اَيِّ شَيْءٍ قَالَ فِيْ مُشْطٍ وَّمُشَاطَةٍ
وَجُفِّ طَلْعَةٍ ذَكَرٍ قَالَ فَاَيْنَ هُوَ
قَالَ فِيْ بِئْرِ ذِيْ اَرْوَانَ قَالَتْ
فَاَتَاهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ اُنَاسٍ مِّنْ اَصْحَابِهٖ
ثُمَّ قَالَ يَا عَائِشَةُ وَاللّٰهِ لَكَاَنَّ
مَاءَهَا نُقَاعَةُ الْحِنَّاءِ وَلَكَاَنَّ
نَخْلَهَا رُءُوْسُ الشَّيَاطِيْنِ قَالَتْ
فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا اَحْرَقْتَهٗ
قَالَ لَا اَمَّا اَنَا فَقَدْ عَافَانِيَ اللّٰهُ
تَعَالٰى وَكَرِهْتُ اَنْ اُثِيْرَ عَلَى النَّاسِ
شَرًّا فَاَمَرْتُ بِهَا فَدُفِنَتْ وَهٰذَانِ
الْمَلَكَانِ عَلٰى مَا يَدُلُّ عَلَيْهِ رِوَايَةُ
ابْنِ مَرْدَوَيْهِ مِنْ طَرِيْقِ عِكْرِمَةَ
عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ هُمَا جِبْرِيْلُ وَ
مِيْكَائِيْلُ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ وَمِنْ
حَدِيْثِهِمَا فِي الدَّلَائِلِ لِلْبَيْهَقِيِّ
بَعْدَ ذِكْرِ حَدِيْثِ الْمَلَكَيْنِ فَلَمَّا
اَصْبَحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَدَا وَمَعَهٗ اَصْحَابُهٗ
اِلَى الْبِئْرِ فَدَخَلَ رَجُلٌ فَاسْتَخْرَجَ
جُفَّ طَلْعَةٍ مِّنْ تَحْتِ الرَّاعُوْثَةِ
فَاِذَا فِيْهَا مُشْطُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمِنْ مُشَاطَةِ رَاْسِهٖ
وَاِذَا تِمْثَالٌ مِّنْ شَمْعٍ تِمْثَالُ رَسُوْلِ
اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ
اِذَا فِيْهَا اِبَرٌ مَغْرُوْزَةٌ وَاِذَا وُتَرٌ فِيْهِ
اِحْدٰى عَشَرَةَ عُقْدَةً فَاَتَاهُ جِبْرِيْلُ
عَلَيْهِ السَّلَامُ بِالْمُعَوِّذَتَيْنِ فَقَالَ
يَا مُحَمَّدُ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ
وَحَلَّ عُقْدَةً مِّنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَ
حَلَّ عُقْدَةً - حَتّٰى فَرَغَ مِنْهَا وَحَلَّ
الْعُقَدَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَا يَنْزِعُ اِبْرَةً
اِلَّا وَجَدَ لَهَا اَلَمًا ثُمَّ يَجِدُ بَعْدَ
ذٰلِكَ رَاحَةً فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ
قَتَلْتَ الْيَهُوْدِيَّ قَالَ قَدْ عَافَانِيَ
اللّٰهُ تَعَالٰى وَمَا يَرَاهُ مِنْ عَذَابِ
تَعَالٰى اَشَدُّ وَفِيْ رِوَايَةٍ اِنَّ الَّذِيْ
تَوَلَّى السِّحْرَ لَبِيْدُ بْنُ الْاَعْصَمِ
وَبَنَاتُهٗ فَمَرِضَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ
تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَزَلَ جِبْرِيْلُ
بِالْمُعَوِّذَتَيْنِ وَاَخْبَرَهٗ بِمَوْضِعِ
السِّحْرِ وَبِمَنْ سَحَرَهٗ وَبِمَ سَحَرَهٗ
فَاَرْسَلَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
عَلِيًّا كَرَّمَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَجْهَهٗ وَالزُّبَيْرَ
وَعَمَّارًا فَنَزَحُوْا مَاءَ الْبِئْرِ وَهُوَ
كَنُقَاعَةِ الْحِنَّاءِ ثُمَّ رَفَعُوْا رَاعُوْثَةَ
الْبِئْرِ فَاَخْرَجُوْا اَسْنَانَ الْمُشْطِ
وَمَعَهَا وَتَرٌ قَدْ عُقِدَ فِيْهِ اِحْدٰى
عَشَرَةَ عُقْدَةً مُّغْرَزَةً بِالْاِبَرِ
فَجَاءُوْا بِهَا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلَ يَقْرَاُ الْمُعَوِّذَتَيْنِ
عَلَيْهَا فَكَانَ كُلَّمَا قَرَاَ اٰيَةً
اِنْحَلَّتْ عُقْدَةٌ وَوَجَدَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ
وَالسَّلَامُ خِفَّةً حَتَّى انْحَلَّتِ الْعُقْدَةُ
الْاَخِيْرَةُ عِنْدَ تَمَامِ السُّوْرَتَيْنِ فَقَامَ
صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَاَنَّمَا

أُنْشِطَ مِنْ عِقَالٍ - اَلْخَبَرُ وَالرِّوَايَةُ
الْاُوْلٰی اَصَحُّ مِنْ هٰذِهٖ" (روح المعانی)
چونکہ مفسرین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا
کی روایت کو ترجیح دی ہے اسلئے ہم صرف اسی
روایت کا ترجمہ کرتے ہیں -
"حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے
روایت ہے - کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر
یہودیوں کی طرف سے جادو کیا گیا - اور اس
کا اثر یہاں تک ہوا کہ آپ بعض اوقات یہ
سمجھتے تھے کہ آپ نے فلاں کام کیا ہے حالانکہ
وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا - ایک دن یا ایک
رات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ
سے دُعا کی - پھر دُعا کی اور پھر دُعا کی - پھر
فرمایا - اے عائشہ! اللہ تعالیٰ سے جو کچھ
مَیں نے مانگا تھا وہ اس نے مجھے دے دیا -
حضرت عائشہ رض کہتی ہیں کہ مَیں نے عرض کیا -
یا رسول اللہ وہ کیا ہے - تو آپ نے فرمایا
کہ میرے پاس دو آدمی آئے - ایک میرے
سر کے پاس بیٹھ گیا اور دوسرا میرے پاؤں
کے پاس - پھر وہ شخص جو میرے سر کے پاس
بیٹھا ہوا تھا اس نے پاؤں کے پاس بیٹھنے والے
کو مخاطب کر کے کہا - یا غالباً یہ فرمایا کہ پاؤں
کے پاس بیٹھنے والے نے سر کے پاس بیٹھنے
والے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اس شخص
(یعنی محمد رسول اللہ) کو کیا تکلیف ہے - تو
دوسرے نے جواب دیا کہ جادو کیا گیا ہے -
اس نے کہا کہ کس نے جادو کیا ہے - تو اس
نے جواب دیا - لبید بن الاعصم یہودی نے -
تب پہلے نے کہا کہ کس چیز میں جادو کیا گیا ہے -
تو دوسرے نے جواب دیا کہ کنگھی اور سر کے بالوں
پر جو کھجور کے خوشہ کے اندر ہے پہلے نے پوچھا
یہ چیزیں کہاں ہیں - تو دوسرے نے کہا بنی ذی اروان
کے کنوئیں میں ہیں - حضرت عائشہ رض کہتی ہیں - کہ
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ بمعیت اس کنویں
کے پاس تشریف لے گئے - پھر فرمایا - اے عائشہ
اللہ کی قسم کنویں کا پانی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے
مہندی کے نچوڑ کی طرح سُرخ ہوتا ہے (معلوم
ہوتا ہے - یہودیوں میں یہ رواج تھا کہ جب وہ
کسی پر جادو ٹونا کرتے تھے تو مہندی یا اسی قسم
کی کوئی اور چیز پانی میں ڈال دیتے تھے - یہ ظاہر
کرنے کے لئے کہ جادو کے زور سے پانی کو سُرخ
کیا گیا ہے) اور وہاں کی کھجوریں ایسی تھیں جیسے
شیاطین یعنی سانپوں کے سر (اس میں کھجور کے
گابھوں کو سانپوں کے سروں کے ساتھ تشبیہ
دی گئی ہے - یعنی کھجوریں گابھوں والی تھیں) -
حضرت عائشہ رض کہتی ہیں - مَیں نے کہا - یا رسول اللہ
آپ نے اس چیز کو جس پر جادو کیا گیا تھا - جلا
کیوں نہ دیا - رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
مجھے جب اللہ تعالیٰ نے شفا دیدی تو مَیں نے ناپسند
کیا کہ کوئی ایسی بات کروں جس سے شر کھڑا ہو -
(یعنی یہودیوں کو یہ شور مچانے کا موقع ملے - کہ
انہوں نے ہماری چیزوں کو جلا دیا ہے) اسلئے
مَیں نے حکم دیا - کہ ان اشیاء کو دفن کر دیا جائے
چنانچہ ان کو دبا دیا گیا ہے - حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا
کی روایت میں جن دو مردوں کا ذکر آتا ہے کہ وہ
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے معلوم ہوتا
ہے کہ وہ دو فرشتے تھے جو رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کو دکھائے گئے - اگر وہ انسان ہوتے

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی نظر آجاتے۔
یہ روایت جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کی گئی ہے اس کا صرف اتنا مطلب ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرشتوں کے ذریعہ سے خبر دی۔ کہ یہودیوں نے آپ پر جادو کیا ہوا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس طرح جادو کا اثر تسلیم کیا جاتا ہے اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہو بھی گیا تھا۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی شخص اس قسم کا ہو جو دوسرے سے شدید عناد رکھتا ہو تو اس کی توجہ دوسرے شخص پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اور جس طرح مسمریزم کا دوسرے پر اثر پڑتا ہے اسی طرح جادو کا بھی ایک اثر پڑتا ہے۔ گویا یہ بھی مسمریزم کی ایک قسم ہوتی ہے جس میں دوسرے پر توجہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسی طرح یہودیوں نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوشش کی۔ اور بعض دفعہ دشمن جب خاص طور پر کسی امر کے متعلق اجتماع خیال کرتا ہے تو اس کا اثر مسمریزم کے طور پر دوسرے پر بھی ہو جاتا ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جادو ٹونے کی چیزیں نکال کر زمین میں دفن کر دیں تو یہودیوں کو خیال ہو گیا کہ انہوں نے جو جادو کیا تھا وہ باطل ہو گیا ہے۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو صحت عطا فرما دی۔ خلاصہ کلام یہ کہ یہودی یقین رکھتے تھے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا ہے اس وجہ سے طبعی طور پر ان کی توجہ اس طرف مرکوز ہوئی۔ کہ آپ بیمار ہو جائیں چنانچہ اس کا اثر آپ کے جسم پر بھی پڑا۔ لیکن جب خدا تعالیٰ نے حقیقت ظاہر کر دی اور آپ نے ان کی چیزیں دفن کرا دیں تو یہودیوں کی وہ توجہ ہٹ گئی اور اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحت عطا فرما دی۔ اس روایت سے جہاں یہودیوں کے اس عناد کا پتہ چلتا ہے جو اُن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے تھا وہاں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے سچے رسول تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ان تمام باتوں کا علم دیدیا گیا جو یہودی آپ کے خلاف کر رہے تھے۔ پس آپ کو غیب کی باتوں کا معلوم ہو جانا اور یہودیوں کا اپنے مقصد میں ناکام رہنا آپ کے سچا رسول ہونے کی واضح اور بیّن دلیل ہے۔

سورۃ الفلق کے فضائل۔

فضائل مسلم۔ ترمذی اور نسائی میں روایت آتی ہے۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُنْزِلَتْ عَلَیَّ اللَّیْلَۃَ اٰیَاتٌ لَمْ اَرَ مِثْلَھُنَّ قَطُّ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (روح المعانی) یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب سورۃ الفلق اور سورۃ الناس نازل ہوئیں۔ تو حضور نے فرمایا۔ کہ آج رات مجھ پر ایسی بے مثل آیات اُتاری گئی ہیں کہ ان جیسی پہلے نازل نہیں ہوئیں۔ اور پھر اس کے بعد سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھی۔

یہ سورتیں چونکہ ایک طرف قرآن کریم کا خلاصہ ہیں۔ اور دوسری طرف ان میں مضامین کی کثرت ہے۔ اور بعض آئندہ زمانہ کے متعلق پیشگوئیاں بھی ہیں۔ اسلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ یہ سورتیں بے مثل ہیں۔ یہ ان کے فضائل اور کثرت مضامین کی طرف اشارہ ہے۔

بخاری۔ ابوداؤد۔ نسائی اور ابن ماجہ نے
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے
اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
کَانَ اِذَا اَوٰی اِلٰی فِرَاشِہٖ کُلَّ لَیْلَۃٍ
جَمَعَ کَفَّیْہِ ثُمَّ نَفَثَ فِیْہِمَا فَقَرَاَ
فِیْہِمَا قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ وَ قُلْ
اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَ قُلْ اَعُوْذُ
بِرَبِّ النَّاسِ ثُمَّ یَمْسَحُ بِہِمَا
مَا اسْتَطَاعَ مِنْ جَسَدِہٖ۔ یَبْدَأُ
بِہِمَا عَلٰی رَأْسِہٖ وَوَجْہِہٖ وَمَا اَقْبَلَ
مِنْ جَسَدِہٖ۔ یَفْعَلُ ذٰلِکَ ثَلَاثَ
مَرَّاتٍ۔ وَجَاءَ فِی الْحَدِیْثِ اَنَّ مَنْ
قَرَاَھُمَا مَعَ سُوْرَۃِ الْاِخْلَاصِ
ثَلَاثًا حِیْنَ یُمْسِیْ وَ ثَلَاثًا حِیْنَ
یُصْبِحُ کَفَتَہُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ (روح المعانی)
یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کے وقت
اپنے بستر میں آرام فرماتے تو اپنی دونوں ہتھیلیوں
کو جمع کرتے اور سورۃ الاخلاص، سورۃ الفلق
اور سورۃ الناس کی تلاوت فرماتے اور ہتھیلیوں
میں پھونکتے اور سر سے لیکر پاؤں تک سارے
جسم پر مل لیتے اور یہ فعل تین بار کرتے۔ نیز حدیث
میں یہ بھی آتا ہے۔ کہ جو شخص ان دونوں سورتوں کو
سورۃ الاخلاص کے ساتھ ملاکر صبح وشام پڑھے گا
اس کے لئے یہ کافی ہوجائیں گی۔ اور اس کی ضرورت
پوری ہوگی اور دُکھ درد سے محفوظ رہے گا۔
اس سے مراد یہ ہے کہ قرآنی تعلیم انسان کو دُکھوں
سے بچاتی ہے۔ کیونکہ جو شخص صبح وشام معوّذتین
پڑھے گا لازماً قرآنی تعلیم خلاصۃً صبح وشام اس
کے سامنے آتی رہے گی۔ اور جس کے سامنے صبح وشام
قرآنی تعلیم آتی رہے گی اُسے عمل کا بھی خیال آئیگا۔
اور اس طرح وہ دُکھوں سے بھی محفوظ رہے گا۔

اسی طرح ابن مردویہ نے عقبہ بن عامرؓ سے روایت
کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اِقْرَءُوْا
بِالْمُعَوِّذَاتِ فِیْ دُبُرِ کُلِّ صَلٰوۃٍ (در منثور)
یعنی اے لوگو! ہر نماز کے بعد سورۃ الفلق اور سورۃ
الناس کو پڑھا کرو۔ اسی طرح سے ابن مردویہ نے
حضرت اُم سلمہؓ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا مِنْ اَحَبِّ السُّوَرِ اِلَی اللّٰہِ
قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَ قُلْ اَعُوْذُ
بِرَبِّ النَّاسِ۔ کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسندیدہ
سورتیں ہیں یعنی سورۃ الفلق اور سورۃ الناس۔

پھر یہ روایت بھی آتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سورۃ
الاخلاص اور معوذتین کو ملاکر وتر کی آخری رکعت میں پڑھا کرتے تھے (در منثور)

یہ سب روایات ان سورتوں کے فضائل
کو ظاہر کرتی ہیں اور ہمیں اس طرف راہنمائی کرتی
ہیں کہ ہمیں ہر وقت اللہ تعالیٰ پر نگاہ رکھنی چاہیئے۔
اور اس کی پناہ میں رہنے کی دُعا کرتے رہنا چاہیئے۔
وتر کی آخری رکعت چونکہ دن کی نمازوں کے خاتمہ
پر ہوتی ہے اسلئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس
میں یہ دونوں سورتیں ملاکر پڑھتے تھے۔ اور آپؐ
کا یہ فرمانا کہ جو شخص صبح وشام اِن سورتوں کو پڑھیگا
وہ آفات سے محفوظ ہوجائے گا۔ اس کے معنے یہ
ہیں کہ انسان کو اپنی ابتداء بھی قرآنی تعلیم پر رکھنی
چاہیئے اور اپنی انتہاء بھی قرآنی تعلیم پر رکھنی چاہیئے۔

بعض لوگوں نے سورۃ الفلق اور سورۃ الناس
کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ سورتیں دراصل
قرآن کریم کا حصہ نہیں۔ اگرچہ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں
کہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے

ساتھ لکھوایا ہے۔ اور قرآن کریم کے خاتمہ پر انہیں پڑھا کرتے تھے۔ اور پڑھنے کا حکم دیتے تھے۔ مگر باوجود اس کے ان کا خیال ہے یہ سورتیں قرآن کریم کا حصہ نہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب صحابہ میں سے تھے ان کی یہی رائے ہے۔ لیکن اس کی بنیاد کسی دلیل پر نہیں۔ واقعات کے متعلق دلیل صرف وہی شہادت ہوسکتی ہے جو یا تو نظری ہو یا سماعی۔ یعنی یا تو اس کی شہادت جس نے خود واقعہ دیکھا ہے یا پھر اگر کسی اور کی طرف اس فیصلہ کو منسوب کرے تو اس کے الفاظ بیان کرے لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ بیان نہیں کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح سُنا بلکہ وہ کہتے ہیں۔ کہ ان دونوں سورتوں کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ ان کے ساتھ استعاذہ کیا کریں۔ اور چونکہ یہ دونوں سورتیں استعاذہ ہیں۔ اسلئے معلوم ہوا کہ قرآن ختم ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ یہ محض ان کا قیاس ہے۔ اس کے مقابل دوسرے متعدد صحابہ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورتیں انہیں قرآن کے حصہ کے طور پر لکھوائیں۔ اسلئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قیاس درآنحالیکہ وہ خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ قرآن کریم کے ساتھ لکھی اور پڑھی جاتی تھیں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ پس یہ سورتیں یقیناً قرآن کریم کا حصہ ہیں اور قرآن کریم کے خاتمہ کے لیے خدا تعالیٰ نے ان کو چُنا ہے۔

تعلق جیسا کہ قبل ازیں سورۃ الاخلاص کی تفسیر میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ آخری تین سورتیں مجموعی لحاظ سے قرآن مجید کا اسی طرح خلاصہ ہیں۔ جس طرح کہ سورۃ فاتحہ قرآن مجید کا خلاصہ ہے۔ چنانچہ سورۃ الاخلاص میں وہی مضمون بیان ہوا ہے جو سورۃ فاتحہ کی آیات اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں بیان ہوا ہے۔ سورۃ الاخلاص کے بعد سورۃ الفلق ہے۔ اسمیں سورۃ فاتحہ کی آیات رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اور غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ کا مضمون بیان کیا گیا ہے کیونکہ سورۃ الفلق کی ابتداء میں قُلْ اَعُوْذُ کے الفاظ ہیں۔ جو بتلاتے ہیں کہ اس جگہ کسی شر کا ذکر ہے جس سے پناہ مانگنے کے لئے کہا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ۔ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ۔ یعنی میں اس خدا سے جو ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے دُنیا کی ہر شے کی بُرائی سے پناہ مانگتا ہوں۔ پس رَبِّ الْفَلَقِ میں خدا تعالیٰ کے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہونے کا ذکر آگیا۔ اور مَا خَلَقَ کے شر سے پناہ مانگنے میں غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ والی دُعا آگئی۔ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ میں جس کے معنے ہیں۔ کہ جب تاریکی سب طرف چھا جاتی ہے۔ یہ بتایا۔ کہ بعض اوقات ربوبیت عالمین کی صفت دُنیا سے مخفی ہو جاتی ہے۔ میں اس سے پناہ مانگتا ہوں۔ اور مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ میں جس کے معنے ہیں۔ ہر حسد کرنے والے کے حسد سے میں محفوظ رہوں۔ ربوبیت کے مخصوص اظہار کا ذکر کیا۔ کیونکہ حسد تب ہوتا ہے جب کچھ لوگوں پر انعام ہو رہا ہو۔ اور کچھ پر سزا نازل ہو رہی ہو۔ پس سورۃ الفلق میں دُعا سکھائی کہ خدایا جب دُنیا میں تیرا عام غضب نازل ہو رہا

ہو۔ اس وقت بھی ہم کو بچا۔ اور جب خاص غضب نازل ہو رہا ہو۔ اس وقت بھی ہم کو بچا۔ تاکہ نہ ہم حاسد بنیں اور نہ محسود ناکام۔ کیونکہ بعض محسود بھی دوسروں کے حسد کے نتیجہ میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ الغرض سورۃ فاتحہ کے مضمون کا کچھ حصہ سورۃ الاخلاص میں آگیا۔ اور کچھ سورۃ الفلق میں اور باقی حصہ سورۃ الناس میں بیان ہوا ہے۔ اور اس طرح وہ سارا مضمون جو سورۃ فاتحہ میں بیان ہوا ہے۔ آخری تین سورتوں میں دہرا دیا گیا ہے۔

اس سورۃ کا سورۃ اخلاص سے یہ تعلق بھی ہے کہ سورۃ اخلاص میں توحید کامل کا سبق سکھایا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے۔ کہ سارے قرآن مجید کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ پھر اس کے بعد سورۃ الفلق اور سورۃ الناس میں ہر مسلمان کو یہ ہدایت کی گئی ہے۔ کہ وہ اپنے اپنے زمانہ میں خدا تعالیٰ کی توحید کے جھنڈے کو بلند رکھے۔ اور کسی جابر، ظالم اور دشمنِ اسلام سے ڈرے نہیں۔ اور یہ یقین رکھے کہ صرف ایک خدا تعالیٰ کی ہستی ہی ہے جس کے اشارہ پر ساری کائنات حرکت کرتی ہے اور وہ خدا ہر خیر کے دینے اور ہر شر سے محفوظ رکھنے پر قادر ہے۔ پس اس کی توحید کا اعلان کرنے کے لئے مخلوق میں سے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ جب کوئی شخص توحید کی اشاعت کے لئے کھڑا ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسکی خود حفاظت کریگا۔ اور بڑے سے بڑا بادشاہ بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔

سورۃ الفلق کا تعلق سورۃ نصر سے بھی ہے۔ سورۃ نصر میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی تھی کہ اسلام بڑھیگا، پھولیگا اور پھیلے گا۔ اور کوئی اس کی ترقی کو روک نہیں سکتا۔ سورۃ الفلق میں یہ بتایا۔ کہ اے مسلمانو! جب تمہیں خدا تعالیٰ کی پیشگوئیوں کے مطابق غلبہ مل جائے۔ تو تم اللہ تعالیٰ کے حضور جھک جانا۔ اور دُعا کرنا کہ تمہارے اندر کوئی ضعف پیدا نہ ہو۔ اور تمہارا سورج کبھی ڈوبنے نہ پائے۔ بلکہ نصف النہار پہ چمکتا رہے۔ اور کسی قسم کا شر پیدا نہ ہو۔ اور نہ تو تمہارا اندرونی نظام درہم برہم ہو کر تمہارا شیرازہ بکھرے اور نہ کوئی بیرونی حاسد کھڑا ہو جائے اور تمہاری حکومت کو تباہ کر دے +

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

(مَیں) اللہ کا نام لے کر جو بے انتہا کرم کرنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے (اس سورۃ کو شروع کرتا ہوں)

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ○ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ○[1]

(ہم ہر زمانہ کے مسلمان سے کہتے ہیں کہ) تُو (دوسرے لوگوں سے) کہتا چلا جا کہ مَیں مخلوقات کے ربّ (اکی) پناہ طلب کرتا ہوں اُسکی ہر مخلوق کی (ظاہری اور باطنی) بُرائی کے دُور کرنے کیلئے۔[1]

[1] **حلّ لغات** :- اَعُوْذُ۔ عَاذَ سے مضارع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور عَاذَ بِہٖ مِنْ کَذَا کے معنے ہیں۔ لَجَاَ اِلَیْہِ وَاعْتَصَمَ۔ کسی کی پناہ اور حفاظت میں آکر بچاؤ چاہا۔ چنانچہ جب اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ کہتے ہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں۔ اَلْتَجِئُ اِلَی اللّٰہِ وَاَعْتَصِمُ مِنَ الشَّیْطَانِ۔ کہ مَیں اللہ کی پناہ میں آکر شیطان کے حملوں سے بچتا ہوں۔ اور جب عَاذَ بِالشَّیْءِ کہیں تو معنے ہونگے لَزِمَہٗ اس کے ساتھ چمٹ گیا۔ نیز جب عَاذَتْ بِوَلَدِھَا کا فقرہ بولیں تو معنے ہوتے ہیں قَامَتْ مَعَہٗ۔ یعنی فلاں عورت اپنے بچّہ کے ساتھ کھڑی ہوگئی (اقرب) پس اَعُوْذُ کے معنے ہوں گے۔ مَیں اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتا ہوں۔ (۲) مَیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ چمٹے رہنا چاہتا ہوں۔

الفلق :- کے معنے ہیں۔ اَلصُّبْحُ۔ صبح۔ اَلْخَلْقُ کُلُّہٗ۔ ساری مخلوقات۔ جَھَنَّمُ۔ جہنم۔ اَلْمُطْمَئِنُّ مِنَ الْاَرْضِ بَیْنَ رَبْوَتَیْنِ۔ دو چوٹیوں کے درمیان میدانی زمین۔ مَقْطَرَۃُ السَّجَّانِ۔ وہ لکڑی جس میں اتنے چوڑے سوراخ ہوتے ہیں کہ جس میں انسان کی پنڈلیاں آجائیں۔ اس میں مجرموں کو قطار میں کھڑا کیا جاتا ہے۔ اور ایک کیلا گاڑ کے سوراخ کو اس طرح تنگ کر دیا جاتا ہے کہ کوئی پاؤں نہ نکال سکے۔ مَا یَبْقٰی مِنَ اللَّبَنِ فِیْ اَسْفَلِ الْقَدَحِ۔ دودھ کا وہ حصّہ جو آخر میں پیالہ میں رہ جاتا ہے۔ اور فلق اس دودھ کو بھی کہتے ہیں جو کھٹا ہو کر پھٹ جاتا ہے۔ وَالشَّقُّ فِی الْجَبَلِ۔ اور پہاڑ میں جو شگاف ہوتا ہے اسکو بھی فلق کہتے ہیں۔ (اقرب)

مفردات میں ہے۔ اَلْفَلْقُ: شَقُّ الشَّیْءِ وَاِبَانَۃُ بَعْضِہٖ عَنْ بَعْضٍ۔ کہ فلق کے معنے ہیں۔ کسی چیز کا پھاڑنا اور اس کے بعض حصّوں کو دوسروں سے جدا کر دینا۔ وَقَوْلُہٗ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اَیِ الصُّبْحِ وَقِیْلَ اَلْاَنْھَارِ الْمَذْکُوْرَۃِ فِیْ قَوْلِہٖ وَجَعَلَ خِلٰلَھَا اَنْھَارًا۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ میں فلق سے مراد صبح ہے (درحقیقت صبح کو فلق اسلئے کہتے ہیں کہ پو پھٹتی ہے اور اس میں سے سفیدی نمودار ہو کر فضاء کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیتی ہے) نیز بعض لوگوں نے فلق کے معنے نہروں کے بھی کئے ہیں۔ اور یہ معنے اس وجہ سے ہیں کہ نہروں کا پانی زمین کو پھاڑتا ہے۔ (مفردات)

پس قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ کے معنے ہونگے

۱۔ مَیں اس خدا کی پناہ چاہتا ہوں جو اندھیرے کے بعد روشنی پیدا کرتا ہے۔

۲۔ مَیں اس خدا کی پناہ چاہتا ہوں جس نے سب کچھ

پیدا کیا ہے۔ یا جس نے جہنم کو پیدا کیا ہے۔ یا جس نے دو گھاٹیوں کے درمیان ایک عمدہ میدان بنایا ہے۔ (یعنی اسلام جو افراط و تفریط کے درمیان ہے۔)

۳۔ یا میں اس خدا کی پناہ میں آتا ہوں جس کا اقتدار قیدخانوں پر بھی ہے۔

۴۔ اس خدا کی پناہ چاہتا ہوں جو نہروں کا رب ہے۔

۵۔ اس خدا کی پناہ چاہتا ہوں جس کے قبضے میں پیالے کا بچا ہوا دودھ ہے۔

تفسیر:۔ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کو معوذتان کہتے ہیں۔ یعنی وہ سورتیں جن کو پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی جاتی ہے۔ اور ان کا یہ نام اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ ان دونوں کے ابتداء میں قُلْ اَعُوْذُ کے الفاظ رکھے گئے ہیں۔ یعنی ہر پڑھنے والے کو یہ حکم دیا گیا ہے۔ کہ وہ یہ اعلان کرے کہ میں ہر قسم کے شر سے بچنے کے لئے رب الفلق اور رب الناس کی پناہ میں آتا ہوں۔ قومی لحاظ سے اور فردی لحاظ سے بھی۔

یہ عجیب بات ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (نحل ع۱۳) یعنی اے قرآن کریم کے ماننے والے جب تو قرآن کو پڑھنے کا ارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ سے استعاذہ کر لیا کر۔ پس قرآن کریم کے شروع کرتے وقت اعوذ پڑھنے کا حکم تو دیا لیکن قرآن کریم کے شروع میں اعوذ نازل نہیں کیا چنانچہ سورۃ فاتحہ کی پہلی آیت بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہے۔ یہ نہیں کہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ سے شروع ہو۔ الغرض قرآن کریم کو شروع کرتے وقت حکم تو دیا کہ اعوذ پڑھا کرو لیکن اعوذ اتارا نہیں۔ اور قرآن کریم کے خاتمہ کے متعلق یہ نہیں فرمایا۔ کہ جب تم قرآن کریم ختم کر لیا کرو تو اعوذ پڑھا کرو لیکن اس کے خاتمہ پر اپنی طرف سے وحی کی صورت میں اعوذ نازل کر دیا ہے۔ اور اس کے لئے دو سورتیں یعنی سورۃ الفلق اور سورۃ الناس بھی آخر میں رکھ دی ہیں۔ جو لازماً قرآن کریم پڑھنے والے کو پڑھنی پڑتی ہیں۔ سو یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اس طریق کے اختیار کرنے میں کئی ایک حکمتیں ہیں :۔

۱۔ جب انسان کسی نیک کام کا ارادہ کرتا ہے تو محض ارادہ ہی کے ساتھ خدا تعالیٰ کے کامل فضلوں کا وارث نہیں ہو جاتا۔ ارادہ کے ساتھ انسان کو خدا تعالیٰ کی طرف سے صحیح تعلیم مل جاتی ہے۔ یعنی اس کے ارادہ میں مدد دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب قرآن کریم کے ابتداء میں اعوذ پڑھنے کے متعلق فرمایا تو وحی کے ذریعہ اعوذ کو اتارا نہیں بلکہ صرف اتنا فرمایا کہ جب تم قرآن کریم پڑھنے کا ارادہ کرو تو اعوذ پڑھ لیا کرو۔ گویا ارادہ کو مضبوط کرنے کا ذریعہ بتا دیا۔ لیکن جب قرآن کریم پڑھ لیا اور عمل کر لیا تو آخر میں اعوذ والی سورتیں رکھ دیں۔ یعنی انسان کے اختیار کے بغیر اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد سے اعوذ پڑھوا دیا۔ پس معلوم ہوا کہ جب انسان نے ارادہ کیا تو ارادہ ہی کی امداد دی گئی۔ اور جب اس نے عمل کر لیا تو اس کو عمل کر کے امداد دی گئی۔

۲۔ جب بھی کوئی مسلمان قرآن کریم کو پڑھے گا

خواہ ابتداء سے پڑھے یا درمیان سے یا آخر سے۔ تو اس وقت تک وہ قرآنی احکام کی تفصیلات سے آگاہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس نے قرآن کریم کا ابھی مطالعہ نہیں کیا۔ مگر جس وقت پڑھنے والا سارا قرآن کریم شروع سے آخر تک ختم کر لیتا ہے تو ایمان کی باریکیوں سے بھی واقف ہوجاتا ہے اور اس کے سامنے اعمال کی تفصیلات بھی آجاتی ہیں۔ اور اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ اسے کون کون سے اعمال بجالانے چاہئیں اور کن اعمال کے کرنے سے مجتنب رہنا چاہیئے اور پھر اسے یہ بھی علم ہوجاتا ہے کہ ٹھوکروں کی کیا کیا نوعیتیں ہوتی ہیں۔ گویا قرآن کریم پڑھ لینے کے بعد انسان کا ذہن کھل جاتا ہے اور وہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے لگ جاتا ہے اور گھبراتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنی ذمہ داریوں میں کوتاہی کروں۔ پس ان دونوں حالتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ہمیں اعوذ سکھایا ہے۔ قرآن کریم کی ابتدا کرتے وقت صرف اتنا ہی حکم دیا کہ اعوذ پڑھ لیا کرو۔ اور اس اعوذ کے جو الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائے ہیں وہ بہت ہی مختصر ہیں۔ گویا قرآن کریم کے پڑھنے والے کی ذہنی کیفیت کے مطابق ہیں۔ اور قرآن کریم کے آخر میں جو اعوذ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے وہ بہت زیادہ وسیع مطالب پر حاوی ہے اور اس میں مضرات سے بچنے کے لئے کامل دعا سکھلائی گئی ہے۔ اور یہ اس شخص کی ذہنی کیفیت کے مطابق ہے جو سارے قرآن کریم کو پڑھ لیتا ہے۔ اور ہر اونچ نیچ کا اسے علم ہوجاتا ہے۔ اور سمجھ لیتا ہے کہ مجھے فلاں فلاں چیز سے بچنا چاہیئے اور فلاں فلاں قسم کی چیز کا طالب ہونا چاہیئے۔ پس ہر دو اعوذ خاص حکمتوں پر مشتمل ہیں۔ قرآن کریم کے شروع اور آخر میں اعوذ پڑھنے کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے کوئی شخص مکان بناتے وقت نیک لوگوں کے ہاتھوں سے بنیاد رکھوائے اور عمارت کی تکمیل پر پھر دعا کرائے۔ یہی حال نیکی کا ہے جب کوئی انسان نیکی کی عمارت کھڑی کرنا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ پہلی اینٹ خدا تعالیٰ کے ہاتھ سے رکھوائے۔ اسی طرح ضروری ہے کہ جب وہ نیکی کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ تو اس وقت بھی خدا تعالیٰ کے ہاتھ سے آخری اینٹ رکھائے۔ پس جو اعوذ ہم قرآن کریم کے ابتداء میں پڑھتے ہیں وہ خدا تعالیٰ سے اپنی نیکی کی بنیاد رکھواتے ہیں۔ اور جب آخر میں اعوذ پڑھتے ہیں تو گویا خدا تعالیٰ کے ہاتھوں اس تقویٰ کے مکان کا افتتاح کراتے ہیں۔ جب تک یہ دونوں باتیں نہ ہوں ایمان کی عمارت مکمل نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک گُر ہے جو ہمیں اعوذ پڑھنے کے حکم میں بتایا گیا ہے۔

۳۔ پھر قرآن مجید کے ابتداء میں اعوذ پڑھنے کا حکم دینے اور آخر میں اعوذ نازل کرنے میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ دنیوی امور کا تو کیا ذکر ہے دینی امور کی ابتدا بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ سے ہونی چاہیئے اور ان امور کی انتہا بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ پر

ہونی چاہیئے۔ کیونکہ کوئی شخص کتنا ہی دینی معاملات میں دسترس رکھتا ہو اور کتنا ہی اللہ تعالیٰ کا عرفان اسے حاصل ہو اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اس کی حفاظت سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسا انسان جو نہ صرف تمام انسانوں بلکہ تمام نبیوں کا سردار تھا اور جو مخلوق کے پیدا ہونے کا اصل موجب تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو پیدا کیا تو اس امر کو مدنظر رکھ کر پیدا کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اس سے ظاہر ہونے والا ہے۔ جس کا ذکر ایک حدیث قدسی میں اس طرح آتا ہے کہ لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ یعنی اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر تیرا وجود نہ ہوتا تو میں زمین و آسمان اور مخلوق کو پیدا نہ کرتا۔ اتنے بڑے وجود کے متعلق بھی احادیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تہجد میں اتنی اتنی دیر خدا تعالیٰ کے حضور کھڑے رہتے۔ کہ آپ کے پاؤں سُوج جاتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ کیفیت دیکھی تو ایک دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ جب آپ کے اگلے اور پچھلے سب گناہ خدا تعالیٰ نے معاف کر دیئے ہیں تو آپ کو تہجد میں اس قدر کھڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ نے فرمایا۔ اے عائشہ کیا میں عبد شکور نہ بنوں۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اس قدر فضل کیا ہے تو میری ذمہ داری بھی بڑھ گئی ہے اور میرے لئے

ضروری ہو گیا ہے کہ میں پہلے سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں۔ اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو ہوئی۔ نجات کا ذکر تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا۔ یا رسول اللہ ہمیں تو اپنی نجات کے لئے اعمال کی ضرورت ہے لیکن جب خدا تعالیٰ کی طرف سے آپ کے لئے نجات مقدر ہے تو آپ کو اعمال کی کیا ضرورت ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ صحیح نہیں میری نجات بھی اس کے فضل سے ہی وابستہ ہے۔ تو انسان کتنا ہی اعمال صالحہ میں ترقی کرے اور کتنے بڑے بلند مدارج روحانیہ پر پہنچ جائے پھر بھی ایسے پہلو باقی رہ جاتے ہیں جن کی وجہ سے وہ خدا تعالیٰ کی حفاظت سے باہر نہیں نکل سکتا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے ہیں کہ میں بھی خدا تعالیٰ کے فضل سے نجات حاصل کروں گا تو اور کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں۔ کہ اب میں خدا تعالیٰ کی رحمت سے مستغنی ہو گیا ہوں اور مجھے اس کے فضل کی ضرورت نہیں رہی۔ بلکہ اپنے زور سے ترقی حاصل کرونگا مگر باوجود اس کے کہ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کے آستانہ پر جھکے رہیں اور اس سے اس کی اعانت طلب کرتے رہیں۔ اگر وہ چند دن بھی نیکی کا کوئی کام کرتے ہیں تو کبر اور خود پسندی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تھوڑے دن نمازیں پڑھیں گے تو اللہ تعالیٰ پر احسان جتانے

لگ جائیں گے۔ چند روزے رکھیں گے۔ تو
سمجھ لیں گے کہ اب خدا تعالیٰ پر احسان ہو گیا
اور اب اس کا فرض ہو گیا ہے کہ وہ ان کی
خواہش پوری کرے۔ چندہ دیا تو اس وہم
میں مبتلا ہونے لگیں گے کہ اب خدا تعالیٰ پر
ان کا حق قائم ہو گیا ہے۔ اور اگر وہ کوئی
امتیازی سلوک ان سے نہیں کرتا تو نعوذ باللہ
مجرم ہے۔ یہی چیزیں ہیں جو انسان کو تباہ
کر دیتی ہیں۔ اور جب کسی کے اندر یہ روح
پیدا ہو جائے تو چاہے وہ ترقی کے تمام
مدارج طے کر چکا ہو اس کے اعمال حبط ہو جاتے
ہیں۔ اور وہ ادنیٰ سے ادنیٰ مقام پر پہنچ
جاتا ہے۔ پس انسان کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی
پناہ طلب کرتے رہنا چاہیئے۔ تا وہ کسی موقع
پر بھی کبر میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کے انعامات
سے محروم نہ ہو جائے۔ کبر ابتداء میں بھی انسان
کو نیکی سے محروم رکھتا ہے۔ یعنی جب اس کے
سامنے کوئی بات پیش کی جائے تو وہ اسے
سُن نہیں سکتا۔ اور کبر انتہاء میں بھی انسان
کی ہلاکت کا باعث بنتا ہے۔ کیونکہ انسان
یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب وہ ایسے مقام پر پہنچ
چکا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی مدد کی ضرورت
نہیں۔

ہندوستان کا ایک مشہور بادشاہ
ہمایوں گزرا ہے۔ جب اس نے بنگال میں
افغانوں کے سوری خاندان کو شکست دی۔
تو اس کے ساتھ بہت بڑا لشکر تھا۔ صوبہ
بہار میں سے وہ گزر رہا تھا کہ ایک دریا کے
کنارے جب اس نے اپنے لشکر کو دُور دُور
تک پھیلا ہوا دیکھا تو اس کے منہ سے یہ فقرہ
نکل گیا۔ کہ یہ اتنا بڑا لشکر ہے کہ اگر خدا
بھی اسے تباہ کرنا چاہے تو اسے کچھ دیر لگے۔
اس وقت پٹھانوں کا لشکر جو اس سے شکست
کھا چکا تھا آہستہ آہستہ اس کے پیچھے آ رہا
تھا۔ مگر بدلہ لینے کے لئے نہیں۔ کیونکہ بدلہ لینے
کی اس میں ہمت نہ تھی۔ بلکہ اسلئے کہ اگر ہمایوں
کی فوج کا اِکا دُکا سپاہی مل جائے تو اسے
مار دیں جیسے کہ گوریلا وارفیئر ہوتی ہے۔
گوریلا دراصل ایک بندر ہے جو چھپ چھپ کے
حملہ کرتا ہے۔ اسی مناسبت سے اب یہ نام
اس لڑائی کو دے دیا گیا ہے جس میں چھپ چھپ کر
دشمن پر حملہ کیا جائے۔ وہ بھی اسی طرح پیچھے
پیچھے چھپ کر آ رہے تھے۔ مگر چونکہ ان کا کوئی
لیڈر نہیں تھا اسلئے وہ متفقہ حملہ نہیں کر سکتے
تھے۔ جونہی بادشاہ کے منہ سے یہ فقرہ نکلا،
ایک افغانی حکمران شیر شاہ سوری جس کو
ہمایوں قید کر کے ساتھ لیجا رہا تھا۔ اس نے
یہ فقرہ سُن لیا۔ اس کو اس قدر غیرت آئی۔ کہ
اس نے زور سے جھٹکا لگایا۔ تو وہ رسّہ جس
سے وہ بندھا ہوا تھا ٹوٹ گیا۔ اور وہ
بھاگ کر اپنے افغان لشکر سے مل گیا۔
چونکہ انہیں ایک لیڈر کی ضرورت تھی اسلئے
جب یہ پہنچ گیا تو انہوں نے باہمی مشورہ کے
بعد یکدم ہمایوں کی فوج پر شب خون مارا۔
جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لشکر اس طرح بکھر کر
بھاگا کہ بادشاہ کو اپنی جان بچانی مشکل ہو گئی
اور جیسا کہ تاریخ پڑھنے والے جانتے ہیں۔
ہمایوں جان بچانے کے لئے گھوڑے پر سوار

ہوکر دریا میں کود پڑا۔ مگر جب گھوڑا منجدھار میں پہنچا تو تھک کر ڈوب گیا۔ اب ہمایوں بھی ڈوبنے لگا۔ اس وقت ایک سقّہ نے آدھے دن کی بادشاہت کے وعدہ پر اس کی جان بچائی۔ اس کے بعد ہندوستان میں اس کے پاؤں نہیں ٹکے بلکہ بھاگ کر ایران چلا گیا۔ تو دنیوی لحاظ سے ترقی کرو یا دینی لحاظ سے جہاں کبر آیا وہاں انسان تباہ ہوگیا۔ اسلئے قرآن کریم کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اعوذ رکھا ہے۔ اور اس طرح نصیحت کی ہے کہ دیکھو تم نے قرآن کریم کو پڑھا۔ اس پر غور کیا۔ اس کے مطالب کو سمجھا اور روحانیت میں ترقی حاصل کی۔ لیکن یاد رکھو جہاں تم نے یہ سمجھا کہ اب اس کے بعد تمہیں دوسروں پر کوئی فوقیت حاصل ہوگئی ہے۔ اور تم کبر میں مبتلا ہوگئے وہی تمہاری تباہی کا دن ہوگا۔ اسلئے جب بھی تم کوئی دینی یا دنیوی کام کرو خدا تعالیٰ کی طرف نظر رکھو۔ اور جب اس کام کو ختم کرلو تب بھی خدا تعالےٰ پر نظر رکھو۔

اس میں یہ پیشگوئی بھی معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان آخری دنوں میں اپنی فتوحات پر جو اُن کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملیں گی متکبر ہوجائیں گے اور اس کے نتیجہ میں پھر طرح طرح کی تباہیاں ان پر نازل ہونی شروع ہوجائینگی پس ان کو چاہیئے۔ کہ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھتے رہا کریں۔ تاکہ اللہ تعالیٰ انکو کبر سے بھی بچائے اور دلی وساوس سے بھی بچائے تاکہ وہ دشمن کے حملہ سے محفوظ ہوجائیں۔

ایک لطیف بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے یہ ہے کہ اَعُوْذُ کے لفظ سے پہلے قُلْ کا لفظ لایا گیا ہے۔ بعض لوگ غور کرنے سے پہلے ہی کہہ دیتے ہیں کہ یہاں قُلْ لانے کا کیا مطلب ہے۔ یعنی ان کے نزدیک یہاں صرف اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ کہنا چاہیئے تھا۔ اور اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ پڑھنے والا جب قُلْ کہتا ہے۔ تو اس کے دل میں ان الفاظ سے وہ جوش پیدا نہیں ہوسکتا جو صرف اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ کہنے سے پیدا ہوسکتا ہے۔ حضرت مولوی عبد الکریم صاحب مرحومؓ جب نماز میں قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتے اور یہ سورتیں پڑھتے تو اسی وجہ سے ان کا طریق یہ تھا کہ وہ کہتے قُلْ۔ اور پھر کچھ وقفہ کے بعد یہ الفاظ کہتے۔ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ۔ تو بہت لوگوں کے دلوں میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ قُلْ نے اس جوش کو دبا دیا ہے جو بغیر قُلْ کے پیدا ہوسکتا ہے۔ حالانکہ قُلْ کہہ کر اس جوش کو زیادہ کیا گیا ہے نہ کہ کم۔ قُلْ کے بعد اَعُوْذُ لانے کا یہ مطلب ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس حکم کے مخاطب ہیں۔ اور اَعُوْذُ کہنے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اوّل المخاطبین ہے۔ اگر قُلْ کے بغیر اَعُوْذُ ہوتا تو اَعُوْذُ کہنے والی صرف ہماری ذات ہوتی اور اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ کہہ کر ہر انسان اپنی ذات مراد لیتا۔ تو بعض لوگ جیسا کہ پنجابی میں مشہور ہے کہہ دیتے ہما تڑاں دا کی ہے۔ یعنی ہمارا اعوذ کہنا کیا حقیقت رکھتا ہے۔ لیکن جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے اللہ تعالیٰ نے یہ کہلوایا کہ تم لوگوں کو کہدو کہ میں جس مقام ترقی پر پہنچ چکا ہوں اس کے

باوجود میں بھی رب الفلق کی پناہ مانگتا ہوں۔ تو اُمتِ مسلمہ کے افراد اعوذ کی اہمیت کو زیادہ عمدگی سے سمجھ سکتے تھے۔ عام حالات میں انسان خیال کرسکتا ہے کہ اعوذ ادنیٰ درجہ کے آدمیوں کے لئے ہے۔ لیکن قُل کہہ کر بتا دیا۔ کہ ہمارے اس حکم کے پہلے مخاطب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور وہ کہہ رہے ہیں کہ میں بھی اعوذ سے مستغنی نہیں بلکہ عملاً اعوذ کہہ کر اللہ تعالیٰ کے حضور جُھک رہا ہوں۔ پس قُل کہہ کر جوش کو کم نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس عظیم الشان انسان کے مُنہ سے اعوذ کہلوا کر جو کمالاتِ روحانیہ کا نقطۂ مرکزی ہے اس کی اہمیت کو زیادہ کیا گیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ کا نبی بھی اعوذ کا محتاج ہے تو تم کیوں نہیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اعوذ کا مفہوم یہ ہے کہ یا الٰہی میری کمزوریوں کی وجہ سے مجھ پر شیطان کا تسلط ہو رہا ہے اسلئے میں تیری پناہ میں آتا ہوں۔ اور اس مفہوم کے اعتبار سے استغفار اور اعوذ ہم معنی بن جاتے ہیں۔ گویا اعوذ پڑھنے والا اپنے گناہ گار ہونے کا اعتراف کرتا ہے اور خدا تعالیٰ سے پردہ پوشی چاہتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں اور آپ فرماتے ہیں کہ میرا شیطان مسلمان ہوگیا ہے پس آپ کے اعوذ پڑھنے کا کیا مطلب؟

اس سوال کے جواب میں یاد رکھنا چاہیئے کہ بے شک ایک عام انسان تو اسلئے اعوذ پڑھتا ہے کہ وہ شیطان سے پناہ میں رہے اور جب وہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کہتا ہے تو وہ اپنے گناہ گار ہونے کا بھی اعتراف کرلیتا ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعوذ پڑھنا ان معنی میں نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ آپ معصوم ہیں اسلئے قرآن کریم میں ان سورتوں کو قُل کے ساتھ شروع کیا گیا اور اس طرف اشارہ کیا گیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گناہوں کو دیکھ کر اعوذ نہیں پڑھتے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کے لئے پڑھتے تھے تاکہ آئندہ آپ کے اور آپ کی جماعت کے خلاف شیطان کوئی کارروائی نہ کرسکے۔

نبی کو اپنے ماننے والوں کا اسی طرح فکر ہوتا ہے جس طرح گلہ بان کو اپنی بھیڑوں کا بعض اوقات گلہ بان اپنی جان کی حفاظت کا خیال نہیں رکھتا۔ اور اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال لیتا ہے۔ مگر بھیڑوں کے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی حالت نبی کی ہوتی ہے۔ وہ اعوذ اسلئے پڑھتا ہے۔ کہ جو بھیڑیں اس کے سپرد کی گئی ہیں وہ شیطان کے حملہ سے محفوظ ہوجائیں۔ کیونکہ وہ خود تو شیطان کے خطرہ میں نہیں ہوتا۔ مگر اس کی بھیڑیں ضرور خطرہ میں ہوتی ہیں۔ الغرض نبی اعوذ اسلئے پڑھتا ہے کہ شیطان کا اس پر جو حملہ بالواسطہ ہو رہا ہے وہ دُور ہوجائے۔ کیونکہ نبی کی اُمت پر حملہ نبی پر ہی حملہ ہوتا ہے۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعوذ پڑھنا عام لوگوں کے اعوذ پڑھنے سے مختلف ہے۔

سورۃ الفلق اور سورۃ الناس دونوں سے پہلے اَعُوْذُ کا لفظ رکھا گیا ہے۔ گویا دونوں سورتیں استعاذہ کے مضمون کو لیکر آئی ہیں۔ یعنی خدا تعالیٰ سے انسان پناہ طلب کرتا ہے۔ اس کے متعلق طبعاً خیال پیدا ہوتا ہے کہ جب دونوں سورتیں ایک ہی مضمون پر مشتمل ہیں تو دونوں کو اکٹھا

کیوں نہ کر دیا گیا اور کیوں علیحدہ علیحدہ رکھا گیا؟

اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ سورۃ الفلق میں زیادہ تر انسان کے سوا دوسری مخلوقات کی برائیوں سے بچنے کی دعا سکھائی گئی ہے اور سورۃ الناس میں زیادہ تر ان فتنوں سے بچنے کی دعا سکھائی گئی ہے جن کی ابتدا انسانوں سے ہو۔ اور چونکہ یہ دونوں مضمون علیحدہ علیحدہ ہیں اسلئے ان کو علیحدہ علیحدہ سورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ۔ ربّ کے معنے ہیں وہ ہستی جو انسان کو تدریجاً ترقی دیتے دیتے کمال تک پہنچاتی ہے۔ فَلَق کے سات معنے حلِّ لغات میں لکھے جاچکے ہیں۔ اور وہ سارے کے سارے اس جگہ پر چسپاں ہوتے ہیں۔

فلق کے پہلے معنے اَلصُّبْحُ کے ہیں۔ پس رَبّ الفَلَق کے معنے ہوئے صبح کا رب۔ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ کے معنے ہوتے ہیں۔ صبح کے رب کی پناہ میں آتا ہوں۔

جیسا کہ سورۃ الفلق کے ابتداء میں لکھا جاچکا ہے کہ اس سورۃ کا تعلق سورۃ نصر سے ہے۔ سورۃ نصر میں یہ بتایا گیا تھا۔ کہ اسلام کی فتوحات اور غلبہ کی عمارت کی وہ بنیاد جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں رکھی گئی اس بنیاد پر عمارت بنتی چلی جائے گی۔ یہاں تک کہ غلبہ کی عمارت مکمل ہوجائے گی۔ اور اگر کوئی روک پیدا ہوئی تو خس وخاشاک کی طرح اُڑ جائے گی۔ سورۃ الفلق میں یہ بتایا گیا ہے کہ اے مسلمانو! تمہیں دُعا کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے غلبہ کو کمال تک پہنچائے اور پھر یہ غلبہ ہمیشہ کے لئے ہو۔ کوئی ایسا دشمن نہ کھڑا ہوجائے جو تمہا رے غلبہ کی عمارت کو نقصان پہنچائے یا تمہارے اندر افتراق پیدا ہوجائے۔ اور تم اس کی حفاظت نہ کرسکو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تیرہ سال رہے۔ وہ زمانہ مشکلات اور مصائب کے لحاظ سے رات کے مشابہ تھا لیکن اس کے بعد آپ ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے۔ اور کامیابی کی سحر نمودار ہونی شروع ہوگئی۔ اور ایک طرف اسلام کی کامیابی کے آثار نظر آنے لگے اور دوسری طرف مشکلات کم ہونے لگیں۔ گو صبح کی ابتدائی سفیدی پوری طرح نظر نہیں آتی تھی اور کمزور نظر والا اسکو دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن تیز نظر رکھنے والا اس کو دیکھ رہا تھا۔ اور وہ اس بات کی خوشخبری پاتا تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد سورج کی روشنی ظاہر ہونی شروع ہوجائے گی۔ اور ہر شخص اس کو دیکھ لے گا۔ حتیٰ کہ آخرکار سورج نصف النہار پر چمکنے لگے گا۔

مدینہ میں آنے سے مسلمانوں پر فجر کا طلوع ہوا۔ گو مسلمانوں کو یہ فجر نظر آرہی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اُفق میں روشنی پھیل جائیگی لیکن مخالفوں کی آنکھیں اس کو دیکھنے سے قاصر تھیں آخر یہ روشنی ظاہر ہونی شروع ہوئی اور مسلمانوں کو غلبہ ملنا شروع ہوگیا۔ حتیٰ کہ ہجرت کے آٹھویں سال مکہ فتح ہوا اور عرب کے لوگوں کو اسلام کی روشنی نے منوّر کردیا۔ اور اسلام کی صبح کو سب لوگ دیکھنے لگ گئے۔ ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے محمد رسول اللہ! آپ کو چاہیئے کہ آپ ربّ الفلق کی پناہ میں آئیں اور اس طرح اپنی اُمت کے ہر فرد کو حکم دیں کہ وہ ربّ الفلق کی پناہ طلب کرے۔ ربّ الفلق کے الفاظ میں ایک طرف یہ اشارہ ہے کہ تم دُعا کرو کہ اسلام کا سورج آہستہ آہستہ اوپر

آتا چلا جائے۔ یہاں تک کہ وسط آسمان پر پہنچ کر
لوگوں کی نظروں کو خیرہ کر دے۔ اور دوسری طرف
یہ بتایا کہ اس ترقی کے زمانہ میں تمہیں خدا تعالیٰ کی حفاظت
طلب کرتے رہنا چاہیئے۔ تا تم پر زوال نہ آئے۔
قرآن کریم کے مخاطب ایک طرف مومن تھے اور
دوسری طرف منکر۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں اس آیت
میں مسلمانوں کو خوشخبری دی۔ وہاں منکروں کو کہا۔
کہ تم کہتے تھے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سورج
ہے تو اس کی روشنی ہونی چاہیئے۔ خدا تعالیٰ فرماتا
ہے۔ اب ہمارے سورج کی روشنی ظاہر ہونے
والی ہے۔ روحانی اور جسمانی علوم جو پہلے پوشیدہ
تھے ظاہر ہو جائیں گے۔ عیوب اور خرابیاں جو
تاریکی کی وجہ سے پوشیدہ تھیں اب اس روشنی
کے ذریعہ نظر آنے لگیں گی۔ اور دُنیوی ترقیات
جن سے لوگ پہلے محروم تھے اب دُنیا کو حاصل
ہو جائیں گی۔ جب سورج طلوع کرتا ہے تو لوگوں
میں بیداری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ لوگ کام کاج
کرنے لگ جاتے ہیں اور ترقی کے کاموں میں مصروف
ہو جاتے ہیں۔ پھر جن چیزوں کے عیوب و نقائص
اور خوبصورتی نظر نہ آتی تھی وہ نظر آنے لگتی ہے۔
رات کی تاریکی میں بدصورت سے بدصورت اور
خوبصورت سے خوبصورت برابر ہوتے ہیں۔ اور
ان میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اندھیرے میں
سُرخ و سفید۔ سیاہ۔ زرد۔ نیلا اور نسواری سب
رنگ یکساں حیثیت رکھتے ہیں لیکن جس وقت سورج
چڑھتا ہے تو ان میں خود بخود امتیاز پیدا ہو جاتا
ہے۔ بدصورت کی بدصورتی اور خوبصورت کی
خوبصورتی نظر آنے لگتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا
ہے اب قرآن کریم کی تکمیل کے ساتھ روحانی سورج
چڑھ جائے گا۔ اس سے عقل میں جو تیزی پیدا ہوگی اس
کے ذریعہ اشیاء کا حسن و قبح معلوم ہوگا۔ پھر اس
سے فائدہ اُٹھانے والوں کے لئے ترقیات کے دروازے
کُھل جائیں گے۔ حکومت۔ شان و شوکت۔ تجارت۔
صنعت و حرفت غرض ہر قسم کی ترقی مسلمانوں کو حاصل
ہوگی۔ لیکن مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح
روشنی اپنے ساتھ برکتیں لاتی ہے اسی طرح بلائیں
بھی لاتی ہے۔ مختلف قسم کی خوبصورتیاں سامنے آکر
انسان کو لالچ دیتی ہیں اور اصل راستہ سے بھٹکانا
چاہتی ہیں۔ اسی طرح روشنی صرف فائدہ کا موجب
نہیں بلکہ نقصان کا موجب بھی ہو جاتی ہے۔ اسلئے
فرمایا۔ دیکھو جب سورج چڑھے گا تو کئی قسم کے
عیوب ظاہر ہونے کا بھی امکان ہوگا۔ دنیوی ترقیات
آرام و آسائش اور عیش و عشرت کے ولولے قلوب
میں پیدا کر دیتی ہیں۔ اور دولت سے ناجائز فوائد
حاصل کرنے کی خواہش انسان کے دل میں رونما
ہو جاتی ہے۔ پھر روحانی علوم حاصل ہونے اور
دُنیا کی ان سے محرومی خود پسندی کا موجب بھی
بن سکتی ہے۔ اسی طرح روحانی و جسمانی خطرات کا
احتمال ہے۔ گویا روحانی علوم کی ترقی خود پسندی
کی طرف لیجا سکتی ہے۔ اور جسمانی ترقیات عیش و عشرت
کی طرف۔ اسلئے ہم کہتے ہیں۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ
الْفَلَقِ۔ یعنی صبح ضرور ہوگی اور مسلمانوں کو ذہنی
اور روحانی ترقیات حاصل ہوں گی۔ سورج ضرور
چڑھے گا مگر خطرہ ہے کہ ترقیات کے بدنتائج نہ پیدا
ہوں۔ گویا وہ وقت جاتا رہا جب یہ خیال کیا جاتا
تھا کہ مسلمان کس طرح ترقی کریں گے۔ اب تو یہ خدشہ
ہے کہ کہیں ان ترقیات کی وجہ سے وہ ابتلاؤں میں
مبتلا نہ ہو جائیں۔ اسی لئے مسلمانوں کو دُعا سکھائی

کہ تم ان جملہ اشیاء کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہو۔ جو اس نے پیدا کی ہیں۔ گویا مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ میں یہ اشارہ ہے کہ مسلمانوں کو ہر چیز ملیگی کیونکہ اس میں ہر چیز کے شر سے بچنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اور ہر چیز کے شر سے بچنے کی ضرورت ایسے ہی ہو سکتی ہے جسے ہر چیز حاصل بھی ہو۔ جو شخص گوشت کا استعمال ہی نہیں کرتا اس کی مضرتوں سے بچنے کے لئے اسے مصلح اشیاء کے استعمال کی ضرورت نہیں۔ پس جب اللہ تعالےٰ فرماتا ہے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ۔ یعنی کہہ دے میں پناہ مانگتا ہوں ربّ الفلق کی یعنی صبح لانے والے اور سورج چڑھانے والے کی۔ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ۔ جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے اس کی خرابی سے۔ تو اس میں بتایا۔ کہ مسلمانوں کو ہر چیز ملے گی یعنی اللہ تعالےٰ نے دنیا میں جس قدر نعمتیں پیدا کی ہیں اُن سب سے مسلمان حصہ پائیں گے۔ اور دُنیا کی کوئی ترقی ایسی نہیں ہوگی جو اُن کو حاصل نہ ہوگی۔ گویا ان کی ترقیات نہایت وسیع ہوں گی۔ ان حالات میں اللہ تعالےٰ نے دُعا سکھائی۔ کہ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ آج ہی سے پناہ مانگیں۔ کہ جب مسلمانوں کو ہر قسم کی کامیابیاں نصیب ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ انہیں ان کے بدنتائج سے محفوظ رکھے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ میں قومی دُعا کے علاوہ فردی طور پر بھی کمال تک پہنچنے کے لئے دُعا سکھائی گئی ہے۔ چنانچہ ربّ کے معنے ہیں۔ وہ ہستی جو انسان کو تدریجاً ترقی دیتے دیتے کمال تک پہنچاتی ہے۔ گویا قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ میں مضمون یہ ہے۔ کہ اے خدا جو ظلمت کے بعد روشنی کو لاتا ہے مجھے بھی ظلمت سے نکال کر روشنی میں لا۔ یہ ظاہر ہے کہ اندھیرے میں پو پھٹتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ روشنی ہوتی جاتی ہے اور سورج اُوپر آتا جاتا ہے۔ حتّٰی کہ نصف النہار پر چمکنے لگتا ہے۔ پس فرمایا۔ اے وہ رب جس نے تمام ذاتی کمالات اور ترقی کے سامان جس قدر کہ ضروری تھے انسان میں جمع کر دیئے ہیں اور بتا دیا ہے کہ انسان اپنی ذات کو ان ذرائع کے استعمال سے کس طرح مکمل کر سکتا ہے۔ اے اپنی ذات میں کامل خدا مجھ کو بھی کمالات حاصل کرنے کی توفیق دے۔ اور مجھ کو اپنی صفتِ ربوبیت کے ماتحت اس طور پر کمال دے کہ میں بھی اسی طرح دُنیا میں چمکوں جس طرح سورج وسطِ آسمان پر چمکتا ہے۔ اور مجھے ہر قسم کے دُکھ اور مصیبت سے محفوظ رکھ۔ اور کمال کے حصول میں کوئی مانع نہ ہو۔

(۲) فلق کے دوسرے معنے ہیں اَلْخَلْقُ كُلُّهُ یعنی تمام مخلوقات پس قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ کے معنے ہوں گے۔ میں اس خدا کی پناہ چاہتا ہوں جو تمام مخلوقات کا ربّ ہے یعنی جو ہر چھوٹی بڑی چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس آیت میں مخلوقات کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے لفظ فلق کو اختیار کیا گیا ہے اور خلق کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ کیونکہ خلق کی نسبت فلق میں ایک زائد مفہوم پایا جاتا ہے۔ خلق کا لفظ صرف پیدائش پر دلالت کرتا ہے۔ مگر فلق کا لفظ ادنیٰ سے اعلیٰ حالت کی طرف جانے پر بھی دلالت کرتا ہے۔ پھر فلق کے معنے تاریکی سے روشنی کی طرف جانے کے بھی ہیں۔ اسی لئے فلق صبح کو بھی کہتے ہیں۔ پس ایک تاریک چیز جب روشنی کی طرف جاتی

ہے تو اسے فلق کہتے ہیں۔ خالی خلق کا لفظ اگر کہا جاتا۔ تو اس میں یہ اشارہ نہ ہوتا کہ انسانی پیدائش کو ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت میں منتقل کرنے کا ذکر ہے۔ لیکن فلق کہہ کر بتا دیا کہ مخلوق کی حالت پہلے ادنیٰ ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ اعلیٰ بنا دیتا ہے پس اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ میں جہاں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں پناہ مانگنے کے اسباب بھی بتا دیئے ہیں۔ یعنی ہم اس سے پناہ مانگ سکتے ہیں جو اشیاء کا خالق و مالک ہو اور جو نقصان رساں چیزوں سے محفوظ رکھ کر ترقیات کے بلند مقام پر پہنچا سکتا ہے۔ جیسے اگر کسی شخص کے پیچھے کوئی کتا پڑ جائے تو اس کتے کا مالک ہی اس کے ضرر سے بچا سکتا ہے۔ اب ایک تو اس میں یہ بتایا ہے کہ جس ہستی سے پناہ مانگنے کا حکم ہے وہ تمہارے آقا و مالک کی ہستی ہے۔ اور پھر ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ وہ پناہ دینے والی ایسی ہستی ہے جو مخلوقات کو ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف لے جا سکتی ہے۔

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ۔ جو چیز بھی اس نے پیدا کی ہے اس کے شر سے میں اس کی پناہ چاہتا ہوں۔ اس میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ دُنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جس میں سے شر نہ پیدا ہو سکے۔ عام طور پر لوگ خیال کر لیتے ہیں کہ بعض چیزیں اچھی ہیں اور بعض بُری۔ مگر قرآن کریم بتاتا ہے۔ کہ یہ صحیح نہیں۔ ہر چیز اچھی بھی ہے اور ہر چیز بُری بھی ہے۔ کوئی اچھی بات نہیں جس میں شر نہ ہو اور کوئی بُری بات نہیں جس میں خیر نہ ہو۔ مثلاً غربت امارت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہو تو دولت بھی شر پیدا کر سکتی ہے اور اگر فضل ہو تو غربت بھی کوئی شر پیدا نہیں کر سکتی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے کتنی دولت دی۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بے حساب رزق دیا ہے۔ مگر یہ دولت اُن کے لئے خیر کا موجب ہی ہوئی شر کا موجب نہ بنی۔ اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کئی صحابہ بڑے مالدار تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف جب فوت ہوئے تو انہوں نے اپنے بعد اڑھائی کروڑ روپے کی جائداد چھوڑی۔ حالانکہ باقی صحابہ کا بیان ہے کہ وہ ہم سب سے زیادہ مالدار نہ تھے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے بھی زیادہ مالدار صحابہؓ میں موجود تھے۔ مگر باوجود اس کے اس قدر مال و دولت ان کے لئے شر نہ بنی۔ اسی طرح صحابہ پر ایک وہ وقت بھی آیا جبکہ وہ غریب تھے۔ مگر غربت کے باوجود شر کا پہلو ان کے لئے ظاہر نہ ہوا۔ حالانکہ دوسری طرف ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ ڈاکو اور چور جس قدر بنتے ہیں محض کنگال ہونے کی وجہ سے بنتے ہیں۔ پس شر درحقیقت اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان خدا تعالیٰ کی حفاظت سے باہر نکل جائے۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ میں خدا تعالیٰ نے یہی بتایا ہے۔ کہ یہ نہ کہا کرو کہ یہ بُری چیز ہے مجھ سے دُور رہے اور فلاں اچھی چیز ہے مجھے مل جائے۔ کیونکہ بُری چیز کی بُرائی اور اچھی چیز کی خوبی سب اعوذ سے دُوری اور نزدیکی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر اعوذ نہ ہو تو اچھی چیز بھی بُری بن جاتی ہے۔ اور اگر اعوذ کا سہارا ساتھ ہو تو بُری چیز بھی خیر کا موجب بن جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ کی کتاب کا علم رکھنا اور اس پر عمل کرنا کتنی اچھی چیز ہے

مگر قرآن کریم میں ہی یہودیوں کے علماء کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ ایسے ہیں جیسے گدھے پر کتابیں لادی جائیں۔ اس کے مقابلہ میں شیطان کتنی بُری چیز ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرا شیطان مسلمان ہو گیا ہے اور وہ مجھے نیکی کی بات ہی کہتا ہے اس کے بھی یہی معنے ہیں کہ شیطان جو بات آپ کے دل میں ڈالنا چاہتا وہ آپ کے لئے اچھی بات بن کر آپ کے قلب میں داخل ہوتی پس قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ میں انسان کو اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی حفاظت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے۔ کہ اگر مخلوقات کے بُرے پہلو سے تم بچنا چاہو تو صرف اللہ تعالیٰ ہی تمہیں بچا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ تمام مخلوقات کا رب ہے اور جانتا ہے کہ کس طرح ہر شر سے بھی خیر پیدا ہو سکتا ہے اور مخلوقات میں سے کوئی شے اس کے اذن کے بغیر حرکت نہیں کر سکتی۔

پھر مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ کے الفاظ سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اے مخلوقات کے پیدا کرنے والے خدا میں تیری پناہ چاہتا ہوں پیدائش کے ان نقائص سے جو کسی چیز کے پیدا ہوتے وقت اس میں رہ جاتے ہیں اور اس چیز کی ترقی اور کمال کے حاصل کرنے میں روک بن جاتے ہیں۔ چنانچہ دُنیا میں جب بھی خرابی ہوگی تین وجہ سے ہوگی۔ (۱) پیدائش میں نقص کی وجہ سے۔ (۲) انتہاء خراب ہونے کی وجہ سے۔ (۳) یا زندگی کے درمیانی حالات کے خراب ہونے کی وجہ سے۔ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ میں پیدائش میں نقص رہ جانے کی وجہ سے جو خرابی انسان کو لاحق ہو سکتی ہے اس سے پناہ سکھائی گئی ہے۔ کیونکہ پیدائش میں نقص یا خرابی ہو تو تباہی آجائیگی۔ اور مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا۔ مثلاً قلم ہے۔ انسان نے بنایا مگر اچھا نہ بنا۔ خراب بنا۔ تو اس سے کوئی اچھا نہیں لکھ سکیگا۔ اسی طرح ایک مکان بنایا جو ٹپکتا ہے۔ تو اس میں کوئی آرام سے نہیں بیٹھ سکتا۔ یا کپڑا پہننے کے لئے بنایا۔ سرد کی ضرورت تھی گرم بنا لیا۔ یا گرم کی ضرورت تھی سرد بنا لیا وہ مفید نہیں ہو سکتا۔ یا کسی نے گھوڑا خریدا جو لنگڑا ہے وہ سفر طے نہیں کر سکتا۔ تو جس چیز میں کوئی ابتدائی نقص ہو وہ اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتی جس کی اس سے توقع کی جاتی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ دُعا سکھائی ہے کہ کہو میری پیدائش میں جو نقص رہ گیا ہے اس سے پناہ مانگتا ہوں۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو ماں باپ کی بداعمالیوں اور بُرائیوں سے بھی ورثہ پاتا ہے جس قسم کے افعال اس کے ماں باپ کرتے ہیں وہ بھی انہیں کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب میاں بیوی ملیں تو دُعا مانگ لیں کہ ہم شیطان سے پناہ مانگتے ہیں اور اپنی اولاد کے لئے بھی شیطان سے پناہ چاہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض خرابیاں ورثہ میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور پھر ظاہری لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ بچے عام طور پر ماں باپ کے قد، علم، حوصلہ اور خیالات کو لیتے ہیں۔ چوری کرنے والے یا جھوٹ بولنے والے لوگوں کے بچے چوری اور جھوٹ کی طرف راغب ہوتے ہیں مسلول باپ کا بچہ بھی مسلول ہو جاتا ہے پس یہ بات بالکل درست ہے کہ ورثہ میں خرابیاں اور کمزوریاں بھی ملتی ہیں اور خوبیاں بھی ملتی ہیں۔

چنانچہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ جس خاندان میں علم دیر تک رہا ہے اور اس کے افراد اہلِ علم ہوتے چلے آئیں اس کے بچے وراثتًا ایسے ہوتے ہیں کہ دوسروں کی نسبت جلدی علم حاصل کر لیتے ہیں۔ اور یہ بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ زیادہ پڑھنے والے ہوتے ہیں ان کی اولاد کی آنکھیں زیادہ لمبی ہوتی جاتی ہیں۔ چنانچہ جن خاندانوں میں علم کا چرچا ہوتا ہے اور مطالعہ کرتے رہتے ہیں ان کی اولاد کی آنکھیں دوسروں کی نسبت لمبوتری ہوتی ہیں۔ یہ ماں باپ کے پڑھنے کا اثر ہوتا ہے۔ تو ماں باپ کی خوبیاں اور کمزوریاں اولاد میں آجاتی ہیں۔ اور جب کسی بچہ میں ماں باپ کی کمزوریاں آجائیں تو اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ اس کے لئے دُنیا کی دَوڑ میں روکیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسلئے خدا تعالیٰ نے یہ دُعا سکھائی کہ کہو اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ۔ اے میرے پیدا کرنے والے اور میری پرورش کرنے والے اب اگر مجھ میں ورثہ کے طور پر یا کسی اور اثر سے کوئی کمزوری اور خلقی نقص رہ گیا ہے تو اس کے اثر سے مجھے بچا تا میں تیری رضا حاصل کر سکوں اور تیرا قرب پا سکوں۔ غرض اس حصّہ آیت میں ان کمزوریوں سے پناہ مانگی گئی ہے جو انسان میں پیدائشی طور پر آجاتی ہیں۔

پھر قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انسان تمام مخلوقات کا ایک حصّہ ہے یعنی دُنیا میں جس قدر جمادات، نباتات اور حیوانات ہیں ان سب کو ترکیب دیکر خدا تعالیٰ نے انسان کو بنایا ہے اور اس کی جڑیں ان تینوں جگہوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور ان تینوں کا خلاصہ نکل کر انسان بنا ہے۔ اگر انسان کو ان تینوں جگہوں سے خوراک نہ ملے تو وہ انسان نہیں رہتا۔ مثلاً مٹی انگور نہیں ہوتی لیکن انگور مٹی سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر تم انگور کی جڑیں مٹی سے نکال لو تو انگور باقی نہیں رہے گا۔ کیونکہ اس کی ترقی کا ذریعہ یہ ہے کہ مٹی بھی ہو اور انگور کی بیل بھی۔ اگر مٹی نہ ہو تو انگور کی حیثیت باقی نہیں رہتی اور اگر مٹی ہی ہو اور انگور نہ ہو تو مٹی کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اسی طرح اگر نباتات، جمادات اور حیوانات کے نتیجہ میں انسان پیدا نہ ہوتا اور اگر خالی اسی حد تک یہ چیزیں رہتیں تو یہ سب فضول اور لغو ہوتیں۔ جیسے مٹی فضول اور لغو ہے بغیر خربوزہ کے بغیر آم اور انگور کے۔ پس وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم انسانوں کو روحانی امور کی طرف تو لیجاتے ہیں۔ مگر طیبات سے پرہیز کرا کر اور ان کی ان ضروریات سے علیحدہ کروا کر جو خدا تعالیٰ نے انسان کے ساتھ لگائی ہیں وہ اس امر کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ طیّبات وہ زمین ہے جس میں روحانیت کا پودا اُگا کرتا ہے اور اسی زمین میں نشوونما پاکر یہ پودا روحانیت کے میوے لاتا ہے۔ یہی چیز ہے جسے اسلام پیش کرتا ہے اسلام کہتا ہے۔ کہ نباتات، جمادات اور حیوانات کے ملانے سے جو خلاصہ پیدا کیا گیا ہے اسکے پھل کا نام انسان ہے۔ جب تک یہ نہ ہو انسانیت کا پودا پنپ نہیں سکتا۔ اور جب تک یہ خیال نہ رکھا جائے کہ انسانیت کی جڑیں جمادات، نباتات اور حیوانات سب میں ہیں اس وقت تک یہ پودا سرسبز نہیں رہ سکتا۔ سورۃ فلق کی آیات قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ

میں ہمیں اسی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان مخلوقات کا ایک جزو ہے۔ وہ جمادات، نباتات، حیوانات سے علیحدہ نہیں ہے۔ اگر ہم ان چیزوں سے علیحدہ ہوتے تو ہمیں یہ حکم نہ دیا جاتا۔ کہ ہم ان چیزوں کے شر سے پناہ مانگیں۔ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ ان چیزوں کی برائی ہم تک پہنچ سکتی ہے اسلئے ہمیں ان کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے ہر وقت دُعا کرنی چاہیئے۔ غرض ہمیں یہ بتایا گیا کہ تمام جمادات سے ہمیں شر بھی پہنچ سکتا ہے اور خیر بھی۔ تمام نباتات سے ہمیں شر بھی پہنچ سکتا ہے اور خیر بھی۔ اور تمام حیوانات سے ہمیں شر بھی پہنچ سکتا ہے اور خیر بھی۔ اور ہماری جڑیں ان تینوں کروں میں دبی ہوئی ہیں۔ ان حالات میں ہمیں دُعا سکھائی۔ کہ اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی جماداتی، نباتاتی اور حیوانی ہستی کا خیال رکھنا چاہیئے۔ جب تک جڑوں کو پانی نہ دیا جائے اس وقت تک درخت سرسبز نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح انسان کی روحانیت اعلیٰ درجہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ جب تک وہ جمادات، نباتات اور حیوانات میں سے طیب اشیاء کو استعمال نہیں کرتا۔ اور ان کے شر سے بچتا نہیں ہے۔ اسی طرح درخت میں بعض امراض اس کی جڑوں سے پیدا ہوتی ہیں اور بعض پتوں سے۔

سورۃ فلق کی ان آیات میں ہمیں ان امراض سے بچنے کا علاج بتایا ہے جو ہمیں جڑھ سے پہنچ سکتی ہیں۔ پس فرمایا۔ تمہیں دُعا کرنی چاہیئے۔ کہ وہ خدا جس نے تمام مخلوقات پیدا کی ہے ہم اس کی پناہ میں آتے ہیں۔ تاکہ ہمیں تمام مخلوقات کی خیر تو ملتی رہے لیکن ان کا شر ہم تک نہ پہنچ سکے۔ کیونکہ ان چیزوں کا خالق ہی اگر چاہے تو ایسا ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ میں ایک اور اہم امر کی طرف بھی اُمتِ مُسلمہ کے ہر فرد کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے اور وہ یہ کہ سورۃ الفلق سے پہلی سورۃ یعنی سورۃ الاخلاص میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو توحید کامل کا سبق دیا تھا۔ اس سورۃ کے بعد قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ کہہ کر یہ بتایا ہے کہ اے وہ شخص جو ایمان لایا ہے ہماری ذات پر۔ ہمارے کلام پر۔ اور اس میں سے بھی ہمارے قرآن پر۔ ہم اسے کہتے ہیں کہ جاؤ اور جاکر لوگوں میں اپنے اس ایمان کا اعلان کرو اور کہو اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ۔ تم لوگ دُنیا میں بھروسہ کرتے ہو اپنے ماں باپ پر۔ تم لوگ بھروسہ رکھتے ہو اپنے رشتہ داروں اور دوستوں پر۔ تم لوگ بھروسہ رکھتے ہو اپنے خاندانوں پر اور جتھوں پر۔ تم لوگ بھروسہ رکھتے ہو اپنے محلہ کے لوگوں پر اور محلہ کے چوہدریوں پر۔ تم بھروسہ رکھتے ہو اپنی حکومتوں پر۔ اور تم بھروسہ رکھتے ہو اپنے ملک کی فوجوں پر اور اپنے ملک کے استادوں پر جو لوگوں کو جہالت سے بچاتے ہیں۔ اور ملک کے ڈاکٹروں پر جو اہل ملک کی صحت کی ترقی میں مدد دیتے ہیں اور ملک کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غرضیکہ تم لوگ ان چیزوں پر بھروسہ رکھتے ہو۔ مگر میرا ان میں سے کسی پر بھروسہ نہیں۔ بلکہ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ۔ ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر میں نے ربّ الفلق کے ساتھ لو لگائی ہے اور اسی پر میرا بھروسہ ہے۔ گو اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ چھوٹا سا فقرہ ہے لیکن اس کو

کہنے والا گویا ساری دُنیا کو چیلنج دیتا ہے اور ایک ایسا دعویٰ کرتا ہے جس کے بعد دُنیا کا ہر فرد اس کے اعمال کا نگران بن جاتا ہے۔ وہ ایک مجلس میں جاتا ہے اور کہتا ہے مجھے پرواہ نہیں حکومت کی، ماں باپ کی، بھائی بہنوں کی، دوستوں رشتہ داروں کی۔ پھر وہ دوسری مجلس میں جاتا ہے اور یہی کہتا ہے۔ کیونکہ اس کو قُلْ کے لفظ میں یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہر مجلس میں جائے اور یہ اعلان کردے کہ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ میں نے ربّ الفلق یعنی مخلوقات کے پیدا کرنے والے کی پناہ میں اپنے آپ کو دیدیا ہے۔ اور اسی لئے اب دنیوی اسباب پر میرا بھروسہ نہیں ہے۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت تیسری مجلس میں جاتا ہے اور یہی کہتا ہے۔ اور اس کے بعد چوتھی مجلس میں جاتا ہے اور یہی کہتا ہے۔ اور اس طرح ہر شخص اس کے اعمال کا نگران بن جاتا ہے۔ اور پھر جب اتنا بڑا دعویٰ کرنے کے بعد وہ اگر کسی تحصیلدار، تھانیدار یا کسی اور کے سامنے جاتا اور اسے سلام کرتا ہے اور اس سے اپنی مشکلات کے دُور کرنے میں مدد مانگتا ہے تو ان لوگوں میں سے جن کے سامنے اس نے اپنے آپ کو ربّ الفلق کی پناہ میں دے دینے اور دنیوی رشتوں سے قطع تعلق کا اعلان کیا تھا۔ ہر ایک اسے شرمندہ کرے گا کہ تُو نے دعویٰ تو بہت بڑا کیا تھا مگر عمل کے وقت اپنے دعویٰ کو سچا کرکے نہ دکھا سکا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ سے پہلے قُلْ کا لفظ لاکر ہر مسلمان کو گویا یہ ہدایت دی ہے کہ جب تم اللہ تعالیٰ کی صحیح توحید کا علم حاصل کرچکے ہو تو ہر مجلس میں جاکر یہ اعلان کرو۔ تا ہر شخص تمہارا نگران بن جائے۔ اور جب بھی دیکھے کہ تمہارا عمل اس کے خلاف ہے تو وہ تم کو شرمندہ کرسکے ایک شخص مُنہ سے تو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مَیں نے اپنے آپ کو ربّ الفلق کی پناہ میں دیدیا۔ مگر جب اس کے گھر میں بیماری آتی ہے وہ خود یا اس کے بیوی بچے بیمار ہوجاتے ہیں تو وہ گھبرا کر رونے لگ جاتا ہے۔ جب اس پر قرضہ ہوجائے تو وہ گھبرا کر رونے لگتا ہے۔ افسر ناراض ہوجائیں تو گھبرا کر رونے لگتا ہے۔ استاد بگڑ جائے تو گھبرا کر رونے لگتا ہے۔ اس پر ہر شخص اُسے جھوٹا کرسکتا ہے کہ تم تو خدا تعالیٰ کی توحید پر قائم ہونے کے دعویٰ دار تھے۔ تم نے تو دعویٰ کیا تھا کہ سوائے خدا تعالیٰ کے مجھے کسی کی پرواہ نہیں پھر یہ کیا ہے کہ دُنیا کی ہر مصیبت سے تم ڈر رہے ہو۔ پس سورۃ فلق کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایک مومن سے یہی کہا ہے کہ اگر تمہارے اندر واقعی ایمان پیدا ہوچکا ہے تو ساری دُنیا کو چیلنج دیدو اور سب لوگوں کے سامنے دُنیا سے بے پرواہ ہوکر اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کی پناہ میں دیدینے کا اعلان کردو۔ تا جب تمہارا عمل اس دعویٰ کے خلاف ہو تو ہر شخص یہ سمجھ سکے کہ یہ جھوٹا ہے۔ مُنہ سے تو کچھ کہتا ہے مگر عمل کچھ اور ہے۔ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ کی آیت میں قُلْ کہنے کا مطلب ہی یہی ہے کہ اپنے اس دعویٰ پر ساری دُنیا کو گواہ بنالو۔ انسان خدا تعالیٰ کے حضور جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اے خدا مَیں نے تمام رشتوں سے قطع تعلق کرلیا اور اپنے ہاتھ پاؤں باندھ کر اپنے آپ کو تیرے حضور ڈال دیا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ

اسے فرماتا ہے کہ یہ بات ہم کو آکر نہ کہو بلکہ جاؤ
اور دُنیا کے سامنے یہ بات بیان کرو اور لوگوں کو
اس بات پر گواہ بناؤ۔ کہ تم خدا تعالیٰ کے سوا
ہر چیز سے بے نیاز ہو۔ تا جب تمہارا عمل تمہارے
اس دعویٰ کے خلاف نظر آئے تو لوگ کہہ سکیں کہ
تم بڑے جھوٹے اور مکار ہو۔ مُنہ سے تو کچھ کہتے
ہو مگر عمل کچھ ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں قُلْ
کا لفظ رکھ کر بتا دیا کہ اب تم سارا قرآن کریم
پڑھ چکے اب تمہارے دل کا ایمان پختگی
حاصل کر چکا ہے اب اسے مخفی نہیں رکھا جا سکتا
جو بات تم ہمارے سامنے آکر کہتے ہو اسے یا تو
کھُلے میدان میں ظاہر کرو۔ لوگوں کو اس پر گواہ
بلکہ قاضی اور جج بناؤ۔ تا جب تمہارا عمل اسکے
خلاف ہو تو وُہ ملامت کر سکیں۔ اور یا پھر اس
دعویٰ کو ترک کر دو۔ ہم تمہارے اس دعویٰ کو
نہیں مانتے جو تم علیحدگی میں ہمارے حضور کرتے
ہو۔ اور نماز پڑھتے وقت کہتے ہو کہ اَعُوْذُ
بِرَبِّ الْفَلَقِ۔ اے میرے رب میں تیری
پناہ میں آتا ہوں۔ تمہارے اس دعویٰ کے معنے
تو یہ ہیں کہ تمام مخلوق سے تمہارا رشتہ ٹوٹ
چکا اور خدا تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو گیا۔ اب
تمہارا بھروسہ ماں باپ، بھائی بہن، دوست
احباب، رشتہ داروں، قوم و حکومت پر نہ
ہوگا۔ ان سب کے تعلق ٹوٹ کر اب خدا تعالیٰ
کے ساتھ قائم ہو گیا۔ اور یہ ایک ایسا دعویٰ ہے
جس کی حقیقت تم پر اس وقت تک واضح نہیں
ہو سکتی جب تک کہ تم لوگوں کو اس پر گواہ نہ بنا لو
اور جو انسان اس مقام پر کھڑا ہو وہ کس طرح
اطمینان کا سانس لے سکتا ہے جب تک
وہ اپنے عمل سے اس دعویٰ کی تصدیق نہ
کر دے۔

بعض لوگ میرے پاس آتے ہیں اور کہتے
ہیں کہ فلاں کام کے لئے دعا کریں۔ اور ساتھ ہی
یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اگر ہو سکے تو فلاں شخص سے
سفارش بھی کرا دیں۔ حالانکہ دُعا کے ساتھ ہی
سفارشی خط چاہنا توکّل کے خلاف ہوتا ہے۔
بلکہ مومن کے لئے تو یہ شرم سے زمین میں گڑ جانے
کا مقام ہے۔ کیونکہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے
رشتہ جوڑ لیتا ہے تو اسے نہ بادشاہوں پر
بھروسہ کرنا چاہیئے اور نہ کسی پارلیمنٹ پر اور
نہ کسی فوج یا حکومت پر اور نہ ملک کے مدبّروں
پر۔ مومن تو دُنیا کے سامنے یہ دعویٰ کرتا ہے
کہ میرا ہاتھ خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ
دعویٰ کرنے کے بعد اگر وہ کسی کے پاس جاتا اور
اس سے باصرار کہتا ہے کہ میرا فلاں کام کر دو۔
(بغیر توکّل اور اصرار کے اس خیال کی بنا پر
کہ اللہ تعالیٰ نے سامانوں سے کام لینے کا حکم دیا
ہے اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص سے جس پر اس کا
حق ہے مدد چاہے تو یہ گناہ نہیں۔ گناہ یہ ہے
کہ وہ سفارش پر توکّل کرے۔ اور جب اُسکی
خواہش پوری نہ ہو تو اسے صدمہ ہو۔ اور وہ اصرار
کرے کہ کسی طرح اس کو سفارشی چٹھی مل جائے)
تو اس سے زیادہ ذلیل کون ہو سکتا ہے قاضی
ظہور الدین صاحب اکمل کے والد مولوی امام دین
صاحب کو تصوّف سے بہت شغف تھا۔ احمدی
ہونے سے پہلے وہ صوفیاء کے مرید تھے۔ اسلئے
جب بھی اُنہیں موقعہ ملتا مجھ سے وہ یہ بات کہتے
کہ فلاں صوفی صاحب کہتے تھے کہ انہوں نے عرش

پر سجدہ کیا۔ فلاں صوفی صاحب تھے جنہوں نے فلاں
آسمان پر سجدہ کیا۔ فلاں نے سجدہ میں اللہ تعالیٰ
کو دیکھا۔ مگر احمدیت میں یہ بات نظر نہیں آتی۔
مَیں اس کے متعلق ان کو کئی دلائل دیتا۔ مگر سال
چھ ماہ کے بعد پھر یہی سوال کر دیتے۔ کہ وہ چیز
ابھی نہیں ملتی جو صوفیاء بتاتے چلے آئے ہیں۔ ایک
دن اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کا جواب سمجھایا۔ مَیں
نے ان سے کہا کہ کیا آپ دیکھتے نہیں۔ کہ وہ جو
عرش پر سجدہ کرتے ہیں یا آسمان پر کرنے والے
ہیں وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے درجہ
میں چھوٹے ہیں۔ وہ کہنے لگے مَیں مانتا ہوں۔ کہ
احمدیت میں سب کچھ ہے مگر عرش پر سجدہ کرنا بھی
تو بہت بڑی بات ہے۔ مَیں نے کہا مَیں مانتا ہوں
کہ وہ عرش پر سجدہ کرتے ہوں گے مگر اللہ تعالیٰ
کے ساتھ اُن کے تعلق کا کوئی ظاہری ثبوت بھی تو
ہونا چاہیئے۔ ایک انسان بھی اپنے ساتھ ادنےٰ
جوڑ یا تعلق رکھنے والے کو ذلیل نہیں کرتا۔ مَیں
نے ان سے کہا۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ حضرت
مسیح موعود علیہ السلام پر کتنا بار تھا۔ ابتداء میں
بیسیوں اور بعد میں سینکڑوں تک مہمان روزانہ
لنگر سے کھانا کھاتے تھے۔ اور مہمان نوازی کا
خرچ پندرہ سَو سے ۲½ ہزار روپیہ ماہوار تک
تھا۔ مگر آپ کی کوئی آمد مقرر اور معیّن نہ تھی۔
بے شک جماعت کے دوست چندہ دیتے تھے۔
لیکن یہ کوئی مقرر اور معیّن آمد تو نہ تھی مگر دیکھئے
باوجود اس قدر کثیر اخراجات کے اور آمد کی معیّن
صورت نہ ہونے کے حضرت مسیح موعود علیہ السلام
کو خدا تعالیٰ پر کیسا توکّل تھا اور خدا تعالیٰ کس طرح
آپ کی ضرورتوں کو پورا کرتا تھا کیا یہ عرش پر سجدہ
کرنے والے لوگ بھی اِس توکّل کے مقام پر تھے؟
مولوی صاحب اس بات کو سُن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے
اور تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے کہ آج میری سمجھ میں
یہ بات آگئی ہے۔ کہ یہ عرش پر سجدہ دھوکہ ہی تھا۔
یہ عرش پر سجدہ کرنے والے صاحب غلّہ نکلنے
کے زمانہ میں زمینداروں سے کہا کرتے تھے۔ کہ
کچھ غلّہ ہمیں بھی بھجوانا۔ مَیں نے اُن سے کہا کہ بس
دیکھ لیں کہ یہی فرق سچے متوکّل اور جھوٹے متوکّل
میں ہوتا ہے۔ بہرحال مومن خدا تعالیٰ پر توکّل کرنے
والا ہوتا ہے۔ اور جب وہ لوگوں کے سامنے کہتا
ہے کہ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ۔ مَیں ربّ الفلق
کی پناہ میں آتا ہوں تو پھر وہ بندوں کی طرف
نگاہ نہیں کر سکتا۔ بلکہ خدا تعالیٰ پر ہی یقین رکھتا
ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی مثال ہمارے
سامنے ہے۔ آپ کو کیا پتہ ہوتا کہ کل روپیہ آجائیگا
یا نہیں مگر خرچ ہوتا تھا۔ اور یہ اللہ تعالےٰ کا
فضل تھا کہ اس نے کبھی تنگی نہ آنے دی۔ تو مومن
بندوں کی طرف نگاہ نہیں کرتا۔ بلکہ اللہ تعالےٰ پر
توکّل رکھتا ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے
کہ وہ کسی کا امتحان فاقہ دیکر لینا چاہے تو لے لے
یا کسی کو فراخی دیکر آزمانا چاہے تو آزمالے۔

شیخ عبد القادر صاحب جیلانیؒ کے متعلق
لکھا ہے۔ کہ بہت اعلیٰ لباس پہنتے تھے اور اعلیٰ
کھانا کھاتے تھے۔ بعض اوقات ایک ایک جوڑا
ان کا ایک ایک ہزار دینار یعنی اڑھائی تین ہزار
روپے کا ہوتا تھا۔ بعض نادان اُن پر اعتراض
بھی کرتے تھے مگر آپ جواب دیتے کہ مَیں تو جو
کپڑا پہنتا ہوں اللہ تعالیٰ کے حکم سے پہنتا ہوں
مَیں تو کبھی کوئی کپڑا نہیں پہنتا جب تک اللہ تعالیٰ

مجھے نہیں کہتا کہ اے عبدالقادر تجھے میری ذات کی قسم یہ کپڑا پہن۔ تو بندہ کے توکل کے یہ معنے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کا ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ۔ جا دنیا کے لوگوں سے کہہ دے کہ میں اب خدا تعالیٰ کا ہو گیا ہوں۔ مجھے تمہاری پرواہ نہیں۔ اور اگر لوگ اس دعویٰ کی وجہ سے تم پر حملہ کرنے کے لئے اُٹھیں تو تم کہنا کہ میں تمہاری ایذاؤں سے بے نیاز ہوں۔ اور ان کے لئے بھی اپنے رب سے پناہ مانگتا ہوں۔

تیسرے معنے فلق کے جہنم کے ہیں۔ ان معنوں کے اعتبار سے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ کا مفہوم یہ ہوگا کہ میں جہنم کے پیدا کرنے والے رب کی پناہ میں آتا ہوں۔ اور ان شدائد سے بھی جو اس جہنم میں پیدا کئے گئے ہیں

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ۔ کہ جو خدا کے بندے ہوتے ہیں ان کو اس دنیا میں بھی جنت ملتی ہے اور آخرت میں بھی۔ اور پھر نبی کے ذریعہ جو نظام قائم ہوتا ہے اس کو بھی جنت کہا گیا ہے۔ جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو فرمایا۔ اُسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ (البقرة) کہ اے آدم تم اور تمہارے ساتھی اس نظام میں رہو جس میں رہنے کا ہم نے تمہیں حکم دیا ہے۔ کیونکہ اگر تم اس میں رہو گے تو تمہارے لئے یہ دنیا جنت بن جائیگی۔ قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام کے واقعات کو بیان کرکے یہ بتایا گیا ہے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی آدم ہیں اور آپ کے ذریعہ بھی ایسا نظام جاری کیا گیا ہے جو اس زمین کے رہنے والوں کو جنتی بنا دے گا۔ اور وہ آرام کی زندگی بسر کریں گے۔

پس قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ اے مسلمانو! تم کو دعا کرنی چاہیئے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو نازل کرکے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کرکے تمہیں انفرادی اور اجتماعی طور پر جنت میں داخل کر دیا ہے۔ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ تم آگ کے کنارے پر تھے تم کو نکال کر جنت میں داخل کر دیا۔ اللہ نے تمہیں ذہنی اور قلبی سکون عطا کیا۔ تم ایک ہاتھ پر جمع ہو گئے۔ تم میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کا وہ اعلیٰ مقام پیدا ہو گیا کہ تمہارے لئے یہ دنیا جنت بن گئی۔ تم کو خدا تعالیٰ مل گیا اور تمہارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو گیا۔ پس ان نعمتوں کو یاد رکھو۔ اور جہنم کے رب کی پناہ میں آؤ۔ اور اس کے شدائد سے بچنے کے لئے بھی اس کی پناہ چاہو تاکہ جہنم کبھی تمہارے قریب نہ آئے یعنی ایسی حالت پیدا نہ ہو کہ تمہارا انفرادی اور قومی اطمینان ختم ہو جائے۔ تمہارے اندر لڑائی جھگڑے پیدا ہو جائیں۔ تم قرآن کریم کی تعلیم کو چھوڑ دو۔ اور یہ دنیا بھی تمہارے لئے جہنم بن جائے اور آخرت میں بھی جہنم دیکھنا پڑے۔

(۴) چوتھے معنے الفلق کے دو پہاڑیوں کے درمیان کے میدان کے ہوتے ہیں بعض اقوام ایسی ہیں جو افراط کی طرف چلی گئی ہیں اور

بعض تفریط کی طرف لیکن اللہ تعالیٰ کے حصول اور دُنیا میں امن و امان کا اصل طریق میانہ روی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو امّت وسط قرار دیا ہے۔ کہ ان کی تعلیم میں نہ افراط پایا جاتا ہے اور نہ تفریط۔ اور جو ایسی تعلیم ہو وہ اعلیٰ درجہ کی ہوگی اور اس سے دُنیا میں امن پیدا ہوگا۔ تو فرمایا۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ۔ کہ اے مسلمانو! کہو ہم اس رب کی پناہ چاہتے ہیں جس نے افراط اور تفریط کی دو پہاڑیوں کے درمیان اسلام جیسا خوبصورت میدان بنایا ہے۔ جہاں دنیا کو چین اور آرام حاصل ہو سکتا ہے۔ گویا ان آیات میں بتایا ہے کہ تم اس خدا کی پناہ چاہو جس نے اسلام جیسے بہترین مذہب کو بھیجا۔ جس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کامل انسان بھیجا اور جس کے ذریعہ سے تم کو قرآن جیسی کامل تعلیم ملی۔ تم اس بات سے پناہ چاہو کہ تمہارے لئے کوئی شر پیدا نہ ہو جائے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ کسی وقت کوئی ایسا شر پیدا ہو جس کی وجہ سے تم اللہ تعالےٰ کی بہترین تعلیم سے علیحدہ ہو جاؤ۔ اسلام کو چھوڑ دو اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دامن سے کنارہ کشی کر لو جس کا نتیجہ یہ ہو کہ تم مشکلات میں مبتلا ہو جاؤ۔ اور تمہاری زندگی تمہارے لئے مشکل ہو جائے۔

اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ کہہ کر اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ تک پہنچنے اور اس کی ربوبیت سے فیض پانے کا صحیح طریق میانہ روی ہے۔ نہ انسان افراط کو اختیار کر کے اللہ تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہے اور نہ تفریط والے راستے کو اختیار کر کے۔

ہاں اگر میانہ روی کو اختیار کرتا ہے۔ تو خدا تعالےٰ تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اس تک پہنچنے میں بہت سی روکیں ہیں۔ اور درحقیقت دُنیا کا ہر ذرّہ اس تک پہنچنے میں روک ہے۔ جو لوگ ناکام رہتے ہیں وہ اسی لئے رہتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے فلاں روک کو دُور کر دیا۔ مگر درحقیقت اس روک کے علاوہ کئی اور روکیں بھی ہوتی ہیں۔ جن کی طرف ان کا خیال بھی نہیں جا سکتا۔ پس کامیاب انسان وہی ہوتا ہے جو کہتا ہے کہ دُنیا کا ذرّہ ذرّہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ وہ اتنا ہوشیار ہوتا ہے کہ بیوی بچے۔ استاد۔ شاگرد۔ مال جائداد۔ مرتبہ عزّت۔ عمل۔ بے عملی۔ غرض ہر چیز سے ہوشیار رہتا ہے۔ کیونکہ کبھی انسان اپنے کسی عمل کی وجہ سے محروم ہو جاتا ہے اور کبھی کسی بے عملی سے اور کبھی علم کی وجہ سے محروم رہ جاتا ہے کبھی جہالت سے۔ اس لئے کامیابی کا حقیقی خواہاں وہی ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ کے حضور گرتا ہے اور کہتا ہے۔ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ۔ اے خدا مجھے معلوم نہیں کہ میرے رستہ میں ہلاکت اور روکاوٹیں کہاں کہاں سے آ رہی ہیں۔ اسلئے اے خدا۔ جو خالق ہے تمام چیزوں کا ان کے شر سے مجھے بچا۔ کیونکہ ان کے شر کا تجھے ہی پتہ ہے۔ پس یہ ترقی کا پہلا زینہ ہوتا ہے۔ کہ انسان ہر ذرّہ سے حتیٰ کہ اپنے نفس سے بھی ڈرتا ہے اور اس کے شر سے پناہ مانگتا ہے۔ پھر یہی نہیں کہ مومن اپنے ایمان کے متعلق ڈرتا ہے کہ ایسا نہ ہو میرے دل میں تکبّر پیدا ہو جائے اور

میں مارا جاؤں - بلکہ وہ قرب الی اللہ سے بھی
ڈرتا ہے - کیونکہ یہ بھی ہلاکت کا موجب بن جاتا
ہے جیسے کہ بلعم کے لئے ہو گیا تھا - اسی خطرہ کی
طرف نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے لَا مَلْجَأَ
وَلَا مَنْجَأَ اِلَّا اِلَیْكَ کے الفاظ میں
اشارہ فرمایا ہے - کہ ہم نہیں کہہ سکتے ہمارے
لئے ہلاکت و وبال اسی راستہ سے آرہا ہو جو
ہم نے تجھ تک پہنچنے کے لئے اختیار کیا ہے -
اس لئے ہماری نجات کی صورت تو یہی ہے تو
ہمیں اپنی پناہ میں لے لے - پس مِنْ شَرِّ مَا
خَلَقَ سے بتایا کہ انسان کو ہر ذرّہ سے ڈرنا چاہیئے
اور چونکہ انسان کو علم نہیں ہوتا کہ کونسی چیز اس
کی ہلاکت کا باعث ہو سکتی ہے اسلئے ان اشیاء
کے پیدا کرنے والے خدا سے ہی پناہ مانگنی
چاہیئے -

(۵) الفلق کے پانچویں معنے اس لکڑی
کے ہیں جس میں مجرموں کو قطار میں کھڑا کیا جاتا ہے
پس ان معنوں کے اعتبار سے قُلْ اَعُوْذُ
بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ کے یہ
معنے ہوں گے - کہ میں قیدخانوں کے مالک کی
پناہ چاہتا ہوں - اس بات سے کہ ایسا نہ ہو کہ
میں قیدخانے میں پڑ جاؤں اور اس کی شدائد
اور مشکلات مجھے برداشت کرنی پڑیں -

گویا اس میں قومی لحاظ سے بھی دعا سکھائی
گئی ہے اور فردی لحاظ سے بھی - یعنی ایسا نہ
ہو کہ ہماری قوم آپس میں لڑ پڑے - اور
ایک دوسرے کو قیدخانوں میں ڈالکر شدائد
میں مبتلا کر دے - یا ایسا نہ ہو کہ کوئی مخالف
حکومت اُٹھے اور اسلامی حکومت کو برباد کرکے
اور مسلمانوں کو قید و بند کی مشکلات سے دوچار
ہونا پڑے اور مسلمانوں کا کام ختم ہو جائے -

اسی طرح فردی لحاظ سے یہ دُعا سکھائی کہ
تمہیں دُعا کرنی چاہیئے - کہ تم دانستہ یا نادانستہ
کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھو جس سے تمہیں قید و بند
کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑے پس ان مشکلات
سے وہی خدا بچا سکتا ہے جو ہر ایک کے قلب پر
حکومت کرتا ہے اور جو حقیقی حکمران ہے - تا کہ
اگر بالفرض ایسا وقت آ بھی جائے تو اللہ تعالےٰ
قیدخانوں کے مالکوں کے دلوں کو بدل دے
اور وہ سختی کی بجائے نرمی سے پیش آئیں -

(۶) الفلق کے چھٹے معنے اس دُودھ کے
ہیں جو دودھ پینے کے بعد پیالے کے آخر میں
تھوڑا سا بچ جاتا ہے - ان معنے کے اعتبار سے
قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ
کا یہ مفہوم ہو گا - کہ اے خدا تُو نے مجھے وہ کامل
تعلیم قرآن کریم کے ذریعہ سے دی ہے جو اس
پیالہ کی مانند ہے جو دُودھ سے بھرا ہوا ہو -
ایسا نہ ہو کہ کسی وقت میری کمزوریوں کی وجہ سے
میرے پاس اس تعلیم میں سے تھوڑا سا حصہ رہ جائے
اور روحانی طور پر امیر ہونے کے بعد میں غریب
ہو جاؤں - احادیث میں آتا ہے - کہ رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے معراج کی رات کو
دودھ، پانی اور خمر پیش کئے گئے - نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم نے دودھ کو لے لیا - تب جبریل نے کہا کہ
یا رسول اللہ! اگر آپ پانی اور خمر کو لے لیتے تو آپ
کی اُمّت تباہ ہو جاتی - آپ نے دودھ کو لیکر فطرتِ
صحیحہ کے مطابق کام کیا ہے - پس دودھ سے مراد
قرآنی تعلیم ہے جو فطرتِ صحیحہ کے مطابق ہے - پس

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ میں بتایا کہ مسلمانوں کو دُعا کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ان کو قرآنی تعلیم پر پوری طرح عمل کرنے کی توفیق دے اور وہ اس تعلیم کی حفاظت کرتے رہیں۔ اور ایسا نہ ہو کہ کسی وقت اس پر عمل کو چھوڑ کر اس شخص کی طرح ہو جائیں جس کے پاس تھوڑا سا دودھ رہ جاتا ہے۔ دنیا میں جب کوئی شخص امیر ہونے کے بعد پھر غریب ہوتا ہے تو اُسے بہت تکلیف ہوتی ہے اور اس کی زندگی اس کے لئے دوبھر ہو جاتی ہے۔ پس انفرادی لحاظ سے بھی اس میں یہ دُعا سکھائی گئی ہے کہ ایسا نہ ہو وہ نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہیں اور جن کے ذریعے وہ آرام و اطمینان کی زندگی بسر کر رہا ہے وہ نعمتیں ہاتھ سے جاتی رہیں۔ اور اس کی زندگی کے دن مشکل سے کٹیں۔

پھر اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ ایسا نہ ہو اسلام کے غلبہ کی وجہ سے جو مسلمانوں کو رفاہیت حاصل ہے۔ وہ کسی وقت مسلمانوں کی حکومت کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے تکلیف میں بدل جائے اور مسلمان کڑھتے رہیں۔ بلکہ اگر کوئی ایسا وقت آئے تو اللہ تعالیٰ خود دستگیری کرے۔ اور پھر سے سامان پیدا کر دے کہ مسلمانوں کی کمزوری طاقت سے اور ضعف کے دن شوکت سے بدل جائیں۔

(۷) ساتویں معنے الفلق کے اَلْاَنْهَارُ کے بھی ہیں۔ اور رب الفلق کے معنے ہوں گے دریاؤں کا رب۔ اس لحاظ سے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ میں یہ دُعا سکھائی گئی ہے۔ کہ کہو میں انہار یعنی دریاؤں کے پیدا کرنے والے رب کی پناہ میں آتا ہوں۔ اس بات سے کہ ان کے ذریعے سے مجھے یا میری قوم کو کوئی شر نہ پہنچ جائے۔

یہ ظاہر ہے کہ دریاؤں کے ذریعے مُلک سیراب ہوتے ہیں اور ان پر مُلکوں کی خوراک کا انحصار ہوتا ہے۔ اگر صحیح رنگ میں ان سے پانی ملتا رہے۔ دریاؤں سے نہریں نکالی جائیں اور ان نہروں سے زمینوں کو سیراب کیا جائے تو وہ مُلک کے لئے مفید ہوتے ہیں لیکن اگر دریاؤں میں طغیانی آجائے تو نہ صرف یہ کہ فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ بلکہ لوگ بھی ڈوب کر مر جاتے ہیں۔ پس دریا ایک مفید چیز ہے۔ جس پر زندگی کا دار و مدار ہے۔ لیکن جب اس کا مضر پہلو ظاہر ہوتا ہے۔ تو وہ زندگی بخش ہونے کی بجائے زندگی ختم کرنے کا ذریعہ ہو جاتا ہے۔ درحقیقت ہر چیز کا یہی حال ہے۔ اس کا فائدہ بھی ہے نقصان بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کو دُعا کرتے رہنا چاہیئے کہ جو کچھ جسمانی اور روحانی لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے دیا ہے وہ ان کے لئے فائدہ بخش ہو اور اس کے مضرات سے اللہ تعالیٰ خود ہی بچاتا رہے۔ اور ایسا نہ ہو کہ دین کے علوم کی فراوانی جو ان کو حاصل ہوئی ہے وہ انہیں مغرور بنا دے۔ اور دوسرے بنی نوع انسان کو ذلیل سمجھنے لگ جائیں۔ اور وہ چیز جو خدا تعالیٰ کے طفیل ان کو ملی ہے وہ اسے ذاتی قابلیت کا نتیجہ نہ سمجھنے لگ جائیں۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝

اور اندھیرا کرنیوالے کی ہر شرارت سے (بچنے کیلئے) جب وہ اندھیرا کر دیتا ہے۔ ۵۴

۵۴ حل لغات :- غَاسِقٌ۔ غَسَقَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور غَسَقَتْ عَیْنُہٗ غُسُوْقًا کے معنے ہیں دَمَعَتْ وَقِیْلَ اِنْصَبَّتْ وَقِیْلَ اَظْلَمَتْ۔ آنکھ آنسوؤں سے ڈبڈبا آئی۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ جب آنسو آنکھ سے ٹپک پڑیں اور آنکھ کے سامنے اندھیرا ہو جائے۔ تو اس وقت غَسَقَتْ عَیْنُہٗ کا فقرہ بولتے ہیں۔ اور جب غَسَقَتِ السَّمَآءُ غَسْقًا کہیں تو معنے ہونگے اِنْصَبَّتْ وَاَرَشَّتْ یعنی بادلوں نے موسلادھار پانی برسایا۔ اور غَسَقَ اللَّبَنُ کے معنے ہیں۔ اِنْصَبَّ مِنَ الضَّرْعِ دودھ زیادتی کی وجہ سے پستان سے ٹپک پڑا۔ اور غَسَقَ الْجُرْحُ کے معنے ہوتے ہیں سَالَ مِنْہُ مَآءٌ اَصْفَرُ کہ زخم سے زرد رنگ کی پیپ بہ پڑی۔ اور جب غَسَقَ اللَّیْلُ غَسْقًا کہیں تو مراد ہوگی کہ اِشْتَدَّتْ ظُلْمَتُہٗ۔ رات کی تاریکی سخت ہو گئی۔ (اقرب)

اَلْغَاسِقُ کے معنے ہیں۔ اَلْقَمَرُ وَاللَّیْلُ اِذَا غَابَ الشَّفَقُ وَاشْتَدَّتْ ظُلْمَتُہٗ یعنی غَاسِقٌ کے معنے چاند کے ہیں اور رات کے بھی۔ جب اس کی تاریکی زیادہ ہو جائے۔ قِیْلَ اَیِ اللَّیْلُ اِذَا دَخَلَ۔ اسی طرح کہا گیا ہے کہ غَاسِقٌ کے معنے رات کے ہیں جب وہ تاریکی پھیلا دیتی ہے وَالثُّرَیَّا اِذَا اسْقَطَتْ لِکَثْرَۃِ الطَّوَاعِیْنِ وَالْاَسْقَامِ عِنْدَ سُقُوْطِہَا۔ بعض کہتے ہیں کہ غَاسِقٌ کے معنے ثریا ستارے کے ہیں جبکہ وہ اپنی اصلی جگہ سے ہٹ جائے اور اس کے نتیجہ میں مختلف قسم کی امراض پیدا ہوں۔ (اقرب)

غَاسِقٌ مفردات میں ہے غَسَقُ اللَّیْلِ شِدَّۃُ ظُلْمَتِہٖ۔ یعنی غَسَقُ اللَّیْلِ کے معنے ہوتے ہیں رات کی تاریکی۔ قَالَ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ ذٰلِكَ عِبَارَۃٌ عَنِ النَّائِبَۃِ بِاللَّیْلِ کَالطَّارِقِ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ کے الفاظ فرمائے ہیں۔ ان میں غَاسِقٌ سے مراد وہ مصیبت یا حادثہ ہے۔ جو رات کو آئے۔ وَقِیْلَ اَلْقَمَرُ اِذَا کَسَفَ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ چاند کو بھی غاسق کہیں گے جبکہ اس کی روشنی جاتی رہے اور اس کو گرہن لگ جائے۔

وَقَبَ وَقَبَ :- وَقَبَتِ الشَّمْسُ وَغَیْرُھَا کے معنے ہوتے ہیں غَابَتْ سورج غائب ہو گیا۔ اور جب وَقَبَ الرَّجُلُ وَقْبًا کہیں۔ تو معنے ہوں گے دَخَلَ فِی الْوَقْبِ یعنی فلاں شخص اندھیرے میں داخل ہو گیا۔ وَغَارَتْ عَیْنَاہُ اور وَقَبَ الرَّجُلُ کے یہ بھی معنے ہیں کہ اس کی آنکھیں اندر دھنس گئیں۔ اور وَقَبَ الظَّلَامُ عَلَی النَّاسِ کے معنے ہوتے ہیں دَخَلَ وَانْتَشَرَ کہ لوگوں پر اندھیرا چھا گیا۔ اور جب وَقَبَ الْقَمَرُ کہیں تو اس کے معنے ہوں گے۔ دَخَلَ فِی الْکُسُوْفِ کہ چاند کسوف میں داخل ہو گیا۔ نیز اَلْوَقْبُ کے معنے ہیں نُقْرَۃٌ فِی الصَّخْرَۃِ یَجْتَمِعُ فِیْھَا الْمَآءُ۔ چٹان کا وہ گڑھا جس میں پانی جمع ہوتا ہے۔ اَلْکُوَّۃُ الْعَظِیْمَۃُ فِیْہَا ظِلٌّ۔ وہ بڑا گڑھا جس میں سایہ ہوتا ہے (اقرب)

پس وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کے

معنے ہوں گے (۱) میں پناہ چاہتا ہوں رات کی تاریکی کے شر سے جب کہ اندھیرا چھا جائے۔ (۲) میں پناہ چاہتا ہوں اس وقت کے شر سے جب سورج غروب ہو جائے (۳) میں پناہ چاہتا ہوں اس وقت کے شر سے جب چاند اور سورج کو گرہن لگے (۴) میں پناہ چاہتا ہوں اس وقت کے شر سے جب کہ فراخی کے بعد تنگی ہو جائے (۵) میں ان حوادث سے پناہ چاہتا ہوں جو رات کے وقت آئیں (۶) میں اس وقت کے شر سے پناہ چاہتا ہوں جب کہ انسان گڑھے میں داخل ہو جائے۔

تفسیر۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ کی تفسیر کرتے ہوئے یہ بتایا جا چکا ہے۔ کہ اِن آیات میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ اسلام کا وہ غلبہ جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شروع ہوا وہ مکمل ہو کر رہے گا۔ اور یہ کہ مسلمانوں کو ہر قسم کی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ اور پھر مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ انہیں ایک طرف تو یہ دعا کرنی چاہیئے کہ یہ موعود غلبہ اُن کو جلد حاصل ہو جائے اور دوسری طرف انہیں اللہ تعالےٰ سے اس بات سے پناہ طلب کرنی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو۔ کہ وہ ان خرابیوں میں مبتلا ہو جائیں۔ جن میں عام طور پر حکمران اقوام مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اور یہ کہ ان کو مال کی فراوانی تعیش میں مبتلا نہ کرے۔ یا وُہ جاہ و حشمت کیلئے آپس میں لڑنا بھڑنا نہ شروع کر دیں۔

اِن آیات کے بعد اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ۔ یعنی میں غاسق کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔ جب کہ وہ وقوب اختیار کر لیتا ہے۔ جیسا کہ حلِّ لغات میں بتایا جا چکا ہے۔ غَاسِق کے معنے رات کے ہیں اور وَقَبَ کے معنے اندھیرے اور ظلمت کے چھا جانے کے ہیں۔ اسی طرح غَاسِق کے معنے سورج کے ہیں اور وَقَبَ کے معنے غائب ہونے کے ہیں۔ پس اِن معنوں کے اعتبار سے وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کا مفہوم یہ بنیگا کہ میں اُس وقت کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جبکہ سورج غروب ہو جائے اور سخت تاریکی چھا جائے۔

اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں سورۃ احزاب میں فرماتا ہے یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا۔ وَّدَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝ (احزاب ع۶)

اے نبی ہم نے تجھے لوگوں کے لئے نمونہ اور ایمان لانے والوں کے لئے ترقیات کی خوشخبری دینے والا اور منکرین کے لئے عذاب کی خبر دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔ نیز اللہ تعالےٰ کے حکم سے اس کی طرف لوگوں کو بلانے والا اور دنیا کو روشن کر دینے والا سورج بنایا ہے۔

اِن آیات میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو چمکنے والا سورج قرار دیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا نور دنیا کو منور کرے گا۔ پس سورۃ الفلق میں قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ کے الفاظ کہہ کر یہ اشارہ فرمایا کہ اے محمد رسول اللہ! یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر ہے۔ کہ آپ کی لائی ہوئی تعلیم ساری دنیا میں پھیل جائے اور آپ وسط آسمان میں سورج کی طرح چمک کر ساری دنیا کو منور کر دیں۔ پھر اس کے بعد وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کہہ کر یہ ہدایت کی کہ آپ کو اللہ تعالےٰ سے التجا کرنی چاہیئے۔ کہ اس کے بعد کوئی ایسا وقت نہ آ جائے۔ کہ آپ کا روشن چہرہ دنیا کی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔

اور لوگ آپ کی روشنی سے محروم ہو جائیں اور دنیا
پر تاریکی چھا جائے۔ اسی طرح اُمّتِ مسلمہ کے ہر فرد کو
حکم دیا کہ وہ دعا کرتے رہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ جو کمال
انہیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعے
دینے والا ہے اور جو روحانی اور جسمانی ترقیات مسلمانوں
کو دی جانے والی ہیں ان کے بعد ان پر زوال نہ آجائے
اور ایسا نہ ہو کہ وہ کسی وقت قرآنی تعلیم پر عمل کرنا
چھوڑ دیں اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی
روشنی اور قرآن کریم کے نور سے محروم ہو جائیں۔
اور اُن پر تاریکی چھا جائے اور اسی طرح مادی ترقیات
ملنے کے بعد کوئی ایسا سبب پیدا نہ ہو۔ جس سے
وہ تباہی کے گڑھوں میں جا گریں۔ اور اگر کوئی ایسی بات
مسلمانوں کی غلطیوں کی وجہ سے پیدا ہو جائے تو
پھر اللہ تعالیٰ ان کی خود دستگیری فرمائے۔ اور
ایسے حالات پیدا کر دے۔ کہ پھر سے محمد رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم کا روشن چہرہ دنیا دیکھنے لگے
اور تنزل کے دن ترقی سے بدل جائیں۔

(۲) غَسَق کے ایک معنے کسی چیز کی کثرت
کے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ غَسَقَتِ السَّمَآءُ
تَغْسِقُ غَسْقًا اَیْ اِنْصَبَّتْ وَ اَرَشَّتْ۔ کہ بادلوں
میں اتنا پانی تھا کہ وہ زور سے برسے۔ اور اسی
طرح آنکھ جب آنسوؤں سے ڈبڈبا آئے اور خود بخود
آنسو بہنے لگیں۔ تو اس وقت بھی غَسَق کا لفظ استعمال
کیا جاتا ہے۔ پس ان معنے کے اعتبار سے وَمِنْ
شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کے معنے ہوں گے۔ کہ
آسودگی کے بعد تنگی سے میں پناہ چاہتا ہوں۔ یہ
ظاہر ہے کہ کبھی دولت کی زیادتی خراب کرتی ہے اور
کبھی دولت کی کمی۔ جیسے کبھی نور کی زیادتی کی وجہ
سے آنکھیں ماری جاتی ہیں اور کبھی تاریکی کی وجہ سے
آنکھیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ سورج کی طرف ٹکٹکی باندھ کر
دیکھنے والا بھی اپنی آنکھیں کھو بیٹھتا ہے اور اندھیرے
میں رہنے والوں کی بھی آنکھیں ماری جاتی ہیں۔ جب تک
درمیانی راہ اختیار نہ کی جاتے۔ چین و آرام حاصل
نہیں ہو سکتا۔ پس مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ میں تو مال
کی زیادتی اور اس کے نقصان سے بچنے کے لئے دعا
سکھائی اور مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ میں
مال کی کمی کے نقصانات سے محفوظ رہنے کی طرف اشارہ
کیا۔ کیونکہ یہ حالت بھی اتنی خراب ہوتی ہے کہ اس
کے متعلق کہا گیا ہے کہ کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ
کُفْرًا۔ یعنی مال کی کمی بعض اوقات انسان کے ایمان
کو ضائع کر دیتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ایسی حالت
سے محفوظ رہنے کے لئے یہ دعا سکھائی کہ تم اللہ تعالیٰ
سے التجا کرو کہ مال ملنے کے بعد پھر فقر کی نوبت نہ
آئے۔ کیونکہ جو شخص شروع سے غریب ہو۔ اس کو
غربت کا احساس زیادہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب کوئی
شخص امارت کے بعد تنگی کے دن دیکھتا ہے تو اس
کے دن گذرنے مشکل ہو جاتے ہیں۔ پس ایسی حالت
سے بچے رہنے کی دعا کے لئے وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ
کے الفاظ سکھائے گئے ہیں۔

(۳) غَاسِقٌ کے معنے سورج کے بھی ہیں اور
چاند کے بھی۔ اور وقوب کے معنے گرہن لگنے کے بھی
ہیں۔ پس مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کے معنے
ہوں گے۔ میں اس وقت کے شر سے پناہ چاہتا ہوں
جبکہ سورج اور چاند کو گرہن لگے۔

سورج اور چاند کو گرہن لگنے کے دو معنے ہیں: -

الف۔ یعنی وہ انوار جو خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان
کی ترقیات کیلئے ضروری ہیں، مٹ جائیں اور جو چیزیں
اس نور کو مکتسب کرتی ہیں وہ بھی اس نور کو حاصل نہ کر سکیں

جیسے سورج کی ذاتی روشنی ہے۔ اور چاند اس سے روشنی حاصل کرکے دنیا کو منور کرتا ہے۔ اگر ایسے حالات پیدا ہوجائیں کہ چاند سورج سے روشنی حاصل نہ کرسکے اور تاریک ہوجائے۔ تو یہ حالت بھی وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کے ماتحت آئیگی۔ پس وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ میں گو دُعا سکھائی گئی ہے۔ لیکن اس میں یہ پیشگوئی ہے کہ ایک زمانہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا نور بھی لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہوجائے گا۔ اور نہ صرف یہ کہ آپ کا نور عوام الناس نہیں دیکھ سکیں گے بلکہ آپ کے نور کو اپنے اندر جذب کرکے اُسے دنیا میں پھیلانے والے صلحاء اور اولیاء جو قمر کا درجہ رکھتے ہیں وہ بھی موجود نہیں ہوں گے اور تاریکی ہی تاریکی چھا جائے گی۔ پس ایسے وقت میں جو شر اُمت مسلمہ کو پہنچ سکتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے پناہ طلب کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

باء۔ ظاہری لحاظ سے یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ اس آیت میں سورج اور چاند کو گرہن لگنے کی طرف اشارہ ہے۔ اور بتایا ہے کہ جب ایسا زمانہ آئے۔ تو اس کے شرور سے پناہ چاہو۔

احادیث میں یہ بات پوری وضاحت سے بیان ہوئی ہے۔ کہ اُمت محمدیہ پر روحانی اور جسمانی ترقیات کے بعد ایک ایسا زمانہ بھی آنے والا ہے۔ جب کہ وہ تنزل کے گڑھے میں گر جائے گی اور اسلام کا صرف نام ان میں باقی رہ جائے گا۔ اور قرآن کریم صرف اوراق میں ہوگا۔ لیکن اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ ہر قسم کی خرابی ان میں پھیل جائے گی۔ اور انکی وہ حکومتیں اور شان وشوکت جو قرآن کریم کی بدولت انکو ملی تھیں ختم ہوجائیں گی۔ ایسے وقت میں اللہ تعالےٰ اُمت محمدیہ کی دستگیری فرمائیگا اور ایک ایسی شخص کو مبعوث کرے گا جو مسیح اور مہدی کا نام پائے گا۔ اور اس کے ذریعہ اسلام ہر حیثیت سے غالب ہوجائے گا اور اس کی مٹی ہوئی عظمت پھر سے قائم ہو جائے گی۔ مہدی اور مسیح کے مبعوث ہونے کے وقت کئی نشانات ظاہر ہوں گے۔ اور ان میں سے ایک نشان سورج اور چاند کو رمضان کے مہینے میں گرہن لگنے کا بھی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ اِنَّ لِمَهْدِيِّنَا اٰيَتَيْنِ لَمْ تَكُوْنَا مُنْذُ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ يَنْكَسِفُ الْقَمَرُ لِاَوَّلِ لَيْلَةٍ مِّنْ رَمَضَانَ وَتَنْكَسِفُ الشَّمْسُ فِي النِّصْفِ مِنْهُ (دار قطنی ۱۸۸) یعنی جب ہمارا مہدی دین اسلام کی عظمت کو قائم کرنے کے لئے مبعوث ہوگا تو اُسوقت اس کے دعویٰ کے ثبوت کے لئے دو نشان ظاہر ہوں گے۔ اور یہ نشان کسی مدعی کی صداقت کیلئے مقرر نہیں کئے گئے۔ پہلا نشان تو یہ ہے کہ چاند کو اس کی گرہن کی تاریخوں میں رمضان کے مہینہ میں پہلی تاریخ کو گرہن لگے گا اور اسی مہینہ میں سورج کو اس کی گرہن کی تاریخوں میں سے درمیانی تاریخ کو گرہن لگے گا۔

اس حدیث میں سورج اور چاند گرہن کے متعلق ایک خاص پیشگوئی کی گئی ہے۔ پس مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ میں اس بات کے لئے دعا سکھائی گئی ہے۔ کہ جب ایسا زمانہ آئے کہ اسلام کمزوری کی حالت میں ہو۔ اور اللہ تعالےٰ مہدی اور مسیح کو دین اسلام کی عظمت قائم کرنے کے لئے کھڑا کرے تو اس زمانہ کے شرور سے اللہ تعالےٰ بچائے اور اس کا اعوان و مددگاروں سے بنائے اور اس کے مخالف لوگوں پر جو عذاب آئیں گے، اللہ تعالےٰ ان سے محفوظ رکھے۔

(۴) جیسا کہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ کی تفسیر میں لکھا جا چکا ہے۔ ان آیات میں اُن کمزوریوں سے بھی پناہ کی دعا سکھائی گئی ہے جو خلقی طور پر رہ جاتی ہیں۔ اور کمال کے حصول میں روک بن جاتی ہیں۔ ان آیات کے بعد مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ میں انجام کی خرابی سے بچنے کے لئے دعا سکھائی کیونکہ کبھی ابتداء تو اچھی ہوتی ہے لیکن انتہا خراب ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسی بے موقعہ اور بے محل انتہاء ہوتی ہے۔ کہ بجائے اس کے کہ نیکی قائم رہے بربادی ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اس آیت میں انسانی زندگی کی درمیانی حالت کو چھوڑ کر انتہاء کو لے لیا یعنی مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ میں ابتداء کو لیا اور اس کے بعد درمیانی حالت کو بیان نہیں فرمایا۔ بلکہ انتہاء کو لے لیا اور فرمایا وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ۔ کہ وہ ڈوبنے والی اور آنکھوں سے اوجھل ہونے والی چیز۔ جو گڑھے میں چلی جاتی ہے۔ یعنی جبکہ انسان مر جاتا ہے۔ زمین میں دفن ہو جاتا ہے۔ اس وقت کے بد نتائج سے بھی پناہ مانگتا ہوں جس طرح پیدائشی کمزوریوں کو جو میرے لئے روک ہو سکتی تھیں پناہ مانگتا ہوں۔ اسی طرح اس سے بھی پناہ مانگتا ہوں۔ کہ ایسی حالت نہ پیدا ہو جائے کہ میرے مرنے سے ایسے نقائص پیدا ہو جائیں جن سے دین کو نقصان پہنچے یا میرے کام ادھورے رہ جائیں اور انکا انجام اچھا ہونے کی بجائے بُرا ہو جائے۔ دنیا میں موتیں بھی بدیوں کا باعث ہو جاتی ہیں۔ انسان ایک کام پورا نہیں کرنے پاتا، کہ مر جاتا ہے۔ بعد میں اس کام سے کوئی نیک نتیجہ نکلنے کی بجائے بُرے نتائج نکلنے لگتے ہیں۔ اس لئے فرمایا۔ دعا کرو کہ مرنے والوں کے ساتھ جو بدیاں تعلق رکھتی ہیں یعنی مرنے کے بعد جو پیدا ہو سکتی ہیں، اُن سے بھی بچائے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔ کہ اس نے مجھے یہ خوشخبری دی ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے کاموں کو پورا کرے گا۔ اور میرا انجام نہایت خوشکن ہوگا۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء میں اللہ تعالیٰ نے مجھے الہاماً فرمایا: ۔

مَوْتُ حَسَنٍ مَوْتٌ حَسَنٌ فِیْ وَقْتٍ حَسَنٍ

کہ حسن کی موت، بہترین موت ہوگی اور ایسے وقت میں ہوگی جو بہتر ہوگا۔ اس الہام میں مجھے حسن رضی اللہ عنہ کا بروز کہا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری ذات کے ساتھ تعلق رکھنے والی پیشگوئیوں کو پورا کرے گا۔ اور میرا انجام بہترین انجام ہوگا۔ اور جماعت میں کسی قسم کی خرابی پیدا نہ ہوگی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ کی تشریح کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ فَلَق کے متعدد معنے ہیں۔ اس کے معنے جہنم کے بھی ہیں۔ اس کے معنے لکڑی کے بھی ہیں جس میں قیدیوں کو جکڑا جاتا ہے۔ اور اس کے معنے اس دودھ کے بھی ہیں جو پیالہ میں تھوڑا سا رہ جاتا ہے۔ ان معنوں کے اعتبار سے مسلمانوں کو یہ دعا سکھلائی گئی ہے۔ کہ وہ ان حالات کی پناہ مانگیں۔ کہ جن سے قوم یا افراد جہنم میں جا پڑیں۔ اسی طرح وہ اُن اسباب سے محفوظ رہنے کی دعا مانگیں جن سے قید خانوں کا مُنہ دیکھنا پڑے۔ یا وہ اس بات سے پناہ مانگیں کہ ان سے قرآنی تعلیم اُٹھ جائے اور اُن کے پاس اس کا بہت تھوڑا سا حصہ رہ جائے پس یہ ساری حالتیں تنزّل کی ہیں اور تاریکی کے مشابہ ہیں۔ ان سب حالتوں سے بچنے کے لئے وَ مِنْ شَرِّ

غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ میں جامع دعا سکھائی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ اُمت مسلمہ کے ہر فرد کو یہ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ چین و آرام کے بعد جھگڑوں میں پڑنے اور حکومت کے بعد ماتحتی کی ذلت سے بچائے اور ایسے حالات سے محفوظ رکھے جن کی وجہ سے تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ کی تفسیر میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اس میں قومی دعا کے علاوہ فردی طور پر بھی کمال تک پہنچنے کیلئے دعا سکھائی گئی ہے۔ اس معنوں کے اعتبار سے مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کا یہ مفہوم ہوگا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ کے بعد جب ترقیات کا رستہ ملتا اور نور کا مینار روشن دکھائی دیتا ہے۔ اسوقت اگر اندھیرا ہو جائے تو وہ پہلی حالت سے بھی زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوتا ہے جیسے انسان جب روشنی سے یکلخت اندھیرے میں آ جائے تو اُسے کچھ نظر نہیں آتا۔ روحانی مراحل طے کرتے ہوئے اس قسم کی حالتیں مومن پر آتی رہتی ہیں۔ قرآن کریم سے بھی پتہ چلتا ہے کہ قبض اور بسط دونوں حالتیں مختلف اوقات میں مومن پر طاری ہوتی ہیں بعض دفعہ اسے یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا خدا تعالیٰ اُسکے ہاتھ میں ہے۔ یہ بسط والی حالت ہوتی ہے۔ دوسری حالت میں اُسے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جو نور اُسے نظر آیا تھا وہ غائب ہو گیا۔ کئی نادان ایسی حالت میں مایوس ہو جاتے ہیں اور عین کامیابی کے سرے پر پہنچ کر ناکام رہتے ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ جو کچھ انہیں نظر آیا وہ شاید نور نہیں تھا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ۔ کہ اے مسلم! تم دعا کرو۔ کہ اے خدا جب تیرا نور حاصل ہو جائے تو قبض کی حالت میرے لئے روحانی موت کا موجب نہ ہو جائے بلکہ موجب ترقی ہو اور کمال کو دیکھنے کے بعد میں زوال کو نہ دیکھوں اور حسرت کی موت سے نہ مروں۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ میں یہ مضمون بھی بیان ہوا ہے۔ کہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ کے حکم کے مطابق جب کامل توحید کو ماننے والا یہ اعلان کرتا ہے کہ مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ تو اس وقت مخالفت شروع ہو جاتی ہے۔ اور دوست دوستیاں چھوڑ دیتے ہیں اور ہمدرد بھی مخالف ہو جاتے ہیں گویا ایک قسم کی ظلمت چھا جاتی ہے اور اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ فرمایا۔ ایسے وقت میں میں اللہ تعالیٰ کی ہی پناہ چاہتا ہوں۔ اسی طرح سے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ میں کمال کے حصول کے لئے دعا سکھائی گئی تھی۔ اس کے بعد وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کا اس مضمون کے ساتھ یہ تعلق ہے کہ ایسا شخص یہ التجا کرتا ہے کہ کمال کے حصول کے دوران میں ان چیزوں کے بد اثر سے میری ذات کو بچا۔ جو غفلت کی حالت میں مجھے نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ اور بے خبری میں ناگہانی مجھ پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب مسلمانوں پر ظلمت اور تاریکی آنی ہی تھی تو پھر دعاؤں کی کیا ضرورت تھی۔ سو یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ان دعاؤں سے بے شک ساری قوم کلیتہً فائدہ نہ اٹھا سکی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مسلمانوں کی دعاؤں سے بیج کو ہر زمانے میں محفوظ رکھا اور ایسی چنگاری باقی رہتی چلی گئی جس سے ہر زمانے میں دوبارہ آگ روشن کی جا سکتی تھی پس محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالےٰ نے اس لئے دعائیں کرائیں کہ مسلمانوں کی ترقیات کے زمانہ میں اُمت کا جو حصہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے مناسبت رکھتا ہو۔ آپ کی دعاؤں کے طفیل بچ جائے اور آپؐ سارے زمانوں کے لئے شفیع ہو سکیں۔ چونکہ اس شر کا تعلق جس کے پھیلنے کی پیشگوئی مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کے الفاظ میں کی گئی تھی، ساری اُمت سے تھا۔ اس لئے پہلی صدی میں بھی جن لوگوں نے اپنی مناسبت کی وجہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں سے حصہ پایا۔ وہ گویا آپ کی شفاعت سے نجات پا گئے۔ اور اس طرح آپ اُن کے لئے بھی شفیع ہوئے۔ اسی طرح دوسری تیسری یا بعد کی صدیوں میں جو لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے مناسبت کی وجہ سے اس دعا کے باعث روحانی شرور سے بچ گئے۔

وہ آپ کی شفاعت کے مستحق ہو گئے۔ اور اس طرح ہر دور میں ایسے لاکھوں انسان جن کی دعائیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں سے مل گئیں وہ بچ گئے۔ اور باوجود اس کے کہ شر ترقی کرتا گیا اور وہ تاریکی کا زمانہ آگیا جو مقدر تھا۔ اور اس نے محمدی نور کو ڈھانپ لیا۔ اور اسلام سے مسلمانوں کا تعلق نام کا رہ گیا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشگوئی پوری ہو گئی۔ جس میں آپ نے فرمایا تھا۔ کہ

لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ
وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ
(مشکوٰۃ ۳۸ کتاب العلم)

کہ ایک زمانہ میں اسلام کا صرف نام باقی رہ جائیگا اور اس پر عمل نہیں ہو گا۔ اور اسی طرح قرآن کریم صرف تحریر میں باقی رہ جائے گا اور اس کے احکام پر عمل چھوڑ دیا جائے گا۔ پس ایسے وقت میں اللہ تعالےٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی بدولت اسلام کو بچانے کے لئے ایک فارسی الاصل انسان کو کھڑا کر دیا۔ جو قرآن کو پھر آسمان سے زمین پر لایا۔ اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کی راتیں روشن دنوں میں تبدیل ہو گئیں۔ پس محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعائیں ضائع نہیں ہوئیں اور نہ امت محمدیہ کے افراد کی دعائیں رائگاں گئیں بلکہ اللہ تعالےٰ نے ان دعاؤں کی وجہ سے ہی فیصلہ کیا۔ کہ آسمانِ اسلام پر ایک ایسا چاند طلوع کرے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چہرے کو اسی طرح سے دکھا دے گا۔ جس طرح چودھویں کا چاند سورج کو دکھاتا ہے۔

پھر یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ معوذتین کے بعد قرآن کریم ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ جیسا کہ مسلمانوں میں دستور ہے قرآن کریم کے خاتمہ کے بعد پھر شروع کی آیات پڑھی جاتی ہیں۔ تاکہ تسلسل قائم ہو جائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے شروع ہوتا ہے۔ اور یہ خدا تعالےٰ کی سنت ہے کہ ہر ترقی کے بعد زوال ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ہر رات کے بعد دن نکلے۔ اس لئے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اَعُوْذُ کے بعد دوبارہ سورج چڑھتا ہے۔ پہلے انبیاء کا سورج جب غروب ہوا تو پھر نئی اُمت قائم کی گئی ہے۔ مگر قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے۔ کہ اعوذ کے طفیل دوبارہ پھر حمد آجاتی ہے اور وہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے گویا اس میں بتایا گیا ہے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر چلنے والا پھر ترقی کرے گا۔ پھر یہ تمام دور اس پر گذریں گے اور پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اَعُوذ آڑے آئے گا۔ اور پھر **فلق محمدی** شروع ہو گا۔ یہ دو اَعُوذ جو قرآن کریم کے آخر میں رکھے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ سلسلہ محمدی ختم نہ ہو گا۔ پس یہ حکمت تھی آخر میں اَعُوذ رکھنے کی۔ باقی کتابوں کے شروع میں اَعُوذ تھا۔ اس لئے وہ ختم ہو گئیں۔ لیکن قرآن کریم کے شروع میں بھی اَعُوذ پڑھنے کا حکم ہے۔ اور آخر میں بھی اَعُوذ نازل کر دیا گیا ہے۔ اور ہر فردِ اُمت کو اسکے پڑھنے کا حکم ہے۔ گویا یہ بتایا گیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ ختم نہ ہو گا۔ بلکہ برابر چلتا رہے گا۔

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۝

اور (تمام) ایسے نفوس کی شرارت سے (بچنے کیلئے بھی) جو (باہمی تعلقات کی) گرہ میں (تعلق تڑوانے کی نیت سے) پھونکیں مارتے ہیں۔ ۵۵

۵۵ حل لغات:۔ اَلنَّفّٰثٰت:۔ اَلنَّفَّاثَةُ کی جمع ہے۔ جو نَفَثَ سے مبالغہ کا مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور نَفَثَ مِنْ فِیْهِ کے معنے ہیں رَمٰی بِهٖ۔ یعنی کسی چیز کو مُنہ سے پھینکا اور جب نَفَثَ الْجُرْحُ الدَّمَ کہیں۔ تو معنے ہوں گے اَظْهَرَهٗ۔ زخم سے خون نکل آیا۔ نیز نَفَثَ کے معنے ہیں بَزَقَ وَقِیْلَ بَزَقَ وَلَا رِیْقَ مَعَهٗ اَوْ هُوَ کَالنَّفْخِ وَاَقَلُّ مِنَ التَّفْلِ۔ یعنی اس نے تھوکا اور بعض اہل لغت کہتے ہیں۔ کہ نَفَثَ کا لفظ اس طور پر تھوکنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کہ مُنہ سے آواز تو نکلے لیکن تھوک نہ نکلے۔ یا جیسے مُنہ سے پھونک ماری جاتی ہو اور آواز نکلتی ہے۔ ویسے آواز نکلے۔ اور نَفَثَ فُلَانًا کے معنے ہیں سَحَرَهٗ۔ اس نے اس پر جادو کیا۔ اور جب نَفَثَتِ الْحَیَّةُ السَّمَّ کہیں تو معنے ہوتے ہیں نَکَزَتْ۔ سانپ نے زہر نکالا۔ اور نَفَثَ الْقَلَمُ کے معنے ہیں۔ کَتَبَ قلم نے لکھا۔ اور نَفَثَ اللّٰهُ الشَّیْءَ فِی الْقَلْبِ کے معنے ہوتے ہیں اَلْقَاهُ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں کوئی بات القاء کی (اقرب)

پس نَفّٰثٰت کے معنے ہوں گے۔ بہت تھوکنے والے گروہ یا نفوس (۲) زہر اگلنے والے گروہ یا نفوس (۳) دلوں میں وسوسے ڈالنے والے گروہ یا نفوس۔ (۴) بہت لکھنے والے گروہ یا نفوس۔

اَلْعُقَد:۔ اَلْعُقْدَةُ کی جمع ہے۔ اور اَلْعُقْدَةُ کے معنے ہوتے ہیں اَلْوِلَایَةُ عَلَی الْبَلَدِ۔ یعنی کسی شہر پر حکومت۔ نیز اَلْعُقْدَةُ کے معنے ہیں اَلضَّیْعَةُ۔ جاگیر۔ اَلْعِقَارُ الَّذِیْ اِعْتَقَدَهٗ صَاحِبُهٗ مِلْکًا اَیْ اِقْتَنَاهُ۔ وہ جائداد جس کو کوئی شخص اپنی ملکیت خیال کرتا ہے۔ نیز عقدہ کے معنے ہیں۔ مَوْضِعُ الْعَقْدِ۔ گرہ لگنے کی جگہ۔ اسی طرح اَلْعُقْدَةُ کے معنے ہیں مَا یُمْسِکُ الشَّیْءَ وَیُوْثِقُهٗ۔ گرہ۔ اَلْبَیْعَةُ الْمَعْقُوْدَةُ بِالْوُلَاةِ۔ وہ بیعت جو حکمرانوں کے ہاتھ پر کی جاتی ہے اس کو بھی عقدہ کہتے ہیں۔ اَلْمَکَانُ الْکَثِیْرُ الشَّجَرِ وَالنَّخْلِ وَالْکَلَاُ الْکَافِیْ لِلْاِبِلِ۔ اس جگہ کو بھی عقدہ کہتے ہیں جہاں بکثرت درخت، گھاس اور پانی ہو۔ جو اونٹوں اور دیگر جانوروں کے لئے کافی ہو۔ وَمَا فِیْهِ بَلَاغُ الرَّجُلِ وَکِفَایَتُهٗ وہ چیز جس پر انسان کا سہارا ہو نیز اَلْعُقْدَةُ کے معنے ہیں کُلُّ اَرْضٍ مُخْصِبَةٍ سر سبز زمین۔ وَالْعُقْدَةُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ وُجُوْبُهٗ وَاِحْکَامُهٗ وَاِبْرَامُهٗ۔ اور ہر چیز کی عقدہ اس کو کہیں گے جس کو پورا کرنا اور پختہ رکھنا ضروری ہو (اقرب)

مفردات میں ہے۔ اَلْعَقْدُ۔ اَلْجَمْعُ بَیْنَ اَطْرَافِ الشَّیْءِ۔ کہ عقد کے معنے دو چیزوں کی اطراف کو اکٹھا کر کے باندھنے کے ہیں۔ لیکن کبھی یہ لفظ مجازاً استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہر اس عہد اور امر کو عقد کہیں گے۔ جس کی خلاف ورزی نہ کی جا سکتی ہو یا جس کو کالعدم قرار نہ دیا جا سکتا ہے

پس وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ کے معنے ہوں گے (۱) میں پناہ چاہتا ہوں ان نفوس کے شر سے

جو دوستیوں اور معاہدات کو تڑوا دیں (۲) میں پناہ چاہتا ہوں اُن گروہوں کے شر سے جو خلفاء کا مقابلہ کروائیں اور اُن کی بیعت تڑوا دیں (۳) میں پناہ چاہتا ہوں اُن نفوس کے شر سے جو اتحاد کو برباد کرائیں اور مسلمانوں کی حکومتوں کو تباہ کرائیں۔

تفسیر:۔ جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے۔ کہ اَلْعُقَدُ کے معنے ہیں اَلْوَلَایَۃُ عَلَی الْبَلَدِ یعنی حکومت یا گورنری۔ اور اسی طرح سے اسکے معنے اَلْبَیْعَۃُ لِلْوُلَاۃِ کے بھی ہیں۔ یعنی حکام اور خلفاء کی بیعت۔ اور نَفَثَ فِی الْعُقَدِ ایک محاورہ ہے جس کے معنے تعلقات قطع کروانے کے ہیں۔ اہل عرب میں یہ قاعدہ تھا۔ کہ انقطاع تعلقات کے وقت گرہیں کھول کھول کر پھونک مارتے تھے۔ آج کل بھی جادو کرنے والے لوگ جدائی ڈلوانے کے لئے اس طرح کرتے ہیں۔ عربی میں کہتے ہیں فُلَانٌ یَنْفُثُ فِی الْعُقَدِ یعنی فلاں شخص تعلقاتِ محبت منقطع کرتا ہے۔ پس وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ میں یہ دعا سکھائی گئی ہے۔ کہ مسلمانوں کو ایسے لوگوں سے اللہ تعالیٰ کی حفاظت طلب کرنی چاہیئے جو تعلقات بیعت کو تڑوا دیں۔ اور مسلمانوں کے اتحاد میں رخنہ پیدا کر دیں۔

آیت زیر تفسیر سے پہلی آیات میں مسلمانوں کے تنزل کی پیشگوئی کی گئی تھی۔ اب اس آیت میں وجوہات تنزل میں سے ایک وجہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے۔ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اُمت محمدیہ کو ایک ہاتھ پر جمع کرنے کے لئے خلافت کا سلسلہ شروع ہوگا جس کی وجہ سے بہت سی برکات حاصل ہونگی لیکن مسلمانوں پر کچھ عرصہ بعد ایسا وقت آجائیگا۔ جبکہ اُن کی خلافت سے وابستگی کچھ عرصہ بعد ختم ہو جائے گی۔ اور اُن کے اندر لامرکزیت پیدا ہو جائیگی۔ راعی اور رعایا کے تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ اور اس کا باعث یہ ہوگا۔ کہ مسلمانوں کے مفتوحہ ممالک میں سے ہر ایک ملک میں ایسے گروہ پیدا ہوں گے جو اسلام کے دشمن ہوں گے اور نہایت ہوشیاری سے کام کریں گے۔ اور ایسے خیالات پھیلائیں گے جن کی وجہ سے کمزور مسلمانوں کے دلوں میں خلفاء کے خلاف بعض خیالات پیدا ہو جائیں گے۔ اور آخر ان کے تعلقات خلفاء سے ختم ہو جائیں گے حتیٰ کہ خلفاء پر حملے ہوں گے۔ اور مسلمانوں کے اندر انتشار پیدا ہو جائے گا۔ اور خلافت سے وابستگی ختم ہو کر لامرکزیت پیدا ہو جائے گی۔ اور مسلمانوں کا دن تاریک رات سے بدل جائے گا۔ ترقیات رُک جائیں گی۔ وہ آپس میں لڑ بھڑ کر جہنم پیدا کر لیں گے اور روحانیت اور پاکیزگی ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ وہ جڑیں جن سے یہ برکات حاصل ہوتی ہیں۔ ان کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق ہی ٹوٹ جائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دُعا سکھائی ہے کہ اُنکو ایسے وقت کے شرور سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنی چاہیئے۔

حل لغات میں جیسا کہ بتایا جا چکا ہے نَفَثَ کے معنے لکھنے کے بھی ہیں۔ اس لحاظ سے نَفّٰثٰت کے ایک معنے لکھنے والے نفوس یا گروہوں کے بھی ہوں گے۔ گویا ان معنوں کے اعتبار سے مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آخری زمانہ میں بڑی کثرت سے ایسا لٹریچر شائع کیا جائے گا۔ جو خدا اور اس کے رسول کے خلاف ہوگا اور جس کی وجہ سے

دنیا میں بڑا بھاری شر اور فتنہ پیدا ہوجائیگا اس فتنہ سے بچنے کے لئے یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ وہ آخری زمانہ جس میں بڑی کثرت سے خدا تعالیٰ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف لٹریچر شائع کیا جائے گا۔ اللہ تعالےٰ اُس کے شر سے ہمیں بچائے۔ اور ہمیں اپنی حفاظت اور پناہ میں رکھے۔ ضمنی طور پر اس سے یہ مراد بھی ہوسکتی ہے۔ کہ آخری زمانہ میں ایسا لٹریچر شائع کیا جائے گا جس میں حکومت اور رعایا کے تعلقات کو بگاڑنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۲) جیسا کہ آیات مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کی تفسیر میں بتایا جاچکا ہے۔ ان آیات میں اِن کمزوریوں سے بچنے کی بھی دعا سکھائی گئی ہے جو خلقی طور پر انسان میں ہوتی ہیں۔ تا وہ کمال کے حصول میں مانع نہ بن جائیں۔ اور ان خرابیوں سے بھی پناہ طلب کی گئی ہے جو بے وقت موت سے پیدا ہوجاتی ہیں۔ ابتدائی اور انتہائی خرابیوں سے پناہ کی دعا سکھانے کے بعد وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ میں زندگی کے درمیانی عرصہ میں جو خرابیاں پیش آجایا کرتی ہیں، اُن سے پناہ طلب کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے۔ کہ بعض اوقات پیدائش میں بھی کوئی نقص اور کمزوری نہیں ہوتی اور بے موقع موت بھی نہیں ہوتی۔ ہاں درمیانی زندگی کے ساتھ تعلق رکھنےوالی بعض کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اور ان کے بھی دو حصے ہوتے ہیں (۱) وہ حصہ جو پیدائش کے زمانہ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے (۲) وہ حصہ جو موت کے زمانہ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے پہلے حصہ کے متعلق فرمایا وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ یعنی انسان کی ابتدائی حالت یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ ماں سے ایسے ہی خوراک لیتا ہے جیسے پودا جڑ سے لیتا ہے۔ گویا ربوبیت کے لحاظ سے اس کا ماں باپ سے ظاہری تعلق ہوتا ہے۔ اور باطنی لحاظ سے خدا تعالےٰ سے تعلق ہوتا ہے۔ یعنی وہ رُوحانی طور پر خدا تعالےٰ کا فرزند ہوتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ ہی اُسے پیدا کرتا۔ خدا تعالےٰ ہی اس کی ربوبیت کرتا اور اُسے بڑھاتا ہے۔ آیت زیر تفسیر میں بھی اسی مضمون کی طرف اشارہ فرمایا کہ خدا تعالیٰ سے انسان کا تعلق اور عقد ایسا ہے۔ کہ تمام قوتیں اسی سے حاصل ہوتی ہیں اور نشو و نما پاتی ہیں۔ مگر کبھی ایسا ہوتا ہے۔ کہ بعض شریر لوگ خیالات میں وسوسے ڈال کر بندہ کو خدا تعالےٰ سے علیحدہ کروا دیتے ہیں اور نالائق بندہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ دیتا ہے۔ جس طرح دنیا میں نالائق بچے ماں باپ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اُن سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ اس لئے خدا تعالےٰ نے دعا سکھلائی۔ کہ کہو ایسا نہو کہ وہ گرہ جس سے ہم خدا تعالےٰ سے فیوض حاصل کرتے ہیں وہ ٹوٹ جائے۔ بلکہ ایسا ہو کہ میرا اللہ تعالےٰ کے ساتھ جو تعلق روحانی اب ہونے کے لحاظ سے ہے۔ وہ گرہ مضبوط رہے۔ تا ایسا نہو کہ جو غذا مجھے وہاں سے ملتی ہے وہ بند ہوجائے اور میں ہلاک ہو جاؤں۔ الغرض مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ میں خلقی کمزوریوں سے بچنے کی دعا سکھائی۔ اور مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ میں موت کے ساتھ تعلق رکھنے والی خرابیوں اور مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ میں زندگی میں پیش آنے والی ان باتوں سے جن سے دور ہوکر انسان

کمال سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور کمال حاصل کرنے کی طاقتیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔

(۳) قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ۔ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ میں ایک مسلمان کو یہ ہدایت تھی۔ کہ اگر وہ کامل توحید پر ایمان لایا ہے۔ تو اُسے اللہ تعالیٰ کی توحید کا اعلان ہر جگہ پر کرنا چاہیئے۔ اور اگر اس وجہ سے مخالفت کے طوفان اُٹھ کھڑے ہوں اور ہر طرف تاریکی چھا جائے۔ تو اُسے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ بلکہ ان مخالفتوں کے باوجود توحید کے جھنڈے کو بلند کرنا چاہیئے۔ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ میں یہ بتایا گیا ہے کہ کامل توحید کو ماننے والا جب یہ اعلان کریگا۔ کہ اب میں نے خدا سے تعلق قائم کر لیا ہے۔ تو کچھ دوست قائم رہیں گے اور کہیں گے تم نے بڑا اچھا کام کیا۔ جو اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کر لیا۔ مگر کچھ لوگ ایسے پیدا ہوں گے۔ جو ان حمایت کرنے والوں کو بدظن کرنے کی کوشش کریں گے اور چاہیں گے کہ دوست بھی دشمن بن جائیں۔ پس ایسے وقت کے لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ اے توحید کو ماننے والے تم یہ اعلان کر دینا۔ کہ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتا ہوں اُن لوگوں کے شر سے۔ جو میرے دوستوں کے دلوں میں وساوس پیدا کر رہے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ وہ تعلقات محبت توڑ کر میرے دشمن ہو جائیں۔ اور میرے راستہ میں مشکلات پیدا کریں۔

(۴) قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ میں کمال کے حاصل کرنے کی دعا سکھائی گئی ہے اور مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ میں یہ کہا گیا ہے۔ کہ یہ بھی دعا کرو کہ کمال کے بعد تم پر زوال نہ آئے۔ اور مصائب کا مُنہ نہ دیکھنا پڑے۔ اس کے بعد فرمایا وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ۔ ایسے وقت میں جب انسان مشکلات و مصائب میں مبتلا ہو کچھ لوگ ایسے کھڑے ہو جاتے ہیں جو گرے ہوئے کو گراتے اور اُسے اور زیادہ ذلیل اور رسوا کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اور جس وقت انسان مشکلات میں مبتلا ہو۔ اس وقت بعض لوگ اس کے رہے سہے تعلقات بھی بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اسے لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ یہ عام طور پر مشاہدہ میں آتا رہتا ہے۔ کہ گھر میں ذرا کسی بچہ پر ناراض ہوں تو دوسرے بچے جھٹ اس کے متعلق شکایتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ اماں جان اس نے فلاں موقع پر یہ شرارت کی تھی۔ کوئی کہتا ہے۔ ابا جان اس نے یہ بھی شرارت کی تھی۔ غرض جب کوئی گر جاتے اور ذلیل ہو جائے۔ تو جھٹ اس کی اور لوگ شکایتیں کرنے والے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پس ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے یہ دعا سکھائی ہے۔ کہ وہ لوگ جو تعلقات میں رخنہ ڈلوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ہی فضل ہو۔ تو انسان کے تعلقات اللہ تعالیٰ اور اس کے نیک بندوں اور رشتہ داروں اور حکمرانوں سے قائم رہ سکتے ہیں۔ کیونکہ انسان کو کچھ علم نہیں۔ کہ کس طرف سے وسوسہ اندازی ہو کر یہ تعلقات ختم ہو جائیں۔ اور ان میں رخنہ پڑ جائے۔

ع ۱ ۳۸

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝

اور ہر حاسد کی شرارت سے (بھی) جب وہ حسد پر تل جاتا ہے ۵۶

۵۶ **حل لغات:-** حَاسِدٌ۔ حَسَدَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اور حَسَدَ عَلَيْهِ حَسَدًا کے معنے ہوتے ہیں تَمَنّٰى زَوَالَ نِعْمَتِهٖ اِلَيْهِ۔ کہ اس نے یہ خواہش کی۔ کہ فلاں کو جو نعمت ملی ہو۔ اس سے چھن کر اس کو حاصل ہو جائے (اقرب)

پس حَاسِدٌ کے معنے ہوں گے۔ وہ شخص جو دوسرے کی نعمت کو دیکھ نہیں سکتا اور چاہتا ہے کہ اس کی نعمت چھن جائے اور اس کو مل جائے۔

تفسیر:- وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ میں تنزل کے اسباب میں سے ایک سبب کا ذکر کیا گیا تھا۔ اور بتایا گیا تھا۔ کہ اگر قومی شیرازہ بکھر جائے اور لامرکزیت آجائے تو قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے۔ کہ وہ دعا کرتے رہیں۔ کہ اللہ ایسے حالات سے بچائے۔ اور اگر ایسے حالات کبھی پیدا ہوں تو اُن کے بدنتائج سے محفوظ رکھے۔

اس مضمون کے بیان کرنے کے بعد اللہ تعالےٰ نے قومی تباہی کا ایک اور سبب بیان فرمایا ہے اور بتایا ہے۔ کہ بعض اوقات کوئی قوم اس وجہ سے تباہ ہو جاتی ہے۔ کہ کوئی بیرونی دشمن اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ جو نعمتیں مال کی فراوانی اور آرام و آسائش اس قوم کو حاصل ہوتی ہیں۔ وہ اس سے چھین لے اور خود اُن سے فائدہ اٹھائے۔ اگر ایسا دشمن ملک پر حملہ کرنے کے بعد غالب آجائے تو پھر ماتحت ملک کی ترقی ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جنت جہنم سے تبدیل ہو جاتی ہے اور اُسے مختلف قسم کے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پس وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ کے الفاظ کہہ کر دعا سکھائی۔ کہ اے مسلمانو! اللہ تعالےٰ نے جو تمہیں غلبہ دینا ہے۔ اور جس کے نتیجہ میں تمہاری ترقی کا سورج وسط آسمان میں چمکے گا اور تمہارا ملک جنت بن جائے گا۔ تم اس غلبہ کے متعلق دعا کرو کہ کوئی حاسد حملہ کر کے اس نعمت کو تم سے چھین نہ لے۔

الغرض اس سورۃ میں نہایت لطیف رنگ میں مسلمانوں کے غلبہ کی بشارت دی۔ اور پھر مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ تنزل اور اس کے اسباب کو مدنظر رکھیں اور دعا کرتے رہیں۔ کہ اللہ تعالےٰ انہیں اپنی حفاظت میں رکھے۔ اس مضمون کو ادا کرتے ہوئے مسلمانوں پر جس جس رنگ میں تباہی آنی تھی اس کا بھی ذکر کر دیا۔ تاکہ مسلمان وقت پر متنبہ ہو سکیں۔

(۳) پھر سورۃ الفلق میں یہ مضمون بھی بیان ہو رہا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ کی کامل توحید پر ایمان لانے والے کو صرف خدا تعالےٰ پر توکل کرنا چاہیئے۔ اور اس کی توحید کا ڈنکا ہر جگہ بجانا چاہیئے۔ اور اگر اس وجہ سے مخالفت کا طوفان اُٹھے یا ایسے لوگ اُٹھ کھڑے ہوں۔ جو عزیزوں۔ دوستوں۔ رشتہ داروں اور بیوی بچوں کو اُکسا کر خلاف کر دیں۔ تب بھی اُسے کسی کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ اس مضمون کے بیان کرنے کے بعد اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ۔ کہ جب انسان اس مقام پر پہنچ جائے۔ کہ وہ کسی کی پرواہ نہ کرے۔ تو اس کے

یہ معنے ہوں گے۔ کہ وہ حقیقۃً خدا تعالیٰ کا ہوگیا۔ اور وہ اپنے دعویٰ توکل میں سچا تھا۔ اور جب وہ اس مقام پر پہنچ جائے گا۔ تو اس کی اس ترقی کو دیکھ کر اس کے حاسد بھی پیدا ہو جائیں گے جو طرح طرح کے طعنے دیں گے۔ کوئی کہیگا کہ اتفاقاً ترقی کر گیا۔ کوئی کچھ کہے گا اور کوئی کچھ۔ ایسے وقت کے متعلق اللہ تعالےٰ نے یہ ہدایت دی۔ کہ اعلان کر دو۔ کہ مجھے اس وقت ایسے حاسدوں کی بھی کوئی پروا نہیں۔ میں اس وقت بھی اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور اُسی کی پناہ میں آتا ہوں کیونکہ وہ نہایت مہربان ہے اور اپنی ذات پر توکل کرنے والوں کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔

پھر سورۃ کی ابتدائی آیات میں رَبِّ الْفَلَقِ کے الفاظ استعمال کرکے کمال کے حصول کے لئے دعا سکھائی گئی تھی۔ اور پھر یہ بتایا گیا تھا۔ کہ یہ دعا کرو۔ کہ جب کمال حاصل ہو جائے۔ تو زوال کا وقت نہ آئے۔ اس کے بعد مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ کہہ کر بتایا ہے۔ کہ انسان کی دو ہی حالتیں ہوتی ہیں۔ یا ترقی یا تنزل۔ تنزل کے وقت یہ دیکھا گیا ہے۔ کہ جب انسان کمزور ہو جاتا ہے۔ تو کئی لوگ ایسے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جو اُسے اور دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جب ترقی ہو۔ تو حسد کرنے والے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غرض انسان کمزوری کی حالت میں ہو۔ تو اُسے اور زیادہ کچلنے والے موجود ہوتے ہیں۔ اور اگر بڑا بن جائے تو حسد کرنے لگ جاتے ہیں۔ پس کوئی حالت ایسی نہیں۔ جس میں انسان لوگوں کے شر سے محفوظ رہ سکے۔ اسے کمزوری میں بھی خطرہ ہے اور ترقی میں بھی خطرہ ہے۔ کمزوری کے وقت میں اسے اُن لوگوں سے خطرہ ہے۔ جنہیں اسباب میں مزہ آتا ہے۔ کہ وہ گرے کو گرائیں۔ اور مرے کو ماریں۔ اور ترقی کے وقت اسے اُن لوگوں سے خطرہ ہے جو حسد کرنے اور اُسے نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں غرض کسی حالت میں بھی انسان مامون نہیں۔ اور وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے خدا تعالیٰ کی مدد کی ضرورت نہیں۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ میں ایک وجود کے مبعوث ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جس کا نام احادیث میں مہدی اور مسیح رکھا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ وہ ایسے وقت میں آئے گا۔ جبکہ مسلمانوں کے اندر سخت تفرقہ ہوگا اور ان کا اتحاد باقی نہ رہیگا۔ ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ جس شخص کو دنیا کی اصلاح کیلئے کھڑا کریگا لوگ اسکی شدید مخالفت کرینگے اور اس پر حسد کرینگے۔ پس وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ میں یہ اشارہ بھی ہے کہ یہ دعا کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ جب ایسے شخص کو مبعوث کرے تو اسکے حاسدوں میں سے نہ بنیں۔ بلکہ اس کے معاونین و انصار میں سے ہو کر خدا تعالیٰ کے فضلوں کے وارث ہوں۔

وہ مضامین جو اس سورۃ کے خلاصۃً بیان کئے گئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ سورۃ اپنے مضمون کے لحاظ سے بہت اہم ہے اور اُمت مسلمہ کو بحیثیت قوم اور افراد کے ایک کامل دعا اس سورۃ کے ذریعے سکھائی گئی ہے۔ اور وہ اسباب جو قومی یا فردی طور پر تباہی کے پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان کو بیان کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ انسان جب تک خدا تعالیٰ کی حفاظت میں نہ آئے۔ اس دنیا میں خطرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ پس امن کا صحیح راستہ یہی ہے۔ کہ انسان ہر حالت میں اللہ تعالےٰ کے آستانہ پر جھکا رہے۔ اور اس کی حفاظت طلب کرے ؂

سُوْرَۃُ النَّاسِ مَدَنِیَّۃٌ

سورۃ الناس۔ یہ سورۃ مدنی ہے

وَہِیَ سَبْعُ اٰیَاتٍ مَّعَ الْبَسْمَلَۃِ

اور بسم اللہ سمیت اس کی سات آیات ہیں [1]

سورۃ الناس مدنی ہے [1]

[1] سورۃ الناس اُن سورتوں میں سے ہے جن کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ کہ ان کا نزول مکہ میں ہوا تھا یا مدینہ میں محققین کی رائے یہ ہے۔ کہ یہ سورۃ مدینہ میں نازل ہوئی تھی۔ لیکن چونکہ دونوں قسم کی روایات اس کے متعلق آتی ہیں۔ یہ بھی کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ اور یہ بھی کہ یہ سورۃ مدینہ میں نازل ہوئی تھی۔ اس لئے بجائے اس کے کہ ہم کسی ایک روایت کو لے لیں اور دوسری کو بلا وجہ چھوڑ دیں۔ ہم یہ کہیں گے۔ کہ یہ سورۃ یا تو مکہ اور مدینہ دونوں مقامات پر نازل ہوئی تھی۔ اور یا پھر مدنی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کا اختتام مدینہ منورہ میں ہوا تھا۔

قبل ازیں سورۃ الاخلاص اور سورۃ الفلق کی تفسیر میں یہ لکھا جا چکا ہے۔ کہ قرآن کریم کی آخری تین سورتیں مجموعی لحاظ سے قرآن کریم کا اسی طرح خلاصہ ہیں جس طرح کہ سورۃ فاتحہ قرآن کریم کا خلاصہ ہے۔

سورۃ الاخلاص اور سورۃ الفلق کا وہ مضمون جو سورۃ فاتحہ کے مضامین کے ساتھ مشابہ ہے۔ اس کو مفصل طور پر ان دونوں سورتوں کی تفسیر میں لکھا جا چکا ہے۔ سورۃ الناس میں رحمانیت رحیمیت اور مالک یوم الدین اور وَلَا الضَّآلِّیْنَ کا مضمون بیان ہوا ہے۔ چنانچہ

رَبِّ النَّاسِ اور اِلٰہِ النَّاسِ کے الفاظ رحمانیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ صفت رحمانیت گو بہت وسیع ہے جس کا تعلق تمام مخلوق کے ساتھ ہے مگر اس کا کمال صرف انسان سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے۔ کہ رحمانیت وہ احسان ہے جو بغیر عمل کے ہوتا ہے۔ اور گو ایسا احسان ہر مخلوق سے متعلق ہے لیکن اس کا کمال انسان سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ تمام مخلوق پر جو فضل نازل ہوتے ہیں۔ وہ ترقی کرتے کرتے انسانیت کے وجود میں ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ اور رحمانیت کی وسعت کا اظہار انسانیت میں ہی ہوتا ہے۔ اس کی وسعت اس سے ثابت نہیں ہوتی۔ کہ عمل نہیں کیا اور بدلہ مل گیا بلکہ اس سے ثابت ہوتی ہے کہ مخالفت کرنے والے پر بھی اللہ تعالیٰ احسان کرتا ہے۔ رحمانیت کی وسعت کا اظہار اس قدر بکری کی پرورش سے نہیں ہوتا۔ بیل یا گھوڑے کی پرورش سے نہیں ہوتا۔ بلکہ ابوجہل کی پرورش سے ہوتا ہے۔ کہ جس نے خدا تعالیٰ کا مقابلہ کیا۔ فرعون کی پرورش سے ہوتا ہے۔ جو خدا تعالیٰ کو گالیاں دیتا تھا۔ بے شک انسان بھی نیک سلوک کرتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رحمانیت دشمن پر بھی ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ (بنی اسرائیل ع ۲) یعنی ہم مومن اور کافر

سب کی مدد کرتے چلے جاتے ہیں وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (بنی اسرائیل ع۲) اور تیرے رب کی عطاء کسی فرقے اور قوم سے روکی نہیں گئی۔ پس رحمانیت کا مظہر کامل انسان ہی ہے۔ دیکھو ابو جہل نے کس طرح مخالفت کی۔ مگر اللہ تعالےٰ پھر بھی اس سے سلوک کرتا گیا۔ فرعون کس قدر مخالفت کرتا تھا۔ مگر پھر بھی اللہ تعالےٰ کی رحمانیت کا نزول اس پر ہوتا تھا۔ زندگی کا زمانہ تو الگ رہا ابو جہل اور فرعون کی مرتے وقت کی دعا بھی اللہ تعالےٰ نے قبول فرمائی۔ فرعون نے مرتے وقت ایمان کا اظہار کیا اور بالفاظ دیگر اپنی نجات کے لئے دعا کی۔ اللہ تعالیٰ کی رحیمیت کا تقاضا تھا۔ کہ یہ دعا قبول نہ ہو۔ مگر رحمانیت اس کی قبولیت کی متقاضی تھی۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا ہم تیرے بدن کو نجات دیتے ہیں۔ ابو جہل نے دعا کی تھی۔ کہ اے اللہ! اگر محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) سچا ہے۔ تو ہم پر پتھر برسا اور اللہ تعالےٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اچھا پتھر برسا دو۔ تو اللہ تعالےٰ نے اُن کی مرتے وقت کی دعائیں بھی قبول کیں۔ چاہے بیوقوفی سے انہوں نے ایسے وقت میں دعائیں کیں کہ وہ ان سے فائدہ نہ اُٹھا سکتے تھے۔ پتھر برسنے کے بعد بھلا ابو جہل کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ اور بدن کو نجات ملنے سے فرعون کو کیا فائدہ ہُوا؟ تو درحقیقت رحمانیت ایک لحاظ سے تو تمام مخلوق پر ظاہر ہوتی ہے۔ مگر ایک لحاظ سے انسان پر ہی اس کا اظہار ہوتا ہے۔ بیشک جانور اور کیڑوں مکوڑوں پر بھی رحمانیت کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر حقیقی اظہار رحمانیت کا اُس وقت ہوتا ہے جب ایک انسان خدا کو گالیاں دے رہا ہوتا ہے۔ مگر اُس وقت بھی اسکی زبان کو اللہ تعالےٰ خون پہنچا رہا ہوتا ہے۔ پس رحمانیت کا مظہر کامل انسان ہے۔

مَلِكِ النَّاسِ کی آیت صفت رحیمیت پر دلالت کرتی ہے۔ لمبا اور متواتر انعام دینا بادشاہ کا ہی کام ہے۔ مغلوں کی دی ہوئی جاگیریں آج بھی لوگ کھا رہے ہیں۔ بلکہ مغل تو قریب کے زمانہ میں ہی ہوئے ہیں۔ پٹھانوں کی دی ہوئی جاگیریں بھی آج تک لوگ کھا رہے ہیں۔ یہ بھی قریب کا زمانہ ہے۔ ہندوستان میں ایسے جاگیردار بھی ہیں۔ جنکو ہندو راجاؤں نے جاگیریں دی تھیں۔ اور جاگیردار پندرہ پندرہ سو اور دو دو ہزار سال سے ان جاگیروں کو کھا رہے ہیں۔ پس رحیمیت ملکیت کا ہی نظارہ ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام فرماتے ہیں۔ کہ میں جوان تھا۔ اب بوڑھا ہُوا۔ پر میں نے صادق کو ترک کئے ہوئے اور اس کی نسل میں سے کسی کو ٹکڑے مانگتے نہ دیکھا (زبور ۳۷- آیت ۲۵) گویا نیک بندے کی نسلوں کو اللہ تعالےٰ بھیک مانگنے سے بچاتا ہے پس مَلِكِ النَّاسِ کی آیت میں خدا تعالیٰ کی رحیمیت کی طرف اشارہ ہے۔

اِلٰهِ النَّاسِ - مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ آخری قبضہ معبود کا ہی ہوتا ہے۔ اس لئے اِلٰهِ النَّاسِ - مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ پر دلالت کرتا ہے۔ پھر اَعُوْذُ سے آخر تک ساری سورۃ وَلَا الضَّآلِّيْنَ سے تعلق رکھتی ہے یعنی اس کا مضمون بھی عیسائی فتنہ سے بچنے پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بحوالہ حدیث نبوی علیہ السلام فرمایا ہے کہ ضَآلِّيْنَ کا سب سے بڑا مظہر عیسائی ہیں۔ ضالّ اور مغضوب میں یہ فرق ہے۔ کہ مغضوب زور اور ڈنڈے سے منواتا ہے۔ اور ضالّ دلیل سے۔ جیسے عیسائی مشنری کہتے ہیں کہ عیسائیت بہت اچھا مذہب ہے۔ اسلام میں عورتوں پر سختی ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ خنّاس بنکر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝

(ہم ہر زمانہ کے مسلمان سے کہتے ہیں کہ) تو (دوسرے لوگوں سے) کہتا چلا جا کہ میں تمام انسانوں کے رب سے (اس کی پناہ) طلب کرتا ہوں

مَلِکِ النَّاسِ ۝ اِلٰہِ النَّاسِ ۝

(وہ رب جو) تمام انسانوں کا بادشاہ (بھی) ہے ۔(اور) تمام انسانوں کا معبود (بھی) ہے ۔ ۵۲

آتے اور وسوسے پیدا کرتے ہیں ۔بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے ۔کہ یہ ہمارے ساتھ کوئی سختی اور جبر نہیں کرتے ۔مگر وسوسے ڈالتے ہیں ۔خناس میں اسی طرف اشارہ ہے کہ کوئی چیز پیچھے ہٹ کر کام کرتی ہے ۔یورپ میں بیٹھا ہوا ایک فلسفی ہماری نظروں سے تو اوجھل ہے ۔مگر لوگ اس کی کتابیں پڑھ پڑھ کر خراب ہو رہے ہیں ۔وہ ہاتھ سے تو جبر نہیں کرتا ۔کسی کی گردن تو نہیں مروڑتا مگر یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ۔سینوں کے اندر وسوسے پیدا کرتا ہے ۔ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ ۔بڑوں کو بھی اور چھوٹوں کو بھی وہ متاثر کرتا ہے ۔چنانچہ یورپ سے امپیریلزم پر لکھی ہوئی جو کتابیں آتی ہیں اُنہیں پڑھ کر غرباء اسلام سے بدظن ہوتے ہیں کہ اس نے امراء کے حقوق کی زیادہ حفاظت کی ہے ۔پس یہ سب کچھ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ کا نظارہ ہے ۔

غرض سورۃ فاتحہ کا مضمون قرآن کریم کی آخری تین سورتوں میں دُہرا دیا گیا ہے ۔گویا جس بنیاد پر قرآن کریم کو شروع کیا گیا تھا ۔اُسی پر آ کر ختم کیا گیا ہے ۔

اس سورۃ کا دوسرا تعلق سورۃ لہب سے ہے ۔سورۃ لہب میں ایک دشمن اسلام کے پیدا ہونے اور اس کے انجام کا ذکر تھا ۔اس سورۃ میں اس دشمن کے متعلق بعض تفصیلات کا ذکر کیا گیا ہے ۔اور بتایا گیا ہے کہ وہ کن کن ذرائع سے اسلام پر حملہ آور ہو گا ۔

اس سورۃ کا تیسرا تعلق سورۃ الفلق کی آخری آیت سے بھی ہے ۔ سورۃ الفلق کی آخری آیت وَمِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ میں یہ بتایا گیا تھا کہ ایک عظیم الشان حاسد مسلمانوں کا پیدا ہونیوالا ہے اور یہ کہ مسلمانوں کو اس کے شر سے بچنے کے لئے دعا کرتے رہنا چاہیئے ۔ سورۃ الناس میں اس حاسد کے متعلق بتایا کہ وہ عیسائی قوم ہے ۔اور وہ اس اس طرح اسلام پر حملے کرے گی ۔

۵۲ تفسیر :۔سورۃ لہب کی تفسیر میں بتایا جا چکا ہے ۔کہ اس میں ایک ایسی قوم کے خروج کا ذکر ہے ۔جس نے آخری زمانہ میں اسلام پر حملہ کرنا تھا ۔اور یہ کوشش کرنی تھی کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ختم ہو جائے ۔ سورۃ الفلق کی آخری آیت وَمِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ میں بھی اسی قوم کے حملوں سے بچنے کی دعا اُمّتِ محمدیہ کو سکھائی گئی تھی ۔اور بتایا تھا ۔کہ

آخری زمانہ میں ایک طاقتور حاسد پیدا ہوگا۔ جو اس بات کا متمنی ہوگا۔ کہ نہ صرف یہ کہ وہ اسلامی حکومتوں کو ختم کرکے اسلامی ممالک پر قبضہ کرلے۔ بلکہ اسکی یہ خواہش بھی ہوگی۔ کہ اسلام کا نام لینے والا اس دنیا میں کوئی باقی نہ رہے۔ چونکہ اس قوم کو مادی طور پر ہر قسم کی طاقتیں حاصل ہونی تھیں۔ اور مسلمان بوجہ ضعف و کمزوری کے اس قوم کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہنے تھے۔ اس لئے اللہ تعالے نے مسلمانوں کو دعا سکھائی۔ کہ اس خطرناک فتنہ سے بچنے کیلئے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو۔ تا وہ ایسے اسباب پیدا کردے کہ اسلام نہ صرف اس دشمن کے حملوں سے محفوظ رہے بلکہ ضعف کے بعد اس پر پھر اس کی شان و شوکت کے دن آجائیں۔ سورۃ الناس کے ابتدا میں اللہ تعالےٰ نے کی تین صفات کا ذکر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے۔ کہ ان کے ذریعہ سے پناہ مانگو۔ چنانچہ فرمایا قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ مَلِكِ النَّاسِ۔ اِلٰهِ النَّاسِ۔ یعنی یہ کہو کہ اے خدا جو رب ہے لوگوں کا ہم تیری پناہ مانگتے ہیں۔ اے خدا جو بادشاہ ہے سب کا۔ ہم تیری پناہ مانگتے ہیں۔ اے خدا جو معبود ہے سب کا ہم تیری پناہ مانگتے ہیں اور یہ ظاہر بات ہے کہ جس چیز کی طرف نسبت دیکر پناہ مانگی جاتی ہے۔ دراصل اُسی چیز سے پناہ پانا مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں۔ اے کتے والے ہمیں بچا۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہہ رہے ہیں۔ کہ ہمیں کتے سے بچا۔ یا اگر ہم کسی ایسی جگہ جاتے ہیں جہاں کسی نے شیر پال رکھا ہو اور کہیں اے شیر والے دوڑیو! تو معلوم ہوگا کہ شیر سے بچنے کیلئے کہہ رہے ہیں۔ پس جب ہم رَبِّ النَّاسِ۔ مَلِكِ النَّاسِ۔ اِلٰهِ النَّاسِ کی پناہ مانگتے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ ہم ناس کی اُن خصوصیتوں سے پناہ مانگتے ہیں۔ جن کا تعلق ربوبیّت سے ہے یا اُن خصوصیتوں سے پناہ مانگتے ہیں جن کا تعلق ملکیت سے ہے۔ یا اُن خصوصیتوں سے پناہ مانگتے ہیں جن کا تعلق الوھیت سے ہے۔ ناس کی ربوبیت ڈیماکریسی کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور اس میں بھی بعض خرابیاں ہوتی ہیں اور ناس کی ملوکیت اقتدار سے ظاہر ہوتی ہے۔ جو کسی قوم کو دوسرے ملکوں پر ہوتا ہے۔ اور اس سے بھی کچھ خرابیاں ہوتی ہیں۔ اور ناس کی الوھیت اس عام غیر مذہبی رَو سے ظاہر ہوتی ہے۔ جو کسی لامذہب قوم میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جس کی وجہ سے اس سے کم ترقی یافتہ ملکوں میں بھی لامذہبیت کی رَو پھیل جاتی ہے۔

یہ ظاہر ہے۔ کہ رب۔ ملك اور اِلٰه کی صفات حقیقی طور پر اللہ تعالےٰ کی ہیں اور یہ صفات جب انسانوں کو حاصل ہوتی ہیں۔ تو بطور ظِل کے ہوتی ہیں۔ پس جب ہمیں رَبِّ النَّاسِ۔ مَلِكِ النَّاسِ اور اِلٰهِ النَّاسِ کے الفاظ کے ذریعہ پناہ طلب کرنے کا حکم ہوا۔ تو اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ انسانوں کی طرف سے بعض ایسی تکالیف پہنچنے والی تھیں۔ جو ربوبیت۔ ملکیت یا الوھیت کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں گویا بعض اقوام نے ان صفات سے ناجائز فائدہ اٹھاکر لوگوں کو اور خاص طور پر مسلمانوں کو نقصان پہنچانا تھا۔ اس لئے فرمایا۔ کہ چونکہ اصل رَب۔ مَلِك اور اِلٰه اللہ تعالےٰ کی ذات ہے اس لئے اس کو ان تینوں صفات کا واسطہ دے کر التجا کی جائے۔ کہ اے خدا تو نے جن لوگوں کو رب ملک اور اِلٰہ ظلّی طور پر بنایا ہے۔ اب وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور بجائے فائدہ پہنچانے کے

لوگوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ پس اب ایسے انسانوں کی ربوبیت۔ ملوکیت اور الوہیت سے خود ہی بچا۔

اب ہم حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ سورۃ الناس میں سارا نقشہ مغربی اقوام کا کھینچا گیا ہے۔ اور یہی وہ حاسد قوم ہے۔ جس کو مسلمانوں کی طاقت دیکھنا گوارا نہیں۔ اور وہ چاہتی ہے۔ کہ اسلام کا نام دنیا سے مٹ جائے۔ پس اس قوم کے پیدا کردہ فتنوں سے بچنے کیلئے مسلمانوں کو دعا سکھائی گئی ہے۔ اور دعا کے پہلے الفاظ یہ ہیں۔ کہ میں رب الناس کی پناہ چاہتا ہوں۔ صفتِ ربوبیت کے ماتحت تمام وہ چیزیں آتی ہیں جو انسانی ضروریات کہلاتی ہیں۔ اور جن کو ملک کی اقتصادیات کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ گویا قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ میں یہ اشارہ ہے کہ جب مسلمانوں کا حاسد نکلے گا تو سب سے پہلے ان کی اقتصادیات کو تباہ کریگا اور تجارت کو نقصان پہنچائے گا۔ وہ پہلے فوجوں سے حملہ نہیں کرے گا۔ بلکہ پہلا کام اُس کا یہ ہوگا۔ کہ تجارتی سامان لے کر اسلامی ممالک میں جائیگا۔ وہاں بنک وغیرہ کھولے گا اور اقتصادیات پر قابض ہو جائے گا۔ چنانچہ یوروپین اقوام ہر جگہ ابتداء میں اسی طرح پہنچی ہیں۔ پہلے تجارت کا سامان لے کر گئے اور آہستہ آہستہ اقتصادیات پر قبضہ کر لیا۔ سود پر روپیہ دیا اور اس طرح اسلامی حکومتوں کو کمزور کرتے رہے۔ گویا اسلام نے جو ربوبیت کا نظام قائم کیا ہے۔ اُسے اُس نے توڑ دیا۔ پس اللہ تعالےٰ نے اُن کے اس فتنے سے محفوظ رہنے کے لئے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ کے الفاظ سکھائے اور بتایا کہ اگر اُن کے شر سے بچنا چاہتے ہو تو اللہ تعالےٰ کی پناہ میں آنا۔

رَبِّ النَّاسِ کے بعد مَلِكِ النَّاسِ کے الفاظ سکھلائے۔ گویا اس میں یہ اشارہ کیا کہ مغربی اقوام کے اقتصادی فتنہ کے بعد ملوکیت کا فتنہ شروع ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ یہ اقوام پہلے تجارت کے ذریعہ سے ملکوں میں داخل ہوئیں اور پھر انہوں نے وہاں حکومتیں قائم کر لیں۔ مصر۔ افریقہ۔ ہندوستان وغیرہ سب اسلامی سلطنتوں کو انھوں نے اسی طرح قبضہ میں کیا۔ افریقہ میں پہلے پہل یہ لوگ کانچ کی چوڑیاں اور دانے ہاتھ تسبیح لے کر گئے۔ اور چونکہ یہ چمکدار چیزیں تھیں۔ وہاں کے جاہل لوگ اُسے قیمتی چیز سمجھ کر سونا اور ہیروں کے بدلے لیتے تھے۔ اور آخر کار یہ لوگ وہاں قابض ہو گئے۔ اور اسی طرح ہندوستان۔ ایران۔ عرب۔ ٹرکی وغیرہ مقامات پر بھی تجارتی کوٹھیاں قائم کر کے اپنا اثر و نفوذ قائم کیا اور پھر دوسرا قدم یہ تھا۔ کہ یہی بادشاہتیں قائم کر لیں۔ اور اس طرح اسلام کے سیاسی تمدن پر قابض ہو گئے

مَلِكِ النَّاسِ کے بعد اِلٰهِ النَّاسِ کے الفاظ رکھے گئے ہیں۔ اور اس میں یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ جب مغربی اقوام مختلف ممالک میں بادشاہتیں قائم کر لیں گی۔ تو ان کی طرف سے ایک اور فتنہ برپا ہوگا۔ یعنی مذہبی پروپیگنڈا شروع کر دیں گی۔ اور اس طرح مسلمانوں کا ایمان متزلزل کر دیں گی۔ اور نیا فلسفہ اور نئی تعلیم پیش کر کے مذہب کو برباد کرنیکی کوشش کریں گی۔ کالجوں وغیرہ میں تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں کے مذہبی عقائد کو کھوکھلا کر دیں گی۔ اور اس قسم کا لٹریچر شائع کریں گی۔ جس سے مذہب اسلام ایک غیر معقول مذہب نظر آئے اور لوگ اس سے متنفر ہوں۔

پس فرمایا۔ اے مسلمانو! جب تمہیں ان حالات سے دوچار ہونا پڑے۔ تو تم اس خدا کی پناہ چاہو۔

چور۔ ملک اور الٰہ ہے۔ یعنی یہ دعا کرو کہ اے
خدا صحیح ربوبیت۔ صحیح ملوکیت اور صحیح الوہیت جس کو
تُو دنیا میں رائج کرنا چاہتا اور پھیلانا چاہتا ہے اسکو
ختم کیا جا رہا ہے۔ پس تُو ایسا انتظام فرما۔ کہ یہ
فتنے مٹ جائیں اور پھر سے صحیح ربوبیت۔
صحیح مالکیت اور صحیح الوہیت دنیا پر قائم ہو جائے۔

(۲) سورۃ الفلق کی آیت وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ
اِذَا وَقَبَ میں یہ بتایا گیا تھا۔ کہ آخری زمانہ میں جب
اسلام ضعف کی حالت میں ہوگا۔ تو اللہ تعالےٰ
ایک ایسے وجود کو پیدا کرے گا۔ جو لوگوں کی اصلاح
کرے گا۔ اور اسلام کی کھوئی ہوئی عظمت واپس
لائے گا۔ اور اس کی صداقت کیلئے آسمانی نشانات
ظاہر ہوں گے۔ جن میں سے ایک سورج اور چاند کو
گرہن لگنے کا نشان ہے۔ سورۃ الناس میں بتایا۔
کہ اس زمانہ میں جب یہ مصلح پیدا ہوگا تین فتنے
نہایت ہی اہم ہوں گے۔

۱۔ اہلی فتنہ
۲۔ حکومت کا فتنہ
۳۔ مذہب کا فتنہ

یہ تینوں امور انسانوں کی ترقیات کا موجب
ہوتے ہیں۔ اور یہی تینوں امور انسانوں کی تباہی کا موجب
بھی بن جاتے ہیں۔ اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
فرماتے ہیں ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو فطرت اسلام پر پیدا ہوتا
ہے فَاَبَوَاہُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ
پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی بناتے یا نصرانی
بناتے یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

وہ ماں جو اپنے بچہ پر اپنی جان قربان کرنے
کے لئے تیار رہتی ہے۔ وہ ماں جو ساری رات اس
فکر میں جاگتی رہتی ہے۔ کہ کہیں اس کے بچہ کو
زکام نہ ہو جائے۔ جب وہ اُسے زکام سے بچانے
کے لئے اپنی نیند خراب کر رہی ہوتی ہے بُت پرستی
کے خیالات بھی اس کے دل میں پیدا کر کے اُسے
قتل کر رہی ہوتی ہے۔ وہ باپ جو روزی کمانے اور بچہ کے
مُنہ میں لقمہ ڈالنے کے لئے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے
سے بھی نہیں گھبراتا۔ وہ ہمیشہ کے لئے اس کی تباہی
کا موجب بن جاتا ہے۔ جب وہ اُسے ایسی تعلیمیں دیتا
ہے۔ جو اُسے خدا تعالےٰ سے دُور لے جانیوالی ہوتی
ہیں۔ وہ خاندان جو بچہ کی بیماری کی حالت میں اس کے
آگے پیچھے دوڑتا ہے۔ وہ قوم جو اس پر فخر کرتی اور
اس کے بنانے میں حصہ رکھتی ہے۔ وہی خاندان اور
وہی قوم بسا اوقات دینی معاملات میں اس کے لئے
تباہی کا موجب بن جاتے ہیں۔ یہی حال ملکیت کا ہے
وہی بادشاہ جو رعایا کی جان و مال اور اس کی عزت کی
حفاظت کرتے ہیں۔ وہی سلطنت جو رعایا کو آرام اور
سہولت پہنچانے کے لئے دن رات ایک کر دیتی ہے۔
بسا اوقات دین کے لحاظ سے رعایا کے لئے تباہی کا
موجب بن جاتی ہے۔ اسی طرح اِلٰہ النّاس سے بھی
تباہی آتی ہے۔ وہی مذہبی لیڈر اور راہنما جو بہتری
کی ہزاروں تجاویز سوچتے اور لوگوں کی برتری کے لئے
کوشاں رہتے ہیں۔ بسا اوقات جب ظاہر میں لوگوں
کی درستی کی تدابیر کر رہے ہوتے ہیں باطن میں وہ انہیں
تباہ کر رہے ہوتے ہیں۔ پنڈت۔ پادری اور دوسرے
مذہبی راہنما اپنی اپنی قوم کو بیسیوں اچھی باتیں بتاتے
اور اُن پر عمل کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ وہ انہیں کہتے
ہیں۔ جھوٹ نہ بولو۔ فریب نہ کرو۔ دھوکا نہ دو۔ قتل نہ کرو
خیانت نہ کرو۔ سچائی اور دیانتداری اختیار کرو۔ یہ سب باتیں
دنیا کے تمام مذہبی پیشوا بتلاتے ہیں لیکن جہاں وہ لوگوں کے
ایک حصہ کو درست کرنیکی کوشش کر رہے ہوتے ہیں وہیں وہ ان کے
دوسرے حصہ کو تباہ بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ جہاں یہ تعلیم دی جاتی ہے

کہ اگر کوئی تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے۔ تو تم دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دو۔ جہاں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ تم غریبوں کا بوجھ اٹھاؤ۔ اور مسکین اور نیک دل بن جاؤ۔ جہاں امراء سے چندے لے کر غرباء کی امداد کے لئے خرچ کئے جاتے ہیں۔ اور اس طرح نیک باتیں دنیا میں قائم کی جاتی ہیں۔ وہاں ساتھ ہی یہ کہہ کر کہ یسوع مسیح خدا کا بیٹا ہے۔ نیکی کی تمام تعمیر کو برباد کر دیا جاتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ مَلِكِ النَّاسِ۔ اِلٰهِ النَّاسِ۔ تو کہہ اے خدا دنیا میں بے شک ربوبیت کرنے والے ہیں۔ مگر ان کی ربوبیت دو دھاری تلوار کی طرح ہوتی ہے۔ جو ایک طرف اگر تیرے دشمن کو کاٹتی ہے۔ تو دوسری طرف میری گردن بھی اڑا دیتی ہے۔ اے خدا دنیا کے بادشاہ! میری جان، میرے مال، میری عزت اور میری آبرو کی حفاظت کرنے اور میری سہولت اور آرام کے لئے ہر قسم کی آسائشیں مہیا کرتے ہیں لیکن بعض دفعہ ان کی مخفی کوشش مجھے تباہ کر سکتی ہے اور مجھے تنزل میں گرا سکتی ہے اے خدا میرے لئے دنیا میں مذہبی پیشوا بھی ہیں جو ایک رنگ میں میرے لئے مطاع کی حیثیت رکھتے ہیں چنانچہ قرآن کریم میں اللہ فرماتا ہے کہ بعض لوگ اپنے مذہبی پیشواؤں کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ سمجھتے ہیں۔ اور وہ واقعہ میں بنی نوع انسان کی خدمت بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ اور دراصل کوئی مذہبی پیشوا ایسا نہیں ہوتا جو ترقی کی باتیں اپنی قوم کو نہ بتاتا ہو۔ لوگ ایسے بے وقوف نہیں ہوتے۔ کہ وہ کسی ایسے شخص کو اپنا مذہبی لیڈر اور مذہبی پیشوا بنا لیں۔ جو انہیں کوئی کام کی بات نہ بتاتے۔ مگر ان مذہبی پیشواؤں کی طرف سے بھی شر پہنچ سکتا ہے اور یہ انسان کو تباہ کر سکتے ہیں۔ لیکن کونسا ایسا رب ہے جس کی طرف سے خیر ہی خیر آتی ہے۔ شر نہیں آتا۔ کونسا ایسا ملک ہے جس کی طرف سے خیر ہی خیر آتی ہے۔ شر نہیں آتا۔ کونسا ایسا الٰہ ہے جس کی طرف سے خیر ہی خیر آتی ہے شر نہیں آتا۔ وہ صرف خدا تعالیٰ ہی ہے۔ پس فرمایا۔ تو کہہ۔ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ مَلِكِ النَّاسِ۔ اِلٰهِ النَّاسِ۔ میں اپنے تمام اہلی تعلقات سے نظر اٹھا کر میں اپنے بھائیوں اپنی بہنوں۔ اپنے ماں باپ اور اپنے دوسرے رشتہ داروں اور اپنی قوم سے نظر اٹھا کر اس خدا کی طرف آتا ہوں۔ جو ربّ النّاس ہے۔ میں حکومتوں کے بغیر دنیا میں گذارہ نہیں کر سکتا۔ مگر چونکہ مجھے ان کی طرف سے شر پہنچنے کا ہر وقت احتمال ہے۔ اس لئے میں اس بادشاہ کی طرف اپنی نظر پھیرتا ہوں۔ جس کے یہ سب اظلال ہیں۔ اور اس کی پناہ میں آتا ہوں۔ پھر مذہبی طور پر خدا تعالیٰ کے اظلال کہلانے والے بھی موجود ہیں۔ جن کو بعض لوگوں نے اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ بنا لیا ہے۔ مجھے ان سے فائدے پہنچتے ہیں مگر مضرتوں کا بھی امکان ہے۔ اس لئے میں اس کی طرف نظر اٹھاتا ہوں جس کی طرف سے خیر ہی خیر آتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس سورۃ کے اس مفہوم کو مدنظر رکھ کر دعا کیا کرے۔ تو نہ اُسے اہلی خطرات پیش آئیں نہ بادشاہت کا کوئی فتنہ اسے نقصان پہنچائے نہ مذہبی پیشواؤں کی وجہ سے کوئی ضعف پہنچے پس قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ مَلِكِ النَّاسِ۔ اِلٰهِ النَّاسِ میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ اگر حکومتیں تمہیں ڈرائیں۔ تمہاری بات نہ سنیں۔ تم پر ظلم کریں۔ تمہیں نقصان پہنچانا چاہیں۔ تو تم میرے دربار میں آؤ میں تمہارا اصل بادشاہ ہوں۔ اگر ملک یا قوم یا خاندان کی طرف سے تم پر ظلم کیا جاتا ہے۔ تو تم میرے دربار میں آؤ۔

میں تمہارا ربّ ہوں۔ اور تمہارا خاندان اور تمہاری قوم بھی میرے قبضہ میں ہے۔ اگر مذہبی پیشوا تمہیں گمراہ کرنا چاہیں۔ تو تم میرے دربار میں آؤ۔ کیونکہ میں تمہارا اِلٰہ ہوں۔ اور تمہاری ہدایت میرے ذمہ ہے اور اگر تم میرے پاس آؤگے۔ تو تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکے گا۔ نہ ربوبیت کی قسم کا۔ نہ ملکیت کی قسم کا۔ نہ الوہیت کی قسم کا۔ جس طرح مائیں اپنے بچوں سے کہتی ہیں۔ کہ کوئی تمہیں چھیڑے تو میرے پاس آجانا۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ یہ تعلیم دیتا ہے۔ کہ دیکھو میں تمہیں دنیا میں بھیج رہا ہوں۔ تمہارے اردگرد تمہارے بھائی بند ہوں گے۔ دوست۔ عزیز اور رشتہ دار ہوں گے۔ اہلِ قوم اور اہلِ ملک ہوں گے۔ اگر وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہیں۔ تو تمہیں گھبرانا نہیں چاہیئے بلکہ میرے پاس آنا۔ ان سے تمہیں خیر بھی پہنچ سکتا ہے اور شر بھی۔ لیکن اگر کبھی اُن سے شر پہنچے تو تم میرے پاس آنا۔ اسی طرح دنیا میں نظام قائم رکھنے کے لئے حکومتیں ہوں گی۔ اُن سے تمہیں خیر بھی پہنچ سکتا ہے اور شر بھی۔ لیکن اگر کبھی تمہیں ان سے شر پہنچے تو تم میرے پاس آؤ۔ پھر دنیا میں روحانی پیشوا بھی ہیں۔ ہوسکتا ہے۔ کہ وہ تمہاری تربیت تو کریں۔ مگر ایسے رنگ میں کہ بجائے فائدہ کے تمہیں نقصان پہنچا دیں۔ اور تمہاری روح کو کچل دیں۔ پس اگر یہ صورت ہو۔ تو بھی تمہیں گھبرانا نہیں چاہیئے۔ تمہارا اصل رُوحانی پیشوا میں ہوں۔ تم میرے پاس آجانا۔ پھر تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ الغرض آخری زمانہ میں ربوبیت۔ ملوکیت اور الوہیت کے ماتحت جو فتنے مخالفین اسلام کی طرف سے اُٹھنے والے تھے۔ اُن کے لئے اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ۔ اِلٰهِ النَّاسِ میں ایک جامع دعا امتِ محمدیہ کو سکھادی گئی ہے۔

(۳) سورۃ الفلق کی تفسیر میں یہ بتایا جاچکا ہے کہ اس سورۃ میں دوسرے مضامین کے علاوہ پیدائش موت اور زندگی کے زمانہ کی خرابیوں سے پناہ کی دعا سکھائی گئی ہے۔ اس کے مقابل پر سورۃ الناس میں خدا تعالےٰ کی تین صفات ربّ۔ ملکؔ اور الٰہؔ کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو انہی زمانوں سے تعلق رکھتی ہیں جن کا ذکر سورۃ الفلق میں کیا گیا ہے۔

پیدائش کی صفت کا تعلق ربّ سے ہے۔

موت کی صفت کا تعلق مَلِك سے ہے۔

اور زندگی کی صفت کا تعلق اِلٰه سے ہے۔

چنانچہ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ کے مقابل میں اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ رکھا اور مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کے مقابل میں مَلِكِ النَّاسِ رکھا اور مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ کے مقابل میں اِلٰهِ النَّاسِ رکھا ہے۔ یعنی تینوں حالتوں کے ساتھ تین صفات جو تعلق رکھتی ہیں۔ اُن کا ذکر سورۃ النّاس میں کیا گیا ہے پیدائش کے لحاظ سے انسان کا تعلق خدا تعالےٰ کی صفت ربوبیت سے ہوتا ہے۔ اور یہ حالت ہر وقت جاری رہتی ہے۔ کیونکہ انسان کی پیدائش بھی ہر وقت جاری رہتی ہے۔ انسان کھانا کھاتا ہے۔ تو اس لئے کہ اس سے خون بنے اور اس کی زندگی کا ذریعہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ پیدائش ہر وقت جاری رہتی ہے۔ گو نطفہ کے لحاظ سے پیدائش ہوچکی۔ مگر حقیقتاً ہر وقت ہوتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ سات سال تک انسان کا جسم بالکل بدل جاتا ہے۔ تو پیدائش ہر وقت جاری رہتی ہے۔ اس لئے خدا تعالےٰ سے ربوبیت کا تعلق بھی ہر وقت جاری رہتا ہے اور جس طرح زمانہ خلق انسان کے لئے تھا۔ اسی طرح

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۵ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِيْ

(میں اُس کی پناہ طلب کرتا ہوں) (ہر) وسوسہ ڈالنے والے کی شرارت سے جو (ہر قسم کے وسوسے ڈال کر آپ) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ (اور) جو انسانوں کے

يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝

دلوں میں شبہات پیدا کر دیتا ہے۔ خواہ وہ (فتنہ پرداز) مخفی رہنے والی ہستیوں میں سے ہو خواہ عام انسانوں میں سے ہو۔ ۵۳

ع ۱
۳۹

ربوبیت کی کیفیت بھی اس میں پائی جاتی ہے۔ اس لئے فرمایا قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ کہہ دے میں اُس رب کی پناہ مانگتا ہوں جس کی تمام انسانوں میں ربوبیت جاری ہے۔ اور ہر دم ایسے تغیرات انسان کے جسم میں ہو رہے ہیں۔ جو یا تو اُسے بدی کی طرف لے جاتے ہیں یا نیکی کی طرف۔ میں اس تغیر کرنیوالی صفت سے پناہ مانگتا ہوں۔ کہ وہ مجھے برائی کیطرف نہ لے جائے۔ بلکہ نیکی کی طرف لے جائے۔ پھر میں مَلِكِ النَّاس کی پناہ مانگتا ہوں۔ موت بھی انسان پر ہر وقت جاری رہتی ہے۔ پیشاب۔ پاخانہ۔ پسینہ ناخن۔ بال کیا ہیں جسم کے وہ اجزاء جو مردہ ہو جاتے ہیں۔ یہ عارضی اور جزوی موت ہے جو انسان پر آتی رہتی ہے۔ پس موت بھی جاری رہتی ہے۔ اس لئے مَلِكِ النَّاس کی پناہ مانگنے کے لئے کہا گیا۔ کہ جزاء سزا کی جو صفت جاری ہے اس کے متعلق پناہ مانگتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ ناکامی کا زمانہ آجائے بلکہ انعام ملتے رہیں۔ اور خدا کے فضل ہوتے رہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ان میں روک نہ واقع ہو۔

تیسری حالت یہ ہوتی ہے۔ کہ خود غرضی داخل ہو جاتی ہے۔ اور نیت خالص نہیں رہتی۔ اس کیلئے فرمایا۔ کہو اِلٰهِ النَّاس۔ میں اس خدا کی جو سب کا معبود ہے پناہ مانگتا ہوں۔ کہ میرے اپنے اندر کوئی فتور نہ پیدا ہو۔ اور اگر کبھی پیدا بھی ہو جائے تو یہ اس کی شان کے خلاف ہے۔ کہ مجھے وہ اپنی الوہیت سے نکل جانے دے۔ اس لئے اس صفت کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ اے خدا میرا تجھ سے تعلق قائم رہے۔ اور کبھی منقطع نہ ہو۔ پس قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ مَلِكِ النَّاسِ۔ اِلٰهِ النَّاسِ میں ان تینوں حالتوں کے متعلق پناہ مانگنے کی بھی دعا سکھائی گئی ہے۔

۵۳ حل لغات:۔ اَلْوَسْوَاسُ اِسْمٌ مِّنْ وَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ۔ وَسْوَاس۔ وَسْوَسَ فعل کا اسم ہے۔ اور وَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ کے معنے ہوتے ہیں حَدَّثَهٗ بِمَالَا نَفْعَ فِيْهِ وَلَا خَيْرَ۔ کہ اس کو وہ بات بتلائی جس میں کوئی نفع اور بھلائی نہیں۔ گویا وَسْوَاس کے معنے ہوں گے۔ وہ بات جس میں کوئی نفع اور بھلائی نہ ہو۔ نیز وَسْوَاس کے معنے ہیں۔ اَلشَّيْطَانُ شیطان هَمْسُ الصَّائِدِ وَالْكِلَابِ شکاری جب شکار کے لئے نکلتا ہے۔ تو وہ اونچی آواز نہیں نکالتا۔ بلکہ ایسی آواز نکالتا ہے جو بالکل نیچی ہو۔ اس آواز کو اور کتوں کی آواز کو وسواس کہتے ہیں۔ اَلْوَسْوَاسُ۔ اَيْضًا مَرَضٌ يَحْدُثُ مِنْ غَلَبَةِ السَّوْدَاءِ وَيَخْتَلِطُ مَعَهُ الذِّهْنُ۔ وسواس اس مرض کو بھی کہتے ہیں۔ جو سوداوی مادہ کے بڑھ جانے سے ہو جاتی ہے اور جس سے ذہن میں پراگندہ خیالات

آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ وَيُقَالُ لِمَا يَخْطُرُ بِالْقَلْبِ مِنْ شَرٍّ وَّ لِمَا لَا خَيْرَ فِيْهِ۔ وَسْوَسَۃٌ اور جو دل میں بُرے خیالات آتے رہتے ہیں جن میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ انکو بھی وسواس کہتے ہیں (اقرب)

اَلْخَنَّاسُ: خَنَسَ سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور خَنَسَ عَنْهُ کے معنے ہیں رَجَعَ وَتَنَحّٰى۔ اس کے پاس سے لوٹ آیا اور الگ ہو گیا۔ نیز خَنَسَ کے معنے ہیں تَاَخَّرَ۔ پیچھے ہٹ گیا۔ اِنْقَبَضَ کسی بات سے دل میں انقباض محسوس کیا۔ اور اگر یہ لفظ کھجور کے لئے استعمال کریں اور کہیں خَنَسَ النَّخْلُ تو معنے ہوں گے تَاَخَّرَتْ عَنْ قُبُوْلِ التَّلْقِيْحِ فَلَمْ يُؤَثِّرْ فِيْهَا وَلَمْ تَحْمِلْ فِيْ تِلْكَ السَّنَةِ۔ کھجور نے نر کے مادے کو قبول نہ کیا۔ اور اس وجہ سے پھلدار نہ ہوئی۔ اور خَنَسَ الشَّيْءَ عَنْكَ کے معنے ہیں سَتَرَهٗ۔ اس نے کچھ چھپا کر رکھا۔ اور جب خَنَسَ بَيْنَ اَصْحَابِهٖ کہیں تو معنے ہوں گے اِسْتَخْفٰى۔ وہ اپنے دوستوں کے درمیان چھپ گیا۔ خَنَسَ بِفُلَانٍ کے معنے ہیں غَابَ بِهٖ۔ اس کو لے کر غائب ہو گیا۔ خَنَسَ الْقَوْلَ کے معنے ہیں اَسَاءَهٗ۔ بات کو بُرا سمجھا۔ اور خَنَسَ اِبْهَامَهٗ کے معنے ہوں گے قَبَضَهَا۔ اپنے انگوٹھے کو دُہرا کیا۔ (اقرب) پس خنّاس کے معنے ہوں گے۔

(۱) بہت علیحدہ رہنے والا (۲) بہت پیچھے ہٹنے والا۔ (۳) اثر کو بالکل قبول نہ کرنے والا (۴) بات کو بہت چھپانے والا (۵) اپنے ساتھیوں میں چھپ جانے والا۔

اَلْجِنَّةُ: جَمَاعَةُ الْجِنِّ۔ یعنی جنوں کے گروہ اور ان کی جماعت کو عربی میں جِنَّة کہتے ہیں۔ اَلْجِنُّ۔ اَلْاِنْسُ کے مقابلے پر بولا جاتا ہے۔ اَلْجِنُّ کا لفظ جَنَّ سے ہے۔ اور مادہ کے اعتبار سے اس کے اندر پوشیدہ رہنے کے معنے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ جنین اس بچے کو کہتے ہیں جو رحم میں مخفی ہوتا ہے۔ اور جنان دل کو کہتے ہیں جو سینے میں مخفی ہوتا ہے۔ پس جِنّ کے معنے ہیں مخفی مخلوق۔ ہر وہ ہستی جو نظروں سے مخفی رہے۔ اس کو عربی میں جِنّ کہیں گے۔ اسی لحاظ سے جِنّ کا لفظ امراء پر بولا جاتا ہے۔ کہ وہ اپنے مکانوں میں بند رہتے ہیں۔ اور اُن تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے:

اَلْخَنَّاس ۵

تفسیر:۔ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ کے معنے ہیں۔ میں اس وسوسہ اندازی کرنے والے کے شر سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ جو وسوسہ ڈال کر پیچھے ہٹ جاتا ہے یا پوشیدہ رہ کر چھوٹے اور بڑے لوگوں کے دلوں میں وسوسہ پیدا کرتا ہے۔

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ کی آیت یا تو يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ کے ساتھ متعلق ہے۔ اور اس صورت میں معنے یہ ہوں گے۔ کہ وسوسہ اندازی کرنے والا لوگوں کے دلوں میں وساوس پیدا کرتا ہے اور وہ نہ چھوٹوں کو چھوڑتا ہے اور نہ بڑوں کو۔ بلکہ ہر ایک کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔

اسی طرح مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ کی آیت مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ سے بھی متعلق ہو سکتی ہے۔ اور اس صورت میں یہ معنے ہوں گے۔ کہ میں وسوسہ اندازی کرنے والوں کے شر سے پناہ چاہتا ہوں۔ جو وسوسہ ڈال کر خود پیچھے ہٹ جاتے ہیں یا پوشیدہ رہتے ہیں۔ اور ایسی ہستیاں چھوٹے لوگوں میں سے بھی ہیں اور بڑوں میں سے بھی۔ ظاہر میں بھی

اَلْجِنَّةُ ۱

نظر آتی ہیں اور پوشیدہ بھی ہیں۔

جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے۔ کہ جن کا لفظ اِنس کے مقابلہ پر بولا جاتا ہے۔ اور جن ان لوگوں کو کہتے ہیں۔ جو عام طور پر نظر نہیں آتے۔ یعنی اپنے گھروں میں بند رہتے ہیں۔ اور ان کی ڈیوڑھیوں پہ پہرے لگے رہتے ہیں اور وہ عوام سے نہیں ملتے۔ اور انس انکو کہتے ہیں۔ جن سے انسان آسانی سے مل سکتا ہے گویا جن کے معنے ہوں گے بڑے لوگ۔ اور انس کے معنے ہوں گے عوام الناس یا عوام الناس سے میل جول رکھنے والے لوگ اس حکمت کے ماتحت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں حکم دے دیا تھا۔ کہ کوئی گورنر اپنی ڈیوڑھی پر دربان مقرر نہ کرے۔ تاکہ لوگ آزادی سے اس تک پہنچ سکیں۔ تا اس کی انسانیت قائم رہے اور وہ افسر بن کر جن نہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ آخری زمانہ میں جب مغربی اقوام اسلام پر حملہ آور ہوں گی۔ اور مسلمانوں کی اقتصادیات کو تباہ کریں گی اور ان کے ملکوں پر قبضہ کرلیں گی۔ تو یہ سب کچھ دھوکہ اور مکاری سے ہوگا۔ اور ظاہر میں تو یہ کہیں گے۔ کہ ہم تہذیب سکھانے آتے ہیں۔ اور ہم چاہتے ہیں۔ کہ ان ملکوں میں علوم کی ترویج ہو۔ لیکن ان کا منشاء لوگوں کے دلوں میں وساوس پیدا کرنا ہوگا۔ تاکہ لوگ خدا اور اس کے رسول سے بدظن ہو جائیں۔ اسی طرح حکومت کریں گے۔ اور ظاہر یہ کریں گے۔ کہ ہم اہلِ ملک کے فائدہ کے لئے سب کچھ کر رہے ہیں۔ لیکن ان کا ارادہ یہ ہوگا۔ کہ کسی طرح یہ لوگ اپنے مذہب سے متنفر ہو کر ان کی تہذیب اور ان کے دین کو اختیار کرلیں۔ اور وہ کسی ایک کو نہیں۔ بلکہ ہر ایک کو متأثر کرنے کی کوشش کریں گے۔ خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ اور اُن کا حربہ اتنا کامیاب ہوگا۔ کہ آخر مسلمان اس سے متاثر ہوں گے۔ اور ان کا تمدن ختم ہو جائے گا۔

کئی شرارت کرنے والے ایسے ہوتے ہیں۔ کہ شرارت کرنے کے بعد سامنے کھڑے رہتے ہیں۔ مگر کئی شرارت کرکے ایسے مخفی ہو جاتے ہیں کہ ان کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ اور بعض پوشیدہ کارروائیاں کرتے رہتے ہیں۔ مغربی اقوام کا یہ خاصہ ہے کہ وہ سیاسیات اور دوسرے امور میں ہمیشہ ایسا طرزِ عمل اختیار کرتی ہیں۔ کہ جس کا دوسروں کو علم بھی نہیں ہوتا۔ اور دوسرا ملک تباہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مختلف کتابیں لکھتے ہیں اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ ہم علم پھیلا رہے ہیں لیکن یا تو اسلام سے نفرت پھیلاتے ہیں۔ اور یا دہریت۔ گویا اس طرح سے اپنے ملکوں میں بیٹھے دوسروں کو تباہ کرتے ہیں۔

وَسْوَاس کے ایک معنے صَوْتُ الْحُلِيِّ کے بھی ہیں۔ یعنی اس آواز کے جو زیوروں کی جھنکار سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ کے یہ معنے ہیں۔ کہ آخری زمانہ میں مغربی اقوام روپیہ کی لالچیں اور حرص دلا دلا کر لوگوں کو گمراہ کریں گی۔ اور پھر ساتھ ہی وہ خنّاس بھی ہوں گی یعنی ایسا نہیں ہوگا۔ کہ وہ کھلے بندوں دس ہزار روپیہ کسی کو اپنی ذاتی اغراض کے لئے دیں۔ بلکہ وہ اس طرح دیں گی کہ روپیہ بھی دوسرے کو پہنچ جائے۔ اور خود بھی چھپی بیٹھی رہیں۔ ایسے حالات میں ہر مومن کو یہ دعا کرنی چاہیئے۔ کہ الٰہی تو مجھے اُن کے فتنہ اور شر سے بچا۔

پھر یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ

وَالنَّاسِ میں بتایا۔ کہ یہ اقوام بعض دفعہ بڑے آدمیوں کے ذریعہ اور بعض دفعہ عوام الناس کے ذریعہ میرے دل میں روپیہ کی محبت پیدا کریں گی۔ یا یہ اقوام اتنی دولت مند ہوں گی۔ کہ اگر میں بڑا ہو جاؤں۔ تب بھی یہ مجھے لالچ دے سکیں گی۔ اور اگر میں عوام میں شامل رہوں تب بھی مجھے لالچ دے سکیں گی۔

اِن آیات میں یہ پیشگوئی بھی ہے کہ آخری زمانہ میں جو فتنے برپا ہوں گے۔ اُن میں آرگنائزیشن ہوگی یعنی ایک انتظام کے ماتحت یہ فساد ہوں گے۔ لوگ فرداً فرداً اس میں حصہ نہیں لیں گے۔ بلکہ دوسروں کو بھی اکسائیں گے۔ اور اپنے ساتھ ملائیں گے۔ جس کے دل میں کوئی خیال ہو گا۔ وہ اکیلا اس کے مطابق کام نہیں کرے گا۔ بلکہ دوسروں کو بھی اپنے ساتھ ملائے گا۔ آقا کی ملازمت ایک نوکر خود نہیں چھوڑیگا بلکہ دوسروں کو بھی کہے گا۔ کہ تم بھی چھوڑ دو۔ اسی طرح آقا دوسرے آقاؤں کو کہے گا۔ کہ اگر میں کسی ملازم کو اپنے کارخانہ سے نکالوں۔ تو تم بھی اُسے ملازم نہ رکھنا۔ آقا اپنی الگ مجلس بنائیں گے۔ اور نوکر الگ۔

اِسی طرح حکمران لوگوں کی علیحدہ تنظیم ہوگی۔ اور ماتحتوں کی الگ۔ اور ہر تنظیم دوسرے ملک کی تنظیم کے ساتھ تعلق رکھے گی۔

اسی طرح مذہب کے خلاف جو فتنے ہوں گے وہاں بھی انجمنیں ہوں گی۔ مثلاً یہ نہیں۔ کہ کوئی دہریہ ہو تو اپنے آپ کو ظاہر نہ کرے۔ بلکہ ان کی بھی انجمنیں ہوں گی۔ اور وہ علی الاعلان کہیں گے کہ خدا کا غلط عقیدہ لوگوں کے دلوں سے مٹانا ہمارا کام ہے۔ پہلے زمانہ میں دہریہ تھے۔ مگر وہ اپنے خیالات کو الگ الگ ظاہر کرتے تھے۔ کوئی ان کی انجمن نہ تھی۔ نہ وہ اخباریں اور ٹریکٹس شائع کرتے تھے۔ مگر اس زمانہ میں دنیا کے تمام ممالک میں ان کی انجمنیں پائی جاتی ہیں۔ پھر اسلام کے خلاف لڑنے والوں کی انجمنیں ہیں۔ اور تو اور مولویوں کو دیکھو۔ جو کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کی بھی انجمنیں ہیں۔ اور کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح پادریوں کی انجمنیں ہیں۔ اور وہ تنظیم کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ الغرض یہ وہی پیشگوئی ہے۔ جو سورۃ الناس کی آخری آیات میں بیان ہوئی ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اس سورۃ کے ابتداء میں خدا تعالےٰ کی تین صفات کا ذکر تھا۔ جو انسانی تین حالتوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ یعنی پیدائش۔ زندگی اور موت کے ساتھ۔ اور یہ بتایا گیا تھا۔ کہ تمہیں دعا کرنی چاہیئے۔ کہ ہر حالت میں تمہارا تعلق خدا تعالےٰ کی ان صفات کے ساتھ رہے۔ اور کبھی منقطع نہ ہو۔ اب مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ میں ان وسوسوں کی طرف اشارہ کیا۔ جو تینوں زمانوں کے متعلق پیدا ہو کر خدا تعالےٰ سے تعلق منقطع کرا سکتے ہیں مثلاً کبھی یہ خیال آسکتا ہے۔ کہ پیدا کرنے والا ہی کوئی نہیں کبھی یہ خیال آسکتا ہے۔ کہ انسان کے پیدا کرنے کی کوئی غرض ہی نہیں۔ کبھی انسان کہتا ہے۔ کہ کوئی ایسی ہستی نہیں۔ جو جزا یا سزا دے کبھی الوہیت کے متعلق وسوسہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ خدا تعالےٰ کو عبادت کی کیا ضرورت ہے۔ اس طرح قسم قسم کے وساوس پیدا ہو کر خدا تعالےٰ سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے وساوس مختلف وجوہات کی بناء پر پیدا ہو سکتے ہیں۔ کبھی مخفی ہستیوں سے کبھی بد روحوں سے۔

کبھی ایسی بیماریوں سے۔ جن میں انسان مبتلا ہو کر شبہات اور شکوک کا شکار ہو جاتا ہے۔ کبھی ایسے مکانات اور جگہوں سے جہاں شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسانوں میں سے بھی ایسے ہوتے ہیں۔ جو شبہات ڈالتے ہیں۔ پس ان سب امور سے محفوظ رہنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے دعا سکھائی کہ ہر وہ امر جو شبہات پیدا کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔ میں اس سے بچنے کے لئے اللہ تعالےٰ کی پناہ میں آتا ہوں۔ اور یہ چاہتا ہوں۔ کہ میرا خدا تعالےٰ کی ربوبیت۔ ملکیت اور الوہیت سے تعلق رہے میری ابتدا بھی اچھی ہو۔ انتہا بھی اچھی ہو اور میری زندگی کی ہر تبدیلی بھی اچھی ہو۔ پس ان آیات میں ایک جامع دعا سکھائی گئی ہے۔

سورۃ الناس قرآن کریم کی آخری سورۃ ہے۔ اور جب انسان سارا قرآن کریم پڑھ لیتا ہے۔ تو اس کے دل میں گھمنڈ پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ اب تو میں نے سارا قرآن پڑھ لیا۔ اور اب میں شیطان سے محفوظ ہو گیا ہوں اور کوئی ٹھوکر نہیں کھا سکتا اس قسم کے خیالات چونکہ تباہ کرنے کا موجب ہو سکتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم کے آخر میں فرمایا۔ کہ اے بندے جسے اب قرآن کریم پڑھنا اور اسے ختم کرنا نصیب ہوا ہے تو یہ نہ سمجھ کہ تو شیطان کے پنجہ سے محفوظ ہو گیا ہے۔ بالکل ممکن ہے۔ کہ رب العالمین خدا کو دیکھ کر اور اس کی اس صفت کا اپنے آپ کو مورد پا کر تو ٹھوکر کھا جاتے۔ خدا کے فضل ہر انسان پر ہر گھڑی نازل ہو رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو۔ کہ جب قرآن پڑھ کر خدا کے فضلوں کی طرف تیری توجہ ہو اور اس وقت خدا کی ربوبیت تیرے لئے ظاہر ہو۔ تو تُو گھمنڈ میں آجائے۔ اور اس طرح ٹھوکر کھا جائے یاد رکھو کہ خدا رب الناس ہے۔ اس کے فیوض معمولی سے معمولی انسان پر بھی ہو رہے ہیں۔ تجھ پر اگر کوئی فضل نازل ہوتا ہے۔ تو اس وجہ سے کوئی گھمنڈ نہ کر۔ اور ٹھوکر نہ کھا۔ بلکہ سمجھو کہ جب تیرے دل میں خدا کی برکت اور فیض حاصل کرنیکی تڑپ پیدا ہوئی۔ تو خدا نے اپنی صفت ربوبیت کے ماتحت تجھ پر کچھ نازل کر دیا۔ ہو سکتا ہے۔ کہ اس وقت تک تیرے اندر پوری پاکیزگی نہ پیدا ہوئی ہو۔ پس تجھے دعا کرنی چاہیئے۔ کہ میں اس خدا سے پناہ مانگتا ہوں جو سب کا رب ہے۔ اور کہتا ہوں۔ اے خدا جب تو میری حالت ناقص ہونیکی وجہ سے مجھ پر ناقص نعمتیں نازل کرتا ہے۔ اور اس طرح ہمیشہ کے لئے نیک انجام ہونا مشکل ہے۔ اس لئے میں تجھ سے ہی التجا کرتا ہوں۔ کہ تو مجھ پر حقیقی رحمتیں نازل فرما۔ اور ہر قسم کی ٹھوکروں سے بچا۔

پھر بعض قرآن کریم پڑھنے والے ایسے ہوتے ہیں۔ کہ جب قرآن کریم ختم کر لیتے ہیں۔ تو اُسوقت ان کی ایسی حالت ہوتی ہے۔ کہ وہ خدا تعالےٰ کے نوکروں اور خادموں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ گویا اتنی نیکی ان میں پیدا ہو جاتی ہے کہ جس طرح سرکاری افسر ہوتے ہیں۔ اسی طرح کا درجہ انہیں مل جاتا ہے۔ ان کی عام حالت نہیں رہتی۔ اُس وقت بھی ٹھوکر کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہو مَلِكِ النَّاسِ۔ اے خدا یہ بھی نہ ہو۔ کہ جب مجھ پر تیرے ایسے فضل نازل ہوں۔ جیسے افسروں پر بادشاہ کے ہوتے ہیں۔ تو اُس وقت میں یہ سمجھ لوں۔ کہ میں بھی کچھ بن گیا ہوں۔ اور اس طرح تجھ سے دُور ہو جاؤں۔ اس لئے

میں تجھ سے ہی پناہ مانگتا ہوں۔ کہ تو اپنی بادشاہت کو کارفرما کر اور میری اصلاح کر۔ اور جس طرح تو چاہتا ہے۔ کہ تیری رعایا کے ساتھ سلوک کیا جائے۔ اُسی قسم کے سلوک کی مجھے توفیق بخش تا میں مغرور ہو کر ظالم اور متمرد نہ بن جاؤں۔

پھر افسر اور بادشاہ کے تعلقات محدود ہوتے ہیں بہ نسبت خالق و مخلوق کے تعلقات کے۔ خالق و مخلوق کے تعلقات غیر محدود ہوتے ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے۔ کہ قرآن کریم کا پڑھنے والا اللہ تعالےٰ کے عباد میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس وقت دوسروں کی نسبت اس پر زیادہ فیض نازل ہونے لگتے ہیں اس وقت بسا اوقات وہ سمجھتا ہے کہ میں بہت بڑا انسان ہو گیا ہوں۔ اس وجہ سے اس تعلیم سے روگردان ہو جاتا ہے۔ جس کے ذریعہ اُسے یہ درجہ ملا تھا۔ اور اس طرح خدا تعالیٰ کے فضل سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ میں اِلٰہِ النَّاسِ کی پناہ چاہتا ہوں۔ کیونکہ ممکن ہے۔ کہ قرآن پڑھ کر تم اتنے قریب پہنچ جاؤ۔ کہ خدا کے عبد بن جاؤ۔ اور عبداللہ کہلاؤ مگر ہو سکتا ہے۔ کہ اس وقت تمہیں یہ خیال پیدا ہو۔ کہ ہم بہت بڑے بن گئے ہیں۔ اس لئے دعا مانگو۔ کہ الٰہی ہم تجھے معبودیت کا ہی واسطہ دیکر کہتے ہیں۔ کہ اس وقت بھی تجھ سے روگردان نہ ہو جائیں۔ بلکہ ہمیشہ اپنے عبد ہی بنائے رکھنا:

کلیدِ مضامین

مرتبہ

سید عبدالحی

اشاریہ

جلد دہم

کلیدِ مضامین

جلد دہم

ا

عقاید

عبادات

دوسرے مذاہب سے موازنہ

نظریۂ حکومت

بین الاقوامی تعلقات

ن

اللہ تعالیٰ

اسمِ ذات

صفاتِ باری تعالیٰ

دوسرے مذاہب میں اللہ کا تصور

الہام نیز دیکھئے عنوان وحی

الہامات حضرت مسیح موعود علیہ السلام

ب

ت

ٹ

عقائد

ذمہ داریاں اور فرائض

ح

ذ

ر

ژ

ض

ط

کو

محاورات و امثال

غ

ف

معجزہ

معراج

مقربانِ الٰہی

ملّت

مومن

مہدی

ہ

ن

نبوت

خاتَم النبیین

نبی موعود صلی اللہ علیہ وسلم

ؤ

اسماء

جلد دوم

آ

ا

آپ کی دعائیں اور ان کی قبولیت

وفات

خُلقِ عظیم

عبادت

صداقت

الہامات۔کشوف و رؤیا

مقامات

ب

ش

ف

ق

قبل از اسلام

بعد از اسلام

ن

حَلُّ اللُّغات

ا

اَلْاَبُ ۴۹۸
اَبَابِيْلُ ۷۵
اَبْتَرُ ۳۶۷
اَحَدٌ ۵۲۰
اَرَئَيْتَ ۱۴۹
اِسْتَغْفِرْ ۴۷۷
اَعُوْذُ ۵۴۲
اَغْنٰى عَنْهُ ۵۰۰
اَفْوَاجٌ م فَوْجٌ ۴۷۷
اَللّٰهُ ۵۲۰
اَلَمْ تَرَ ۱۷
اِنَّا ۲۴۴
اِنْحَرْ ۳۶۳
اِيْلَافُ ۸۰،۸۸

ب

بَاءٌ ۷۶

ت

تَابَ يَتُوْبُ ۴۸۹
تَبَّ يَتُبُّ ۴۹۸
تَبَّتْ ۴۹۸
تَضْلِيْلٌ ۷۵
تَوَّابٌ ۴۸۹

ج

اَلْجِنَّةُ ۵۸۵
جِيْدٌ ۵۱۰

ح

حَاسِدٌ ۵۷۴
حَدَبٌ ۵۰۲
حَضَّ يَحُضُّ ۲۲۱
اَلْحَطَبُ ۵۱۰

خ

خَاتَمٌ ۳۷۴
اَلْخِلَافَةُ ۴۴۲
خَلِيْفَةٌ ۴۴۴
اَلْخَنَّاسُ ۵۸۵

اَلْخَيْرُ ۲۴۹

د

دَجَّالٌ ۵۰۲
دَعَّ يَدُعُّ ۲۱۳
اَلدِّيْنُ ۱۴۹،۲۱۵،۴۴۲

ذ

ذَنْبٌ ۴۸۳

ر

رَاءَ يُرَاءُ ۲۲۴
رَاَيْتَ ۴۷۶
رَجُلٌ ج رِجَالٌ ۳۰۱

س

سَبِّحْ ۴۷۷
سِجِّيْنٌ ۷۶
اَلسُّلْطَانُ ۴۴۴
سَهَا يَسْهُوْ ۲۲۳
سِيْرَةٌ ۴۵۲

ص

اَلصَّمَدُ ۵۲۸
صَلّٰى يُصَلِّىْ ۵۰۹
صَلٰوةٌ ۳۶۳

ض

ضَلَّلَ يُضَلِّلُ ۷۵

ع

عَاذَ يَعُوْذُ ۵۴۲
اَلْعُقَدُ م اَلْعُقْدَةُ ۵۷۰

غ

غَاسِقٌ ۵۶۳
غَفَرَ يَغْفِرُ ۴۷۷

ف

اَلْفَتْحُ ۴۷۱
اَلْفَلَقُ ۵۴۲
فَوْجٌ ج اَفْوَاجٌ ۴۷۷

BIBLIOGRAPHY

تفسیر

الاتقان للسیوطی ۳۹۴، ۴۹۲، ۵۱۲، ۵۳۵

تفسیر البحر المحیط للعلامہ محمد بن حیان ۲۲۵، ۳۹۳، ۴۰۳

تفسیر الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۳۸۸، ۳۹۲

جامع البیان للعلامہ ابن جریر طبری

۳۶، ۳۷، ۴۷، ۳۹۲

تفسیر روح البیان للشیخ اسماعیل حقی بروسوی

۳۹۲، ۴۰۳، ۴۶۲، ۴۶۴، ۵۱۶

تفسیر روح المعانی للعلامہ آلوسی

۴۷، ۳۹۲، ۴۰۳، ۴۶۱، ۴۹۵، ۵۳۸

السراج المنیر ۹۷، ۱۱۶

تفسیر فتح البیان ۲۳۳، ۲۳۴، ۴۶۱، ۵۱۲، ۵۱۶

فتح القدیر علامہ شوکانی ۳۹۲، ۴۹۱، ۴۹۲، ۵۱۴

تفسیر کبیر للامام فخر الدین رازی ۴۰۴، ۴۹۴، ۵۱۹

تفسیر الکشاف للزمخشری ۳۹۳، ۴۰۳

کنکڑی آن قرآن پادری دہیری ۷۸، ۴۶۶، ۵۱۲

حدیث

جامع صحیح بخاری ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۸، ۲۳۹

۲۴۰، ۳۱۴، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۵۳، ۳۵۵

۳۵۹، ۴۵۵، ۴۶۳، ۵۱۷، ۵۳۹

صحیح مسلم ۲۳۳، ۳۱۴، ۳۸۵، ۴۰۵، ۴۵۱، ۵۰۱

جامع صحیح الترمذی ۲۸۳، ۲۸۴، ۵۰۱، ۵۱۷

سنن ابی داؤد ۳۹، ۳۱۱، ۳۱۴، ۳۹۱، ۴۵۱

۵۰۱، ۵۱۷، ۵۳۹

کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام وخلفاء سلسلہ

تاریخ وسیرت

اسلامیات

ادب

لغت

ہندو مذہب

عیسائیت

اخبارات و رسائل

انڈکس کی تیاری میں معاونت

۱۔ فضل کریم صاحب تبسم شاہد

۲۔ طاہر محمود احمد صاحب شاہد

حرفِ آخر و عرضِ دُعا

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کی تحریر فرمودہ تفسیر کبیر جو ۱۹۴۰ء سے ۱۹۶۲ء تک ۲۳ سال کے عرصہ میں قادیان، لاہور اور ربوہ سے گیارہ جلدوں میں طبع ہوئی تھی باوجود انتہائی نامساعد حالات کے موجودہ ایڈیشن کی دس جلدوں میں بتمام وکمال طبع ہوگئی ہے۔ الحمد للہ

احبابِ جماعت سے درخواست ہے کہ وہ ان تمام کارکنوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں جنہوں نے اِس نادرِ روزگار تفسیر کی طباعت و اشاعت کے مختلف مراحل میں کام کیا ہے۔

ایڈیشن اوّل کے جملہ کوائف ریکارڈ کو محفوظ کرنے کے لئے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

والسلام

خاکسار

سیّد عبد الحی

موجودہ اور سابقہ ایڈیشن کے متعلق ضروری کوائف

موجودہ نمبر	سابقہ نمبر	نام سورتہائے	کوائف
جلد اوّل	جلد اوّل جزء اوّل	سورۃ الفاتحہ سورۃ البقرہ پہلے نو رکوع	تاریخ اشاعت ۲۳ مئی ۱۹۴۸ء ۔ تعداد تین ہزار ۔ فہرست مضامین مرتبہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب انور۔ باہتمام مولوی ابوالمنیر نورالحق صاحب فاضل۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب انور وکیل الدیوان تحریکِ جدید نے ضیاء الاسلام پریس قادیان میں چھپوا کر صیغہ تحریکِ جدید لاہور پاکستان سے شائع کی۔ (صرف ٹائیٹل اتحاد پریس لاہور میں چھپا) ۔
جلد دوم	جلد اوّل جزء دوم	سورۃ البقرہ کے دسویں رکوع سے آخر تک ۔	تاریخ اشاعت ۳، دسمبر ۱۹۶۲ء پیش لفظ از حضرت مولانا جلال الدین صاحب شمس فہرست مضامین مرتبہ حضرت مولوی عبداللطیف صاحب بہاولپوری مطبوعہ ضیاء الاسلام پریس ربوہ ناشر الشرکۃ الاسلامیہ لمیٹڈ۔ ربوہ
جلد سوم	جلد سوم	یونس ، ہود ، یوسف ، الرعد ، ابراہیم ۔	تاریخ اشاعت دسمبر ۱۹۴۰ء ۔ تعداد دو ہزار پیش لفظ حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ فہرست مضامین مرتبہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب انور پرنٹر و پبلشر بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانی مطبوعہ ضیاء الاسلام پریس قادیان
جلد چہارم		الحجر، النحل، بنی اسرائیل، الکہف	

موجودہ نمبر	سابقہ نمبر	نام سُورتہائے	کوائف
			مہتمم نشرواشاعت خلیفہ صلاح الدین احمد صاحب نے صیغہ تحریکِ جدید قادیان سے شائع کیا۔
جِلد پنجم	جلد چہارم	مریم، طٰہٰ، الانبیاء	تاریخ اشاعت ۲۰؍ مارچ ۱۹۵۸ء۔ تعداد تین ہزار فہرست مضامین مرتبہ حضرت مولانا جلال الدین صاحب شمس مطبوعہ ضیاء الاسلام پریس ربوہ ناشر الشرکۃ الاسلامیہ لمیٹڈ ربوہ حضرت اُمِّ طاہر ٹرسٹ کے اخراجات سے شائع ہوئی۔
جِلد ششم	جِلد پنجم جزء اوّل	الحج، المومنون، النور	تاریخ اشاعت ۱۹۵۷ء مطبوعہ ضیاء الاسلام پریس ربوہ ناشر الشرکۃ الاسلامیہ لمیٹڈ ربوہ۔
	جِلد پنجم جزء دوم	الفرقان	تاریخ اشاعت ۱۹۵۹ء مطبوعہ ضیاء الاسلام پریس ربوہ ناشر الشرکۃ الاسلامیہ لمیٹڈ ربوہ
جِلد ہفتم	جِلد پنجم جزء سوم	الشعراء النمل القصص العنکبوت	تاریخ اشاعت ۱۵؍ نومبر ۱۹۶۰ء تعارف حضرت مولانا جلال الدین صاحب شمس اِنڈیکس مرتبہ مولوی ابوالمنیر نورالحق صاحب فاضل مطبوعہ ضیاء الاسلام پریس ربوہ ناشر الشرکۃ الاسلامیہ لمیٹڈ ربوہ
جِلد ہشتم	جِلد ششم جزء چہارم حصہ اوّل	النبأ، النازعات، عبس، التکویر، الانفطار، التطفیف، الانشقاق، البروج، الطارق، الاعلیٰ، الغاشیہ، الفجر، البلد	تاریخ اشاعت ۹؍ اگست ۱۹۴۵ء۔ تعداد تین ہزار پیش لفظ حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ فہرست مضامین مرتبہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب انور مولوی عبدالرحمٰن صاحب انور انچارج تحریکِ جدید نے

موجودہ نمبر	سابقہ نمبر	نام سورتہائے	کوائف
			صیغہ تحریکِ جدید قادیان کی طرف سے شائع کیا۔ پرنٹر و پبلشر بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانی مطبع ضیاء الاسلام پریس قادیان حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ نے پارہ عمّ کی طباعت کیلئے دس ہزار روپے عطا فرمائے اور اس کا منافع بطور صدقہ جاریہ حضرت سیدہ مریم بیگم اُمِّ طاہر کی رُوح کو ثواب پہنچانے کے لئے وقف فرمایا۔
جلد نہم	جلد ششم جزء چہارم حصہ دوم	الشمس، الیل، الضحیٰ، الانشراح، التین، العلق، القدر، البینہ، الزلزال	تاریخ اشاعت ۲۵ دسمبر ۱۹۴۶ء تعداد تین ہزار پیش لفظ حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ فہرست مضامین مولوی عبدالرحمٰن صاحب انور بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانی پرنٹر و پبلشر نے باہتمام مولوی عبدالرحمٰن صاحب انور وکیل الدیوان تحریکِ جدید ضیاء الاسلام پریس قادیان سے طبع کروا کر شائع کیا۔
	جلد ششم جزء چہارم حصہ سوم	العادیات، القارعہ، التکاثر، العصر، الہمزہ	تاریخ اشاعت دسمبر ۱۹۵۰ء تعداد تین ہزار فہرست مضامین مولوی عبدالرحمٰن صاحب انور وکیل الدیوان تحریکِ جدید باہتمام مولوی ابوالمنیر نورالحق صاحب فاضل مولوی عبدالرحمٰن صاحب انور نے اِستقلال پریس لاہور سے طبع کرا کر صیغہ تحریکِ جدید انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ سے شائع کیا۔
جلد دہم	جلد ششم جزء چہارم حصہ چہارم۔	الفیل، قریش، الماعون، الکوثر، الکافرون، النصر، اللھب، الاخلاص، الفلق، النّاس	تاریخ اشاعت اکتوبر ۱۹۵۶ء تعداد تین ہزار اُمِّ طاہر ٹرسٹ کے لئے الشرکۃ الاسلامیہ لمیٹڈ نے ضیاء الاسلام پریس ربوہ سے طبع کرا کر شائع کیا۔